ناقابلِ فراموش

دیوان سنگھ مفتوںؔ

Marfat.com

ناقابلِ فراموش

(اضافہ شدہ ایڈیشن)

دیوان سنگھ مفتوں

مکتبہ شعر و ادب ○ سمن آباد ○ لاہور

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

786

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تخلیق کیا تخلیق کیا انسان کو لہو کی پھٹکی سے

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم سے

وہ گھر جس میں کتابیں نہ ہوں اُس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو۔

سُقراط

87150

ناشر _______ آصف نواز
مطبع _______ شکر گنج پرنٹرز لاہور
قیمت _______ 375 روپے

Marfat.com

3896

نذر

[library stamp]

محبت کے آنسوؤں کے ساتھ

اُن کے قدموں میں

جو اس دنیا میں موجود ہیں یا دوسری دنیا میں چلے گئے اور جن کی محبت، اخلاص اور دوست نوازی کی یاد ہمیشہ ہی میرے دل میں مسرت، راحت اور طہارت پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوئی۔

یکم نومبر ۱۹۵۷ء

نذر گزار

دیوان سنگھ

Marfat.com

Marfat.com

3896

فہرست مضامین

۱- نذر — دیوان سنگھ — ۳

۲- دیباچہ — " — ۹

۳- اردو زبان میں ناقابلِ فراموش اضافہ — ۱۲
(از شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی)

۴- ناقابلِ فراموش اردو کی یادگار کتاب — ۱۲
(از ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی مرحوم)

۵- بہترین دوست اور خطرناک دشمن — ۱۴
(حضرت علامہ نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ)

۶- "ناقابلِ فراموش" ایڈیٹر کے ناقابلِ فراموش مضامین — ۱۷
(جناب شیخ احسان الحق صاحب عشقی رئیس اعظم میرٹھ)

۷- سبق آموز اور عبرت انگیز — ۲۱
(ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بانی انجمن ترقی اردو)

۸- ناقابلِ فراموش میں جرأت اور صاف گوئی — ۲۶
(حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر "شمع" دہلی)

۹- بہترین دوست اور بدترین دشمن — ۲۷
(جناب ملا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" کراچی)

۱۰- پنجاب کا تیسرا معجزہ — ۲۹
(پروفیسر غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی ایم اے)

۱۱- غیر فانی کتاب — ۳۲
(حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی)

۱۲- بہترین خودنوشت سوانح عمری — ۳۴
(جناب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ ہیڈ پنجابی ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی)

۱۳- درسِ عمل — ۳۷
(ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم اے پی ایچ ڈی، ممبر برٹش انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی۔ لندن)

۱۴- ریاستوں کی قومی زندگی کا علمبردار — ۳۹
(جناب مالک رام صاحب مصنف "ذکرِ غالب" وغیرہ)

۱۵- نغمۂ مقدم (پنڈت ہری چند صاحب اختر)

۱۶- دلچسپ۔ پرکشش اور مفید — ۴۶
(مسٹر گوپال متل ایڈیٹر رسالہ "تحریک" دہلی)

۱۷- سچا افسانہ — ۴۹
(جناب عرش ملسیانی ایڈیٹر "آجکل" دہلی)

مضامین

۱۸- کام سے محبت — ۵۱

۱۹- طوائفوں سے نفرت — ۵۱

۲۰- خودداری کا کیریکٹر — ۵۲

۲۱- اعتماد کشی جرم ہے — ۵۳

۲۲- محنت کی عادت — ۵۴

۲۳- کامیابی کے لیے مضبوط قدم کی ضرورت — ۵۵

۲۴- خبریں حاصل کرنے میں مشکلات — ۵۸

۲۵- کام کرو روپیہ کی کمی نہیں — ۶۱

۲۶- کیریکٹر کا دشمنوں پر بھی اثر ہوتا ہے — ۶۴

۲۷- اچھے لوگ اپنے ہم وطنوں کے لیے باعثِ عزت — ۶۷

۲۸- دعا اور بددعا کا اثر — ۶۸

۲۹- ماں کی ممتا — ۶۹

۳۰- محنت اور کامیابی — ۷۳

۳۱- والیانِ ریاست کا انتقام — ۷۶

۳۲- انگریزوں کا کیریکٹر — ۸۴

۳۳- مہاراجہ نابھ کی نظربندی کا سبب
مہاتما گاندھی کا پوسٹ کارڈ — ۸۶

۳۴- روپیہ سے محبت نہ کرو — ۸۸

Marfat.com

۳۵- سیاسی جرائم کی تعزیر لاحاصل ۸۸
۳۶- احسان کرنا اور احسان جتانا ۹۲
۳۷- خبریں حاصل کرنے میں مشکلات ۹۳
۳۸- ایک پاگل کی "ریاست" کو امداد ۹۸
۳۹- پبلک لائف اور شادی ۱۰۰
۴۰- ایڈیٹر "ریاست" پر چوری کا مقدمہ ۱۰۲
۴۱- ایڈیٹر "ریاست" پر کوکین کا مقدمہ ۱۰۸
۴۲- عورت اور سنگار ۱۱۱
۴۳- بددل ملازم دشمن سے بدتر ۱۱۲
۴۴- "ریاست" سرجان تھامپسن اور والیان ریاست ۱۱۴
۴۵- جرنلزم کی چاٹ اور عشق ۱۱۸
۴۶- دوستوں کے لیے قربانی کرو ۱۲۲
۴۷- ایڈیٹر "ریاست" کی عدالتی قماربازی ۱۳۰
۴۸- گناہوں کی سزا ۱۳۶
۴۹- ریاستی رعایا اور اہل کاروں کی "وفاشعاری" ۱۳۸
۵۰- خودکشی کرنا بزدلی نہیں ۱۴۵
۵۱- ریاستوں کے مظالم اور برٹش حکام ۱۴۹
۵۲- اگروال ذہنیت ۱۵۱
۵۳- نفرت ومحبت کے اسباب ۱۵۷
۵۴- نسل اور صحبت کا اثر ۱۶۴
۵۵- رازداری اور کامیابی ۱۶۹
۵۶- "روحانیت" کا تجربہ ۱۷۲
۵۷- بغیر نیت کے جرائم ۱۷۵
۵۸- "ریاست" اور افغان گورنمنٹ ۱۷۹
۵۹- پبلک آواز واقعات کی بنیادوں پر ۱۸۲
۶۰- ایڈیٹر "ریاست" کی نیک چلنی اور بدچلنی" ۱۸۴
۶۱- اخبار نویس مصیبت زدہ لوگوں کے لیے ۱۸۹
۶۲- غلط تشخیص اور غلط علاج ۱۹۲
۶۳- ریاست نابھہ کا پُراسرار بکس ۱۹۵
۶۴- مارشل لاء کا زمانہ ۱۹۹
۶۵- پولیس کے نہلے پر پبلک کا دہلہ ۲۰۴
۶۶- والیانِ ریاست کا "پرسٹیج" ۲۰۸
۶۷- عادت کا قوتِ ارادی پر اثر ۲۱۰
۶۸- معقولیت باعثِ اطمینان ۲۱۲
۶۹- قانون اور فرض ۲۱۶
۷۰- ریاستوں کے جرائم اور ان کی سزائیں ۲۲۵
۷۱- ریاستی جرنلزم ۲۲۸
۷۲- اخبارنویس ۲۳۵
۷۳- جرنلزم کا روشن پہلو ہوئے ۲۳۹
۷۴- گورنمنٹ کی کاغذی مشینری ۲۴۵
۷۵- ریاستوں کی عدالتیں اور مجسٹریٹ ۲۴۸
۷۶- غدار ناقابل معافی ہیں ۲۵۲
۷۷- سی آئی ڈی کے "معتبر رپورٹر" ۲۵۵
۷۸- علامہ مشرقی کی گرفتاری ورہائی" ۲۶۲
۷۹- برٹش گورنمنٹ کی والیانِ ریاست کے متعلق مصلحتیں ۲۶۹
۸۰- پانی کا اثر طبائع پر ۲۶۹
۸۱- عزت، مرنے کے بعد ۲۷۳
۸۲- عزت کی قربانی ۲۷۵
۸۳- والیانِ ریاست کا "پرسٹیج" ۲۸۱
۸۴- خاندانی وقار پر فخر نہ کرو ۲۸۴
۸۵- ظلم وزیادتی کو برداشت نہ کرو ۲۸۶
۸۶- لائق سمجھنا ہی نالائقی کا ثبوت ہے ۲۸۹
۸۷- ستاروں کے اثرات ۲۹۱
۸۸- کیریکٹر کا بننا اور بگڑنا ۲۹۷
۸۹- انگریزوں کے کیریکٹر کی بلندی ۳۰۰
۹۰- نفس کو دھوکہ ۳۰۳

Marfat.com

۹۱- قابلِ معافی گناہ ۳۰۶
۹۲- ریاستی وزراء کا اقبال و زوال ۳۰۹
۹۳- بھروسہ کا مستحق ہر شخص نہیں ۳۱۴
۹۴- طوائف کی ناقابلِ تبدیل فطرت ۳۱۹
۹۵- خواب اور خیال ۳۲۲
۹۶- والیانِ ریاست کا انتقام اور ریاستی عدالتیں ۳۲۵
۹۷- ریاستوں کے جرائم ۳۲۹
۹۸- ہندوستانی ہوٹل ۳۳۴
۹۹- مرحوم مہاراجہ نابھہ کی گرفتاری ۳۳۸
۱۰۰- مرہٹوں کا بڑھاپے میں جوش ۳۴۱
۱۰۱- وضعداریاں ۳۴۳
۱۰۲- ریاستوں کی رعایا کا احساسِ کمتری ۳۴۶
۱۰۳- شہرت باعثِ راحت نہیں ۳۴۹
۱۰۴- تجارتی ہتھکنڈے ۳۵۱
۱۰۵- مہاتما گاندھی سے ملنے کی آرزو ۳۵۴
۱۰۶- غلط فہمی سے بچنے کی ضرورت ۳۵۶
۱۰۷- جھوٹ بولنے کی فطرت ۳۵۹
۱۰۸- جیل کی "بدمعاشیاں" ۳۶۱
۱۰۹- جرائم پر فطرت کا اثر ۳۶۷
۱۱۰- بد اچھا بدنام برا ۳۷۰
۱۱۱- خیالات میں انقلاب کا باعث ۳۷۴
۱۱۲- گھریلو ملازموں کی بددیانتیاں ۳۷۶
۱۱۳- سی آئی ڈی کی "کارگزاری" ۳۸۰
۱۱۴- بھوتوں کا وجود ۳۸۴
۱۱۵- عورتوں کا نازک احساس ۳۸۶
۱۱۶- ہمارا تجارتی چلن ۳۸۷
۱۱۷- بچپن کا زمانہ اور والدین کا فرض ۳۸۹
۱۱۸- فربہ جسم ایک لعنت ہے ۳۹۲
۱۱۹- طوائفوں کی قابلِ رحم زندگی ۳۹۵
۱۲۰- پولیس کے گرگوں کی کارگزاریاں ۴۰۰
۱۲۱- اخبار نویسوں کا امتحان طلب صبر ۴۰۳
۱۲۲- مقدمہ ہوشنگ آباد ۴۰۷
۱۲۳- ہوشنگ آباد کے مقدمہ کا تماشہ ۴۱۲
۱۲۴- والیانِ ریاست کا "پرسٹیج" ۴۱۶
۱۲۵- ایڈیٹر "ریاست" پر جھوٹا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا الزام ۴۱۹
۱۲۶- خواب اور اس کی تعبیر ۴۲۴
۱۲۷- علاج کے لیے تشخیص کی ضرورت ۴۲۵
۱۲۸- والیانِ ریاست کی سازشیں ۴۲۸
۱۲۹- گناہوں کی سزا ۴۳۲
۱۳۰- والیانِ ریاست کا روپیہ اور پبلک خدمت ۴۳۴
۱۳۱- سیاسی پراپاگنڈا ۴۴۰
۱۳۲- وکیلوں کی طفل تسلیاں ۴۴۲
۱۳۳- نئے اخبارات کی ناکامی ۴۴۶
۱۳۴- بدحواسیاں ۴۴۸
۱۳۵- بزدلی یا بے بسی ۴۵۱
۱۳۶- دفعہ ۱۰۹ تعزیراتِ ہند کا شکار ۴۵۷
۱۳۷- فسادات کا کیریکٹر پر اثر ۴۶۱
۱۳۸- اندھوں میں قوتِ احساس ۴۶۴
۱۳۹- مسٹر ہارنیمین کی فیاضی ۴۶۸
۱۴۰- عشق و شباب کی مجبوریاں ۴۷۳
۱۴۱- عورت اور شباب جیل میں ۴۷۶
۱۴۲- لیڈری اور اخبارات ۴۷۹
۱۴۳- رشوت اور سفارش ۴۸۱
۱۴۴- اہلِ فن اور ان کی قدر ناشناسی ۴۸۳
۱۴۵- ٹیلیفون پر شرارتیں یا مذاق ۴۸۵
۱۴۶- شہرت کا غلط شوق ذلت کا باعث ۴۹۰

Marfat.com

۱۴۷۔ سوامی شردھانند اور خواجہ حسن نظامی ۴۹۲
۱۴۸۔ پُراسرار مسٹر سوامی ۴۹۵
۱۴۹۔ ذہن میں انقلاب ۴۹۷
۱۵۰۔ مسٹر ہاسورتھ سمتھ آف مارشل لاء کا وحشیانہ پن ۴۹۹
۱۵۱۔ پولیس کے نہلے پر ایڈیٹر "ریاست" کا دہلہ ۵۰۱
۱۵۲۔ کمیونسٹوں کی قوت ارادی ۵۰۴
۱۵۳۔ ہندوستان کی پولیس اور ظلم ۵۰۷
۱۵۴۔ ریاستوں کے "خوش خور" ۵۱۰
۱۵۵۔ کھانے کی لذت ۵۱۲
۱۵۶۔ کتوں کی وفاشعاری ۵۱۵
۱۵۷۔ پھانسی کے منتظر ۵۱۸
۱۵۸۔ گناہوں کی سزا اس جنم میں ۵۲۴
۱۵۹۔ یتیم ہونا بھی ایک نعمت ہے ۵۲۷
۱۶۰۔ صحافتی "مراسم" ۵۳۰
۱۶۱۔ ہندوستان کا عام دین ۵۳۳
۱۶۲۔ عدالتوں میں ضمیر کا سودا ۵۴۲
۱۶۳۔ مسٹر ہارنیمین کی تنگ دستی ۵۴۴
۱۶۴۔ جہیز کا شکار ۵۴۶
۱۶۵۔ ۱۹۴۷ء کا "بیت المال" ۵۴۸
۱۶۶۔ مرحوم شیخ ضیاء الحق کی علم دوستی ۵۵۰
۱۶۷۔ ہندوستانی وضعداریاں ۵۵۲
۱۶۸۔ ریاست پٹیالہ کے سیشن ججوں کا ناچ ۵۵۵
۱۶۹۔ مذاق کا کفارہ ۵۵۶
۱۷۰۔ مہاراجہ بھرت پور کا انجام ۵۶۱
۱۷۱۔ بھن جی کہنے کا اثر ۵۶۳
۱۷۲۔ عورتوں پر صدمہ کا اثر ۵۶۵
۱۷۳۔ نظام دکن کا ظلم اور مہاتما گاندھی ۵۷۰
۱۷۴۔ مجرمانہ ذہنیت اور اس کے نتائج ۵۷۱
۱۷۵۔ جیل کا پاگل پن ۵۷۶
۱۷۶۔ "ریاست" اور جسٹس سر ڈگلس ینگ ۵۸۰
۱۷۷۔ نوبل پرائز کے امیدوار مولانا ناصر بلیاوی ۵۸۴
۱۷۸۔ شراب کی زیادتی موت کا باعث ۵۹۱
۱۷۹۔ روپیہ کی موجودہ افلاس ۵۹۴
۱۸۰۔ مرحوم بابا سر کھیم سنگھ کے اثرات ۵۹۸
۱۸۱۔ ضامن ہونا بھی ایک جرم ہے ۶۰۲
۱۸۲۔ گھر کا جوگی 'جوگڑا' ۶۰۷
۱۸۳۔ سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ آف نابھہ ۶۱۰
۱۸۴۔ روپیہ اور فیاضی ۶۱۳
۱۸۵۔ خاندانی وقار ۶۱۶
۱۸۶۔ "نیتاجی" "نیم چند" ۶۱۸
۱۸۷۔ گھریلو ملازموں کا جھوٹ اور چوری ۶۲۲
۱۸۸۔ اخبارات کی اشاعت کے متعلق غلط بیانیاں ۶۲۶
۱۸۹۔ حُسن اور موسیقی کا اثر ۶۳۲
۱۹۰۔ گناہوں کے اقرار کا اثر ۶۳۶
۱۹۱۔ نفرت و عداوت میں فرق ۶۴۰
۱۹۲۔ غسل اور صحت ۶۴۹
۱۹۳۔ بزنس کا کیریکٹر اور تجارتی ساکھ ۶۵۳
۱۹۴۔ جوش ملیح آبادی کی درویشانہ فطرت ۶۵۶
۱۹۵۔ کیا سکھ ہندو نہیں ۶۶۱
۱۹۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلی اور آخری ملاقات ۶۶۳
۱۹۷۔ سفید پوشی کی مصیبتیں ۶۶۹
۱۹۸۔ بالائی آمدنی ۶۷۱
۱۹۹۔ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف مقدمات اور ان میں بریت ۶۷۵

Marfat.com

دیباچہ

دوسرے لوگوں کے لیے تو جیل شاید مصائب و مشکلات کا باعث ہو مگر جیل کی زندگی میرے لیے تو ہمیشہ ہی ایک نعمت ثابت ہوئی کیونکہ جیل سے باہر جہاں مجھے ایک منٹ کے لیے بھی کبھی فرصت نہ ملتی تھی۔ میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچ نہ سکتا تھا اور مالی مشکلات ہمیشہ ہی ذہنی کوفت اور پریشانی کا باعث رہیں۔ جیل میں کوئی کام نہ ہونے کے باعث مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کے لیے بہت کافی وقت ملا اور چونکہ وہاں مالی پریشانیوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ میں وہاں ہمیشہ ہی اس کوشش میں رہا کہ اپنی حالت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرسکوں اور وہاں کے فرصت کے زمانہ کو "ریاست" اور پبلک کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنا سکوں۔ چنانچہ نواب بھوپال والے مقدمہ میں جب میں تین ماہ کے لیے ناگپور جیل میں رہا تو میں نے "ریاست" کے مستقل کالم "جذباتِ مشرق" کے لیے ہندی کے بہترین شعراء کے کلام کا اتنا ترجمہ کرلیا جو آئندہ کئی ماہ کے لیے کافی تھا اور رہا ہوتے ہی دہلی پہنچ کر میں نے اس نئے اور مستقل کالم کو شروع کردیا اور انبالہ و فیروزپور جیل میں جب ایک سال کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر اپنی زندگی کے گزشتہ اکثر واقعات کے نوٹ لے لیے اور دہلی پہنچتے ہی مستقل عنوان "ناقابلِ فراموش" قائم کرکے اس کے لیے ہر ہفتہ ایک مضمون لکھنا شروع کردیا۔ چنانچہ اگر میں جیل نہ جاتا تو یہ کالم شاید کبھی بھی جاری نہ ہوسکتا۔ کیونکہ جیل سے باہر پچھلے واقعات کو یاد کرکے ان کے متعلق نوٹ لینے کی فرصت ہی نہ تھی۔

"ریاست" میں جب ہر ہفتہ "ناقابلِ فراموش" کالم کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے تو یہ پبلک میں بے حد مقبول ہوئے اور مجھے یاد ہے اس زمانہ میں جب چھوٹے سائز پر چند مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تو ایک بہت بڑے ادیب نے جو اس زمانہ میں دہلی میں گورنمنٹ ہند کے ایک بہت بڑے عہدہ پر تھے۔ آجکل پاکستان میں ایک منسٹر کی پوزیشن میں ہیں اور جو اپنے مطالعہ کے لیے پانچ سو روپیہ ماہوار کی کتابیں یورپ اور امریکہ سے مستقل طور پر خریدا کرتے ہیں، نے ایک خط لکھا جس میں آپ کا ارشاد تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں اس کتاب سے زیادہ دلچسپ دوسری کوئی کتاب کسی زبان میں نہیں دیکھی اور ان کی خواہش ہے کہ اس کتاب کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو۔ اس بڑی پوزیشن کے ادیب کا یہ خط میری اور بھی حوصلہ افزائی کا باعث ہوا اور ان مضامین کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ جو اب موجودہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے اور اس میں بہت سے ایسے نئے مضامین بھی شامل کردیے ہیں جو صرف اس

Marfat.com

کتاب کے لیے ہی حال میں لکھے گئے اور جو قطعی غیر مطبوعہ ہیں۔

"ریاست" ۱۹۲۴ء میں جاری کیا گیا اور آج اس کو تینتیس برس ہوتے اور گو "ریاست" اردو زبان کا بہترین باتصویر ہفتہ وار تھا جو انگریزی زبان کے اچھے سے اچھے رسائل کا مقابلہ کر سکتا تھا اور تینتیس برس تک ہی میں نے کوشش کی کہ میری زبان غلطیوں سے پاک ہو مگر میں ایمان داری کے ساتھ اس کا اقرار کرتا ہوں کہ "بارہ برس دہلی میں رہے بھاڑ جھونکتے رہے" کے مصداق تینتیس برس میں بھی میں اردو زبان پر قادر نہ ہو سکا کیونکہ اردو میری مادری زبان نہیں اور میرے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ زبان کے لحاظ سے مجھے وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو دہلی کے رہنے والے ایک معمولی تعلیم یافتہ شخص کو بھی حاصل ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ پنجاب کا رہنے والا کوئی شخص جس کو ماں کے دودھ کے ساتھ پنجاب کی صرف پنجابی زبان نصیب ہوئی وہ ایک دوسرے علاقہ میں بولی جانے والی اردو زبان پر قادر ہو سکے۔ چنانچہ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اردو زبان کا کوئی ادیب بھی (مع مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا سالک اور مرحوم سر عبدالقادر جو اردو زبان پر ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے ہیں) ایسا نہیں جو پنجاب میں پیدا ہوا ہو اور وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اردو زبان پر قادر ہے، یعنی میری رائے میں کوئی شخص بھی کسی غیر زبان پر قادر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر وہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ یقیناً غلط فہمی میں مبتلا ہے جس کے ثبوت میں پروفیسر محمد حسین آزاد کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔

مرحوم پروفیسر محمد حسین آزاد تو دہلی میں پیدا ہوئے مگر آپ فارسی زبان کے بہت بڑے عالم تھے اور اپنی اس کوالیفکیشن کے باعث ہی سالہا سال تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی زبان کے پروفیسر رہے۔ آپ کو یہ وہم تھا کہ آپ فارسی زبان کے اعتبار سے ایران کے اہل زبان کا بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں ہی مبتلا تھے کہ آپ ایران تشریف لے گئے تاکہ وہاں کے اہل زبان علماء پر اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھا سکیں۔ طہران پہنچنے کے بعد آپ وہاں کے ایک عالم اور مصنّف کے مہمان ہوئے اور دوسرے تیسرے روز کا واقعہ ہے آپ مکان کے صحن میں بیٹھے تھے اور قریب ہی چولھا جل رہا تھا اتنے میں دیگچی زیادہ آنچ ہونے کے باعث اُبل پڑی اور دیگچی کا ڈھکنا ایک طرف ہو گیا۔ مولانا آزاد یہ کیفیت دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ دیگچی کی اس کیفیت کو کیا کہنا چاہیئے کہ اتنے میں کمرے کے اندر سے ایک چھوٹی لڑکی صحن میں آئی اور اس نے دیگچی کو ابلتی حالت میں دیکھا تو فوراً اپنی ماں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "اماں! ـــ اماں دیگچی سر کردہ" مرحوم پروفیسر آزاد نے جب یہ سنا تو آپ کو احساس ہوا کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور کوئی شخص بھی چاہے کسی غیر زبان میں کتنا بھی اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہو وہ کسی غیر زبان پر قادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مرحوم پروفیسر صاحب ایران میں اپنی فارسی دانی کا سکہ بٹھائے بغیر واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔

میں نے اپنی پچھلی زندگی میں بہت کوشش کی کہ میں صحیح اور درست اردو لکھ سکوں اور اس سلسلہ میں مُلّا واحدی صاحب، مسٹر ممتاز مرزا، بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان کی ایک مرحوم خاتون اور بعض دوسرے

Marfat.com

دوستوں نے میری بہت امداد کی۔ یہ "شخصیتیں" ریاست" میں شائع ہو چکے مضامین کی غلطیوں پر طویل عرصہ تک مجھے توجہ دلاتی رہیں اور میں ان کا انتہائی شکرگزار ہوں مگر پھر بھی مجھے قطعی درست اور صحیح اردو لکھنے میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور گو بطور ایک طالب علم کے میری کوشش ہوتی ہے کہ میں بغیر غلطیوں کے اردو لکھ سکوں مگر کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اردو میری مادری زبان نہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ زبان کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے اس مقصد کو پیش نظر رکھیں جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ۔۔۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ میں اس کتاب کے ذریعہ پبلک کے کیریکٹر کو بلند لے جانے کے اعتبار سے ملک کی کچھ خدمت انجام دے سکوں اور اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا رومؒ کا ایک واقعہ یاد دلاتا ہوں۔ مولانا پر کسی شخص نے اعتراض کیا کہ آپ کے اشعار میں غلطیاں ہوتی ہیں تو مولانا نے اس اعتراض کا جواب اس شعر میں دیا تھا: ؎

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات
شعر می گویم بہ از آب حیات۔

(میں شاعری کے فن اور عروض سے واقف نہ سہی مگر اشعار تو ایسے کہتا ہوں جن کو آب حیات سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے) یعنی یہ نہ دیکھئے کہ کس نے لکھا ہے یہ پڑھیئے کہ کیا لکھا اور کیا کہا ہے اور میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے "عزت کی قربانی" (جو مرحوم دیوان دیا رام گدومل کے متعلق ہے) وغیرہ مضامین نہ صرف پڑھیں بلکہ ایسی قابلِ احترام شخصیتوں کے بلند کیریکٹر کی پیروی کی بھی کوشش کریں۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں کئی برس سے کوشش میں تھا مگر مالی مشکلات کے باعث کامیابی نصیب نہ ہوئی اور میں ان دوستوں کا صدق دل کے ساتھ شکرگزار ہوں۔ جن کی مالی امداد سے یہ کتاب آج شائع ہو رہی ہے اور چونکہ یہ دوست نہیں چاہتے کہ ان کا نام شائع ہو اس لیے مجبور ہوں کہ اس شکریہ کے ساتھ ان کا نام نہ لکھا جائے۔

یکم نومبر ۱۹۵۰ء
دھلی

نیاز کیش
دیوان سنگھ

Marfat.com

اردو زبان میں ناقابلِ فراموش اضافہ

(شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

میرے مخلص ترین دوست سردار دیوان سنگھ مفتون، ہماری قدیم وضعداری، ہماری قدیم شرافت ہماری قدیم دریادلی اور اخلاقی جرأت کی ایک ایسی عظیم یادگار ہیں کہ اگر ہماری قوم اندھی نہ ہو چکی ہوتی تو ان کو اسی احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا جس احتیاط کے ساتھ حکومتیں اپنے آثارِ قدیمہ کو برقرار رکھتی ہیں۔

سردار صاحب کی یہ کتاب ان کی زندگی کا ایک زبردست کارنامہ اور اردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

انہوں نے اپنی زندگی کی پیچیدہ اور طویل راہوں سے اپنے منتشر نقوشِ قدم کو بڑی دیدہ وری کے ساتھ جن جن کر اس سلیقے کے ساتھ الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ جو اس کتاب کو غور سے پڑھے گا اس کی زندگی کے راستوں پر ایسے چراغ جگمگا اٹھیں گے، جن کی مستقل روشنی میں وہ بے خوف و خطر آگے بڑھے گا اور کسی نشیب و فراز یا کسی موڑ پر وہ ٹھوکر نہیں کھا سکے گا۔

میری دلی آرزو ہے کہ اس کتاب کو بہمہ وجوہ فروغ حاصل ہو اور حکومتِ ہند اس کے بعض حصوں کو نصاب میں داخل کر کے آئندہ نسلوں تک اُس روحِ شرافت کے چشمے کو پہنچا دے جو اب عنقریب خشک ہو جانے والا ہے۔

کاش! ایسی کتاب کسی زندہ قوم میں شائع ہوتی!

ناقابلِ فراموش اردو کی یادگار کتاب

(ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی مرحوم)

دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کا جہاں کہیں ذکر چھڑ جائے۔ نہایت ہندوستانی قسم کی بحث کا آغاز ہو جاتا ہے، اگر ما گرم بحث جس میں ہر کوئی دوسرے کی سُنے بغیر اپنی کہے جاتا ہے۔

Marfat.com

راجے نواب کو سنیں گے تو دائیں بائیں دیکھ کر۔ تعریف کریں گے تو جیں بہ ابرو ہو کر۔ ان کے وزیر وزراء ایسے حیرت ناک قصے سنائیں گے کہ سچ جھوٹ معلوم ہونے لگے اور پرجا ئیے لوگ ایسے مہاتما قسم کا قائد اعظم یا عمرو عیار قسم کا گوبلز بتائیں گے۔ پارٹی باز سیاسی لوگ ایک سانس میں گالی اور دوسرے سانس میں قصیدہ لکھائیں گے۔ غرض ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق اندازہ لگائے گا۔ البتہ ایک بات پر سب کو اتفاق ہے کہ دیوان سنگھ بڑا یار آدمی ہے۔

دیوان سنگھ کے یاروں کا حلقہ دولت مندی کے دنوں سے لے کر اب تک بہت متنوع رہا ہے سرکاری افسر، مفرور قیدی، رندمزاج ادیب، سادھو منش فرنگی، ہر طرح کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دہریے اس میں شامل ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا دیوان سنگھ مختلف ہے۔

دیوان سنگھ کوئی گہرا فلسفی یا سیاست دان نہیں۔ وہ جو کچھ بھی کہتا یا کرتا ہے ہر کسی کی سمجھ میں آسانی سے آسکتا ہے۔ مگر وہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو کرتا ہے اسے برملا بیان کر دیتا ہے۔

"ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے جو سلسلۂ مضامین ۳ اپریل ۱۹۴۴ء سے "ریاست" میں شروع ہوا وہ ابھی تک جاری ہے۔ شروع ہی سے یہ سلسلہ ایسا مقبول ہوا کہ اب یہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ کتاب دیوان سنگھ کی برملا گوئی کی شاہد ہے۔

ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں اور اردو نثر میں اس طرح کی تحریریں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کیے گئے ہوں۔ جو ہوں بھی تو ضروری نہیں کہ مصنف کی زندگی اس طرح کی ہو کہ ہر شخص کو اس میں دلچسپی ہو اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہے وہ ہر قسم کا واقعہ پوری تفصیل سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہے۔ یہ نہیں تو زیب داستان کے لیے یوں رنگ آمیزی کی جاتی ہے کہ واقعہ قصہ اور قصہ داستان بن جاتا ہے۔

"ناقابلِ فراموش" ان عیوب سے پاک ہے۔ مصنف کی زندگی اہم تاریخی قسم کے واقعات میں سے گزری ہے بلکہ کئی بار اس نے سوانح سازی میں تاریخ کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس نے واقعات کے انتخاب میں صرفے سے کام لیا ہے اور اس کی شخصیت اس قدر بھرپور ہے اور اسے زندگی کا اتنا گہرا احساس ہے کہ اس پر گزری ہوئی ہر بات ہر کسی کو اپنے اوپر گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو واقعات وہ بیان کرتا ہے، وہ اس قدر جاندار ہیں کہ اسے انہیں بڑھانے سجانے کی ضرورت نہیں اور اس کی یادداشت اس بلا کی ہے کہ وہ بھول کر غلط بیانی نہیں کرتا۔

بلیشتر واقعات بظاہر اور لوگوں سے متعلق ہیں مگر ان کا راوی سے اتنا تعلق ہے یا اسے ان سے اس قدر انہماک ہے کہ ان میں سے اس کا اپنا کردار، اپنی شخصیت۔ اپنا آپ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے بات خواہ مہاراجہ نابھہ کی ہو یا کسی خفیہ پولیس والے کی۔ دوست کی ہو یا دشمن کی۔ اس میں سے بات کرنے والا جھلملاتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کبھی کبھی صحافتی واقعہ نویسی، وقوعہ گوئی سے مل جاتی ہے اس ادبیت کا ظہور کچھ اس بے ساختہ پن سے ہوتا ہے کہ بسا اوقات تلاش نہ کرنے والے کو واضح دکھائی

Marfat.com

دیتا ہے اور تلاش کرنے والے سے اوجھل رہتا ہے۔ اس لیے کہ مفتوں کا طرزِ تحریر مصنوعی آرائش سے پاک ہے۔ وہ پھول کی کلی کہتا ہے "گرہِ رنگ و بو" نہیں کہتا۔ نہ کہ دال (آلہ زبان کنی) "جب غصے کا اظہار کرتا ہے تو محض "آپ کے قبلہ و کعبہ کی شان میں گستاخی کے ارادے" کا اعلان نہیں کرتا اور خوش ہوتا ہے تو "نا فدا با شد بہادر شاہ باد" قسم کے قصیدے نہیں لکھتا۔ کھری کھری بات کھرے کھرے لہجے میں صاف صاف کہتا ہے بے خوف اور برملا کہتا ہے۔

وہ اول و آخر صحافت نگار ہے اور دیانت دار ہے۔ یہ اجتماع ہمارے ہاں کمیاب ہے یہی وجہ ہے کہ میں "ناقابلِ فراموش" کو اردو کی چند یادگار کتابوں میں شمار کرتا ہوں اردو کیا ہندوستان میں انگریزی میں بھی اس قسم کی کتابیں کم شائع ہوئی ہیں۔

اس کتاب کی ہر سطر دلچسپ ہے کیونکہ لکھنے والا دلچسپ ہے اور بے حد دلچسپ انسان ہے۔ البتہ ہر واقعہ کے بعد جو اخلاقی سبق نکالا گیا ہے وہ مجھے بوجھل معلوم ہوا میں اسے دیوان سنگھ مفتوں کی شخصیت سے باہر کی بات سمجھتا ہوں۔ یوں تو ظاہر ہے کہ جس شخص نے جبر و استبداد کا اس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا ہو اس کی اخلاقی اقدار بہت راسخ ہوں گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاق کے ساتھ "اخلاقیت" بلکہ وعظ گوئی بھی شامل ہو۔ یہ لیڈری منیخیت، مہاتمائیت قسم کی خو ہے۔ مفتوں اس سے اب تک محفوظ رہا ہے امید ہے آئندہ بھی بچا رہے گا۔ جس طرح وہ بے اختیار اور بے پناہ قہقہے لگاتا ہے اپنے پر اور دوسروں پر ہنستا ہنساتا ہے۔ بہ طور طریقے اور طرح کے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کتاب میں سکھ، کانگرسی اکالی، ہندو، مسلم، عیسائی، گورے، کالے، راجے، وزیر، رند اور نمازی سب ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ انسانیت کی رسی میں مفتوں کی جانبداری، دوستی، دشمنی سب انسانی ہے۔ اس دور میں اس فتنہ و شر کے دور میں اس قسم کے لوگ بہت غنیمت ہیں۔ آپ ان سے اس کتاب میں مل کر بہت خوش ہوں گے۔

ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بہترین دوست اور خطرناک دشمن

(حضرت علامہ نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ)

اب سے سینتیس ۳۷ سال قبل ۱۹۲۰ء کی بات ہے دہلی سے ملا واحدی روزنامہ "رعیت" نکال رہے ہیں اور مجھے بھوپال سے اس کی ایڈیٹری کے لیے طلب کیا جاتا ہے۔ میں آجاتا ہوں اور ملا واحدی کے مکان پر اخبار "رعیت" کے دفتر میں اول اول سردار دیوان سنگھ سے میرا تعارف ہوتا ہے۔

Marfat.com

میں صبح کو دو تین گھنٹے کے لیے دفتر جاتا تھا اور اداریہ وغیرہ لکھ کر اپنی جائے قیام پر لوٹ آتا تھا۔ اس سے قبل و بعد وہاں کیا ہوتا تھا، اخبار کہاں چھپتا تھا، کب شائع ہوتا تھا۔ اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ اس کی ملکیت کے متعلق ضرور یہ بات کانوں میں پڑی تھی کہ اس اخبار کو پہلے خواجہ حسن نظامی کی تحریک سے بھیا احسان الحق نے جاری کیا تھا اور پھر جب ان کو کچھ دشواریاں پیش آئیں تو ملا واحدی نے اسے لے لیا۔

عوام کی آواز حکومت تک پہنچانا اس کی پالیسی تھی اور حکومت اسے کچھ اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی غالباً بھیا احسان اسی لیے اس سے دست بردار ہو گئے تھے۔ ملا واحدی سمجھتے تھے کہ حکومت اخبار کو زیادہ دن چلنے نہ دے گی اور ضمانت طلب کر کے اسے ختم کر دے گی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب صورت یہ ہے تو کیوں نہ اس کے لب و لہجہ کو زیادہ سخت کر دیا جائے اور جب وہ بند ہو تو اپنا نقش عوام کے دل پر چھوڑ جائے۔ مجھ کو بلانے کی وجہ یہی تھی کیونکہ اس وقت میری سیاسی نظمیں اور سیاسی مضامین "الہلال" اور "زمیندار" وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا لب و لہجہ بہت پُر جوش ہوتا تھا اور حکومت۔ مری نکتہ چینیاں پسند کی جاتی تھیں۔ آخر کار جب چند دن بعد یہ معلوم ہو گیا کہ حکومت نے اپنی جگہ "رعیت" کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو واحدی صاحب نے مجھ سے کہا کہ جب صورت یہ ہے تو کیوں نہ سنبھالا دیا جائے۔

آخر کار میں نے مسئلہ مصر پر دو اداریے زیادہ سخت لکھ دیے۔ اور حکومت کو ایک اور بہانہ "رعیت" بند کر دینے کا ہاتھ آ گیا اور یہ بساط الٹ دی گئی۔

یہ ذکر میں نے اس لیے کیا کہ میرے اور دیوان سنگھ کے اولین تعارف کا پس منظر سامنے آ جائے۔ سردار صاحب سے روز دفتر میں ملاقات ہوتی تھی لیکن بہت سرسری۔ وہ مجھے دیکھ کر کیا سمجھتے ہوں گے، مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے ان کی مستعدی، بے چینی، گفتگو کا انداز، بلند لب و لہجہ اور رجحانی میلان کو دیکھ کر ضرور ان کے سمجھنے کی کوشش کی اور آخر کار ایک دن واحدی صاحب کے دریافت کرنے پر میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ رعیت چلے یا نہ چلے لیکن دیوان سنگھ سارا عی آپ کو مشکل سے ملے گا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے دہلی سے بھوپال لوٹ آنے کے بعد دیوان سنگھ، واحدی صاحب سے وابستہ رہے یا نہیں۔ اور انہوں نے اس کے بعد کیا کیا۔ کیونکہ انہوں نے جو حالات اپنے قلم بند کیے ہیں ان میں کوئی تاریخی تسلسل نہیں پایا جاتا۔ لیکن ان کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی انہوں نے "ریاست" جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس سلسلے میں جو "ہفت خواں" انہوں نے طے کیے ان کا علم آپ کو بالتفصیل اسی کتاب سے ہو سکتا ہے۔ میرے بھوپال واپس جانے کے بعد دیوان سنگھ اور میں عرصہ تک بیگانہ رہے۔ لیکن یہ بیگانگی ایسی نہ تھی کہ میں ان کو بھول جاتا۔ اسی لیے "ریاست" کے اجراء کے بعد جب کبھی دہلی جاتا تو انہیں کے پاس قیام کرتا اور صرف اس لیے کہ مجھے ان کی سادگی اور بے تکلفی بہت پسند تھی اور وہاں ٹھہرنے کے بعد میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کرتا تھا۔ سردار دیوان سنگھ کی خانگی زندگی کی میں نے کبھی جستجو نہیں کی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ میں نے

Marfat.com

ہمیشہ ان کو تنہا سادھوؤں کی سی زندگی بسر کرتے دیکھا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دنیا کے اسباب عیش و راحت سے متنفر تھے۔ آراستہ مکان، اچھا فرنیچر، متعدد ملازم، سواری کے لیے موٹر سبھی کچھ ان کے پاس تھا اور اپنے احباب کی خاطر و مدارات میں بڑی دریا دلی سے کام لیتے تھے لیکن خود ان کی زندگی، راہبانہ انداز کی تھی جو انہوں نے کبھی ترک نہیں کی اور اب تک اس پر قائم ہیں۔

سردار دیوان سنگھ کی طبعی خصوصیت جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئی ان کا مردانہ عزم و استقلال ہے۔ مصیبت و پریشانی میں گھبرا جانا انسانی فطرت ہے لیکن قدرت نے یہ احساس ان میں پیدا ہی نہیں کیا۔ اور وہ مصائب کا مقابلہ ایسی پامردی، خوش دلی اور صبر و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔

وہ بڑے بولنے والے نڈر اسپنج انسان ہیں اور غم و فکر کو کبھی پاس نہیں آنے دیتے۔ وہ فطرتاً بڑے بیباک، آزاد، صاف گو، زندہ دل و زبان کی ایسی ہم آہنگی میں نے کم کسی میں پائی ہے۔ وہ بڑے اچھے اور سچے دوست ہیں لیکن اسی حد تک خطرناک دشمن بھی۔ وہ بڑے مضبوط کردار کے انسان ہیں اور ایک بار جس سے جو تعلقات قائم ہو گئے انہیں ہمیشہ نباہتے ہیں لیکن وہ آستین کو کبھی معاف نہیں کرتے اور جب تک اس کا سر نہ کچل دیں پیچھا نہیں چھوڑتے۔

سردار دیوان سنگھ کی ساری زندگی صحافت ہی کے مشغلے میں بسر ہوئی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اخبار ریاست ان کی صحافتی زندگی کا اتنا زبردست کارنامہ ہے کہ ہم اس سے ہٹ کر ان کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتے۔ کسی کام کا ارادہ کر لینا ان کے نزدیک ایک ایسا روحانی عہد ہے جس کی تکمیل میں وہ اپنی تمام ذہنی و جسمانی قوت صرف کر دیتے ہیں۔ وہ ہر کام کا اسلوب پہلے سے سوچ لیتے ہیں اور پھر اس سے نہیں ہٹتے۔ ان کی محنت کا یہ حال ہے کہ وہ تھکنا جانتے ہی نہیں اور ایک مشین کی طرح ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کامیاب صحافتی زندگی کا سب سے بڑا راز ان کا یہی جوش عمل ہے اور اس کے ساتھ ضمیر کی پاسداری۔ کہ "موج خود سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے" لیکن وہ اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھیں گے۔

سردار دیوان سنگھ بڑے تن و توش کے آدمی ہیں اور ایک زمانہ سے یورک ایسڈ کے مریض ہیں لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس کی وجہ سے ان کے مشاغل میں کوئی فرق آیا ہو۔

بہت صبح اٹھنا اور کام میں لگ جانا ان کی زندگی کے ایسے تعینات ہیں جن سے انحراف ممکن نہیں۔ وہ اپنا ایک تخلص بھی رکھتے ہیں مفتوں لیکن میں نے کبھی ان کی زبان سے ان کا کوئی شعر نہیں سنا۔ البتہ انشا پرداز کی حیثیت سے ان کے بہت سے کارنامے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

وہ صحافی ادیب ہیں اور اس فن کے پورے ماہر۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک صحافی کو کس وقت کس انداز سے لکھنا چاہیے لیکن کبھی کبھی فرط جوش میں ان کا قلم مناسب حدود سے آگے گزر جاتا ہے۔

الغرض سردار دیوان سنگھ بڑا سچا دوست، بڑا خطرناک دشمن، نہایت بیباک صحافی، بے خوف اور نڈر انسان ہے اور میں نے کم ایسے انسان دیکھے ہیں جو دیوان سنگھ کی طرح صابر و ضابط اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسا شگفتہ دل رکھتے ہوں۔ یہ کتاب اسی ناقابل فراموش ہستی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور اس قدر دلچسپ ہے کہ کم از کم اس کے مطالعہ میں مجھے اتنا ہی لطف آتا ہے جتنا غوث علی شاہ کے "تذکرہ غوثیہ" کے مطالعہ میں۔

Marfat.com

ناقابلِ فراموش ایڈیٹر کے ناقابلِ فراموش مضامین

(بعنایت شیخ احسان الحق صاحب عشقی، رئیس اعظم میرٹھ)

ہفت روزہ اخبار "ریاست" دہلی کے نامور ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ کی ہمہ رنگی زندگی بھی قدرت کی تخلیقی عجوبہ کاریوں اور ستم ظریفیوں کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس بوقلموں مرقع میں سردار صاحب کی طوفانی زندگی کے مدوجزر، سیرت انسانی کی بلندی و پستی اور خیر و شر کی آمیزش و آویزش کے ایسے بصیرت افروز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جو دوسرے خود ساختہ (سیلف میڈ) مشہور و معروف لوگوں کے حیاتی مرقعوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ ان خود ساختہ مشاہیر عہد میں سے ہیں جو محض اپنی اولوالعزمی جراءت مندی محنت و جفاکشی اور صبر و استقامت وغیرہ جیسی فطری قابلیتوں کے ذریعہ چھوٹی اور گمنام حیثیت سے ترقی کر کے بام شہرت و عروج پر پہنچے ہیں۔ جن کی ساری زندگی اپنی فلاح و ترقی کے لیے نئی نئی راہیں نکالنے، مختلف جولانگاہوں میں ہمت و مردانگی کے کمالات دکھانے اور پیش آنے والی رکاوٹوں اور مشکلوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ جنہوں نے اپنی لرزہ خیز تحریروں سے با اختیار حکمرانوں اور بڑے بڑے بااثر لیڈروں کے دل ہلا دینے اور اپنی حیرت انگیز حکمت عملیوں اور حریف شکن منصوبوں سے اپنے بڑے بڑے مخالفوں کے چھکے ڈھیلے کر دیے اور ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔ سردار صاحب نے اپنی ہمہ رنگی زندگی کے ایسے بصیرت افروز واقعات کو جو خود ان کے نزدیک ناقابلِ فراموش ہیں منتفرق مضمونوں میں قلم بند کر کے ان مضمونوں کا ایک مجموعہ "ناقابلِ فراموش" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعۂ مضامین سردار صاحب کی زندگی کا کوئی مکمل اور صحیح مرقع نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سے واقعاتِ زندگی تو درج ہی نہیں کیے گئے ہیں اور جو واقعات درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض اہم واقعات کی پوری تفصیلات مصلحتاً نہیں بیان کی گئیں۔ لیکن ناقص و نامکمل مرقع زندگی ہونے کے باوجود اس مجموعۂ مضامین کے مندرجہ واقعات سے سردار صاحب کی زندگی اور ان کے کردار کے ہر ایک پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے اور واقعات کے مطالعہ کے بعد ہر غیر جانب دار شخص کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ سردار دیوان سنگھ میں کچھ ایسی عجیب و غریب اہلیتیں اور متضاد قابلیتیں اور صلاحیتیں ضرور ہیں جو عام انسانوں میں نہیں ہوا کرتیں اور اس لحاظ سے سردار صاحب بلاشبہ ایک غیر معمولی انسان ہیں اور اگر اس غیر معمولی انسان کے سینکڑوں قابلِ قدر کارناموں میں سے کچھ کارنامے ایسے ہیں جن کو مقدس اور متدین طبقوں میں اخلاقی معیاروں سے گرا ہوا اور ناپسندیدہ کہا جا سکتا ہے تو سردار صاحب کے ان ناپسندیدہ کارناموں کو بھی کم از کم اولوالعزمانہ اور جرأت مندانہ کارنامے ہونے کی عزت سے محروم نہیں کیا جا سکتا سردار صاحب کی رسمی تعلیم صرف درجہ پنجم تک ہوئی ہے لیکن جو قدرتی تعلیم و تربیت سردار صاحب نے خود اپنی پُرآشوب زندگی کی آغوش اور مکتب حوادث میں پائی ہے وہ مروجہ اعلیٰ تعلیمات کے مقابلے میں کہیں زیادہ گراں بہا اور قابلِ قدر ہے۔ سردار صاحب آج کل کے اُن ڈگری یافتہ علم برداروں میں سے نہیں جو "چارپائے بروکتابے چند" کے مصداق ہیں اور جن کی فطری صلاحیتیں ان کے اکتسابی علوم و فنون کے بوجھ میں دب کر ناکارہ ہو گئی ہیں۔

Marfat.com

سردار صاحب اس قدرتی تعلیم سے فیض یاب ہوئے ہیں جس نے ان کی تمام فطری صلاحیتوں کو بیدار اور مجلّی کر دیا ہے۔ سردار صاحب کی فطرت میں اولوالعزمی و بلند ہمتی، جرأت مندی و عالی حوصلگی، خودداری و خود نمائی، ایثار و قربانی، فیاضی و دریا دلی، ہمدردی و دلسوزی، غریب پروری و مظلوم نوازی اور وطن پرستی و حریت پسندی جیسی اعلےٰ اور قابلِ قدر صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان صلاحیتوں کو سردار صاحب کی قدرتی تعلیم نے اس قدر بیدار کر دیا ہے کہ وہ سردار صاحب کے تمام جوارح فکر و عمل پر چھا گئی ہیں اور سردار صاحب کے اندر انہوں نے خود اعتمادی کا ایسا احساس پیدا کر دیا ہے کہ سردار صاحب مروجہ ضوابط اخلاق کی پابندی و تقلید سے بھی کسی قدر آزاد و بے نیاز ہو گئے ہیں اور اعمال کے تابع نیت ہونے کے اصول پر وہ ایسی سختی سے عامل ہیں کہ ہر اس عمل کو جو نیک نیتی سے کسی اچھے مقصد کے لیے کیا جائے! اچھا اور نیک ہی سمجھتے ہیں خواہ وہ عمل فی نفسہ برا اور غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے نظام معاشرت و تمدن میں خلل ہی کیوں نہ واقع ہوتا ہو اس کے علاوہ اپنی نیت اور اپنے مقصد کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ بھی سردار صاحب خود اپنے ضمیر سے کرتے ہیں اور اس ضمیر سے جو ان کے فطری تقاضوں کا تابع ہوتا ہے چنانچہ جب سردار صاحب اپنی رحم دلی یا دوست نوازی کے تقاضوں سے کسی ضرورت مند یا عزیز دوست کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو وہ امداد کے ناجائز ذرائع کو بھی استعمال کرنے میں اخلاقاً کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ اسی طرح جب سردار صاحب اپنے کسی مخالف یا دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرنے اور اس کو شکست دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو بعض اوقات وہ قانون کی زد سے بچتے ہوئے ایسے غیر اخلاقی اقدامات بھی کر گزرتے ہیں جو جرائم کی تعریف میں بھی آسکتے ہیں۔ سردار صاحب کا انتقامی جوش اس قدر بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمن کو اس کے دنیا سے رخصت اور "مرحوم" ہو جانے کے بعد بھی معاف نہیں کرتے اور مرنے کے بعد بھی اس سے انتقام لیے جاتے ہیں۔ "در عفو لذت است کہ در انتقام نیست" کے عارفانہ اصول کو وہ نہیں مانتے اور دشمن کے معاف کر دینے کو کیریکٹر کی کمزوری سمجھتے ہیں۔ سردار صاحب کے ایسے ہی متضاد رجحانات و اقدامات کی وجہ سے سردار صاحب کے دوست بھی سردار صاحب کو اگر ایک بہت اچھا اور قابلِ قدر دوست سمجھتے ہیں تو ساتھ ہی ایک بہت بڑا اور نہایت خطرناک دشمن بھی کہتے ہیں اور جو لوگ سردار صاحب سے کوئی قریبی تعلق نہیں رکھتے اور نفسیات کے ماہر بھی نہیں ہیں ان کے لیے بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ سردار صاحب کو ملکوتی اوصاف کی حامل شخصیتوں کی صف میں جگہ دی جائے یا ان کے برعکس خصائل رکھنے والی شخصیتوں کی صف میں۔

سردار دیوان سنگھ ایک کہنہ مشق اور کامیاب اخبار نویس ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادیب و انشاپرداز بھی ہیں۔ وہ سیدھے سادے لفظوں اور بے تکلفانہ فقروں میں اپنے جمالی تاثرات اور جلالی جذبات کی ایسی صحیح تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کا دل اس سے وہی اثرات قبول کرتا ہے جو سردار صاحب اس پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ سردار صاحب کے ایڈیٹوریل نوٹس اس قدر پُر زور، پُر جوش اور پُر اثر ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی دوسرا ہم عصر یہاں تک کہ ان کا کوئی ہم قوم و ہم وطن یعنی پنجابی اور سکھ بھی اس خصوصیت میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وقائع نگاری میں بھی سردار صاحب کو بڑی دسترس حاصل ہے۔ وہ واقعہ کے تمام بصیرت افروز

Marfat.com

اور دلچسپ پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر واقعہ کو اس سادگی اور روانی کے ساتھ اپنے خصوصی پُر زور انداز میں اس طرح قلم بند کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ خود اس پر گزر رہا ہے یا اس کے سامنے ہو رہا ہے۔ مجموعۂ مضامین "ناقابلِ فراموش" عبرت و بصیرت کے ماتحت مرقعوں کا ایک دلکش البم ہے جس کے ہر مضمون میں ایسے قیمتی تجربات اور انمول نصائح موجود ہیں جن سے مرد، عورت، جوان اور بوڑھے سب ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں خصوصاً جن لوگوں میں جرأت مندانہ اقدامات کی کچھ اہلیت موجود ہے ان کے لیے "ناقابلِ فراموش" مضامین کا یہ مجموعہ ایک ایسے قابلِ اعتماد اور کامل رہنما کا کام دے سکتا ہے جس سے وہ اپنے اولوالعزمانہ منصوبوں اور ارادوں کی تکمیل اور زندگی کی تشکیل میں ہر قسم کی قیمتی امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ مجموعۂ مضامین "ناقابلِ فراموش" کی دلچسپی و دلکشی کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ اس کا ہر ایک مضمون ایک مستقل حیثیت رکھتا اور ایک ہی واقعہ سے متعلق ہے لیکن پڑھنے والا ایک مضمون کے ختم ہوتے ہی دوسرا مضمون پڑھنا چاہتا ہے اور دوسرے کے بعد تیسرا مضمون۔ اس طرح جب تک کہ تمام مضامین ختم نہیں ہو جاتے کتاب ہاتھ سے رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

سردار دیوان سنگھ کے "ناقابلِ فراموش" مضامین کے اس دلچسپ و پُر نصائح مجموعہ کو بیسویں صدی کے ایک غیر مسلم کی لکھی ہوئی گلستاں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سردار دیوان سنگھ نے ناقابلِ فراموش مضامین میں زیادہ تر اپنے ان کارناموں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ان کے مخالفوں اور دشمنوں سے ہے، لیکن اپنی دوست نوازیوں اور وضعداریوں کا سردار صاحب نے بہت کم ذکر کیا ہے حالانکہ سردار صاحب کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات بھی ناقابلِ فراموش ہیں جو ان کی دوست نوازیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ راقم الحروف کو بھی سردار صاحب کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے اس لیے میں اس مختصر دیباچہ میں چند ایسے واقعات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا جن کا تعلق سردار صاحب کی دوست نوازی اور رواداری سے ہے اور جن کو سردار صاحب کے ناقابلِ فراموش مضامین کا ایک جزو سمجھا جا سکتا ہے۔

پہلا واقعہ: ایک زمانہ میں غفران مآب حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے ساتھ سردار دیوان سنگھ کے بھی نہایت گہرے دوستانہ بلکہ نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ تعلقات تھے جو بدقسمتی سے بعد میں باہمی اختلافات اور پھر باہمی منافرت عداوت میں تبدیل ہو گئے اور ایک عرصہ تک دونوں حضرات کے درمیان نہایت افسوسناک تحریری جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔ جناب ملا واحدی صاحب اور راقم الحروف کو بھی حضرت خواجہ صاحب سے دیرینہ الفت و عقیدت تھی اور حضرت خواجہ صاحب بھی ہم دونوں پر اپنے عزیزوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اور ہم کو اپنا مخلص و بہی خواہ سمجھتے تھے۔ سردار صاحب کو بھی اس کا بخوبی علم تھا کہ ملا واحدی صاحب اور راقم الحروف کے حضرت خواجہ صاحب کے ساتھ کتنے اخلاص مندانہ تعلقات ہیں مگر حضرت خواجہ صاحب کو اپنا شدید مخالف بلکہ دشمن سمجھنے اور باہمی جنگ و جدل جاری ہونے کے باوجود سردار صاحب نے ملا واحدی صاحب اور راقم الحروف سے دوستی کے

Marfat.com

تعلقات منقطع نہیں کیے بلکہ اس کے خلاف سردار صاحب ہم دونوں پر اور زیادہ مہربانیاں کرنے لگے اس وجہ سے نہیں کہ ان کو اپنے دشمن حضرت خواجہ صاحب کے خلاف ہم سے کچھ مدد ملنے کی امید تھی بلکہ غالباً صرف اس وجہ سے کہ وہ ہم دونوں کے اخلاص مندانہ کیریکٹر سے واقف تھے اور ان کو اگر ہم سے کوئی امید مدد ملنے کی نہیں تھی تو اس کا بھی اندیشہ نہ تھا کہ ہم ان کو حضرت خواجہ صاحب کی نیاز مندی کی وجہ سے کچھ نقصان پہنچائیں گے۔

ملا واحدی صاحب اور میں نے خواجہ صاحب اور سردار صاحب کی جنگ کے دوران میں خواجہ صاحب کے دشمن سردار صاحب سے اپنے تعلقاتِ دوستی اس لیے برقرار رکھے کہ سردار صاحب کی مخلصانہ عنایتوں اور مہربانیوں کی وجہ سے ان تعلقات کے منقطع کر دینے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ ہمیں اندیشہ تھا کہ سردار صاحب سے ہمارے تعلقات منقطع ہو جانے سے ممکن ہے کہ باہمی جنگ اور زیادہ طول پکڑے اور مقدمہ بازی وغیرہ تک نوبت پہنچ جائے جس کو رکوانے کی ہم ہمیشہ امکانی کوشش کرتے رہے سردار دیوان سنگھ کی انتہائی رواداری اور دوست نوازی کا یہ واقعہ بھی یقیناً ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ کیونکہ سردار صاحب جیسے مضبوط کیریکٹر کے شخص سے یہ امید کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے ایک دشمن کے مخلص دوستوں سے تعلقاتِ دوستی قائم رکھ سکے گا۔

دوسرا واقعہ: سردار دیوان سنگھ کی طرح میں بھی ہندوستان کی تقسیم کا مخالف تھا اور پاکستان کے ایک اسلامی مملکت ہونے کے تخیل کو شیخ چلی کے منصوبے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا لیکن جب ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب کسی باہمی سمجھوتہ سے تقسیم ہند کے فیصلے کا تبدیل ہونا ناممکن ہے اور اب اگر اس فیصلے میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے تو صرف بھارت اور پاکستان کی باہمی جنگ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور جنگ کی صورت میں ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات میں اور زیادہ کشیدگی بلکہ سخت عداوت اور دشمنی کا پیدا ہو جانا یقینی ہے اس لیے میں سردار صاحب اور اپنے دوسرے نیشنلسٹ مسلم اور غیر مسلم دوستوں کو پاکستان کی مخالفت سے روکا کرتا تھا جب میری تمام فیملی کے پاکستان چلے آنے کی وجہ سے (جس کو مجبوراً جنوری ۱۹۴۸ء ہی میں بھارت چھوڑنا پڑا تھا) اپریل ۱۹۵۱ء میں مجھ کو خود مستقل طور پر پاکستان ہجرت کرنے کی ضرورت پڑی اور پاکستان کو میں نے بادلِ نخواستہ اپنا وطن بنا لیا تو یہاں کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد مجھے بھارتی اخبارات کا پاکستان کی مخالفت کرنا زیادہ ناگوار گزرنے لگا اور سردار دیوان سنگھ کے ایک ایڈیٹوریل نوٹ سے جو انہوں نے پاکستان اور باسیانِ پاکستان کے خلاف اپنے مخصوص انداز میں نہایت سخت لکھا تھا۔ مجھ کو بہت تکلیف پہنچی اور میں نے ایک خط سردار صاحب کے نام لکھ کر اس میں ان کے مذکورہ مضمون کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور سردار صاحب سے درخواست کی کہ وہ پاکستان کے خلاف لکھنا چھوڑ دیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے اس خط کو پڑھ کر سردار صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن میرے اندیشے کے برخلاف سردار صاحب نے میرا وہ خط ریاست کے ایک لیڈر میں نقل کر کے اس پر تبصرہ کرتے ہوتے لکھا کہ اس قسم کے خطوط پاکستانیوں کی طرف سے ان کے پاس اکثر آتے رہتے ہیں۔ مگر وہ ان کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے لیکن یہ خط چونکہ سردار

Marfat.com

صاحب کے ایک ایسے دوست نے لکھا تھا جس کی اخلاص مندی کا سردار صاحب کو پورا یقین ہے اس لیے وہ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان سنگھ تقسیم ہند کا مخالف ہے اور جب تک یہ تقسیم ختم نہ ہوگی وہ برابر مخالفت کرتا رہے گا۔ سردار صاحب کا میرے ساتھ یہ مخلصانہ طرزِ عمل بھی سردار صاحب کی دوست نوازی اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے کہ ان کی قوم اور وطن پرستی نے بھی میری پاکستانی حمایت کو گوارا کر لیا اور ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔

تیسرا واقعہ: ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ہندو مسلم خون ریز فسادات کا زور تھا۔ میرا مرحوم لڑکا عرفان الحق شبلی احو میری مرضی اور اجازت کے خلاف فرقہ وارانہ سیاسی سرگرمیوں میں پرجوش اور نمایاں حصہ لے رہا تھا، اور میرے داماد مسٹر قمر الاسلام کے والد ضیاء الاسلام صاحب ہندوؤں پر فائرنگ کے الزام میں گرفتار ہو کر دہلی جیل کی حوالات میں بند کر دیے گئے تھے۔ ان کی رہائی اور جیل میں ان کو خورونوش کی آسانیاں بہم پہنچانے کی غرض سے مجھ کو سردار صاحب سے امداد لینے کی ضرورت تھی۔ سردار صاحب اس زمانے میں محلہ چرخے والاں میں رہا کرتے تھے جس میں مسلمانوں کے صرف چند مکانات تھے اور وہ مسلمان بھی فسادات کے ڈر سے اپنا گھر بار چھوڑ کر محلے سے بھاگ گئے تھے۔ محلہ چھوڑ جانے والے کچھ مسلمانوں نے اپنے مکانات اور مال و اسباب اور ایک مسجد کی حفاظت سردار صاحب کے سپرد کر دی تھی۔ مسجد اور مکانات کی حفاظتی کوششوں کی وجہ سے محلّہ کے تقریباً تمام ہندو سردار صاحب کے مخالف ہی نہیں بلکہ دشمن ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد سردار صاحب کو خود بھی یہ ہندو محلہ چھوڑ کر ایک دوسرے محلے میں اپنی رہائش اور کاروبار کو منتقل کرنا پڑا۔ میرا قیام اس زمانے میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمد عمر صاحب مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر محمد اصغر عرف اچّی میاں کے مکان واقع مٹیا محل میں تھا کیونکہ میرے سکونتی مکان واقع محلہ کاشغری پر ہندو شرنارتھیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور میرا کافی گھریلو سامان اور کتب خانہ لُوٹ لیا گیا تھا۔ سردار صاحب اپنی دوراندیشانہ احتیاط پسندی کی وجہ سے مجھ سے ملنے کے لیے مسلمانی محلے مٹیا محل میں آنا پسند نہیں کرتے تھے اور مجھ جیسے کمزور دل شخص کے لیے چرخے والاں جانا ناممکن تھا۔ اس لیے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ ہم دونوں کسی ایسی جگہ جمع ہو جایا کریں جہاں نہ ہندوؤں کا غلبہ ہو نہ مسلمانوں کا۔ چنانچہ دریا گنج میں کوچہ چیلان کے نکڑ پر ایک نانبائی کی دکان کو اس غرض کے لیے منتخب کیا گیا۔ سردار صاحب اور ان کے مسلمان دوست اس دکان پہ جمع ہوتے اور اپنی ضرورتوں کے متعلق مشورے کیا کرتے تھے۔ میں اپنے سمدھی ضیاء الاسلام صاحب کو جیل میں بی کلاس کی مراعات دلوانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے سردار صاحب مجھ کو اور اپنے دو دوستوں کو ساتھ لے کر ایک تانگہ پر مسٹر رندھاوا ڈپٹی کمشنر دہلی سے ملنے کے لیے ٹاؤن ہال روانہ ہوئے۔ تانگہ ٹھنڈی سڑک اور چاندنی چوک ہوتا ہوا ٹاؤن ہال پہنچا۔ سردار صاحب مسٹر رندھاوا سے ملے۔ اور ضیاء الاسلام صاحب کو بی کلاس دیئے جانے کا حکم لکھوایا۔ یہ حکم لے کر ہم سب گھر واپس آنے کے لیے اسی تانگے پر سوار ہوئے۔ تانگے والا بھی غالباً ہندو تھا۔ اس تانگے پر دو ہندو، دو سکھ اور صرف ایک میں مسلمان تھا واپسی کے لیے قریب کا راستہ نئی سڑک کا تھا جو اس وقت تمام تر ہندوؤں کے قبضہ میں تھی۔ میں نے اپنے

Marfat.com

ساتھیوں سے کہا کہ مجھ کو ساتھ لے کر نئی سڑک پر سے گزرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی راستے سے واپس جایا جائے مگر میرے ساتھی نہ مانے اور تانگہ نئی سڑک کو عبور کر کے جب شاہ بولا کے بڑ کے قریب پہنچا تو چاوڑی بازار کی طرف سے دو مسلمان تانگے والے اپنے تانگے سرپٹ دوڑاتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے اور انہوں نے مجھ کو تانگے پر دیکھ کر چلّا کر کہا۔ اُدھر مت جاؤ۔ واپس آ جاؤ مگر سردار صاحب اور ان کے ساتھی لوٹنے پر رضامند نہ ہوئے۔ جب تانگہ شاہ بولا کے بڑ پر پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی بیل گاڑی کے قریب چند مسلمانوں کی لاشیں جامع مسجد جانے والی سڑک پر پڑی ہیں اور سڑک کو والنٹیریوں اور پولیس والوں نے آمد و رفت کے لیے بند کر رکھا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لاشیں ان بدنصیب مسلمانوں کی تھیں جو ایک بیل گاڑی پر پرانے قلعے پناہ لینے جا رہے تھے کہ یہاں پہنچ کر کسی ہندو نے کوٹھے کے اوپر سے بم پھینک دیا اور بیچارے سب شہید ہو گئے۔

جامع مسجد کا راستہ مسدود پا کر ہم سب نہایت پریشان ہوئے کہ اب مٹیا محل کیونکر پہنچا جائے لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نہ نکل سکا اور میرے سب ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ بھیا! اب تو سردار صاحب ہی کے مکان پر چلنا پڑے گا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ سہمے ہوئے دل سے اس فیصلے کو قبول کر لیا اور ہمارا تانگہ محلہ چرخے والاں جانے کے لیے بلّی ماروں کی گلی کی طرف مڑا۔ راستے میں کچھ ہندو ملے جو سردار صاحب سے زیادہ واقف نہ تھے وہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک اور مسلمان شکاریوں کے جال میں پھنسا۔ پھر کچھ ہندو سردار صاحب کے ہم محلہ ملے جو سردار صاحب کو بہت بُرے الفاظ سے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ دیکھو یہ خبیث سردار ایک مسلمان کو جان بچانے کے لیے اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے۔ میں یہ آوازیں سن رہا تھا اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کہ ہمارا تانگہ چرخے والاں کی گلی کے قریب پہنچ گیا جہاں سے سردار صاحب کا گھر صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ تانگے کے کھڑے ہوتے ہی اس کا ہندوؤں نے محاصرہ کر لیا اور انہوں نے مجھ کو تانگے پر سے نیچے گھسیٹنے کا ارادہ کیا۔ سردار صاحب نے اول نرم و متین لہجے میں محاصرہ کرنے والے ہندوؤں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بُرے ارادے سے باز آ جائیں اور مجھ کو جو ایک سچا نیشنلسٹ مسلمان ہے کوئی تکلیف نہ دیں لیکن جب سردار صاحب کی اس فہمائش کا کوئی اثر نہ ہوا تو سردار صاحب کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے اپنے پنجابی نوکیلے لہجے میں محاصرہ کرنے والے ہندوؤں کو گالیاں دینی شروع کیں اور کہا کہ اگر کسی نے بھی میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ اس کا سر توڑ ڈالیں گے۔ سردار صاحب کے اس غصہ اور جوش کو دیکھ کر بھیڑ چھٹنی شروع ہوئی اور محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کی حفاظت میں سردار صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں سردار صاحب کا ایک سابق سکھ ملازم جو مجھ کو بھی جانتا تھا اور فوج میں ملازم تھا گلے میں کارتوسوں کی پیٹی ڈالے اور رائفل لیے کھڑا تھا سردار صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ محض سردار صاحب سے ملنے آیا ہے۔ سردار صاحب نے کہا۔ بہت اچھا۔ لو اب تم بھیا کو اپنی حفاظت میں محلہ مٹیا محل پہنچا آؤ۔ میں نے کہا کہ میں کسی مسلح شخص کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرے تانگے کے سب ساتھیوں کو چلنا پڑے گا۔ میرے اس کہنے پر سردار صاحب اور دوسرے ساتھی اس مسلح شخص کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور چوڑی والاں کے محلے میں سے ہوتے ہوئے

87150

Marfat.com

محلہ مٹیا محل کی طرف چلے ہم مطبع مجتبائی کے قریب پہنچے تھے کہ سامنے مسلمانوں کا ایک مجمع نظر آیا۔ یہ مسلمان محلہ جفت فروشان کے تھے جو مطبع مجتبائی سے متصل تھا۔ میرے ساتھیوں نے مسلمانوں کے اس مجمع کو دیکھ کر کہا کہ بھیا! اب آپ چلے جائیں ہمارے آپ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بھی ان کو واپس جانے کی اجازت دے دی اور میں تنہا مسلمانوں کے محلے میں پہنچ گیا وہاں کے سب مسلمان میرے جاننے والے تھے انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر بہ حفاظت مٹیا محل پہنچا دیا۔ اگر تانگے کے محاصرہ کے وقت سردار دیوان سنگھ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میری حفاظت نہ کرتے تو غالباً مجھے زندہ نہ چھوڑا جاتا۔ اپنے دوستوں کے لیے جان کو خطرے میں ڈال دینے کا یہ واقعہ بھی سردار صاحب کی زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے جس کا میں نے اپنے احسان مندی کے تقاضے سے یہاں ذکر کر دینا ضروری سمجھا۔

سردار دیوان سنگھ کو میں نے عنوان مضمون ہذا میں ناقابلِ فراموش لکھا ہے حالانکہ سردار صاحب خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں اور عنقریب مرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے کیونکہ وہ اپنے خارجی دشمنوں کی طرح اپنے اندرونی دشمنوں یعنی بڑھاپے کا بھی شباب آور دواؤں کے حربوں سے برابر مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ سردار صاحب دنیا میں نہ ہوتے اور مجھے ان کا مجموعۂ مضامین ناقابلِ فراموش پر کچھ لکھنے کے لیے کہا جاتا تو میں ہرگز اس آزادی اور صاف گوئی سے نہ لکھ سکتا جتنی آزادی اور صاف گوئی سے اس وقت سردار صاحب کی زندگی میں لکھ رہا ہوں۔ میری اس جسارت اور صاف گوئی کے کریڈٹ کے مستحق بھی سردار صاحب ہی ہیں کیونکہ ان ہی جیسے رواداراور دوست نواز شخص ہی کے کسی مخلص دوست کو اس جسارت کی ہمت ہو سکتی ہے۔

زندہ باد ناقابلِ فراموش سردار دیوان سنگھ

Marfat.com

سبق آموز اور عبرت انگیز

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحبؒ بانی انجمن ترقی اُردو)

دنیا میں پند و نصیحت کی ہزارہا کتابیں ہیں ایک سے ایک اچھی اور ہر زبان میں ہیں۔ الہامی اور آسمانی صحیفے بھی ہیں۔ اخلاق و کردار پر تقریریں اور وعظ بھی ہوتے ہیں۔ ماں باپ اپنی اولاد کو وقت بے وقت نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو سمجھاتے اور ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ تدبیریں کچھ زیادہ کارگر اور مؤثر ثابت نہیں ہوتیں۔ ایک میں حکم و فرمان ہے اور دوسری پھیکی اور بے مزہ جس میں کوئی دل کشی نہیں تعلیم کے لیے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ ذہنی قابلیت اور امتحانات پاس کرنے کے لیے اچھی درس گاہیں ہیں لیکن اخلاق اور کردار کی بلندی جغرافیہ اور ریاضی کی طرح پڑھنے اور رٹنے سے میسر ہوتی ہے نہ پروفیسروں کے لیکچروں سے، یہ نایاب شے، صالح صحبت اور شائستہ ماحول ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ بلاشبہ یہی ایک کارگر اور مؤثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے نمونے نصیب نہیں ہوسکتے۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ دولت اور اقتدار کی ہوس مقصدِ حیات بن گئی ہے ایسی صورت میں اس کا صرف ایک ہی بدل ہے وہ یہ کہ اُن اولوالعزم اور برگزیدہ ہستیوں کی آپ بیتی یا حالاتِ زندگی مطالعہ کے لیے پیش کیے جائیں جنہوں نے اپنی خودی کو مٹا کر جان اور مال اور اپنا سب کچھ اپنی قوم یا وطن یا خلقِ خدا کی خدمت کے لیے نثار کردیا جن کی بے نفسی، فرض شناسی، بے لوث خدمت اور عزمِ راسخ نے افراد یا قوموں کی قسمتیں بدل دیں یا جن کی حق پرستی، باطل شکنی اور راست گوئی کے کارناموں نے مُردہ دلوں میں نئی روح پھونک دی۔ ان حالات کو پڑھ کر دلوں میں اُمنگ، ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی بننے اور ویسے ہی کام کرنے کا شوق دلوں کو گدگداتا ہے۔

یہ کتاب "ناقابلِ فراموش" بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ اس میں ایک ایسے شخص کے تجربوں اور مشاہدوں اور تاثرات کا بیان ہے جو عمر بھر حق کی حمایت میں باطل سے دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور اس کی بدولت اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور عقوبتیں سہیں۔ اس پر چوری، جعل سازی، سازش، کوکین بیچنے، نوٹ بنانے کے عجیب الزامات لگائے گئے، جھوٹے مقدمات چلائے گئے اور اس کی پاداش میں اسے بارہا جیل خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے ایسے ایسے والیانِ ریاست کا مقابلہ کیا جن کی قوت اور دولت بے حساب تھی اور جنہوں نے بڑوں بڑوں کو نیچا دکھایا تھا۔

دیوان سنگھ کا گھر مظلوموں اور ظلم رسیدوں کی پناہ گاہ تھا۔ وہ اپنی فریادیں لے کر ان کے پاس پہنچتے یا لکھ کر بھیجتے۔ ان میں امیر، غریب، رئیس سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ جب تحقیق ہو جاتی کہ

Marfat.com

شکایت صحیح ہے تو وہ ان کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوجاتے۔ ان میں اکثر ظالم، جابر بے دردالیان ریاست کے ستائے ہوئے ہوتے تھے جن کے مقابل آتے ہوئے بڑے بڑے بہادر سورماؤں کے پتے پانی ہوتے تھے۔ سردار صاحب نے ایک جگہ مسٹر ہارنی مین کا یہ قول نقل کیا ہے: کہ "اخبار نویس دنیا میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے پیدا ہوا ہے جو مصائب میں ہوں۔ اُن لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو عیش و آرام میں ہوں۔" دیوان سنگھ مفتوں نے ہارنی مین کے اس قول پر ہمیشہ عمل کیا اور جان جوکھوں میں ڈال کر مظلوموں کی حمایت کی۔ اگرچہ اس کی بدولت انہیں بہت سے بُرے دن دیکھنے پڑے۔ پندرہ بار گرفتار ہوئے اور آٹھ جیلوں کی سیر کی لیکن ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں اور جتنے مقدمات قائم ہوئے اسی قدر ان کی عزت اور رفعت بڑھتی گئی۔ وہ چاہتے تو بغیر زیادہ دوا دوش کے گھر بیٹھے بے شمار دولت حاصل کر لیتے لیکن بڑی سے بڑی رشوت اور بڑے سے بڑا لالچ بھی انہیں اپنے اصول میں ڈانوا ڈول نہ کر سکا۔

یہ آپ بیتی بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اس میں جہاں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار، مظالم اور سازشوں، رشوت کی گرم بازاری، پولیس اور حکومت کی چیرہ دستیوں جیلوں کی زندگی، اخلاق کی انتہائی پستی، خود غرضی، ہوا و ہوس، غداری اور نمک حرامی کے حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے وہاں غریبوں کی مہمان نوازی، مخلص دوستوں کی وفاداری اور وضع داری، احسان شناسی اور بے لوث خدمت کا بھی کوئی نہ کوئی واقعہ نظر آئے گا۔ غرض یہ کتاب انسانی فطرت کے مطالعہ کے لیے ایک عجیب مرقع ہے۔

سردار دیوان سنگھ کی زندگی سے ہمیں ایک اور سبق بھی ملتا ہے۔ ان کی تعلیمی حالت کچھ بھی نہ تھی صرف پانچویں جماعت پڑھنے پائے تھے کہ حالات سے مجبور ہو کر تعلیم ترک کرنی پڑی اور محض اپنے سرگرم شوق اور شب و روز کے مطالعہ سے ایسی لیاقت حاصل کی کہ وہ صحافت (جرنلزم) کی صفِ اوّل میں آ گئے اور ان کا اخبار آزادی رائے، بے لاگ تنقید اور زورِ بیان کے اعتبار سے بہترین اخبار سمجھا جانے لگا۔ کامیابی کا راز محنت، کام کی لگن اور استقلال میں ہے جو اقوام اور افراد کام سے بھاگتے اور محنت سے جی چُراتے ہیں وہ ہمیشہ ناکام اور غلام رہیں گے۔ کامیابی اور آزادی ان کی قسمت میں نہیں ؛

Marfat.com

ناقابلِ فراموش میں جرأت اور صاف گوئی

(جناب حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر "شمع" دہلی)

سردار دیوان سنگھ مفتوں مدیر "ریاست" کی تحریریں میں گزشتہ بیس بائیس سال سے پڑھتا ہوں سات آٹھ سال سے میرا ان سے میل جول بھی ہے۔ یہ چیز کچھ انسانی فطرت سی بن گئی ہے کہ ہم اپنی اچھی باتیں تو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور خامیوں کو دوسروں سے چھپاتے ہیں۔ مفتوں صاحب کو قدرت نے یہ خوبی عطا کی ہے کہ وہ اپنی خامیاں اور خوبیاں دونوں بیان کرنے کے عادی ہیں۔ شاید قدرت کا یہی وہ بڑا عطیہ ہے جس نے انہیں ایک نڈر اور بے باک صحافی بنا دیا ہے کہ اردو جرنلزم میں صاف گوئی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی تحریروں سے جہاں ایک بڑا آدمی خائف نظر آتا ہے وہاں ایک چھوٹا آدمی متاثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ انہیں جگ ہنسائی کی باتیں بھی آتی ہیں اور آپ بیتی بھی خوب بیان کرتے ہیں۔

"ناقابلِ فراموش" ان کے ایسے ہی واقعات کا ایک مرقع ہے جس میں انہوں نے بیتے واقعات کی یاد ایک نہایت دلچسپ پیرائے میں قلم بند کی ہے جو ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات سے پردہ بھی اٹھاتی ہے۔ اس انکشاف میں بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں، امیروں، نوابوں اور راجوں مہاراجوں سے بھی تعارف ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے مفتوں صاحب کو ان کی بے باکانہ تحریروں کے سبب اکثر حلقوں میں ان کو خوفناک سمجھا جاتا تھا۔ ایک صاف گو اور بے باک انسان کے لیے یہ اعزاز اس ملک میں ارزاں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مفتوں صاحب کو یہ "اعزاز" پسند تھا یا ناپسند۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوستوں اور مخالفوں کے اس دیئے گئے اعزاز پر کبھی ناخوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ "اعزاز" انہیں صاف گوئی کے صلہ میں چند بڑے آدمیوں کے حواریوں کے دربار سے ملا تھا۔ اس پاداش میں کہ انہوں نے بعض پُراسرار محلوں اور خلوتوں کے سربستہ راز افشا کیے تھے۔ اسی صاف گوئی اور بیباکی کے لیے انہیں اکثر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں اچھے اچھے لوگ ڈول جاتے ہیں لیکن انہوں نے جیل کی چار دیواری میں بھی نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنے خصوصی کردار کو برقرار رکھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تحریریں کیا جوان کیا بوڑھے سبھی کے لیے یکساں مفید ہیں کیونکہ ان کے مطالعہ سے انسان میں جرأت، صاف گوئی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ اس ناقابلِ فراموش کارنامے کو اردو کے علاوہ دیگر مروّجہ زبانوں میں بھی منتقل کریں تاکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کا آدمی ان سے مستفید ہو سکے اور اپنے کردار کو ان تحریروں میں پیش کئے گئے سانچے میں ڈھال سکے۔

Marfat.com

بہترین دوست اور بدترین دشمن

(جناب مُلا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" کراچی)

اس کتاب "ناقابلِ فراموش" کو میں نے پڑھا۔ سردار دیوان سنگھ صاحب مفتوں کی زندگی "اتار چڑھاؤ اور جوار بھاٹوں" سے پُر ہے۔ سردار صاحب نے بڑی طوفانی زندگی بسر کی ہے۔ وہ جہاں کو دیکھتے نہیں پھر لیکن جہان ان کے پاس برابر آتا رہا۔ انہیں ہر قسم کے انسانوں اور ہر قسم کے حالات و واقعات سے سابقہ پڑا ہے۔ چالیس دن کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حوصلہ مند ماں نے بارہ سال کی عمر تک پڑھایا لکھایا۔ بارہ سال کی عمر میں پڑھنا لکھنا چھوڑ کر پانچ روپیہ ماہوار کی نوکری کر لی۔

ابتدا پانچ روپیہ ماہوار کی نوکری سے ہوئی اور انتہا یہ کہ اخبار "ریاست" کے صرف اشتہاروں کی آمدنی ہزار ہا روپے ماہوار تھی۔

سردار صاحب کی عادت ہے کہ جاڑا گزر جانے کے بعد، گرمی میں کام نہ آنے والے جاڑے کے کپڑے اور گرمی گزر جانے کے بعد جاڑے میں کام نہ آنے والے کپڑے خیرات کر دیتے ہیں۔ دوسرے جاڑے اور دوسری گرمی کے واسطے کپڑا رو کتے نہیں۔ لیکن یہ تماشا بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ سردار صاحب جیل سے لوٹے ہیں اور ایک سے دوسرا جوڑا بدلنے کو نہیں ہے اسے ہی دھوتے اور پہن لیتے ہیں۔

بر یک گردش چرخ پھر نئے سرے سے لہر بہر ہو جاتی ہے۔ سردار صاحب کی زندگی میں لہر بہر کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں ہے اور ایسا وقت بھی آتا ہے کہ سردار صاحب کہتے ہیں کہ دلی کی حکومت نے مجھے مہاراجہ پٹیالہ کے حوالے کر دیا تو ہیرے کی کنی کھاؤں گا اور مر جاؤں گا۔ مہاراجہ کے رحم و کرم پر نہیں جیوں گا۔ مہاراجہ پٹیالہ سردار صاحب پر پٹیالہ بلا کر مقدمہ چلانا چاہتے تھے مگر دلی کے چیف کمشنر کسر جان تھامپسن نے جو حکومت ہند کے پولیٹیکل سیکرٹری رہ چکے تھے اور راجہ نوابوں کی بدعنوانیوں سے واقف تھے مہاراجہ پٹیالہ کی خواہش کو ٹھکرا دیا۔

لہر بہر کا دور ہو یا خودکشی کے لیے آمادہ ہو جانے کا دور۔ پانچ روپے ماہوار کی ملازمت کر رہے ہوں یا ہزار ہا روپے ماہوار کما رہے ہیں۔ سردار صاحب کی عقل حالات و واقعات سے نتائج ضرور اخذ کرتی ہے۔

پانچ روپے ماہوار کی ملازمت سردار صاحب نے اپنے وطن حافظ آباد کے کسی ہندو بزاز کے ہاں کی تھی۔ بزاز کی دوکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی بھی بیٹھتا تھا۔ اس کے جوان بیٹے نے کہیں سبز رنگ کی مخمل کا کوٹ سفید تاگے سے سی دیا۔ درزی نے بیٹے سے کہا۔ کوٹ سلوانے والے گنوار کا خیال نہیں کیا تھا تو مخمل کا خیال تو کرنا چاہیئے تھا۔ تو نے مخمل کا ناس کر دیا۔ درزی نے سارا کوٹ ادھیڑا۔ اور دوبارہ خود سبز تاگے سے سیا۔

سردار صاحب لکھتے ہیں: اس واقعہ کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں ہر کام پوری توجہ سے کرنے لگا۔

Marfat.com

جو شخص بارہ سال کی عمر میں اتنا اثر لے سکتا ہے اس نے آئندہ حالات و واقعات سے کتنا اثر لیا ہوگا اور حالات و واقعات سے کیا کیا نتائج اخذ کئے ہوں گے۔ اس کتاب میں سردار صاحب نے اپنے ان ہی تاثرات اور تجربات کو جمع کر دیا ہے۔

سردار صاحب کی تحریر میں اللہ تعالیٰ نے خاص نوعیت کی قوت بخشی ہے۔ تحریر بناوٹ اور تصنع سے پاک ہوتی ہے۔ سردار صاحب خیالات کو تکلف اور پیچ پیچ کے ساتھ نہیں پیش کرتے، بالکل بے ساختہ لکھتے ہیں۔ غالباً یہی ان کی تحریر کی قوت کا راز ہے۔ اس بات نے تحریر میں وہ زور بھر دیا ہے اور تحریر کو وہ پختگی دے دی ہے جس کی بنا پر باوجود زبان کے نقائص کے انہیں صاحب طرز لکھنے والا کہا جا سکتا ہے۔

اخبار "ریاست" کے ایڈیٹوریل سٹاف میں بہت سے ممتاز اہل قلم اور زبان دان شامل رہ چکے ہیں لیکن اہل قلم اور زبان دان حضرات اور مضامین لکھا کرتے تھے یا اوروں کے مضامین کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ اخبار "ریاست" کا ایڈیٹوریل ہمیشہ سردار صاحب نے لکھا۔ کبھی اتفاق سے بیمار ہو گئے اور ایڈیٹوریل اہل قلم اور زبان داں حضرات کو لکھنا پڑ گیا تو اخبار "ریاست" پھیکا اور پھس پھسا سمجھا جاتا تھا اور پڑھنے والوں کو مزا نہ آتا تھا۔ سردار صاحب کے غلاف محاورہ فقروں کا ہلا دینا ایڈیٹوریل کی جان سلب کر لیتا تھا۔

تحریر کا یہی طرز اور تحریر کا یہی ٹھاٹھ سردار صاحب کی کتاب "ناقابل فراموش" میں ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مندرجات واقعی ناقابل فراموش ہیں اور یاد رکھنے کے لائق ہیں اور ان پر رائے زنی غور کرنے کے لائق ہے۔ اخبار "ریاست" کے ایڈیٹوریل جیسی جرأت مندانہ رائے زنی۔

ضروری نہیں کہ آپ سردار صاحب کی ہر رائے اور سردار صاحب کے ہر تاثر سے اتفاق ہی کر لیں میں بھی ہر ہر رائے اور ہر ہر تاثر سے متفق نہیں ہوں لیکن ان کے اظہار کی قوت سے انکار بہر حال محال ہے۔ سردار صاحب کی تحریر کی اور بھی خصوصیات ہیں۔ مثلاً اس میں جتنا زور پہلے دن تھا اتنا ہی زور آج موجود ہے اور سردار صاحب کی تحریر بوڑھی نہیں ہوئی۔ تحریر میں جوانی کی سی جان ہے۔

جیسے عبرت ناک اور سبق آموز واقعات سے سردار صاحب کو سابقہ پڑا ویسے واقعات سے کم لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ پھر سردار صاحب نے واقعات کے بیان میں افسانوں کی سی دل کشی پیدا کر دی ہے۔

کئی جگہ خواجہ حسن نظامی صاحبؒ کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے لیے دل کش نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق میں بس اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ سردار صاحب بہت اچھے دوست ہیں اور بہت بڑے دشمن۔ جب خواجہ صاحب کے دوست تھے تو خواجہ صاحب کا فدا کار سردار صاحب کے برابر کم از کم میں نے نہیں دیکھا تھا۔

سردار صاحب بہترین دوست اور بدترین دشمن نہ ہوتے تو ناقابل فراموش کتاب ہمیں پڑھنے کو نہ ملتی جن حالات سے سردار صاحب گزرے ہیں معمولی انسان ان حالات سے نہیں گزرا کرتا۔

Marfat.com

پنجاب کا تیسرا معجزہ

(پروفیسر غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی ایم اے)

دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست" کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب سے وہ مجھے نہیں جانتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے تئیس سال یعنی اپنے بچپن سے ۱۹۴۷ء تک میرے جملہ حقوق صرف شہر لکھنؤ کے میونسپل حدود کے نام محفوظ رہے اس لیے ہندوستان کی بڑی سے بڑی مشہور تاریخی عمارتوں سے لے کر ایڈیٹر "ریاست" جیسی تاریخی شخصیت تک سے میرا تعارف دلّی آنے سے قبل تک صرف غائبانہ رہا۔ غائبانہ یوں کہ میں ان کا اخبار اس وقت سے جب کہ وہ پہلے پہل آرٹ پیپر پر چھپنا شروع ہوا تھا۔ الف سے لے کر ی ے تک پابندی سے پڑھتا رہا تھا اس اخبار کی ترتیب اور انداز بیان اور مضامین کی ندرت کے پیش نظر میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ایڈیٹوریل نوٹوں سے قلمزار تک کون سی چیز زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔ ان کے قلم کی بے باکی، ان کی معلومات کی پختگی، ان کی تحریر کا زور، اُن کا غیر متعصبانہ انداز بیان اور ان کے قلم کی شوخیاں پڑھ کر میں یہ سوچا کرتا تھا۔ کہ نہ جانے یہ شخص کس وضع قطع، طول و عرض، ذہانتوں اور بذلہ سنجیوں کا مجسمہ ہو گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ سکھ ہیں کبھی میرے دماغ میں ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ خیال نہ جگہ پا سکا کہ ان کے سر پر بال اور چہرے پر ڈاڑھی بھی ہو گی۔ اگر کبھی ڈاڑھی کا تصور آتا بھی تھا تو اس وقت جب ان کی تحریر میں کوئی شرعی غیر شرعی موقع پر۔ رواداری میں کسی اسلامی مذہبی مسئلے کے سلسلے میں نکل جاتی تھی اور اس سے میرا دماغ دوسرا نتیجہ یہ نکالتا تھا۔ کہ یہ شخص یا تو مسلمان زدہ سکھ ہے، نہیں تو سکھ زدہ مسلمان ضرور ہے۔ بہرحال جہاں جہاں اور جب بھی "ریاست" میں کسی اسلامی مسئلے پر روشنی ڈالی جاتی یا مذہبی حوالے دیئے جاتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایڈیٹر "ریاست" نے میدانِ صحافت میں قدم رکھنے سے قبل ضرور کسی خالص اور عربی النسل مولوی کے پاؤں دابے ہوں گے یا پنجوقتہ اس کی بدھنیوں کو غسل دے کر یہ شرعی نکتے جمع کیے ہوں گے

بہرحال ایک عرصے بعد جب انہوں نے اپنے اخبار میں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں ان کی آپ بیتی ہوتی تھی تو اسے پڑھ کر مجھے ان کے مذہب کے بارے میں اندازہ ہوا کہ وہ صرف انسانیت کو اپنا دین و مذہب مانتے ہیں اور کرم اور اعمال کے قائل ہیں چنانچہ اپنے مذہبی عقائد کے سلسلے میں وہ زیرِ نظر مجموعہ کے صفحہ ۱۱۲ میں لکھتے ہیں: "ایڈیٹر ریاست" نہ تو خدا پر یقین رکھتا ہے اور نہ خدا سے منکر ہے اور نہ کبھی اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ یا اس دنیا کو چلانے والا خدا ہی ہے یا کوئی اور قدرت مگر وہ تین باتوں کا قائل ضرور ہے ضرور ہے جوتش یعنی ستارو

Marfat.com

کی گردش کا اثر انسانوں پر۔ دوسرے پچھلا یا آئندہ جنم یعنی مسئلہ تناسخ (گویا اعمال) اور دعا یا بد دعا کا اثر۔ یہ واقعہ ہے کہ جو شخص دعاؤں یا بد دعاؤں کا قائل ہوگا۔ وہ نیکی اور بدی کا بھی سختی سے قائل ہوگا۔ نیک اعمال پر بھی وہ پورا پورا بھروسہ رکھتا ہوگا۔ اس کی زندگی تصنع اور بناوٹ، مکر و فریب سے بالا ہوگی اور اس کا ظاہر اور باطن ایک ہوگا۔ وہ اپنی اچھائیوں اور برائیوں کو ظاہر کرنے میں ذرا بھی شرم و حیا محسوس نہ کرتا ہوگا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی جیسی بلند پایہ شخصیت کی طرح ایڈیٹر "ریاست" کی تحریروں کی بھی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا ذکر بھی اسی طرح نہایت تفصیل سے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں چنانچہ اس تصنیف کے صفحہ ۵۱ پر انہوں نے باوجود اتنے بلند پایہ صحافت ہونے کے اس واقعہ کا ذکر کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی کہ ایڈیٹر "ریاست" پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزاز کی دکان پر ملازم ہوا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑوں کے تھان لا کر گاہکوں کو دکھائے جائیں اور اس سلسلے میں ایک دوسری جگہ جبکہ وہ اپنے ذوق صحافت کی تشنگی کو دور کرنے کے سلسلے میں لکھنؤ آکر سید جالب مرحوم دہلوی ایڈیٹر "ہمدم" کے پاس گئے اور ان سے کہا، اگر آپ میرے لیے تیس روپیہ ماہوار بھی مقرر کر دیں تو میں اطمینان کے ساتھ آپ کی خدمت میں رہ کر کام کرنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا بطور چپراسی ہی مجھے رکھ لیجئے۔ میں چپراسی کے طور پر تمام دن کام کروں گا اور ساتھ ساتھ آپ سے جو لازم سیکھوں گا۔ سید جالب میری اس درخواست پر حیران تھے مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس! چپراسی کی بھی کوئی جگہ خالی نہیں۔ یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا کیا آپ کو میرے مفت کام کرنے پر اعتراض ہے۔ سید جالب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اگلے روز سے دفتر "ہمدم" میں بغیر تنخواہ کے کام کرنا شروع کر دیا۔ دن بھر "ہمدم" کے دفتر میں بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتا ہے۔ رات کو بارہ بجے تک ایک کیمسٹ کے ہاں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہے اور اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آنے روز سے زیادہ نہیں۔" .....

مذکورہ بالا واقعہ سے ایڈیٹر "ریاست" کے کردار کی بلندی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اگر آپ اسے مذاق پر محمول نہ فرمائیں تو میں کہوں گا کہ فرشتوں کی فروگزاشت سے اگر ایڈیٹر "ریاست" ہندوستان میں نہ پیدا ہوا ہوتا اور امریکہ یا دوسرے کسی یورپین ممالک میں پیدا ہوا ہوتا تو آج وہاں کا صدر ریاست ضرور ہوتا کیونکہ ایسے ہی ذہین اور جفاکش انسان وہاں کے بارہا صدر ہوئے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" کی تحریر کی شوخی کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل فقروں سے کر سکتے ہیں۔ جس میں صفحہ ۶۰ پر مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دتیا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "قاضی صاحب مرحوم بہت وضع دار بزرگ تھے۔ دہلی میں آپ کی حجامت کے لیے سالہا سال سے وہی حجام آتا جس نے کنگ جارج، کنگ ایڈورڈ، درجنوں وائسرائز، کمانڈر انچیفوں، ممبران انتظامیہ کونسل اور کنگ حبیب اللہ آف افغانستان وغیرہ کی حجامت بنائی تھی" یہ واقعہ ہے کہ اس مجموعہ میں جو ذاتی تجربات ایڈیٹر "ریاست" نے لکھے ہیں۔ انہیں پڑھ کر جب ناظرین ایڈیٹر "ریاست" کا تصور کریں گے تو ایک ریش دار بزرگ قسم کی انسائیکلوپیڈیا ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی نظر آئیگی۔

Marfat.com

دراصل "ناقابلِ فراموش" میں ایڈیٹر "ریاست" نے اپنے جن ذاتی تجربات پر روشنی ڈالی ہے وہ ایک اخلاقی درس ہے جو انہوں نے عام انسانوں کو دیا ہے۔ یہ کتاب ایک اخلاقی صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ نوجوانوں کو اسے پڑھ کر اپنا مستقبل بنانے میں خاص مدد ملے گی۔

ایڈیٹر "ریاست" کی تحریر میں جو دلکشی پائی جاتی ہے اس کی مثال نہ تو کسی صحافت نگار کے یہاں ملتی ہے اور نہ کسی دوسرے ادیب کے یہاں اور غالباً اسی چیز کو دیکھ کر ایک مرتبہ بابائے صحافت سید جالب دہلوی نے کہا تھا کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے اور اس کامیابی پر آپ کو فخر ہے۔

ایڈیٹر "ریاست" کی تحریر کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت ان کا بیباکانہ اندازِ بیان ہے۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے جب ہندوستانی صحافت کے گلے پر انگریزی قانون کی شمشیر برہنہ ہر وقت لٹکی رہتی تھی۔ وہ اس وقت بھی بدیسی حکومت اور اس کے پروردہ والیانِ ریاست پر اتنی ہی شدت سے تنقید کرتے تھے جس شدت سے آج ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد موجودہ ذمہ داران حکومت پر تنقید کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جس طرح آج حکام اور ملک کے اربابِ حل و عقد ان کے قلم سے لرزہ براندام رہتے ہیں وہی حالت بدیسی حکومت کے دور میں والیانِ ریاست اور ان کے آقائے نامدار کی تھی۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرزمینِ پنجاب سے تین معجزے وجود میں آئے۔ اوّل سر اقبال۔ دوسرے مولانا ظفر علی خاں تیسرے سابق بھاری بھرکم اور موجودہ نحیف الجثہ دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر "ریاست"۔

Marfat.com

غیر فانی کتاب

(حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی)

بجلی کی کڑک، کوندے کی لپک، بادلوں کی گرج، گھنگھور گھٹاؤں کی رم جھم، ہنسیاں، چہلیں، دل لگیاں! پھر دفعۃً پولیس اور پولیس کی زنگار رنگ "نیکیاں" شیطانی حکومت کا قہر و ستم، قید و بند، حبس دوام، پھانسی بھی!
پھر راجے مہاراجے اور راجوں مہاراجوں کی "رشک ملائک" بوقلموں سیرتیں!
پھر عزم و ہمت کے مرقعے، پہاڑوں سے ٹکر لینے کا عزم، سمندروں سے بھڑ جانے والی ہمت!
جلوے، حیرت انگیز جلوے! باطل کی یلغار، ظلم کا طوفان! حق کی بے کسی، بے بسی، کس مپرسی! اور ان ارجن کی شان سے فتح مند سینہ تانے ناچ رہا ہے۔ سچائی کا بے گور و کفن لاشہ پڑا تڑپ رہا ہے۔ نہ آسمان کے آنسو ٹپکتے ہیں، نہ زمین ہی کی چھاتی پھٹ جاتی ہے!

مگر؟

"نو مگر" کے بعد سچ مچ ایک طلسم ہوش ربا سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔
غرور کا سر کچل ڈالنے والا ایک سر ابھرتا نظر آتا ہے۔ جوشِ حق سے یہ سر اونچا ہوتے ہوتے دوشِ ثریا تک پہنچ جاتا ہے۔
ایک گردن نمودار ہوتی ہے جس نے ظلم و استبداد کے سامنے جھکنا جانا ہی نہیں۔
ایک گدائے بوریہ نشیں، شیروں کی طرح دھاڑتا، چنگھاڑتا، جبار و قہار قوتوں پر مردانہ وار بڑھتا چلا آتا ہے!
باطل اپنی طاغوتی طاقتوں، قارونی خزانوں کے بل بوتے پر جاں لیوا آہنی ضربیں لگا رہا ہے، لیکن یہ دیکھو گدائے بے نوا نے باطل کو پچھاڑ دیا اور باطل اپنے نمرودی، چنگیزی، گنگا جمنی دریائے غرور میں پڑا ڈبکیاں کھا رہا ہے!
یہ ہے کتاب "ناقابل فراموش"۔
پھر مفتی صاحب کے قلم کی گل کاریاں ہیں۔ ہنسا بھی رہی ہیں، رلا بھی رہی ہیں۔ نشتر ہیں کہ دلوں میں چبھے چلے جا رہے ہیں۔
پھر سبق ہیں۔ مکارم اخلاق کے سبق، روکھی سوکھی زبان میں نہیں، شہد برساتی ہوئی زبان میں اخلاقیات کے سبق چل رہے ہیں، اس طرح چل رہے ہیں کہ وہم ہی نہیں ہوتا ہم سبق پڑھ رہے ہیں۔ مگر سبق ہیں کہ دلوں میں رچتے بستے چلے جا رہے ہیں! چہلیں ہیں کہ گدگدا، گدگدا کے بے دم کیے ڈال رہی ہیں۔
پھر تجربے ہیں۔ لہو رلانے والے تجربے، دلوں کو گرما ڈالنے والے تجربے۔
کہیں انسانیت برہنہ پڑی سسک رہی ہے اور ہم اُبکائیاں لے رہے ہیں۔ شرم سے گڑے چلے جا رہے ہیں کہ ہم بھی "انسان" ہیں!

Marfat.com

اور کہیں انسانیت اپنی تمام رعنائیوں، جلالتوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہے اور ہم فخر سے سر اونچا کیے چلے جا رہے ہیں کہ ہم بھی "انسان" ہیں!

بخدا مجھے تو رشک آتا ہے کتاب پڑھتا جاتا تھا اور "پٹھانی شیطان" بھی انگڑائیاں لیتا جاتا تھا۔ لگاتار کا ناپھوسی کیے جاتا تھا "سردار کا قلم چھین لے الجھاؤ بڑا تھا مگر عقل نے کہا تو پٹھان سہی مگر مقتول بھی سکھ ہے۔ زبردستی تو سردار قبضے میں آنے سے رہا۔ ہاں پٹھانوں کی روایتی "چالاکی" سے کام لیا جائے تو شاید سردار اپنا قلم سپرد کر دے۔ آخر "سردار" ہی تو ہے!

عمرو بن معدی کرب عرب کا شہرۂ آفاق سورما تھا۔ ایک دنیا اس کی ترک تازیوں، بے پناہ حملوں سے تھرآیا کرتی تھی۔ ابن معدی کرب کی تلوار کا نام صمصامہ تھا اور اپنی کاٹ میں ضرب المثل تھی۔ عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے خود بھی بڑے جرار سپاہی تھے۔ خیال ہوا ابن معدی کرب کی صمصامہ کو دیکھیں۔ حکم کی دیر تھی تلوار حاضر ہوگئی۔ ہاتھ میں لی اور جھٹک کر ہلائی تو ذرا نہ جچی۔ حیرت سے چیخ اٹھے۔ اسی صمصامہ کی یہ دھوم ہے! بلاؤ معدی کرب کے بیٹے کو" حاضر ہوا تو فرمایا "تیری تلوار تو کچھ بھی نہیں"۔ عرب سورما نے عرض کیا۔۔! امیر المومنین! تلوار تو محض لوہے کا ایک ٹکڑا ہے لیکن وہ ابن معدی کرب کا بازو ہے جس نے لوہے کے اس ٹکڑے کو پورے عرب میں شہرت دے دی ہے۔ خطا معاف، امیر المومنین کے جسم میں ابن معدی کرب کا بازو موجود نہیں۔

تو بس اب آپ خود ہی فرمائیں۔ دیوان سنگھ کا قلم کسی طرح چھین بھی لوں یا دم دلاسا دے کر اینٹھ بھی لوں تو نتیجہ وہی "صمصامہ" جیسا ہی تو نکلے گا!

اما بعد، دیوان سنگھ کی "ناقابلِ فراموش" آپ چاہیں تو میں قسم کھا کر کہدوں کہ یہ کتاب اردو لٹریچر میں ناقابلِ فراموش رہے گی!

عمر بھر کسی کتاب کا دیباچہ لکھا نہیں۔ کوئی کتاب کبھی جچی ہی نہیں قلم سے تعریف کرنے میں اول درجے کا کنجوس، مکھی چوس ہوں لیکن دیوان سنگھ کی "ناقابلِ فراموش" نے مجھ پر واقعی ناقابلِ فراموش اثر کیا ہے۔

پورے جزم، پورے یقین، پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اردو ادب نے "ناقابلِ فراموش" جیسی کتاب پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارے ادب میں یہ کتاب زندہ رہے گی۔ کیوں؟ اس لیے زندہ رہے گی کہ یہ کتاب انسانی زندگی کی بھیانک خوں چکانیوں اور دلفریب رعنائیوں کی ہوبہو تصویر ہے۔ ایک زندگی ہے۔ جو صفحے صفحے سے پھوٹ رہی ہے۔ چھلک رہی ہے امنڈ رہی ہے!

دیوان سنگھ بے شک فانی انسان ہے کسی دن مر ہی جائے گا۔ مگر دیوان سنگھ کی "ناقابلِ فراموش" غیر فانی ہے کبھی نہیں مرے گی!

Marfat.com

بہترین خود نوشت سوانح عمری

(جناب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ہیڈ پنجابی ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی)

مفتوں صاحب سے کئی برس ہوئے میں نے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے سوانح حیات کتابی صورت میں شائع کیجئے۔ ان دنوں "ریاست" کے توسط سے ہر ہفتہ سردار صاحب اپنی کتاب زندگی کا کوئی ورق پیش کرتے تھے۔ مجھے تو چند ہی واردات کی اہمیت نے سردار جی کی شخصیت کا مداح۔ ان کی اعجاز بیانی کا شیدائی اور ان کی صاف گوئی اور ان کے نڈرپن کا والا بنا دیا تھا۔ بہت ممکن ہے اور اصحاب نے بھی اسی طرح کا تقاضا کیا ہو۔

ذاتی ملاقات تو مدیر ریاست سے غالباً ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ دریا گنج کے ایک کونے میں پڑے تھے، اور میری طرح انقلاب کو دعائیں دے رہے تھے۔ جب چائے میز پر آئی اور تکلفات پر نظر گئی تو معلوم ہوا کہ ایک صادق دوست، سخی میزبان اور دریا دل داتا ایک اجنبی کو بھی باوجود اپنی مالی مشکلات کے وہ کچھ پیش کرسکتا ہے جس کا مہمان کو خواب و خیال تک نہ ہو، توقع کی تو بات جانے دیجئے۔ ہاں بے واسطہ دیوانہ ۱۹۱۹ء سے سردار دیوان سنگھ مفتوں کو جانتا تھا۔ غالباً ۲۱-۱۹۲۰ء میں سردار سردول سنگھ کویشر سے مفتوں صاحب کی بلند کرداری کے قصائد سنے اور جبھی قائل ہو گیا۔ جسے کویشر اچھا کہیں وہ بہت اچھا ہے فی الواقعی۔

مفتوں صاحب کی یہ خود نوشت سوانح عمری پڑھ چکا تو دل نے شاعری شروع کر دی۔ کیا فرماتے ہیں حضرت دل۔ مجھ سے کوئی پوچھے نہ پوچھے میں کہوں گا کہ اس کتاب کا ترجمہ سرکاری طور سے ہندوستان کی تمام تسلیم شدہ زبانوں میں کیا جائے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ امریکہ میں شائع ہو اور اس کتاب سے موزوں اقتباسات ہائر سیکنڈری سکولوں کے ادبی لسانی نصاب میں شامل کیے جائیں۔

میں جانتا ہوں کہ دل دیوانہ کیوں یوں مفتوں صاحب کی تحریرات پر لٹو ہے۔ عرصہ ہوا ایک شعر ہوا تھا وہ بھی سنیئے:

تھا دل دیوانہ ایک پُتلا خلوص و صدق کا
راز کی سب باتیں چہرے سے نمایاں ہو گئیں

میری طرح ہر وہ شخص جس کے دل میں درد ہے جو جذب و سلوک کا قائل ہے جو وحدت الوجود پر ایمان رکھتا ہے جسے روز حساب کی فکر ہے جو حقیقی اور باقی مساوات کا قائل ہے جو ہر فرد واحد، ہر گروہ، ہر قوم، ہر ملک میں کچھ نہ کچھ اچھائی دیکھنے کا عادی ہے جو اخلاقی اقدار کی تینوں بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے۔ خاندانی تربیت

Marfat.com

ذاتی تجربات اور اللہ تعالیٰ کا کرم جسے اپنے وطن کی روحانی اور اخلاقی ترقی کی اور بھی زیادہ فکر ہے اقتصادی اور سیاسی ارتقاء کے ساتھ ساتھ۔ ہاں ہر وہ شخص مفتوںؔ صاحب کے سوانح حیات پڑھ کر بے اختیار ان کے دل و دماغ اور قلم کی بے پناہ داد دینے پر خود کو مجبور پائے گا۔

فقیر نے انگریزی زبان میں شائع ہوئی بہت سی خود نوشت سوانح عمریاں ادیبوں، سیاست دانوں اور روحانیت پرست دوستوں کی جن میں ہندوستانی۔ امریکن۔ فرانسیسی۔ انگریزی۔ یونانی اور جرمن شامل ہیں بڑے غور و انہماک اور سبق اندوزی کے جذبہ سے پڑھی ہیں۔ اس مطالعہ کی بنا پر منصفانہ انداز اور تقابلی نکتہ نظر سے فقیر کہتا ہے کہ آج تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں مفتوںؔ کی خود نوشت سوانح عمری کی طرح ہر واقعہ بے کم و کاست، بے غلو اور بے رنگ آمیزی کے بے طرحداری کے لکھ دیا گیا ہو۔ اس قدر نڈر پن سے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہا گیا ہو تجربات کی اتنی وسعت امارت، عمق، ان کا اتنا تنوع ہو اور تجربات ہر طبقہ، ہر سطح، ہر رنگ کردار سے متعلق ہوں۔ بیان کا ڈھنگ اتنا رواں، شفاف، توجہ گیر اور ہلکا ہو۔ زبان ہر موقع واقعہ کے لیے موزوں ہو۔ نیز مجموعی طور پر زبان کا استعمال قادرانہ ہو اور لغات و طرز عام و خاص کی تمیزوں کو بھلوا دینے والا ہو۔ داستان گوئی کے ساتھ ساتھ معرفت پیمائی ہو۔ تصویر کشی کے ساتھ ساتھ حق پروری ہو۔ اور واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ نکتہ آفرینی ہو۔ غریبی میں امیری اور امیری میں غریبی کے مزے لینے والا مصنف زندگی کا سارا کھیل شروع سے آخر تک ایک بے لاگ لیلا کے طور پر کھیل سکا ہو یعنی ہر قدم پر عامل خود کو شاہد و ناظر بھی محسوس کرتا رہا ہو۔

میاں اپنے بچوں کو اپنے دوستوں کو اپنی بیوی کو اپنے شوہر کو اپنے افسروں کو اپنے ماتحتوں کو اپنے پڑوسیوں کو اپنے دشمنوں کو اگر تعلیم کرنا مقصود و منظور ہو تو ساری کی ساری کتاب انہیں پڑھوا دو۔ اور اگر اتنا نہیں کر سکتے وہ یا آپ تو اتنا ہی کریں کہ اس کتاب کے ابواب کے عنوانوں کو الگ الگ تختہ کاغذ پر لکھ کر درون خانہ کی دیواروں پر چسپاں کر دو۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ زندگی کامیاب ہو جائے گی۔ ہاں زندگی زندگی ہو جائے گی۔ دیکھو تو کیا فرماتے ہیں سردار صاحب۔

واللہ یہ عنوان ہیں یا اخلاق خداوندی پہ مشتمل ایک عارف پر نازل ہوئے"

ظلم و زیادتی کو برداشت نہ کرو۔

والیان ریاست کا پرسٹیج۔

عزت کی قربانی۔

عزت مرنے کے بعد۔

پانی کا اثر طبائع پر۔

سی آئی ڈی کے معتبر رپورٹر۔

غدار قابل معافی ہیں۔

گورنمنٹ کی کاغذی مشینری۔

Marfat.com

جرنلزم کا روشن پہلو۔
قانون اور فرض۔
معقولیت باعثِ اطمینان۔
بغیر نیت کے جرائم۔
نفرت اور محبت کے اسباب۔

وہ خاص بات جس نے مجھے سردار صاحب کا بے حد گرویدہ کر دیا ہے اور جو میرے پچاس سالہ تجربہ میں کسی اور ادیب، رہنما عامل اور عارف میں شاذونادر ہی ملی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سردار صاحب نے سوانح قلم بند کرنے وقت واقعہ کی اہمیت۔ اس کی سبق آموزی، اس کی دل چسپی اور اس کی معنی خیزی کو پیش نظر رکھا ہے۔ خواہ وہ واقعہ کسی غریب دکھیا مجرم یا ولایتی شخص سے متعلق ہے خواہ کسی امیر، فارغ البال، پاک دامن یا دیسی شخص سے۔

عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ سوانح نویس صرف انہیں ناموں، کاموں، مقاموں، واقعوں یا تعلقوں کو لیتے ہیں۔ بلکہ گھسیٹ لاتے ہیں، جو بڑے ہیں جن سے کوائف نگار کی بڑائی یا بڑا پن ثابت ہو اور پڑھنے والے پر اس بات کا رعب چھا جائے کہ میں اس بڑے آدمی کی زندگی کے بڑے واقعات پڑھ کر بڑے نکتے حاصل کر سکتا ہوں مگر سردار دیوان سنگھ مفتوں ایک معمولی کھتری سکھ گھرانے کا فرد تھا یہی تھا یہی ہے یہی ہوگا یعنی اس نے خاندانی روایات، سکھ تعلیمات اور عوامی فطری صلاحیتوں کو ایسا سنبھالا اور انہیں وہ فروغ دیا اور اس سختی سے ان پر کاربند رہا کہ سب کچھ دیکھ، سُن سہہ کر بھی وہ وہی ہے جو پہلے تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اول ہی سے بڑا یا چھوٹا تھا اور اب بھی وہی، ویسا ہی ہے۔ ہاں تلخئ دوراں نے ستم ہائے زمانہ نے اسے کوئلہ سے ہیرا کر دیا ہے اور پتھر سے سنگ مرمر۔ اسے اظہارِ عقیدت سمجھئے یا بیانِ واقعی۔

Marfat.com

درسِ عمل

(ڈاکٹر م حفیظ سید ایم اے پی ایچ ڈی - ممبر برٹش انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی لندن)

دیباچہ کا مقصد ہے کسی کتاب کا قارئین سے تعارف کرانا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ راقم الحروف اس فریضہ کو انجام دے کر اطمینان و مسرت حاصل کرے "ناقابلِ فراموش" کتاب کے مصنف کے کارناموں پر انہیں مبارک دیتا ہے۔

ادبی اور اخلاقی کتابوں کے مضامین عموماً فرضی، قیاسی اور تخلیقی ہوتے ہیں اور زیادہ تر جگ بیتی واقعات پر مبنی — لیکن زیرِ نظر تصنیف اس نظریہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے فاضل مصنف نے جو کچھ قلم بند کیا ہے وہ آپ بیتی ہے جسے ان کے ناقابلِ فراموش تجربات، تاثرات، مشاہدات کا جیتا جاگتا مرقع سمجھئے یا عبرت آموز واقعات کا سرچشمہ۔ ان کی حقیقت بھی اور مآل اندیش نگاہیں روزمرہ کے حادثات اور واقعات کو سرسری طور سے نہیں دیکھتیں۔ بلکہ ان پر غائرانہ نظر ڈالتی ہیں اور ان سے سبق حاصل کرتی ہیں اور یہی عمل زندگی کا ماحاصل ہونا چاہیئے۔ کون ذی ہوش اور باحس انسان ہوگا جو اس عبرت انگیز مرقع کو پڑھ کر اثر پذیر نہ ہوگا۔ ادب کے مطالعہ کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیئے۔ جس شعبۂ ادب کا اثر زندگی پر نہ ہو اور جس کے مطالعہ سے چشمِ بصیرت وا نہ ہو وہ حقیقتاً غیر مفید ہے۔

"ناقابلِ فراموش" کتاب کا ہر ورق بصیرت افروز ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر برنا و پیر، ہر کس و ناکس اس کے مطالعہ سے مستفیض ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس میں ذاتی اصلاح اور ضبطِ نفس کا قدرے ذوق ہو۔ اس کے مصنف حضرت دیوان سنگھ مفتون سراپا خلوص اور پیکرِ صدق و صفا ہیں۔ جن لوگوں نے بالاستیعاب "ریاست" کا مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ بلا تامل میری ہم نوائی فرمائیں گے۔ ہر شذرہ کی تہہ میں اخلاقی پہلو مخفی رکھتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ موصوف کے لیے سبق آموز ہے اور معمولی سے معمولی بات ان کے واسطے تنبیہہ کا تازیانہ۔ معیارِ اخلاق، دیانت داری اور راست بازی کے اصول سے جو حادثہ منطبق نہیں ہوتا وہ ان کی مشاہدہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ ان کی روداد حیات جفاکشی کی ایک زندہ مثال ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ زریں سبق حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر کامیابی مقصد کے لیے ارادہ کی پختگی اور محنت کی عادت ضروری ہے۔ اپنے حصولِ مقاصد کے لیے انہیں جن جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کا بیان اپنی سادگیٔ عبارت کے باوجود کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ چند واقعات میں انہوں نے اپنی قابلِ تقلید زندگی کی ان حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے جن کے انکشاف و اعتراف سے عام طور پر لوگ گریز

Marfat.com

کرتے ہیں۔

یہ یگانۂ روزگار اور اپنے قسم کی پہلی کتاب مصنف کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ اس کے بغور مطالعہ سے قاری کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ عالم باعمل کے گوناگوں مشاہدات کا بے نظیر مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر معمولی سے معمولی شخص بھی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اردو زبان اور ادب سے مفنوں صاحب کو شغف ہے ان کا اسلوب بیان جاذبِ نظر اور دلکش ہے۔

ایک نشست میں پوری کتاب پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے جی نہیں اکتاتا۔ روح میں بالیدگی اور عقل میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ یہ کتاب ہر طبقہ کے طلباء کے لیے بھی مفید اور کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

قارئین کرام یقین کریں یا نہ کریں مگر درحقیقت یہ ناقابلِ فراموش واقعہ ہے کہ سردار دیوان سنگھ صاحب نے تین چار سو روپیہ ماہوار آمدنی کو خیرباد کہہ کر ساٹھ روپیہ ماہوار کی ملازمت کو محض اس وجہ سے قبول کیا کہ فنِ اخبار نویسی میں مہارت حاصل کریں۔ ایک واقعہ کے مطابق آپ پنجاب سے سفر کر کے لکھنؤ "ہمدم" کے ایڈیٹر جالبؔ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا معاوضہ اس فن کو سیکھنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ رئیسوں اور امیروں کی خوشنودی کی فکر انہوں نے کبھی نہیں کی۔ بلکہ ان کی ہر غلطی اور فروگزاشت کی سخت تنقید کی اور بے دھڑک ان عیوب کو طشت ازبام کیا۔ اس ذات پات، کنبہ پروری اور فرقہ پرستی کے زمانہ میں بے لوث ہو کر رائے زنی کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ اس کتاب میں متعدد واقعات ایسے درج ہیں جن سے بہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محترمی دیوان سنگھ صاحب نے اپنے اور غیروں میں جہاں تک کہ واقعات کا تعلق ہے کوئی امتیاز نہیں برتا ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ان میں سے کسی فرقہ کے فرد سے اگر کوئی دیدہ دانستہ غلطی ہوئی یا لغزش سرزد ہوئی تو اس پر آپ نے بے کم و کاست، بلا خوف و خطر، بے باکانہ نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ آپ فطرتاً حق پسند، حق جُو اور حق بیں واقع ہوتے ہیں۔

مجھ کو تیس برس کے عرصے میں انگریزی اور اردو کے ایڈیٹروں سے کافی سابقہ رہا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ لکھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میں نے سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر کو بحیثیت ایڈیٹر کے بہر نوع مجموعۂ صفات پایا۔ یہ صادق القول، صادق الاقرار اور اپنی بات کا دھنی انسان اپنی آپ بیتی سنا کر ہمیں غیر محسوس طریقہ پہ زندگی کا وہ درسِ عمل دیتا ہے جو ہر پہلو اور ہر نقطہ نظر سے مفید، کارآمد اور اعلیٰ ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس ناقابلِ فراموش مجموعہ کو قارئین توجہ اور دلچسپی سے پڑھ کر مستفیض ہوں گے"

Marfat.com

ریاستوں کی قومی زندگی کا علَم بردار

(جناب مالک رام صاحب مصنّف "ذکرِ غالب" وغیرہ)

مَیں نے ۱۹۲۴ء میں وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیرآباد سے میٹریکولیشن کی سند لی اور اسی سال گورنمنٹ کالج گجرات میں ایف اے کلاس میں داخلہ لے لیا۔ یادش بخیر، اس زمانے کا گجرات سراسر شعر و نغمہ کا شہر تھا۔ یہاں کا ہر چھوٹا بڑا شعر کہتا تھا۔ اگر خود نہ کہتا تو دوسروں کے ہی گنگناتا رہتا۔ ہر گلی کوچے سے طبلے کی تھاپ اور سارنگی کی دلنواز لَے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہفتہ وار طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں مقامی اصحاب کے علاوہ باہر کے شعرا بھی اپنا کلام سنانے کو آیا کرتے۔ اختر شیرانی اور عابد علی عابد کو مَیں نے پہلی مرتبہ یہیں دیکھا اور سنا۔ میری عمر بھی یہی ۱۶، ۱۷ برس کی ہوگی۔ ناممکن تھا کہ مَیں اس فضا سے متاثر نہ ہوتا چنانچہ مَیں بھی ان مشاعروں میں جانے لگا۔ شعر سنانے کے لیے نہیں بلکہ سننے کے لیے۔ کیونکہ اگرچہ مَیں نے اس زمانہ میں دو تین غزلیں لکھیں اور اُن مشاعروں میں پڑھیں لیکن بہت جلد مَیں نے محسوس کر لیا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے نہ شعر میں تازگی ہوتی ہے۔ نہ کوئی خاص بات ہی۔ وہی ایک مضمون ہے جو آپ لفظوں کے ہیر پھیر سے لکھ دیتے ہیں اگر اس لفظی نٹ بازی میں کوئی محاورہ یا ترکیب عمدہ اور جدید طریقے پر بندھ گئی تو واہ واہ، ورنہ دوسروں کا تو کیا ذکر، شعر خود اپنی نظر سے گر گیا۔ غرض کہ اس کے بعد مَیں نے شعر کہنا یکسر ترک کر دیا البتہ ان محفلوں میں باقاعدہ شریک ہوتا رہا۔

تو خیر یہاں میری ملاقات ایک صاحب محمد یوسف سے ہوئی۔ ان کی تعلیم تو بالکل واجبی سی تھی شاید چوتھے پانچویں درجے تک ہو۔ لیکن وہ بہت ذہین تھے اور انہوں نے اپنے شوق اور محنت سے اچھی استعداد پیدا کر لی تھی ان کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ ہزاروں شعر یاد تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ یوسف تخلص تھا چونکہ سیماب اکبرآبادی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے اس لیے اپنے نام کے ساتھ سیمابی بھی لکھتے تھے یعنی محمد یوسف، یوسف سیمابی گجراتی۔ سنا کہ شروع میں یہ درزی کی دُکان کرتے تھے۔ اس کام میں ضرور نفع ہوا ہوگا اور شاید باپ دادا کی کمائی سے بھی کچھ بچا کھچا پاس ہو۔ انہوں نے درزی کا کام چھوڑ کر کپڑے کا کاروبار کر لیا۔ مَیں جس زمانے میں اُن سے ملا ہوں ان کے پاس یہی بزازی کی دکان تھی۔ دن بھر کی تو خدا جانے کہ وہ کیا کرتے تھے لیکن دن ڈھلنے کے ساتھ ہی دوست احباب ان کی دکان پر جمع ہونے لگتے اور پھر یہ جمگھٹا رات گئے تک رہتا۔ دراصل یوسف صاحب نے یہ دکان تو محض "سرکل" کی طرح محض دوستوں سے ملاقات کے لیے ایک جگہ مہیا کرنے کے لیے کھول رکھی تھی، ورنہ حقیقت میں انہیں شوق صرف دو چیزوں کا تھا، شعر اور کھانا

Marfat.com

چنانچہ جتنی دیر یہ مجمع رہتا یار لوگ یا تو شعر پڑھتے اور سنتے رہتے یا دعوتیں اُڑاتے رہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے یوسف صاحب کے پاس کوئی قاروں کا خزانہ تو تھا نہیں۔ دو تین برس میں دوکان خالی ہونے لگ گئی۔

یوسف صاحب کے ہاں مختلف رسالے اور اخبار بھی آیا کرتے تھے۔ "نگار"، "زمانہ"، "پیمانہ" اور "نیرنگِ خیال" وغیرہ اس دور کے مشہور پرچے تھے۔ وہ ان سب کے خریدار تھے۔ گاہے ماہے ان میں سے کسی میں ان کی غزل بھی چھپ جاتی اور غالباً اسی غرض سے وہ انہیں منگواتے تھے۔ ایک دن شام کو جو میں ان کی دکان پر گیا تو یہاں ایک نیا پرچہ دیکھا "ریاست" بڑا سائز، بڑھیا چکنا کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ، تصویریں اعلیٰ۔ غرض ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ تھا میرا پہلا تعارف سردار دیوان سنگھ مفتوں سے جو "ریاست" کے ایڈیٹر تھے۔

میں پہلی نظر میں "ریاست" پر فریفتہ ہو گیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد ہر ہفتے مجھے اس کا انتظار اسی بے چینی سے رہا کرتا جیسے "نامۂ دلدار" کا۔ اور میں جب اسے کھولتا تو جی چاہتا کہ "جانِ نذرِ دل فریبی عنوان" کردوں۔ میں اسے بلاناغہ پندرہ برس تک (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۹ء) پڑھتا رہا۔ اس کے بعد میں "پاؤں کے چکر" سے مجبور ہو کر ذرا وسیع تر پیمانے پر دشت نوردی کرنے کو ملک سے باہر چلا گیا اور پندرہ برس کی جہاں گردی کے بعد ۱۹۵۴ء کے اواخر میں وطن واپس آیا۔ اس دوران میں مجھے "ریاست" دیکھنے کو نہیں ملا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کہیں بھی رہا ہوں، کبھی اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ جب میں یہاں آیا تو چونکہ گھر بار تو غیر حاضری کے زمانے میں تقسیمِ ملک کے باعث پاکستان کو پیارا ہو چکا تھا۔ لامحالہ مجھے دہلی میں قیام کرنا پڑا لیکن معلوم نہیں کیوں میں نے سردار دیوان سنگھ صاحب سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

میں جلسے جلوس کا قائل نہیں اور ایسی تقریبوں میں جہاں ہنگامہ ہو، بہت کم شامل ہوتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے سردار دیوان سنگھ مجھ سے بھی زیادہ کم آمیز ہیں کیونکہ میں نے ان تین برسوں میں انہیں کسی جگہ بھی نہیں دیکھا۔

پچھلے جاڑوں میں میرے ایک مہربان بزرگ نے لکھنؤ سے لکھا کہ میں دو تین دن کے لیے دہلی آ رہا ہوں اور حسبِ معمول سردار دیوان سنگھ مفتوں کے ہاں ٹھہروں گا۔ چونکہ ان سے ملنا ضروری تھا اس لیے جس دن ان کا آنے کا وعدہ تھا میں مکان تلاش کر کے حاضر ہوا۔ وہ بزرگ تو تشریف نہیں لائے تھے لیکن اس بہانے سردار صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ زمانے کے اتفاقات کہ یوں میں نے اس شخص کو، جسے میں غائبانہ طور پر ۳۳ برس سے جانتا تھا پہلی مرتبہ، ۱۹۵۷ء میں دیکھا۔

"ریاست" نے "تحریکِ آزادی" میں جو نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں۔ وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں جنگ کا ایک محاذ تو یہ تھا کہ برطانوی اقتدار سے براہِ راست ٹکر لی جاتے۔ کانگریس نے یہی کیا۔ اس کی تمام تحریکیں اسی مقصد سے شروع کی گئیں۔ اس سے قوم میں بیداری پیدا ہوئی اور بدیسی حکمرانوں کا جو مادی اور جسمانی رعب لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ زائل ہو گیا۔ دوسرا محاذ وہ تھا جس کی لڑائی ہماری صحافت

Marfat.com

نے لڑی۔ اخبار نویسوں نے بہ کوشش کی کہ تحریروں سے انگریزوں کو اور یہاں ان کے طرزِ حکومت کو خودسر اور مطلق العنان اور اس طرح مضحکہ خیز ثابت کیا جائے تاکہ اخلاقی اور معنوی حیثیت سے بھی ان کی کم مائگی ظاہر ہو۔ اگرچہ اس میں بسا اوقات ان غریبوں کا مالی نقصان اس حد تک ہُوا کہ وہ تباہ ہی ہو گئے اور ان میں سے بعض کو قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں لیکن آفرین ہے ان پر کہ یہ ہمت نہیں ہارے اور برابر میدان میں ڈٹے رہے۔ "ریاست" نے یہی دوسرا راستہ اختیار کیا بلکہ اپنی سرگرمیوں کو ریاست تک وسیع رکھ کے اس نے اپنی دشواریوں میں اور اضافہ کر لیا۔ ہندوستان میں انگریزی نوکر شاہی کی سب سے بڑی پشت پناہ دیسی حکمران تھے۔ چونکہ ان کی اپنی ہستی اور زندگی سراسر انگریز کے رحم و کرم پر موقوف تھی۔ اس لیے یہ ہمیشہ اس کے قول و فعل کی تائید کرنا اپنا فرض خیال کرتے تھے اور اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ حالانکہ بیشتر ریاستوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں بدانتظامی اور ظلم و ستم کا دَور دَورہ تھا۔ یہاں کے نواب اور مہاراجے دن رات من مانی کرتے اور گلچھرے اڑاتے تھے۔ ریاست کی آمدنی گویا ان کا جیب خرچ تھی۔ اس کے باوجود انگریز نہ تو کھلے بندوں ریاستوں کے معاملات میں دخل دیتا۔ نہ ان کے حکمرانوں کو آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا مشورہ دیتا۔ غرض دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ انگریز کی موجودگی میں کوئی کسی نواب یا مہاراجہ کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ اور رائے عامہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام کے لیے یہ دیسی حکمران سب سے بڑا بند تھے۔ "ریاست" نے ان دیسی رئیسوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ تاکہ عوام کے دماغ سے ان کا ہوّا نکلے اور اس طرح ان کے دلوں میں خود انگریز کے خلاف نفرت پیدا ہو جو ایسے ناکارہ لوگوں کی حمایت کرتا تھا۔ "ریاست" کو کسی غلط بیانی یا مبالغے کی ضرورت نہیں تھی۔ واقعی ریاستوں کی رعایا کا نہ جان و مال محفوظ تھا نہ عزت و ناموس، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ نہ داد تھی نہ فریاد۔ خوش قسمتی سے اسے نامہ نگار بھی وہ مل گئے جو گھر کے بھیدی تھے۔ اس لیے ہر ہفتے اس میں ایسے ایسے کچے چٹھے چھپتے کہ پڑھنے کا لطف آجاتا۔ ان مضامین اور خبروں نے آگ سی لگا دی۔ سرکاری حلقوں پر ان سے جو گزر جاتی ہوگی اس کا تو بس اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ ریاستوں کا وقار اور ان کے حکمرانوں کی عزت ملیامیٹ ہو کے رہ گئی اور خود انگریز بھی ان شعلوں کی لپیٹ سے نہ بچا اور یہی "ریاست" کا مقصد تھا۔ ریاستوں میں قومی تحریک کی بنیاد رکھنے اس کے نشوونما میں "ریاست" کا بہت بڑا حصہ ہے کاش کہ کوئی اس کی تاریخ لکھ دے۔ اس کے لیے بھی سردار دیوان سنگھ سے زیادہ کون موزوں ہے۔

ظاہر ہے کہ سردار دیوان سنگھ کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہے۔ "ریاست" کی ایڈیٹری پھولوں کی سیج نہیں بلکہ تلوار کی دھار تھی۔ ریاستوں کا تمام روپیہ اور ان کے اثر و رسوخ کی پوری مشین ان کے خلاف تھی چنانچہ تلاشیاں ہوئیں۔ مقدمے قائم کیے گئے، گرفتاریاں ہوئیں۔ انہیں اپنے بچاؤ کے لیے کیا کیا جوڑ توڑ نہ کرنا پڑے ہوں گے۔ اس دوران میں دوستوں کی دوستی آزمانے اور دشمنوں کی دشمنی کا مقابلہ کرنے کے بیسیوں موقعے پیش آئے۔ ایسی بھرپور زندگی کے سینکڑوں واقعات ناقابلِ فراموش ہونا چاہئیں چنانچہ اپنے تجربات بیان کرنے کو انھوں نے ایک زمانے میں "ریاست" میں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے اپنی

Marfat.com

زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھنا شروع کیے تھے انہی کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

سردار دیوان سنگھ کا اسلوب نگارش سادہ اور پُرکار ہے۔ ان کے قلم میں زور ہے۔ چونکہ ساری عمر صحافت میں گزری۔ اس لیے ان کے بیان میں روانی بہت ہے۔ زندگی کی افتاد نے انہیں واقعیت پسند بنا دیا ہے ـــ اس لیے لگی لپٹی رکھنا یا باتیں چبا چبا کے کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے مدنظر مغز ہوتا ہے نہ کہ اس کا چھلکا۔ اگر ان کا مافی الضمیر کسی خاص لفظ سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ اس کے لکھنے سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس سے کسی اہل زبان یا زبان داں کی پیشانی پر بل ہی کیوں نہ پڑ جائے میں نے جب یہ کتاب پڑھی تو مجھے اس میں "داستان" کا لطف آیا۔ ناممکن ہے کہ آپ اسے ایک دفعہ شروع کر کے آسانی سے ہاتھ سے رکھ دیں۔ کیا اچھا ہو کہ وہ اپنے علم وصلاحیت سے دنیائے ادب کو اور زیادہ مستفید کریں اور ان ریاستوں کے نظم ونسق اور ان کے حکمرانوں کی کارگزاریوں سے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہے اسے قلم بند کر دیں۔ یہ مستقبل کے مورّخ اور افسانہ نویس (اور قلم نگار) کے لیے خام مواد کا کام دے گا۔ اور اس طرح ان کا احسان ہمارے علم وادب پر دائمی رہے گا۔

اب ایک مشورہ

ہماری زبان میں اچھی سوانح عمریوں کی بہت کمی ہے۔ ان کے نام آسانی سے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جہاں یہ حالت ہو وہاں خود نوشت سوانح عمری کا کیا ذکر۔ اس صنف میں سر رضا علی مرحوم کے "اعمال نامہ" کے سوائے کوئی اور کتاب میرے علم میں نہیں جو ادبی لحاظ سے بھی دیکھنے کے لائق ہو اس افسوسناک کمی کے پورا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اصحاب جن کی زندگی کے واقعات دلچسپ اور سبق آموز ہوں اور وہ لکھنے پر بھی قادر ہیں، وہ بخل سے کام نہ لیں اور اپنے حالات اور تجربات لکھ ڈالیں سردار دیوان سنگھ نے زندگی معمولی حیثیت سے شروع کی تعلیم بھی معمولی تھی لیکن مسلسل محنت، خلوص، استقلال اور خود اعتمادی سے انہوں نے قابلِ رشک کامیابی حاصل کی۔ ان کے سوانح حیات ہمارے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ انہیں حوالۂ قلم کر دیں۔

ہے آج جو داستاں اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

Marfat.com

خیر مقدم

(جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر)

میری ان چند سطور کو سردار دیوان سنگھ مفتوں کا تعارف یا "ناقابلِ فراموش" کا دیباچہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ دورِ حاضر کا اردو داں طبقہ اخبار "ریاست" کی معرفت دیوان سنگھ کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان ہی سے نہیں بلکہ ان کے کردار کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف ہو چکا ہے۔ اس طرزِ تحریر کے متعلق اختلاف رائے ہو سکتا ہے مگر اس کی مقبولیت کے بارے میں اب شک و شبہ تک کی گنجائش نہیں رہی دیوان سنگھ نے کبھی ادیب یا انشا پرداز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ زندگی کی ابتدائی دوڑ دھوپ کے چند سالوں کو چھوڑ کر عمر بھر صحافت ہی ان کی تمام تر توجہ اور سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے اور صحافت میں وہ ایک ایسی طرزِ تحریر کی ایجاد کا دعویٰ کر سکتے ہیں جو اخبار "ریاست" کے روزِ اجرا سے اب تک بڑے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں سے داد و تحسین حاصل کرتی رہی ہے۔

عہدِ انگریزی کے آخری تیس پینتیس سال ہندوستانی صحافت کے لیے ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھے۔ اس وقت قوم پرست اخباروں اور اخبار نویسوں کو بے شمار مشکلات اور مصائب کا سامنا ہوا۔ پھر مفتوں صاحب کا اخبار تو نہ صرف قوم پرست تھا بلکہ والیانِ ریاست کے اس گروہ کے خلاف جہاد کر رہا تھا جو انگریزی حکومت کا پشتیبان اور قانون کا لاڈلا تھا۔ اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے سب کچھ کر گزرتا تھا۔ اور غیر محدود اختیارات، وسیع ذرائع اور طاقتِ ارفع کی پشت پناہی کی بدولت سب کچھ کر گزرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کو مٹا ڈالنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے پے در پے حملے کیے۔ ہر طریقہ اور ہر ہتھیار سے کام لیا اور نیک و بد کی تمیز چھوڑ کر اس دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سردار دیوان سنگھ کو ان لوگوں کے پس پردہ کارناموں اور کرتوتوں کا حال معلوم کرنے اور ان کے مختلف النوع حملوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ہر طبقہ اور ہر قماش کے بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑا۔ ہزاروں تعلقات بنانے اور بگاڑنے پڑے اور انسانی ذہنیت اور نفسیات کے متعلق ان گنت اچھے برے تجربے ہوئے۔ انسان عمر بھر میں جو کچھ دیکھتا، پڑھتا اور سنتا ہے۔ اگر وہ سب کا سب یاد رہے تو یہ بیچارہ کثرتِ معلومات کے طوفان میں گم ہو کے رہ جائے۔ چنانچہ بعض تجربے تو محض ہنگامی حیثیت کے ہوتے ہیں اور انسان انہیں بہت جلد بھول جاتا ہے لیکن بعض تجربوں سے انسان کا اپنی طبیعت اور مزاج سے خاص لگاؤ ہوتا ہے اور وہ ان سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہ تجربے دل کے کسی گوشے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاگزیں اور دماغ کے کسی خانے میں عمر بھر

Marfat.com

کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔" ناقابلِ فراموش" ایڈیٹر "ریاست" کے ایسے ہی تجربوں کی داستان ہے جو تجربوں کی کثرت تعداد اور بوقلمونی کی بدولت انسانی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں اور شعبوں پر حاوی ہو کر بے حد دلچسپ اور سبق آموز بن گئی ہے۔

روانی اور صاف گوئی دیوان سنگھ کی تحریر کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ انہوں نے عبارت آرائی اور الجھاؤ سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ جو کچھ کہنا ہو سیدھے سادے جملوں میں پوری صفائی اور بے باکی سے کہہ دیتے ہیں۔ ہر تحریر میں یہ خواہش جھلکتی نظر آتی ہے کہ جو کچھ کہا ہے پڑھنے والے کی سمجھ میں پوری طرح آجائے۔ اسی لیے جہاں ضرور سمجھتے ہیں اپنے کسی بیان کا پس منظر اور تلمیحات بطور جملہ معترضہ لکھ کر پھر سلسلۂ کلام شروع کر دیتے ہیں چنانچہ بعض اوقات آٹھ دس الفاظ کے ایک فقرے کے عین درمیان میں پانچ چھ فقروں کا جملہ معترضہ آجاتا ہے۔ بعینہٖ جیسے عام بات چیت میں ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت جو صحافت میں دیوان سنگھ کی کامیابی اور ان کے اخبار کی مقبولیت کے لیے بہت بڑی حد تک ذمہ دار رہی ہے "ناقابلِ فراموش" میں موجود ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے۔ "ریاست" کی ادارتی تحریروں میں قدرتی طور پر دیوان سنگھ کے اپنے خیالات و جذبات کے ساتھ ساتھ پبلک کے احساسات اور جذبات بھی شامل ہوتے تھے اور "ناقابلِ فراموش" میں دیوان سنگھ اور صرف دیوان سنگھ بول رہا ہے حتیٰ کہ جہاں دوسرے لوگوں کے اقوال اور بیانات ہی لکھے ہیں۔ وہاں بھی بین السطور میں خود دیوان سنگھ کا ذہنی اور نفسیاتی ردعمل جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو مختلف واقعات پر بزرگوں کے سے فلسفیانہ انداز میں تنقید و تبصرہ کرتا ہے اور دوسری جانب بچوں کی سی سادگی کے ساتھ اپنی اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی کمزوریوں اور حماقتوں کی داستان سناتا ہے مگر انداز بیان دونوں جگہ ایسا ہے جس سے محرّر اور قاری میں خود بخود ایک مفاہمت بلکہ یگانگت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ داستان گو اپنے مخاطبوں کو رازداں اور راز دار بنا لینے کا آرزو مند ہے اور اس مقصد کے لیے صدق دلی سے کوشش کر رہا ہے مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں اس انداز کی کامیابی یقینی تھی۔ چنانچہ "ناقابلِ فراموش" کے مختلف واقعات جب "ریاست" میں شائع ہوئے تو مفتوں کی اس تازہ اپچ سے نہ صرف دلچسپی کا اظہار کیا گیا بلکہ ان واقعات و تجربات کو کتابی صورت میں چھاپنے کا پُر اصرار مطالبہ ہونے لگا۔

ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دیوان سنگھ نے کسی شخص کے ان مشاغل و عادات سے کبھی تعرض نہیں کیا جن کا تعلق صرف اس شخص کی ذات سے ہو۔ وہ صرف ان اشغال و حرکات کو اخبار نویس اور نقاد کی توجہ کا مستحق سمجھتے ہیں جن کا بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر دوسرے لوگوں پر اثر پڑتا ہو۔ کوئی بیس بائیس سال کا ذکر ہے۔ جب میں پہلے پہل دہلی آیا تو سردار صاحب سے ملنے گیا ہم دونوں ایک دوسرے کے نام اور تحریروں سے آشنا تھے مگر اب تک ملاقات نہ ہوئی تھی۔ مفتوں صاحب مجھے اور منشی رام رچھپال سنگھ شیدا مرحوم کو اپنی کار میں بٹھا کر دہلی کی سیر کرانے لے گئے۔ شام کو کناٹ پلیس پہنچے تو مجھ سے پوچھا "کچھ پئیں گے آپ؟" میں نے کہا میں شراب نہیں پیتا چنانچہ ایک فیشن ایبل ریستوران میں چائے پینے بیٹھ گئے۔ وہاں کیک پیسٹری آئی تو میں نے کہا میں گوشت اور انڈا بھی نہیں کھاتا۔ دیوان سنگھ نے دونوں

Marfat.com

مرتبہ میرے انکار کو سن کر اس "صوفی پن" پر تنقید و تبصرہ تو درکنار معمولی حیرت و تعجب کا اظہار بھی نہیں کیا۔ نہ تو بعض دوسرے لوگوں کی طرح شراب اور گوشت کے "فضائل و مناقب" بیان کیے نہ اس بات پر حیرانی ظاہر کی کہ ایک شاعر شراب سے اور نئے زمانے کا ایک گریجویٹ گوشت سے احتراز کرتا ہے۔ میری بات کو یوں سنا جیسے میں نے صرف یہ کہا کہ ڈاک خانہ میں خط ڈال آیا ہوں یا صبح سے دو پان کھا چکا ہوں۔ "ناقابلِ فراموش" میں بھی ان کے کردار کا یہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے حتیٰ کہ جہاں اپنی کسی کمزوری یا غیر معمولی طرزِ عمل کا ذکر آ گیا ہے۔ وہاں اس کے متعلق صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مثلاً ایک موقع پر سخت مصیبت میں گرفتار ہیں تو کوئی شخص سکھنی صاحب کا پاٹھ کرنے کا مشورہ دیتا ہے مگر یہ مشورہ پسند نہیں آتا۔ "کیونکہ میں نے کبھی عبادت نہیں کی۔" اس کے بعد نہ تو اس بات یعنی عبادت نہ کرنے پر فخر و مباہات کا اظہار ہے نہ توجیہہ و معذرت کی کوشش۔ بس ایک حقیقت تھی جو ضمناً بیان کر دی گئی۔ کسی شخص کے ذاتی معاملات اور پبلک کیریکٹر کے درمیان یہ بہت ہی غیر نمایاں اور مبہم سی حدِ فاصل عام طور پر ہمارے صحافیوں کی نظر سے اوجھل رہتی ہے، مصنف نے ہمیشہ سے پیشِ نظر اور ملحوظِ خاطر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں ابتدا ہی میں کہہ چکا ہوں کہ میرا مقصد سردار دیوان سنگھ کا تعارف یا "ناقابلِ فراموش" کی دیباچہ نگاری نہیں۔ بعض باتیں جو میرے نزدیک اُن کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہیں اُن کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ "ناقابلِ فراموش" کے قارئین ان واقعات و تجربات کو کتابی صورت میں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اور دیوان سنگھ کی اس تصنیف کا دلی جوش اور مسرت سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

Marfat.com

دلچسپ، پُر کشش اور مُفید

(مسٹر گوپال متل ایڈیٹر رسالہ "تحریک" دہلی)

۱۹۲۴ء کے اواخر کی بات ہے میں ان دنوں اپنے وطن مالیر کوٹلے میں آٹھویں کا طالب علم تھا۔ ایک روز میں بھائی کی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ڈاک سے "ریاست" کا ایک پرچہ موصول ہوا میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو اس وقت تک ہاتھ سے نہیں چھوڑا جب تک یہ ختم نہ ہو گیا۔ آج ۳۳ سال بعد جب "ریاست" کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ کی کتاب "ناقابلِ فراموش" کو پڑھنا شروع کیا تو بھی ایسا ہی ہوا کہ اسے تمام و کمال پڑھے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھ سکا۔ اس سے صرف یہی پتہ نہیں چلتا کہ سردار دیوان سنگھ کے اندازِ تحریر میں ایک غیر معمولی کشش ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی کتابوں کی طرح ان کی نگارش میں کوئی ایسی بات ہے جس کی ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق پذیرائی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ۳۳ سال کی مدت میں میرے مزاج میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئی ہوں گی اور اس تمام مدت میں چونکہ میں نے لکھنے پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ اس لیے میرے علم اور معلومات کا دائرہ بھی وسیع ضرور ہوا ہو گا۔ کم سنی کے کچے جذبات کی جگہ مزاج میں تھوڑی بہت پختگی آ چکی ہے اور کچھ لوگ تو مجھ پر سنگین مزاجی کا الزام بھی لگاتے ہیں لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود سردار دیوان سنگھ کی تحریر میرے لیے مسلسل کشش کا باعث بنی رہی ہے یہ اور بات ہے کہ کشش کے اسباب بدلتے رہے ہیں پہلے جہاں ان کی بے خوفی، جرأت مندی اور ان کی تحریر کا جوش و خروش موجبِ کشش تھا وہاں اب ان کے اور ان کی تحریر کے بالکل مختلف اوصاف دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں مثلاً یہ کہ انہوں نے زندگی کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے اور اس کے بے شمار گوشوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے تجربات وسیع، متنوع اور رنگا رنگ ہیں جنہیں انہوں نے مکمل بے ریائی کے ساتھ بغیر کسی تصنّع کے قلم بند کر دیا ہے۔

آپ بیتی میں جو قدرتی کشش ہوتی ہے اسے بسا اوقات یہ بات زائل کر دیتی ہے کہ مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم و کاست بیان کرنے کی بجائے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے کسی مصنوعی اور مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کے حقیقی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں اور ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت سامنے آ جاتی ہے جو نہ دل کے لیے کشش رکھتی ہے نہ دماغ کے لیے ایک اور چیز جو آپ بیتی کی کشش کو زائل کرتی ہے یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے وقت حقیقی تاثرات کی بجائے ایسے خیالات قلم بند کرنے لگتا ہے جو مفروضوں کی چھلنی سے چھن کر نکلتے

Marfat.com

ہیں۔ سردار دیوان سنگھ کی کتاب اگر موجب کشش ہے تو اس کا باعث یہی ہے کہ وہ اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالتے اور اپنی زندگی کے تمام خط و خال بے ریائی کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔ یہ بات موجودہ دور میں مجھے ان کی کتاب کے علاوہ صرف مہاتما گاندھی کی خود نوشت سوانح حیات" سچائی کے ساتھ میرے تجربات" میں نظر آئی۔

ایک اخبار نویس کی حیثیت سے سردار دیوان سنگھ کی کامیابی مسلمات میں شامل ہے اور اس کے بیانات میں اگر وہ چاہتے تو انتہائی مبالغے سے کام لے سکتے تھے لیکن جہاں انہوں نے یہ بیان کر دیا ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کے لیے اہم ترین خبریں کن کن ذرائع سے حاصل کیں سو وہاں یہ بات بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا کہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے مینجنگ ڈائرکٹر مرحوم مسٹر کے سی رائے نے ان کی خبریں حاصل کرنے کے شوق سے فائدہ اٹھا کر انہیں کس طرح ایک دلچسپ مذاق کا ہدف بنایا۔ سردار دیوان سنگھ مسٹر رائے سے اکثر ملنے جاتے اور باتوں باتوں میں بہت راز کی خبریں معلوم کر کے ریاست میں شائع کر دیتے۔ ایک روز سردار دیوان سنگھ کی موجودگی میں مسٹر رائے نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے مخاطب ہو کر کہا "امریکہ سے جو اطلاع مہاراجہ اندور کی امریکن بیوی کے طلاق کے متعلق آئی ہے وہ فی الحال اخبارات کو نہ بھیجئے۔ دو چار روز بعد بھیجی جائے۔ سردار دیوان سنگھ نے اس "مصدقہ" خبر پر بھروسہ کرتے ہوئے "ریاست" میں جو دوسرے ہی روز شائع ہونا تھا۔ ایک نوٹ سپرد قلم کر دیا۔ اور یہ عقدہ مسٹر رائے سے دوبارہ ملنے کے بعد ہی کھلا کہ وہ ایک مذاق کا ہدف بن گئے ہیں جو ایک سازش کا نتیجہ تھا۔ سردار دیوان سنگھ اگر چاہتے تو اس واقعے کو نظر انداز کر دیتے لیکن انہوں نے خبریں حاصل کرنے کی مشکلات بیان کرتے وقت اپنی کامیابیوں کے ذکر کے ساتھ اس واقعے کو بھی بیان کر دیا۔

اخبار نویس کی حیثیت سے ان کے کیریکٹر کی بلندی کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ انہوں نے باز پرس کے ڈر سے اپنی خبروں کے مآخذ کو کبھی افشا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی صاف گوئی سے بڑے بڑوں کو برہم کیا لیکن اگر کبھی ادھر سے عتاب نازل ہوا تو اس کا وار انہوں نے اپنے سینے پر لیا اور ان لوگوں کے نام کبھی ظاہر نہیں کیے جن کے ذریعہ ان تک اطلاعیں پہنچی تھیں۔ مثلاً ایک مرتبہ مسٹر شیام لال نہرو نے انہیں باتوں باتوں میں یہ بتا دیا کہ پنڈت موتی لال نہرو نے بھوپال سے ایک قانونی مشورے کی فیس بیس ہزار روپے وصول کی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "قانونی مشورہ اور مقدمہ کیا ہے یہ تو بہانے ہیں۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ بھوپال میں کانگریس کے لوگ ایجی ٹیشن نہ کریں اور نہ چچا سے گہری دوستی ہو"۔ اس پر سردار دیوان سنگھ نے "ریاست" میں ایک نوٹ لکھا جس میں نواب بھوپال پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ پبلک کی آواز کو دبانے کے لیے ملک کے لیڈروں کو دعوتیں دیتے ہیں اور قانونی مشورے کے نام پر بیس بیس ہزار روپیہ نذر کیا جاتا ہے جسے رشوت قرار دیا جا سکتا ہے۔

نواب بھوپال نے پنڈت موتی لال نہرو کو بھڑکایا کہ آپ پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو برہم ہوئے، نوٹس دیا۔ مقدمے کی دھمکی دی لیکن سردار دیوان سنگھ نے کنایتہً بھی یہ ظاہر نہ کیا

Marfat.com

کہ بیس ہزار کے متعلق خبر انہیں پنڈت موتی لال نہرو کے سگے بھتیجے پنڈت شیام لال نہرو نے فراہم کی تھی
سردار دیوان سنگھ طوائفوں سے سخت متنفر ہیں اور انہیں گندگی کے ڈھیر سے تشبیہ دیتے ہیں
انہیں یہ بھی یقین ہے طوائف کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور ان کے دل میں اخلاص کا گزرنا ممکن ہے
لیکن جب ان طوائفوں کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو ان کے سامنے آتے ہیں جن سے مظلومیت برستی ہے
تو وہ ان کے بیان میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

سردار دیوان سنگھ ایک سیلف میڈ آدمی ہیں اور انہوں نے بہت ہی معمولی زندگی سے ترقی کے مراحل طے کئے ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ان کی غیر معمولی ذہانت جرأت اور بے خوفی کو دخل ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں ان کی محنتِ شاقہ کو بھی کچھ کم دخل نہیں جس سے اکثر ذہین لوگ محروم ہوتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل اور ناگوار سے ناگوار ماحول میں کام کر سکتے ہیں اور صلے سے بے نیاز ہو کر جس آدمی میں یہ وصف ہو۔ ناکامی اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

اس کتاب کی دلچسپی اور کشش شک و شبہ سے بالا ہے لیکن اس سے استفادہ ہر شخص اپنی بساط مطابق ہی کر سکے گا۔ اسے اگر سرسری پڑھا جائے تو بھی پڑھنے والے کو ایک اچھے سے اچھے ناول سے زیادہ لطف آ جائے گا اور اگر کوئی اسے گہری نظر سے پڑھے تو یہ بات بھی دائرۂ ممکنات سے باہر نہیں کہ اس کا مطالعہ اس کی زندگی کا رخ بدل دے۔ کم از کم میں نے سردار دیوان سنگھ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے میرے دل میں اخبار نویسی کی دھن ان کی تحریریں پڑھ کر پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی میں نے انہی سے سیکھی کہ افلاس اور مشکلات کو آدمی کے عزائم کے راستے میں مزاحم نہیں ہونا چاہیئے اور یہ بھی کہ ذہانت کا پودا محنتِ شاقہ کے بغیر بارآور نہیں ہوتا۔

Marfat.com

سچّا افسانہ

(جناب عرش ملسیانی ایڈیٹر "آجکل" دھلی)

"زمیندار" والے مولانا ظفر علی خاں، پیسہ اخبار والے شیخ محبوب عالم، اخبار عالم" والے لالہ گوپی ناتھ "دیش" کے ایڈیٹر لالہ دینا ناتھ اور "ہندوستان" والے لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا، پنجاب کے پرانے صحافیوں میں ایک خاص شہرت کے مالک ہوئے ہیں۔ انہیں کے ساتھ ساتھ اخبار نویسوں کی جو صف آراستہ تھی۔ اس کے پیشروؤں میں سردار دیوان سنگھ مفتون کا نام آتا ہے۔ سردار دیوان سنگھ کے اخبار "ریاست" کا مطالعہ میں کم و بیش اس زمانے سے کرتا ہوں جب یہ جاری ہوا تھا۔ میں نے اس کے انتہائی عروج کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور اس کج نہاد زمانے کی ناقدر شناسی بھی کہ آج یہ اخبار اس منزل میں ہے کہ اس کا مجاہد مدیر اسے بند کرنے کا اعلان کر چکا ہے۔

اس اخبار میں سردار دیوان سنگھ گاہ گاہ اپنے تجربے کی کہانیاں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے درج کیا کرتے تھے۔ ان کو کتابی صورت میں پہلے بھی شائع کیا گیا تھا اب دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اس زمانے میں جب کہ اردو کی اچھی کتابیں شائع نہیں ہوتیں اور شائع ہوتی ہیں تو "کس نمی پرسد" کی نذر ہو جاتی ہیں۔ یہ ضخیم کتاب اردو کے اس پرانے مجاہد کا کارنامۂ عظیم ہے۔ یہ کتاب کہنے کو چھوٹے چھوٹے چھوٹے واقعات کی تفصیلات کا مجموعہ ہے لیکن یہ ایک مسلسل تگ و دو اور جہد البقاء کا قصہ ہے زندگی کی گوناگوں روزمرّہ کے واقعات سے زندگی کے لیے سبق، جہدِ مسلسل اور ان سب کے علاوہ کردار کی بلندی ان قصوں میں نظر آتی ہے۔ یہ قصّے ہندوستان کے ایک عہد کی تاریخ ہیں کتنے مختلف النوع لوگ ہیں۔ جن سے سردار دیوان سنگھ زندگی میں دوچار ہوئے۔ امیر بھی ہیں اور وزیر بھی۔ رہنمایانِ قوم بھی اور رہروانِ طریقت بھی۔ مخلص قسم کے دوست اور جاں نثار، ہم نشیں بھی اور خفیہ پولیس کے افسر بھی۔ والیانِ ریاست بھی، قبروں کے مجاور بھی، رجعت پسند بھی اور انقلاب دوست بھی۔

آپ نے اس کتاب میں کسی تعصب آمیز تاثر سے کام نہیں لیا۔ آپ ایک محبِ وطن انسان ہیں صحافت و سیاست کی خاطر کئی بار جیل گئے ہیں لیکن جہاں دیانت و امانت کا تقاضا ہے۔ آپ نے اپنے ہم مذہبوں کو برا بھلا کہا ہے۔ انگریز دوستوں کی بحیثیت انسان تعریف کی ہے اور مسلمان احباب پر اپنی جان چھڑکی ہے۔ نصف صدی تک جس شخص نے بڑی بے پروائی سے قلمرانی کی ہو اس کا ایک حصہ کتابی صورت میں محفوظ ہو جائے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ والیانِ ریاست کے وہاں جو فتنہ آرائیاں ہوتی رہیں،

Marfat.com

عیاشی اور لاابالی پن کے جو جو مظاہرے ہوتے رہے۔ قانون شکنی کے جو دلخراش واقعات اور ننگِ انسانیت حادثات وقوع پذیر ہوتے رہے ان کی نقاب کشائی سردار صاحب نے جس ہمتِ مردانہ سے کی وہ ہندوستانی صحافت کا ایک اہم باب ہے۔

انہیں واقعات کے اجزاء اس کتاب کا موضوع ہیں اس سرگرم زندگی میں آپ نے ایسے تجربے حاصل کیے جو خود انہیں اب تک یاد ہیں اور جو شخص انہیں پڑھے گا اسے بھی یاد رہیں گے۔

مختصر افسانہ نویس اور ناول دونوں کا مزہ اس کتاب میں ملتا ہے۔ ہر واقعہ جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اس لیے ایک مختصر افسانہ ہے اور افسانہ بھی سچا۔ لیکن تمام واقعات ایک ہی آدمی کے گرد گھومتے ہیں اس لیے یہ کتاب ایک ناول کا مقام بھی رکھتی ہے۔

کتاب میں ادبیت ہے، تاریخ ہے۔ داستانِ عہدِ حاضر کے تمام عناصر ہیں دوا بیچنے والوں نے تو کتنی ہی دوائیں ایسی بنا ڈالیں جن سے ہر مرض کا علاج ہو لیکن صحافی یا ادیب نے ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی تھی جس سے ہر ذوق کی تسکین ہو۔

میرے ایک دوست ایک دن تشریف لائے۔ میز پر "ناقابلِ فراموش" کے مطبوعہ اوراق پڑے تھے جو دیباچہ لکھنے کے لیے میں نے سردار صاحب سے طلب کیے تھے۔ پہلے ہی صفحے پر عنوان تھا "طوائفوں سے نفرت" وہ لوکھلا اٹھے۔ کہنے لگے "یہ کون بدذوق ہے" میں نے کہا "یہ سردار دیوان سنگھ مفتوں ہیں"۔ انہوں نے کہا "یوں نہیں کہہ دیا ہوگا" مجھے ان کی خوش ذوقی پر پورا اعتماد ہے۔

Marfat.com

کام سے محبّت

ایڈیٹر" ریاست" کا وطن حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ ہے۔ یہ وہاں کے ایک کھنہ کھتری سکھ خاندان میں پیدا ہُوا۔ خاندان کے لوگ عام طور پر ملازمت پیشہ اور اچھے عہدوں پر ہیں اور بعض سرکاری خطاب یافتہ بھی ہیں۔ ایڈیٹر" ریاست" کے والد اپنے زمانہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ جو بنوں، میانوالی اور جہلم وغیرہ میں سرکاری ملازم رہے۔ ایڈیٹر" ریاست" کی عمر ایک ماہ دس روز کی تھی۔ جب والد کا انتقال ہو گیا اور یتیمی نصیب ہوئی۔ اس وقت گھر میں کافی روپیہ، زیورات، زمین اور مکانات تھے۔ کیونکہ والد نے اپنی کامیاب زندگی میں کافی روپیہ پیدا کیا تھا مگر والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور مکانات پر قبضہ کر لیا۔ اور بارہ سال تک بغیر کسی آمدنی کے ضروریاتِ زندگی اور بڑے بھائی اور چار بہنوں کی شادیوں پر زر صرف ہونے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایڈیٹر" ریاست" کی عمر جب بارہ سال کی تھی تو گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ایڈیٹر" ریاست" پانچ روپیہ ماہوار پر حافظ آباد میں ایک بزازی دکان پر ملازم ہُوا۔ کام یہ تھا کہ اندر سے کپڑے کے تھان لاکر خریداروں کو دکھائے جائیں۔ اس ملازمت کے دو واقعات مجھے یاد ہیں۔ جن کا میرے کیریکٹر پر بہت نمایاں اثر ہُوا۔ یہ دکان ہندو بزاز کی تھی، اور اس دکان پر ایک بوڑھا مسلمان درزی اور اس کا جوان بیٹا کام کرتے تھے۔ یہ باپ اور بیٹا حافظ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ایک روز چند دن کے لیے باپ کسی شادی میں شریک ہونے اپنے گاؤں گیا تو اپنی غیر حاضری کے دنوں کے لیے اپنے بیٹے کو چند کپڑے سپرد کر گیا۔ تاکہ وہ ان کو تیار کر رکھے۔ بوڑھا درزی جب واپس آیا اور اس نے بیٹے کے تیار کیے ہوئے کپڑوں کو دیکھا تو ان میں کسی بچہ کا سبز رنگ کی مخمل کا ایک کوٹ بھی تھا جس کو بیٹے نے بجائے سبز رنگ کے تاگے کے سفید تاگے سے سِیا تھا۔ اس غلطی کو دیکھ کر بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کے منہ پر زور سے تھپّڑ مارا اور کہا: کہ نالائق تو دیہات کے رہنے والے جاٹ کے لڑکے (جس کا کوٹ سِیا تھا) پر رحم نہ کرتا مگر اس مخمل پر تو رحم کرتا، جس کا ستیاناس کر دیا۔ چنانچہ بوڑھے باپ نے مخمل کے اس کوٹ کی سلائی کو کھولا۔ سفید تاگے نکالے اور سبز تاگے سے سِیا۔

اس واقعہ کا میری طبیعت پر ایسا اثر ہُوا کہ چاہے میں نے چھ روپے تنخواہ لی یا بارہ روپے یا دو سو روپے اور چاہے ملازمت کی یا خود اپنا کام کیا۔ تمام زندگی ہمیشہ کام کو دیکھ کر کام کیا نہ کہ اس کے معاوضہ کو۔ ہمیشہ بارہ گھنٹے سے اٹھارہ گھنٹے تک کام کیا۔ چاہے تنخواہ کچھ ہی ملتی تھی اور شاید ایک دفعہ بھی ایسا نہ ہُوا ہو گا کہ کسی کام کو کرتے ہوئے اس پر پوری توجہ نہ دی ہو۔ غرض میرے کیریکٹر پر اس واقعہ نے بہت بڑا اثر کیا۔

طوائفوں سے نفرت

بزازی کی دکان کی اس ملازمت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس دکان کے بالکل سامنے اور قریب طوائفیں

Marfat.com

رہتی تھیں اور یہ طوائفیں ادنیٰ اور ارزاں قسم کی میلی اور گندی تھیں۔ دکان پر آتے جاتے اور کام کرتے ہوئے ان طوائفوں کو دیکھتا کہ یہ کیوں کر چار چار اور آٹھ آٹھ آنے کے لیے اپنے ضمیر کو فروخت کرتی ہیں۔ کتنے گندے اور سڑے ہوئے لوگ آتے ہیں جن سے یہ بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ان کو بے وقوف سمجھ کر ان کے خلاف باتیں کرتی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر شرمناک بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ اس دوکان پر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان طوائفوں سے نفرت اور حقارت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اب کسی اچھی صاف اور خوش سلیقہ طوائف کا گانا تو سن سکتا ہوں اور موسیقی کی اچھی مجلس میں بھی بیٹھ سکتا ہوں جہاں کوئی بلند معیار طوائف گا رہی ہو مگر پیشہ ور عورتوں کے بازار یا محلہ میں سے موٹر میں گزرتے ہوئے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی کہ پاخانہ یا گندگی کے ڈھیر کے قریب سے گزرتے ہوئے اور اس کی وجہ بچپن کے وہ تاثرات ہیں جو پیشہ ور عورتوں کے حالات دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے۔

خودداری کا کیریکٹر

”ریاست“ جاری ہو چکا تھا اور دفتر ”ریاست“ پریڈ کے میدان کے قریب سڑک پر تھا۔ ایک روز ایڈیٹر ”رئیس ہند“ اچکن میں سونے کے بٹن لگائے تشریف لائے اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فرمایا کہ کرنل امریک سنگھ اے ڈی سی مہاراجہ پٹیالہ ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا ”اچھی بات ہے۔ مل لوں گا۔“ چنانچہ اگلے روز کرنل امریک سنگھ (جو چیمبر آف پرنسس کے دنوں میں مہاراجہ پٹیالہ کے ساتھ کنگز وے کے کیمپوں میں مقیم تھے) دفتر ”ریاست“ میں تشریف لائے اور آپ نے رسمی گفتگو کے بعد کہا کہ مجھے مہاراجہ پٹیالہ نے بھیجا ہے۔ مہاراجہ کو معلوم ہوا ہے کہ ایڈیٹر ”ریاست“ کا بطور ایک دوست مہاراجہ نابھہ پر بہت اثر ہے۔ مہاراجہ پٹیالہ کو مہاراجہ نابھہ کی گدی سے دست برداری کا بے حد افسوس ہے اور مہاراجہ پٹیالہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر ”ریاست“ مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ نابھہ کے درمیان صلح کی بات چیت کرے۔ ایڈیٹر ”ریاست“ نے جواب دیا کہ اگر صلح ہو جائے تو اس سے زیادہ بہتر کیا ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر ”ریاست“ رات کی گاڑی سے ڈیرہ دون گیا۔ مہاراجہ نابھہ سے ملا۔ کرنل سردار امریک سنگھ کا آنا اور مہاراجہ پٹیالہ کا پیغام بیان کیا اور کہا کہ مہاراجہ پٹیالہ معافی مانگنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ مہاراجہ نابھہ نے تمام واقعات سننے کے بعد جو الفاظ کہے وہ میرے کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں۔ وہ یہ تھے:

”یہ تو ممکن ہے کہ مہاراجہ نابھہ تنگ دستی، افلاس اور غربت کے باعث گداگری اختیار کرے۔ اس کے پاس نہ کھانے کے لیے کچھ ہو اور نہ رہنے کے لیے مکان۔ دن کو ڈیرہ دون کی سڑکیں کوٹ کر روٹی حاصل کرے اور رات کو گوردوارہ رام رائے (جو ڈیرہ دون میں ہے) کے برآمدے میں پڑ کر سو رہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی خودداری کو جواب دے کر وہ مہاراجہ پٹیالہ سے ہاتھ ملائے۔“

Marfat.com

اس جواب کو سن کر ایڈیٹر "ریاست" رات کو ڈیرہ دون سے سوار ہوا صبح دہلی پہنچا۔ کرنل امریک سنگھ منتظر تھے جن کو پیغام کا جواب من وعن سنا دیا گیا۔ اس جواب کا کرنل امریک سنگھ اور ایڈیٹر "ریاست" دونوں کو افسوس تھا مگر اس واقعہ کا میرے کیریکٹر پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد زندگی میں کم ہی ایسے واقعات ہیں جب خودداری کا جواب دے کر ایڈیٹر "ریاست" کبھی دشمن کے سامنے جھکا ہو۔ چنانچہ نواب بھوپال کے مقدمہ میں میرے اس کیریکٹر نے بہت بڑا پارٹ ادا کیا اور چھ برس کی مقدمہ بازی میں قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔

اعتماد کشی جرم ہے

پنجاب کے مارشل لاء کے بعد لاہور میں کانگریس کی طرف سے تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی۔ پنڈت موتی لعل نہرو اور پنڈت مالویہ جیسے بڑے بڑے لیڈروں کے علاوہ مہاتما گاندھی بھی تشریف لائے اور شہادتیں شروع ہوئیں۔ سردار سردول سنگھ کویشر شہادتیں جمع کر رہے تھے۔ خالصہ کالج کے ایک لڑکے نے سردار سردول سنگھ کو بتایا۔ کہ امرتسر کے واقعہ جلیانوالہ کے بعد جب خالصہ کالج کے طلباء نے ہڑتال کر دی اور غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لیے مجمع کی شکل اختیار کی تو اس شور کو سن کر مسٹر واون (انگریز پرنسپل) لڑکوں کے پاس آئے اور ان کو تسلی دیتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ہندوستانیوں کے خیر خواہ ہیں اور جنرل ڈائر نے گولی چلانے سے پہلے جب امرتسر کے تمام یورپینس کو جمع کر کے فائر کرنے کے متعلق رائے لی تھی تو میں (یعنی مسٹر واون) نے جنرل ڈائر سے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ اس اندسکریمینیٹ شوٹنگ (اندھا دھند گولی چلانے) کو میں پسند نہیں کرتا۔

سردار سردول سنگھ کویشر نے جب یہ سنا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ فوراً پنڈت مالویہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ مسٹر واون انگریز ہیں۔ انگریزوں کا کیریکٹر ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ اگر مسٹر واون کو تحقیقاتی کمیٹی میں طلب کیا جائے تو وہ یقیناً یہ کہہ دیں گے کہ وہ اس وقت بھی اس خونریزی کو اندھا دھند سمجھتے تھے اور ناجائز قرار دیتے تھے اور انہوں نے یہ الفاظ طلباء کے سامنے کہے تھے۔

سردار سردول سنگھ سے مسٹر واون کے الفاظ سن کر پنڈت مالویہ بھی بہت خوش ہوئے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ راقم الحروف (ایڈیٹر "ریاست" جو اس وقت سردار سردول سنگھ کے ساتھ بطور پریس کے نمائندے کے (کیونکہ اس زمانہ میں ایڈیٹر "ریاست" لاہور کے ایک اخبار میں کام کرتا تھا) امرتسر جائے اور مسٹر واون سے انٹرویو کر کے بیان لے اور وہ بیان اخبارات میں شائع کیا جائے تاکہ بطور شہادت کام میں لایا جا سکے۔

اس مشورہ کے بعد پنڈت مالویہ اور سردار سردول سنگھ مہاتما گاندھی کے پاس گئے۔ تمام واقعات بیان کیے اور چاہا کہ مہاتما گاندھی جی اس سکیم کے ساتھ متفق ہوں۔ پنڈت مالوی اور سردار سردول سنگھ کا بیان سن کر مہاتما گاندھی نے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے:

"مسٹر واون نے اگر پرائیویٹ طور پر لڑکوں سے یہ بات کہی تو یہ ایک قسم کا ان پر اعتماد کیا مسٹر واون

Marfat.com

کے اس اعتماد کے ساتھ ہمارا غداری کرنا اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا بُری بات ہے۔ اس لیے میں اس سکیم کے ساتھ متفق نہیں ہوں اور ہمیں کسی قیمت پر بھی مسٹر داون کے اس اعتماد کا ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے جو انہوں نے لڑکوں پر کیا۔"

مہاتما گاندھی کے یہ الفاظ سن کرنیڈت مالویہ اور سردار سردول سنگھ دونوں سُن ہو گئے اور کچھ کہہ نہ سکے۔ چنانچہ اس سکیم کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور مسٹر داون کے بیان لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اس واقعہ اور مہاتما گاندھی کے کیریکٹر کا راقم الحروف پر یہ اثر ہُوا کہ جب کسی نے راز کی بات کہی۔ اس کو ہمیشہ ایک امانت کے طور پر چھپائے رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ درجنوں مہارانیوں اور بیگمات نے اپنے شوہروں اور عزیزوں کے خلاف اطلاعات دیں اور خطوط لکھے۔ "ریاست" کے ناظرین اور نامہ نگاروں نے بھی ہمیشہ اطلاعات دیں۔ مگر ان خطوط اور اطلاعات کے ناجائز استعمال کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا اور اس مسئلہ پر سوچنے کو بھی ہمیشہ کمینہ پن سمجھا۔

محنت کی عادت

ریاست نابھہ کی ملازمت سے ایک سال پہلے ایڈیٹر "ریاست" اور خواجہ حسن نظامی دونوں نے مل کر دہلی سے ایک روزانہ اخبار "رعیت" جاری کیا۔ اخبار بہت اچھا تھا۔ اڑھائی سو روپیہ ایڈیٹر "ریاست" نے بطور حصہ دیئے اور فیصلہ ہُوا کہ باقی روپیہ خواجہ حسن نظامی لگائیں گے۔ ایڈیٹر "ریاست" اپنے کھانے کے لیے ایک روپیہ روز یعنی تیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ لے گا۔ خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کے اشتہار کا ایک صفحہ ہر روز مفت چھپے گا جس کی اجرت ادا نہ کی جائے گی۔ اس کے بعد اگر منافع ہو گا تو دونوں کا مساوی ہو گا۔ اور اگر نقصان ہو گا تو خواجہ حسن نظامی پورا کریں گے۔ یہ اخبار چند ماہ جاری رہا۔ جب خواجہ حسن نظامی کو اس میں چھ سو روپیہ کے قریب نقصان ہُوا۔ تو آپ نے اس کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ایڈیٹر "ریاست" کے لیے افسوسناک تھا۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ یہ اخبار زندہ رہے۔ لالہ شام لال کپور ایڈیٹر "گورو گھنٹال" کو لاہور تار دیا۔ وہ آئے۔ ان کے پاس بھی سرمایہ نہ تھا۔ وہ چند روز بھی نہ چلا سکے۔ پھر بھتیا شیخ احسان الحق صاحب نے اور بعد میں اس کو ملا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" نے لے لیا۔ واحدی صاحب کے پاس "رعیت" جانے کے بعد اس کا دفتر بھی واحدی صاحب کے مکان میں چلا گیا۔ ایڈیٹر "ریاست" اتنے مالکان کے بدلنے کے بعد بھی مسلسل محنت سے کام کرتا رہا۔ تاکہ اخبار کامیابی سے چل جائے۔

چنانچہ راقم الحروف واحدی صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں ہی (جہاں کہ دفتر تھا) رہتا۔ بازار سے کھانا منگا لیتا اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ ایک دن شام کو دفتر کے تمام لوگ چلے گئے مگر راقم الحروف کام کرتا رہا۔ کام کرتے کرتے رات کے دس بج گئے تو واحدی صاحب اتفاق سے اپنے رہائشی حصہ سے پیشاب کرنے کے لیے دفتر کے حصہ میں آئے۔ آپ نے دیکھا کہ میں اکیلا بیٹھا کام کر رہا ہوں۔ آپ نے

Marfat.com

دیکھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے پھر ایک بجے آپ کو پیشاب کی حاجت ہوئی اور تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ میں پھر میز پر بیٹھا کام کر رہا ہوں۔ چنانچہ آپ کمرہ کے اندر میری میز کے قریب آ گئے اور پوچھا کہ اس وقت تک کام کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کام موجود تھا۔ اس لیے کر رہا ہوں۔ کام باقی ہو تو اطمینان نہیں ہوتا۔ اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ واحدی صاحب میری باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔ آپ نے باتوں باتوں میں پوچھا۔ کہ اتنا زیادہ کام کیوں کرتے ہو۔ صبح سورج نکلنے ہی بیٹھ جاتے ہو اب رات کے ایک بجے تک کام کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ انسان کی کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سخت محنت کا عادی ہو اور اپنی زندگی میں بہت کام کرے۔ واحدی صاحب نے پھر سوال کیا کہ کامیاب زندگی کا معیار کیا ہے اور کامیاب زندگی کس کو سمجھتے ہو۔ میں نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ مجھے اور واحدی صاحب دونوں کو اب تک یاد ہے۔ میں نے کہا :

"میں کامیاب زندگی اس شخص کی سمجھتا ہوں۔ جب وہ مرے تو چند لاکھ روپیہ نقد چھوڑے اور چند ہزار آدمی اس کے جنازہ کے ساتھ ہوں"

زندگی کی کامیابی کا یہ معیار اب بھی میرے ذہن میں وہی ہے جو "ریاست" کے زمانہ میں تھا۔ مگر نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس میں کامیابی کہاں تک ہوئی۔ یا کب ہو گی۔ بہر حال اگر کوئی شخص کامیاب زندگی حاصل کرنا چاہے تو اس کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ وہ مالی اعتبار سے لاکھوں روپیہ پیدا کرے (چاہے اس روپیہ کو خیرات کر دے یا ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرے) اور جب مرے تو ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے اعتبار سے ہزار ہا لوگ اس کے جنازہ کے ساتھ ہوں۔

کامیابی کے لیے مضبوط قدم کی ضرورت

ایڈیٹر "ریاست" نے موگا سے مستعفی ہونے کے بعد مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس شروع کر دی۔ آنکھوں کے یعنی موتیابند کے کثرت کے ساتھ اوپریشن کیے۔ اپنا ہسپتال جاری کیا۔ جہاں انڈور بیمار بھی رہتے۔ اس زمانہ میں راقم الحروف کی آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان تھی۔ اخبارات اور رسائل کے پڑھنے اور نامور مضمون نگاروں، ایڈیٹروں اور شعراء سے ملنے اور ان سے خط و کتابت کا بہت شوق تھا۔ اردو زبان کا شاید کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب ایسی ہو گی جس کا باقاعدہ مطالعہ نہ کرتا۔ اس شوق میں ایک روز مضمون لکھا جو لاہور کے اردو ہفتہ وار "خالصہ اخبار" کو چھپنے کے لیے بھیجا۔ یہ مضمون ایک فرضی "ایشر سنگھ فیروزپوری" کے نام سے شائع ہوا۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا۔ کہ اگر مضمون اچھا نہ ہوا اور اپنے نام سے چھپا تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں نے دو تین اور مضامین اسی نام سے شائع کرنے کے لیے اس اخبار کو بھیجے جو شائع ہوئے۔ ان مضامین کے چھپنے کے بعد بھائی مول سنگھ مینجر "خالصہ اخبار" کا خط میرے پاس پہنچا جس میں پوچھا گیا تھا۔ کہ میں مانسہ میں کیا کام کرتا ہوں۔

Marfat.com

تعلیم کہاں تک ہے۔ آمدنی کتنی ہے کیا "خالصہ اخبار" کو ایڈٹ کرنے کے لیے لاہور آسکتا ہوں۔ اور اگر آسکتا ہوں تو کیا تنخواہ لوں گا۔

اس خط کو دیکھ کر مسرت اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے باعث میری حالت عجیب سی تھی خط کو بار بار پڑھتا تھا۔ غور سے دیکھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی اخبار کا ایڈیٹر بن سکوں اس خط کا میں نے جواب دیا۔ کہ میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہوں۔ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے تعلیم معمولی ہے مگر لٹریچر کا مطالعہ کافی ہے۔

میرے اس خط کا جواب سردار مول سنگھ نے یہ دیا کہ وہ ایڈیٹر کو زیادہ سے زیادہ ساٹھ روپیہ تنخواہ دے سکتے ہیں۔ اور چونکہ میری میڈیکل پریکٹس تین چار سو روپیہ ماہوار کی ہے اس لیے میرے اخبار میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس جواب کے بعد بھی میں کچھ بیتاب سا تھا اور رہ رہ کر خیال کرتا تھا کہ میں جرنلزم اختیار کروں شاید اس میں میڈیکل پریکٹس سے زیادہ کامیابی نصیب ہو چنانچہ میں نے اپنے ایک محترم خیر خواہ بھگت لکشمن سنگھ بی اے انسپکٹر آف سکولز فیروز پور جو کئی کتابوں کے مصنف تھے اور جن کو میرے فرضی نام سے بھیجے گئے ان مضامین کا علم تھا کہ میں نے لکھے ہیں، کو خط لکھا کہ "خالصہ اخبار" کے مالک مجھے ایڈیٹر مقرر کرنا چاہتے ہیں مگر تنخواہ صرف ساٹھ روپیہ ماہوار دیں گے۔ میری موجودہ آمدنی تین چار سو روپیہ ماہوار کے درمیان ہے میں اس اخبار میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ بھگت لکشمن سنگھ کا جو جواب آیا۔ اس کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور شاید میں زندگی بھر انہیں نہ بھول سکوں کیونکہ یہی الفاظ میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوئے۔ آپ نے لکھا:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے قلم میں غیر معمولی زور ہے۔ یہ غیر ممکن نہ ہو گا کہ تم بطور جرنلسٹ کامیاب ہو جاؤ۔ میری رائے میں جرنلزم اختیار کر کے دیکھنا چاہیئے کہ تم کس حد تک اس میں کامیاب ہوتے ہو"

اس خط کے پہنچنے کے بعد میں نے بھائی مول سنگھ کو خط لکھا کہ میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر ہی آنے کے لیے تیار ہوں۔ ان کا جواب آیا کہ آجاؤ۔ چنانچہ میں تین چار سو روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس کو چھوڑ کر ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ پر لاہور پہنچ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد میں نے سردار مول سنگھ سے یہ فیصلہ کیا کہ میرے لاہور آنے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے اور میں پوشیدہ طور پر اخبار کو ایڈٹ کروں گا۔ میرے اپنے آپ کو چھپانے کی غرض صرف یہ تھی کہ میں ناکامی سے خوف زدہ تھا اور سوچتا تھا کہ اگر ناکام ہوا تو دوست احباب مذاق اڑائیں گے

"خالصہ اخبار" کو میں شاید چار ماہ ایڈٹ کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اخبار میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ ہر شخص ایڈیٹوریل مضامین کا مداح تھا۔ مگر مجھے قانون سے ناواقفیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس چار ماہ میں مالک اخبار سردار ہربچن سنگھ رئیس لائل پور، اور سردار مول سنگھ پرنٹر پبلشر پر فوجداری مقدمات

Marfat.com

وار ہو گئے۔ ان مقدمات میں ایک مقدمہ سردار امر سنگھ ایڈیٹر "شیر پنجاب" نے بھی کیا۔ جن کے خلاف مضامین لکھے گئے تھے چنانچہ میں ان مقدمات کے باعث علیحدہ کر دیا گیا۔

میری زندگی کا یہ وقت بہت نازک تھا۔ میڈیکل پریکٹس چھوڑ چکا تھا۔ "خالصہ اخبار" سے علیحدہ کر دیا گیا۔ دوسری کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر میں ایک لمحہ کے لیے بھی مایوس نہ ہوا۔ اور لاہور میں ہی بہت تھوڑی تھوڑی تنخواہ پر کئی ایک اخبارات میں کام شروع کر دیا۔ لاہور کے اخبارات میں مجھے کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا ایک روز میں نے مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ صاحب شیدا ایڈیٹر "ہندوستان" سے پوچھا کہ اردو جرنلزم میں سب سے زیادہ لائق کون صاحب ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ وسیع معلومات کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ایڈیٹر سید جالب ایڈیٹر "ہمدم" ہیں۔ راقم الحروف نے سید جالب کو لکھنو خط لکھا کہ مجھے جرنلزم سیکھنے کا شوق ہے۔ اگر آپ اجازت دیں اور میرے اخراجات کے لیے معمولی تنخواہ مقرر کر دیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد میں نے پھر خط لکھا۔ پھر جواب ندارد۔ اس بے اعتنائی سے میں مایوس نہ ہوا۔ لکھنو کا ٹکٹ لیا اور لکھنو پہنچ گیا۔ لکھنو پہنچ کر سیدھا گوردوارہ گیا۔ وہاں بطور مسافر ایک کوٹھڑی میں سامان رکھا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے "ہمدم" کے دفتر میں پہنچا۔ "ہمدم" کا دفتر اس زمانہ میں حضرت گنج کی ایک بلڈنگ میں تھا جو "آئی اوڈی۔ ٹی" کے ساتھ مشترک تھی۔ کیونکہ دونوں اخبارات کے مالک غالباً مرحوم راجہ صاحب محمود آباد تھے۔ "ہمدم" کے دفتر میں پہنچ کر میں نے پنسل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا نام لکھا اور چپراسی کے ہاتھ سید جالب کے پاس بھیجا۔ سید صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ سامنے کھڑا ہوا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا:

"آپ کے دو خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ یہاں کوئی جگہ خالی نہیں۔ اب بھی یہی پوزیشن ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔"

میں نے عرض کیا۔ مجھے کام سیکھنے کا شوق ہے چونکہ میں نے سنا ہے کہ آپ اردو جرنلزم میں ایک لائق ترین شخصیت ہیں۔ اس غرض سے آیا ہوں۔ اگر آپ میرے لیے تیس روپے ماہوار بھی مقرر کر دیں تو میں اطمینان کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر کام کرنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔ سید جالب نے جواب دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا کہ بطور چپراسی مجھے رکھ لیجئے۔ میں چپراسی کے طور پر تمام دن کام کرونگا اور ساتھ ساتھ آپ سے جرنلزم سیکھوں گا۔ سید جالب میری اس درخواست پر حیران تھے مگر آپ نے فرمایا کہ افسوس کہ چپراسی کی بھی کوئی جگہ خالی نہیں۔ یہ جواب سن کر میں نے عرض کیا کیا آپ کو میرے مفت کام کرنے پر اعتراض ہے۔ سید جالب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ مفت کام لینے میں کیا انکار ہو سکتا ہے۔

چنانچہ راقم الحروف نے اگلے روز سے دفتر "ہمدم" میں بغیر تنخواہ کام شروع کر دیا۔ گزارہ کے لیے امین آباد پارک کے قریب ایک بنگالی کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔ دن بھر دفتر "ہمدم" میں کام کرتا۔ شام کو چھ بجے سے بارہ بجے رات تک اس کیمسٹ کے ہاں۔ رات کو گوردوارہ میں سوتا اور چونکہ قد، جسم اور شکل و صورت بارعب تھی۔ جب لکھنو کے بازاروں میں سے گزرتا تو پولیس کے ٹرافک

Marfat.com

کے سپاہی یہ سمجھ کر سیلوٹ کرتے کہ شاید کوئی نیا سب انسپکٹر یا انسپکٹر مقرر ہوا ہے۔ کیونکہ یو پی کی پولیس میں سکھ کافی تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ جس کو سلیوٹ کر رہے ہیں۔ سو ان بھر "ہمدم" کے دفتر میں بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتا ہے۔ رات کو بارہ بجے تک ایک کیمسٹ کے ہاں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہے۔ اور اس کی ذاتی آمدنی یا خرچ آٹھ آنہ روز سے زیادہ نہیں۔

"ہمدم" اور امین آباد پارک کے کیمسٹ کے ہاں کام کرتے کچھ عرصہ گزر گیا جون کا مہینہ تھا لکھنؤ کی گرمی صبح آٹھ بجے "ہمدم" کے دفتر میں پہنچا اور دو بجے دوپہر کو پیدل گوردوارہ واپس آتا۔ ایک روز گرمی زیادہ تھی۔ لو لگ گئی۔ تیز بخار ہو گیا۔ گوردوارہ کی ایک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ کہ گوردوارہ کے گرنتھی نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو۔ اپنا حسب نسب بتاؤ۔ تاکہ اگر مر جاؤ تو تمہارے گھر والوں کو اطلاع کی جائے۔

میں نے جواب دیا۔ حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) کا رہنے والا ہوں۔ گرنتھی نے پوچھا کہ کیا اسی حافظ آباد کے جہاں کے سردار گوربخش سنگھ سپرنٹنڈنٹ ٹیلی گراف رہنے والے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ اس گرنتھی نے بغیر میری اطلاع کے سردار گوربخش سنگھ کو خبر کی۔ سردار گوربخش سنگھ میرے قریبی چچازاد بھائی تھے اور لکھنؤ میں آٹھ نو سو روپیہ ماہوار کے قریب تنخواہ پاتے تھے۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میں گوردوارہ میں بیمار ہوں۔ گوردوارہ میں پہنچے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا کہ لکھنؤ کب آئے۔ میں نے جواب دیا۔ چند ماہ ہوئے۔ پوچھا کہ اطلاع کیوں نہ دی۔ میں نے جواب دیا۔ جب انسان اچھی حالت میں نہ ہو تو بلند پوزیشن کے رشتہ داروں کو اطلاع نہ دینا ہی مناسب ہے۔ سردار گوربخش سنگھ مجھے اپنی کوٹھی لے گئے۔ چند روز علاج کیا اور میں اچھا ہو کر واپس پنجاب آگیا۔

اوپر کے حالات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بلند جانا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خطروں کو لبیک کہنے کے لیے تیار رہیں مصائب و مشکلات سے گھبرائیں نہیں اور کوئی راہ ایسی نہ چھوڑیں جو ان کی بہتری کے لیے ہو۔ چاہے اس راہ کو اختیار کرتے ہوئے ان کے لیے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں۔

ایڈیٹر "ریاست" کو شکایت ہے کہ مرحوم سید جالب نے اس زمانہ میں اس کے ساتھ حوصلہ افزا سلوک نہ کیا۔ سید جالب ان واقعات کے بعد کئی برس زندہ رہے۔ جب کبھی اپنے وطن دہلی آتے تو دفتر "ریاست" میں بھی تشریف لایا کرتے اور لکھنؤ اور دہلی میں جب کبھی اپنے شاگردوں (جو درجنوں کی تعداد میں تھے) کا ذکر کرتے تو فرمایا کرتے کہ ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ کامیاب دیوان سنگھ ہے اور اس کامیابی پر آپ کو فخر ہے۔

خبریں حاصل کرنے میں مشکلات

روزانہ اخبارات کو ہر روز سینکڑوں تار نیوز ایجنسیوں سے مل جاتے ہیں اور ان خبروں کے لیے پبلک کو روزانہ اخبارات کے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہفتہ وار اخبارات میں چونکہ نیوز ایجنسیوں کے تار نہیں ہوتے اس لیے لازم ہے کہ یہ اپنے ناظرین کے لیے ایسی خبریں شائع کریں جو روزانہ اخبارات میں نہ ہوں تاکہ روزانہ اخبارات کے پڑھنے والے بھی ان ہفتہ وار اخبارات کو خریدیں۔ کیونکہ اگر روزانہ اخبارات سے کچھ مختلف

Marfat.com

مراد ہفتہ وار اخبارات میں نہ دیا جائے تو پھر کسی کو ہفتہ وار اخبارات کے خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس اصول کے تحت ہمیشہ یہ کوشش کی گئی کہ "ریاست" چونکہ ہفتہ وار ہے اس لیے اس میں ادبی، تاریخی اور تفریحی مواد کے علاوہ ایسی خبریں بھی دی جائیں جو روزانہ اخبارات میں نہ ہوں۔

ایک زمانہ میں "ریاست" کی خبروں کے لیے دوسرے اصحاب کے علاوہ مرحوم کے سی رائے منیجنگ ڈائرکٹر ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا اور مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد دیوان دتیا دو بہت بڑے ذرائع تھے۔ راقم الحروف کے مرحوم مسٹر رائے کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایڈیٹر "ریاست" ہر دوسرے تیسرے روز شام کو مسٹر رائے سے ملنے کے لیے آپ کی کوٹھی (جو انڈر ہل لین پر تھی) جاتا اور مسٹر رائے بھی ہفتہ میں ایک دو بار اپنی کوٹھی سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے دفتر جاتے ہوئے دفتر "ریاست" میں تشریف لاتے۔ مسٹر رائے اردو نہ جانتے تھے۔ اس لیے ان کو کچھ معلوم نہ ہوتا کہ "ریاست" میں کیا کچھ چھپا ہے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" مسٹر رائے سے ملتے وقت باتوں باتوں میں ریاستوں اور گورنمنٹ ہند کے متعلق ایسی خبریں حاصل کر لیتا جن کو وہ اپنی ایجنسی کے ذریعہ روزانہ اخبارات کو بھیجنا مناسب نہ سمجھتے اور یہ خبریں "ریاست" کے نوٹوں میں تنقید کے ساتھ شائع کر دی جاتیں۔ مرحوم مسٹر رائے کا اثر گورنمنٹ ہند پر بہت زیادہ تھا۔ کوئی ممبر گورنمنٹ یا سیکرٹری ایسا نہ تھا جو سیاسی امور میں مسٹر رائے کو گورو نہ سمجھتا ہو۔ ہر شخص عزت کرتا تھا۔ وائسرائے ہاؤس میں جب کوئی مشکل پیش آتی تو مسٹر رائے کو مشورہ کے لیے طلب کیا جاتا اور بعض دن تو ایسے بھی ہوتے کہ جب مسٹر رائے مشورہ کے لیے وائسرائے سے کئی کئی بار ملتے۔ چنانچہ اس راز کا آج مسٹر رائے کے انتقال کے بعد انکشاف کیا جاتا ہے کہ مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کے سلسلہ میں مسٹر رائے آٹھ دس بار وائسرائے سے ملے اور اس مقدمہ میں نواب بھوپال کے مقابلہ میں جو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس میں کافی حصہ مرحوم مسٹر رائے کے اثر اور ان کی کوششوں کا تھا۔

مسٹر رائے کی ملاقاتوں اور دوستی سے "ریاست" کے لیے خبریں حاصل کرتے ایک طویل عرصہ گزر گیا کئی شخصوں نے مسٹر رائے سے شکایت کی کہ دیوان سنگھ آپ سے خبریں حاصل کر کے "ریاست" میں شائع کرتا ہے۔ مسٹر رائے نے نہ صرف یہ کہ ان شکایتوں کی کبھی کوئی پرواہ نہ کی۔ بلکہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کے بہت معترف تھے اور اس کو صحیح معنی میں جرنلسٹ سمجھتے تھے کہ یہ باتوں باتوں میں خبریں حاصل کر لیتا ہے چنانچہ ایک روز مسٹر رائے کو مذاق سوجھا۔ ایڈیٹر "ریاست" جب آپ سے ملنے کے لیے گیا تو آپ نے اپنے ایک اسسٹنٹ (مجھے ٹھیک یاد نہیں غالباً مسٹر سری کرشن تھے) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"امریکہ سے جو اطلاع مہاراجہ اندور کی امریکن بیوی کی طلاق کے متعلق آئی ہے وہ فی الحال اخبارات کو نہ بھیجئے دو چار روز بعد بھیجی جائے۔"

اس ہدایت کو دیتے ہوئے مسٹر رائے نے ایڈیٹر "ریاست" کی طرف دیکھا تک نہیں تاکہ میں اس مذاق کو تاڑ نہ جاؤں۔ ملاقات کے بعد میں دفتر "ریاست" پہنچا۔ اگلے روز اخبار شائع ہونا تھا۔ اس "اہم خبر" کے متعلق فوراً نوٹ لکھا:

Marfat.com

"ریاست" کا پرچہ چھپنے کے بعد دوسرے روز ایڈیٹر "ریاست" مسٹر رائے سے ملنے کے لیے گیا تو اس سے پہلے مسٹر رائے کو وہ پرچہ ان کے اسسٹنٹ دکھا چکے تھے۔ بہت قہقہہ پڑا۔ چنانچہ ایڈیٹر "ریاست" کو بتایا گیا کہ خبر ایک سازش کا نتیجہ تھی تاکہ مذاق اڑایا جائے۔ کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" مسٹر رائے سے ملتے وقت باتوں باتوں میں ہمیشہ خبریں حاصل کر لیتا ہے۔

مسٹر رائے جب تک زندہ رہے ان کے ذریعہ "ریاست" کے لیے کافی اور بہت اچھا خبروں کا مواد ملتا رہا۔ آپ ہر جرنلسٹ کے لیے مفید تھے کوئی دن ایسا نہ جاتا جب ان کے گھر پر چائے یا ڈنر میں چند جرنلسٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے چند بڑے حکام شامل نہ ہوتے ہوں۔ کیا پُرلطف زمانہ تھا۔ آہ! دہلی کے جرنلسٹ مرحوم مسٹر رائے کے اخلاص، مہربانی، شفقت اور امداد سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے اور دہلی کے جرنلسٹوں کا حلقہ آپ کی موت سے اب تک ایک یتیمی محسوس کرتا ہے۔

"ریاست" کے لیے خبریں حاصل کرنے کے سلسلہ میں بہت سے واقعات بیحد دلچسپ ہیں۔ جگہ کم ہونے کے باعث آج یہاں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

مرحوم قاضی سر عزیز الدّین احمد وزیر اعظم دتیا ایڈیٹر "ریاست" پر اس طرح مہربانی فرماتے جیسے بزرگ اپنے عزیزوں پر۔ آپ مہینہ میں ایک آدھ بار دہلی ضرور آتے۔ آپ کا اثر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بہت تھا ہر انگریز افسر آپ کو بزرگ اور خیرخواہ سمجھتا اور درجنوں والیانِ ریاست آپ سے سفارشیں کراتے۔ آپ جب بھی دہلی تشریف لاتے سٹیشن پر اُترتے ہی ریلوے انکوائری آفس سے ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلیفون کرتے کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔ قاضی صاحب سے ملنے کا بہترین وقت صبح پانچ بجے سے سات بجے تک تھا آپ علی الصبح چار بجے بیدار ہوتے۔ اس وقت ہی اُن کے خاص خاص دوست ملنے کے لیے پہنچ جاتے باتیں کرنے میں دانت صاف کرتے۔ حجامت بنواتے (قاضی صاحب مرحوم بہت وضعدار بزرگ تھے دہلی میں آپ کی حجامت کے لیے سالہا سال سے وہی حجّام آتا جس نے کنگ جارج۔ کنگ ایڈورڈ درجنوں وائسرائے، کمانڈر انچیفوں ممبرانِ انتظامیہ کونسل اور کنگ حبیب اللّٰہ آف افغانستان وغیرہ کی حجامت بنائی تھی۔ مجھے یاد ہے اس حجّام کو قاضی صاحب ہر روز حجامت بنوانے کے بعد پانچ روپے دیا کرتے) منہ ہاتھ دھوتے، خطوط لکھواتے اور دوسرے کام کرتے۔ ایڈیٹر "ریاست" کا معمول تھا۔ کہ جب تک قاضی صاحب دہلی میں قیام کرتے صبح پانچ بجے ان کے کمرہ میں سیسل ہوٹل پہنچ جاتا اور سات بجے تک وہاں رہتا۔ پھر شام کو کبھی کبھی پانچ چھ بجے اپنی کار میں قاضی صاحب کو سیر کے لیے نئی دہلی وغیرہ لے جاتا۔ صبح کے دو گھنٹہ میں قاضی صاحب اپنے پچھلے دن کی تمام مصروفیات اور والیانِ ریاست و پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے حالات بیان کرتے رہتے۔ جو "ریاست" کے کئی صفحوں کے لیے کافی مواد ہوتا۔

ایک دن قاضی صاحب نے فرمایا کہ آپ ڈپٹی سیکرٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند کے ہاں چائے پر گئے تھے تو باتوں باتوں میں ڈپٹی سیکرٹری نے بتایا۔ کہ نواب بھوپال جب ولایت گئے تو نواب صاحب نے بطور چانسلر والیانِ ریاست وزیر ہند سر سیمویل ہور سے درخواست کی۔ کہ اخبار "ریاست" سے والیانِ ریاست

Marfat.com

بہت تنگ ہیں۔ اگر معمولی قانون اخبار "ریاست" کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لیے کافی نہیں تو وائسرائے ایک آرڈی نینس کے ذریعہ ہی اس اخبار کو بند کردیں۔ سر سیمویل ہورنے وائسرائے کو لکھا کہ نواب بھوپال کی یہ خواہش ہے مگر گورنمنٹ ہند نے اس کے خلاف رائے دی اور وزیر ہند کو لکھا کہ نواب بھوپال اور ایڈیٹر "ریاست" کے ذاتی جھگڑے ہیں گورنمنٹ کو ان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے اس واقعہ کو کہ نواب بھوپال نے وزیر ہند سے کیا کہا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا "ریاست" میں شائع کردیا۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ بھوپال کے حلقہ میں ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ مرحوم کرنل امیر احمد ملٹری سیکرٹری نواب بھوپال دہلی آئے اور سر چارلس واٹسن پولیٹیکل سیکرٹری سے ملے۔ اس راز کی خبر کے شائع ہونے کے خلاف سخت پروٹسٹ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ ہند نے دہلی گورنمنٹ کو لکھا کہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف آفیشل سیکرٹ ایکٹ (قانون رازداری) کے ماتحت مقدمہ چلایا جائے۔ اس زمانہ میں دہلی کے چیف کمشنر سر جان تھامپسن تھے۔ آپ پانچ سال تک پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند رہ چکے تھے۔ اور تمام والیان ریاست کے اعمال سے اچھی طرح واقف ہونے کے ساتھ "ریاست" کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ آپ نے گورنمنٹ ہند کو جواب دیا کہ یہ اتنا اہم معاملہ نہیں کہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ صرف تنبیہ کافی ہوگی۔ چنانچہ تنبیہ یعنی وارننگ کے لیے آپ نے ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی۔ ڈپٹی کمشنر کا حکم ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پہنچا۔ کہ فلاں تاریخ اور فلاں وقت ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر پہنچو۔ ایڈیٹر "ریاست" جب وہاں گیا تو ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ یہ خبر غلط ہے اس لیے آپ کو وارننگ دی جاتی ہے کہ آئندہ ایسی خبریں شائع نہ کرو۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جواب دیا کہ خبر تو بالکل درست ہے ہاں وارننگ دینا آپ کا فرض ہے چنانچہ اس وارننگ سے اس مقدمہ کا خاتمہ ہوا۔

ان اوپر کے دو واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک جرنلسٹ کے لیے خبریں حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔ کوئی خبر حاصل کی جائے تو اس کو شائع نہ کرنا اور صبر سے اس کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا ایک اخبار نویس کے لیے کتنا تکلیف کا باعث ہے اور خبریں چھپنے کے بعد کیونکر مقدمات دائر کیے جاتے ہیں۔

کام کرو روپیہ کی کمی نہیں

بعض لیڈر اور اخبار نویس زندگی بھر روتے رہے اور پبلک پر قدر ناشناسی کا الزام لگا کر ہمیشہ ہی چلاتے رہے کہ روپیہ نہیں کام کیوں کر کریں مگر راقم الحروف کا صرف اپنی ذات کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے تمام لیڈروں اور اخبار نویسوں کے متعلق بھی یہ تجربہ ہے کہ اگر اخلاص اور ایمانداری کے ساتھ کام کیا جائے تو پبلک روپیہ کی تھیلیاں اور کرنسی نوٹوں کے بنڈل لے کر کام کرنے والوں سے درخواستیں کرتی ہے کہ قبول کرلو۔ اور اگر کوئی لیڈر یا اخبار نویس خود غرض ہے تو وہ روپیہ کے لیے لوگوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے مگر اس کو روٹی کا ایک ٹکڑا نصیب نہیں ہوتا۔ آپ دیکھیے کیا مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر جناح، ماسٹر تارا سنگھ یا دوسرے مخلص کام کرنے والوں کو پبلک کام کے لیے کبھی بھی روپیہ کی کمی ہوئی۔ اور اگر کبھی انہوں نے ہاتھ پھیلایا

Marfat.com

توکیا لاکھوں اورکروڑوں روپیہ ان کے پاس نہیں پہنچ گیا۔ ان لیڈروں کو بھی چھوڑیئے۔ مولانا ظفر علی خان جیسے اخبار نویسوں کو شروع شروع میں پبلک نے کتنا روپیہ ضمانتوں کے لیے دیا۔ ہمارے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کام کرنے والے لوگ اپنی ذاتی اغراض سے بلند رہ کر اخلاص کے ساتھ پبلک کا کام کریں تو ان کو روپیہ کی کبھی بھی کمی نہیں ہوتی۔ اور اگر مقصد پبلک روپیہ سے ذاتی جائیدادیں بنانا ہو تو پھر پبلک سے روپیہ کی توقع کرنا بے انصافی ہے۔ پبلک روپیہ کیوں دے۔

"ریاست" جب جاری کیا گیا تو ایڈیٹر "ریاست" کے پاس کل سرمایہ ڈیڑھ ہزار روپیہ تھا اور یہ ڈیڑھ ہزار روپیہ مرحوم سردار کیسر سنگھ کلسی ٹھیکیدار کی معرفت انبالہ چھاؤنی کے ایک بنیئے کے پاس زیور رکھ کر قرض لیا گیا تھا۔ یہ پندرہ سو روپیہ تو غالباً تین ماہ کے اندر صرف ہو گیا۔ اس کے بعد درجنوں بار مالی پریشانیاں پیش آئیں اور ان پریشانیوں کی وجہ روپے کو بیدردی کے ساتھ صرف کرنا تھا کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" اپنی فطرت سے مجبور ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ "ریاست" کو آج تک کبھی نہ روپیہ کی کمی محسوس ہوئی اور نہ روپیہ دینے والے قدردانوں کی۔

کئی برس کی بات ہے "ریاست" کو جاری ہوئے شاید چار ماہ ہوئے ہوں گے۔ دفتر "ریاست" جامع مسجد کے بالکل سامنے مچھلی والاں بازار کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک بارعب جسم مسلمان سوٹ پہنے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ دو ملازم بھی تھے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے سمجھا کہ شاید پولیس کے کوئی افسر ہیں اور وارنٹ لے کر آئے ہیں۔ آپ نے آتے ہی پوچھا کہ سردار دیوان سنگھ کہاں ہیں۔ راقم الحروف نے جواب دیا۔ فرمایئے میں ہی دیوان سنگھ ہوں۔ میرے پاس کاتب اور دفتر کے سٹاف کے دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا علیٰحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ دفتر کا ایک ہی بڑا کمرہ تھا۔ میں ان کو برآمدہ میں لے گیا۔ وہاں ہم کھڑے تھے کہ آپ نے اپنے جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر مجھے دیا اور کہا:

"میں آپ کے اخبار کا ایک معترف ہوں۔ یہ لفافہ آپ کے اخبار کی امداد کے لیے ہے۔"

میں نے پوچھا آپ کون صاحب ہیں اور دہلی کیسے تشریف لائے ہیں۔ آپ نے بتانے سے انکار کر دیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد معلوم ہوا کہ آپ یوپی کے ایک خان بہادر اور ڈپٹی کلکٹر پنشنر تھے۔

ایڈیٹر اور "ریاست" پر نوٹوں کا مقدمہ چل رہا تھا۔ لاہور سے ایک خط پہنچا جو ایک مسلمان نوجوان کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر روپے کی ضرورت ہے تو لکھو کتنا روپیہ چاہیئے۔ میرا خیال ہے اس زمانہ میں تو میں نے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے بعد جب "ریاست" کو دوبارہ جاری کرنے کا انتظام ہو رہا تھا اور بکھرے ہوئے کاغذات درست کر رہا تھا۔ تو یہ خط نظر سے گزرا۔ ان کو لکھا کہ آپ کون صاحب ہیں۔ اور آپ کے لکھنے کا مقصد کیا تھا تو معلوم ہوا۔ کہ آپ کا نام شیخ محمد عمر ہے۔ لاہور میں چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں اور "ریاست" کے پرانے معترف ہیں۔ چنانچہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ "ریاست" پھر جاری ہونے والا ہے تو آپ نے امپیریل بنک کا ایک ڈرافٹ بھیجا جو معقول رقم کا تھا۔ میں ان صاحب سے آج تک نہ کبھی ملا ہوں اور نہ ان کو جانتا ہوں۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ یہ خود ان کی والدہ اور ان کے گھر کے دوسرے لوگ "ریاست" کے معترف ہیں۔

Marfat.com

نوٹوں کا مقدمہ چل رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر ایک دوست ملے انہوں نے فرمایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فلاں بڑے افسر جو خطاب یافتہ سر ہیں، ملنا چاہتے ہیں میں نے پوچھا کیا کام ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کام کا تو علم نہیں ملنا چاہتے ہیں۔ میں دوسرے یا تیسرے روز ان صاحب سے ملنے گیا۔ مقدمہ کے حالات پوچھتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ جب چلنے لگا تو آپ نے ایک بند لفافہ دیا اور کہا۔ کہ مقدمہ کے باعث روپیہ بہت خرچ ہو رہا ہو گا۔ یہ دوستانہ ہدیہ ہے۔ میں نے بار بار انکار کیا۔ آپ نہ ملنے۔ آخر آپ نے کہا کہ اگر نہ لوگے تو بہت تکلیف ہو گی۔ یہ کہتے ہوئے لفافہ آپ نے میرے کوٹ کی جیب میں زبردستی ڈال دیا۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں جیل سے رہا ہو کر آیا اور اخبار جاری کرنے کی کوشش میں تھا۔ تو دریا گنج ایک جرنلسٹ دوست سے ملنے گیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور جب چلنے لگا تو آپ نے جو الفاظ کہے ان کو میں شاید آئندہ زندگی میں کبھی بھی بھول نہ سکوں گا۔ آپ نے فرمایا،

"پچھلے زمانہ میں ایک بہت بڑا یگیہ ہُوا۔ جس میں لاکھوں یا کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ ایک کوّا اپنی چونچ میں ایک چاول لے آیا اور اس یگیہ میں ڈال دیا تاکہ وہ یگیہ کی خدمت اور سعادت سے محروم نہ رہ جائے "ریاست" کا دوبارہ جاری ہونا بھی ایک یگیہ ہے اس لیے میری درخواست ہے کہ اس کے لیے یہ رقم قبول کر لیجئے۔"

خلوص و محبت سے بھرے ہوئے ان الفاظ کو سن کر مجھ پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت سی طاری ہو گئی۔ میں نے کہا کہ ان الفاظ کی قیمت ... روپیہ سے بھی زیادہ ہے۔ میں روپیہ نہیں لیتا۔ آپ نے بار بار زور دیا اور میں انکار کرتا ہُوا چلا آیا۔ پھر بھی باز نہ آئے اور آپ نے اپنے دفتر کے ایک آدمی کے ہاتھ چیک بھجوا دیا۔

میری زندگی میں اس طرح کے دو چار دس بیس نہیں سینکڑوں واقعات ہیں کہ دوستوں اور معترفین نے چاہے ان سے کبھی ملا ہوں یا نہیں فراخدلی کے ساتھ "ریاست" کی امداد کی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب جیل سے باہر آیا تو خیال تھا کہ اخبار کو دوبارہ جاری کرنے کے لیے روپیہ کی ضرورت ہو گی اور اس روپیہ کے لیے اپنے وطن کی ایک زمین کو فروخت کر دوں گا۔ اس زمین کا ابھی سودا ہی ہو رہا تھا۔ فروخت نہیں ہوئی تھی مگر اخبار کی اڑھائی ہزار روپیہ کی ضمانت بھی داخل کر دی گئی۔ اخبار بھی جاری ہو گیا اور کام بھی چل نکلا۔

میرے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ پبلک کا کام کرنے والے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کو کام کرنے کے لیے روپیہ نہیں ملتا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور ان میں اخلاص اور ایمان داری کی کمی ہے۔ پبلک آواز پبلک کام کرنے والوں کے ایمان اور اخلاص کا سب سے بڑا تھرما میٹر ہے اور کام کرنے والوں کے ایمان کا پتہ پبلک آواز سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پبلک آواز کبھی غلط نہیں ہوتی۔ کام کرنیوالوں کا جیسا اعمالنامہ ہو گا ویسی ہی ان کے متعلق پبلک آواز اور شہرت ہو گی۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی میں کبھی کسی شخص سے یہ نہیں کہا کہ وہ نیک ہیں مگر کیا دنیا میں ایک شخص بھی ایسا ہے جو ہزار اختلافات کے باوجود آپ کو نیک نہ سمجھے برخلاف اس کے خواجہ حسن نظامی اپنے اخبار "منادی" میں دن رات اپنی تعریفیں کرتے تھے۔ مگر کیا ایک شخص بھی آپ کو ایسا ملے گا جو آپ کو سیاسی چار سو بیس اور مذہبی فراڈ نہ سمجھتا ہو یعنی دنیا

Marfat.com

پہلے ضبط کرلیں ہیں اس مقصد کے لیے ہی شملہ سے آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے رائے بہادر نے اپنے جیب سے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کہا کہ یہ روپیہ آپ کے اخراجات کے لیے ہے کیونکہ شاید کچھ لوگوں کو روپیہ دینا پڑے اور شاید آپ کو کہیں جانے آنے کی بھی ضرورت ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ روپیہ کتنا تھا۔ پانچ ہزار تھا۔ سات ہزار یا دس ہزار۔ یہ گڈی نصف اور ایک انچ کے درمیان موٹائی میں تھی۔

میں نے رائے بہادر سے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا پیڈ انفارمر ہوں۔ اور آپ مجھے اس قدر ذلیل اور کمینہ سمجھتے ہیں۔ کہ میں آپ سے روپیہ لے کر مہاراجہ بھرت پور اور دوسرے دوستوں کے ساتھ غداری کروں گا۔ اور آپ کی سی آئی ڈی کی مخبری کی خدمات انجام دوں گا۔ رائے بہادر نے نوٹوں کی وہ گڈی میرے کوٹ (مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اس زمانہ میں میں نے کھدر کے سوٹ سلوائے تھے اور وہ کوٹ کھدر کا تھا) میں ڈالنے کی کوشش کی اور کہا "تم بے وقوف ہو۔ گورنمنٹ کافی روپیہ لیڈروں اور اخبارات کو دیتی ہے اس میں کوئی ہرج نہیں۔"

رائے بہادر کو میں نے جواب دیا۔ اگر لیڈر اس قدر کمینہ ہوں تو ہوں مگر میں اس قدر کمینہ نہیں۔

رائے بہادر میرے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ آپ نے پھر آگے بڑھ کر نوٹوں کی وہ گڈی میری جیب میں ڈالنے کی کوشش کی تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے میں نے نیم غصہ اور نیم سنجیدگی کی حالت میں رائے بہادر سے کہا: "رائے صاحب! آپ اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے مگر میں سمجھتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اگر کوئی شخص اخبار نکالتے ہوئے یا پبلک ورکر ہوتے ہوئے گورنمنٹ سے روپیہ لے کر مخبری کرتا ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کو چاوڑی بازار میں بٹھا کر اس سے پیشہ کرائے اور روپیہ حاصل کرے۔" رائے بہادر میرے ان الفاظ کو سن کر سکتہ میں رہ گئے۔ ان کا ہاتھ میرے جیب کی بجائے مع نوٹوں کے اپنے جیب میں چلا گیا۔ اور ہم پھر واپس ڈرائنگ روم میں چلے آئے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر رائے بہادر نے کھسیانہ پن سے ایک بار پھر کہا کہ تم کوشش کرنا کہ یہ اطلاعیں حاصل ہو سکیں۔ میں نے پھر جواب دیا۔ کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ پھر رائے بہادر نے ادھر ادھر کی دوسری رسمی باتیں شروع کر دیں اور چند منٹ کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

سی آئی ڈی اور پولیس کے چھوٹے اور ادنیٰ لوگ تو اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے اپنے افسروں کو بہت جھوٹی اور غلط رپورٹیں دیتے ہیں مگر بڑے افسر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بڑے افسروں کے پاس جھوٹی رپورٹیں نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر جھوٹے ثابت ہوئے تو ان کے لیے ندامت کا باعث ہوگا۔ رائے بہادر نے وہ تمام بات چیت جو ان کے اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان ہوئی تھی من وعن اپنے افسر سر ڈیوڈ پیٹری ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو (جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان کی سی آئی ڈی کے اعلیٰ ترین افسر اور اپنی دیانت داری اور قابلیت کے باعث بعد میں پریذیڈنٹ فیڈرل پبلک سروس کمیشن مقرر ہوئے) کو پہنچا دی۔

گرمیوں کا موسم ختم ہوا۔ سردیاں شروع تھیں اور گورنمنٹ آف انڈیا شملہ سے دہلی آرہی تھی۔ ایک روز

Marfat.com

شام کو ایک بہت لمبے قد کے مضبوط مسلمان سوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے دفتر ریاست میں تشریف لائے۔ میں اوپر اپنے ذاتی دفتر کے کمرہ میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آپ نے چپراسی سے پوچھا کہ دیوان سنگھ کہاں ہیں۔ چپراسی نے جواب دیا۔ اوپر۔ آپ بے تکلف اوپر میرے ذاتی دفتر کے کمرہ میں چلے آئے۔ میں ان کے خیر مقدم کے لیے کھڑا ہو گیا اور ساتھ والے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی آپ نے بے تکلفی کے انداز میں کہا: "ارے بھائی! چائے منگاؤ۔" میں نے بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چپراسی آیا اس سے کہا باورچی کو بھیجو۔ اس زمانہ میں میرے پاس گوا کا رہنے والا باورچی کریلو تھا۔ کریلو سے میں نے کہا کہ چائے لاؤ۔ مگر دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ یہ کون صاحب ہیں۔ شاید پہلے کبھی ان سے مل چکا ہوں۔ کس ریاست کے وزیر ہیں۔ کہاں ملا ہوں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے خود ہی مسکرا کر کہا: "شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا: جی ہاں! مجھے یاد نہیں پڑتا۔ جناب سے نیاز کہاں حاصل ہوا تھا۔ آپ نے ذرا زیادہ مسکراتے ہوئے فرمایا: "میں تصدق حسین ڈپٹی ڈائرکٹر انٹیلی جنس بیورو ہوں۔ اور آپ کے ہم وطن رائے بہادر کے ساتھ کام کرتا ہوں۔" میں نے کہا "بہت مہربانی فرمائی۔ آپ کے نام سے تو واقف تھا۔ رائے بہادر سے بھی ذکر آیا مگر آپ سے نیاز حاصل کرنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ خان بہادر تصدق حسین نے جواب میں فرمایا: "میرے اور سر ڈیوڈ پیٹری کے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ رائے بہادر نے اپنی رپورٹ میں وہ سب کچھ لکھ دیا تھا۔ جو آپ کے اور ان کے درمیان بات ہوئی۔ ہم لوگ آپ کے کیریکٹر کے بہت مداح ہیں اور اسی لیے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ یہ افسوسناک واقعہ ہے کہ ہندوستان کے لیڈروں اور اخبار نویسوں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جن کا کوئی کیریکٹر نہیں۔ جو بہت تھوڑی رقم سے خریدے جا سکتے ہیں اور ان میں بعض ممبران اسمبلی بھی ہیں۔ یہ لوگ گو ہمارے لیے مفید ہوتے ہیں مگر کیریکٹرلیس ہونے کے باعث ہمارے دل میں ان کی عزت نہیں۔"

خان بہادر چائے پیتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ اس روز نصف گھنٹہ کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ چار روز کے بعد آپ نے مجھے ڈنر پر بلایا۔ اس کے بعد یہ کبھی کبھی تشریف لایا کرتے اور میں بھی جب کبھی نئی دہلی ان کی سڑک پر شام کو سیر کے لیے جاتا تو ان کی کوٹھی پر ان سے ملنے حاضر ہوتا اور تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ خان بہادر تصدق حسین بہت مخلص، بہت محبت والے، بہت ہمدرد بہت بے تکلف اور بہت بلند انسان تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے اور ان کے درمیان بھائیوں جیسے تعلقات ہو گئے۔ مجھے یاد ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے بیمار ہو گئے۔ راجہ اکبر علی صاحب کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ میں ہوشنگ آباد مقدمہ کی پیشی پر جا رہا تھا۔ ملنے کے لیے گیا۔ آپ کو پلورسی کے باعث سخت تکلیف تھی۔ جب آنے لگا اٹھ نہ سکے۔ آپ نے لیٹے لیٹے ہاتھ پھیلا دیئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا: "اچھا بھائی جاؤ۔ اب تو شاید ملنے کا اتفاق نہ ہو۔" یہ سن کر میرے بھی آنسو نکل آئے۔ میں ہوشنگ آباد چلا گیا۔ وہاں مقدمہ کے لیے آٹھ دس روز کی مسلسل تاریخیں تھیں۔ پہنچنے کے چار پانچ روز بعد "سٹیٹس مین" میں پڑھا۔ کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ اور گورنمنٹ ہند کا غیر معمولی گزٹ سیاہ حلقہ کے ساتھ

Marfat.com

شائع ہوا۔

خان بہادر تصدق حسین انتقال کر گئے۔ سی آئی ڈی کے ذلیل محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی ڈائرکٹر انٹلی جنس بیورو گورنمنٹ ہند تھے۔ مگر طبعاً اتنے اچھے دیانت دار مخلص اور بلند انسان کہ اُن کے قدموں پر درجنوں وہ کانگرسی قربان کیے جا سکیں۔ جو اپنی ذاتی اغراض کے لیے قومی میدان میں موجود ہیں۔ مرحوم کے انتقال کو کئی برس ہو گئے۔ مگر جب بھی خیال آتا ہے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

ان تمام حالات کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کے اندر کیریکٹر ہو تو اس کے لیے اس کے دشمنوں کے دل میں بھی عزت ہوتی ہے۔ اور اگر انسان میں کیریکٹر نہ ہو تو اس کے دوست احباب، ماں، باپ بھائی، بہن اور عزیز بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ چاہے یہ لوگ اپنی اغراض کے لیے اس کے منہ پر اس کی تعریف ہی کریں۔

راجپوتانہ کے قومی ورکر اور لیڈر شری رام نرائن جی چودھری اپنا زیادہ وقت مہاتما گاندھی کے پاس گزارتے جب کبھی وہ دہلی تشریف لاتے تو دفتر "ریاست" میں بھی آتے اور کئی کئی گھنٹے مہاتما گاندھی کے حالات کا ذکر ہوتا۔ ان کا بیان ہے کہ باوجود اس بات کے کہ مسٹر جناح کی مسلم لیگی پالیسی ملک اور کانگریس کے لیے انتہائی نقصان کا باعث ہے مگر مہاتما گاندھی کے دل میں مسٹر جناح کے لیے انتہائی عزت ہے۔ اور مہاتما گاندھی پرائیویٹ دوستوں میں بھی جب کبھی مسٹر جناح کا ذکر کرتے ہیں تو انتہائی عزت اور محبت کے ساتھ۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مہاتما جی یہ سمجھتے ہیں کہ مسٹر جناح کے اندر کیریکٹر ہے گورنمنٹ کسی قیمت پر بھی ان کو خرید نہیں سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ نے کبھی بھی جناح کو اپنا نہ سمجھا اور آپ سے ہمیشہ بدگتی ہی رہی۔ جناح کے مقابلہ پر جن کانگرسیوں کے اندر کیریکٹر نہیں۔ مہاتما جی اُن کو بدتر اور ذلیل سمجھتے ہیں مگر بے بس ہیں ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

جو لوگ پبلک میں عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر کیریکٹر پیدا کریں۔ دنیا میں روپیہ اور دولت ہی سب کچھ نہیں۔ انسان کو اپنی عزت پر روپیہ قربان کرنا پڑتا ہے اور عزت تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب انسان میں کیریکٹر ہو بلکہ غور کیا جائے تو اس شخص سے جس کے اندر کیریکٹر نہیں جو دوستوں کے ساتھ بھی بددیانت ہے۔ جو اعتماد کش ہے اور جو قومی غدار ہے۔ بازار کا ایک آوارہ کتا بھی اچھا ہے جو اپنے دوست اور دشمن میں تمیز کرتا ہے اور دوستوں کے ساتھ غداری نہیں کرتا۔

اچھے لوگ اپنے ہم وطنوں کے لیے باعثِ عزت

ایڈیٹر ریاست گوجرانوالہ کے ضلع کا رہنے والا ہے۔ اس ضلع نے سینکڑوں کی تعداد میں اخبار نویس مصنف اور علم دوست حضرات پیدا کیے۔ چنانچہ اس ضلع کے رہنے والے ایڈیٹروں اور مصنفین میں مولانا

Marfat.com

محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار" مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر "زمیندار" لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر "دیش" و "ہندوستان" لالہ پنڈی داس۔ حضرت وارث شاہ مصنف "ہیر" راجہ مہدی علی خاں۔ مسٹر حامد علی۔ مہاتما نند گوپال اڈوولی نصراللہ خاں عزیز ایڈیٹر "کوثر" وغیرہ درجنوں شخصیتیں ہیں جنہوں نے علم و ادب کی بہت خدمات انجام دیں۔

ایڈیٹر "ریاست" جن دنوں لکھنؤ کے اخبار "ہمدم" میں کام کرتا تھا۔ دوسرے تیسرے روز سہ پہر کے بعد منشی نوبت رائے صاحب نظر سابق ایڈیٹر "ادیب" الہ آباد کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتا۔ نظر صاحب اس زمانہ میں اردو کے ایک بہترین شاعر اور ادیب تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں آپ روزانہ "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر تھے اور پنجاب کے اخبار نویسوں اور مصنفین کے حالات سے خوب واقف تھے۔ ایک روز باتوں باتوں میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ وطن کہاں ہے؟ میں نے جواب دیا۔ پنجاب۔ پھر کہا کہ کونسا ضلع؟ میں نے جواب دیا۔ گوجرانوالہ۔ گوجرانوالہ کا نام سنتے ہی آپ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ شیراز ہند کے رہنے والے ہو۔ کیونکہ ایران میں شیراز نے سینکڑوں کی تعداد میں علم دوست اور مصنف پیدا کیے اور ہندوستان میں گوجرانوالہ نے۔"

گوجرانوالہ کے لیے "شیراز ہند" کا خطاب سن کر میرے دل نے جتنی مسرت محسوس کی میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اچھے لوگوں کا کام ان کے ہم وطنوں اور ان کی اولاد کے لیے بھی باعث عزت ہے۔ چنانچہ پیغمبروں، گوروؤں اور اوتاروں کی اولاد سینکڑوں اور ہزارہا برس گزر جانے کے بعد بھی آج تک لوگوں میں قابل پرستش ہے اور بُرے لوگوں کے رشتہ داروں سے بھی نفرت کی جاتی ہے۔

دُعا اور بد دُعا کا اثر

مرحوم مہاراجہ نابھہ بہت بڑے قوم پرست اور لٹریری ذوق رکھنے والی علم دوست شخصیت تھے ان کے دشمن بھی ان کی صفات کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر ریاست نابھہ کی ایڈمنسٹریشن اور دوسرے حالات کا جہاں تک تعلق ہے۔ نابھہ اور دوسری ریاستوں میں کوئی فرق نہ تھا۔

راقم الحروف جس زمانہ میں مہاراجہ کے پاس ریاست نابھہ میں ملازم تھا وہاں ایک سادھو برہمن رہا کرتے تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ یہ آنکھوں سے معذور تھے۔ ایک طویل عرصہ تک سوامی دیانند بانی آریہ سماج کے ساتھ رہے اور انہوں نے سوامی جی سے سنسکرت پڑھی تھی۔ یہ پنڈت جی ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لیے اکثر آیا کرتے اور سوامی دیانند کے متعلق اپنے چشم دید اور دلچسپ واقعات سنایا کرتے۔ پنڈت جی جو سادھوؤں کے لباس میں رہتے تھے، بوڑھے ہو چکے تھے ان کی بیوی اور بچے بھی موجود تھے۔ بچوں میں ایک لڑکی کا نام ایشر کور تھا اور لڑکے کا نام ایشر سنگھ (یہ دونوں آجکل غالباً ڈیرہ دون میں رہتے ہیں)۔ پنڈت جی کی بیوی کافی بوڑھی اور دبلی پتلی اور کمزور تھیں۔

مہاراجہ نابھہ اپنے ایک اے ڈی سی سے ناراض ہو گئے۔ اس اے۔ ڈی سی کا ناجائز تعلق پنڈت جی

Marfat.com

کی صاحب زادی ایشر کور کے ساتھ تھا۔ مہاراجہ کی ناراضی کے باعث جب یہ ایے۔ڈی سی نابھ سے چلا گیا تو اس نے ایک عورت بھیج کر اس ایشر کور کو بھی اپنے پاس لاہور بلوا لیا۔ ایشر کور کے جانے کا جب مہاراجہ کو علم ہوا تو پولیس نے پنڈت جی سے ایک درخواست لی۔ جس میں لکھا گیا کہ یہ اے ڈی سی ان کی دختر ایشر کور کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ باپ کی درخواست پر بیٹی اور اس کے آشنا کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے اور ساتھ ہی ایشر کور کی ماں یعنی بوڑھے پنڈت جی کی بوڑھی بیوی کو بھی اغوا میں امداد دینے کے جرم میں بغیر ضمانت لیے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ ضعیفہ کوتوالی کی حوالات میں بند تھی۔ مئی جون کا مہینہ تھا۔ چھت کے اوپر سونے والے بھی گرمی کی شدت سے تڑپتے تھے۔ مگر یہ خاتون بغیر کسی جرم یا قصور کے حوالات کے بند کمروں میں قید تھی۔ تمام رات سو نہ سکتی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد جب یہ روتے ہوئے بلند اور دردناک آواز کے ساتھ "ہائے میں مر گئی"، "ہائے میں بے گناہ ہوں"، "ہائے میرا کیا قصور ہے" کہتی تو کوتوالی کے قریب کے مکانوں کی چھت پر سوئے ہوئے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ظلم کے کئی واقعات میں سے ایک یہ واقعہ ہے جس کو دیکھ کر ایڈیٹر "ریاست" کو نابھ کی ملازمت میں ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ والیان ریاست کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اخبار جاری ہو اور ریاستوں میں انقلاب پیدا کیا جائے۔

اب نہ تو مہاراجہ نابھ اس دنیا میں موجود ہیں نہ یہ ضعیف اور کمزور خاتون۔ مگر میرا یقین ہے کہ مہاراجہ نابھ کی تباہی کا باعث جن لوگوں کی بددعائیں تھیں ان میں اس بے گناہ اور بے قصور خاتون کی بددعاؤں کا بھی کافی حصہ تھا۔ اس خاتون کا یہ واقعہ ہی اخبار "ریاست" کو جاری کرنے کی بنیادوں کا باعث ہوا اور ایڈیٹر "ریاست" کا ایمان ہے کہ ان لوگوں کو قدرت ضرور سزا دیتی ہے جو معصوم اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ چاہے یہ سزا اسی وقت ملے یا دو چار دس سال کے بعد اور خدا کا وجود ہو یا نہ ہو مگر سزا دینے والی کوئی نہ کوئی طاقت ضرور موجود ہے اور یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ دعا اور بددعا کا اثر نہ ہو۔

ماں کی ممتا

پنجاب کی اکالی تحریک کا آغاز دہلی کے گوردوارہ رکاب گنج سے ہوا۔ یہ گوردوارہ گورنمنٹ سیکرٹریٹ کے بالکل قریب ہے۔ گورنمنٹ چاہتی تھی کہ اس گوردوارہ کی بیرونی اونچی دیوار کو گرا دیا جائے تا کہ کوئی بم باز یا انارکسٹ اس دیوار کے پیچھے چھپ کر کبھی کوئی وار نہ کر سکے۔ سکھ اس دیوار کو مسجد مچھلی بازار کانپور کے غسلخانہ کی طرح گوردوارہ کا ایک حصہ سمجھتے تھے اور اس دیوار کی حفاظت کے لیے ہی اکالی (جو مرنے سے نہ ڈریں) عالم وجود میں آئے۔ اس دیوار کی کامیابی نے اکالی تحریک کو ایک مستقل اور مضبوط حیثیت دینے کا کام کیا۔ چنانچہ آج پنجاب منسٹری اور گورنمنٹ ہند کی وزارت میں اکالیوں کے مشورہ سے ہی سکھ وزرا

Marfat.com

لیے جانتے ہیں۔

میں جب ریاست نابھہ میں ملازم تھا تو اس وقت وہاں ہم چار جرنلسٹ تھے۔ (۱) میں (۲) مسٹر ایس زنگا آئر سابق سب ایڈیٹر "لیڈر" الہ آباد (۳) سردار سوہن سنگھ راہی (۴) اور سردار چرن سنگھ شہید۔ اکالی تحریک جب زور پکڑ رہی تھی تو مہاراجہ نابھہ نے ایک روز مجھ سے کہا۔ کہ میں پنجاب کا دورہ کر کے معلوم کروں کہ اس نئی اکالی تحریک کی تہہ میں کیا مقصد ہے۔ اس کے ساتھ کون کون با اثر حضرات شامل ہیں۔ چیف خالصہ دیوان (حکومت پرست پارٹی) کا اس کے ساتھ کس حد تک تعلق ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی کیا پوزیشن ہے اور اس کا مستقبل کیا نظر آتا ہے۔ میں مہاراجہ کے حکم کے مطابق نابھہ سے روانہ ہو کر سب سے پہلے امرتسر پہنچا۔ وہاں سکھوں کے اکثر لیڈروں اور ورکرز سے واقفیت تھی۔ متعدد اصحاب سے ملنے کے بعد ماسٹر تارا سنگھ (جو اکالی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے) سے ملا۔ ماسٹر صاحب سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں تو باتوں باتوں میں آپ سے معلوم ہوا۔ کہ پٹیالہ کے سردار لال سنگھ کے قتل کے متعلق کاغذات ان کے ایک دوست سردار تلوک سنگھ مینجر گوردوارہ پنجہ صاحب حسن ابدال (ضلع راولپنڈی) کے پاس ہیں۔

سردار لال سنگھ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کی مہارانی (موجودہ مہارانی پٹیالہ کی حقیقی والدہ) کے چچا تھے۔ سردار لال سنگھ کی بیوی دلیپ کور غیر معمولی خوبصورت تھیں اور مہاراجہ کا اس خاتون کے ساتھ ناجائز تعلق تھا مہاراجہ نے چاہا۔ کہ سردار لال سنگھ پچاس ہزار روپیہ یا اس سے زیادہ رقم لے کر دوسری شادی کر لیں اور دلیپ کور کو چھوڑ دیں۔ مگر سردار لال سنگھ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس انکار کے بعد مہاراجہ نے سردار لال سنگھ کو قتل کرا دیا۔ اس قتل میں جن لوگوں کا حصہ تھا ان میں سے کچھ تو مر چکے ہیں اور کچھ ابھی زندہ ہیں چنانچہ جن کاغذات کا ماسٹر تارا سنگھ نے ایڈیٹر "ریاست" سے ذکر کیا۔ ان میں وہ مسودہ بھی تھا جو سردار لال سنگھ کو اس غرض سے دیا گیا تھا۔ کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑنے کے متعلق اس پر دستخط کر دیں اور سردار بہادر سر سندر سنگھ مجیٹھیہ سابق منسٹر پنجاب گورنمنٹ کے خطوط بھی تھے۔ جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قتل کے بعد جب لوگوں کو اور گورنمنٹ کو قتل کا علم ہوا تو اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس قتل کے واقعات بہت دلچسپ، دردناک، طویل اور ایک پوری کتاب لکھے جانے کے مستحق ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" ماسٹر تارا سنگھ سے مل کر لاہور وغیرہ کئی مقامات پر دوسرے سکھ لیڈروں سے ملنے کے لیے گیا اور ایک عشرہ کے اس دورہ کے بعد جب واپس نابھہ پہنچا تو اکالی تحریک کے متعلق اپنی رپورٹ کے ساتھ مہاراجہ کو لکھا۔ کہ کاغذات قتل سردار لال سنگھ کے متعلق ماسٹر تارا سنگھ سے کیا بات چیت ہوئی۔ مہاراجہ ان کاغذات کو حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ سے کوشش میں تھے۔ کیونکہ یہ کاغذات مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف قتل کا جرم ثابت کر سکتے تھے۔ میرا خط دیکھ کر مہاراجہ بہت خوش ہوئے مجھے طلب کیا۔ زبانی سب کچھ پوچھا اور کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کاغذات کو حاصل کیا جائے چاہے ان کاغذات پر کتنا بھی روپیہ خرچ ہو۔

میں نے ہز ہائی نس سے پوچھا کہ کتنا روپیہ زیادہ سے زیادہ ان کاغذات پر خرچ کیا جا سکتا ہے

Marfat.com

مہاراجہ نے جواب دیا کہ ایک یا دو لاکھ۔ یا اگر زیادہ ضرورت ہو تو زیادہ بھی۔

اگلے روز میں نے سفر کے اخراجات کے لیے پانچ سو روپیہ سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری (جو بعد میں نابھہ میں منسٹر ہوتے اور سردار بہادر تھے) سے لیا۔ اور سیدھا گوجر خاں (ضلع راولپنڈی) سردار نانک سنگھ کے مکان پر پہنچا۔ سردار نانک سنگھ کسی وقت پٹیالہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی تھے اور سردار لال سنگھ کو قتل کرنے کے الزام میں اس وقت پٹیالہ جیل میں تھے اور قتل کے کاغذات انہوں نے ہی اپنے بہنوئی سردار تلوک سنگھ کو دیئے تھے تاکہ محفوظ رہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے سردار نانک سنگھ کے گھر میں ان کی بوڑھی اور ضعیف والدہ اور ایک بہن تھیں۔ ان کی بہن کا نام غالباً گوبند رکور تھا۔ اس لڑکی کی شادی ہوئے ابھی دو تین ماہ ہوئے تھے اور اس کے ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں (جو شادی ہونے کے بعد پنجاب میں ایک سال تک پہنی جاتی ہیں) تھیں۔ ان دونوں خواتین کو جب یہ علم ہوا کہ میں نابھہ سے آیا ہوں۔ نابھہ اور پٹیالہ دونوں کی عداوت ہے۔ اور اگر قتل لال سنگھ کے کاغذات مہاراجہ نابھہ کو دے دیئے جائیں تو مہاراجہ پٹیالہ اس قتل کے الزام میں گدی سے اتر سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سردار نانک سنگھ بھی پٹیالہ جیل سے رہا کر دیئے جائیں گے۔ تو ان ماں بیٹی کے چہروں پر مسرت اور خوشی کا سرخ رنگ چمکنے لگا۔ اس کے بعد سردار نانک سنگھ کی ماں نے مجھے متاثر کرنے کے لیے بیٹے کی جدائی اور اپنے غم کی داستان سنانا شروع کی اور اس ضعیف اور دکھی خاتون نے جب یہ کہا کہ نانک سنگھ قید ہونے کے باعث اپنی بہن کی شادی میں بھی شامل نہیں ہو سکا تو پاس بیٹھی معصوم جوان خوبصورت اور سرخ چوڑیوں والی گوبند رکور کی آنکھیں بھائی کی محبت میں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور اس نے حیا کے ساتھ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس کے بعد سردار نانک سنگھ کے ماموں سردار جے سنگھ اور دوسرے عزیز آ گئے۔ راولپنڈی اور سرحد کے لوگ ویسے تو فطرتاً ہی بے حد مہمان نواز ہوتے ہیں مگر مجھے تو وہ اس وقت ایک فرشتہ سمجھ رہے تھے جو نانک سنگھ کو جیل سے رہا کرنے کے لیے آسمان سے نازل ہوا ہو۔ ان لوگوں نے اخلاص و محبت اور خاطر تواضع کی انتہا کر دی۔ ان کے مکان پر دو روز رہا مشورے ہوتے رہے۔ آخر میں اور سردار جے سنگھ دونوں سردار تلوک سنگھ کے پاس پنجہ صاحب (حسن ابدال) روانہ ہوئے۔ پنجہ صاحب پہنچ کر مشورہ ہوا۔ پھر تینوں واپس گوجر خاں پہنچے۔ پھر مشورہ ہوا۔ یہ لوگ والیانِ ریاست کو ناقابل اعتبار، خود غرض اور جھوٹا سمجھتے تھے۔ اس لیے مہاراجہ نابھہ پر بھی بھروسہ کرنا نہ چاہتے تھے اور کاغذات حوالہ کرنے میں ان کو تامل تھا اور بعض اس بات کے حق میں تھے کہ کاغذات ایک یا دو لاکھ روپیہ میں فروخت کیے جائیں اور نابھہ سے روپیہ لیا جائے۔ میری خواہش یہ تھی کہ یہ کاغذات بغیر ایک پیسہ خرچ کیے مہاراجہ نابھہ کو مل جائیں۔ مہاراجہ نابھہ ان کو مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف استعمال کریں اور سردار نانک سنگھ بھی پٹیالہ جیل سے رہا ہوں۔ چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ سردار نانک سنگھ کے گھر والوں کی یہ پنچایت کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی اور ان کی مختلف رائیں ہیں تو میں نے سب کے سامنے قطعی فیصلہ کے لیے دو تجویزیں پیش کیں: (۱) یا تو آپ روپیہ لے لیجئے ہم ایک لاکھ روپیہ دینے

Marfat.com

کے لیے تیار ہیں۔ہم ان کاغذات کو جیسا چاہیں استعمال کریں اور آپ کو حق حاصل نہ ہوگا اگر ہم ان کاغذات کو استعمال کرتے ہوئے سردار نانک سنگھ کے مسئلہ کو چھوڑ دیں۔

(۲) آپ کوئی روپیہ نہ لیجئے۔آپ کاغذات بغیر ایک پیسہ لیے مہاراجہ نابھ کے حوالہ کر دیجئے۔مہاراجہ نابھ آپ سے وعدہ کریں گے کہ وہ ان کاغذات کو استعمال کرتے ہوئے سردار نانک سنگھ کی رہائی کے لیے انتہائی کوشش کریں گے اور اس مسئلہ کو کسی قیمت پر بھی چھوڑا نہ جائے گا چاہے اس پر دس لاکھ روپیہ بھی کیوں نہ خرچ ہو۔

میں نے جب قطعی فیصلہ کے لیے یہ دونوں شرائط سب کے سامنے رکھیں تو سردار نانک سنگھ کی ماں نے جو اپنے بیٹے کی جدائی میں بے حال تھیں بغیر کچھ سوچے یا غور کیے فوراً جواب دیا،

"مجھے روپے کی ضرورت نہیں مجھے اپنے بچے کی ضرورت ہے میں روپیہ نہیں چاہتی۔آپ کاغذات لے جائیے اور میرے بچے کو جیل سے چھڑانے کی کوشش کیجئے"

سردار نانک سنگھ کی والدہ کا یہ جواب سن کر تمام لوگ خاموش ہو گئے۔اور آخر فیصلہ ہوا۔کہ کاغذات بغیر روپیہ لیے مہاراجہ نابھ کے حوالہ کر دیے جائیں۔چنانچہ میں سردار تلوک سنگھ اور سردار جے سنگھ کو ساتھ لے کر نابھ واپس آ گیا۔کاغذات ایک ٹین کے نلکے میں بند تھے اور یہ نلکا سردار تلوک سنگھ کے کوٹ کے اندر چھاتی اور گردن کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

تیسرے روز رات کو ہم نابھ پہنچے۔میں نے ان کی رہائش کا انتظام مہمان خانہ سرائے شاہی بات میں کیا۔خود اپنے مکان پر جا کر سویا۔صبح اٹھا آٹھ بجے کے قریب سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری کے مکان پر پہنچا۔سردار صاحب نے پوچھا کہ کاغذات کا کیا ہوا۔میں نے کہا کہ کاغذات لے آیا ہوں۔ وہ حیران ہوئے اور کہا کہ روپیہ ساتھ لے نہیں گئے تھے۔ابھی صرف معلوم کرنے گئے تھے کہ کاغذات کہاں ہیں۔کاغذات کس طرح آ گئے۔یہ ممکن ہی کیوں کر ہے۔کیا مذاق کر رہے ہو۔میں نے تمام قصہ بیان کیا سردار گوردیال سنگھ حیران رہ گئے۔انہوں نے ہیرا محل جا کر مہاراجہ کو تمام حالات بتائے۔مہاراجہ حیران تھے کہ دو لاکھ روپیہ تک خرچ کرنے کی اجازت دی گئی تھی مگر ایک پیسہ خرچ کیے بغیر کاغذات مل گئے مہاراجہ واقعات کو سن کر بے حد خوش ہوئے۔

رات کو نو بجے کے قریب میں سردار تلوک سنگھ اور سردار جے سنگھ کو لے کر قلعہ میں گیا۔دونوں کو مہاراجہ سے ملایا۔کاغذات والا ٹین کا نلکا کوٹ کے اندر سے نکالا گیا۔تمام کاغذات مہاراجہ کو دیے گئے مہاراجہ نے ان کو دیکھا بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ وہ سردار نانک سنگھ کی رہائی کے مسئلہ کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کر کوشش کریں گے۔چنانچہ ان لوگوں کے ذریعہ سردار نانک سنگھ کی والدہ کو مہاراجہ نے دو ہزار روپیہ نقد بھجوایا اور ایک سو روپیہ ماہوار پنشن تا حیات مقرر کی (جو شاید چند ماہ ملی۔اس کے بعد مہاراجہ گدی سے دست بردار ہو گئے) اور اگلے روز جب راقم التحریر مہاراجہ سے ملا تو مہاراجہ نے کہا:

"میں اور دربار نابھ آپ کا یہ احسان کبھی بھی نہ بھول سکیں گے"

Marfat.com

یہ کاغذات گو مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف قتل کا الزام ثابت کرنے کے اعتبار سے بہت قیمتی تھے مگر گورنمنٹ مہاراجہ پٹیالہ کے حق میں تھی اور مہاراجہ نابھ کے خلاف، اور صرف گورنمنٹ ہی قتل سے متعلق کوئی کارروائی کر سکتی تھی۔ یہ کاغذات استعمال نہ ہو سکے اور ان کاغذات کی پوزیشن بالکل ایک ایسے چیک کی تھی جو میعاد گزر جانے کے بعد بنک سے کیش نہیں ہو سکتا۔

سردار نانک سنگھ ایک عرصہ کے بعد پٹیالہ جیل سے رہا ہوئے اور وہ آجکل غالباً ڈیرہ دون میں کوئی کام کرتے ہیں۔

ان اوپر کے واقعات سے ماں کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کے اپنی اولاد اور اپنے بچہ کے لیے ہوتے ہیں یعنی یہ اپنی اولاد کے مقابلہ پر لاکھوں روپیہ کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھتی۔

محنت اور کامیابی

کئی برس ہوئے "ریاست" جب جاری ہوا تو اس کے دفتر میں نہ کوئی سب ایڈیٹر تھا نہ مترجم اور نہ کوئی مینیجر۔ صرف ایک کلرک تھا اور ایک چپڑاسی۔ کلرک کی تنخواہ تیس روپیہ تھی اور چپڑاسی کی پندرہ روپیہ "ریاست" کا دفتر دہلی دروازہ کے قریب موجودہ تھانہ کے بالکل سامنے ایک گلی کے اندر تھا۔ اس مکان کا کرایہ اٹھائیس روپیہ ماہوار تھا۔ اس میں سے بھی کچھ حصہ ایک ریلوے گارڈ کو بارہ روپیہ ماہوار پر دیا گیا تھا۔ گویا کہ "ریاست" کے دفتر اور ایڈیٹر "ریاست" کی رہائش دونوں کے لیے سولہ روپیہ ماہوار کرایہ دیا جاتا تھا اور کام کی حالت یہ تھی کہ ویسے تو ایڈیٹر "ریاست" کی تمام زندگی ہی دن رات میں سے چودہ چودہ یا سولہ سولہ گھنٹہ کام کرتے گزر گئی مگر اس زمانہ میں یہ لگاتار اٹھارہ اٹھارہ گھنٹہ کام کرتا اور چھ گھنٹہ سوتا۔ چنانچہ کئی بار تو ایسا ہوا کہ صبح چھ بجے کام شروع کیا۔ شام ہو گئی۔ رات ہو گئی۔ رات بھر کام جاری رہا۔ دن نکل آیا۔ ضروری حاجات سے فارغ ہوا۔ غسل کیا اور پھر میز پر بیٹھ گیا اور پھر رات ہو گئی یعنی چھتیس چھتیس گھنٹہ مسلسل کام کرتا رہا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار میں کامیابی ہوئی۔ دو تین ماہ کے اندر ہی اشتہارات کے آٹھ دس صفحے ہو گئے۔ اور لاہور، دہلی اور دوسرے مقامات کے اخبار نویس "ریاست" کو رشک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"ریاست" کو جاری ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور اس کی اشاعت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ اس زمانہ میں جامع مسجد کے قریب ایڈورڈ پارک میں شام کے وقت چند اہم شخصیتیں جمع ہوا کرتیں۔ مرحوم مولانا راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ"، قاری عباس حسین منشی عبدالمجید ایڈیٹر "مولوی" مولانا عارف ہسوی اور بھیا شیخ احسان الحق وغیرہ۔ یہ مجلس بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایڈیٹر "ریاست" بھی کبھی کبھی فرصت نکال کر ان دوستوں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ کیونکہ یہ تمام ہی اس نیازمند کے کرم فرما تھے۔ اور مرحوم مولانا راشد الخیری کے اخلاص و محبت میں تو بہت بڑی کشش تھی۔

Marfat.com

ایک روز ایڈیٹر "ریاست" ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر تھا تو قاری عباس حسین صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ کہ آپ ایک اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں جو بالکل "ریاست" کے سائز کا ہو گا۔ اس کے لیے "ریاست" والا سفید کاغذ استعمال کیا جائے گا اور ترتیب کے اعتبار سے بھی "ریاست" جیسا ہو گا۔ اس میں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ میں نے قاری صاحب سے عرض کیا کہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جتنے زیادہ اخبارات جاری ہوں اتنا ہی میدان وسیع ہو گا۔ قاری صاحب نے پوچھا کہ اگر اخبار جاری ہو تو میں اس میں کیا امداد دوں گا میں نے عرض کیا جو خدمت مجھے بتائیے میں حاضر ہوں۔ پھر پوچھا۔ کیا کامیابی ہو گی؟ میں نے جواب دیا: اگر "ریاست" کو کامیابی ہوئی ہے تو کیا وجہ ہے کہ آپ کے اخبار کو نہ ہو۔ چنانچہ اگلے روز ایڈیٹر "ریاست" نے قاری صاحب کو "ریاست" کے چھپے ہوئے مسطر کے کاغذ بھیجے۔ اخبار "قوم" کا ڈیکلریشن داخل کیا گیا اور دو ہفتہ کے اندر اس اخبار کا پہلا پرچہ بازار میں آ گیا۔

قاری عباس حسین صاحب اس سے پہلے "بندے ماترم" لاہور وغیرہ متعدد روزانہ ہفتہ وار قومی اخبارات میں ایڈیٹری اور سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دے چکے تھے اور آپ ایک اچھے جرنلسٹ ہیں مگر اخبار کو ایڈیٹ کرنا اور اخبار کو تجارتی اعتبار سے چلانا دو مختلف چیزیں ہیں۔ قاری صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہ میں نے کتنے سرمایہ سے "ریاست" جاری کیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ پندرہ سو روپیہ سے۔ چنانچہ قاری صاحب نے بھی اس اخبار "قوم" کو جاری کرنے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ کا انتظام کیا تھا۔ تین ماہ کے اندر اس اخبار پر ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہو گیا مگر اخبار کو کامیابی نہ ہوئی۔ تین ماہ کے بعد قاری صاحب ایڈورڈ پارک میں ملے تو آپ نے فرمایا۔ کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ تو صرف ہو چکا مگر کامیابی نہیں ہوئی نقصان ہو رہا ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے عرض کیا اور کوشش کیجیے۔ قاری صاحب نے مزید بارہ سو روپیہ کا انتظام کیا۔ وہ روپیہ بھی صرف ہو گیا۔ اس کے بعد ایک ہزار روپیہ کا اور انتظام کیا وہ بھی غرق ہوا تو ایک روز ایڈورڈ پارک میں پھر ملے۔ آپ نے فرمایا کہ ساڑھے تین ہزار روپیہ سے زیادہ صرف ہو چکا ہے نہ زیادہ اشاعت ہے، نہ اشتہارات کافی۔ اخبار میں گھاٹا ہے، کیا صورت ہو۔ ایڈیٹر "ریاست" نے عرض کیا۔ اگر گھاٹا ہے تو بند کر دیجیے۔ قاری صاحب دوستانہ شکوہ کے انداز میں بولے۔ آپ نے کوئی مدد نہیں کی۔ نہ اشتہارات لے کر دیئے نہ کوئی صورت خریدار زیادہ کرنے کی بتائی۔

اس دوستانہ شکوہ کے بعد آپ نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا کہ ناکامی کا باعث کیا ہے تو ایڈیٹر "ریاست" نے جو کچھ عرض کیا وہ یہ تھا:

"قاری صاحب! آپ کے لیے کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا اور میں جانتا تھا کہ آپ کو کامیابی نہ ہو گی مگر اس خیال سے کہ اگر میں آپ کے اخبار جاری کرنے سے پہلے آپ کو اخبار جاری کرنے سے روکتا تو آپ مجھ پر خود غرضی اور تجارتی حسد اور رقابت کا الزام لگاتے اس لیے میں نے آپ کو منع نہیں کیا ورنہ سوچیئے۔ کہ آپ کو کامیابی کیونکر ہوتی۔ آپ صبح آٹھ بجے جاگتے ہیں۔ ایک گھنٹہ پلنگ پر کروٹیں بدلتے رہتے ہیں پھر بیگم صاحبہ سے فرماتے ہیں

Marfat.com

کہ پان لاؤ۔ بیگم صاحبہ آپ کے پلنگ کے قریب چھالیا کترتی ہیں۔ چھالیا کترتے
چوڑیوں کی آواز کو سننے اور پان کھانے کے لیے آپ کو نصف گھنٹہ چاہیئے۔ پھر پاخانہ جاتے
ہیں۔ ہاتھ منہ دھوتے اور ناشتہ کرتے۔ آپ کو ساڑھے دس بج جاتے ہیں اور گیارہ
بجے اچکن پہن کر دفتر میں تشریف لے جاتے ہیں۔ آپ کے ملازم جب جانتے ہیں کہ آپ
گیارہ بجے تشریف لاتے ہیں تو وہ بھی پونے گیارہ بجے سے پہلے دفتر میں قدم رکھنا
حرام سمجھتے ہیں۔ آپ کے تمام کے تمام ملازم دہلی کے رہنے والے نازک مزاج اصحاب
ہیں۔ دفتر کے بند ہونے کا وقت پانچ بجے ہو تو یہ تین بجے ہی سے گھڑی کو دیکھنا شروع
کر دیتے ہیں۔ کہ گھڑی کی سوئی کب آگے بڑھے اور یہ گھر کو جائیں۔ آپ چار بجے دفتر سے
روانہ ہو کر گھر پہنچتے ہیں۔ بیوی چائے پلاتی ہیں۔ پان کھلاتی ہیں اور آپ اچکن پہن کر اور
چھڑی ہاتھ میں لے کر سیر کے لیے تشریف لے جاتے ہیں۔ ایک دو چکر چاوڑی بازار کے
بھی ضروری ہیں کیونکہ اس کے بغیر تفریح نامکمل رہتی ہے۔ پھر ایڈورڈ پارک میں آتے ہیں
اور سیر و تفریح کے بعد دس بجے واپس گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ تو کیفیت آپ کی
ہے۔ میری حالت یہ ہے کہ صبح ۶ بجے میز پر بیٹھتا ہوں۔ میز پر ہی چائے پیتا ہوں۔ یہاں
ہی کھانا کھاتا ہوں۔ دفتر کے لوگ تمام کے تمام پنجابی ہیں جو فطرتاً کام کی پروا کرتے ہیں۔
وقت کی پروا نہیں کرتے۔ دس بجے دفتر کا وقت ہو تو نو بجے ہی دفتر میں پہنچ جاتے ہیں
کیونکہ گھر میں ان کو کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور بغیر کام ان کا جی گھبراتا ہے۔ شام کو یہ لوگ
دفتر سے اس وقت تک نہیں جا سکتے۔ جب تک کہ یہ اپنا کام ختم نہ کر لیں۔ چنانچہ ان کو کبھی
دفتر میں رات کے آٹھ بج جاتے ہیں۔ میں صبح چھ بجے کا میز پر بیٹھا رات کو دس گیارہ
بلکہ بعض اوقات بارہ بجے اٹھتا ہوں۔ رات کو خواب آتے ہیں تو وہ بھی اشاعت کو زیادہ
کرنے اور اشتہارات بڑھانے کے۔ نہ کوئی سیر ہے نہ تفریح، نہ کبھی کسی پارٹی میں جاتا
ہوں نہ کسی دوست کے ہاں۔ تو فرمایئے آپ کو کامیابی کیوں ہو اور مجھے ناکامی کیوں؟

قاری صاحب میری یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئے اس ہفتہ میں ہی انہوں نے اپنے اخبار کو بند کر دیا
آپ آجکل ریڈیو سٹیشن کراچی میں ملازم ہیں ان کے ساتھ کئی برس سے دوستانہ گہرے تعلقات ہیں جب
بھی کبھی ملتے ہیں تو ساڑھے تین ہزار روپیہ کے نقصان کا اس طرح ہی گلہ کرتے ہیں جس طرح کوئی قرض خواہ
بنیا کسی نادہند مقروض سے قرضہ وصول کرنے کے لیے تقاضا کرتا ہے اور اس قرضہ کو بھول نہیں سکتا۔

میرے اس لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی آسمان سے نازل ہو اور وہ محنتی نہ
ہو تو اس کی کامیابی کا اس دنیا میں کوئی امکان نہیں اور اگر کوئی شخص انتہائی محنتی ہے اور اس میں کوئی
غیر معمولی نقص نہیں جو اس کو قدم قدم پر ناکامی کی طرف لے جاتا ہے، تو اس شخص کے کامیاب ہونے میں
کوئی شک نہیں۔ میں نے درجنوں سیلف میڈ لوگوں کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، ان سے ملا

Marfat.com

ہوں اور ان سے ان کی کامیابی کے متعلق گفتگوئیں باتیں کی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملا جو انتہائی محنتی نہ تھا اور میں نے تجارتی اعتبار سے ناکام اور تباہ حال لوگوں کے حالات پر بھی غور کیا ہے۔ ان میں سے ننانوے فیصدی ایسے لوگ تھے جن کا وقت محنت کی جگہ عیش و آرام کی نذر ہوا۔

"ریاست" کی پچھلے کئی برس کی زندگی میں میرا اندازہ ہے کہ لاہور، دہلی، یوپی اور دوسری جگہوں سے ایک سو کے قریب ایسے اخبارات جاری ہوئے۔ جنہوں نے "ریاست" کی نہ صرف شکل و شباہت بلکہ مضامین کی ترتیب اور اس کے عنوانات کی بھی تقلید کی۔ مگر ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہوگا جس کو "ریاست" جیسی کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ چنانچہ اب اس کے نئے دور ہی کو لیجئے۔ یہ پرچہ "ریاست" کا بارھواں نمبر ہے۔ گو یا کہ اس کو جاری ہوئے ابھی صرف تین ماہ ہوئے ہیں مگر باوجود اس بات کے کہ کام کرنے والے اچھے آدمی اب تک نہیں مل سکے۔ اس مئی کے مہینے میں اس کے اشتہارات کی آمدنی دو ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ہے اور اشاعت کے لحاظ سے بھی چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اردو کا ایسا ہفتہ وار اخبار ہوگا جو "ریاست" کا مقابلہ کر سکے۔

ان تمام حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ "ریاست" کی تمام کامیابی کا سبب صرف محنت ہے اور جو لوگ ناکام ہوئے وہ محنت نہ کرنے کے باعث۔

والیانِ ریاست کا انتقام

ایڈیٹر "ریاست" جب مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں تھا۔ تو اُس زمانہ میں اس کے تعلقات وہاں کے ایک بنیئے لالہ جوت رام کے ساتھ بہت گہرے اور دوستانہ تھے۔ یہ لالہ جوت رام ذات کے تو بنیئے تھے مگر بہت بہادر، فیاض، دوست نواز اور سیر چشم تھے۔ چنانچہ آپ کی ان صفات کے باعث تمام دوست آپ کو "پٹھان بنیا" کہا کرتے۔ ان لالہ جوت رام کے ساتھ ایڈیٹر "ریاست" کا لین دین بھی تھا یعنی جب ضرورت ہوتی ان سے روپیہ لیا جاتا اور پھر واپس کر دیا جاتا۔

ایڈیٹر "ریاست" جب مانسہ سے لاہور "خالصہ اخبار" کو ایڈٹ کرنے کے لیے چلا گیا تو اس وقت حساب میں ایڈیٹر "ریاست" کے ذمہ لالہ جوت رام کا دو سو روپیہ تھا اور ایڈیٹر "ریاست" نے لاہور پہنچنے پر لالہ جوت رام کو ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ یہ دو سو روپیہ میں چند روز کے اندر آپ کو ادا کر دوں گا۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد یہ روپیہ لالہ جوت رام کو واپس کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے کئی برس بعد ایک مقامی مقدمہ کے سلسلہ میں لالہ جوت رام کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ پٹیالہ پولیس جب تلاشی لے رہی تھی تو تلاشی لینے والے سب انسپکٹر نے وہ کارڈ بھی دیکھا جو ایڈیٹر "ریاست" نے دو سو روپیہ کے متعلق لالہ جوت رام کو کئی برس پہلے لکھا تھا اور چونکہ تلاشی لینے والے کو علم تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ "ریاست" کے مضامین کے باعث ایڈیٹر "ریاست" کے دشمن ہیں اس نے یہ

Marfat.com

کارڈ لے لیا۔ اور انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجا۔ اس کارڈ کے پہنچنے پر پٹیالہ کے افسروں کے درمیان کانفرنس ہوئیں کہ اس کارڈ کو کس طریقہ سے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ اس کارڈ کے دوسو روپیہ کو ایک امانت قرار دیا جائے اور امانت میں خیانت کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا جائے۔

پٹیالہ کے افسروں کے اس فیصلہ کے بعد اس معاملہ کے لیے ایک بڑا پولیس افسر خاص طور سے مقرر کیا گیا۔ یہ افسر مانسہ آیا۔ اس نے لالہ جوت رام سے حکومت کا دباؤ ڈال کر یہ بیان لیا۔ کہ کارڈ لکھنے سے چند ماہ پہلے دیوان سنگھ مانسہ سے بھٹنڈہ جا رہا تھا تو لالہ جوت رام نے دوسو روپیہ ساون سنگھ ٹھیکیدار شراب بٹھنڈہ کو دینے کے لیے دیوان سنگھ کو دیئے۔ مگر دیوان سنگھ نے ساون سنگھ کو یہ روپیہ نہ دیا اور امانت میں خیانت کی۔ مانسہ کے دو نمبرداروں سے بیان لیا گیا۔ کہ ان کے سامنے اور ان کی موجودگی میں لالہ جوت رام نے دیوان سنگھ کو دوسو روپیہ اس غرض کے لیے دیئے کہ یہ روپے ساون سنگھ کو دیئے جائیں۔ اس افسر نے بٹھنڈہ جا کر ساون سنگھ سے یہ بیان لیا۔ کہ لالہ جوت رام نے دوسو روپیہ دیوان سنگھ کے ہاتھ اسے بھیجا۔ مگر دیوان سنگھ نے یہ روپیہ اسے نہیں دیا۔ چنانچہ ان شہادتوں کی بنیاد پر ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف مقدمہ کی کارروائی ریاست پٹیالہ میں شروع ہوئی۔

لالہ جوت رام بہت نیک فطرت اور دوست پرست تھے۔ آپ نے دباؤ میں آ کر یہ بیان تو دے دیا۔ مگر آپ اگلے روز ہی دہلی پہنچے۔ ایڈیٹر "ریاست" سے ملے اور تمام واقعات بیان کیے۔ کہ پولیس نے کس طرح ان کو دھمکی دی۔ کہ اگر وہ دیوان سنگھ کے خلاف بیان نہ دیں گے تو خود ان پر کوئی جھوٹا مقدمہ قائم کیا جائے گا۔ ساون سنگھ ٹھیکیدار سے کہا کہ اگر وہ بیان نہ دے گا تو اس کا ٹھیکہ ضبط کر لیا جائیگا۔ اور آئندہ کبھی ٹھیکہ نہ دیا جائے گا اور نمبردار تو پولیس کے قدیمی اور خاندانی گرگے تھے۔ جن کا کام ہی پولیس کو امداد اور جھوٹی شہادتیں دینا ہے۔

لالہ جوت رام نے جب یہ تمام حالات بتائے تو ایڈیٹر "ریاست" نے پوچھا کہ کیا آپ وہ دو سو روپیہ اس زمانے میں لے چکے ہیں یا نہیں۔ لالہ صاحب نے کہا "ہاں"۔ ایڈیٹر "ریاست" نے پوچھا۔ کیا آپ کو رسید دینے میں کوئی اعتراض ہے۔ آپ نے کہا کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ لالہ جوت رام نے رسیدی ٹکٹ لگا کر رسید لکھ دی کہ دوسو روپیہ جو حساب میں دیوان سنگھ کے ذمے تھا۔ اس زمانہ میں ہی کارڈ لکھنے کے چند روز بعد آپ نے واپس لے لیا تھا۔ اور اس کے بعد ایڈیٹر "ریاست" کے ذمہ کوئی روپیہ نہ تھا۔ اس رسید کے بعد لالہ جوت رام کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ مانسہ میں وہ پولیس کو بیان دے چکے تھے کہ دیوان سنگھ نے امانت میں خیانت کا جرم کیا۔ یہاں انہوں نے رسید لکھ دی۔ آپ مہاجنہ پٹیالہ کی رعیت اور مہاراجہ پٹیالہ دیوان سنگھ کے دشمن۔ یہ سب کچھ تھا مگر بہادر اور دوست پرست جوت رام دوستی اور سچائی کے لیے مصائب کو لبیک کہنے کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ لالہ جوت رام ایڈیٹر "ریاست" کو رسید دے کر تمام حالات بتا کر اور دو تین دن ایڈیٹر "ریاست" کے مہمان رہ کر واپس مانسہ چلے گئے۔

ایڈیٹر "ریاست" کا یہ تجربہ ہے کہ جب کبھی اس نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی لوگ بغیر مواقعہ...

Marfat.com

کے بھی اس کے ہمدرد ہو گئے اور کوئی ریاست ایسی نہیں کہ جو اس کے خلاف ہو اور وہاں کے لوگ اس کے ہمدرد اور معاون ثابت نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ یہی کیفیت پٹیالہ کے متعلق تھی۔ لالہ جوت رام کے دہلی سے جانے کے چند روز بعد پٹیالہ سے ایک سب انسپکٹر پولیس کا پرائیویٹ پیغام ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پہنچا۔ کہ پٹیالہ پولیس لالہ جوت رام کے بیان کی بنیادوں پر مقدمہ کی تکمیل کر رہی ہے اور کوشش جاری ہے کہ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب اس مقدمہ میں ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق دیوان سنگھ کو ریاست پٹیالہ کے حوالہ کر دیں تاکہ مہاراجہ پٹیالہ دیوان سنگھ سے پٹیالہ جیل میں انتقام لے سکیں۔

اس اطلاع کے چند روز بعد ایڈیٹر "ریاست" ایک روز صبح چھ بجے اخبار کے لیے مضامین لکھ رہا تھا تو دیکھا۔ کہ دفتر "ریاست" اور رہائشی مکان (اس زمانہ میں دونوں دریا گنج کی ایک کوٹھی میں تھے) کا پولیس نے محاصرہ کر لیا ہے اور دہلی سی آئی ڈی کے انسپکٹر مسٹر نذیر الحق۔ پٹیالہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر فضل کریم اور دو درجن کے قریب دہلی اور پٹیالہ کے سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل موجود ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے نذیر الحق صاحب سے پوچھا، معاملہ کیا ہے تو آپ نے بتایا کہ ریاست پٹیالہ نے امانت میں خیانت کا ایک مقدمہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف چلایا ہے۔ اس سلسلہ میں ہی تلاشی اور گرفتاری ہوگی۔ نذیر الحق صاحب کے بتانے پر ایڈیٹر "ریاست" نے کہا کہ سب سے پہلے آئرن سیف میں سے لالہ جوت رام کی رسید لے لی جائے۔ چنانچہ رسید لے لی گئی۔ اور اس پر نذیر الحق صاحب اور مسٹر فضل کریم اور گواہوں کے دستخط ہو گئے لالہ جوت رام کی رسید دیکھ کر فضل کریم صاحب کے "چھکے" چھوٹ گئے۔ یہ پولیس کے کام میں بہت ہوشیار تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مقدمہ تیار کرنے کی تمام محنت پر پانی پھر گیا۔ دفتر میں سامان بہت تھا۔ سورج کے غروب ہونے تک تلاشی ہوتی رہی۔ مگر ابھی کئی کمرے باقی تھے۔ اس لیے بقایا کمروں کو تالا لگا کر پہرہ لگا دیا گیا۔ تاکہ اگلے روز صبح پھر تلاشی ہو۔ تلاشی کی یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ دہلی کے اخبارات کے ایڈیٹر اور دوست احباب دن بھر جمع رہے۔ رات کو آٹھ بجے کے قریب نذیر الحق صاحب ایڈیٹر "ریاست" کو کوتوالی لے گئے۔ "ملزم" کو اس زمانہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ملک دیوی دیال کے سپرد کر دیا گیا اور فضل کریم صاحب نے ڈپٹی صاحب سے کہا۔ کہ ملزم کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔ ملک صاحب اپنے کام میں بہت ہوشیار اور نیک شخصیت تھے۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ حوالات میں بند کرنا دہلی پولیس کا کام ہے۔ آپ ہوٹل میں جا کر آرام کیجیے اور صبح پھر تلاشی کے لیے تشریف لائیے۔ فضل کریم صاحب کے فاتحانہ انداز میں ہوٹل جانے کے بعد ملک دیوی دیال نے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی مسٹر مارگن کو ٹیلی فون پر کہا۔ کہ دیوان سنگھ بہت بڑا اخبار نویس ہے اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے اکثر ممبر اس کے دوست ہیں اور مقدمہ کی کیفیت یہ ہے کہ زیر بحث الزام کے متعلق ملزم نے مستغیث کی رسید پیش کر دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مقدمہ کا کوئی وجود نہیں رہا۔ پٹیالہ والے چاہتے ہیں کہ ملزم کو حوالات میں بند کر دیا جائے معاملہ بہت اہم ہے۔ ممکن ہے کل کو لوکل پولیس اور لوکل گورنمنٹ کے لیے اسمبلی یا کونسل آف سٹیٹ میں جواب دینا مشکل ہو جائے۔ سوچ لیجیے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ملزم کو حوالات میں بند کر دوں یا نہ کروں۔ مسٹر مارگن نے ڈپٹی کمشنر مسٹر جانسن کو ٹیلیفون کیا تمام

Marfat.com

حالات بتائے۔ مسٹر جانسن نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ اور حکم دیا۔ کہ ملزم کو پانچ سو روپیہ کی ضمانت پر فوراً رہا کر دیا جائے۔ یہ اطلاع ملک دیوی دیال کو رات کے دس بجے کے قریب پہنچی۔ ملک صاحب نے ایڈیٹر "ریاست" اور اس کے ضامن مسٹر کرشن داس کو ہی مینجر "مسل کال" (جو اس وقت "ہندوستان ٹائمز" کے مینجر تھے) کو موٹر میں ساتھ لیا۔ ہم لوگ رات کو گیارہ بجے کے قریب مسٹر لوئیس سٹی مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچے۔ مسٹر لوئیس کو جگایا۔ ضمانت تصدیق کی گئی اور ملک صاحب اسی موٹر میں ایڈیٹر "ریاست" کو دفتر "ریاست" میں چھوڑ گئے۔

مسٹر فضل کریم صبح اٹھتے ہی دفتر "ریاست" میں پہنچے تاکہ پٹیالہ کی اپنی امت سے خیر خیریت پوچھیں۔ جو رات بھر دفتر "ریاست" کی نگرانی کرتی رہی۔ آپ نے جب دیکھا کہ ایڈیٹر "ریاست" بجائے حوالات کے اپنے گھر پر ہے ان کا رنگ فق ہو گیا۔ بھاگے ہوئے کوتوالی گئے۔ ملک دیوی دیال سے پوچھا تو ملک صاحب نے بتایا۔ کہ ملزم کو ڈپٹی کمشنر کے حکم سے ضمانت پر رہا گیا ہے۔ فضل کریم صاحب کیا کر سکتے تھے۔ اپنا سر پکڑ کر رہ گئے۔

اگلے روز پھر تلاشی ہوئی جو چند گھنٹے جاری رہی۔ تلاشی کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے مسٹر و بدموتی ممبر کونسل آف سٹیٹ (جو ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے) سے مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد دیوان گیان ناتھ سیکرٹری ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب (جو بعد میں اندور میں وزیر اعظم ہوئے) کو لاہور ٹیلیفون کیا کہ کرنل سینٹ جان ایجنٹ گورنر جنرل کہاں ہیں۔ دیوان صاحب نے بتایا کہ وہ شملہ میں ہیں اور وہاں کرزن ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" رات کو دہلی سے سوار ہو کر صبح کالکا پہنچا۔ کالکا سے موٹر ریل میں دس بجے کے قریب شملہ پہنچا اور وہاں سے کرزن ہاؤس میں ٹیلیفون کیا تو ایک لیڈی نے بتایا۔ کہ کرنل سینٹ جان آج صبح بذریعہ موٹر ڈلہوزی چلے گئے ہیں اور دو روز وہاں ٹھہر کر ریاست چمبہ کے دورہ پر جائیں گے۔ ایڈیٹر "ریاست" اسی روز صبح ڈلہوزی پہنچ کر چمبہ ہاؤس میں کرنل سینٹ جان سے ملنے گیا۔ چمبہ ہاؤس پہنچ کر چپراسی کو وزٹنگ کارڈ دیا تو مسز سینٹ جان برآمدہ میں آ گئیں۔ یہ خاتون بہت اچھی طرح سے پیش آئیں۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں اور چائے وغیرہ پوچھی میں نے کہا کہ میں ابھی ہوٹل میں پی کر آیا ہوں۔ مسز سینٹ جان نے اپنے شوہر کو اطلاع کی تو ان کے شوہر نے دفتر کے کمرہ میں بلا لیا۔ میں نے کرنل سینٹ جان کو بتایا کہ یہ مقدمہ جھوٹا اور بے بنیاد ہے اور چونکہ مہاراجہ پٹیالہ دشمن ہیں اس لیے یہ مقدمہ بنایا گیا۔ تاکہ مہاراجہ ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے ماتحت ظلم کرنے کے لیے مجھے پٹیالہ لے جائیں۔

کرنل سینٹ جان کی باتوں سے معلوم ہوا۔ کہ اس مقدمہ کے متعلق مہاراجہ پٹیالہ یا ان کے وزراء میں سے کسی سے ان کی بات ہو چکی ہے بلکہ ان کی منظوری سے کارروائی شروع کی گئی ہے اور ان کو تمام واقعات کا علم ہے۔ کرنل سینٹ جان نے صاف طور سے کہا کہ مقدمہ چاہے جھوٹا ہے یا سچا، گورنمنٹ کسی صورت میں بھی والیان ریاست کو بے نقاب ہوتا دیکھ نہیں سکتی۔ اور وہ ایڈیٹر "ریاست" کو ایکسٹراڈیشن ایکٹ

Marfat.com

کے تحت لازمی طور سے ریاست پٹیالہ کے حوالے کر دے گی۔ ایڈیٹر "ریاست" نے کہا کہ کیا برطانوی انصاف یہی ہے تو کرنل سینٹ جان نے فوجی انداز میں جواب دیا۔ "ہم انصاف نہیں جانتا۔ ہمارا کام ہے کہ نوابوں اور مہاراجوں کی پریس کے حملوں سے حفاظت کی جائے۔"

یہ جواب سن کر میں سمجھ گیا کہ ایجنٹ گورنر اور مہاراجہ پٹیالہ ایک ہیں۔ اور اگر ایجنٹ گورنر جنرل نے ایڈیٹر "ریاست" کو مہاراجہ کے حوالہ کر دیا تو اس حکم میں ہائی کورٹ بھی دخل نہیں دے سکتا۔ اور ایجنٹ گورنر جنرل کے حکم کے مطابق اگر ایڈیٹر "ریاست" کو پٹیالہ بھیج دیا گیا تو وہاں دشمن کے جیل کا ایک دن بھی سالہا سال کی ہر روز کی موت سے زیادہ عذاب کا باعث ہو گا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چاہیے کچھ بھی ہو میں اپنے آپ کو پٹیالہ کے حوالہ نہ ہونے دوں گا۔

ڈلہوزی سے سوار ہو کر تانگہ میں پٹھان کوٹ پہنچا۔ کیونکہ وہاں کوئی موٹر یا لاری نہ مل سکی۔ پٹھانکوٹ سے ریل شروع ہوتی ہے مگر میں ریل میں نہ بیٹھا۔ خیال تھا کہ شاید پٹیالہ پولیس نے ایجنٹ گورنر جنرل سے وارنٹ حاصل کر لیے ہوں۔ پٹھان کوٹ سے لاری میں سوار ہوا۔ امرتسر پہنچا۔ امرتسر سے دوسری لاری پر سوار ہوا۔ جالندھر چھاؤنی پہنچا۔ رات کو کلکتہ جانے والی گاڑی جب لاہور سے جالندھر چھاؤنی پہنچی تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر کوپے میں بیٹھ گیا۔ کمرہ کو اندر سے بند کر لیا۔ رات کو نیند نہ آئی۔ زندگی کا آئندہ پروگرام بناتا رہا۔ اگلے روز صبح دس بجے لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ ریلوے سٹیشن سے "انڈین ڈیلی ٹیلی گراف" کے دفتر میں گیا۔ وہاں اس اخبار کے ایڈیٹر مسٹر ننگا آر سے ملا۔ تمام حالات بتائے اور کہا کہ میں ہمیشہ کے لیے فرانس کے علاقہ پانڈی چری میں جا رہا ہوں۔ راستہ اور مدراس کے لوگوں سے ناواقف ہوں۔ میرے ساتھ پانڈی چری چلیے اور مجھے وہاں چھوڑ آیئے۔ مسٹر ننگا آر میرے گہرے دوست تھے فوراً تیار ہو گئے۔ ہم لکھنؤ سے کانپور گئے۔ کانپور سے جھانسی۔ جھانسی صبح کے وقت پہنچے۔ جھانسی سے سولہ میل کے فاصلے پر ریاست دتیا ہے۔ وہاں ایک ہم وطن اور دوست لالہ لبھن داس چوپڑہ ملازم تھے۔ جھانسی سے دتیا پہنچے۔ تاکہ اخبار، پریس اور حافظ آباد کی جو کچھ بھی تھوڑی بہت زمین مکان وغیرہ جائیداد ہے ان کے نام منتقل کر دوں کیونکہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ اب آئندہ زندگی میں ہندوستان کے برطانوی علاقہ میں نہ آسکوں گا۔

ہم دتیا لالہ لبھن داس چوپڑہ کے مکان پر پہنچے۔ لکھت پڑھت کے متعلق مشورہ ہو رہا تھا۔ تو ایک افسر نے ہمیں لالہ لبھن داس کے مکان پر بیٹھا دیکھا وہ صاحب قاضی سر عزیز الدین احمد دیوان دتیا کی کوٹھی پر ان سے ملنے کے لیے جا رہے تھے۔ انہوں نے قاضی صاحب سے ذکر کر دیا۔ کہ دیوان سنگھ آیا ہوا ہے اور لالہ لبھن داس چوپڑہ کے مکان پر ٹھہرا ہے۔ قاضی صاحب کو میرے آنے کا جب پتہ چلا تو قاضی صاحب نے اپنی موٹر بھیج کر ہمیں بلوایا۔ ہم جب پہنچے تو آپ نے دوستانہ شکایت کی کہ ان کو آنے کا پتہ کیوں نہ دیا۔

قاضی صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں مگر میرا دل پانڈی چری میں تھا۔ قاضی صاحب نے محسوس

Marfat.com

کیا کہ میں کچھ متفکر ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ متفکر کیوں ہو؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ انہوں نے جب پھر بار بار پوچھا تو مسٹر رنگا آئر نے تمام قصہ سنا دیا۔ اور بتایا کہ آج رات تو ایکسپریس ٹرین سے ہم لوگ بمبئی جا رہے ہیں بمبئی سے مدراس جائیں گے اور وہاں سے پانڈی چری۔ قاضی صاحب اخبار "ریاست" کے نہ صرف مداح تھے بلکہ اس کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں پانڈی چری جا رہا ہوں اور اخبار "ریاست" بند ہو جائے گا۔ اور بند نہ بھی ہوا تو دیوان سنگھ اس کو آئندہ ایڈیٹ نہ کر سکے گا۔ تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ آپ کچھ دیر سوچتے رہے۔ سوچنے کے بعد فرمایا۔ کہ پٹیالہ اور دتیا کے درمیان ایکسٹراڈیشن کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں اور پٹیالہ کے وارنٹوں کی تعمیل دتیا کی حدود میں نہیں ہو سکتی اور ایڈیٹر "ریاست" قاضی صاحب یا ریاست دتیا کے مہمان کی صورت میں دتیا میں رہے۔ جب تک کہ اس جھگڑے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے قاضی صاحب سے عرض کیا۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ آپ کے دشمن ہو جائیں گے یا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اعتراض ہو۔ یہ مناسب نہیں۔ قاضی صاحب نے جواب دیا۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ کے تعلقات کو دیوان سنگھ کی دوستی پر قربان کیا جا سکتا ہے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے اعتراض کا وہ جواب دے دیں گے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ میں چند روز دتیا میں رہوں۔ ایک دوسرے دوست سردار تارا سنگھ انجینئر بھی وہاں ملازم تھے وہ مجھے موٹر میں اپنے ہاں لے گئے۔ میں نے ان کے مکان پر قیام کیا۔ مسٹر وید موورتی کو دہلی تار دیا گیا کہ آپ فوراً دتیا پہنچے۔ وہ دتیا پہنچ گئے۔ پھر سب نے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد اسی روز رات کو مسٹر وید موورتی شملہ گئے۔ اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ آپ نے اسمبلی کے تمام ممبران کو جو ان کے گہرے دوست تھے۔ حالات بتائے۔ ممبران اسمبلی حالات سن کر حیران رہ گئے۔ مسٹر نیوگی نے ایڈجرنمنٹ موشن پیش کر دی۔ مسٹر پٹیل اسمبلی کے صدر تھے۔ ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ ہوم ممبر کو بھی حالات کا کچھ پتہ نہ تھا وہ حیران تھا۔ کہ ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے اور دو سو روپیہ کے الزام میں ایک جرنلسٹ کو کیوں کر ایک دشمن ریاست کے حوالہ کیا جا رہا ہے۔ ہوم ممبر نے پریذیڈنٹ اسمبلی سے کہا۔ کہ تھوڑے عرصہ کی مہلت دی جائے۔ تاکہ پولیٹیکل سیکرٹری سے حالات معلوم کیے جا سکیں۔ مسٹر کولیٹن ڈائرکٹر انفرمیشن بیورو گورنمنٹ ہند تھے۔ ہوم ممبر کی ہدایت کے مطابق انہوں نے سر جان تھامسن پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند سے پوچھا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر ہوم ممبر کے یہ وعدہ کرنے پر التوا کی تحریک واپس لے لی گئی کہ جب تک اسمبلی میں اس مسئلہ پر بحث نہ ہو گی اور سوالات کے جوابات نہ دیئے جائیں گے۔ دیوان سنگھ کو ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے ماتحت پٹیالہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا۔

اسمبلی میں ہوم ممبر کے اس وعدہ پر سر جان تھامسن پولیٹیکل سیکرٹری نے کرنل سینٹ جان کو لاہور تار دیا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" کے معاملہ میں اس وقت تک کچھ نہ کیا جائے جب تک کہ پولیٹیکل سیکرٹری سے اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔ اور مسٹر وید موورتی نے ایڈیٹر "ریاست" کو دتیا تار دیا۔ کہ فوراً شملہ پہنچو اسمبلی کے ممبران مل کر خود حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں تار پہنچنے پر شملہ گیا۔ وہاں مسٹر بی داس۔ مسٹر

Marfat.com

ٹی سی گوسوامی (جو پچھلے دنوں بنگال میں منسٹر تھے۔ مسٹر راما ریڈی۔ مسٹر رنگا آئر، اور مسٹر نیوگی وغیرہ دوستوں سے ملا۔ تمام حالات بتائے۔ اسمبلی کے لیے سوالات تیار کیے گئے۔ ایک درجن کے قریب ممبروں نے سپلیمنٹری سوالات پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ نوٹس کے بعد سوالات دریافت کیے گئے اور ضمنی سوالات پوچھے گئے۔ مقدمہ کی نوعیت پر اکثر ممبروں نے مذاق اُڑایا۔ اور آخر ہوم ممبر نے یقین دلایا۔ کہ دیوان سنگھ کو اس مقدمہ میں پٹیالہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا۔

گورنمنٹ کے اس فیصلہ کے بعد مرحوم مہاراجہ پٹیالہ سر جان تھامپسن کے پاس پہنچے اور کہا کہ ریاست پٹیالہ کی بہت توہین ہوئی ہے اور اگر دیوان سنگھ کو پٹیالہ کے حوالہ نہ کیا جائے گا تو آپ گدی چھوڑ دیں گے۔ سر جان تھامپسن نے مہاراجہ کو ٹال دیا۔ اور جب مہاراجہ سر جان سے مل کر چلے گئے تو آپ نے ڈپٹی پولیٹیکل سیکرٹری مسٹر جی جے گلینسی (جو بعد میں سر برٹرینڈ گلینسی گورنر پنجاب تھے) سے کہا۔ کہ اگر مہاراجہ گدی چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیں۔ مگر ایک بکری کو بھیڑیئے کے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کتنی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

انگریزوں کا کیریکٹر

"ریاست" کا دفتر اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ ایک روز حافظ آباد سے میرے ایک قریبی رشتہ دار اور دوست سردار حاکم سنگھ کپور کا خط آیا۔ کہ حافظ آباد کا سب انسپکٹر پولیس یہ تحقیقات کر رہا ہے کہ دیوان سنگھ کی زمین۔ مکان وغیرہ جائیداد حافظ آباد میں کیا کچھ اور کتنی مالیت کی ہے۔ میں نے سمجھا کہ پولیس سیاسی کام کرنے والوں کی ہسٹری شیٹ تیار کرتی ہے اور اس کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لیے ہر سال اس میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ پہلے بھی کئی بار ایسی تحقیقات ہوتی رہی۔ اس سلسلہ میں ہی شاید اب جائیداد بھی معلوم کی جا رہی ہو۔ چنانچہ سردار حاکم سنگھ کو میں نے جواب دیا۔ کہ معمولی بات ہے۔ پولیس پتہ لیتی ہے تو لینے دو۔ جو پوچھتی ہے بتا دو۔

اس خط کے آنے کے دو ہفتہ بعد ایک روز راقم الحروف دفتر سے نیچے اترا۔ اور موٹر میں سوار ہو کر باہر جانے والا تھا۔ کہ دیوانی عدالت کے ایک پیادہ نے دو سمن دیئے۔ ایک سمن تو سول جج سکھر (سندھ) کی عدالت کا تھا جس میں لکھا تھا۔ کہ مسٹر ٹامٹن آئی سی ایس چیف منسٹر ریاست خیرپور (جو بعد میں گورنر بمبئی کے ایڈوائزر اور منسٹری معطل ہونے کے باعث صوبہ بمبئی کے سیاہ و سفید کے مالک تھے) نے دس ہزار روپے کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ فلاں تاریخ کو جواب دعویٰ کے لیے سکھر میں حاضر ہو جاؤ۔ دوسرا سمن یہ تھا۔ کہ اسی تاریخ کو حاضر ہو کر وجہ بتاؤ کہ مقدمہ کے فیصلہ سے پہلے یعنی قبل از ڈگری تمہاری حافظ آباد

Marfat.com

کی جائیداد کیوں نہ عارضی طور سے قرق کرلی جائے۔ تاکہ تم اس جائیداد کو خورد بُرد نہ کر سکو۔
میں نے دونوں سمنوں پر دستخط کر دیئے اور موٹر میں سیر کو چلا گیا۔

اس مقدمہ کے واقعات یہ ہیں کہ مرحوم ہز ہائی نس میر صاحب خیرپور دہلی میں آئے۔ تو ایک روز ملنے کے لیے دفتر "ریاست" میں بھی تشریف لائے۔ میر صاحب کا وزن مرحوم مولانا شوکت علی سے دوگنے کے قریب تھا۔ آپ زینہ پر چڑھ نہ سکتے تھے۔ اپنی کار کو نیچے کھڑا کیا۔ اور اپنے اے ڈی سی کو اوپر بھیج کر راقم الحروف کو بلوایا۔ میں موجود نہ تھا۔ واپس چلے گئے۔ جب دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے تھے۔ چنانچہ اگلے روز ان کی جائے رہائش (جو دریا گنج میں ایک کوٹھی میں تھی) پر پہنچا۔ میر صاحب سے ملا دو گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ یہ اپنی مظلومیت کے حالات بتاتے رہے کہ ان کا وزیر اعظم مسٹر ٹامنٹن آئی سی ایس (جس کو بمبئی گورنمنٹ نے خیرپور میں پورے اختیارات کے ساتھ وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں ریاست خیرپور ریذیڈنٹ پنجاب کے ماتحت نہ تھی بلکہ سندھ میں ہونے کے باعث گورنر بمبئی کے ماتحت تھی) ان کو تنگ کر رہا ہے۔ اور یہ اپنے اس وزیر اعظم سے انتہائی پریشان ہیں۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ میر صاحب نے یہ بھی بتایا۔ کہ ان کے پاس ایک روز پہلے خیرپور سے یہ اطلاع آئی ہے کہ مسٹر ٹامنٹن شکار کو گئے ہوئے تھے۔ وہاں آپ نے کسی جانور پر بے احتیاطی کے ساتھ بندوق چلائی اور گولی ایک لڑکی کو لگی جو ہلاک ہو گئی۔ میر صاحب کی ذاتی تکلیفیں اور پریشانیاں تو ایڈیٹر "ریاست" کے لیے کچھ زیادہ دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ مگر ایک دیہاتی لڑکی کا گولی سے مار دیا جانا بہت افسوسناک تھا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے اس ہفتہ کے پرچہ میں ایک نوٹ لکھا جس میں تمام واقعہ لکھنے کے بعد تنقید کی گئی کہ انگریز آئی سی۔ ایس ریاستوں میں جا کر انسانوں کو بھی جانوروں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ اور بے احتیاطی کے ساتھ معصوم لڑکیوں تک کو گولیوں سے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ "ریاست" میں یہ نوٹ چھپ گیا تو میر صاحب کو ان کے ایک ملازم نے خیرپور سے اطلاع دی کہ وہ لڑکی مری نہیں بلکہ چھرّوں سے صرف زخمی ہوئی اور چھرّے ہسپتال میں ڈاکٹر نے نکال دیئے۔ چنانچہ اگلے ہفتہ ہی اس نوٹ کے متعلق لکھ دیا گیا کہ لڑکی کے مرنے کا واقعہ غلط ہے۔ لڑکی چھرّوں سے زخمی ہوئی تھی اور چھرّے نکال دیئے گئے۔

پہلے نوٹ کے چھپنے کے بعد دہلی گورنمنٹ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ (جو اس زمانہ میں مرزا عبدالرحمٰن تھے۔) نے اپنی ڈیوٹی سمجھتے ہوئے اس نوٹ کا کٹنگ اور اس کا ترجمہ بمبئی گورنمنٹ کو بھیجا۔ بمبئی گورنمنٹ نے مسٹر ٹامنٹن سے جواب طلب کیا۔ کیونکہ الزام ایک لڑکی کو ہلاک کرنے کا تھا۔ مسٹر ٹامنٹن نے جواب دیا۔ کہ الزام غلط ہے۔ انہوں نے کسی لڑکی کو ہلاک نہیں کیا۔ صرف ایک دو چھرّے لگے جو نکال دیئے گئے اس جواب کے بعد بمبئی گورنمنٹ نے مسٹر ٹامنٹن سے کہا کہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے سرکاری خرچ سے ایڈیٹر "ریاست" پر دیوانی مقدمہ دائر کرو۔ چنانچہ سکھر کا سرکاری وکیل مقدمہ کی پیروی کے لیے مقرر ہوا اور سرکاری کورٹ فیس لگا کر مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ہی مقدمہ سے پہلے حافظ آباد کی جائیداد دریافت کی گئی اور سمن پہنچے۔

Marfat.com

مقدمہ کی تاریخ سے تین چار روز پہلے ایڈیٹر "ریاست" مسٹر برج بہاری توکلی ایڈووکیٹ دہلی اور مسٹر بشن داس چوپڑہ (جو بعد میں خطاب یافتہ رائے صاحب اور ریاست بیکانیر میں ریونیو کمشنر تھے) سکھر گئے۔ وہاں روہڑی جنکشن کے ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں قیام کیا۔ میں اور توکلی صاحب تو سکھر گئے تاکہ کوئی مقامی وکیل بھی مقرر کیا جائے اور لالہ بشن داس خیرپور گئے۔ تاکہ وہاں کے سٹیٹ انجینئر مسٹر ساہنی سے مل کر مسٹر نائٹن سے صلح وصفائی اور مقدمہ واپس لینے کی گفت وشنید کی جائے۔

لالہ بشن داس جب واپس آئے تو انہوں نے بتایا۔ کہ صلح وصفائی کا کوئی سوال نہیں۔ مسٹر ساہنی نے بہت کوشش کی مگر مسٹر نائٹن نہیں مانتے۔ وہ اپنی بہت سخت توہین سمجھتے ہیں کہ ان پر لڑکی کو ہلاک کرنے کا الزام لگایا گیا۔ سکھر میں ہم لوگ جب عدالت میں گئے تو مسٹر توکلی نے پرائیویٹ طور سے سرکاری وکیل سے کہا۔ کہ بطور ایک غیر جانبدار جرنلسٹ کے ایڈیٹر "ریاست" نے اپنے پرچہ کی اگلی اشاعت میں ہی جب کہ اس کو علم ہوا لڑکی کے مرنے کی تردید کر دی۔ اور چھوٹوں سے مسٹر نائٹن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں مقدمہ واپس لے لیا جائے مگر سرکاری وکیل نے اپنی بے لبسی کا اظہار کیا اور کہا کہ مسٹر نائٹن کسی صورت میں بھی مقدمہ واپس نہ لیں گے۔ وہ بہت سخت غصہ میں ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کی سخت توہین ہوئی۔

ہم لوگ مقدمہ کی پیشی کے بعد واپس دہلی آ گئے۔ اگلے روز راقم الحروف شام کو مسٹر کے سی رائے مینجنگ ڈائرکٹر ایسوسی ایٹڈ پریس (جن سے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور جن سے ایڈیٹر "ریاست" دوسرے تیسرے روز ملا کرتا تھا) کے ہاں گیا۔ تو مسٹر رائے نے کئی روز نہ ملنے کا سبب پوچھا۔ میں نے بتایا۔ کہ مقدمہ کی پیشی پر سکھر گیا ہوا تھا۔ آپ نے مقدمہ کے تمام حالات سنے تو پوچھا کہ مسٹر نائٹن کس صوبہ کی سول سروس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا بمبئی کے صوبہ سے۔ وہاں سے ہی بطور لینٹ آفیسر خیرپور میں گئے اور ریاست خیرپور گورنر بمبئی کے ماتحت ہے۔ مسٹر رائے نے فرمایا۔ کہ بمبئی گورنمنٹ میں ان کے دو افسر بہت گہرے دوست ہیں۔ ایک سر ارنیسٹ ہاٹسن ہوم ممبر (جو گورنر کے رخصت پر ولایت جانے کے باعث عارضی طور سے ان دنوں گورنر بمبئی تھے) اور دوسرے مسٹر لوئنگ جنرل سیکرٹری بمبئی گورنمنٹ۔ ان دونوں کے نام خط لے کر بمبئی جاؤ۔ تاکہ مقدمہ واپس لیا جائے۔ دو تین روز کے بعد مسٹر رائے نے دونوں اصحاب کے نام مجھے خط دیئے۔ جن میں لکھا تھا۔ کہ دیوان سنگھ آپ کا گہرا دوست ہے۔ اور یہ مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ ایڈیٹر "ریاست" یہ خط لے کر بمبئی گیا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ نہ تو گورنر ارنیسٹ ہاٹسن وہاں ہیں۔ نہ مسٹر لوئنگ، دونوں بمبئی گورنمنٹ کے گرمائی صدر مقام مہابلیشور پہاڑ پر ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" بمبئی سے پونا گیا۔ پونا سے موٹر کے ذریعے مہابلیشور پہنچا۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ جس کا مالک پارسی تھا۔ غسل کر کے کپڑے بدلے اور مسٹر لوئنگ کے پاس پہنچا۔ مسٹر لوئنگ نہایت شریف۔ ملنسار اور اچھے آدمی تھے۔ مسٹر رائے کا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور کچھ دیر مسٹر رائے کی صحت کے متعلق پوچھتے رہے۔ آپ نے

Marfat.com

بتایا کہ ریاستوں کا محکمہ مسٹر ٹرنر آئی سی ایس پولیٹیکل سیکرٹری بمبئی گورنمنٹ کے ماتحت ہے۔ جو کچھ مسٹر رائے چاہتے ہیں۔ مسٹر ٹرنر کر دیں گے اور سر ازلیسٹ ہالسن سے ملنے کی ضرورت نہیں چنانچہ مسٹر یوٹنگ نے ٹیلیفون پر مسٹر ٹرنر کو کہا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" آرہا ہے۔ اس سے مل لیا جائے۔ اور مسٹر رائے کی خواہش کے مطابق مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ مسٹر یوٹنگ نے مسٹر ٹرنر کو ٹیلیفون کرنے کے علاوہ ایک خط بھی دیا۔ اور ساتھ مسٹر رائے کا خط بھی اس خط میں ملفوف کر دیا۔ میں یہ خط لے کر مسٹر ٹرنر کے پاس پہنچا۔ تھوڑی تھوڑی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مسٹر ٹرنر برآمدہ میں بیٹھے سرکاری فائلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ فوراً بلا لیا۔ مسٹر ٹرنر بہت تند مزاج اور متعصب قسم کے آئی سی ایس تھے۔ آپ نے کہا۔ کہ لڑکی کو ہلاک کرنے کی اطلاع کہاں سے ملی۔ میں نے جواب دیا۔ میں اس کے متعلق کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ یہ صحافتی کیریکٹر کے خلاف ہے۔ آپ نے کہا کہ مسٹر نانٹن کا بیان ہے کہ میر صاحب خیرپور نے یہ اطلاع دی۔ میں نے کہا۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر وہ غصہ میں آگئے اور کہا کہ میر خیرپور جیسے ناقابل اعتبار آدمی کا کیوں اعتبار کیا گیا۔ میں نے کہا۔ کہ میں اس کا اقرار نہیں کرتا۔ کہ میر خیرپور نے مجھے بتایا۔ مگر چونکہ آپ کہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر میر خیرپور اتنے ہی ناقابل اعتبار ہیں تو گورنمنٹ کے کاغذات میں وہ ہز ہائینس کیوں ہیں اور ان کی توپوں کی سلامی کیوں مقرر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ گورنمنٹ ریاستوں کی بے زبان رعایا کو ناقابلِ اعتبار والیانِ ریاست کے سپرد اس طرح کرتی ہے جیسے بھیڑوں کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا جائے۔ میرا یہ جواب سن کر مسٹر ٹرنر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ وہ توقع نہ کرتے تھے۔ کہ یہ الفاظ اُن سے وہ شخص کہے گا جو مقدمہ میں صلح کی درخواست کر رہا ہو۔ اس کے بعد مسٹر ٹرنر نے کہا۔ کہ اخبارات کے حملے سے انڈین سول سروس کے افسر بھی محفوظ نہیں۔ میں نے کہا۔ کہ مسٹر نانٹن سے کوئی عداوت نہ تھی۔ بغیر واقعہ کے الزام نہیں لگایا گیا۔ مسٹر نانٹن کی بندوق سے لڑکی زخمی ہوئی اور جب یہ معلوم ہُوا کہ لڑکی مری نہیں زخمی ہوئی تو فوراً لکھ دیا گیا۔ کہ مرنے کی اطلاع غلط تھی صرف زخمی ہوئی۔ اس میں اخبار کا کیا قصور ہے۔ مسٹر ٹرنر نے جواب دیا۔ کہ گورنمنٹ کسی قیمت پر بھی اخبارات کے آئی۔ سی۔ ایس افسروں کے خلاف لکھنے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مسٹر ٹرنر میرے جواب سے بہت غصہ میں تھے۔ آپ نے کہا۔ کہ مقدمہ کبھی واپس نہیں لیا جا سکتا۔ جس صورت میں کہ ایڈیٹر "ریاست" کا رویہ یہ ہے۔ میں نے کہا کہ میرے لیے جھوٹی خوشامد کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور کھڑے ہوتے ہی کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنا اور آپ کا وقت ضائع کیا۔ مجھے آپ سے ملنا نہ چاہیئے تھا۔ مسٹر ٹرنر میرے اس جواب سے اور بھی حیران ہوئے۔ وہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔ کہ ایسا جواب ملے گا۔ میں جب چلا تو وہ حیرانی کے عالم میں میری پشت دیکھتے رہے۔ اور میں جب ان کی کوٹھی سے مڑا تو میں نے دیکھا۔ کہ ان کی نگاہیں میری طرف تھیں۔ میں نے مسٹر ٹرنر کے اس جواب کے بعد مسٹر یوٹنگ کو ملنا مناسب نہ سمجھا اور دل میں فیصلہ کیا۔ کہ دس ہزار روپیہ کی ڈگری کا روپیہ مسٹر نانٹن کو ادا کر دوں گا۔ مہابلیشور سے واپس پونا پہنچا وہاں سے واپس دہلی آیا۔ مسٹر رائے کو تمام واقعہ سنایا۔ مسٹر رائے کو افسوس تھا۔ کہ میں سر ازلیسٹ ہالسن گورنر سے نہ ملا۔ میں نے کہا۔ کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ

Marfat.com

ڈگری کا دعویٰ کا مگر ملوں گا نہیں۔

ایک ہفتہ کے بعد پھر پیشی پر سکھر گیا اور فیصلہ کیا۔ کہ مقدمہ اچھی طرح سے لڑا جائے۔ دو ہفتہ بعد میں اور مسٹر توکلی پھر سکھر گئے۔ روہڑی ریلوے ویٹنگ روم میں ٹھہرے۔ کیونکہ یہ جگہ سٹیشن سے بلند بہت پُرفضا مقام پر ہے۔ دس بجے سکھر سول جج کی کورٹ میں گئے۔ اور عدالت کے اہلمد سے پوچھا۔ کہ پیشی کس وقت ہوگی۔ تو اہلمد نے بتایا۔ کہ سرکاری وکیل کا منشی مجھے تلاش کر رہا تھا۔ وکیلوں کے بیٹھنے کی جگہ پر گئے سرکاری وکیل کے منشی کو تلاش کیا تو اس نے کہا کہ سرکاری وکیل ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سرکاری وکیل کے پاس گئے تو اس نے بتایا۔ کہ بمبئی گورنمنٹ کا حکم اس کے پاس پہنچا ہے کہ کورٹ فیس وغیرہ پر جو کچھ خرچ ہُوا ہے۔ وہ لے کر مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ کورٹ فیس اور سرکاری وکیل کی فیس چودہ سو روپیہ جو گورنمنٹ نے ادا کی تھی وہ ہم نے سرکاری وکیل کو دی۔ عدالت میں گئے۔ سرکاری وکیل نے مقدمہ واپس لینے کے لیے عدالت سے درخواست کی۔ مقدمہ واپس لیا گیا اور ہم واپس دہلی آ گئے۔

مسٹر ٹرزا اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان گو باتیں کچھ تلخی کے ساتھ ہوئیں اور ایڈیٹر "ریاست" سخت جواب دے کر مسٹر ٹرز سے جدا ہو گیا۔ مگر آپ نے میرے جانے کے بعد سرکاری وکیل سکھر کے نام حکم لکھ دیا۔ کہ جو روپیہ گورنمنٹ کا خرچ ہُوا ہے وہ لے کر مقدمہ واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ ایک صورت تو وہ تھی۔ کہ ہم مسٹر نانکن مدعی سے مقدمہ واپس لینے کی درخواستیں کرتے رہے مگر وہ صلح پر آمادہ نہ ہوتے تھے اور ایک صورت یہ کہ سرکاری وکیل کا منشی صلح کے لیے ہمیں تلاش کرتا رہا۔ یہ سب کچھ مسٹر رائے کی کوشش دوست نوازی اور محبت کا نتیجہ تھا۔ اور اس واقعہ سے انگریزوں کے قومی کیریکٹر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ اور اگر بات چیت میں تعلقات شریفانہ طریقہ سے ناخوشگوار بھی ہو جائیں تو ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور وہ بطور ایک سپورٹس مین اپنی اور دوسروں کی کمزوریوں سے درگزر کرتے ہیں۔

مہاراجہ نابھہ کی نظر بندی کا سبب

مہاتما گاندھی کا پوسٹ کارڈ

مرحوم مہاراجہ نابھہ میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں مگر آپ کی معزولی کا اصلی باعث پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ آپ ابھی ولی عہد ہی تھے۔ گورنمنٹ نے تو اپنی حمایت کے لیے آپ کو سنٹرل اسمبلی (جو اس وقت امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے نام سے تھی۔) کا ممبر نامزد کیا۔ مگر آپ اسمبلی میں گورنمنٹ کا ساتھ چھوڑ کر مرحوم مسٹر گوکھلے کے ساتھ مخالف بنچوں پر جا بیٹھے۔ چنانچہ آپ کے مصائب کی بسم اللہ یہاں سے ہوتی ہے۔ آپ کے ولی عہدی کے زمانہ میں ہی سر لوئیس ڈین گورنر پنجاب (جن کے ماتحت ان دنوں پنجاب کی ریاستیں

Marfat.com

تھیں) نے گورنمنٹ آف انڈیا کو رپورٹ کی تھی کہ مہاراجہ نابھہ (یعنی مرحوم مہاراجہ نابھہ) کو جب گدی پر بٹھانے کا زمانہ آئے تو یہ غور کر لیا جائے کہ یہ گورنمنٹ کے خلاف ہیں۔ وفا شعار نہیں۔ اس کے بعد کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی اور نتیجہ آپ کی معزولی کی صورت میں ہُوا۔ آپ کی معزولی کی داستان بہت طویل ہے۔ اس کے چشم دید حالات میں پھر عرض کروں گا۔ کیونکہ میں معزولی کے وقت نابھہ میں موجود تھا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہُوا۔ میرے اس لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بقول مرحوم مولانا محمد علی (جیسا کہ آپ نے اپنی کانگریس کی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا) مہاراجہ کی معزولی کا سبب آپ کی صفات (یعنی حب الوطنی اور خودداری) تھیں۔ نہ کہ آپ کے نقائص (جن کو سامنے رکھ کر گورنمنٹ نے آپ کو معزول کیا) کیونکہ اگر ان نقائص کی بنا پر دوسرے الیانِ ریاست کو بھی سزا دی جاتی۔ تو شاید ایک والیٔ ریاست بھی گدی پر حکمران نہ رہتا۔

مہاراجہ نابھہ نے اپنی معزولی کے بعد گورنمنٹ کے حکام سے تو تعاون کرنا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور آپ اس کوشش میں رہے کہ کانگریس اور پارلیمنٹ کے لیبر ممبروں کے ذریعے انصاف حاصل کریں چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ کی دعوت پر سر چمن لعل سیتلواد اور مرحوم پنڈت موتی لال نہرو۔ مسٹر رنگا آئر۔ مسٹر جناح۔ سردار سردول سنگھ کویشر۔ ماسٹر تارا سنگھ۔ مولانا محمد علی۔ سر سنکرانائر۔ سر سی۔ پی راما سوامی آئر وغیرہ درجنوں ہندوستانی لیڈر اور مسٹر مارڈی جونس اور مسٹر تھر ٹل وغیرہ ممبرانِ پارلیمنٹ مہاراجہ سے ملے اور ان لوگوں میں سے اکثر نے مختلف طریقوں سے مہاراجہ سے روپیہ بھی حاصل کیا۔ چنانچہ بعض اصحاب نے تو ایک ایک دو دو لاکھ روپیہ بھی گدی پر واپس بٹھانے کے نام پر وصول کیا۔

مہاراجہ نابھہ ان تمام اصحاب کی معرفت کوشش کرتے رہے۔ کبھی پارلیمنٹ میں سوالات کبھی اسمبلی میں تقریریں۔ کبھی میمو ریل۔ کبھی ڈیپوٹیشن مگر نتیجہ کچھ نہ ملا۔ کیونکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کے خلاف تھا۔ مہاراجہ کو مشورہ دیا گیا۔ کہ اگر مہاتما گاندھی آپ کے مسئلہ میں دلچسپی لیں تو آپ گدی پر واپس جا سکتے ہیں۔ چنانچہ مہاتما گاندھی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کی مسوری میں دعوتیں ہوئیں مرحوم مولانا محمد علی نے مہاتما جی سے کہا۔ مختلف ممبرانِ اسمبلی اور لیڈروں کے ذریعے اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ سردار سردول سنگھ کویشر اس سلسلہ میں کئی بار مہاتما جی سے ملے اور مہاراجہ نے اپنی مظلومیت کے متعلق نہ صرف تمام مطبوعہ لٹریچر بھیجا جو چھپایا گیا تھا بلکہ ٹائپ کرا کر بہت طویل خطوط بھی مہاتما جی کو لکھے کہ آپ اس مسئلہ پر ذاتی توجہ کیجئے اور وائسرائے سے مل کر گدی پر واپس بھجوائیے۔

اس تمام لٹریچر، اثرات اور خط و کتابت کے بعد مہاتما جی کا ایک پوسٹ کارڈ مہاراجہ نابھہ کے نام مسوری پہنچا جس پر صرف دو چار سطریں پنسل سے لکھی تھیں اور جن کا مطلب یہ تھا۔ کہ تمام لٹریچر اور خطوط پڑھنے اور حالات سننے کے بعد مہاتما جی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مہاراجہ نابھہ کانگریس یا مہاتما گاندھی کی امداد کے مستحق نہیں۔

مہاتما گاندھی تو ہر شخص کو اپنے کیریکٹر کی بلندی کے پیمانہ سے ناپتے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ مہاراجہ نابھہ چونکہ انسانی کمزوریوں سے پاک نہیں ہیں اس لیے وہ مہاتما جی یا کانگریس کی ہمدردی اور امداد کے مستحق نہیں مگر یہ پنسل کا لکھا ہُوا پوسٹ کارڈ ہی مہاراجہ نابھہ کی مزید تباہی اور کوڈائی کنال میں نظربندی کا باعث ہُوا۔ مہاراجہ

Marfat.com

کی ڈاک سنسر ہوتی تھی۔ اس کارڈ کا فوٹو گورنمنٹ کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد گورنمنٹ نے فیصلہ کیا۔ کہ مہاراجہ کو ہمیشہ کے لیے کسی دور دراز مقام پر نظربند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک دوسرا الزام لگا کر آپ کو کوڈائی کنال میں نظربند کر دیا گیا۔ جہاں سے آپ اپنے مرتے دم تک رہا نہ کیے گئے اور وہیں نظربندی کی حالت میں ہی انتقال کر گئے۔

روپیہ سے محبت نہ کرو

دہلی سے روزانہ "ریاست" جاری کرنے سے پہلے راقم الحروف لکھنؤ، کانپور اور الہ آباد اس غرض کے لیے گیا۔ کہ اگر کسی پریس کا انتظام ہو جائے تو وہاں سے روزانہ اخبار جاری کیا جائے۔ اس زمانہ میں پریس ایکٹ بہت سخت تھا۔ کسی پریس میں بھی اخبار کے چھاپنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ میں اس سلسلہ میں جب الہ آباد گیا تو سید اکبر الہ آبادی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میں رات کو تو ایک سرائے میں سوتا تھا۔ جہاں ایک کوٹھڑی کرایہ پر لے رکھی تھی۔ مگر دن بھر اکبر صاحب کی خدمت میں عشرت منزل رہتا۔ میں چار پانچ روز رہا۔ حضرت اکبر جیسے شاعروں اور فلاسفروں کو دنیا صدیوں کے بعد پیدا کرتی ہے۔ اکبر تمثیل دینے کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ایک روز فیاضی اور کنجوسی کے فلسفہ پر باتیں ہو رہی تھیں تو آپ نے فرمایا۔ روپیہ سے اتنی محبت کرنی چاہیئے جتنی ایک انگریز اپنے بہرا یا خانساماں سے کرتا ہے۔ یعنی جب بہرا یا خانساماں سے کام لینا ہو تو انگریز بہرا اور خانساماں کو اپنے کمرہ میں اپنے پاس بلا لیتا ہے مگر جب کام نکل جائے تو اس بہرا یا خانساماں کو صاحب کے کمرے میں ایک منٹ بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یعنی روپیہ سے کام لو مگر اس سے محبت نہ کرو۔

سیاسی جرائم کی تعزیر لاحاصل

میں لاہور کے ہفتہ وار "ہندوستان" میں کام کرتا تھا۔ کہ ایک روز ماسٹر موتا سنگھ (جن کو سکھوں میں ڈی ولیرا کہتے ہیں۔ جو پنجاب پولیس کی انتہائی کوشش کے باوجود کئی برس تک گرفتار نہ ہو سکے۔ جو مرحوم کنگ نادر خاں آف افغانستان کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ جن کی زندگی کا زیادہ حصہ جیلوں میں گزرا۔ جن کی شہادت جیل کمیشن کے سامنے قیدیوں کے نمائندہ کے طور پر ہوئی اور جو آجکل پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں) مجھ سے ملے اور انہوں نے بتایا۔ کہ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ بھسورڈ ریاست پٹیالہ کے قومی ورکر بابو تیجا سنگھ کو بہت تنگ کر رہے ہیں (بابو تیجا سنگھ بہت بلند کیریکٹر کے بزرگ تھے) وہاں کے لڑکیوں کے ہائی سکول کے منیجر تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے بابو تیجا سنگھ کو اپنے گرمائی صدر مقام چایل سے پیغام بھیجا۔ کہ کچھ لڑکیوں کو ساتھ لے کر آؤ۔ بابو تیجا سنگھ بہت باغیرت شخص تھے۔ آپ نے مہاراجہ پٹیالہ

Marfat.com

کی رعیت ہوتے ہوئے بھی اس خواہش کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ بابو تیجا سنگھ کے دشمن ہو گئے اور ماسٹر موتا سنگھ نے یہ بھی کہا۔ کہ بابو تیجا سنگھ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بھسوڑ آؤں۔ ماسٹر موتا سنگھ بھی ان دنوں بھسوڑ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ماسٹر موتا سنگھ کی خواہش کے مطابق میں بھسوڑ پہنچ گیا۔ وہاں بابو تیجا سنگھ، ماسٹر موتا سنگھ اور سکھوں کے دوسرے قومی ورکر موجود تھے۔ مشورہ ہوتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے آخر طے پایا۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ کی زیادتیوں کے متعلق اخبارات میں مضامین شائع ہوں اور ان تمام سختیوں کو جو آپ بابو تیجا سنگھ کے خلاف کر رہے ہیں پبلک میں بے نقاب کر دیا جائے۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا۔ کہ میں اردو زبان میں ایک پمفلٹ لکھوں جو شائع ہو۔

میں لاہور واپس آ گیا۔ اس زمانہ میں میرا قیام لاہور موری دروازہ کے اندر اولڈ ہندو ہوٹل میں تھا۔ جہاں کھانے اور رہائش دونوں کے لیے ہر بورڈر سے صرف چھ روپے ماہوار لیا جاتا تھا۔ کھانے میں ایک دال اور ایک سبزی ملتی تھی۔ دال تو خیر پھر بھی غنیمت ہوتی تھی۔ سبزی ہمیشہ وہ پکائی جاتی جس کا موسم جا چکا ہو اور بازار میں جسے کوئی نہ خریدتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں یہ ہوٹل شاید تمام لاہور میں ارزاں ترین بورڈنگ ہاؤس تھا جس میں ساٹھ کے قریب بورڈر رہتے تھے۔

اس ہوٹل میں پہنچ کر میں نے پمفلٹ لکھا جس کا نام "خونِ شہادت کا تازہ قطرہ" تھا۔ یہ پمفلٹ بہت اچھا لکھا گیا جس کی کتابت امرتسر کے ایک بہت اچھے کاتب منشی فرخ سے کرائی گئی اور لاہور پہنچنے کے بعد دوستوں سے مشورہ کیا اور وہاں کے سب سے اچھے پریس میں یہ دو ہزار چھپا۔ جب یہ پمفلٹ چھپ چکا اور ابھی اس کی سلائی نہ ہوئی تھی۔ تو میں دو سو کاپیاں سلوا کر پریس سے لے آیا۔ جن میں سے کچھ میں نے اسی روز بعض دوستوں میں تقسیم کر دیں۔ پمفلٹ کو دیکھتے ہی اس کا چرچا شروع ہوا۔ شام تک مہاراجہ پٹیالہ کے دوستوں کو بھی علم ہو گیا جو لاہور میں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے جو لاہور میں سکھوں کے ایک لیڈر تھے اور اس زمانہ میں حکام رس تھے، یہ پمفلٹ حکام تک پہنچا دیا۔ رات کو بعض مقامی افسروں میں مشورہ ہوا۔ اور اگلے روز میں جب بقایا اٹھارہ سو کاپی لینے کے لیے پریس میں گیا تو پریس والوں نے بتایا۔ کہ صبح پولیس آئی تھی پمفلٹ گورنمنٹ نے ضبط کر لیا ہے اور تمام کاپیاں پولیس لے گئی ہے۔

اس خبر کو سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ دو سو کاپیوں میں سے جو پمفلٹ بچے تھے ان کو لے کر میں بھسوڑ پہنچا۔ ماسٹر موتا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ صاحب سے تمام واقعات بیان کیے۔ ان لوگوں کو بھی بے حد افسوس ہوا۔ رات بھر مشورہ ہوتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ آخر طے پایا۔ کہ چاہے کچھ ہو اس پمفلٹ کو پھر دوبارہ چھاپ کر شائع کیا جائے۔ بابو تیجا سنگھ نے مجھے دو سو روپیہ اخراجات کے لیے دیئے۔ پمفلٹ کی ایک کاپی لے کر میں لدھیانہ پہنچا۔ لدھیانہ سے دہلی آیا۔ یہاں مہاراجہ ہوٹل میں قیام کر کے منشی فردوس خوش نویس کے گھر گیا۔ ان کو پمفلٹ کتابت کرنے کے لیے دیا اور کہا۔ کہ جو اجرت چاہو لے لو۔ مگر دن رات لگا کر اس کو جلدی لکھ دو۔ منشی فردوس نے تمام کام چھوڑ کر کتابت کر دی۔ کاپیاں لے کر میں مچھلی والاں کے ایک پریس میں گیا جس کا نام جے اینڈ سنز پریس تھا۔ یہ پریس اب بند ہو چکا ہے۔ مالک پریس سے میں نے پمفلٹ

Marfat.com

چھاپنے کے لیے کہا۔ اس زمانہ میں پریس ایکٹ بہت سخت تھا۔ مگر جب مالک پریس نے دیکھا کہ اس سے پہلے بھی یہ پمفلٹ چھپ چکا ہے اور اب دوبارہ چھپ رہا ہے تو وہ چھاپنے پر آمادہ ہو گئے۔ میں نے کہا۔ کہ میں کل واپس جانا چاہتا ہوں۔ جو اجرت چاہو لے لو۔ مگر کل دوپہر تک چھپائی اور سلائی وغیرہ مکمل ہو جائے۔ انہوں نے اجرت کچھ زیادہ طلب کی جو دے دی گئی۔ اور اگلے روز دو ہزار پمفلٹ تیار صورت میں مجھے مل گیا۔ میں رات کو گاڑی سے بھسوڑ پہنچا۔ وہاں ایک روز میں ان پمفلٹوں کے پیکٹ بنا کر رکھ لیے گئے ان پیکٹوں کو لے کر میں لدھیانہ پہنچا۔ کچھ وہاں کے ڈاک خانہ میں پوسٹ کیے۔ پھر جالندھر پہنچا وہاں پوسٹ کیے۔ پھر امرتسر گیا وہاں پوسٹ کئے اور باقی لاہور آ کر پوسٹ کر دیے۔

ادھر تو یہ پمفلٹ اس طریقہ سے پوسٹ کر دیے گئے ادھر دہلی گورنمنٹ کو جب یہ علم ہوا کہ ضبط شدہ پمفلٹ دوبارہ چھاپ کر تقسیم کیا گیا ہے تو جے اینڈ سنز کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اور منشی فردوس کاتب کو پولیس نے پریشان کیا اور پوچھا۔ کہ پمفلٹ کتابت کے لیے کس نے دیا اور کون لے گیا وغیرہ۔

پمفلٹ کے تقسیم ہونے کے بعد میں بدستور اسی اولڈ ہندو ہوٹل میں رہتا تھا اور کام "ہندوستان" میں لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا مرحوم کے ماتحت کرتا تھا۔ ایک روز اتوار تھا۔ ہوٹل میں صبح بیدار ہوا۔ پاخانے گیا اور جب واپس آیا تو میرے کمرے میں میری چارپائی پر ایک مسلمان بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔ فرمائیے کس طرح تشریف لائے۔ آپ نے بتایا۔ کہ کوتوالی میں انسپکٹر صاحب نے ملنے کے لیے بلایا ہے میں نے پوچھا۔ کیا کام ہے تو آپ نے کہا۔ کہ ان کو کچھ علم نہیں۔ میں ٹانگہ میں ان کے ساتھ دہلی دروازہ والی کوتوالی میں گیا۔ انسپکٹر انچارج کوتوالی کے سامنے پیش کیا گیا۔ انسپکٹر نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر کلارک کو ٹیلی فون کیا۔ ایک سب انسپکٹر پولیس آیا۔ وہ سب انسپکٹر مجھے مسٹر کلارک کی کوٹھی پر لے گیا۔ کیونکہ اتوار کے باعث یہ اپنی کوٹھی پر ہی تھے۔ یہ مسٹر کلارک کم قسم کے اینگلو انڈین تھے۔ بہت تند مزاج جو ہندوستانیوں کو انسان ہی نہ سمجھتے تھے اور ان کی پبلک میں یہ عام شکایت تھی۔ میں جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے پوچھا مجھ سے کہ "پولیس دو ہفتہ سے تلاش کر رہی تھی تم کہاں تھے"۔ میں نے کہا۔ کہ اولڈ ہندو ہوٹل میں رہتا تھا۔ اور کام اخبار "ہندوستان" میں کرتا تھا۔ ان سے پتہ چلا کہ پمفلٹ کے شائع اور ضبط ہونے کے بعد مجھ پر مقدمہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت قائم کیا گیا ہے۔ پولیس مجھے میرے وطن حافظ آباد تلاش کرتی رہی اور آخر بہت مشکل سے پولیس کو اولڈ ہندو ہوٹل کا پتہ ملا۔ مسٹر کلارک نے سب انسپکٹر کو حکم دیا۔ کہ مجھے ہتھکڑی لگا لی جائے اور چونکہ اتوار ہے سب انسپکٹر مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر ہی ریمانڈ کے لیے لے جائے کیونکہ گرفتاری کے وارنٹ ڈپٹی کمشنر کے ہی دستخطوں سے جاری ہوئے ہیں۔ سب انسپکٹر اور کانسٹیبل مجھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر لے گئے۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹالنٹن تھے ان کی اس زمانہ میں غالباً شادی نہیں ہوئی تھی۔ شراب کثرت کے ساتھ پیتے تھے اور چونکہ اتوار تھا معلوم ہوا کہ شراب میں مخمور ہیں۔ سب انسپکٹر نے بہرے سے کہا۔ کہ وہ صاحب بہادر سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایک ملزم کا ریمانڈ لینا ہے۔ بہرے نے مسٹر ٹالنٹن کو اطلاع کی۔ تو مسٹر ٹالنٹن نشہ میں غٹ کچھ تھوڑے سے لڑکھڑاتے

Marfat.com

ہوئے برآمدہ میں تشریف لائے اور آتے ہی سب انسپکٹر سے پوچھا۔ کیا ہے۔ سب انسپکٹر نے سلیوٹ کرتے ہوئے عرض کیا۔ کہ حضور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا یہ ملزم ہے۔ آج اتوار ہے اور ریمانڈ لینا ہے چنانچہ سب انسپکٹر نے وارنٹ پیش کیے جو وہ مسٹر کلارک سے لایا تھا۔

مسٹر ٹالنٹن نشہ میں چور تھے۔ انسان شراب کے نشہ میں بہت فیاض اور فراخدل ہوتا ہے۔ آپ نے میری طرف دیکھا اور مخمور آواز میں بولے۔ ویل، کیا تم کل ہماری کورٹ میں آئے گا۔ میں نے کہا ضرور آؤں گا اگر آپ کہتے ہیں۔ میرے اس جواب پر مسٹر ٹالنٹن نے سب انسپکٹر سے کہا۔ کھول دو ہتھکڑی اور مجھ سے کہا۔ کہ جاؤ کل ہماری کورٹ میں حاضر ہو جاؤ۔ ڈپٹی کمشنر تو یہ حکم دے کر برآمدہ سے اپنے کرے میں چلے گئے۔ مگر سب انسپکٹر حیران کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا مقدمہ ہے۔ دو ہفتے مختلف مقامات پر تلاش کرنے کے بعد مشکل سے ملزم ملا اور ڈپٹی کمشنر نے شراب کے نشہ میں چھوڑ دیا۔ کیا کیا جائے۔ سب انسپکٹر مجبور تھا۔ اس نے ہتھکڑی کھول دی۔ اور وہ تو واپس مسٹر کلارک کے پاس چلا آیا۔ اور میں ہوٹل میں واپس آ گیا۔

اگلے روز سوموار کو میں مسٹر ٹالنٹن کی عدالت میں گیا اور جب پیش ہوا تو مسٹر ٹالنٹن بغلیں جھانکنے لگے۔ بہت پریشان نظر آتے تھے۔ کہ کل نشہ میں کیا حکم دے چکے۔ کبھی کاغذات کو الٹتے کبھی میری طرف دیکھتے۔ کبھی سوچتے۔ آخر آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا:

"ویل اگر تم معافی مانگو اور یہ وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی کوئی ایسا پمفلٹ نہ لکھو گے تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے" ناتجربہ کاری اور جوش کا زمانہ تھا۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ نہ میں معافی مانگتا ہوں اور نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے آپ مقدمہ چلائیے۔

میرا یہ خلافِ توقع جواب سن کر مسٹر ٹالنٹن اور پریشان ہوئے اور آپ نے چپڑاسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اس لڑکے کو عدالت سے باہر نکال دو۔ چھوکرہ ہے۔ یہ جانتا نہیں کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے۔"

چپڑاسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے باہر جانے کے لیے کہا۔ میں عدالت سے باہر آ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ مسٹر ٹالنٹن نے یہ لکھ کر مقدمہ داخل دفتر کر دیا۔ کہ ملزم نوجوان لڑکا ہے۔ ناتجربہ کار ہے۔ اس کو تنبیہ کر دی گئی ہے کہ آئندہ گورنمنٹ اور مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھے۔ اور چونکہ جرم پہلی بار کیا گیا ہے اس لیے وارننگ ہی کافی سمجھی گئی ہے۔

یہ میری پہلی گرفتاری تھی۔ اس کے بعد مجھ پر درجنوں مقدمات قائم کیے گئے۔ اگر کسی اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تو شاید دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوتا۔ مگر سیاسی جرم کی یہ ابتدا ایک دوامی زندگی کا باعث ثابت ہوئی اور جب بھی کوئی نیا مقدمہ قائم ہوا۔ گو تکلیفیں تو اس میں بہت ہوئیں مگر جوش، زندگی اور قوتِ ارادی میں ہمیشہ ہی اضافہ ہوا۔ چنانچہ دنیا میں سیاست کی راہ میں گرفتاریاں اور سزائیں کبھی بھی توبہ کرنے کا باعث نہ ہو سکیں۔ بلکہ ملزم ملک کے مخلص اور بے غرض خادم ہوں تو:

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

Marfat.com

اِحسان کرنا اور احسان جتانا

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس جو ہندوستان کے بہترین آئی سپیشلسٹ تسلیم کیے جاتے ہیں جب سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے تو ان کی تنخواہ پچیس روپیہ ماہوار تھی۔ اور ایک ہاسپٹل اسسٹنٹ (جن کو اب سب اسسٹنٹ سرجن کہا جاتا ہے) تھے۔ آپ ہندوستان بھر میں سب سے پہلے ہاسپٹل اسسٹنٹ تھے۔ جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کیے بغیر اسسٹنٹ سرجن ہوئے اور بعد میں سول سرجن کے عہدہ پر پہنچے۔ آپ نے اپنی زندگی میں موتیا بند کے اتنی تعداد میں آپریشن کیے کہ غالباً دنیا کے تمام ڈاکٹروں کے آپریشنوں کی مجموعی تعداد بھی اس سے کم ہے۔ آپ نے اپنی حیات میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا اور لاکھوں خیرات میں دیا۔ آپ کے روپیہ سے اس وقت ایک کالج اور متعدد سکول چل رہے ہیں۔ اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار مسلسل خیرات میں صرف کرتے رہے۔ اور آپ کو تمام ہندوستان میں شہرت نصیب ہے چنانچہ عرصہ ہوا۔ مہاتما گاندھی نے بھی آپ کی تعریف میں اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا تھا ڈاکٹر متھرا داس نہ صرف بطور ڈاکٹر بہت کامیاب ہیں بلکہ بطور انسان ان میں اخلاص اور نیک نیتی وغیرہ کی بعض ایسی صفات موجود ہیں جو ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب کہی جا سکتی ہیں اور جن کے باعث آپ کو عالمگیر شہرت اور ہر دلعزیزی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر متھرا داس کی شروع کی زندگی میں جب کہ آپ موگا کے ہسپتال میں مقرر تھے فیروز پور کے سول سرجن کرنل ایڈی تھے۔ کرنل ایڈی شاہانہ مزاج کے خوشامد پسند انگریز تھے۔ مگر نہایت شریف اور نیک، جس پر مہربانی کرتے ہمیشہ ہی اس کی امداد پر آمادہ رہتے۔ یہ ڈاکٹر متھرا داس پر بہت مہربان تھے اور آپ نے ڈاکٹر متھرا داس کی قدم قدم پر امداد کی۔ یہ کئی برس فیروز پور میں سول سرجن رہے۔ وہاں سے پنجاب کے چیف ملیریل میڈیکل آفیسر وغیرہ ہو گئے اور ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے پھر فیروز پور میں ہی مستقل رہائش اختیار کی۔ کیونکہ فیروز پور کی آب و ہوا ان کو موافق تھی اور وہاں دوستوں کا حلقہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ کرنل ایڈی کو ریٹائر ہونے کے بعد فیروز پور میں رہتے کئی برس ہو گئے۔ ڈاکٹر متھرا داس کا معمول تھا۔ کہ وہ جب کبھی فیروز پور کسی کام کے لیے جاتے تو کرنل ایڈی سے ملنے کے لیے ان کی کوٹھی پر ضرور پہنچتے۔ ایک روز کرنل ایڈی نے ڈاکٹر متھرا داس سے کہا۔ کہ ان کو ایک گائے کی ضرورت ہے۔ موگا سے خرید کر بھجوا دی جائے۔ ڈاکٹر متھرا داس نے واپس موگا پہنچ کر ایک بہت اچھی گائے اسی روپے میں خریدی اور اپنے آدمی کے ساتھ فیروز پور کرنل ایڈی کو بھیج دی۔ ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر متھرا داس کو فیروز پور جانے کا پھر اتفاق ہوا تو آپ حسبِ معمول کرنل ایڈی سے ملنے کے لیے گئے۔ باتوں باتوں میں کرنل ایڈی نے کہا کہ گائے بہت اچھی ہے۔ یہ کتنے میں خریدی گئی۔ ڈاکٹر متھرا داس نے جواب دیا۔ کہ قیمت کا کیا سوال ہے۔ سب کچھ آپ کا ہے۔ کرنل ایڈی حاکمانہ سپرٹ کے انگریز تھے۔ آپ نے کہا نہیں ہم حکم دیتا ہے کہ گائے کتنے میں خریدی گئی۔ ڈاکٹر متھرا داس کرنل ایڈی کی نبض پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ جب وہ حکم کا لفظ استعمال کریں اور پھر بھی ضد کی جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جواب

Marfat.com

دیا کہ اسی روپیہ میں۔ کرنل ایڈی نے فوراً اسی روپے کا چیک لکھ کر ڈاکٹر متھراداس کو دے دیا اور ڈاکٹر صاحب چلے آئے۔

چیک لانے کے بعد یہ چیک ڈاکٹر متھراداس کے پاس کئی روز پڑا رہا۔ ڈاکٹر صاحب سوچا کرتے کہ اس چیک کا کیا کریں۔ کرنل ایڈی کے احسانات ان پر بہت تھے۔ ان کا ضمیر یہ گوارا نہ کرتا تھا۔ کہ اتنے بڑے محسن سے گائے کی قیمت لی جائے۔ کرنل ایڈی اپنی طرف سے روپیہ ادا کر چکے تھے۔ ان کے بنک میں کئی لاکھ روپے تھے اور ان کو خیال بھی نہ رہا ہو گا۔ کہ چیک کیش ہوا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر متھراداس کئی روز سوچتے رہے۔ کہ کیا کریں۔ آخر انہوں نے اپنے محسن سے گائے کی قیمت لینا گوارا نہ کی اور چیک بغیر کرنل ایڈی کو بتائے پھاڑ دیا اور لطف یہ کہ کرنل ایڈی جب تک زندہ رہے وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ گائے کی قیمت متھراداس کو ادا کر چکے ہیں۔

اس واقعہ سے ڈاکٹر متھراداس کے اخلاص محسن شناسی اور نیک نیتی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر یہ صفات ڈاکٹر متھراداس میں نہ ہوتیں تو وہ بھی معمولی ڈاکٹروں کی طرح گمنامی کی زندگی بسر کرتے اور موجودہ عروج حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ جب کوئی شخص کسی سے اخلاص اور نیکی کا سلوک کرتا ہے تو قدرت لازمی طور پر مخلص اور نیک شخص کو اس کا معاوضہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر مخیر شخص ہمیشہ مالامال رہا۔

یہ واقعہ ان لوگوں کے لیے آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیے جو اگر احسان کرتے ہیں تو جتا کر اور بقول ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے "اگر خیرات دینے والے نے خیرات دے کر اس کا اظہار کر دیا تو اس نے اپنی نیکی کو خود اپنے ہاتھوں مٹی میں ملا دیا۔"

خبریں حاصل کرنے میں مشکلات

مرحوم مہاراجہ الور ایڈمنسٹریشن کی بدانتظامی اور اپنے اعمال کے باعث اپنی ریاست سے نکال دیے گئے تھے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے آپ کو حکم دیا تھا۔ کہ آپ ریاست الور کی حدود سے ایک سو میل دور رہیں۔ تا کہ الور کے ملازموں یا رعایا کے ساتھ مل کر کوئی سازش نہ کر سکیں۔ چنانچہ آپ بمبئی تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے رہائش اختیار کر لی۔

والیان ریاست گدی پر ہوں یا معزول حالت میں۔ چونکہ ان کو لاکھوں روپیہ سالانہ الاؤنس ملتا ہے خود غرض لوگ ہر صورت میں ان کے ساتھ چسپاں رہتے ہیں۔ مہاراجہ کے بمبئی پہنچنے پر بہت سے لیڈروں اور دوسرے لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔ کوئی گدی پر واپس بٹھانے کی روشنی دکھاتا۔ کوئی بااختیار کرنے کا دعویٰ کرتا اور کوئی اپنا اثر جتاتے ہوئے تمام زخموں کو مندمل کر دینے کا یقین دلاتا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک صاحب مسٹر جمناداس دوارکاداس بھی تھے جو تھیاسوفسٹ اور مسز اینی بیسنٹ کے خاص چیلوں میں شمار

Marfat.com

کیسے جاتے تھے۔ اور جب مسز اینی بیسنٹ انگلستان گئیں اور لندن میں لیڈی ولنگڈن کی بہن یعنی لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند کی سالی کے گھر پر بطور مہمان مقیم تھیں تو اس وقت یہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس بھی مسز اینی بیسنٹ کے ساتھ ملاقات کیا کرتے تھے یعنی مسٹر جمنا داس دوارکا داس کی کوالیفیکیشن صرف یہ تھی کہ آپ لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی بیوی کے پرانے واقف تھے۔ اس سرٹیفکیٹ پر آپ نے مرحوم مہاراجہ الور کو یقین دلایا۔ کہ مہاراجہ کو گدی پر بٹھا دیں گے اور مہاراجہ گدی پر بیٹھنے کی صورت میں پچیس تیس لاکھ روپیہ صرف کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس اس مشن پر دہلی تشریف لائے۔ مسٹر میول پرائیویٹ سیکرٹری وائسرائے سے ملے۔ پھر لیڈی ولنگڈن سے ملاقات ہوئی اور بعد میں لارڈ ولنگڈن کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ نے عرض کیا۔ کہ مہاراجہ الور کو واپس الور جانے کی اجازت دی جائے۔ لارڈ ولنگڈن نے تمام کچھ سننے کے بعد جواب دیا۔ کہ اگر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ مہاراجہ کو واپس الور جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس جواب کو سن کر آپ پولیٹیکل سیکرٹری سے ملے۔ پولیٹیکل سیکرٹری نے ٹالتے ہوئے کہا۔ کہ اگر میجر کیمبل ایڈمنسٹریٹر الور کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں چنانچہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس پولیٹیکل سیکرٹری کے اس جواب سے خوش ہو کر میجر کیمبل سے ملنے کے لیے الور تشریف لے گئے۔

ایڈیٹر "ریاست" کو ان تمام باتوں کا علم وائسرائے ہاؤس کے ایک دوست سے ہوتا رہا اور راقم الحروف دیکھتا رہا۔ کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ اس دوست نے اطلاع دی کہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس الور سے واپس تشریف لے آئے ہیں اور سوس ہوٹل میں مقیم ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے سوس ہوٹل ٹیلیفون کیا اور مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو فون پر بلا کر پوچھا۔ کہ میں کب مل سکتا ہوں۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس ملنے سے گھبراتے تھے۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" بھی بطور عزرائیل نظر آ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ لنچ کے بعد دو بجے آئیے۔ ایڈیٹر "ریاست" دو بجے سوس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس ہوٹل کے ڈائیننگ روم کے برآمدہ میں بید کی ایک کرسی پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ ایڈیٹر "ریاست" نے خیریت پوچھنے کے بعد سوال کیا: "فرمائیے مسٹر جمنا داس دوارکا داس آپ الور میں کیا کچھ کر کے آئے ہیں"۔ یہ سوال پوچھنا تھا۔ کہ آپ کا رنگ فق ہو گیا۔ کیونکہ آپ تمام کارروائی راز میں کر رہے تھے۔ آپ نے فوراً جواب دیا۔ "آپ کو پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے"۔ میں نے جواب دیا "ایک اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر مجھے حق حاصل ہے کہ میں معلوم کروں کہ الور کی غریب رعایا آئندہ کس بھیڑیے کے سپرد کی جائے گی۔ فرمائیے آپ الور جا کر میجر کیمبل سے مہاراجہ الور کے لیے چارٹر لے آئے ہیں یا نہیں"۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس کے منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ حیران تھے کہ ایڈیٹر "ریاست" کو تمام حالات کا علم کیونکر ہو گیا۔ آپ نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔ "مہاراجہ الور اخبار "ریاست" کے بہت مداح ہیں۔ اور باوجود اس بات کے کہ "ریاست" نے مہاراجہ کے خلاف سخت مضامین لکھے اور ایجی ٹیشن کرنے میں حصہ لیا۔ مہاراجہ اخبار "ریاست" کو پسند کرتے ہیں۔ کئی بار آپ کے متعلق ذکر آیا۔ ہمیشہ آپ کی تعریف کرتے تھے۔ آپ بمبئی چلئے۔ مہاراجہ سے

Marfat.com

چلیئے۔ وہ خود آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں بمبئی جانے اور مہاراجہ سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ میجر کیمبل نے آپ کو کیا جواب دیا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس کیا جواب دیتے۔ بس یہی کہتے رہے۔ اخبار "ریاست" بہت اچھا ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" بہت اچھے ہیں۔ مہاراجہ الور اخبار "ریاست" کے زورِ قلم کے مداح ہیں۔ میں الور گیا تو تھا۔ مگر میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ آپ بمبئی چلیئے۔ وہاں مہاراجہ سے مشورہ کریں گے وغیرہ۔

مسٹر جمنا داس دوارکا داس سے مل کر میں واپس آیا اور میں نے وائسرائے ہاؤس والے دوست کو ٹیلی فون کیا۔ کہ وہ مزید معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ اگلے روز مسٹر جمنا داس دوارکا داس ہوٹل والوں کو کچھ بتائے بغیر بارہ کھمبہ روڈ پر آنریبل مسٹر آسکریا ممبر کونسل آف سٹیٹ کے ہاں چلے گئے۔ ہوٹل میں ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا۔ کہ آپ واپس بمبئی چلے گئے ہیں۔ وائسرائے ہاؤس میں ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ مسٹر آسکریا کے ہاں بارہ کھمبہ روڈ پر مقیم ہیں۔

مسٹر جمنا داس دوارکا داس، مسٹر آسکریا کے ہاں پانچ چھ روز رہے۔ اس عرصہ میں آپ کئی بار مسٹر میول پرائیویٹ سیکرٹری سے ملے۔ کئی خطوط لکھے۔ آخر آپ کو لارڈ ولنگڈن نے جواب لکھا کہ چونکہ میجر کیمبل مہاراجہ الور کا واپس جانا مناسب نہیں سمجھتے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اعتراض ہے۔ اس لیے وائسرائے مداخلت کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور وہ مہاراجہ الور کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ خط وائسرائے نے لکھ کر مسٹر میول کے حوالہ کیا۔ مسٹر میول نے یہ خط وائسرائے ہاؤس کے ایک چپڑاسی کو دیا۔ کہ آسکریا صاحب کی کوٹھی پر مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو پہنچا دیا جائے۔ مگر مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو یہ خط نہیں ملا۔ آپ جواب کا دو روز انتظار کرتے رہے۔ تو آپ نے مسٹر میول کو جواب کے لیے ٹیلی فون کیا۔ مسٹر میول نے جواب دیا۔ کہ دو روز ہوئے جواب تو ایک لفافہ میں بھیجا جا چکا ہے۔ وائسرائے کے خط کا گم نام ہونا تمام لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوا۔ ایک گھبراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس مسٹر میول کے پاس فوراً پہنچے۔ خط لے جانے والے چپڑاسی کو بلایا گیا۔ خط ڈلیور کرنے والی پئین بک دیکھی گئی۔ اس میں اردو زبان میں دیوی داس کے دستخط تھے جس نے خط وصول کیا۔ چپڑاسی نے کہا۔ کہ جب وہ مسٹر آسکریا کی کوٹھی پر پہنچا تو وہاں ایک شخص سے پوچھا۔ کہ مسٹر جمنا داس دوارکا داس کہاں ہیں۔ اس شخص نے بتایا کہ وہی ہیں دستخط کر کے خط لے لیا۔ تمام لوگ حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ خط کون اڑا کر لے گیا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس نے مسٹر میول کو بتایا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" سوس ہوٹل میں ان سے ملا تھا۔ وہی پیچھا کر رہا ہے۔ اس نے ہی یہ خط اڑایا ہو گا۔ اور اُسی کا کوئی آدمی ہے جس نے اردو میں دستخط کر کے یہ خط وصول کیا۔

وائسرائے ہاؤس میں سنسنی پھیل گئی۔ مسٹر میول نے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس آئے تمام حالات بتائے گئے۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو بلایا۔ وہ مع ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خان بہادر میاں محمد صادق وغیرہ پہنچے۔ کانفرنس ہوئی مشورے ہوئے۔ تو سب لوگ اس بات پر متفق ہوئے کہ دیوان سنگھ مسٹر جمنا داس دوارکا داس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے ہی کوئی

Marfat.com

اپنا آدمی چھوڑ رکھا ہے جس کی معرفت یہ خط اڑایا گیا۔ چنانچہ دونوں سپرنٹنڈنٹوں نے فیصلہ کیا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" کو گرفتار کیا جائے اور دفتر "ریاست" کی تلاشی لی جائے۔ ان تمام حالات کی ایڈیٹر "ریاست" کو بھی وائسرائے ہاؤس کے دوست سے ٹیلیفون پر اطلاع ملتی رہی اور ایڈیٹر "ریاست" گرفتاری و تلاشی کا منتظر رہا۔

خان بہادر میاں محمد صادق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی (جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں) لاہور کی احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذہبی قسم کے بہت شریف اور نیک بزرگ ہیں۔ آپ نے شاید اپنی تمام زندگی ایک پیسہ رشوت نہیں لی۔ اور نہ جھوٹے مقدمے بنائے۔ آپ موگا (ضلع فیروزپور) کے علاقہ میں کئی برس سب انسپکٹر اور انسپکٹر پولیس رہے۔ اور وہاں آپ کے رائے بہادر ڈاکٹر متھراداس کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر متھراداس جب کبھی دہلی تشریف لاتے اور ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر ٹھہرتے تو میاں محمد صادق بھی ڈاکٹر صاحب سے ملنے ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر تشریف لاتے۔ اس ذریعہ سے ایڈیٹر "ریاست" کی میاں محمد صادق سے ذاتی واقفیت تھی اور میاں صاحب ایڈیٹر "ریاست" کے حالات، کیریکٹر اور صفات یا برائیوں سے واقف تھے۔ جب پولیس کے دونوں سپرنٹنڈنٹوں نے ایڈیٹر "ریاست" کی گرفتاری اور تلاشی کا فیصلہ کیا تو میاں صاحب نے ان سے کہا۔ کہ اگر یہ خط دیوان سنگھ نے اڑایا ہے تو وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اس نے یہ خط اپنے گھر پر کبھی نہ رکھا ہو گا اس کی درجنوں بار تلاشیاں ہوئیں مگر کبھی ایک پرزہ برآمد نہیں ہو سکا۔ یہ طریقہ غلط ہے اس صورت میں خط کا واپس ملنا ممکن نہ ہو گا اور حالات زیادہ بگڑ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھایا جائے دیوان سنگھ اپنے ذاتی دوستوں سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر اسے نہ بتانا ہو گا تو کہہ دے گا۔ کہ وہ بتانا نہیں چاہتا۔ اگر خط اس نے لیا ہے اور وہ بتانے میں ہرج نہیں سمجھے گا تو وہ فوراً بتا دے گا۔ اور اگر اسے خط کو اخبار میں شائع کرنا ہے تو وہ شائع کر دے گا کسی کی پرواہ نہ کرے گا۔ وہ بزدل نہیں کہ ان باتوں سے ڈر جائے۔ چنانچہ دو تین گھنٹہ کی بحث اور مشورہ کے بعد یہ تحقیقات میاں محمد صادق کے سپرد کر دی گئی۔ میاں صاحب موٹر میں بیٹھ کر اپنے دفتر میں پہنچے۔ ادھر مجھے وائسرائے ہاؤس سے تمام مشوروں اور نتیجہ کا ٹیلیفون پر پتہ چل گیا تھا۔ میں منتظر تھا۔ کہ میاں صاحب نے اپنے دفتر میں پہنچ کر مجھے ٹیلیفون کیا اور اس طرح بات چیت شروع ہوئی:۔

میاں صاحب: فرمائیے کیا حال ہے۔ مزاج اچھے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست": آپ کی مہربانی ہے میاں صاحب۔

میاں صاحب: کیا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خط آیا۔

ایڈیٹر "ریاست": حال میں تو کوئی نہیں آیا۔ پندرہ بیس روز ہوئے آیا تھا۔

میاں صاحب: ڈاکٹر صاحب دہلی تو نہیں آئے۔

ایڈیٹر "ریاست": میاں صاحب ان کا کیا ہے۔ کام ہوا فوراً چلے آئے۔ نہ کام ہوا مہینوں نہیں آتے۔

Marfat.com

میاں صاحب: میری آج طبیعت بہت اداس تھی۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ کو ٹیلی فون ہی کر لوں۔

ایڈیٹر "ریاست": آجکل موسم ایسا ہی ہے۔ شاید ملیریا کی آمد ہو۔

میاں صاحب: ہاں۔ شاید۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست": میاں صاحب! کام کر رہا ہوں۔ ہم مزدور آدمی ہیں صبح سے رات تک کام کرتے ہیں۔ آپ کی طرح تو نہیں کہ کوئی کام نہیں اور حکم چلاتے رہے۔

میاں صاحب: اگر آپ کو فرصت ہو تو یہاں آجائیے۔ تھوڑی دیر باتیں کریں گے یا مجھے کہیئے میں وہاں آجاؤں۔

میں نے جواب دیا۔ میں ہی آتا ہوں۔ کیونکہ جانتا تھا۔ کہ اس طرح نہ جاؤں گا تو کنسٹیبل یا سب انسپکٹر بھیج کر بلالیں گے۔ پولیس کے افسر ہیں چاہے کتنے دوست ہوں۔ وقت پر نہ باپ کے ہیں نہ بھائی کے اور نہ دوستوں کے۔ میں اپنی کار پر میاں صاحب کے دفتر میں گیا۔ میاں صاحب اکیلے بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں تو تمام حالات سے واقف تھا۔ کہ وائسرائے ہاؤس میں کیا مشورے ہوئے مگر میاں صاحب سمجھتے تھے۔ کہ میں بالکل بے خبر ہوں۔ میرے پہنچنے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر متھرا داس کے متعلق موسم کے متعلق۔ ملیریا کے متعلق۔ اخبار "ریاست" کے کاروبار کے متعلق۔ پانچ سات منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میاں صاحب نے پوچھا۔ کہ مہاراجہ الور کہاں ہیں آجکل۔ یہ سن کر مجھ سے رہا نہ گیا میں مسکرادیا اور جواب میں کہا: میاں صاحب یہ نہ پوچھیئے کہ مہاراجہ الور کہاں ہیں۔ یہ پوچھیئے کہ لارڈ ولنگڈن کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی وہ چٹھی کہاں ہے جو مہاراجہ الور کے متعلق وائسرائے نے مسٹر جمنا داس دوارکا داس کو مسٹر آسکرپال کی کوٹھی پر بھیجی اور جو گم ہے۔ میاں صاحب یہ سن کر دنگ رہ گئے۔ حیران تھے کہ مجھے تمام واقعات کا علم کیونکر ہوا۔ آخر میاں صاحب نے اقرار کیا۔ کہ ہاں اس خط کی تحقیقات کے سلسلہ میں ہی مجھے یہاں دفتر میں بلایا گیا ہے۔

میں نے میاں صاحب سے کہا۔ کہ آپ کے بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی میں آپ کو کوئی جواب دینا نہیں چاہتا۔ مگر چونکہ آپ ذاتی دوست ہیں اس لیے آپ سے کہتا ہوں کہ چٹھی میرے پاس نہیں پہنچی۔ نہ میں نے اڑائی اور نہ مجھے کوئی علم ہے۔ اور مجھے سخت افسوس ہے کہ ایسی چٹھی میرے ہاتھ کیوں نہ لگی۔ جس میں وائسرائے نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سامنے اپنے بے بسی کا اظہار کیا ہے۔ اگر یہ چٹھی مجھے مل جاتی تو چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہوتا میں اس چٹھی کو "ریاست" میں ضرور شائع کر دیتا۔

میاں صاحب کو میرے اس بات سے یقین ہو گیا۔ کہ خط کے اڑانے میں میرا ہاتھ نہیں۔ آپ نے وائسرائے ہاؤس جا کر اس چپڑاسی سے پھر پوچھنا شروع کیا کہ سوالات ہوئے اور وہ کچھ ہوا جس کو پولیس اپنی لغات میں "انٹیروگیشن" کہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چپڑاسی نے اقرار کر لیا۔ کہ اس کا لڑکا سخت بیمار تھا اس بیماری کے باعث وہ خط نہ لے جا سکا۔ اگلے روز اس خوف سے کہ خط لیٹ کیوں ہوا اس نے خط

Marfat.com

کو چولھے میں خود جلا دیا ہے۔ چنانچہ چولھے میں دیکھا گیا تو جلے ہوئے اس خط کے ٹکڑے موجود تھے چپڑاسی جو پنجاب کا رہنے والا مسلمان تھا۔ اس جرم میں موقوف کر دیا گیا اور مسٹر میول کو یقین ہوا کہ خط دیوان سنگھ نے نہیں اڑایا۔ اور نہ دیوان سنگھ سے وائسرائے ہاؤس غیر محفوظ ہے (مسٹر میول نے پولیس کے سپرنٹنڈنٹوں سے کہا تھا۔ کہ دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کے ہاتھوں ریاستوں کے علاوہ وائسرائے ہاؤس بھی محفوظ نہیں۔) اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے لیے خبریں حاصل کرنا کتنا مشکل ہے اور ان کے لیے کیونکر قدم قدم پر خطرہ برداشت کیا جاتا ہے۔

ایک پاگل کی "ریاست" کو امداد

ایڈیٹر "ریاست" اور مسٹر ہارنیمین ایڈیٹر "بمبئی سینٹی نل" دونوں نے دہلی سے انگریزی کا ایک ہفتہ وار باتصویر اخبار "ہیرلڈ" جاری کیا۔ "ریاست" اور "ہیرلڈ" دونوں کے دفاتر اجمیری دروازہ کے باہر لالہ دیوان چند کی بلڈنگ میں تھے۔ مسٹر ہارنیمین کام تو دفتر میں کرتے تھے مگر رہتے تھے نئی دہلی رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ٹھیکیدار کی کوٹھی کے ایک حصہ میں۔ جب "ہیرلڈ" کو جاری ہوئے دو ہفتے گزر چکے تو ایک روز صبح نو بجے کے قریب ایک گجراتی نوجوان کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے دفتر میں آئے اور آپ نے پوچھا۔ کہ مسٹر ہارنیمین کہاں ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جواب دیا۔ کہ وہ نئی دہلی میں ہیں۔ کوئی ضروری کام ہو تو فرمائیے میں آدمی ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ آپ نے بتایا۔ کہ مسٹر ہارنیمین نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ بمبئی میں ایک نئے جاری ہونے والے روزانہ انگریزی اخبار کو ایڈیٹ کریں گے۔ اس وعدہ پر آپ نے اڑھائی تین لاکھ روپے کی مشینری کا آرڈر ولایت دیا تھا اور اب جب کہ مشینری بمبئی میں پہنچ گئی ہے تو مسٹر ہارنیمین دہلی آ گئے ہیں۔ میں نے ان صاحب کے لیے چائے منگائی۔ چائے پر باتیں ہوئیں تو آپ نے فرمایا کہ آپ ایک کروڑ پتی سیٹھ ہیں۔ اخبارات نکالنے کا آپ کو شوق ہے۔ بمبئی اور کراچی میں آپ کا کاروبار ہے اور جاری کیے جانے والے روزانہ انگریزی اخبار کے لیے آپ دس لاکھ روپیہ صرف کر دیں گے تاکہ وہ اخبار ہندوستانیوں کا ہو اور "سٹیٹس مین" اور "ٹائمز آف انڈیا" کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ آپ نے یہ بھی رائے ظاہر کی۔ کہ اس انگریزی روزانہ اخبار کے ساتھ "ریاست" کو بھی بمبئی سے شائع کیا جائے اور اس کے لیے آپ لاکھ دو لاکھ روپیہ صرف کر دیں گے۔

اس گجراتی سیٹھ کی باتیں سن کر ایڈیٹر "ریاست" کو ایک نئی دنیا نظر آ رہی تھی اور وہ خیال کر رہا تھا کہ اگر اتنا روپیہ صرف کیا جائے تو "ریاست"، "ٹائمز آف انڈیا" — "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کی طرح تمام کا تمام اردو ٹائپ اور تصاویر میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے اس گجراتی کو اپنی کار میں ساتھ لیا اور اسے مسٹر ہارنیمین کے پاس نئی دہلی لے گیا۔ مسٹر ہارنیمین مضمون لکھ رہے تھے اور مصروف تھے۔ معمولی بات چیت کرنے کے بعد آپ نے فرمایا۔ کہ لنچ کے وقت دفتر میں بات چیت کریں گے۔ میں سیٹھ صاحب کو

Marfat.com

لے کر واپس آ گیا۔ ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ باورچی سے (جس کا نام کو بلو تھا۔ گوا کا رہنے والا تھا اور انگریزی کھانا بہت اچھا پکاتا تھا) کہا کہ آج لنچ غیر معمولی طور سے زیادہ اچھا اور پُرتکلف ہو۔ میں ایک بجے تک ان گجراتی صاحب کے ساتھ ہی باتیں کرتا رہا۔ ایک بجے مسٹر ہارنیمین آ گئے۔ اس زمانے میں میرے ہاں لنچ اور ڈنر پر پانچ سات دوست ضرور ہوتے تھے۔ لنچ کھایا۔ باتیں ہوتی رہیں اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو مشینری ولایت سے آئی ہے وہ فی الحال بمبئی میں ہی رکھی جائے۔ نیا اخبار بمبئی سے جاری کیا جائے اور پھر مناسب موقع سے "ریاست" کو بھی بمبئی منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ وہاں پریس کے متعلق زیادہ سہولتیں ہوں گی۔

مسٹر ہارنیمین شام تک کام کرتے رہے۔ شام کو ان گجراتی سیٹھ صاحب کے اعزاز میں پُرتکلف چائے کا انتظام کیا گیا۔ نصف درجن کے قریب دوست چائے پر موجود تھے۔ چائے کے بعد سب دوست اور مسٹر ہارنیمین اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ گجراتی سیٹھ صاحب بیٹھے رہے۔ دو گھنٹے کے بعد میں ان کو دہلی کی سیر کرانے کے لیے کار میں لے گیا۔ راستہ میں آپ نے پوچھا۔ کہ "ریاست" کی مالی حالت کیسی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ اخبارات کو مالی پریشانیاں تو رہتی ہیں میں نے جواب دیا۔ ہاں ہندوستان میں جرنلزم کی حالت ایسی ہی ہے۔ سیر سے واپس آئے تو آپ نے پہنچتے ہی اپنی چیک بک نکالی۔ اس میں سے دس ہزار روپیہ کا ایک چیک کراچی بنک کا "ریاست" کے لیے لکھ کر راقم السطور کو دیا۔ اور کہا۔ کہ فی الحال یہ دس ہزار روپیہ لو۔ اگر اور ضرورت ہوئی تو دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ تک اور "ریاست" کی امداد کریں گے۔ یہ گجراتی سیٹھ رات کو ڈنر کھانے کے بعد تشریف لے گئے۔ اور آپ نے فرمایا۔ کہ آپ لاہور، راولپنڈی اور پشاور وغیرہ سیر کے لیے جا رہے ہیں۔ اگلے روز وہ چیک کیش کرنے کے لیے مسلم بنک (جہاں کہ اس زمانہ میں "ریاست" کا حساب تھا) کو بھیجا گیا۔ اس دس ہزار روپیہ کے صرف کرنے کی سکیم پر غور ہونے لگا۔ اتنا روپیہ مسٹر ہارنیمین کو دیا جائے گا۔ اتنا فلاں دوست کو۔ اتنا قرضہ میں ادا کیا جائے گا۔ اتنے روپیہ کی فلاں فلاں چیز منگائی جائے گی وغیرہ۔ ایک ہفتہ ان دل خوش کُن خیالات میں مصروف رہی۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ چیک مسلم بنک سے واپس آیا تو یقین نہ آتا تھا۔ کہ گجراتی سیٹھ صاحب کا بنک میں حساب نہیں۔ میں کبھی چیک کو سیدھی طرف سے دیکھتا کبھی الٹی طرف سے۔ کبھی ساتھ والی سلپ کو۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ بار بار خیال آتا تھا۔ کہ کراچی والے بنک نے شاید غلطی سے ایسا غلط لکھ دیا۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بنک میں حساب نہ ہو۔ واپس آئے ہوئے چیک پر میں اور مسٹر ہارنیمین دو روز غور کرتے رہے کبھی خیال آتا۔ کہ کراچی کے کسی دوست کو اصل حالات معلوم کرنے کے لیے لکھا جائے۔ ان ہی خیالات میں تھا۔ کہ کوتوالی سے انسپکٹر پولیس کا ٹیلیفون آیا۔ کہ ایک صاحب جو اپنے آپ کو ایڈیٹر "ریاست" کا ذاتی دوست بیان کرتے ہیں حوالات میں بند ہیں اور ملنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا۔ کہ کون دوست حوالات میں بھیج دیے گئے فوراً کار میں بیٹھ کر کوتوالی پہنچا۔ حوالات میں دیکھا تو وہی سیٹھ صاحب جنگلے کے اندر تشریف فرما ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ کہا: "ہیلو دیوان سنگھ"۔ میں نے پوچھا۔ آپ کس طرح یہاں تشریف لائے آپ نے فرمایا کہ کچھ غلط فہمی سی ہے۔ انسپکٹر پولیس سے ملا۔ پوچھا کیا معاملہ ہے تو انسپکٹر نے بتایا۔ کہ سیٹھ صاحب

Marfat.com

ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ فرینچ موٹر کار کمپنی کو پانچ ہزار روپے کا جعلی چیک دے کر موٹر خریدی۔ پتھر والے بائیسکوپ کے پاس ایک گھڑی ساز کو چیک دے کر گھڑیاں خریدیں۔ بزاز کے ہاں سے کپڑا خریدا اور اس طرح ایک درجن کے قریب جعلی چیک دے کر مختلف لوگوں سے سامان خریدا مگر سامان لیا نہیں۔ انسپکٹر کی باتیں سن کر یقین آیا۔ کہ دس ہزار روپیہ والا چیک بھی ایسا ہی ہے جو کیش نہیں ہو سکتا۔

تین روز بعد سیٹھ صاحب کی پیشی مسٹر رشید مجسٹریٹ کی عدالت میں تھی۔ مقدمہ چار سو بیس یعنی دھوکہ قابل ضمانت تھا۔ مجسٹریٹ نے ملزم سے کہا۔ کہ اگر ضمانت دو تو ضمانت پر رہا ہو سکتے ہو۔ کیا کوئی ضامن ہے جو ضمانت دے۔ سیٹھ صاحب نے فرمایا۔ کہ دیوان سنگھ آپ کا بہت گہرا دوست ہے۔ مسٹر رشید نے ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلیفون کر کے عدالت میں بلایا اور کہا۔ کہ سیٹھ صاحب آپ کے دوست ہیں۔ اگر ضمانت دو۔ تو یہ رہا ہو سکتے ہیں۔ یہ سن کر میں مسکرا دیا۔ اور کہا۔ کہ اگر آپ فرمایئے تو میں تمام حالات عرض کروں میں نے من وعن تمام حالات بتائے۔ کہ کس طرح مجھے بھی دس ہزار روپے کا چیک دیا گیا اور لنچ اور ڈنر کی دعوتیں ہوئیں۔ عدالت میں مسکراہٹ اور قہقہوں کی ایک دلچسپ کیفیت سی تھی۔ آخر میں نے کہا کہ سیٹھ صاحب کے دماغ میں خلل ہے۔ ان کی نیت بری نہیں۔ صرف چیک جاری کرنے کا شوق اور پاگل پن ہے ورنہ مجھے دس ہزار کا چیک کیوں دیتے۔ کیونکہ مجھ سے تو انہوں نے کوئی چیز اس کے معاوضے میں لی نہیں۔ چنانچہ میری شہادت ہوئی میں نے تمام حالات لکھائے اور سیٹھ صاحب دماغی عارضہ میں مبتلا قرار دیے جا کر بری ہوتے واپس بمبئی تشریف لے گئے اور وہ دس ہزار روپے کا چیک جو ایک ہفتہ کے قریب دل کو انتہائی خوش کرنے اور نئی سکیمیں بنانے کا باعث رہا۔ پھاڑ دیا گیا۔

پبلک لائف اور شادی

"ریاست" جاری ہو چکا تھا۔ میں مہاراجہ نابھ کے پاس منصوری پہاڑی پر مقیم تھا۔ مہاراجہ اور مہارانی مجھے اپنی فیملی کے ایک ممبر کی طرح سمجھتے تھے۔ مہاراجہ کے ساتھ کئی برس سے گہرے تعلقات تھے۔ اور مہارانی بھی اپنے بھائیوں کی طرح عزیز سمجھتی تھیں۔ مجھے منصوری گئے ہوئے پندرہ بیس روز ہوئے تھے۔ حافظ آباد سے میری والدہ کا خط ملا۔ کہ شادی کے لیے تمام تیاری مکمل ہو چکی ہے اور تاریخ مقرر کی جا رہی ہے۔ روپیہ کا انتظام کرو۔ میرے پاس روپیہ کہاں۔ تمام زندگی کبھی بھی روپیہ جمع نہ ہو سکا۔ بلکہ ہمیشہ مقروض رہا۔ روپیہ جمع بھی کیوں کر ہو۔ جب روپیہ آنے سے پہلے ہی اس کے خرچ کرنے کا پروگرام بنا لیا جاتا۔ اس خط کو پڑھ کر سوچتا رہا۔ کہ کیا کروں۔ دو روز سوچنے کے بعد میں نے یہ خط مہارانی کو دکھایا دوپہر کو جب ہم لوگ لنچ کھا رہے تھے تو مہارانی نے مہاراجہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیوان سنگھ کی شادی کے لیے تاریخ مقرر ہو رہی ہے۔ اس کے پاس روپیہ موجود نہیں۔ زیور اور کپڑا وغیرہ تو تیار ہے مگر دوسرے اخراجات کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ مہاراجہ نے پوچھا۔ کہ کتنا روپیہ چاہیئے۔ مہارانی

Marfat.com

نے جواب دیا۔ دو ہزار روپیہ کافی ہوگا۔ مہاراجہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

لنچ کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہاں بیٹھے تھے کہ مہاراجہ نے میری شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ جو لوگ پبلک خدمت کریں ان کو شادی نہ کرنی چاہیئے۔ میں نے جواب دیا کہ میں تنہائی کی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شادی کر لوں۔ یہ بحث دیر تک جاری رہی مہاراجہ بار بار زور دیتے تھے کہ میں شادی نہ کروں۔ میں کہتا تھا کہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مہارانی میرے ساتھ متفق تھیں اور کہتی تھیں کہ شادی کر لینا چاہیئے۔ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ رات کو ڈنر پر پھر بحث ہوئی۔ تو مہاراجہ نے اپنے متعلق کہا،

"اگر میری شادی نہ ہوتی۔ بیوی بچے نہ ہوتے تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ یہ بیوی بچے ہیں جن کے باعث میں نے گورنمنٹ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ اور نابھہ کی گدی سے دست بردار ہو گیا۔ اگر بیوی بچے نہ ہوتے تو میں کبھی دست بردار نہ ہوتا اور زندگی کے آخری لمحوں تک کھڑا رہتا۔"

مہاراجہ کے ان الفاظ کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ میں شادی کے خوش گوار خواب دیکھ رہا تھا تین چار روز یہ بحث جاری رہی۔ مہاراجہ بار بار زور دیتے تھے کہ میں شادی نہ کروں۔ پبلک لائف اختیار کرنے والے لوگوں کے راستے میں شادی اور بیوی بچے بہت بڑی رکاوٹ ہیں اور انسان شادی کے بعد جرأت، بہادری اور شجاعت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مگر مجھ پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ مہارانی بیچاری کبھی تو غیر جانبدار بن کر خاموش رہتیں۔ کبھی فرماتیں کہ دیوان سنگھ کو شادی کرنی چاہیئے۔ آخر کئی دن رات اس مسئلہ پر بحث ہونے کے بعد جب میں نہ مانا تو مہاراجہ نے مجبور ہو کر اپنی چیک بک منگائی۔ چیک لکھنے لگے تو پھر فرمایا:

"سردار دیوان سنگھ تم نہیں مانتے۔ تمام زندگی پچھتاؤ گے۔ چونکہ تم نہیں مانتے اس لیے میں تم کو شادی کے لیے دو ہزار روپیہ دیتا ہوں۔"

جب آپ دو ہزار روپیہ کا چیک لکھ چکے تو آپ نے چیک دیتے ہوئے پھر فرمایا۔

"دیوان سنگھ جی! آپ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ میں پھر آپ سے کہتا ہوں۔ شادی نہ کرو۔ پبلک لائف اختیار کرنے والے لوگوں کو شادی نہ کرنی چاہیئے۔ آپ کو شادی کے لیے دو ہزار روپیہ دے چکا ہوں اب بھی اگر شادی نہ کرنے کا اقرار کرو تو میں دو ہزار روپیہ کا ایک اور چیک آپ کو دیتا ہوں۔ یعنی شادی کرو تو دو ہزار اور اگر شادی نہ کرو تو چار ہزار۔"

میں دو ہزار روپیہ لے کر دہلی واپس آ گیا۔ اور چند روز بعد اپنے وطن حافظ آباد شادی کے لیے چلا گیا اور شادی ہو گئی۔ مگر میرے کانوں میں اب تک مہاراجہ نابھہ کے وہ الفاظ گونج رہے ہیں۔

"شادی نہ کرو۔ تمام زندگی پچھتاؤ گے۔ پبلک لائف اختیار کرنے والوں کو شادی نہ کرنی چاہیئے۔"

۱۹۴۲ء میں جب کانگریسی اصحاب کے ساتھ راقم الحروف بھی نظر بند کر دیا گیا۔ جیل میں سونے

Marfat.com

کتابیں پڑھنے کے دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ تو دہلی کے ایک کانگریسی بزرگ شری برج کرشن جی چاندی والا (جو مہاتما گاندھی کے سچے بھگت اور جو غالباً دہلی کے تمام کانگریسیوں سے زیادہ نیک ہیں اور پبلک کے بے غرض خادم ہیں) نے ایک چھوٹی سی کتاب "منگل پربھات" دی جو مہاتما گاندھی کی تصنیف ہے یہ کتاب انسان کے کیریکٹر کو بلند کرنے کے اعتبار سے ایک لاجواب تصنیف ہے۔ شاید سولہ یا بیس صفحے کا چھوٹا سا پمفلٹ مگر جس کے ایک ایک صفحہ۔ ایک ایک سطر۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر جواہرات قربان کیے جاسکیں۔ اس تصنیف میں بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ پبلک لائف اختیار کرنے والے شخص کو شادی نہ کرنی چاہیئے۔ اور اگر اس کی شادی ہو چکی ہو تو پھر بھی اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بہن کے برابر سمجھے اور میاں بیوی کے تعلقات نہ رکھے۔

پچھلے تجربہ کے بعد میری رائے یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستہ میں بیوی، بچے اور روپیہ ایک لعنت ہیں۔ بیوی بچوں اور روپیہ کے باعث انسان جرأت اور شجاعت سے محروم ہو کر خطرات کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اگر پبلک لائف اختیار کریں تو ان کے بیوی بچے نہ ہوں اور وہ روپیہ سے محروم ہوں۔ اور شادی صرف ان لوگوں کو کرنی چاہیئے جو کلرک ٹائپ کے ہوں اور جن کی زندگی کا مقصد کھانا، پہننا، شادی کرنا۔ بچے پیدا کرنا۔ بچوں کو کھلانا۔ ملازمت کرنا۔ اور اگر ان کا افسر مسکرا دے تو خوش ہو جانا۔ اور اگر افسر کی پیشانی پر شکن پڑ جائیں تو رات کو نیند نہ آنا ہو۔

ایڈیٹر "ریاست" پر چوری کا مقدمہ

میں نواب بھوپال والے مقدمہ کی پیشی پر مسٹر برج بہاری تنکلی اور سردار بہادر دیوان سنگھ وکلا کے ساتھ ہوشنگ آباد گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو دفتر کے لوگوں نے بتایا۔ کہ مرحوم نواب صاحب رام پور کے اے ڈی سی کرنل محمد علی آئے تھے۔ اور کہتے تھے کہ نواب صاحب رام پور کی حقیقی بہن شہزادی بیگم صاحبہ دہلی آئی ہیں۔ رام کشور لین کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں اور ملنا چاہتی ہیں۔ میں شام کے وقت کار میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو جس کوٹھی کا پتہ بتایا گیا تھا وہ خالی تھی۔ کوٹھی کے چوکیدار سے معلوم ہوا کہ دو تین روز ہوئے بیگم صاحبہ نئی دہلی کی کسی کوٹھی میں چلی گئی ہیں۔ میں نے پڑوسیوں سے پوچھا کہ نئی دہلی میں کس سڑک پر وہ کوٹھی ہے تو کچھ پتہ نہ چلا۔ واپس آگیا۔ ڈاک خانہ کو ٹیلی فون کیا کہ بیگم صاحبہ کی ڈاک کہاں جاتی ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس بھی کوئی ہدایت نہیں۔ دو روز بعد کرنل محمد علی پھر آئے۔ انہوں نے بتایا۔ کہ شہزادی بیگم صاحبہ نئی دہلی پارک روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم ہیں۔ حالات بتانا چاہتی ہیں اور کئی بار یاد فرما چکی ہیں۔ شام کو جب سیر کے لیے گیا تو پارک روڈ والی اس کوٹھی میں پہنچا جس کا پتہ بتایا گیا تھا۔ کرنل محمد علی منتظر تھے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ بیگم صاحبہ کے دونوں صاحبزادے (موجودہ نواب رامپور کے حقیقی بھانجے) بھی بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ساتھ والے کمرہ میں بیگم صاحبہ تشریف لائیں اور دروازہ

Marfat.com

کی اوٹ میں پردہ کے اندر بیٹھ کر آپ نے باتیں شروع کیں۔ آپ نے پوچھا۔ کیا دفتر "ریاست" میں رامپور سے گمنام خطوط ملا کرتے تھے۔ میں نے کہا۔ مجھے تو یاد نہیں۔ شاید ملے ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ رام پور کے شاہی محلات سے آپ بغیر نام لکھے وہاں کے مظالم کے متعلق خطوط لکھا کرتی تھیں۔ اور ملازموں کو دے کر سٹیشن پر پوسٹ کرایا کرتی تھیں۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آیا۔ کہ گمنام کئی خطوط رام پور سے ملے تھے۔ جن میں رامپور پیلس کے اندرونی افسوسناک حالات کا ذکر ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ آپ نے ایک طویل عرصہ بطور ایک قیدی کے پیلس میں بسر کیا۔ آپ کو محلات سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ آپ نواب صاحب اور اپنی بھاوج وغیرہ اور عزیزوں کے ساتھ منصوری گئیں۔ اور جب سب لوگ منصوری سے واپس ڈیرہ دون جا رہے تھے۔ تو آپ راستہ میں ڈیرہ دون، رام پور والی گاڑی کی جگہ دہلی والی گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ملازموں میں بہت تشویش ہوئی مگر کسی کو جرأت نہ تھی۔ کہ کوئی روکتا۔ اور اب آپ دہلی میں اس لیے آئی ہیں کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کے ساتھ انصاف کرے اور پبلک کو بتایا جائے کہ بھائی نے حقیقی بہن کے ساتھ کس قدر زیادتی کی۔ میں دو گھنٹہ کے قریب بیگم صاحبہ سے باتیں کرتا رہا۔ میں ڈرائنگ روم میں تھا اور وہ پردہ کے پیچھے دروازہ کی اوٹ میں دوسرے کمرہ کے اندر۔ باتیں ہو چکنے کے بعد میں یہ وعدہ کر کے چلا آیا کہ حاضر ہوا کروں گا۔

شہزادی بیگم صاحبہ کے آنے کی اطلاع تمام شہر میں پھیل گئی۔ اور بھائی کی بہن کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے چرچے شروع ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی کو جب معلوم ہوا۔ تو آپ فوراً رام پور پہنچے۔ وہاں سے بیس ہزار روپیہ کے قریب اس لیے لائے کہ شہزادی بیگم صاحبہ کو دہلی میں رسوا و ذلیل کیا جائے۔ آپ نے ایک روزانہ اخبار "عادل" جاری کیا۔ اس میں ہر روز شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف کئی کئی کالم کے مضامین شروع ہوئے۔ آپ نے کرایہ کے کچھ لوگ تھوڑے روپیہ کے ساتھ خریدے اور باقی روپیہ جو دوسرے لوگوں کے نام سے لائے تھے وہ بھی ہضم کر گئے۔ چند روز کے بعد پھر رام پور تشریف لے گئے۔ اس طرح سے ہیرا پھیری کر کے آپ نے کافی روپیہ اخبار "عادل" کو چلانے اور دوسرے لوگوں کا ضمیر خریدنے کے نام پر حاصل کیا اور نواب رام پور کو یقین دلایا۔ کہ آپ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بھی اپنا اثر استعمال کر کے شہزادی بیگم صاحبہ کو جبراً دہلی سے رام پور بھجوا دیں گے۔ حالانکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کو جو کچھ سمجھتا تھا اس کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ کہ نواب صاحب رام پور کو کیوں کر بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔

ادھر تو خواجہ حسن نظامی نے شہزادی بیگم صاحبہ کے خلاف اخبار "عادل" اور دوسرے چند اخبارات میں گندا پراپیگنڈہ شروع کیا۔ ادھر شہزادی بیگم صاحبہ کے ہاں خود غرض لوگوں نے آنا شروع کیا۔ کوئی پمفلٹ لکھنے کی ترغیب دیتا۔ کوئی پوسٹر لکھنے کی۔ کوئی نیا اخبار نکالنے کے لیے امداد چاہتا۔ اور کوئی اپنے اخبار میں حمایت کرنے کا وعدہ کرتا۔ بیگم صاحبہ کسی کو کچھ جواب نہ دیتیں صرف یہ کہہ کر سب کو ٹال دیا جاتا کہ غور کریں گی۔ میں کام سے فارغ ہونے کے بعد جب کار میں سیر کو جاتا۔ تو مغرب کے بعد بیگم صاحبہ کے ہاں بھی ہر روز پہنچتا۔ بیگم صاحبہ بتاتیں کہ کون صاحب تشریف لائے تھے۔ اور کیا کہتے تھے۔ میں مناسب رائے

Marfat.com

دے دیتا۔ کیونکہ ان خدمات پیش کرنے والوں کے تمام حالات سے واقف تھا۔ یہ زمانہ بھی میرے اور میرے دوستوں کے لیے بہت امتحان کا تھا۔ اس سے پہلے میرے اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ آپ نے نواب رام پور کو خوش کرنے کے لیے میرے خلاف لکھنے کی بسم اللہ اس اخبار "عادل" سے کی۔ جب خواجہ حسن نظامی نے میرے خلاف پہلا مضمون لکھا تو میں نے واحدی صاحب اور بھیا شیخ احسان الحق جو دونوں کے مشترکہ دوست تھے، کی معرفت آپ سے کہا کہ میرے خلاف بلاوجہ نواب رام پور کو خوش کرنے کے لیے نہ لکھیئے۔ یہ وضعداری کے خلاف ہے۔ زبانی تو آپ نے واحدی صاحب اور بھیا احسان دونوں سے وعدہ کیا۔ مگر مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ ان کی جیب ان کو مجبور کر رہی تھی۔ کہ نواب رام پور کو اور خوش کرو۔ آخر میں نے واحدی صاحب سے ٹیلیفون پر کہا۔ کہ اب میں خواجہ کو ایسا سیدھا کروں گا جیسے (اس کے بعد پنجابی زبان میں کہا جس کا یہاں لکھنا مناسب نہیں) واحدی صاحب بچارے پنجابی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھ سکتے تھے اور غیر معمولی اور غیر ضروری نیک۔ آپ نے جب مجھے انتہائی غصہ کی حالت میں ٹیلی فون میں پنجابی کے زیادہ سخت اور زوردار الفاظ کہتے سنا تو آپ نے کہا۔ کیا فرمایا سردار صاحب، کیا فرمایا۔ میں سمجھا نہیں۔ آپ نے کیا فرمایا۔ میں نے پنجابی کے ان الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ واحدی صاحب سُن کر سُن ہو گئے۔ میں نے ٹیلی فون بند کر دیا اور سمجھ لیا کہ خواجہ حسن نظامی روپیہ کے لیے دوستوں کو بھی قربان کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد کبھی ان کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہو سکے۔ حالاں کہ انہوں نے درجنوں بار تعلقات کو اچھا کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام واقعات کا علم واحدی صاحب اور بھیا احسان دونوں کو ہے اور یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کی مخالفت کا ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میرے ان دونوں کے ساتھ ہمیشہ ہی گہرے اخلاص و دوستی کے تعلقات قائم رہے۔ چنانچہ بھیا صاحب نے تو دو سال ہوئے میرے جیل جانے پر میری غیر حاضری میں دفتر "ریاست" کا اور میرا ذاتی تمام انتظام بھی اپنے ذمہ لیا۔ اور اب تک دونوں کے ساتھ بھائیوں جیسے گہرے تعلقات ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے علاوہ اس زمانہ میں کئی اور دوست بھی ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے۔ میرٹھ کے ایک جرنلسٹ ان واقعات سے پہلے جب کبھی دہلی آتے تو ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر ٹھہرتے تھے۔ بہت گہرے مراسم تھے۔ اس کشمکش کو دیکھ کر ان کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ خواجہ حسن نظامی کے پاس چلے گئے اور امداد چاہی۔ وہاں درویشوں کے پاس دوسروں کے لیے کیا رکھا تھا۔ ان کی جھولی میں تو اپنے لیے بھی کافی نہیں ہوتا ناکام میرٹھ واپس چلے گئے۔ چند روز کے بعد پھر دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ مجھے ان کے خواجہ حسن نظامی سے ملنے اور اپنی خدمات پیش کرنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ میں نے کہا تشریف لے جائیے اور آئندہ کبھی نہ آئیے۔ چنانچہ اس کے بعد ان حضرت کو ادھر کا رخ کرنے کا کبھی حوصلہ نہیں ہوا۔ اس طرح سے ہی کئی دوسرے دوستوں سے تعلقات منقطع ہو گئے جن کے متعلق دیکھ لیا کہ یہ لوگ روپیہ پر دوستوں کو قربان کر سکتے ہیں۔

میں ایک روز شام کو شہزادی بیگم کے ہاں گیا تو انہوں نے فرمایا۔ کہ ایک صاحب خواجہ حسن نظامی کے

Marfat.com

ہاں کلرک کا کام کرتے ہیں آئے تھے کہتے تھے کہ اگر روپیہ دو تو خواجہ حسن نظامی کے ہاں کے کچھ کاغذات دیئے جاسکتے ہیں جو رام پور سے آئے ہیں چونکہ آپ سے مشورہ کرنا تھا اس لیے اس شخص کو کل آنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ میں نے کہا کل جب وہ شخص آئے تو اس سے کہیئے۔ کہ پہلے کاغذات دکھاؤ پھر روپے کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ اگلے روز اس کلرک سے یہی کہا گیا۔ تیسرے روز یہ شخص کاغذات کا ایک چھوٹا سا بنڈل لے کر آیا۔ تو اس سے کہا گیا۔ کہ دو روز کے بعد جواب دیا جائے گا۔ میں اس روز جب بیگم صاحبہ کے ہاں گیا تو آپ نے بغیر اس بنڈل کو کھولے یہ کاغذات مجھے دیکھنے کے لیے دیے۔ میں کاغذات لے کر دفتر چلا آیا۔ وہاں اس بنڈل کو کھولا تو زیادہ تر اس میں خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے مضامین کے ردّی مسودے تھے۔ جن سے ہمیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کام کے جو کاغذات ملے ان میں چار پانچ بہت اہم تھے۔ ایک خط مسعود صاحب (میرا خیال ہے یہی نام تھا۔ اس زمانہ میں "ریاست" میں اس خط کا بلاک چھپا تھا) ریونیو منسٹر رام پور کا ایک وہاں کے پبلسٹی آفیسر کا اور ایک اور کسی صاحب کا۔ ان خطوط میں لکھا گیا تھا۔ کہ شہزادی بیگم کے خلاف اخبارات میں اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر اپنا اثر استعمال کرتے ہوئے خوب پراپاگنڈہ کرو۔ تاکہ یہ خاتون ذلیل رسوا ہو۔ ان خطوط کے علاوہ اخباری نقطۂ نگاہ سے چند مضامین کے مسودے بہت اہم تھے۔ جو خواجہ صاحب نے اپنے اخبار میں چھپنے کے لیے حیدر آباد سے بھیجے اور جن میں بار بار آپ نے خود اپنے آپ کو "حضرت خواجہ صاحب" "حضرت خواجہ صاحب" لکھا تھا یعنی حسن نظامی کو اپنے نام کے ساتھ خود "حضرت خواجہ صاحب" لکھتے ہوئے شرم محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ذہنیت کے آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لالہ۔ بابو یا سردار وغیرہ لکھے۔ میں نے جب یہ کاغذات دیکھے تو ایسا محسوس کرتا تھا۔ گویا کہ ایک نعمت ہاتھ میں آگئی اور اس سے خواجہ حسن نظامی کی پبلک میں اخلاقی موت کی جاسکے گی۔

میں بار بار ان خطوط اور مسودوں کو دیکھتا رہا مجھے نیند نہ آئی (میری فطرت ہے کہ جب تک کسی بات کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کرلوں یا پروگرام تیار نہ ہوجائے۔ یا کام ختم نہ کرلیا جائے میں سو نہیں سکتا) نصف گھنٹہ کے قریب ان کاغذات کو دیکھتا رہا اور کھانا بھی کھاتا رہا بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ سوچتا رہا پھر خیال کیا۔ کہ کون شخص ایسا ہوگا جو مسعود صاحب کے خط سے واقف ہو۔ چند منٹ سوچنے کے بعد مکان سے نیچے اترا۔ دفتر کی پچھلی طرف موٹر گیرج تھا۔ اس میں سے کار نکالی۔ اور نئی دہلی خان بہادر مولوی محمد مظہر صاحب (جو دہلی آنے سے پہلے یوپی میں ملازم تھے، ہندوستان کے مشہور مفتی مولانا اشرف علی تھانوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور بعد میں ریاست حیدر آباد میں ایک بہت بڑے عہدہ پر تھے) کے مکان پر گیا۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے مگر وہ ابھی ایک دوست کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے پان کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرمانے لگے اس وقت کیسے تشریف لائے۔ خیریت تو ہے۔ میں نے کہا "سلام دہقانی خالی از مطلب نیست"۔ کیا آپ مسعود صاحب کو جانتے ہیں جو پہلے یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور آجکل رام پور میں ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ بہت اچھی طرح سے۔ میں نے جیب سے مسعود صاحب والا خط نکالا۔ اور پوچھا کیا آپ یہ خط پہچانتے ہیں۔ آپ نے خط دیکھ کر کہا۔ کہ آپ اتنے زیادہ واقف نہیں۔ مگر یہ صاحب (جو ساتھ

Marfat.com

بیٹھے تھے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کئی برس مسعود صاحب کے ساتھ مرادآباد میں اکٹھے رہے ہیں اور ان کے گہرے دوست ہیں۔ خط ان صاحب کو دیا گیا۔ تو انہوں نے دیکھتے ہی فوراً کہا۔ ہاں یہ خط مسعود کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ہے۔ مظہر صاحب نے پوچھا کیا معاملہ ہے میں نے کہا معمولی بات ہے۔ پوچھنا تھا۔ کہ یہ خط کس کا ہے۔ میں واپس چلا آیا۔ دفتر پہنچا۔ نیند کسے آتی۔ میز پر بیٹھ گیا۔ تمام سکیم تیار کی۔ کہ ان کو کب اور کس طرح شائع کیا جائے۔ لیڈر لکھا اور تمام پروگرام تیار کرنے کے بعد سو گیا صبح اٹھتے ہی ان خطوط کو فوٹوگرافر کے پاس اس تاکید کے ساتھ آدمی کے ہاتھ بھیجا۔ کہ جب وہ فوٹو لے چکے تو اصل خط واپس لے آئے۔ شام کو بیگم صاحبہ کے پاس گیا۔ ان سے کہا کہ پانچ چھ خط کام کے ہیں۔ باقی تمام واپس کر دیجئے اور کہا۔ کہ ان پانچ چھ خطوط کا ایک یا دو سو روپیہ دے دیا جائے۔ چنانچہ اگلے روز جب خط لانے والا آیا۔ تو اس کو دو سو روپے دے دیے گئے۔

ان خطوط کے بلاک بنے۔ بلاکوں کا چربہ لیا گیا۔ اور "ریاست" میں ان چربوں کے ساتھ لیڈر شائع ہُوا۔ اس پرچہ کا شائع ہونا تھا۔ کہ خواجہ حسن نظامی کے کیمپ میں زلزلہ آ گیا۔ انتہائی گھبراہٹ۔ بھاگ دوڑ۔ کہ اب کیا ہو۔ خواجہ اینڈ کو کی کانفرنس اور مشورے۔ خواجہ حسن نظامی کو جو لوگ ذاتی اعتبار سے جانتے تھے ان کو علم تھا۔ کہ یہ حضرت عقل اور ہوشیاری کے اعتبار سے ہمیشہ دوسروں کے رحم پر رہے ہیں۔ ان کی اوپر کی منزل کا حصہ (دماغ) بالکل ٹولیٹ (خالی) رہتا ہے۔ ان کے مشیروں نے رائے دی کہ پولیس افسروں سے مل کر تھانہ میں رپورٹ درج کرائیے۔ اور کاغذات کے چوری کرانے کے جرم میں دیوان سنگھ کو قید کرا دیجئے۔ تعزیراتِ ہند کی دفعہ فلاں کے مطابق چوری کا مال لینا بھی جرم ہے۔ دیوان سنگھ فوراً قید ہو۔ چنانچہ آپ مع اپنے حواریوں کے پولیس افسروں کے پاس پہنچے۔ راقم الحروف نے بھی اطلاعوں کے لیے ان کے کیمپ میں آدمی چھوڑ رکھا تھا اس نے ٹیلی فون کیا۔ کہ یہ سکیم ہے۔ چوری کا مقدمہ قائم ہو گا اور دفتر "ریاست" کی تلاشی ہوگی۔ میں نے ٹیلیفون پر اس اطلاع کو پاتے ہی فوراً تمام کاغذات اور بلاک ایک اٹاچی کیس میں بند کیے تالا لگایا اور نئی دہلی ایک دوست کے ہاں گیا۔ وہ دوست اپنے خسر کے ہاں رہتے تھے اور ان کے خسر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدہ پر تھے میں نے اس دوست کو اٹاچی کیس دیا اور کہا۔ کہ اس میں کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ ان کو اپنے ہاں احتیاط سے رکھ چھوڑیئے۔ اس دوست نے کہا رکھ لیے جائیں گے معمولی بات ہے۔ اگر بہت ہی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے تو آپ اپنے خسر کے ہاتھ دفتر میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں وہ کانفیڈنشل کاغذات کی الماری میں رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں تو واپس آ گیا اور وہ کاغذات گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی کانفیڈنشل الماری میں پہنچ گئے۔ جہاں سے دو ہفتہ کے بعد واپس منگائے گئے۔ اٹاچی کیس اس دوست کے پاس چھوڑ کر میں واپس آیا۔ اپنے کام میں مصروف تھا۔ کہ پولیس کی جمعیت کے آٹھ دس آدمی۔ ایک سب انسپکٹر خواجہ حسن نظامی کے سالے ابن عربی۔ ایک اخبار نویس جو ان دنوں خواجہ حسن نظامی کے اخبار میں کام کرتے تھے (اور اب خواجہ حسن نظامی کو قابلِ نفرت مگر قابلِ رحم سمجھتے ہیں۔) اور متعدد دوسرے لوگ تلاشی کے لیے تشریف لائے۔ میں بے فکر تھا۔ تلاشی ہوئی۔ ایک ایک کونہ

Marfat.com

چھان مارا گیا۔ کوئی کسی طرف تلاشی میں مصروف ہے کوئی کسی طرف۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے دُور سے آواز دی کہ دیکھو دری کے نیچے سے خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی ایک تحریر نکل آئی ہے ہم لوگ وہاں گئے تو کاغذ کا ایک پرزہ ان کے ہاتھ میں تھا جو خواجہ حسن نظامی کے کسی مضمون کے مسودہ کی ایک سلپ تھی۔ میں نے سب انسپکٹر کو بتایا۔ کہ اس شخص نے خود اپنے جیب سے یہ پرزہ نکال کر رکھا ہے۔ ورنہ دری کے نیچے اگر میں نے رکھا ہوتا تو اصل کاغذات بھی یہاں ہوتے جن کی تلاش ہے۔ سب انسپکٹر پولیس کو بھی اس شخص کی اس حرکت پر افسوس ہوا۔ کیونکہ یہ پرزہ بالکل بے ضرر تھا۔ دراصل یہ لوگ بے ایمانی کرنا چاہتے تھے مگر ان کے اندر بے ایمانی کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ اگر اس طرح سے کوئی شے رکھنا چاہتے تھے تو کوئی پستول یا کوکین وغیرہ رکھواتے۔ ایک کاغذ کا پرزہ وہ بھی بے ضرر یعنی ساری رات رٹتے رہے مرا ایک بھی نہ۔ تلاشی ختم ہوئی کچھ نہ نکلا۔ "ریاست" کے جس پرچہ میں بلاک چھپا تھا۔ پولیس وہ پرچہ لے کر چلی گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے بہت کوشش کی کہ اس پرچہ کو چوری کا ثبوت سمجھ کر ایڈیٹر "ریاست" کو گرفتار کیا جائے۔ مگر یہ بیچارا نہ قانون سے واقف تھا۔ نہ خدا نے شے لطیف دی تھی۔ مقدمہ کیسے چلتا جب کہ "چوری کا مال" ہی نہ پکڑا گیا۔ کیونکہ کسی چوری شدہ شے کا فوٹو تو چوری نہیں قرار دیا جا سکتا جس طرح فرار شدہ مجرم کا فوٹو قابل تعزیر نہیں۔ بلکہ خود فرار ہونے والا مجرم قابلِ گرفت ہے۔ یہ لوگ ٹھنڈے ہو کر اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ اس کے بعد "ریاست" میں یہ بلاک چھپے اور ان پر تفصیل کے ساتھ بحث ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کے پریشان مشیروں کی پھر کانفرنس ہوئی۔ ایک صاحب نے آپ کو رائے دی کہ اپنی پبلک پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ اعلان کر دو کہ یہ خطوط جعلی تھے رام پور کے لوگوں کے لکھے ہوئے نہیں۔ تاکہ لوگ "ریاست" کے پراپاگنڈہ پر یقین نہ کریں۔ خواجہ حسن نظامی لوگوں کی رائے قبول کرنے کے اعتبار سے بہت احمق واقع ہوئے تھے۔ آپ نے کچھ نہ سوچا جھٹ اخبار میں اعلان کر دیا۔ کہ جو خطوط "ریاست" میں شائع ہوئے وہ جعلی ہیں۔ رام پور کے منسٹروں کے لکھے ہوئے نہیں خواجہ حسن نظامی کا یہ اعلان شائع ہونا تھا۔ کہ ہمارے ہاتھ اور مضبوط ہو گئے۔ ہم نے چیلنج کیا کہ خواجہ حسن نظامی میدان میں آئیے اور بتائیے کہ اصل پوزیشن کیا ہے۔ یہ خطوط جعلی ہیں یا اصلی۔ کیونکہ صرف دو صورتیں ہی ممکن ہیں یا تو یہ جعلی ہیں یا اصلی۔ اگر یہ خط جعلی ہیں تو اس نے پولیس میں چوری کی جھوٹی رپورٹ دی۔ کیونکہ جعلی خطوط کا چوری سے کیا تعلق۔ اس کا تعلق تو جعل سازی سے ہے اور اگر چوری کی رپورٹ درست تھی اور خواجہ حسن نظامی نے یہ رپورٹ پولیس میں ایمان داری کے ساتھ سچی درج کرائی یعنی خطوط چوری ہوئے تو پھر یہ جعلی کس طرح قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس چیلنج کو پڑھ کر حضرت خواجہ صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔ کیا جواب دیتے۔ اس زہر کو اپنی والدہ محترمہ کا میٹھا دودھ سمجھ کر صبر کے ساتھ پی گئے۔ اور قطعی خاموش ہو گئے۔ گویا آپ کی زبان میں گنگ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اس مسئلہ پر پھر آپ نے کبھی کچھ نہ فرمایا۔

چیلنج شائع ہوا۔ دفتر "ریاست" میں اطلاع پہنچی۔ کہ نواب رام پور کے خسر صاحبزادہ عبدالصمد (جو بعد میں ریاست کشمیر میں ہوم منسٹر مقرر ہوئے) دہلی آئے ہیں اور میڈن ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اس زمانہ میں مسٹر محمد حسن سابق ایڈیٹر روزنامہ "اودھ اخبار" لکھنؤ، دہلی میں تھے اور دفتر "ریاست" میں تشریف لایا کرتے تھے۔ صاحبزادہ

Marfat.com

صاحب کے دوست تھے۔ ہیں نے ان سے کہا کہ میڈن ہوٹل ہیں جا کر پتہ تو کرو کہ صاحب زادہ صاحب پر اس چیلنج کا کیا اثر ہے وہ گئے۔ صاحب زادہ صاحب سے ملے اور اس چیلنج۔ اخبار "ریاست" اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر چھیڑ دیا۔ تو صاحبزادہ صاحب نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر محسن صاحب سے کہا۔

"محسن صاحب! کیا پوچھتے ہو۔ نواب صاحب غلط راستہ پر جا رہے ہیں کسی کی نہیں سنتے۔ خواجہ حسن نظامی جیسے غیر ذمہ دار اور نادان دوستوں کے باعث ریاست رام پور کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ ذمہ دار منسٹروں نے حسن نظامی جیسے غیر ذمہ دار شخص کو خطوط لکھنے کی حماقت کی ہیں تو ایسے معاملات ہیں دخل نہیں دینا۔ خدا ان کو عقل دے۔"

یہ خطوط اب بھی ایڈیٹر "ریاست" کے پاس موجود ہیں۔ جن کی حیثیت اوراق پارینہ سے زیادہ نہیں۔ جب کبھی پچھلے کاغذات کو چھانتا ہوں اور ریاست رام پور کے فائل ہیں ان خطوط اور شہزادی بیگم صاحبہ کے خط (جس میں آپ نے لکھا تھا۔ کہ آپ ایڈیٹر "ریاست" کی اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح عزت و قدر کرتی ہیں) کو دیکھتا ہوں تو گنگناتے ہوئے یہ شعر زبان سے نکل جاتا ہے۔ ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

ایڈیٹر "ریاست" پر کوکین کا مقدمہ

ایڈیٹر "ریاست" لاہور کے ایک روزانہ اردو اخبار "بندے ماترم" کو ایڈیٹ کرتا تھا۔ اس اخبار ہیں دبے الفاظ کے ساتھ پٹیالہ کے سردار لال سنگھ کے قتل کا ذکر ہوا۔ اس سے پہلے کسی اخبار ہیں کبھی بھی مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف ایسا الزام شائع نہ ہوا تھا۔ اس مضمون کا شائع ہونا تھا۔ کہ پٹیالہ کے کیمپ ہیں زلزلہ آ گیا۔ سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ لاہور تشریف لائے۔ اور یہ مضمون ڈاکٹر گوکل چند نارنگ بیرسٹر (جو بعد ہیں پنجاب کے منسٹر بنے اور اب سر گوکل چند ہیں) کو دکھا کر قانونی مشورہ طلب کیا۔ اس مضمون ہیں دبے الفاظ کے ساتھ اشارۃً قتل کا ذکر تھا۔ صاف الفاظ ہیں نہ تھا۔ ہیں نہیں کہہ سکتا ڈاکٹر نارنگ نے کیا رائے دی۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر نارنگ کے پاس لالہ دینا ناتھ مرحوم ایڈیٹر "ہندوستان" جو ڈاکٹر صاحب کے بہت گہرے دوست تھے بیٹھے تھے۔ ان کو معلوم ہوا۔ کہ سر دیا کشن کول اس مضمون پر مقدمہ چلانے کا مشورہ لے رہے ہیں تو آپ سیدھے دفتر "بندے ماترم" ہیں تشریف لائے اور بتایا کہ سر دیا کشن کول ڈاکٹر نارنگ سے مشورہ لینے کے لیے پٹیالہ سے تشریف لائے ہیں اور مقدمہ چلایا جائے گا۔ راقم الحروف کا یہ زندگی بھر معمول رہا۔ کہ اس وقت تک کسی معاملہ کو اخبار ہیں شروع نہیں کرتا جب تک کہ ہاتھ مضبوط نہ ہوں اور ہیں قدم اٹھانے کے بعد ڈر، خوف یا دھمکی کے ذریعہ قدم پیچھے لے جانا بزدلی سمجھتا ہوں۔ لالہ دینا ناتھ باتیں کرتے اور مجھے قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ ہیں سنتا رہا۔ لالہ جی کے جانے کے بعد ہیں تھوڑی دیر غور کرتا رہا۔ پھر ایک لیڈر لکھا جو بہت زوردار تھا۔ اس لیڈر ہیں مرحوم مہاراجہ پٹیالہ پر کھلے

Marfat.com

اور صاف الفاظ میں لال سنگھ کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا اور چیلنج کیا گیا۔ کہ اگر مہاراجہ پٹیالہ میں غیرت ہے تو مجھ پر اس الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔ میں ثابت کرنے کے لیے تیار ہوں کہ قتل کی ذمہ داری مہاراجہ پٹیالہ کی گردن پر ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پٹیالہ کی کیا حالت ہوگی جس صورت میں کہ اشارہ اور دبے الفاظ سے ہی گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ لیڈر کے بعد راقم الحروف نے اخبار "بندے" میں ہر روز اس الزام کے سلسلہ میں لکھنا شروع کیا اور کئی روز تک مضامین کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس واقعہ سے قریباً ڈیڑھ ماہ بعد کا ذکر ہے کہ میں شام کو کچھ سامان خریدنے بازار گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو دیکھا۔ کہ دفتر "بندے" کے سامنے ایک اکسائز انسپکٹر۔ ایک سب انسپکٹر پولیس اور ایک درجن کے قریب اکسائز اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ملازم اور گواہ کھڑے ہیں۔ میں نے پہنچتے ہی پوچھا۔ کہ فرمائیے کیا حکم ہے۔ انہوں نے بتایا۔ کہ کوکین رکھنے کے الزام میں تلاشی ہوگی۔ پولیس کو اطلاع ملی ہے کہ دیوان سنگھ کوکین فروشی کرتا ہے۔

تلاشی ہوئی۔ تلاشی میں میری میز پر جو کاغذات والا ڈسپیچ بکس تھا اس میں سے نارتھ ویسٹرن ریلوے کے دو ٹائم ٹیبل نکلے۔ ایک ٹائم ٹیبل جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا اور میرا ذاتی تھا۔ دوسرا جس کے لفافہ میں (جو ٹائم ٹیبل کے ساتھ پچھلے حصہ میں ریلوے کے نقشہ کے لیے ہوتا ہے) کوکین کی ایک چھوٹی سی پڑیہ اور ایک کارڈ تھا جو گوجرانوالہ سے دیوان سنگھ ایڈیٹر "بندے" کے نام بھیجا گیا اور جس میں لکھا تھا کہ کوکین بھیجی جا رہی ہے۔ روپیہ جلدی بھیج دو۔ اس کارڈ کے لکھنے والے کا نام گوربخش سنگھ تھا (غالباً یہی نام تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں) تلاشی میں کوکین اور یہ خط نکل آیا۔ میں حیران تھا۔ کہ یہ اس بکس میں کیونکر آ گیا۔ اس خط اور کوکین کے نکلنے کے بعد مجھے کوتوالی انارکلی لے جایا گیا۔ وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس چوہدری رام چند تھے۔ میری گرفتاری کی خبر اخبارات اور دوستوں کے حلقہ میں پہنچی تو اخبارات کے ایڈیٹر حیران تھے۔ کئی دوستوں نے کوتوالی پہنچ کر ضمانت کے لیے کوشش کی اور باوجود اس بات کے کہ جرم قابل ضمانت تھا۔ پولیس والوں نے ضمانت نہ لی اور رات کو مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اگلے روز صبح بھی میرے دوست، اخبارات کے ایڈیٹر اور عزیز ضمانت کے لیے کوشش کرتے رہے مگر پولیس والوں نے کسی کی بات تک نہ سنی۔ دوپہر کو پولیس مجھے لالہ شنکر لال مجسٹریٹ کے گھر پر گوالمنڈی ریمانڈ کے لیے لے گئی۔ وہاں کئی اخبارات کے ایڈیٹر، دوست اور رشتہ دار موجود تھے۔ ان لوگوں نے بتایا۔ کہ رات کو اور صبح ضمانت کے لیے کوشش کی گئی۔ مگر کسی نے پروا نہیں کی مجسٹریٹ نے فوراً ضمانت پر چھوڑنے کا حکم دیا۔ اور آپ پولیس والوں پر ناراض ہوئے اور پوچھا۔ کہ جس صورت میں جرم قابل ضمانت تھا۔ کیوں ضمانت نہیں لی گئی۔ پولیس کے جو لوگ ساتھ آئے تھے وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ صرف یہی کہا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب جواب دے سکتے ہیں ان لوگوں کو کچھ علم نہیں کہ کیوں ضمانت نہ لی گئی۔

کوکین کا مقدمہ چلا۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کو وکیل کیا۔ ڈاکٹر صاحب لاہور کے فاضل ترین وکلاء میں سے تھے۔ آپ صرف ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ چھوٹی عدالتوں میں نہ جاتے تھے۔ آپ نے کافی فیس طلب کی جو ادا کر دی گئی۔ مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی اور مسل کو غور کے ساتھ

Marfat.com

دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ کوکین کے ساتھ جو پوسٹ کارڈ رکھا ہوا ملا اس پر جو عبارت درج ہے اس میں کارڈ لکھنے کا مقام گوجرانوالہ درج ہے مگر کارڈ کی روانگی کی مہر نصف لگی ہے۔ جس میں سے شہر کا نام پڑھا نہیں جاتا۔ مگر ڈاک خانہ سے ڈسپیچ کا وقت صبح آٹھ بجے ہے۔ دوسری مہر لاہور پہنچنے کی لگی تھی جس پر لاہور اور وہی تاریخ جو ڈسپیچ کی تھی اور وقت نو بجے کا تھا۔ گویا کہ یہ کارڈ مہروں کے مطابق اگر گوجرانوالہ سے چلا ہے، تو گوجرانوالہ کے ڈاک خانہ سے ۸ بجے کے بعد چلا اور نو بجے لاہور کے ڈاک خانہ میں پہنچا۔ اس کارڈ کو دیکھ کر ہم سب لوگ حیران تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر نارنگ نے مجسٹریٹ کو توجہ دلائی۔ کہ صبح آٹھ بجے گوجرانوالہ سے کوئی گاڑی لاہور کی طرف نہیں آتی۔ اور اگر آئے بھی تو ٹرین جلدی سے جلدی دو گھنٹہ میں گوجرانوالہ سے لاہور پہنچ سکتی ہے پھر یہ کارڈ کس طرح اور کس ذریعہ سے آٹھ بجے گوجرانوالہ کے ڈاک خانہ سے چل کر نو بجے لاہور کے ڈاک خانہ میں پہنچ گیا۔ استغاثہ کی یہ جعل سازی صاف ظاہر تھی اور اس کارڈ کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے ڈاک خانہ میں کسی مہر لگانے والے کو پانچ دس روپے دے کر دونوں مہریں لگوالی گئیں۔ اور جلدی میں وہی مہریں لگ گئیں جو تاریخ اور وقت کی تیار رکھی تھیں۔ چنانچہ اس مقدمہ میں ٹھاکر للت چند مجسٹریٹ نے جو بعد میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور ریاست جے پور میں ریونیو منسٹر رہے، نے راقم الحروف کو بری کرتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا۔ کہ یہ مقدمہ ایک سازش کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں ریاست پٹیالہ کا روپیہ ہے اور بلاشبہ جعل سازی کی گئی ہے۔

میں بری ہو گیا۔ اخبار "پنتھ" بند ہو چکا تھا اور میں ریاست نابھہ میں چلا گیا تھا جہاں مہاراجہ کی معزولی کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ نابھہ میں تین ماہ کے قریب پولیس کی نگرانی میں نظر بند رہا۔ کسی کو مجھ سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میرے دوستوں نے نابھہ کی گرفتاری اور نظر بندی کو وائسرائے تک پہنچایا۔ لارڈ ریڈنگ وائسرائے تھے۔ آپ نے کاغذات طلب کئے۔ کوئی الزام نہ تھا۔ آپ کے حکم سے تین ماہ کی نظر بندی کے بعد رہائی ہوئی اور جب میں رہا ہو کر لاہور پہنچا تو معلوم ہوا۔ کہ میری نظر بندی کے زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے میرے کوکین کے مقدمہ کی تحقیقات ہوئی۔ تحقیقات کا کام خان بہادر عبدالعزیز سپرنٹنڈنٹ پولیس (جو بعد میں پنجاب میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے) کے سپرد کیا گیا۔ خان بہادر عبدالعزیز نے گورنمنٹ آف انڈیا کو من و عن اصل حالات کی رپورٹ کی۔ اس رپورٹ کے بعد لاہور پولیس و اکسائز ڈیپارٹمنٹ کے متعدد افسروں کے گھروں کی تلاشی ہوئی۔ تلاشی میں کوکین کا سراغ نکل آیا اور ان افسروں میں سے بعض پر مقدمہ قائم ہوا۔ بعض موقوف کیے گئے اور بعض کی تبدیلیاں کی گئیں۔

مقدمہ کے دوران میں ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کہ کوکین کے رکھنے اور مقدمہ بنانے میں مہاراجہ پٹیالہ کا پچاس ہزار کے قریب روپیہ صرف ہوا۔ کوکین والا ٹائم ٹیبل رکھنے کے لیے دفتر "پنتھ" کے ایک کلرک کی خدمات دو سو روپیہ میں حاصل کی گئیں۔ یہ مقدمہ میرے اندر قوت ارادی اور مصائب کو برداشت کرنے کی سپرٹ کو زیادہ کرنے کا بڑا باعث ہوا اور میرا خیال ہے کہ ہر مصیبت انسان کو زیادہ مضبوط کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

Marfat.com

عورت اور سنگار

"ریاست" کا دفتر اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ سردار گوپال سنگھ ممبر پنجاب اسمبلی (جو آجکل پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن کے لیڈر ہیں اور او۔بی۔ای کا خطاب بھی حاصل کر چکے ہیں) اپنی امریکن بیوی مسز آئرس گوپال سنگھ کے ساتھ تشریف لائے۔ اور غالباً تین ماہ کے قریب بطور مہمان رہے۔ امریکن اور انگلش عورتوں کی سوسائٹی بہت پُرلطف ہوتی ہے۔ اگر ان کے ساتھ بے تکلفی کے مگر بھائی بہنوں جیسے پاکیزہ تعلقات ہوں اور ان تعلقات میں بدنیتی کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ یہ عورتیں لطیف مذاق سے بہت محظوظ ہوتی ہیں۔ ان میاں بیوی کی سوسائٹی کو میں زندگی بھر بھول نہیں سکا اور شاید یہ تین ماہ میری زندگی کا ایک بہترین حصہ تھا۔ اوپر کی منزل پر میرے پرائیویٹ دفتر کے ساتھ والے کمرہ میں یہ مقیم تھے۔ اور میرے پرائیویٹ دفتر میں ہی میری خواب گاہ تھی۔ تاکہ جب کام سے فارغ ہو جاؤں تو سو جاؤں اور جب جاگوں تو فوراً کام شروع کر دوں۔ چنانچہ جب رات کو ہم کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ میاں بیوی میرے کمرے میں آ جاتے۔ میں تھکاوٹ کے باعث پلنگ پر لیٹ جاتا اور یہ پاس کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرتے۔ اس طرح رات کا بارہ ایک بج جاتا اور بارہا ایسا ہوا۔ کہ سردار گوپال سنگھ میرٹھ وغیرہ دہلی سے باہر چلے جاتے۔ رات کو بھی واپس نہیں آتے اور مسز گوپال سنگھ حسب معمول اسی طرح رات کو بارہ ایک بجے تک میرے پاس میٹھی باتیں کرتی رہتیں اور ایسا محسوس ہوتا۔ کہ ایک بہن تنہائی میں اپنے بھائی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ مسز گوپال سنگھ خوبصورت تھیں بیس بائیس سال کی عمر امریکن سرخ و سپید رنگ اور پھر جوان لڑکیوں کا بناؤ سنگار۔ دن میں کئی کئی بار ساڑھی بدلتیں اور اپنی خوبصورتی کو شیشہ میں دیکھتیں۔ ایک روز ہم شام کو موٹر میں سیر کو جانے والے تھے۔ مسز گوپال سنگھ نے بناؤ سنگار کر کے بہت خوبصورت ساڑھی پہنی اور بار بار قدِ آدم آئینہ کے سامنے کبھی سیدھی کھڑی ہو کر، کبھی ایک طرف کا حصہ اور کبھی دوسری طرف کا دیکھتیں۔ میں نے مذاق سے کہا۔ کہ آپ کا حسن قدرتی طور پر ہی دہلی کے لوگوں کے لیے کافی خطرہ کا باعث ہے۔ اس قدر بناؤ سنگار اور خوبصورت ساڑھی کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر آپ کے میاں دن بھر آپ کے پاس رہتے ہیں جن کو سنگار دکھانے کی ضرورت ہے۔ اب باہر جاتے وقت کیوں یہ حسن کا زرہ بکتر پہن لیا۔ کیا شہر کے لیے قتل عام کا حکم جاری ہوگا۔ سردار گوپال سنگھ اور ان کی بیوی دونوں مسکرا دیئے مسکرانے کے بعد مسز گوپال سنگھ نے بناؤ سنگار کے فلسفہ پر بحث شروع کر دی اور جو کچھ کہا میں اس کو اس کے بعد کبھی بھول نہیں سکا۔ آپ نے فرمایا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بناؤ سنگار کا باعث کیریکٹر کی کمزوری ہے یا اس کی تہہ میں بُرے خیالات ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ عورت بناؤ سنگار کسی کو خوش کرنے کے لیے نہیں کرتی بلکہ انسانی فطرت ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو خوبصورت دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور یہ خوشی صرف عورتوں تک محدود نہیں مرد، بچے اور جانور بھی اس سے مسرت اور حظ حاصل کرتے ہیں۔ مرد آئینہ کے سامنے کالر ٹائی لگاتا ہے بالوں کو سنوار کر ٹوپی پہنتا ہے۔ یا بنا بنا کر پگڑی باندھتا ہے تو کیا وہ اپنی ٹائی، کالر یا پگڑی دوسری عورتوں کو دکھانے یا ان کو محبت کی دعوت دینے کے لیے پہنتا ہے۔ آپ ایک بچہ کو لیجئے۔ اس کو نہلا دھلا کر اچھے خوبصورت

Marfat.com

کپڑے پہنایئے اور پھر دیکھئے وہ کس قدر خوش ہوتا ہے۔ اس قدر خوش کہ دوسرے میلے کچیلے بچوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ عورت اگر بناؤ سنگار کرتی ہے تو وہ صرف اپنی ذات کو خوش کرنے کے لیے۔ کیونکہ عورت ہونے کے باعث فطرتاً اس کو خوبصورتی کی زیادہ ضرورت ہے اور جب وہ آئینہ کے سامنے یا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو بہت حسین محسوس کرتی ہے تو وہ انتہائی مسرور ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ برے خیالات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسز گوپال سنگھ کے اس جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس سے پہلے میں ہر اس عورت کو بدچلن سمجھتا تھا جو بناؤ سنگار کرنے کے بعد بازار میں اپنے حسن کی لہریں پھینکتی ہوئی گزرتی ہے مگر اب محسوس کرتا ہوں کہ میرا خیال غلط تھا۔ اس نمائش حسن کا بدچلنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ عورت مرد کے مقابلہ پر فطرتاً زیادہ داد پسند ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر، اس کی سہیلیاں، اس کے رشتہ دار اور دوسرے لوگ اگر زبان سے نہیں تو اپنے دل میں ضرور اس کے حسن اور خوبصورتی کی داد دیں۔ اور اس کے حسن کی کشش کو محسوس کریں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ایسے سینکڑوں واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں کہ کوئی حسین عورت بناؤ سنگار کے بعد لوگوں سے دادِ حسن لیتے ہوئے مسکرا دی۔ بعض بے وقوفوں نے اس نمائش حسن کو دعوتِ محبت سمجھ لیا۔ اور اس خاتون کے دل کو ٹٹولنے کے لیے اس نے مذاق کیا۔ تو اس خاتون نے اس "عاشق" کی جوتوں سے مرمت کر دی۔

میں اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ عورت کی فطرت سے ناواقف ہوتے ہوئے اس کے بناؤ سنگار اور اس کی نمائش حسن کو بدچلنی سمجھتے ہیں، غلطی پر ہیں اور جو عورت یہ کہتی ہے کہ وہ بناؤ سنگار صرف اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لیے کرتی ہے۔ اور اس کی اپنی ذات یا لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کرنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ مکاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے شوہر کو بے وقوف بناتی ہے کیونکہ عورت فطرتاً یہ چاہتی ہے کہ دنیا اس کو حسین سمجھے۔ اس کی فطرت کے ساتھ بدچلنی یا بدمعاشی کا کوئی تعلق نہیں اور عورت کے بناؤ سنگار کو بدچلنی سمجھنا عورت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

بددل مُلازم دُشمن سے بدتر

مرحوم راجہ دیواس سینئر فطرت کے لحاظ سے صحیح معنی میں مرہٹہ تھے۔ دشمن کے سامنے نہ جھکنا اور خودداری پر جان دینے کو تیار رہنا آپ کا کیریکٹر تھا۔ اس کیریکٹر کے باعث آپ زندگی بھر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے معتوب رہے اور گورنمنٹ ہمیشہ اس کوشش میں رہی کہ آپ کو معزول کیا جائے چنانچہ آپ جب پولیٹیکل مصائب میں گھرے ہوئے تھے تو آپ کا ایک پرائیویٹ ملازم ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پیغام لایا اور کہا کہ مہاراجہ ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس شخص کے ساتھ دیواس گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ گیسٹ ہاؤس بہت اچھی جگہ پر ہے۔ سامنے چھوٹے چھوٹے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ سنٹرل انڈیا کی برسات

Marfat.com

ایسا دل کش منظر سوائے منصوری، شملہ وغیرہ پہاڑوں کے شمالی ہندوستان میں کم نصیب ہوتا ہے۔ اس گیسٹ ہاؤس میں تین روز رہا۔ مہاراجہ سے دن میں کئی کئی بار ملتا اور مشورہ ہوتا۔ کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی مخالفت کا کیا علاج ہو۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں میرے پلنگ کے پاس میرا کوٹ لٹک رہا تھا اور میں برسات کے خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر صحن میں ٹہل رہا تھا۔ ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتا رہا۔ اتنے میں مہاراجہ کا موٹر مجھے لینے کے لیے آیا۔ میں کوٹ پہننے کے لیے کمرے کے اندر گیا۔ کوٹ پہنا اور پاکٹ بک کو کوٹ میں سے نکال کر اس میں اپنے وزیٹنگ کارڈ درست کرنے لگا۔ تو دیکھا کہ دس روپے کا نوٹ غائب ہے۔ جو وقت بے وقت کے لیے اس پاکٹ بک میں ہمیشہ پڑا رہتا تھا جب اس نوٹ کو غائب دیکھا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ مجھ میں کمزوری ہے کہ جب میرے گھر یا دفتر میں چوری ہو یا کوئی جھوٹ بولے تو میں صبر نہیں کر سکتا۔ چوری کرنے اور جھوٹ بولنے والے چپڑاسی یا ملازم کو پیٹنا شروع کر دیتا ہوں اور پیٹنے کے بعد اکثر نکال دیتا ہوں۔ اس دس روپے کے نوٹ کو غائب دیکھ کر بھی میں خاموش نہ رہ سکا۔ گیسٹ ہاؤس کے انچارج کو بلایا اور کہا کہ ابھی دو تین گھنٹہ کے اندر جیب میں سے دس روپیہ کا نوٹ غائب ہو گیا ہے۔ میری اس شکایت کو سن کر گیسٹ ہاؤس کے انچارج نے جواب دیا۔

"سرکار کیا عرض کروں۔ اس سے پہلے بھی کئی مہمانوں کی جیب سے روپیہ نکل چکا ہے ان ملازموں کو چھ چھ ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتیں۔ یہ لوگ کھائیں آخر کہاں سے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ بددیانتی نہ کریں مگر باز نہیں آتے۔ کھانے پینے کے سامان میں سے بھی چوری کرتے ہیں اور جو مہمان آتے ہیں ان کی جیب میں سے بھی روپیہ نکال لیتے ہیں۔ ان کو خیال نہیں آتا۔ کہ اس طرح ریاست کی اور مہاراجہ کی بدنامی ہوتی ہے۔"

دس روپیہ بہت معمولی رقم تھی۔ میں نے اس کا تو کوئی خیال نہیں کیا۔ نہ ریاست کے کسی افسر سے ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ مگر اس سپرنٹنڈنٹ گیسٹ ہاؤس کے یہ الفاظ اس کے بعد ہمیشہ ہی میرے کانوں میں گونجتے رہے:

"چھ چھ ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتیں۔"

"یہ لوگ کھائیں آخر کہاں سے۔"

ان الفاظ کا اثر یہ ہوا۔ کہ میں نے اس کے بعد ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ملازم بددل نہ ہوں۔ ان کو پیٹ بھرنے کے لیے کافی اور وقت پر تنخواہ دی جائے۔ مگر کبھی مجبوری کے باعث دیر ہوتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دفتر "ریاست" کے ملازم یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی پھر اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ دفتر "ریاست" کی ملازمت کریں۔ اور اب "ریاست" کے اس نئے دور میں تو فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور اب تک اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔ کہ ملازموں کو وقت پر اور کافی تنخواہ دی جائے۔ تاکہ ملازم کو خود

Marfat.com

ملازمت کی خواہش ہو نہ کہ ملازم سے ملازمت نہ چھوڑنے کی درخواست کی جائے۔

میری رائے یہ ہے کہ معمولی تنخواہ پر نکمّے دس ملازموں کی جگہ اچھے محنتی اور کام کرنے والے پانچ ملازم زیادہ تنخواہ پر رکھنا اچھا ہے اور کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ ملازم خوش اور مطمئن رہیں اور ان کو وقت پر تنخواہ ملتی رہے۔ غیر مطمئن اور بددل ملازم کو کسی صورت میں نہ رکھا جائے کیونکہ وہ دشمنوں کی طرح نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

"ریاست"۔ سر جان تھامپسن اور والیانِ ریاست

جب "ریاست" میں والیانِ ریاست کو سختی کے ساتھ بے نقاب کیا جا رہا تھا اور سر جان تھامپسن گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل سیکرٹری تھے تو سر جان نے تمام ریاستوں کو ایک سرکلر بھیجا جس میں لکھا۔ کہ "ریاست" کے نمائندے اور نامہ نگار ریاستوں میں پھر کر حالات معلوم کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور خطرہ ہے کہ یہ لوگ کوئی ایسی کانفیڈینشل خط و کتابت حاصل نہ کر لیں جو والئ ریاست اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے درمیان ہو۔ بہت احتیاط کی جائے۔

اس سرکلر کی اطلاع مجھے ایک ریاست کے وزیر اعظم نے دی جو کہ دوست تھا۔ اس اطلاع کے بعد میرے ذہن پر یہ اثر رہا کہ سر جان تھامپسن بھی "ریاست" کے خلاف ہیں۔

سر جان تھامپسن کے پولیٹیکل سیکرٹری کے عہدہ سے علیحدہ ہونے کی داستان بھی بیحد دلچسپ ہے۔ آپ نہایت شریف، غیر معمولی دیانت دار، بہت لائق۔ انصاف پسند۔ قوتِ ارادی کے مضبوط اور ایک مدبّر سویلین تھے۔ جب آپ مارشل لا کے بعد چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کے عہدہ سے تبدیل کر کے پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند مقرر کیے گئے اور آپ نے ریاستوں کے حالات دیکھے تو آپ کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کو حیرت ہوئی۔ کہ اس زمانہ میں بھی ریاستوں کے اندر ایسے ناقابلِ برداشت مظالم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس حیرت کا نتیجہ تھا کہ آپ دل سے والیانِ ریاست کے خلاف ہو گئے۔ یہ جذبات ہی مہاراجہ نابھہ اور مہاراجہ اندور وغیرہ کو گدیوں سے علیحدہ کرنے اور نظام دکن کو تاریخی خط لکھنے کا باعث ہوئے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر آپ پانچ سال اور پولیٹیکل سیکرٹری رہتے تو مرحوم مہاراجہ پٹیالہ۔ مہاراجہ الور اور جام صاحب نوانگر نے بیس بیس لاکھ روپیہ چندہ دیا۔

سر جان تھامپسن چیف کمشنر مقرر ہو کر جب دہلی آئے تو ایڈیٹر "ریاست" کے ذہن پر اس سرکولر کا جو آپ نے "ریاست" کے متعلق والیانِ ریاست کو بھیجا تھا، کے باعث یہ اثر تھا کہ سر جان "ریاست" کے خلاف ہیں۔ یہ بہت مضبوط قوتِ ارادی کے انسان ہیں۔ اگر دشمن ہوئے تو نقصان پہنچائیں گے۔ چنانچہ دو تین ہفتہ ایڈیٹر "ریاست" سوچتا رہا۔ کہ سر جان کے "ریاست" کے متعلق خیالات کا کیونکر پتہ کیا جائے۔ آخر ایک شرارت سوجھی۔ ایک دوست مسٹر پلے ایڈیٹر "پرنسلی انڈیا" (یہ اخبار بھی ریاستوں کے متعلق تھا۔ آجکل کھنڈوہ

(سی پی) سے نکلتا ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے نکلتا تھا) کو بلایا۔ اور اس کو سمجھا کر بھیجا، کہ وہ سر جان تھامپسن سے ملنے کے لیے جائے اور باتوں باتوں میں ایڈیٹر "ریاست" کا ذکر اس طریقہ سے کرے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے ایکسٹراڈیشن وارنٹوں کی مخالفت کر کے سر جان تھامپسن نے اخبار "ریاست" کی بہت امداد کی۔ تاکہ آپ کے ذہن میں "ریاست" کے متعلق جو جذبات ہوں۔ وہ ان کو اپنی زبان سے اگل دیں۔ مسٹر گوپال پلے نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ وہ سر جان سے ملے تو انہوں نے اس طریقہ سے ہی "ریاست" کا ذکر کیا سر جان نے "ریاست" کے متعلق سنتے ہی مسٹر پلے سے پوچھا۔ کہ دیوان سنگھ آجکل کہاں ہے۔ مسٹر پلے نے جواب دیا۔ کہ یہیں دہلی میں ہے۔ سر جان نے کہا کہ "ریاست" بہت اچھا اخبار ہے۔ آپ اس کو پسند کرتے ہیں اور دیوان سنگھ اگر ملے تو اس سے کہا جائے۔ کہ وہ کسی روز آپ سے ملنے کے لیے آئے۔

مسٹر پلے سر جان سے ملنے کے بعد سیدھے دفتر "ریاست" میں آئے۔ انہوں نے حالات بتائے تو معلوم ہوا۔ کہ سر جان نہ صرف "ریاست" کے خلاف نہیں بلکہ اس کے مداح ہیں۔ اور آپ ایڈیٹر "ریاست" سے ملنا چاہتے ہیں۔

اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد ایڈیٹر "ریاست" سر جان سے ملنے کے لیے چیف کمشنر کی کوٹھی پر گیا اس سے پہلے چیف کمشنر کی کوٹھی پر جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہاں کوٹھی کے احاطہ میں ہی لکڑی کا ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کے اندر دس پندرہ کرسیاں تھیں۔ ان کرسیوں پر رائے بہادر، خان بہادر، خطاب یافتہ، آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر وغیرہ بیٹھے تھے۔ میری ان میں سے کسی سے بھی واقفیت نہ تھی۔ کیونکہ میں بغیر کام کبھی کسی سے ملتا نہیں اور نہ پارٹیوں میں جاتا ہوں۔ دفتر، گھر اور موٹر کی سیر کے علاوہ کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ اور دوستوں کا حلقہ بھی کوشش کر کے زندگی بھر بہت محدود رکھا۔ میں ایک کونہ میں ایک ہریجن کے طور سے کرسی پر بیٹھ گیا اور چپڑاسی میرا وزیٹنگ کارڈ مجھ سے لے گیا۔ دوسرے لوگوں کے وزیٹنگ کارڈ پہلے جا چکے تھے۔ اور ایک صاحب چیف کمشنر کے پاس کمرہ کے اندر ملاقات کر رہے تھے۔ مجھے وزیٹنگ کارڈ بھیجے دو منٹ ہوتے تھے۔ کہ چیف کمشنر کے ملاقاتی کی ملاقات ختم ہوئی اور چپڑاسی نے آکر کہا۔ کہ چلیے صاحب بلاتے ہیں۔ میں جانے کے لیے کھڑا ہوا تو خطاب یافتہ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر تعجب کے ساتھ مجھے دیکھنے لگ گئے۔ کہ یہ شخص سب سے پیچھے ابھی آیا اور سب سے پہلے بلا لیا گیا۔ یہ معاملہ کیا ہے ان لوگوں کے چہرہ کو دیکھ کر میں بھی کچھ خفیف سی ندامت محسوس کر رہا تھا۔ کہ یہ لوگ اپنے دل میں خیال کرتے ہونگے کہ شاید میں بھی اندرونی طور سے سرکاری یا نیم سرکاری آدمی ہوں۔ بہر حال میں چیف کمشنر سے ملنے کے لیے گیا سر جان کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ ملایا۔ رسمی گفتگو کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے فرمایا۔ کہ جب آپ پولیٹیکل سیکرٹری تھے۔ "ریاست" کو باقاعدہ پڑھتے تھے۔ اور آپ "ریاست" اور "ریاست" کی پالیسی کو بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ سر جان پانچ سال تک پولیٹیکل سیکرٹری رہے۔ آپ کو ریاستوں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ مختلف ریاستوں اور والیانِ ریاست کے متعلق پوچھتے رہے کہ فلاں کا کیا حال ہے اور فلاں ریاست میں کیا کیا ظلم ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ملاقات مختصر سی تھی۔ شاید نصف گھنٹہ کے قریب باتیں کرنے کے بعد

Marfat.com

یہ کہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ کہ آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ اس پر سر جان نے کہا کہ انہیں مل کر بہت خوشی ہوئی اور آئندہ بھی میں مہینہ میں ایک دو بار ضرور ملا کروں۔

میں چیف کمشنر سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ مجھے افسروں کی دوستی کی ضرورت نہ تھی۔ میں یہ چاہتا تھا۔ کہ یہ لوگ بلاوجہ دشمن ہو کر نقصان بھی نہ پہنچائیں اور اس غرض کے لیے ایک دفعہ ملنا کافی سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس ملاقات کے بعد مجھے یقین ہو گیا۔ کہ سر جان میرے خلاف نہیں بلکہ میرے معترف ہیں۔ میں نے سر جان سے ملنے کی پھر ضرورت محسوس نہ کی۔ اور ڈیڑھ ماہ کے قریب عرصہ ہو گیا تو ایک روز شام کو سر جان نے چپڑاسیوں سے کہا۔ کہ دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کو اطلاع کر دی جائے کہ وہ صبح ساڑھے نو بجے آپ سے مل جائے۔ اگلے روز چپڑاسی نے نو بجے کے قریب ٹیلیفون کیا۔ کہ چیف کمشنر ملاقات کے لیے بلاتے ہیں۔ اس زمانہ میں لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر "وطن" اور ایڈیٹر ریاست کے درمیان ٹیلیفون پر بہت مذاق ہوا کرتا تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کو آواز بدل کر یا دوسرے شخص سے ٹیلیفون کرا کر بے وقوف بنایا کرتے مثلاً دوسرے آدمی کی طرف سے ٹیلیفون پر یہ کہنا۔ کہ فلاں ریاست کے وزیر اعظم آئے ہوئے ہیں۔ میڈن ہوٹل میں ٹھہرے ہیں اور ملنے کے لیے بلاتے ہیں۔ جب وہاں جاتے تو پتہ چلتا۔ کہ وہ صاحب وہاں آئے ہی نہیں۔ بعد میں ٹیلیفون پر بتاتے کہ بے وقوف بنایا تھا۔ اس چپڑاسی کا خلافِ توقع یہ کہنا۔ کہ چیف کمشنر ملنے کے لیے بلاتے ہیں۔ میں نے سمجھا۔ کہ یہ شرارت لالہ شیو نرائن بھٹناگر کی ہے۔ تاکہ میں کام چھوڑ کر چیف کمشنر کی کوٹھی جاؤں اور شرمندہ ہو کر واپس آؤں۔ میں نے چپڑاسی کو جواب دیا۔ کہ میں نہیں آتا۔ چپڑاسی حیران کہ لوگ تو خطوط لکھ لکھ کر ملاقاتوں کے لیے درخواستیں کرتے ہیں۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں چیف کمشنر سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس نے پھر کہا۔ کہ تھامپسن صاحب چیف کمشنر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ساڑھے نو بجے چیف کمشنر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ جایئے۔ میں نے پھر جواب دیا۔ کہ میں نہیں آتا۔ اس نے پھر کہا۔ کہ وہ چیف کمشنر کو کیا جواب دے۔ میں نے غصہ میں کہا کہ دو میں چیف کمشنر کے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں نہیں آتا۔ یہ کہ کر میں نے غصہ سے ٹیلیفون بند کر دیا۔ کیونکہ کام کر رہا تھا۔ اور ٹیلیفون کام میں مخل ہوا۔ ادھر تو چپڑاسی نے سر جان سے یہی الفاظ کہے کہ دیوان سنگھ کہتا ہے میں چیف کمشنر کے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ وہ کہ نہیں آتا۔ ادھر اس ٹیلیفون کے پانچ منٹ بعد چیف کمشنر کے دفتر کا دوسرا چپڑاسی آیا (اس کے خود آنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ یہ بطور انعام یا دستور ایک دو روپیہ وصول کرنا چاہتا تھا) اس نے بتایا۔ کہ کل شام کو چیف کمشنر صاحب نے چپڑاسیوں سے کہا تھا۔ کہ دفتر "ریاست" میں اطلاع کر دی جائے۔ کہ ایڈیٹر صاحب ساڑھے نو بجے مل جائیں۔ اس چپڑاسی کے کہنے سے علم ہوا۔ کہ لالہ شیو نرائن نے یہ مذاق نہ کیا تھا۔ بلکہ فی الحقیقت سر جان تھامپسن نے بلایا ہے۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور کار میں چیف کمشنر کی کوٹھی پر پہنچا۔ وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ سر جان نے بلایا۔ اندر گیا تو سر جان کی پیشانی پر ناراضی کے شکن تھے۔ مگر اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ ملایا۔ تو میں نے فوراً کہا۔ کہ میں سب سے پہلے اس ندامت کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آپ کے چپڑاسی کو سخت اور غیر مناسب الفاظ میں جواب دیا۔ جس کی وجہ غلط فہمی تھی۔ لالہ شیو نرائن

Marfat.com

بھٹناگر آواز بدل کر کئی بار دھوکہ دے چکے ہیں اور میں بھی ان کو بے وقوف بنا چکا ہوں۔ میں نے سمجھا کہ یہ ٹیلیفون بھی لالہ شیو نرائن نے مذاق کے طور پر کیا۔ کیونکہ آپ کے ٹیلیفون کی کوئی توقع نہ تھی۔ اب جڑاسی سے معلوم ہوا۔ کہ آپ نے فی الحقیقت بلایا ہے تو میں آیا مجھے اس واقعہ کا بہت افسوس ہے۔ سرجان تھامپسن یہ سن کر قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور آپ نے کہا۔ کہ آپ حیران تھے کہ جس صورت میں ایڈیٹر "ریاست" کو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ ایسا سخت اور خلافِ اخلاق جواب کیوں دیا اور چونکہ آپ کا ملنے کو جی چاہتا تھا اس لیے آپ نے آنے کے لیے پیغام بھیجا۔

سرجان تھامپسن سے ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں۔ باتیں یہی فلاں ریاست کا کیا حال ہے فلاں مہاراجہ نے جو قتل کیا۔ اس میں کون کون شامل تھا۔ "ریاست" کے فلاں مضمون میں بہت جرأت دکھائی گئی۔ ریاستیں ختم ہو جائیں تو اچھا ہے۔ سرجان مجھ سے ریاستوں کے متعلق سوال کرتے اور والیانِ ریاست کے مظالم مزہ لے لے کر پوچھتے۔ کیونکہ وہ فطرتاً نوابوں اور مہاراجوں کے دشمن تھے اور "ریاست" میں ان مظالم کو بے نقاب کیا جاتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ کہ یہ خود بھی واقعات کا اظہار کریں اور کھلیں۔ مگر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے نہ کھلتے تھے۔ کیونکہ میں جرنلسٹ تھا۔ ان کو خیال تھا۔ کہ زبان سے بات نکلی اور اخبار میں چھپی۔ باتیں کر کے میں چلا آیا۔ آتے ہوئے آپ نے پھر تاکید کی کہ میں دس پندرہ روز کے بعد ان سے مل جایا کروں۔ آپ نے یہ بھی کہا۔ کہ اخبار ان کو باقاعدہ بھیجا جائے۔ ہر ہفتہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ اردو فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے اور ان زبانوں کے آپ نے امتحانات بھی پاس کئے تھے۔

اس کے بعد میں سرجان تھامپسن سے کبھی کبھی ملتا۔ ایک بار والیانِ ریاست اور میرے مقدمات کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ تو میں نے کہا۔ کہ آپ کو بھی تو والیانِ ریاست نے ہی پولیٹیکل سیکرٹری شپ سے علیحدہ کرایا۔ آپ نے تعجب کے ساتھ پوچھا وہ کیوں کر۔ میں نے کہا۔ کہ پٹیالہ، الور اور نواں نگر نے ساٹھ لاکھ روپیہ جمع کیا۔ اتنا روپیہ فلاں شخص کو دیا گیا اور اتنا روپیہ فلاں آدمی درمیان میں کھا گیا۔ سرجان نے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ والیانِ ریاست میں چھوٹے سے لے کر نظام تک آپ کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی مطلق العنانی کو آپ نے نقصان پہنچایا اور کئی نوابوں اور مہاراجوں کے اختیارات کم کیے۔ مگر ان لوگوں کے اندر اتنی قوت کہاں۔ کہ یہ پولیٹیکل سیکرٹری کو تبدیل کرا سکیں۔ میں نے کہا۔ کہ انڈیا آفس میں آپ کا کوئی گہرا دوست ہے آپ نے کہا۔ ہاں فلاں شخص (میرا خیال ہے انہوں نے کرنل ہالینڈ سابق ریذیڈنٹ راجپوتانہ کا نام لیا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں رہا۔) جو وزیر ہند کا پولیٹیکل ایڈوائزر ہے۔ گہرا دوست ہے۔ میں نے کہا۔ ان سے یہ تمام حالات لکھ پوچھیئے۔ کہ یہ واقعات غلط تو نہیں۔ آپ نے کہا۔ بہت اچھا۔ چنانچہ آپ نے ہوائی ڈاک کے ذریعہ اپنے اس دوست کو کانفیڈنیشل خط لکھا۔ جس کا دو ہفتہ میں جواب آیا۔ کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ لفظ بہ لفظ سچ ہے۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد سرجان نے پھر ٹیلیفون کر کے مجھے بلایا اور کہا۔ کہ جب لندن سے جواب آ گیا ہے وہ واقعات بالکل سچ تھے۔ اس جواب کے بعد تو سرجان "ریاست" کی اطلاعات پر بہت اعتماد کرتے تھے اور والیانِ ریاست کے اور زیادہ دشمن ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے ایک روز باتوں

Marfat.com

باتوں میں کہا:

"سردار صاحب! اب شاید زندگی میں موقع نہ مل سکے مگر میری خواہش ہے کہ اگر ایک بار پھر مجھے والیانِ ریاست پر اختیارات حاصل ہوں تو میں ان میں سے نصف کو پانچ سال کے اندر ختم کر دوں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ پبلک ان کے رحم پر چھوڑی جائے۔"

سر جان تھامپسن نے پٹیالہ اور بھوپال وغیرہ کے مقدمات میں میری بہت امداد کی۔ یہ والیانِ ریاست جب بھی مجھ پر کبھی وار کرنے تو اس وار کو ناکام بنانے میں آپ میرے لیے کھڑے ہو جاتے۔ کیونکہ میں ان کے صوبہ میں تھا۔ اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی والیٔ ریاست مجھے نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔

سر جان بہت لائق، منصف مزاج اور مدبّر تھے۔ میرا تو خیال ہے کہ شاید آج تک کوئی پولیٹیکل سیکرٹری آپ کے پایہ کا نہ تھا۔ مارشل لاء کے زمانہ میں آپ پنجاب کے چیف سیکرٹری تھے اور پبلک میں مارشل لاء کی خلافِ آئین اور سخت کارروائیوں کی ذمہ داری آپ کی گردن پر بھی بیان کی جاتی ہے مگر جو لوگ اصل حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سر مائیکل اوڈوائر جیسا خود سر شخص کسی سیکرٹری کے ہاتھوں میں کبھی بھی نہ رہا، بلکہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے سیکرٹریوں کو ہمیشہ ہی ایک کلرک سمجھا اور جو کرتا خود اپنی مرضی سے اور سر جان قطعی بے قصور اور سر مائیکل اوڈوائر کے حکم کی تعمیل کرنے والے تھے۔

سر جان تھامپسن انتقال کر چکے ہیں اور وہ اس وقت اس دنیا میں موجود نہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کی خط و کتابت کا سلسلہ ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ جاری رہا۔ اور جب کبھی دہلی کا کوئی شخص لندن جاتا اور آپ سے ملتا تو آپ ایڈیٹر "ریاست" اور "ریاست" کے متعلق ضرور پوچھتے۔

یہ مضمون بہت طویل ہو گیا۔ عنقریب سر جان تھامپسن کے متعلق وہ واقعات لکھوں گا جن کو میں زندگی میں بھول نہیں سکتا۔ اور جو "ریاست" کو موت کے منہ سے بچانے کا باعث ہوئے اور اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ میں اگر جان تھامپسن دہلی کے چیف کمشنر نہ ہوتے یا آپ والیانِ ریاست کی مطلق العنانی کو نفرت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے تو "ریاست" کو شاید ایسی مصائب کا مقابلہ کرنا پڑتا جو اس کے لیے قابلِ برداشت نہ ہوتیں۔

جرنلزم کی چاٹ اور عشق!

میں نے "ریاست" میں "ناقابلِ فراموش" کے تحت جو اپنے حالات شائع کیے۔ وہ پبلک میں نہ صرف دلچسپی سے پڑھے گئے۔ بلکہ ان کا اثر بھی ہوا۔ چنانچہ دو درجن کے قریب نوجوانوں نے خطوط لکھے کہ وہ دہلی آ کر اسی طرح ہی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرتے ہوئے جرنلزم سیکھنا چاہتے ہیں جس طرح ایڈیٹر "ریاست" سید جالب کے پاس "ہمدم" میں کام کرنے کے لیے لکھنؤ گیا۔ چنانچہ ایک سکھ لڑکا تو مردان سرحد سے بغیر خط و کتابت آ بھی پہنچا۔ ان تمام نوجوانوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو جرنلزم کے لیے فٹ ہوتا کیونکہ

Marfat.com

اس پیشہ کے لیے اخبارات، رسائل ولٹریچر کی چاٹ یا عشق کا ہونا ضروری ہے اور ان لوگوں میں شوق تھا تو صرف یہ کہ وہ بلندی پر پہنچیں اور آئندہ ایڈیٹر بن سکیں سب مجھے افسوس ہے کہ ان نوجوانوں میں سے میں کسی کے لیے بھی مفید نہیں ہو سکا۔ اور آج وہ واقعات بتاتا ہوں۔ جن کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ کسی کام میں کامیاب ہونے کے لیے اس کام کا عشق ہونا کتنا ضروری ہے۔

میری تعلیم کچھ نہ تھی۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد خالصہ ہائی اسکول گوجرانوالہ میں چھٹی جماعت میں داخل ہوا۔ سکول میں تین روز گیا تو ماسٹر نے فیس کا مطالبہ کیا۔ دو روز تو یہ کہہ کر جاتا رہا۔ کہ فیس لا دوں گا۔ اس کے بعد سکول نہیں گیا۔ کیونکہ حالات اس قابل ہی نہ تھے کہ فیس دے سکتا۔ آخر مجبوراً سکول چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد سکول میں پڑھنے کا زندگی میں اتفاق نہیں ہوا یعنی میری تعلیم صرف پانچویں جماعت تک ہی رہی۔ اور اب اگر باتوں باتوں میں کوئی صاحب تعلیم کے متعلق پوچھتے ہیں اور میں ان کو بتاتا ہوں۔ کہ پانچویں جماعت پاس کی ہے اور چھٹی جماعت میں چار پانچ روز پڑھا ہوں تو وہ اس پر یقین نہیں کرتے۔ ایک مذاق سمجھتے ہیں اور بار بار یقین دلانے پر بھی میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

تعلیم کی کیفیت تو یہ تھی مگر مطالعہ کے شوق کی حالت یہ کہ فیروزپور کے سول ہسپتال میں کمپونڈر تھا۔ چھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ مگر رسالہ "زمانہ" کانپور کا خریدار تھا۔ اور رسالہ "مخزن" دہلی دوسرے لوگوں سے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کا مجھے واقعہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی ادبی رسالہ دیکھا ہو۔ یعنی میری ادبی چاٹ کا سلسلہ سولہ سترہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں ابوہر کے ہسپتال میں رہا۔ وہاں بھی ادبی رسائل پڑھا کرتا۔ اور پڑھنے کی کیفیت یہ ہوتی۔ کہ ایک ایک مضمون ایک ایک سطر اور ایک ایک شعر کو بار بار پڑھتا۔ چنانچہ اپنی بے وقوفی کا ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ ابوہر میں ہی ایک روز خیال آیا۔ کہ اگر میں اردو لٹریچر میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں تو ان رسائل کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف ایک کتاب یعنی اردو کی کوئی لغات کیوں نہ یاد کر لوں۔ تاکہ کوئی لفظ بھی ایسا باقی نہ رہے جس سے میں واقف نہ ہوں۔ اس خبط کو پورا کرنے کے لیے میں نے چھ آنے میں کریم اللغات کی ایک جلد خریدی اور الف کی تختی سے الفاظ شروع کیے۔ ان الفاظ کو یاد کرتا تھا یاد نہ ہوتے تھے۔ یاد ہوتے اور آگے چلتا تو پیچھے کے یاد کیے ہوئے بھول جاتے۔ آخر کئی روز کی اس کش مکش کے بعد اپنی بیوقوفی کو محسوس کیا اور "ڈاکٹر آف لغات" کی ڈگری کے خیال کو ترک کر دیا۔ کیونکہ یہ طریقہ غلط، ناقابل عمل اور قطعی لاحاصل تھا۔

ابوہر کے بعد میں پھر فیروزپور کے ہسپتال میں آ گیا وہاں چھ ماہ کے قریب رہا تھا۔ کہ موگا کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔ مگر رسائل اور کتابوں کا پڑھنا جاری رہا۔ موگا میں مجھے پہلے نو روپیہ اور بعد میں بارہ روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس زمانہ میں میرے پاس "ادیب" الہ آباد (جس کو نوبت رائے صاحب نظر ایڈیٹ کرتے تھے) اور "زمانہ" کانپور (جس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تھے) آیا کرتے۔ ان کے علاوہ روزانہ "اخبارِ عام" کا بھی خریدار تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں تمام ہندوستان کے اندر صرف وہی روزانہ اردو اخبار تھا۔ اس کا چندہ بارہ روپیہ سالانہ تھا۔ میری مالی پوزیشن ان دو رسائل اور ایک روزانہ اخبار سے زیادہ کے خریدنے کی اجازت

Marfat.com

نہ دیتی تھی۔ دوسرے اخبارات۔ رسائل اور کتابیں لوگوں سے لے کر پڑھتا اور شاید ہی اردو کی کوئی کتاب یا اخبار ایسا نہ تھا جسے میں نے اس زمانہ میں پڑھا نہ ہو۔

اس زمانہ میں خیالات محدود، ذریعۂ معاش محدود، پوزیشن محدود، معلومات محدود اور دوستوں کے تعلقات کا حلقہ محدود۔ چنانچہ خیالات کے محدود ہونے کی تو حالت یہ تھی۔ کہ جب اخبار "عام" آتا اور اس پر پتہ کی چھپی ہوئی چٹ اپنے نام کی دیکھتا تو ایک مسرت سی محسوس ہوتی۔ کہ میرا نام بھی چھپا ہوا ہے۔

موگا میں ایک علم دوست شخص پنڈت وشنودت وکیل تھے۔ اچھے مضمون لکھنے والے۔ اردو لٹریچر میں دلچسپی۔ آریہ سماج کے لیڈر اور آریہ سماجی رسالہ "آریہ مسافر" کے ایڈیٹر۔ یہ "آریہ مسافر" شائع تو شاید آگرہ یا لاہور سے ہوتا تھا مگر پنڈت جی اس کو موگا میں ہی ایڈیٹ کرتے اور وہاں سے ہی مضمون بھیجتے۔ پنڈت وشنودت میرے لٹریری شوق کو دیکھ کر مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے۔ اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے اور میں کتابیں اور رسائل ان سے بھی کافی تعداد میں پڑھنے کے لیے لیتا۔

اخبار "عام" اور رسائل ہسپتال کی ڈاک میں آتے کیونکہ ایک چپڑاسی ہر روز صبح ڈاک خانہ سے ڈاک لایا کرتا تھا۔ یہ ڈاک ڈاکٹر متھرا داس کے ہاتھوں میں جاتی اور وہ جس کسی کا کوئی خط یا اخبار ہوتا۔ اس کو دیتے۔ میرے رسائل اور اخبار کو دیکھ کر وہ اپنی پیشانی پر شکن ڈالتے اور میری اس فضول خرچی کو برا سمجھتے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے کیونکہ میں نہ صرف ان کے ماتحت تھا۔ بلکہ ان کے مجھ پر احسانات بھی تھے۔ خاندانی تعلقات کے باعث میرے بزرگ تھے اور ان کو حق حاصل تھا۔ کہ میری اور میرے کیریکٹر کی نگرانی کرتے۔

جب اخبار "عام" میرے نام جاری ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا۔ کہ شاید ایک روپیہ دے کر ایک مہینہ کے لیے یہ ادبی عیاشی کی گئی ہوگی۔ انہوں نے درگزر کیا۔ مگر اخبار کو دیکھ کر ان کی پیشانی کے شکن ظاہر کرتے تھے۔ کہ یہ میری اس "فضول خرچی" کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد ان کو احساس ہوا۔ کہ میں نے ایک ماہ سے زائد عرصہ کے لیے چندہ بھیج دیا ہے تو آپ مجھ پر بہت خفا ہوئے اور کہا نو روپیہ ماہوار تنخواہ اور روزانہ اخبار کی خریداری۔ اس فضول خرچی پر شرم آنی چاہیئے۔ اس ڈانٹ کے بعد میں نے ان سے تو کہا۔ کہ بند کر دوں گا۔ مگر شام کو ڈاک خانہ پہنچا۔ وہاں چٹھی رسان اور پوسٹ ماسٹر سے ملا۔ اور ان سے کہا۔ کہ میرے نام کا کوئی خط یا اخبار ڈاکٹر صاحب کی ڈاک میں نہ بھیجا جائے اور چٹھی رساں کے ہاتھ میرے کوارٹر میں بھیجا جائے۔ جہاں میری رہائش تھی۔ چنانچہ اخبار "عام" اور رسائل میرے کوارٹر میں مجھے ملنے شروع ہوئے اور ڈاکٹر صاحب نے سمجھا۔ کہ میں اب فضول خرچ نہیں رہا۔ شریف ہو گیا ہوں۔

ایک یا ڈیڑھ ماہ تک میں اخبار "عام" ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ پڑھتا رہا۔ ایک روز پہلا چٹھی رسان بیمار ہو گیا۔ اس کی جگہ دوسرا چٹھی رسان ڈاک تقسیم کرنے کے لیے آیا۔ تو اس کم بخت نے میرا اخبار میرے کوارٹر میں دینے کی بجائے میرے ہاتھوں میں دے دیا۔ جب کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑا آؤٹ ڈور بیماروں کا رجسٹر دیکھ رہا تھا۔ اخبار کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے۔ کہ ان کو دھوکا دیا گیا تھا۔ اخبار مسلسل آرہا ہے اور یہ فضول خرچی جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب پھر ناراض ہوئے۔ میں نے پھر وعدہ کیا۔ کہ اخبار بند کر دوں گا۔

Marfat.com

چنانچہ سوچتا رہا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ ہسپتال سے دور کسی دوسرے شخص کے نام اخبار جاری کرا دیا جائے۔ اور میں وہاں سے منگا کر پڑھا کروں۔ چنانچہ اخبار، موگا کے قصبہ میں حکیم محمد عمر صاحب مرحوم (جو میرے بھائیوں کی طرح دوست، دیو سماجی خیالات کے، خدا سے منکر مگر بہت بلند کیریکٹر اور مخلص تھے) کے نام جاری کرا دیا گیا۔ اخبار ان کے نام پہنچتا۔ ہر روز چھپی ہوئی پتہ کی چِٹ دیکھنے کی مسرت اور اخبار کو خود کھولنے کے لطف سے محروم ہو گیا۔ اخبار کو پہنچتے ہی حکیم صاحب اس کو کھولتے اور پڑھتے۔ اور میں رات کو کام سے فارغ ہو کر ان کے گھر جاتا اور کھلا اور پڑھا ہوا اخبار لیتے ہوئے ایسا محسوس کرتا۔ گویا کہ گرم گرم پراٹھوں سے محروم ہو کر اب باسی روٹی کھانے پر مجبور ہوں۔ مگر کیا کرتا اس "گناہ" کو جاری رکھنے کا اور طریقہ بھی کیا تھا۔ کیونکہ اخبارات اور رسائل کے متعلق اس وقت میرے چسکے اور عشق کی وہی کیفیت تھی جو آج جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی سکاچ وسکی کے متعلق ہے۔ چنانچہ میں جب تک موگا میں رہا۔ میرے نام کے اخبارات تو حکیم محمد عمر صاحب کے نام آتے رہے اور رسائل میرے کوارٹر پر میرے نام۔ میرے موگا کے تین سال کے قیام میں پنڈت وشنو دت میری بہت ہمت افزائی کرتے رہے۔ رسائل، اخبارات اور کتابیں دیتے۔ اور انہوں نے اس بات کا اس زمانہ میں متعدد بار مجھ سے مذاقاً اظہار کیا۔ کہ میں ایڈیٹر بننا چاہتا ہوں۔ میں یہ سنتا اور شرما کر سر جھکا لیتا۔ اور منہ سے کہتا کہ نہیں صرف دل چسپی کے لیے پڑھتا ہوں۔ آہ! وہ اخلاص و محبت کے بے غرض لوگ آج اس دنیا میں موجود نہیں اور زمانہ دن بدن خود غرض ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میری اخبار بینی اور اخبار نویسی کی زندگی میں مجھے کامیاب بنانے کے لیے ایک اور بات نے بڑا پارٹ ادا کیا۔ میں پانچویں جماعت تک پڑھا۔ پنجاب کا رہنے والا سکھ، اردو زبان کے جاننے کا جن میں سوال ہی نہیں۔ زندگی بھر محنت کر کے زبان کو سیکھا۔ پنجاب کے متعدد روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کو ایڈٹ کرتا رہا اور دہلی جیسے اردو کے مرکز سے اردو زبان میں ایسا کامیاب اخبار جاری رکھا جس کی نظیر بھی اردو جرنلزم میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایمان داری کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ میں اب تک اپنے آپ کو نالائق سمجھتا ہوں۔ اور جب کبھی دوستوں میں ذکر آتا ہے تو مذاقاً یہی کہتا ہوں کہ بارہ برس دہلی میں رہے مگر بھاڑ جھونکتے رہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اگر میرے ذہن کی یہ کیفیت (یعنی اپنے آپ کو ہمیشہ ایک طالب علم سمجھنا۔ اپنی کامیابی کو کامیابی قرار نہ دینا اور کوشش میں دن رات مصروف رہنا) نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو لائق سمجھتا تو آج اخبار "ریاست" کو چلانے کی جگہ کسی ہسپتال میں بوتلیں دھونے کا کام کرتا۔ جو لوگ کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ کبھی بھی اپنے آپ کو اس فن میں لائق نہ سمجھیں ہمیشہ نالائق تصور کرتے ہوئے اور زیادہ سیکھنے کی کوشش کریں اور ایسا عشق پیدا کریں جیسا کہ لٹریچر اور اخبارات کے ساتھ ایڈیٹر "ریاست" نے زندگی بھر کیے رکھا۔

Marfat.com

دوستوں کے لیے قربانی کرو

ریاست بھوپال نے ایڈیٹر "ریاست" پر ایک مقدمہ توہین کا دہلی میں بھی کیا تھا۔ یہ مقدمہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر پول کی عدالت میں تھا۔ مسٹر پول اینگلو انڈین تھے جو ہندوستان کی آزادی کے انگریزوں سے زیادہ دشمن تھے۔ ادھر ملزم ایک اخبار نویس، جو گورنمنٹ کی نظروں میں دس نمبری بدمعاشوں سے زیادہ خطرناک اور بدچلن (میں بدچلن اس لیے لکھ رہا ہوں کہ گورنمنٹ کے احکام میں عام طور سے یہ لکھا جاتا ہے کہ فلاں پولیٹیکل ورکر کا چال چلن قابلِ اعتراض رہا) اور خان بہادر عبد الرحمٰن ایڈووکیٹ (جو آجکل سر عبد الرحمٰن جج ہائیکورٹ لاہور ہیں) نواب بھوپال کے وکیل جو مسٹر پول کے دوست تھے۔ چنانچہ اس مقدمہ میں میرے لیے عام طور سے خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا اور مختلف قسم کی افواہیں بھی مسٹر پول کے متعلق پبلک میں مشہور تھیں جن پر میں نے کبھی یقین نہ کیا۔ مگر محسوس کیا۔ کہ عدالت میں جب جاتا ہوں تو مسٹر پول کا چہرہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف ہے۔ بالکم از کم وہ ایڈیٹر "ریاست" کو باوجود اس کے مجرم ثابت نہ ہونے کے دہر مجسٹریٹ کا اخلاقاً فرض ہونا چاہیئے۔ کہ جب تک مجرم، ملزم ثابت نہ ہو اس کو بے گناہ سمجھے ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتا۔ میں سوچتا رہا۔ کہ اس مجسٹریٹ کا کیا کرنا چاہیئے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا اور مسٹر پول کا رویہ دن بدن میرے خلاف ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ان حالات سے پہلے سر جان تھامپسن چیف کمشنر دہلی دوست ہو چکے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا۔ کہ مجھے مسٹر پول سے انصاف کی امید نہیں اور شہر میں مسٹر پول کے متعلق مختلف افواہیں ہیں۔ سر جان غیر معمولی دیانت دار تھے اور ان کی زندگی میں ایک مثال بھی ایسی نہ تھی۔ کہ انہوں نے کبھی کسی ریاست یا پبلک سے ایک پیسہ لیا ہو اور آپ اس بات کے ہمیشہ خواہاں رہے کہ ان کا ہر ماتحت دیانت دار ہو۔ سر جان نے جواب دیا۔ کہ مسٹر پول دیانت دار آدمی ہیں۔ کوئی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کے جواب میں کہا مسٹر پول پر میں کوئی الزام نہیں لگا رہا اور جب تک ثبوت نہ ہو الزام لگانا گناہ ہے۔ مگر مسٹر پول ریلوے گارڈ کلاس کے آدمی ہیں۔ پہلے کلرک تھے۔ پھر ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ گورنر کے دفتر میں جا پہنچے وہاں سے مجسٹریٹ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ اب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کی قیمت ہوتی ہے اور کم انسان ہیں جو کسی قیمت پر خریدے نہ جا سکیں۔ میں ان پر تو الزام نہیں لگاتا مگر بے فکر بھی نہیں ہوں۔ سر جان نے وعدہ کیا۔ کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ میرے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ چنانچہ سر جان نے اگلے روز مسٹر پول کو بلا کر فہمائش کی کہ نواب بھوپال چاہے کتنی بڑی پوزیشن کے ہوں مگر ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔

ادھر تو سر جان تھامپسن نے مسٹر پول سے کہا۔ ادھر ایک روز مرحوم خان بہادر تصدق حسین ملے انہوں نے پوچھا۔ کہ مقدمہ کا کیا حال ہے تو میں نے بتایا۔ کہ مسٹر پول کا رویہ ایسا ہے جیسا قمار بازوں اور چوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خان بہادر بہت مخلص، بہت بلند اور دوستوں کے لیے جان قربان کر دینے

Marfat.com

والے انسان تھے۔ آپ نے مجھ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر دو دن کے بعد مجھے ٹیلی فون کیا۔ کہ میں آج رات کو کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ چنانچہ رات کو میں ان کے ہاں کھانے پر گیا۔ تو دیکھا۔ کہ وہاں ڈنر کے لیے ایک درجن کے قریب معزز مہمان موجود ہیں۔ جن میں چند ممبران اسمبلی اور مسٹر پول بھی ہیں۔ خان بہادر نے میرے پہنچتے ہی مسٹر پول سے تعارف کرایا۔ کہ آپ مسٹر پول ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی اور آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" میرے گہرے اور مخلص دوست جو مجھے حقیقی بھائیوں کی طرح عزیز ہیں۔ مسٹر پول اور ایڈیٹر "ریاست" نے دستور کے مطابق ہاتھ ملایا۔

سر جان تھامپسن اور خان بہادر تصدق حسین کے ان دو واقعات کا اثر یہ ہوا۔ کہ پہلے تو مسٹر پول ایڈیٹر "ریاست" کو ایسا سمجھتے تھے جیسے سناتن دھرمی حضرات اچھوتوں اور ہریجنوں کو۔ اب ایڈیٹر "ریاست" جب عدالت میں جاتا تو پہنچتے ہی مسٹر پول فرماتے۔ ہیلو سردار دیوان سنگھ کیا حال ہے آج موسم تو بہت اچھا ہے۔ دہلی میں برسات کا موسم پنجاب کے مقابلہ پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس سال سردی بھی بہت پڑے گی۔ وغیرہ۔ ایڈیٹر "ریاست" اس اخلاق کے سلوک کا مسکرا کر مسٹر پول کو جواب دیتا۔ اور جب وکیلوں کے پاس بار روم میں جا کر بیٹھتا۔ تو میں مسٹر نوکلی ایڈووکیٹ اور سردار بہادر بھگوان سنگھ بیرسٹر ہم تینوں کا نا پھوسی کرتے ہوئے کہتے۔ کہ سر جان اور تصدق حسین کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔ اب دیکھیں گے کہ بھوپال کس طرح مسٹر پول کو ہاتھوں میں لیتا ہے۔ اس مخالف کو جس ہم نے سیدھا کر لیا مقابلہ کا اب لطف آئے گا۔

بچارے بھوپال والوں کو کچھ علم نہ تھا۔ کہ اس کانٹے کے بدلنے کا باعث کیا ہے۔ یہ اسی زعم میں تھے۔ کہ مسٹر پول کا اخلاق صرف ظاہرا طور سے ہے اور ہر مجسٹریٹ جب کسی ملزم کو سزا دینا چاہتا ہے تو ملزم سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا ہے۔ تاکہ یہ اسے مخالف نہ سمجھے۔ اور مقدمہ تبدیل نہ کرا لے ورنہ اندرونی طور سے وہ بھوپال کا ہمدرد ہے۔ اتنے میں مسٹر پول تو قائم مقام ڈپٹی کمشنر ہو گئے اور مسٹر البیسر ان کی جگہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ مسٹر البیسر اپنی جرأت اور دیانت داری کے لیے بہت بڑی شہرت رکھتے تھے۔ آپ نے شملہ میں ایک بہت بڑے فوجی افسر کو ایک قلی کو مارنے کے جرم میں کئی برس قید کی سزا دی تھی۔ آپ دہلی میں بھی پچھلے تمام مجسٹریٹوں میں ایک نمایاں حیثیت کے افسر تھے۔ بھوپال والے مسٹر البیسر کے نام سے بہت بدکے۔ انہوں نے چاہا۔ کہ مسٹر پول اس مقدمہ کو اپنے ساتھ ہی اپنے نئے عہدہ یعنی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں لے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر پول کی عدالت میں یہ درخواست دی۔ کہ چونکہ آپ مقدمہ کے پچھلے حالات سے واقف ہیں اس لیے مقدمہ نئے اے ڈی ایم مسٹر البیسر کی عدالت میں نہ بھیجے اور آپ سنیں جب مقدمہ پیش ہوا۔ میری طرف سے مسٹر نوکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ تھے۔ اور نواب بھوپال کی طرف سے خان بہادر عبدالرحمٰن۔ مقدمہ کے مستغیث خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال بھی اپنی انسپکٹر جنرل پولیس کی پوری وردی پہنے عدالت میں تشریف فرما تھے اور ان لوگوں کو پورا یقین تھا۔ کہ مسٹر پول یہ مقدمہ خود ہی اپنی عدالت میں رکھیں گے مگر ان لوگوں کے "چھکے" چھوٹ گئے۔ جب مسٹر پول نے اس درخواست کا فیصلہ کرتے ہوئے

Marfat.com

لکھا۔ کہ یہ مسل بھوت کی طرح ان کے پیچھے پیچھے کیوں پھرتی ہے اور کیوں مسٹر ایسر اس مقدمہ کا فیصلہ نہ کریں۔ بھوپال کے نمائندے مسٹر ایسر کی زبردست قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ سے گھبراتے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ آپ ہی فیصلہ کریں کیونکہ ہمارے لیے وہی مجسٹریٹ مفید ہو سکتا تھا جو نواب بھوپال تو کیا، نظام دکن کی بھی پروا نہ کرے۔ چنانچہ مقدمہ شروع ہوا تو بھوپال والوں نے مقدمہ تبدیل کرنے کی درخواست دی اور مقدمہ تبدیل کرانے کی وجہ یہ لکھی کہ مسٹر ایسر اور دیوان سنگھ کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا۔ کہ میں اس سے پہلے مسٹر ایسر سے کبھی بھی عدالت سے باہر نہ ملا تھا۔ تعلقات کا تو سوال ہی کیا ہے۔ بھوپال کے نمائندوں نے اپنے اس الزام کی تائید میں مسٹر ایسر کے ایک موقوف شدہ موٹر ڈرائیور کا بیان شامل کیا جس نے کہا۔ کہ اس نے دیوان سنگھ کو مسٹر ایسر کے مکان پر ایک بار دیکھا تھا بھوپال والوں کی اس درخواست کا بھی وہی حشر ہوا جس کی یہ مستحق تھی یعنی خارج ہو گئی اور مقدمہ مسٹر ایسر کی عدالت میں ہی رہا۔ نواب بھوپال کی طرف سے چوالیس گواہ پیش ہوئے جن میں اکثر دفتر "ریاست" کے موقوف شدہ یا خریدکردہ غدار ملازم تھے۔

یہ مقدمہ کئی اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ نواب بھوپال کی طرف سے ایک دستاویز پیش کی گئی جو جعلی تھی اور ہماری اطلاع کے مطابق یہ جعل سازی چاندنی چوک کے ایک کمرہ میں نواب بھوپال کے نمائندوں کی نگرانی میں بدایون کے ایک جعل ساز نے تیار کیا۔ یہ دستاویز ثابت کرتی تھی۔ کہ نواب بھوپال کے خلاف دیوان سنگھ نے ایک پمفلٹ لکھوایا یعنی دیوان سنگھ کا اس میں ہاتھ ہے۔ بھوپال کے نمائندے اس دستاویز کو لے کر مختلف ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹوں کے پاس گئے۔ اگر بھوپال والے اپنی پوزیشن کو بتائے بغیر غیر جانب داری کی رائے لیتے تو ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ ان کو بتاتے کہ یہ جعلی ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی گئے انہوں نے اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے بتایا۔ کہ نواب بھوپال کے نمائندہ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سب نے اپنی شہادت کے لالچ میں یہی کہا۔ کہ یہ دیوان سنگھ کی تحریر ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ایک ایکسپرٹ نے پرائیویٹ طور سے انہیں بتایا۔ کہ بھوپال کے نمائندے جب اس کے پاس گئے اور دستاویز دیکھی تو معلوم ہوا۔ کہ یہ ادنیٰ قسم کی فورجری یعنی جعل سازی ہے اور ہر شخص آسانی کے ساتھ اس جعل سازی کی خامیوں کو معلوم کر سکتا ہے مگر اس نے اس خیال سے کہ یہ بڑی مرغی ہے ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔ اس نے کہا۔ کہ بہت اچھی دستاویز ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس طرح سے ایک ایک ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ نے پانچ پانچ دس دس ہزار روپیہ فیس اور شہادت کے خرچ کا بھوپال کے خزانہ سے وصول کیا۔ اور عدالت نے آخر ان ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹوں کے خلاف بھی بہت سخت الفاظ کے ساتھ ریمارک پاس کیے۔ اور ان کی شہادت کو ناقابلِ قبول قرار دیا۔ بھوپال کے یہ لوگ اس دستاویز کو عدالت میں پیش کرنے کی حماقت تو کر بیٹھے مگر یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت مصائب کا باعث ہوئی۔

بھوپال والوں نے دفتر "ریاست" کے متعدد آدمی خرید کر ان کو غدار اور نمک حرام بنایا۔ یہ ان لوگوں سے میرے متعلق اطلاعیں لیتے اور ان کو گواہوں کے طور پر پیش کرتے۔ میں ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس جو ان تمام مقدمات کے انچارج تھے، کے دفتر کے ایک ماتحت کو جس کا ان

Marfat.com

مقدمات سے تعلق تھا۔ تقریباً ایک سو روپیہ ماہوار دیا کرتا اور یہ شخص مجھے ریاست بھوپال کی اندرونی خبریں روزانہ بھیجتا رہتا۔ اس سے مجھے معلوم ہوتا رہتا کہ میرے دفتر کا کون کون شخص خرید لیا گیا ہے اور کون کون خواجہ محمد کے ساتھ ملا ہوا ہے اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور کون کون لوگ ہیں جو ریاست کے ہاتھ میں فروخت ہونے کے لیے تیار تھے چنانچہ پنجاب کے ایک مشہور جرنلسٹ بھوپال آئے ہوئے تھے۔ یہ بہت ضرورت مند ہوتے تھے اور مجھ سے پوشیدہ خواجہ محمد اور ان سے ملے اور دیوان سنگھ کے مقابلہ پر خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہاں تک کہ گویا یہ بھی دیکھ لیں گے۔ بھوپال والوں کے کیمپ کا میر دو نفر مقرر اور کام سب طرح مکمل ہو گیا۔ وہ مجھے سرزمین ہند کے برف خانہ کے پاس پہنچا جب میں اپنے گھر سے لوٹ رہا تھا۔ پہنچ برف خانہ کے پاس یہ لوگ پہرہ دیتے تھے اور مجھے دیکھتے ہی چلے گئے۔ کی شہادت جو اس کے روزمرہ کی ایک کارروائی تھی اور مجھے پیش کیا گیا۔ اس شخص نے مجھے ایک روز بتایا کہ فلاں جرنلسٹ جو کہ ... دہلی کے بہت اچھے ہیں۔ کانفیڈنشل ہوٹل میں انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال سے ملنے کے لیے آئے اور انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں مگر چونکہ ان کے پاس کوئی نئی اطلاع نہ تھی اور نہ یہ مفید ہو سکتے تھے اس لیے ان کو خریدا نہیں گیا اور واپس کر دیا گیا۔ چنانچہ اگلے روز ان مشہور جرنلسٹ صاحب جو میرے دوست تھے اور میرے ہاں تشریف لائے تھے سے درخواست کی گئی کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ آپ نے پوچھا کیا وجہ ہے تو بتایا گیا کہ وجہ یہ ہے۔ تو آپ سے کہا گیا کہ کوئی وجہ نہیں۔ آپ سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کوئی غداری نہ کریں۔ ان مشہور جرنلسٹ کی طرح لاہور کے متعدد اور اخبار نویس بھی بھوپال والوں کے پاس پہنچے اور خدمات پیش کیں۔ مگر ان کی خدمات قبول نہ کی گئیں کیونکہ ان کے پاس دیوان سنگھ کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی مواد نہ تھا۔

بھوپال کے اس شخص نے ہی مجھے اطلاع دی کہ بھوپال والے کوشش کر رہے ہیں کہ گورنمنٹ انڈیا کا ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ بھی دستاویز کے متعلق یہ فتویٰ دے کہ یہ جعلی نہیں اور دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ دستاویز پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کی معرفت گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کو بھیجی جائے گی۔ تاکہ رپورٹ کے نتیجے کی صورت میں جانب داری کا شبہ نہ ہو۔ اس اطلاع سے میں بہت پریشان تھا کہ اگر گورنمنٹ ہند کے ایکسپرٹ نے بھی یہ کہہ دیا کہ یہ جعلی نہیں۔ دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے تو اس کا نتیجہ ہمارے لیے بہت نقصان کا باعث ہوگا اور عدالت کو ماننا پڑے گا کہ یہ دستاویز دیوان سنگھ کی لکھی ہوئی ہے اور وہ مجرم ہے۔ میں کئی روز سوچتا رہا کہ اس مشکل کو کیسے حل کیا جائے۔ آخر یہ خیال آیا کہ اس سرکاری ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کے بڑے افسر سے ملنا چاہیے۔ تاکہ اس معاملہ میں کوئی بددیانتی نہ ہو۔ اس محکمہ کے سب سے بڑے افسر سر ڈیوڈ پیٹری تھے۔ سر ڈیوڈ پیٹری ایک غیر معمولی قابلیت کے افسر تھے غیر معمولی دیانتدار، نہایت نیک اور انصاف پسند۔ چنانچہ اپنی ان صفات کے باعث ہی آپ بعد میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے پریذیڈنٹ ہوئے۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن بڑے بڑے عہدوں مثلاً آئی سی

Marfat.com

سروس کے لیئے امیدواروں کو انتخاب کرتا ہے۔ میں نے دن کو دس بجے کے بعد سر ڈیوڈ پیٹری کو ٹیلی فون کیا کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ لنچ کے بعد ان کے دفتر میں دو بجے ملوں۔ میں نے کہا۔ کہ میں آپ کے گھر ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے دفتر کے خلاف شکایت ہے۔ سر ڈیوڈ حیران ہوئے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں۔ ان کے دفتر کے خلاف شکایت۔ جہاں ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ پانے والے ایک درجن سے زیادہ آدمی ہیں۔ میں نے جب یہ کہا۔ کہ فی الحقیقت آپ کے دفتر کے خلاف شکایت ہے۔ تو انہوں نے شام کو سات بجے اپنی کوٹھی پر آنے کو کہا۔ جو اکبر روڈ پر نئی دہلی میں تھی۔ میں سات بجے وہاں پہنچ گیا۔ سر ڈیوڈ کی کوٹھی سے باہر سڑک پر دو آدمی وردی میں اور دو سفید کپڑوں میں پہرہ دے رہے تھے اور چاروں کے پاس سائیکل اور ریوالور تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ میں صاحب سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ کسی کو کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا۔ بہرا کو بلا دو۔ جو صاحب کے پاس میرا وزیٹنگ کارڈ لے جائے۔ ان میں سے ایک شخص کوٹھی کے اندر گیا۔ بہرا کو بلا لایا۔ وہ میرا کارڈ لے گیا۔ سر ڈیوڈ نے کوٹھی کے اندر لے آنے کے لیے کہا۔ میں گیا اور آپ سے باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا۔ کہ بھوپال والوں نے جعل سازی کی ہے اور اس جعلی دستاویز کی بنیادوں پر وہ مجھے پھنسانا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ آپ کے ماتحت جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ ہیں وہ بھی یہ فتویٰ دیں کہ یہ جعلی دستاویز اصلی اور دیوان سنگھ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میرے اس الزام پر سر ڈیوڈ حیران ہوئے اور آپ نے کہا۔ یہ ممکن نہیں کہ ان کے دفتر کا کوئی آدمی رشوت لے یا بد دیانت ہو۔ میں نے کہا۔ میں تو دنیا میں بہت کم آدمیوں کو دیانت دار سمجھتا ہوں۔ ہر شخص کی قیمت ہوتی ہے۔ آپ تین ہزار روپیہ تنخواہ پاتے ہیں۔ آپ کو تین لاکھ روپیہ دیا جائے تو شاید آپ بھی بد دیانت ثابت ہوں۔ وائسرائے بائیس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ اور وائسرائے کو ایک کروڑ روپیہ رشوت دی جائے تو شاید وائسرائے بھی دیانت داری کو چھوڑ دیں۔ اس طرح یہ سو دو سو روپیہ کا سوال نہیں۔ نواب بھوپال کے خزانہ کے ہزارہا روپیہ کا سوال ہے۔ میں الزام نہیں لگاتا آپ سے صرف احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ کہ آپ کے دفتر میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ نہ بنایا جائے کیونکہ اس مقدمہ میں نواب بھوپال کی عزت کا سوال ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ کوئی شخص دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ لے کر اس جعلی دستاویز کو اصلی میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی بتائے۔ سر ڈیوڈ نے کہا۔ کہ اگر یہ دستاویز اصلی ہوئی۔ تو آپ کے دفتر سے اس کے اصلی ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ میں نے کہا۔ میں چیلنج کرتا ہوں۔ کہ آپ اس دستاویز کے متعلق ایمان داری کے ساتھ وہی فیصلہ دیجئے جیسی یہ فی الحقیقت ہے اور یہ انتظام کر دیجئے۔ کہ نہ نواب بھوپال کا اثر استعمال ہو اور نہ میری کوئی رعایت۔ سر ڈیوڈ نے اس کو منظور کر لیا۔

سر ڈیوڈ پیٹری نے اگلے روز اپنے دفتر میں حکم دیا۔ کہ کوئی دستاویز ہینڈ رائیٹنگ کے متعلق ان کے دفتر میں بھوپال سے آئے تو اس لفافہ کو کوئی شخص نہ کھولے اور بند کا بند ان کو دیا جائے۔

فارن منسٹر بھوپال نے دستاویز پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کو بھیجی۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے سیکرٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو اور پولیٹیکل سیکرٹری نے سر ڈیوڈ کے دفتر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائیٹنگ

Marfat.com

اکسپرٹ کو بھیجی۔ کہ یہ تحریر اصلی ہے یا جعلی۔ جب یہ تحریر سر ڈیوڈ کے دفتر میں پہنچی۔ تو بند لفافہ سر ڈیوڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ یہ لفافہ لے کر خود ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ کی لیباریٹری میں گئے۔ وہاں خود موجود رہے اور مسٹر سٹاٹ سینئر ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ، مسٹر ہاجسن اسسٹنٹ ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ اور دوسرے اس فن سے واقف اسسٹنٹوں سے کہا۔ کہ بہت احتیاط کے ساتھ معلوم کر کے بتایا جائے کہ یہ تحریر اصلی ہے یا جعلی۔ سر ڈیوڈ وہاں کافی عرصہ موجود رہے۔ ان کی موجودگی میں دستاویز کے فوٹو لیے گئے اور دوسرے سائینٹفک عمل ہوئے۔ آخر سب نے یہ کہا۔ کہ یہ دستاویز قطعی طور پر جعلی ہے اور جعل سازی بھی کسی ادنیٰ قسم کے جعل ساز نے کی ہے جو اس فن سے اچھی طرح واقف نہیں۔ سر ڈیوڈ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ اتنی بڑی ریاست کی طرف سے جعلی دستاویز عدالت میں پیش ہوئی۔ سر ڈیوڈ پیٹری نے فوراً سر چارلس واٹسن پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو ٹیلی فون کیا۔ پولیٹیکل سیکرٹری نے کہا کہ فوراً تمام ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹوں کے بیانات قلم بند کیے جائیں۔ چنانچہ ان کے بیانات لیے گئے اور دستاویز یہ لکھ کر واپس بھوپال کے فارن منسٹر کو بھیج دی گئی۔ کہ یہ جعلی ہے۔ اس دستاویز کے پہنچنے پر میرے اس اطلاع دینے والے مخبر نے (جو انسپکٹر جنرل بھوپال کے دفتر میں ملازم تھا) اطلاع دی کہ دستاویز واپس آ گئی ہے اور اس کے متعلق جعلی ہونے کا فتویٰ صادر کیا گیا ہے اور بھوپال والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ کی اس رائے کو راز میں ہی رکھا جائے۔ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کیا جائے عدالت کو نہ بتایا جائے اور صرف دوسرے کرایہ کے غیر سرکاری ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹوں کی رائے اور شہادت ہی عدالت میں پیش کی جائے۔

ہم ہر شخص کے متعلق اطلاعیں حاصل کرتے رہتے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ایک ماہ تک مسٹر سٹاٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے سینئر ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ ایک سال کی طویل رخصت پر ولایت جانے والے ہیں اور چونکہ انہوں نے اس دستاویز کے جعلی ہونے کی بطور سینئر ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ تصدیق کی ہے۔ یہ اگر ولایت چلے گئے اور ان کی غیر حاضری میں مقدمہ کا فیصلہ ہوا۔ تو ان کی شہادت نہ ہو سکے گی۔ سردار بہادر بھگوان سنگھ اور مسٹر نوکلی نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا۔ کہ عدالت میں درخواست دے کر مسٹر سٹاٹ کی شہادت کرا لی جائے۔ چنانچہ دو چار روز کے بعد مقدمہ کی عدالت میں پیشی تھی۔ ہم نے ایک درخواست دی کہ گو استغاثہ کی تمام شہادتیں ختم نہیں ہوئیں مگر مسٹر سٹاٹ جنہوں نے بھوپال والوں کی درخواست پر اس دستاویز کا معائنہ کیا ہے کی شہادت لے لی جائے کیونکہ آپ طویل رخصت پر ولایت جا رہے ہیں۔ اور مقدمہ کے ختم ہونے سے پہلے ولایت سے واپس نہ آ سکیں گے۔ ہمارے اس درخواست دینے سے پہلے بھوپال کو میرے سر ڈیوڈ سے ملنے وغیرہ کے متعلق قطعی کوئی علم نہ تھا۔ اور وہ یہ یقین کیے ہوئے تھے کہ ملزم یا ملزم کے وکیلوں کو مسٹر سٹاٹ کی رائے کا کوئی علم نہیں۔ اس رائے کو وہ ہضم کر جائیں گے۔ اور عدالت سے اسے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ تاکہ اس رائے سے نئی مصیبت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ جب یہ درخواست دی گئی تو اس درخواست کو مجسٹریٹ نے پڑھا۔ پڑھنے کے بعد مجسٹریٹ نے اسے خان بہادر

Marfat.com

عبدالرحمٰن کو دیا۔ کہ اس کے متعلق آپ کا کیا جواب ہے۔ اس لمحہ سے پہلے بھوپال کے وکیل اور انسپکٹر جنرل پولیس ہماری کوششوں سے بالکل بے خبر اور تاریکی میں تھے۔ اس درخواست کو دیکھ کر خان بہادر عبدالرحمٰن بھی حیران ہوئے اور خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال جو مقدمہ کے انچارج تھے، کی پیشانی پر تو پسینہ آ گیا۔ اب ہم تو کہہ رہے ہیں کہ مسٹر سٹاٹ کی شہادت بھوپال کے گواہ کے طور پر ہو کیونکہ آپ نے بھوپال کی درخواست پر دستاویز کا معائنہ کیا ہے اور بھوپال والوں نے کہا ہے کہ وہ مسٹر سٹاٹ کی شہادت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور اس کو پیش کرنا نہیں چاہتے۔ یہ واقعہ عدالت میں ایک بہت بڑی سنسنی پیدا کرنے کا باعث ثابت ہوا اور مجسٹریٹ کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ کہ بھوپال کی درخواست پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ہینڈ رائیٹنگ ایکسپرٹ نے دستاویز کا معائنہ کیا اور اس نے بھی اس کو جعلی قرار دیا۔ چنانچہ آخر مسٹر سٹاٹ کے نام مجسٹریٹ نے عدالت کی طرف سے سمن جاری کیے مسٹر سٹارٹ عدالت میں آئے۔ آپ کی شہادت ہوئی اور آپ نے قرار دیا۔ کہ یہ دستاویز جو نواب بھوپال کے نمائندوں نے عدالت میں پیش کی ہے۔ سو فیصدی جعلی ہے۔ چنانچہ بھوپال کے چوالیس گواہوں اور اس ایکسپرٹ کی شہادت کے بعد اس مقدمہ میں مجسٹریٹ مسٹر الیسر نے فیصلہ دیا۔ کہ یہ دستاویز جعلی ہے اور اخبار "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کو کچلنے اور پھنسانے کے لیے جھوٹے مقدمہ کی سازش کی گئی۔ اس فیصلہ سے بھوپال والوں کی جو حالت ہوئی۔ ظاہر ہے اپیل کی گئی جو ہائی کورٹ میں خارج ہوئی اور ایڈیٹر "ریاست" بری نہیں بلکہ ڈسچارج ہوا۔

اس مقدمہ کے فیصلہ تک ایڈیٹر "ریاست" کا مسٹر الیسر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کبھی بھی ایڈیٹر "ریاست" کو مسٹر الیسر سے پرائیویٹ طور سے ملنے یا آپ کے گھر جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

مقدمہ کے فیصلہ کے عرصہ بعد مسٹر الیسر بیمار ہو گئے۔ آپ کی انتڑیوں میں زخم تھا اور خون بہ رہا تھا آپ ہندو راؤ ہسپتال (جہاں انگریز افسروں وغیرہ کا علاج ہوتا ہے) داخل کیے گئے۔ آپ کی زندگی کی کوئی امید نہ تھی اور مجھے جب یہ حالت معلوم ہوئی۔ تو میں بطور ہمدردی آپ کے گھر گیا۔ آپ کی میم صاحبہ پریشانی کی حالت میں مغموم تھیں میں نے پوچھا کیا حالت ہے۔ تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آپ نے کہا۔ کہ خدا رحم کرے۔ حالت بہت نازک ہے۔ کسی کو مسٹر الیسر کے پاس جانے کی اجازت نہیں اور نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کیا ہوگا۔ اور آپ خود بھی صرف چند منٹ کے لیے شام کو اپنے شوہر کو دیکھنے جاتی ہیں۔ اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنے اور بات چیت کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں مسٹر الیسر کے مکان پر گیا۔

مسٹر الیسر کچھ اچھے ہو گئے اور ڈاکٹروں نے کہا۔ کہ وہ انگلینڈ جا کر وہاں اوپریشن کرائیں۔ چنانچہ اس بیماری اور کمزوری کی حالت میں ہی آپ ولایت گئے۔ وہاں ہسپتال میں داخل ہوئے اور کئی ماہ تک علاج کراتے رہے۔ ان کی غیر حاضری میں بھی میں مسٹر الیسر کی حالت دریافت کرنے ان کے گھر کبھی کبھی جایا کرتا۔ ایک روز میں نے مسٹر الیسر سے باتوں باتوں میں پوچھا۔ کہ مسٹر الیسر کا اس بیماری میں روپیہ تو کافی خرچ ہوا ہوگا

Marfat.com

مسٹر ایسر نے معمولی طور سے ہاں کہہ دیا مگر میں نے محسوس کیا۔ کہ ان کے کئی بچے ہیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ رشوت نہ کھانے والا دیانت دار شخص۔ پوزیشن کا قائم رکھنا۔ کوٹھی، موٹر، ملازم اور اس پر بیماری کی یہ مصیبت اور انگلینڈ کا خرچ۔ میں سوچتا رہا۔ کہ یہ بیچارے کیا کرتے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے معلوم ہوا۔ کہ رخصت کی نصف تنخواہ تو میم صاحبہ اپنے پاس رکھتی ہیں اور نصف اپنے شوہر کو ولایت خرچ کیلئے بھیج دیتی ہیں۔

میں یہ حالات سن کر واپس آ گیا مگر کچھ بے چینی سی محسوس کرتا رہا۔ رات کو بھی یہی خیال۔ کہ اگر ولایت میں مسٹر ایسر کے پاس خرچ کے لیے کافی روپیہ نہ ہوگا۔ تو کیا کریں گے۔ ایسے نیک آدمی کے لیے اتنی مصیبت۔ اگر مسٹر ایسر کی زندگی نہ رہی تو ان کے بچے کیا کریں گے۔ ان لوگوں کو کس جرم میں یہ سزا ملے گی۔ اور کیا نیک لوگوں کے لیے مصائب ضروری ہیں۔ ان ہی خیالات میں نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو رات کے خیالات کا اثر موجود تھا۔

میری فطرت ہے کہ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو جب تک میں اس مشکل کا کوئی حل نہ سوچ لوں۔ مجھے بے چینی سی رہتی ہے اور کام نہیں کر سکتا۔ نو بجے دفتر کے لوگ آئے۔ میں نے ایک خط لندن کی ایڈورٹائزنگ فرم ڈی۔ جے کیمر اینڈ کو کو لکھوایا۔ کہ ہمارے حساب میں ایک سو پونڈ مسٹر ایسر آف دہلی کو معرفت تھامس کک اینڈ کمپنی لندن بھیج دیا جائے۔ یہ خط پہنچتے ہی کیمر اینڈ کو نے ایک سو پونڈ کا چیک مسٹر ایسر کو تھامس کک کی معرفت بھیج دیا۔ مسٹر ایسر اس وقت ہسپتال میں بیمار پڑے تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ آپ کے پاس اس وقت صرف پانچ پونڈ باقی تھے اور سوچ رہے تھے۔ کہ کسی دوست سے قرض لیں۔ مسٹر ایسر کو خیال بھی نہ تھا کہ دیوان سنگھ کا بھیجا ہوا ایک سو پونڈ کا چیک آپ کے پاس آئے گا۔ ہسپتال میں ہی بستر پر آپ کو یہ چیک ملا۔

مسٹر ایسر غالباً چار ماہ کے بعد انگلینڈ سے واپس آئے۔ آپ کا اوپریشن ہوا اور آپ اچھے ہو گئے جب دہلی پہنچے تو میں خیریت پوچھنے کے لیے دوسرے تیسرے روز آپ کے پاس گیا۔ خیریت پوچھی۔ باتیں ہوئیں تو آپ نے امپیریل بنک دہلی کا میرے نام کا ایک ہزار تین سو تیس روپیہ کا چیک دیا اور کہا۔ کہ آپ کے دل میں ایڈیٹر "ریاست" کے جذبات اور اخلاص کی انتہائی قدر اور عزت ہے۔ مگر آپ یہ روپیہ نہیں لے سکتے کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" کا مقدمہ آپ نے کیا اور اسے اپنے ضمیر پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ میں نے بہت کہا اور بار بار درخواست کی۔ کہ یہ بیماری کی حالت میں ایک دوستانہ نذر تھی اس کو قبول کیا جائے۔ مقدمہ ختم ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کا ہائی کورٹ میں بھی فیصلہ ہو چکا۔ اب احسان یا معاوضہ کا سوال ہی کیا ہے مگر آپ نہ مانے اور آپ نے چیک دے دیا جو بنک سے کیش کرا لیا گیا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد اس مقدمہ کا بھی آخری فیصلہ ناگپور ہائی کورٹ سے ہوا۔ جو نواب بھوپال نے ہوشنگ آباد میں چلا رکھا تھا اور دہلی کے مقدمہ کی جعل سازی کے سلسلہ میں تمام انتظامات مکمل تھے۔ کہ بھوپال کے نمائندوں پر جعل سازی کے جرم میں فوجداری اور ایک لاکھ روپیہ ہرجانہ کا دیوانی مقدمہ دائر کیا جائے مگر صرف اس خیال سے دونوں مقدمات کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ کہ چونکہ مسٹر ایسر کو ایک سو پونڈ ان کی بیماری کے وقت ایڈیٹر "ریاست" نے بھیجا تھا۔ اگر مقدمہ چلا تو شاید اس مقدمہ میں بے قصور، معصوم اور نیک سیرت

Marfat.com

مسٹر الیسر کا نام بھی اس روپیہ کے سلسلہ میں زیر بحث آئے۔ آپ پر کوئی غلط الزام لگایا جائے اور آپ کی شہرت کے لیے ایڈیٹر "ریاست" نقصان کا باعث ہو۔

مسٹر الیسر کے روپیہ واپس کرنے کے بعد میرے اور مسٹر الیسر کے تعلقات فی الحقیقت گہرے دوستانہ ہو گئے۔ اور یہ تعلقات میرے لیے نقصان کا باعث بھی ہوئے۔ چنانچہ ناظرین کو یاد ہوگا۔ کہ نوٹوں کا مقدمہ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ نے مسٹر الیسر کو غیر معمولی دیانت دار اور قوت ارادی کا مضبوط اور انصاف پسند مجسٹریٹ سمجھ کر آپ کی عدالت میں بھیجا اور لکھا۔ کہ مسٹر الیسر ہی اس کا فیصلہ کریں مگر مسٹر الیسر کا ضمیر اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ آپ نے اس حکم کی پشت پر ہی لکھ کر یہ حکم واپس کر دیا۔ کہ دیوان سنگھ سے آپ کے ذاتی تعلقات ہیں اس لیے آپ مقدمہ سننا نہیں چاہتے۔ چنانچہ اگر ایک سو پونڈ کا چیک مسٹر الیسر کو ولایت نہ بھیجا گیا ہوتا جو آپ نے ہندوستان آتے ہی واپس کر دیا تو نوٹوں کا یہ مقدمہ بھی مسٹر الیسر جیسے انصاف پسند اور قوت ارادی کے مضبوط مجسٹریٹ کے ہاتھوں فیصل ہوتا اور جعل سازی والے بھوپال کے مقدمہ میں بھوپال کے نمائندوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آج جیل میں ہونے کے علاوہ ایڈیٹر "ریاست" ایک کافی رقم بطور ہرجانہ بھوپال کے خزانہ سے وصول کر لیتا۔

ان تمام واقعات کے بعد اگر ایڈیٹر "ریاست" کے دل کی اصلی آواز معلوم کی جائے تو یہ ایمانداری کے ساتھ کہنے کے لیے تیار ہے کہ مسٹر الیسر کی بیماری کی حالت میں ایک سو پونڈ کے لیے لندن خط لکھتے وقت میرے دل کو جو مسرت و اطمینان اور خوشی محسوس ہوئی اس پر درجنوں دشمنوں کی جعل سازیوں کو معاف اور لاکھوں روپیہ قربان کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ دوستوں اور مستحق لوگوں کی ضرورت کے وقت خدمت کرنے میں وہ لطف ہے جو شاید صوفیوں کے مراقبہ میں اور ہندو بھگتوں کو انہد شبد (یعنی دل کا خدا سے ہم کلام ہونا) میں بھی میسر نہیں۔ اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں جب تک دوستوں اور مستحق لوگوں کی ضروریات میں ان کی خدمت کرتا رہا۔ میرے پاس بہت روپیہ آیا۔ جب کبھی میں نے دوستوں کی امداد سے ہاتھ کھینچا۔ میں افلاس میں مبتلا ہوا اور اب بھی "ریاست" کے موجودہ نئے دور میں اس غیر معمولی کامیابی کا سب سے بڑا باعث دوستوں اور دوسرے مستحق لوگوں کی دعائیں ہی ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" کی عدالتی قماربازی

اس سے پہلے "ریاست" میں دہلی والے مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کے حالات مسٹر الیسر کے فیصلہ تک لکھے گئے تھے۔ ان حالات نے "ریاست" کے اڑھائی صفحہ کی جگہ لے لی۔ حالانکہ اس "ناقابل فراموش" کالم کے لیے مستقل طور سے جگہ صرف دو کالم وقف تھی۔ اب اس مقدمہ کی اپیل کے حالات درج کیے جاتے ہیں جو دلچسپ ہیں۔

مسٹر الیسر کے فیصلہ کے بعد نواب بھوپال کی طرف سے سشن جج دہلی کی عدالت میں نگرانی دائر کی گئی۔

Marfat.com

جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ استغاثہ کے چالیس گواہوں کے گزرنے کے بعد دیوان سنگھ کے خلاف فردجرم لگنا چاہیئے ہمارے وکیل کہتے تھے کہ جس صورت میں نواب بھوپال کے منتخب کردہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سرکاری ہینڈ رائیٹنگ اکسپرٹ کی شہادت بھی موجود ہے کہ نواب بھوپال کی طرف سے جعلی کاغذات عدالت میں پیش کیے گئے اور استغاثہ کے گواہ بھی دیوان سنگھ کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں کر سکے۔ اس لیے قانوناً دیوان سنگھ کو ڈسچارج ہونا چاہیئے۔ فردجرم کی ضرورت نہیں۔ یہ مقدمہ مسٹر بکیٹ آئی سی ایس سیشن جج کی عدالت میں تھا مسٹر ایسر کی عدالت میں تو بھوپال کی طرف سے مقدمہ کے انچارج وکیل خان بہادر عبدالرحمٰن تھے۔ مگر مسٹر بکیٹ کی عدالت کے لیے انہوں نے ایک انگریز مسٹر کارڈن نوڈ بیرسٹر کو بہت کافی فیس پر وکیل کر لیا۔ یہ مسٹر کارڈن نوڈ کئی برس تک مسٹر بکیٹ سیشن جج کے ساتھ ایک ہی کوٹھی میں مقیم رہے جبکہ مسٹر بکیٹ لاہور میں رجسٹرار ہائیکورٹ یا لیگل ریمبرلنسر تھے۔ اور مسٹر بکیٹ کے گہرے دوست تھے مسٹر کارڈن نوڈ کا وکیل ہونا ہمارے دل میں شبہات پیدا کرنے کا باعث ہونا چاہیئے تھا مگر آپ کا مسٹر بکیٹ کی عدالت میں وکیل مقرر ہونا خلافِ قانون نہ تھا۔ ہم کیا کر سکتے تھے خاموش رہے۔ مسٹر بکیٹ پر کوئی الزام لگانا غیر مناسب تھا۔ چنانچہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ اور مسٹر کارڈن نوڈ مسٹر بکیٹ کی عدالت میں آئے تو مسٹر بکیٹ نے عدالت میں ہی کہا۔ کہ مسٹر کارڈن نوڈ آپ کے دوست ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ رات کو مسٹر کارڈن نوڈ کو اپنے ہاں ڈنر پر بلایا ہیں۔ کسی پارٹی کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ جہاں تک ہمارے شبہات کا تعلق تھا۔ مسٹر بکیٹ کا مسٹر کارڈن نوڈ کو اپنی کوٹھی پر دعوت دینا نہلے پر دہلے والی بات تھی۔ ہمارے شبہات میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ مگر مقدمہ عدالت میں پیش ہے سیشن جج پر الزام کیوں کر لگاتے ہم نے بھی بد دلی کے ساتھ کہہ دیا۔ کہ ہمیں مسٹر کارڈن نوڈ کے آپ کے ہاں ڈنر پر جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

مسٹر کارڈن نوڈ، مسٹر بکیٹ کے ہاں ڈنر پر گئے۔ مقدمہ اس کے بعد کئی روز تک رہا۔ بحث ہوئی بحث کے بعد مسٹر بکیٹ نے مقدمہ کا فیصلہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف دیا۔ اور فیصلہ میں لکھا۔ کہ دیوان سنگھ پر چارج شیٹ یعنی فردجرم لگائی جائے اور پھر دیوان سنگھ کی طرف سے صفائی پیش ہو کر مقدمہ کا فیصلہ ہو۔

مسٹر بکیٹ کے اس فیصلہ کے خلاف ہم ہائی کورٹ میں گئے وہاں نگرانی داخل کی۔ رجسٹرار نے یہ مقدمہ بخشی سر ٹیک چند جج ہائی کورٹ کی عدالت میں سماعت کے لیے بھیج دیا۔ اس زمانہ میں ہائی کورٹ کے مستقل چیف جج سر شادی لال ایک قانونی کمیشن کے سلسلہ میں ولایت گئے ہوئے تھے اور قائم مقام چیف جسٹس ایک انگریز سر ایلن براڈوے تھے جن کے متعلق ہمارے پاس اطلاع تھی کہ وہ بھی مسٹر کارڈن نوڈ کے دوست ہیں۔ مگر ہم کیا پروا کرتے جس صورت میں کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں لگ چکا تھا اور انصاف اور قابلیت کے اعتبار سے بخشی صاحب شاید تمام ججوں میں ہی ایک نمایاں ترین حیثیت رکھتے تھے۔ بھوپال والوں کو جب یہ علم ہوا کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں لگ چکا ہے تو ان لوگوں نے کوشش کر کے مقدمہ سر ایلن براڈوے کی عدالت میں لگوا لیا اور عدالت کی اس تبدیلی کا حکم سر ایلن براڈوے نے خود بطور قائم مقام چیف جسٹس دیا۔ چیف جسٹس کا حکم ہائی کورٹ میں خدائی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اپیل کے لیے کوئی گنجائش

Marfat.com

ہی نہیں۔ اور ہر ملزم چاہے وہ دل میں کیا کچھ سمجھتا ہو۔ اس حکم کے سامنے سر جھکانے کے لیے مجبور ہے دہلی میں اپیل ہوئی۔ تو مسٹر ہیکیٹ سیشن جج کے ذاتی دوست مسٹر کارڈن نوڈ۔ اور اب ہائی کورٹ میں آئے ہیں تو مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت سے سر ایلن براڈوے اپنی عدالت میں لے گئے۔ اور مسٹر کارڈن نوڈ، سر ایلن کے دوست۔ ہم کیا کر سکتے تھے۔ بہت سوچا اس بیماری کا علاج سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر ہم نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ مقدمہ انگریز جج کی عدالت میں ہوگا۔ استغاثہ کے وکیل انگریز۔ اس لیے اس انگریزیت کے زہر کے اثر کو کچھ نرم کرنے کے لیے ہم بھی کوئی انگریز وکیل کر لیں تاکہ مسٹر کارڈن نوڈ کا بطور صرف انگریز اگر اثر ممکن ہو (میں مسٹر کارڈن نوڈ پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ صرف اپنے دل کی کیفیت اور شبہات بیان کر رہا ہوں) تو وہ اثر ایک حد تک زائل ہو سکے۔ اس زمانہ میں انگریز وکیلوں میں سب سے زیادہ لائق وکیل مسٹر پٹ مین ستر سال کے ضعیف۔ مگر بہت محنتی، بہت لائق اور بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ آپ پنجاب کے سازش وغیرہ کے بڑے مقدمات میں بطور سرکاری وکیل یا ملزموں کے وکیل کی حیثیت سے پیروی کر چکے تھے اور غالباً جج ہائی کورٹ بھی رہے۔ مسٹر پٹ مین اس زمانہ میں فلیٹی ہوٹل کی اوپر کی منزل کے کمروں میں مستقل رہائش رکھتے تھے۔ ایڈیٹر "ریاست" اور سردار بہادر بھگوان سنگھ فلیٹی ہوٹل پہنچے۔ مسٹر پٹ مین سے ملے۔ مسٹر پٹ مین کی فیس پانچ سو روپیہ روزانہ تھی۔ آپ نے پوچھا مقدمہ کیا ہے تو جواب دیا گیا۔ توہین کا ہے اور اس کی ہائیکورٹ میں نگرانی ہے۔ مسٹر پٹ مین نے پوچھا ایک دو گھنٹہ کا کام ہے اور چند منٹ مسل دیکھنے پر صرف ہوں گے۔ آپ نے فرمایا۔ پانچ سو روپیہ فیس ہوگی۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔ پانچ سو روپیہ فیس اور پچاس روپیہ منشیانہ ہم نے نذر کیا اور یہ وعدہ کر کے چلے آئے کہ شام تک مسل کی نقل بھیج دیں گے۔ سردار بہادر بھگوان سنگھ دبیر سٹر اجمیر، جج مسٹر تو کل کے ساتھ میرے وکیل تھے۔ مقدمہ کی مسل کے کیڑے ہیں اور شاید تمام ہندوستان میں کوئی وکیل بھی اتنا محتاط، دور اندیش اور محنتی نہ ہوگا۔ یہ غیر ممکن تھا۔ کہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی عدالت کی مسل میں ہو اور اس کی مصدقہ نقل ہمارے پاس موجود نہ ہو۔ اس مقدمہ کی مسل بھی ایک ہزار صفحات سے زیادہ ضخیم تھی۔ کیونکہ مقدمہ کی کارروائی چالیس گواہوں کے بیانات اور ایک ایک گواہ پر کئی کئی ہفتہ جرح۔ شام کو ہم نے مسل کی مکمل نقل مسٹر پٹ مین کو بھیج دی تاکہ وہ پانچ سات روز میں اطمینان کے ساتھ معائنہ کر لیں اور ہم واپس دہلی چلے آئے کیونکہ مقدمہ کی پیشی میں چند روز باقی تھے۔

دہلی پہنچ کر ایڈیٹر "ریاست" سر ایلن براڈوے کی عدالت سے بے فکر نہ تھا۔ سوچتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے آخر میں نے اپنی پوری قوتِ ارادی کے ساتھ فیصلہ کیا۔ کہ نتیجہ چاہے کچھ ہو اور چاہے توہین عدالت کے جرم میں بھی سزا ہو جائے۔ جب سر ایلن براڈوے کی عدالت میں جاؤں گا۔ تو مقدمہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے علانیہ طور سے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہوں گا۔ کہ چونکہ سر ایلن براڈوے نے خود ہی مقدمہ جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت سے منتقل کرا لیا ہے مجھے اس عدالت کے انصاف پر بھروسہ نہیں میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مقدمہ کسی دوسرے جج ہائی کورٹ کے پاس بھیجا جائے۔ اور اگر یہ عدالت کو منظور نہیں تو میں عدم تعاون کرتا ہوں۔ عدالت جو چاہے مقدمہ کا فیصلہ دے۔ میں مقدمہ کی کارروائی میں حصہ نہ لوں گا اور میں اس توہین عدالت

Marfat.com

کے جرم کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار ہوں۔

میں نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ جانتا تھا۔ کہ ہائی کورٹ توہین عدالت میں بہت سخت سزا دے سکتی ہے (ناظرین کو یاد ہو گا۔ کہ مرحوم لالہ کرشن لال کو چیف جسٹس ہائیکورٹ لاہور نے توہین عدالت کے جرم میں عمر قید کی سزا دی تھی)۔

ابھی مقدمہ کی پیشی میں ایک ہفتہ کے قریب باقی تھا خوش نصیبی سمجھیئے یا حسنِ اتفاق۔ کہ صبح کو میں نے سٹیٹس مین دیکھا۔ اس میں ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک تار تھا۔ کہ لندن کے اس قانونی کمیشن کا کام خلاف توقع جلدی ختم ہو چکا ہے جس میں سرشادی لال چیف جسٹس ممبر تھے۔ اور سرشادی لال جہاز کے ذریعہ آج واپس بمبئی پہنچ گئے اور شام کو فرنٹیر میل میں پنجاب روانہ ہو رہے ہیں۔ اس خبر کو پڑھتے ہی ذہن میں مختلف خیالات آنے شروع ہوئے۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ سرشادی لال واپس آ گئے ہیں۔ مقدمہ سر ایلن براڈوے کی عدالت سے نکلوایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ جب کوئی بھی مشکل پیش آئے۔ مجھے اس وقت تک بہت بے چینی سی رہتی ہے جب تک کہ اس مشکل کا حل اور اس حل کا پروگرام تیار نہ کر لوں۔ اس حالت میں مجھ سے نہ کوئی کام ہو سکتا ہے اور نہ میں کوئی مضمون لکھ سکتا ہوں۔ جب کوئی حل تجویز کر لوں اور اس حل کا پروگرام بنا لوں۔ تو پھر قطعی طور سے مطمئن ہو کر اپنا کام شروع کر دیتا ہوں۔ میں نے اس خبر کو صبح چھ بجے کے قریب پڑھا۔ دوپہر کے دو بجے تک بے چین رہا۔ اور سوچتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ آخر فیصلہ کیا۔ کہ تمام حالات کے متعلق سرشادی لال کو اطلاع بھیجی جائے۔ چنانچہ میں نے سرشادی لال کو ایک خط لکھا جس میں مقدمہ کے تفصیل کے ساتھ حالات تھے۔ مسٹر ایلسر کا فیصلہ چالیس گواہوں کی شہادت۔ گورنمنٹ ہند کے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ کی گواہی۔ مسٹر لبکیٹ کی عدالت میں مسٹر کارڈن نوڈ کا وکیل مقرر ہونا۔ عدالت میں ڈنر کا ذکر۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جانا اور وہاں سے مقدمہ بطور چیف جسٹس مسٹر ایلن براڈوے کا اپنی عدالت میں منگانا وغیرہ اور ساتھ یہ بھی لکھا۔ کہ پیشی کے روز میں توہین عدالت کی پروا نہ کرتے اور عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے جسٹس ایلن پر علانیہ جانب داری کا الزام لگاؤں گا اور کہوں گا کہ آپ عدالت یا ہائی کورٹ سے مجھے انصاف کی توقع نہیں۔ یہ خط غالباً سولہ صفحہ کا تھا۔ اور "ریاست" کے فارم پر تھا۔ میں نے خط کو لکھنے کے بعد پڑھا۔ بند کیا۔ اس کی پشت پر ٹکٹ لگائے۔ اور آدمی کے ہاتھ ساڑھے تین بجے کے قریب رجسٹری کے لیے ڈاک خانہ بھیج دیا۔ اور اس کی رسید میرے پاس آ گئی یعنی جس شام کو اور جس فرنٹیر میل میں جسٹس سرشادی لال دہلی سے گزرے۔ اسی شام کو اور اسی فرنٹیر میل میں میری رجسٹری لاہور ہو گئی۔ سرشادی لال آٹھ نو بجے کے قریب پہنچے اور دوپہر کو بارہ بجے کے قریب یہ رجسٹری خط ان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

جسٹس سرشادی لال نے اگلے روز چیف جسٹس کے عہدہ کا چارج مسٹر ایلن براڈوے سے لے لیا چارج لینے کے بعد آپ نے ڈپٹی رجسٹرار (جو انگریز تھا اور جو مقدمات کو عدالتوں کے سپرد اور تبدیل کرنے کا ذمہ دار تھا) میں اس ڈپٹی رجسٹرار کا نام بھول گیا ہوں کو اپنے پاس بلایا اور اس مقدمہ کے متعلق عدالت کی تبدیلی

Marfat.com

کے واقعات دریافت کیے۔ ڈپٹی رجسٹرار نے تمام حالات لینی یہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں لگا اور بعد میں سر ایلین کے حکم سے سر ایلین براڈوے کی عدالت میں گیا، وغیرہ بتائے۔ یہ واقعات سننے کے بعد سر شادی لال نے حکم دیا۔ کہ مسل ان کے پاس بھیجی جائے۔ وہ مسل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر شادی لال تین روز تک مسل کو دیکھتے رہے اور دیکھنے کے بعد مسل پر حکم لکھا۔ کہ مقدمہ سر ایلین براڈوے کی عدالت سے پھر جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت میں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ مسل بخشی ٹیک چند کی عدالت میں بھیج دی گئی۔

مقدمہ کی پیشی سے دو روز پہلے میں مسٹر نوکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ لاہور پہنچ گئے۔ امپیریل ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ مسٹر پٹ مین سے ملے تو مسٹر پٹ مین نے کہا۔ کہ ان کو علم نہ تھا۔ کہ مسل ایک ہزار صفحہ سے زیادہ ضخیم ہے۔ اور اس کا معائنہ کرتے ہوئے ان کے سات روز صرف ہوئے۔ اگر یہ معلوم ہوتا۔ کہ مسل اس قدر ضخیم ہے اور اتنی محنت کرنی پڑے گی۔ تو آپ کم از کم پانچ ہزار روپیہ محنتانہ طلب کرتے۔ کہاں پانچسو اور کہاں پانچ ہزار۔ ہم حیران تھے۔ کہ ان کے اس اعتراض کا کیا جواب دیا جائے۔ ایڈیٹر "ریاست" اپنی تمام زندگی وکیلوں اور ڈاکٹروں کے متعلق بہت محتاط رہا ہے۔ اور ہمیشہ یہ خیال رکھا۔ کہ ان کو غیر مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ اور چاہے کتنے گہرے تعلقات ہوں۔ ان کو ہمیشہ فیس دی۔ (سوائے مسٹر نوکلی کے جو فیس قبول نہیں کرتے اور کرتے ہیں تو کبھی وہ بھی برائے نام۔ اور اگر کوئی ڈگری ہو تو اپنے پاس سے اس ڈگری کا روپیہ بھی ادا کر دیتے ہیں چنانچہ اب بھی ان کا میرے ذمہ ڈیڑھ ہزار روپیہ کے قریب باقی ہے۔ جو آپ نے ایک عدالت میں میری جگہ ادا کیا۔ خدا کرے کہ میں یہ روپیہ ان کو جلدی واپس کر سکوں۔ گو نہ صرف انہوں نے کبھی تقاضا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ روپیہ وہ نہ لیں گے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں۔ کہ نہیں میں لازمی طور سے واپس کروں گا) مجھے خیال آیا۔ کہ مسٹر پٹ مین پانچسو روپیہ فیس سے مطمئن نہیں۔ شاید ہمارے مقدمہ میں دلچسپی نہ لیں۔ تو ہین عدالت کی کارروائی بھی ہو گی۔ نہ معلوم کہ عدالت میں کیا حالات ہوں۔ پانچ سو روپیہ دے چکے ہیں۔ ان کو اور فیس جو طلب کریں نذر کی جائے۔ چنانچہ ایڈیٹر "ریاست" نے کہا۔ کہ آپ اور کم از کم کیا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ نذر کیا جائے۔ مسٹر پٹ مین بہت بلند انسان تھے۔ آپ کا کیریکٹر ملاحظہ ہو۔ آپ نے فرمایا:

"دیوان سنگھ! یہ سوال زبان اور کیریکٹر کا ہے۔ میری غلطی تھی۔ کہ میں نے مسل کو دیکھے بغیر آپ سے پانچسو روپیہ فیس طلب کی۔ اب جب کہ میں اس فیس میں مقدمہ لے چکا ہوں تو میرا ایمان ہے کہ میں لالچ نہ کروں۔ اور اس فیس میں ہی پوری محنت اور کوشش سے تیاری کروں۔ آپ اب اگر ایک لاکھ روپیہ بھی مجھے دیں تو میں اس میں سے ایک پیسہ نہ لوں گا"

کیسے بلند کیریکٹر لوگ تھے۔ مسٹر پٹ مین کا انتقال ہو چکا ہے اور اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر جب ان کا خیال آتا ہے تو عزت و احترام کے ساتھ دل کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ مسٹر پٹ مین نے کوئی مزید فیس قبول نہ کی۔

مسٹر پٹ مین سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ رجسٹرار کے دفتر میں گئے تاکہ معلوم کریں کہ میرے اس خط کا کیا نتیجہ ہوا۔ جو میں نے سر شادی لال کو بذریعہ رجسٹری بھیجا تھا۔ وہاں کے کلرکوں سے معلوم ہوا۔ کہ

Marfat.com

چیف جسٹس سر شادی لال نے مسل طلب کی۔ تین روز تک مسل کا معائنہ کرتے رہے اور حکم دیا۔ کہ مقدمہ پھر جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جائے۔ یہ سن کر ہم مطمئن ہوگئے اور مسٹر پٹ مین کو اطلاع دی کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہوگا۔

تیسرے روز پیشی تھی۔ بھوپال والوں کو یا مسٹر کارڈن نوڈ کو مقدمہ کی اس تبدیلی کا کوئی علم نہ تھا۔ نو بجے کے قریب ہم لوگ ہائی کورٹ پہنچے۔ رجسٹرار کے دفتر کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ کہ بھوپال کے انسپکٹر جنرل پولیس خواجہ محمد اکرم اپنی پوری وردی کے ساتھ۔ خان بہادر عبدالرحمن ترکی ٹوپی اور سوٹ پہنے ہوئے اور مسٹر کارڈن نوڈ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے۔ اس لمحہ تک ان بیچاروں کو نہ تو میرے اس خط کا علم تھا جو میں نے سر شادی لال کو لکھا اور نہ یہ خبر تھی۔ کہ حالات چوپٹ ہو چکے ہیں اور مقدمہ چیف جسٹس کے حکم سے سر ایلین کی عدالت سے بخشی ٹیک چند کی عدالت میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہائی کورٹ کے وکیلوں کا قاعدہ ہے کہ وہ جب ہائی کورٹ میں پہنچتے ہیں تو ایک چکر رجسٹرار کے دفتر کا ضرور لگاتے ہیں۔ تاکہ مقدمہ کے حالات معلوم کر سکیں۔ یہ لوگ بھی رجسٹرار کے دفتر میں گئے۔ تو ان کو معلوم ہوا۔ کہ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہوگا۔ مسٹر کارڈن نوڈ بہت تیز طبیعت کے انگریز تھے۔ آپ بہت غصہ میں آئے فوراً سر ایلین براڈوے کی عدالت میں پہنچے۔ سر ایلین ابھی تک عدالت میں نہ آئے تھے۔ اپنے پرائیویٹ چیمبر میں تشریف رکھتے تھے۔ ان سے ملے اور کہا۔ کہ اس طرح مقدمہ آپ کی عدالت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سر ایلین کے لیے بھی یہ خبر خلاف توقع تھی۔ کیونکہ دس بجے ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہونا تھا اور وہ مقدمہ سننے کی تیاریاں فرما چکے تھے۔ آپ پر بھی بہت جوش اور غصہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ ڈپٹی رجسٹرار کو طلب فرمایا۔ حالات پوچھے۔ اور حالات پوچھنے کے بعد آپ نے ڈپٹی رجسٹرار کو سر شادی لال کے پاس یہ کہلوا کر بھیجا۔ کہ سر ایلین نے یہ مقدمہ بطور چیف جسٹس اپنی عدالت میں منتقل کیا ہے۔ سر شادی لال کو حق حاصل نہیں کہ وہ اس مقدمہ کو ان کی عدالت سے منتقل کریں اور مقدمہ کا پھر جسٹس بخشی ٹیک چند کی عدالت میں جانا سر ایلین کی توہین ہے۔ ڈپٹی رجسٹرار یہ پیغام لے کر چیف جسٹس سر شادی لال کے پرائیویٹ چیمبر میں پہنچے۔ پیغام دیا تو سر شادی لال نے ڈپٹی رجسٹرار کی معرفت سر ایلین کو جواب بھیجا۔ کہ اگر بطور چیف جسٹس سر ایلین یہ مقدمہ اپنی عدالت میں لے گئے ہیں تو میں اب بطور چیف جسٹس ہی پھر حکم دیتا ہوں کہ یہ مقدمہ سر ایلین کی عدالت میں نہ رہے اس کی سماعت بخشی ٹیک چند کی عدالت میں ہو اور یہ سر ایلین کے فائدہ کے لیے ہے۔ کہ وہ اس مقدمہ کو نہ سنیں۔ ورنہ دیوان سنگھ سر ایلین کی عدالت میں کہے گا۔ کہ اسے اس عدالت سے انصاف کی امید نہیں۔ اور مقدمہ اس طرح بخشی ٹیک چند کی عدالت سے تبدیل کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ سر ایلین براڈوے اور لاہور ہائی کورٹ دونوں کی تمام ہندوستان کے اخبارات اور پبلک میں مٹی پلید ہوگی۔

سر شادی لال کا یہ جواب سن کر سر ایلین براڈوے کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ مقدمہ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں رہا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد ہم لوگ بخشی ٹیک چند کی عدالت میں پہنچے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ نواب بھوپال کی طرف سے مسٹر کارڈن نوڈ۔ خان بہادر عبدالرحمن وغیرہ وکیل تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کی طرف مسٹر پٹ مین سردار بہادر بھگوان سنگھ اور مسٹر توکل۔ تین روز بحث ہوئی۔ تین روز کی کارروائی کے بعد جسٹس بخشی ٹیک چند نے ایڈیٹر ریاست

Marfat.com

کی نگرانی منظور کرتے ہوئے مسٹر ایسیر کا وہ فیصلہ بحال رکھا جس میں مسٹر ایسیر نے لکھا تھا کہ مقدمہ جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔ اور نواب بھوپال کے نمائندوں نے نواب بھوپال کی طرف سے دیوان سنگھ کو نقصان پہنچانے اور اخبار "ریاست" کو کچلنے کے لیے مقدمہ کی سازش کی اور جعلی دستاویز عدالت میں پیش کیں۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور مصنف نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ:

"کامیاب لوگوں کی زندگی دنیا میں قمار بازی کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انتہائی نفع اور انتہائی نقصان دونوں ممکن ہیں۔"

انگریزی کے اس مصنف کے قول کے مطابق ایڈیٹر "ریاست" کی تو تمام زندگی ہی قمار بازی میں گزری۔ چاہے یہ سیاسی تھی یا عدالتی۔ اور اس قمار بازی میں قدم قدم پر خطرہ کو لبیک کہا۔ اس سے فائدے بھی پہنچے اور نقصان بھی۔ چنانچہ اگر جسٹس سر شادی لال کو خط لکھنے اور سر ایلن براڈوے کی عدالت میں عدم تعاون کرنے کے فیصلہ کی عدالتی قمار بازی نہ کی جاتی۔ اور ایڈیٹر "ریاست" خطرہ میں نہ کودتا۔ تو یہ مقدمہ بخشی سر ٹیک چند کے ہاتھوں سے فیصل نہ ہوتا۔ اور یہ سر ایلن براڈوے کی عدالت میں رہتا۔ جس کا نہ معلوم نتیجہ کیا ہوتا۔ جو لوگ دنیا میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ جگہ جگہ قمار بازی کا ثبوت دیں۔ اور اپنے لیے خطرات برداشت کریں۔ کیونکہ گو ان قمار بازیوں میں نقصان کا بھی خدشہ ہے مگر کامیابی بھی صرف قمار بازی اور خطرات کو لبیک کہنے میں ہی ہے اور وہ لوگ زندگی میں ہمیشہ ناکام و نامراد رہیں گے جو خطرات کو لبیک کہنے کی جرات نہیں رکھتے۔

گناہوں کی سزا

ایڈیٹر "ریاست" نہ تو خدا پر یقین رکھتا ہے نہ خدا سے منکر ہے اور نہ اس نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ خدا ہے یا نہیں۔ یا اس دنیا کو چلانے والا خدا ہی ہے یا کوئی اور قدرت۔ مگر وہ تین باتوں کا قائل ضرور ہے (۱) جوتش یعنی ستاروں کی گردش کا اثر انسانوں پر (۲) پچھلا اور آئندہ جنم یعنی مسئلہ تناسخ اور (۳) دعا یا بددعا کا اثر یعنی اس کے خیال، یقین اور تجربہ میں ستاروں کا اثر ہوتا ہے۔ جو جوتش کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے اس جوتش کے ذریعہ ہی انسان معلوم کر سکتا ہے کہ وہ پچھلے جنم میں کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا اور آئندہ جنم کہاں ہوگا اور دعاؤں اور بددعاؤں کا اثر بھی لازمی ہے چاہے وہ کسی صورت میں اور کب ہو۔ چنانچہ گناہوں کی سزا کے متعلق ایک واقعہ لکھتا ہوں:

مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا سابق ایڈیٹر "ہندوستان" لاہور بہت مخلص اور محبت کے بزرگ دوست نواز شخصیت تھے اور ایڈیٹر "ریاست" پر ہمیشہ کرم فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ اپنے بال بچوں کی خواہش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی دہلی آتے اور ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں چھ چھ ماہ تک قیام کرتے اور ان کے صاحب زادگان کو یہ ہمیشہ شکایت رہتی۔ کہ آپ اتنے عرصہ تک بڑھاپے میں خاندان کے ممبروں سے دور دہلی رہتے ہیں۔ جب شیدا صاحب یہاں تشریف رکھتے تو میں شام کو ہر روز ان کی موٹر میں سیر کے لیے

Marfat.com

دہلی، نئی دہلی اور قرب وجوار کی دیہاتی سڑکوں پر لے جاتا اور کبھی کبھی مہینہ میں ایک آدھ بار دو چار گھنٹہ کے لیے ہم لوگ دہلی سے دور میرٹھ وغیرہ بھی چلے جاتے۔ ایک روز شام کا وقت تھا میں شیدا صاحب، سردار بھگوان سنگھ لونگووالیہ سیکرٹری پنجاب سٹیٹس پیپلز کانفرنس، مسٹر محمد یوسف جمالی اور لالہ امیر چند کھنہ شام کو بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ یہ فیصلہ ہوا۔ کہ آج میرٹھ سیر کے لیے چلیں۔ چنانچہ ہم پانچوں کار میں میرٹھ کے لیے روانہ ہوئے۔ میرٹھ کے راستہ میں جب بڑی نہر کے دوسری طرف پہنچے تو کسی نے کہا کہ جنگل کی تازہ ہوا کا لطف لینے کے لیے تھوڑی دیر سڑک کے کنارے بیٹھا جائے۔ یہاں ایک گڑھا اور چند درخت تھے ہم نصف گھنٹہ کے قریب یہاں بیٹھے تھے۔ کہ قریب کی جھاڑی میں سے ایک خرگوش نکلا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جب اس خرگوش کو دیکھا تو اس نے دفعتاً شیدا صاحب کی لکڑی (جو کافی موٹی تھی) اٹھا کر اس خرگوش کو ماری یہ لکڑی خرگوش کے لگی اور خرگوش لنگڑاتا ہوا یا اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا یہ مر گیا۔

اس کے بعد ہم لوگ میرٹھ گئے۔ وہاں ایک کانگرسی دوست مل گئے۔ شیدا صاحب کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ اور آپ اکثر راگوں اور راگنیوں سے واقف تھے۔ ان کانگرسی دوست کے ساتھ ہم بازار گئے۔ سیر کرتے رہے اور ایک جگہ گانا سنا۔ گانا سننے کے بعد ان کانگرسی دوست کے ہاں کھانا کھایا اور رات کو گیارہ بجے کے قریب موٹر میں ہی واپس دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ سردی کا زمانہ تھا اور غالباً نومبر یا دسمبر کا مہینہ تھا۔ سڑک پر موٹروں، بیل گاڑیوں اور لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔ میں موٹر کو پینتالیس میل کی رفتار سے چلا رہا تھا۔ کیونکہ چالیس میل کا سفر تھا اور خیال تھا۔ کہ جلدی گھر پہنچ کر آرام کریں۔ موٹر تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ کہ سڑک کے بائیں طرف ایک بیل گاڑی جا رہی ہے۔ چونکہ وہ بیل گاڑی سڑک سے بائیں طرف تھی۔ میں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم نہ کی مگر جس وقت موٹر اس بیل گاڑی کے قریب پہنچی تو تیز روشنی کو دیکھ کر بیل چونک اٹھے اور وہ گاڑی چلانے والے سے بے قابو ہو کر داہنی یعنی سڑک کے درمیان کی طرف مڑے۔ اب اس وقت اگر میں موٹر کو روکتا نہیں تو موٹر سیدھی اس بیل گاڑی میں جا کر لگتی۔ چنانچہ میں نے فوراً بریکوں کو زور سے دبایا۔ موٹر بہت تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیل گاڑی تو بچ گئی مگر کار یک لخت کھڑے ہونے کے باعث سڑک سے پھسل گئی جس کو سکڈ ہونا کہتے ہیں۔ کار کو سخت دھکا لگا۔ شیدا صاحب اچھل کر زمین پر گرے اور ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میرے دماغ پر چوٹ آئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ موٹر کے دروازے ٹوٹ گئے اور ہم جا تو رہے تھے شمال سے جنوب کی طرف۔ مگر سکڈ ہونے کے باعث موٹر کا رخ شمال کی طرف ہو گیا چنانچہ لالہ امیر چند یوسف صاحب اور سردار بھگوان سنگھ نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہی موٹر کے نیچے سے نکالا۔ شیدا صاحب شدتِ درد کے باعث بہت بے چین تھے اور دیکھا گیا کہ ہم بالکل اس جگہ ہی اس وقت اس حالت میں پڑے ہیں۔ جہاں کے میرٹھ جاتے ہوئے گڑھے اور درختوں کے پاس بیٹھے تھے اور جہاں میں نے شیدا صاحب کی لکڑی کے ساتھ خرگوش کو زخمی کیا تھا ہم لوگ اس بے کسی کی حالت میں نصف گھنٹہ تک وہاں ہی رہے۔ اتنے میں میرٹھ کی طرف سے ایک موٹر آتی دکھائی دی۔ یوسف صاحب نے سڑک پر کھڑے ہو کر موٹر کو

Marfat.com

رو کنے کا اشارہ کیا۔ موٹر رک گئی۔ اس موٹر میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک صاحب مسٹر ہریش چندر تھے ان کو جب معلوم ہوا کہ میری موٹر ہے اور میں بے ہوش پڑا ہوں تو انہوں نے مجھے اپنی موٹر میں ڈالا۔ میری موٹر کے دروازے وغیرہ کو ٹوٹ گئے تھے مگر انجن درست حالت میں تھا اور موٹر چل سکتی تھی۔ شیدا صاحب کو میری موٹر میں ڈالا گیا جسے یوسف صاحب نے چلانا شروع کیا اور دونوں موٹریں آہستہ آہستہ دہلی پہنچیں شیدا صاحب کو تو موٹر سول ہسپتال میں لے گئی۔ جہاں ان کے ٹریچر کو سیٹ کیا گیا اور آپ دو ماہ کے قریب ہسپتال میں رہے۔ مجھے ہریش چندر جی میرے مکان پر لے آئے۔ مکان پر پہنچ کر مجھے چارپائی پر ڈالا گیا۔ ڈاکٹر بیری کو ٹیلیفون کیا۔ رات کو دو تین بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آئے۔ میں بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کنکشن آف برین (دماغی حادثہ) ہے میں بھی دو ماہ کے قریب چارپائی پر پڑا رہا اور علاج کراتا رہا۔ دو ماہ کے بعد ہم دونوں اچھے ہوئے۔ اس کے بعد شیدا صاحب مرحوم ہمیشہ کہا کرتے کہ بے گناہ خرگوش کو دیوان سنگھ نے میری لاٹھی سے زخمی کیا اور دونوں کو سزا ملی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر خرگوش کو زخمی کرنا یا مارنا گناہ نہیں اور یہ حادثہ بھی اتفاقاً ہوا تو اس کی وجہ کیا ہے کہ یہ حادثہ عین اس جگہ ہوا جہاں چند گھنٹے پہلے ہم لوگ بیٹھے تھے اور جس جگہ خرگوش زخمی کیا گیا تھا۔

ایڈیٹر "ریاست" کا ایمان ہے کہ ہر گناہ کی سزا ملتی ہے چاہے وہ اس جنم میں ملے یا اگلے جنم میں۔ اور فوراً ملے یا دیر میں اور چند سال یا چند ماہ کے بعد۔ مگر یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ انسانوں اور جانوروں جن میں دکھ یا سکھ محسوس کرنے کا احساس موجود ہے ان کی دعاؤں یا بد دعاؤں کا اثر نہ ہو۔ اور اگر ہم کوئی گناہ کرتے ہیں (ایڈیٹر "ریاست" کے خیال میں گناہ صرف وہ ہے جو کسی کا دل دکھانے یا کسی کا حق غصب کرنے کی ذیل میں آئے) تو اس کی سزا کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔

ریاستی رعایا اور اہلکاروں کی "وفا شعاری"

میں ریاست نابھہ میں ملازم تھا۔ دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ مہاراجہ کے دل میں نہ صرف میرے جرنلسٹ ہونے کے باعث عزت تھی۔ بلکہ وہ ایک حد تک مجھے اپنا خیر خواہ دوست بھی سمجھتے تھے۔

اس زمانہ میں مہاراجہ پر سیاسی بادلوں کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا عتاب اور مہاراجہ پٹیالہ دشمن۔ جو چاہتے تھے کہ مہاراجہ نابھہ سے انتقام لیں۔ پبلک غیر مطمئن۔ کیونکہ مہاراجہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے جھگڑوں کے باعث ریاست کی ایڈمنسٹریشن میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔ یہ تمام حالات مہاراجہ کے لیے بہت پریشانی کا باعث تھے۔ ایک روز مہاراجہ کو اطلاع ملی کہ جسٹس سٹوارٹ (جو نابھہ اور پٹیالہ کے جھگڑوں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے انبالہ میں جج مقرر ہوئے تھے۔ اسی رپورٹ پر گورنمنٹ مہاراجہ کو گدی سے معزول کرنا چاہتی ہے۔ یہ رپورٹ مہاراجہ کے لیے مزید پریشانی کا باعث ہوئی۔ مہاراجہ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری۔ نارن منسٹر، ہوم منسٹر اور دوسرے پرانے خاندانی اہلکاروں کو مشورہ کے

Marfat.com

بیلیے طلب کیا۔ ریاستوں کے یہ لوگ نالائق۔ جاہل۔ سازشی اور پرانے ٹائپ کے خوشامدی۔ سیاسی جھگڑوں کو نپٹانے کے بالکل اہل نہ تھے۔ ان میں سے جن لوگوں کی پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں سے ذاتی واقفیت تھی۔ انہوں نے تو مشورہ دیا۔ کہ پولیٹیکل ایجنٹ کے پاؤں پکڑ لیے جائیں۔ دوسرے جو تھے انہوں نے کہا کہ سرکار آپ مہاراجہ ہیں۔ خود مختار ہیں آپ کو کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹوں کی حیثیت کیا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیجئے۔ گورنمنٹ کو حوصلہ نہ ہوگا کہ وہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ یہ مشورے ہو رہے تھے کہ اتنے میں اکالی لیڈر مل اور ایک تعلیم یافتہ سادھو سنت تیجا سنگھ ایم اے (جو مہاراجہ کے دوست تھے) کو علم ہوا۔ یہ لوگ حالات معلوم کرنے کے لیے نابھ پہنچے۔ ان لوگوں نے بھی مہاراجہ کو مشورہ دیا۔ کہ گورنمنٹ کی پرواہ نہ کی جائے۔ تمام سکھ قوم آپ کے لیے مر مٹے گی۔ ان دو پارٹیوں (ایک گورنمنٹ سے صلح کرنے کے حق میں اور دوسری گورنمنٹ کی پرواہ نہ کرنے کا مشورہ دینے والی) کے درمیان مہاراجہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔ صبح گورنمنٹ سے صلح کرنے کے حق میں ہیں تو شام کو اس کے خلاف مہاراجہ کئی روز تک اس ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے۔ آخر ان تمام لوگوں پر آپ کے سابق اتالیق سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ کی رائے غالب آئی۔ کہ پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے ان کے مشورہ سے کرنل منچن ایجنٹ گورنر جنرل پنجاب سٹیٹس کو ملنے کے لیے خط لکھا گیا۔ کرنل منچن اس وقت کسولی میں مقیم تھے۔ ان کا جواب آیا۔ کہ فلاں دن کسولی میں مل سکتے ہو۔ اس جواب کے آنے کے بعد اکالی لیڈروں کا مشورہ پھر غالب آ گیا۔ مہاراجہ نے پھر چاہا۔ کہ وہ کرنل منچن سے نہ ملیں۔ اس کے بعد بھائی کاہن سنگھ نے پھر کہا۔ کہ ملنے کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد کرنل منچن سے نہ ملنا زیادہ نقصان کا باعث ہوگا۔ مہاراجہ نے پھر اپنا خیال بدل لیا۔ آخر ملاقات کے لیے مہاراجہ مع اپنے پرائیویٹ سیکرٹری و چند اہلکاروں کے موٹر میں کسولی تشریف لے گئے۔ کسولی جب پہنچے اور ملاقات ہوئی۔ تو کرنل منچن نے بغیر کچھ سنے سب سے پہلے مہاراجہ سے کہا۔ کہ آپ بطور ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب مہاراجہ کو مطلع کرتے ہیں۔ کہ یا تو گدی سے خود بخود دست بردار ہو جاؤ۔ ریاست نابھہ ہی نہیں بلکہ پنجاب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو اور معزولی کے زمانہ میں آپ کو ریاست نابھہ کے مالیانہ کا دس فیصدی بطور الاؤنس ملے گا اور اگر یہ شرائط منظور نہیں تو کھلی عدالت میں معمولی ملزموں کی طرح مقدمہ چلانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس عدالت میں آپ کے جو جرائم ثابت ہوں گے۔ ان کی آپ کو معمولی ملزموں کی طرح سزا دی جائے گی۔ چاہے وہ قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہی کیوں نہ ہو۔ مہاراجہ نابھہ اس وقت تک حالات کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کو خیال بھی نہ تھا۔ کہ ایجنٹ گورنر جنرل یہ کہے گا۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل کے اس نوٹس پر بھی آپ نے یہی سمجھا۔ کہ کرنل منچن صرف دھمکی دے رہے ہیں اور خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں ورنہ گورنمنٹ ایسا نہ کرے گی۔ مہاراجہ نے جواب دیا۔ کہ آپ کے لیے ایسا کہنا مناسب نہیں۔ میں تو آپ کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے لیے ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ کرنل منچن نے کہا۔ کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں گورنمنٹ کی اتھارٹی سے کہہ رہے ہیں۔ مذاق نہیں کر رہے۔ اگر آپ چاہو تو سر جان تھامپسن پولیٹیکل سیکرٹری

Marfat.com

سے ٹیلی فون پر بات کرلو۔ چنانچہ کسولی سے سرجان تھامپسن کا شملہ میں ٹیلی فون نمبر ملایا گیا۔ اور سرجان سے بات ہوئی تو سرجان نے کہا۔ کہ کرنل منچن جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے کے حکم کے مطابق کہہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہیں۔ سرجان تھامپسن سے ٹیلی فون کرنے کے بعد مہاراجہ کو یقین ہوا۔ کہ حالات بدل چکے ہیں اور تباہی بالکل قریب ہے۔ چنانچہ مہاراجہ کے دماغ پر اس گفتگو کا بہت برا اثر ہوا اور نابھہ واپس آتے ہوئے ہمراہی اہل کاروں نے محسوس کیا۔ کہ مہاراجہ اپنے دماغی توازن سے محروم ہو چکے ہیں۔

نابھہ پہنچنے کے بعد شہر میں ماتمی گھٹائیں چھا گئیں۔ چاروں طرف حسرت برس رہی تھی۔ اہل کاروں کے پھر مشورے شروع ہوئے۔ کچھ لوگ اس بات کے حق میں کہ دست برداری کو لبیک کہا جائے۔ کچھ لوگ یہ چاہتے کہ گورنمنٹ کی پروا نہ کی جائے۔ چنانچہ کسولی جانے سے پہلے تو مہاراجہ کی رائے دن میں دو بار بدلتی تھی۔ یعنی صبح کچھ اور شام کچھ۔ اب ایک ایک گھنٹہ کے بعد بدلنی شروع ہوئی۔ یعنی اگر مہاراجہ اب دستبرداری کے لیے تیار ہیں تو ایک گھنٹہ کے بعد اس کے خلاف اور مقدمہ چلوانے کے حق میں۔ اور پھر ایک آدھ گھنٹہ کے بعد دست برداری کے لیے تیار۔ کرنل منچن نے جواب کے لیے چند یوم کی مہلت دی تھی۔ مہاراجہ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ یہ میعاد ختم ہو رہی تھی۔ ریمائنڈر آنے شروع ہوئے۔ تو آخر کرنل منچن کو خط لکھا گیا۔ جس میں مہاراجہ نے شرائط قبول کر لیں۔ یہ خط مہاراجہ کے انگریز موٹر گیرج سپرنٹنڈنٹ مسٹر اوگریڈی ممبر پارلیمنٹ کے بھائی تھے ان کو دیا گیا۔ کہ وہ موٹر میں کسولی جا کر کرنل منچن کو دیں۔ مسٹر اوگریڈی شام کو نابھہ سے روانہ ہونے کے بعد مہاراجہ کے خیال میں پھر تبدیلی پیدا ہوئی۔ چنانچہ رات کو ایک تیز رفتار موٹر میں دو اہلکار انبالہ چھاؤنی بھیجے گئے کہ وہ اوگریڈی کو مع خط واپس لے آئیں۔ یہ لوگ انبالہ چھاؤنی پہنچے۔ اور اوگریڈی سے ہوٹل میں ملے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ اوگریڈی کو واپس آنے کے لیے کہتے۔ انہوں نے اوگریڈی سے کہا۔ کہ کسولی جلدی چلے جاؤ۔ تاکہ تم کو واپس لانے کے لیے کوئی اور شخص نہ آ جائے۔ اوگریڈی صبح سورج نکلنے سے پہلے انبالہ چھاؤنی سے چلا۔ تین چار گھنٹہ میں کسولی پہنچ گیا۔ اور اس نے مہاراجہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دست برداری کا اقرار نامہ کرنل منچن کے حوالہ کر دیا۔ کرنل منچن نابھہ کے لمحہ لمحہ کے حالات سے واقف تھے اور مہاراجہ کے بعض معتمد ترین اہلکاران کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ وہ اس خط کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے۔ خط کے پہنچتے ہی انہوں نے انبالہ چھاؤنی کے فوجی افسروں سے فوج تیار کرنے کے لیے ٹیلی فون پر کہا۔ شملہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو ٹیلی فون کر کے مسٹر اوگلوی جو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈیفنس سیکرٹری تھے ان کو انبالہ بھیجنے کے لیے کہا۔ انبالہ پہنچنے کے بعد کرنل منچن مع مسٹر اوگلوی اور گورکھا انگریزی پلٹن کے پٹیالہ پہنچے۔ وہاں تھوڑی دیر قیام کیا اور مشورے ہوئے اور یہ تمام قافلہ رات کو چار بجے نابھہ پہنچ گیا۔ نابھہ پہنچنے کے بعد گورکھا اور انگریزی پلٹن شہر کے دروازوں پر، قلعہ پر، خزانہ پر، بارود خانہ پر، نابھہ کی ریاستی پلٹن کی بارکوں پر اور ہیرا محل (جہاں مہاراجہ رہتے تھے) کے ارد گرد تعینات کر دی گئی۔ کیونکہ کرنل منچن کو مہاراجہ نابھہ کے بعض غدار اہل کاروں نے اطلاع دی تھی کہ

Marfat.com

اکالی بہت بڑی تعداد میں مقابلہ کے لیے نابھہ پہنچ چکے ہیں۔ جگہ جگہ انگریزی اور گورکھا فوج مقرر کرنے کے بعد کرنل منچن مع مسٹر او گلوی اور ایک فوجی افسر ہیرا محل کے باہر کے پھاٹک پر گئے اور پہرہ والے سپاہی سے کہا کہ آپ پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔ مہاراجہ سے ملنے کے لیے محل میں جانا چاہتے ہیں۔ پہرہ والے نے جواب دیا۔ کہ جب تک مہاراجہ کا حکم نہ ہو وہ اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ چنانچہ اس پہرہ والے نے محل کے اندر سے مہاراجہ کے لئے ڈی سی ڈاکٹر وریام سنگھ کو بلایا۔ اسے ڈی سی مہاراجہ کے پاس گیا۔ اور اطلاع ملی کہ کرنل منچن آئے ہیں۔ مہاراجہ نے کہا لے آؤ۔ کرنل منچن مہاراجہ کے پاس پہنچے۔ تو آپ نے مہاراجہ سے کہا۔ کہ نابھہ چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائیے۔

میں اس روز صبح چھ بجے کے قریب اپنے مکان پر ضروریات سے فارغ ہوا ہی تھا۔ کہ ایک آدمی جو میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ شہر کے دروازوں پر انگریزی فوج کا پہرہ ہے اور شہر میں بھی گورکھا فوج بندوقوں کے ساتھ گشت لگا رہی ہے۔ یہ خبر میرے لیے بالکل خلاف توقع تھی۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور حالات معلوم کرنے کے لیے بازار میں گیا تو دیکھا کہ جگہ جگہ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں اور تعجب و پریشانی کی حالت میں ہیں۔ میں سوچتا تھا۔ کہ اصل حالات کا کس سے پتہ لوں۔ ایک دوست کے ہاں گیا تو وہاں معلوم ہوا۔ کہ کرنل منچن آٹھ بجے قلعہ میں ایک شاہی دربار کر رہے ہیں۔ جہاں گورنمنٹ کا اعلان سنایا جائے گا اور حکم دیا گیا ہے۔ کہ ہر سرکاری ملازم اس دربار میں موجود ہو اور ہیرا محل میں کسی شخص کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ میں پریشان تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اپنے مکان پر واپس آیا۔ اتنے میں ایک بنگالی دوست مسٹر ہری پرشاد سور دجو نابھہ سیکرٹریٹ میں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے) آئے وہ بھی پریشان تھے انہوں نے پوچھا۔ کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے کہا۔ کہ جہاں ملاح تباہ ہوا وہاں کشتی کی سواریاں بھی غرق ہوں گی۔ مہاراجہ کی ذاتی دوستی اور مہربانی کے باعث ہم لوگ یہاں تھے۔ اب یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک دو اور دوست آئے۔ چونکہ حکم تھا اس لیے ہم لوگ قلعہ میں پہنچے۔ وہاں ریاست کے تمام ملازم جمع ہو رہے تھے۔ اور دربار ہال میں کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ہر شخص کا چہرہ اداس اور اترا ہوا تھا۔ کرنل منچن مسٹر اوگلوی کے ساتھ دربار میں آئے۔ درباری کرسی پر بیٹھے تو آپ نے بیٹھتے ہی فوراً اعلان کیا۔ کہ مہاراجہ نابھہ گدی سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ کوئی شخص آئندہ مہاراجہ کو ریاست کا حکمران نہ سمجھے۔ اور جو شخص آئندہ مہاراجہ کا وفا شعار ہو گا یا ان کے ساتھ تعلق رکھے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس دربار میں ہی اہل کاروں سے پتہ چلا کہ مہاراجہ نو بجے کے قریب ہیرا محل سے بذریعہ موٹر ہمیشہ کے لیے نابھہ سے روانہ ہو جائیں گے۔

قلعہ سے نکلنے کے بعد میں پریشان تھا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص ہیرا محل جا نہیں سکتا۔ میں مہاراجہ نابھہ کے صرف ذاتی تعلقات کے باعث نابھہ میں آیا اور ملازم ہوا۔ میرا سوائے مہاراجہ کے کسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مہاراجہ اس حالت میں جلاوطن کیے جا رہے ہیں۔ کس قدر کمینہ پن اور فرض ناشناسی ہو گی۔ کہ میں ان کی روانگی کے وقت بطور ہمدردی ہیرا محل بھی نہ جاؤں۔ میں قلعہ سے اپنے گھر کو چلا جا رہا تھا اور میرا ذہن ان خیالات میں غرق اور پولیٹیکل ایجنٹ کے حکم اور مہاراجہ

Marfat.com

کو الوداع کہنے کی فرض شناسی کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ میں اس پریشانی اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے مکان کے قریب (جو ہیرا محل کے راستہ میں تھا) پہنچا تو میرے پاؤں نے گھر کی طرف چلنے سے انکار کر دیا۔ میں سیدھا ہیرا محل کو جانے کے لیے مجبور ہو گیا۔ ہیرا محل کے باہر کے پھاٹک پر پہنچا تو پہرہ والے نے پہلے تو بندوق پر ہاتھ رکھ کر حسب دستور سلیوٹ کیا (ریاست میں دستور تھا۔ کہ پہرہ والے ہر اہلکار اور بڑی تنخواہ کے ملازم کو سلیوٹ کرتے تھے) پھر کہا۔ کہ اندر جانے کی اجازت نہیں میں نے کہا۔ میں ضروری کام کے لیے جا رہا ہوں اور مجھے محل میں سے آدمی بھیج کر طلب کیا گیا ہے۔ میرے اس جواب پر پہرہ والے نے مجھے اجازت دے دی۔ میں اندر چلا گیا۔ تمام محل اداسی اور حسرت کا مرکز تھا۔ ہر شخص غمزدہ اور مستقبل سے ناآشنا جیسے کشتی بھنور میں ہو اور نہ کہا جا سکتا ہو کہ نتیجہ کیا ہو گا۔ ہیرا محل کے نیچے مہارانی کے بڑے بھائی سردار بلبیر سنگھ، سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری، مہاراجہ کے ٹائپسٹ بابو فتح سنگھ اور مہاراجہ کے کچھ ذاتی ملازم کھڑے تھے۔ میں بھی غمزدہ حالت میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے پہلے کرنل منچن اور مسٹر اوگلوی وغیرہ محل کے اوپر مہاراجہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ مجھے وہاں پہنچے پندرہ بیس منٹ ہونے ہوں گے کہ اوپر سے پہلے مہارانی اور بچے اور بعد میں مہاراجہ کرنل منچن اور مسٹر اوگلوی وغیرہ انگریزوں کے ساتھ نیچے اترے۔ دو رولز رائس موٹر گاڑیاں تیار تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی اور دوسری سفید۔ پہلے مہارانی اور بچے اترے۔ جو سفید رنگ کی گاڑی میں سوار ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ سیاہ رنگ کی گاڑی میں سوار ہوئے تو کرنل منچن نے ایک انگریز انسپکٹر پولیس کو جو انبالہ سے ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ مہاراجہ والی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ انگریز انسپکٹر موٹر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور یہ گاڑی بھی مہارانی والی گاڑی کے بعد روانہ ہو گئی۔ یہ منظر کس قدر دردناک تھا۔ نابھہ کا حکمران اپنی ریاست کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جلاوطن ہو رہا ہے مگر اس کے سینکڑوں خاندانی اہلکاروں۔ بڑی بڑی تنخواہ پانے والوں ملازموں، وزراء اور ساتھ مرمٹنے کا دم بھرنے والے نمک خواروں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کو الوداع کہنے کے لیے ہیرا محل پہنچتا۔ یا کم از کم راستہ میں سڑک پر ہی الوداع کہتا۔

مہاراجہ کے جانے کے بعد ہیرا محل کے ملازموں سے جو حالات معلوم ہوئے۔ ان میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ مہاراجہ جب کسولی سے واپس آئے اور ان کو معزولی کا یقین ہو چکا تو آپ نے اپنی نجی تمام فائلیں اپنے دوستوں کے تمام پچھلے خطوط اور راز کے تمام کاغذات الماریوں کو خالی کر کے ہیرا محل کی سب سے اوپر کی چھت پر منگائے اور ان کو آگ لگا دی۔ ان کاغذات کے ضائع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ چلے جائیں۔ کیونکہ مہاراجہ انتہائی نیشنلسٹ تھے۔ اور ان کاغذات میں خط و کتابت کی وہ تمام فائلیں تھیں جو ہندوستان کے نیشنلسٹ لیڈروں کے ساتھ مختلف موضوع پر آپ کے ساتھ ہوئی۔ کاغذات کا یہ ڈھیر پندرہ بیس من ہو گا۔ جب یہ ڈھیر جل کر خاک ہو گیا اور اس کی راکھ کو اٹھایا جا رہا تھا۔ تو اس میں سے سونے کے کئی ہزار پاؤنڈ یعنی گنیاں ملیں۔ ان گنیوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ ان کاغذات میں کئی لاکھ روپیہ کے کرنسی نوٹ بھی جل گئے۔ اور یہ گنیاں اور نوٹ تک نابھہ (موجودہ مہاراجہ

Marfat.com

نابھہ) کے پیدا ہونے پر رعایا کے لوگوں اور مہاراجہ کے دوستوں نے تمام ہندوستان سے بطور نذر بھیجے تھے اور مہاراجہ نے ان کو اس طرح ہی لفافوں کے اندر خطوط کے ساتھ بطور یادگار رکھ دیا تھا۔

مہاراجہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد اب میرے سامنے سوال یہ تھا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے مہاراجہ کے ملازموں اور اہل کاروں میں نوے فی صدی لوگ مہاراجہ کے دشمن ہو گئے۔ ان میں ہر شخص اس کوشش میں تھا۔ کہ وہ مہاراجہ کے بعد مہاراجہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ غداری کرے تاکہ انگریز ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی کا منظورِ نظر ہو۔ پانچ چھ روز ان انقلابات کو دیکھتا رہا اور حیران تھا۔ کہ وہ لوگ جو ایک ہفتہ پہلے مہاراجہ کے خوشامدی تھے۔ آج سب سے بڑے دشمن ہو رہے ہیں۔ کسی کا نہ کوئی ضمیر ہے نہ ایمان چند لوگ جو مہاراجہ کے فی الحقیقت وفا شعار تھے گھروں میں خاموش بیٹھ گئے۔ میرے لیے نابھہ میں رہنا کیونکر مناسب یا ممکن تھا۔ جب کہ میں صرف مہاراجہ کے باعث نابھہ میں آیا اور اب مہاراجہ ہی جلاوطن ہو گئے سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اب کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ نابھہ سے چلا جاؤں۔ سب سے پہلے ڈیرہ دون پہنچوں۔ مہاراجہ مصیبت میں ہیں۔ اگر میری ان کو ضرورت ہو اور میں ان کے لیے مفید ہو سکوں۔ تو ان کے پاس رہوں ورنہ لاہور جا کر کسی اخبار میں ملازمت اختیار کر لوں۔ اپنی روانگی کے دن میں دوستوں سے ملنے کے لیے گیا۔ دوستوں سے ملنے کے بعد سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ (جو مہاراجہ کے اتالیق رہ چکے تھے سکھوں میں بڑی پوزیشن کے لیڈر کئی کتابوں کے مصنف اور ادبی ذوق کے بزرگ تھے) سے بھی ملنے کے لیے گیا۔ بھائی صاحب مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ میں آج رات جا رہا ہوں اس لیے ملنے آیا۔ پھر نہ معلوم زندگی میں ملنے کا کب اتفاق ہو۔ بھائی صاحب نے پوچھا۔ کہاں جاؤ گے میں نے کہا۔ شاید لاہور کے کسی اخبار میں ملازمت اختیار کر دوں۔ بھائی صاحب نے مشورہ دیا کہ میں جاؤں تو استعفیٰ دے کر۔ بغیر استعفیٰ نہ جاؤں۔ تاکہ جانے کے بعد کوئی کارروائی میرے خلاف نہ ہو سکے۔ بھائی کاہن سنگھ بہت اچھے سیاست دان تھے۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا۔ گھر پر آیا۔ فل سکیپ کے کاغذ پر استعفیٰ لکھا اور استعفیٰ لے کر شام کو مسٹر اوگلوی کے پاس پہنچا۔ مسٹر اوگلوی اس وقت دوسرے انگریزوں کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب میں پہنچا تو وہ موٹر میں سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے باہر جانے والے تھے۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ مجھے اندر بلا لیا۔ میں نے جاتے ہی ان کو استعفیٰ دیا۔ انہوں نے پوچھا۔ ملازمت کیوں چھوڑتے ہو۔ میں نے کہا۔ میں یہاں صرف مہاراجہ کے ذاتی تعلقات کے باعث آیا تھا۔ اب مہاراجہ یہاں سے چلے گئے میرا یہاں کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ کسی سے میرا واسطہ ہے مسٹر اوگلوی نے کہا۔ کہ نہیں نابھہ ریاست کو اب اچھے اور لائق ملازموں کی ضرورت ہے۔ میں استعفیٰ نہ دوں میں نے کہا۔ کہ میں مہاراجہ کے جانے کے بعد ملازمت کرنا غیرت اور حمیت کے خلاف اور ذلت سمجھتا ہوں اس لیے میرا استعفیٰ منظور کر لیا جائے۔ مسٹر اوگلوی نے مجھے پھر سمجھایا اور جب میں نہ مانا تو آپ نے میرا استعفیٰ رکھ لیا اور کہا کہ دو ہفتہ کی رخصت منظور کی جاتی ہے۔ دو ہفتہ کے بعد اگر آپ چاہیں گے تو آپ کا استعفیٰ منظور کر لیا جائے گا۔ رخصت کی اس منظوری کے بعد میں واپس گھر آیا۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ سامان بہت کافی تھا۔

Marfat.com

مجھے یہی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ سامان کہاں لے جانا۔ ضروری اور مختصر سا سامان اپنے ساتھ لیا۔ باقی سامان اسی مکان میں بند کر کے ایک دوست پنڈت ویو نانک کے سپرد کیا اور رات کی گاڑی پر سوار ہو کر اگلے روز ڈیرہ دون مہاراجہ کے پاس پہنچا۔ مہاراجہ سے ملا اور کہا کہ اگر آپ کو میری ضرورت ہو اور میں مفید ہو سکوں تو تنخواہ کا کوئی سوال نہیں۔ بغیر تنخواہ جب تک آپ چاہیں میں آپ کے پاس رہوں گا۔ اور اگر آپ میرا یہاں رہنا مناسب نہ سمجھیں تو میں لاہور چلا جاتا ہوں وہاں کسی اخبار میں ملازمت اختیار کر لوں گا۔ مہاراجہ نے کہا کہ اس معزولی کے خلاف اکالی ایجی ٹیشن شروع ہو چکی ہے اگر میں مہاراجہ کے پاس رہا تو گورنمنٹ شاید یہ خیال کرے کہ اکالیوں اور مہاراجہ کے درمیان میں ایجی ٹیشن پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہوں۔ اس لیے دو تین ماہ کے لیے اپنے گھر چلا جاؤں اور دو تین ماہ کے بعد ڈیرہ دون آ کر پھر مہاراجہ کے پاس رہوں۔ اس پروگرام کے فیصلہ کے بعد مہاراجہ نے مجھے نظام دکن کے پاس ایک ضروری پیغام دے کر حیدر آباد بھیجا۔ وہاں میں مہاراجہ کے خسر میجر سردار پریم سنگھ (جو وہاں نظام گورنمنٹ کے ملٹری سیکرٹری تھے) سے ملا۔ دو تین روز وہاں رہا۔ نظام دکن سے کیا توقع تھی وہ خود سہمے بیٹھے تھے۔ واپس ڈیرہ دون پہنچا۔ دو تین روز وہاں رہا۔ اور پہلے نابھہ جانے وہاں سے گھر کا سامان مال گاڑی میں اپنے وطن حافظ آباد بھجوانے اور پھر خود اپنے وطن چلے جانے کا پروگرام تیار کر لیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ میں نابھہ نہ جاؤں۔ شاید وہاں گرفتاری ہو جائے۔ میں نے کہا کہ میری گرفتاری کیونکر ممکن ہے۔ جب کہ میرا کسی معاملہ سے تعلق ہی نہ تھا۔ مہاراجہ کے کہنے کا میں نے خیال نہ کیا۔ ڈیرہ دون سے سوار ہو کر صبح نابھہ پہنچا۔ مکان پر گیا۔ صبح دو تین آدمی لگا کر سامان بندھوانا شروع کیا۔ اس عرصہ میں جوں جوں دوستوں کو میرے آنے کا علم ہوا وہ ملنے کے لیے آتے رہے۔ نو بجے کے قریب سردار گوردیال سنگھ (جو مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے اور برٹش ایڈمنسٹریشن کے زمانہ میں وہاں ہوم ممبر ہوئے) سے ملا۔ بارہ بجے کے قریب دوسرے دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ کہ نیچے باہر سے کسی نے آواز دی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نیچے سپرنٹنڈنٹ پولیس مع دو سب انسپکٹروں اور کئی کانسٹیبلوں کے موجود ہیں مجھے نیچے آنے کے لیے کہا۔ میں نیچے گیا تو انہوں نے بتایا تو انہوں نے بتایا کہ میں ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہوں۔ گرفتار کرنے کے بعد یہ لوگ مجھے لے گئے۔ کئی ماہ بغیر مقدمہ قید رکھا گیا۔ میرے دوستوں نے وائسرائے پر اپنا اثر استعمال کیا اور آخر وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے حکم سے بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

ان حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ریاستوں کی رعایا اور وہاں کے سرکاری ملازم اور اہلکار چونکہ شخصی حکومت کے باعث مطمئن نہیں تھے۔ ان لوگوں کو والیانِ ریاست کے ہمدرد و جاں نثار کہنا ایک غلطی تھا۔

Marfat.com

خودکشی کرنا بزدلی نہیں

حیدر آباد (دکن) اور ڈیرہ دون سے واپس آنے کے بعد جب نابھہ میں میری گرفتاری ہوئی۔ تو پولیس مجھے وہاں کی ایک نیم سرکاری بلڈنگ سرائے شادیات میں لے گئی۔ یہ بلڈنگ کئی لاکھ روپیہ مصارف سے بنائی گئی تھی۔ اس کے لیے نصف روپیہ تو مہاراجہ نابھہ نے دیا تھا اور نصف پبلک سے چندہ کے ذریعہ جمع کیا گیا تھا۔ اس میں بہت وسیع ہال اور متعدد چھوٹے چھوٹے کاٹیج نما رہائشی کمرے ہیں جن کے ساتھ غسل خانے اور باورچی خانے بھی ہیں۔ یہ عمارت ریاست کی سرکاری اور پبلک، دونوں ضروریات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یعنی سرکار کے مہمان بھی اس میں ٹھہرتے ہیں اور پبلک میں کسی کی شادی وغیرہ ہو تو براتیں بھی اس میں قیام کرتی ہیں۔ چنانچہ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن (ممبر پارلیمنٹ) نابھہ میں ملازم تھے۔ تو اس بلڈنگ میں ہی رہتے تھے۔ مسٹر ایس رنگا آئر بھی طویل مدت تک اس میں رہے اور میں بھی جب ملازم ہوا تو شروع میں دو ماہ کے قریب اس بلڈنگ میں ہی سرکاری مہمان کے طور پر رہا تھا۔

جب میری گرفتاری ہوئی تو اس وقت لالہ نتھو رام جو انگریزی علاقہ میں سب انسپکٹر پولیس تھے اور نابھہ کے اس انقلاب کے بعد فوراً ہی ریاست نابھہ کے انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کیے گئے (جو بعد میں رائے بہادر اور دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے) کا دفتر اور رہائش بھی اس بلڈنگ میں ہی تھی۔ چنانچہ پولیس نے مجھے لالہ نتھو رام کے سامنے پیش کیا۔ تو آپ نے بتایا۔ کہ میں ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہوں۔ میں نے الزام اور دفعہ پوچھی تو جواب ملا۔ کہ کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ چنانچہ پولیس اس بلڈنگ کے کونہ کی ایک کاٹیج میں مجھے لے گئی۔ میرا بستر منگا لیا گیا اور چار کانسٹیبل اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کا پہرہ لگا دیا گیا۔ کہ نہ تو میں اس نظربندی سے باہر جاؤں اور نہ کوئی شخص مجھ سے بات چیت کر سکے۔

ریاستی پولیس کے کانسٹیبل جن کی تمام زندگی ہی غلامی میں گزری۔ شاید آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ یہ لوگ لگائے گئے تھے مجھ پر پہرہ کے لیے۔ مگر ان لوگوں کی ہمدردی میرے ساتھ تھی بجائے اس کوشش میں رہتے کہ میں خوش رہوں۔ یہ لوگ شہر میں درپردہ طور پر میرے دوستوں کے پاس میرے پیغام لے جاتے اور لاتے۔ چنانچہ اس نظربندی اور کڑی نگرانی میں ہی میرے اور مہاراجہ نابھہ کے درمیان میرا پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک آدمی مقرر کر لیا گیا جو نابھہ سے ڈیرہ دون جاتے اور ڈیرہ دون سے نابھہ آتے۔ میں مہاراجہ کو نابھہ کے تفصیل کے ساتھ تمام حالات کی اطلاعیں اس حراست یا نظربندی سے ہی بھیجتا رہتا۔ کہ نئی برٹش ایڈمنسٹریشن مہاراجہ کے خلاف کیا کچھ کر رہی ہے۔ میں اس بلڈنگ میں تین ماہ کے قریب رہا۔ پہلے چند روز مجھے ذہنی کوفت سی محسوس ہوئی۔ ایک سکھ کانسٹیبل نے رائے دی۔ کہ میں سکھمنی صاحب دگورو گرنتھ صاحب کا ایک حصہ) کا پاٹھ کروں۔ چند روز سکھمنی صاحب پڑھتا رہا مگر پاٹھ کرنے کو جی نہ چاہا۔ ایک تو اس کی وجہ یہ کہ میں نے زندگی میں نہ کبھی عبادت کی اور نہ کبھی پاٹھ کیا۔ دوسرے اصولاً بھی کسی پاٹھ، منتر یا کلام کو بار بار پڑھنا لاحاصل سمجھتا ہوں۔ وقت کو گزارنے کے لیے میں نے ہندی پڑھنا

Marfat.com

شروع کی۔ مکان پر میرے پاس ایک نہایت خوبصورت سپینئل نسل کی لمبے کانوں والی سیاہ رنگ کی کتیا تھی جس کا نام رانی تھا میری گرفتاری کے بعد یہ رانی میرے مکان کے سامنے ایک گھر میں رہتی تھی۔ میں نے کنسٹیبل بھیج کر اس کو اپنے پاس منگا لیا۔ سپینئل نسل کے کتے نظرتاً بہت محبت کرنے والے جانور ہیں۔ اس رانی کو نہلانے کھانا کھلانے اور اس کے ساتھ کھیلنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ اس کے علاوہ تاش اور کنسٹیبلوں کے ساتھ گپ بازی میں میرا وقت اچھی طرح گزرتا رہا۔

مجھے اس بلڈنگ میں نظر بند یا قید ہوئے پندرہ روز ہوئے تھے کہ مہاراجہ کا ایک نفر یعنی ذاتی ملازم بھان سنگھ گرفتار کیا گیا اور اس کو میرے کمروں کے قریب ہی اس بلڈنگ کے ایک کمرہ میں رکھا گیا میں نے پتہ لیا تو معلوم ہوا۔ کہ اس شخص نے مہاراجہ کے خلاف بہت سخت بیان دیا ہے اور اپنے بیان میں مہاراجہ کے خلاف سنگین الزامات لگائے ہیں۔ میں نے اس بھان سنگھ کے ساتھ پیغام بازی شروع کر دی اور موقعہ دیکھ کر کبھی کبھی اس سے بات بھی کر لیتا۔ کیونکہ اس کے اور میرے درمیان چند کمروں کا فاصلہ تھا میں نے ایک روز اس سے پوچھا۔ کہ آیا یہ واقعہ سچ ہے کہ تم نے مہاراجہ کے خلاف بیان دیا ہے اس نے کہا کہ ہاں دیا ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے یہ غداری کیوں کی۔ اس نے بتایا۔ کہ پولیس نے اس کو بہت پیٹا تھا چنانچہ پانچ سات روز کی گفتگو اور میرے سمجھانے کے بعد یہ اپنے بیان کی تردید کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے مہاراجہ کے نام ایک خط لکھا کہ اس نے جو بیان ایڈمنسٹریٹر کے پاس دیا ہے بے بنیاد اور غلط ہے اور اس سے یہ جھوٹا بیان جبراً لیا گیا۔ یہ خط میں نے اس سے لے کر ڈیرہ دون مہاراجہ کے پاس بھیج دیا۔

میں نے اس نظر بندی یا قید کی حالت میں لالہ نتھو رام سے کئی بار پیغام کے ذریعہ پوچھا کہ میری نظر بندی کی وجہ کیا ہے۔ کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ آخر ایک روز لالہ نتھو رام نے مجھے بلوا بھیجا۔ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے بتایا۔ کہ مجھ پر الزام یہ ہے کہ میں نے مہاراجہ نابھہ کے ساتھ مل کر مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف لغاوت کی۔ اس الزام میں مہاراجہ پٹیالہ نے میرے وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں۔ ریاست پٹیالہ ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق میرے نابھہ سے پٹیالہ بھیجے جانے کا مطالبہ کر رہی ہے اور معاملہ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب کے زیر غور ہے۔

لالہ نتھو رام کے یہ الفاظ سن کر مجھے احساس ہوا۔ کہ معاملہ معمولی نہیں جیسا کہ میں سمجھتا تھا۔ اگر پٹیالہ کے حوالہ کیا گیا تو زندگی میں پٹیالہ کے جیل سے نکلنا ممکن نہ ہو گا اور چونکہ مہاراجہ پٹیالہ میرے دشمن ہیں پٹیالہ جیل میں جو عذاب دیے جائیں گے ان کو برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔

لالہ نتھو رام کے منہ سے یہ اطلاع سن کر میں اپنی نظر بندی کے کمرہ میں واپس آ گیا۔ بہت سخت بے چین تھا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ میری فطرت ہے کہ جب تک کسی مشکل کے متعلق پروگرام تیار نہ کر لوں نہ کھا سکتا ہوں نہ سو سکتا ہوں۔ پروگرام تیار کرنے کے بعد مستقبل سے بے پروا ہو جاتا ہوں۔ میں رات کو سو بھی نہ سکا اور نہ کھا پی سکا۔ سامنے موت نظر آ رہی تھی۔ اور موت ہی نہیں بلکہ موت سے ہزار گنا زیادہ بھیانک پٹیالہ جیل کے عذاب کا خوف تھا۔ میں نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا۔ کہ اس نظر بندی سے فرار ہو جانا چاہیئے

Marfat.com

اور اگر فرار نہ ہو سکوں تو پٹیالہ کو حوالہ کیے جانے سے پہلے اپنی زندگی کو ختم کر لوں (میں اصولاً خودکشی کو بزدلی نہیں سمجھتا بلکہ بہت بڑی بہادری۔ کیونکہ موت جیسی خوفناک شے سے بغلگیر ہونا بزدلی نہیں بہادری ہے) چنانچہ میں نے ان کنسٹیبلوں میں سے ایک کنسٹیبل چھوٹا سنگھ کو اپنے راز میں لیا اور اس سے کہا کہ میرے سر میں درد ہے میں تھوڑی سی افیون کھانا چاہتا ہوں۔ چھوٹا سنگھ بازار سے ایک پلیبہ کی افیون لے آیا دو دو دن کے بعد میں نے کئی بار پھر منگائی۔ اس طرح جب یہ افیون ایک انسان کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہو گئی تو میں نے اس کو کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں باندھ کر اس کو اپنے تکیہ میں رکھا اور تکیہ سی لیا۔ افیون کو اس طرح رکھنے کا علم سوائے میرے کسی کو نہ تھا۔

حراست سے فرار ہونے کے متعلق میں نے چھوٹا سنگھ کو راز میں لے کر اس سے مشورہ کیا تو چھوٹا سنگھ نے کہا۔ کہ رات کو جب اس کا پہرہ ہو تو وہ اور میں دونوں بھاگ چلیں گے۔ جن کمروں میں ہم تھے ان کمروں کے بالکل ساتھ ایک زینہ تھا۔ یہ زینہ بند کر دیا گیا تھا اور اس کے اندر ایک تالہ لگا ہوا تھا کہ کوئی آ جا نہ سکے یہ زینہ تاریک تھا اور مدت سے اس کی کبھی صفائی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس راستہ سے کوئی نہ آتا تھا نہ جاتا تھا۔ چھوٹا سنگھ دوسرے کنسٹیبلوں سے پوشیدہ اس زینہ میں گیا اور اس نے تالہ توڑا اور تالہ کی جگہ ایک رسی باندھ دی گئی۔ تاکہ باہر سے کوئی کھول بھی نہ سکے۔ اور جب ہم فرار ہوں تو اس رسی کو توڑ کر اندر سے دروازہ کھول لیا جائے۔ چھوٹا سنگھ کے ساتھ فراری کا پروگرام تیار کیا تو اس نے کہا۔ کہ نابھہ سے جانے کے لیے وہ ایک تیز رفتار اونٹ کا انتظام کر سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ کہ کیا کسی صورت سے موٹر کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ چھوٹا سنگھ نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے مشورہ کیا۔ کہ یہاں سے فراری کے بعد کیا میں پانچ سات روز شہر میں کسی کے ہاں پوشیدہ طور پر رہ سکتا ہوں۔ اس نے بتایا کہ یہ انتظام ہو سکے گا ہم یہ تمام سکیم تیار کر رہے تھے مگر اس کی ضرورت ہی نہ پڑی اور وائسرائے نے رہا کرنے کا حکم دیا۔ ورنہ حراست سے فرار ہونے کے خطرہ کو بھی میں نے خودکشی سے پہلے لبیک کہنا تھا۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ ہی ہوتا۔

افیون رکھنے کے بعد میں نے ایڈمنسٹریٹر کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ مہاراجہ پٹیالہ میرے دشمن ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی یہ بے انصافی ہوگی اگر مجھے مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ کیا گیا۔ اگر گورنمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ میں نے مہاراجہ نابھہ کے ساتھ مل کر فی الحقیقت مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف بغاوت کی ہے تو اس جرم کی جو زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔ بغیر مقدمہ کے ہی اس سزا کو میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر مجھے برٹش علاقہ کے کسی جیل میں رکھا جائے اور اگر گورنمنٹ برٹش جیل میں نہیں رکھ سکتی اور میرا میرے دشمن مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ کرنا ضروری ہی ہے تو میں پھر چیلنج کرتا ہوں کہ آپ میری لاش تو مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ کر سکتے ہیں مگر دیوان سنگھ کو زندہ حالت میں مہاراجہ پٹیالہ کے حوالہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ موت کی تکلیف کے مقابلہ پر پٹیالہ جیل کا عذاب ہزار گنا زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔

ایڈمنسٹریٹر کو یہ خط بھیجنے کے بعد میں نے مہاراجہ نابھہ کو تمام حالات لکھے اور ساتھ یہ بھی لکھ بھیجا کہ اب شاید آپ سے اس جنم میں ملاقات نہ ہو کیونکہ اگر پٹیالہ بھیجا گیا۔ تو پٹیالہ حدود میں پہنچنے سے پہلے

Marfat.com

دیوان سنگھ اس دنیا میں نہ ہوگا۔ میرے اس خط کو پڑھ کر مہاراجہ کے آنسو نکل آئے اور انہوں نے اپنے دوست ممبران اسمبلی کو خط لکھے کہ دیوان سنگھ پر اس طرح ظلم ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے وائسرائے کو لکھا کہ راؤ بہادر چوہدری لال چند آف رہتک (جو بعد میں پنجاب کے منسٹر اور ممبر پنجاب پبلک سروس کمیشن ہوئے) میرے بہت مخلص اور مہربان تھے اور سر جان تھامپسن پولیٹیکل سیکرٹری کے گہرے دوست۔ ان کو پیغام بھیجا اور تمام حالات بتائے۔ یہ سر جان تھامپسن سے ملے اور دہلی میں کئی ایک دوست سرکاری ملازم تھے۔ ان کی معرفت کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آخر لارڈ ریڈنگ نے میرے اور نابھ کے نصف درجن کے قریب دوسرے اصحاب (جن پر بھی مہاراجہ نابھ کے ساتھ مل کر مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف سڈیشن پھیلانے یا بغاوت کرنے کا الزام تھا) کی فائل پر حکم لکھا۔ کہ اگر دیوان سنگھ اور ان دوسرے لوگوں نے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف سڈیشن میں حصہ لیا ہے تو اپنے آقا مہاراجہ نابھ کے حکم سے۔ اور ان کا یہ فعل اپنے آقا کی وفا شعاری کے خیال سے قابلِ تعریف تھا۔ ان کا کوئی قصور نہیں اس لیے فوراً رہا کیا جائے۔ لارڈ ریڈنگ نے یہ حکم جہاز میں لکھا جب کہ آپ برما کے دورہ سے واپس ہندوستان آرہے تھے (اس زمانہ میں برما ہندوستان سے الگ نہ ہوا تھا اور برما بطور ایک صوبہ کے وائسرائے کے ماتحت تھا) میرا ایک آدمی دہلی میں اطلاعوں کے لیے موجود تھا۔ وائسرائے جب دورہ سے واپس دہلی پہنچے تو اس کو پولیٹیکل ڈیپارٹ کے ایک کلرک سے معلوم ہو گیا کہ وائسرائے نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ وائسرائے کے پہنچنے کے چار روز بعد مجھے یہ اطلاع نابھہ میں پہنچ گئی اور میں مطمئن ہو گیا۔

اس اطلاع کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ایک سب انسپکٹر پولیس میرے پاس پہنچا اس نے کہا کہ لالہ نتھو رام کے پاس چلیئے وہ بلاتے ہیں۔ میں نے چھوٹا سنگھ کنسٹیبل سے کہا کہ میرا بستر اور سامان وغیرہ باندھ کر تیار رکھو۔ سب انسپکٹر کو حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ وہ حیران کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے کہا کچھ دریافت کرنے کے لیے بلایا گیا ہوں۔ ابھی تو پھر واپس آنا ہے۔ بستر وغیرہ کیوں بندھوا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہ آپ کو علم نہیں مجھے پتہ ہے کہ آج میری رہائی ہوگی۔ چنانچہ سب انسپکٹر مجھے لالہ نتھو رام کے پاس لے گئے۔ لالہ نتھو رام نے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا میں بیٹھا تو آپ نے نہایت ہمدردی کے لہجہ میں (جس طرح پولیس اور جیل کے افسر کسی ملزم یا مجرم کو رہا کرتے وقت ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ تاکہ یہ رہائی کے بعد مخالفت نہ کرے) فرمایا "سردار صاحب! آپ نے بہت تکلیف اٹھائی۔ کیا کیا جائے۔ میرا فرض ایسا تھا۔ میں نے تو ایڈمنسٹریٹر کے حکم کی تعمیل کی جو آپ کو اتنا عرصہ نظر بند رکھا گیا۔ ورنہ آپ کی میرے دل میں بہت عزت ہے اب گورنمنٹ کے حکم سے آپ کو رہا کیا جاتا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ دنیا میں ہر شخص کو فرض ادا کرنا چاہیئے معمولی بات ہے۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اس کے بعد لالہ نتھو رام نے پوچھا۔ کہ اب آپ کا آئندہ پروگرام رہائی کے بعد کیا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ نابھہ آنے سے پہلے کاغذ سیاہ کر کے روٹی پیدا کرتا تھا اور اب بھی کاغذ سیاہ کر کے روٹی پیدا کروں گا۔ لالہ نتھو رام نے کہا۔ کہ دوستانہ رائے ہے اب کسی ایجی ٹیشن

Marfat.com

میں حصہ نہ لیجیئے۔ آپ نے بہت تکلیف اٹھائی۔ میں نے جواب دیا۔ بدنصیبی یا خوش نصیبی سے خدا نے رزق ہی ایجی ٹیشن کے ذریعہ لکھا ہے تو کیا کریں۔ اگر ایجی ٹیشن نہ کریں تو روٹی کہاں سے کھائیں۔ جرنلزم نام ہی ایجی ٹیشن کرنے کا ہے۔ لالہ ٹھاکر رام نے کہا۔ کہ آپ صرف دوستانہ رائے دے رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا افسوس ہے کہ میں آپ کی دوستانہ رائے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ لالہ ٹھاکر رام نے مجھے سرکاری حکم سنایا۔ کہ میں آئندہ کبھی ریاست نابھ کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ آپ نے پولیس کی ایک گارد طلب کی۔ یہ گارد مجھے ریلوے سٹیشن پر لے گئی۔ میرا سامان بستر وغیرہ سٹیشن پر پہنچا دیا گیا۔ اور یہ گارد اس وقت تک ریلوے سٹیشن پر موجود رہی جب تک کہ میں گاڑی میں سوار نہ ہو گیا اور گاڑی چل نہ پڑی۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد اگلے روز صبح میں ڈیرہ دون پہنچا۔ مہاراجہ سے ملا۔ تمام حالات بیان کیئے اور دس روز کے قریب مہاراجہ کے پاس رہا۔

ریاستوں کے مظالم اور برٹش حکام

"ریاست کو جاری ہوئے دو برس کے قریب ہو چکے تھے۔ میرے پاس نالہ گڑھ سے بذریعہ رجسٹری ایک خط پہنچا جو بارہ یا سولہ صفحہ کا تھا اس خط میں رانی نالہ گڑھ (موجودہ راجہ نالہ گڑھ جو حال ہی پٹیالہ یونین میں منسٹر تھے کی والدہ) کے مصائب کا ذکر تھا۔ کہ وہ وہاں قید کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ انتہائی تکلیف میں ہیں اور وہاں کا وزیر جو گورنمنٹ کا بھیجا ہوا ایک سرکاری افسر تھا نہ صرف رانی کو بہت تنگ کر رہا ہے بلکہ ریاست نالہ گڑھ کو بھی لوٹ رہا ہے اور پبلک بے حد پریشان ہے۔ اس خط میں وزیر پر بہت سخت اور سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ اس خط کے ملنے پر میں سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیئے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اگر ان الزامات کو شائع کرتا ہوں تو مقدمہ ہونے کا خوف۔ کیونکہ الزامات چاہے سچ ہوں اُن کی سچائی کے متعلق ثبوت موجود نہیں تھے۔ صرف یہ خط الزامات کو عدالت میں ثابت کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ چاہے کتنی بھی ذمہ دار شخصیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

میں چند روز سوچتا رہا۔ اس کے بعد ایک اور خط ملا۔ جس میں پہلے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حالات درج تھے اور کچھ شمار و اعداد دینے کے علاوہ لکھا تھا۔ کہ رانی نالہ گڑھ کی زندگی خطرہ میں ہے کیونکہ راجہ نالہ گڑھ رانی کے خلاف ہے اور وزیر راجہ کے ساتھ مل گیا ہے اور کسی شخص کو بھی اجازت نہیں کہ وہ رانی سے مل سکے۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد میں پھر غور کرتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ جب ان حالات کے درست ہونے کے متعلق میری تسلی ہو گئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ ریاست نالہ گڑھ کے مسئلہ کو ہاتھ میں لینا چاہیئے اور اس وقت تک نہ چھوڑنا چاہیئے۔ جب تک کہ وہاں کے مظالم کا خاتمہ نہ ہو۔ میں نے ان خطوط میں سے الزامات کی ایک فہرست تیار کی اور اس فہرست کو ٹائپ کرایا۔ اس ٹائپ شدہ فہرست کو لے کر

Marfat.com

میں شملہ گیا۔ سوامی رامانند اس زمانہ میں کانگریس کے مشہور ورکر تھے اور شملہ کی ریاستوں کی پبلک میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں مصروف تھے۔ ان سے ملا۔ ان کی معرفت ریاستوں کے دوسرے واقف کار لوگوں سے بات چیت کی معلوم ہوا کہ ثبوت گو نہ ہو مگر الزامات تمام کے تمام درست ہیں جب ان الزامات کے متعلق مجھے تسلی ہو گئی تو میں ڈپٹی کمشنر (جو ریاست ہائے شملہ کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا اور جس کے ماتحت ریاست نالہ گڑھ تھی) کے دفتر میں گیا وہاں معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر (مجھے ٹھیک نام یاد نہیں رہا غالباً ان کا نام مسٹر ویکفیلڈ تھا) موجود ہیں۔ میں نے چپڑاسی کے ہاتھ وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ ڈپٹی کمشنر نے اندر بلا لیا۔ میں نے سب سے پہلے پوچھا یہ بتائیے کہ ریاستوں کے متعلق گورنمنٹ کی کیا پوزیشن ہے؟ کیا حکام جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں فی الحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ ریاستوں کی بدانتظامی، رشوت اور مظالم بند ہوں۔ یا آپ کا اصل مقصد یہ ہے کہ ریاستوں کے مظالم اور بدانتظامی جاری رہے۔ میری یہ بات سن کر ڈپٹی کمشنر مسکرا دیا اور کہا کہ گورنمنٹ فی الحقیقت چاہتی ہے کہ ریاستوں کی اصلاح ہو۔ ڈپٹی کمشنر کے ایسا کہنے پر میں نے اپنے جیب سے نالہ گڑھ کے متعلق الزامات کی ٹائپ شدہ فہرست نکالی اور ڈپٹی کمشنر کو دے کر کہا۔ کہ آپ مجھ پر یا کسی دوسرے شخص پر اعتبار نہ کیجئے۔ کسی دوسرے صوبہ سے یا اس صوبہ سے کوئی افسر جسے کوئی بھی نالہ گڑھ میں نہ جانتا ہو اور جو دیانت دار اور ہوشیار ہو نالہ گڑھ بھیج دیجئے اور معلوم کیجئے۔ کہ یہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں یا نہیں۔ اور اگر آپ کی تسلی ہو جائے کہ یہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں۔ تو آپ کا فرض ہے کہ اس ریاست کی اصلاح کے لیے قدم اٹھائیے۔ ڈپٹی کمشنر نے ان الزامات کی تحقیقات کا وعدہ کیا اور میں واپس دہلی چلا آیا۔

دہلی پہنچے مجھے تین ہفتے ہوئے تھے۔ اس ڈپٹی کمشنر کا میرے پاس تار پہنچا۔ کہ میں فلاں تاریخ سوموار کے دن گیارہ بجے ان سے ملوں۔ میں سنیچر کی رات کو دہلی سے روانہ ہوا۔ اتوار کی دوپہر کو شملہ پہنچا۔ وہاں لالہ ٹھاکر داس کے پنجاب ہوٹل میں قیام کیا اس روز سوامی رامانند وغیرہ دوستوں سے ملا۔ سوموار کو گیارہ بجے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں گیا۔ وزیٹنگ کارڈ بھیجا اور ملا تو ڈپٹی کمشنر نے بتایا۔ کہ آپ نے گورنمنٹ ہند کے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو لکھا کہ وہاں سے ایک دیانت دار افسر کو بلایا تھا۔ اس کو تحقیقات کے لیے نالہ گڑھ بھیجا وہ وہاں بغیر کسی کو اطلاع دیے ایک ہفتہ کے قریب رہا۔ اس نے رپورٹ کی ہے کہ الزامات تمام کے تمام درست ہیں۔ اس رپورٹ کو گورنر پنجاب کے پاس بھیجا گیا تھا وہاں سے حکم آیا ہے کہ اس وزیر کو معطل کر کے اس پر رشوت اور تغلب وغیرہ کے مقدمات چلائے جائیں۔ چنانچہ گورنمنٹ اس کو معطل کر کے اس پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ ان الزامات کے متعلق ثبوت دیا جائے جو مقدمہ میں بطور شہادت کام آ سکے۔

ڈپٹی کمشنر کے اس انکشاف کو سن کر میں مطمئن تھا۔ مگر حیران کہ کیا کروں اخبار کی مصروفیت۔ ایک دن کی فرصت نہیں۔ شملہ بھی بہت وقت کے ساتھ آیا ہوں۔ میں نے ڈپٹی کمشنر سے کہا۔ کہ کیا آپ کا ضمیر مطمئن ہے کہ یہ الزامات درست ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے بتایا۔ کہ ہاں الزامات درست ہیں اور گورنمنٹ مقدمہ چلانے کے

Marfat.com

لیے ثبوت چاہتی ہے۔ میں نے کہا۔ کہ اگر آپ کو الزامات کے درست ہونے کے متعلق یقین ہے تو میرا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ آپ اس وزیر کو نالہ گڑھ سے تبدیل کر دیجئے۔ تاکہ رانی نالہ گڑھ اور وہاں کی پبلک کی مصائب کا خاتمہ ہو۔ ڈپٹی کمشنر نے بار بار کہا۔ کہ گورنمنٹ صرف تبدیل کرنے پر مطمئن نہیں۔ مقدمہ چلانا چاہتی ہے اور اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے جو عدالت میں پیش ہو سکے۔ میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور کہا کہ نہ تو میرے پاس اس وقت کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ اتنا وقت ہے کہ نالہ گڑھ جا کر ثبوت جمع کروں میرا جو فرض تھا میں نے ادا کر دیا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔

اس ملاقات کے ایک ہفتہ کے اندر ہی معلوم ہوا۔ کہ یہ وزیر جو گورنمنٹ کی ملازمت میں تھا اور نالہ گڑھ میں بطور لیفٹیننٹ آفیسر تھا تنزل کر کے نالہ گڑھ سے واپس برٹش علاقہ میں بھیج دیا گیا اور نالہ گڑھ کی پبلک اور رانی کو اس سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی اخبار نویس ذاتی لالچ اور خوف سے بلند رہ کر ظلم کو دور کرنے کے لیے قدم اٹھائے تو گورنمنٹ کے انصاف پسند حکام بھی اس ظلم کو دور کرنے میں اس کے معاون ثابت ہوتے ہیں انگریز قوم انگریز اور ہندوستانی کے درمیان انصاف نہ کرتی تھی مگر ہندوستانی اور ہندوستانی کے درمیان انصاف ضرور کرتی تھی۔ بشرطیکہ ہندوستانی ہی انصاف میں روڑا اٹکانے کا باعث نہ ہونے +

اگروال ذہنیت

دہلی میں جب روزانہ "ریاست" جاری تھا تو دیوبند کے ایک لالہ اوگرسین تشریف لائے۔ پہلے آپ کی بزازی کی دکان تھی اور آپ نے اپنا کاروبار بند کر دیا تھا۔ آپ نے "ریاست" میں اشتہار دیا۔ کہ آپ بہت تجربہ کار بزنس مین ہیں۔ اگر کوئی صاحب روپیہ لگائیں تو آپ اس کے بزنس میں شریک ہونا چاہتے ہیں اشتہار کے نیچے چونکہ معرفت دفتر "ریاست" تھا اس لیے آپ اپنے خطوط لینے کے لیے ہر روز دفتر "ریاست" میں تشریف لایا کرتے۔ جب کبھی آتے۔ صبح آئیں دوپہر کو یا شام کو۔ دیکھتے کہ ایڈیٹر "ریاست" مصروف ہے آپ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں بھی کرتے۔ دس بارہ روز آتے رہے تو آپ نے فرمایا: "سردار صاحب کیا اخبار میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ آپ اس قدر محنتی ہو۔ اگر آپ میرے ساتھ بمبئی چلو تو وہاں تجارت کی جائے۔ مجھے بہت تجربہ ہے۔ میرے پاس تجارت کے لیے روپیہ بھی کافی ہے۔ آپ ساتھ شامل ہو جائیے ہم بمبئی میں لاکھوں روپیہ پیدا کریں گے۔

لالہ صاحب کے اس خیال کی میں نے پروا نہ کی۔ کیونکہ اگر روپیہ پیدا کرنے کا سوال ہوتا تو میں تین چار سو روپیہ ماہوار کی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر جرنلزم کیوں اختیار کرتا۔ لالہ صاحب اس کے بعد بھی کبھی کبھی ملنے آتے کیونکہ بیکار تھے۔ وقت گزارنے کے لیے ان کو کسی باتیں کرنے والے کی ضرورت ہوتی اور میں بھی زیادہ محنت کے باعث تھک جاتا۔ تو لالہ جی کے ساتھ گپ بازی میں چند منٹ یا نصف گھنٹہ گزارنا ایک تفریح سمجھتا کچھ

Marfat.com

روز کے بعد خواجہ حسن نظامی نے کہا کہ آپ "رعیت" کے لیے زیادہ گھاٹا برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے اخبار بند کر دیا جائے۔ (اس اخبار کی پوزیشن یہ تھی۔ کہ اڑھائی سو روپیہ تو میں نے دیا تھا۔ باقی روپیہ خواجہ صاحب نے۔ اور فیصلہ یہ تھا۔ کہ ایک پورا صفحہ تو خواجہ صاحب کی کتابوں کا اشتہار بغیر اجرت چھپے اور ایڈیٹر "ریاست" اپنے خرچ کے لیے ایک روپیہ روز لے۔ اس کے بعد اگر نقصان ہو تو خواجہ صاحب پورا کریں اور اگر نفع ہو تو دونوں برابر کے شریک) خواجہ صاحب اس وقت تک چھ سو روپیہ گھاٹا دے چکے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اخبار بند نہ کیا جائے۔ کسی دوسرے کو دے دیا جائے تاکہ ایڈیٹر "ریاست" اس میں کام بھی کرتا ہے اور اخبار بھی زندہ ہے۔ "رعیت" پہلے شام لال کپور ایڈیٹر "گورو گھنٹال" نے لیا۔ وہ شاید ایک ہفتہ بھی نہ چلا سکے پھر واحدی صاحب نے لیا۔ اور پھر بھیا احسان الحق صاحب نے اور آخر اس کو بند کر دیا گیا۔ "رعیت" کے بند ہونے پر اب پھر سوال پیدا ہوا۔ کہ میرا استقبل کیا ہو۔ لالہ اوگرسین ملا کرتے تھے۔ آپ سے فیصلہ ہوا کہ دونوں تجارت کے لیے بمبئی چلیں۔ میرے پاس چونکہ سرمایہ نہ تھا۔ نہ میں بمبئی کی تجارت سے واقف تھا میں نے کہا۔ اور لالہ اوگرسین اس سے متفق ہو گئے۔ کہ میرا حصہ نہ ہو۔ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ لوں اور ان کے ساتھ بمبئی چلوں۔ ہم لوگ بمبئی چلے گئے۔ وہاں مرچی سٹریٹ میں ایک کمرہ دفتر کے لیے کرایہ پر لیا۔ لالہ اوگرسین بہت ہوشیار آدمی تھے۔ کچھ تھوڑا سا فرنیچر۔ ایک بڑا گدا۔ بڑے بڑے تکیے۔ گدے کے لیے سفید چادریں۔ بہی کھاتہ کی کتابیں اور لوہے کی ایک الماری یعنی آئرن سیف۔ یہ سامان خریدا گیا۔ تاکہ ہم سیٹھ بچ سکیں۔ دکان کا نام سیٹھ اگرسین اینڈ کمپنی رکھا گیا۔ اس نام کے فارم چھاپے گئے اور ٹیلی گرافک ایڈریس بھی ڈاک خانہ میں رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔

دکان کا سامان وغیرہ ٹھیک ہونے کے بعد ہم نے لاہور سے اردو کی ایک تجارتی ڈائرکٹری منگائی۔ جس میں پنجاب کی تمام منڈیوں کے آڑھتیوں اور دکانداروں کے نام اور پتے تھے۔ ان پتوں پر میں نے خط لکھنے اور سرکولر لیٹر بھیجنے شروع کیے کہ یہ دکان بہت قابل اعتماد ہے اگر کوئی صاحب بمبئی سے کچھ منگانا چاہیں تو ہم بہت کم آڑھت پر یہاں سے سامان بھیجتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایک ہزار کے قریب سرکولر لیٹر بھیجے تھے کہ آرڈر آنے شروع ہوئے۔ کوئی شخص مصری کھجوریں منگا رہا ہے، کوئی بزازی اور کچھ اور۔ اور کوئی اپنا غلہ اور دوسرا سامان بمبئی میں فروخت کرنا چاہتا ہے۔ میں کام تو بہت محنت سے کرتا رہا۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ مجھے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

پنجاب سے ایک شخص نے خط لکھا۔ کہ وہ بمبئی سے سرخ اور سبز کیلا منگانا چاہتا ہے۔ اس خط کو دیکھ کر ہمیں خیال ہوا۔ کہ بمبئی کا کیلا تمام ہندوستان میں جاتا ہے۔ ہم لوگ اس بزنس کو بھی کیوں نہ شروع کریں۔ چنانچہ مشورہ کے بعد میں اس بزنس کے لیے بسین گیا جہاں یہ کیلا پیدا ہوتا ہے اور اس کی مارکیٹ ہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ بسین میں صرف دو پنجابی خاندان ہیں جن کے ہاتھوں میں یہ تمام بزنس ہے اور یہ لوگ تمام ہندوستان میں کیلا سپلائی کرتے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں کہ صرف دو دکانیں اور اتنا بڑا بزنس۔ ہم یہاں دکان کھول کر لاکھوں روپیہ پیدا کر سکیں گے۔ مزید واقفیت کے لیے میں ان پنجابیوں کی دکان پر گیا۔

Marfat.com

پنجاب کے اندر ایک پنجابی چاہے دوسرے پنجابی کا دشمن ہو مگر پردیس میں پنجابی، پنجابی کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہت اخلاص کے ساتھ پیش آئے۔ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ کھانا کھلایا اور میں رات کو ان کے گھر ہی رہا۔ ان کو کچھ پتہ نہیں کہ میں کس مقصد کے لیے لسبین آیا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ بمبئی سیر وتفریح کے لیے آیا اور لسبین بھی چلا آیا۔ رات کو جب ہم کھانا کھا چکے اور باتیں شروع ہوئیں تو میں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے کہ یہاں اتنی بڑی مارکیٹ میں آپ کے خاندان کی صرف دو دکانیں ہیں اور دوسرے لوگ کاروبار نہیں کرتے۔ میرے اس سوال کو سن کر میزبان نے فخر کے ساتھ جواب دیا۔ کہ پچھلے پندرہ بیس برس میں سینکڑوں لوگوں نے یہاں آکر کیلے کا کاروبار کرنا چاہا مگر سب دیوالہ نکال کر چلے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی نئی دکان کھلتی ہے تو ہم لوگ فوراً مارکیٹ کو چڑھا دیتے ہیں یعنی زیادہ قیمت پر کیلا خرید کر دساور کو کم قیمت پر بھیجنا شروع کر دیتے ہیں اور پندرہ، بیس یا پچاس ہزار روپیہ گھاٹا برداشت کر لیتے ہیں نئے کاروبار والے کو بھی مجبوراً ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ قیمت پر مال خرید کر ارزاں نرخوں پر باہر بھیجنا پڑتا ہے ہمارے لیے تو گھاٹا کوئی مشکل نہیں۔ ہمارے لیے کئی کئی لاکھ روپیہ پیدا کیا ہوا موجود ہے۔ اس میں سے دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ گھاٹا برداشت کر لیں تو ہمیں کوئی پرواہ نہیں مگر نیا کاروبار کرنے والا شخص دو چار ماہ میں اپنا دس بیس ہزار روپیہ تباہ کر کے میدان سے نکل جاتا ہے۔ اور اس کے میدان سے نکلنے کے بعد ہم پھر مال ارزاں قیمت پر خرید کر گراں قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور دو تین ماہ میں گھاٹا پورا کر لیا جاتا ہے ان باتوں کو سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ یہاں کاروبار کرنا خطرہ سے خالی نہیں میں واپس بمبئی پہنچا۔ لالہ اوگر سین سے تمام حالات بیان کیے۔ لالہ اوگر سین اس کام میں دس بارہ ہزار روپیہ تو لگانے کے لیے تیار تھے۔ گھاٹے کے لیے اور وہ بھی اس سے کافی زیادہ روپیہ کیونکر لگاتے۔ چنانچہ ہماری یہ سکیم شروع نہ ہو سکی اور ہم نے کیلے کے بزنس کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں لالہ اوگر سین کے پاس چار ماہ کے قریب رہا۔ کام چل نکلا۔ میری رہائش دھوبی تلاؤ کے قریب سندھیوں کے ایک ہوٹل میں تھی۔ جہاں میں پچھتر روپیہ ماہوار کھانے اور رہائش کا دیتا تھا۔

چار ماہ گزر گئے مگر اس کام میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ لالہ اوگر سین میرا ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کچھ بار محسوس کرتے ہیں۔ مہاراجہ نابھ کے ساتھ اس سے پہلے سردار سردول سنگھ کویشر کے ذریعہ تعارف ہو چکا تھا۔ میں نے مہاراجہ کو خط لکھا۔ کہ "ریاست" کے بند ہونے کے بعد بمبئی آ گیا ہوں۔ اور یہاں ملازم ہوں۔ مگر میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ ملازمت دیں تو میں آپ کے پاس نابھ آنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے اس خط میں اپنا پتہ معرفت پوسٹ ماسٹر بمبئی لکھا کیونکہ اپنے تمام خطوط اس پتہ پر ہی منگایا کرتا تھا۔ دس بارہ روز کے بعد مہاراجہ کا جواب آیا۔ کہ میں ان کے پاس ڈیرہ دون پہنچ جاؤں۔ یہ خط سردار گوردیال سنگھ پرائیوٹ سیکرٹری کے ہاتھ کا شملہ سے لکھا ہوا تھا۔ کیونکہ مہاراجہ اس وقت شملہ میں تھے۔

اس خط کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ میں بمبئی سے جاؤں تو کیونکر حساب کیا تو لالہ اوگر سین کے ذمہ میرا ڈیڑھ سو روپیہ سے زیادہ نکلتا تھا۔ اگر لالہ اوگر سین مجھے یہ روپیہ دے دیتے

Marfat.com

اور خوشی کے ساتھ میرا استعفیٰ منظور کرتے تو بہت اچھا تھا۔ مگر لالہ جی بنیئے تھے۔ میں ان کی ذہنیت سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ کہ وہ مفت تو دوزخ میں جانے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں مگر روپیہ خرچ کرنا ہو تو بہشت کی بھی پرواہ نہ کرنے والوں میں سے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے اصل حالات لالہ جی کو بتائے تو یہ میرا بقایا ڈیڑھ سو روپیہ ضبط کر لیں گے۔ نابھہ جانے کے لیے میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔ کروں تو کیا کروں۔ سوچتا رہا۔ آخر لالہ جی سے کہا۔ کہ اگر ہم میں سے ایک شخص پنجاب جا کر منڈیوں کا چکر لگائے اور وہاں خود دکانداروں سے ملے تو بمبئی سے مال منگانے والے بہت گاہک پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقے سے میں نے لالہ جی سے اپنا ڈیڑھ سو روپیہ اخراجات کے نام پر لیا۔ اور پنجاب جانے کی منظوری حاصل کی۔ لالہ صاحب بہت ہوشیار تھے انہوں نے مجھ سے ایک تحریر لکھوائی۔ کہ یہ ڈیڑھ سو روپیہ بطور امانت ہو گا۔ میں ہر روز اپنے کام کی رپورٹ بھیجوں گا۔ اگر میں واپس نہ آؤں تو اس ڈیڑھ سو روپیہ کو بقایا تنخواہ نہیں بلکہ امانت میں خیانت سمجھا جائے گا۔ تاکہ فوجداری مقدمہ قائم ہو سکے۔ میں ہر قیمت پر نابھہ جانے اور اپنی قسمت آزمانے کے لیے تیار تھا۔ ڈیڑھ سو روپیہ لے کر فرنٹیئر میل میں سوار ہوا۔ اس زمانہ میں فرنٹیئر میل بھٹنڈہ کے راستہ لاہور جاتی تھی۔ بمبئی سے سوار ہو کر بھٹنڈہ پہنچا۔ وہاں ایک دوست لالہ ہنسراج وکیل تھے۔ ان کے مکان پر گیا۔ میرے پاس کپڑے کافی نہ تھے۔ بازار سے لٹھا خرید کر چھ قمیضیں اور چھ پاجامے بنوائے ایک رضائی تیار کرائی۔ جب کپڑے تیار ہو گئے تو بھٹنڈہ سے راجپورہ انبالہ کے راستہ ڈیرہ دون پہنچا۔ ڈیرہ دون ریلوے اسٹیشن کے قریب سکھوں کے ایک معمولی سے ہوٹل میں چار آنہ روز پر ایک کمرہ لیا۔ اور کپڑے بدل کر مہاراجہ نابھہ کی کوٹھی ایسٹ کینال روڈ گیا۔ وہاں سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری سے ملا۔ سردار گوردیال سنگھ بہت با اخلاق شخص تھے۔ والیانِ ریاست سے ملنا بے حد مصیبت تھا۔ گیارہ روز کے قریب اس ہوٹل میں رہا۔ ہر روز کوٹھی پر مہاراجہ سے ملنے کی توقع پر جاتا۔ وہاں سے کبھی تو جواب ملتا کہ مہاراجہ کی طبیعت اچھی نہیں۔ کبھی غسل خانہ میں ہیں۔ کبھی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کبھی فرصت کم ہے۔ کبھی کھانے پر بیٹھے ہیں۔ اور کبھی آرام فرما رہے ہیں۔ یہ جواب سن کر واپس آ جاتا۔ ہوٹل میں جی اکتاتا تو بازار چلا جاتا۔ وہاں وقت نہ کٹتا۔ تو کسی پارک میں چلا جاتا۔ ایک دن اتوار کو دیکھا کہ عیسائیوں کے سکول کے لڑکے گرجے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے جا کر گرجے میں کچھ عرصہ پادری کا وعظ سنتا رہا۔ چنانچہ بہت مشکل کے ساتھ دس روز کٹے اور گیارھویں روز مہاراجہ کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی۔ سیاسی اور دوسرے مختلف موضوع پر باتیں ہوئیں یہ انٹرویو غالباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک رہا۔ انٹرویو کے بعد واپس چلا آیا۔ اگلے روز گیا تو سردار گوردیال سنگھ نے بتایا۔ کہ مہاراجہ نے مجھے ملازمت دے دی ہے۔ میں نابھہ چلا جاؤں۔ وہاں ہوم ممبر کے پاس حکم بھیج دیا جائے گا اور مہاراجہ مع سٹاف کے کنسرو کے جنگل میں شیر کا شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس روز کے بعد نابھہ پہنچ جائیں گے۔

پہلے تو جب کبھی نابھہ جاتا تو دستور کے مطابق بطور رخصتانہ مجھے ایک یا دو سو روپیہ دیا جاتا۔ اب میں چونکہ ملازم ہو گیا۔ اس لیے اس موقع پر مجھے رخصتانہ بھی نہ ملا۔ یہ حکم سن کر میں ہوٹل گیا۔ بستر اور ٹرنک

Marfat.com

لیا اور سٹیشن آیا۔ گاڑی میں سوار ہو کر نابھہ سٹیشن پہنچا تو میرے پاس اس وقت گیارہ روپے کے قریب تھے۔ ڈیڑھ سو روپیہ میں سے باقی تمام کا تمام روپیہ کپڑوں اور سفر میں خرچ ہو گیا۔

نابھہ میں میرے ایک چچا (میرے والد کے حقیقی چچازاد بھائی) سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ رہتے تھے۔ یہ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ، اور کئی لاکھ روپیہ کی جائیداد کے مالک تھے۔ یہ اس وقت ریاست نابھہ میں پنشن پر تھے اور پہلے مرحوم مہاراجہ سرہیرا سنگھ (موجودہ مہاراجہ نابھہ کے دادا) کے میڈیکل ایڈوائزر تھے۔ میرے چچا خرچ کرنے کے اعتبار سے میری طبیعت کے بالکل خلاف اور ضد تھے۔ یعنی میں تو روپیہ اگر پاس ہو تو جب تک خرچ نہ کر لوں۔ رات کو سو نہیں سکتا۔ مگر ان کے گھر میں دال کے ساتھ آلو اس روز پکتے جس روز ان کے ہاں کوئی مہمان آئے۔ میرے لیے ان کے ہاں جا کر قیام کرنا اپنی طبیعت پر ایک قسم کا جبر تھا۔ مگر کیا کرتا۔ جیب میں تو صرف گیارہ روپے تھے۔ اور دوسرا کوئی واقف نہیں تھا۔ دل پر جبر کر کے ان چچا کے مکان پہنچا۔ تانگہ میں سے سامان اتروا کر ان کے گھر کے اندر گیا تو آپ صحن میں بیٹھے تھے۔ آپ کی نظر کمزور تھی۔ دور سے دیکھا تو پوچھا کون ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں دیوان سنگھ ہوں۔ قریب جا کر ان کے پاؤں کو چھوا۔ کیونکہ بزرگ تھے۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ پچھلے زمانہ کے لوگوں میں چاہے ہزار نقائص ہوں۔ اخلاص، محبت اور وضعداری کے اعتبار سے یہ لوگ فرشتہ تھے۔ بہت ہی اخلاص سے پیش آئے۔ ان کے گھر میں کھانا پکانے پر ایک براہمن عورت ہزنامی کئی برس سے ملازم تھی۔ اس کو آلو کی سبزی پکانے کا حکم ملا۔ میں ایک ماہ کے قریب ان چچا کے ہاں مہمان رہا۔ جب تک کہ مہاراجہ شکار سے واپس نابھہ نہ پہنچ گئے۔ مہاراجہ کے پہنچنے پر میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے نیم سرکاری بلڈنگ سرائے شادیات کی ایک کاٹیج میں چلا گیا۔ ڈاکٹر سیوا سنگھ صاحب کے ہاں ایک ماہ کے قیام کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ جو پھر لکھوں گا۔

نابھہ جب پہنچا تو میں نے اپنے وطن اور عزیزوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور لالہ دینا ناتھ مرحوم ایڈیٹر اخبار "ہندوستان" کو بھی لاہور لکھا۔ کہ میں نابھہ میں سرکاری ملازم ہو گیا ہوں۔ لالہ اوگرسین کو علم تھا۔ کہ لالہ دینا ناتھ اور لالہ شام لعل کپور ایڈیٹر "گورو گھنٹال" میرے دوستوں میں سے ہیں۔ لالہ اوگرسین نے ایک ہفتہ تک میرا انتظار کیا۔ جب میری طرف سے کوئی اطلاع نہ پہنچی تو آپ نے لالہ دینا ناتھ کو خط لکھا۔ کہ دیوان سنگھ ڈیڑھ سو روپیہ بطور ایڈوانس لے کر پنجاب میں دورہ کے لیے گیا تھا۔ اب تک اس کی کوئی اطلاع نہیں اور امانت میں خیانت کے الزام میں پولیس کو اطلاع دی جا رہی ہے۔ تاکہ دیوان سنگھ گرفتار ہو کر واپس بمبئی لایا جا سکے اور اس پر فوجداری مقدمہ قائم ہو۔ میں نے جب لالہ دینا ناتھ کو اپنے ملازم ہونے کی اطلاع دی تو انہوں نے اس کے جواب میں میرے ملازم ہونے کی خوشی کے اظہار کے ساتھ لالہ اوگرسین کا یہ خط بھی بھیجا جس میں مجھ پر امانت میں خیانت کا الزام اور پولیس کو اطلاع دینے کی دھمکی تھی اور لالہ دینا ناتھ نے لکھا۔ کہ آپ کے دلی میں ایڈیٹر "ریاست" کے دیانت دار ہونے کے باعث بہت عزت تھی۔ اور توقع نہ تھی۔ کہ ایڈیٹر ریاست اس قدر پست کیریکٹر ہو گا۔ اور یہ حالات اور ایڈیٹر "ریاست" کی بمبئی کی بددیانتی کے واقعات سن کر آپ کو

Marfat.com

بے حد صدمہ ہُوا ہے۔ لالہ دینا ناتھ کے خط جس میں لالہ اودگرسین کا خط ملفوف تھا، کو دیکھ کر مجھے نہ صرف بے حد تکلیف ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ کیونکہ میں ایک طرف تو لالہ دینا ناتھ کی نظروں میں ذلیل ہُوا۔ دوسرے یہ خوف کہ میں بمبئی میں لالہ اودگرسین کو تحریر دے آیا ہوں۔ اگر لالہ جی نے پولیس کو اطلاع دے دی اور وہاں سے وارنٹ جاری ہو گئے اور میں نابھہ میں گرفتار ہو گیا تو یہاں نہ صرف ملازمت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا بلکہ لوگ کہیں گے کہ اچھا "معتبر اور شریف" آدمی تھا جس کو مہاراجہ نے دوست سمجھ کر ملازم رکھا۔ ان خطوط کو دیکھ کر میں بے حد پریشان ہُوا۔ رات کو نیند نہ آئی۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ آخر اس پریشانی کی حالت میں بھٹنڈہ لالہ ہنسراج وکیل کو خط لکھا۔ کہ فوراً نابھہ پہنچو۔ لالہ ہنسراج خط ملتے ہی نابھہ پہنچ گئے۔ ان سے تمام حالات بیان کیے تو انہوں نے کہا۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ آپ نے لالہ اودگرسین کے نام اپنی طرف سے ایک نوٹس تیار کیا جس میں لکھا کہ لالہ اودگرسین نے لالہ دینا ناتھ کو جو خط لکھا ہے وہ واقعات کے خلاف اور توہین آمیز ہے۔ ان کے مؤکل دیوان سنگھ نے ڈیڑھ سو روپیہ جو لیا ہے "وہ" اس نے اپنی تنخواہ میں وضع کر لیا ہے اور وہ لالہ جی کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ ریاست نابھہ میں سرکاری ملازم ہو گیا ہے اور چونکہ لالہ جی نے ان کے مؤکل دیوان سنگھ پر غلط الزام لگا کر توہین کی ہے اس لیے دو ہفتہ کے اندر بطور ہرجانہ لالہ جی دس ہزار روپیہ ادا کریں اور معافی مانگیں ورنہ دیوانی اور فوجداری مقدمات دائر کیے جائیں گے۔

اس نوٹس کے پہنچنے کے بعد لالہ اودگرسین کا میرے پاس خط آیا جس کا مفہوم یہ تھا:

"پیارے دیوان سنگھ جی! آپ میرے چھوٹے بھائی کے برابر ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نابھہ میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ میں نے تو لالہ دینا ناتھ کو ویسے ہی لکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ سو روپیہ کاٹ کر پندرہ روپیہ کے قریب اور آپ کے میرے ذمہ نکلتے ہیں۔ آپ لکھیئے تو میں وہ بھی بھیج دوں۔ میں تو آپ کا نیازمند ہوں۔ کسی چیز کی بمبئی سے ضرورت ہو تو لکھنا تاکہ بھیج دوں اب آپ نابھہ میں سرکاری ملازم ہو گئے ہیں۔ ہمارا بھی خیال رکھنا اور اگر ہو سکے تو وہاں سے کوئی بڑا سرکاری آرڈر بھی بھجوانا جس سے بہت فائدہ ہو۔ میرے گھر سے اور میرا چھوٹا بھائی آپ کو رام رام کہتے ہیں اور میری چھوٹی لڑکی کانتا آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اپنی خیریت کا خط لکھتے رہا کیجیے۔

آپ کا داس : "اودگرسین"

میرے نوٹس پہنچنے پر نہ معلوم لالہ اودگرسین کا کیا حال ہُوا ہو گا۔ مگر ان کا یہ جواب ملنے پر میں مطمئن ہو گیا کہ اب لالہ صاحب میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ لالہ اودگرسین میرے بمبئی سے آنے کے بعد شاید تین چار سال وہاں رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن آ گئے۔ آجکل میرٹھ میں رہتے ہیں اور جب کبھی دہلی آتے ہیں تو ضرور ملتے ہیں بلکہ اس نیازمند کے مکان پر ہی قیام فرماتے ہیں۔ اب نئے دور میں "ریاست" نکلنے والا تھا اور انہوں نے اخبارات میں پڑھا۔ کہ میں رہا ہو کر دہلی پہنچ گیا ہوں تو آپ دہلی آئے۔ تلاش کرنے پر بہت وقت کے ساتھ آپ کو موجودہ مکان ملا۔ جب ملے تو اخلاص و محبت کے باعث ان کی آنکھوں میں

Marfat.com

آنسو بھر آئے اور آپ نے چاہا اور بار بار کہا کہ اخبار جاری کرنے کے لیے روپیہ کی ضرورت ہو تو لے لوں۔ مگر ایک تو ضرورت نہ تھی دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ لالہ جی اگروال ہیں۔ روپیہ دیں گے تو بطور قرض دیں گے دوستانہ امداد کے طور پر نہیں۔ شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

لالہ اوگرسین کے لیے میرے دل میں بہت عزت اور احترام ہے اور جب ملتے ہیں اور میں لوگوں سے ان کا تعارف کراتا ہوں تو یہی کہہ کر کہ میرے سابق آقا ہیں جن کے پاس میں نے ملازمت کی ہے۔

نفرت اور محبت کے اسباب

میں ملازم ہو کر جب ڈیرہ دون سے نابھہ پہنچا اور اپنے چچا سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ کے ہاں مقیم ہوا تو پہلے روز میری خاطر تواضع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آئے ہر نامی ملازمہ کو دال کے ساتھ میرے لیے سپیشل ڈش یعنی آلو پکانے کا بھی حکم دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں پنشن پر تھے اور ریاستوں میں انسان چاہے کتنا ضعیف ہو جائے وہ سمجھتا ہے کہ اس کو مرتے دم تک ملازم رہنے کا حق حاصل ہے اور اگر اس کو پنشن پر ریٹائرڈ کر دیا جائے تو اس کے اپنے خیال میں اور لوگوں کی نگاہوں میں بھی وہ سرکار کا معتوب سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ والئ ریاست اگر خوش ہو تو وہ لوگ بھی سلسلہ ملازمت میں رہتے ہیں جو چار پائی سے اٹھ نہیں سکتے۔ میرے چچا مہاراجہ ہیرا سنگھ مرحوم نظر بند مہاراجہ کے والد اور موجودہ مہاراجہ نابھہ کے دادا کے میڈیکل ایڈوائزر تھے اور جب مہاراجہ ہیرا سنگھ کا انتقال ہوا تو نابھہ کی دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ڈاکٹر سیوا سنگھ کو بھی ریٹائرڈ کر دیا گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کے ریٹائر ہونے کا باعث یہ تھا کہ مہاراجہ نے گدی پر بیٹھتے ہی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کی اصلاح کرنی چاہی اور دوسری تبدیلیوں کے ساتھ بڑی عمر کے ملازموں کو پنشن دے کر نوجوان اور مستعد لوگوں کو ملازم رکھا مگر میرے چچا اپنے ریٹائر ہونے کو یہی سمجھتے رہے کہ مہاراجہ آپ کے خلاف ہیں اور آپ معتوب ہیں۔ جس روز میں پہنچا۔ کھانا کھانے کے بعد باتیں ہوئیں تو آپ نے دریافت کیا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور نابھہ آنے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے بتایا۔ کہ میں ڈیرہ دون سے آرہا ہوں اور مہاراجہ نے مجھے سرکاری ملازمت دے دی ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب کو یقین نہ آیا اور انھوں نے نہایت حیرانی کے ساتھ پوچھا کیا یہ سچ ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا۔ کہ ریاستوں میں ملازمت کا ملنا بہت مشکل ہے والیان ریاست سے ملنا تو کیا ان کی کوٹھیوں اور محلات کے قریب جانا بھی خوش نصیبی میں داخل ہے۔

پھر دیوان سنگھ کی مہاراجہ تک رسائی کیوں کر ہوئی اور ملازمت کس طرح ملی۔ ان کے دریافت کرنے پر میں نے بتایا کہ میں مختلف اخبارات میں بطور سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کام کرتا رہا۔ مہاراجہ میرے مضامین کو پسند کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے تعلقات ہوئے اور اب جب کہ میں نے ان سے ملازمت کے لیے کہا تو مہاراجہ نے مہربانی کی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو مہاراجہ کا معتوب سمجھتے تھے اور مہاراجہ کے خلاف

Marfat.com

تھے۔ یہ سن کر مہاراجہ پر برس پڑے اور غصہ نفرت اور طعنہ زنی کے لہجہ میں آپ نے فرمایا اس مہاراجہ کو سوائے اخبارات پڑھنے کے دوسرا کوئی کام نہیں۔ دن رات یا تو کتابیں پڑھتے ہیں یا اخبارات۔ گورنمنٹ کے خلاف جو لیڈر ہیں ان سے ملتا ہے۔ رعایا تباہ ہو رہی ہے۔ رعیت کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس کا باپ بہت اچھا آدمی تھا ہم نے اس کا زمانہ دیکھا ہے۔ ہر روز لوگوں کے حالات سنتا تھا۔ یہ کسی سے ملتا تک نہیں اس کی دوستی ہے تو گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کرنے والے لیڈروں سے ہے۔ یہ گدی سے اتر جائے گا گورنمنٹ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ یہ غلط راستہ پر چل رہا ہے پولیٹیکل ایجنٹ اس کے خلاف ہے۔ ہمیں کبھی پوچھنا تک نہیں۔ جب سے پنشن لی ہے۔ گھر میں پڑے ہیں۔ بڑے مہاراجہ کتنے اچھے تھے۔ ہم نے لاکھوں روپے پیدا کیئے وغیرہ وغیرہ۔ میں سنتا رہا اور میں نے محسوس کیا۔ کہ ڈاکٹر صاحب نہ صرف مہاراجہ کے خلاف اپنے دل میں بہت سخت بغض کے جذبات رکھتے ہیں بلکہ یہ سن کر کہ میرے مہاراجہ کے ساتھ تعلقات ہیں اور مہاراجہ نے مجھے سرکاری ملازمت دی ہے مجھے بھی کچھ نیم حاسدانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈیرہ دون میں جب سردار گوردیال سنگھ نے مجھ سے زبانی کہا۔ کہ مہاراجہ نے مجھے ملازمت دے دی ہے اور میں نابھہ چلا جاؤں تو آپ نے کہا تھا۔ کہ آپ ایک دو روز میں ہی ہوم ممبر اور اکونٹنٹ جنرل کے نام میری ملازمت کے متعلق حکم بھیج دیں گے مگر ریاستوں کی گاڑی کے پرزے بہت آہستہ چلتے ہیں۔ سردار گوردیال سنگھ مصروفیت کے باعث ہوم ممبر اور اکونٹنٹ جنرل کو حکم بھیجنا بھول گئے اور دو تین روز کے بعد کنسرو کے جنگلات میں مہاراجہ کے ساتھ شیر کے شکار کے لیے چلے گئے۔ یعنی میں نابھہ میں بحکم مہاراجہ ملازم تو ہوں مگر میری تقرری کا کہیں کوئی حکم نہیں اور نہ کسی کو علم ہے۔ ڈاکٹر سیوا سنگھ کو میرے کہنے کے باوجود یقین نہ آتا تھا کہ میں نابھہ میں ملازم ہو گیا ہوں۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ریاستوں میں ملازم ہونا اور کسی مہاراجہ یا نواب تک رسائی حاصل کرنا بہت ہی مشکل اور پچھلے جنم کے اچھے کرموں کے باعث ہی ممکن ہے۔ وہ کئی روز تک یہی سمجھتے رہے کہ شاید میں غلط بیانی کر کے ان کے پاس چند روز گزارنے کے لیے آیا ہوں اور دراصل ملازم نہیں ہوا۔ چنانچہ آپ دن میں ایک آدھ بار یہ ضرور کہہ دیتے کہ انسان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ بیکار نہیں رہنا چاہیئے کام کرنا چاہیئے۔ دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ اور اگر کم تنخواہ پر بھی کہیں ملازمت مل جائے تو کر لینی چاہیئے اس تمام نصیحت کا مقصد یہ تھا کہ میں ان کے گھر پر پڑا اپنا وقت ضائع نہ کروں اور کہیں جا کر کوئی کام کروں۔

ڈاکٹر سیوا سنگھ بجا ہے غیر ضروری طور پر کفایت شعار تھے اور مہمانوں کی صورتیں دیکھنا ان کے لیے مسرت اور خوشی کا باعث نہ تھا اور میں یہ محسوس کرتا تھا۔ کہ گو یہ چچا ہیں مگر ان کے گھر پر رہنا اور ان کے لیے بار ثابت ہونا مناسب نہیں۔ مگر کرتا کیا۔ وہ گیارہ روپے بھی خرچ ہو گئے جو نابھہ سٹیشن پر اترتے وقت جیب میں تھے۔ نابھہ میں کوئی ایسی دوسری جگہ نہ تھی جہاں رہتا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی "نصیحتوں" کا سلسلہ زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھنا شروع ہوا۔ جب بھی میں ان کے سامنے جاتا۔ وہ یہی فرماتے کہ جھوٹ نہ بولنا چاہیئے۔ انسان کو کام کرنا چاہیئے۔ وقت کی قدر کرنی چاہیئے۔ بیکار رہنا باعث عزت نہیں۔ میں پریشان

Marfat.com

تھا۔ کہ کیا کروں۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں جتنا بھی ممکن ہو دُور رہوں۔ میں صبح ان کے جاگنے سے پہلے بیدار ہوتا۔ کوئی کتاب لے کر شہر سے باہر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ کئی میل دُور نکل جاتا۔ کسی کنوئیں یا نہر پر غسل کرتا۔ کھیتوں یا نہر کے کنارے بیٹھا کتاب پڑھتا اور جب بارہ بجے کھانے کا وقت ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کے گھر واپس پہنچتا۔ گھر پر کھانے کے لیے بیٹھتا تو ڈاکٹر صاحب پھر وہی نصیحتیں شروع کر دیتے۔ میں بے غیرت اور ڈھیٹ لوگوں کی طرح یہ نصیحتیں سنتا۔ کھانا کھانے کے بعد پھر گھر سے نکلتا اور شہر سے باہر کھیتوں میں یا ریلوے کی پٹڑی پر جا بیٹھتا اور رات کو آٹھ نو بجے پھر واپس آتا۔ کھانا کھاتے ہوئے پھر نصیحتیں سنتا اور سو جاتا۔ یہ دن میرے لیے بہت تکلیف کے تھے۔ مگر کرتا بھی کیا۔ اگر ملازم نہ ہوتا تو چلا جاتا۔ یہ سوچ کر دن گزار رہا تھا۔ کہ مہاراجہ آئیں۔ تنخواہ ملے تو کوئی مکان لے کر رہوں۔

کئی دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی پنشن لینے خزانہ میں چلے گئے۔ خزانہ کے قریب ہی اکونٹنٹ جنرل کا دفتر تھا۔ خزانہ سے اپنی پنشن کا روپیہ لے کر اکونٹنٹ جنرل سے ملنے چلے گئے۔ اکونٹنٹ جنرل سے آپ نے پوچھا۔ آپ کے پاس کسی دیوان سنگھ کے ملازم ہونے کے متعلق مہاراجہ کا حکم پہنچا ہے۔ اکونٹنٹ جنرل نے اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ جواب ملا کوئی حکم نہیں پہنچا۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب واپس گھر پہنچے۔ اب ان کو پورا الیقین ہو گیا۔ کہ میں ان کو دھوکہ دے کر ان کے مکان پر مقیم ہوں۔ ملازم نہیں ہوا اور ان کے ساتھ چار سو بیس کی جا رہی ہے۔ میں رات کو نو بجے حسبِ معمول باہر سے واپس کھانے کے وقت پہنچا تو آپ بہت غصہ میں تھے۔ دیکھتے ہی مجھ پر برس پڑے کہ بغیر کام کے زندگی کے دن گزارتے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ آجکل کے زمانہ میں جھوٹ بولنے کو تو کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اور آپ نے اکونٹنٹ جنرل سے پوچھا ہے۔ میں فی الحقیقت ملازم نہیں اور دھوکہ دیتے ہوئے ان کے مکان پر پڑا ہوا ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے اس سلوک کو بہت بری طرح محسوس کرتا تھا۔ میں نے یوں اپنے ایک چچا زاد بھائی سردار صاحب سنگھ کو جو وہاں سب انسپکٹر پولیس تھے خط لکھ کر روپے منگائے مگر وہ صرف پچیس روپیہ تھے۔ ان پچیس روپیہ میں نہ مکان کرایہ پر لے سکتا تھا نہ کھانا پکانے کے لیے ملازم رکھ سکتا تھا۔ نہ یہ اخراجات کے لیے کافی تھے کرتا تو کیا ــــ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر رہنے اور وقت گزارنے کے لیے مجبور تھا۔ مہاراجہ کے انتظار کا ایک ایک دن سال سال بھر کا محسوس ہو رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب کی "نصیحتوں" کے سلسلہ میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس زندگی سے بہت تنگ آ چکا تھا اور کئی دفعہ خیال آیا۔ کہ نابھہ سے چلا جاؤں مگر اس توقع پر کہ مہاراجہ آج آتے ہیں کل آتے ہیں نہ جا سکا۔

میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر غالباً ایک ماہ کے قریب رہا۔ ایک دن صبح کے وقت شہر میں توپوں کی آواز سنائی دی۔ یہ توپیں مہاراجہ کے واپس نابھہ میں پہنچنے کی سلامی کی تھیں۔ میری روزانہ زندگی اور ڈاکٹر صاحب کی نصیحتیں میرے لیے ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ جب مجھے معلوم ہوا۔ کہ مہاراجہ واپس نابھہ پہنچ گئے ہیں۔ تو میں نے مہاراجہ کو ایک خط بذریعہ رجسٹری بھیجا جس کا مفہوم یہ تھا:

Marfat.com

"یور ہائینس!

ڈیرہ دون میں سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے بتایا تھا کہ میں ملازم ہوگیا ہوں اور ملازمت کے متعلق حکم ہوم ممبر اور اکونٹنٹ جنرل کو ایک دو روز میں ہی بھیج دیا جائے گا۔ مگر اب تک کوئی حکم نہیں پہنچا۔ میں یہاں نابھہ میں سردار صاحب ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان پر مقیم اور مہمان ہوں۔ کیونکہ میرے پاس ایک پلیسہ خرچ کے لیے نہیں۔ نہ کوئی رہنے کے لیے دوسری جگہ ہے۔ میں اس موجودہ زندگی سے انتہائی تنگ آچکا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو مہمانوں کی منحوس صورت دیکھنا گوارا نہیں گو وہ میرے چچا ہیں۔ یہ خط آپ کے پاس کل پہنچ جائے گا اور میں پرسوں شام تک انتظار کروں گا۔ اگر پرسوں شام تک جناب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا اور میری ملازمت کا حکم اکاؤنٹنٹ جنرل کے پاس نہ پہنچا۔ تو میں پرسوں رات کی گاڑی یہاں سے لاہور چلا جاؤں گا۔ میرے لیے اب مزید عرصہ تک انتظار کرنا ممکن نہیں۔"

اس خط کو میں نے بذریعہ رجسٹری بھیجا اور لفافہ پر پرسنل بھی لکھ دیا۔ تاکہ مہاراجہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے خط بھیجنے کے بعد میں نے لاہور جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کیونکہ میں نے خیال کیا کہ مہاراجہ بڑے آدمی ہیں اس خط کا جواب جلدی کیا دیں گے۔ میرے لیے مزید عرصہ تک نابھہ میں رہنا ممکن نہیں۔ اگر مہاراجہ چاہیں گے تو میں لاہور سے پھر آجاؤں گا۔

یہ خط مہاراجہ کو اگلے روز پہنچ گیا۔ آپ نے خط پڑھتے ہی سردار زورا سنگھ ہوم ہولڈ منسٹر کو طلب فرمایا اور کہا۔ کہ ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان پر دیوان سنگھ ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے پاس جائیے۔ سرکاری مکان کا رہنے کے لیے انتظام کر دیجئے۔ سرکاری ملازم دیجئے۔ جتنے روپیہ کی ضرورت ہو وہ دیجئے اور بطور سرکاری مہمان ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائیے۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس حکم کے ملتے ہی شام کو چار بجے کے قریب سردار زورا سنگھ ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان پر پہنچے۔ میں حسب معمول گھر پر موجود نہ تھا۔ "دورہ" پر تھا یعنی ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ جا کر شہر سے کئی میل دور بیٹھا تھا۔ سردار زورا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچ کر ملازم کو آواز دی۔ ملازم باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دی کہ سردار زورا سنگھ آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سردار صاحب کو اندر بلایا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد سردار زورا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ کے ہاں جو سردار جیون سنگھ رہتے ہیں مہاراجہ نے حکم دیا ہے کہ ان کے لیے سرکاری کوٹھی، سرکاری مہمان داری روپیہ اور جس شے کی ضرورت ہو انتظام کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک ملازم جیون سنگھ (جو پہلے فوج میں تھا اور فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے پاس جائیداد کا کرایہ وغیرہ وصول کرنے پر ملازم ہو گیا تھا) پاس کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب سردار زورا سنگھ کے منہ سے یہ سنا۔ کہ مہاراجہ نے جیون سنگھ کو روپیہ اور کوٹھی کا حکم دیا ہے تو ڈاکٹر صاحب بہت حیران ہوئے اور ان کو خیال ہوا کہ ریاستوں کا معاملہ ہے یہ جیون سنگھ شاید ان کی مخبری کرتا ہوگا۔ جو اس کو روپیہ اور کوٹھی دینے کا حکم ہوا۔ جیون سنگھ پریشان کہ مہاراجہ نے بغیر درخواست کے اتنی مہربانی کیوں کی۔ حیرانی کی اس فضا کو دیکھ سردار زورا سنگھ حیران کہ معاملہ کیا ہے۔ مہاراجہ نے حکم کیوں دیا اور کس کے لیے دیا۔ چنانچہ سردار زورا سنگھ نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا یہی

Marfat.com

سردار جیون سنگھ ہیں جو آپ کے ہاں بطور مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خیال آیا کہ یہ حکم دیوان سنگھ کے متعلق ہے۔ جو نئے سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ میں نام بھول گیا تھا۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ مہاراجہ نے یہ حکم دیوان سنگھ کے متعلق دیا ہے اور دیوان سنگھ دراصل ملازم ہو گیا ہے اور اس کے فی الحقیقت مہاراجہ کے ساتھ تعلقات ہیں۔ آپ نے سردار زورا سنگھ کو جواب دیا۔ کہ آپ مہاراجہ صاحب سے کہیئے کہ دیوان سنگھ ڈاکٹر صاحب کا حقیقی بھتیجا ہے۔ کوئی بیگانہ نہیں۔ اس کا اپنا گھر ہے اور وہ بہت آرام سے ہے۔ اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے۔ کوئی کمی نہیں۔ وہ جو کچھ چاہے یہاں اپنے گھر سے لے سکتا ہے۔ ہم حضور کے قدیمی نمک خوار ہیں اور شکر گزار ہیں کہ سرکار نے ہمارے خاندان کے ایک اور ممبر کو سرکاری خدمت کا موقع دیا۔ ہماری تو خواہش ہے کہ ہمارے خاندان کا بچہ بچہ حضور کی وفاشعاری کے ساتھ خدمت انجام دے۔ یہ سن کر سردار زورا سنگھ اپنے گھر چلے گئے۔

میں حسبِ معمول آٹھ بجے کے قریب واپس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب میرا انتظار فرما رہے تھے جب میں نے صحن میں قدم رکھا اور انہوں نے میرے پاؤں کی آہٹ سنی تو آپ نے کمرہ کے اندر سے آواز دے کر پوچھا۔ کون ہے۔ میں نے بھیگی اور سہمی ہوئی بلی کی طرح آہستہ سے جواب دیا۔ جی میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے شفقت کے ساتھ مجھے اپنے پاس اندر بلا لیا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں بیٹھنے کے لیے سرکنڈے کے چھ سات مونڈھے تھے۔ جن پر ہرنوں کی کھالیں منڈھی ہوئی تھیں۔ ایک مونڈھے پر بیٹھنے کے لیے مجھے حکم ملا۔ میں بیٹھ گیا تو آپ نے ہرنامی ملازمہ کو آواز دی۔ ہرنامی کاکے کے لیے کھانا لاؤ (نابھہ پٹیالہ اور جیند کی ریاستوں میں والیانِ ریاست کے لڑکوں اور عزیزوں کو تو کنور صاحب کہتے ہیں اور اہلکاروں اور افسروں کے لڑکوں اور چھوٹی عمر کے رشتہ داروں کو "کاکا جی" کہتے ہیں۔ ہرنامی جب کھانا لائی میں مونڈھے پر بیٹھا اور آگے تپائی رکھ کر کھانا کھا رہا تھا تو ہرنامی کو حکم ملا۔ کہ آئندہ دونوں وقت دال کے ساتھ آلو یا کوئی سبزی بھی بنائی جائے۔ جیون سنگھ ملازم کو حکم دیا گیا۔ کہ کل صبح اوپر کے چوبارے میں ایک پلنگ بچھا دیا جائے۔ ایک چھوٹا تخت پوش رکھا جائے۔ گودام کے کمرہ میں سے پانی کے لیے ٹب نکال کر وہاں پہنچا دیا جائے اور کوئی ملنے والا آئے تو اس کے لیے ایک کرسی اور ایک مونڈھا بھی وہاں رکھ دیا جائے۔ گویا کہ سیاسی قیدی کو سی کلاس سے یک لخت اے کلاس میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔ میں حیران کہ ڈاکٹر صاحب آج بہت ہی مہربانی فرما رہے ہیں۔ وجہ کیا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ڈاکٹر سیوا سنگھ جب تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تو میرے والد مرحوم اس زمانہ میں ڈاکٹر تھے اور ان کے زور دینے پر ہی ڈاکٹر سیوا سنگھ کو ڈاکٹری پڑھنے کے لیے داخل کیا گیا تھا اور میرے والد نے اکثر آپ کی مالی امداد بھی کی تھی۔ شاید پرانے زمانہ کے تعلقات اور والد مرحوم کے احسان کا احساس ہوا ہے یا ویسے ہی ان کو خیال آیا ہے یا خاندانی محبت کے باعث مہربانی فرما رہے ہیں میں نے کہا آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں میں تو غالباً "کل رات واپس لاہور جا رہا ہوں۔ اتنے روز تک تو میری ملازمت کا حکم جاری نہیں ہوا۔ اب کیا توقع ہے میرے یہ الفاظ سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا کہ سردار زورا سنگھ ہوم ہولڈ منسٹر شام کو آئے تھے۔ مہاراجہ نے رہائش کے لیے کوٹھی۔ ملازم۔ سرکاری مہمان سرائے

Marfat.com

اور روپیہ دینے کا حکم صادر فرمایا ہے اور آپ نے سردار زوراسنگھ سے کہہ دیا ہے کہ دیوان سنگھ آپ کا بھتیجا ہے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نہیں رہ سکتا اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

میں یہ سن کر سمجھ سکا۔ کہ ڈاکٹر صاحب آج کیوں فرماتے ہیں۔ میں متفکر تھا۔ کہ مہاراجہ نے کیا حکم دیا۔ میں نے پوچھا۔ سردار زوراسنگھ کا مکان کہاں ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت غصہ کی حالت میں بولے کہ جو کہنا تھا سردار زوراسنگھ سے کہہ دیا ان سے ملنے کی ضرورت نہیں۔

میں صبر کیوں کر کرتا۔ ڈاکٹر صاحب کا ملازم جیون سنگھ میرے ساتھ بہت اخلاص سے پیش آتا تھا اور میری بہت عزت کرتا تھا بلکہ وہ ڈاکٹر صاحب سے پوشیدہ مجھے کھانے کے ساتھ آم کا اچار بھی دیا کرتا تھا۔ جو دال کے ساتھ ایک ایکسٹرا ڈش کی حیثیت رکھتا۔ میں نے اس سے اشارہ سے باہر چلنے کو کہا اس کے باہر جانے کے بعد میں بھی پیشاب کے بہانہ اٹھا۔ باہر گیا اور باہر جا کر میں نے جیون سنگھ سے سردار زوراسنگھ کے آنے اور بات چیت کے تمام حالات پوچھے۔ حالات معلوم کرنے کے بعد دریافت کیا کہ سردار زوراسنگھ کہاں رہتے ہیں۔ جیون سنگھ نے بتایا۔ کہ ریلوے سٹیشن کے پاس منڈی ہے اس منڈی میں ان کی اپنی ذاتی بلڈنگ ہے اس بلڈنگ کے اوپر کے حصہ میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے سردار زوراسنگھ کا مکان ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ میری جیب میں ٹانگہ کے لیے پیسے نہ تھے۔ میں پیدل چلا گیا۔ سردار صاحب کے مکان پر پہنچ کر آواز دی۔ سردار صاحب کا ملازم نیچے آیا۔ اس نے نام پوچھا۔ میں نے کہا۔ ڈاکٹر سیوا سنگھ کے مکان سے دیوان سنگھ۔ ملازم نے اطلاع دی۔ تو سردار زوراسنگھ نیچے آ گئے۔ آپ نے ہاتھ جوڑ کر سکھوں کی طرح ست سری اکال کہا۔ میں نے بھی اسی طرح جواب دیا۔ میں نے کہا میں شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے تھے۔ بے وقت آپ کو تکلیف اس لیے دی تھی۔ کہ کہیں آپ مجھ سے ملے اور بات کیے بغیر مہاراجہ کو وہ نہ کہہ دیں جو ڈاکٹر صاحب نے آپ سے کہا ہے۔ سردار زوراسنگھ نے کہا۔ کہ ذمہ داری کا سوال تھا آپ مجھ سے ملے بغیر مہاراجہ سے کچھ نہ کہتے اور آپ صبح مجھ سے ملنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے ہاں پھر آنے والے تھے۔ سردار زوراسنگھ کے ساتھ فیصلہ کیا کہ آپ کل صبح آٹھ بجے تشریف لائیں گے۔ میں ان کا انتظار کروں۔

سردار زوراسنگھ سے ملنے کے بعد میں واپس آیا۔ ڈاکٹر صاحب میرے انتظار میں تھے کہ کہاں چلا گیا آپ نے پوچھا کہاں تھے۔ میں نے کہا۔ کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرنے چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید مہربانی فرماتے ہوئے ہرنامی کو حکم دیا۔ کہ کاکا کے لیے ایک گلاس دودھ لاؤ۔ پورے ایک مہینے میں شاید یہ پہلا موقع تھا۔ کہ مجھے "کاکا جی" کا لقب نصیب ہونے کے بعد ایک گلاس دودھ بھی ملا۔

اگلے روز میں صبح حسب معمول جاگا۔ مگر آج "دورہ" ملتوی تھا۔ ضروری حاجات سے فارغ ہو کر پھر رضائی اوڑھ کر لیٹ گیا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب نہا کر فارغ ہوا۔ کپڑے پہنے اور گھر سے باہر نکل کر گلی میں سردار زوراسنگھ کا انتظار کرنے لگا۔ دماغ میں مختلف خیالات تھے۔ رات کو سردار زوراسنگھ نے کہا تھا۔ کہ مہاراجہ نے رہائش کے لیے کوٹھی دینے کا حکم فرمایا ہے مگر میرے پاس ایک بستر اور ایک ٹرنک

Marfat.com

ہے۔ جس کوٹھی میں جا کر رہوں گا وہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ کہ یہ نئے اہلکار کہاں سے تشریف لے آئے جن کا اثاث البیت صرف ایک بستر ہ اور ایک ٹرنک ہے۔ اس ایک بستر ہ اور ایک ٹرنک کو ڈرائنگ روم میں رکھوں گا۔ بیڈروم میں، ڈائننگ روم میں یا سٹور روم میں۔ ملازم لوگ کیا کہیں گے۔ اسی خیال میں غرق تھا کہ سامنے سے سردار زوار سنگھ دو سفید گھوڑوں والی سرکاری فٹنی میں آتے ہوئے دکھائی دینے میں آگے بڑھا۔ گاڑی کھڑی ہوگئی۔ سردار صاحب نے نیچے اتر کر ہاتھ ہلایا۔ پھر پاس بٹھا لیا اور کوچوان کو حکم دیا کہ چلو گیسٹ ہاؤس والی سڑک پر۔ سردار زورا سنگھ نے کہا کہ پہلے گیسٹ ہاؤس کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں کئی ایک سرکاری کوٹھیاں ہیں۔ آپ ان میں سے جو پسند کیجئے اس میں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا جائے میں نے جواب دیا۔ کہ میں تنہا بغیر بیوی وغیرہ کے ہوں اور میری زندگی بھی بالکل سادہ ہے۔ میں اپنے ساتھ بالکل مختصر سا سامان رکھتا ہوں۔ کوٹھی کیا کروں گا۔ میرے لیے تو اگر دو تین کمروں والے چھوٹے سے مکان کا انتظام ہو جائے تو کافی ہے۔ اس پر سردار زورا سنگھ مجھے نابھہ کی سرائے شادیات اور وسیع بلڈنگ کئی لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوئی تھی۔ نصف روپیہ ریاست نابھہ نے دیا تھا اور نصف پبلک نے چندہ کے ذریعہ جمع کیا تھا۔ یہ سرکاری مہمانوں کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی اور اس میں براتیں بھی ٹھہرتی تھیں۔ اس میں وسیع ہال، بہت سے کمرے اور کونوں پر چار پانچ چھوٹی چھوٹی خوبصورت کاٹیج بھی تھیں (میں لے گئے۔ اس بلڈنگ کی ایک کاٹیج کو دکھایا۔ جسے میں نے پسند کیا۔ ایک چھوٹا سا سونے کا کمرہ۔ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم۔ غسل خانہ۔ باورچی خانہ وغیرہ صاف ستھرے کمرے سردار صاحب نے اس کو فرنش کرنے کا حکم دیا۔ سرکاری باورچی اور ایک ملازم کا انتظام ہوگیا۔ سرکاری رسد یعنی سامان خوراک کے روز بھیجنے کے لیے چِٹ بھیج دی گئی۔ یہ تمام انتظام ہونے کے بعد سردار زورا سنگھ نے پوچھا۔ کتنا روپیہ نقد چاہیئے۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہ تھا۔ مگر نیا اہلکار پرانے ریاستی اہلکار سے اپنے افلاس کا اظہار کیونکر کرتا۔ میں نے بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ کہ نہیں روپے کی ضرورت نہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ سردار صاحب اپنے کام پر واپس چلے گئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر آگیا۔ میرے آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے مکان کا اوپر کا چوبارہ بھی میرے لیے فرنش ہو چکا تھا۔ اس چوبارہ میں ایک پلنگ ایک تخت پوش۔ ایک کرسی۔ ایک مونڈھا۔ ایک چھوٹی میز اور غسل کے لیے ایک ٹب پہنچ گیا تھا۔ میں حیران کہ ڈاکٹر صاحب کی اس مہربانی سے کیونکر انکار کیا جائے۔ جرأت نہ ہوتی تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے قریب سوچتا رہا۔ آخر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ کھانا کھانے کے بعد نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔ کہ سردار زورا سنگھ ملے تھے۔ انہوں نے مہاراجہ کے حکم کے باعث مشورہ دیا ہے کہ میں ضرور دوسری جگہ رہوں۔ چنانچہ انہوں نے سرائے شادیات کی بلڈنگ کی اوپر کی ایک کاٹیج میں میرے لیے انتظام کیا ہے۔ میں اب وہاں جاؤں گا۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب بیحد خفا ہوئے۔ بزرگانہ نصیحتیں شروع ہوئیں۔ کہ گھر کا مکان چھوڑ کر دوسری جگہ جانا تباہی کا باعث ہے۔ یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سامان چوبارہ میں پہنچ چکا ہے۔ بھتیجا کی پوزیشن بیٹے کے برابر ہوتی ہے لوگ کیا کہیں گے۔ خاندان کے لوگوں میں اتفاق ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

میں سنتا رہا۔ دو گھنٹہ تک یہ کش مکش جاری رہی۔ ڈاکٹر صاحب مجھے جانے نہ دیتے تھے۔ میں جانا چاہتا تھا دو گھنٹہ کی کش مکش کے بعد یہ فیصلہ ہوا اور مجھے اس شرط پر جانے کی اجازت ملی کہ میں گو رہوں تو سرائے شادیات کی کاٹیج میں مگر کھانا دونوں وقت ڈاکٹر صاحب کے ہاں کھاؤں۔ چنانچہ میں نے جیون سنگھ کو مزدور لینے کے لیے بھیجا۔ مزدور سے سامان اٹھوا کر جیون سنگھ کے ساتھ سامان سرائے شادیات میں بھجوایا۔ اس کے بعد خود وہاں گیا۔ میرے جانے سے پہلے اس کاٹیج میں دریاں بچھ چکی تھیں۔ برتن وغیرہ پہنچ چکے تھے۔ میزوں پر چمنیاں صاف کر کے لیمپ رکھے گئے تھے۔ کھانے کا سامان۔ آٹا۔ سبزی۔ گوشت۔ دال گھی وغیرہ پہنچ چکا تھا۔ اور ایک باورچی اور ایک ملازم موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو آپ پچاس روپے قرض دے دیجئے اور دیتے ہوئے کہا۔ بیٹا یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔ اگر تم چاہو تو ہزار روپیہ لے سکتے ہو۔ پچاس کا کیا سوال ہے۔ روپیہ لینے کے بعد میں سرائے شادیات میں چلا گیا۔ میری تقرری کا حکم اس روز سے جاری ہوا۔ جس روز میں ڈیرہ دون سے مہاراجہ سے ملا تھا۔ اس سرائے شادیات میں تین ماہ کے قریب بطور سرکاری مہمان رہا۔ پھر میں نے یہاں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ کرایہ پر مکان لے کر اس میں چلا گیا۔ یہاں نابھہ میں اڑھائی تین سال کے قریب رہا۔ میری موجودگی میں ہی وہاں انقلاب ہوا اور مہاراجہ گدی سے دست بردار ہوئے۔ مہاراجہ کی دست برداری کے بعد برٹش ایڈمنسٹریٹر نے مجھے گرفتار کیا۔ تو پھر اسی سرائے شادیات کی بلڈنگ کی کاٹیج میں مجھے تین ماہ نظر بند رکھا گیا اور جب رہائی ہوئی تو میرا ریاست نابھہ میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ کئی بار وہاں کی گورنمنٹ کو لکھا کہ مجھے نابھہ آنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں ان لوگوں سے مل سکوں جن کے ساتھ دل کو تعلق رہا۔ مگر نابھہ گورنمنٹ نے یا تو جواب نہ دیا۔ اگر دیا تو یہی کہ اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مگر دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر کبھی نابھہ گیا تو اس سرائے شادیات کی بلڈنگ کو ضرور دیکھوں گا۔ جہاں شروع میں بطور مہمان اور آخر میں بطور قیدی کے رہا۔

ان تمام واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حالات غیر موافق ہوں تو عزیز و اقارب بھی نفرت کرنے ہیں اور حالات موافق ہوں تو یہ نفرت محبت میں بدل جاتی ہے۔

نسل اور صحبت کا اثر

دہلی میں میرے ایک دوست محمد یوسف صاحب تھے جو خواجہ حسن نظامی اور ان کے دوستوں میں بھی عزیز سمجھے جاتے۔ ان یوسف صاحب کو مالیر کوٹلہ کی ایک حسین طوائف شریفن سے عشق ہو گیا اس شریفن کا پہلے تعلق نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے ساتھ تھا۔ یوسف صاحب خوبصورت ہیں۔ شریفن کو بھی یوسف صاحب سے بے حد محبت ہو گئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس محبت کے سلسلہ میں شریفن نے ہی پہلے قدم اٹھایا۔

Marfat.com

یوسف صاحب اور شریفن کا تعلق پہلے تو راز میں رہا۔ اور شریفن کی والدہ اور اس کے بھائیوں کو کوئی علم نہ ہوا۔ ان تعلقات کے بڑھنے پر جب شریفن کے خاندان کے لوگوں کو علم ہوا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور قدم قدم پر مخل ہونا چاہا۔ کیونکہ یہ لوگ نوابوں اور مہاراجوں کے متلاشی تھے۔ یوسف صاحب کے ذرائع آمدنی محدود تھے۔ اور وہ مالی اعتبار سے شریفن کے گھر والوں کی خواہش پوری نہ کر سکتے تھے۔ آخر کشمکش شروع ہوئی۔ شریفن اور یوسف صاحب آپس میں تعلقات قائم رکھنا چاہتے تھے مگر شریفن کے والدین قدم قدم پر مخل ہوتے۔ یہ تعلقات کچھ عرصہ تک تو در پردہ جاری رہے۔ آخر یوسف صاحب کے لیے مشکلات پیدا ہوئیں اور آپ نے چاہا کہ آپ کی شریفن کے ساتھ شادی ہو جائے۔ شادی کے لیے آپ نے مشورہ کیا تو ایڈیٹر "ریاست" نے کہا کہ شریفن کے خاندان کے لوگوں کو سمجھا کر ان کو بھی شادی پر آمادہ کر لیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے شریفن کی والدہ کو (جو ریٹائرڈ طوائف تھیں) بلوا بھیجا۔ جب وہ آئیں تو ان کو اور یوسف صاحب کو میں بات چیت کرنے کے لیے موٹر میں لے گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہم لوگ کناٹ پیلس کی گھاس پر جا بیٹھے۔ یوسف صاحب نے عزت و احترام یا خوشامد کے باعث اپنا سالک کا کوٹ اتار کر "اماں جی" کے لیے گھاس پر بچھا دیا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے محبت کے فلسفہ پر ایک طرح سے وعظ شروع کیا۔ کہ محبت خدا ہے اور خدا محبت۔ رسول اللہ بھی محبت کو پسند کرتے تھے اور تمام نبیوں، اوتاروں اور گوروؤں نے محبت کے درجہ کو بہت بلند قرار دیا ہے۔ محبت سے روح پاک ہوتی ہے اور اس شادی کو شادی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جس کی تہہ میں محبت نہ ہو۔ وغیرہ۔ آخر میں کہا کہ چونکہ یوسف صاحب اور شریفن کی آپس میں محبت ہے اس لیے ان دونوں کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ تاکہ شریفن حرام کی زندگی کو چھوڑ کر ایمان و راحت کی زندگی بسر کرے۔ شریفن کی والدہ کو میں نصف گھنٹہ کے قریب سمجھاتا رہا اور وہ میرا منہ دیکھتی رہیں اور خاموشی کے ساتھ سنتی رہیں۔ میں جب اپنی تمام نصیحتوں کا ذخیرہ ختم کر چکا تو شریفن کی والدہ نے پنجابی زبان میں (چونکہ یہ مالیر کوٹلہ کی تھیں) جواب دیا جس کا ترجمہ یہ تھا:

"سردار جی! آپ کس خیال میں پھر رہے ہو۔ ہمارے گھروں میں تو محبت کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ہماری بچیاں جب پیدا ہوتی ہیں تو ان کے کانوں میں کہا جاتا ہے کہ آئندہ زندگی میں جو دل چاہے، کرنا۔ مگر کسی سے محبت نہ کرنا۔ جب یہ بڑی ہوتی ہیں تو ایک ہی سبق دیا جاتا ہے کہ محبت، محبت کہنے والے لوگ خود غرض اور بدمعاش ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ یہ شریف لڑکیوں کو گھروں سے نکال کر لے جائیں اور برباد کر دیں۔ ہمارے دل سے پوچھو تو ہم کہتے ہیں کہ اگر لڑکی نے کسی آشنا یا دوست سے محبت کرنی ہو تو بہتر ہے کہ وہ مر جائے اور ہم اس کے جنازہ کو بھی کندھا نہ دیں۔ میں تو سنتی تھی کہ اخبار والے بہت شریف آدمی ہوتے ہیں۔ آپ کہاں کے شریف ہیں جو لوگوں کی لڑکیوں کو برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ہمارا گھر تباہ ہو جائے گا تو آپ کے ہاتھ کیا آئے گا؟"

Marfat.com

شریفن کی والدہ کا جواب سُن کر میں دنگ رہ گیا۔ اس سے کیا کہنا، میں نے سمجھ لیا۔ کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ ہم وہاں سے اٹھے۔ شریفن کی والدہ کو برشاہ بولا پراس کے مکان کے قریب چھوڑا اور ہم دونوں واپس دفتر" ریاست" میں پہنچے۔ دیر تک مشورہ ہوتا رہا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر فیصلہ ہُوا۔ کہ شریفن بالغ ہے۔ وہ خود چاہتی ہے کہ اس کی شادی ہو۔ اس لیے اس کی ماں کی پروا نہ کرتے ہوئے نکاح کرلیا جائے۔

شریفن کی والدہ اور اس کے بھائی شریفن کی بہت حفاظت کرتے تھے کہ یوسف اس کو کہیں نکال کر نہ لے جائیں۔ اس کو اکیلے کبھی نہ جانے دیتے۔ ہمیشہ ساتھ جاتے۔ میں نے شریفن کے بڑے بھائی محمد عمر کو پیغام بھیجا۔ کہ وہ شام کو شریفن کے ساتھ آکر مجھ سے مل جائے۔ یوسف کے ساتھ مشورہ کرنا ہے۔ محمد عمر شریفن کو ساتھ لے کر چھ بجے کے قریب میرے مکان پر آگیا۔ یوسف موجود تھے۔ کچھ دیر تک تو ہم باتیں کرتے رہے اس کے بعد میں نے یوسف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ ایک ضروری معاملہ کا پتہ لینا ہے۔ (اس زمانہ میں نواب بھوپال بنام ایڈیٹر" ریاست" کا مقدمہ چل رہا تھا) بھوپال کے دو افسر آج شام کی کسی گاڑی دہلی سے جائیں گے اور معلوم کرنا ہے کہ وہ کس گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ یوسف صاحب نے بناوٹی تشویش کا اظہار کیا کہ کس طرح پتہ لینا چاہیئے۔ محمد عمر پنجاب کا رہنے والا مستعد آدمی تھا ہماری تشویش کو دیکھ کر کہنے لگا:

"کس بات کی تشویش ہے۔ مجھے بتائیے میں پتہ لاتا ہوں۔"

محمد عمر کو میں نے ایک روپیہ ٹانگہ کے لیے دیا اور کہا۔ کہ دو شخص ہیں۔ دونوں نے اچکن اور ہیٹ پہن رکھی ہیں۔ تم ریلوے سٹیشن پر سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس جاکر کھڑے ہو جانا۔ جب یہ دونوں آئیں تو پلیٹ فارم پر چلے جانا اور دیکھنا کہ کس گاڑی میں بیٹھے ہیں اور جب تک کہ رات کو جانے والی تمام گاڑیاں چل نہ جائیں ان کی نگرانی کرنا کہ ان سے کون کون ملتا ہے۔ محمد عمر اس ہدایت کے مطابق سٹیشن چلا گیا اور سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس رات کو دس بجے تک کھڑا رہا۔ جب تمام گاڑیاں نکل گئیں تو بیچارا واپس آیا اور اس نے آکر بتایا۔ کہ اس نے خوب نگرانی کی۔ اچکن اور ہیٹ والے بھوپال کے کوئی آدمی کسی گاڑی پر سوار نہیں ہوتے۔ بھوپال کے آدمی کہاں آنے تھے۔ اس بچارے کو تو صرف اس لیے ریلوے سٹیشن بھیجا تھا۔ کہ دو اڑھائی گھنٹہ کے لیے ہمیں شادی کا موقعہ مل جائے۔

محمد عمر کے جانے سے پہلے تمام انتظام ہو چکا تھا اس کے جانے کے بعد دہلی کے تحصیلدار میر حسین رائے صاحب لالہ گوپال داس ریٹائرڈ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و آنریری مجسٹریٹ، مسٹر برج بہاری توکل ایڈووکیٹ اور دو تین اور اصحاب آگئے۔ قاضی صاحب تشریف لے آئے۔ ناشتے، چھوہارے اور مٹھائی منگائی گئی۔ "ریاست" پریس کے فورمین استاد تصدق حسین نے لڑکی کے ولی کے فرائض ادا کئے تصدق حسین پہلے تو ہچکچائے۔ مگر جب ان سے یہ کہا گیا۔ کہ یہ کار ثواب ہے تو آمادہ ہو گئے۔ حق مہر لکھا گیا۔ نکاح نامہ تیار ہُوا اور اس پر تحصیلدار صاحب۔ آنریری مجسٹریٹ اور وکیل صاحبان اور ایڈیٹر" ریاست"

Marfat.com

کے بطور گواہوں کے دستخط ہوئے۔ قاضی صاحب نے شریفن بی بی سے "قبول ہے" وغیرہ پوچھا۔ شریفن نے بھی "ہاں قبول ہے" کہا۔ نکاح ہُوا۔ چھوہارے، بتاشے اور مٹھائی "لڑکی والوں" اور "برات" میں تقسیم ہوئی اور یہ تمام کارروائی نو بجے سے پہلے ختم کر دی گئی۔

دس بجے محمد عمر صاحب تشریف لائے تو اس سے پہلے "لڑکی والے" اور "برات" والے چھوہارے اور مٹھائی کھا کر روانہ ہو چکے تھے۔ کمرہ میں صرف "دلھن یعنی شریفن" "دولھا" یعنی یوسف صاحب اور ایک "گواہ" یعنی ایڈیٹر "ریاست" بیٹھا تھا۔ اور پاس پھولوں کے دو تین ہار پڑے تھے۔ جو دولھا اور دلھن کو شادی کے وقت پہنائے گئے تھے۔ محمد عمر بیچارے کو کیا علم کہ اس کے سٹیشن سے واپس آنے سے پہلے بقول اس کی والدہ کے ان کا گھر برباد ہو چکا ہے اور یوسف صاحب کا گھر آباد ہو چکا ہے۔ محمد عمر کے آنے پر شریفن اپنے بھائی محمد عمر پر برس پڑیں کہ اتنی دیر سے اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اماں گھر میں ناراض ہوتی ہوں گی۔ کہاں چلا گیا تھا اور اس نے سٹیشن پر اتنی دیر کیوں لگائی۔ محمد عمر اگرچہ عمر میں شریفن سے کافی بڑا تھا مگر طوائفوں میں چھوٹی عمر کی لڑکیاں بھی بڑے عمر کے بھائی، ماں اور باپ کو ڈانٹ لیتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ تمام لوگ نکھٹو اور ان کے رحم پر ہیں۔ محمد عمر بیچارے نے اس ڈانٹ کا صرف یہی جواب دیا۔ کہ اگر کام پورے طور پر نہ کر کے آتا۔ تو سردار صاحب (یعنی دیوان سنگھ) ناراض ہوتے۔ اب میں اگر حکم کی پورے طور پر تعمیل یعنی بھوپال کے لوگوں کی اچھی طرح سے نگرانی کر کے آیا ہوں تو تم ڈانٹتی ہو۔ اس کے بعد شریفن اور اس کا بھائی تو اپنے گھر چلے گئے اور یوسف صاحب اپنے گھر۔

اس شادی کا علم سوائے قاضی صاحب، دولہا دلہن یا گواہوں اور "براتیوں" کے کسی دوسرے کو نہ تھا۔ اس وقت تک شریفن کی والدہ اپنی لڑکی کے مجبور کرنے پر صرف اس حد تک آمادہ تھی کہ اس کا تعلق یوسف سے بھی رہے اور وہ پیشہ کے ذریعہ امراء کے طبقہ سے روپیہ بھی پیدا کرتی رہے مگر شادی کے بعد نئے جھگڑے شروع ہوئے۔ شریفن نے دوسرے لوگوں کے ہاں جانا یا ان سے بات تک کرنا چھوڑ دیا۔ اس کی والدہ اور اس کے بھائی مجبور کرتے ہیں مگر یہ نہیں مانتیں۔ نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے پیغام چلے آتے ہیں کہ مالیر کوٹلہ آؤ۔ مگر شریفن دہلی چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ اور نواب صاحب کی پروا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرے لوگ آتے ہیں تو ان کے سامنے نہیں ہوتیں۔ ایک دو ماہ تک جھگڑے کا یہ سلسلہ جاری رہا آخر شریفن نے اپنی والدہ سے کہہ دیا۔ کہ چونکہ اس کا نکاح یوسف صاحب کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ تعلق نہ رکھیں گی۔ اس کو وہ حرام سمجھتی ہیں اور اگر ان لوگوں نے تنگ کیا۔ تو یہ گانا بھی چھوڑ دیں گی اور یوسف صاحب کے گھر جا کر پردہ میں بیٹھ جائیں گی۔ شریفن کے اس انکشاف کو سن کر شریفن کی ماں اور بھائی سر پیٹ کر بیٹھ گئے۔ ان کو اب پتہ چلا کہ ان کا گھر تباہ ہو گیا ہے اور وہ لٹ چکے ہیں ان لوگوں کی نگاہ میں سب سے بڑا مجرم دیوان سنگھ تھا جس نے نکاح کا انتظام کیا۔ ہر روز شکوے۔ ہر روز شکایتیں کبھی یہ کہ شریفن نے روپیہ کمانا چھوڑ دیا۔ کھائیں کہاں سے۔ نواب صاحب مالیر کوٹلہ اتنے سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ اب پلیسہ کی آمدنی نہیں برباد ہو گئے۔ کہاں جائیں کیا کریں۔ یوسف صاحب کی آمدنی کم ہے۔ ہمارے اخراجات

Marfat.com

پورے نہیں ہوتے۔ جب ان شکایتوں کا سلسلہ بہت زیادہ ہوگیا تو یوسف صاحب شریفن کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ اور انہوں نے اپنی بیوی کو پردہ میں بٹھا دیا اور شادی کے بعد دو تین سال کے اندر دو لڑکیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ یوسف صاحب کی آمدنی محدود تھی۔ دو تین سال تو ان کے اچھے گزرے۔ بچوّں کے ہونے کے بعد شریفن کی محبت قدرتی طور پر اپنے شوہر سے کم ہوکر بچوں میں منتقل ہوگئی۔ وہ پہلے تو ساتھ مرنے کا دم بھرتی تھیں۔ اب شکایت ہے کہ فلاں بچے کے لیے ریشمی فراک نہیں آیا اور فلاں بچے کے لیے جوتا اور ٹوپی نہیں۔ ان شکایتوں نے سنجیدہ صورت اختیار کی۔ ادھر شریفن کی ماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ شریفن مطمئن نہیں۔ اس نے پھر اپنی بیٹی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ وہ جب شریفن سے ملتیں یہی کہتیں کہ نواب صاحب نے دو دو سو روپیہ کی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ فلاں راجہ صاحب نے جڑاؤ گلوبند لے دیا تھا اور فلاں سیٹھ نے موٹر لے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان باتوں کا ذکر شریفن کی آنکھوں سے آنسو نکال دیتا۔ کیونکہ اگر اچھے دن دیکھے ہوں تو پھر برے دنوں کا مقابلہ کرنا بہت مصیبت ہوتا ہے شریفن خاندانی طوائف تھی اس نے بچپن ہی سے دیکھا تھا کہ ان کے آنکھ کے اشارے پر کیونکر بڑے بڑے نواب، راجے اور امیر ڈانس کرتے ہیں۔ ایک متوسط درجہ کے گھر میں رہ کر معمولی گزارہ پر کیونکر مطمئن ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دن رات جھگڑے رہنے لگے۔ اور وہ پھر اپنے والدین کے ہاں چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد یوسف صاحب نے بہت کوشش کی کہ یہ واپس آجائے۔ اور گھریلو زندگی بسر کرے مگر یہ اپنے والدین کے ہاتھوں میں تھی۔ یوسف صاحب کو قدرتی طور پر صدمہ ہوا۔ آپ نے اپنی بیوی اور اس کی والدہ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ بھی کچھ عرصہ چلتا رہا۔ آخر یوسف صاحب کو مشورہ دیا گیا۔ کہ جس عورت میں شریفن ان کے پاس رہنا نہیں چاہتی ان کو اپنا خیال بدل دینا چاہیے۔ چنانچہ مقدمہ واپس لے لیا گیا اب شریفن پھر اپنی ماں اور بھائیوں کے پاس غالباً مالیر کوٹلہ میں ہی رہتی ہے۔ اس نے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ دیا ہے۔ اس کی چھوٹی بہنیں اس کے بعد پیشہ کرتی رہیں۔ جن سے ان کو کافی آمدنی تھی۔ اب نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی آمدنی کی کیا صورت ہے۔ یوسف صاحب سے اب باتوں باتوں میں کبھی شریفن کا ذکر آ جاتے تو ان کی پیشانی پر بل سے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دل میں محبت کی جگہ انتقام اور انتقام کے بعد نفرت پیدا ہوچکی ہے اور وہ شریفن کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

اوپر کے ان واقعات سے طوائفوں کی فطرت کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ جب طوائف محبت کے جذبات سے مغلوب ہو تو اپنی طوائفیت کو عارضی طور پر بھول جاتی ہے مگر اس کے بعد جب محبت کے یہ جذبات کم ہوں گے چاہے اس کی وجہ محبت کا بچوں میں منتقل ہونا ہی کیوں نہ ہو دہر عورت کی فطرت ہے کہ اس کی سگائی کے دن سے لے کر بچہ ہونے تک اس کی محبت کا مرکز سو فیصدی اس کا شوہر ہوتا ہے۔ بچہ ہونے کے بعد یہ محبت دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ دسواں حصہ اس کے شوہر کے لیے وقف رہتا ہے باقی نوّے فی صدی بچہّ پیدا ہوتے ہی بچہ میں منتقل ہوجاتی ہے اور جو لوگ اولاد ہونے کے بعد اپنی بیویوں سے محبت کے کم ہونے کی شکایت کرتے ہیں وہ محبت کے فلسفہ سے ناآشنا ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔

Marfat.com

کیونکہ عورت فطرتاً مجبور ہے کہ اس کی محبت بچہ پیدا ہونے سے بعد فوراً بچہ میں منتقل ہو جاتی ہے تو یہ زیادہ طویل عرصہ تک گھریلو زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں تو ان کو ان کے عاشقوں اور مزیولوں کی یاد ہمیشہ تڑپاتی ہے۔

بھوپال اور خیرپور میرس کے مرحوم منسٹر خان بہادر سر اسرار حسن بہت تجربہ کار اور وضعدار بزرگ تھے ایڈیٹر "ریاست" کو اپنا عزیز سمجھتے اور جب بھی دہلی آتے تھے ان سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ انسان، گھوڑا، کتا اور بیل خریدتا ہے تو خریدنے سے پہلے دیکھتا ہے کہ یہ کس نسل کا ہے۔ دوغلا تو نہیں۔ یعنی گھوڑا ہے تو کیا خالص عربی ہے۔ کتا ہے تو کیا خالص سپینیل یا فاکس ٹیریر ہے اور کیا بیل خالص پرشین ہے۔ اگر جانوروں کے متعلق یہ احتیاط ہے تو انسانوں کے ساتھ دوستی۔ رشتہ داری یا تعلقات قائم کرتے ہوئے کیوں نہ نسل یا خاندان دیکھا جائے۔ سر اسرار حسن خاں صاحب کے اس خیال کی تائید میں ایڈیٹر "ریاست" کا بھی یہی تجربہ ہے کہ انسان جس خاندان میں پیدا ہو یا جس فضا میں اس کی پرورش ہو اس کا انسان کے کیریکٹر پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اول تو یہ کیریکٹر بدلتا نہیں اور اگر بدلتا بھی ہے تو اس شخص کے طویل عرصہ تک مسلسل بہت بڑی کوشش اور ضمیر کے ساتھ بار بار جدوجہد کرنے کے بعد۔ دنیا کے کاروبار میں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ جس کے ساتھ واسطہ پڑے گا اس کا پچھلا کیریکٹر کیا ہے اور اگر کیریکٹر میں کمزوریاں ہیں تو کیا ان کی اصلاح ممکن ہے۔

رازداری اور کامیابی

دہلی سے روزانہ "رعیت" جاری ہونے سے کچھ عرصہ پہلے میں ریاست حیدرآباد گیا۔ راستہ میں چند روز ناندیڑ (جہاں کہ گورو گوبند سنگھ صاحب کا وصال ہوا اور جہاں ہندوستان کے اس ایک سب سے بڑے شاعر، شجاع اور محب الوطن کا مزار بھی ہے) ٹھہرا۔ ناندیڑ میں گورو گوبند سنگھ اور شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی خط و کتابت کے متعلق مجھے کچھ ایسے حالات معلوم ہوئے جو سکھ تاریخ میں درج نہ تھے (یہ حالات حیدرآباد سے واپسی پر پمفلٹ کی صورت میں اور امرتسر کے روزانہ اردو "اکالی" کے گورو گوبند سنگھ نمبر میں شائع ہوئے) ناندیڑ سے میں حیدرآباد گیا اور وہاں سے واپسی پر اورنگ آباد اتر کر اس گوردوارہ میں گیا جو بھائی دیا سنگھ (گورو گوبند سنگھ کے زمانہ کے مشاہیر میں سے ایک بزرگ) کے نام سے مشہور ہے اور جہاں بھائی دیا سنگھ اس وقت مقیم ہوئے۔ جب وہ گورو گوبند سنگھ کا خط ظفر نامہ لے کر اورنگ آباد اورنگ زیب کے پاس پہنچے۔ اس گوردوارہ میں گرنتھ صاحب کے سامنے ایک روپیہ بطور نذر رکھ کر میں نے ماتھا ٹیکا (سجدہ کیا) اور بیٹھ گیا۔ اس گوردوارہ کا سفید ریش بوڑھا سادھو مہنت اور اس کی بیوی بھی وہاں موجود تھے۔ میں جب بیٹھ گیا تو اس مہنت کے اور میرے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مہنت: آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔

Marfat.com

میں: میں حیدرآباد سے آرہا ہوں۔

مہنت: کہاں کے رہنے والے ہو۔

میں: میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔

مہنت: کون سا ضلع۔

میں: گوجرانوالہ۔

مہنت: کون سی تحصیل۔

میں: حافظ آباد

مہنت: کونسا گاؤں۔

میں: حافظ آباد خاص۔

مہنت: آپ کون سکھ ہیں۔

میں: کھتری کھنہ۔

مہنت: آپ کا مکان حافظ آباد میں کس طرف ہے۔

میں: جس گلی کے سرے پر ٹھاکر دوارہ اور لالہ جوتی رام کپور کا مکان ہے۔

مہنت: کیا آپ سردار میوہ سنگھ کے لڑکے ہیں۔

میں: نہیں میں ڈاکٹر مدھان سنگھ کا لڑکا ہوں۔ سردار میوہ سنگھ میرے چچا ہیں۔

مہنت: کیا آپ کا نام کرتار سنگھ ہے۔

میں: نہیں میں کرتار سنگھ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میرا نام دیوان سنگھ ہے۔

میرے اس کہنے کے بعد ایک خاموشی سی طاری ہوئی۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اس بوڑھے سفید ریش سکھ مہنت کی آنکھیں کچھ نرم ہو گئی ہیں۔ میں حیران کہ یہاں ہزار ہا میل دور یہ کون شخص ہے۔ جو ہمارے گھر کے تمام لوگوں سے واقف ہے۔ کیونکہ اس نے ایک ایک کا نام لے کر پوچھا کہ فلاں کیسے ہیں اور فلاں کی صحت کیسی ہے۔ میں نے ان سے سوال کیا۔ کہ آپ کس طرح ہم لوگوں کو جانتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ بہت برس ہوئے ایک بار حافظ آباد جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

یہ باتیں جب ہو چکیں تو مہنت صاحب اپنی بیوی کو اندر لے گئے۔ ان کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد ان کی بیوی نے میرے لیے بازار سے مٹھائی منگائی۔ سنگترے وغیرہ پھل ان کے گھر میں موجود تھے انہوں نے میرے سامنے رکھا میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ میرا ان کے گھر آنا ان کے لیے مسرت کا باعث ہے۔ ان لوگوں نے بہت کوشش کی۔ کہ میں دو چار روز ان کے ہاں مہمان رہوں مگر میرا بستر اور ٹرنک ایک ریٹائرڈ سکھ صوبیدار کے ہاں پڑا تھا جو مجھے ناندیڑ ملے تھے۔ اور جنہوں نے مجھے اورنگ آباد آنے کی دعوت تھی۔ ان کے ہاں سے میں صوبیدار کے ہاں پہنچا۔ وہاں کھانا کھایا۔ انہوں نے میرے لیے مرغ پکا رکھا تھا۔ یہ مرغ بہت مرغن تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے محسوس کیا۔ کہ انہوں نے گھی بہت زیادہ ڈال دیا ہے تو انہوں نے مجھے ایک

Marfat.com

کٹوری چربی کی دکھائی۔ جو مرغ پکاتے ہوئے انہوں نے پکانے والے برتن میں سے نکالی تھی اور کہا کہ گھی کا تو ایک قطرہ بھی اس میں نہیں ڈالا۔ بلکہ یہ چربی اس مرغ کی ہے جو پکتے پکتے نکال لی گئی ہیں حیران۔ کیونکہ میری زندگی میں یہ سننے کا پہلا موقع تھا۔ کہ مرغ میں سے بھی چربی نکال لی جاتی ہے۔ میری حیرانی کو دیکھ کر صوبیدار صاحب نے بتایا کہ ان کے ہاں پانچ چھ بھینسیں ہیں۔ ہر رات کو بھینس کے دودھ میں چنے کی دال بھگو دیتے ہیں اور صبح دودھ والی دال ان مرغوں کو کھلاتے ہیں اور ایسی دال پر ہی ان پرندوں کی ہمیشہ پرورش کی جاتی ہے جس کے باعث یہ پرندہ بہت فربہ اور چربی والے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان مرغوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اتنے فربہ مرغے میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اور کبھی سنا بھی نہ تھا۔ کہ بغیر گھی کے مرغ پکایا جائے۔ اور اس کے پکتے پکتے ایک کٹوری چربی نکال لی جائے۔

اورنگ آباد میں ایک رات رہا۔ اگلی صبح روانہ ہوا تو مہنت صاحب ملنے کے لیے تشریف لائے۔ میں پنجاب آیا۔ حافظ آباد پہنچا تو میں نے اپنے چچا سردار میوہ سنگھ کو بتایا۔ کہ اورنگ آباد میں اس طرح مہنت صاحب سب کے متعلق پوچھتے تھے۔ میں نے حلیہ بیان کیا تو خیال ہوا کہ اورنگ آباد والے مہنت صاحب ہمارے ایک رشتہ دار ہیں۔ جنہوں نے میری پیدائش سے پہلے حافظ آباد میں ایک عورت کا قتل کیا تھا۔ قتل کرنے کے بعد وہ بھاگ گئے۔ ریاست حیدر آباد پہنچے۔ اس قتل کے واقعہ کا انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے ذکر نہ کیا اور حیدر آباد میں ہی مقیم ہو گئے۔ جب وہ قتل کرنے کے بعد حافظ آباد سے بھاگے تو نوجوان تھے اور جب میں نے اورنگ آباد ان کو دیکھا تو وہ سفید ریش بوڑھے تھے۔ میرے تمام حالات بیان کرنے کے بعد میرے چچا سردار میوہ سنگھ نے اورنگ آباد مہنت صاحب کو خط لکھا تو ان کا جواب آیا کہ ہاں وہ فی الحقیقت وہی ہیں۔ یہ مہنت صاحب غالباً اب انتقال کر چکے ہیں کیونکہ اس وقت بھی کافی بوڑھے تھے۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ مہنت صاحب اس قتل کے متعلق راز نہ رکھتے تو گرفتار ہو جاتے اور سالہا سال پہلے پھانسی پر چڑھ چکے ہوتے۔ مگر چونکہ انہوں نے راز رکھا آپ نے کسی دوست یا تعلق والے بلکہ اورنگ آباد والی بیوی اور بچوں سے بھی کبھی ذکر نہ کیا اور زندہ رہے اور اپنی طبعی عمر تک پہنچے۔

اس واقعہ کے ساتھ اس قسم کا ہی ایک دوسرا دلچسپ واقعہ سنیے جو راز رکھنے کے متعلق ہے۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں جب میں دہلی جیل میں تھا تو اس وقت سپیشل کلاس والی کاٹیج کے سامنے کی کوٹھڑیوں میں دہلی کا رہنے والا ایک شخص موہن قتل کے الزام میں گرفتار تھا۔ اس موہن نے دہلی میں قتل کیا تو قتل کرنے کے بعد یہ دہلی سے بھاگ کر ناگپور چلا گیا۔ ناگپور پہنچ کر اس نے پان سگریٹ کی دکان جاری کر لی اور زندگی گزارنے لگا۔ دہلی میں پولیس نے اس کے وارنٹ نکال دیے مگر پولیس کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کہاں ہے۔

یہ موہن عیاش طبیعت کا آدمی تھا اور شراب پیتا تھا۔ انسان جہاں بھی رہے وہاں کے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہو جاتے ہیں۔ موہن کی بھی ناگپور میں کئی لوگوں کے ساتھ واقفیت ہو گئی اور اس کے کئی دوست ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی ہو گئے۔ ان دوستوں میں سے ایک شخص اس کا گہرا اور راز دار دوست ہو گیا دونوں اکٹھے شراب پیتے اور اکٹھے ہی عیاشی کرتے۔ چنانچہ ایک روز موہن نے

Marfat.com

اعتماد کرتے ہوئے اس دوست کو بتا دیا۔ کہ وہ دہلی کا رہنے والا ہے۔ وہاں اس نے ایک قتل کیا تھا اور اب وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ یہ بتانے کے بعد بھی دوستی کا سلسلہ جاری رہا اور چھ ماہ کے قریب گزر گئے اس کے بعد ان دونوں دوستوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے دشمنی کی حد تک پہنچ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے پولیس والوں کو جا کر کہہ دیا۔ کہ موہن ایک قتل کے سلسلہ میں مفرور ہے اور اس کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ پولیس نے یہ سنتے ہی اپنے رجسٹر میں رپورٹ لکھی اور اس کے دستخط کرائے۔ اور دستخط کرانے کے بعد موہن کی دکان پر پہنچ کر موہن کو گرفتار کر لیا۔ تھانہ میں لا کر دفعہ ۱۰۹ (آوارہ گردی) کے مطابق اس کو حوالات میں بند کر دیا اور دہلی پولیس کو تار دے کر پوچھا کہ کیا موہن نام کا کوئی شخص قتل کے الزام میں دہلی سے مفرور ہے۔ دہلی سے جواب گیا کہ ہاں ہے۔ چنانچہ موہن پر دفعہ ۱۰۹ کی بجائے ۳۰۲ (قتل) لگا کر اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا کر اسے دہلی جیل لایا گیا اور قتل کے الزام میں اس پر سیشن کورٹ میں مقدمہ چلا اس موہن کا مقدمہ چل رہا تھا کہ میں جیل سے رہا ہو گیا۔ مجھے علم نہیں کہ اس مقدمہ میں موہن کو پھانسی ہوئی یا عمر قید یا بری ہوا۔ مگر ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہے کہ اس پر قتل کے الزام میں گرفتار ہونے اور مقدمہ چلنے کا باعث اس کا راز نہ رکھنا تھا۔ اور اگر یہ ناگپور میں اس دوست پر اپنا راز ظاہر نہ کرتا تو اس پر یہ مصائب نازل نہ ہوتیں۔

اوپر کے ان دو واقعات سے راز رکھنے اور راز کے افشا کرنے کے نتائج ظاہر ہیں۔ یہ پوزیشن تو جرائم کے متعلق ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو سیاسی معاملات، زندگی کے ہر روز کے واقعات اور تجارت وغیرہ ہر کامیابی کے لیے انسان کو راز کی ضرورت ہے اور وہ لوگ بہت بے وقوف اور عاقبت نااندیش ہیں۔ جو اپنا راز غیر ذمہ دار لوگوں کو بتائیں اور یہ توقع کریں کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق ان کا راز کسی دوسرے پر ظاہر نہ کریں گے اور راز کے افشا ہونے پر راز کے افشا کرنے کی شکایت یا گلہ کریں۔ چنانچہ میرا تو خیال یہ ہے کہ کسی اہم راز کو غیر مناسب اور غیر ذمہ دار لوگوں پر ظاہر کرنا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے گلے میں رسی ڈال کر دوسرے کے ہاتھوں میں دے دی جائے اور پھر التجا کی جائے کہ اس رسی کو نہ کھینچئے۔ گلا گھٹ کر مر جاؤں گا۔

رُوحانیت کا تجربہ

اب تو کئی برس سے وقت نہیں ملا۔ مگر پہلے یہ میرا معمول تھا کہ چھ سات جون کے قریب جب دہلی میں گرمی کا زیادہ زور ہوتا تو میں دو ہفتہ کے لیے بمبئی چلا جاتا۔ بمبئی میں ہمیشہ آٹھ اور بارہ جون کے درمیان مون سون کی ہوائیں شروع ہو جاتی ہیں اور موسم بہت پُر فضا ہو جاتا ہے۔ دہلی میں بارش ۲۰ جون کے قریب شروع ہوتی ہے اور بارش سے پہلے کے دو ہفتے دہلی میں حشر سے کم نہیں ہوتے۔ چنانچہ میں بمبئی پہنچ کر جون کے آخری ہفتہ تک منتظر رہتا۔ جب یہاں سے بارش کے متعلق تار پہنچتا تو وہاں سے روانہ ہو جاتا۔ بمبئی کے یہ دو ہفتے بہت دلچسپیوں میں گزرتے۔ چودھری عبدالغنی جنرل سیکرٹری آل انڈیا خلافت کمیٹی (جن سے مہاتما گاندھی نے یاروڈا جیل میں اردو پڑھی اور جن کا لندن میں انتقال ہو گیا تھا) اور مرحوم مولانا عرفان

Marfat.com

(اسسٹنٹ سیکرٹری خلافت کمیٹی) کا زیادہ وقت میرے ساتھ گزرتا۔ آہ! ان دونوں دوستوں کا اخلاص اور محبت میں کبھی نہ بھولوں گا۔

میں دہلی سے روانہ ہوا۔ جب گاڑی کلیان کے سٹیشن پہنچی تو میں نے "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ اس روز کی تازہ خبریں پڑھنے کے لیے خریدا۔ خبریں دس پندرہ منٹ میں ختم ہو گئیں۔ میں سامان باندھ چکا تھا۔ اور ساتھ کی کتابیں بکس میں بند تھیں۔ پڑھنے کے لیے صرف یہ "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ ہی تھا۔ خبریں پڑھنے کے بعد میں نے اس کے اشتہارات دیکھنے شروع کیے تو ایک اشتہار تھا جس کا ترجمہ یہ ہے

روحانی تحریر

آئندہ کے اور پچھلے حالات روح کے ذریعہ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں۔ مُردہ اشخاص سے بھی بات چیت کی جا سکتی ہے۔

محمود بے مصری

یہ اشتہار میرے لیے کشش کا باعث ہوا۔ کیونکہ مجھے شروع سے ہی روحوں کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ایک خبط سا تھا۔ میں بمبئی کے وکٹوریہ ٹرمنس پہنچا تو دفتر "ریاست" بمبئی کے منیجر مسٹر ہربنس لال موجود تھے۔ میں نے یہ اشتہار کاٹ کر ان کو دیا اور کہا کہ کسی وقت ان کے پاس جا کر میری ملاقات کے لیے وقت مقرر کر لیجئے۔ مسٹر ہربنس لال اسی روز مسٹر محمود بے کے پاس پہنچے اور جب ملاقات کے لیے پوچھا تو مسٹر محمود بہت خوش ہوئے۔ وہ اخبار "ریاست" سے واقف تھے اور مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ آپ نے اگلے روز شام کا وقت مقرر کیا اور کہا کہ ایڈیٹر "ریاست" شام کو چائے ان کے ساتھ پئے۔

میں اگلے روز شام کو مسٹر محمود بے کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تکلف کے ساتھ چائے کا انتظام کیا تھا اور وہ ایک خوبصورت یورپین لڑکی (جو اُن کی سیکرٹری تھیں) کے ساتھ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جب پہنچا تو آپ نے میرا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ہم تینوں نے بیٹھ کر چائے پی مقدمہ اور اخبار کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم چائے پی چکے تو میں نے کہا۔ کہ اب میں اصل مقصد بیان کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی روحانی تحریر کو دیکھوں جس کا آپ نے اخبار میں اشتہار دیا ہے۔ مسٹر محمود بے نے بیرا کو آواز دی۔ چائے کی میز خالی کر دی گئی۔ اور آپ نے میرے ہاتھ میں ایک بالکل کورا کاغذ دیا۔ اور کہا کہ بغیر اِن کو دکھائے اس کاغذ پر تین یا پانچ سوالات لکھ لیے جائیں اور لکھنے کے بعد اس کاغذ کو تہ کر دیا جائے۔ مسٹر محمود بے یہ کہہ کر اپنی سیکرٹری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے تنہائی میں پنسل کے ساتھ یہ سوالات لکھے:

۱۔ آج دہلی میں بارش ہوئی یا نہیں؟

۲۔ آج امریکہ میں گندم کا کیا نرخ ہے؟

۳۔ مقدمہ میں جیتوں گا یا ہاروں گا؟

ان سوالات کو لکھ کر میں نے کاغذ کو تہ کیا اور مسٹر محمود بے کو آواز دی کہ آ جائیے۔ مسٹر محمود بے

Marfat.com

اُکر میز کی دوسری طرف بیٹھ گئے اور مجھ سے کہا کہ تہہ شدہ کاغذ کو پنسل کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھ لوں۔ میں نے ایسا کیا۔ مسٹر محمود بے مجھ سے دور بیٹھے رہے اور منہ سے کچھ پڑھتے رہے پانچ سات منٹ پڑھنے کے بعد آپ نے مجھ سے کہا کہ میں تہ شدہ کاغذ کھولوں۔ میں نے جب کاغذ کھولا تو اس میں ہر سوال کے آگے جواب لکھا تھا۔

۱-آج دہلی میں بارش نہیں ہوئی۔

۲- امریکہ میں گیہوں کا نرخ چار روپیہ من ہے۔

۳- میں مقدمہ جیتوں گا۔

یہ جوابات پنسل سے ہر سوال کے آگے لکھے تھے اور اس قسم کی تحریر تھی جیسے لکھنے والے کے ہاتھوں میں رعشہ ہو اور لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہوں۔

میں ان جوابات کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کورا کاغذ لیا خود سوالات لکھے۔ کاغذ میرے ہاتھ میں رہا مسٹر محمود بے مجھ سے چھوئے تک نہیں۔ یہ جوابات کون لکھ گیا۔ مسٹر محمود بے نے مجھے بے وقوف بنا لیا۔ یا فی الحقیقت مسٹر محمود بے ایک روحانی بزرگ ہیں۔ کیا یہ جواب روح نے لکھے اور اگر محمود بے فی الحقیقت روحانی بزرگ ہیں تو ان کے پاس یہ خوبصورت لڑکی کیوں۔ کیا روحانیت میں کمال حاصل کرنے کے لیے خوبصورت لڑکیوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ذہن میں مختلف خیالات تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے مسٹر محمود بے سے کہا کہ آپ نے کمال کر دیا۔ میں ان واقعات کو دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ روحانی بزرگ ہیں اور یہ تحریر آپ کے حکم سے روح نے لکھی تو میرے دل میں آپ کے لیے بہت بڑی عزت ہونی چاہیئے کیونکہ روحانی بزرگ ہیں اور اگر یہ روح کا کام ہے صرف ہتھکنڈے کا کام ہے تو میرے دل میں آپ کے لیے اس عزت (جو آپ کے روحانی بزرگ ہونے کا باعث میرے دل میں ہونی چاہیئے) سے کئی سو گنا زیادہ قدر ہے کہ آپ نے مجھ جیسے اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھنے والے کو بھی بے وقوف بنا دیا اور آپ کے اس کمال کے سامنے مجھے سجدہ کرنا چاہیئے۔

مسٹر محمود بے اور ان کی سیکرٹری یہ سن کر کھلکھلا پڑے اور دونوں نے میری اس بے تکلفی اور صاف بیانی کی داد دی۔ مسٹر محمود بے نے میرے اس کہنے پر جواب دیا۔ کہ یہ روح کا کام ہے۔ ہتھکنڈے کا نہیں۔ میں مسٹر محمود بے کے اس جواب سے مطمئن نہ تھا اور سمجھتا تھا۔ کہ اس راز کا کیوں کر پتہ لیا جائے۔ میں نے مسٹر محمود بے کو اپنے ہوٹل میں ڈنر پر آنے کو کہا۔ وہ ایک روز بعد رات کو آئے۔ کھانے کے ساتھ انہوں نے وسکی پی۔ کھانے کے بعد ہم سیر کے لیے موٹر میں گئے اور پھر میں ان کو ان کے مکان پر چھوڑ کر واپس ہوٹل آ گیا۔

مسٹر محمود بے کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا۔ کہ یہ اپنی اس "روحانیت" سے چار پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے ہیں۔ قیمتی موٹر۔ بیرے خانسامے اور دوسرے اخراجات۔ طبعاً فیاض ہیں جس کا نتیجہ یہ کہ ہمیشہ مقروض۔ میں ان سے باتیں کرتا تھا اور سوچتا تھا۔ کہ اس سے پہلے تو ہمیشہ یہی سنتا رہا۔ کہ روحانیت میں نہ کھاؤ نہ پیو۔ راتوں کو جاگتے رہو۔ دنیا فانی ہے۔ اب تکلیف اٹھاؤ گے تو بہشت میں مزے لوگے اور

Marfat.com

زندگی کی کوئی قیمت نہیں، وغیرہ باتیں ضروری ہیں۔ مگر اب پتہ چلا کہ روحانیت میں اچھا کھانا، قیمتی شراب پینا یورپین لڑکیاں بطور سیکرٹری رکھنا، سینما دیکھنا اور زندگی کو پُرلطف بسر کرنا ممکن ہے اور ایسی صورت میں روحانیت کا سودا مہنگا نہیں۔

میں بمبئی میں دو ہفتے رہا۔ اس عرصہ میں قریب قریب ہر روز مسٹر محمود بے سے ملا۔ اور "روحانیت" پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ مسٹر محمود بے نے یہ خواہش ظاہر کی کہ چونکہ میں پراپاگنڈا اور اشتہارات کے فن سے واقف ہوں ان کے ساتھ امریکہ چلوں۔ امریکن لوگ مشرقی روحانیت کے بہت دلدادہ ہیں۔ اس سے پہلے سوامی رام تیرتھ اور دوسرے کئی سوامی وہاں روحانیت کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ اگر ہم چھ ماہ بھی وہاں رہیں تو روح کے ساتھ کاغذ پر لکھ کر ہم لاکھوں روپیہ پیدا کر لیں گے۔ میں مسٹر محمود بے کی اس سکیم سے بالکل متفق تھا مگر چونکہ نواب بھوپال والا مقدمہ عدالت میں تھا اور میرے لیے امریکہ جانا ممکن نہ تھا۔ یہ سکیم عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔

مسٹر محمود بے نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کاغذ پر روح کے ساتھ لکھنا مجھے دو ہفتے میں سکھا دیں گے اور میں کبھی دو ہفتے ان کے پاس رہوں مگر مقدمات اور اخبار کی مصروفیت کے باعث موقع نہ ملا اس کے بعد مسٹر محمود بے تین چار بار دہلی آئے۔ ان کا قیام امپیریل ہوٹل نئی دہلی یا سسل ہوٹل دہلی میں ہوا کرتا۔ ان کے پاس ہمیشہ معتقدوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا اور معتقدوں میں راجے اور مہاراجے بھی ہوتے چنانچہ ایک بار مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے آپ کو پٹیالہ طلب کیا اور بیس ہزار روپیہ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ محمود بے روحانیت کے ذریعہ معلوم کر کے بتائیں کہ ان کے ولی عہد (موجودہ مہاراجہ پٹیالہ) ان کے خلاف ہیں یا نہیں اور ایک بار نواب صاحب بہاولپور کی دعوت پر یہ بتانے کے لیے بہاولپور گئے کہ ان کے علاقہ کے ریگستانوں میں کہاں کہاں سونا اور پٹرول موجود ہے۔

مسٹر محمود بے سے ملے ہوئے مجھے کئی برس ہو گئے۔ کیونکہ مقدمات اور کاروبار کی مصروفیت کے باعث بمبئی جانے کا عرصہ سے اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مسٹر محمود بے آجکل بمبئی میں ہیں یا اپنے وطن مصر کو واپس چلے گئے۔ مگر آپ کے دوستانہ اخلاص کو میں کبھی بھول نہیں سکا اور ان کی "روحانیت" کا اتنا ہی قائل ہوں۔ جتنا خواجہ حسن نظامی کی "روحانیت" کا۔ یعنی جب تک دنیا میں بیوقوف موجود رہیں گے ایسی شخصیتیں اپنی "روحانیت" کے ذریعہ لوگوں کی جیب خالی کرتی رہیں گی ؂

بغیر نیت کے جرائم

میری عمر سولہ برس کی تھی جب کہ میں موگا کے ہسپتال میں اپرنٹس کمپونڈر تھا۔ اس زمانہ میں کوئی تنخواہ نہ لیتا تھا۔ اَن پیڈ اپرنٹس تھا۔ چھ ماہ تک کام سیکھتا رہا۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ یاد ہے ہسپتال میں رہائش اختیار کرنے والے (انڈور) بیماروں کو ڈاکٹر صاحب دونوں وقت دیکھا کرتے تھے تاکہ اگر کسی

Marfat.com

کو تکلیف ہو تو وہ رفع کی جائے۔ ایک روز شام کو ڈاکٹر صاحب مع کمپونڈروں کے بیماروں کو دیکھ رہے تھے تو معلوم ہوا کہ ایک ضعیف بوڑھی عورت دن بھر بے چین رہی اور درد سے چلاتی رہی کیونکہ اس کی ناک میں کیڑے تھے اور وہ کیڑے اس کو کاٹتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کمپونڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس عورت کو نصف ڈرام لائیکوار مارفیا (افیون کا جوہر) دیا جائے۔ تاکہ رات کو یہ سو سکے اور افیون کے نشہ میں تکلیف کم محسوس کرے۔ سب بیماروں کو دیکھنے کے بعد میں ڈسپنسنگ روم میں گیا اور نصف ڈرام لائیکوار مارفیا لے کر اس عورت کو پلا دیا۔ اگلے روز جب ہم بیماروں کو دیکھنے کے لیے پھر گئے تو اس بوڑھی عورت کے قریب کی چارپائیوں پر پڑی ہوئی بیمار عورتوں نے بتایا کہ یہ دن بھر تکلیف میں ہائے ہائے کرتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ کیا رات کو اسے نیند آئی تھی یا نہیں۔ عورتوں نے جواب دیا کہ رات کو بھی نیند نہیں آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کمپونڈروں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ رات کو مارفیا دیا گیا تھا؟ میں نے جواب دیا۔ کہ نصف ڈرام دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا۔ کہ چونکہ رات کو نصف ڈرام مارفیا کے ساتھ اس کو نیند نہیں آئی۔ آج اس کو ایک ڈرام مارفیا دیا جائے۔ ہم سب نے یہ حکم سن لیا۔ بیماروں کو دیکھنے سے فارغ ہونے کے بعد میں ڈسپنسنگ روم میں گیا اور ایک ڈرام لائیکوار مارفیا لے کر اس عورت کو پلا آیا۔ میرے جانے کے بعد انچارج ڈسپنسر ڈسپنسنگ روم میں گیا اور ڈاکٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہی ڈرام لائیکوار مارفیا لے کر اس عورت کو پلا آیا۔

عورت بیچاری دیہات کی رہنے والی اس کو کیا معلوم کہ دوائی کتنی بار دی جاتی ہے اس نے اس ڈسپنسر کو نہیں بتایا۔ کہ پہلے بھی دوائی دی جا چکی ہے۔ یہ ڈسپنسر بھی دوائی پلا کر اپنے کوارٹر میں چلا گیا ہم لوگ جب صبح اٹھے اور ہسپتال میں گئے تو معلوم ہوا کہ بڑھیا رات کو مر گئی۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ان کو خیال ہوا کہ موت کا باعث مارفیا کا زہر ہے۔ ان کو احساس ہوا کہ میں ناتجربہ کار ہوں شاید مارفیا کے ناپنے میں غلطی کی ہو۔ پوچھا۔ کہ رات کو کتنا مارفیا دیا۔ میں اور انچارج ڈسپنسر دونوں موجود تھے۔ دونوں نے جواب دیا۔ ایک ڈرام اور دونوں جواب دینے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنے لگ گئے۔ یعنی میں کہتا تھا کہ میں نے دیا اور ڈسپنسر کہتا تھا کہ اس نے دیا۔ گویا کہ بغیر جرم کی نیت کے دونوں ہی اس موت کے ذمہ دار تھے ہندوستان کے ہسپتالوں میں غلطیوں کے ساتھ ایسی موتیں ہر روز ہوتی ہیں اول تو شاید ایسی موتوں کے جرائم کے لیے تعزیرات ہند میں کوئی سزا ہی مقرر نہیں۔ اگر سزا ہو بھی تو سرکاری ملازموں کو چاہے وہ کتنی بھی ادنیٰ حیثیت کے ہوں کون پوچھتا ہے۔ ہم دونوں نے کسی کو کچھ نہیں کہا مگر بغیر نیت کے کئے گئے اس جرم کا بوجھ اب تک ضمیر پر موجود ہے۔

کئی برس کی بات ہے "ریاست" کا دفتر اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ ایک رانی کا خط ملا کہ وہ مظلوم ہے۔ اس کی ریاست میں ملنا ممکن نہیں۔ وہ ہردوار جا رہی ہے۔ میں ہردوار میں اس کے فلاں ملازم کی معرفت ملوں۔ وہ اس ظلم کی داستان بتانا چاہتی ہے جو اس کے شوہر کے ہاتھوں اس پر کیا جا رہا ہے۔ اس خط کے ملنے کے بعد میں اپنی کار میں یہاں سے رڑکی گیا۔ رڑکی سے نہر کے کنارے ہردوار پہنچا۔ میرے ساتھ

Marfat.com

موٹر ڈرائیور کہیر سنگھ تھا۔ ہم لوگ ہردوار ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے اور میں نے وہاں سے رانی کے ملازم کو پیغام بھیجا کہ میں پہنچ گیا ہوں ڈاک بنگلہ میں مقیم ہوں۔ رانی صاحبہ جہاں کہیں وہاں آجاؤں۔ رانی صاحبہ نے انتظام کر رکھا تھا۔ ایک دھرم شالہ میں ان سے ملا۔ تین چار گھنٹے کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہیر سنگھ سے کہا۔ کہ اب ہم ہردوار آگئے ہیں۔ ڈیرہ دون قریب ہے وہاں ہوتے چلیں۔ ایک تو جنگل کی سیر ہو جائے گی۔ دوسرے ڈیرہ دون میں مہارانی نابھہ اور ان کے والد اور بھائی ہیں ان سے بھی مل سکیں گے۔ چنانچہ ہم ہردوار سے سیدھے جنگل کے راستہ ڈیرہ دون روانہ ہوئے۔ ہردوار اور ڈیرہ دون کے درمیان سڑک اس زمانہ میں اچھی نہ تھی۔ راستہ میں بغیر پلوں کے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں تھیں اور بعض جگہ راستہ ناہموار بھی تھا۔ (اب ملٹری نے فوجی ضروریات کے باعث یہ سڑک بہت اچھی بنا دی ہے) میں اور کہیر سنگھ جا رہے تھے۔ کہیر سنگھ موٹر چلا رہا تھا اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈیرہ دون پہنچنے سے غالباً تین چار میل پہلے موٹر تیزی کے ساتھ جا رہی تھی۔ سڑک پر کھڑا ہوا ایک بچہ جو سات آٹھ سال کی عمر کا ہوگا موٹر کے دیکھنے کے شوق میں تیزی کے ساتھ موٹر کے سامنے آگیا اور موٹر اس پر سے گزر گئی۔ اس بچہ کے والدین قریب ہی جھونپڑیوں میں مقیم تھے۔ جب بچہ موٹر کے نیچے آیا تو میں نے کہیر سنگھ سے کہا کہ موٹر فوراً کھڑی کرو مگر کہیر سنگھ نے میرے اس کہنے کی کوئی پرواہ نہ کی اور اس نے موٹر کو اور تیز کر دیا میں نے کہا کہ موٹر کھڑی کرو۔ ہم دیکھیں کہ اگر بچہ کی حالت خراب ہو تو اس کو ہسپتال لے چلیں مگر کہیر سنگھ نے میرے کہنے کی کوئی پرواہ نہیں کی گویا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کا پابند نہیں تھا۔ چند منٹ بعد ہم ڈیرہ دون پہنچے۔ تو کہیر سنگھ نے کہا کہ اگر وہ موٹر وہاں کھڑی کرتا۔ تو اس بچہ کے خاندان کے لوگ جو جھونپڑیوں میں مقیم تھے۔ اور خانہ بدوش قبیلہ کے تھے غصہ میں ہم لوگوں کو شاید قتل کر دیتے اور اگر یہ نہ بھی ہوتا تو وہ مقدمہ چلوانے اور قید ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اس واقعہ کے باعث میں بے حد پریشان تھا۔ بار بار خیال آیا کہ نہ معلوم وہ بچہ مر گیا یا زندہ رہا۔ گو میرا قصور نہ تھا بچہ خود ہی دوڑ کر موٹر کے سامنے آگیا۔ مگر ہمارا موٹر کا کھڑا کر کے اس بچہ کو نہ دیکھنا اور اس کو ہسپتال میں نہ لے جانا کتنا بڑا اخلاقی جرم تھا۔ مجھے اس قدر ذہنی کوفت تھی کہ میں نے مہارانی نابھہ اور ان کے والد وغیرہ سے ملنے کا خیال ترک کر دیا۔ ڈیرہ دون میں پٹرول لیا اور ہم سہارنپور والی سڑک کے راستہ واپس دہلی روانہ ہوگئے۔ ڈیرہ دون اور دہلی کے درمیان میں نے کچھ نہ کھایا۔ دہلی پہنچ کر دو راتیں نیند نہ آئی اور اب بھی کئی بار یہ خیال آتا ہے کہ گو میرا اس میں کوئی قصور نہ تھا اور نہ جرم کرنے کی میری نیت ہی تھی۔ مگر کہیر سنگھ کے جرم میں شریک ہوں۔ اور نہ معلوم مجھے اس جرم کی سزا کیا ملے۔

میں مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ آب و ہوا خشک ہونے کے باعث سندھ میں لوگ کثرت کے ساتھ موتیا بند (کیٹریکٹ) میں مبتلا ہیں۔ میں اس سے پہلے موتیا بند کے کثرت کے ساتھ اوپریشن کر چکا تھا اور اس فن میں مجھے بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ سندھ میں جا کر وہاں لوگوں کی آنکھوں کے اوپریشن کیے جائیں۔ چنانچہ میں نے مانسہ کے ایک لڑکے کو (مجھے اس لڑکے کا اب نام یاد نہیں رہا۔ یہ وہاں کی سنگھ سبھا کے سیکرٹری سردار سند سنگھ

Marfat.com

کا بیٹا تھا، ساتھ لیا۔ یہ لڑکا بہت ہوشیار اور مُستعد تھا۔ ہم لوگ بٹھنڈہ اور سماسٹہ کے راستے جب خان پور پہنچے تو وہاں ایک سکھ بابو مل گئے جو ریلوے سٹیشن پر بجلی کے کام کے انچارج تھے۔ یہ واقف تھے بہت تپاک سے ملے اور چونکہ شام کا وقت تھا انہوں نے ہمارے کھانے کے لیے مچھلی، انڈے، سبزی اور روٹی وغیرہ خریدی۔ اتنے میں گاڑی چلنے والی تھی تو انہوں نے کہا کہ انٹر کلاس میں جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے جگہ تنگ ہے کھانا کھانے میں تکلیف ہوگی۔ سیکنڈ کلاس کا کوپے خالی ہے اس میں بیٹھ کر کھانا کھا لیجئے اور اگلے سٹیشن پر اتر کر پھر انٹر میں چلے جائیے۔ ریلوے کے بابو اپنے محکمہ کو اپنے باپ کی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ نہ صرف ان کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کا ٹکٹ لینا بھی فضول خرچی ہے۔ یہ سکھ بابو ہمیں سیکنڈ کلاس کے کوپے میں لے گئے اور وہاں کھانا رکھا تو گاڑی چل پڑی۔ گاڑی کے چلنے پر میں نے اور اس لڑکے نے کھانا کھایا۔ یہ گاڑی کراچی میل تھی اور کئی کئی سٹیشنوں کے بعد ٹھہرتی تھی۔ ہم کھانا کھا چکے اور اگلے سٹیشن کا انتظار کر جہاں گاڑی ٹھہرے اور ہم واپس اپنے انٹر کلاس میں چلے جائیں تو راستہ میں یک لخت گاڑی ٹھہر گئی۔ اس وقت کچھ اندھیرا سا ہو چکا تھا۔ گاڑی کے ٹھہرنے کے بعد ٹرین کا ڈرائیور اور گارڈ گاڑی سے نیچے اترے اور انہوں نے دیکھنا شروع کیا کہ کون سے ڈبے کا ویکیوم خراب ہے چنانچہ وہ دیکھتے دیکھتے اس سیکنڈ کلاس والی گاڑی کے پاس آگئے تو معلوم ہوا کہ اس ڈبہ میں خرابی ہے تو ان کو شبہ ہوا کہ شاید ہم نے زنجیر کھینچا ہے۔ چنانچہ گارڈ نے ہم سے ٹکٹ دکھانے کو کہا۔ ٹکٹ دکھایا تو وہ انٹر کلاس کا تھا۔ اس شبہ میں اور اضافہ ہوا۔ اس نے کہا کہ انٹر کا ٹکٹ ہے یہاں کیوں آئے۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ وہاں جگہ تنگ تھی کھانا کھانے کے لیے یہاں چلے آئے۔ یہ جواب تسلی بخش نہ تھا۔ کیونکہ قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اینگلو انڈین گارڈ کو اس کا پورا شبہ ہو گیا۔ کہ ہم لوگ کسی بدمعاشی کی نیت سے یہاں آئے ہیں اور اس غرض کے لیے تاریکی و تنہائی میں بیٹھے ہیں۔ ہم لوگ اتر کر انٹر کلاس میں چلے گئے مگر پریشان کہ نہ معلوم کیا الزام لگایا جائے اور پولیس کے حوالہ کیے جائیں۔ حالانکہ قصور تھا تو صرف یہ کہ ریلوے کے سکھ بابو نے اپنے حوصلہ کا غلط استعمال کرتے ہوئے ہمیں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ کر کھانا کھانے کے لیے کہا اور ہم نے بے وقوفی کے باعث ایسا کیا۔

ہم روہڑی سٹیشن پر اترے۔ گارڈ ہمیں پولیس کو دینا چاہتا ہے۔ ہم اس کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ آخر اس نے ہم سے خان پور اور روہڑی کے درمیان کا انٹر کلاس سے زائد سیکنڈ کلاس کا کرایہ بغیر رسید دیے وصول کیا اور بقول پنجابی کہاوت کے ہمارا لالہ موسیٰ کا یہ سفر ختم ہوا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ایسے جرائم کرتا ہے جن کو کرنے کی اس کی نیت نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ جرائم آخر جرائم ہیں۔ انسان کو ان جرائم کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ چاہے وہ سزا قانونی عدالت کے ذریعہ ملے یا قدرت اس کو کسی دوسرے ذریعے سے دے۔ اور صرف اس بات سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کی نیت جرم کرنے کی نہ تھی۔ کیونکہ جرم کرنا۔ مجرم کے جرم پر چشم پوشی کرنا۔

Marfat.com

جرم میں حصہ لینا۔ جرم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا یا جرم کو بے نقاب نہ کرنا اخلاقاً سب ہی جرائم ہیں۔

"ریاست" اور افغان گورنمنٹ

"ریاست" کو جاری ہوئے دو برس ہوتے تھے۔ لالہ لاجپت رائے اپنی آخری عمر میں مسٹر ساورکر اور مسٹر جناح کی طرح حریت پرستی، وطنیت اور ملک کی آزادی کی راہ چھوڑ کر فرقہ پرستی کی لعنت اختیار کر چکے تھے اور ان کا ہر قدم ہندو مہاسبھا کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف اٹھتا تھا۔ آپ نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں ارشاد تھا۔ کہ ہندوستان، افغانستان کے حملہ سے بے فکر نہیں ہو سکتا اور صوبہ سرحد کو آئینی اصلاحات نہ ملنی چاہئیں۔ کیونکہ اگر نئی اصلاحات کے مطابق صوبہ سرحد کی گورنمنٹ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوئی تو ہندو وہاں خطرہ میں ہوں گے اور افغانستان ہندوستان پر آسانی کے ساتھ حملہ کر سکے گا۔ لالہ لاجپت رائے کا یہ بیان پڑھ کر مجھے لالہ جی کے اکروال ازم پر بہت غصہ آیا اور میں نے "ریاست" میں آپ کے اس بیان کے خلاف ایک سخت نوٹ لکھا۔ کہ اگر صوبہ سرحد کے ہندو اس قدر ہی بزدل اور کمزور ہیں کہ وہ افغانستان کے حملہ کو ڈیفنڈ نہیں کر سکتے تو ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ صوبہ سرحد کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے مدراس کو چلے جائیں مگر صوبہ سرحد کو صرف اس جرم میں سیاسی اصلاحات نہ دی جائیں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس صوبہ کے ساتھ ظلم اور بے انصافی ہوگی اور لالہ لاجپت رائے کا افغانستان کے خوف سے صوبہ سرحد کی اصلاحات کی مخالفت کرنا ان کی بزدلی اور بنیا پن ہے جس کے ساتھ کوئی بہادر شخص متفق نہیں ہو سکتا۔

"ریاست" اُس زمانہ میں افغانستان جاتا تھا اور وہاں کے دفتر خارجیہ میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا۔ دفتر خارجیہ کی باگ ڈور امان اللہ کے خسر اور ملکہ ثریا کے والد سردار محمود طرزی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نوٹ کو شائع ہوئے دو ماہ کے قریب ہوا تھا۔ کہ ایک روز قونصل جنرل افغانستان کے دفتر سے ٹیلیفون آیا کہ سردار اکبر خاں قونصل جنرل ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ جب فرمایئے میں آ جاؤں۔ ٹیلیفون کرنے والے نے (مجھے ٹھیک یاد نہیں میرا خیال ہے کہ ٹیلیفون کرنے والے غالباً منشی محمد فاضل سرکاتب یعنی سیکرٹری تھے) کہا۔ نہیں۔ قونصل جنرل صاحب خود تشریف لانا چاہتے ہیں۔ دفتر "ریاست" کس جگہ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ پریڈ گراؤنڈ کے سامنے ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سردار اکبر خاں تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ "ریاست" میں افغانستان اور لالہ لاجپت رائے کے متعلق جو نوٹ شائع ہوا تھا آپ اس سلسلہ میں تشریف لائے ہیں شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ میں نے کہا کہ مجھے فرماتے میں وہاں آ جاتا۔ آپ نے جواب دیا کہ نہیں افغان گورنمنٹ کے حکم سے آیا ہوں۔ کابل سے خط آیا ہے کہ شکریہ ادا کیا جائے۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے دوسرے کے مکان پر ہی جانا چاہیئے۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں خود آتا۔ آپ تھوڑی دیر بیٹھے اس کے بعد آپ نے خواہش ظاہر کی کہ میں اگلے روز افغانستان کے

Marfat.com

تو نصل خانہ پہنچا۔ اس زمانہ تو نصل خانہ انڈر بل لین کی ایک دو منزلہ بلڈنگ میں تھا میں گیا تو سردار اکبر خاں منتظر تھے۔ ہم بیٹھے چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ سردار اکبر خاں نے ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ کہ قرآن کی قسم (افغان لوگ بات بات میں قسم کھاتے ہیں) افغانستان کبھی نہیں چاہتا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے۔ ہندوستانیوں کو افغان اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح افغانستان آزاد ہے ہندوستان بھی آزاد ہو۔ لالہ لاجپت رائے جیسے لیڈر بلا وجہ افغانوں کو ہوّا سمجھتے ہیں حالانکہ افغان گورنمنٹ کی ہمدردی ہندوستان کے ساتھ ہے وغیرہ۔ سردار اکبر خاں نے خواہش ظاہر کی کہ میں کبھی کبھی ان سے ملتا رہوں اور سوچ کر یہ بتاؤں۔ کہ کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے دل سے افغانوں کے متعلق جو ہوّا بیٹھا ہوا ہے نکل جائے۔

اس ملاقات کے بعد میرے تعلقات افغان گورنمنٹ کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ ہو گئے۔ اور میں ہفتہ عشرہ کے بعد سردار اکبر خاں سے ملتا۔ چنانچہ ایک روز وہاں بیٹھا قونصل جنرل سے باتیں کر رہا تھا تو اچانک ہمیفرے صاحب جو افغانستان میں برٹش قونصل تھے اور ہندوستان میں آئے تھے۔ سردار اکبر خاں سے ملنے کے لیے آ گئے۔ سردار اکبر خاں نے میرا تعارف کرایا تو مسٹر ہمیفرے نے کہا۔ کہ آپ "ریاست" کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اسے پسند بھی کرتے ہیں۔

کچھ روز بعد میں نے سردار اکبر خاں کو رائے دی کہ ہندوستانیوں کے دل سے افغانی ہوّا نکالنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ یہاں سے سات آٹھ جرنلسٹوں کا ایک ڈیپوٹیشن جس میں دو ہندو۔ دو مسلمان۔ دو سکھ اور ایک انگریز مسٹر ہارنیمین ہوں۔ افغانستان مدعو کیا جائے۔ ان لوگوں کو اجازت دی جائے کہ اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں جا کر افغانستان اور افغانستان کے ہندو باشندوں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اور پھر واپس آ کر ایک مشترکہ بیان دیں کہ وہاں کی پبلک کی عموماً اور ہندو رعایا کی خصوصاً کیا حالت ہے۔ اس مشترکہ بیان کا بہت اثر ہو گا۔ سردار اکبر خاں نے میری اس تجویز کو بہت پسند کیا اور آپ نے سردار محمود طرزی کو لکھا۔ سردار محمود طرزی نے بھی اس خیال کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ افغان گورنمنٹ کی طرف سے گورنمنٹ آف انڈیا کو اس ڈیپوٹیشن کی اجازت کے لیے لکھا گیا تو گورنمنٹ ہند نے اس کی منظوری دینے سے اس دلیل کے ساتھ انکار کر دیا۔ کہ یہ سیاسی پراپاگنڈہ ہے اور بین الاقوامی قانون اور افغانستان و ہندوستان کی گورنمنٹوں کے تعلقات کے باعث ایسا ڈیپوٹیشن جانا مناسب نہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تجویز رد کر دی گئی۔ اور اس کا سردار اکبر خاں و افغان گورنمنٹ کو افسوس ہوا۔

افغان تو نصل خانہ پر سی آئی ڈی کے لوگ نگرانی کرتے تھے اور میرا یقین ہے کہ تمام قونصل خانوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ نگرانی کرنے والے سی آئی ڈی کے لوگوں نے میری آمد و رفت کی گورنمنٹ کو رپورٹ کی نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن آفس کے حکم سے دفتر "ریاست" کی نگرانی شروع ہو گئی۔ اس نگرانی کا لوکل گورنمنٹ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لوکل گورنمنٹ صرف فارن آفس کے حکم سے اپنے آدمی نگرانی کے لیے تعینات کرتی تھی۔ چنانچہ اس نگرانی کے متعلق میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ گورنمنٹ کے کار

Marfat.com

کاغذات میں یہ رپورٹ کی گئی ہے کہ دیوان سنگھ روس سے روپیہ لے کر بالشویکوں کا پراپاگنڈہ کرتا ہے اور اس تعلق کے درمیان افغان گورنمنٹ اور قونصل جنرل افغانستان ایک کڑی ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی اس بے وقوفی کا مجھے جب علم ہوا تو میں حیران ہو گیا۔ کیونکہ میرا روس کے ساتھ نہ کبھی کوئی تعلق تھا اور نہ اب ہے۔

سردار اکبر خاں کے ہندوستان سے تبدیل ہونے کے بعد دہلی میں افغان قونصل جنرل سید قاسم مقرر ہوئے جو کنگ امان اللہ کے ہم زلف اور ملکہ ثریا کی چھوٹی بہن کے شوہر تھے۔ سید قاسم کے بھی ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ چنانچہ مہاراجہ پٹیالہ نے جب ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق وارنٹ جاری کئے اور دفتر "ریاست" کی تلاشی ہوئی تو سید قاسم کو اس کا بہت افسوس ہوا اور آپ کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سیکرٹری (جو آپ کا دوست تھا) کا اثر استعمال کریں۔ مگر میں آپ کی اس رائے سے متفق نہ ہوا اور میں نے کہا۔ کہ فارن سیکرٹری کو کہنا زیادہ نقصان کا باعث ہو گا۔ گورنمنٹ پہلے ہی میرے اور افغان گورنمنٹ کے تعلقات کو پسند نہیں کرتی۔ اگر سفارش کی گئی تو فارن آفس کو یہ یقین ہو جائے گا۔ کہ یہ تعلقات بہت گہرے ہیں۔ برٹش لوگ سب کچھ بھول سکتے ہیں مگر کسی شخص کا اینٹی برٹش ہونا نہیں بھول سکتے۔ فارن سیکرٹری پر اس کا برا اثر ہو گا اور ممکن ہے کہ زیادہ نقصان پہنچے۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اس تجویز پر عمل نہ کرنے کے بعد سید قاسم نے ایڈیٹر "ریاست" سے یہ کہا۔ کہ اگر میں چاہوں تو سید قاسم اپنے پشاور کے ٹریڈ ایجنٹ (مجھے نام یاد نہیں رہا۔ غالباً سردار عبدالحکیم تھا) کی معرفت سرحدی قبائل کے ذریعہ مجھے افغانستان لے جائیں گے اور وہاں افغان گورنمنٹ میرے لیے زیادہ سے زیادہ آرام و سہولت اور میری رہائش و اخراجات کا ہمیشہ کے لیے انتظام کرے گی۔ چنانچہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا مہاراجہ پٹیالہ کے ایکسٹراڈیشن کے وارنٹوں کی تعمیل سے انکار نہ کرتی تو میں اپنی آئندہ زندگی جن مقامات پر گزارتا — ان میں سے ایک جگہ افغانستان بھی تھی اور یہ ممکن تھا۔ کہ میں آج افغانستان میں ہوتا۔

ایڈیٹر "ریاست" اور افغانستان کے تعلقات کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور دلچسپ ہے۔ مہاراجہ نابھ جب ڈیرہ دون میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور گورنمنٹ ہند کے سلوک اور مہاراجہ پٹیالہ کی مخالفت سے پریشان تھے تو میں نے مہاراجہ سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو افغانستان جا کر اپنی زندگی آرام و راحت سے گزار سکتے ہیں۔ میں افغان گورنمنٹ سے اس کے متعلق انتظام کر سکتا ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا۔ کہ میں ان کے ساتھ چلوں گا۔ اور ہم آئندہ زندگی افغانستان یا کسی دوسرے آزاد ملک میں گزار دیں گے۔ چنانچہ اس کے متعلق میں نے سید قاسم سے بات چیت بھی کی مگر مہاراجہ نابھ کسی خطرہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ مہارانی اور بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

کنگ امان اللہ کی گورنمنٹ اور میرے درمیان تعلقات بہت دوستانہ اور گہرے ہو چکے تھے۔ ان تعلقات میں ہی امان اللہ افغانستان کو چھوڑ کر اٹلی چلے گئے۔ اس کے بعد میرے تعلقات اس گورنمنٹ

Marfat.com

کے ساتھ منقطع ہو گئے۔ حالانکہ موجودہ گورنمنٹ کے نمائندے ہمیشہ اخلاص و محبت کے ساتھ ملتے رہے۔ مگر میری وضعداری کی سپرٹ نے اجازت نہ دی کہ میں کنگ امان اللہ کے جانے کے بعد آپ کے مخالفوں کے ساتھ تعلقات جاری رکھوں۔ میں اسے ابن الوقتی سمجھتا تھا۔ ایڈیٹر "ریاست" کنگ امان اللہ کا شکر گزار ہے کہ آپ نے اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں بھی ایڈیٹر "ریاست" کو یاد رکھا اور مسٹر چمن لال جرنلسٹ اور مسٹر دلیپ سنگھ وغیرہ اصحاب جب کبھی آپ سے اٹلی میں ملے تو آپ ایڈیٹر "ریاست" کی خیریت پوچھتے رہے۔

پبلک آواز واقعات کی بنیادوں پر

میری زندگی کا تجربہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق مختلف لوگوں کی ایک ہی رائے ہو تو وہ رائے بے بنیاد نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً اگر مہاتما گاندھی کو عام لوگ نیک اور مہاتما کہتے ہیں۔ تو گاندھی فی الحقیقت نیک تھے اور اگر خواجہ حسن نظامی کو پبلک مکار سمجھتی ہے تو یہ آواز خالی از صداقت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پبلک رائے تب ہی قائم ہوتی ہے۔ جب لوگوں کو ان واقعات کے دیکھنے کا بار بار اتفاق ہو۔ جب "ریاست" کو جاری ہوئے ایک یا ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا اور کام زیادہ ہو گیا تو ایک سب ایڈیٹر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ "ریاست" میں اشتہار دیا گیا۔ اس اشتہار کے جواب میں جو درخواستیں آئیں ان میں ایک درخواست مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کی بھی تھی۔ یہ حضرت پہلے رسالہ "زمانہ" کانپور میں کام کرتے رہے پھر "ادیب" الہ آباد کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور وہاں سے علیحدہ ہوئے تو آپ نے اپنا رسالہ "العصر" جاری کیا۔ جو شاید ایک یا دو سال جاری رہا۔ اپنی درخواست میں شاکر صاحب نے اپنے تجربہ کے سلسلہ میں یہ نام کچھ لکھا۔ کہ آپ کہاں کہاں کام کرتے رہے۔ شاکر صاحب کی درخواست آنے پر راقم الحروف نے منشی دیا نرائن صاحب نگم ایڈیٹر "زمانہ" (جو ایڈیٹر "ریاست" کے بہت مہربان دوست اور "ریاست" کے معترف تھے) سے خط لکھ کر دریافت کیا۔ کہ شاکر صاحب آپ کے ہاں کام کرتے رہے۔ کیسے آدمی ہیں۔ دیا نرائن صاحب کا جواب آیا کہ شاکر صاحب دوسروں کی نظمیں چوری کر کے اپنے نام کے ساتھ شائع کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔ اخبار یا رسالہ کو ترتیب اچھی دے سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی چوری کرنے کی ان کو عادت ہے۔ کوئی شے بھی دفتر میں دیکھیں اسے چوری کر لیتے ہیں اور بہتر ہے کہ ان کو ملازم نہ رکھا جائے۔ ایڈیٹر "ریاست" منشی دیا نرائن صاحب کے اس خط کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ ایک شخص شاعر ہے۔ ادبی رسائل کا ایڈیٹر رہا۔ اور کافی عمر کا آدمی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ چوری جیسے ادنیٰ فعل کا بھی مرتکب ہو۔ چنانچہ اس خیال سے کہ شاید نگم صاحب کو شاکر صاحب کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ آپ کو بطور مترجم یا سب ایڈیٹر بلا لیا گیا۔ اردو اخبارات میں سب ایڈیٹر کا کام عام طور پر انگریزی یا ہندی وغیرہ رسائل یا اخبارات سے ترجمہ ہوتا ہے یا اگر کبھی ایڈیٹر غیر حاضر ہو تو ایڈیٹوریل وغیرہ کے حصہ کو بھی پورا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ شاکر صاحب کے ذمہ بھی دوسرے سب ایڈیٹروں کی طرح یہی کام تھا کہ وہ ترجمہ کریں اور باہر سے آئے ہوئے افسانوں یا مضامین وغیرہ کی غلطیاں درست کر کے ان کو ترتیب دیں

Marfat.com

جائے۔ شاکر صاحب نے دفتر "ریاست" میں کام شروع کیا ہی تھا۔ کہ دفتر میں چوری کا سلسلہ شروع ہوا۔ کبھی پنسلیں غائب۔ کبھی نبیں اُڑ گئیں۔ کبھی ٹکٹ چوری ہو گئے اور کبھی جیب سے پیسے نکل گئے۔ ان چوریوں پر ہمیشہ ہی چپڑاسیوں سے باز پرس کی جاتی اور خیال بھی نہ آتا۔ کہ شاکر صاحب مہربانی فرماتے ہوں گے ان ادنیٰ چوریوں کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ کہ ایک روز شاکر صاحب نے فرمایا اُن کی ایک بھتیجی جو لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کی نرسنگ کلاس میں پڑھتی ہیں۔ کالج سے گھر آئی ہوئی ہیں۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ میں کھانا وہاں کھاؤں۔ چنانچہ میں کھانے پر ان کے گھر گیا اور ابھی کھانا کھایا نہ تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں تو میری نگاہ وہاں ایک ڈبیہ پر پڑی۔ جس میں سنہری رنگ کے کاغذ کو لگانے کے کلپ پڑے تھے (ایڈیٹر "ریاست" کو شروع سے ہی سٹیشنری کا بہت شوق ہے۔ دفتر "ریاست" کی سٹیشنری ولایت سے چھپوائی جاتی تھی اور یہ کلپ کلکتہ کی ایک فرم سے منگائے گئے تھے) اس ڈبیہ کو دیکھ کر یقین آیا۔ کہ ملسی دیانہ ان صاحب نگم کی رائے درست تھی اور ان کی رائے کی پرواز کرنا غلطی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" واپس دفتر آ گیا۔ رات کو سوچتا رہا۔ کہ شاکر صاحب کو کس طریقہ سے پکڑا جائے۔ اگلے روز جب دفتر کے لوگ آ گئے تو ایڈیٹر "ریاست" نے اوپر کی منزل میں اپنی میز پر دو پیسہ والے دو روپیہ کے ٹکٹ گن کر رکھ دیئے اور خود نیچے دفتر میں آ کر کام شروع کر دیا۔ دفتر میں بیٹھے پانچ سات منٹ ہوئے تو میں نے شاکر صاحب سے کہا۔ کہ اوپر کے کمرہ میں میز پر پنسل پڑی ہے وہ لا دیجئے۔ شاکر صاحب پنسل لینے کے لئے اوپر گئے اور پنسل لے کر واپس آ گئے تو ایڈیٹر "ریاست" فوراً اوپر گیا اور دو پیسہ والے ٹکٹ جو گن کر رکھ آیا تھا ان کو دیکھا ان میں سے نصف کے قریب غائب تھے۔ شاکر صاحب کو اوپر بلایا اور کہا کہ مہربانی فرما کر وہ ٹکٹ رکھ دو جو چوری کیے ہیں۔ شاکر صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے آپ کے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکال لیے۔ اگر چپڑاسی ہوتا تو دستور کے مطابق اس چپڑاسی کی اچھی خاصی مرمت کی جاتی مگر تعلیم یافتہ تھے۔ عیسائی ہونے کے باعث بوٹ سوٹ پہنے ہوئے۔ یہی کہا کہ بہت ہی کمینہ شخص ہو۔ اگر ضرورت تھی تو ٹکٹ مانگ لیتے۔ شاکر صاحب کی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ چنانچہ ان کو اس شرط پر اور قسم کھانے پر معاف کر دیا گیا کہ آئندہ چوری نہ کریں گے۔

شاکر صاحب اس کے بعد کئی برس تک دفتر "ریاست" میں رہے۔ پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے اور بطور "الاؤنس" پانچ چھ روپیہ ماہوار کا ادنیٰ سامان چوری کر لے جاتے تھے۔

نواب بھوپال نے جب ایڈیٹر "ریاست" پر ہوشنگ آباد (سی پی) میں مقدمہ دائر کیا تو دفتر "ریاست" کے متعدد ملازم خریدے گئے۔ ان سے وعدے کیے گئے کہ جو تنخواہ دفتر "ریاست" میں پاتے ہیں اس سے زیادہ تنخواہ ان کو ریاست بھوپال میں ملے گی اور کچھ روپیہ نقد بھی دیا گیا۔ روپیہ کے لالچ سے خریدے گئے ان لوگوں میں مسٹر پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی سابق ایڈیٹر "ادیب" و "العصر" بھی تھے۔ آپ نے لالچ میں آ کر بطور سرکاری گواہ شہادت بھی دی۔

Marfat.com

شاکر صاحب نے جب غداری کی اور بطور سرکاری گواہ عدالت میں تشریف لائے تو آپ پر مسٹر برج بہاری توکلی ایڈووکیٹ نے جرح کی۔ مسٹر توکلی کو جرح کرنے میں کمال حاصل ہے۔ کایستھ ہونے کے باعث ذہین بھی بہت ہیں اور قدرت نے آپ کو قوتِ گویائی کی نعمت بھی فراخ دلی کے ساتھ عطا کی ہے جرح میں آپ نے شاکر صاحب سے بچپن سے لے کر اس زمانے تک کے تمام حالات دریافت کیے تو شاکر صاحب نے مجسٹریٹ کے سامنے حلف لیتے ہوئے اقرار کیا کہ آپ دو بار عدالتوں سے چوری کے جرم میں ایک ایک یا دو دو سال کی سزا بھی پا چکے ہیں۔ ان واقعات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی شخص کے متعلق متعدد اصحاب یا اہل الرائے حضرات کے تجربہ کے بعد جو رائے ہو اس رائے کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ رائے بے بنیاد نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہوتی ہے۔

ایڈیٹر "ریاست" کی "نیک چلنی اور بدچلنی"

دفتر "ریاست" دریا گنج کی کوٹھی نمبر ۱۵ میں تھا۔ اس کوٹھی میں بہت بڑے بڑے آٹھ کمرے تھے اور باہر سڑک کی طرف موٹر کے لیے گیرج تھا۔ میرے پاس اس زمانہ میں موٹر نہ تھی۔ ایک سکھ ٹیکسی ڈرائیور بھائی لہنا سنگھ کے ساتھ مستقل انتظام تھا۔ کہ جب ضرورت ہو ارزاں نرخ پر اس کی گاڑی منگا لیا کرتے چونکہ یہ گیرج خالی رہتا اس میں ردی اخبارات وغیرہ رکھ دیے جاتے۔

مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے جب اپنی ریاست میں میرے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر اس دفتر کی تلاشی کرائی اور تلاشی کے دو تین ہفتہ بعد اس گیرج کو کھولا تو دیکھا کہ باہر سے تالہ تو بدستور لگا ہوا ہے۔ مگر اندر کچھ ردی کاغذات جلے ہوئے ہیں۔ ان جلے ہوئے کاغذات کو دیکھ کر خیال ہوا۔ کہ شاید پٹیالہ والوں کی شرارت ہو۔ انہوں نے دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کی ہو یا کسی نے جلتا ہوا سگریٹ پھینکا ہو اور یہ سگریٹ دروازہ کے نیچے سے جہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اتفاق سے اندر چلا گیا ہو۔ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا اور اسے معمولی بات سمجھ کر اس کی پرواہ نہ کی۔

اس واقعہ کو گزرے ابھی دو ہفتے ہوئے تھے۔ کہ میں ایک روز دوپہر کو ریلوے سٹیشن گیا وہاں وہیلر بک سٹال سے انگریزی کے رسائل خریدنے تھے۔ جب بک سٹال پہنچا تو دیکھا کہ وہاں پٹیالہ کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی مسٹر فضل کریم خاں اور وہاں کے پبلک پراسیکیوٹر جو سکھ تھے۔ مجھے اب نام یاد نہیں رہا کھڑے اخبارات دیکھ رہے تھے اور پڑھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا میں ان کو غور سے دیکھتا رہا۔ کہ میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ یہ فضل کریم ہی ہیں جو تلاشی کے لیے پٹیالہ سے تشریف لائے تھے۔ جب میری تسلی ہو گئی کہ یہی حضرت ہیں تو میں ان کے سامنے کی طرف آ گیا اور کہا۔ خاں صاحب! آداب عرض۔ خاں صاحب نے اس کا جواب اخلاق کے ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ آداب عرض ہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا فرمایئے خاں صاحب آج پٹیالہ سے کس مار پر آئے۔ کیا تلاشی لو گے یا گرفتاری کرو گے

Marfat.com

خان صاحب کچھ جھینپ گئے اور آپ نے جواب دیا "نہیں سردار صاحب! ہم آپ کے دشمن تو نہیں نہ ہماری کوئی ذاتی عداوت ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ سرکار کے حکم سے تلاشی لینے آئے تھے ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آج تو ڈاکٹر شراف کو آنکھیں دکھانے کے لیے آیا تھا آنکھوں میں تکلیف ہے۔"

اتنی بات کرنے اور رسائل خریدنے کے بعد میں سٹیشن سے باہر آیا مگر بہت متفکر کہ پٹیالہ کے یہ دونوں افسر اب دہلی میں کیوں آئے۔ کیا کوئی نیا مقدمہ قائم کیا۔ کیا نئی تلاشی ہوگی۔ کیا وارنٹ ان کے پاس ہیں۔ کیا گیرج میں آگ پٹیالہ والوں نے لگائی۔ دریا گنج کوٹھی پر گرفتاری کے لیے پولیس موجود تو نہیں۔ ان خیالات میں غرق تھا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ دفتر جاؤں یا نہ جاؤں۔ ممکن ہے وہاں پولیس گرفتاری کیلئے موجود ہو۔

میں نے اپنے دفتر جانا مناسب نہ سمجھا۔ سیدھا سوامی رامانند جی کے دفتر میں پہنچا۔ سوامی جی اس زمانہ میں سوامی شردھانند جی کے دست راست اور دلت ادھار سبھا اور کانگریس وغیرہ کئی سوسائٹیوں کی روحِ رواں تھے ان کا دفتر تیج کے سامنے تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کے ہاں سے اپنے دفتر ٹیلیفون کیا اور پوچھا کہ کیا وہاں پولیس وغیرہ تو نہیں اور کوئی خاص بات تو نہیں۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ سوامی جی سے میں مشورہ کرتا رہا کہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ مسٹر فضل کریم پٹیالہ سے اب کیوں آئے ہیں۔ ہم کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد میں نے مختلف ہوٹلوں میں ٹیلیفون کیا۔ کہ کیا کوئی صاحب پٹیالہ کے مسٹر فضل کریم وہاں ٹھہرے ہیں۔ تمام ہوٹلوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا۔ گرانڈ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲ میں ٹھہرے ہیں اور ہوٹل سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہاں موجود نہیں۔ یہ معلوم نہ ہوسکا۔ کہ ان کے دہلی آنے کا مقصد کیا ہے۔

میں بہت سوچتا رہا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کئی جگہ ٹیلیفون کیا مگر کہیں سے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر مجھے ایک شرارت سوجھی میں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ میری گرفتاری کے لیے آئے ہیں یا تلاشی لیں گے تو یقیناً یہ خود کچھ نہیں کر سکتے جو کچھ کریں گے لازمی طور پر مقامی گورنمنٹ اور مقامی پولیس کی معرفت ہوگا اور اس کا علم سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو ہونا چاہیئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو ملوں اس سے طریقہ کے ساتھ بات چیت کی جائے اور اس کی باتوں سے معلوم کیا جائے کہ پوزیشن کیا ہے اگر تو اس نے مسٹر فضل کریم کے دہلی میں آنے کی اطلاع کو تعجب کے ساتھ سنا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقامی پولیس کو کچھ علم نہیں۔ اور فضل کریم صاحب اپنے کسی پرائیویٹ کام کے لیے آئے ہیں اور اگر باتوں میں اس کے چہرہ سے یہ معلوم ہوا کہ اس کو فضل کریم صاحب کے آنے کا علم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پٹیالہ سے یہ لوگ میرے متعلق ہی آئے ہیں اور کوئی نہ کوئی کارروائی میرے خلاف ہوگی۔ اس زمانہ میں سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر مارگن تھے۔ میں نے ان کو ٹیلیفون کیا۔ کہ ایک ضروری کام کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔ مسٹر مارگن کو پہلی تلاشی اور جھوٹے مقدمہ کا تمام علم تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر فوری معاملہ ہو تو ابھی آجاؤ۔ اس وقت چار بج چکے تھے اور وہ اپنی کوٹھی میں تھے۔ میں نے بھائی لہنا سنگھ کو

Marfat.com

ٹیکسی لانے کے لیے ٹیلی فون کیا۔ ٹیکسی آئی تو میں مسٹر مارگن کی کوٹھی پہنچا۔ مسٹر مارگن میرا انتظار کر رہے تھے وزیٹنگ کارڈ اندر بھیجا تو وہ خود ہی برآمدہ میں نکل آئے۔ گڈ ایوننگ ہوئی۔ تو مجھے تشویش میں دیکھتے ہوئے انہوں نے کھڑے کھڑے فوراً بات چیت شروع کر دی۔ جو یہ تھی:

مسٹر مارگن: کیا بات ہے کیا کوئی نئی مشکل یا مصیبت پیش آئی۔

میں: جب تک کوئی مشکل یا مصیبت نہ ہو آپ کے پاس آتا ہی کون ہے اور آنے کی کسی کو ضرورت ہی کیا ہے۔

مسٹر مارگن: بتائیے کیا معاملہ ہے کیا بات ہے۔

میں: مجھے سب سے پہلے یہ بتائیے کہ کیا میں برٹش رعایا ہوں یا پٹیالہ کی رعایا۔

مسٹر مارگن یہ سن کر مسکرا دیئے اور کہا کہ آپ برٹش رعایا ہیں۔ بتائیے کیا معاملہ ہے۔

میں: پٹیالہ کا سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی مسٹر فضل کریم جو بدمعاشی کے وقت آیا تھا اب پھر دہلی میں کیوں آیا ہے۔ اس کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ یہ لوگ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ اگر میں پٹیالہ کی رعایا نہیں تو ان کو حق کیا حاصل ہے کہ یہ اس طرح مجھے برٹش علاقہ میں تنگ کریں۔

برٹش رعایا اور پٹیالہ کی رعایا کے میرے یہ الفاظ سنتے ہی مسٹر مارگن آگ بگولہ ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر شکن تھے اور یہ غصہ سے سرخ ہو گئے اور پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ فضل کریم دہلی میں ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں نے اپنی آنکھوں سے سٹیشن پر ان کو دیکھا اور وہ چھ نمبر کے کمرہ رائل ہوٹل میں ٹھہرے ہیں مسٹر مارگن غصہ سے سرخ ہو رہے تھے۔ آپ نے کہا:

"ویل دیوان سنگھ! تم جاؤ اپنے گھر میں آرام کرو۔ ہم کبھی پٹیالہ کو اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ وہ دہلی میں کوئی بدمعاشی کرے۔ ہم کبھی پٹیالہ کے کسی افسر کو یہاں نہ آنے دے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ برٹش سبجیکٹ کو پروٹیکٹ کرے۔ پٹیالہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اگر فضل کریم دہلی میں ہے تو ہم ابھی پتہ لے گا۔ اس کو دہلی میں کبھی رہنے نہ دے گا۔ ریاستیں برٹش علاقہ میں بدمعاشی نہیں کر سکتیں۔ ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ وار ہے۔"

اس جواب سے میں سمجھ گیا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ فضل کریم صاحب میرے متعلق دہلی میں نہیں آئے کیونکہ اگر آتے تو مقامی گورنمنٹ اور مقامی پولیس کو علم ہوتا۔ مسٹر مارگن کی باتیں اور ان کا جوش ظاہر کر رہا تھا۔ کہ ان کو فضل کریم کے آنے کا کچھ علم نہیں۔ میں اطمینان کے ساتھ اپنے مکان پر چلا گیا۔ وہاں سے سوامی رامانند جی کو تمام حالات ٹیلی فون پر بتائے اور مجھے یقین ہو گیا کہ فضل کریم اپنے کسی کام آئے ہوں گے۔ ان کے آنے کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

رات کو میں آرام سے سویا۔ صبح جاگا اور غسل کرنے کے بعد چائے پی رہا تھا تو سردار کرم سنگھ انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی تشریف لائے۔ انہوں نے ست سری اکال کہا۔ بیٹھے۔ میں نے چائے پیش کی۔ انہوں نے چائے کی پیالی پیتے ہوئے پوچھا کہ کیا رات کو کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ میں نے کہا

Marfat.com

نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ انہوں نے بتایا۔ کہ میں جب مسٹر مارگن سے مل کر ان کی کوٹھی سے چلا آیا تو مسٹر مارگن نے حکیم اکرام الحق ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو ٹیلی فون کر کے طلب کیا اور کہا کہ وہ فوراً رائل ہوٹل جائیں۔ اگر فضل کریم وہاں ہوں تو ان کو حکم دیا جائے اور انتظام کیا جائے کہ وہ پہلی گاڑی سے دہلی چھوڑ دیں۔ اور اگر وہ دہلی نہ چھوڑیں تو ان کو حوالات میں دے دیا جائے۔ اور اس حکم کی تعمیل کر کے بعد ان کی رپورٹ کی جائے۔ چنانچہ حکیم اکرام الحق اس حکم کو سن کر رائل ہوٹل پہنچے وہاں چھ نمبر کے کمرہ میں مسٹر فضل کریم موجود تھے۔ حکیم اکرام الحق نے فضل کریم صاحب کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کا کا حکم سنایا۔ فضل کریم صاحب نے بہت واویلا کیا۔ کہ ان کو کیوں دہلی سے نکالا جا رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر شرف کے پاس آنکھوں کا علاج کرانے آتے ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا۔ کہ علاج کرانا ہے تو لاہور جائیے دہلی کبھی مت آئیے۔ اور پہلی گاڑی میں پٹیالہ چلے جائیے اور اگر آپ نہ گئے تو آپ کو حوالات میں دے دیا جائے گا۔ چنانچہ فضل کریم صاحب کا بستر اور سامان بندھوایا گیا۔ حکیم اکرام الحق کی موٹر میں فضل کریم صاحب کو مع ان کے سامان کے بٹھایا گیا اور حکیم صاحب ان کو ریلوے سٹیشن لے گئے۔ فرنٹیر میل کے جانے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ ریلوے سٹیشن پہنچ کر ریلوے کے تھانہ سے حکیم اکرام الحق نے پولیس لائن میں ٹیلی فون کر کے ایک سب انسپکٹر منگایا۔ اس سب انسپکٹر کو ہدایت کی گئی کہ جب تک فضل کریم صاحب گاڑی میں بیٹھ نہ جائیں اور گاڑی روانہ نہ ہو جائے وہ فضل کریم صاحب کے ساتھ رہے۔ ان کو گاڑی پر چڑھا کر سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کی کوٹھی جائے اور فضل کریم صاحب کی روانگی کی رپورٹ کرے کیونکہ مسٹر مارگن نے یہی حکم دیا تھا۔ چنانچہ سب انسپکٹر نے رات کو دس بجے کے بعد مسٹر مارگن کو اطلاع دی کہ فضل کریم صاحب دہلی سے تشریف لے گئے ہیں۔

سردار کرم سنگھ نے بتایا۔ کہ ان کی بھی رات کو ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ اپنے آدمیوں کی معرفت نگرانی کریں۔ چنانچہ ان کے دو سپاہی رات بھر دفتر "ریاست" کا پہرہ دیتے رہے۔

مسٹر فضل کریم کا دہلی آنے کا یہ واقعہ اس کے بعد میں نے تو معمولی سمجھا مگر دہلی کی مقامی گورنمنٹ نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو لکھا۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے مہاراجہ پٹیالہ کو تنبیہہ کی کہ اگر پٹیالہ کے آدمیوں کے ہاتھوں برطانوی علاقہ میں برطانوی رعایا دیوان سنگھ کے خلاف کوئی بات ہوئی تو مہاراجہ ذمہ دار ہوں گے۔ اس کے دو ہفتہ بعد ڈپٹی کمشنر کا ایک خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا۔ کہ میں فوراً ریوالور کے لیے درخواست کروں۔ خط ملنے پر میں میسرز الٰہی بخش اینڈ کو بندوق سازاں کی دکان پر گیا وہاں ایک خوبصورت ریوالور انتخاب کیا۔ اس کا نمبر لیا۔ درخواست میں اس نمبر کو درج کیا اور درخواست بھیجی۔ تین چار روز کے اندر اس درخواست کی منظوری آ گئی۔ اور میں ریوالور خرید کر لے آیا۔

اس ریوالور کا شروع شروع میں تو شوق تھا۔ جب کبھی سفر میں جاتا تو ساتھ لے جاتا۔ بعد میں یہ ہمیشہ ہی لوہے کی الماری میں بند پڑا رہتا۔ جہاں سے چوری ہو گیا۔ چوری ہونے پر اس کی تحقیقات شروع ہوئی تو پولیس کو معلوم ہوا کہ دفتر کے ایک شخص نے چوری کر کے اس کو ایک دوسرے شخص کے پاس اسی روپیہ

Marfat.com

بیں فروخت کیا ہے۔ پولیس نے اس شخص کو اس خیال سے گرفتار نہ کیا اور انتظار کیا۔ کہ شاید آگے فروخت ہو اور پھر کسی انارکسٹ کا سراغ لگ سکے۔ پولیس کے اس انتظار میں ہی خریدنے والے شخص کو پولیس کے پیچھا کرنے کا علم ہوگیا اور وہ وہاں سے رُوپوش ہوگیا۔ پھر کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ کہ اس ریوالور کا کیا ہُوا اور کہاں گیا۔

ریوالورز کے سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ کا بیان کرنا بھی خالی از لطف نہ ہوگا۔ بھوپال کا مقدمہ چل رہا تھا۔ کئی والیانِ ریاست دشمن تھے۔ میں ہوشنگ آباد پیشی پر جانے کے لیے سامان بندھوا رہا تھا تو میرے پاس لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا، ایڈیٹر "ہندوستان" لاہور اور مسٹر پوتھن جوزف (ایڈیٹر "دکن ہیرلڈ") جو اس زمانہ میں "ہندوستان" کو ایڈیٹ کرتے تھے، بیٹھے تھے۔ لالہ رام رچھپال سنگھ صاحب نے بزرگانہ محبت کے جذبات میں نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ کہ اپنے ساتھ ریوالور بھی رکھ لو۔ تمہارے دشمن بہت ہیں۔ جب کبھی باہر جایا کرو تو ریوالور اپنے پاس ضرور رکھا کرو۔" یہ سن کر مسٹر جوزف نے کہا: "شیدا صاحب دیوان سنگھ اگر کبھی مارا جائے گا تو کسی والی ریاست کے ہاتھوں سے نہیں مارا جائے گا۔ یہ جب کبھی مارا جائے گا تو دیوانی یعنی سول عدالتوں سے قرقی کرنے والے بیلفوں کے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔" (یعنی دیوان سنگھ والیانِ ریاست کے مقدمات اور ان کے حملوں کے مقابلہ کے لیے کافی ہے۔ اس کے لیے مصیبت ہے تو مالی پریشانیوں کی۔ کیونکہ روپیہ صرف کرنے کی اس کی عادت بدل نہیں سکتی۔ زندگی بھر اس کی یہ پریشانیاں کبھی کم نہ ہوں گی۔ اس کے خلاف قرضہ کے دیوانی مقدمات اور قرقیاں ہوتی رہیں گی اور یہ ان پریشانیوں میں ہی ختم ہوجائے گا۔)

ریوالور کے چوری ہونے کے بعد تحقیقات کے سلسلہ میں پولیس میرا لائسنس لے گئی۔ اس کے بعد اس نے مجھے دوبارہ ریوالور کا لائسنس مجھے نہیں دیا۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا اور ریوالور فی الحقیقت چوری ہُوا جس کا علم پولیس کو بھی ہے۔

ریوالور کے چوری ہونے کے عرصہ بعد ایک سال محکمہ انکم ٹیکس نے مجھ پر زیادہ انکم ٹیکس لگا دیا۔ میں نے اس انکم ٹیکس کی لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس ایکسپرٹ سے شکایت کی۔ انہوں نے ٹیکس کم کرانے کی کوشش بھی کی مگر کامیابی نہ ہوئی تو لالہ امیر چند نے کہا کہ اتنے زیادہ انکم ٹیکس کی صورت میں بندوق کا لائسنس کیوں نہ لو۔ کیونکہ گورنمنٹ بندوق کا لائسنس دیتے وقت زیادہ تر انکم ٹیکس کو ہی دیکھتی ہے۔ میں نے ان کی رائے سے درخواست لکھ کر بھیج دی۔ جو چند دن میں منظور ہوگئی۔ میں نے بمبئی کی ایک فرم سے اشتہارات کا حساب میں بہت اچھی بندوق خرید لی۔ یہ بندوق میرے پاس کئی برس تک رہی اور جب ۱۹۴۲ء میں گرفتار کیا جاکر کانگرسیوں کے ساتھ نظر بند کیا گیا۔ تو میں جیل میں ہونے کے باعث اس سال لائسنس کی تجدید نہ کرا سکا۔ دہلی آیا اور لائسنس کو تجدید کے لیے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا تو اس نے لائسنس تجدید نہ کرانے کے قصور میں یہ لائسنس ضبط کر لیا۔ حالانکہ میں جیل میں تھا۔ وہاں خط و کتابت تک کی ممانعت تھی لائسنس کیوں کر تجدید کراتا۔ بندوق کا لائسنس ضبط ہونے کے بعد پولیس کا ایک کانسٹیبل ڈپٹی کمشنر کا حکم لے کر بندوق لینے کے لیے میرے پاس آیا تو اس کے پاس جو کاغذات ضبطی کے متعلق تھے۔ میں

Marfat.com

نے وہ دیکھے ان پر لکھا تھا "دیوان سنگھ کا چال چلن اس قابل نہیں کہ اس کو لائسنس عطا فرمایا جائے۔ اس لیے ضبط کیا جاتا ہے۔" یہ چال چلن کے الفاظ پڑھ کر میں نے برا محسوس نہیں کیا کیونکہ گورنمنٹ کے کاغذات میں ہندوستان کے تمام پولیٹیکل لیڈر اور ورکرز مع مہاتما گاندھی بدچلن تھے۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی دفتری حکومت کے سایہ میں اس ملک میں کاغذات کی خانہ پُری کیوں کر ہوتی تھی اور سرکاری کتابوں میں نیک چلنی اور بدچلنی کے کیا معنی تھے۔

اخبار نویس مصیبت زدہ لوگوں کے لیے

مرحوم مہاراجہ نابھہ اور آپ کی فیملی کے ساتھ ایڈیٹر "ریاست" کے بہت گہرے تعلقات تھے اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ان لوگوں کا ہمیشہ مخلص رہا۔ میں نے کبھی ان کی خوشامد نہ کی اور سچی بات ان کے منہ پر کہہ دیا کرتا۔

چنانچہ یہ دلچسپ کیفیت ہے کہ مہاراجہ اور مہارانی اور مہاراجہ کی بہن (مہارانی وصول پور) کے درمیان انتہائی عداوت کے دنوں میں بھی میرے تینوں کے ساتھ گہرے تعلقات رہے۔ یہ تینوں مجھ پر اعتماد کرتے اور تینوں ہی مجھے ایسا سمجھتے جیسے میں ان کی فیملی کا ایک ممبر ہوں۔ مہاراجہ مصوری پہاڑ پر تھے آپ نے مجھے دہلی سے بلایا اور کئی روز تک واپس آنے نہ دیا۔ ہر روز مشورہ ہوتا۔ ایک روز مہاراجہ نے افسوس کے لہجہ میں شکایت کی۔ کہ فلاں ممبر اسمبلی اتنے ہزار روپیہ کھا گیا مگر اس نے کچھ نہ کیا۔ فلاں لیڈر ایک لاکھ روپیہ چاٹ گیا۔ مگر اس نے وائسرائے تک سے نہ کہا اور فلاں بیرسٹر یا ایڈووکیٹ اتنے لاکھ اڑا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تمام لوگ روپیہ لوٹنے والے لالچی ہیں اور کوئی خیر خواہ یا ہمدرد نہیں۔

مہاراجہ نے یہ کہا تو افسوس کے لہجہ میں مگر میں مسکرا دیا۔ مہاراجہ نے پوچھا۔ کہ مسکرائے کیوں ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہ سرکار! یہ لوگ صرف آپ کے مخلص یا ہمدرد ہو کر بغیر غرض یا لالچ کے آپ کی خدمت کریں تو کیوں۔ کیا آپ مہاتما گاندھی ہیں جو دنیا کے لیے تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور ان لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بغیر غرض کے آپ کے لیے تکلیفیں اٹھائیں اور کیا خود آپ کا ان لوگوں سے تعلق بغیر غرض کے ہے اور اگر آپ نابھہ میں اپنی گدی پر ہوتے اور آپ کو کوئی سیاسی تکلیف نہ ہوتی تو کیا پھر بھی آپ ان پولیٹیکل لیڈروں اور ممبران اسمبلی کو روپیہ دیتے۔ آپ اگر ان لوگوں کو روپیہ دیتے ہیں تو اپنی غرض کے لیے اور یہ لوگ آپ کے ساتھ ہیں تو اپنی غرض کے لیے۔ آپ کا لیڈروں کے لالچ اور غرض کی شکایت کرنا لاحاصل ہے۔ مہاراجہ میرے ان الفاظ کو سن کر خوش نہ ہوئے اور ان کی پیشانی کے بل ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس صاف بیانی کو سننا نہ چاہتے تھے۔ چند لمحہ تک تو سکون کی کیفیت طاری رہی اس کے بعد مہاراجہ نے محسوس کیا کہ میں نے جو کچھ کہا وہ صداقت ہے۔ دونوں اطراف غرض کی غلام ہیں۔

اس واقعہ سے چند روز بعد مسٹر ہارنیمین ایڈیٹر "بمبئی سینٹینل" بمبئی سے مہاراجہ کی دعوت پر مصوری

Marfat.com

آئے۔ ان کا قیام تو وہاں ہیکمن ہوٹل کے ایک کمرہ میں تھا مگر زیادہ وقت ان کا بھی مہاراجہ کے پاس گزرتا۔ میں ہر روز صبح نو بجے مسٹر ہارنیمین سے باتیں کرنے ان کے ہوٹل میں جایا کرتا۔ دو تین گھنٹے ان کے ساتھ باتیں ہوتیں۔ ایک روز مسٹر ہارنیمین سے مہاراجہ نابھہ کی مصائب کا ذکر چل پڑا۔ تو مسٹر ہارنیمین نے جو الفاظ کہے وہ اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"ویل مسٹر دیوان سنگھ! اخبار نویس دنیا میں صرف ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے پیدا ہوئے جو مصائب میں ہوں۔ ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو خوشی و آرام میں ہوں۔ مہاراجہ نابھہ مصیبت میں ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کا ساتھ دیں اور مہاراجہ نابھہ جب گدی پر واپس چلے جائیں آرام میں ہوں تو کوئی تعلق نہ رکھیں۔"

مسٹر ہارنیمین کے یہ الفاظ میرے لیے نہ صرف انتہائی دلچسپی اور روح کو ایک ناقابلِ بیان لذت دینے کا باعث ہوئے۔ بلکہ میں اب جب کبھی کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں بے اختیار ان الفاظ کی گونج پیدا ہو جاتی ہے۔

ان واقعات کے عرصہ بعد مہاراجہ نابھہ کوڈائی کنال (مدراس) میں نظر بند تھے۔ مہاراجہ اور مہارانی (موجودہ مہاراجہ کی والدہ) کے درمیان سخت عداوت تھی اور میاں بیوی کے درمیان خط و کتابت تک کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ کہ مہارانی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب سے مل گئیں۔ اور انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ مہارانی نابالغ مہاراجہ اور دوسرے بچوں کو ساتھ لے کر نابھہ چلی جائیں۔ نابھہ جانے سے پہلے مہارانی بچوں کو لے کر ڈیرہ دون سے دہلی آئیں۔ یہاں علی پور روڈ پر نابھہ ہاؤس میں مقیم ہوئیں۔ یہاں پہنچنے پر مہارانی کے بھائی سردار رنبیر سنگھ نے ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلیفون کیا۔ کہ مہارانی صاحبہ نابھہ ہاؤس میں تشریف فرما ہیں اور ہیں ان سے ملنے کے لیے پہنچ جاؤں۔ میں کار میں گیا مہارانی اور بچوں سے ملا۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں تو مہارانی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ کہ آپ نابھہ جا رہی ہیں۔ اس کے متعلق میری کیا رائے ہے۔ میں نے جواب دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نابھہ میں برسرِ اقتدار ہوں گی۔ ریاست نابھہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آپ کی مدد پر ہوگا۔ اور آپ آرام و راحت کے ساتھ زندگی بسر کریں گی۔ مگر میری رائے میں بغیر شوہر کی مرضی کے شوہر کے خلاف ہوتے ہوئے نابھہ جانا آپ کے لیے عزت کا باعث نہ ہوگا۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ آپ مہاراجہ کو زیادہ ناراض کریں۔ اور لوگوں میں بھی ذلیل و رسوا ہوں۔ مہارانی نے کہا۔ کہ مہاراجہ کی تکالیف کے کم ہونے کا بھی ذریعہ صرف یہی ہے کہ وہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تعلقات اچھے کرنے کے لیے نابھہ چلی جائیں اور پھر وہاں پہنچ کر اپنے شوہر کے لیے کوشش کریں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ صرف بہانہ سازی ہے۔ یہ کوئی جواب نہیں جو کسی معقولیت پسند شخص کو مطمئن کر سکے۔

مہارانی کا اس کے بعد شاید چار پانچ روز دہلی میں قیام رہا۔ میں ہر روز ملتا رہا۔ اس عرصہ میں آپ نے بہت کوشش کی۔ کہ میں ان کے ساتھ نابھہ چند روز کے لیے چلوں۔ مہارانی کی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے گہری چال تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا۔ کہ میں اگر آپ کے ساتھ نابھہ چلا گیا۔ تو ایک تو اس کے بعد میں

Marfat.com

مہارانی کے نابھہ جانے کی مخالفت اختیار میں نہ کروں گا۔ کیونکہ خود ان کے اس قدم میں شریک ہوں گا۔ دوسری اُن کی غرض یہ تھی کہ میرے ان کے ساتھ نابھہ جانے کی صورت میں مہاراجہ میرے بھی خلاف ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دیوان سنگھ ہمیشہ مہارانی کا ساتھ دے گا۔ اور مہاراجہ سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے میں نے مہارانی کو جواب دیا۔ کہ میں ایک تو اصولاً اس کے خلاف ہوں کہ آپ اپنے شوہر کی خواہش کے خلاف نابھہ جائیں۔ دوسرے ریاست نابھہ میں میرا سرکاری طور پر داخلہ بند ہے۔ میں وہاں جا نہیں سکتا۔ تیسرے میں اس بات کا اہل نہیں ہوں کہ مہاراجہ نابھہ جیسے دوست سے غداری کر کے آپ کے ساتھ مل جاؤں۔ گو آپ کو بھی اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ میرے لیے بہتر راستہ یہ ہے کہ میں آپ کے ان پرائیویٹ معاملات اور جھگڑوں سے بالکل الگ رہوں۔ اور کسی کا ساتھ نہ دوں۔ مہارانی نے پھر زور دیا اور کہا۔ کہ نابھہ میں داخلہ کی ممانعت کے متعلق آپ ابھی ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب سے بذریعہ تار اجازت منگا لیتی ہیں مگر میں نے پھر بھی انکار کر دیا۔

مہارانی جس روز نابھہ جانے والی تھیں۔ موٹریں گیارہ بجے کے قریب یہاں سے روانہ ہونی تھیں اور پروگرام یہ تھا۔ کہ موٹریں راجپورہ تک جائیں اور وہاں سے شاہی داخلہ (کیونکہ نابالغ مہاراجہ اور ان کی والدہ اور مہاراجہ کی بھائی بہنیں کئی برس کے بعد واپس اپنی ریاست میں جا رہے تھے) کے لیے ریلوے کی سپیشل ٹرین نابھہ جائے۔ میں اس روز نو بجے کے قریب مہارانی اور بچوں سے ملنے کے لیے نابھہ ہاؤس پہنچا ایک گھنٹہ کے قریب ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ اور دس بجے واپس آیا۔ جب واپس آنے لگا۔ تو مہارانی اور نابالغ مہاراجہ (جن کو میں اس روز تک محبت اور وضعداری سے مجبور ہو کر ٹکا صاحب (یعنی ولی عہد) ہی کہا کرتا تھا۔ کیونکہ ضمیر گوارا نہ کرتا تھا۔ کہ ان کے باپ کی زندگی میں ان کو مہاراجہ کہوں) مجھے رخصت کرنے کے لیے کمرہ کے اندر سے باہر برآمدہ میں آئے۔ برآمدہ سے میں جب باہر نکلنے لگا تو میں نے مہارانی کو تو ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا اور نوجوان مہاراجہ کے گلابی رخساروں کو پیار کے ساتھ ہاتھوں سے چھوا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ٹکہ صاحب! گڈ بائی۔ اب تو شاید ہم زندگی میں کبھی آپ سے مل بھی نہ سکیں گے" میرے یہ الفاظ سن کر مہارانی چونک پڑیں اور آپ نے گھبراتے ہوئے کہا۔ کیوں۔ کیوں۔ کیوں۔ دیوان سنگھ جی۔ آپ نے یہ کیا کہا۔

میں نے جواب دیا۔ مہارانی صاحبہ! میں دنیا کی حالت سے واقف ہوں۔ اب آپ لوگ آرام سے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ میرا آپ لوگوں کے ساتھ تعلق صرف اس وقت تک کے لیے تھا جب تک کہ آپ لوگ تکلیف میں تھے۔ اب اس کے بعد آپ سے کیا واسطہ۔ مہارانی نے فوراً جوش کے ساتھ کہا "نہیں نہیں دیوان سنگھ جی۔ آپ کو کبھی ایسا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ آپ کے اور ہم لوگوں کے تعلقات فیملی کے سے تعلقات ہیں۔ یہ ممکن ہی کیوں کر ہے کہ ہم لوگ زندگی میں کبھی جدا ہو سکیں۔ آپ کبھی ایسا خیال نہ کیجیے اور کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالیئے"

میں رخصت ہو کر اپنی کار میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔ واپس آتے ہوئے کار چلا رہا تھا۔ مگر ذہن

Marfat.com

مسٹر ہارنیمین کے ان الفاظ کو بار بار دہرا رہا تھا۔ جو آپ نے سیکسن ہوٹل مصوری میں کہے تھے،

"اخبار نویس دنیا میں صرف ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے پیدا ہوئے جو مصائب میں ہوں۔ اُن لوگوں سے ہمارا کیا تعلق جو خوشی و آرام میں ہوں"

اس کے بعد میں نے نہ تو کبھی مہارانی یا موجودہ مہاراجہ کو کوئی خط لکھا اور نہ ملنے کی کوشش کی۔ نہ ان دونوں کی طرف سے مجھے کبھی کوئی خط ملا۔ یہ کئی بار دہلی میں آئے۔ اور نہ انہوں نے کبھی مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں انبالہ جیل میں نظر بند تھا جب مرحوم مہاراجہ نابھہ کا کوڈائی کنال میں انتقال ہوا۔ ستمبر ۴۲ء میں مجھے نظر بندی سے رہائی ملی اور دہلی جیل سے مسٹر پوتھن جوزف ایڈیٹر "ڈان" کے مکان پہنچا۔ اور پہلے روز رہائی کی اطلاع کے متعلق جب اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے تو ان خطوط میں ایک خط مہاراجہ نابھہ کو بھی لکھا۔ جس میں ان کے والد کے انتقال کے متعلق اظہارِ افسوس کیا گیا تھا۔ اس خط کا جواب اب تک میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ اور نہ شاید کبھی آئے۔ کیونکہ اخبار نویس خطوط کے جواب کی بھی صرف ان لوگوں سے توقع کر سکتے ہیں جو مصائب میں ہوں۔ ان لوگوں کا ان سے کیا تعلق جو آرام و راحت میں ہوں۔

غلط تشخیص اور غلط علاج

میرے وطن حافظ آباد میں ایک درزی امام الدین تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ ہمارے گھر کے کپڑے سیا کرتے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو میری پیدائش سے پہلے میرے والد کے کپڑے بھی شاید وہی سیتے تھے۔ بہت اچھا زمانہ تھا۔ ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا۔ ان امام الدین کو ہمارے گھر میں کسی نے نام سے کبھی نہ پکارا تھا۔ ہر شخص عزت کے ساتھ ان کو مخاطب کرتا۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ جب کبھی ہمارے گھر سینے کے لیے کپڑے لینے یا سینے کے بعد کپڑے دینے آتے تو میں ان کو پنجابی زبان میں چاچا (یعنی چچا) کہتا۔ اور ان کی غیر حاضری میں بھی جب کبھی ان کا نام لیتا تو میں امام الدین کے ساتھ چاچا ضرور کہتا۔ یعنی میں چاچا امام الدین کے ہاں گیا۔ یا چاچا امام الدین سے ملا۔ ہمارے خاندان کے تمام لوگ آپ کے ساتھ اس طرح ہی عزت و محبت کا سلوک کرتے اور یہ سلوک صرف امام الدین تک ہی محدود نہ تھا۔ ہمارے گھر میں صفائی کرنے کے لیے ایک بھنگن روشن بی بی آیا کرتی۔ مجھے یاد ہے میں اس کو بھی ہمیشہ چاچی (چچی) کہہ کر پکارتا۔ اس کی ایک لڑکی مجھ سے سات آٹھ سال بڑی تھی۔ اس سے بھی میں ہمیشہ بہن کہہ کر مخاطب ہوتا۔ کیونکہ تمام گھر بھر میں یہی دستور تھا۔ اور میرے حقیقی بھائی بہن۔ چچا زاد بھائی اور عزیز دوسروں کے ساتھ اس طرح ہی پیش آتے۔

میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ جب میں تلاش روزگار کے لیے وطن سے چلا گیا۔ اس کے بعد اگر کبھی وہاں گیا تو چند روز کے لیے۔ بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ پانچ چھ سال کے بعد جانے کا اتفاق ہوا تو صرف ایک

Marfat.com

یادوروز کے لیے۔ چنانچہ چچا امام الدین سے ملے بھی سالہا سال ہو گئے مگر ان لوگوں کے اخلاص و محبت کا اب تک ذہن پر اثر ہے اور جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو اس اخلاص کی یاد سے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

کئی برس کی بات ہے۔ چچا امام الدین کا نواسہ جس کی عمر دس سال کی ہو گی کھانسی میں مبتلا ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو بخار کی بھی شکایت ہوئی۔ کھانسی اور بخار دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ہندوستان کے نالائق حکیموں کے خیال میں سو فیصدی تپ دق ہے۔ امام الدین اس بچہ کو جس حکیم کے پاس لے جائیں وہ کھانسی اور بخار سن کر نبض دیکھے اور تپ دق کا نسخہ لکھ دے۔ یہ بچہ دو برس تک اس "تپ دق" میں مبتلا رہا۔ تمام حکیموں کے فتوے کی صورت میں بچہ کے والدین کی تشویش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ امام الدین صاحب اس وقت بہت ضعیف تھے۔ (معلوم اب زندہ ہیں یا انتقال کر چکے) ان کو علم تھا کہ میں دہلی میں ہوں اور "ریاست" اخبار بہت شان کے ساتھ نکل رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی سنا تھا کہ دہلی لائق حکیموں کا مرکز ہے۔ ان کو یہ بھی خیال ہوا کہ ویران سنگوہ کا ان حکیموں پر اثر ہو گا۔ یہ بچہ دہلی کے حکیموں کو دکھایا جائے۔ شاید اس کے تپ دق کا علاج ہو سکے اور لڑکا بچ جائے۔ امام الدین صاحب نے اپنے داماد یعنی اس بچہ کے باپ کے ساتھ اپنے نواسہ کو بھیجا۔ اور ساتھ مجھے خط لکھا کہ یہ بچہ دو سال کے عرصہ سے تپ دق میں مبتلا ہے۔ اس کو کھانسی و بخار ہے۔ تمام حکیموں نے جواب دے دیا۔ اسے دہلی کے حکیموں میں سے کسی لائق حکیم کو دکھایا جائے تاکہ اس کا علاج ہو شاید یہ بچ جائے۔

یہ بچہ اپنے باپ کے ساتھ جب آیا اور میں نے اس خط کو پڑھا تو مجھے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا جب امام الدین ہمارے دکھ سکھ کے شریک تھے۔ ہمارے ہاں شادی ہوتی تو یہ کئی کئی روز تک ہمارے ہاں بیٹھ کر کپڑے سیتے اور اگر کوئی موت ہو جاتی تو یہ اس طرح بین کرتے۔ جیسے ان کے گھر کا کوئی عزیز مر گیا ہے۔ میں نے ایک کمرہ میں امام الدین کے داماد اور نواسہ کی رہائش کا انتظام کیا۔ مرحوم حکیم محمد احمد خاں (مرحوم حکیم اجمل خاں کے بھتیجے) کے ساتھ میرے حقیقی بھائیوں جیسے تعلقات تھے (آہ! ایسے مخلص بے ریا اور محبت کے لوگ دنیا سے اٹھ گئے اور اب ان کا نعم البدل کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ بچے کو ایک دو روز بعد حکیم کو دکھاؤں گا۔ شام کو میں کام سے فارغ ہوا۔ تو میں نے امام الدین کے داماد کو اس غرض سے اپنے پاس بلایا۔ کہ اس سے حافظ آباد کے تازہ حالات معلوم کروں۔ یہ باتیں کرنے کے لیے اپنے بچہ کے ساتھ میرے پاس آیا تو باتوں باتوں میں اس نے بتایا۔ کہ بچہ کے متعلق تمام حکیموں نے مایوسی کا اظہار کیا ہے یہ دو سال سے بیمار ہے اور اس کی زندگی کی گھر والوں کو کوئی امید نہیں کیونکہ اسے تپ دق ہے۔

دو سال کی طویل بیماری اور تپ دق کو سن کر میں نے جب بچہ کی طرف دیکھا تو اس کے رخساروں پر سرخی تھی اور بچپن کے باعث وہ سکون کے ساتھ بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اس کا ذہن شرارتوں اور کھیلوں کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ وہ چاہتا تھا۔ کہ ہمارے پاس بیٹھنے کے بجائے کھیلنے کے لیے نیچے چلا جائے۔ میں نے اس کی اس کیفیت کو دیکھا تو سوچنے لگا۔ کہ یہ کس قسم کا تپ دق ہے جس میں دو سال

Marfat.com

تک مبتلا رہنے کے بعد بھی بچہ کے چہرہ پر سرخی ہے اور اس کی بچپن کی شرارت میں کمی نہیں ہوئی۔ میں تین چار برس تک میڈیکل پریکٹس کرتا رہا۔ اور میں کامیاب پریکٹیشنروں میں سے تھا۔ اس سے پہلے موگا کے ہسپتال میں رہا۔ اور اب بھی ادویات کے ساتھ دلچسپی باقی ہے۔ اور جب کبھی کوئی ڈاکٹر ملے تو نئی ایجادات کے متعلق باتیں کر لیتا ہوں۔ میں نے بچہ کے متعلق پوچھا۔ کہ اس کو تکلیف کیا ہے۔ تو بچہ کے باپ نے بتایا۔ کہ تپ دق ہے۔ میں نے پھر پوچھا اور کہا۔ کہ تپ دق تو بیماری ہے۔ اس کو تکلیف کیا ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ دن بھر اور رات بھر کھانستا ہے اور رات کو اسے بخار بھی ہوتا ہے۔ میں حیران کہ یہ تپ دق کس قسم کا ہے۔ جو دو سال تک رہا۔ مگر بچہ کے چہرہ پر سرخی اور رونق ہے۔ کیونکہ تپ دق کا دو چار ماہ میں ہی اگر علاج نہ کیا جائے تو موت کے قریب لے جاتا ہے۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ شاید اس کا گلا خراب ہو اور گلے کی خرابی کے باعث ہی یہ کھانستا ہو اور بخار بھی ہو جاتا ہو۔ میں نے اس کو منہ کھولنے کے لیے کہا۔ اس نے منہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس کے گلے کے دونوں طرف لوکاٹ کے برابر گلینڈ بڑھے ہوئے ہیں اور تمام منہ غلیظ ہے۔ یعنی کبھی صاف نہیں کیا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہی اس کی بیماری کا باعث ہے۔

اس واقعہ سے ایک عرصہ پہلے کئی برس تک میرا گلا خراب تھا اور سور تھروٹ کے باعث میں آرام سے سو بھی نہ سکتا تھا۔ اس زمانہ میں چاندنی چوک کے سرے پر ایک تھروٹ اکسپرٹ ڈاکٹر قریشی تھے۔ (میرا خیال ہے کہ یہ صاحب بعد میں غالباً ریاست رام پور میں چیف میڈیکل آفیسر تھے) میں نے ان کو دکھایا تو انہوں نے مجھے ناک اور گلے میں سپرے کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے دو فیصدی کی طاقت کا ارجیرول سلیوشن بتایا۔ میں نے اس لوشن کا استعمال کیا تو میرا گلا جو کئی برس سے خراب تھا۔ دو تین دن ہی میں بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ یہ لوشن اور سپرے میرے پاس ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ میں کئی درجن دوستوں کو یہ نسخہ بتا چکا تھا۔ اور کوئی طلب کرتا تو معہ سپرے اس کو دے بھی دیتا۔ اور اگلے روز نیا خرید لیتا۔ میں نے دوا سپرے میں ڈال کر اسے لگائی اور ناک کے ذریعہ ناک اور گلے کے درمیان کے حصہ میں پہنچائی۔ صبح پھر اسی طرح سپرے کیا اور غرارہ کے لیے میں نے اس کو مرکوزون اور لسٹرین دیا۔ (جو میں غرارہ کے لیے ہمیشہ خود استعمال کرتا ہوں) دو دن کے بعد میں نے دیکھا تو اس کا گلا بہت حد تک اچھا ہو چکا تھا۔ میں نے حال پوچھا۔ تو اس نے بتایا۔ کہ اب اس کو کھانسی کی شکایت نہیں اور رات کو بخار بھی نہیں ہوتا۔ اور کوئی تکلیف باقی نہیں۔ تین چار روز میں نے اس بچہ کو خود سپرے کیا۔ جب بچہ بالکل اچھا ہو گیا تو میں نے اس کو ایک شیشی سلیوشن۔ ایک سپرے۔ ایک شیشی مرکوزون اور ایک شیشی لسٹرین دی۔ تفصیل سے سپرے کے ساتھ دوائی کا لگانا بتایا اور غراروں کے متعلق سمجھایا۔ اور کہا تپ دق نہ تھا گلا خراب تھا اب بچہ اچھا ہو گیا ہے۔ یہ ادویات لے کر واپس تشریف لے جائیے۔ یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد اس نے سوال کیا۔ کہ حکیم صاحب کو کب دکھاؤ گے۔ میں نے پوچھا۔ کہ بچہ اب بالکل اچھا ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا۔ کہ ہاں بالکل اچھا ہے نہ کھانسی ہے نہ بخار۔ رات کو آرام سے سوتا ہے۔ اور کوئی شکایت نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں بالکل

Marfat.com

اچھا ہے نہ کھانسی ہے نہ بخار۔ رات کو آرام سے سوتا ہے اور کوئی شکایت نہیں۔ میں نے کہا کہ جب بالکل اچھا ہے تو پھر حکیم صاحب کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میری تمام دلائل سننے کے بعد اس نے پھر کہا کہ حکیم صاحب کو تو ضرور دکھا دیجئے۔ میں نے بہت کہا کہ جب بچہ بالکل اچھا ہے تو اب دکھانے سے کیا حاصل۔ یہ نہیں مانا۔ بہت مایوسی محسوس کر رہا تھا۔ آخر مجبوراً مجھے بھی جہالت کا ساتھ دینا پڑا۔ میں ان باپ بیٹے کو موٹر میں حکیم صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ تمام حالات بتائے اور عرض کیا۔ کہ اس طرح سے علاج کیا۔ اب بچہ بالکل اچھا ہے مگر ان کی خواہش تھی کہ آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں۔ حکیم صاحب تمام حالات سن کر مسکرا دیئے۔ اور آپ نے نسخہ لکھ دیا۔ شربت شہتوت ایک تولہ اور فلاں معجون دن میں تین بار۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں حکیموں اور ویدوں کے متعلق کتنا کورانہ اعتقاد ہے اور پبلک کس طرح سے غلط تشخیص اور غلط علاج کا شکار ہو کر نئی ایجادات اور سائنس سے فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے تباہ ہو رہی ہے۔

ریاست نابھ کا پُر اسرار بکس

ریاست نابھ میں ایک صاحب پنڈت آسا سنگھ مہاراجہ کے لے ڈی سی تھے۔ بڑے منکسر مزاج بات کرتے تو ہاتھ جوڑ کر نگاہیں نیچی کر کے خوشامدانہ طریقہ سے۔ مہاراجہ ان کی خوشامدوں کے باعث ان سے بہت خوش تھے۔ ان کے والد بھی پہلے اس ریاست میں ملازم تھے اور پنڈت آسا سنگھ نے بھی ایک ادنیٰ حیثیت سے لے ڈی سی تک ترقی کی تھی۔ اس لیے ان کو خاندانی اور فطرتاً وفا شعار سمجھا جاتا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے مہاراجہ نے اپنے ایک دوست سردار بہادر سردار گجن سنگھ آف لدھیانہ (جو اس زمانہ ممبر پنجاب کونسل تھے) کو ایک زبانی پیغام بھیجا۔ جو لکھ کر نہ بھیجنا چاہتے تھے تو اس پیغام کو پہنچانے والے پنڈت آسا سنگھ تھے۔ مہاراجہ نے جو تعارفی خط پنڈت آسا سنگھ کو دیا اس میں لکھا کہ "پنڈت آسا سنگھ میرے معتمد ترین نمائندہ ہیں۔ یہ جو کچھ کہیں گے وہ میری طرف سے اور سچ سمجھا جائے۔" پنڈت آسا سنگھ کا نابھ میں کافی عروج تھا۔ ریاستوں میں تو حکمران کے ہاتھ دھلانے اور کھانا کھلانے والوں سے بھی ان کو سگ حضوری سمجھ کر لوگ ڈرتے تھے۔ پنڈت آسا سنگھ لے ڈی سی تھے ان سے تو وزراء بھی خوف کھاتے اور بہت عزت سے پیش آتے۔

چیمبر آف پرنسس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا۔ مہاراجہ یہاں لڈلو کیسل روڈ کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے اس کوٹھی کے میدان میں پرائیویٹ سیکرٹری اے ڈی سی اور دوسرے ملازمین حضوری کے لیے خیمے نصب تھے۔ سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ وڈلینڈ ہوٹل میں مقیم تھے اور راقم الحروف کو بھی تار دے کر نابھ سے دہلی بلوایا گیا تھا جو بعض دوسرے افسروں کے ساتھ ایک ہوٹل (مجھے ٹھیک یاد نہیں رہا غالباً مہاراجہ ہوٹل تھا جو نادلٹی سینما کے پاس ہے) میں مقیم تھا۔

پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسر اور ان کا ڈیپارٹمنٹ مہاراجہ کا ان کے گدی پر بیٹھنے کے دن سے ہی دشمن تھا۔ اس مخالفت کے باوجود مہاراجہ سرکاری خط و کتابت میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو جو جواب دیتے وہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کے لیے خوش گوار نہ ہوتا۔ ان ایسے جوابات میں سے مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب نے گورنمنٹ ہند کی ہدایت کے مطابق پنجاب کی تمام ریاستوں سے دریافت کیا۔ کہ ان کی ریاست میں سرکاری ملازمین اور ریاست کے لوگوں کے پاس کتنی بندوقیں، کتنی تلواریں، کتنی برچھیاں، کتنے بھالے اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ کیونکہ گورنمنٹ ہند تمام ہندوستان میں اسلحہ شماری کرنا چاہتی تھی۔ گورنمنٹ کے اس سرکولر کے جواب میں ہندوستان کی ہر ریاست نے مطلوبہ اطلاع بہم پہنچائی مگر مہاراجہ نابھہ نے جواب میں لکھا۔ کہ آپ معاہدہ کی کونسی دفعہ کے مطابق یہ پوچھ رہے ہیں اور ایسا پوچھنے کا آپ کو حق کیا حاصل ہے۔ اس قسم کے جوابات حالات کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بناتے چلے گئے۔ اور مہاراجہ یہ معلوم کرنے کی فکر میں رہتے۔ کہ گورنمنٹ ان کے خلاف کیا کچھ کر رہی ہے۔ چنانچہ مہاراجہ نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دفتر سے اپنے متعلق تمام حالات معلوم کرنے کے لیے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے متعدد بڑے افسروں اور کلرکوں کو کرایہ پر خرید رکھا تھا۔ ان کو ہزارہا روپیہ ماہوار دیا جاتا اور یہ لوگ تمام اس خط و کتابت کی نقلیں اور کاغذات لکڑی کے ایک بکس میں رکھتے اور مہاراجہ جہاں سفر کرتے یہ بکس اپنے ساتھ پنڈت آسا سنگھ کی تحویل میں لے جاتے۔ چنانچہ اس زمانہ میں یہ بکس بھی مہاراجہ کے ساتھ تھا جو پنڈت آسا سنگھ کی تحویل میں آپ کے خیمہ میں رہتا۔

والیان ریاست طوائفوں اور روزانہ اخبارات کے ایڈیٹروں کی زندگی کا پروگرام دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دنیا سوتی ہے۔ تو یہ جاگتے ہیں۔ دنیا جاگتی ہے تو یہ سوتے ہیں۔ مہاراجہ نابھہ بھی دوسرے والیان ریاست کی طرح صبح دس بجے جاگتے۔ بارہ بجے چائے پیتے۔ دو بجے ناشتہ ہوتا۔ شام کو چھ بجے۔ لنچ رات کو دس بجے شام کی چائے اور رات کو دو بجے ڈنر کھانے کے بعد تین بجے بیڈروم میں جاتے۔ آپ ایک روز رات کو دو بجے سو گئے تو چار بجے پنڈت آسا سنگھ نے خزانچی سے جو کیمپ میں ساتھ رہتا، سے دو ہزار روپیہ اخراجات کے نام پر لیا اور کہا۔ کہ آپ مہاراجہ کے ایک ضروری کام کے لیے گوالیار جا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک ٹانگہ منگایا۔ اس ٹانگہ میں لکڑی کا وہ بکس رکھوایا جس میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے حاصل کی ہوئی نقلیں اور رشوت دے کر حاصل کیے ہوئے کاغذات تھے۔ آپ کی روانگی سے پہلے پٹیالہ کی تیز رفتار موٹریں اس کوٹھی سے کچھ فاصلہ پر موجود تھیں۔ یہ بکس ایک موٹر میں رکھا گیا۔ پنڈت جی بھی بیٹھ گئے اور یہ موٹریں پٹیالہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ تیز موٹر دہلی سے پٹیالہ چار گھنٹہ میں پہنچا سکتی ہے۔ پنڈت آسا سنگھ معہ کاغذات آٹھ بجے کے قریب پٹیالہ پہنچ گئے۔ دس بجے کے قریب مہاراجہ نیند سے بیدار ہوئے۔ ضروری حاجات سے فارغ ہوئے۔ تو پنڈت آسا سنگھ کو طلب فرمایا۔ کیونکہ یہ معمول تھا کہ بیدار ہونے کے بعد مہاراجہ کا یہ "معتمد ترین" اے ڈی سی ہر روز مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ملازم پنڈت آسا سنگھ کو بلانے گیا تو پنڈت جی اپنے خیمہ میں نہ تھے۔ دوسروں کے خیموں میں تلاش کیا۔ وہاں بھی نہ ملے

Marfat.com

مہاراجہ کو رپورٹ ہوئی۔ کہ موجود نہیں ہیں۔ مہاراجہ نے سمجھا۔ کہ شاید یہیں کہیں ہوں گے۔ گیارہ بج گئے۔ پنڈت آسا سنگھ پھر طلب کیے گئے۔ وہ پھر نہ ملے تو پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا گیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری سردار گوردیال سنگھ تھے انہوں نے سٹاف کے دوسرے لوگوں سے دریافت کیا۔ تو خزانچی نے بتایا کہ صبح چار بجے دو ہزار روپیہ لے کر گوالیار گئے ہیں اور انہوں نے اپنے ساتھ ایک بکس بھی ٹانگہ میں رکھوایا تھا۔ پنڈت جی کے خیمہ میں جا کر بکس دیکھا گیا تو وہ بھی غائب تھا۔ اب تشویش ہوئی۔ کہ مہاراجہ نے تو پنڈت جی کو کہیں بھیجا نہیں۔ پنڈت جی گئے کہاں۔ مہاراجہ کی موٹریں پنڈت جی کی تلاش میں نکلیں۔ کوئی ریلوے سٹیشن۔ کوئی ووڈ لینڈ ہوٹل میں۔ کوئی دوسرے ہوٹلوں میں۔ گوالیار ایکسپریس جوابی تار دیا گیا۔ وہاں سے لاعلمی کا جواب آیا۔ کئی گھنٹہ تک تشویش و ہیجان کہ پنڈت جی گئے کہاں۔ آخر کئی گھنٹہ مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ پولیس میں رپورٹ کی جائے۔ چنانچہ دو ہزار روپیہ اور سرکاری سامان لے کر بھاگ جانے کی رپورٹ تھانہ میں لکھی گئی مگر تفتیش ہو تو کہاں اور کرے تو کون۔ پنڈت آسا سنگھ کے پٹیالہ پہنچنے پر پنڈت جی کو چالیس ہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا اور آپ کو وہاں نائب تحصیلدار بھی مقرر کیا گیا۔ جو شاید بعد میں وہاں ترقی کر کے تحصیلدار بھی ہوئے۔

پنڈت آسا سنگھ والے بکس کو سر پاکستن کول وزیر اعظم پٹیالہ دہلی لائے۔ یہ بکس سر جان تھامپسن پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو دیا گیا۔ سر جان نے تمام کاغذات دیکھے۔ کاغذات دیکھنے کے بعد آپ ان کاغذات کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے کے پاس لے گئے۔ لارڈ ریڈنگ نے تمام کاغذات کو دیکھا۔ تو وہ اس خط و کتابت کی نقلیں تھیں جو مہاراجہ نابھ کے متعلق وائسرائے اور پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند یا پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند اور ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب کے درمیان ہوئی تھی اور قطعی کانفیڈنشل تھی۔ لارڈ ریڈنگ نے ان کاغذات کو دیکھ کر حیرانی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی انگلی دانتوں میں لے لی اور سر جان تھامپسن کو مہاراجہ کے متعلق حکم دیتے ہوئے کہا:

"اس شخص کے ہاتھوں سے گورنمنٹ ہند کا کانفیڈنشل ریکارڈ بھی محفوظ نہیں اس شخص کو لازمی طور پر ختم کیا جائے اور گدی سے اتارا جائے۔"

اس واقعہ سے پہلے نابھہ اور پٹیالہ کے درمیان مقدمہ بازی جاری تھی۔ لکھنؤ چیف کورٹ کے ایک جج جسٹس سٹورٹ انبالہ میں مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ نابھہ کی طرف سے مسٹر ایڈرلی نارٹن۔ سر علی امام۔ مسٹر حسن امام اور سردار بہادر بھگوان سنگھ (جو آج کل اجمیر میں وکالت کرتے ہیں) وغیرہ اور پٹیالہ کی طرف سے کلکتہ کے مسٹر سین اور نصف درجن دوسرے بڑے بڑے وکلاء جن کے نام یاد نہیں رہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر سپرو بھی تھے) پیروی کر رہے تھے۔ وکیلوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لیے کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی لاریاں نابھہ اور پٹیالہ لائی جاتیں شاید ہی کوئی گواہ ایسا ہو گا جس کو دس ہزار روپیہ سے کم رشوت دی جاتی۔ بعض گواہوں کو تو ہاں کی جگہ صرف نہ کہنے کے لیے پچیس پچیس اور پچاس پچاس ہزار روپیہ رشوت دی گئی۔ نابھہ اور پٹیالہ کی رعایا کا پسینہ بہا کر پیدا

Marfat.com

کیا ہُوا روپیہ مقدمہ کے نام پر وکیلوں اور گواہوں کے جیب میں گیا اور ابھی جسٹس سٹوارٹ کا فیصلہ نہ ہُوا تھا۔ کہ مہاراجہ نابھہ کو گورنمنٹ ہند نے نوٹس دے دیا۔ کہ یا تو گدی سے خود بخود دست بردار ہو جاؤ ورنہ جرائم کے بیسے اسی طرح ہی کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی جس طرح عام ملزموں کو دی جاتی ہے۔ مہاراجہ دست بردار ہو گئے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ان ملازموں پر راز افشا کرنے وغیرہ کے جرم میں مقدمہ چلا۔ جنہوں نے اپنے دفتر کے کاغذات کی نقلیں مہاراجہ کو سپلائی کی تھیں اس مقدمہ میں سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری مہاراجہ نابھہ اور فارن منسٹر ریاست نابھہ وغیرہ بطور سرکاری گواہ پیش ہوئے۔ جنہوں نے بیان کیا۔ کہ وہ ان لوگوں سے کاغذات لے جا کر مہاراجہ نابھہ کو بیتتے رہے۔ ملازموں کو دو دو تین تین سال قید سخت کی سزائیں ہوئیں اور ملازمت سے برطرف کیے گئے۔

ان واقعات کے کئی برس بعد جب مہارانی موجودہ مہاراجہ اور اپنے دوسرے بچوں کو لے کر واپس اپنی ریاست نابھہ میں چلی گئیں تو ایک روز پنڈت آسا سنگھ ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لیے دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ ان بیچاروں کو یہ وہم تھا یا انہوں نے کسی سے سنا تھا۔ کہ مہارانی نابھہ پر دیوان سنگھ کا بہت اثر ہے اور دیوان سنگھ جو مشورہ دے مہارانی اس مشورہ کو قبول کر لیتی ہیں۔ پنڈت آسا سنگھ جب تشریف لائے تو وہی انکسار اور وہی ریاستیوں کا سا ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کرنا۔ دعا سلام کے بعد باتیں ہوئیں تو آپ نے خواہش ظاہر کی کہ چونکہ مہارانی نابھہ اب نابھہ واپس چلی گئی ہیں۔ اور وہ وہاں برسر اقتدار ہوں گی اور مہارانی کے دل میں ایڈیٹر "ریاست" کے لیے بہت عزت و قدر ہے۔ مہارانی سے ایڈیٹر "ریاست" یہ کہے کہ پنڈت آسا سنگھ نابھہ کے شاہی خاندان کے بدستور وفا شعار ہیں اور انہوں نے غداری نہ کی تھی۔ صرف غلط فہمی ہوئی۔ جو دُور ہو جانی چاہیئے۔ میں نے پنڈت آسا سنگھ سے جب یہ سنا۔ تو حیران رہ گیا۔ کہ دنیا میں کتنے بڑے بیوقوف لوگ موجود ہیں۔ جو اپنے ذہن کو دھوکہ دیتے ہوئے خود بے وقوف بنتے ہیں اور دوسروں کو بھی بے وقوف سمجھتے ہیں۔ میں نے پنڈت جی سے کہا۔ کہ پنڈت جی میرا مہارانی پر فی الحقیقت کوئی اثر نہیں اور اگر اثر ہوتا بھی تو میں آپ کے متعلق کچھ کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کیونکہ میں آپ کے تمام حالات سے واقف ہوں اور مہارانی خود واقف ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دونوں ہی اپنے ذہن کو دھوکہ دے کر یہ سمجھ لیں کہ آپ نے مہاراجہ کے ساتھ غداری نہ کی تھی۔ آپ کا ہم دونوں کو بے وقوف سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اپنے ذہن کو دھوکا دے رہے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ کبھی بھی یہ کوشش نہ کیجیے کہ آپ درست فہمی کو غلط فہمی بنا کر اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اس میں کامیابی ممکن نہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا اس کی سزا یہی کافی ہے کہ پٹیالہ میں بھی لوگ آپ کو غدار سمجھتے ہوئے آپ سے نفرت کرتے ہیں اور آپ کے دوستوں کے دل میں بھی آپ کے لیے عزت نہیں۔

مجھے علم نہیں کہ پنڈت آسا سنگھ آجکل ریاست پٹیالہ میں ملازم ہیں یا نہیں اور زندہ ہیں یا مر چکے مگر پُراسرار کیس کا یہ واقعہ ریاست نابھہ اور پٹیالہ دونوں کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ جس کے باعث وائسرائے نے مہاراجہ نابھہ کو گدی سے اتارنے کا قطعی فیصلہ کیا۔

Marfat.com

مارشل لا کا زمانہ

میں لاہور میں لالہ شام چند کپور کے روزانہ اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ وقت سنڈے والے "ہندو" (جس کو ایک پنڈت جی نکالتے تھے۔ یہ پنڈت جی آجکل غالباً ہردوار میں ایک سنیاسی کے طور پر زندگی بسر کرتے ہیں اور اب بھی کبھی کبھی اخبار نکال لیتے ہیں) اور ایک دوسرے اخبار میں بھی کچھ وقت دیتا تھا تاکہ میرا گزارہ ہو سکے۔ لاہور میں اطلاع پہنچی کہ مہاتما گاندھی بمبئی سے پنجاب آتے ہوئے ریلوے سٹیشن پلول (پلول دہلی کے قریب ہے اور یہاں سے ضلع گوڑگانواں (پنجاب) کا علاقہ شروع ہوتا ہے) پر گرفتار کر لیے گیے۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر آگ کی طرح تمام صوبہ میں پھیل گئی۔ لاہور شہر میں تمام دکانیں بند۔ پانچ پانچ سات سات ہزار کا مجمع جگہ جگہ۔ بازار کا تمام کاروبار معطل اور مہاتما گاندھی زندہ باد کے نعرے۔ مجھے اطلاع ملی کہ شاہی مسجد میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے خلاف اظہار ناراضگی کے لیے جلسہ ہوگا۔ میں بھی اخبار کے لیے رپورٹ لینے شاہی مسجد میں گیا اور جس جگہ تقریریں ہونی تھیں اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ تقریریں شروع ہوئیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد، مہاتما گاندھی کی گرفتاری اور انگریزوں کے مظالم پر تقریریں کیں۔ میں نے کاغذ کی سلپوں کی کاپی پر پنسل سے اخبار کے لیے نوٹ لینے شروع کیے تو قریب بیٹھے ایک شخص نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کہ یہ کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا اخبار کے لیے تقریر لکھ رہا ہوں۔ یہ شخص میرا جواب سن کر خاموش تو ہو گیا مگر اس کے چہرہ اور اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ میرے جواب سے مطمئن نہیں اور مجھے کوئی سی آئی ڈی کا آدمی سمجھتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت پبلک راج ہے اور ہر شخص لیڈر اور خود مختار ہے۔ لوگ جوش اور غصہ میں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شبہ ہی شبہ میں مجھ پر کوئی حملہ کر دے۔ میں نے سلپوں کی کاپی اور پنسل اپنے جیب میں ڈال لی اور تقریریں سننے لگا۔ تاکہ بعد میں اپنی یادداشت سے ان کے نوٹ لوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیڈر تقریریں کر رہے تھے تو مجھے کچھ غیرت سی محسوس ہوئی کہ ان تقریر کرنے والوں میں سکھ ایک بھی نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سکھ اس قومی تحریک (جس کو لوگ ملکی بغاوت سمجھتے تھے) میں حصہ نہیں لے رہے۔ میرے بالکل قریب ماسٹر موتا سنگھ بی اے (یہ بزرگ جنگ سے پہلے دس پندرہ برس جیل میں رہے اور جنگ شروع ہوتے ہی پھر گرفتار کر لیے گئے۔ مرحوم گنگا دھر خاں کے بہت گہرے دوست تھے۔ متعدد بار روس اور افغانستان گئے۔ تقریر کرنے کے اعتبار سے میرا خیال ہے کہ ملک میں کم آدمی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں) بیٹھے تھے۔ میرے دوست تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ماسٹر جی! آپ سکھوں کے نمائندہ کے طور پر تقریر کیجئے۔ سکھوں کی طرف سے اس تحریک میں شامل نہ ہونا شرمناک ہے۔ ماسٹر جی نے انکار کیا اور کہا کہ آپ شام کی گاڑی پر سوار ہو کر اگلی صبح بھسوڑ (ریاست پٹیالہ) جہاں کہ آپ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ضرور پہنچنا چاہتے ہیں کیونکہ ضروری کام ہے۔ میں نے ان کے اس بہانہ کو کسر نفسی سمجھا اور پھر زور دیا۔ ماسٹر جی نے پھر انکار کیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ایک دوسرے صاحب تقریر

Marfat.com

ختم کر چکے تو میں نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اب سکھوں کی طرف سے سکھوں کے لیڈر ماسٹر موتا سنگھ تقریر کریں گے۔ اس اعلان کے بعد ماسٹر جی کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ پنجاب کے ہندو اور مسلمان بھی ماسٹر جی کے نام سے اور ان کی جیلوں کی زندگی سے واقف تھے۔ اللہ اکبر، مہاتما گاندھی کی جے اور ماسٹر موتا سنگھ زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے۔ ماسٹر جی نے تقریر کی۔ آپ کی تقریر دوسرے تمام مقررین سے زیادہ سخت اور پُر اثر تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے اس تقریر میں آپ نے فرمایا تھا:

"ظلم کو برداشت کرنا خود ظلم کی تبلیغ کرنا ہے"

ماسٹر جی کی تقریر کے بعد دو تین اور اصحاب کی تقریریں ہوئیں تو ہم لوگوں نے دیکھا کہ ہمارے قریب ہی ایک شخص کے ہاتھ میں کاغذ اور پنسل ہے اور لوگ اسے بری طرح مارتے ہوئے اسے سی آئی ڈی کا آدمی کہہ رہے ہیں۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ بیچارا بھی شاید میری طرح کسی اخبار کا رپورٹر ہو گا۔ میں فوراً اٹھا۔ اور مارنے والے لوگوں اور مار کھانے والے شخص کے درمیان کھڑا ہو گیا تاکہ اس کو بچایا جا سکے۔ میں نے ہاتھ پھیلا دیئے تھے کہ اس کو چوٹ نہ پہنچے۔ لوگوں کا حملہ میرے ہاتھوں پر بھی ہوا۔ اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ میرے ساتھ تقریریں کرنے والے کئی لیڈر بھی اس شخص کو بچانے میں مصروف تھے۔ چنانچہ ہماری درخواست پر مجمع خاموش ہو گیا اور یہ شخص جلسہ میں سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے تقریر کی تھی کہ بعض لوگ دور سے ایک فوجی وردی پہنے ہوئے شخص کو اٹھائے لا رہے ہیں اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مجمع میں شور پیدا ہو گیا دریافت کیا گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ تو لوگوں نے بتایا کہ جالندھر چھاؤنی کی فوج میں بغاوت ہو گئی ہے اور یہ فوجی نوجوان وہاں سے دس بارہ گوروں کو قتل کر کے بھاگ آیا ہے۔ اس خوشی میں لوگوں نے اس کو اٹھا لیا ہے اور نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ تقریریں کرنے والے بعض لیڈر پریشان تھے کہ کہاں مہاتما گاندھی کا عدم تشدد اور کہاں عوام کی یہ سپرٹ۔ ملک کا کیا حال ہو گا۔ مگر ان لیڈروں کی کون سنتا تھا۔ لوگ بے قابو ہو رہے تھے۔ اس فوجی کے آنے کے بعد جلسہ منتشر ہو گیا۔ جب ہم لوگ جلسہ سے شہر کی طرف جانے لگے تو دیکھا کہ گھوڑوں پر پولیس سوار اس دروازہ کے باہر پہنچ چکے ہیں۔ جو دروازہ شاہی مسجد سے شہر کو جاتا ہے لوگ آہستہ آہستہ اس دروازہ سے نکل گئے پولیس سواروں نے کچھ نہیں کہا۔

میں مجمع کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف گیا تو آگے چوک میں (جہاں ایک قبر ہے جسے غالباً نو گزہ کی قبر کہتے ہیں) پولیس بندوقیں لیے موجود تھی۔ مجمع پولیس کو دیکھ کر رک گیا۔ پولیس کے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر تھا اس نے مجمع سے کہا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ ایک جگہ جمع نہ ہو مگر لوگ صرف خود تماشہ نہ تھے تماشائی بھی تھے لوگ نہ گئے۔ تو اس پولیس افسر کے حکم سے پولیس نے بندوقیں چلا دیں۔ ایک دو اشخاص مر گئے۔ تین چار زخمی ہوئے تو لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور چوک صاف ہو گیا۔ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے ایک بند دکان کے برآمدہ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔

رات کو میں لالہ بانکے دیال ایڈیٹر "جھنگ سیال" کے مکان پر بھاٹی دروازہ سویا کرتا تا کیونکہ سونے

Marfat.com

سے زیادہ دلچسپی موجودہ حالات کے متعلق باتیں اور بحث کرنے میں تھی۔ اس واقعہ سے اگلے روز یا ایک دو روز بعد (مجھے ٹھیک یاد نہیں) صبح میں حالات کا پتہ لینے شہر میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہی مسجد میں جو شخص پٹا تھا اور جس کو بچاتے ہوئے میرے ہاتھ کی انگلیوں پر چوٹ آئی تھی وہ علی گوہر انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی تھا۔ جو جلسہ میں سرکاری رپورٹر کے طور پر گیا تھا۔ میں لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر "ویش" کے مکان پر پہنچا تو وہاں معلوم ہوا کہ مارشل لاء نافذ ہو چکا ہے اور رات کو ڈاکٹر گوکل چند نارنگ۔ پنڈت رام بھج دت چودھری اور لالہ ہرکشن لال وغیرہ تمام لیڈر ملک معظم کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ لالہ دینا ناتھ کے ہاں سے میں گوالمنڈی کی طرف گیا تو وہاں ایک دوست ملے۔ انہوں نے کہا۔ کہ ساٹھ گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ وہاں سے میں سردار سردول سنگھ کویشر کے مکان پر پہنچا تو ان کے آدمی نے بتایا۔ کہ سردار صاحب کو کل ہی علم ہو گیا تھا۔ کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ لاہور سے باہر کسی نامعلوم جگہ پر چلے گئے ہیں اور وہ جاتے ہوئے میرے (دیوان سنگھ) کے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ میں بھی فوراً لاہور سے کسی پوشیدہ جگہ چلا جاؤں۔ سر مائیکل اوڈوائر نے جن اڑھائی سو اشخاص کے وارنٹ جاری کیے ہیں ان میں میرا بھی نام ہے۔ کیونکہ میں نے شاہی مسجد میں ماسٹر موتا سنگھ کا تعارف کرایا تھا۔ سردار سردول سنگھ کے مکان سے واپس لالہ دینا ناتھ کے ہاں پھر مشورہ کے لیے آیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک سوا سو کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ وہاں سے لالہ بانکے دیال کے مکان پر پہنچا۔ حالات بتائے مشورہ کیا تو لالہ بانکے دیال نے کہا۔ اب شہر میں مت جاؤ۔ فوراً لاہور سے باہر کسی مقام پر چلے جاؤ اور دیر مت کرو۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ گرفتاری ہو جائے۔" میں وہاں سے سیدھا دریائے راوی کی طرف پیدل چل دیا۔ کیونکہ مارشل لاء کے باعث تمام لوگوں کی آمد و رفت بغیر اجازت ممنوع قرار دی گئی تھی اور تانگے وغیرہ چلنے صبح سے ہی بند ہو چکے تھے۔ اس وقت میرے جیب میں صرف دو روپیہ تھے اور میرے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ کہ میں دوبارہ شہر میں جا کر کسی سے روپیہ کا انتظام کرتا۔

میں جب دریائے راوی کے پل پر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں مسلح پولیس کا پہرہ ہے اور کسی شخص کو لاہور سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ مجھے بھی پولیس نے روک دیا اور کہا۔ کہ واپس شہر کو جاؤ۔ پل پر سے گزرنے کی ممانعت ہے۔ پولیس کے یہ سپاہی مسلمان تھے میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ضروری کام کے لیے صرف شاہدرہ تک جا رہا ہوں۔ وہاں میرے عزیزوں میں ایک صاحب بیمار ہیں دوائی کا انتظام کرنا ہے آپ مہربانی کر کے مجھے جانے دیجئے۔ میں دوائی کا انتظام کر کے ابھی واپس آ جاؤں گا۔ دوسرے سپاہیوں نے تو میری اس درخواست کی پرواہ نہ کی مگر ایک شخص بہت نیک تھا اس نے اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا "یار کیا اندھیر آ جائے گا۔ جانے دو۔ بیمار کے لیے دوائی لے جانا چاہتا ہے۔ یہ کونسا کوئی لیڈر ہے کہ بھاگ رہا ہے۔" اس شخص کی سفارش پر اس کے ہمراہیوں نے مجھے کہا۔ کہ "اچھا سردار جی! جلدی چلے جاؤ۔ کوئی افسر دیکھ نہ لے ورنہ ہماری بے عزتی کریگا۔" میں جلدی جلدی چلا گیا۔ پل پار کرنے کے بعد گوجرانوالہ کو روانہ ہوا۔ سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ پہلے اتنا زیادہ چلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ بہت مشکل کے ساتھ

Marfat.com

چلا جاتا۔ صبح نو بجے کے قریب لاہور سے چلا تھا۔ رات کو دس بجے کے قریب تیس میل کا فاصلہ طے کر کے کامونکے پہنچا۔ راستہ میں کچھ نہ کھایا۔ دو ایک جگہ پانی پی لیا۔ پاؤں میں کثرت کے ساتھ آبلے پڑ گئے تھے چلا نہ جاتا تھا۔ جب کامونکے پہنچا تو خیال آیا۔ کہ ایک صاحب میرے معترف ہیں۔ لاہور میں کئی بار مل چکے ہیں۔ ان کے ہاں چلنا چاہیئے۔ ان کا نام یاد نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کا یہ معمول رہا۔ کہ اگر کوئی شخص ملنے کے لیے بھی آئے تو کبھی نام نہیں پوچھتا۔ اور کوشش ہوتی ہے کہ یہ صاحب پھر دوبارہ ملنے کے لیے تشریف نہ لائیں کیونکہ میں نے ہمیشہ یہ چاہا۔ کہ دوستوں کا حلقہ بہت ہی محدود رہے اور جو ہوں وہ بہت مخلص اور گہرے دوست ہوں۔ رام رام جپے رام کرنے والے دوست نہ ہی ہوں تو اچھا ہے۔ مجھے اتنا یاد تھا۔ کہ ان کے والد انجینئر تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا تو اس شخص نے بتایا کہ دوسری طرف تھانہ کے قریب ان کا مکان ہے۔ میں وہاں پہنچا تو گھر کے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مالک مکان اوپر کی منزل سے نیچے اترے (میرا خیال ہے کہ ان کا نام غالباً گھبیر سنگھ تھا) انہوں نے دروازہ کھولا ان کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ روشنی سامنے کر کے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کہ میں ہوں۔ مجھے اوپر لے گئے۔ پنجاب کے لوگ بہت متواضع ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے کھانے کے لیے پوچھا۔ میں دن بھر کی تھکاوٹ اور بھوک کے باعث بے حال ہو رہا تھا۔ جب دیکھا کہ یہ لوگ سو رہے ہیں غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہ کھانے کی ان کو تکلیف دوں۔ میں نے اپنے دل میں جبر کرتے ہوئے لاپروائی کے ساتھ کہا۔ کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ کوئی خیال نہ کیجیئے۔ میرا یہ جواب سن کر یہ مطمئن ہو گئے۔ باتیں شروع ہوئیں انہوں نے پوچھا۔ کہ اس وقت کہاں سے آئے۔ میں نے تمام حالات بتائے تو انہوں نے کہا۔ کہ یہاں کامونکے کے قریب ہی ریلوے ٹیلی گراف کے تار کٹ گئے ہیں اور پولیس تحقیقات کر رہی ہے اور ان سے بھی کئی بار پوچھا گیا۔ اب رات کا وقت ہے۔ ابھی آئے ہو۔ اس وقت یہ کہنا مناسب نہیں کہ ابھی چلے جاؤ۔ رات تو آرام کر لو مگر کل صبح ہی روشنی ہونے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ مگر مجھے پانچ سات روپے قرض دے دیجئے۔ میرے پاس صرف دو روپے ہیں تاکہ اپنے وطن حافظ آباد پہنچ جاؤں۔ جہاں جانا ہو گا حافظ آباد مشورہ کر کے وہاں جاؤں گا۔ انہوں نے سات روپے مجھے اسی وقت دے دیئے میں سو گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ گہری نیند آئی۔ سردار صاحب نے چار بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ چار بجے ان کے ٹائم پیس نے گھنٹی بجائی تو آپ جاگے۔ آپ نے مجھے جگایا اور فرمایا۔ کہ تشریف لے جائیے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا۔ کہ میں گوجرانوالہ کے راستہ حافظ آباد نہ جاؤں کیونکہ گوجرانوالہ میں کثرت کے ساتھ گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ ریلوے سٹیشن وغیرہ جلا دیا گیا ہے۔ میں کامونکے سے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ جاؤں اور وہاں سے حافظ آباد۔ رات کے چار بجے تھے۔ تاریکی اور راستہ سے ناواقف تھا۔ یہ حضرت دو فرلانگ کے قریب گاؤں سے باہر میرے ساتھ آئے اور ایک راستہ دکھا کر کہا کہ اس راستہ سے چلے جائیے تھکاوٹ اور آبلوں کے باعث میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ چلا نہ جاتا تھا۔ نیند کا غلبہ تھا۔ تھوڑی دور گیا تو ایک چھوٹی نہر کا پل تھا۔ نہر ٹوٹی ہوئی تھی اور راستہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ

Marfat.com

چاہے گرفتاری ہو یا نہ ہو۔ میں اس وقت آگے نہ جاؤں گا — نہر کے پل پر جو چھوٹی سی پختہ دیوار تھی میں اس پر سو گیا اور اس وقت آنکھ کھلی جب آفتاب کی کرنیں کھیتوں کو منور کر رہی تھیں۔ میں اٹھا۔ نہر کے کنارہ ضروری حاجت سے فارغ ہُوا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانچ دس منٹ کھیتوں کا منظر دیکھا۔ اتنے میں ایک شخص آتا ہُوا نظر پڑا۔ تو اس سے پوچھا کہ قلعہ دیدار سنگھ کو راستہ کونسا جاتا ہے۔ اس نے راستہ بتایا۔ وہاں سے چل پڑا۔ قلعہ دیدار سنگھ اور کاموکے کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اس گاؤں میں گیا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ اور فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ تمام لوگ کھیتوں میں تھے۔ اس گاؤں کے ایک گھر میں ایک بوڑھی مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا کیا پینے کے لیے پانی مل سکے گا۔ اس خاتون نے نہایت اخلاص اور محبت کے ساتھ جواب دیا۔ کہ یہاں تمام کے تمام گھر مسلمانوں کے ہیں کوئی گھر ہندو کا نہیں۔ میں نے کہا کہ میں مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لوں گا۔ اس خاتون نے مجھے اندر سے چارپائی نکال دی۔ میں بیٹھ گیا۔ یہ اندر سے مٹکے کا ٹھنڈا پانی پینے کے لیے لائی تو اس کو خیال آیا۔ کہ اگر یہ سکھ مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لیتا ہے تو شاید چھاچھ بھی پی لے۔ اس نے پوچھا۔ کہ بیٹا اگر تم پانی پی سکتے ہو تو کیا لسی (چھاچھ) نہیں پی سکتے۔ میں نے کہا کہ پی لوں گا۔ پنجاب میں چھاچھ کا بہت رواج ہے اور شاید ہی کوئی شخص ایسا موجود ہو جو دن میں کئی بار دہی کی لسی (چھاچھ) نہ پیتا ہو۔ یہ بیچاری میرے لیے مکھن ڈال کر چھاچھ لے آئی۔ میں نے چھاچھ پی لی تو یہ میرے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور اس نے باتیں شروع کیں۔ مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہا۔ لاہور سے آ رہا ہوں اور حافظ آباد جاؤں گا۔ سواری نہ ملی تھی۔ اس لیے کاموکی سے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ کے راستہ جاؤں گا۔ اس نے پوچھا۔ کہ سنا ہے مہاتما گاندھی پکڑ لیے گئے اور ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں۔ اس نے پھر پوچھا۔ کہ کیا میں اس لیے ہی مسلمانوں کے ہاں سے پانی پی لیتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں میں تو کئی برس سے مسلمانوں کے ہاں سے پی لیتا ہوں۔ اس کے بعد یہ خاتون تھوڑی دیر خاموش ہو گئی اور کچھ سوچتی رہی۔ پھر مجھ سے سوال کیا۔ جب ہندو مسلمان ایک ہو گئے ہیں تو کیا اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ بھی ہُوا کرے گا۔ یہ سوال سن کر میں مسکرا دیا۔ کیا جواب دیتا۔ میں نے ٹال دیا۔ اور کہا کہ ابھی ہندو مسلمان اس حد تک ایک نہیں ہوئے۔ آئندہ جا کر ایسا کریں گے۔ میرا جی نہ چاہتا تھا۔ کہ میں اور سفر کروں مگر مجبور تھا۔ روانہ ہونے لگا تو اس ضعیف خاتون نے کہا کہ بیٹا تھوڑی دیر آرام کر لو۔ کھانا کھا کے چلے جانا۔ میری خواہش تھی۔ کہ یہ مجھے ایسا کہتی۔ میں نے نیم دلی کے ساتھ انکار کرتے ہوئے اس کے دوبارہ کہنے پر ہاں کر لی۔ اس چارپائی پر ہی سو گیا۔ اتنے میں اس خاتون نے کھانا تیار کیا۔ بینگن کی سبزی۔ گھر کے گھی کے پراٹھے۔ دہی۔ مکھن اور لسی۔ چالیس گھنٹہ سے کچھ کھایا نہ تھا اس خاتون کی اخلاص و محبت کی دعوت میں وہ لطف آیا جو اس کے بعد مہاراجوں اور نوابوں کے دسترخوان پر بھی کبھی نصیب نہیں ہُوا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک گھنٹہ کے قریب پھر سو گیا۔ جاگنے کے بعد وہاں سے چلنے لگا تو میں نے چاہا کہ اس خاتون کے پوتے کو جو وہاں کھیل رہا تھا دو روپیہ دوں۔ مگر اس خاتون نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا: "بیٹا! گو ہم غریب آدمی ہیں مگر روٹیاں فروخت نہیں کرتے۔ ہماری

Marfat.com

خوش نصیبی ہے کہ تم جیسا مہمان ہمارے گھر میں آیا۔ اگر اس طرف آنے کا پھر کبھی اتفاق ہو تو ہمارے گھر ضرور آنا۔ اس خاتون کے اخلاص و محبت کے یہ الفاظ سن کر میری آنکھوں میں احسان شناسی کے آنسو بھر آئے پنجاب میں تو شہروں کے اندر بھی لوگ مہمانوں کو کھانا کھلانا اور خاطر تواضع کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں گاؤں کی یہ خاتون کیونکر دو روپیہ لے سکتی تھی۔ اس نے بچہ سے روپیہ لے کر مجھے واپس دیے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس نے پھر انکار کر دیا۔ میں نے بھی محسوس کیا۔ کہ کھانے کا معاوضہ لینا یہ اپنی توہین سمجھے گی۔ اس گاؤں سے چل کر میں ایک دوسرے گاؤں میں پہنچا۔ اس وقت شام کے پانچ چھ بج چکے تھے۔ مجھے اس گاؤں کا نام ٹھیک یاد نہیں رہا۔ غالباً قلعہ صوبھا سنگھ ہے۔ اس گاؤں میں چند پختہ و منزل عمارتیں بھی ہیں جو وہاں کے درزیوں کی ہیں۔ یہ درزی کسی بڑے شہر میں فوجی ٹھیکیدار ہیں اور لاکھوں روپیہ کے مالک اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس گاؤں میں پہنچا اور آرام کرنے کے لیے درخت کے نیچے بیٹھا تو ان درزیوں میں سے ایک صاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرے پاس آئے اور پوچھا کہ کہاں سے آئے اور کہاں جاؤ گے۔ میں نے کہا لاہور سے آ رہا ہوں اور حافظ آباد جاؤں گا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ چائے تیار کی۔ گھر کے دوسرے لوگوں سے تعارف کرایا۔ بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے جب چائے پی چکے تو ان لوگوں نے اپنا گھر کا ٹانگہ میری سواری کے لیے تیار کرایا۔ تاکہ یہ ٹانگہ مجھے قلعہ دیدار سنگھ چھوڑ آئے۔ یہ ٹانگہ مجھے قلعہ دیدار سنگھ چھوڑ گیا۔ وہاں کرائے کے ٹانگے حافظ آباد جا رہے تھے۔ ایک ٹانگہ میں بیٹھ کر میں حافظ آباد کے لیے روانہ ہوا اور وہاں رات کو گیارہ بجے پہنچا۔

حافظ آباد پہنچ کر میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ کہ کیوں آیا اور کیا ہوا۔ خاموشی کے ساتھ چند روز گزار دیے اتنے میں سر مائیکل اوڈوائر بھی گورنری کا چارج دے کر چلے گئے۔ سر ایڈورڈ میکلیگن گورنر مقرر ہو چکے تھے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہو گئی تھیں اور اوڈوائر نے جو کچھ کیا۔ حکومت اس پر نادم تھی۔ میں لاہور واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ گرفتار کیے گئے۔ جو گرفتار ہو سکے اور جو لوگ ادھر ادھر ہو گئے پولیس نے ان کا پیچھا نہ کیا تھا۔ وہ گرفتار نہ ہوئے۔

پولیس کے نہلے پر پبلک کا دہلہ

مارشل لاء کے اعلان سے پہلے پنجاب کے ہر شہر اور قصبہ میں سیاسی ہیجان و جوش پیدا ہو رہا تھا کہیں ریلوے کے تار کاٹے جا رہے ہیں کہیں سرکاری عمارتیں جل رہی ہیں۔ کہیں بنک لوٹے جا رہے ہیں اور کہیں انگریزوں اور سرکاری ملازموں پر حملے ہو رہے ہیں۔ ان دنوں فوج کے ایک انگریز لیفٹیننٹ ٹامنسن (غالباً یہی نام تھا یا ٹامسن) لائلپور سے وزیر آباد کو جا رہے تھے۔ راستہ میں جب گاڑی حافظ آباد کے سٹیشن پر پہنچی تو لوگوں نے دیکھا۔ کہ اس گاڑی میں ایک انگریز بیٹھا ہے۔ انگریز کا دیکھنا ہی ان دنوں میں پبلک کے جوش اور مستقبل سے لاپرواہ ہونے کا کافی باعث ہو سکتا تھا۔ لوگ اس انگریز کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے

Marfat.com

اور ہجوم نے اس پر حملہ کر دیا۔ کوئی باقاعدہ آرگنائز کی ہوئی تحریک تو تھی نہیں۔ ایک قسم کا سیاسی اُبال سا تھا۔ لوگوں نے اس انگریز کو جوتوں۔ تھپڑوں۔ چھڑیوں اور مکّوں وغیرہ سے پیٹا۔ ریلوے ڈرائیور اور گارڈ نے جب یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے ریلوے ٹرین کو قبل از وقت چلا دیا۔ تاکہ یہ انگریز بچ جائے۔ چنانچہ گاڑی کے جلدی چلے جانے کے باعث اس انگریز کی جان بچ گئی ورنہ یہ غیر ممکن نہ تھا کہ اس کو حافظ آباد کے سٹیشن پر ہلاک کر دیا جاتا۔

اس واقعہ کے بعد پنجاب میں مارشل لا جاری ہوا۔ گرفتاریاں۔ مقدمات اور سزائیں۔ پولیس نے لیفٹیننٹ ٹاٹنہم کو پیٹنے کے جرم میں حافظ آباد میں گرفتاریاں شروع کیں۔ ملزموں کی شناخت کرنے کے لیے ٹاٹنہم صاحب حافظ آباد تشریف لائے۔ پولیس نے منادی کے ذریعے حکم دیا کہ شہر کا ہر فرد لڑکا ہو جوان یا بوڑھا۔ جو بھی ہے تحصیل کے سامنے حاضر ہو جائے۔ جو حاضر نہ ہو گا وہ گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ تھرو دریش یہ جان ور دریش۔ ہر شخص تحصیل کے سامنے پہنچ گیا۔ تمام لوگوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ اور لیفٹیننٹ ٹاٹنہم نے ملزمان کو پہچاننا شروع کیا۔ ان کے ساتھ پولیس تھی اور پولیس اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے بہت مستعد تھی۔ جن لوگوں پر پولیس نے لیفٹیننٹ ٹاٹنہم نے یا سرکاری گواہوں نے جو اس بات کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ کہ وہ موقعۂ واردات یعنی ریلوے سٹیشن پر اس وقت موجود تھے جب کہ لیفٹیننٹ ٹاٹنہم کو پیٹا گیا، ہاتھ رکھا۔ وہ لوگ چاہے بے گناہ تھے یا گنہ گار۔ ملک معظم جارج پنجم کے خلاف اعلانِ جنگ اور علمِ بغاوت بلند کرنے کے جرم میں گرفتار کیے گئے۔ ان گرفتار ہونے والوں میں میرے ایک چچا زاد بھائی ہوشیار سنگھ (یہ آجکل امرت سر میں ہوشیار سنگھ اینڈ کمپنی اور جنرل انکٹس وغیرہ کے نام پر کاروبار کرتے ہیں اور کافی کامیاب ہیں) بھی تھے۔ جن کو پولیس نے اس جرم میں گرفتار کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا۔ کہ یہ لڑکا خالصہ کالج امرت سر کی بی ایس سی کلاس میں پڑھتا تھا۔ جب سیاسی بے چینی شروع ہوئی اور امرت سر میں بنک اور سرکاری عمارتیں پبلک نے جلائیں تو میرے چچا سردار میوا سنگھ (ہوشیار سنگھ کے والد) نے ہوشیار سنگھ کو احتیاطاً حافظ آباد بلا لیا۔ اس کا لیفٹیننٹ ٹاٹنہم کو پیٹنے سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس روز یہ حافظ آباد میں ضرور موجود تھا اور واردات کے وقت اپنے گھر پر تھا یعنی اس واقعہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

ہوشیار سنگھ نوجوان اور ہونہار لڑکا تھا۔ گورا رنگ۔ بہت خوبصورت۔ کالج کا ہر طالب علم اور کالج کے پروفیسر اس کو بہت عزیز سمجھتے۔ گھر میں بھی اس کے لیے ہر شخص کے دل میں محبت تھی۔ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اس کو ملک معظم جارج پنجم کے خلاف جنگ میں حصہ لینے یا بغاوت کرنے کے جرم میں جس کی سزا پھانسی یا عمر قید سے کم کوئی دوسری سزا نہ تھی گرفتار کیا گیا۔ حوالات میں بند کیا گیا۔ اس سے گھر کا کوئی شخص نہ مل سکتا تھا اور نہ بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کے والدین اور گھر کے لوگوں کی کیا حالت ہو گی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ قانون اور انصاف صرف مجرموں اور گنہ گاروں کو سزا دینے کے لیے ہی نہیں تھا۔ ہندوستان میں اس کے ذریعہ ہر روز درجنوں، سینکڑوں اور ہزارہا بے گناہ لوگ پھانسیوں پر چڑھائے اور جیلوں میں جا رہے تھے

Marfat.com

ہوشیار سنگھ چند روز تو حافظ آباد کے تھانہ کی حوالات میں رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرے دیگر ملزموں کے ساتھ لاہور بورسٹل جیل میں بھیجا گیا۔ ادھر اس کے بھائی۔ اس کے والد اور گھر کے دوسرے لوگ بھی مقدمہ کی پیروی کے لیے لاہور پہنچے۔ اس زمانہ میں رائے بہادر لالہ بدری داس لاہور کے بہترین کلاء میں شمار ہوتے تھے۔ چونکہ آپ "رائے بہادر" بھی تھے۔ اہل مقدمات کو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ شاید ان کی رائے بہادری کا عدالت پر بھی کچھ رعب یا اثر پڑے۔ چنانچہ رائے بہادر صاحب کو بہت کافی فیس دے کر وکیل مقرر کیا گیا۔ اور مقدمہ ایک ٹریبیونل کے سپرد ہوا جس کا انگریز جج پریذیڈنٹ اور دو ہندوستانی ممبر تھے اور یہ ٹریبیونل اس لیے مقرر کیا گیا تھا۔ کہ اس ٹریبیونل کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کے فیصلہ کے بعد ہائی کورٹ وغیرہ میں کوئی اپیل نہ کی جا سکے گی۔

مقدمہ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ میرے چچا۔ ان کے صاحب زادے اور میں نے وکیل صاحب کے ہاں چکر کاٹنے شروع کیے۔ ایک روز ہم لوگ رائے بہادر بدری داس کے پاس بیٹھے ان کو مقدمہ کے واقعات سمجھا رہے تھے تو میرے چچا نے کہا:

"رائے بہادر صاحب۔ ہم لوگ بہت مصیبت زدہ ہیں۔ میرا لڑکا واقعہ کے وقت سٹیشن پر موجود نہ تھا پولیس نے بڑے بڑے لوگوں کے لڑکوں کو صرف رشوت لینے کی غرض سے گرفتار کیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں بہت سے لوگ بے گناہ ہیں۔ الزام بہت سخت لگایا گیا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ کوشش کیجئے۔ اگر لڑکے کو سزا ہوگئی تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

رائے بہادر بدری داس نے میرے چچا کے یہ درد ناک الفاظ سننے کے بعد جواب دیا۔

"سردار صاحب! لڑکا گنہ گار ہے یا بے گناہ۔ یہ کوئی سوال نہیں۔ یہ عدالتیں ہیں اور عدالتیں بھی نہیں بلکہ مارشل لاء کی عدالتیں۔ یہاں جھوٹ اور بے ایمانی کی دوڑ ہے۔ اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ بنا سکتے ہیں تو لڑکا چھوٹ جائے گا۔ اور اگر آپ پولیس سے زیادہ جھوٹ نہیں بنا سکتے جو پولیس کے جھوٹ کو کاٹ سکے تو یقیناً لڑکے کو سزا ہو گی۔ اور شاید لڑکے کو پھانسی مل جائے۔ یہاں انصاف اور قانون کا کوئی سوال نہیں۔ جھوٹ کی دوڑ کا سوال ہے جو زیادہ جھوٹ بنا سکے گا کامیاب ہوگا آپ یا پولیس"۔

رائے بہادر کے یہ الفاظ سن کر یہ سوال پیدا ہوا۔ کہ مقدمہ کا ڈیفنس کیا ہو۔ فوجداری مقدمہ میں یہ ڈیفنس قطعی لچر اور بے معنی ہوتا ہے کہ ملزم شریف ہے۔ خاندانی ہے یا بڑے لوگوں کا رشتہ دار ہے فوجداری مقدمہ میں تو صرف وہی ڈیفنس کارآمد ہو سکتا ہے کہ جو جرم کی ڈائریکٹ تردید کرے۔ چنانچہ مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ ڈیفنس صرف یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ملزم واقعہ کے روز حافظ آباد میں نہ تھا۔ بلکہ یہاں سے سینکڑوں میل دور تھا۔ جہاں سے اس کا اس روز حافظ آباد پہنچ کر جرم کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

اب سوال پیدا ہوا۔ کہ حافظ آباد میں ملزم کی عدم موجودگی کیوں کر ثابت کی جائے۔ اس مسئلہ پر غور ہوا۔ کہ کہاں کہاں گھر سے تعلقات ہیں۔ جہاں سے کہ ڈاک خانہ کی مہر پوسٹ کارڈ پر لگوائی جا سکتی ہے یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم لوگوں نے ایک مضمون تیار کیا جو ہوشیار سنگھ کی طرف سے پوسٹ کارڈ پر لکھا

Marfat.com

جاتے۔ ہم نے بورسٹل جیل کے ایک وارڈر کی معرفت ہوشیار سنگھ کو وہ مضمون اور ایک سادہ پوسٹ کارڈ لکھنے کے لیے جیل کے اندر بھیجا۔ اس پوسٹ کارڈ پر ہوشیار سنگھ نے لکھا۔ کہ وہ کارڈ لکھنے کے روز (یعنی ٹاٹنہم کے واقعہ کے دن) لدھیانہ میں ہے۔ ابھی لدھیانہ دو تین روز اور رہے گا۔ اس کے بعد سانگلہ دھہاں کہ ایک دوست کے نام خط لکھا گیا تھا آئے گا اور پھر حافظ آباد آئے گا۔ ہوشیار سنگھ نے یہ کارڈ لکھ کر ہمیں جیل سے باہر جیل کے وارڈر کے ذریعہ بھیج دیا۔ ہم میں سے ایک شخص اس خط کو لے کر پہلے لدھیانہ گیا۔ وہاں کے ڈاک خانہ کے مہر لگانے والے کو پانچ روپیہ دے کر اس روز کی ڈیسپیچ کی تاریخ کی مہر لگوائی۔ جس روز ٹاٹنہم کے ساتھ واقعہ ہوا تھا۔ پھر یہ خط سانگلہ لایا گیا۔ اسی طرح ہی وہاں کے ڈاک خانہ کے مہر لگانے والے کو پانچ روپے دے کر واقعہ سے دوسرے روز کی تاریخ کی مہر لگوائی۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ہوشیار سنگھ نے واقعہ کے روز یہ پوسٹ کارڈ لدھیانہ سے لکھا اور واقعہ کے اگلے روز یہ کارڈ سانگلہ ضلع گوجرانوالہ پہنچا۔

مقدمہ شروع ہوا۔ پولیس کے سرکاری گواہوں کی شہادتیں ہوئیں کہ واقعہ کے روز انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوشیار سنگھ لیفٹیننٹ ٹاٹنہم کو مار رہا تھا۔ پولیس کا مقدمہ بہت مضبوط رہا۔ اور فرد جرم بھی لگ گئی۔ مگر جب ڈیفنس شروع ہوا تو لدھیانہ کے ہمارے گواہ پیش ہوئے جنہوں نے کہا کہ واقعہ کے روز ہوشیار سنگھ لدھیانہ میں تھا۔ سانگلہ کے گواہ پیش ہوئے کہ واقعہ سے اگلے روز یہ پوسٹ کارڈ بذریعہ ڈاک ملا تھا جو ایک روز پہلے ہوشیار سنگھ نے لدھیانہ سے پوسٹ کیا۔ ہوشیار سنگھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ اور اس کی مہروں کو دیکھ کر ٹریبونل اور اس کے یورپین جج کو یقین ہو گیا کہ ہوشیار سنگھ واقعہ کے روز حافظ آباد میں نہ تھا۔ لدھیانہ میں تھا۔ چنانچہ ہوشیار سنگھ باعزت بری کر دیا گیا کیونکہ ہندوستانی میجسٹریٹ تو اپنے ڈپٹی کمشنر کے اشارہ پر اپنے حقیقی بھائی کے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اس کو تیار کر سکتے تھے تاکہ صاحب بہادر ناراض نہ ہو جائیں مگر یورپین ججوں کے اندر پھر بھی ضمیر تھا۔ اور وہ اپنے ضمیر کے مقابلے پر کسی بے گناہ کو سزا دیتے ہوئے کئی بار اپنے دماغ اور دل سے مشورہ کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس طرح کوئی دوسرے صاحب مقدمہ میں عدم موجودگی ثابت کرتے ہوئے ایسے کارڈ بنانے کی اب حماقت نہ کریں۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد کئی ہائیکورٹوں کے فیصلے ایسے خطوط کے متعلق صادر ہو چکے ہیں۔ جن میں ایسے خطوط یا پوسٹ کارڈوں کو قابل یقین قرار نہیں دیا جاتا۔

ہوشیار سنگھ کے مقدمہ کے واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پولیس کیونکہ جھوٹے مقدمے بنایا کرتی ہے اور اس جھوٹ کو کاٹنے کے لیے کیوں کہ پبلک کو مجبوراً پولیس سے زیادہ جھوٹ بنانا پڑتا ہے کیونکہ قانون چاہیے کتنا بھی اچھا ہو۔ قانون کو استعمال کرنے کا طریقہ اس قدر پیچیدہ اور قابل اعتراض ہے کہ مقدمہ میں قدم قدم پر جھوٹ بولنے۔ جھوٹ بنانے۔ جھوٹ تصنیف کرنے اور جھوٹے حلفیہ

Marfat.com

بیان سننے کی ضرورت ہے اور عدالتیں جھوٹ، بے ایمانی اور ظلم کا سب سے بڑا مرکز ہیں۔

والیان ریاست کا "پرسٹیج"

مرحوم رائے بہادر سردار نرائن سنگھ ٹھیکہ دار دہلی سیلف میڈ بزرگ تھے۔ آپ کی زندگی چھ روپیہ ماہوار کے ایک فوجی سپاہی سے شروع ہوئی اور جب آپ نے انتقال کیا تو آپ کی جائیداد کے کرایہ وغیرہ کی آمدنی آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ ان رائے بہادر کے صاحبزادہ سردار بہادر رنجیت سنگھ نے چند سال ہوئے گورنمنٹ کو بائیس لاکھ روپیہ انکم ٹیکس ادا کیا ہے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ چونکہ "ریاست" میں مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے مظالم کو بے نقاب کیا جاتا تھا اور رائے بہادر نرائن سنگھ ان تمام حالات سے واقف تھے۔ آپ "ریاست" کو بیحد پسند کرتے اور ایڈیٹر "ریاست" کے بہت بڑے مداحوں میں سے تھے۔ میں ایک روز منصوری جا رہا تھا۔ ڈیرہ دون جانے والی گاڑی میں سامان رکھا تو رائے بہادر بھی اسی خانہ میں آ گئے۔ کیونکہ دونوں کے لیے اسی کمرہ میں جگہ ریزرو تھی۔ گاڑی میں بستر بچھا کر ہم بیٹھ گئے۔ تو رائے بہادر نے اخبار "ریاست" کی تعریف شروع کی۔ اور پچھلے متعدد مضامین کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد آپ نے بتایا۔ کہ پٹیالہ کے سردار بہادر جنرل بخشیش سنگھ وہاں کی فوج میں جنرل تھے۔ انگریزی گورنمنٹ کے متعدد خطابات اور بہادری کے تمغے حاصل کر چکے تھے۔ اور آپ کو پٹیالہ میں بہت بڑا عروج حاصل تھا۔ مگر چونکہ مہاراجہ ذاتی طور پر آپ سے ناراض ہو گئے اس لیے ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر جیل میں ڈال دیے گئے۔ اور یہ فوجی جرنیل جیل کے قیدیوں کی وردی پہنے جیل کی کوٹھڑی میں جیل کی روٹی کھا رہا ہے اور قید ہے۔ رائے بہادر یہ تمام حالات سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔ صبح جب جاگے۔ تو ہردوار کا اسٹیشن تھا۔ ہردوار اور ڈیرہ دون کے درمیان ہم لوگوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے بدلے۔ ڈیرہ دون پہنچنے پر رائے بہادر اپنی کوٹھی چلے گئے اور میں موٹر میں بیٹھ کر منصوری روانہ ہو گیا۔

میں منصوری سے جب واپس آیا تو جنرل بخشیش سنگھ کا مسئلہ میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا دہلی پہنچنے پر میں نے "ریاست" میں ایک بہت سخت لیڈر لکھا۔ جس میں جنرل بخشیش سنگھ کے واقعات درج تھے اور کمانڈر انچیف ہند کی توجہ دلاتے ہوئے گورنمنٹ ہند سے کہا گیا تھا۔ کہ سردار بہادری کا خطاب اور فوجی شجاعت کے تمغوں کی موجودگی میں جنرل بخشیش سنگھ کا پٹیالہ جیل میں رہنا اس خطاب اور تمغوں کی سخت توہین ہے اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ جنرل بخشیش سنگھ کے جرائم کی تحقیقات کرے اگر بخشیش سنگھ مجرم ہیں تو ان کا خطاب اور تمغے ضبط کر لیے جائیں اور اگر بے گناہ ہیں تو ان کو پٹیالہ جیل سے نکالا جائے کیونکہ ایک بے گناہ جنرل کا بلاوجہ قید کیا جانا برٹش گورنمنٹ کے لیے رسوائی و ذلت کا موجب اور فوجیوں میں بددلی پیدا کرنے کا باعث ہے۔

Marfat.com

اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد دہلی کی مقامی گورنمنٹ کی سرکاری پریس برانچ نے اس مضمون کا ترجمہ ملٹری سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو بھیجا (مرزا عبدالرحمٰن سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ دہلی نے ایک بار ایڈیٹر "ریاست" کو بتایا تھا۔ کہ جس روز "ریاست" شائع ہو ان کے دفتر کے لیے مصیبت ہوتی ہے کیونکہ ان کے لیے حکم ہے کہ ریاستوں کے متعلق تمام مضامین کا ترجمہ کر کے متعلقہ افسروں اور پولیٹیکل ایجنٹوں کو بھیجا جائے)۔

رائے بہادر نرائن سنگھ انگریزی بالکل نہ جانتے تھے اور اردو بھی معمولی طور پر۔ مگر آپ وائسرائے اور بڑے سے بڑے انگریز سے ملتے اور بہت بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرتے۔ یہ مضمون جب آپ نے دیکھا تو آپ اس مضمون والے پرچہ کو ساتھ لے کر شملہ گئے۔ وہاں ہندوستان کے کمانڈر انچیف سر ولیم برڈووڈ سے ملے۔ اور سر ولیم برڈووڈ کو "ریاست" کا پرچہ دیتے ہوئے کہا۔ کہ اس مضمون کو پڑھیے آپ کے خطابوں اور تمغوں کی کس قدر مٹی پلید ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ یا تو یہ خطاب اور تمغے بخشیش سنگھ سے واپس لے اور یا بخشیش سنگھ کو جیل سے نکالا جائے ورنہ گورنمنٹ کی بہت سخت بدنامی ہے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ جب انگریزوں سے بات چیت کرتے تو بالکل اس طرح بے تکلفی کے ساتھ ان کو دوست سمجھتے ہوئے، جیسے ایک جاٹ دوسرے جاٹ سے بات کرتا ہے اور انگریز اس بے تکلفی میں اخلاص محسوس کرتے ہوئے رائے بہادر کی بہت عزت کرتے۔ سر ولیم برڈووڈ بھی ہندوستانیوں کے بہت دوست اور وضعدار افسر تھے۔ ان کی تمام زندگی ہندوستان میں گزری۔ اور ان کلرکوں اور ملازموں کے بیمار ہونے پر ان کے گھروں میں چلے جاتے جو بیس بیس برس پہلے ان کے ماتحت تھے۔ سر ولیم نے رائے بہادر سے کہا۔ کہ اس مضمون کو وہ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ملٹری سیکرٹری نے ان کو اس کا ترجمہ بھیجا تھا اور وہ اس معاملہ پر وائسرائے کی توجہ دلائیں گے۔

اس مضمون کو شائع ہوئے ایک ماہ ہوا تھا۔ کہ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ ایک روز جیل میں گئے۔ جیل کا معائنہ کیا۔ تمام قیدیوں کی پریڈ دیکھی۔ پریڈ دیکھنے کے بعد آپ نے ساٹھ قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔ ان ساٹھ قیدیوں میں سردار بہادر جنرل بخشیش سنگھ بھی تھے۔

رائے بہادر نرائن سنگھ جب ڈیرہ دون سے واپس دہلی آئے تو آپ نے فرمایا۔ کہ آپ سر ولیم برڈووڈ سے ملے تھے۔ سر ولیم نے وائسرائے کو تمام حالات لکھے۔ وائسرائے نے پولیٹیکل سیکرٹری کو کہا۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ کو بخشیش سنگھ کی رہائی کے لیے لکھا جائے۔ چنانچہ پولیٹیکل سیکرٹری کا حکم جب مہاراجہ پٹیالہ کے پاس پہنچا تو مہاراجہ پٹیالہ جنرل بخشیش سنگھ کو رہا کرنے کے لیے مجبور تھے اس مجبوری کے باعث ہی مہاراجہ پٹیالہ جیل دیکھنے گئے۔ اور سردار بخشیش سنگھ کے ساتھ ساٹھ دوسرے عام قیدیوں کو رہا کرنے کا باعث یہ تھا۔ کہ مہاراجہ کا پرسٹیج قائم رہے اور ان کی رعایا یہ سمجھے کہ مہاراجہ نے اپنی دریادلی کے باعث ساٹھ قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا ہے اور اتفاق سے ان ساٹھ میں جنرل بخشیش سنگھ بھی رہا ہو گئے۔

Marfat.com

عادت کا قوّتِ ارادی پر اثر

میں لاہور کے ایک روزانہ اخبار میں سب ایڈیٹر تھا۔ اس زمانہ میرے پاس ایک دوسرے سکھ جرنلسٹ آیا کرتے۔ ان کی تعلیم بی اے تک تھی۔ اچھے خاندان سے تھے مگر کثرت سے شراب پینے کے باعث ان کا ضمیر اور ان کی قوتِ ارادی بالکل مردہ ہو چکی تھی۔ اور شراب حاصل کرنے کے لیے کوئی جرم ایسا نہ تھا جس پر یہ آمادہ نہ ہو سکتے ہوں۔ چنانچہ شراب کی کثرت کا ان کے اعصاب پر بھی اثر تھا اور یہ زیادہ محنت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔

میرے پاس کئی روز آتے رہے اور ملتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بیحد تکلیف میں ہیں۔ کوئی شخص ان کا اعتبار نہیں کرتا۔ دوستوں کی نظروں میں گر چکے ہیں۔ گھر والوں کے لیے بار ہیں اور معمولی اخراجات بھی پورے نہیں کر سکتے۔ ان کو کیا کرنا چاہیئے۔

ان کے حالات پر میں کئی روز ہمدردی کے ساتھ غور کرتا رہا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ادھر ان کی حالت یہ تھی۔ کہ کھانے کے لیے روٹی نہ ملے مگر شراب ضرور ہو۔ دوستوں سے ایک ایک دو دو روپیہ قرض لے کر شراب کی طلب کو پورا کرتے۔

میری عمر جب اٹھارہ انیس برس کی تھی اور میری فیروزپور کے سکھوں کے حلقہ میں آمدورفت تھی تو ایک حد تک میرے دماغ میں بھی مذہبی دیوانگی تھی۔ اور بغیر سکھوں کے دوسرے تمام مذاہب کو برا سمجھتا تھا۔ حالانکہ نہ سکھ ازم سے واقفیت تھی نہ اسلام سے اور نہ ہندو ازم سے۔ یہ اثر صرف صحبت کا تھا۔ جب ملنے والے سکھوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتے دیکھتا تو خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا۔ اور بحث میں حصہ لیتا۔ مگر اس کے بعد یہ مذہبی دیوانگی دن بدن کم ہوتی چلی گئی۔ جب یہ صاحب لاہور میں آیا کرتے تو اس وقت میں ذہنی اعتبار سے ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں میں کوئی فرق نہ سمجھتا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ گو آپ کی بیماری حد سے گزر چکی ہے اور جو شخص قوتِ ارادی سے اس قدر محروم ہو چکا ہو اس کی اصلاح قریب قریب ناممکن ہے مگر پھر بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ میرے خیال میں سکھوں میں کوئی ایسی سوسائٹی موجود نہیں جو آپ جیسے گئے گزرے شخص کی اصلاح کا بار لے سکے۔ میری تو رائے ہے کہ آپ عیسائی ہو جائیے۔ ممکن ہے کہ پادری لوگ آپ کی اصلاح کر سکیں اور آپ کی زندگی بدل جائے۔ میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر یہ صاحب حیران ہوئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو یقین دلایا۔ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ اپنی رائے دے رہا ہوں۔

میری رائے سن کر یہ چلے گئے اور تین چار روز کے بعد پھر واپس آئے تو پھر اسی مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ میں نے ان سے صاف کہا۔ کہ آپ کی بیماری غالباً لاعلاج حد تک پہنچ چکی ہے اور اب آپ کی شاید ہی اصلاح ہو سکے۔ اور اگر اصلاح ہوئی بھی تو آپ کو قوتِ ارادی پیدا کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ کے ساتھ

Marfat.com

بہت ہی کشمکش کرنی پڑے گی۔ آپ سوچ لیجیے۔ کہ کیا کرنا چاہیے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا اور چاہا۔ کہ یہ عیسائی ہو جائیں۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی۔ کہ میں ان کے عیسائی مذہب تبدیل کرنے کا انتظام کروں۔ مگر میں کسی کو جانتا نہ تھا۔ نہ عیسائیوں کے حلقہ سے واقفیت تھی۔ انہوں نے پھر زور دیا۔ کہ میں انتظام کروں کیونکہ یہ اس معاملہ میں کچھ شرم سی محسوس کرتے تھے۔

میں عیسائیوں کے حلقہ سے بالکل ناآشنا تھا مگر اخبارات میں ڈاکٹر دتہ (میرا خیال ہے یہی نام تھا اگر میں غلطی نہیں کرتا) پروفیسر فورمین کرسچین کالج کا نام کئی بار پڑھا تھا۔ میں نے اس جرنلسٹ کو اپنے ساتھ لیا اور ہم ڈاکٹر دتہ کے مکان کی تلاش میں نکلے۔ ایک دو جگہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ آپ اس سڑک پر رہتے ہیں۔ جو سڑک نیلا گنبد سے میو ہسپتال کو جاتی ہے یا اس کے قریب دوسری سڑک ہے۔ ہم لوگ تلاش کرتے کرتے ڈاکٹر دتہ کی کوٹھی پہنچے۔ مجھے اب تک اچھی طرح سے یاد ہے کہ یہ کوٹھی سطح سڑک سے کافی بلند تھی۔ اور اس کے صحن میں پھولوں کے گملے تھے۔ شام کا وقت تھا اور ڈاکٹر دتہ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کوٹھی کے باہر کے دروازہ کے پاس ان کا ملازم تھا۔ اس ملازم کو میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔ جس پر لکھا تھا: "دیوان سنگھ سب ایڈیٹر روزانہ اخبار فلاں"۔ میرا کارڈ جب ڈاکٹر دتہ کے پاس گیا تو انہوں نے بلا لیا۔ ہم برآمدہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب بہت تپاک سے ملے۔ جرنلسٹ ہونے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص ملنے سے انکار نہیں کرتا۔ اور ملتے ہوئے ہر شخص عزت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہم لوگ جب بیٹھے تو خیر خیریت دریافت کرنے کے تبادلہ کے بعد میں نے کہا۔ کہ ڈاکٹر صاحب میں ان صاحب کو لایا ہوں۔ آپ سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ یہ صاحب سکھ ہیں۔ بی اے ہیں۔ جرنلسٹ ہیں۔ بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر شراب پیتے ہیں۔ رنڈی بازی کرتے ہیں۔ سگریٹ کے کش لگاتے ہیں۔ قمار بازی بھی کبھی کبھی تفریحاً کر لیتے ہیں۔ فاقہ کش ہیں۔ ان کا ضمیر اور قوتِ ارادی بالکل مردہ ہو چکے ہیں۔ یہ عیسائی ہونا چاہتے ہیں۔ ان کو عیسائی کر لیجیے۔ شاید ان کی اصلاح ہو جائے۔ ڈاکٹر دتہ میرے یہ الفاظ سن کر حیران سے ہو گئے۔ کہ ایک سکھ دوسرے سکھ کو عیسائی کرنے کے لیے لایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دتہ نے سمجھا۔ کہ یہ یا تو مذاق کر رہا ہے یا کوئی دھوکا یا فریب ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ "آپ سکھ ہیں اور ایک سکھ کو عیسائی کرنے کے لیے لائے ہیں۔ یہ معاملہ کیا ہے"؟ میں نے پھر سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا۔ کہ ان کے جو عیوب میں نے بتائے ہیں فی الحقیقت وہ ان میں موجود ہیں اور میں نے آپ کو تاریکی میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاکہ بعد میں آپ کو علم ہو تو ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یہ صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہ ان کو موجودہ قابلِ نفرت زندگی کے بدلنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ان کو ایمان داری کے ساتھ رائے دی کہ عیسائی ہو جاؤ۔ شاید عیسائیوں کے پادریوں کی نیکی کا ان پر اثر ہو اور ان کی زندگی بدل سکے۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ ہم لوگ پھر کسی روز ان سے ملیں۔ یہ پادریوں سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا کام

Marfat.com

تو ختم ہو چکا۔ اب میں آپ کے ہاں آنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اب یہ سردار صاحب خود ہی آئیں گے۔

میں اس کے بعد ڈاکٹر دت سے کبھی نہیں ملا۔ کئی ماہ کے بعد یہ سکھ جرنلسٹ مجھ ملے تو انہوں نے بتایا۔ کہ یہ ڈاکٹر دت کے ہاں گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک پادری کے سپرد کیا اس پادری نے ان کو منٹگمری رکھا۔ وہاں چند روز ان کی نگرانی کے بعد ان کو دوسرے یورپین پادری کے پاس منصوری پہاڑ پر بھیجا۔ یہ منصوری میں پادری صاحب کے گھر پر غالباً دو ماہ رہے۔ پادری صاحب ان کے تمام اخراجات برداشت کرتے تھے۔ ایک روز پادری صاحب نے صبح دیکھا۔ کہ سردار صاحب کے کمرہ میں شراب کی خالی بوتل پڑی ہے۔ اس لیے ان کو بہت ملامت کی۔ اس کے بعد ایک رات پادری صاحب کے اُس کمرہ میں شور پیدا ہوا۔ جہاں کہ ان کی نوجوان لڑکیاں سوئی ہوئی تھیں۔ پادری صاحب اس کمرہ میں پہنچے تو دیکھا۔ کہ سردار صاحب شراب میں بدمست شرمندہ حالت میں کھڑے ہیں اور پادری صاحب کی نیک دل لڑکی ان کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ صبح پادری صاحب نے ان کو لاہور کا کرایہ دیا اور واپس کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت یسوع مسیح کی تعلیم کا بھی آپ جیسے "پختہ ارادہ" کے نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ لاہور آنے کے بعد ان کی وہی کیفیت تھی جو لاہور سے منٹگمری جانے سے پہلے تھی۔ یعنی شراب، قماربازی۔ تاش۔ رنڈی بازی۔ قرضہ اور دوستوں سے ایک ایک دو دو روپیہ طلب کرنا۔

میرا جیلوں کا اور جیلوں سے باہر کا تجربہ ہے کہ جب انسان کو چوری۔ شراب۔ ڈاکہ۔ دھوکہ بازی یا کسی قسم کی عادت پڑ جائے تو یہ عادت فطرت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس عادت کا جانا بے حد مشکل ہے اور دقت طلب ہے اور اس میں اگر تبدیلی ممکن ہے تو کئی برس تک مسلسل دن رات اپنے ذہن کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد اور وہ بھی اگر انسان کی قسمت اچھی ہو۔

معقولیّت باعثِ اطمینان

میں جب نابھہ میں سرکاری ملازم تھا۔ وہاں مجھے دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی تو میری سگائی ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں سردار ہرنام سنگھ کی لڑکی سے ہو گئی۔ ہندوستان میں عموماً اور ملازمت پیشہ لوگوں میں خصوصاً تجارت یا صنعت و حرفت کی کوئی قدر نہیں۔ اگر کوئی شخص تجارت یا صنعت سے ایک ہزار روپیہ ماہوار بھی پیدا کرتا ہو تو اس کو معمولی شخص سمجھا جاتا ہے مگر اس شخص کی زیادہ قدر ہے جو پچاس روپیہ ماہوار کا سرکاری ملازم ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ اگر بیس روپیہ ماہوار بھی رشوت سے مزید آمدنی ہو تو یہ بیس روپیہ سو روپیہ کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی شخص اپنی لڑکی کا رشتہ کرنا چاہے تو وہ سب سے پہلے پوچھے گا۔ تنخواہ کیا ہے اور اوپر سے آمدنی (یعنی رشوت) کتنی ہے۔ اگر لڑکے والوں نے پچاس روپیہ تنخواہ اور بیس روپیہ ماہوار بالائی آمدنی بتائی تو لڑکی والوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً رشتہ کر دیا جاتا ہے۔ چاہے شادی کے بعد میاں بیوی فاقہ کشی ہی

Marfat.com

کیوں نہ کریں اور ان کی تمام زندگی مصائب کا شکار ہی کیوں نہ ہو۔ میں نابھہ میں دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ ریاست کی سرکاری ملازمت ریاستوں کی لوٹ مشہور ہے۔ بالائی آمدنی (یعنی رشوت) کے پوچھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا۔ کہ اگر دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے تو ریاست کی ملازمت میں "اوپر کی آمدنی" چار یا پانچ سو روپیہ ماہوار سے کم کیا ہو گی۔ چنانچہ سردار ہرنام سنگھ نے اپنی لڑکی کا رشتہ میرے ساتھ کر دیا۔ اور شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

اس رشتہ کو چند ماہ ہوئے تھے۔ کہ مہاراجہ نابھہ پر مصائب کے بادل چھا گئے اور وہ گدی سے اتار دیے گئے۔ مہاراجہ کے گدی سے اتار دیے جانے کے بعد انگریز ایڈمنسٹریٹر آ گیا۔ میں نے استعفٰی دیا تو اس نے منظور نہ کیا۔ آخر بغیر استعفٰی ہی میں نابھہ چھوڑنے والا تھا۔ کہ گرفتار کیا جا کر پولیس کے پہرہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ تین ماہ کے قریب ہی میں نابھہ میں اسیری کی حالت میں رہا۔ وہاں سے جب چھوڑا گیا تو روزانہ اردو اخبار "اکالی" کو ایڈیٹ کرنے امرت سر چلا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ اس اخبار کو ایڈیٹ کرتا رہا۔ اس کے بعد اپنے وطن حافظ آباد گیا۔ وہاں بالکل بے کار تھا۔ نہ کوئی پروگرام نہ ملازمت اور نہ کوئی ذریعۂ معاش۔

سردار ہرنام سنگھ جن کی صاحب زادی سے میرا رشتہ ہوا۔ بہت شریف اور نیک آدمی تھے۔ ان کے گاؤں کے تمام لوگ محب الوطن تھے۔ جتنے لوگ کانگریس کی تحریک میں اس گاؤں سے قید ہوئے شاید پنجاب کے کسی دوسرے گاؤں سے نہ ہوئے تھے۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو پنجاب میں صرف اس گاؤں نے ہی سرکاری مالیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور قومی حلقوں میں اس گاؤں کو پنجاب کا باردولی کہا جاتا تھا۔ سردار ہرنام سنگھ نے جب میرے متعلق سنا۔ کہ میں نابھہ کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں اور بیکار ہوں تو وہ حافظ آباد آئے۔ میرے چچا بھگوان سنگھ سے ملے اور انہوں نے میری بے کاری کے متعلق کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ قدرتی طور پر ان کو تشویش ہونی چاہیئے تھی۔ کیونکہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ میں آئندہ کب برسرکار ہو سکوں۔ اور کہاں ملازمت ملے۔ میرے چچا نے بالکل اس طرح ہی غلط امیدیں دلاتے ہوئے جس طرح عام لوگ ایسے موقع پر دلایا کرتے ہیں۔ سردار ہرنام سنگھ سے کہا۔ کہ فلاں فلاں جگہ ملازمت کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ جلد ہی ملازمت مل جائے گی۔ چند روز کی بات ہے۔ دیوان سنگھ کو ملازمت کی کیا کمی ہے اس کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سردار ہرنام سنگھ اور میرے چچا کی گفتگو کا علم مجھے سردار ہرنام سنگھ کے حافظ آباد سے واپس چلے جانے کے بعد اگلے روز ہوا۔ میں نے جب تمام حالات سنے تو میں سوچتا رہا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ سردار ہرنام سنگھ بے حد شریف اور نیک شخص۔ بہت اچھا معزز خاندان۔ ان کی لڑکی جوان شادی کے قابل۔ میں بیکار اور میرا مستقبل تاریک۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ میں آئندہ زندگی میں کیا

کریں۔ اور کب کریں معقولیت کے ساتھ دیکھا جائے تو سردار ہرنام سنگھ کو میرے برسرکار ہونے کے لیے غیر معین عرصہ تک کا انتظار نہ کرنا چاہیئے۔ ادھر تو یہ خیال۔ دوسری طرف یہ احساس۔ کہ اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ تو رشتہ دار اور برادری کے لوگ مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ بیکاری کے باعث شادی نہ ہو سکی۔ میں رات کو کئی گھنٹے تک سوچتا رہا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر میں نے فیصلہ کیا۔ کہ مجھے معقولیت اور انصاف کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اپنی خودغرضی کے باعث سردار ہرنام سنگھ کو غلط امیدوں اور توقعات میں رکھنا مناسب نہیں۔ چنانچہ اگلے روز میں نے سردار ہرنام سنگھ کو ایک رجسٹری خط بھیجا (رجسٹری کے ذریعہ خط بھیجنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ یہ ان تک پہنچ جائے) جس میں لکھا کہ میں بیکار ہوں۔ ملازمت سے علیحدہ ہو چکا ہوں۔ میرا مستقبل تاریک ہے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آئندہ میرا ذریعۂ معاش کیا ہو اور میں کب برسرکار ہو سکوں۔ آپ کا انتظار کرنا مناسب نہیں۔ میرے دل میں آپ کی شرافت، اخلاق اور بزرگی کی بہت عزت قدر ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ اپنی صاحبزادی کی شادی کسی دوسری جگہ کر دیجئے۔ اور میرے حالات کے بہتر ہونے کا انتظار نہ کیجئے۔ اس خط کو بھیجنے کے بعد میں نے کچھ ایسی راحت سی محسوس کی۔ جیسی ایک فرض کو ادا کرنے کے بعد انسان محسوس کرتا ہے۔

میرے خط لکھنے کے بعد سردار ہرنام سنگھ نے اپنی لڑکی کی شادی شیخوپورہ کی ایک فیملی میں کر دی۔ میں حافظ آباد غالباً پانچ چھ ماہ بیکار رہا۔ یہ عرصہ میں نے حافظ آباد سے دو میل کے فاصلہ پر ایک باغ میں بسر کیا۔ یہ باغ میرے عزیز دوست اور چچازاد بھائی سردار حاکم سنگھ کپور کا تھا اس باغ میں ایک خیمہ لگا لیا گیا۔ میں شہر میں بہت کم جاتا۔ اور دوست اکثر شام کو وہاں ہی پہنچ جاتے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ شام کو آٹھ آٹھ دس دس دوستوں کی وہاں ہی دعوت ہوتی۔ اور شاید ہی کوئی شام ہوتی جبکہ ہم چار پانچ دوستوں نے مل کر کھانا نہ کھایا ہو۔

پانچ چھ ماہ گزرنے کے بعد میں نے دہلی آکر یہاں سے "ریاست" جاری کیا۔ "ریاست" کو شروع سے ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ روز بروز اشتہارات، اشاعت اور آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرے معترف اور قدردان اصحاب کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ "ریاست" کو چند ماہ میں ہی بہت کافی شہرت نصیب ہوئی اور اس کامیابی کی اطلاع سردار ہرنام سنگھ کو بھی ملتی رہی۔

پنجاب کے قریب قریب ہر قصبہ کے پاس تالاب ہیں۔ یہ تالاب نہر کے پانی سے بھرے رہتے ہیں۔ اور ان تالابوں پر لوگ نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں اور ان کا پانی مال مویشی کے پینے یا ان کو نہلانے وغیرہ کے کام بھی آتا ہے۔ مجھے یاد ہے میں خود بھی حافظ آباد کے تالاب پر بچپن میں نہانے اور اپنے کپڑے دھونے جایا کرتا تھا۔ اور تالاب کی سیڑھیاں مردوں اور عورتوں سے بھری رہتی تھیں۔ جو نہانے اور اپنے کپڑے دھونے کے لیے وہاں جایا کرتے۔

گورو نانک کی پیدائش شیخوپورہ کے ضلع میں ننکانہ صاحب کے مقام پر ہوئی۔ کاتک کی پورنماشی یعنی گورو نانک کے یوم ولادت کو اس مقام پر لاکھوں زائرین جاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ آباد سے بھی دس

Marfat.com

دس بارہ بارہ بیل گاڑیوں کا قافلہ ننکانہ صاحب جایا کرتا تھا۔ ان گاڑیوں میں سے کسی میں مرد بھرے ہوتے اور کسی میں عورتیں اور بچے۔ یہ قافلہ آٹھ یا دس میل کے بعد مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے جاتا اور قافلہ کے لوگ گورو صاحب کے شبد پڑھتے ہوئے جاتے۔

"ریاست" کو جاری ہوئے دو تین سال ہوئے تھے۔ کہ حافظ آباد سے ننکانہ صاحب کے لیے ایک قافلہ روانہ ہوا۔ اس قافلہ میں میری بعض دوسری رشتہ دار خواتین کے ساتھ میری والدہ اور میری ممانی بھی تھیں۔ یہ قافلہ سفر کرتے ہوئے شیخوپورہ پہنچا۔ اور چونکہ بیلوں کو پانی پلانے وغیرہ کا سوال تھا۔ اس قافلہ کا قیام وہاں کے تالاب کے کنارے ہوا۔ گاڑیوں سے بیل کھول دیے گئے۔ تاکہ ان کو چارہ دیا جا سکے۔ اور لوگ آرام کر لیں۔ عورتیں اور مرد الگ الگ ٹولیوں کی صورت میں درختوں کے سایہ کے نیچے تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ عورتیں جہاں بیٹھی تھیں۔ وہاں قریب ہی شیخوپورہ کی عورتیں تالاب پہ نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ جب عورتوں نے عورتوں کو دیکھا تو شیخوپورہ کی عورتیں حافظ آباد کی عورتوں کے پاس آ گئیں۔ اصولاً اور عملاً جہاں دو عورتیں بھی ایک جگہ جمع ہو جائیں وہاں ایک کانفرنس کا منظر ہوتا ہے۔ اتنی عورتیں خاموش کہاں رہ سکتی تھیں۔ ان کی آپس میں باتیں شروع ہوئیں۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے میکے کہاں ہیں۔ تمہاری سسرال کہاں ہیں۔ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے اور تمہارے بچے کتنے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اتفاق سمجھیے یا پچھلے جنم کے تعلقات کے باعث اس زندگی میں ملنا جلنا (میں اس بات کا قائل ہوں کہ جن لوگوں کے ساتھ اس زندگی میں تعلقات ہوتے ان کے ساتھ پچھلے جنم میں بھی تعلقات تھے۔ چاہے کسی صورت میں بھی تھے۔ اور آئندہ جنم میں بھی ہوں گے۔ اس کا میرے پاس قطعی ثبوت موجود ہے جو کبھی آئندہ بتاؤں گا) میری والدہ اور میری ممانی کے پاس ایک لڑکی آ بیٹھی جس سے یہ باتیں شروع ہوئیں۔

میری والدہ: بیٹی! تم کہاں کی رہنے والی ہو۔

لڑکی: میں یہاں شیخوپورہ کی رہنے والی ہوں۔

میری والدہ: تمہارے میکے شیخوپورہ میں ہیں یا یہاں تم بیاہی گئیں۔

لڑکی: میری شادی یہاں ہوئی ہے۔ میرے میکے تو گوبند پورہ میں ہیں۔

میری والدہ: میرے لڑکے کی شادی بھی گوبند پورہ میں ہونے والی تھی مگر وہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

لڑکی: گوبند پورہ میں کس کے گھر رشتہ ہوا تھا۔

میری والدہ: وہاں ایک سردار ہرنام سنگھ ہیں۔ ان کی لڑکی سے رشتہ ہوا تھا۔

لڑکی: آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔

میری والدہ: ہم حافظ آباد کے رہنے والے ہیں۔

لڑکی: آپ کون ہوتے ہیں۔

میری والدہ: ہم کھتری ہوتے ہیں۔

Marfat.com

لڑکی: آپ کا لڑکا کیا کام کرتا ہے۔

میری والدہ: پہلے ریاست نابھہ میں ملازم تھا۔ اب دہلی سے "ریاست" اخبار نکال رہا ہے۔

لڑکی یہ جواب سن کر کچھ حیران اور خاموش سی ہو گئی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میری والدہ نے پوچھا۔ بیٹی کیا بات ہے۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔ لڑکی پھر بھی خاموش رہی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میری والدہ اور میری ممانی نے پھر زور دے کر پوچھا۔ کہ کیا بات ہے۔ تم خاموش ہو گئیں۔ تو لڑکی نے بتایا۔ کہ وہ بی سردار ہرنام سنگھ کی لڑکی ہے اور اس کی سگائی ہی حافظ آباد میں ہوئی تھی۔

اس لڑکی کی اس کیفیت کو سن کر میری والدہ نے کہا۔ بیٹی! جہاں سنجوگ ہوں وہاں ہی شادی ہوتی ہے۔ اگر تمہاری قسمت میں ہمارے گھر آنا لکھا ہوتا تو تم آتیں۔ ایسا نہ لکھا تھا۔ اس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں اور کچھ دیر کے بعد قافلہ ننکانہ صاحب کی طرف روانہ ہوا اور وہ لڑکی اپنے گھر چلی گئی۔

ان حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان خود غرضی سے بلند ہو کر معقولیت کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرے اور پھر انصاف کا خیال کرتے ہوئے قدم اٹھائے۔ یہ قدم چاہے پیچھے ہی لے جانا پڑے تو انسان کا ضمیر نقصان اٹھانے کی صورت میں بھی راحت اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اور اگر انصاف۔ حق اور معقولیت کا خیال نہ کرتے ہوئے فائدہ بھی اٹھایا جائے۔ جیسا کہ چوری ڈاکہ یا رشوت میں لوگ اٹھاتے ہیں، تو روپیہ اور دولت یا دوسرے سامانِ راحت موجود ہوتے ہوئے بھی ذہن عذاب محسوس کرتا ہے اور صبر، سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

قانون اور فرض

میں اپنی زندگی میں پندرہ بار گرفتار کیا گیا اور اتنی بار ہی میرے خلاف مقدمات چلائے گئے۔ ان مقدمات کے سلسلہ میں مجھے آٹھ جیلوں میں رہنے اور وہاں کے حالات کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ آٹھ جیل یہ تھے: ہوشنگ آباد۔ ناگپور۔ دہلی۔ گوڑگاؤں۔ ملتان اولڈ سنٹرل۔ انبالہ۔ فیروز پور اور لاہور سنٹرل جیل۔ جیل کی زندگی کے متعلق میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر کوئی شخص انسانی فطرت اور انسان کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کرنا چاہے۔ تو جیل سے زیادہ بہتر دوسری کوئی جگہ نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ انسان اگر اپنے آپ کو بلند کرنا چاہے تو جیل بہترین ذریعہ ہے۔ اور پستی کی طرف جانا چاہے تو انسان کی گراوٹ کے لیے جیل سے زیادہ بدتر کوئی مقام نہیں کیونکہ جیل میں اپنی اور دوسروں کی حالت پر غور کرنے کے لیے بہت کافی وقت اور بہت مواقع ملتے ہیں۔ ان جیلوں کے متعلق درجنوں دلچسپ واقعات مجھے یاد ہیں جن سے انسان سبق حاصل کر سکتا ہے۔ میں آج ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ سنیچر کا دن اور دسمبر کا مہینہ تھا۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی نے میری ضمانت نامنظور کی اور حکم دیا۔ کہ میں دہلی جیل بھیجا جاؤں اور وہاں میرے ساتھ سپیشل کلاس کے قیدیوں کا

Marfat.com

سلوک کیا جائے۔ سب انسپکٹر مجھے لے کر جیل گیا اور وہاں دروازہ پہ دربان کے حوالہ کر کے واپس چلا آیا۔ دربان نے نام۔ ولدیت وغیرہ پوچھا۔ اور یہ لکھنے کے بعد اس نے ایک نمبردار (جیل میں طویل عرصہ تک رہنے کے بعد قیدی کو نمبردار بنا دیا جاتا ہے۔ یہ نمبردار خود کوئی کام نہیں کرتے۔ دوسرے قیدیوں سے کام لیتے ہیں۔) سے کہا کہ اس نئے قیدی کو جیل کے اندر داخل کرو۔ میں جیل کے اندر گیا۔ تو وہاں وسیع میدان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل میز کرسی لگائے بیٹھے تھے۔ سامنے بہت سے قیدی اپنے ہاتھوں میں اپنا ٹکٹ (یعنی اعمال نامہ جس پہ قیدی کا نام۔ پتہ۔ قیدی کی میعاد۔ کام۔ چال چلن اور مشقت وغیرہ لکھی جاتی ہے) لیے تھے۔ ایک نمبردار ڈپٹی صاحب کے قریب تولیہ نما کپڑے کے ساتھ اس طرح مکھیاں ہٹا رہا تھا۔ جس طرح ہنومان سری رام چندر جی کے پیچھے کھڑے ہو کر چنور کرتا ہے۔ سردی کا موسم تھا۔ دسمبر کا مہینہ، شام کا وقت اور مکھی کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ مگر چونکہ جیل میں افسروں کو بغیر تنخواہ ملازم ملتے ہیں اس لیے گرمی ہو یا سردی۔ ہر افسر کے ساتھ مکھیاں اور مچھر اڑانے والا ایک نمبردار ضرور ہوتا ہے۔ جو مکھیاں نہ ہونے کی صورت میں بھی بطور خوشامد کپڑا ہلاتا رہتا ہے۔

مجھے کچھ علم نہ تھا۔ کہ اب کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں ڈپٹی صاحب کے قریب گیا اور کہا

"میں ابھی باہر سے آیا ہوں اور جیل کے اندر داخل کیا گیا ہوں۔ میرے لیے کیا حکم ہے۔"

اس وقت میں نے سیاہ سرج کا گرم کوٹ اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ کوٹ کے بٹن کھلے تھے میرے ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ کے بازووں والی جگہ (یعنی کندھوں کے قریب) سے واسکٹ کے اندر تھے اور ہاتھ باہر (جب انسان سوچ رہا ہو وہ سوچنے کی صورت میں اکثر ہاتھوں کے ذریعہ اس طرح واسکٹ کا سہارا لیتا ہے) دوسرے لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ میری یہ بے تکلفی ڈپٹی صاحب کو پسند نہ آئی۔ آپ نے فرمایا:

"انسانوں کی طرح کھڑے ہو۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھے واسکٹ سے نکال دیئے۔ ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔ کون ہو اور کب آئے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ ایک ملزم ہوں ابھی آیا ہوں اور مجسٹریٹ نے سپیشل کلاس میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ نے قریب کھڑے نمبرداروں میں سے ایک نمبردار کو حکم دیا۔ کہ اس قیدی کا وارنٹ لاؤ۔ نمبردار دربان کے پاس جا کر وہ وارنٹ لایا جو پولیس نے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے دیکھا۔ کہ اس پہ سپیشل کلاس نہ لکھی تھی۔ جب آپ وارنٹ دیکھ چکے تو آپ نے حقارت سے اور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور جیل کے حکام کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر جیل کے حکام کافی ہوشیار ہیں جو دھوکہ میں نہیں آ سکتے۔ اس مسکراہٹ اور حقارت کے ساتھ دیکھنے کے بعد آپ نے نمبردار کو حکم دیا۔ کہ اس قیدی کو چالیس چکی کی طرف لے جاؤ۔ چالیس چکی وہ جگہ ہے۔ جہاں کہ چالیس کوٹھڑیاں قیدیوں کو تنہائی میں رکھنے کے لیے ہیں اور ہر کوٹھڑی میں پیسنے کے لیے چکی موجود ہے۔ نمبردار مجھے ان کوٹھڑیوں کی طرف لے گیا اور جاتے ہوئے اس نے کپڑا گودام کے

انچارج نمبردار کو پیغام بھیجا۔ کہ ایک نئے قیدی کے لیے کمبل اور تپڑی بھیج دو۔ میں جب کوٹھڑیوں کے پاس پہنچا تو ایک کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا۔ کہ اس کوٹھڑی میں رہو گے۔ مجھے وہاں پہنچے دو تین منٹ ہوئے تھے کہ کپڑے گودام کا نمبردار میرے لیے تین پھٹے ہوئے پرانے گندے اور میلے کچیلے کمبل اور ایک مونج کی تپڑی (یہ تپڑی نیچے بچھانے کا ایک قسم کا فرش ہوتا ہے جو چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا تیار کیا جاتا ہے۔ اور اسے ہر قیدی کو نیچے بچھانے کے لیے دیا جاتا ہے) لے کر آیا۔ یہ سکھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ تو سوچتا رہا۔ کہ میں کون ہوں۔ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ دہلی میں ہی رہتا ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر سوچتا رہا تو سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ کیا آپ سردار دیوان سنگھ اخبار "ریاست" والے تو نہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں! میرا نام دیوان سنگھ ہی ہے یہ بیچارے حیران ہوئے۔ کہ میں کیوں جیل آیا۔ پھر انہوں نے بتایا۔ کہ وہ لائلپور کے ایک زمیندار سردار نرائن سنگھ ہیں کئی برس سے ریاستوں میں بیداری پیدا کرنے کا کام کرتے رہے۔ پنجاب ریاستی پرجا منڈل کو کام کرنے کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ایک ڈاکہ تو ریاست جیند میں اور دوسرا انگریزی علاقہ میں ڈالا۔ تاکہ روپیہ حاصل کر کے پرجا منڈل کے کام پر صرف کریں۔ ڈاکہ ڈالنے کے کچھ عرصہ بعد پولیس نے گرفتار کر لیا۔ سات سال کے لیے قید کر دیئے گئے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا۔ کہ قید ہونے سے ایک سال پہلے پنجاب ریاستی پرجا منڈل کے سیکرٹری سردار بھگوان سنگھ لونگووالیہ کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لیے دفتر "ریاست" میں بھی آئے تھے۔

میں ان کو پہچان نہ سکا اور ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہ آیا۔ کہ یہ کب ملے تھے۔ انہوں نے جو واقعات اور سردار بھگوان سنگھ کے ساتھ آنے کے حالات بتائے ان سے یقین آ گیا۔ کہ سردار نرائن سنگھ نیک دل اور قومی ورکر ہیں۔ آپ ان میلے اور گندے کمبلوں کو لے کر پھر واپس کپڑا گودام میں گئے۔ وہاں سے آپ نے تین اچھے کمبل اور ایک نئی تپڑی انتخاب کی۔ اور پھر واپس میرے پاس پہنچے اور یہ سامان آپ نے میری کوٹھڑی میں رکھ دیا۔ سامان رکھنے کے بعد آپ نے کھانے کے لیے پوچھا۔ میں نے انکار کیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ جیل کے اندر وہ اس سے زیادہ میرے ساتھ بہتر سلوک یا ہمدردی کا ثبوت دے بھی کیا سکتے تھے۔

چند منٹ کے بعد کوٹھڑیوں کے نمبردار نے مجھے کوٹھڑی کے اندر جانے کے لیے کہا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ میں کوٹھڑی کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ کمبلوں کو دیکھا تو وہ بالکل ایسے تھے جیسے دیہات میں سردیوں کے زمانہ میں رات کو گائے بھینس وغیرہ جانوروں پر ڈالے جاتے ہیں۔ مجھے بہت کراہت محسوس ہوئی کمبلوں کو میں نے کھڈی (جیل میں کھڈی اس اونچی جگہ کو کہتے ہیں جو قیدی کے سونے کے لیے کوٹھڑی میں بنائی جاتی ہے) پر ایک طرف رکھ دیا۔ اور فیصلہ کیا۔ کہ ان گندے اور میلے کمبلوں کو استعمال نہ کروں گا اور گرم کوٹ و واسکٹ کو پہنے ہوئے ہی سو جاؤں گا۔ میں کھڈی پر بیٹھ گیا۔ سوچتا رہا۔ کہ مقدمہ کے متعلق مجھے آئندہ کیا کرنا چاہیئے۔ اگر کئی برس کے لیے قید ہو گیا تو اخبار کا انجام کیا ہو گا۔ دو تین گھنٹے تک سوچتا رہا۔ تپڑی بچھی ہوئی تھی۔ پھر اس پر لیٹ گیا۔ جب رات کو دس بجے تو سردی محسوس ہوئی۔ میں

Marfat.com

نے سوچا۔ کمبلوں کو پاؤں پر کیوں نہ ڈال لوں میں نے بوٹ کھولے نہیں تھے۔ پہنے ہی لیٹ گیا تھا۔ کمبلوں کے ایک حصہ کو میں نے پاؤں پر ڈال لیا۔ تاکہ پاؤں تو گرم رہیں۔ لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ نیند سی آ گئی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد زیادہ سردی ہو گئی۔ مجبور تھا میں نے کمبلوں کو سرکا کر گھٹنوں تک کر لیا۔ اس کے بعد اور سردی بڑھی تو ذرا اور اوپر کھینچے۔ چنانچہ صبح جب پانچ بجے میری آنکھ کھلی تو کمبل آہستہ آہستہ میرے کندھوں تک پہنچ چکے تھے اور جن کمبلوں کو دیکھ کر شام کے وقت کراہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ صبح پانچ بجے وہ کمبل میرے اوپر تھے۔ انسان کی قوتِ ارادی کمزور ہو تو ضروریات کے باعث انسان گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ آنکھ کھلنے پر سوچتا رہا۔ کہ اگر کمبلوں کی یہی کیفیت مہاتما گاندھی کے ساتھ پیش آتی اور مہاتما گاندھی ان کمبلوں کو استعمال کرنا نہ چاہتے تو وہ اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے باعث جان دے دیتے۔ اور کمبل استعمال نہ کرتے۔ مگر یہاں دیوان سنگھ ہے۔ شام کو ان کمبلوں سے نفرت تھی۔ قوتِ ارادی کے کمزور ہونے کے باعث اب ان میں لپٹا پڑا ہے۔

صبح روشنی ہوتے ہی نمبردار نے دروازہ کھولا۔ اس نمبردار کا نام ننھو تھا اور ایک قتل کے مقدمہ میں سات سال کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس کے پانچ سال گزر چکے تھے اور دو سال باقی تھے۔ یہ جیل کے افسروں کا گُرگا تھا اور تمام قیدیوں کو اس سے شکایت تھی کہ یہ افسروں کے کہنے پر قیدیوں سے برا سلوک کرتا ہے۔

دہلی شہر میں ہی کم آدمی ہیں جو مجھے پہچان سکتے ہیں۔ حالانکہ اخبار اور میرے نام سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے کیونکہ میں کبھی پبلک جلسوں، جلوسوں یا میٹنگوں میں نہیں جاتا۔ موٹر سے دفتر اور موٹر میں ہی دفتر سے گھر۔ شہر یا نئی دہلی میں جانا بھی ہوتا تو موٹر میں۔ مجھے جیل میں کون جانتا تھا۔ ننھو نمبردار نے مجھے بھی چوروں ڈاکوؤں اور دوسرے مجرموں کی طرح ایک قیدی سمجھا۔ اس نے مجھے اس کوٹھڑی کی صفائی کے کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے کہا کہ بتا دو کہ کس طرح کروں۔ اس طرح ہی آئندہ کر دیا کروں گا۔ اس روز اتوار تھا اور جیل میں قیدیوں کی چھٹی تھی۔ جب چھٹی ہو تو تمام قیدی جیل کی صفائی کرتے ہیں۔ زمین کو لیپا جاتا ہے تاکہ مٹی بیٹھی رہے۔ اس نے مجھے اس کوٹھڑی کے کچھ حصہ کو پوت کر بتایا کہ اس طرح پوت دو۔ میں نے کوٹھڑی کے باقی حصہ کو پوت دیا۔ کیونکہ میں اس اصول کے حق میں ہوں اور ہمیشہ اس کا پابند رہا کہ جیل کے اندر وہ سب کام کیا جائے جو جیل کے قوانین کے مطابق قیدی کو کرنا چاہیئے۔ میں اس کو ایک فرض سمجھتا ہوں کوٹھڑی کو پوتنے کے بعد میں نے نل پر ہاتھ دھوئے۔ پھر پاخانہ گیا۔ ہاتھ صاف کیے۔ بہت برسوں سے کبھی مٹی سے ہاتھ صاف نہ کیے تھے۔ ہمیشہ صابن سے کرتا تھا۔ بلکہ گھر میں باورچی کے لیے بھی یہ سخت پابندی تھی۔ کہ وہ برتنوں کو کبھی مٹی سے صاف نہ کرے ہمیشہ صابن سے کرے مگر جیل میں صابن کہاں۔ میں آج سی کلاس کا قیدی تھا مجھے اس طرح ہی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ جیسے دوسرے عام قیدی کرتے ہیں۔ میں نے مٹی سے ہاتھوں کو صاف کیا۔ ایک طرف دھوپ میں جا کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے قیدیوں کو دیکھتا رہا۔ کہ وہ اپنی زندگی جیل میں کیونکر بسر کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد قیدیوں میں بھنے ہوئے چنے تقسیم ہوتے۔ قیدی وہ کھاتے رہے۔ اتوار کی چھٹی کے باعث خوش فعلیاں ہو رہی تھیں اطمینان

Marfat.com

میں ایک دوسرے کو گندی گالیاں دی جا رہی ہیں۔ بعض قیدی ان میں ایسے تھے جو کئی کئی برس سے جیل کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور بعض ایسے رنگروٹ تھے جو پہلی بار آئے۔ دس بجے کے قریب ان میں کھانا تقسیم ہوا۔ کالی سڑی پکی ہوئی سبزی اور دو دو روٹیاں۔ نتھو نمبردار اور دوسرے ایک دو قیدیوں نے مجھے بھی روٹی اور سبزی کھانے کے لیے کہا مگر میں بھوک محسوس نہ کر رہا تھا۔ انکار کر دیا۔ چائے کے لیے جی چاہتا تھا مگر وہاں چائے کہاں۔ قیدیوں کے حالات دیکھتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب نتھو نے آواز دی کہ تمام قیدی اپنی اپنی کوٹھڑی میں چلے جائیں۔ میں بھی کوٹھڑی میں گیا تو نتھو نے باہر سے حسب دستور تالا لگا دیا۔ کیونکہ جیل کے قواعد کے مطابق قیدیوں کو اتوار کے روز دوپہر کے وقت بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کوٹھڑی کے متعلق یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ یہ کوٹھڑی جو مغرب کی طرف ایک چھوڑ کر آخر میں ہے۔ ان تین چار کوٹھڑیوں میں سے ایک ہے جس میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے والے دہلی سازش کیس کے وہ ملزمان رہے جن کو بعد میں پھانسی ملی۔ یہ مجھے لالہ ہنومنت سہائے نے بتایا۔ جو خود اس مقدمہ میں ملزم تھے۔ میں کوٹ واسکٹ اتار کر کوٹھڑی کے صحن میں بیٹھ گیا۔ اور آئندہ کے متعلق سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا۔ کہ اخبار کو کسی معاوضہ کے ڈاکٹر اشرف (جو کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ہیں اور میری اس گرفتاری سے چند روز پہلے مجاز صاحب کے ساتھ ملنے کے لیے دفتر "ریاست" میں تشریف لائے تھے) کے سپرد کر دیا جائے اور اس قسم کی ایک تحریر ڈاکٹر صاحب کو دے دی جائے کہ میں یہ اخبار ان کو بغیر کسی معاوضہ کے دیتا ہوں۔ میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ نتھو نمبردار آیا۔ اس نے تالا کھولا اور کہا۔ کہ دفتر میں ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں۔ میں نے کوٹ واسکٹ پہنا اور نتھو کے ساتھ دفتر میں گیا۔ تو وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سردار رگھو نندن سنگھ تشریف فرما تھے اور ان کے پاس دفتر "ریاست" کے مسٹر ظفر احمد میرا بستر، کپڑے، سامان اور کھانا لیے بیٹھے تھے۔ میں جب پہنچا تو ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے۔ آپ نے مصافحہ کیا اور کہا:

"سردار صاحب! میں بہت سخت نادم اور شرمندہ ہوں۔ مجھے کل شام کو معلوم نہ تھا۔ کہ آپ کون ہیں۔ میں نے آپ سے جو الفاظ کل شام کو کہے ان کے لیے معافی چاہتا ہوں اور فی الحقیقت مجھے سخت افسوس ہے اور میں نادم ہوں۔"

میں نے کہا۔ آپ اس کا کوئی خیال نہ کیجئے۔ آپ کا کیا قصور ہے۔ آپ کو علم نہ تھا۔ کہ میں کون ہوں بالکل معمولی بات ہے اور آپ نے کہا بھی کیا۔ کوئی غیر مناسب بات نہ تھی۔ ڈپٹی صاحب سے مجھے معلوم ہوا۔ کہ تھوڑی دیر پہلے کسی دوسرے کام کے لیے انہوں نے مسٹر لوئیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو جیل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے) کو ٹیلیفون کیا۔ تو اس وقت مسٹر لوئیس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو تاکید کی کہ ایڈیٹر "ریاست" کو کل شام جیل بھیجا گیا ہے وہ سپیشل کلاس میں رہیں۔ بڑی پوزیشن کے آدمی ہیں ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ظفر صاحب نے مجھے بتایا۔ کہ کل شام کو ہی جب دفتر کے لوگوں نے سنا۔ کہ مجھے جیل بھیج دیا

Marfat.com

گیا ہے تو وہ میرا بستر، کھانا اور سامان لے کر جیل آئے تھے مگر کسی نے ان کی پروا نہیں کی۔ ظفر صاحب کا یہ بیان سن کر ڈپٹی صاحب نے پھر معافی چاہی۔ میں نے پھر ان سے کہا کہ معمولی بات ہے۔ آپ خیال نہ کیجئے۔ اس بات چیت کے بعد میں نے ڈاکٹر اشرف کے نام ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی کوٹھی کے پتہ پر خط لکھا۔ جس میں اخبار "ریاست" بغیر کسی معاوضہ کے دینے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ جیل آ کر اس کے متعلق تحریر لکھوا لی جائے۔ یہ خط میں نے ڈپٹی صاحب کے حوالے کیا۔ مگر پولیس نے اسے روک لیا۔ ڈاکٹر اشرف کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ وہ اب تک مقدمہ کی مثل میں موجود ہے۔ اب ڈپٹی صاحب نے ایک نمبردار کو بلایا اور حکم دیا۔ کہ میرے لیے وہاں انتظام کیا جائے جہاں سپیشل کلاس کے لوگ رکھے جاتے ہیں۔ یہ جگہ بہت اچھی، صاف ستھری، روشن اور ہوادار ہے۔ یہاں چارپائی، میز اور چھوٹی الماری وغیرہ سامان بھیج دیا گیا۔ میرا سامانِ غسل، کپڑے اور بستر وغیرہ جو ظفر صاحب لائے تھے۔ وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان کے دن میں مجھ سے پہلے وہاں احرار لیڈر عبد القیوم صاحب کانپوری بھی مقیم تھے۔

تین چار سال ہوئے میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک جگہ فلم ایکٹر کہتا ہے: "دنیا جھکتی ہے جھکانے والا چاہیئے۔" جیلوں میں عام قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے انسانیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر جیل کے حکام اخبار نویسوں اور پولیٹیکل لیڈروں کے ساتھ جس خوشامد، چاپلوسی، فرضی محبت اور دلداری کا سلوک کرتے ہیں۔ اس کی مثال سسرال کے گھر کے بغیر انسان کو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ چنانچہ اس بار میں دہلی جیل میں پانچ ماہ کے قریب رہا۔ کھانا دونوں وقت گھر سے آتا۔ کتابیں، کاغذ، قلم دوات، لکھنا پڑھنا، اخبارات، سب سہولتیں۔ دوسرے لوگوں کو تو اپنی بیرک یا کوٹھڑی سے بھی نکلنے کی اجازت نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ میرے ساتھ رہنے والے ایک لیڈر مسٹر واٹسن اپنے کمرہ سے بھی نہ نکل سکتے تھے مگر میں تمام جیل میں پھرا آتا۔ دوپہر کو گھنٹہ دو گھنٹہ غلہ گودام کے انچارج سردار جاگیر سنگھ (جو آجکل دہلی جیل میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں اور غیر معمولی طور پر دیانت دار اور شریف ہیں) کے پاس چلا جاتا اور جس قیدی سے چاہتا بات چیت کرتا۔ مگر مجھے کوئی نہ روکتا۔ اس "رعایت" کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ یہ لوگ محسوس کرتے تھے۔ کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد جیل کی خرابیوں کو بے نقاب کر سکتا ہوں اور بے نقاب کرنا ان کے لیے مصائب و مشکلات کا باعث ہو گا۔

میں جیل میں ہی تھا۔ کہ وہاں قتل کے سلسلہ میں تین سادہ لوح دیہاتی جاٹ جیل میں آئے۔ ایک اٹھارہ سال کا لڑکا جس نے چار پانچ ماہ کے بچہ کو زیور کے لالچ میں قتل کیا تھا اور دو بڑی عمر کے جاٹ۔ جن کے متعلق پولیس نے لڑکے سے بیان دلوا دیا۔ کہ یہ دونوں بھی قتل میں شریک تھے اس قتل کے اصل اور صحیح واقعات یہ ہیں کہ ضلع دہلی کے ایک گاؤں میں چار یا پانچ برس کا ایک بچہ کھیل رہا تھا اور اس نے پانچ سات روپے کے چاندی کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ بچہ جب گلی میں آیا

Marfat.com

تھا تو ایک اٹھارہ سالہ جاٹ نوجوان اس بچہ کو اپنے گھر جہاں وہ اکیلا رہتا تھا، لے گیا۔ اس نے بچے کا زیور اتار لیا۔ بچہ جب رونے لگا تو اس نے بچہ کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ یہ نوجوان ملزم بہت بے وقوف اور ہونق کلاس کا دیہاتی تھا۔ بچہ کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے بچہ کی لاش کو اپنے گھر کی دیوار کے ایک بہت بڑے سوراخ میں رکھ دیا اور اوپر سے اینٹیں چن دیں۔ مقتول بچہ جب گھر نہ پہنچا تو اس کی ماں تلاش کرنے کے لیے گلی میں نکلی۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی پتہ نہ چلا۔ تشویش ہوئی۔ لوگ جمع ہو گئے تو ایک شخص نے بتایا۔ کہ کچھ عرصہ پہلے اس نے نوجوان جاٹ کو بچہ کے پاس کھڑا دیکھا تھا۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں نے جب نوجوان جاٹ کو دھمکایا اور دو چار تھپڑ مارے تو ملزم نے بتا دیا۔ کہ اس نے زیور کے لالچ میں بچہ کو ہلاک کیا ہے اور لاش فلاں جگہ پڑی ہے لوگوں نے لاش نکال لی۔ پولیس میں اطلاع ہوئی۔ پولیس آ گئی۔ ہر گاؤں اور قصبہ میں کچھ لوگ پولیس کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو پولیس اور ملزموں کے درمیان رشوت کے سودے کراتے ہیں۔ جھوٹے گواہ تیار کرتے ہیں۔ خود شہادتیں دیتے ہیں۔ مخبریاں کرتے ہیں اور پولیس ان کے تمام جرائم پر پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس گاؤں کے پولیس کے ایجنٹ کی دو جاٹوں (جو اصلی نوجوان ملزم کے ساتھ گرفتار ہو کر جیل میں آئے) سے عداوت تھی۔ پولیس کے اس ایجنٹ نے پولیس کے ساتھ مل کر اصلی ملزم سے بچہ کے زیورات لیے اور گاؤں کے باہر فرضی ملزموں کے کھیت میں دفن کر دیے۔ ادھر نوجوان ملزم کو پہلے تو پولیس نے مارا اور دھمکایا۔ جب یہ پولیس کے اشارہ پر بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا تو اس کی خاطر تواضع شروع ہوئی۔ اس کو جلیبیاں اور لڈو کھلائے گئے۔ اور اس سے کہا گیا۔ کہ اگر وہ عدالت میں یہ بیان دے کہ اس نے دونوں فرضی ملزموں کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ فرضی ملزم تو سزا پا جائیں گے مگر یہ خود بچ جائے گا۔ کیونکہ اگر کسی دوسرے کے کہنے پر جرم کیا جاتے تو جرم کرنے والے کو سزا نہیں ملتی۔ ترغیب دینے والے کو ہی ملتی ہے۔ چنانچہ اس نوجوان ہونق نے پولیس کے کہنے پر یقین کر لیا اور اس نے بیان دے دیا۔ کہ دونوں فرضی ملزموں نے اس سے جرم کرنے کے لیے کہا۔ دونوں ملزموں کے کہنے پر اس نے بچہ کو ہلاک کیا۔ دونوں ملزم زیور لے گئے اور انہوں نے اپنے کھیت میں زیور دفن کیا۔ چنانچہ اس بیان کے مطابق کھیت میں سے گواہوں کے سامنے زیور نکالا گیا شہادتیں تیار کی گئیں اور دونوں بے گناہ غریب معصوم اور سادہ لوح جاٹ جن کو جرم کا کچھ علم نہیں تھا، بھی اصلی نوجوان ملزم کے ساتھ گرفتار کیے جا کر جیل بھیج دیے گئے۔ جیل میں یہ لوگ جب پہنچے تو جیل کے حکام نے پولیس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے نوجوان ملزم کو تو جیل کے شمال کی جانب آخری کوٹھڑیوں میں رکھا اور دونوں فرضی ملزموں کو جنوب کی طرف کی کوٹھڑیوں میں۔ تاکہ یہ لوگ آپس میں مل کر نوجوان ملزم کے بیان کو بدلنے کا باعث نہ ہوں۔ اور "مقدمہ" "کامیاب" ہو سکے۔ یہ تمام حالات مجھے دونوں فرضی ملزموں نے بتائے۔ میں نے ان پر مختلف سوالات بھی کیے تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہ یہ جھوٹ تو نہیں بول رہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ کہ یہ سچ بول رہے ہیں۔ یہ لوگ بہت تشویش میں تھے۔ بے گناہ قتل کا مقدمہ جس میں پھانسی کی سزا

Marfat.com

دی جا سکتی ہے۔ قانون اور مقدمہ سے ناواقفیت۔ کریں تو کیا۔ سوائے تشویش میں گھلنے اور رات کو نہ سونے کے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ میں اگلے روز صبح نوجوان جاٹ ملزم کی کوٹھڑیوں کی طرف گیا۔ تو اس کے ساتھ تپاک کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے پیش آیا۔ تاکہ یہ اصل حالات بتائے۔ یہ سادہ لوح، بے وقوف تو تھا۔ اس سے جب میں نے ایک دو باتیں ہمدردی کے ساتھ کیں تو اس نے سب حالات من وعن بتا دیے جو او پر بیان کیے گئے ہیں۔ کہ کس طرح پولیس اور پولیس کے ایجنٹ کے کہنے پر اس نے جھوٹا بیان دیا۔ بے گناہوں کو پھنسایا اور اسے جلیبیاں اور لڈو کھلائے گئے وغیرہ۔ میں اس سے باتیں کر کے واپس اپنے کمرے میں آیا تو کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ قانوناً پوزیشن یہ ہے کہ اگر ایک ملزم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے اپنے ہمراہی ملزموں کا نام بھی لیتا ہے تو ہمراہی ملزم چاہے قطعی بے گناہ ہوں وہ بھی مجرم سمجھے جائیں گے کیونکہ ایک مجسٹریٹ یا جج اس ملزم کے تمام کے تمام بیان پر یقین کرنے کے لیے مجبور ہے۔ مجھ پر پندرہ کے قریب مقدمات تمام ہوئے۔ جہاں تک فوجداری مقدمات کے ڈیفنس کا سوال ہے۔ معمولی وکیلوں سے میں زیادہ مقدمات کی نوعیت کو سمجھتا ہوں اور یہ دلچسپ کیفیت ہے کہ ہوشنگ آباد والے مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" میں چھ سال وکیلوں کی پیروی کرنے کے بعد آخری بحث ایڈیٹر "ریاست" نے خود کی کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" کے وکیل مصروفیت کے باعث اس روز پہنچ نہ سکے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے اپنی طرف سے بحث خود کی اور نواب بھوپال کی طرف سے بحث کرنے والے سر عبدالرحمن تھے۔ جو بعد میں پنجاب کے جج ہائیکورٹ ہوئے۔ بحث کے بعد مجسٹریٹ مسٹر راڈرک نے کہا: "سردیوان سنگھ! میں آپ کو اس بحث پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اس سے بہتر بحث کوئی وکیل بھی نہیں کر سکتا۔" میں اپنے کمرے میں پہنچا تو تمام حالات پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ لوگ اخبارات میں دعوی تو کرتے ہیں دنیا سے مظالم کو ختم کرنے کی کوشش کا۔ مگر یہ ظلم سامنے ہو رہا ہے۔ بے گناہ لوگ پھانسی پر چڑھیں گے۔ دن بھر میں آرام سے بیٹھ نہ سکا۔ کبھی دونوں بے گناہ ملزموں کے پاس جا کر پھر باتیں کرتا۔ کبھی واپس آ کر سوچتا۔ میں نے خیال کیا۔ کہ سیشن جج جس کے پاس مقدمہ پیش ہونے والا ہے کو تمام حالات لکھ کر بھیجوں۔ پھر خیال آیا۔ کہ اس لکھنے کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہ ہوگی۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ سوچتا رہا۔ کہ کیا قدم اٹھایا جائے۔ صبح چار بجے چارپائی سے اٹھا پاخانہ گیا۔ ہاتھ منہ صاف کیے۔ انگیٹھی میں کوئلے سلگائے۔ چائے کے لیے پانی رکھا۔ گلاس میں دودھ کے پوڈر کلم سے دودھ تیار کیا۔ چائے بنائی اور چائے پی رہا تھا۔ تو خیال آیا۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو اصلی نوجوان ملزم کا بیان تبدیل ہونا چاہیے۔ بے گناہوں کے پھانسی کی رسی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ کہ اصلی ملزم اپنے بیان کو بدل دے۔

جب دن نکلا آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ میں سیر کے بہانے ٹہلتے ٹہلتے نوجوان ملزم کے پاس پہنچا میں نے پوچھا۔ کیا حال ہے۔ یہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ پولیس کے کہنے کے مطابق اس کو یہ یقین تھا کہ قتل کرنے والے سزا نہیں پا سکتے۔ صرف قتل کی ترغیب دینے والے سزا پاتے ہیں۔ یہ بالکل

Marfat.com

بری ہو جائے گا۔ اور اس کے ہمراہی جاٹ پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اس نے جواب دیا۔ مزے میں ہوں یہ مجھے ہمدرد اور بے تعلق سمجھتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ خدا کرے تم بری ہو جاؤ۔ مگر تمہارے بری ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ تم تو لازمی طور پر پھانسی پاؤ گے۔ یہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں نے کہا تم قانون سے واقف نہیں ہو۔ بے وقوف جاٹ ہو۔ پولیس کے چکمہ میں آ گئے تم اتنا تو سوچو کہ جو شخص قتل کرنے کا خود اقرار کرے۔ کبھی بری ہو سکتا ہے اور عدالت اس کو کبھی چھوڑ سکتی ہے۔ پولیس نے تو تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ میری بات سن کر یہ سوچنے لگ گیا۔ اتنے میں وہاں کا ایک پرانا قیدی جا رہا تھا۔ میں نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ یہ جاٹ کتنا گدھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قتل کا اقرار کرتے ہوئے یہ پھانسی سے بچ جائیگا پرانے قیدی بھی مقدمات کی نوعیت سے واقف ہوتے ہیں۔ اس نے جواب دیا: سردار صاحب جی! ایسے بے وقوف ہی تو پھانسیوں پر لٹکتے ہیں۔ عدالتوں میں اقرار نہ کرنے والے تو سزا پا جاتے ہیں اور اقرار کرنے والا یہ الو کا پٹھا بری ہو جائے گا۔ ان لوگوں کی ایسی ہی حالت ہے۔ یہ جاٹ پیدائشی بے وقوف ہوتے ہیں۔" اس پرانے قیدی کی رائے سن کر نوجوان جاٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ میرے پاؤں پہ گر پڑا۔ اور کہا "خدا کے لیے بچاؤ۔ میں مر جاؤں گا۔" میں نے اس سے کہا۔ تمہارے بچنے کی صورت ہے تو صرف ایک ہی۔ کہ تم جب سیشن کورٹ میں جاؤ تو زور زور سے رونا شروع کر دو۔ اور سیشن جج سے کہو کہ تم بالکل بے گناہ ہو۔ پولیس کے کہنے پر تم نے جھوٹا بیان دیا ہے۔ تم نے بچہ کو قتل نہیں کیا۔ اور تمہارا بیان مار مار کر لیا گیا ہے۔ میری اس رائے کو سن کر پرانے قیدی نے کہا: "ہاں یہی صورت بہتر ہے سیشن میں جا کر اپنے بیان سے پھر جاؤ۔ تب بچ سکو گے۔

یہ نوجوان جاٹ مجھے ہمدرد سمجھتا تھا۔ میری بات اس کے دل میں لگی اور اس نے وعدہ کیا کہ میں نے جیسا کہا ہے ویسا ہی وہ کرے گا۔ اس لڑکے نے مجھے بتایا کہ جب یہ پیشی پر جاتا ہے تو پولیس کے لوگ اس کو اپنے بیان پر پختہ رہنے کے لیے تاکید کرتے ہیں اور کبھی کپڑے لے دیتے ہیں کبھی مٹھائی۔ اور اس سے کہتے ہیں کہ فیصلہ کے روز یہ بری ہو جائے گا۔

میں نے اس نوجوان جاٹ کے پاس ہر روز جانا شروع کیا اور اسے سمجھا دیا۔ کہ جب پولیس اس کو مٹھائی وغیرہ دے اور بیان پر قائم رہنے کے لیے کہے تو یہ پولیس سے یہی کہتا رہے کہ وہ بیان پہ قائم رہے گا۔ تاکہ پولیس کو اس کے بیان بدلنے کا علم نہ ہو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ پولیس یہی سمجھتی رہی کہ اقراری ملزم اپنے بیان پر قائم ہے۔ یہ مجھے ہر پیشی کے حالات بتاتا رہا اور میں بھی اس کو اچھی طرح تاکید کرتا اور سمجھاتا۔ آخر جب سیشن جج نے اس کا بیان لینا چاہا تو عدالت میں یہ زار زار رونے لگ گیا اور اس نے کہا: "حضور میں نے قتل نہیں کیا اور نہ مجھے قتل کا علم ہے کہ کس نے کیا۔ پولیس نے مار مار کر مجھ سے جرم کا اقرار کرایا۔ اور دوسرے بے گناہ لوگوں کے متعلق بیان لیے لیا۔ نہ میں نے قتل کیا نہ مجھ سے کسی نے قتل کرنے کو کہا۔ ہم تینوں بے گناہ ہیں۔ پہلا بیان میں نے

Marfat.com

بالکل غلط اور پولیس کے کہنے پر دیا ہے۔"
سیشن جج نے یہی بیان لکھ لیا۔ پولیس اور سرکاری وکیل حیران کہ یہ کیا ہو گیا۔
اقراری بیان کی قانونی پوزیشن یہ ہے کہ اگر اقرار کے بعد ملزم اپنے بیان سے پھر جائے۔ تو بعض حالتوں میں اس کا بیان اس کے خلاف استعمال ہوتا ہے بعض حالتوں میں نہیں مگر ساتھی ملزموں کے خلاف تو یہ قطعی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس مقدمہ میں چونکہ لاش زحوان ملزم کے گھر سے برآمد ہوئی سیشن جج نے اس کو تو عمر قید کی سزا دی مگر چونکہ اس نے اپنے اقراری بیان کی تردید کر دی دو نوں بے گناہ ملزم بری کر دیے گئے۔

اس مقدمہ میں قانوناً تو شاید میں بھی ملزم کو ورغلانے اور اس کا بیان بدلوانے کا مجرم ہوں مگر یہاں تک اخلاقی فرض کا سوال ہے۔ میں نے نہ صرف کوئی جرم نہیں کیا بلکہ میں مسرت اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے دو بے گناہوں کو پھانسی کے تختہ سے بچا کر اپنا فرض ادا کیا۔ اور آئندہ زندگی میں بھی اگر کوئی ایسا موقع آیا۔ جہاں کہ قانون اور فرض میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں یقیناً فرض کو ہی انتخاب کروں گا۔ قانون کی کبھی پروا نہ کروں گا۔ چاہے قانون کی پروا نہ کرنے کے جرم میں قابلِ تعزیر ہی کیوں قرار نہ دیا جاؤں۔

ریاستوں کے جرائم اور ان کی سزائیں

ریاستوں میں ہر افسر اور اہل کار کا گھر خوشامدیوں کا مرکز ہوتا تھا اور شاید ایک بھی افسر یا اہل کار ایسا نہ ہو گا۔ جس کے ہاں ہر روز پانچ سات دس خوشامدی نہ آتے ہوں۔ یہ خوشامدی نہ کوئی اس افسر سے تنخواہ پاتے تھے۔ نہ کوئی اور معاوضہ۔ اور یہ اس بات میں ہی خوش رہتے۔ کہ ان کا اس افسر سے تعلق ہے۔ کیونکہ اس تعلق کے باعث عام لوگوں پر خوشامدی کا کچھ رعب سا رہتا۔
میں جب ریاست نابھہ میں ملازم ہوا اور لوگوں کو یہ علم ہوا کہ مہاراجہ نے مجھے ذاتی دوستانہ تعلقات کے باعث ملازمت دی ہے تو میرے ہاں بھی چند خوشامدیوں نے آنا شروع کیا۔ یہ لوگ دن میں ایک آدھ بار یا دوسرے تیسرے روز آتے۔ کوئی کام نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی غرض نہیں۔ صرف آئے۔ سلام دعا کی۔ بیٹھے۔ شہر کے حالات بتائے۔ میرے سامنے میری تعریف کی۔ اپنا اور میرا وقت ضائع کیا اور چلے گئے۔ ان لوگوں میں مہاراجہ کے باورچی خانہ کا ایک سرکاری باورچی سری سنگھ دمیرا خیال ہے کہ یہی نام تھا۔ اگر میں بھول نہیں گیا) بھی تھا جو دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتا۔ مہاراجہ کے حالات سناتا اور شہر کے متعلق واقعات بتاتا۔ یہ کھانا پکانے میں ماہر تھا۔ ہندوستانی و انگریزی ہر قسم کا کھانا پکا سکتا تھا۔ یہ کبھی کبھی میرے ہاں آ کر میرے لیے کھانے کی ایک آدھ اچھی ڈش بھی تیار کرتا۔ چنانچہ میں نے اس سے فرنچ ٹوسٹ اور دو چار دوسرے انگریزی کھانے پکانا بھی سیکھا ہے۔

Marfat.com

میں اس کا بہت لحاظ کرتا اور یہ میرا۔ کیونکہ یہ مہاراجہ کا باورچی تھا۔ مجھے خیال تھا کہ ایسے لوگ اگر خلاف ہوں تو مہاراجہ کے پاس بدگوئی کر کے مہاراجہ کو خلاف کر سکتے ہیں۔ اس کو یہ خیال کہ مہاراجہ سے میرا ذاتی تعلق ہے۔ شاید میں اس کی ترقی کے لیے مہاراجہ سے کبھی سفارش کروں اور اس کے لیے مفید ثابت ہوں۔ یہ میرے پاس کئی ماہ تک آتا رہا۔ اس کے بعد گرمیوں کے شروع ہونے پر مہاراجہ منصوری پہاڑ پر چلے گئے تو یہ بھی سٹاف کے ساتھ وہاں گیا۔ مہاراجہ منصوری میں عام طور پر سال میں آٹھ نو ماہ رہتے تھے یعنی مارچ میں جاتے اور اکتوبر یا نومبر میں واپس نابھہ آتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سرکاری سٹاف کے لوگ اتنا طویل عرصہ اپنے وطن اور بال بچوں سے دور رہ کر تنگ آ جاتے۔ اور اگر کسی کو رخصت ملتی یا سرکاری کام کے لیے نابھہ آتا تو وہ اسے غنیمت سمجھتا۔ منصوری میں مہاراجہ کے باورچی خانہ میں سے ایک چمچہ اور کھانا کھانے کا ایک کانٹا گم ہو گیا۔ اس چمچہ اور کانٹے کے گم ہونے کے متعلق مہاراجہ کے ایک نفر (پنجاب کی سکھ ریاستوں میں ذاتی خدمت کرنے والے بیرہ، لڑکے یا ملازم کو نفر کہتے تھے) نے مہاراجہ سے شکایت کی کہ ایک چمچہ اور ایک کانٹا گم ہے اور اس کو شک ہے کہ اس چمچہ اور کانٹے کی چوری ہری سنگھ باورچی نے کی ہے۔ نفر کا یہ کہنا تھا کہ مہاراجہ غصہ اور جوش میں آ گئے۔ سرکاری سامان کی چوری مہاراجہ کے پاس رہنے والا سرکاری ملازم کرے۔ منصوری انگریزی علاقہ میں تھی۔ وہاں مہاراجہ کی جورسڈکشن نہ تھی۔ مہاراجہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ انگریزی پولیس کو رپورٹ کرتے اور پولیس اس چوری کے متعلق تحقیقات کرتی۔ مگر مہاراجہ کو یہ کب گوارا تھا کہ انگریزی پولیس نابھہ کے شاہی محل میں آکر تحقیقات کرے۔ یہ تو بہت ہتک تھی۔ آخر کچھ دیر سوچنے کے بعد مہاراجہ نے سردار کاہلا سنگھ انسپکٹر جنرل پولیس نابھہ کے نام ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ کہ اس خط کو لانے والے ہری سنگھ نے سرکاری سامان کی چوری کی ہے اس کو تا حکم ثانی جیل بھیج دیا جائے۔ مہاراجہ نے یہ خط لکھ کر لفافہ میں بند کیا۔ اور لفافہ کی پشت پر سرخ لاکھ کے ساتھ مہریں لگائیں اور لفافہ تیار ہونے پر ہری سنگھ کو طلب فرمایا۔ اور حکم دیا۔ کہ یہ خط لے کر فوراً نابھہ چلے جاؤ۔ ضروری کام ہے۔ اور یہ خط سردار کاہلا سنگھ انسپکٹر جنرل پولیس کو پہنچاؤ۔ ہری سنگھ اس حکم کو سن کر بے حد خوش ہوا۔ کیونکہ کئی ماہ کے بعد سرکاری سفر خرچ پر نابھہ جا رہا تھا۔ ایک دو روز وہاں اپنے وطن رہ کر بیوی بچوں سے ملے گا۔ اس نے لفافہ کو نہایت احتیاط کے ساتھ پہلے ایک کاغذ میں لپیٹا اور پھر اس کو کپڑے میں تاکہ میلا نہ ہو اور بحفاظت نابھہ پہنچا سکے۔ چنانچہ یہ منصوری سے اپنا ٹرنک بستہ لے کر روانہ ہوا۔ ڈیرہ دون تک ڈانڈی (اس زمانہ میں منصوری تک موٹر نہ جاتی تھی۔ راجپورہ سے منصورہ تک ڈانڈی جاتی تھی۔ جس کو چار یا چھ آدمی اٹھایا کرتے تھے) میں گیا ڈیرہ دون سے ریل میں سوار ہو کر اگلے روز صبح نابھہ پہنچ گیا۔ نابھہ ریلوے سٹیشن پر اترا تو پہلے سیدھا انسپکٹر جنرل پولیس سردار کاہلا سنگھ کے مکان پر گیا۔ تاکہ سرکاری لفافہ کو پہلے وہاں پہنچا دے اور پھر اپنے گھر جائے اور سرکاری کام میں حرج نہ ہو۔ کیونکہ مہاراجہ نے کہا تھا۔ کہ یہ لفافہ ضروری

Marfat.com

ہے یہ بیچارا سردار کا ہار سنگھ کے مکان پر پہنچا تو اس نے ملازم کے ذریعے سردار صاحب کی خدمت میں اپنے منصوری سے آنے اور ایک ضروری لفافہ لانے کی اطلاع دی۔ ملازم نے سردار صاحب کو اطلاع دی تو سردار صاحب نے ہری سنگھ کو مکان کے اندر بلا لیا۔ ہری سنگھ نے نہایت ادب کے ساتھ سردار صاحب کو خط دیا۔ سردار صاحب نے خط کھولا اور پڑھا تو آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ باہر پہرہ پر پولیس کا سپاہی ہے (سردار صاحب کے مکان پر پولیس کا دن رات پہرہ رہتا تھا) اس کو بلاؤ۔ ملازم سپاہی کو بلا لایا۔ جب سپاہی آیا تو سردار صاحب نے سپاہی کو حکم دیا کہ ہری سنگھ کو ہتھکڑی لگا لو۔ ہری سنگھ پریشان کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ قابلِ اعتماد سمجھا جا کر منصوری سے کانفیڈنشل خط لایا ہے اور یہاں گرفتاری ہو گئی۔ یہ غریب رونے لگا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے داروغہ جیل کے نام روبکاری کی کہ ملازم ہری سنگھ بحکم سری حضور مہاراجہ صاحب مالوندر بہادر جیل میں بھیجا جاتا ہے اس کو تا حکم ثانی جیل میں قید رکھا جائے۔ کنسٹیبل پولیس اس روبکار اور ہری سنگھ کو لے کر جیل گیا اور ہری سنگھ بجائے اپنے گھر میں بال بچوں سے ملنے کے داروغہ صاحب جیل کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے کانٹا اور چمچہ کی چوری کے شاہی ملازم کو بغیر مقدمہ، بغیر سزا، بغیر اپیل یا بغیر کسی قانونی مشورہ یا فیصلہ کے قیدیوں کے ڈبے میں داخل کر دیا۔ جہاں کہ یہ بیچارا اسی حالت میں اس روز تک قید رہا۔ جب تک کہ مہاراجہ کی معزولی کے بعد انگریز ایڈمنسٹریٹر نابھہ میں نہیں پہنچ گیا اور اسی قسم کے بغیر کسی مقدمہ کے قید کیے گئے اسی کے قریب دوسرے شاہی قیدی رہا نہیں کیے گئے۔

ہری سنگھ نے اپنی قید کے زمانہ میں میرے پاس کئی بار جیل سے پیغام بھیجا۔ جس میں اس نے گرنتھ صاحب کی قسمیں کھائیں کہ اس کو چمچے اور کانٹے کا کچھ علم نہیں۔ یہ بے گناہ ہے۔ اور اس کی رہائی کے لیے میں مہاراجہ سے سفارش کروں مگر میں بے بس تھا۔ مہاراجہ سے کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ جس صورت میں کہ تمام ریاست کا ایک ملازم یا ایک اہلکار بھی ایسا نہ تھا جو اس اطمینان کے ساتھ رات کو سوتا ہو کہ اگلے روز جب سورج نکلے گا تو اس وقت وہ اپنے بستر پر ہی ہو گا جیل میں نہ ہو گا۔ یعنی ایک آدمی بھی تمام ملازموں میں ایسا نہ تھا چاہے وہ کتنا بھی بے گناہ اور معصوم کیوں نہ ہو جو اپنے آپ کو خطرہ میں نہ سمجھتا ہو۔

یہ تو ریاست نابھہ کا ایک واقعہ ہے جس کا مجھے ذاتی علم ہے مگر ہندوستان کی چھ سو ریاستوں میں شاید ہی کوئی ایسی ریاست ہو گی جس میں اس قسم کے جھوٹے لیے بنیاد اور بے معنی مقدمات نہ بنائے جاتے ہوں۔ اور سرکاری ملازم یا رعایا کے لوگ والئی ریاست کی ناراضی اور غصہ کا شکار ہوتے ہوتے "تا حکم ثانی" جیلوں میں نہ بھیج دیے جاتے ہوں۔ ریاستوں کے ایسے حالات میں یہ خواہش کرنا، کہ ریاستوں کی لعنت ہندوستان میں ہمیشہ قائم رہے۔ انتہائی حماقت تھی اور اگر انسانوں کی سول لبرٹی کی دنیا میں کوئی حیثیت ہے تو ریاستوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جانا ہی بہتر تھا۔

Marfat.com

ریاستی جرنلزم

ریاست دتیا میں ایک صاحب شیر خاں بارہ یا پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم تھے (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً پولیس میں کنسٹیبل تھے) آپ جب یہ دیکھتے کہ ہر ماہ دو چار ایڈیٹر صاحبان دتیا میں تشریف لاتے۔ سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرتے۔ اچھے سے اچھا کھانا کھاتے۔ موٹر یا دو گھوڑوں کی گاڑی ان کی سیر کے لیے موجود رہتی۔ دنیا کے بڑے سے بڑے سرکاری ملازم اگر وزیر اعظم یا مہاراجہ سے ملنا چاہیں تو ملنے کے لیے راستہ میں دقتیں۔ مگر یہ ایڈیٹر صاحبان جب دتیا آتے۔ وزیر اعظم یا مہاراجہ نے فوراً ان سے ملاقات کی۔ اور دو چار یا پانچ روز سرکاری مہمان رہنے کے بعد جب واپس جانے لگتے تو ان کو پچاس یا سو یا دو سو روپیہ بطور رخصتانہ دیا جاتا۔ شیر خاں صاحب نے سوچا کہ اس بارہ پندرہ روپیہ ماہوار کی ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ ایڈیٹری کا پیشہ سب سے اچھا ہے۔ جس کے خلاف چاہو لکھو۔ ایڈیٹر صاحب کہلاؤ۔ ریاستوں کے دورے کرو۔ اچھا کھاؤ۔ رخصتانے وصول کرو۔ والیانِ ریاست اور حکام سے ملاقاتیں۔ سینماؤں کے پاس مفت۔ دعوتوں اور تقریبوں میں شمولیت۔ اور عزت و وقار۔ آپ نے ملازمت چھوڑ دی اور دتیا سے سولہ میل کے فاصلے پر جھانسی تشریف لے آئے۔ سنٹرل انڈیا کے رہنے والے تھے۔ ہندی جانتے تھے۔ آپ نے ہندی زبان کے اخبار (مجھے ٹھیک نام یاد نہیں رہا۔ اس اخبار کا نام غالباً "ریاستی سنسار" یا "ریاستی پرجا" تھا) کا ڈیکلریشن کلکٹر جھانسی کی عدالت میں داخل کر دیا اور اخبار نکال لیا۔ اخبار نکالنے کے علاوہ آپ نے کھدر پہن لیا۔ جھانسی میں کانگرس قائم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی کانگرس میں بالکل وہی پوزیشن تھی جو پاکستان کے حق میں بیانات دینے والے کسی ہندو یا ہندوستان کی مکمل آزادی کے حق میں مضمون لکھنے والے ایک انگریز کی ہو سکتی تھی۔ جھانسی کے کانگرسیوں نے بھی ان کے مسلمان ہونے کے باعث ان کا کانگرس میں آنا غنیمت سمجھا۔ چنانچہ آپ اب شیر خاں پولیس کانسٹیبل دتیا نہ تھے بلکہ مسٹر شیر خاں ایڈیٹر "ریاستی سنسار" و ممبر کانگرس کمیٹی جھانسی تھے۔

مسٹر شیر خاں نے اخبار نکالنے کے بعد ریاستوں کے خلاف اور حق میں لکھنا شروع کیا اور گو اخبار ہفتہ وار تھا مگر ایڈیٹر صاحب کو ریاستوں کے دورے پر بھی جانا ہوتا۔ اس لیے اخبار کبھی کبھی نکلتا۔ آپ کا کام اچھا چل نکلا۔ تمام اخراجات نکالنے کے بعد آپ اس کاروبار میں اتنا بچا لیتے جتنی ایک سینئر گریڈ کے انسپکٹر پولیس کو تنخواہ ملتی ہے۔ یعنی ان کی آمدنی دتیا کی ملازمت سے کہیں زیادہ تھی۔

شیر خاں صاحب ریاستوں کا دورہ کرتے بیکانیر تشریف لے گئے۔ مرحوم مہاراجہ بیکانیر کا دور تھا۔ مہاراجہ بہت بڑے مطلق العنان جو سوائے انگریزوں کے دوسرے کسی شخص کو انسان ہی نہ سمجھیں اور کھدر کے ہر تار میں بغاوت کی بو محسوس کریں۔ آپ جب بیکانیر پہنچے۔ اور

Marfat.com

پولیس نے ایک کھدر پوش کو گاندھی ٹوپی پہنے دیکھا تو آپ کو بغیر کچھ دریافت یا تحقیقات کیے گرفتار کر لیا گیا اور حوالات میں بند کر دیا گیا (یعنی آپ ریاستوں کے دورہ میں بھی سرکاری مہمان ہُوا کرتے اور اب بھی سرکاری مہمان۔ فرق صرف یہ کہ پہلے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں مگر اب حوالات میں) حوالات میں بند کر دینے کے بعد پولیس نے حکام کو رپورٹ کی کہ ایک گاندھی ٹوپی والے کھدر پوش کو گرفتار کیا گیا ہے جو اپنا نام شیر خاں اور اپنے آپ کو جھانسی کے کسی اخبار کا ایڈیٹر بتاتا ہے۔ یہ رپورٹ تحقیقات کے لیے جھانسی پولیس کے پاس گئی۔ وہاں سے دس بارہ روز میں جواب آیا۔ کہ شیر خاں معمولی اور بے ضرر آدمی ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ ریاستوں کا دورہ کر کے گداگری کرتا ہے۔ اس کو نہ کوئی اہمیت حاصل ہے اور یہ خطرناک آدمی ہے۔ اس جواب کے آنے کے بعد بیکانیر پولیس نے شیر خاں صاحب کو چھوڑ دیا اور زبانی حکم دیا۔ کہ فوراً ریاست بیکانیر سے چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ بیکانیر سے واپس دہلی تشریف لائے۔ یہاں سرائے احمد پائی میں ٹھہرے اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد دوپہر کو دفتر "ریاست" میں پہنچے تاکہ ریاست بیکانیر کے ظلم اور زیادتی کے خلاف ایجی ٹیشن پیدا کی جائے۔ یہ بزرگ جب ایڈیٹر "ریاست" سے ملے تو ایڈیٹر "ریاست" نے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد یہ محسوس کیا۔ کہ یہ بے وقوف کلاس کے سادہ لوح مگر اچھے آدمی ہیں۔ پانچ سات روز ان کے ساتھ دلچسپی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ تفریح کا وقت گزارنے کے اعتبار سے مفید ہوں گے۔ تمام حالات سننے کے بعد آپ سے درخواست کی گئی۔ کہ اس وقت تو کام زیادہ ہے آپ شام کو تشریف لائیے۔ چائے بھی یہاں پیجیے اور باتیں بھی کریں گے۔ اس زمانہ میں دن بھر کام کرنے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے شام کا وقت تفریح کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ چائے پر دو تین دوست آ گئے۔ چائے کے بعد موٹر میں سینما یا سیر کے لیے چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد دوستوں کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور سو گئے۔ یعنی شام کو چھ بجے سے نو دس بجے رات تک گپ بازی اور سیر و تفریح ہوتی۔ شیر خاں صاحب شام کو چھ بجے تشریف لائے تو اس وقت ایڈیٹر "ریاست" کے ایک دوست مسٹر محمد یوسف بیٹھے تھے۔ یوسف صاحب اس زمانہ میں قریب قریب ہر روز شام کو آیا کرتے تھے۔ شیر خاں صاحب تشریف لائے تو میں نے انٹروڈیوس کرایا۔ مسٹر شیر خاں صاحب ایڈیٹر "ریاستی سنسار" جھانسی اور میرے دوست مسٹر محمد یوسف۔ شیر خاں صاحب بیٹھ گئے۔ چائے آئی۔ چائے پی رہے تھے تو باتیں شروع ہوئیں۔ مسٹر شیر خاں نے یوسف صاحب سے پوچھا۔ کہ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں مسٹر یوسف ابھی جواب نہ دے سکے تھے تو میں نے شرارتاً بات کاٹ کر کہا۔ اوہ! مجھے افسوس ہے۔ میں پورے طور پر تعارف نہ کرا سکا۔ بھول گیا۔ آپ کا نام خاں صاحب مسٹر محمد یوسف ہے اور آپ ولی عہد جوناگڑھ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں۔ ولی عہد صاحب کے ساتھ دہلی تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت گہرے دوست ہیں اور میڈن ہوٹل میں ولی عہد صاحب کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور آپ مسٹر شیر خاں صاحب ہیں۔ جھانسی کے مشہور اخبار "ریاستی سنسار" کے ایڈیٹر ہیں۔ جھانسی

Marfat.com

کانگریس کے لیڈر ہیں اور آپ کا اخبار تمام سنٹرل انڈیا اور راجپوتانہ میں بہت باثر سمجھا جاتا ہے اس اخبار میں ریاستوں کے متعلق ہی مضامین ہوتے ہیں۔ ابھی حال میں آپ بیکانیر گئے تھے۔ وہاں سے واپس تشریف لائے ہیں اور اب اپنے ہیڈ کوارٹر جھانسی تشریف لے جائیں گے۔ یوسف صاحب غیر معمولی ذہین آدمی ہیں۔ فوراً سمجھ گئے کہ ان حضرت کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ تاکہ وقت تفریحاً اچھا گزر جائے۔ آپ فوراً اٹھے اور آپ نے شیر خاں صاحب سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور کہا۔ کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بعد ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ جب چائے پی چکے تو شیر خاں نے ایڈیٹر "ریاست" سے کان میں کہا۔ کہ ذرا دوسرے کمرے میں چلیے۔ کچھ پرائیویٹ بات کرنی ہے۔ میں شیر خاں صاحب کو لے کر برآمدہ میں آگیا تو آپ نے فرمایا:

"خاں صاحب! مسٹر یوسف آپ کے گہرے دوست ہیں۔ آپ کا اشارہ ہی کافی ہوگا۔ اگر آپ ان سے کہہ دیں تو یہ کچھ روپیہ مجھے دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اس وقت میرے پاس صرف چھ روپیہ ہیں۔ میں جھانسی جاؤں گا تو میرے پاس کوئی پیسہ نہ ہوگا۔ جانے کے بعد اخبار کا پرچہ نکالنا ہے۔ جو روپیہ جھانسی سے لے کر چلا تھا سفر میں تمام خرچ ہوگیا۔ بیکانیر سے ایک پیسہ نہ ملا بلکہ تکلیف مفت کی ہوئی۔ آپ کا احسان ہوگا۔ اگر آپ ان سے کچھ روپیہ لے دیں گے اور سفارش کریں گے۔"

میں نے جواب دیا:

"شیر خاں صاحب! یہ ریاستوں کے لوگ بہت بے ایمان ہیں۔ شرافت کے ساتھ ایک پیسہ نہیں دیتے۔ ان سے طریقہ کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے! یہ میرے دوست ہیں میں ان کے خلاف کچھ لکھ نہیں سکتا۔ ولی عہد جوناگڑھ کے یہ پرائیویٹ سیکرٹری ہیں۔ مگر ولی عہد کو طوائفوں کی چاٹ لگ رہی ہے۔ پرسوں یہ ولی عہد کو ایک طوائف کے ہاں لے گئے تھے وہاں اڑھائی ہزار روپیہ اڑا دیا۔ مگر ایڈیٹروں کے لیے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ خیر دیکھئے سوچیں گے۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔"

طوائف کے ہاں جانے کا نام سن کر یہ اچھل پڑے اور کہا:

"اس طوائف کا کیا نام ہے مجھے بتائیے۔ میں ایک پمفلٹ لکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ یہ کس طرح روپیہ نہیں دیتے۔ ان لوگوں کے پاس رنڈی بازی کے لیے ہزارہا روپیہ ہے مگر اخبارات کے ایڈیٹروں کے لیے ایک پیسہ نہیں۔"

اس زمانہ چاوڑی بازار کی طوائفوں میں ایک طوائف ہما کی بہت شہرت تھی۔ یہ خوبصورت بھی بہت تھی اور گاتی بھی اچھا تھی۔ اس لیے والیانِ ریاست کے ہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ میں نے اسی کا نام لے دیا۔ اس "کانفیڈنشل" گفتگو کے بعد ہم لوگ پھر کمرہ کے اندر چلے گئے۔ یوسف صاحب سگریٹ پی رہے تھے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو میں نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا اور یوسف صاحب:

Marfat.com

رجن کو میں نے اب یوسف صاحب نہیں، خاں صاحب کہنا شروع کیا) سے کہا۔

"خاں صاحب۔ مسٹر شبیر خاں کا اخبار بہت بااثر ہے۔ ہندی زبان میں ہے اور تمام سنٹرل انڈیا، راجپوتانہ اور سی پی میں پڑھا جاتا ہے۔ دیکھئے آپ طوائفوں کے ہاں اتنا روپیہ برباد کرتے ہیں۔ پرسوں رات کو اڑھائی ہزار روپیہ ہما طوائف کے ہاں خرچ کر آئے۔ آپ مہربانی فرما کر ولی عہد سے کہیئے کہ وہ شبیر خاں صاحب کو بھی کچھ دیں۔ شبیر خاں صاحب اپنے اخبار میں آپ کی ریاست کی تعریف کریں گے ولی عہد اور آپ کا فوٹو چھاپ دیں گے اور یہ ہمیشہ آپ کا پراپاگنڈہ کریں گے۔"

مسٹر یوسف ایسے ڈراموں میں پارٹ کرنا خوب جانتے ہیں۔ آپ نے میری بات سن کر جواب دیا:

"ہم اردو اور ہندی اخبارات کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ ان اخبارات کی قیمت ہی کیا ہے۔ یہ خلاف لکھیں تو ہمیں پروا نہیں۔ حق میں لکھیں تو ہم خیال نہیں کرتے۔ ہم تو ان ایسے چھوٹے چھوٹے اخبارات کو گداگر سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ناگرہ دربار میں اگر اثر ہے تو بمبئی کے "ٹائمز آف انڈیا" یا "السٹریٹیڈ ویکلی" کا اور کچھ تھوڑا بہت "بمبئی کرانیکل" کا۔ جھانسی کے اخبارات کی کیا حیثیت ہے۔ میں ولی عہد بہادر سے سفارش نہیں کر سکتا۔"

مسٹر یوسف کے منہ سے جھانسی کے اخبارات کی توہین کے الفاظ کا نکلنا تھا کہ شبیر خاں صاحب جوش میں آ گئے اور آپ نے ذرا زیادہ بلند آواز سے کہا۔

"میں ایڈیٹروں کی توہین نہیں سن سکتا۔ آپ لوگ والیان ریاست کو بدمعاشی سکھاتے ہیں۔ آپ نے دہلی کے چاوڑی بازار میں ہزاروں روپیے ناجائز صرف کیئے۔ یہ روپیہ ریاستوں کی پبلک کا تھا۔ آپ کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ کہ روپیہ اس طرح برباد کرتے۔ میں اپنے اخبار میں تو پھر لکھوں گا۔ آپ کو کل ہی بتاؤں گا۔ کہ آپ دہلی میں کیا کر رہے ہیں۔ میں ابھی ایک پمفلٹ لکھتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ایڈیٹروں کے قلم میں کتنا زور ہے۔ میں نے مہاراجہ گوالیار کو سیدھا کر دیا۔ مہاراجہ دتیا میرے اخبار سے خوف کھاتے ہیں آپ کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

شبیر خاں صاحب کے اس غصہ کو دیکھ کر میں اور یوسف صاحب بصد مشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکے اور اس ڈراما کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے میں نے کہا۔ میری پوزیشن بیحد نازک ہے۔ خان صاحب آپ بھی میرے دوست ہیں اور شبیر خاں صاحب آپ بھی میری برادری کے جرنلسٹ ہیں۔ میرے مکان پر آپ لوگوں کا جھگڑا ہونا مناسب نہیں۔ خدا کے لیے یہاں تُو تُو میں میں نہ کیجئے۔ بہتر تو یہ ہے خاں صاحب آپ شبیر خاں صاحب کی روپیہ سے امداد کیجئے۔ یہ جرنلسٹ ہیں۔ آپ کی ہمیشہ تعریف کریں گے

ان کا اخبار بہت با اثر ہے۔ اور یہ یو۔پی کی کانگرس کے لیڈر بھی ہیں۔ آپ کے لیے مفید ہوں گے مسٹر یوسف نے پھر وہی کہنا شروع کیا۔ کہ آپ اخبارات کی پروا نہیں کرتے۔ اخبارات کے ایڈیٹروں سے طوائفیں اچھی ہیں۔ طوائفوں میں کچھ تو کیریکٹر ہے مگر اردو و ہندی اخبارات کے ایڈیٹر تو انسانی کیریکٹر سے بکلی محروم ہیں۔ آج حق میں لکھتے ہیں تو کل خلاف۔ پرسوں پھر حق میں لکھتے ہیں تو اگلے روز پھر خلاف جب کافی دیر جھگڑا ہوتا رہا۔ تو میں نے کہا۔ کہ اچھا آج تو اس میٹنگ کو ختم کیا جائے۔ کل شام کو فیصلہ کریں گے۔ میں نے یوسف صاحب اور شبیر خاں صاحب دونوں سے درخواست کی۔ کہ کل شام کو پھر چائے پر تشریف لائیے تاکہ ٹھنڈے دل کے ساتھ بات چیت کی جا سکے۔

شبیر خاں صاحب تو سرائے احمد پانی میں چلے گئے۔ میں اور یوسف صاحب موٹر میں سیر کے لیے نئی دہلی گئے۔ راستہ میں شبیر خاں صاحب کی بے وقوفی کا ہی ذکر رہا۔ کیونکہ جوناگڑھ کے ولی عہد بچارے تو ابھی نابالغ بچے تھے اور شاید کسی سکول میں پڑھتے ہوں گے۔ اور یوسف صاحب کا جوناگڑھ سے کوئی تعلق نہیں مگر ایڈیٹر صاحب "ریاستی سنسار" پمفلٹ اور اخبار میں لکھنے کے لیے آستینیں چڑھا رہے ہیں۔

اگلے روز شام کو شبیر خاں صاحب اور یوسف صاحب چائے پر پھر تشریف لائے شبیر خاں صاحب نے مجھے کمرہ سے باہر لے جا کر بتایا۔ کہ وہ تمام رات جاگتے رہے۔ رات رات میں آپ نے ولی عہد جوناگڑھ کے خلاف ہندی میں ایک پمفلٹ لکھا۔ یہ پمفلٹ صبح ختم ہوا۔ تو یہ ایک پریس میں گئے۔ وہاں دو روپیہ پیشگی دے کر اس پمفلٹ کو کمپوز کرنے دے آئے ہیں۔ دو دن میں پروف مل سکے گا۔ ان سے بات کرنے کے بعد میں اور شبیر خاں کمرہ کے اندر آئے۔ چائے لائی گئی اور باتیں شروع ہوئیں تو میں نے یوسف صاحب سے پوچھا۔ فرمائیے۔ ولی عہد صاحب اچھے ہیں۔ کیا پروگرام رہا۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا۔ ہاں اچھے ہیں۔ رات کو سینما گئے تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ آئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں ڈنر تھا۔ وہاں رقص کی محفل گرم تھی۔ نصف درجن کے قریب طوائفیں تھیں۔ رات کو مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں ہی ایک بج گیا۔ آج جوہری آئے ہوئے تھے۔ اڑھائی لاکھ روپیہ کے قریب قیمت کے جواہرات خریدے ہیں۔ ولی عہد صاحب کو کچھ کمزوری کی شکایت ہے۔ حکیم محمد احمد خاں صاحب تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مقوی باہ ادویات دی ہیں۔ دو ہزار روپیہ تو حکیم صاحب کو فیس کا دیا اور ڈیڑھ ہزار روپیہ کا نسخہ تیار ہوگا۔ اس میں سونا، موتی اور جواہرات ڈالے جائیں گے۔ ولی عہد کے ساتھ ان کی بیوی بھی ہیں۔ ان کے لیے کپڑا خریدا گیا۔ لیلارام کی دکان کا بل بائیس ہزار روپیہ کا تھا۔ ایک ایک ساڑھی کا دو دو ہزار روپیہ لگایا گیا ہے۔ وغیرہ۔

جوں جوں یوسف صاحب اخراجات بتا رہے تھے۔ شبیر خاں صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ جب یوسف صاحب پچھلے دن کی تمام "کارگزاری" بتا چکے تو میں نے یوسف صاحب سے کہا کہ آپ اتنا روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ آپ کے پاس اخبارات کے ایڈیٹروں کے لیے کچھ نہیں۔ مجھے افسوس

Marfat.com

ہے کہ میرے مکان پر آپ لوگوں کا تعارف ہوا۔ آپ ہیں کہ شیر خاں صاحب کے لیے آپ کے جیب میں کچھ نہیں اور ادھر شیر خاں صاحب ہیں کہ آپ نے رات بھر جاگ کر آپ کے ولی عہد کے خلاف پمفلٹ لکھا جو پریس میں چھپنے کے لیے دے دیا گیا ہے۔ اگر یہ پمفلٹ چھپ گیا تو کتنی بدنامی کی بات ہو گی۔ نواب صاحب جوناگڑھ میرے متعلق کیا خیال کریں گے کہ میں نے تعارف کرایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیا کروں۔ میری پوزیشن بے حد نازک ہے۔ یوسف صاحب نے کچھ تیز ہو کر کہا۔ کہ ایک بار نہیں۔ ہزار بار پمفلٹ چھپیں۔ ہم پروا نہیں کرتے۔ اگر پمفلٹ چھپا تو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی معرفت اس کو ضبط کرایا جائیگا۔ اور پمفلٹ لکھنے والے کو جیل بھجوایا جائے گا۔ نواب صاحب بہادر جوناگڑھ کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بہت کافی اثر ہے۔ چائے پی جا رہی تھی۔ یوسف صاحب تیزی سے جواب دیتے تھے۔ شیر خاں صاحب غصہ میں آنکھیں سرخ کیے اپنے چہرہ سے انتقام لینے اور سیدھا کر دینے کا اظہار کر رہے تھے اور میں اپنی بنسی کو سختی کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر دونوں کو خاموش رہنے اور ٹھنڈے دل سے بات چیت کرنے کی درخواست کرتا تھا۔ آخر بہت کوشش کے بعد جب فضا کچھ پُرسکون ہوئی۔ تو یوسف صاحب نے دریافت کیا۔ کہ شیر خاں صاحب کتنا روپیہ چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ آپ جانیئے یا یہ۔ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ آپ خود ہی آپس میں فیصلہ کر لیجئے۔ اس پر شیر خاں صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں جو فیصلہ کروں ان کو منظور ہو گا۔ میں نے جواب دیا۔ میں اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ میرے انکار کرنے پر شیر خاں صاحب پھر مجھے بہلے گئے۔ اور پوچھا۔ کہ کتنا روپیہ کہا جائے۔ میں نے پہلے تو دخل نہ دینے کا بہانہ کرتے ہوئے انکار کیا۔ مگر جب انہوں نے پھر بھی میری رائے پوچھی تو میں نے کہا۔ کہ پچیس ہزار روپیہ طلب کرو۔ تو یہ پانچ ہزار تک آئیں گے اور میں اُن سے کہوں گا۔ کہ پانچ ہزار دے دیں۔ شیر خاں صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کو سو سو روپیہ کے پچاس نوٹ نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ پھر اندر آئے تو میں نے یوسف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ شیر خاں صاحب اس شرط پر پمفلٹ نہ لکھیں گے۔ اگر ان کو پچیس ہزار روپیہ دیا جائے۔ پچیس ہزار روپیہ کا نام سن کر یوسف صاحب پھر تیز ہوئے۔ اور کہا۔ کہ کیا گدڑ پریس کی قیمت پچیس ہزار روپیہ ہو سکتی ہے۔ جوناگڑھ میں تو درجنوں ایسے ایڈیٹر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ان کو پچاس یا زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دیا جاتا ہے اور آپ شیر خاں صاحب کو بطور خیرات زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ شیر خاں صاحب پانچ ہزار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پچاس روپیہ اور خیرات سن کر پھر تیز ہوئے۔ ادھر یوسف صاحب نے بھی تیزی دکھائی۔ میں دونوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ کہ خدا کے لیے میرے مکان پر تُو تُو میں میں نہ کرو۔ میری پوزیشن بہت نازک ہے۔ چنانچہ یہ شام بھی ان کے آپس میں جھگڑنے اور میرے صلح کی کوشش میں صرف ہوئی اور دو گھنٹہ کے بعد یہ ڈرامہ یہ کہہ کر ختم ہوا۔ کہ اگلے روز شام کو پھر بات چیت کی جائے۔ مسٹر شیر خاں اپنی سرائے کو تشریف لے گئے اور میں یوسف صاحب کے ساتھ موٹر میں سیر کو چلا گیا۔

اگلے روز شام کو شیر خاں صاحب پھر تشریف لائے۔ پمفلٹ کا پروف ان کے پاس تھا۔ یوسف

Marfat.com

صاحب ابھی نہ آئے تھے۔ اُن کے آنے سے پہلے باتیں ہوئیں تو میں نے ان کو تاکید کی کہ پچیس ہزار روپیہ ہی طلب کریں اور اس پر اَڑے رہیں۔ تو خان صاحب پانچ ہزار تک آئیں گے اور پمفلٹ دیکھ کر ان کے حواس اُڑ جائیں گے۔ شبیر خاں صاحب میری تجویز پر بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی آ گئے چائے منگائی گئی۔ چائے پیتے ہوئے کچھ باتیں شروع ہوئیں تو میں نے اپنی ہنسی کو بہت مشکل کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ کیا عرض کیا جائے۔ مجھے ایسی مشکل کے ساتھ زندگی میں کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ بہت پریشان ہوں شبیر خاں صاحب ہیں کہ ان کے پمفلٹ کا پروف بھی تیار ہو گیا اور یہ چھپنے کے لیے پریس میں کاغذ دے آئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے شبیر خاں صاحب سے کہا۔ کہ وہ پروف تو دکھایئے۔ شبیر خاں صاحب نے فخر، حوصلہ اور فاتحانہ انداز میں اپنے جیب میں سے پروف نکالا۔ یوسف صاحب بھی بہت مشکل کے ساتھ اپنی ہنسی ضبط کر سکے اور پروف کو دیکھ کر نفرت و حقارت کے ساتھ کہا۔ کہ وہ ایسے پمفلٹوں کی پروا نہیں کرتے چنانچہ پھر وہی پہلے اور دوسرے دن والا منظر۔ تُو تُو، مَیں مَیں۔ تیزی۔ ایک دوسرے پر الزامات۔ اُدھر پچیس ہزار کا مطالبہ۔ ادھر پچاس روپیہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ۔ مَیں دونوں سے ہاتھ جوڑ رہا ہوں اور یوسف صاحب سے رقم بڑھانے کی منتیں کر رہا ہوں۔ آخر یوسف صاحب بصد مشکل میری سفارش پر پانچ سو روپیہ تک پہنچے۔ شبیر خاں صاحب بار بار مجھے کمرہ سے باہر لے جاتے ہیں اور مشورہ لیتے ہیں کہ پانچسو روپیہ قبول کر لیں یا نہیں۔ میں نے اپنی ہنسی کو بہت مشکل کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے ان سے کہا۔ کہ پچیس ہزار سے کم پر بات نہ کیجئے۔ پمفلٹ کو دیکھ کر ان کا اندر سے تو پیشاب خطا ہو رہا ہے۔ صرف ظاہرا طور پر حوصلہ دکھا رہے ہیں۔ ہم لوگ پھر اندر آئے۔ پھر جھگڑا شروع ہوا۔ وہی تُو تُو، مَیں مَیں۔ یوسف صاحب کہتے ہیں۔ کہ وہ اخبارات کی پروا نہیں کرتے۔ شبیر خاں صاحب سیدھا کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ میں دونوں کی خوشامد کرتا ہوں۔ اور اپنی نازک پوزیشن بیان کرتے ہوئے درخواستوں پر درخواستیں کرتا ہوں کہ دوستانہ مصالحت کیجئے۔ یہ شام بھی اسی طرح پُر لطف صحبت میں بسر ہوئی اور پھر اگلے روز بات چیت کرنے کا فیصلہ ہوا۔

چار پانچ روز یہی کیفیت رہی تو آخر یوسف صاحب نے ایک پیسہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کر لو جو کرنا ہے اور بہت غصہ میں کہا۔ کہ وہ اس تمام واقعہ کی اطلاع پولیس اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو دیں گے۔ یوسف صاحب کے اس کہنے پر شبیر خاں صاحب بہت نرم ہوئے۔ آخر مجھے پھر باہر لے گئے۔ اور کہا کہ اچھا پانچ سو روپیہ ہی دلوا دو۔ میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ وہ میری ہنسی کو دیکھ کر حیران کہ معاملہ کیا ہے ہم لوگ اندر آئے۔ میری ہنسی کو دیکھ کر یوسف صاحب بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے شبیر خاں صاحب حیران کہ معاملہ کیا ہے۔ جو دونوں ہنس رہے ہیں۔ جب ہنسی ضبط نہ ہو سکی تو آپ نے بار بار ہنسی کا سبب پوچھا۔ تو آخر ان کو اصل واقعہ بتایا۔ کہ نہ تو یوسف صاحب ولی عہد جوناگڑھ کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں نہ ولی عہد دہلی میں ہیں۔ وہ بچارے نابالغ ہیں۔ کسی سکول میں پڑھتے ہیں۔ صرف تفریح کے لیے یہ ڈرامہ کھیلا گیا۔ شبیر خاں صاحب کو ایک تو پانچ ہزار روپیہ یا پانچسو روپیہ کے جانے کا صدمہ اور دوسرے

Marfat.com

اپنی بے وقوفی پر ندامت ۔ میں نے ان کی اس کیفیت پر پردہ ڈالنے کے لیے موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ لطائف سنائے ۔ جب فضا کچھ بدل گئی تو شیر خاں صاحب نے فرمایا ۔ کہ جب وہ دہلی تشریف لائے تھے تو ان کے پاس چھ روپیہ موجود تھے اور ان کا خیال تھا ۔ کہ وہ چھ روپیہ میں جھانسی پہنچ جائیں گے ۔ اس چھ روپیہ کی رقم میں سے دو روپیہ تو پریس والوں کو کمپوزنگ کے لیے پیشگی دے دیئے ۔ باقی چار روپیہ کھانے پر صرف ہو گئے ۔ اب ان کے پاس نہ تو سرائے والے کو دینے کے لیے کچھ ہے اور نہ جھانسی پہنچنے کے لیے کرایہ ۔ چنانچہ ان کو آٹھ روپیہ نذر کیے گئے ۔ تو وہ سرائے کا حساب صاف کر کے جھانسی پہنچے ۔ اس ڈراما میں میرا خیال ہے ۔ کہ ہم دونوں (بلکہ تینوں یوسف صاحب بھی) گھاٹے میں نہ رہے ۔ شیر خاں صاحب پانچ روز تک ہزار ہا روپیہ کے خیال سے خوش ہوتے رہے ۔ میں نے صرف آٹھ روپیہ خرچ کر کے پانچ روز ایسی تفریح حاصل کی جو ہزار ہا روپیہ صرف کرنے پر بھی میسر ہونی ممکن نہیں ۔ اور جو اب تک ناقابل فراموش ہے اور یوسف صاحب مفت میں مزے لیتے رہے ۔ شیر خاں صاحب کا اس کے بعد کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا ۔ عرصہ ہوا سنا تھا ۔ کہ آپ نے مہاراجہ گوالیار اور ریاست گوالیار کے ایک سیٹھ کے خلاف کئی مضامین لکھے ۔ اس سیٹھ سے بات چیت ہو رہی تھی ۔ کہ آپ ریاست گوالیار میں مزید گفت و شنید کے لیے چلے گئے ۔ ریاست گوالیار کی پولیس آپ کے خلاف تھی ۔ اس نے آپ کو گرفتار کر لیا ۔ سیٹھ صاحب نے توہین کا مقدمہ چلایا آپ دو سال کے لیے بند ہوئے اور گوالیار جیل میں رہے ۔

اخبار نویس ہوتے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اخبار نویسوں کی زندگی قابل رشک ہے اور دنیا ان کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی پارٹی جلسہ یا میٹنگ ہو تو اخبار نویسوں کو دعوت دی جاتی ہے اور ان کو عزت و احترام کے ساتھ قریب بٹھایا جاتا ہے ۔ تاکہ یہ لوگ اپنے اخبار میں اس پارٹی یا جلسہ کی تعریف کریں ۔ اور تصاویر چھاپیں اور سینما کے پاس بھی مفت دیئے جاتے ہیں مگر ذیل کے واقعات سے اندازہ ہو سکے گا ۔ کہ اخبار نویس اکثر ایک ہوا کی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً اس صورت میں جب کہ اخبار نویس کو صاف گو، بے لاگ، نڈر اور خطرہ برداشت کرنے والا یقین کیا جائے ۔

ایڈیٹر "ریاست" جعلی نوٹوں کے الزام میں لاہور سنٹرل جیل میں بھیجا گیا تو جیل میں داخل ہونے کے بعد اسے سب سے پہلے جیل کے دفتر میں لایا گیا ۔ تاکہ نام ۔ پتہ ۔ حلیہ وغیرہ لکھا جائے ۔ جیل کے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے نام وغیرہ لکھنا شروع کیا وہ پولیس سے آئے ہوئے میرے وارنٹوں کو بھی دیکھتا جاتا تھا اور نام، ولدیت اور سکونت وغیرہ بھی پوچھتا جاتا تھا ۔ جب وہ تعزیرات ہند کی لگائی گئی دفعہ والے خانے پر پہنچا تو اس خانہ میں چار دفعات تھیں ۔ نوٹ بنانے کا سامان

Marfat.com

رکھنا۔ نوٹ بنانا۔ نوٹ چلانا اور نوٹ قبضہ میں رکھنا اس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کون ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کبھی اخبارات بھی نہیں پڑھے۔ کیونکہ اخبارات پڑھتا تو اس کو مقدمہ کی کیفیت کا علم ہوتا۔ مقدمہ کی تفصیلات اخبارات میں چھپتی رہی تھیں۔ جب اس نے یہ دفعات دیکھیں تو اس نے مسکراتے ہوتے طنزاً کہا۔ اوہو! آپ کرنسی نوٹ بنانے کے جرم میں تشریف لائے ہیں۔ سنائیے سردار جی! کتنے نوٹ آپ نے بنائے۔" میں اس کم بخت کو کیا جواب دیتا۔ اور اگر کچھ کہتا بھی تو یہ میرا اعتبار کیوں کرتا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" اگر بنائے ہیں تو دو چار دس روپیہ کے مالیت کے نہ بنائے ہوں گے یقیناً" لاکھوں روپیہ کے بنائے ہوں گے۔ جو بناتا ہے لاکھوں روپیہ کے بناتا ہے۔" میرا یہ جواب سن کر میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ شرمندہ ہوا یا حیران۔ بہر حال یہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ اس کو توقع یہ تھی۔ کہ دوسرے تمام ملزموں کی طرح میں بھی اس سے کہتا۔ کہ "نہیں حضور! میں نے کہاں بنائے ہیں۔ مجھے ویسے ہی رشتہ داروں نے پھنسا لیا ہے وغیرہ" وہ میرے چہرے کی طرف غور اور حیرانی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ کہ اتنے میں جیل کے ایک دوسرے افسر آگئے جن سے میں پہلے مل چکا تھا اور جو میرے تمام حالات سے واقف تھے۔ یہ آئے تو انہوں نے حیرانی، افسوس، اخلاص اور محبت کے مجموعی جذبات کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور کہا" میں نے اخبارات میں آپ کے مقدمہ کے فیصلہ کے متعلق پڑھا تھا۔ مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔" اس افسر کا تپاک اور ہمدردی سے ملنا تھا۔ کہ حلیہ لکھنے والا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کچھ حیران سا ہو گیا۔ آپ نے دوسرے افسر سے پوچھا۔ کہ یہ کون ہیں تو اس افسر نے کہا" آپ کو علم نہیں۔ آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" ہیں۔ جن کے مقدمہ کا تمام ہندوستان میں چرچا ہے۔" یہ سن کر حلیہ لکھنے والے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے بھی کچھ ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا۔

اس مقدمہ سے پہلے میں ہمیشہ جیل میں اے کلاس میں رکھا جاتا رہا۔ مگر اس مقدمہ میں مجسٹریٹ دیوان سکھانند نے مجھے بی کلاس دی (یہ مجسٹریٹ ملتان کے رہنے والے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی دیوان شرد ھا نند کے دراما نویس میرے کئی برس کے دوست تھے اور مقدمہ کے دوران میں بھی دہلی میں دوسرے چوتھے روز اکثر ملا کرتے تھے اور یہ واقعہ پُر لطف ہے کہ ہائیکورٹ نے جب اس مقدمہ میں مجھے بری کیا اور ہائی کورٹ نے بحث سنتے ہوئے کھلی عدالت میں دیوان سکھانند کے "انصاف" کی بھی دھجیاں اڑائیں تو ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد دیوان سکھانند نے جب کہ آپ کرسمس کی چھٹیوں میں لاہور تشریف لائے ہوئے تھے تو میرے ایک عزیز دوست کو جو پنجاب میں سب جج تھے میری باعزت رہائی پر مبارک باد دی۔ نام اور حلیہ وغیرہ لکھنے کے بعد مجھے بی کلاس کے انچارج کے سپرد کیا گیا (اے اور بی کلاس میں فرق صرف یہ ہے۔ کہ اے کلاس میں قیدی جیسے کپڑے چاہے اپنی مرضی کے مطابق پہن سکتا ہے مگر بی کلاس میں کپڑے چاہے اپنے گھر سے سلوا تے جائیں سفید کھدر کے ہونے چاہئیں) بی کلاس کے وارڈ میں پہنچ کر میرے لیے چارپائی، نیا پانی اور الماری وغیرہ کا انتظام

Marfat.com

کیا گیا۔ جو بی کلاس کے ہر قیدی کو دی جاتی ہے۔

جیل میں پہنچنے کے بعد دو یا تین روز ہوئے تھے کہ میری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے جیل کے پریس میں لگائی۔ (جیل میں ہر قیدی کو بشرطیکہ قید محض نہ ہو یا نظر بندی نہ ہو، کام کرنا پڑتا ہے اور یہ کام اس کی پوزیشن کے مطابق دیا جاتا ہے) میں پریس انچارج کے پاس بھیجا گیا۔ پریس کے انچارج نے میری ڈیوٹی بطور کلرک ایک سیکشن میں لگائی۔ جہاں کہ پٹواریوں وغیرہ کے فارم چھپتے ہیں۔ میرے جیل میں جانے کے بعد دو دن کے اندر تمام سرکاری ملازموں اور قیدیوں کو میرے جیل میں پہنچنے کا علم ہو چکا تھا۔ میں جب اس سیکشن میں پہنچا۔ تو اس سیکشن کے انچارج (جو سرکاری ملازم تھے ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ لوگ ان کو شاہ جی کہتے تھے) نے میرے لیے ایک چھوٹا سا بنچ خالی کرایا اور اس پر بوریا اور ایک چادر بچھوا دی اور کہا۔ کہ تشریف رکھیے۔ کئی گھنٹے میں وہاں بیٹھا رہا۔ تو میں نے عرض کیا۔ کہ کوئی کام بتائیے۔ اس کے جواب میں شاہ جی نے فرمایا: "نہیں کوئی کام نہیں۔ کام ہو رہا ہے۔ آپ آرام کیجئے۔" یہ تمام دن میرا اس طرح بیٹھے گزر گیا۔ اگلے روز گیا تو پھر وہی کیفیت شاہ صاحب بہت تپاک سے ملتے۔ بہت خاطر کرتے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دن میں کئی بار پانی کے لیے پوچھتے۔ اگر میں کہتا ہاں۔ تو میرے لیے برف کا پانی منگایا جاتا۔ کوئی کام نہیں۔ دن بھر اس گدی دار بنچ پر بیٹھا رہتا۔ میں تنگ آ گیا۔ کہ وقت کس طرح گزرے۔ آخر تیسرے روز جب میں اس پریس میں کلرکی کرنے کے لیے گیا تو ساتھ ایک کتاب لے گیا۔ دن بھر یہ کتاب پڑھتا رہا۔ وہاں کے تمام لوگ مصروف۔ ایک لمحہ کے لیے آرام نہیں۔ مگر میں اس گدی دار بنچ پر مہنت بنا بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہوں۔ تین چار روز گزرے تو میں نے ایک دوسرے قیدی کو جو اس سیکشن میں کام کرتا تھا راز میں لے لیا۔ اور پوچھا۔ کہ یہ شاہ صاحب مجھے کوئی کام کیوں نہیں بتاتے۔ ویسے بڑے شریف ہیں۔ میری آسائش کا بہت خیال کرتے ہیں۔ بار بار ٹھنڈے پانی کے لیے پوچھتے ہیں۔ بجلی کا پنکھا چل رہا ہے اور مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ مجھے کوئی کام کیوں نہیں بتایا جاتا۔ میرے اس پوچھنے پر اس قیدی نے بتایا۔

"شاہ صاحب آپ کو بہت بڑا خطرناک آدمی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو یہاں کے حالات کا علم ہو گیا اور آپ جیل سے چلے گئے تو اپنے اخبار میں ان کی کمزوریوں کو بے نقاب کریں گے اور پھر شاید یہ موقوف ہو جائیں۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ آپ کو یہاں کے کسی راز کا علم ہو۔ اور یہ اسی کوشش میں ہیں کہ آپ کو کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کیا جائے۔"

یہ جواب سن کر میں حیران کہ کیا کروں۔ شاہ صاحب سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس قیدی نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے شاہ صاحب کے خیال سے آگاہ کیا۔ کتاب کہاں تک تمام دن پڑھتا رہوں بغیر کام کے وقت کا گزرنا مصیبت۔ اور جب شاہ صاحب سے کام کے لیے کہتا ہوں تو ارشاد

Marfat.com

ہوتا ہے کہ "تشریف رکھیئے۔ آرام کیجئے۔ کیا پیاس تو نہیں لگی۔"

ایک ہفتہ کے قریب اس سیکشن میں گزرا ہوگا۔ کہ شاہ صاحب نے پریس کے انچارج کو کانفیڈنشل رپورٹ کی جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ دیوان سنگھ اس کے سیکشن میں فالتو ہے۔ کام تھوڑا ہے اور آدمی زیادہ ہیں۔ اس لیے دیوان سنگھ کو کسی دوسرے سیکشن میں تبدیل کیا جائے۔ اس کانفیڈنشل رپورٹ کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ شاہ صاحب کے پاس حکم پہنچا۔ دیوان سنگھ کو دوسرے سیکشن میں (جہاں انگریزی کے فارم چھپتے تھے) بھیج دیا جائے۔ چنانچہ میں دوسرے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ اس سیکشن میں پہنچا تو وہاں بھی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ ایک چھوٹی بنچ پر اسی طرح سے گدی بچھا دی گئی اور ارشاد ہوا کہ آرام کرو۔ میں اس "آرام" سے تنگ ہوں مگر کوئی کام نہیں بتایا جاتا۔ تمام دن کتاب پڑھتے پڑھتے تنگ آ گیا جب کام کے لیے کہتا ہوں تو یہی ارشاد ہوتا ہے "آرام کیجئے۔ کوئی کام نہیں۔ آپ تو بہت اچھے اور لائق ہیں۔ آپ سے تو کام کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ گرمی ہے پانی پئیں گے۔ پیاس تو نہیں لگی" میں اس خاطر تواضع سے تنگ آ گیا۔ بغیر کام وقت نہیں گزرتا اور جب کام کے لیے کہتا ہوں تو انچارج صاحب مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں اور میری دلچسپی کے لیے دوسری باتیں شروع کر دی جاتی ہیں۔

دس روز کے قریب میں اس سیکشن میں بھی جاتا رہا۔ اس عرصہ کے بعد اس سیکشن کے انچارج نے بھی رپورٹ کی۔ کہ اس کے سیکشن میں کام کم ہے اور آدمی زیادہ ہیں۔ نئے آدمی یعنی دیوان سنگھ کو کسی دوسرے سیکشن میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ان کی رپورٹ پر میں جلد سازوں کے سیکشن میں تبدیل کیا گیا جس روز مجھے اس سیکشن سے دوسرے سیکشن میں تبدیل کیے جانے کا حکم ہوا تو جمعہ تھا۔ اس جمعہ کو میں صبح ہی جلد سازوں کے سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی میری بہت خاطر تواضع کی گئی۔ انچارج صاحب نے بجلی کے پنکھے کے نیچے میرے لیے گدی دار بنچ بچھوا دی۔ کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جب بیٹھا۔ تو میں نے عرض کیا۔ فرمائیے۔ کیا کام کروں۔ اس کے جواب میں سیکشن کے انچارج صاحب نے فرمایا:

"میرے دل میں آپ کے لیے بڑی عزت ہے۔ آپ نے تو ملک کے لیے بہت تکلیفیں برداشت کیں اور زندگی بھر مصائب کا مقابلہ کیا۔ آپ کا تو نیاز حاصل کرنا ہی خوش نصیبی ہے۔ آپ آرام کیجئے اگر فرمائیے تو پڑھنے کے لیے میں آپ کو اور کتابیں دوں۔ کیا ٹھنڈا پانی پیجئے گا" یہ انچارج بھی مسلمان تھے۔ پریس میں مسلمان افسروں کو دو بجے کے قریب جمعہ کی نماز کے لیے چھٹی ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد وہ واپس دفتر میں نہیں آتے۔ یعنی اس روز ان کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے۔ دو بجے کے قریب یہ صاحب آداب عرض کر کے نماز کے لیے چلے گئے۔ اور آپ نے فرمایا۔ کہ اب تو کل نیاز حاصل ہوگا۔ سنیچر کو میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے میں پریس میں نہیں گیا۔ اتوار کو پریس بند تھا۔ پیر یعنی سوموار کو سپرنٹنڈنٹ جیل تمام قیدیوں کو دیکھنے کے لیے ہر وارڈ میں آتے ہیں اور ہر قیدی کے پاس جاتے ہیں۔ تاکہ اگر کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو بتائی جائے۔ سپرنٹنڈنٹ کے اس دورہ کو پریڈ کہا جاتا ہے۔ سوموار کو صبح سپرنٹنڈنٹ جیل میجر شاہ ایک بزرگ بہت شریف، دیانت دار، نیک اور مذہبی خیال کے بزرگ تھے۔ قادیان کی احمدی

Marfat.com

جماعت کے پیشوا کے عزیزوں میں سے تھے۔ قیدیوں کے بہت ہمدرد تھے مگر ان کی دماغی کیفیت کچھ ایسی تھی۔ کہ جسے ومزیکل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی خیال آ جائے تو قیدی کے لیے سب کچھ کر دیں اور خیال نہ آئے تو قیدی کی کسی خواہش کی پرواز کریں۔ یہ ہمیشہ ہی میرے احساس کا خیال کرتے رہے)۔ "پریڈ" میں تشریف لائے تو میں نے ان سے کہا۔ کہ پریس کی بجائے اگر میری ڈیوٹی کسی اور جگہ لگادی جائے تو اچھا ہو۔ میجر شاہ نے فوراً حکم دیا۔ کہ میں اپنی رہائش والی جگہ پر ہی رہوں اور جو کام دینا ہو یہاں ہی دے دیا جائے۔

میں سوموار کو پریس میں نہ گیا اور اپنی رہائش والے وارڈ میں ہی رہا۔ مگر پریس کے دوسرے لوگوں سے معلوم ہوا ——— کہ سوموار کو جب جلد سازی والے سیکشن کے انچارج نے سنا۔ کہ میں اب پریس سے تبدیل کر دیا گیا ہوں تو اپنے ماتحت سے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ ایڈیٹر صاحب "ریاست" پریس سے چلے گئے۔ میں نے جمعہ کے روز نماز کے بعد دعا کی تھی۔ کہ یا اللہ ایڈیٹر "ریاست" کو کسی دوسرے سیکشن میں بھیجا جائے۔ مجھے خطرہ تھا۔ کہ اگر یہ یہاں کے تمام رازوں سے واقف ہو جاتا۔ تو نہ معلوم میرے لیے کیا مصائب پیدا ہوتیں۔ کیونکہ یہ شخص جس کے پیچھے پڑ جائے نہ صرف موقوف بلکہ قید کرانے تک جاتا ہے۔ اور کئی بڑے سرکاری افسروں کے لیے مصیبت کا باعث ثابت ہو چکا ہے"۔

پریس سے آنے کے بعد میں کئی ماہ جیل میں رہا۔ وہاں میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ کاغذات میں میرے ذمہ یہ کام تھا۔ کہ میں کاغذ نقی کرنے والے ٹیگ تیار کروں۔ بطور آرٹ اور تفریح کے میں نے یہ کام سیکھ لیا تھا اور بہت اچھے ٹیگ بنا لیتا تھا۔ مگر کام دینے والا شخص جیسا کام لاتا تھا ویسا ہی لغیر کیے اٹھائے جاتا تھا۔ مگر کاغذات میں درج ہوتا تھا۔ کہ میں نے بارہ سو ٹیگ تیار کیے۔ جیل والوں کی اس "مہربانی" کو گو میں دل سے ناپسند کرتا رہا کیونکہ یہ لوگ مجھے ہوّا سمجھتے ہوئے مجھ سے کام نہ لیتے۔ مگر میں پھر بھی ان کی اس مہربانی کا شکر گزار رہوں۔

جرنلزم کا روشن پہلو

میرے چچا سردار میوہ سنگھ کھنہ کے داماد لالہ ہنسراج ہیں۔ یہ گوجرانوالہ میں لوہے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے کارخانہ میں آئرن سیف لوہے کی الماریاں، لوہے کی کرسیاں اور لوہے کا دوسرا سامان تیار ہوتا تھا۔ لالہ ہنسراج اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ریاست اندور گئے۔ اور وہاں ایک سوداگر سے جو بوہرہ قوم میں سے تھے۔ انہوں نے دو سو آہنی کرسیوں کا آرڈر لیا۔ جب اس دورہ سے واپس آئے تو انہوں نے سوچا۔ کہ اگر دو سو کرسیاں بذریعہ ریل بھیجی گئیں۔ ان کی بلٹی بذریعہ وی پی گئی اور اس سوداگر

Marfat.com

نے یہ وی پی واپس کر دیا۔ تو نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ یہ دو سو کرسیاں اندور سے پھر واپس گوجرانوالہ منگانی پڑیں گی۔ ان کے بھیجنے اور واپس منگانے کا خرچ ادا کرنا پڑے گا اور کرسیاں الگ خراب ہوں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ کرسیاں فی الحال صرف دس بھیجی جائیں۔ تاکہ نقصان ہو تو زیادہ نہ ہو۔ جب دو سو کرسیوں کی قیمت وصول ہو جائے۔ تو پھر ایک سو نوّے کرسیاں بغیر وی پی معمولی بلٹی کے ذریعہ بھیج دی جائیں چنانچہ آپ نے دس کرسیاں اندور ریلوے سٹیشن کے لیے بلٹی کرا دیں۔ اور دو سو کرسیوں کی قیمت کا وی پی اس سوداگر کے نام بھیج دیا۔ اس سوداگر نے دو سو کرسیوں کی بلٹی کا وی پی وصول کر لیا اور اس نے کرسیاں لینے کے لیے جب اندور ریلوے سٹیشن پر آدمی بھیجا تو وہاں دو سو کی جگہ دس کرسیاں تھیں۔ چنانچہ اس سوداگر نے دس کرسیاں تو سٹیشن سے منگا لیں۔ اور فوراً ریاست اندور کی پولیس کو رپورٹ کی کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ دس کرسیاں بھیج کر دو سو کرسیوں کی قیمت بذریعہ وی پی وصول کر لی ہے اور ساتھ لالہ ہنسراج کو بھی لکھا کہ آپ پر فوجداری مقدمہ کیا گیا ہے کیونکہ آپ نے دھوکا کیا۔ لالہ ہنسراج کی نیت گو خراب نہ تھی۔ اور انہوں نے نقصان سے بچنے کے لیے ایسا کیا مگر جہاں تک قانون کا سوال ہے۔ مقدمہ صاف تھا اور جرم ثابت۔ لالہ ہنسراج کو جب مقدمہ کی اطلاع ہوئی تو وہ پریشان ہوئے اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اب بقایا ایک سو نوّے کرسیاں بھیجی جائیں یا نہیں۔ انہوں نے وکیلوں سے مشورہ لیا۔ وکیلوں کے مشورے مقدمہ کو بیچیدہ بنانے کے حق میں ہوتے ہیں ان کو بتایا گیا۔ کہ اگر اب انہوں نے بقایا کرسیاں بھیجیں تو مستغیث کو جرم کا مزید ثبوت مل جائے گا۔ مقدمہ کے دوران میں کرسیاں اب نہ بھیجنی چاہئیں۔ چنانچہ لالہ ہنسراج نے وکیلوں کی اس رائے پر عمل کیا اور فیصلہ کیا۔ کہ مقدمہ کے بعد کرسیاں بھیجی جائیں۔

ادھر اندور پولیس نے مقدمہ دھوکہ کے جرم میں اندراج رجسٹر کیا۔ قانونِ حوالگی یعنی ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے ماتحت وارنٹ گرفتاری ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو بھیجے گئے۔ ایجنٹ گورنر جنرل نے وارنٹوں پر تصدیق کر کے یہ وارنٹ پنجاب گورنمنٹ کو بھیجے۔ کہ ملزم کو گرفتار کر کے ریاست اندور کے حوالے کیا جائے۔ لالہ ہنسراج کے تعلقات گوجرانوالہ پولیس کے کئی اصحاب کے ساتھ ذاتی دوستانہ تھے۔ وارنٹ جب گوجرانوالہ پہنچے تو ان پر پولیس سے لکھوا دیا گیا۔ کہ ملزم موجود نہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔ اس کے بعد وارنٹ پھر آئے۔ پھر ایسا ہی لکھا گیا۔ اس عرصہ میں لالہ ہنسراج نے ہائی کورٹ میں درخواست کی کہ ان کو ریاست اندور کے حوالہ نہ کیا جائے۔ ہائیکورٹ نے دخل دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ایکسٹراڈیشن ایکٹ کے مطابق پولیٹیکل ایجنٹوں کے اختیار میں تھا کہ وہ انگریزی علاقہ سے جس ملزم کو چاہیں منگا لیں۔ کوئی عدالت اس میں دخل نہیں دے سکتی تھی۔

لالہ ہنسراج کے وارنٹ جب تین بار واپس چلے گئے تو ریاست اندور کے انسپکٹر جنرل پولیس نے محسوس کیا۔ کہ وارنٹ گوجرانوالہ پولیس سے مل ملا کر واپس کئے جاتے ہیں۔ اس نے اپنا ایک سب انسپکٹر اس کام کے لیے مقرر کیا اور وارنٹ دستی دیئے کہ ملزم کی گرفتاری کے لیے گوجرانوالہ بھیجا۔ یہ سب انسپکٹر

Marfat.com

جب گوجرانوالہ پہنچا تو وہاں ایک مزید حماقت کی گئی۔ اس خیال سے کہ اندور پولیس کا کوئی شخص دوبارہ گوجرانوالہ نہ آئے۔ اس سب انسپکٹر کے پیچھے غنڈے لگا دیئے گئے۔ تاکہ وہ اس کو تنگ کریں۔ ان غنڈوں نے سب انسپکٹر کو مارا بھی۔ یہ سب انسپکٹر جب واپس اندور پہنچا تو اس نے انسپکٹر جنرل پولیس کو تمام حالات بتائے انسپکٹر جنرل پولیس کو قدرتی طور پر یہ حالات سن کر غصہ آنا چاہیئے تھا۔ اس نے تمام واقعہ کی رپورٹ ریاست کے اعلیٰ افسروں کو کی۔ انہوں نے یہ رپورٹ ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو بھیجی اور معاملہ نازک سے نازک تر صورت اختیار کر گیا۔ کیونکہ ریذیڈنسی نے محسوس کیا۔ کہ نہ صرف اس کے حکم اور وارنٹوں کی تعمیل نہیں گئی بلکہ سب انسپکٹر کو بھی مارا۔ اور اس کی ہتک کی گئی۔ چنانچہ ایجنٹ گورنر جنرل نے نہایت سختی کے ساتھ ان تمام واقعات کے متعلق پنجاب گورنمنٹ کو لکھا۔

جب حالات یہاں تک نازک ہو گئے تو مسٹر ہنسراج نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ یا تو افغانستان کو چلا جائے یا نیپال کو۔ تاکہ ریاست اندور میں وہاں کی پولیس کے انتقام کا شکار نہ ہو۔ اس نے گوجرانوالہ سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی تیاری کر لی۔ اس کے کئی بچے۔ بیوی اور ضعیف والدہ۔ گھر میں ایک کہرام سا پیدا ہو گیا۔ ان حالات کی اطلاع جب ہنسراج جی نے اپنے خسر یعنی میرے چچا سردار میوہ سنگھ کو حافظ آباد بھیجی تو وہ بھی پریشانی کے عالم میں اپنے بیٹے سردار ہوشیار سنگھ کے ساتھ گوجرانوالہ پہنچے کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کہ اس مصیبت سے چھٹکارا کیوں کر ہو۔ صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ تو میرے چچا سردار میوہ سنگھ کو خیال آیا۔ کہ دیوان سنگھ کا اخبار ریاستوں کے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا اندور میں کسی افسر سے کوئی تعلق ہو اور وہ مفید ہو سکے۔ مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا۔ کہ دیوان سنگھ سے ملنا چاہیئے۔ چنانچہ سردار ہوشیار سنگھ اور مسٹر ہنسراج دونوں اسی شام گوجرانوالہ سے روانہ ہو کر دہلی ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پہنچے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے تمام حالات بتائے تو میں نے ان سے وعدہ کیا۔ کہ جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکے گا میں کروں گا۔ اس زمانہ میں مرحوم لالہ دینا ناتھ ایڈیٹر "دیش" و "ہندوستان" لاہور، دہلی میں مقیم تھے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ بھی تشریف لائے۔ وہ بہت جہاندیدہ اور تجربہ کار تھے۔ جب انہوں نے تمام حالات سنے تو وہ مجھے الگ لے گئے۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ یہ رشتہ داری کا معاملہ ہے۔ اگر تو لالہ ہنسراج اس مقدمہ سے نکل گئے تو یہ رشتہ دار کہیں گے کہ معاملہ بالکل معمولی تھا۔ اور اگر ہنسراج جی کو نقصان پہنچا۔ تو یہ کہیں گے کہ مقدمہ تو کچھ نہ تھا مگر دیوان سنگھ نے نقصان پہنچایا۔ یہ رشتہ دار ہمیشہ تاریک پہلو دیکھتے ہیں۔ حالت خطرناک ہے اور میں اس میں کوئی حصہ نہ لوں۔ لالہ دینا ناتھ کی دلیل معقول تھی۔ ان کی رائے سننے کے بعد میں سوچنے لگا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔

ایسا نہ ہو کہ لالہ ہنسراج کو نقصان پہنچے اور یہ لوگ مجھے نقصان پہنچانے کا ذمہ دار قرار دیں۔ میں اس رات اسی کشمکش میں تھا۔ کہ سوچتا رہا۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ادھر لالہ ہنسراج اور سردار ہوشیار سنگھ دونوں بے چین۔ ہنسراج جی کے مستقبل کا سوال۔ کہ وہ آئندہ زندگی کے دن کہاں بسر کریں گے جہاں کہ گرفتار نہ کیے جا سکیں۔ بہت پریشانی۔ میں نے جب ان کو پریشان دیکھا تو فیصلہ کیا۔ کہ نتیجہ چاہے کچھ ہو مجھے

Marfat.com

قدم اٹھانا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد اندور سر ایس۔ این باپنا وزیر اعظم کو تار بھیجا کہ میں اگلے روز بعد دوپہر اندور پہنچ رہا ہوں اور رات کو میں بی۔ بی اینڈ سی آئی ایکسپریس میں لالہ ہنسراج اور سردار ہوشیار سنگھ دونوں کے ساتھ اندور روانہ ہو گیا۔ ہم تینوں اگلے روز بعد دوپہر اندور پہنچے۔ اندور سٹیشن پر ہمارے لیے سرکاری موٹر اور مہمان خانہ کے دو ملازم موجود تھے۔ ہم تینوں اس کار میں سوار ہو کر ایک کوٹھی میں پہنچے جو سرکاری مہمان خانہ تھی۔ اس مہمان خانہ میں پہنچتے ہی گیسٹ ہاؤس کے انچارج مجھ سے ملے تو میں نے ان سے کہا کہ میں رات کی گاڑی سے واپس دہلی جانا چاہتا ہوں۔ آپ ابھی باپنا صاحب کے پاس چلے جایئے اور ان سے پوچھیئے۔ کہ میں ان سے کس وقت مل سکتا ہوں۔ میں نے جب یہ کہا۔ تو گیسٹ ہاؤس کا انچارج میرے منہ کی طرف حیرانی کے ساتھ دیکھنے لگ گیا اور اس نے کہا: "آپ اتنی جلدی دیوان صاحب سے نہیں مل سکتے۔ اس سے پہلے لوگ آٹھ آٹھ دس دس دن سے منتظر بیٹھے ہیں۔ ان کو موقع نہیں مل سکا۔ یہ ممکن ہی کیونکر ہے کہ آپ دو چار روز میں بھی مل سکیں۔"

میں نے جب گیسٹ ہاؤس کے انچارج کا یہ جواب سنا تو میں نے اس سے کہا۔ کہ اگر باپنا صاحب جلدی نہیں مل سکتے تو میں لازمی طور پر رات کو دو بجے کی گاڑی سے واپس دہلی چلا جاؤں گا۔ میرے کام کا ہرج ہو گا۔ بغیر باپنا صاحب کو اطلاع کیے میرا واپس جانا مناسب نہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ میرا یہ پیغام باپنا صاحب تک پہنچا دیں۔ ورنہ میں اگر رات کو چلا گیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ ریاستوں کے ملازم غلام ابن غلام۔ ان کے اندر جرات کی کمی۔ یہ بیچارا کرے بھی تو کیا۔ مجھے کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس میں جرات کہ باپنا صاحب کو اطلاع دے۔ اس نے اپنے افسر یعنی سپرنٹنڈنٹ محکمہ مہمان داری کو ٹیلی فون کیا۔ وہ تشریف لائے۔ میں نے ان سے بھی یہی کچھ کہا۔ کہ میں رات کو دو بجے کی گاڑی سے واپس جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بتایا۔ کہ ایک ہفتہ سے پہلے وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن نہ ہو گا۔ کیونکہ کئی کئی روز سے لوگ منتظر بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ باپنا صاحب کو اطلاع کر دیجئے۔ اگر پھر بھی ان کا ملنا جلدی ممکن نہ ہوا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ میرے لیے زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا ممکن نہ ہو گا۔ ان بیچاروں میں بھی زیادہ جرات نہ تھی۔ مگر یہ مجبور تھے یہ سہمے ہوتے باپنا صاحب کے پاس اندور کلب میں گئے۔ باپنا صاحب وہاں ٹینس کھیل رہے تھے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر وہ کچھ کہا۔ جو میں نے ان سے کہا تھا۔ باپنا صاحب نے سن کر کہا: "سردار دیوان سنگھ سے جا کر کہیئے۔ کہ وہ دہلی سے ابھی آئے ہیں۔ تھکے ہوتے ہوں گے۔ مجھے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ ابھی آ کر مل سکتے ہیں۔ مگر بہتر یہ ہو کہ وہ رات کو آرام کریں۔ میں صبح آٹھ بجے ان کے پاس کار بھیج دوں گا۔ وہ آٹھ بجے مجھ سے مل کر دو بجے بعد دوپہر کی گاڑی سے واپس تشریف لے جائیں۔" سپرنٹنڈنٹ صاحب واپس تشریف لائے انہوں نے باپنا صاحب کا جواب بتایا تو میں نے کہا۔ کہ بہت بہتر۔ میں صبح ان سے مل کر دوپہر کو واپس چلا جاؤں گا۔ رات کو ہم نے گیسٹ ہاؤس میں آرام کیا۔ ریاستوں کے مہمان خانے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ اچھے سے

Marfat.com

اچھے کھانے۔ ہاتھ باندھے ہوئے ملازم۔ شان دار عمارت۔ بہترین قسم کا فرنیچر اور جو طلب کرو حاضر ہوشیار سنگھ مجھ سے عمر میں کم۔ میں ان سے اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت کرتا ہوں۔ رات کو میں نے سنجیدہ صورت بنا کر مذاقاً ہوشیار سنگھ سے پوچھا۔ کہ دیکھو پانچ پانچ سو روپیہ کا ایک ایک پلنگ ہے اور ہزار ہزار روپیہ کا صوفہ سیٹ۔ کئی ملازم۔ کھانے پینے کا سامان بہت اعلیٰ شاندار عمارت۔ سواری کے لیے موٹر۔ اگر اس تمام سامان کے ساتھ آپ کو دو تین سو روپیہ ماہوار جیب خرچ کے لیے دے دیا جائے تو اس کوٹھی میں کتنے عرصہ کے لیے تم نظر بند ہونے کے لیے تیار ہو ہوشیار سنگھ سوچنے لگ گیا مگر اس نے یہ محسوس کر لیا۔ کہ میں تفریحاً مذاق کر رہا ہوں۔ اس نے جواب دیا۔ کہ فی الحال چھ ماہ کا ایگریمنٹ تو ریاست اندور کے ساتھ کرنے کو تیار رہوں۔ چھ ماہ کے بعد اس ایگریمنٹ میں مزید تجدید کر دی جائے گی۔

اگلے روز ہم صبح جاگے اور سات بجے تک غسل کر کے اور کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ پونے آٹھ بجے باپنا صاحب کی موٹر آئی۔ اس میں ہم تینوں آپ کی کوٹھی پہنچے۔ یہ کوٹھی دو منزلہ تھی۔ ایک ویٹنگ روم نیچے، ایک اوپر۔ نیچے کے ویٹنگ روم میں ایک درجن سے زیادہ لوگ۔ بہت اچھے اچھے درباری چوغے اور مختلف قسم کی پگڑیاں پہنے ملنے کے لیے منتظر بیٹھے تھے۔ ہم بھی ان میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ چوبدار کو دیا۔ وہ وزیٹنگ کارڈ لے کر اوپر گیا۔ اوپر کے چوبدار نے یہ کارڈ لے کر باپنا صاحب کے میز پر رکھا۔ جہاں کر اور کئی کارڈ رکھے تھے۔ باپنا صاحب نے یہ کارڈ دیکھا تو انہوں نے چوبدار کو حکم دیا۔ کہ ایک صاحب سردار دیوان سنگھ پنجابی ہیں ان کو لے آؤ۔ یہ چوبدار نیچے کے ویٹنگ روم میں آیا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اوپر کے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا۔ اور باپنا صاحب کو اطلاع کی کہ اوپر کے ویٹنگ روم میں آ گئے ہیں میں اوپر کے ویٹنگ روم میں اپنے ساتھ ہنسراج جی کو بھی لے گیا تھا۔ باپنا صاحب نے جب چوبدار سے میرے اوپر کے ویٹنگ روم میں پہنچنے کے متعلق سنا تو کہا۔ کہ بلا لاؤ۔ میں نے ہنسراج جی سے کہا۔ کہ آپ یہاں ہی بیٹھئے۔ جب تک کہ میں آپ کو بلا نہ بھیجوں۔ میں باپنا صاحب کے کمرے میں گیا۔ باپنا صاحب اخلاقاً کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کیا۔ بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ دہلی کا کیا حال ہے صحت کیسی ہے موسم کیسا ہے وغیرہ۔ جب چند منٹ رسمی گفتگو ہو چکی تو میں نے کہا۔ سلام دہقانی خالی از مطلب نیست کے مصداق میں ایک غرض کے لیے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیجئے تو میرے ساتھ ایک اور صاحب باہر بیٹھے ہیں ان کو بھی بلا لوں۔ آپ نے کہا۔ ضرور ضرور۔ آپ نے گھنٹی بجائی۔ چوبدار حاضر ہوا تو اسے حکم دیا۔ کہ جو صاحب اوپر کے ویٹنگ روم میں تشریف رکھتے ہیں اور سردار صاحب کے ساتھ آئے ہیں ان کو لے آؤ۔ ہنسراج صاحب بھی باپنا صاحب کے کمرہ کے اندر آ گئے۔ باپنا صاحب نے ہاتھ ملایا اور وہ بیٹھ گئے۔ میں نے اب ذکر شروع کیا۔ کہ یہ صاحب لالہ ہنسراج ہیں اور میرے چچا کے داماد ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں۔ جن کے خلاف آپ کی ریاست میں دھوکا کا مقدمہ قائم ہے اور جنہوں

Marfat.com

نے آپ کے سب انسپکٹر کی توہین کی اور اسے مارا۔ میں نے تمام کے تمام حالات من و عن سچ سچ بتانے کے بعد کہا۔ کہ یہ آپ کے حوالہ ہیں۔ ان کو یا تو جیل بھیج دیجئے۔ یا میرے ساتھ واپس دہلی۔ دونوں میں سے جو صورت پسند ہو کیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو ریذیڈنٹ کے وارنٹوں کے سپرد تو نہ کیا مگر میں ان کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

باپنا صاحب ریاستوں کے وزرا میں غیر معمولی شریف اور نیک دل شخصیت تھے۔ ان کی شرافت ان کی زندگی میں کئی بار ان کے لیے مہنگی ثابت ہوئی۔ مگر ان کے شعار اور کیریکٹر میں تبدیلی نہیں ہوئی۔

ان کو مقدمہ کے تمام حالات کا علم تھا۔ کیونکہ ان کے ذریعہ سے ہی وارنٹ کئی بار ریذیڈنٹ کے پاس گئے تھے اور آئے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ہنسراج جی کو فوراً ریلوے سٹیشن پر انگریزی جورسڈکشن میں بھیج دیا جائے۔ تاکہ ریاست کی حدود میں ریاست کی پولیس کا کوئی شخص شرارت نہ کر سکے۔ ہنسراج جی کو موٹر میں ریلوے سٹیشن بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے میونسپلٹی کے پریذیڈنٹ کو ٹیلیفون کر کے طلب فرمایا یہ صاحب بیرسٹر تھے اور ان کا نام غالباً عزیز خاں یا عبدالعزیز خاں تھا۔ اور ان کو سمجھایا۔ کہ کیا کرنا چاہئے میں اور پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی موٹر میں ان بوہروں کے پاس گئے جنہوں نے مقدمہ دائر کیا تھا۔ پریذیڈنٹ صاحب نے ان کو وزیر اعظم صاحب کا پیغام دیا۔ بوہرے بنیا قسم کے سوداگر ہوتے ہیں جو ایک ایک پیسہ کا خیال رکھیں۔ انہوں نے بتایا۔ کہ مقدمہ میں ان کا ڈیڑھ سو روپیہ خرچ آ چکا ہے۔ میں نے کہا اس کا خیال نہ کیجئے۔ یہ ڈیڑھ سو روپیہ میں دوں گا۔ بات چیت کرنے کے بعد یہ دونوں بوہرہ مستغیث کو لے کر ہائیکورٹ گئے۔ وہاں مستغیث کی طرف سے درخواست لکھی گئی۔ کہ مقدمہ قابل راضی نامہ ہے اور یہ مقدمہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ اس درخواست کو لے کر ہم چیف جسٹس صاحب کے پاس گئے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ باپنا صاحب نے ان کو بھی کہہ دیا تھا۔ چنانچہ مستغیث کی درخواست پر چیف جسٹس صاحب نے حکم لکھا۔ کہ چونکہ ملزم اور مستغیث میں صلح ہو چکی ہے اور مستغیث مقدمہ واپس لینا چاہتا ہے۔ عدالت کو اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ ملزم مقدمہ میں ڈسچارج کیا جائے اور ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے سنٹرل انڈیا کو وارنٹوں کے منسوخ کرنے کے لیے لکھا جائے۔ یہ تمام کارروائی بارہ بجے سے پہلے پہلے ختم ہو گئی۔ میں نے خرچ کا ڈیڑھ سو روپیہ بوہرہ سوداگر کو دینا چاہا۔ اور بہت زور لگایا مگر پریذیڈنٹ میونسپلٹی نے نہ دینے دیا۔ کارروائی ختم ہونے کے بعد میں باپنا صاحب کی خدمت میں شکریہ کے لیے حاضر ہوا۔ وہ مقدمہ کے ختم ہونے پر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے دوستانہ التجا کے ساتھ درخواست کی۔ کہ بوہرہ سوداگر کے خرچہ کا روپیہ مجھے دینے کی اجازت دی جائے۔ یہ روپیہ ہمارا نہ دینا ہمارے لیے انتہائی غیر مناسب ہے۔ مگر باپنا صاحب نہ مانے اور آپ نے کہا کہ سردار دیوان سنگھ دوست اور مہمان ہیں۔ یہ ممکن نہیں اور کسی صورت میں ایسا نہ ہو گا۔ یہ روپیہ وہ خود اپنے جیب سے دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں نے پھر التجا کی۔ مگر انہوں نے پھر انکار کیا اور دوسری باتیں شروع کر دیں۔

باپنا صاحب سے رخصت ہو کر میں ہوشیار سنگھ جی کے ساتھ موٹر میں ریلوے سٹیشن گیا۔

Marfat.com

وہاں سے ہنسراج جی کو ساتھ لیا۔ ہم تلینوں گیسٹ ہاؤس میں پہنچے وہاں لنچ کھایا۔ سامان بندھوایا گیسٹ ہاؤس کے ملازموں کو دس روپیہ بطور انعام دیئے اور ہم موٹر میں ریلوے سٹیشن پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد رتلام جانے والی گاڑی آئی اور ہم اس میں سوار ہو کر دہلی واپس آئے۔

لاہور جیل کے واقعات بتائے گئے تھے۔ کہ جرنلسٹوں کو کیونکہ ہوّا سمجھا جاتا ہے۔ اندر کے اس واقعہ سے اندازہ ہو سکے گا۔ کہ جرنلسٹوں کو بعض ایسی سہولتیں بھی حاصل ہیں جو دوسرے کم لوگوں کو حاصل ہوں گی ◆

گورنمنٹ کی کاغذی مشینری

مہاراجہ نابھہ معزول ہونے کے بعد جب ڈیرہ دون میں مقیم تھے تو آپ کے ملازموں نے ایک روز دیکھا۔ کہ سردار حضور اسنگھ ڈھلوں (جو پٹیالہ میں مختلف عہدوں پر رہے۔ ایک زمانہ میں انسپکٹر جنرل پولیس بھی تھے اور بعد میں منسٹر بھی ہو گئے تھے) ڈیرہ دون آئے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی دیکھا گیا۔ کہ آپ ایسٹ کینال روڈ (جہاں مہاراجہ نابھہ کی کوٹھی تھی) کی سڑک پر اکثر موٹر سائیکل پر آتے جاتے ہیں۔ والیان ریاست ذہنی اعتبار سے عام طور پر وہم میں مبتلا ہوتے ہیں اور مہاراجہ نابھہ کا ذہن بھی ایسا ہی تھا آپ نے جب سردار حضور اسنگھ کے متعلق ملازموں سے ایسٹ کینال روڈ کی سڑک پر موٹر سائیکل پر آنے جانے کے متعلق سنا تو آپ کو شک ہوا۔ کہ شاید پٹیالہ کے لوگ کوئی نئی شرارت کرنے والے ہیں۔ آپ نے مجھے ڈیرہ دون سے ٹیلی فون پر کہا۔ کہ میں فوراً ڈیرہ دون پہنچ جاؤں۔ ضروری کام ہے۔ میں رات کی گاڑی دہلی سے سوار ہوا اور صبح ڈیرہ دون پہنچا۔ مہاراجہ سے ملا۔ تو آپ نے سردار حضور اسنگھ کا ڈیرہ دون کی سڑکوں پر موٹر سائیکل پر پھرنے کا واقعہ سنایا۔ مہاراجہ بے حد تشویش میں تھے۔ کہ شاید مہاراجہ پٹیالہ کوئی نئی شرارت کرنے والے ہیں۔ میں نے مہاراجہ سے کہا کہ ڈیرہ دون ہمارا خریدا ہوا نہیں ہے کہ یہاں پٹیالہ کا کوئی شخص آ بھی نہ سکے۔ پُر فضا مقام ہے۔ اکثر لوگ آب و ہوا کے لیے آتے ہیں۔ ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر میرے اس جواب سے مہاراجہ کی تسلی نہ ہوئی۔ آپ گھبرائے ہوئے تھے اور آپ نے چاہا۔ کہ میں ان کے پاس کچھ روز رہوں۔ میں تین چار روز ڈیرہ دون میں رہا۔ مگر ادھر اخبار کے کام کی فکر کہ غیر حاضری کے باعث اچھی طرح سے نہ ایڈیٹ ہو گا اور نہ انتظام قابلِ اطمینان ہو سکے گا۔ میں نے چاہا۔ کہ واپس دہلی چلا جاؤں۔ آخر مہاراجہ سے فیصلہ ہوا کہ میں چند ہفتے تک ہفتہ میں دو تین روز دہلی میں رہا کروں گا اور تین چار روز ڈیرہ دون رہوں گا۔

میں جب دہلی پہنچا تو اگلے روز رائے بہادر لالہ بھگوان داس کپور سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ بزرگ میرے ہم وطن ہیں اور دور کے کچھ رشتہ دار یا برادری میں سے بھی ہیں۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل سی آئی ڈی کے ماتحت سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے آپ

Marfat.com

کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں تھا۔ پندرہ روز لاہور میں تشریف رکھتے تھے اور پندرہ روز دہلی میں۔ ان کے والد رائے بہادر لالہ دریائی لال کپور بھی پولیس کے ایک بڑے افسر تھے۔ یعنی رائے بہادر بھگوان داس، پولیس کے محکمہ میں ہونے کے اعتبار سے دو آتشہ تھے۔ آپ جب دہلی تشریف لاتے تو کبھی کبھی ملنے کے لیے آیا کرتے۔

رائے بہادر پولیس سے خاندانی تعلق ہونے کے باعث گورنمنٹ کے بہت بڑے وفا شعاروں میں سے تھے۔ اور آپ نے اور آپ کے والد مرحوم نے ہندوستان کی آزادی کی سپرٹ کو کچلنے کے اعتبار سے گورنمنٹ کی بہت بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ آپ کے والد ۱۹۰۶ء کی تحریک میں جبکہ لالہ لاجپت رائے کو مانڈلے بھیجا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ کے دستِ راست تھے۔ اور رائے بہادر بھگوان داس نے تو لالہ لاجپت رائے اور لالہ ہردیال کا امریکہ تک پیچھا کیا اور یہاں ہندوستان میں ہارڈنگ بمب کیس سے لے کر ارون بمب کیس اور اس کے بعد تک کی تفتیشوں میں نمایاں حصہ لیا۔ مگر میرا خیال ہے اور آپ کی پولیس کی برادری کے بھی بعض اصحاب میرے اس خیال سے متفق ہیں کہ آپ ذہنی اعتبار سے کوئی بہت زیادہ ہوشیار لوگوں میں سے نہیں تھے۔ آپ جب ملنے کے لیے تشریف لائے اور چائے پی رہے تھے تو آپ نے فرمایا۔ کہ انہوں نے دو تین بار ٹیلی فون کیا۔ میں دہلی میں موجود نہ تھا اور میں کہاں گیا ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ کہ ڈیرہ دون مہاراجہ سے ملنے کے لیے گیا تھا۔

پولیس والوں کی یہ فطرت ہے کہ یہ ہر بات کو کریدتے ہیں کہ شاید اس میں سے بھی کوئی مراد مل جائے۔ اگر کسی برات میں جائیں گے تو وہاں بھی لوگوں کو غور سے دیکھیں گے کہ اس برات میں کوئی مفرور ملزم تو نہیں۔ کسی گوردوارہ اور دھرم سالہ میں جائیں گے تو وہاں عبادت کرنے والوں پر بھی ان کی نگاہ ہوگی۔ کہ کوئی انارکسٹ تو موجود نہیں جس کو گرفتار کیا جائے۔ میں رائے بہادر کی ذہنیت سے واقف تھا۔ آپ نے جب میرے منہ سے مہاراجہ نابھہ اور ڈیرہ دون سنا تو سوالات شروع کر دیئے۔ کیوں گئے تھے کیا کام تھا۔ مہاراجہ کی صحت کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان کے سوالات کو غنیمت سمجھا اور سوچا۔ کہ ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یہ لوگ دوسروں کو بے وقوف سمجھ کر اپنا کام نکالتے ہیں۔ ان کو بے وقوف سمجھ کر کام نکالا جائے تو کیا ہرج ہے۔ رائے بہادر اور میرے درمیان یہ باتیں ہوئیں:

رائے بہادر: ڈیرہ دون کیوں گئے تھے۔

میں: مہاراجہ کا ٹیلی فون آیا تھا۔ کہ آکر مل جاؤ۔

رائے بہادر: کیا کوئی ضروری کام تھا۔

میں: کیا ضروری کام تھا ان لوگوں کے آپس میں جھگڑے ہیں۔ مجھے خواہ مخواہ وقت ضائع کرنا پڑتا ہے

رائے بہادر: کیوں کیا بات تھی کیا جھگڑا ہے۔

میں: کچھ بات نہیں۔ یہی پٹیالہ نابھہ کے جھگڑے۔ ہمارا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔ رائے بہادر صاحب چھوڑیئے ان قصوں کو۔ آپ چائے پیجئے۔ کتنے چمچے شکر کے ڈالوں۔

Marfat.com

رائے بہادر: ایک چمچہ کافی ہوگا۔ میں شکر بہت کم پیتا ہوں۔ کیا نابھ پٹیالہ کا کوئی نیا جھگڑا پیدا ہوگیا۔

میں: جی نہیں۔ وہی پٹیالہ والے شرارتیں کرتے ہیں۔ ڈیرہ دون میں حضورا سنگھ ڈھلوں بیس پچیس غنڈوں کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ موٹر سائیکل پر مہاراجہ نابھہ کی کوٹھی کے چکر لگاتا تھا۔ مہاراجہ نے مشورہ کے لیے بلایا تھا۔

رائے بہادر: پھر مہاراجہ نے کیا کہا۔ کیا کریں گے۔

میں: (اپنی بے تعلقی اور لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے) اجی چھوڑیئے۔ رائے بہادر صاحب ان لوگوں کو۔ یہ قصے تو چلتے ہی رہیں گے۔ آپ چائے پیجیے۔ یہ فرنچ ٹوسٹ ٹھنڈے ہو رہے ہیں کھائیے۔

رائے بہادر کو ایسی "اہم خبر" ملے اور وہ صبر کریں۔ یہ کس طرح ممکن تھا۔ ان کے دل میں تو کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ یہ بجائے چائے سے کیا دلچسپی لیتے۔ انہوں نے میرے کہنے سے ایک فرنچ ٹوسٹ کھایا اور پھر باتیں شروع کردیں مگر میں لاپرواہی کا اظہار کر رہا ہوں۔ تاکہ رائے بہادر یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ میں ان کو سنا کر کہہ رہا ہوں۔ اور میرے کہنے میں کوئی غرض پوشیدہ ہے۔ رائے بہادر نے تھوڑی دیر کے بعد پھر پلٹا کھایا اور پوچھا:

رائے بہادر: مہاراجہ نے کیا سوچا ہے کیا فی الحقیقت پٹیالہ کے لوگ ڈیرہ دون میں موجود ہیں۔

میں: مہاراجہ نے تو پرواہ نہیں کی۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا پرواہ کرتے ہیں۔ ہاں ڈیرہ دون کے اکالیوں کو ان واقعات کا علم ہوگیا۔ انہوں نے امرتسر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو اطلاع کر دی اور اب معلوم ہوا تھا۔ کہ شرومنی گوردوارہ کمیٹی اکالی دل کے پانچ سو آدمی ڈیرہ دون بھیج رہی ہے جو مہاراجہ کی کوٹھی کے ارد گرد اور ایسٹ کینال روڈ پر پہرہ دیں گے۔ تاکہ پٹیالہ والے کوئی شرارت نہ کر سکیں۔

میرا یہ کہنا تھا۔ کہ رائے بہادر کا چہرہ دلچسپی اور حیرانی کا مرکز بن گیا۔ رائے بہادر نے پوچھا۔ کہ امرتسر سے اکالی کب ڈیرہ دون پہنچ رہے ہیں۔ میں نے پھر بے اعتنائی، غیر دلچسپی اور لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کہ چھوڑیئے رائے بہادر صاحب ان باتوں کو۔ یہ لوگ کریں جیسا کرنا چاہتے ہیں ہم اپنا وقت ان لوگوں پر کیوں ضائع کریں۔ فرمایئے حافظ آباد میں تو سب خیریت ہے آپ کب وہاں گئے تھے

رائے بہادر کو صبر کہاں۔ انہوں نے اور کریدنا چاہا۔ میں نے پھر لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے دوسری باتیں شروع کر دیں اور اگر دوسری باتیں شروع نہ کرتا تو ڈیرہ دون کی بات ہی کون سی تھی جو ان سے کہتا۔ چائے کے بعد رائے بہادر دفتر "ریاست" سے سیدھے اپنے افسر سر ڈیوڈ پیٹری ڈائرکٹر جنرل سی آئی ڈی کی کوٹھی پہنچے۔ وہاں تمام واقعات بیان کیے۔ ان "سنسنی خیز" اور "اہم" واقعات کے متعلق سر ڈیوڈ پیٹری نے پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند کو ٹیلیفون کیا اور کہا۔ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ پانچ سو اکالیوں کا جتھا مہاراجہ نابھہ کی کوٹھی کا پہرہ دینے کے لیے امرتسر سے روانہ ہو رہا ہے اور پنجاب میں سکھوں کے اندر سخت ایجی ٹیشن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ پولیٹیکل سیکرٹری نے فوراً بذریعہ تار مہاراجہ

Marfat.com

پٹیالہ سے جواب طلب کیا اور حکم دیا۔ کہ سردار حضورا سنگھ اور پٹیالہ کے دوسرے آدمیوں کو فوراً ڈیرہ دون سے واپس بلا لیا جائے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے جواب دیا۔ کہ پٹیالہ سے انہوں نے آدمی نہیں بھیجے۔ سردار حضورا سنگھ پرائیویٹ حیثیت سے ڈیرہ دون گئے ہیں اور ان کو بذریعہ تار واپس آنے کے لیے حکم دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ احکام بذریعہ تار جاری ہوئے اور اگلے روز سردار حضورا سنگھ واپس پٹیالہ چلے گئے۔

میں تین روز کے بعد پھر ڈیرہ دون گیا۔ مہاراجہ کو رائے بہادر بھگوان داس کی ملاقات کا واقعہ بتایا مہاراجہ کے ہنسنے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ مہاراجہ نے بتایا۔ کہ سردار حضورا سنگھ ڈیرہ دون سے واپس پٹیالہ چلے گئے ہیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گورنمنٹ کی کاغذی مشینری کیونکر چلتی ہے۔ اس مشینری کے باعث جہاں ہر روز بے گناہ لوگ قید اور نظر بند ہوتے ہیں وہاں اس مشینری کو بھی اگر بے وقوف بنایا جائے تو اس سے کام لیا جا سکتا ہے ؎

ریاستوں کی عدالتیں اور مجسٹریٹ

نواب صاحب بہاولپور کی دادی نے عید کے روز اپنی پوتی یعنی نواب صاحب کی بہن کو عیدی کے طور پر ایک پنّا دیا۔ نواب صاحب کی بہن نے یہ پنّا اپنے شوہر (ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ بہاولپور کی پلٹن میں میجر ہیں اور ان کو محبت سے میجر بلّا کہتے ہیں) کو دیا۔ اس پنّا کی قیمت تین چار لاکھ روپیہ کے قریب تھی۔ میجر بلّا نے یہ پنّا بہاولپور کے ایک مقامی جوہری کو دکھایا اور پوچھا۔ کہ کیا قیمت ہے۔ تو اس جوہری نے اس کی قیمت سولہ ہزار روپیہ بتائی۔ اس کے بعد یہ پنّا بہاولپور کے قریب ملتان کے ایک جوہری کو دکھایا گیا تو اس نے بھی یہی سولہ سترہ ہزار روپیہ قیمت بتائی۔ میجر بلّا ناتجربہ کار نوجوان تھے۔ انہوں نے اس پنّا کو فروخت کر دینا چاہا تو کچھ دن بات چیت کرنے کے بعد یہ چار جوہریوں کے پاس جن میں دو بہاولپور اور دو ملتان کے تھے۔ انیس ہزار روپیہ میں فروخت کر دیا۔ اور اس سودے کا علم نہ تو نواب صاحب بہاولپور کو ہوا۔ نہ ان کی ہمشیرہ کو اور نہ ان کی دادی کو۔

یہ چاروں جوہری اس پنّا کو لے کر دہلی آئے۔ انہوں نے یہاں کے جوہریوں کو دکھایا۔ جوہری لوگ دوسرے کا جیب کاٹنے کے اعتبار سے بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا جواہر شناس کو بھی بے وقوف بنا لیتے ہیں اور والیانِ ریاست کے جیب میں سے تو دہلی کے جوہری ہر سال لاکھوں روپیہ حاصل کرتے تھے۔ دہلی کے ان جوہریوں نے اس پنّا کی قیمت چالیس پچاس ہزار روپیہ تک لگائی اس کے بعد ملتان اور بہاولپور کے جوہری پنّا کو لے کر بمبئی گئے۔ وہاں کے جوہریوں کو دکھایا گیا تو اس سے کچھ زیادہ رقم بتائی گئی۔ آخر یہ پنّا جے پور کے کروڑپتی جوہری لال سندر لال جو بمبئی میں سندر لال اینڈ کو

Marfat.com

کے نام سے جواہرات کا کام کرتے ہیں۔ یہ پنّا پچھتر ہزار روپیہ میں فروخت کر دیا گیا۔
پنّا بمبئی میں فروخت ہوا تھا۔ کہ ملتان کے جوہریوں میں سے ایک نے جو کافی حصہ نہ ملنے یا کسی دوسری وجہ سے اپنے ہمراہیوں سے بددل ہو گیا تھا۔ ایک خط کے ذریعہ نواب صاحب بہاولپور کو تمام واقعہ کی اطلاع دے دی۔ نواب صاحب نے اپنے بہنوئی سے پوچھا تو معلوم ہوا۔ کہ واقعہ درست ہے۔ ایک تو قیمتی شئے کا کوڑیوں کے مول فروخت ہونا، دوسرے پرسٹیج کا سوال۔ نواب صاحب کو اس کا بے حد افسوس ہوا۔

نواب صاحب کے حکم سے بہاولپور پولیس نے مقدمہ کو درج رجسٹر کیا۔ مقدمہ درج ہونے کے بعد جوہریوں پر دھوکہ اور امانت میں خیانت وغیرہ کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ اور کاغذات ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب کو اس درخواست کے ساتھ بھیجے گئے۔ کہ تا فیصلہ مقدمہ پنّا کو فوراً قبضہ میں کر لیا جائے۔ تاکہ ملزم اس کو خرد برد نہ کر سکیں۔ ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب نے بمبئی پولیس کو تفصیل کے ساتھ بذریعہ تار حکم دیا اور بمبئی پولیس نے لالہ سندر لال کے ہاں پہنچ کر پنّا جو اس وقت پچھتر ہزار روپیہ میں فروخت ہو چکا تھا اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس حکم کے پہنچنے سے پہلے چاروں جوہری روپیہ لے کر بمبئی سے روانہ ہو چکے تھے۔ ایجنٹ گورنر جنرل کا حکم دہلی اور لاہور پولیس کو بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ جوہری روپیہ لے کر جب لاہور سٹیشن پہنچے تو پنجاب ریلوے پولیس نے ان کو مع روپیہ کے گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری کے بعد ان سے روپیہ لے کر لاہور کے سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیا گیا اور جب ملزموں کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا تو ان سے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔

ریاستوں کے مظالم برطانوی علاقہ میں کافی شہرت رکھتے تھے اور لوگ جانتے تھے کہ ریاستوں کی حدود میں اگر سرکار مستغیث یا مدعی ہو تو نہ دلیل کا سوال ہے نہ وکیل کا اور نہ اپیل کا۔ ان جوہریوں نے جب یہ سنا۔ کہ ان کے خلاف ریاست بہاولپور میں مقدمہ قائم کیا گیا ہے اور ایجنٹ گورنر جنرل نے وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہیں تو ان بیچاروں کے ہوش اڑ گئے۔ اور انہوں نے محسوس کیا۔ کہ اگر اس نے ان کو ریاست بہاولپور کے حوالہ کر دیا۔ تو نہ معلوم کتنے برس تک یہ وہاں جیل میں رکھے جائیں۔ ان لوگوں نے لاہور میں اپنا وکیل مسٹر پی این کول بیرسٹر کو مقرر کیا۔

یہ لوگ بے حد پریشان تھے۔ تو ان کو خیال آیا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" ریاستوں کے معاملات اور ایکسٹراڈیشن ایکٹ وغیرہ سے واقف ہے۔ اس سے رائے اور امداد لینی چاہیئے۔ یہ لوگ دہلی آئے اور ایڈیٹر "ریاست" سے ملے۔ انہوں نے تمام حالات سنائے۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ گو سودا کرتے وقت انہوں نے چوروں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز کے مصداق تین چار لاکھ روپیہ کا پنّا انیس ہزار میں اڑا لیا۔ مگر غور کیا جائے تو انہوں نے یہ تجارت کی تھی۔ دھوکہ یا امانت میں خیانت کا جرم نہ کیا تھا میں نے ان سے کہا۔ کہ میں اخبار میں لکھ کر ان کی ہر امداد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا کیونکہ مقدمہ عدالت میں ہے۔ اگر مقدمہ کے لیے ریذیڈنٹ نے ان کو بہاولپور کے حوالے کر دیا تو کچھ یہ

Marfat.com

بہاولپور کے حکام کے رحم پر ہوں گے وہ جو چاہیں کریں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ نتیجہ کیا ہو۔ ہاں اگر مقدمہ برطانوی علاقہ میں ہو تو قانونی اعتبار سے مقدمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور وہ قطعی بری ہو جائیں گے مگر برطانوی علاقہ میں مقدمہ کا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے ان کو اس مقدمہ کے تمام روشن اور تاریک پہلو بتا دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے خواہش ظاہر کی۔ کہ چونکہ میں نواب صاحب بہاولپور کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اس لیے ان کی سفارش کروں۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ ایسے سفارش کرنا تو بے معنی ہو گا اور نہ ایسی سفارش کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ اگر یہ پوزیشن ہو کہ لالہ سندر لال اپنا پچھتر ہزار روپیہ واپس لے لیں۔ اور انیس ہزار روپیہ جو آپ نے میجر بلا کو دیا وہ نواب صاحب بہاولپور آپ کو دے دیں اور نواب صاحب کو پنا واپس مل جائے تو یہ تینوں کے لیے مناسب و مفید ہو گا۔ اور اس تجویز پر نواب صاحب سے مقدمہ واپس لینے کی سفارش کی جا سکتی ہے اور میرا خیال ہے کہ نواب صاحب کو اس تجویز سے متفق ہونے سے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ میری یہ تجویز ان لوگوں نے پسند کی کیونکہ ان کو ریاستی جیل خانہ نظر آ رہا تھا اور بہت خوف زدہ تھے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو جیل جانے کا سوال تھا۔ نہ انیس ہزار روپیہ کے مارے جانے کا۔ نواب صاحب بہاولپور میں بھی کئی کمزوریاں ہوں گی اور کوئی انسان کمزوریوں سے بلند نہیں۔ مگر طبیعت کے اعتبار سے نواب صاحب نہایت اچھے۔ نہایت مخلص۔ بہت فیاض اور بے ریا والئی ریاست ہیں۔ اور ان سے ملنے اور باتیں کرنے والا شخص ایک کشش محسوس کرتا ہے گرمیوں کا زمانہ تھا اور نواب صاحب اس وقت پالم پور۔ (ضلع کانگڑہ) پہاڑ پر تھے۔ میں نے ان کو تمام حالات اور وہ تمام بات چیت لکھی جو میرے اور ملزموں کے درمیان ہوئی۔ اس خط کے ملنے پر نواب صاحب کا تار آیا۔ کہ میں ان سے پالم پور ملوں۔ چنانچہ میں پالم پور گیا۔ سو ہاں بات چیت ہوئی تو نواب صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ کیونکہ وہ خود نہ چاہتے تھے کہ ملزم قید ہوں۔ اس مرحلہ کے طے ہونے کے بعد میں لالہ سندر لال سے دہلی میں ملا۔ اور کئی روز کی بات چیت کے بعد میں سندر لال جی کو نواب صاحب سے ملانے کے لیے پالم پور لے گیا۔ تاکہ نواب صاحب لالہ جی کی بھی تسلی کر دیں کیونکہ وہ بھی امانت میں خیانت کا مال لینے کے ملزم گردانے جا سکتے تھے۔ چنانچہ اس ملاقات کے بعد لالہ سندر لال نے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ بمبئی کو (جس کے قبضہ میں بمبئی پولیس نے یہ پنا رکھا ہوا تھا) لکھ دیا۔ کہ پنا نواب صاحب بہاولپور کو واپس کر دیا جائے ان کو کوئی اعتراض نہیں۔

یہ تمام مرحلے طے ہونے کے بعد اب باقی مسئلہ بہاولپور کا مقدمہ واپس لینے کا تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا۔ کہ ملزم بہاولپور کی عدالت میں حاضر ہوتے۔ بیان ہوتے۔ ان کا انیس ہزار روپیہ ان کو واپس ملتا۔ عدالت ان کو ڈسچارج کرتی اور ریذیڈنٹ کے جاری کیے ہوئے ایکسٹراڈیشن وارنٹ منسوخ ہوتے۔ چنانچہ باوجود اس بات کے کہ نواب صاحب سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ ملزم بہاولپور جاتے ہوئے گھبراتے تھے اور خوف زدہ تھے۔ میں درمیان میں پڑ کر ذمہ داری لے چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ کہ میں بہاولپور چل کر مقدمہ کی کارروائی بھی اپنے سامنے ختم کرا دوں۔ چنانچہ میں ان

Marfat.com

چاروں ملزموں اور ان کے وکیل کے ساتھ بہاول پور گیا۔ تمام راستہ میں یہ لوگ پریشان رہے کہ ریاستوں کا معاملہ ہے۔ وہاں جا رہے ہیں۔ والیانِ ریاست اور ان کے اہل کاروں کا کیا اعتبار۔ ایسا نہ ہو جیل میں ڈال دیئے جائیں۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے بہاولپور خان بہادر کرنل مقبول حسین قریشی کو تار دے دیا تھا۔ ہم لوگ جب بہاولپور سٹیشن پر پہنچے تو کاریں ہمارے لیے موجود تھیں۔ گیسٹ ہاؤس میں گئے۔ وہاں کے افسروں کو ہمارے پہنچنے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ غسل کرنے اور کپڑے بدلنے کے بعد میں اس قافلے کو لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گیا۔ تاکہ قانونی کارروائی ختم ہو۔ ہم وہاں جا کر بیٹھے تھے کہ پولیس کے چار کنسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر ہتھکڑیاں لے کر ملزموں کو ہتھکڑیاں لگانے کے لیے آ گئے۔ ہم لوگوں نے جب ہتھکڑیوں کو دیکھا تو نہ صرف ملزموں کے ہوش اڑ گئے۔ میں بھی شرم اور ندامت کے باعث پانی پانی ہو گیا۔ کیونکہ ملزموں کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ لوگ مجھے غدار اور بے ایمان سمجھتے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ میں نے دھوکہ دے کر ان کو پکڑوا دیا۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہا۔ کہ یہ وعدہ خلافی ہو رہی ہے۔ نواب صاحب نے مجھ سے ذاتی طور پر کہا تھا۔ کہ ملزموں کو بہاول پور میں کوئی تکلیف نہ ہو گی ان کو عدالت میں پیش کر دیا جائے اور مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔ ایسا کرنا ریاست بہاولپور کے لیے شرمناک ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا۔ میں نے غصہ اور جوش میں آ کر بلند آواز سے کہا۔ کہ اچھا اگر یہ ملزم جیل میں گئے تو جیل سے باہر رہنا میں اپنے لیے بھی کمینہ پن سمجھتا ہوں اور یقیناً ان کے ساتھ جیل جاؤں گا۔ میرے اس چیلنج پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اندر کچھ انسانیت پیدا ہوئی اور اس نے محسوس کیا۔ کہ معاملہ بہت زیادہ بگڑ جائے گا۔ اس پر اس نے کہا۔ کہ چونکہ ملزموں کے خلاف وارنٹ جاری ہوئے تھے اور ملزم عدالت میں ہیں۔ عدالت کا فرض ہے کہ وہ ان کو حراست میں لے۔ میں نے کہا آپ تھوڑی دیر انتظار کیجئے۔ ان کو ہتھکڑیاں نہ لگایئے۔ میں ابھی منسٹروں سے مل کر انتظام کرتا ہوں۔ چنانچہ عدالت سے باہر وہ موٹر کھڑی تھی جس میں ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے آئے تھے۔ میں اس موٹر میں وہاں کے منسٹر لالہ او دھوداس کے پاس پہنچا۔ اول تو ان سے ملنے کے لیے ہی مجھے کئی منٹ برآمدہ میں انتظار کرنا پڑا۔ اور جب ملے تو بڑھے آدمی۔ ننھو خاں کا مقبرہ نہ دعا نہ بددعا۔ یعنی نہ ہاں کرتے ہیں نہ نہیں۔ نہ کوئی تسلی بخش جواب۔ ریاستی اہل کاروں والی چال بازیاں اور چالاکیاں۔ نواب صاحب کا حکم نہیں آیا۔ پالم پور سے کوئی تحریری اطلاع نہیں آئی۔ پولیس کے اختیار میں ہے۔ مجسٹریٹ سے کہیئے۔ مجبور ہوں۔ یہ ہے اور وہ ہے۔

انہوں نے کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا میں بیحد پریشان کہ نواب صاحب پالم پور میں ہیں۔ یہاں کے منسٹروں کی حالت یہ ہے کہ کروں تو کیا اور جاؤں تو کدھر۔ پہلے سے کرنل قریشی کے ہاں گیا۔ وہ مکان پر موجود نہ تھے۔ پھر آغا محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس کے مکان پر گیا۔ یہ برٹش پولیس کے ریٹائرڈ افسر تھے۔ سی پی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس رہ چکے تھے۔ ان سے ملا۔ تمام حالات بیان کیے تو ان کو بے حد افسوس ہوا۔ یہ فوراً میرے ساتھ عدالت میں آئے۔ مجسٹریٹ سے پوچھا تو مجسٹریٹ نے وہی قانون بازی

Marfat.com

شروع کی۔ کہ آپ وارنٹوں کی تعمیل کرا رہے ہیں۔ اس پر آغا صاحب نے اپنے سب انسپکٹر کو شہر بھیج کر دو شاہوکاروں کو بلایا اور ان سے کہا۔ کہ یہ ان چاروں ملزموں کی پانچ پانچ سو روپیہ کی ضمانت عدالت میں داخل کر دیں۔ چنانچہ ضمانت نامے لکھے گئے اور داخل ہوئے۔ اس کے بعد آغا صاحب نے اپنے سامنے تمام کارروائی جو ہونی چاہیے تھی۔ کرائی اور ملزم ڈسچارج کیے گئے۔

ملزموں کے ڈسچارج ہونے کے بعد ہم لوگ واپس گیسٹ ہاؤس آئے۔ پتا اس سے پہلے بہاول پور کے خزانہ میں پہنچ چکا تھا۔ ملزموں کا روپیہ ملزموں کو ملا۔ اور میں رات کی گاڑی سے سوار ہو کر دہلی واپس آیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد میں نے بہاولپور کا ہتھکڑیوں کا واقعہ اور تمام حالات نواب صاحب کو لکھے۔ نواب صاحب کو حالات معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ریاستوں کے مجسٹریٹوں کے اندر شئے نطیف اور انسانیت پیدا ہونے کے لیے ابھی نصف صدی کی اور ضرورت تھی۔ اچھا ہوا۔ کہ آغا محمد اکرم نے ملزموں کی ضمانت کا انتظام کر دیا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ ملزم تو جیل میں جاتے اور میں جس کے وعدہ اور بھروسہ پر وہ بہاولپور کی حدود میں داخل ہوئے باہر رہتا۔

غدّار نا قابلِ معافی ہیں

جس زمانہ نواب بھوپال کے ساتھ میرے مقدمات چل رہے تھے۔ دفتر "ریاست" میں ایک چپراسی مبارک حسین تھا۔ اس زمانہ چپراسیوں کی تنخواہ عام طور پر بارہ پندرہ روپیہ ماہوار تھی۔ مگر یہ مبارک حسین تیس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا اور اس کا دوسرا تمام خرچ یعنی کھانے کپڑے وغیرہ کا بھی میرے ذمہ تھا کیونکہ یہ قابلِ اعتماد تھا۔ میرے گھر کے لیے سامان کی خرید و فروخت بھی یہی کرتا۔ میری والدہ بھی اس کو بچوں سے زیادہ عزیز سمجھتیں۔ قابلِ اعتماد ہونے کے باعث یہ میرے خطوط مرحوم مہاراجہ نابھہ کے پاس ڈیرہ دون لے جایا کرتا اور ان کے جواب لاتا۔ گویا کہ یہ ہمارے ہاں ایک فیملی ممبر کی سی حیثیت رکھتا۔ چنانچہ اس کی جب شادی ہوئی تو اس کی شادی کے اخراجات کے لیے تین سو روپیہ میں نے اور تین سو روپیہ مرحوم مہاراجہ نابھہ نے بھی دیا۔

نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کے مقدمات کے دوران بھوپال والوں نے لالچ سے کر دفتر "ریاست" کے آدمی توڑنے شروع کیے۔ ان آدمیوں کو ان کی شہادت وغیرہ کے لیے ضرورت تھی۔ چنانچہ بھوپال والوں نے دفتر "ریاست" کے جن لوگوں کے ضمیر خریدے۔ ان میں ایک یہ مبارک حسین چپراسی بھی تھا۔ اس کو پانچسو روپیہ تو پیشگی دیا گیا۔ اور اس سے وعدہ کیا گیا۔ کہ اگر اس نے ایڈیٹر ریاست سے غداری کرتے ہوئے نواب بھوپال کی خدمات انجام دیں تو وہ ان مقدمات کے بعد بھوپال میں اچھی جگہ پر سرکاری ملازم مقرر کر دیا جائے گا۔

بھوپال والوں کی اطلاعیں حاصل کرنے کے لیے بھوپال کے ایک سب انسپکٹر پولیس دجو مقدمات

Marfat.com

کے فائلوں کا انچارج تھا اور جس کے بعد میں بھوپال والوں نے وارنٹ جاری کر دیے اور وہ بھاگ گیا تھا) کو میں ایک سو روپیہ ماہوار کے قریب دیتا تھا۔ تاکہ یہ مجھے مقدمہ کے تمام حالات کی اطلاعیں دیتا رہے مبارک حسین کو خریدے ابھی چند روز ہوئے تھے تو اس سب انسپکٹر پولیس نے مجھے بھوپال سے اطلاع دی کہ دفتر "ریاست" کا چپڑاسی مبارک حسین بھی پانچسو روپیہ دے کر خرید لیا گیا ہے اور اس کی معرفت وہ ردی کا غذات حاصل کیے جا رہے ہیں جو ایڈیٹر "ریاست" کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوں۔ تاکہ ان کو دیکھ کر اور ان کی امداد سے جعل سازی تیار کی جا سکے۔ اس اطلاع کے ملنے پر میں نے مبارک حسین پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ اور دفتر میں بھی تاکید کر دی کہ اس کی نگرانی کی جائے۔ جب اس کی نگرانی ہونے لگی اور اعتبار نہ کیا جا رہا تھا تو اس نے محسوس کر لیا کہ مجھے اس کی غداری کا علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ دفتر سے غائب ہو گیا اور بعد میں اعلانیہ طور پر بھوپال والوں سے مل گیا اور اس نے ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف عدالت میں شہادت بھی دی۔ گو اس کی شہادت کی ذرہ بھر قیمت نہ تھی کیونکہ اس پر جو جرح کی گئی وہ بھوپال والوں کے لیے اور زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔

مبارک حسین امروہہ کا رہنے والا تھا اور وہاں کے سیّدوں کے خاندان میں سے تھا۔ امروہہ کے سیّدوں کو اپنے نسب کے متعلق بہت فخر ہے اور میرا تجربہ ہے کہ یہ جب کبھی کوئی اخلاقی کمزوری یا جرم کرنے لگیں۔ تو ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا ہے اور ایک شخص دوسرے کو طعنہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تم ایسا کرتے ہو امروہہ کے سادات میں سے ہوتے ہوئے تمہیں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس غداری کے بعد مبارک حسین اپنے رشتہ داروں اور ہم وطنوں کی نظروں میں گر گیا۔ یہ دہلی میں جب تک رہا اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا۔ لوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم محسوس کرتا۔ امروہہ گیا تو وہاں بھی اس ندامت نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کیونکہ امروہہ کے لوگوں کو اس کے حالات کا علم ہو چکا تھا۔ آخر یہ مستقل طور پر اپنی سسرال چلا گیا۔ جہاں غالباً یہ آج کل سائیکلوں کی مرمت کی دکان کرتا ہے۔

مقدمہ کا فیصلہ ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ مبارک حسین کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ چند برس ہوئے اس کا ایک خط پہنچا جس کا مفہوم یہ تھا:

"میں نے آپ کا نمک کھایا اور نمک حرامی کی۔ مجھے آپ کی ملازمت کی ضرورت نہیں اور نہ میں یہ خط اس غرض کے لیے لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میں یہاں اپنے گزارہ کے لیے کافی پیدا کر رہا ہوں۔ میرے اس خط لکھنے کی غرض یہ ہے کہ میں جب سے آپ کے ہاں سے آیا ہوں بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے رات کو اچھی طرح سے نیند بھی نہیں آتی میری صرف ایک خواہش ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں تاکہ میری روح کو تسکین نصیب ہو اور مرنے کے بعد بھی مجھے عذاب برداشت نہ کرنا پڑے۔"

غداروں کو معاف کرنے کے اعتبار سے میں بے حد سخت ہوں اور اسے چاہے بے رحمی ہی کیوں نہ کہیے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے غداروں سے اتنی نفرت ہے جتنی کسی شخص کو گندگی کے ایک ڈھیر یا ڈلاؤ

Marfat.com

سے ہو سکتی ہے ۔ میں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا ۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر اس کا خط آیا جس کا مفہوم یہ تھا :

"میں نے آپ کی خدمت میں خط لکھا تھا ۔ مجھے اب تک اس خط کا جواب نہیں ملا میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہوں ۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی ۔ نہ معلوم مرنے کے بعد میری کیا حالت ہو ۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو ۔ میں نے آپ سے غداری کر کے بہت بڑا گناہ کیا ۔ میری آپ سے صرف یہی درخواست ہے کہ مجھے معاف کر دو ۔ اور اگر آپ مجھے کسی صورت سے بھی معاف نہ کر سکیں تو میری طرف سے والدہ صاحبہ کی خدمت میں درخواست کیجئے ۔ کہ وہ مجھے معاف کر دیں ۔ شاید میری روح کو تسکین نصیب ہو ۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں میں نے غداری کر کے بہت بڑا گناہ کیا ۔"

میں نے اس خط کے بعد مبارک حسین کو جو جواب دیا وہ یہ تھا :

"آپ کے دو خط ملے ۔ میں دنیا میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں مگر غداری معاف نہیں کر سکتا ۔ اور نہ تمہاری غداری کو معاف کرنے کے لیے والدہ سے کہہ سکتا ہوں ۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں غداری کی سزا قدرت کی طرف سے ملے ۔ وہ چاہے اس دنیا میں ہو یا دوسری دنیا میں ۔ اور یقیناً ملے گی ۔ کیونکہ میرا یہ ایمان ہے کہ خدا غداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا ۔ آپ آئندہ مجھے کبھی خط نہ لکھیئے ۔"

مبارک حسین کے متعلق میرا یہ رویہ رحم دل لوگوں کے حلقہ میں سنگ دلی اور بے رحمی قرار دیا جائیگا مگر واقعہ یہی ہے جو میں نے لکھا اور غداری کے متعلق میرے جذبات یہی ہیں ۔ جن کا میں نے اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں میری والدہ نے بہت کوشش کی کہ میرے خیالات مذہبی ہوں ۔ میری عمر بہت چھوٹی تھی جب کہ مجھے سردیوں میں بھی سورج نکلنے سے پہلے غسل کے لیے مجبور کیا جاتا جپ جی صاحب وغیرہ کا پاٹھ کرتا اور گوردوارہ میں جاتا ۔ تو کھانا دیا جاتا ورنہ نہیں ۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی سنتوں سادھوؤں اور مہاتماؤں کے ہاں جا کر کتھا وغیرہ سننے کے لیے تاکید ہوتی ۔ اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ پر زور دیا جاتا ۔ مذہبی اعتبار سے میرا ذہن بائیس برس کی عمر تک تو ان اثرات کو قبول کرتا رہا مگر اس کے بعد خیالات میں انقلاب سا پیدا ہو گیا ۔ اور اب جو کیفیت ہے وہ کوئی راز نہیں ۔ اس کا اظہار ریاست کے صفحات سے ظاہر ہے ۔ مگر بچپن میں بھائی گورداس دیہ سکھوں میں گورو صاحب کے بعد سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیت ہیں) کے کلام میں سے چند اشعار پڑھے تھے جو اب تک ذہن میں تازہ ہیں مبارک حسین کو جو جواب دیا گیا وہ بھی ان اشعار کے اثرات کا نتیجہ ہے ۔ ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے :

"ایک بھنگن مرے ہوئے کتے کے گوشت کو مردہ انسان کی کھوپڑی میں ڈال کر لیے جا رہی تھی ۔ یہ گوشت شراب میں پکایا گیا تھا ۔ اس میں سے گندی بو آ رہی تھی اور اسے ایک ایسے گندے کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا جو عورت کے حیض کے خون میں آلودہ تھا ۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ایک شخص نے بھنگن سے سوال کیا ۔ کہ کتا پلید، مردہ انسان

Marfat.com

کی کھوپڑی قابلِ نفرت۔ شراب پلید۔ عورت کے حیض کا کپڑا پلید، جس سے کوئی چھونا بھی پسند نہ کرے۔ اس میں سے بدبو آرہی ہے۔ پھر اس کھوپڑی پر نقاب کیوں ڈال رکھا ہے۔ اس کو چھپانے کا کیا فائدہ۔ تو بھنگن نے جواب دیا۔ کہ گو یہ تمام اشیا انتہائی گندی اور قابلِ نفرت ہیں۔ مگر غدار کی نگاہ ان سے بھی بُری ہے۔ ان اشیا کو میں ڈھانپ کر اس لیے لے جا رہی ہوں۔ کہ کسی غدار کی بُری نظر لگنے سے یہ اور زیادہ خراب ہو جائینگی۔"

غداروں کے متعلق میرے دلی جذبات کا اظہار ایک اور واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔ ابھی حال کا ذکر ہے۔ "ریاست" کے "ناقابلِ فراموش" کالم میں ایک جگہ مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کا ذکر آ گیا تھا جو "ریاست" میں مترجم تھے اور بعد میں مبارک حسین کی طرح نواب بھوپال کے روپیہ سے خرید لیے گئے۔ اس مضمون کو دیکھ کر میرے دوست بناز صاحب تحصیلدری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ کا خط ایڈیٹر "ریاست" کے نام پہنچا۔ جس میں آپ نے لکھا۔ کہ پیارے لال صاحب شاکر آجکل بہت مصیبت میں ہیں۔ لکھنؤ میں ایک دوست کے مکان میں رہتے ہیں۔ بیمار اور قابلِ رحم حالت میں ہیں اور یہ ہمدردی کے مستحق ہیں ان کے متعلق آئندہ کچھ نہ لکھا جائے۔ اور معاف کر دیا جائے۔ اس خط کا جواب ایڈیٹر ریاست نے نیاز صاحب کو بہت مختصر دیا جو یہ تھا:

"غدار مستحق ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر کو بھی ٹھوکر لگائی جائے۔"

میرے یہ جذبات شاید بعض حلقوں میں ناپسند کیے جائیں گے۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ مجھے غداروں سے بہت سخت نفرت ہے اور کوئی غدار کسی فرد واحد کے ساتھ غداری کرے یا ملک و قوم کے ساتھ میرے خیال میں وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی زندگی مصائب و مشکلات میں بسر ہو۔ مرنے کے بعد اس کو دوزخ یا عذاب نصیب ہو۔ اور لوگ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کو ٹھوکریں لگائیں۔

سی آئی ڈی کے "معتبر" رپورٹر

کرسمس کا زمانہ کلکتہ میں بہت پُررونق ہوتا ہے۔ اور لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ چند برس پہلے میں بھی کئی بار کرسمس کے دنوں کلکتہ گیا۔ ایک بار کلکتہ گیا تو وہاں میجسٹک ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ ہوٹل اخبار "سیکس مین" کے دفتر کے قریب تھا اور اس کے مالک مہاشہ کرشن ایڈیٹر "پرتاپ" کے واقف تھے میں نے ہوٹل کی کتاب میں اپنا نام و پتہ لکھا۔ تو ہوٹل کے مالک کو معلوم ہو گیا۔ کہ میں فلاں شخص ہوں۔ مگر میری کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ کیونکہ میں بغیر ضرورت کے بلا وجہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوا۔ ریل کے طویل سفر میں بھی ہمراہیوں سے کبھی نہ پوچھا۔ کہ کہاں جاؤ گے اور نہ بتایا۔ کہ میں کون ہوں اور پڑوسیوں کے متعلق کئی کئی برس تک علم نہ ہوا کہ یہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

میں جب کبھی بمبئی۔ کلکتہ یا کسی دوسرے بڑے شہر میں جاؤں۔ تو میں اپنے جانے کی اطلاع سوائے

Marfat.com

ایک آدھ گھر سے دوست کے کسی دوسرے کو نہیں دیتا۔ کیونکہ اطلاع ہونے کی صورت میں سیر و تفریح اور بزنس میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ عام دوستوں سے اس روز ملتا ہوں۔ جب واپس جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ میں اس سفر میں کلکتہ ایک ہفتہ کے قریب ٹھہرا۔ سیر و تفریح میں بھی مصروف رہا اور بزنس کے لیے بھی بڑی بڑی فرموں کے مالکان سے ملا۔ جب وہاں سے روانہ ہونے میں دو دن باقی تھے۔ تو عنایت صاحب مرحوم ایڈیٹر اخبار "چونچ" کو معلوم ہوا۔ کہ میں کلکتہ میں ہوں۔ عنایت صاحب فلمی اخبار نکالتے تھے۔ بہت دلچسپ آدمی تھے اور آپ کا زیادہ وقت طوائفوں اور فلم ایکٹرسوں کے ہاں گزرتا تھا۔ آپ صبح کے وقت ملنے کے لیے تشریف لائے۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں اس زمانہ فلم ایکٹریس مس کجن کو بہت عروج حاصل تھا۔ آپ مجھ سے مل کر گئے تو مس کجن کے ہاں پہنچے اور آپ نے مس کجن کو بتایا۔ کہ دیوان سنگھ کلکتہ میں ہے اور میجسٹک ہوٹل میں مقیم ہے۔

میں دوپہر کے وقت اپنے کمرہ میں لیٹا ہوا تھا تو ہوٹل کے دفتر کا چپڑاسی آیا۔ کہ کوئی صاحب ٹیلیفون پر بلاتے ہیں۔ میں ٹیلیفون پر گیا اور پوچھا۔ کہ کون صاحب ہیں تو جواب ملا۔ کہ میں مس کجن ہوں۔ عنایت صاحب ایڈیٹر "چونچ" سے معلوم ہوا۔ کہ آپ کلکتہ آئے ہوئے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر شام کو میرے ہاں چائے پر آئیے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں ایک دو دن میں واپس جا رہا ہوں۔ کام بہت زیادہ ہے۔ اس لیے حاضر نہ ہو سکوں گا۔ معافی چاہتا ہوں اور آپ کا شکرگزار ہوں۔ اس پر مس کجن نے کہا۔ کہ نہیں چاہے کچھ ہو آپ ضرور تشریف لائیے۔ میں نے پھر کہا۔ کہ میں نہ آسکوں گا۔ آپ نے پھر اصرار کیا اور کہا۔ کہ میں ہوٹل میں ہی رہوں۔ شام کو چار بجے وہ اپنی کار لینے کے لیے بھیجیں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

شام کو چار بجے مس کجن کی موٹر میں عنایت صاحب تشریف لائے۔ میں ان کے ساتھ مس کجن کے ہاں گیا۔ دو تین اور اصحاب بھی موجود تھے۔ چائے پر باتیں ہوتی رہیں۔ مس کجن نے اپنے گانے کے گراموفون ریکارڈ سنائے جو اسی ہفتہ بھرے گئے تھے۔ جب رخصت ہونے لگا تو مس کجن نے کہا۔ کہ رات کو دس بجے تھیٹر میں آئیے جہاں کہ وہ کام کرتی ہیں۔ وہ اپنا کام دکھانا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا میں نہ آسکوں گا۔ مگر آپ نے عنایت صاحب سے کہا کہ لازمی طور پر لے کر آئیے۔

اس روز میں کچھ دوستوں سے مل چکا تھا کیونکہ کلکتہ سے واپس دہلی جانے والا تھا۔ ہوٹل واپس پہنچنے کے بعد مس کجن کی کار کو تو چھوڑ دیا۔ ایک ٹیکسی لی اور سردار سمپورن سنگھ انسپکٹر پولیس کے مکان پہنچا۔ یہ میرے ہم وطن اور رشتہ میں بھتیجے ہوتے تھے۔ چند منٹ ان سے باتیں کیں اور ان کے بچوں کو کچھ دے کر دوسرے دوستوں سے ملنے گیا۔ دوستوں سے ملنے کے بعد مارکیٹ میں گیا وہاں سے کچھ سامان اور ایک درجن چھوٹے طوطے خریدے (یہ طوطے چڑیوں کے سائز اور مختلف رنگوں کے بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور غالباً جاپان سے آتے ہیں) سامان خریدنے کے بعد واپس ہوٹل پہنچا۔ کھانا کھایا۔ دس بجے کے قریب عنایت صاحب تشریف لائے اور ان کے ساتھ تھیٹر گیا (یہ تھیٹر غالباً ایک

Marfat.com

رائے بہادر کا تھا جس میں مس کچن ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم تھیں۔ اور چونکہ رائے بہادر ان پر بہت مہربان تھے۔ ان کی پوزیشن تھیٹر میں ایک ڈکٹیٹر کی سی تھی۔ یعنی جو چاہتیں کرتیں) ہم لوگ تھیٹر میں پہنچے وہاں رائے بہادر صاحب ملے۔ راؤ راجہ سیکر بھی تشریف فرما تھے۔ رات کو دو بجے تک تھیٹر دیکھا۔ تھیٹر دیکھنے کے بعد میں ہوٹل پہنچا اور کپڑے بدل کر لیٹا تھا۔ کہ نیند آ گئی۔ ابھی آنکھ لگے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ کہ میرے کمرہ کے دروازہ کو کسی نے کھٹ کھٹایا۔ میں نے سمجھا کہ ہوٹل ہے۔ کسی شخص نے غلطی کے باعث اس کمرہ کو کسی دوسرے کا کمرہ سمجھ لیا ہوگا۔ میں نے آواز دی۔ آپ غلط کمرہ کو کھٹ کھٹا رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر دروازہ کھٹ کھٹایا گیا۔ میں نے خیال کیا۔ کہ رات کو کوئی مسافر شراب پیئے آیا ہے۔ جو میرے کہنے کے باوجود پھر کھٹ کھٹایا ہے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" میرے اس ڈانٹنے کے بعد کوئی جواب نہ آیا۔ مگر دروازہ پھر کھٹ کھٹایا گیا۔ مجھے بیحد غصہ آیا۔ میں اٹھا اور دروازہ کھولا۔ تاکہ رات کے اڑھائی تین بجے دروازہ کھٹ کھٹانے والے کو دیکھوں۔ کہ کون ہے اور کیوں ایسا کر رہا ہے۔ جب دروازہ کھولا تو دیکھا۔ کہ ایک انسپکٹر پولیس اور اس کے ساتھ چھ سات سب انسپکٹر اور کنسٹیبل وردیوں میں موجود تھے۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ کہ کیا آپ کا نام سردار دیوان سنگھ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ ہاں۔ میرے اس کہنے پر یہ لوگ کمرہ کے اندر آ گئے اور انسپکٹر نے کہا۔ کہ "تلاشی لینی ہے اور آپ کو گرفتار کرنا ہے۔" میں نے اطمینان کے ساتھ کہا۔ بہت اچھا۔ پہلے تلاشی لے لیجئے۔

ان لوگوں نے میرے سامان کی تلاشی لینی شروع کی۔ ہر چیز اور ہر کاغذ کو غور کے ساتھ دیکھتے اور پڑھتے۔ ان کے ساتھ ایک سکھ بزرگ بھی تھے جو غالباً ہیڈ کنسٹیبل ہوں گے۔ یہ اس لیے تھے۔ کہ اگر کوئی گورمکھی کا خط وغیرہ ہو تو پڑھ سکیں۔ جب انہوں نے میرے اٹاچی کیس کی تلاشی لی۔ تو اس میں انہوں نے ریوالور دیکھا۔ ریوالور کو دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے کوئی گمشدہ شے مل گئی ہو۔ یہ مسرت و خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ریوالور کو انہوں نے لیا۔ تو اس میں سے گولیاں نکال کر علیحدہ کیں۔ یہ چھ گولی کا ریوالور تھا۔ ریوالور پر قبضہ کرنے کے بعد انسپکٹر نے مجھ سے "اینٹروگیشن" شروع کیا۔ یہ ریوالور کہاں سے لیا۔ میں نے کہا دہلی سے۔

کس سے لیا۔

الٰہی بخش اینڈ سنز سے۔

یہ الٰہی بخش اینڈ سنز کون ہیں۔

سوداگران بندوق۔

تو کیا یہ ناجائز ریوالور بھی فروخت کرتے ہیں۔

نہیں۔

تو پھر یہ ریوالور انہوں نے آپ کو کیوں کر دیا۔

Marfat.com

لائسنس کے باعث۔

اوہ! ہمیں اب یہ بھرّا دیتے ہو۔ کہ لائسنس کے ساتھ۔ لائسنس کہاں ہے؟

میں نے اسی اٹاچی کیس کے اوپر کے حصہ میں سے ریوالور کا لائسنس نکال کر ان کو دیا۔ انہوں نے لائسنس کو دیکھا۔ کبھی اسے اوپر دیکھتے ہیں۔ کبھی نیچے۔ کبھی دستخطوں کو۔ کبھی مہر کو۔ جب انہوں نے اس لائسنس کو اچھی طرح سے دیکھا تو اس کے بعد یہ لوگ بہت مایوسی سی محسوس کر رہے تھے۔ گویا کہ ہاتھ آیا شکار جال سے نکل گیا۔ ان لوگوں نے سامان کو اچھی طرح سے دیکھا۔ جب اور کوئی شے نہ نکلی تو مجھے گرفتار کر کے اپنے ساتھ ایک تھانہ میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے روزنامچہ میں رپورٹ درج کی۔ کہ تلاشی لی گئی۔ تلاشی میں ایک ریوالور اور ایک لائسنس نکلا۔ جو قبضہ میں لیا گیا۔ یہ لائسنس غالباً جعلی ہے۔ اور ملزم کو صبح کمشنر صاحب بہادر پولیس کے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت رات کے چار بجے ہوں گے سردیوں کا زمانہ۔ دسمبر کا مہینہ۔ آٹھ بجے سورج نکلا۔ اور میں دس بجے تک تھانہ کے دفتر کے اسی کمرہ کے اندر ایک پولیس کنسٹیبل کی نگرانی میں بیٹھا رہا۔ دس بجے یہ لوگ مجھے سی آئی ڈی (جس کو کلکتہ میں سپیشل برانچ کہتے ہیں) کے دفتر لے گئے۔ وہاں مجھے ایک برآمدہ میں کرسی پر بٹھا دیا گیا اور میں انتظار کرنے لگا۔ کہ اب کمشنر پولیس کے سامنے پیش کیا جاؤں گا۔ اس سپیشل برانچ کے متعلق معلوم ہوا۔ کہ یہ وہی دفتر ہے۔ جس کو بنگال کے انارکسٹوں کے متعلق سپیشل حقوق حاصل ہیں۔ یعنی کمشنر پولیس جس شخص کو چاہے پندرہ روز کے لیے بغیر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے یا ریمانڈ لیے اپنے قبضہ میں جہاں چاہے رکھ سکتا ہے۔ وہاں کے کنسٹیبلوں سے جو میری نگرانی پر تھے باتوں باتوں میں معلوم ہوا۔ کہ تمام بنگال کے انارکسٹوں کے معاملات اس دفتر کے ہاتھ میں ہیں اور اس کا سٹاف تمام بنگال میں ایک جال کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ بنگال میں انارکسٹ کافی تعداد میں ہیں۔

مجھے معلوم ہوا کہ کمشنر پولیس تو انگریز ہے جو دوسرے صوبجات کے انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ کے برابر سمجھا جاتا ہے اور ڈپٹی کمشنر پولیس ایک ہندوستانی عیسائی ہیں۔ جن کا نام غالباً مسٹر بنرجی تھا اور یہ اس سپیشل برانچ کی اوپر کی منزل میں ہی رہتے تھے۔ میں دس بجے سے چار بجے شام تک اس سپیشل پولیس کے دفتر کے برآمدہ میں ایک کرسی پر بیٹھا رہا۔ میرے کسی دوست کو میرے متعلق کوئی علم نہیں کہ کیا ہوا اور میں کہاں ہوں۔ بیٹھا بیٹھا تنگ آ گیا۔ نہ کوئی بات کرنے والا۔ نہ کوئی اخبار نہ کتاب جس سے وقت کٹے۔

چار بجے ڈپٹی کمشنر پولیس اپنے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر دفتر میں تشریف لائے۔ تو مجھے ان کے سامنے پیش کیا گیا اور انٹروگیشن یعنی گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو یہ تھا:

آپ کا نام۔

دیوان سنگھ۔

کہاں رہتے ہیں۔

دہلی میں۔

Marfat.com

کلکتہ کب آئے۔

ایک ہفتہ ہوا۔

کیوں آئے۔

کرسمس دیکھنے اور بزنس کے متعلق لوگوں سے ملنے۔

آپ بمبئی کیوں نہیں گئے۔ کلکتہ کیوں آئے۔

کیونکہ کرسمس کے دنوں کلکتہ میں بہت رونق ہوتی ہے۔

کیا آپ کو کبھی سزا ہوئی۔

میرا خیال ہے کبھی نہیں ہوئی۔

کیا آپ کبھی گرفتار کیے گئے۔

درجنوں بار۔

(حیران ہوکر) درجنوں بار۔ کس الزام میں۔

مختلف الزامات میں۔

وہ الزامات کیا تھے۔

کوکین۔ امانت میں خیانت۔ پرنس پروٹیکشن ایکٹ۔ بغاوت۔ توہین۔ مارپیٹ کرنا اور موٹر کو تیز چلانا وغیرہ۔

خوب۔ یہ گرفتاریاں کب ہوئیں۔

پچھلے کئی برس میں۔

کلکتہ میں کس کس سے ملے۔

سردار نرنجن سنگھ طالب ایڈیٹر "ویش درپن" سر ایس سرما ایم ایل اے ایڈیٹر "وپ" عنایت صاحب ایڈیٹر "چونچ" سردار کپور سنگھ بڑے سوداگر موٹر۔ مسٹر دینا ناتھ آف "وشوامتر" سردار سمپورن سنگھ انسپکٹر پولیس اور مس کجن وغیرہ سے۔

آپ مس کجن سے کیوں ملے۔

اس نے چائے پر بلایا تھا۔

(مسکراتے ہوئے) خوب۔ ایڈیٹروں کی چائے پارٹی فلم ایکٹرسوں کے ہاں ضرور ہوتی ہے۔

(میں مسکراتے ہوئے) آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری گرفتاری ہوٹل میں ہوئی۔ اگر مس کجن کے ہاں آپ گرفتار کرتے تو آج اخبارات میں شائع ہوتا۔ ایڈیٹر "ریاست" مس کجن کے ہاں پکڑا گیا۔

یہ سن کر ڈپٹی کمشنر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

اس قہقہہ کے بعد میں نے سنجیدگی کے ساتھ ڈپٹی کمشنر سے پوچھا۔ کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو بتائیے کہ میری گرفتاری کیوں ہوئی اور اس کا سبب کیا ہے۔

Marfat.com

مہاراجہ پٹیالہ کرسمس کے باعث کلکتہ آئے ہیں اور یہاں ہیں۔ ہماری اطلاع ہے کہ آپ ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور آپ بہت بڑے انارکسٹ ہیں۔

یہ سن کر میں مسکرا دیا اور کہا۔ کہ آپ لوگوں کے ذرائع واقفیت بلاشبہ بہت وسیع اور قابل اعتماد ہیں۔ میرے یہ الفاظ سن کر ڈپٹی کمشنر کچھ تھوڑے سے جھینپ گئے۔ اور پھر باتیں شروع ہوئیں آپ نے کہا۔ ریوالور کب لیا۔

چند برس ہوئے۔

کیا یہ لائسنس اصلی ہے یا جعلی۔

آپ دیکھ لیجئے کہ اصلی ہے یا جعلی۔

ہاں! ہم نے دہلی سے پوچھا ہے۔ ابھی تک وہاں سے جواب نہیں آیا۔ معلوم تو ہوتا ہے کہ جعلی نہیں۔ کیونکہ کسی شخص کو جعلی لائسنس رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ ناجائز ریوالور رکھنے والا ریوالور کو چھپا کر پوشیدہ رکھ سکتا ہے۔ آپ کا سردار سمپورن سنگھ انسپکٹر پولیس سے کیا تعلق ہے۔

وہ میرے رشتہ میں بھتیجے ہوتے ہیں۔

اس پر آپ نے سردار سمپورن سنگھ کے ساتھ ٹیلی فون پر بات چیت کی۔ جو یہ تھی:

کیا آپ دہلی کے سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کو جانتے ہیں۔

ہاں۔ اچھی طرح سے۔ وہ میرے رشتہ میں چچا ہوتے ہیں۔ کل مجھ سے ملنے کے لیے بھی آئے تھے۔ آج وہ چلے گئے۔ کیونکہ انہوں نے سٹیشن پر اپنے لیے سیٹ ریزرو کرائی تھی۔

کیا وہ آج جانے والے تھے۔

ہاں وہ کل مجھ سے کہتے تھے کہ آج جائیں گے۔ انہوں نے اپنے لیے تین بجے والی گاڑی میں ایک برتھ ریزرو کرائی تھی۔

وہ گرفتار ہیں اور یہاں سپیشل برانچ میں ہیں۔

گرفتار ہیں۔ کس جرم میں؟

ان پر الزام یہ ہے کہ وہ مہاراجہ پٹیالہ کو قتل کرنے کے لیے کلکتہ آئے۔

کیا ان کی تلاشی میں بھی کچھ نکلا۔

ہاں۔ ایک ریوالور۔

(حیرانی کے ساتھ) ریوالور۔ بغیر لائسنس کے ریوالور۔

ریوالور کا لائسنس بھی ساتھ ہے۔

اگر ریوالور کا لائسنس بھی ساتھ ہے۔ تو یہ تو سردار دیوان سنگھ کے لیے کریڈٹ کی بات ہے کہ وہ قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔

ہاں۔ یہ ٹھیک ہے مگر ہمارے آدمی نے جو پنجاب کا سکھ ہے اور ہمارے محکمہ میں ملازم ہے

Marfat.com

اطلاع دی تھی۔ کہ سردار دیوان سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کے پرانے دشمن ہیں اور مہاراجہ کو قتل کرنے کے لیے کلکتہ آئے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ فوراً موٹر میں میرے پاس آ جیئے۔

ڈپٹی کمشنر کا یہ ٹیلی فون سن کر سردار سمپورن سنگھ سپیشل برانچ میں پہنچے۔ وہاں ان سے ڈپٹی کمشنر کی وہی باتیں ہوئیں۔ جو ٹیلی فون پر ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ آپ کو ریوالور کا لائسنس کیوں ملا۔

مہاراجہ پٹیالہ وغیرہ متعدد والیانِ ریاست دشمن تھے اور خیال تھا۔ کہ یہ لوگ شاید نقصان پہنچائیں۔ آپ نے اگر دہلی جانے کے لیے اپنی برتھ ریزرو کرائی تھی۔ تو کیا آپ کے پاس وہ ٹکٹ موجود ہے جو آٹھ آنہ ریزرویشن فیس دے کر لیا جاتا ہے۔

ہاں (میں نے اپنی پاکٹ بک میں سے ٹکٹ نکال کر دکھایا) یہ ٹکٹ ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے جب یہ ٹکٹ دیکھا تو ان کو یقین ہو گیا۔ کہ ان کے سی آئی ڈی کے برخوردار نے جو اطلاع اپنے محکمہ کو دی تھی وہ غلط تھی۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے افسوس کا اظہار کیا۔ کہ خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا معمولی بات ہے۔ ہم لوگ تو تکلیفوں کے لیے ہی پیدا ہوئے۔ ہمارے لیے یہ کوئی نئی اور غیر متوقع بات نہیں۔ جب تک زندگی ہے تکلیفیں ہمارا ساتھ دیں گی۔

اس گفتگو کے بعد ڈپٹی کمشنر پولیس نے فیصلہ کیا۔ کہ میں سردار سمپورن سنگھ کے ساتھ ہوٹل میں جاؤں وہاں سے سامان لے کر سردار سمپورن سنگھ مجھے اپنے تھانہ میں لے جائیں۔ وہاں اپنے پاس رات کو رکھیں۔ کیونکہ دہلی کے لیے میل شام کو چار بجے چلتی تھی۔ اگلے روز مجھے وہ سٹیشن پر لے جائیں اور گاڑی میں بٹھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ کریں کہ دیوان سنگھ کلکتہ سے چلا گیا ہے۔ چنانچہ سردار سمپورن سنگھ سرکاری موٹر میں میرے ساتھ ہوٹل آئے۔ خریدے گئے سلطوں کے لیے دن بھر دانہ نہ پانی۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ ان کو دانا اور پانی ڈالا۔ سامان باندھا اور اسی گاڑی میں ہم لوگ مع سامان سردار سمپورن سنگھ کے گھر گئے۔ ان کا مکان ان کے تھانہ کے اوپر تھا۔ سردار سمپورن سنگھ نے میری یعنی ملزم کی آمد کی رپورٹ تھانہ کے روزنامچہ میں لکھی کہ میں ڈپٹی کمشنر پولیس کے ہاں سے اس تھانہ میں گرفتاری کی حالت میں لایا گیا ہوں۔ ملزم رات بھر رکھا جا کر کل دوپہر کو گاڑی میں سوار کرایا جائے گا۔ (رپورٹ لکھنے کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ موٹر میں سیر کے لیے گئے۔ دو تین گھنٹہ تک سیر کرتے رہے۔ واپس آئے۔ بستر تیار تھا میں سو گیا۔ صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہوا۔ چائے پی۔ سردار نرنجن سنگھ وغیرہ دوستوں کو رات کو ہی علم ہو گیا تھا۔ کہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اور رہا ہو کر سردار سمپورن سنگھ کے تھانہ میں ہوں یعنی چچا جان، برخوردار بھتیجہ کی حراست میں ہیں۔ یہ دوست یہاں ملنے کے لیے آ گئے۔ دو تین بجے تک یہاں ہی دوستوں کی محفل گرم رہی۔ تین بجے میں اپنے دوستوں اور اپنے سامان کے ساتھ سردار سمپورن سنگھ کی حراست میں ہی سٹیشن آیا اور گاڑی میں سوار ہوا۔ اور سردار سمپورن سنگھ نے اپنے افسروں کے حکم

Marfat.com

کی تعمیل کرنے کے بعد سپیشل پولیس میں رپورٹ کی ہوگی۔ کہ ملزم دیوان سنگھ ان کی موجودگی میں ریل میں سوار ہو کر دہلی چلا گیا ہے اور اب مہاراجہ پٹیالہ کو کلکتہ میں کوئی خطرہ نہیں۔

علامہ مشرقی کی گرفتاری و رہائی

میں دہلی جیل میں تھا۔ رات کا وقت تھا۔ کہ بڑے دروازہ کی طرف سے اس وارڈ کی طرف جو جیل کے جنوب مغربی کونہ میں ہے۔ کچھ آدمی جاتے آتے معلوم ہوئے۔ میں نے پہرہ والے ایک نمبردار سے پوچھا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ آج یہ گڑبڑ کیسی ہے۔ تو اس نمبردار نے جا کر پتہ لیا اور واپس آ کر بتایا۔ کہ کوئی بڑا لیڈر جیل میں لایا گیا ہے۔ اس نمبردار کو اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ کون ہے۔ میں معلوم کرنے کا خواہش مند تھا۔ کہ کون ہے۔ مگر رات کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ صبح اٹھتے ہی جب اس کمرے کا جس میں ہم لوگ تھے۔ دروازہ کھلا۔ تو میں نے ایک وارڈر سے پوچھا۔ اس وارڈر نے بتایا۔ کہ خاکساروں کے لیڈر علامہ مشرقی صاحب گرفتار کیے جا کر جیل میں لائے گئے ہیں۔ جیل کے اندر بھی ان پر سخت پہرہ ہے کہ کوئی شخص ان سے بات چیت نہ کرے۔ تاکہ یہ اپنے مقلدین کو جیل سے باہر کوئی پیغام نہ بھیج سکیں کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا۔ کہ جیل سے باہر خیمے نصب ہو چکے ہیں اور پولیس جیل کی دیوار سے باہر پہرہ دے رہی ہے۔ تاکہ اگر خاکسار جیل پر حملہ کریں تو ان کو روکا جا سکے۔

میں نے دوپہر کے وقت بھنگیوں کے نمبردار کو بلایا اور اس کی معرفت (چونکہ علامہ مشرقی کے پاس صرف بھنگی ہی صفائی کے لیے جا سکتے تھے) علامہ کو پیغام بھیجا۔ کہ کوئی خواہش ہو تو بتائیے۔ میں یہاں ہوں اس لیے ایک طرح سے میرا فرض ہے کہ میں بطور میزبان کے آپ کی خدمت انجام دوں۔ علامہ کا جواب شکریہ کی صورت میں پہنچا۔ اس وائیوا ووسی (وائیوا ووسی اس امتحان کو کہتے ہیں جو بغیر پرچوں یا کتابوں کے صرف زبانی سوالات پوچھ کر لیا جاتا ہے۔ انڈین سول سروس کے امتحان میں اکثر لڑکے وائیوا ووسی کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے کتابوں کی رٹ لگائی ہوتی ہے۔ عام واقفیت نہیں ہوتی۔ اور مختلف قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی سوالات کا جواب نہیں دے سکتے۔) کی مہمانی اور میزبانی کے علاوہ جیل میں کوئی خدمت انجام بھی کیا دی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں ہی سرکاری مہمان تھے۔ میں مولانا سے مل نہ سکا۔ کیونکہ ان کے پاس سوائے دو تین خدمت گزار قیدیوں اور بھنگی کے کسی دوسرے قیدی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر آپ کے حالات سے دلچسپی تھی۔ میں یہ حالات معلوم کرتا رہا۔ جس روز لاہور میں خاکساروں پر فائر ہوا اور غالباً بیس کے قریب خاکسار مارے گئے اور بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ اسی رات کو مولانا قرول باغ دہلی سے گرفتار کیے جا کر دہلی جیل میں لائے گئے تھے۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کے چند گھنٹے بعد یعنی اگلی صبح کو جو اخبارات آئے ان میں مولانا کی گرفتاری اور لاہور کے فائرنگ کی تفصیلات تھیں۔

Marfat.com

میں علامہ مشرقی سے آج تک کبھی مل نہیں سکا۔ کیونکہ کسی لیڈر سے بھی میں نے کبھی ملنے کی کوشش یا خواہش نہیں کی۔ اور صرف ان لیڈروں سے واقفیت ہے۔ جن کے ساتھ ذاتی اور گھر کے تعلقات ہیں۔ جیل میں میری خواہش تھی کہ آپ سے ملتا۔ اور خاکسارازم کے متعلق باتیں کرتیں گا۔ میں آپ سے مل نہ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی اجازت نہ تھی۔ میں آپ کے حالات معلوم کرنے میں مسلسل دلچسپی لیتا رہا۔ ووپیر گودام کے قیدی کلرک سردار پیارا سنگھ (یہ صاحب پہلے پوسٹ ماسٹر تھے اور ترن تارن کے رہنے والے تھے۔ ایک مقدمہ میں قید ہو گئے تھے) سے معلوم ہوا۔ کہ علامہ مشرقی نے اپنی خوراک اور ضروریات کے لیے ایک طویل فہرست پنسل سے لکھ کر بھیجی ہے۔ جس میں چاول گوشت مچھلی انڈے مرغی تمباکو قسم اعلیٰ۔ خالص گھی اور مصالحہ وغیرہ بیس کے قریب اشیاء ہیں۔ مولانا کے لیے منظوری تو سوا روپیہ روزانہ کی ہے۔ مگر یہ انڈنٹ کافی رقم کا ہے۔ جیل والے مولانا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کہ کل تو لاہور میں فائرنگ ہوا۔ خاکساروں کا ابھی پوسٹ مارٹم بھی ختم نہیں ہوا اور جو خاکسار گرفتار ہوئے ان کے گھروں میں ماتم چھا رہا ہوگا۔ مگر یہ نانا۔ قورمہ۔ پلاؤ اور مچھلی کے کباب اڑانے کی فکر میں ہیں۔ میں نے سردار پیارا سنگھ سے کہا۔ کہ وہ فہرست مجھے دکھا دیجئے۔ اس فہرست کے نہ تو جیل میں کسی ریکارڈ کے رکھنے کی ضرورت تھی اور نہ یہ کوئی سرکاری دستاویز تھی۔ سردار پیارا سنگھ نے علامہ مشرقی کے ہاتھ کی پنسل سے لکھی ہوئی یہ فہرست مجھے لادی اور میں اس فہرست کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور مجھے خیال آیا۔ کہ اگر یہی واقعات مہاتما گاندھی کے ساتھ پیش آتے تو وہ آج یقیناً مرن برت نہیں تو تین ہفتوں کا فاقہ ضرور شروع کر دیتے۔

اس فہرست کے پہنچنے کے دو گھنٹہ بعد سردار پیارا سنگھ ایک اور سلپ لے آئے جو مولانا نے سخت الفاظ کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجی اور جس میں تحکمانہ لہجہ میں شکایت کی گئی کہ سامان اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ اس کے بعد شام کو ایک اور سلپ پہنچی جس میں دوسری اشیاء کے علاوہ کاغذ پنسل وغیرہ کا بھی مطالبہ تھا۔ یہ سلپیں سردار پیارا سنگھ میرے پاس ہی چھوڑ گئے کیونکہ ان کے لیے یہ ایک بے معنی پرزے تھے۔ مگر میں نے ان کو بطور "تبرک" کے احتیاط سے اپنی کتابوں میں رکھ لیا جو اب بھی میرے پاس موجود ہیں اور شاید پچاس ساٹھ یا سو سال کے بعد یہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کر سکیں۔

مولانا بیچارے کو تو علم نہیں مگر ان کی ان تحریروں کو دیکھ کر جیل کے افسران کا مذاق اڑاتے تھے اور میں جب اس مذاق کے متعلق سنتا۔ تو مجھے بے حد افسوس ہوتا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر پنجاب میں سے سر سکندر حیات کی بیوروکریسی ختم کی جا سکتی ہے اور پنجاب کے زمیندارہ سسٹم پر چوٹ لگائی جا سکتی ہے تو صرف خاکساروں کے ذریعہ۔ کیونکہ احراریوں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ میں کوئی جان نہ تھی اور مسلم لیگی خود خان بہادروں اور خان صاحبوں کا ایک مجموعہ تھے۔ چنانچہ میں اسی لیے خاکسار تحریک کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا اور ان کے حق میں لکھتا اور میری اس خدمت بالعرایف

Marfat.com

کے باعث خاکساروں نے میری سلامی مقرر کی تھی۔ یعنی جب میں ان کے کیمپ میں جاؤں تو یہ سلامی دیں۔ مگر جب علامہ مشرقی کا ذہنی افلاس اور ان کی حرکات دیکھیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ علامہ کی رہنمائی میں خاکسار تحریک کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا۔ کہ علامہ کا کانگریس گورنمنٹوں کے زمانہ میں یوپی گورنمنٹ سے معافی مانگنا اور رہائی حاصل کرنا تعجب انگیز نہ تھا اور ایسا کمزور دل، لالچی اور عاقبت نا اندیش لیڈر گورنمنٹ کے ہاتھوں ہر وقت مارا جا سکتا ہے۔

مولانا چند روز دہلی جیل میں رہے۔ ان کے حالات کا میں بغور مطالعہ کرتا رہا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مولانا کسی تحریک کے آرگنائیزر کرنے میں یقیناً ایک لاجواب شخصیت ہیں مگر اس تحریک کو چلانا اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں۔ مولانا کے متعلق جیل کے اُن حالات کے بعد آپ کی دہلی جیل سے روانگی بے حد دلچسپ ہے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ جیل کے دروازہ کے باہر اور جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ مسلح پولیس کا پہرہ تھا تاکہ کوئی شخص جیل پر حملہ نہ کر سکے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر لوئیس جو دہلی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تھے، جیل میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ شہر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس متعدد انسپکٹر اور سب انسپکٹر اور موٹریں تھیں۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا۔ کہ علامہ کو ریل میں سوار کرا کر ویلور جیل (صوبہ مدراس) میں لے جائیں۔ جہاں کہ آپ نظر بند رکھے جائیں گے۔ مسٹر لوئیس جب ان کو جیل سے روانہ کرنے کے لیے جیل میں آئے تو بہت پریشان تھے۔ کیونکہ جیل سے کچھ فاصلہ پر خاکسار چکر لگا رہے تھے شہر میں خاکساروں کا اجتماع تھا۔ خاکسار عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ علانیہ تشدد کے حق میں ہیں۔ مسٹر لوئیس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ فکر تھی کہ جب وہ علامہ کو جیل سے باہر نکالیں گے۔ اگر علامہ نے دروازہ پر ہی جانے سے انکار کر دیا یا موٹر سے چھلانگ لگا دی۔ اور خاکساروں اور جیل یا پولیس کے حکام کے درمیان تصادم ہو گیا تو بہت بدنامی ہو گی اور شاید لاہور کی طرح یہاں بھی فائرنگ ہو یہ افسر اس تشویش میں تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔ کہ علامہ کو کس طریقہ سے جیل سے نکال کر امن اور خیریت کے ساتھ گاڑی میں سوار کرایا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال تھا۔ کہ خاکساروں کو علم ہو گیا تو شاید ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم یا ٹرین پر حملہ کر دیں۔

اس زمانہ دہلی جیل میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر گنیش داس آنند بہت ہوشیار اور سمجھدار افسر تھے۔ یہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں جیل مینول پر اتھارٹی سمجھے جاتے اور جب کبھی کسی افسر کو کوئی مشکل پیش آتی تو وہ ان سے مشورہ لیتا۔ ان کی قابلیت کے باعث مسٹر لوئیس ان پر بہت بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے۔ جب مسٹر لوئیس کو لالہ گنیش داس نے پریشان دیکھا تو آپ نے مسٹر لوئیس سے کہا کہ فکر نہ کیجیے۔ وہ خود سب انتظام کر دیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ طریقہ سے کام ہونا چاہیے چنانچہ علامہ کی روانگی وغیرہ کا تمام کام لالہ گنیش داس کے سپرد کر دیا گیا۔ آپ علامہ مشرقی کے پاس گئے۔ اور جاتے ہی ایک سنسنی پیدا کرنے والی خبر سناتے ہوئے علامہ سے ذیل کی گفتگو کی۔

Marfat.com

لالہ گنیش داس: علامہ صاحب مبارک ہو۔

علامہ: کیوں کیا بات ہے۔

لالہ گنیش داس: آپ کی رہائی کا حکم ہوگیا ہے مگر اس شرط پر کہ آپ صوبہ دہلی سے باہر نکل جائیں۔ اور کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔ تاکہ یہاں صوبہ دہلی کے علاقہ میں شور و شر نہ ہو۔ دہلی سے باہر آپ یوپی میں جائیے یا پنجاب میں۔ جہاں بھی آپ کی مرضی ہو جائیے۔ دہلی کا چیف کمشنر صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے علاقہ میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

علامہ: مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ میں چپ چاپ یہاں سے جانے کے لیے تیار ہوں۔

لالہ گنیش داس: گورنمنٹ چاہتی ہے کہ آپ پولیس کی نگرانی میں یہاں سے متھرا (جہاں کہ یوپی کا علاقہ ہے) تک جائیں اور وہاں سے جہاں چاہیں چلے جائیں۔

علامہ: میں تیار ہوں۔ کسی کو اس کا علم نہ ہوگا اور میں خاموشی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

لالہ گنیش داس: میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ جیل سے باہر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ میں ان سے آپ کے شرط قبول کرنے کے متعلق کہہ آؤں۔

لالہ گنیش داس یہ کہہ کر علامہ کے وارڈ سے باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر گھوم کر پھر واپس گئے اور کہا کہ سب فیصلہ ہو گیا ہے۔ سامان بندھوا لیجئے۔ چنانچہ دو قیدی لگا کر علامہ کا سامان بندھوایا گیا۔ علامہ نے خوشی و مسرت کے ساتھ خود اپنے سامان کو بندھوانے کی نگرانی کی۔ آپ نے حقہ اور تمباکو کو احتیاط سے علیحدہ رکھا۔ تاکہ متھرا کے راستہ میں وقت نہ ہو۔ کیونکہ مولانا ظفر علی کی طرح آپ بھی حقہ کے بہت شوقین ہیں۔ سامان تیار ہو گیا۔ تو لالہ گنیش داس نے علامہ کو یقین دلانے کے لیے کان میں کہا۔ کہ چونکہ لاہور میں بہت سے خاکسار مارے جا چکے ہیں۔ اس لیے چند روز یوپی کے کسی مقام پر رہیئے۔ فی الحال پنجاب میں نہ جائیے تو اچھا ہو۔ علامہ نے اس "نیک رائے" کا شکریہ ادا کیا اور آپ مع سامان متھرا کے لیے روانہ ہوئے۔ جیل میں آپ کے استقبال یا روانگی کے "پروسیشن" میں شامل ہونے کے لیے مسٹر لوئیس، سٹی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس خان بہادر خواجہ (مجھے نام یاد نہیں رہا۔ یہ بیچارے دہلی میں بیمار ہو گئے تھے اور غالباً ان کا اروِن ہسپتال میں ہی انتقال ہو گیا تھا) اور کئی انسپکٹر و سب انسپکٹر وغیرہ مع کار کے موجود تھے۔ علامہ مع سامان و حقہ کے موٹر میں بیٹھے۔ ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ تھے۔ آپ کو خاموشی کے عالم میں نئی دہلی کے سٹیشن پر لایا گیا۔ جہاں مدراس جانے والی گرینڈ ٹرنک ایکسپریس منتظر تھی۔ ریلوے سٹیشن پر پہنچتے ہی آپ کو سیکنڈ کلاس کے ریزرو خانہ میں سوار کرایا گیا جو پولیس کو لے کر بڑے سٹیشن سے لایا تھا۔ دہلی پولیس کے افسروں نے علامہ کو خدا حافظ کہا اور گاڑی روانہ ہوئی۔

متھرا کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں پہنچنے سے پہلے علامہ اسی خیال میں تھے کہ وہاں آپ آزاد کر دیے جائیں گے۔ گاڑی جب متھرا کے سٹیشن پر پہنچی تو آپ اپنا سامان سنبھالنے اور قلیوں سے

Marfat.com

سامان اٹھوانے کے لیے اپنی سیٹ سے اٹھے۔ آپ کی اس جلد بازی کو دیکھ کر ساتھ جانے والی پولیس کے قافلے کے افسر نے آپ کو بتایا کہ حضرت متھرا آپ نہ اتر سکیں گے۔ صوبہ مدراس کے ویلور جیل میں جائیں گے۔ جہاں کہ آپ کو تا حکم ثانی نظر بند کیا جائے گا۔

علامہ مشرقی کے تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی شے کو حاصل کرنا اور اس کو قائم رکھنا علیٰحدہ علیٰحدہ حیثیتیں ہیں۔ یعنی بعض لوگ ایک شے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ بعض حاصل نہیں کر سکتے مگر اس کو قائم رکھ سکتے ہیں اور بعض حاصل بھی کر سکتے ہیں اور اس کو قائم بھی رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی کسی تحریک کو جاری بھی کر سکتے تھے اور اس کو قائم بھی خوب رکھ سکتے تھے۔ پنڈت جواہر لال کسی تحریک کو غالباً جاری نہیں کر سکتے مگر اس کو قائم خوب رکھ سکتے ہیں۔ ماسٹر تارا سنگھ نئی تحریک جاری نہیں کر سکتے اس کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ مسٹر جناح تحریک جاری کر سکتے تھے اس کو قائم رکھنے کی ان میں صلاحیت بہت کم تھی۔ مولانا محمد علی کسی تحریک کو جاری کرنے کی بھی قابلیت رکھتے تھے اور اس کو قائم رکھنے کی بھی۔ بھائی پرمانند میں کسی تحریک کو جاری کرنے کی قابلیت بالکل نہ تھی تحریک کو قائم ایک حد تک رکھ سکتے تھے۔ مرحوم لالہ لاجپت رائے میں تحریک کو جاری کرنے کی بہت بڑی قابلیت تھی مگر تحریک کو قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ اسی طرح علامہ مشرقی میں کسی تحریک کو آرگنائز کرنے اور اس کو جاری کرنے کی بہت بڑی قابلیت اور صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ آپ طبعاً بزدل اور کمزور ہیں اور خطرات کو لبیک نہیں کہہ سکتے اس لیے آپ کسی تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلا نہیں سکتے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ خاکسار تحریک موت کی ہچکیاں لے رہی ہے اور اگر یہ تحریک کسی ایسے لیڈر کو سپرد کر دی جاتی جو قربانی کر سکتا اور مہاتما گاندھی کی طرح موت کی پرواہ کرنے والا ہوتا تو اس مفید اور اچھی تحریک میں پھر زندگی پیدا کی جا سکتی تھی۔

برٹش گورنمنٹ کی والیانِ ریاست کے متعلق مصلحتیں

کئی برس کا ذکر ہے کہ سنٹرل انڈیا اور راجپوتانہ کے علاقہ میں چمبل ندی کے قریب ایک مشہور ڈاکو ڈونگر سنگھ تھا۔ یہ ڈونگر سنگھ ریاست گوالیار اور دھولپور کے درمیان کے جنگلات میں رہتا تھا اور گوالیار اور راجپوتانہ کی ریاستوں اور ضلع آگرہ کے جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے ہاں ڈاکے ڈالتا اس نے اپنی زندگی میں ڈاکے ڈال کر لاکھوں روپیہ پیدا کیا۔ اور غریبوں اور محتاجوں اور ضرورت مندوں کو لاکھوں روپیہ ہی خیرات میں دیا۔ جس جس علاقہ میں اس نے ڈاکے ڈالے وہاں کے امیر لوگ اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے۔ اور غریب لوگ اس کو دعائیں دیتے تھے۔

ریاستوں نے تو اس ڈونگر سنگھ کی گرفتاری کے لیے کوشش نہ کی۔ اور اگر کی تو برائے نام۔

Marfat.com

یعنی جب کبھی کوئی ڈاکہ پڑا۔ ڈاکہ کے دو چار روز بعد پولیس تفتیش و تحقیقات کے لیے ڈاکہ کے مقام پر پہنچ گئی۔ اور پڑوسیوں کے بیانات لے لیے۔ مگر آگرہ کے علاقہ کے لوگوں نے جب واویلا کیا تو گورنر یوپی نے ڈونگر سنگھ کی گرفتاری کے لیے ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ینگ کو مقرر کیا۔ یہ مسٹر ینگ غیر معمولی جفاکش افسر تھے۔ ریاست بھوپال میں بھی انسپکٹر جنرل پولیس رہے اور بعد میں غالباً یوپی میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

جب مسٹر ینگ انگریزی پولیس کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دھولپور اور گوالیار کے درمیانی علاقہ کی پہاڑیوں میں ڈونگر سنگھ کا تعاقب کر رہا تھا تو ڈونگر سنگھ کا میرے پاس خط پہنچا جو ہندی زبان میں لکھا تھا۔ (یہ خط پرانے کاغذات میں شاید اب بھی کہیں پڑا ہو گا۔) اس میں ڈونگر سنگھ نے لکھا۔ کہ راجپوتانہ کی ایک ریاست کا مہاراجہ جو اس کے ڈاکے ڈالنے میں امداد دیتا تھا اور اس سے ڈاکہ کے مال میں سے حصہ لیتا تھا۔ وہ اب مسٹر ینگ کی امداد کر کے اسے پکڑنے کی فکر میں ہے اور وہ (یعنی ڈونگر سنگھ) ایڈیٹر "ریاست" سے مل کر تمام اصل واقعات بتانا چاہتا ہے۔ اس خط میں اس نے یہ بھی لکھا۔ کہ یہ اخبار "ریاست" کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے دل میں ایڈیٹر "ریاست" کی بہادری کے لیے بہت عزت ہے۔ اور اس نے اخبار "ریاست" کی امداد کے لیے بیس ہزار روپیہ نقد اور کچھ جواہرات محفوظ رکھے ہیں۔ اور جب کبھی ایڈیٹر "ریاست" سے ملے گا تو یہ روپیہ اور جواہرات اس وقت اسے خود دے گا۔

میں اس خط کو دیکھ کر حیران تھا۔ کہ یہ خط کس نے بھیجا۔ اس لفافہ پر مہر ریاست گوالیار کے ایک ڈاک خانہ کی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اس خط لکھنے والے کو جواب دوں تو کہاں۔ یہ [illegible] بھی ڈونگر سنگھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لکھا۔ کہ اس کا لڑکا جھانسی کے سکول میں پڑھتا ہے اور اس نے اپنے لڑکے سے کہا ہے کہ وہ خود دفتر "ریاست" میں جا کر ایڈیٹر "ریاست" سے ملے اور تمام حالات بتائے۔

اس خط کے بعد ایک اور خط ملا جس میں ڈونگر سنگھ نے لکھا کہ اس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا مگر نہ تو لڑکے میں ایڈیٹر "ریاست" کے پاس جانے اور تمام حالات بتانے کی جرأت ہے اور نہ خود اس نے مناسب سمجھا کہ لڑکا جائے۔ کیونکہ لڑکا چھوٹی عمر کا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بچہ کسی وجہ سے گرفتار ہو جائے تو پولیس کے دباؤ میں آ کر تمام حالات بتا دے۔ یہ خود دہلی آ کر بتائے گا۔

اس خط کے ایک ہفتہ کے بعد ایڈیٹر "ریاست" کو ایک ٹیلیفون آیا۔ ٹیلیفون کرنے والے نے اپنا نام ڈونگر سنگھ بتایا۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ بندھیل کھنڈ کا رہنے والا ہے کیونکہ اس کی بات چیت میں بندھیل کھنڈی زبان جو جھانسی گوالیار اور دتیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے کے الفاظ زیادہ تھے۔ اس نے پوچھا کہ یہ ملنا چاہتا ہے۔ کہاں مل سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ کہ آپ دفتر "ریاست" میں آ جائیے۔ اس نے کہا۔ کہ وہاں لوگ ہوں گے۔ شاید اس کو کوئی پہچان لے اس لیے دفتر "ریاست" میں آنا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں نے کہا۔ کہ آپ رات کو آ سکتے ہیں تو اس نے جوا

Marfat.com

دیا۔ کہ اس کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ کسی شخص پر اعتبار نہیں کرتا کیونکہ اس کی گرفتاری کا بہت بڑا انعام مقرر ہے۔ اگر گرفتار ہو گیا تو پھانسی کی سزا کا سوال ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں کئی قتل کیے۔ یہ قدم قدم پر محتاط ہے اور میں اس سے کہیں شہر سے باہر ملوں۔ چنانچہ بات چیت کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ اگلے روز شام کے وقت میں دہلی دروازہ سے باہر جہاں پولیس کا سپاہی ٹریفک کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ پہنچ جاؤں۔ پہچان کے لیے میرے ہاتھ میں اخبار "ریاست" کا پرچہ ہو اور ڈونگر سنگھ وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچ جائے گا۔ وہاں سے ہم شہر سے باہر دور جا کر باتیں کریں گے

میں اگلے روز وقتِ مقررہ پر اپنی کار میں دفتر "ریاست" سے روانہ ہوا۔ چونکہ کئی والیانِ ریاست مخالف ہیں۔ خیال ہوا۔ کہ شاید کوئی سازش ہو۔ میں نے اپنے ریوالور میں گولیاں بھر کر اور لاک لگا کر ریوالور اپنے جیب میں ڈال لیا اور "ریاست" کا ایک پرچہ لے کر دہلی دروازہ سے باہر مقررہ جگہ پہنچ گیا۔ میں ایک گھنٹہ کے قریب وہاں ڈونگر سنگھ کا انتظار کرتا رہا مگر ڈونگر سنگھ نہ آیا۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ اس مہاراجہ کے تمام حالات معلوم کرتا جو ڈاکوؤں سے حصہ لے کر خود ڈاکے ڈلواتا ہے۔ مایوس ہو کر واپس دفتر میں چلا آیا۔ رات کو سوچتا رہا۔ کہ کیا معاملہ ہے ڈونگر سنگھ کیوں نہ پہنچا۔

اگلے روز دس بجے کے قریب پھر ٹیلی فون آیا۔ ڈونگر سنگھ نے اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اپنی وعدہ شکنی کے لیے معافی چاہی اور کہا۔ کہ جب وہ جائے مقررہ پر جانے کے لیے تیار ہوا تو اس کو خیال آیا۔ کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائے۔ اس کو وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس لیے نہیں آ سکا اور وہ اپنے کسی عزیز پر بھی بھروسہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کو زندگی میں بہت لوگوں نے دھوکا دیا۔ اور غداریاں کیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہ تھا تو آپ خط ہی نہ لکھتے اور نہ ملنے کی کوشش کرتے اس بات چیت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ دنیا میں کسی شخص کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اور اس کو ہر وقت یہ خوف ہے کہ نہ معلوم کون شخص روپیہ کے لالچ میں اس کو گرفتار کرا دے۔ اور انعام حاصل کرے ٹیلی فون میں اس نے بتایا۔ کہ یہ واپس دھولپور کے جنگلوں میں جا رہا ہے اور وہاں سے تمام حالات تفصیل کے ساتھ لکھے گا۔

اس ٹیلی فون کے دس پندرہ روز بعد ڈونگر سنگھ کا ایک طویل خط ہندی زبان میں ملا۔ جس میں اس نے اپنے حصہ دار مہاراجہ کے تمام حالات لکھے اور تاریخ وار بتایا۔ کہ اس نے کہاں کہاں ڈاکے ڈالے کتنا کتنا روپیہ اس نے ڈاکہ میں لیا۔ کتنا اس مہاراجہ کو دیا۔ اور ڈاکے کے سامان میں سے کون کون سا سامان اس وقت مہاراجہ کے ہاں کس کس جگہ کام آ رہا ہے۔ اس خط میں اس نے مجھ سے درخواست کی۔ کہ میں یہ تمام واقعات گورنمنٹ ہند تک پہنچا دوں اور ان کو اپنے اخبار میں بھی لکھوں۔

اس خط کو پڑھ کر میں کئی روز سوچتا رہا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ ایک والئی ریاست کا روپیہ کے لیے ڈاکے ڈلوانا۔ حصہ لینا۔ اس ڈاکو کو پناہ دینا۔ اور جب اس مہاراجہ پر شک کیا گیا تو اس مہاراجہ کا

Marfat.com

اس ڈاکو کے ساتھ غداری کر کے اس کو گرفتار کرانے میں امداد دینا کتنا بڑا ظلم اور بے ایمانی ہے۔

میں کئی روز سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہئیے۔ میں نے "ریاست" میں ان واقعات کے متعلق اس مہاراجہ کا نام لکھے بغیر ایک نوٹ بھی لکھا۔ مگر وہ کافی نہ تھا۔ اگر نام لکھتا ہوں اور کھلے الفاظ میں الزام لگاتا ہوں تو ان واقعات کا میرے پاس ثبوت کیا ہے۔ کئی روز سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس آگرہ کی معرفت یوپی کے گورنر تک یہ معاملہ پہنچانا چاہئیے۔ کیونکہ یہ ڈاکے زیادہ تر ضلع آگرہ میں ڈالے گئے تھے اور ڈونگر سنگھ کے خط کے مطابق واقعات کا ثبوت ضلع آگرہ سے مل سکتا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس آگرہ کو لکھا۔ کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس ڈونگر سنگھ کا خط آیا ہے۔ جس میں اس نے اپنے جرائم کا اقرار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ اس کے جرائم میں ایک مہاراجہ بھی شریک ہے۔ اور اس نے اپنے خط میں اس کا ثبوت بھی دیا ہے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا جواب آیا۔ کہ میں اس سے فوراً ملوں مگر میں اس کے بعد بیمار ہو گیا۔ خیال تھا کہ جب نواب بھوپال والے مقدمہ میں ہوشنگ آباد جاؤں گا تو راستہ میں آگرہ اتر کر اس سپرنٹنڈنٹ پولیس سے بھی ملوں گا اور خط دکھاؤں گا۔ میں بیماری کے باعث کئی روز تک ہوشنگ آباد نہ جا سکا۔ اتنے میں ڈونگر سنگھ کے بھائی (جس کا نام غالباً ہٹی تھا) کا خط آیا جس میں لکھا تھا۔ کہ ڈونگر سنگھ نمونیہ میں بیمار ہو کر چمبل ندی کے کنارے جنگل میں انتقال کر گیا ہے اور وہ آخری وقت بھی ایڈیٹر "ریاست" کو یاد کرتا رہا اور اس نے مرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" کو ہاتھ جوڑ کر جے رام جی کی لکھی جائے۔

ڈونگر سنگھ کے مرنے کے بعد اس خط کے مطابق گورنمنٹ کا تحقیقات کرنا اور مہاراجہ کو سزا دینا ممکن نہ تھا۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملنے کے لیے آگرہ نہیں گیا۔ کیونکہ اسے لاحاصل سمجھا۔ اس کے عرصہ بعد ایک بار ان واقعات کے متعلق خان بہادر تصدق حسین ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل انٹیلی جینس بیورو گورنمنٹ ہند سے ایک ڈنر پر ذکر آیا تو تصدق حسین صاحب نے بتایا۔ کہ تمام واقعات اور اس مہاراجہ کے خلاف لگائے گئے الزامات درست تھے اور یوپی کی پولیس کے اعلیٰ افسران کو اس کا علم تھا مگر گورنمنٹ مصلحتاً کچھ کرنا نہ چاہتی تھی کیونکہ ایک مہاراجہ کے خلاف اتنے بڑے الزام کے متعلق تحقیقات کا ہونا خود گورنمنٹ کے لیے بدنامی اور رسوائی کا باعث ہوتا۔

پانی کا اثر طبائع پر

پروفیسر سراج الدین آذر دہلی میں انسپکٹر آف سکولز تھے۔ بے تکلف پنجابی۔ یوپی اور دہلی کی تصنع کے دشمن۔ بے حد مخلص۔ شعر و ادب کے دلدادہ۔ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے سخن فہم بلکہ سخن گو بھی اردو فارسی دونوں سے دلچسپی۔ ڈاکٹر اقبال کے دوستوں میں سے اور اردو زبان کے عاشق۔ آپ کا کوئی دن ایسا نہ گزرتا۔ جب کہ آپ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں مولانا عبدالحق کے پاس چند گھنٹے

Marfat.com

نہ گزرتے ۔ پروفیسر آذر ایڈیٹر "ریاست" کے بھی کرم فرما اور گہرے دوستوں میں سے تھے ۔ اور باوجود اس بات کے کہ میں زیادہ مصروفیت کے باعث دوستوں کو اپنے ہاں بہت کم دعوت دیتا کوئی مہینہ ایسا نہ گزرتا ۔ جب کہ آذر صاحب گپ بازی کے لیے اپنے ہاں ڈنر پر نہ بلاتے ۔ ایک روز آپ نے رات کو کھانے پر بلایا ۔ میں جب گیا تو وہاں ایک درجن کے قریب دوسرے اصحاب بھی موجود تھے جو سب کے سب پنجابی تھے ۔ آذر صاحب نے فرمایا ۔ کہ یہ مجلس خالص طور پر پنجابی اصحاب کی ہے ۔ سر سکندر حیات کی جورسڈکشن یعنی پنجاب سے باہر کے کسی شخص کو نہیں بلایا گیا ۔ اور بات چیت صرف پنجابی زبان میں ہو گی ۔

اس دعوت میں مختلف موضوع پر باتیں ہوتی رہیں ۔ پنجابی لطائف نے بھی بہت دلچسپی پیدا کر دی اور باتوں باتوں میں آذر صاحب نے سب سے مخاطب ہو کر سوال کیا ۔ کہ ہر شخص ایمان داری کے ساتھ بتائے کہ دہلی میں آ کر اس نے کیا کچھ حاصل کیا یعنی علمی، مالی یا دوسرے اعتبار سے اس نے دہلی میں آ کر کیا فوائد حاصل کیے ۔

سب لوگوں نے بتانا شروع کیا ۔ کسی نے کہا ۔ کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ پیدا کیا ۔ کسی نے بتایا کہ اس نے علمی اعتبار سے یہ مدارج طے کیے ۔ کسی نے ظاہر کیا ۔ کہ اس نے فلاں ترقی و پوزیشن حاصل کی ۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا ۔ کہ چونکہ آپ لوگ سچ بتا رہے ہیں اور سچ پوچھ رہے ہیں اس لیے میں سچ عرض کرتا ہوں ۔ کہ دہلی میں آنے کے بعد مالی اعتبار سے میرے قرضہ میں تو کئی گنا اضافہ ہوا ۔ اور جب دہلی میں آیا تھا تو بے حد مخلص اور مہمان نواز تھا ۔ مگر اب طبیعت میں کمینہ پن اور خود غرضی پیدا ہو چکی ہے ۔ چنانچہ پہلے اگر کوئی دوست ایک دو روز کے لیے بھی آ جاتا تو اس کو کئی کئی ہفتے تک جانے نہ دیا جاتا ۔ مہمان کی خدمت گزاری میں لطف اور حظ محسوس ہوتا ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ چھ چھ ماہ اور ایک ایک سال تک دوست مستقل مہمان کی صورت میں مقیم رہے اور ایک دوست مسٹر محسن ایڈیٹر "اودھ اخبار" لکھنؤ جو بعد میں ایسوسی ایٹڈ پریس میں ملازم ہو کر دہلی تشریف لائے تھے ۔ غالباً دو سال تک بطور مہمان رہے ۔ اور جب بھی وہ اپنے لیے مکان لے کر جانا چاہتے تو ان کو روک لیا جاتا ۔ مگر اب کیفیت یہ ہے ۔ کہ اگر کوئی دوست دہلی میں تشریف لانے کی اطلاع خط یا تار کے ذریعہ دیتا ہے تو میں اسٹیشن نہیں پہنچتا ۔ تاکہ وہ کسی دوسری جگہ قیام کر لے ۔ اگر وہ پھر بھی آ جائے تو مہمان کی خدمت گزاری طبیعت پر ایک بار سی محسوس ہوتی ہے ۔ اور اس فرق کی وجہ دہلی کا پانی اور دہلی کی فضا ہے ۔ جس کا اثر طبیعت پر ہوا ۔ گو یہ تمام دوست خود بھی دہلی کی فضا کے اس اثر کو اپنے اندر محسوس کرتے تھے مگر تعجب کا اظہار کر رہے تھے ۔ کیونکہ ان کو یہ خیال بھی نہ تھا ۔ کہ میں اس کمزوری کا اقرار کروں گا ۔ چنانچہ میں نے اس کے ثبوت میں تفصیل کے ساتھ ان کو ذیل کے وہ واقعات بتائے جن کا میری ذات کے ساتھ تعلق تھا ۔

میں جب مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا ۔ اس زمانہ دہلی میں ایک شاعر منشی عبدالخالق خلیق رہتے تھے ۔ ان سے خط و کتابت تھی ۔ ان کے خط آیا کرتے کہ میں کبھی دہلی آؤں چھ

Marfat.com

ماہ تک جب ان کے خط آتے رہے اور انہوں نے دہلی آنے کے لیے بار بار لکھا۔ تو میں ان سے ملنے کے لیے مانسہرہ سے دہلی آیا۔ میں دہلی اور دہلی کے لوگوں کے حالات سے قطعی ناواقف تھا اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی دوست کے بار بار لکھنے کے بعد ملنے کے لیے جائے تو وہ دعوت دینے والے کے مکان پر نہ ٹھہرے۔ میں نے دہلی ریلوے سٹیشن پر اترنے کے بعد تانگے میں سامان رکھوایا اور بازار لال کنواں میں پہنچا۔ وہاں گلی چابک سواراں کے سرے پر ٹانگہ والے سے یہ کہہ کر ٹانگہ کھڑا رکھنے کے لیے کہا۔ کہ میں ابھی آکر سامان لے جاتا ہوں۔ میں گلی چابک سواراں کے اندر ملنشی عبدالخالق صاحب خلیق کے مکان پر پہنچا۔ خلیق صاحب کو آواز دی۔ اپنے دہلی آنے کی اطلاع پہلے دے چکا تھا میری آواز سن کر خلیق صاحب مکان سے باہر نکلے اور بہت اخلاق اور تپاک سے ملے۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد آپ نے پوچھا۔ کہ میرا قیام کہاں ہے۔ میں اس کا کیا جواب دیتا۔ یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ اگر کوئی شخص ڈیڑھ سو میل کا سفر کرکے ملنے کے لیے آئے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ کہ قیام کہاں ہے۔ کیونکہ پنجاب میں اگر کوئی شخص کسی سے ملنے کے لیے جائے تو یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ وہ ہوٹل یا سرائے میں ٹھہرے۔ میزبان اس کو اپنی توہین سمجھتا ہے اور تمام پنجاب میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو مہمانوں کو اپنے ہاں ٹھہرا کر لطف، حظ اور اپنی عزت محسوس نہ کرتا ہو۔ خلیق صاحب کا یہ سوال سن کر کہ میں کہاں ٹھہرا ہوں۔ میں کچھ حیران سا ہو گیا اور میں نے کھسیا تا سا ہو کر جواب دیا۔ کہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ چنانچہ ان سے شام کو پھر ملنے کا وعدہ کرکے میں گلی سے باہر آیا۔ اور ٹانگہ والے سے کہا کہ کسی ہوٹل میں لے چلو۔ ٹانگے والا مجھے مہاراجہ ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں میں نے قیام کیا اور شام کو خلیق صاحب کا نیاز حاصل کرنے کے لیے پھر ان کے مکان پر آیا۔ وہ مجھے حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی جو بعد میں دہلی میں آنریری مجسٹریٹ اور خطاب یافتہ خاں صاحب تھے، کے مکان پر لے گئے۔ جہاں ہم کچھ دیر بیٹھے اور علمی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ میں دو تین دن دہلی میں رہ کر اور دہلی دیکھ کر واپس مانسہرہ چلا گیا۔

یہ کیفیت تو مہمان نوازی کے متعلق دہلی کی فضا کی ہے۔ میں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ میں جب دہلی آیا تو مہمان نوازی کے اعتبار سے خالص طور پر پنجابی تھا اور دو دو چار چار دن کے عارضی مہمانوں کے علاوہ چھ چھ ماہ اور سال سال تک رہنے والے مستقل مہمان بھی ہوا کرتے اور دوپہر کو لنچ پر اور رات کو ڈنر پر آٹھ آٹھ دس دس اصحاب ضرور ہوتے۔ اگر کوئی مہمان جانا چاہتا تو اسے مختلف طریقوں سے یعنی گاڑی جانے کا وقت غلط بتا کر یا گھڑی کو پیچھے کرکے اسے روک لیا جاتا۔ اور اگر کوئی مہمان آجاتا تو دل کو مسرت سی محسوس ہوتی۔ مگر دہلی کے پانی اور یہاں کی فضا کا اثر آہستہ آہستہ کیا ہوا۔ اس کے متعلق ایک واقعہ (جو آذر صاحب کی دعوت سے دو تین ہفتے پہلے ہی پیش آیا تھا) بھی سن لیجئے۔

میں جب سے دہلی آیا ہوں۔ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس میرے ہاں ہی قیام فرماتے تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا اخلاص، احسان اور ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ دہلی میں بڑی سے بڑی پوزیشن کے ان کے سینکڑوں

Marfat.com

دوست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جب بھی تشریف لاتے۔ ایک دو روز پہلے ان کا تار آجاتا جس کا مطلب یہ ہوتا۔ کہ میں ان کے تمام دوستوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دوں۔ تاکہ جو لوگ آنکھیں دکھانا چاہیں وہ میرے مکان پر یا ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائیں۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا دہلی تشریف لانے کے متعلق تار آیا تو میں دوسرے لوگوں کے علاوہ نئی دہلی پلازا سینما کے پروپرائٹر لالہ کدار ناتھ ورما (جو رائے بہادر ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں) کو بھی ٹیلی فون کیا کہ ڈاکٹر صاحب کل صبح فرنٹیر میل میں تشریف لا رہے ہیں۔ لالہ کدار ناتھ نے ٹیلی فون پر جواب دیا کہ ان کے پلازا سینما کا اوپر کا حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔ تمام کمرے فرنیچر سے آراستہ ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر صاحب اس نئی بلڈنگ میں قیام کریں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ اگلے روز صبح میں فرنٹیر میل کے آنے کے وقت ریلوے سٹیشن پہنچا۔ تو وہاں لالہ امیر چند کھنہ، سیٹھ آنند راج سورانا۔ لالہ کدار ناتھ ورما وغیرہ ایک درجن کے قریب اصحاب اور تیس چالیس کے قریب آنکھوں کے مریض آنکھیں دکھانے کے لیے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب گاڑی سے اُترے تو آپ نے سب سے پہلے بیماروں کو دیکھا۔ پندرہ بیس منٹ ان کے پلیٹ فارم پر صرف ہوئے۔ اس کے بعد ہم سٹیشن سے باہر آئے تو ہمارے پہنچنے سے پہلے لالہ کدار ناتھ ڈاکٹر صاحب کا سامان اپنی موٹر کے پیچھے کیریئر پر بندھوا چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب میری کار کے پاس سوار ہونے کے لیے پہنچے تو آپ نے پوچھا۔ کہ کیا ابھی تک سامان نہیں بندھوایا۔ اس پر لالہ کدار ناتھ نے کہا۔ کہ سامان دوسری گاڑی میں بندھوا دیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ پلازا بلڈنگ میں قیام کریں گے۔ وہاں نئے کمرے فرنش کیے گئے ہیں۔ لالہ کدار ناتھ کی اس درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ نہیں۔ آپ دیوان سنگھ کے ہاں ہی ٹھہریں گے۔ اس پر لالہ کدار ناتھ نے پھر کہا اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نہیں آپ دیوان سنگھ کے ہاں ہی ٹھہریں گے۔ اس پر لالہ کدار ناتھ نے پھر کہا اور ڈاکٹر صاحب نے پھر یہی جواب دیا۔ چنانچہ لالہ کدار ناتھ اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان قیام کے متعلق پانچ چھ بار تکرار ہوئی۔ کدار ناتھ صاحب ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہاں لے جانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب میرے ہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتے تھے۔ میں اس عرصہ میں خاموش رہا اور دونوں کا اصرار سنتا رہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان اثرات کے باعث جو دہلی میں میری طبیعت پر مہمان نوازی کے متعلق اثر انداز ہو چکے تھے۔ میں چاہتا تھا۔ کہ ڈاکٹر صاحب پلازا بلڈنگ میں ہی چلے جائیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے احسانات، ان کا اخلاص، ان کی محبت اور ذاتی تعلقات کا اب بعد میں جب خیال کرتا ہوں تو ان کمینہ جذبات پر شرم اور ندامت محسوس کرتا ہوں جو اس وقت ان کی مہمان نوازی کے متعلق میرے ذہن میں پیدا ہوئے۔

آذر صاحب کے ہاں ڈنر پارٹی والے دوستوں کو میں نے دونوں واقعات بیان کرنے کے بعد بتایا۔ کہ اگر دہلی کی فضا مہمان نوازی کے خلاف ہے تو اس میں دہلی والوں کا قصور نہیں یہ پانی کا اثر ہے دریا کے اندر مختلف اجزا ہوتے ہیں اور ان اجزاء کا دل و دماغ اور قویٰ پر اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان

Marfat.com

میں سب سے زیادہ مہمان نواز صوبہ سرحد کے لوگ ہیں۔ اس کے بعد پوٹھوہار راولپنڈی۔ جہلم کا علاقہ کے لوگ۔ ان سے کم گوجرانوالہ، لاہور اور امرت سر کے لوگ۔ اور ان سے کم لدھیانہ اور انبالہ کے لوگ۔ اس کے بعد نمایاں فرق شروع ہوتا ہے۔ اور جہاں جہاں جمنا کا پانی سیراب کرتا ہے وہاں مہمان نوازی کے اعتبار سے بالکل ہی صفائی ہے۔ چنانچہ پنجاب کے صوبہ کے لوگوں میں شاید اس بات کا یقین نہ کیا جائیگا۔ کہ دہلی، لکھنؤ، الہ آباد اور بنارس وغیرہ میں پانی پلانے والے پانی کی قیمت پیسہ یا دو پیسے لیتے ہیں۔ حالانکہ پنجاب میں پانی کی قیمت لینا ایک گناہ اور پاپ سمجھا جاتا ہے اور پانی پلانے والا چاہے کتنا بھی غریب ہو پانی کی قیمت قبول نہیں کر سکتا۔

اگر اپنی کمزوری کا اظہار کرنا اس کمزوری کو رفع اور دل میں طہارت پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے تو میں یہ صاف الفاظ میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ جمنا کے پانی کے باعث میں اس خوبی سے محروم ہو چکا ہوں جو اخلاص اور مہمان نوازی کے متعلق مجھ میں چند برس پہلے موجود تھی اور میرا یقین ہے۔ کہ اگر یوپی اور دہلی کے اصحاب بھی دس پندرہ یا بیس برس پنجاب یا صوبہ سرحد میں قیام کریں تو ان کے اندر مہمان نوازی کا وہ کیریکٹر پیدا ہو جائے گا جو وہاں کے لوگوں میں موجود ہے۔ کیونکہ اس کا سبب پانی کے وہ اجزا ہیں جو پنجاب کے دریاؤں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں مگر جمنا اور یوپی کے دریا ان سے محروم ہیں۔

عزّت مرنے کے بعد

عزت کا فلسفہ دوسرے تمام فلسفوں سے زیادہ عمیق اور گہرا ہے اور اگر اس فلسفہ پر غور کیا جائے تو انسانی فطرت کے بہت دلچسپ مظاہرے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان کے لیے عزت سے زیادہ دوسری کوئی شے عزیز نہیں اور عزت پر انسان روپیہ، مال و دولت، بیوی، بچے، بہن بھائی، صحت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ مگر عزت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔ مثلاً عزت کے لیے ہر شخص روپیہ صرف کرتا ہے بے عزتی کے خوف سے اکثر ایسا ہوا۔ کہ لوگوں نے اپنی بیوی، بچوں، بہن اور بھائی تک کو قتل کر دیا اور خود بھی اپنی جان پر کھیل گئے۔ مگر رسوائی برداشت نہ کی۔ یعنی اس دنیا میں انسان کے لیے عزت سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں۔ عزت پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ اور جو لوگ اپنی عزت کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیں تو وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں اور جو لوگ اپنی عزت کو بھی

حیدرآباد سندھ کے دیوان دیارام گدومل مرحوم کی طرح ایڈیٹر "ریاست" کو اپنی تمام زندگی میں صرف اس شخصیت کا علم ہو سکا جس نے غریبوں، ضرورت مندوں، محتاجوں اور مستحق لوگوں کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے علاوہ اپنی عزت کو بھی قربان کر دیا۔ دوسروں پر بغیر غرض کے قربان کر دیں وہ انسان نہیں۔ فرشتے بلکہ فرشتوں سے بھی بلند کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ نیک سے نیک اور پارسا سے

Marfat.com

پارسا شخص بھی نہیں چاہتا۔ کہ وہ عزت حاصل نہ کرے یا ذلیل ہو۔

عزت کے متعلق اس مختصر تمہید کے بعد میں چند چشم دید واقعات بیان کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ انسان زندگی میں تو کیا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ عزت حاصل کرے۔

میں دہلی جیل میں تھا۔ وہاں مجھے سوائے کتابوں کے پڑھنے یا مقدمہ کے حالات پر غور کرنے کے دوسرا کوئی کام نہ تھا جو شخص زندگی بھر اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا رہا ہو اس کے لیے یہ مصروفیت کافی نہ تھی۔ میرا زیادہ وقت وہاں انسانی فطرت پر غور کرتے گزرتا اور میں اس سلسلہ میں ہر قسم کے قیدیوں سے ملتا اور اُن سے گھنٹوں باتیں کرتا۔ چنانچہ وہاں مجھے قتل کے مجرموں سے بھی ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا جو موت کے منتظر تھے۔

مولانا مظہر الدین ایڈیٹر اخبار "الامان" کا قاتل بھی اس زمانہ دہلی جیل میں تھا۔ اس کے لیے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا اور اپیلیں وغیرہ خارج ہونے کے بعد وہ پھانسی کی رسّی کا منتظر تھا۔ میں اس سے اکثر ملا کرتا میں کہ جب بھی ملتا یہ مجھ سے یہی سوال کرتا۔ کہ اس کے متعلق پبلک کا کیا خیال ہے۔ کیا لوگ اس کے اس فعل کی تعریف کرتے ہیں یا نہیں اور اس کے حق میں نعرے بلند ہوتے ہیں یا نہیں۔ میں اس کی دل داری کے خیال سے لیے جب یہ کہتا کہ لوگ اس کو بہت بہادر سمجھتے ہیں تو اس کا چہرہ خوشی کے باعث سُرخ ہو جاتا۔ جس روز اس کو پھانسی ملنے والی تھی۔ اس سے ایک روز پہلے اس کی آخری ملاقات کے لیے اس کی ماں۔ باپ اور عزیز و رشتہ دار آئے۔ یہ لڑکا بلیس بائیس برس کی عمر کا جوان۔ گورے رنگ کا خوبصورت تھا جب بھی کسی کو جیل میں پھانسی ہو تو جیل کے تمام قیدی مغموم ہو جاتے ہیں۔ اس لڑکے کی آخری ملاقات کے وقت تمام جیل میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ملاقات ہوئی۔ مجرم۔ اس کے والدین اور عزیز و اقارب چیخیں مار مار کر روتے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کو روتا دیکھ کر چیخیں مار رہے تھے۔ شاید ہی کوئی سنگ دل انسان ہوگا۔ اس منظر کو دیکھ کر جس کی آنکھیں تر نہ تھیں۔ جیل کے حکام بھی جو دن رات کی بے رحمی کے باعث ایک حد تک سنگ دل ہوتے ہیں اس دردناک منظر سے متاثر تھے۔ قاتل کی پردہ میں رہنے والی ماں برقع میں تھی۔ مگر اس کی دلوانگی اس کو بے پردہ کیے جا رہی تھی۔ اور اس خاتون میں یہ برقع کو سنبھالنے کی ہمت نہ تھی۔ نصف گھنٹہ کے قریب کہرام کی یہ کیفیت رہی۔ نہ ماں کوئی بات کر سکتی تھی نہ باپ۔ ان میں ہمت نہ تھی منہ سے کوئی لفظ نکال سکیں۔ دوسرے رشتہ دار پھانسی ملنے والے سے باتیں کرتے تھے اور باتیں بھی یہ کہ تم آخری وقت مغرب کی طرف اپنا منہ رکھنا۔ کلمہ کو نہ بھولنا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا۔ رات کو نماز ضرور پڑھنا وغیرہ۔ چنانچہ ان رشتہ داروں میں سے ایک نے پوچھا۔ کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو بتاؤ۔ یا کوئی خواہش ہو تو اس کا اظہار کرو تاکہ وہ پوری کی جائے۔ تو قاتل نوجوان نے اپنی جس آخری خواہش کا اظہار کیا وہ یہ تھی۔ کہ اس کے پھانسی ملنے کے بعد اس کی لاش کو جامع مسجد لے جانا۔ وہاں نمازِ جنازہ پڑھنا اور جلوس نکالنا۔ چنانچہ اس نوجوان کی اس خواہش کے مطابق ایسا ہی کیا گیا تھا۔ گویا کہ اس نوجوان کی مرتے ہوئے آخری خواہش یہ تھی۔ کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔

Marfat.com

ایک دوسرا شخص قتل کا مجرم تھا۔ یہ پیشہ ور غنڈہ تھا اور اس نے ایک دوسرے شخص کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کو بھی موت کی سزا دیئے جانے کا حکم ہو چکا تھا۔ جس روز اس کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ اس سے ایک روز پہلے اس کے رشتہ دار بھی اس سے ملنے کے لیے آئے۔ یہاں بھی وہی جذبات کا منظر تھا۔ جب یہ رو رہا تھا تو جیل کے ایک سپاہی نے اس سے نیم طنز یہ انداز میں (گویا کہ تو چاقو مارتے وقت بہادر تھا اب پھانسی کے وقت روتا ہے) کہا کہ "حوصلہ کر۔ رونے سے کیا حاصل" اس سپاہی کے یہ نیم طنز یہ الفاظ سن کر اس نے فوراً سر اٹھایا اور فاتحانہ انداز میں (گو موت کو سامنے دیکھتے ہوئے اس کی قوت گویائی جواب دے رہی تھی اور اس کے منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی) کہا "نہیں نہیں نہیں میں میں گھبرایا نہیں۔ نہیں میں حوصلہ میں ہوں" یعنی یہ موت کو دیکھتے ہوئے زندگی میں ہی نیم مُردہ ہو چکا تھا۔ منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ مگر یہ چاہتا تھا۔ کہ لوگوں پر اس کے غنڈہ پن (جس کو یہ خود بہادری اور شجاعت سمجھتا تھا) کے اثرات قائم رہیں۔ چنانچہ اگلے روز جب اس کو پھانسی کی کوٹھڑی سے پھانسی گھر میں پھانسی پر چڑھانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ تو اس کے چہرہ پر ایک فرضی اور بناوٹی مسکراہٹ سی تھی جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ یہ بہادری کی موت مر رہا ہے اس کی شجاعت پر موت اثر انداز نہیں ہوئی اور لوگ اس کو مرنے کے بعد اس کو بہادر ہی سمجھیں۔ گویا کہ اس کی بھی آخری خواہش یہی تھی۔ کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔

مجھے اور بھی کئی ایسے واقعات یاد ہیں۔ کہ لوگوں نے مرتے ہوئے اگر کسی خواہش کا اظہار کیا تو وہ صرف یہ تھی۔ کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی عزت ہو۔ چنانچہ ہماری زندگی کے ہر روز کے واقعات میں دیکھا جا رہا ہے۔ کہ عزت ایک ایسی شے ہے۔ جس پر زندگی میں سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے۔ لوگ عزت کی موت مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اس کی عزت کریں۔ یعنی عزت ایک ایسی شے ہے جس کو انسان زندگی میں تو کیا مرنے کے بعد بھی چاہتا ہے میں حیدر آباد سندھ کے دیوان دیارام گدومل مرحوم پریذیڈنٹ آل انڈیا سوشل کانفرنس کے حالات عرض کروں گا۔ جن کا پبلک پر ظاہر کرنے کا فخر سب سے پہلے ایڈیٹر "ریاست" کو حاصل ہوا اور یہ حالات لاہور کے اخبار "ہندوستان" میں شائع ہوئے جبکہ ایڈیٹر "ریاست" اس اخبار میں کام کرتا تھا ان حالات میں بتایا جائے گا۔ کہ قربانی کے اس فرشتہ نے کیونکر ایک خاندان کی عزت کو بچانے کے لیے اپنی عزت کو قربان کر دیا اور دنیا میں سب سے اہم قربانی وہ ہے جو ذاتی اغراض سے بلند رہ کر دوسروں کے لیے کی جائے کیونکہ انسان فطرتاً عزت سے نہ اس دنیا میں محروم ہونا چاہتا ہے نہ اگلی دنیا میں۔

عزّت کی قُربانی

میں نے لکھا ہے کہ مجھے میری پچھلی تمام زندگی میں سوائے دیوان دیارام گدومل آف حیدرآباد

Marfat.com

(سندھ) کے کسی ایسے دوسرے شخص کا علم نہ ہو سکا۔ جس نے دوسروں کے لیے اپنی عزت کو بھی قربان کر دیا ہو۔ میں ذیل میں دیوان دیارام گدومل کی زندگی کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے والے مسٹر ویرومل بیگھ راج ایڈیٹر "سندھی" سکھر نے بتایا۔ اور جس کی تصدیق بعد میں مرحوم مہاراجہ نابھہ اور بمبئی کے بعض اصحاب نے بھی کی۔ کہ اس واقعہ نے میرے کیریکٹر پر بہت بڑا اثر کیا ہے میں دوسروں کے لیے اپنی عزت کو قربان کرنے کا اہل تو نہیں ہو سکا۔ مگر یہ سچ ہے کہ دوسروں کی خدمت گزاری اور اس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا احساس اگر مجھ میں موجود ہے تو اس کا باعث صرف یہ واقعہ ہے جو ہمیشہ ہی میری زندگی میں میرے لیے نصب العین رہا۔ خدا کرے کہ ان حالات کو پڑھنے والے بھی وہی اثرات حاصل کریں جو مجھے نصیب ہوئے۔

دیوان دیارام گدومل حیدرآباد (سندھ) کے ایک معزز خاندان میں سے تھے۔ آپ بمبئی پراونشل سول سروس کے جج تھے اور آپ کے صاحب زادگان حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ دیوان دیارام گدومل کی زندگی کا زیادہ حصہ سندھ اور بمبئی (چونکہ اس زمانہ میں سندھ علیحدہ صوبہ نہ تھا بمبئی سے ملحق تھا) کے اضلاع میں بطور سیشن جج گزرا۔ آپ ہزار روپیہ سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے مگر آپ کا ذاتی خرچ چالیس پچاس روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھا۔ آپ کے پاس صرف ایک کوٹ تھا۔ جو کئی برس تک آپ نے استعمال کیا اور اپنی تنخواہ کا تمام کا تمام روپیہ اور جدی جائیداد کی آمدنی کا ایک معقول حصہ آپ غریبوں، محتاجوں، یتیم بچوں اور بیواؤں کی خدمت میں صرف کرتے۔ چنانچہ سندھ میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو کہ ذالدین چپڑاسی۔ مزدور، قلی۔ برتن صاف کرنے والے، گھروں کے ملازم اور ادنیٰ قسم کے لوگ تھے۔ مگر یہ دیوان دیارام کے روپیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بہت بڑے عہدوں پر پہنچے۔ دیوان صاحب ٹراولنگ یعنی سفری لائبریریوں اور بیوہ آشرموں کے بانی تھے اور آپ کے روپیہ سے سندھ میں بہت سی ٹراولنگ لائبریریاں موجود ہیں۔ جو گاؤں گاؤں پھر کر لوگوں کو کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان مفت تقسیم کرتی ہیں۔ اور درجنوں بیوہ آشرم، بیواؤں کی پناہ گاہ ہیں۔

دیوان دیارام گدومل ملک کے بہت بڑے سوشل ریفارمر تھے۔ آپ مرحوم مسٹر مالاباری کے ساتھیوں میں سے تھے اور آپ کے پرانے دوستوں میں سے مرحوم سر جگندر سنگھ (ممبر انتظامیہ کونسل وائسرائے) وغیرہ کئی اصحاب تھے (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو سر جگندر سنگھ نے اپنی ایک تصنیف دیوان دیارام کے نام ڈیڈیکیٹ بھی کی تھی) دیوان صاحب کئی بار آل انڈیا سوشل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اور آپ کی سندھ میں جو عزت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ حیدرآباد میں جب لوگوں کو یہ علم ہوتا۔ کہ آپ اس بازار میں سے گزریں گے تو لوگ وقت سے پہلے انتظار میں کھڑے ہو جاتے۔ اور آپ کو اس طرح ہی جھک کر نمسکار یا ڈنڈوت کیا جاتا جس طرح گرو یا رشی یا سنیاسیوں یا مہاتماؤں کو کیا جاتا ہے۔ مرحوم مہاراجہ نابھہ نے مجھے بتایا۔ کہ مہاراجہ جب نابھہ کے تخت پر نہ تھے (ولی عہد) اور وائسرائے کی کونسل (جو ان دنوں امپیریل کونسل کہلاتی تھی) کے ممبر تھے۔ مہاراجہ نابھہ وائسرائے

Marfat.com

کے نامزد ممبر تھے۔ مگر اس کونسل میں جاتے ہی آپ مسٹر گوکھلے کے ساتھ مخالف بنچوں پر جا بیٹھے اور آپ کا حب الوطنی کا یہ قدم آپ کے لیے زندگی بھر مصائب کا باعث ثابت ہوا۔ کے ممبر تھے۔ تو دیوان دیارام گدومل کے درشن کرنے کے لیے نابھ سے احمد نگر (صوبہ بمبئی) گئے تھے۔ جہاں کہ دیوان صاحب ان دنوں سیشن جج تھے۔ گویا کہ دیوان دیارام گدومل کے لیے احترام و عزت غریبوں اور عام لوگوں سے لے کر والیان ریاست تک کے دلوں میں کھبی تھی۔ اور آپ تمام ملک میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے۔

دیوان دیارام گدومل کا ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ جو آپ کو لاہور میں پیش آیا۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے پر چاندنی چوک دہلی میں شاہی داخلہ کے وقت بم پڑا تھا۔ پنجاب پولیس دن رات تفتیش میں مصروف تھی۔ مگر بم پھینکنے والے کا کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ ہر صوبہ میں تعلیم یافتہ پبلک ورکر کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا۔ دیوان دیارام بمبئی سے کشمیر جا رہے تھے۔ آپ کا لباس سادھوؤں کی طرح سادہ تھا۔ آپ نے لاہور ریلوے پلیٹ فارم پر کسی شخص سے انگریزی میں بات چیت کی۔ قریب ہی سی آئی ڈی کا ایک شخص کھڑا بات سن رہا تھا۔ سادھوؤں کے لباس میں انگریزی میں بات چیت کرنا پنجاب سی آئی ڈی کی نظروں میں شبہ پیدا کرنے کا باعث ہوا۔ آپ کو گرفتار کر کے ریلوے سٹیشن کی حوالات میں دے دیا گیا۔ آپ جب رات بھر حوالات میں بسر کر چکے تو اگلی صبح پولیس نے آپ سے انٹروگیشن (گفت و شنید) شروع کی۔ دیوان صاحب نے پوچھا۔ کہ کس الزام میں گرفتار کیا ہے تو پولیس افسر نے بتایا۔ کہ وائسرائے پر بم مارنے کے شبہ میں۔ دیوان صاحب سے کہا گیا۔ پولیس افسر نے کہا۔ کہ اپنا حسب نسب بتاؤ اور کوئی ضمانت دینے والا ہو تو پیش کرو۔ تب جا سکتے ہو۔ اس پر دیوان صاحب نے کہا۔ لارڈ ہارڈنگ آپ کو جانتے ہیں اور وہی ضمانت دیں گے۔ چنانچہ پولیس نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کو تار دیا۔ کہ ایک شخص سندھ کا رہنے والا دیارام گدومل اپنے آپ کو وائسرائے کا واقف بتاتا ہے۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے لارڈ ہارڈنگ کو اس تار کے مضمون سے اطلاع دی تو وائسرائے نے جواب لکھوایا۔ کہ مسٹر دیارام گدومل ہندوستان کے چند نیک ترین اصحاب میں سے ہیں۔ انارکسٹ نہیں اور وائسرائے کے ذاتی دوست ہیں۔ ان کو فوراً چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس تار کے پہنچنے کے بعد آپ کشمیر روانہ ہوئے۔

دیوان دیارام گدومل جب زندگی بھر غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت انجام دیتے رہے تو آپ کو خیال آیا۔ کہ اگر امیر طبقہ کے نوجوانوں میں غریبوں کی خدمت کی سپرٹ پیدا کی جائے تو امیر طبقہ کے نوجوان دوسرے ہزاروں لوگوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی میں آپ نے ایک اخلاقی آشرم کی بنیاد قائم کی۔ جس میں صرف امیر طبقہ کے کئی سو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر روز دو گھنٹے کے لیے آتے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو لیکچروں کے ذریعہ بتایا جاتا۔ کہ غریبوں کی خدمت کرنی چاہیے۔ دوسروں کا دکھ اپنا دکھ سمجھنا انسان کا فرض ہے۔ روپیہ کا صحیح استعمال یہ ہے کہ وہ ضرورت مندوں کے کام آئے! اور اس

Marfat.com

شخص کا پیدا ہونا اور زندہ رہنا لاحاصل ہے جو صرف اپنے لیے زندہ ہے اور دوسروں کے کام نہیں آتا۔ یہ آشرم کئی برس تک چلتا رہا اور اس کے ذریعہ بمبئی کے امیر گھرانوں کے نوجوانوں کے دلوں میں پبلک خدمت اور دوسروں کے دکھوں کو دور کرنے کی سپرٹ پیدا کی گئی۔

اس آشرم کو جاری ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ کہ ایک روز ایک نوجوان لڑکی جس کے والد بمبئی میں بہت بڑے عہدہ پر سرکاری ملازم تھے۔ اور جس کا والد بیرسٹری کر چکا تھا اور انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے انگلستان میں تھا، دیوان دیا رام گدومل کے پاس آئی اور تنہائی میں کہا۔ کہ "پتا جی (آشرم کے تمام لڑکے اور لڑکیاں دیوان صاحب کو پتا جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے) میں بہت دکھی ہوں۔ مجھے ایک شخص کا ناجائز حمل ہے۔ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ خودکشی کر کے بھی خاندان کے ناموس کو بچاؤں آپ کی اپنے باپ کی طرح عزت کرتی ہوں۔ آپ مجھے رائے دیجیے کہ میں کیا کروں۔"

دیوان دیا رام نے جب یہ سنا تو آپ کو حالات سن کر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے اس لڑکی کو رائے دی کہ جس شخص کا ناجائز حمل ہے اس سے شادی کر لی جائے۔

اس رائے کے بعد لڑکی نے چاہا۔ کہ اسی شخص سے شادی کرے جس کا ناجائز حمل ہے مگر لڑکی براہمن خاندان سے تھی اور لڑکا بنیا خاندان سے۔ سوسائٹی میں ایسی شادی معیوب تھی۔ لڑکے نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد لڑکی نے حالات دیوان صاحب کو بتائے تو دیوان صاحب نے بھی کوشش کی۔ کہ لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہو جائے۔ کیونکہ لڑکا بھی اس آشرم میں آتا تھا۔ دیوان صاحب کے کہنے کا لڑکے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس نے نہ صرف لڑکی کی شادی کی التجا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ آشرم میں آنا بھی چھوڑ دیا۔ اور اگر لڑکی اتفاق سے اس کو راستہ میں آتے جاتے کہیں ملتی تو یہ راستہ چھوڑ کر دوسری طرف ہو جاتا۔

یہ لڑکی کئی روز تک دیوان دیا رام سے مشورہ کرتی رہی اور دیوان صاحب نے یہ بھی کوشش کی کہ کوئی اور نوجوان اس لڑکی سے شادی کرے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور کوئی اچھی حیثیت کا لڑکا اس لڑکی سے اس حالت میں شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ ادھر جوں جوں دن زیادہ گزرتے لڑکی کو حمل کے ظاہر ہو جانے کا خوف۔ آخر ایک روز لڑکی دیوان صاحب سے پھر تنہائی میں ملی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے دیوان صاحب سے کہا:

"پتا جی۔ میں بہت دکھی ہوں۔ میں نے حمل قرار پانے پر شروع میں حمل ضائع کرنے کی کوشش کی اس میں ناکام رہی۔ اس کے بعد اس لڑکے سے شادی کرنی چاہی جس کا حمل تھا۔ اس نے ٹھکرا دیا۔ پھر چاہا۔ کہ کوئی اور شخص پناہ میں لے۔ مگر کوئی تیار نہ ہوا۔ اب میرے لیے اپنے والدین اور خاندان کی عزت و ناموس کو بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ میں خودکشی کر کے اپنی جان کو ختم کر لوں۔ اور میرے حمل کا کسی کو علم نہ ہو۔"

یہ کہتے ہوئے روتے روتے لڑکی کی ہچکی بندھ گئی۔ دیوان صاحب لڑکی کی مصیبت کو دیکھ رہے

Marfat.com

تھے اور دُکھی تھے۔ مگر کچھ کر نہ سکتے تھے۔ انہوں نے لڑکی سے کہا۔ کہ بیٹی! خودکشی کرنا پاپ ہے۔ خودکشی مت کرو اور جس طرح بھی ممکن ہو کسی نوجوان سے شادی کر لو۔" لڑکی نے جواب دیا: "پتاجی نوجوان تو کیا اس حالت میں تو مجھے کوئی بوڑھا بھی پناہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارے کا سوائے خودکشی کے دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

دیوان دیارام اس لڑکی کو غور سے دیکھ رہے تھے اور بے حد متفکر تھے۔ کہ اس نوجوان لڑکی کو مصیبت سے کیوں کر نجات ہو۔ بلکہ دیر سوچتے رہے۔ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد آخر آپ نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"بیٹی! اگر تم کو دنیا میں کوئی پناہ دینے اور تمہیں بے عزتی سے بچانے کے لیے تیار نہیں تو میں تمہیں پناہ دینے اور بے عزتی سے بچانے کے لیے تیار ہوں میں تم سے شادی کرتا ہوں۔"

یہ کہنے کے بعد دیوان صاحب بمبئی سے چند میل کے فاصلہ پر باندرہ گئے وہاں آپ نے ایک ایسی کوٹھی کرایہ پر لی جو سمندر کے کنارے اور آبادی سے کچھ فاصلہ پر تھی۔ کوٹھی کرایہ پر لینے کے بعد بمبئی واپس آئے۔ آشرم کے طلبا اور طالبات کو بلایا اور ان سے کہا۔ کہ آج کے بعد یہ آشرم بند کیا جاتا ہے اس اعلان کے بعد لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دیوان صاحب نے آشرم کو تالا لگایا اور اس لڑکی کو لے کر سکھوں کے گوردوارہ میں گئے۔ آنند برج (سکھ طریقہ شادی) ایکٹ کو کونسل میں پاس ہوئے چند ماہ ہوئے تھے۔ آپ نے گوردوارہ کے گرنتھی سے درخواست کی۔ کہ آپ کی اس لڑکی سے شادی کرا دی جائے گرنتھی کیوں انکار کرتا۔ کڑاہ پرشاد (حلوہ) تیار ہوا۔ راگیوں نے شبد پڑھے اور گرنتھی نے اس سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی اور ستر سال کے سفید ریش (دیوان صاحب کے سفید لمبی داڑھی تھی) بوڑھے کی شادی گورو گرنتھ صاحب کے سامنے کرا دی۔

دیوان صاحب اپنی "نوجوان" "بیوی" کو لے کر باندرہ اس کوٹھی میں چلے گئے جو آئندہ زندگی گزارنے کے لیے کرایہ پر لی گئی تھی۔ "میاں بیوی" نے اس کوٹھی میں رہائش اختیار کی۔ دیوان دیارام آل انڈیا شہرت کے مالک تھے اور انڈین سوشل کانفرنس کے کئی برس سے صدر۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوئے جن کے عنوانات تھے: "باپ کی بیٹی سے شادی" "نفس پرستی کی انتہا" "سوشل کانفرنس کے صدر کی گراوٹ" "دیوان دیارام گدومل کا ذلت آمیز فعل" وغیرہ۔ دیوان دیارام گدومل کی مخالفت صرف اخبارات تک ہی محدود نہ رہی۔ اسی سال آپ کو اپنی خاندانی جائیداد کی رجسٹری کرانے کے لیے حیدر آباد جانا پڑا تو جب آپ بازار میں سے گزرے۔ لوگوں نے آپ پر اینٹیں پھینکیں اور یہ کہہ کر ماں بہن کی گالیاں دیں کہ اس نے حیدر آباد کو تمام دنیا میں رسوا و ذلیل کر دیا ہے۔

مسٹر ویرومل بیگھراج (ایڈیٹر "سندھی" سکھر) نے جب اس شادی کی اطلاع سنی تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ کیونکہ دیوان صاحب ویرومل جی کے ساتھ بیس پچیس برس تک سندھ کے اندر سوشل اصلاح میں مصروف رہے تھے۔ آپ نے شادی کی خبر سنتے ہی دیوان دیارام کو باندرہ خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

Marfat.com

میں اخبارات میں پڑھ رہا ہوں اور لوگوں سے سن رہا ہوں، کہ آپ نے اتنے بڑے سوشل لیڈر اور سوشل کانفرنس کے صدر ہوتے ہوئے اس بڑھاپے میں سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی سے شادی کی۔ مجھے اس خبر پر یقین نہیں آتا۔ کہ آپ اتنا بڑا پاپ کر سکتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر بوالپسی ڈاک اصل حالات سے مطلع فرمائیے۔ کیونکہ اگر یہ واقعہ سچ ہے تو میرا بھی بطور ایک پبلک ورکر اور اخبار نویس کے فرض ہے کہ میں آپ کی اس شیطنت کے خلاف لکھوں۔"

دیوان دیارام نے اس طویل خط کا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

"میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔"

اس جواب کے بعد دیوان دیارام کے قدیمی دوست اور دیرینہ ساتھی مسٹر ویرومل بیگھ راج (جو سندھ میں ہندو مہاسبھا کے صدر بھی تھے) نے اپنے اخبار "سندھی" میں دیوان صاحب کے خلاف متعدد سخت مضامین لکھے۔

دیوان دیارام کی "بیوی" کے بطن سے اُس حمل کا نتیجہ ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ دیوان صاحب شادی کے بعد دنیا سے بالکل الگ رہے۔ وہ اپنی "بیوی" اور بچی کے ساتھ سمندر کے کنارے اس کوٹھی میں تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس طرح دس سال گزر گئے۔ دنیا کو کچھ علم نہیں کہ کیا ہوا۔ شادی کے دس سال بعد دیوان صاحب کی "بیوی" تپ دق میں مبتلا ہو گئیں۔ کئی ماہ تک اس موذی مرض میں مبتلا رہیں۔ اور جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس کی والدہ اور والد اپنی بیٹی کی عیادت کے لیے بمبئی سے آئے یہ لوگ کئی روز تک باندرہ میں رہے۔ ایک روز دیوان صاحب کی "بیوی" نے اپنی ماں سے تنہائی میں کہا:

"اماں! میں اب زندہ نہ رہوں گی۔ چند روز کی مہمان ہوں۔ مگر ایک راز میں تم سے ظاہر کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ اس راز کو لے کر اس دنیا سے رخصت نہ ہو جاؤں۔ وہ راز میں تمہیں بتاتی ہوں۔ اور وہ راز یہ ہے کہ دیوان صاحب نے میرے ساتھ شادی میری عزت کو بچانے کے لیے کی۔ مجھے ایک لڑکے کا ناجائز حمل تھا۔ اس لڑکے نے حمل کے بعد مجھ سے شادی تو کیا، بات تک کرنے سے انکار کر دیا۔ کوئی دوسرا بھی مجھے پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ میری عزت کو بچانے کے لیے دیوان صاحب نے اپنی آل انڈیا شہرت اور عزت کو میرے لیے قربان کر دیا اور مجھ سے کھلے طور پر شادی کر لی۔ ورنہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ میرے اور ان کے آج تک تعلقات باپ اور بیٹی کے ہیں۔ دنیا مجھے ان کی بیوی سمجھتی ہے مگر میں ان کی ویسے ہی بیٹی ہوں جیسے شادی سے پہلے تھی۔"

اس راز کے اظہار کے بعد دیوان صاحب کی "بیوی" کا انتقال ہو گیا۔ مرنے والی کی ماں نے یہ راز اپنے شوہر کو بتایا۔ اس نے اپنے خاص دوستوں سے ذکر کیا۔ وہاں سے یہ راز مسٹر ویرومل بیگھ راج کے پاس پہنچا اور مسٹر ویرومل بیگھ راج سے ایڈیٹر "ریاست" کو یہ حالات معلوم ہوتے جن کی بعد میں بمبئی کے کئی

Marfat.com

اصحاب نے بھی تصدیق کی۔ چنانچہ ایڈیٹر "ریاست" جس زمانہ بمبئی ایک فرم اگر سیلن اینڈ کمپنی میں ملازم تھا۔ بمبئی سے باندرہ گیا۔ تاکہ دیوان دیارام کے قدموں کو بوسہ دے کر اپنے لیے عاقبت میں جگہ بنائے مگر افسوس کہ دیوان صاحب اس روز باندرہ میں نہ تھے۔ ان کا نیاز حاصل نہ ہو سکا۔ ایڈیٹر "ریاست" ناکام واپس بمبئی آ گیا۔ اور چند روز کے بعد اسے بمبئی چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ اسے مہاراجہ نابھہ نے اپنی ریاست میں بلا کر ملازمت دے دی۔

جو لوگ کسی پر تھوڑا سا احسان کر کے اس احسان کو جتاتے ہیں یا اس کا معاوضہ چاہتے ہیں اور یا جن کی پبلک خدمت کا مقصد ذاتی شہرت یا عزت حاصل کرنا ہے۔ ان کے لیے دیوان دیارام گدومل کے یہ حالات آنکھیں کھولنے کا باعث ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اپنی ذات، اپنے پیٹ یا اپنی عزت کے لیے کسی کے ساتھ احسان کرنا قابلِ تعریف فعل نہیں۔ اس کی تہہ میں ذاتی اغراض پوشیدہ ہیں۔ انسان وہ ہے جو کسی غرض یا معاوضہ کے بغیر دوسروں کے کام آئے۔ اور دیوان دیارام گدومل جیسے لوگ تو فرشتہ کہلانے کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنی عزت و آبرو کو بھی بغیر کسی غرض کے دوسروں پر قربان کر دیا۔

والیانِ ریاست کا "پریسٹیج"

"ریاست" کا دفتر دریا گنج میں تھا۔ اخبار کو جاری ہوئے تین برس ہو چکے تھے۔ "ریاست" کے مضامین کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اور اس کے درجنوں دوست اور دشمن پیدا ہو چکے تھے۔ میرے پاس مرحوم مہاراجہ الور کے سیکرٹری مسٹر ایس زنگا آئر آئے۔ مسٹر آئر میرے پرانے دوست تھے ہم دونوں نابھہ میں ملازم رہے تھے بلکہ اس ملازمت کے زمانے میں مسٹر آئر ایک عرصہ تک میرے مکان پر ہی رہے جب کہ ان کے بیوی بچے نابھہ میں نہ تھے۔ مسٹر زنگا آئر سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں تو آپ نے کہا کہ چیمبر آف پرنسس کے اجلاس کے باعث مہاراجہ الور دہلی میں ہیں۔ اگر میں ان سے ملنا چاہوں تو وہ ملاقات کا انتظام کریں۔ میں نے جواب دیا کہ بغیر کام یا ضرورت کے کسی سے ملنا لاحاصل ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو والیانِ ریاست کے درشن کرنے کو سعادت یا ثواب سمجھتے ہوں۔ اس لیے ملنے کی ضرورت نہیں۔ مسٹر زنگا آئر نے پھر زور دیا کہ مہاراجہ سے ملنا چاہیئے۔ بہت اچھے اور لائق آدمی ہیں۔ میں نے پھر انکار کیا اور کہا کہ مہاراجہ الور کے مقابلہ پر ان کے سیکرٹری مسٹر زنگا آئر سے ملنا زیادہ اچھا ہے۔

میرے اس انکار کرنے پر مسٹر زنگا آئر نے پھر زور دیا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی دعوت علت سے خالی نہیں۔ میں نے زور کے ساتھ پھر انکار کیا اور کہا کہ مجھے کسی والیٔ ریاست سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر مہاراجہ الور کو ملنے کی خواہش ہو تو کوئی حرج نہیں۔ میں مل سکتا ہوں۔ اس کے بعد مسٹر آئر نے مجھے رازمیں کہا۔ کہ مہاراجہ خود ملنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اس غرض کے لیے ہی بھیجا ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ دیوان سنگھ کی طرف سے ملنے کی درخواست ہو تاکہ ان کے پریسٹیج پر برا اثر نہ پڑے کیونکہ وہ

Marfat.com

مہاراجہ ہیں مسٹر آٹر کی اس رازداری کی بات کو سن کر میں ضبط نہ کر سکا۔ میری ہنسی نکل گئی۔ اور میں نے کہا۔ کیا مہاراجہ عورت ہیں کہ محبت کی خواہش کا اظہار کرنا ان کی فطرت کے خلاف ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اظہار عشق میں دوسرے ہی قدم اٹھائیں۔ اور انہوں نے آپ کو بطور سگنل بھیجا ہے۔ اس طرح سے مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ تو مسٹر زنگا آٹر نے کہا۔ کہ مہاراجہ کو علم ہے۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" اور زنگا آٹر دوست ہیں۔ اور اگر ایڈیٹر "ریاست" نہ گیا تو مہاراجہ پر اثر یہ ہوگا۔ کہ یا تو مسٹر زنگا آٹر نے ایڈیٹر "ریاست" سے کہا نہیں یا اگر کہا ہے تو دیوان سنگھ پر مسٹر زنگا آٹر کا اثر نہیں۔ اور یہ دونوں صورتیں مسٹر زنگا آٹر کے لیے مفید نہ ہوں گی۔ مسٹر زنگا آٹر کے بار بار زور دینے کے بعد یہ فیصلہ ہوا۔ کہ میں مہاراجہ سے ملنے کے لیے جاؤں۔ اور مہاراجہ کو یہ علم بھی نہ ہو۔ کہ مسٹر زنگا آٹر نے راز میں مہاراجہ کی ملنے کی خواہش کا اظہار ایڈیٹر "ریاست" سے کر دیا ہے۔

مسٹر زنگا آٹر واپس الور کیمپ میں چلے گئے۔ یہ کیمپ ریاست الور کی خالی زمین پر تھا جو بیکانیر ہاؤس کی پشت پر ہے۔ میرا خیال ہے۔ آجکل اس زمین پر سپلائی ڈیپارٹمنٹ کے عارضی دفاتر یا رہائشی مکانات ہیں۔ مسٹر زنگا آٹر اگلے روز وقت مقرر کر کے مجھے لینے کے لیے تشریف لائے۔ میں ان کے ساتھ ریاست الور کی کار میں گیا۔ کیمپ خیموں میں تھا۔ مہاراجہ ایک بڑے خیمہ میں تھے۔ اور اس بڑے خیمہ کے پاس ہی ایک چھوٹے خیمہ میں ویٹنگ روم تھا۔ میں جب مسٹر زنگا آٹر کے ساتھ ویٹنگ روم والے خیمہ میں داخل ہوا۔ تو وہاں مرحوم مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مرحوم مولانا ایڈیٹر "ریاست" پر بہت مہربانی فرماتے اور ایسا سلوک کرتے تھے۔ جیسا بزرگ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ بہت محبت اور تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر کے بعد چوب دار مولانا کو لینے آیا۔ مولانا مہاراجہ سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ میں زنگا آٹر سے باتیں کرتا رہا۔ مولانا ملاقات سے فارغ ہوئے تو میں مہاراجہ کے خیمہ میں گیا۔

مرحوم مہاراجہ الور اپنے دور کے والیان ریاست میں سب سے زیادہ لائق تھے اور آپ کو متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ بہت اعلیٰ درجہ کے مقرر اور ریاست دان۔ مگر اعمال کے اعتبار سے سب سے بدتر۔ نہ صرف آپ کی ایڈمنسٹریشن کی حالت بہت قابلِ رحم تھی بلکہ آپ کے ذاتی حالات بھی انتہائی قابلِ نفرت تھے۔ میں جب مہاراجہ سے ملنے گیا۔ تو آپ تپاک سے ملے۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو مہاراجہ نے اپنا رعب قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے ویدانت کا فلسفہ شروع کر دیا۔ پرماتما ایک ہے۔ ہم سب اسی کا نور ہیں۔ نہ پرماتما میں فرق ہے نہ آتما میں۔ پرماتما غیر فانی ہے اور روح بھی غیر فانی ہے پرماتما کے بعد آتما ہے اور آتما کے بعد پرماتما وغیرہ۔ میں ان کے ویدانت کے اس فلسفہ کو سنتا رہا۔ مگر میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہاں اس فلسفہ کے بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے آخر اس تمام ویدانت بازی کا نچوڑ آپ نے یہ ظاہر کیا۔ کہ والیانِ ریاست بھی ذی روح ہیں۔ انسان ہیں۔ ہندوستانی ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" کے ہندوستانی بھائی ہیں۔ گورنمنٹ والیانِ ریاست کی خیر خواہ نہیں۔

Marfat.com

نہ والیانِ ریاست گورنمنٹ کے خیرخواہ ہیں۔ انسان سب برابر کے ہیں اور ایڈیٹر "ریاست" والیانِ ریاست کے خلاف سخت مضامین نہ لکھے کیونکہ اس سے والیانِ ریاست کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے۔

مہاراجہ جب ناصحانہ انداز میں اپنی تمام تقریر ختم کر چکے تو ایڈیٹر "ریاست" نے چند الفاظ میں عرض کیا۔ کہ والیانِ ریاست اپنی رعایا پر اس قدر شرمناک مظالم کرتے ہیں کہ ایڈیٹر "ریاست" ان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ اور یہ لوگ اس سلوک کے مستحق ہیں کہ جو سلوک آدم خور درندوں کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔

مہاراجہ کے لیے میرے یہ الفاظ غیر متوقع تھے کیونکہ ان کو یقین تھا۔ کہ وہ اپنے ویدانت اور پرماتما آتما کے فلسفہ کو بیان کر کے مجھ پر چھا جائیں گے اور میں حضور حضور کہہ کر آئندہ کے لیے توبہ کر لوں گا۔ ان کو یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ مجھ پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ لوگوں کو اس طرح ہی اپنی باتوں سے قائل کرنے کے عادی تھے میرا یہ جواب سن کر حیرانی کی حالت میں میری طرف دیکھنے لگے۔ آدمی بہت ہوشیار تھے۔ آپ نے فوراً گفتگو کا پہلو بدل کر اور باتیں شروع کر دیں۔ اخبار کا کیا حال ہے۔ کتنا چھپتا ہے۔ اس کا حلقۂ اثر تو بہت کافی وسیع ہے۔ کبھی الور نہیں آئے۔ وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے۔ مہاراجہ کا پروگرام یہ تھا۔ کہ وہ مجھ سے ملیں گے۔ مجھ پر اپنا رعب قائم کریں گے۔ میں اپنے گزشتہ مضامین پر جو الور کے متعلق لکھے گئے۔ اظہار ندامت و افسوس کروں گا۔ آئندہ کے لیے "نیک چلن" رہنے کا یقین دلاؤں گا۔ مہاراجہ اس کے بعد پانچ، سات یا دس ہزار روپیہ بطور رخصتانہ یا امداد مجھے عطا فرمائیں گے۔ اور "ریاست" میں آئندہ مہاراجہ کی تعریفیں چھپا کریں گی۔

کچھ دیر گفتگو کے بعد مہاراجہ نے پوچھا۔ کہ "ریاست" کی مالی حالت کیسی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ کھانے کے لیے روٹی مل جاتی ہے۔ مہاراجہ کے اس پوچھنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ میں مالی پریشانی کا اظہار کروں۔ اور مہاراجہ امداد کرنے پر آمادہ ہوں۔ مہاراجہ کے لیے میرا یہ جواب بھی خلافِ توقع تھا۔ مالی حالت کے دریافت کرنے کے سلسلہ میں مجھے موقع مل گیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو روپیہ کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ پیدا کر لیتا ہوں۔ مگر ایک درخواست ہے۔ آپ کے لکھنے پر رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس آپ کے گورو کی آنکھوں کا اپریشن کرنے کے لیے الور گئے۔ آپ نے دس ہزار روپیہ فیس کا وعدہ کیا۔ اوپریشن ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے بعد متعدد بار الور گئے مگر آپ نے فیس نہ دی۔ ڈاکٹر صاحب کئی ہزار روپیہ ماہوار سکولوں اور کالجوں وغیرہ پبلک انسٹی ٹیوشنوں کو خیرات دیتے ہیں۔ ایسے نیک شخص کی فیس ادا نہ کرنا مناسب نہیں۔ اگر آپ ان کی یہ فیس ادا کر دیجئے تو نہ صرف یہ انصاف ہو گا۔ بلکہ اسے میں اپنی ذات پر بھی ایک احسان سمجھوں گا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب میرے بزرگ اور محترم ہیں۔ مہاراجہ کے لیے یہ صاف بیانی بھی خلاف توقع تھی۔ کیونکہ یہ مہاراجہ پر نادہندگی کا الزام تھا۔ آپ نے ٹالتے ہوئے کہا کہ آپ الور جائیں گے تو گورو جی سے پوچھ کر۔ گورو جی جو رقم فرمائیں گے وہ بھیج دیں گے۔

اس ملاقات کے بعد میں مہاراجہ کے خیمہ سے باہر آیا۔ ویٹنگ روم میں مسٹر ونکا آر میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھے چھوڑنے کے لیے دریا گنج دفتر "ریاست" میں آئے۔ راستہ میں انہوں نے پوچھا۔ کہ کیا باتیں ہوئیں۔ میں نے ونکا آر سے کہا۔ کہ اگر اس شخص سے میں نہ ملتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مجھ پر جتنا برا

Marfat.com

اثر پہلے تھا اس میں کافی اور اضافہ ہو گیا۔

اگلے روز مسٹر رنگا آئر پھر آئے۔ مہاراجہ نے ان کو اس غرض کے لیے بھیجا۔ کہ ایک تو معلوم کریں کہ مجھ پر اس ملاقات کا کیا اثر ہوا۔ اور میں مہاراجہ کی قابلیت کا قائل ہوا یا نہیں اور دوسرے اگر میں مالی امداد چاہتا ہوں تو اس کے متعلق بات چیت کی جائے۔ اثرات کے متعلق میں نے مسٹر رنگا آئر سے وہی کچھ کہا۔ جو میں نے الور کیمپ سے واپسی کے وقت ان سے موٹر میں کہا تھا۔ مالی امداد کے متعلق میں نے مسٹر رنگا آئر سے کہا۔ کہ تم میرے دوست ہو۔ میں الور سے روپیہ لوں گا۔ تو پھر بھی اس شخص کو بے نقاب کرنے سے باز نہ آؤں گا۔ یہ شخص اپنی رعیت کے لیے بہت بڑی لعنت ہے۔ تمہاری پوزیشن نازک ہو جائیگی تم مہاراجہ کو ٹال دو۔ چنانچہ مسٹر رنگا آئر میں یہ جرأت تو کہاں تھی۔ کہ وہ مہاراجہ سے ان برے اثرات کا اظہار کرتے جو میرے ذہن پر مہاراجہ کے متعلق ہوئے۔ اگر اتنی جرأت ہوتی تو وہ ریاست الور میں ملازمت ہی کیوں کرتے۔ مالی امداد کے متعلق انہوں نے کہا کہ دیوان سنگھ کو آمدنی کافی ہے اس کو روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اس نے مالی امداد لینے سے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میرے دل میں مہاراجہ کے لیے نفرت کے جذبات زیادہ ہوتے چلے گئے جوں جوں "ریاست" میں مضامین شائع ہوتے۔ الور کی رعایا کی طرف سے مواد اور زیادہ آتا۔ مہاراجہ کے بے اختیار ہونے تک "ریاست" میں مہاراجہ کے خلاف مہاراجہ کو بے نقاب کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مہاراجہ نے بمبئی میں ایک بار جب کہ آپ کئی ماہ تک وہاں مقیم رہے اپنے اہل کاروں سے کہا۔ کہ آپ کی مصائب کا ایک بڑا سبب اخبار "ریاست" بھی ہے جس نے پبلک رائے کو آپ کے خلاف کر دیا اور جب گورنمنٹ نے آپ کے خلاف قدم اٹھایا تو پبلک رائے بھی آپ کے خلاف تھی۔

خاندانی وقار پر فخر نہ کرو

میرے جرنلزم کے پیشہ کو اختیار کرنے کے ابتدائی زمانہ کا ذکر ہے۔ میں "خالصہ اخبار" سے علیحدہ ہو چکا تھا اور لاہور کے متعدد چھوٹے چھوٹے اخبارات میں دو دو تین تین گھنٹہ کام کرتا تھا۔ شام کو مرحوم لالہ بانکے دیال ایڈیٹر "جھنگ سیال" کے مکان پر چند اخبار نویس جمع ہوا کرتے۔ ان میں ہر روز شامل ہونے والوں میں مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ شیدا۔ پنڈت رتن چند موہن (جو بعد میں پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ انفرمیشن میں کام کرتے تھے) اور ایڈیٹر "ریاست" تھے۔ دو تین غیر جرنلسٹ دوست بھی آتے۔ جن کے لالہ بانکے دیال سے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے۔

اس زمانہ گورنمنٹ کی پالیسی میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی اور حکومت نے محسوس کیا تھا۔ کہ اخبار نویسوں اور پبلک ورکرز کو جرائم پیشہ سمجھنا غلطی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ تھوڑا بہت تعاون ہونا چاہیئے۔ اور اگر اخبار نویسوں میں سے کچھ کام کے آدمی مل جائیں تو ان کو گورنمنٹ کی ملازمت میں لے لیا جائے

Marfat.com

چنانچہ اس پالیسی کے تحت ہی مرحوم مسٹر عبدالعزیز جو لاہور میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ سرکاری ملازمت میں لے لیے گئے تھے۔

ایک روز ہم لوگ شام کے وقت جمع ہوئے اور مختلف موضوع پر گپ بازی ہو رہی تھی اور گورنمنٹ کی اخبارات اور جرنلسٹوں کے متعلق پالیسی کی تبدیلی کا ذکر آیا۔ تو لالہ بانکے دیال نے ایڈیٹر "ریاست" سے طنزاً کہا کہ "تم دو دو تین تین گھنٹے کئی اخبارات میں کام کرتے ہو۔ کیوں نہ سرکاری ملازمت کر لو" میں نے اس طنز کا فوراً جواب دیا "بہت اچھا خیال ہے۔ آیئے ہم دونوں سرکاری ملازم ہو جائیں" میرے اس جواب کے بعد پنڈت رتن چند نے مذاقاً کہا کہ "آیئے آپ دونوں کی جانب سے درخواست لکھ لی جائے۔ وہاں قلم دوات اور کاغذ موجود تھا۔ پہلے میری طرف سے درخواست لکھی جانے لگی۔ پنڈت رتن چند نے کہا۔ سب سے پہلے اپنے خاندانی حالات بتایئے۔ کیونکہ ہر درخواست میں ضروری ہے کہ خاندان کے حالات ہوں۔ میں نے حالات بتانے شروع کیے۔ میرے والد گورنمنٹ کی ملازمت میں ڈاکٹر تھے میرے چچا سردار سیوا سنگھ گورنمنٹ کے خطاب یافتہ "سردار صاحب" اور ریاست نابھ میں چیف میڈیکل آفیسر ہیں۔ میرے چچازاد بھائی ڈاکٹر امریک سنگھ گورنمنٹ کی ملازمت میں اسسٹنٹ سرجن ہیں۔ میرے ایک چچازاد بھائی سردار گوربچن سنگھ وکیل ہیں اور ایک چچا سردار موہن سنگھ آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ جب میں نے اتنا ہی بتایا۔ تو پنڈت رتن چند نے کہا "گویا کہ خاندان کے سب لوگ ہی اچھی جگہ پر ہیں۔ صرف تم ہی بے وقوف اور بدنصیب ہو۔ جو اخبارات کے دفاتر میں فاقہ کشی کرتے ہوئے دھکے کھا رہے ہو" پنڈت رتن چند کے ان الفاظ پر تمام لوگ ہنس پڑے۔ اور ان لوگوں کی ہنسی کے ساتھ میں بھی کھسیانی حالت میں ہنس پڑا۔ کیونکہ گو دل میں تو میں اپنی ناکامی اور کمزوری پر شرمندہ تھا مگر ان کے ساتھ شامل ہو کر ہنسنے کے علاوہ دوسری مناسب صورت بھی کیا تھی۔

عام طور پر لوگ چھوٹے چھوٹے واقعات سے اثر نہیں لیتے۔ مگر میں بعض بہت چھوٹے واقعات سے بھی متاثر ہو جاتا ہوں۔ اور پھر زندگی بھر یہ واقعہ میری اصلاح کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد آج تک میں نے اپنے خاندان کے کسی بڑے شخص پر کبھی بھی فخر نہیں کیا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ انسان وہی بڑا ہے جو خود اپنی قوت بازو سے بلند ہو۔

درخواستوں کے خاندانی وقار کے سلسلہ میں ایک صاحب نے جو ایک امریکن دفتر نئی دہلی میں اعلیٰ عہدہ پر ہیں۔ مجھے بتایا۔ کہ ان کے دفتر میں بھی جب کلرکی کی ملازمت کے لیے لوگ درخواست دیتے ہیں تو ان میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ درخواست کرنے والے کا باپ فلاں عہدہ پر ہے۔ چچا فلاں عہدہ پر بھائی نے فوج میں یہ خدمت انجام دی اور بہنوئی پنشن پا رہے ہیں۔ ان ایسی درخواستوں کو دیکھ کر امریکن بیحد نفرت کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ ان واقعات سے ملازمت کا کیا تعلق۔ درخواست میں تو صرف یہ لکھا جانا چاہیئے۔ کہ درخواست دینے والے کی اہلیت کیا ہے اور وہ کیا کام کر سکتا ہے مگر درخواستوں میں خاندانی وقار کو اس طرح لکھا جاتا ہے۔ گویا کہ امریکن شادی کے لیے لڑکیاں تقسیم کر رہے ہیں اور

Marfat.com

جو شخص خاندانی وقار کے لحاظ سے بلند ہوگا۔ اس کو خوبصورت لڑکی دی جائے گی۔

اس واقعہ کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذاتی قابلیت اور کامیابی حاصل کرنے کی جگہ اپنے خاندان پر فخر کرکے کاہلی، سستی اور بے ہمتی کا ثبوت دیتے ہیں وہ اپنے ذہن کو دھوکا دینے کا باعث ہیں۔ وہ زمانہ چلا گیا اور یہ زمانہ اب کبھی بھی واپس نہ آئے گا۔ جب خاندان کو دیکھ کر حکومتیں پنشن مقرر کر دیتی تھیں۔ یا لوگ لڑکیاں دیتے تھے۔ اب تو بڑا وہی شخص ہے جو اپنی قوتِ بازو کے ذریعہ بلند ہو۔

ظلم و زیادتی کو برداشت نہ کرو

جب "ریاست" جاری کیا گیا تو سب سے پہلے دفتر اور رہائش کے لیے مکان دہلی دروازہ کے بالکل قریب موجودہ تھانہ کے عین سامنے، کوچہ لال سن میں تھا۔ یہ مکان چودھری پت رام کا تھا۔ چودھری صاحب بہت شریف اور نیک بزرگ تھے۔ یہ محلہ تمام کا تمام ہندوؤں کا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر کوئی مسلمان دگنا کرایہ بھی دیتا۔ تو اسے مکان کرایہ پر نہ مل سکتا تھا۔ لیکن اس مکان کا کرایہ اٹھائیس روپے ماہوار دیتا تھا۔ اور بارہ روپیہ ماہوار میں اس کا ایک حصہ میں نے ایک بابو صاحب کو دیا ہوا تھا۔ جو ریلوے میں گارڈ تھے یعنی یہ مکان میرے پاس صرف سولہ روپیہ ماہوار میں تھا اور اس میں دفتر "ریاست" اور میری رہائش دونوں کے لیے جگہ تھی۔

میں نے جب مکان کرایہ پر لیا تو چودھری پت رام تو مجھے مکان دینے پر آمادہ تھے۔ مگر اس مکان کے قریب کے براہمن اور بنیئے مجھے دیکھ کر ناک چڑھا رہے تھے اور انہوں نے چودھری پت رام سے اس وقت جبکہ میں کرایہ پر لینے کے لیے مکان دیکھ رہا تھا۔ اشارۃً کہا۔ کہ یہ مکان مجھے کرایہ پر نہ دیا جائے ان لوگوں کے پاس مجھے مکان نہ دیئے جانے کے حق میں اگر کوئی دلیل تھی تو صرف یہ کہ میں پنجابی ہوں۔ اور سکھ ہوں۔ اس زمانہ میں (اور شاید اب بھی) دہلی کے لوگ پنجابیوں کو ناپسند کرتے تھے اور سکھوں سے تو اس قدر ہیبت زدہ تھے۔ جیسے پنجاب کے لوگ افغانستان کے پٹھانوں سے خوف کھاتے تھے۔ یعنی یہ پنڈت اور بنیئے نہیں چاہتے تھے۔ کہ ان کے پڑوس میں کوئی ایسا پنجابی یا سکھ آباد ہو۔ جس پر ان کا رعب نہ رہے۔ چودھری پت رام فطرتاً شریف اور نیک بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ ان کو کرایہ سے غرض تھی۔ آپ نے ان بنیوں اور براہمنوں کی کانا پھوسی کا جواب یہ دیا۔ کہ سکھ مسلمان نہیں ہوتے۔ یہ بھی ایک قسم کے ہندو ہیں اور مکان کرایہ پر لینے والا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مکان دینے میں کوئی ہرج نہیں چنانچہ چودھری پت رام نے مکان مجھے کرایہ پر دے دیا۔ اور ایک ماہ کا کرایہ پیشگی لے کر چابی میرے حوالہ کی۔ جب چابی میں لے رہا تھا۔ تو ان پڑوسیوں میں سے ایک نے نیم بددلی اور نیم اطمینان کے سے ملے جلے جذبات میں کہا۔ کہ اچھا سردار جی! مکان لے لیجئے۔ آپ ہندو ہیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ مگر آپ نے پیاز اور گوشت نہ پکانا۔ کیونکہ یہ محلہ براہمنوں اور بنیوں کا ہے۔ میں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور صرف مسکرا

Marfat.com

دیا۔ میری اس مسکراہٹ کے دو معنی تھے۔ لالہ جی تو یہ سمجھیں کہ میں نے آپ کی اس شرط کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ میں نے دل میں یہ کہا کہ لالہ جی مجھے مکان میں اسباب لے آنے دو۔ پھر دیکھو نگا کہ مجھے پیاز اور گوشت پکانے سے کون روکتا ہے۔

میں اب تو گوشت بہت کم کھاتا ہوں اور اسے گناہ بھی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انسان کا اپنی لذت کے لیے کسی جان دار کی جان لینا بے رحمی ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں گوشت کثرت کے ساتھ کھایا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سالہا سال تک بلا ناغہ ہر روز کھاتا رہا۔ میں نے جب اس مکان میں رہائش اختیار کی تو ہمیشہ کی طرح میرے لیے وہاں بھی گوشت پکنا شروع ہُوا۔ پانچ سات روز میں ہی پڑوسیوں کو مصالحہ کی خوشبو سے یہ احساس ہُوا کہ میں شاید گوشت پکواتا ہوں۔ اور اگر گوشت نہیں تو میرے ہاں پیاز کا مصالحہ تو ضرور بھونا جاتا ہے۔ چنانچہ پھر کانا پھوسی شروع ہوئی۔ مگر کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ مجھ سے دریافت کرے۔ اس طرح سے ہی دو تین ہفتے گزر گئے۔

میں جہاں بھی اور جس مکان میں بھی رہا ہوں۔ پڑوسیوں کے متعلق میری پوزیشن ہمیشہ ہی دلچسپ رہی۔ میں نے کسی پڑوسی کے متعلق کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ پانچ پانچ سات سات سال تک رہنے کے باوجود مجھے علم نہیں ہوتا۔ کہ پڑوسیوں کا نام کیا ہے۔ نہ ان کے ہاں کبھی جاتا ہوں اور نہ ان کے اپنے ہاں آنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پڑوسیوں سے جتنا بے تعلق رہا جائے۔ انسان آرام میں رہتا ہے۔ تعلقات ہونے پر پہلے دوستی ہوتی ہے۔ پھر یہ دوستی عداوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور تو تو میں میں تک نوبت پہنچتی ہے۔ میں پڑوسیوں کے جھگڑوں اور ان کے حالات سے اس قدر بے تعلق رہتا ہوں۔ کہ اگر میرے دروازے کے سامنے دو پڑوسی لڑ رہے ہوں۔ تو میں اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں۔ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پڑوسیوں سے باوجود اس بے تعلقی کے یہ لطیفہ اور بھی دلچسپ ہے کہ پڑوسیوں کے تمام چھوٹے بچے مجھ سے بے حد مانوس ہو جاتے ہیں اور میں ان سے بہت بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ یہ جب بھی میرے ہاں آئیں ان کی خاطر اور ان سے محبت کا سلوک کرتا ہوں اور یہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ میں کب کام سے فارغ ہو جاؤں اور یہ میرے پاس آئیں۔

مجھے اس مکان میں رہتے ہوئے پانچ ہفتے ہوئے تھے تو میرے مکان کے سامنے والے پنڈت جی تشریف لائے اور میرے ساتھ ان کی یہ بات چیت ہوئی۔

پنڈت جی: سردار جی مزاج اچھے ہیں۔

میں: پنڈت جی آپ کی مہربانی ہے۔

پنڈت جی: سردار جی آپ پیاز کھاتے ہیں۔

میں: جی ہاں۔ میں کھاتا ہوں۔

پنڈت جی: اور کیا گوشت بھی کھاتے ہیں۔

Marfat.com

میں: جی ہاں، گوشت بھی کھاتا ہوں۔

پنڈت جی: تو کیا گوشت اور پیاز یہاں ہی پکاتے ہیں۔

میں: جی ہاں۔ یہاں ہی پکاتا ہوں۔

پنڈت جی: یہ محلہ ہندوؤں کا ہے۔ آپ گوشت نہیں پکا سکتے۔

میں: پنڈت جی، میں پڑوسیوں کے احساس کا ہمیشہ احترام کرتا ہوں اور میرا یہ فرض ہے۔ مگر اس صورت میں کہ میں گوشت اور پیاز اپنے گھر کے اندر پکاؤں اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ آپ کو اس سے برا نہ ماننا چاہیے۔

پنڈت جی: نہیں صاحب ہم تو محلہ میں گوشت یا پیاز نہیں پکنے دیں گے۔

میں: میں تو گوشت ہر روز کھاتا ہوں۔ لازمی طور پر پکواؤں گا۔ ہاں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

پنڈت جی یہ بات چیت کر کے چلے گئے۔ میں ان سے مخاطب تو پہلے ہی کبھی نہ ہوا تھا اس روز کے بعد تو صاحب سلامت بھی موقوف۔ یہ کبھی گلی میں سے دکھائی بھی دیتے تو پیشانی پر بل ڈال کر دوسری طرف منہ پھیر لیتے۔ اس کے علاوہ آپ نے محلہ کے دوسرے لوگوں کے پاس میری برائی شروع کی۔ مگر میں نے کوئی پروا نہ کی۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اثر لینا صرف چھوٹے خیال کے لوگوں کا کام ہے۔ جو لوگ بلند ہونا چاہیں۔ انہیں چھوٹی باتوں سے بلند رہنا چاہیے۔

کئی دن گزر گئے۔ پنڈت جی روز بروز زیادہ مخالف ہوتے چلے گئے۔ ہر جگہ میرے خلاف باتیں کرتے اور میں چونکہ ان کی مخالفت کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ یہ مجھے کمزور سمجھتے۔ میں نے ان کو ایک روز سمجھایا۔ کہ انسان کو دنیا میں نہ تو کسی پر زیادتی کرنی چاہیے اور نہ ہی زیادتی برداشت کرنی چاہیے۔ میں نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ مگر آپ خواہ مخواہ میری مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کے لیے یہ مناسب نہیں۔ پنڈت جی پر میری اس درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور آپ میری اس مخالفت میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے۔ اور ان کو مخالفت کے لیے اور کوئی بات نہ ملتی تو بار بار پیاز اور گوشت کا نام لے کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

ایک روز میرے ہاں مرغی پکائی گئی اور مرغی کی کھال، پنجے اور انتڑیاں وغیرہ ابھی بھنگن اٹھا کر نہ لے گئی تھی کہ بلی ان میں سے ایک پنجہ اٹھا کر لے گئی۔ اور اس کم بخت نے پنڈت جی کی ڈیوڑھی میں لے جا کر اسے کھانا شروع کر دیا۔ پنڈت جی گھر پر نہ تھے۔ باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس تشریف لائے تو بلی اپنے شکار میں مصروف تھی۔ پنڈت جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا محلہ میں کوئی دوسرا شخص گوشت تو کیا پیاز بھی نہ کھاتا تھا اس جرم کا مجرم ہو سکتا تھا تو صرف میں ہی۔ پنڈت جی آگ بگولا صورت میں ڈیوڑھی سے باہر نکل آئے اور آپ نے اس طرح ہی واویلا شروع کیا جیسے کوئی ڈاکہ پڑا ہو۔ گلی کے لوگ بھی تماشہ دیکھنے جمع ہو گئے۔ پنڈت جی مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ میں نے ان کا جنم بھرشٹ کر دیا۔ ان کی ڈیوڑھی میں مرغی کا پنجہ آ گیا۔

Marfat.com

میں اپنے متعلق شور سن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ پنڈت جی چلا رہے ہیں اور مجھے برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ میں نے پنڈت جی سے کہا۔ کہ میرا قصور نہیں بلی پنجہ اٹھا لے گئی۔ اگر فرض کیا کہ بلی کوئی مرا ہوا چوہا آپ کی ڈیوڑھی میں لے جاتی تو پھر کس کا قصور تھا مگر پنڈت جی نہیں مانتے تھے اور اس بات پر ضد کر رہے تھے کہ میرے ہاں پیاز اور گوشت کیوں آتا ہے میں نے آخر کہا۔ اچھا پنڈت جی! اگر آپ غیر معقولیت پر اتر آئے ہیں تو لیجئے اب آپ منہ سے ایک لفظ نکالیئے میں آپ کا سر موری میں دے کر آپ کو مار مار کر دنبہ بنا دوں گا چنانچہ میں پنڈت جی کی مرمت کے لیے تیار ہو گیا اور ان کو پیٹنے والا ہی تھا۔ کہ آپ نے اپنی بزدلی کا اظہار کرتے ہوئے جھٹ کہا:

"سردار جی! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ آپ ذرا احتیاط کیا کیجئے تاکہ بلی کسی ہڈی وغیرہ کو اٹھا نہ لائے۔ ہم تو آپ کے سیوک ہیں۔ آپ اپنے گھر میں جو چاہیں کریں آپ کو کون روکتا ہے۔" اس کے بعد پنڈت جی ہمیشہ کے لیے سیدھے ہو گئے۔ گلی میں اگر ملتے تو فوراً نمستے کہتے ہوئے تپاک کے ساتھ پوچھتے۔ مزاج کیسے ہیں اور سلام دعا کا سلسلہ میرے اس مکان کو چھوڑنے کے بعد بھی عرصہ تک قائم رہا۔

سکھوں کے گورو صاحب کا ایک شبد ہے جس کے معنی ہیں: "عارف اللہ وہ ہے جو نہ کسی کو خوف دے اور نہ کسی کا خوف برداشت کرے۔" اس اصول کے مطابق انسان کا فرض ہے کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی کرنے کو گناہ سمجھے اور اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے تو اس زیادتی کو برداشت نہ کرے کیونکہ زیادتی برداشت کرنا بزدلی ہے اور بہادر و بزدل انسان میں یہی فرق ہے۔ بہادر شخص نہ تو کسی دوسرے پر ظلم کرتا ہے نہ خود ظلم برداشت کرتا ہے اور بزدل شخص ظلم اسی پر کرتا ہے جو ظلم برداشت کرے اور کمزور ہو اور اس پر ظلم نہیں کرتا جو بہادر ہو۔

لائق سمجھنا ہی نالائقی کا ثبوت ہے

ایڈیٹر "ریاست" کی جرنلزم کی تمام زندگی میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جس روز اس کے پاس پانچ سات مضامین، افسانے یا نظمیں ایسی نہ پہنچی ہوں جن کو "ریاست" میں شائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور صرف "ریاست" کا ہی کیا سوال ہے۔ دنیا کے ہر اخبار کے دفتر میں چھپنے والے مضامین سے زیادہ مواد ناقابلِ اشاعت پہنچتا ہے جو لکھنے والوں کو واپس کر دیا جاتا ہے مگر ایک اخبار نویس کی حالت اس وقت قابلِ رحم ہوتی ہے جب مضمون نگار مضمون کے واپس پہنچنے کے بعد یہ دریافت کرے کہ مضمون شائع نہ کرنے کی وجہ کیا ہے۔ چنانچہ دفتر "ریاست" سے ایسے حضرات کو صرف یہی جواب دیا جاتا ہے کہ ہماری قابلیت بہت محدود ہے۔ آپ کے بلند مضمون کو سمجھنے کی ہم اہلیت نہیں رکھتے۔

انسان کی فطرت حق و صداقت اور معقولیت کی پروا نہیں کرتی۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو

Marfat.com

معقولیت کو اپنی فطرت پر غالب آنے دیں۔ چنانچہ مضامین کے سلسلہ میں بھی یہ قدرتی امر ہے کہ اگر کسی مضمون نگار کا مضمون اخبار میں شائع ہو تو مضمون نگار کا خوش ہونا فطرتاً ضروری ہے اور اگر مضمون شائع نہ ہو اور وہ واپس کر دیا جائے تو مضمون نگار یقیناً ناخوش ہی نہ ہو گا بلکہ اس کے دل میں اخبار کے لیے نفرت بھی پیدا ہو جائے گی اور مضمون نگار ایسا کرنے کے لیے انسانی فطرت کے باعث مجبور ہے کیونکہ جب وہ مضمون لکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مضمون بہت اچھا ہے۔ اسے اخبار میں شائع ہونا چاہئے اور جب مضمون ناقابلِ اشاعت قرار دیا جا کر اس کے پاس واپس پہنچے تو اس کو یہی احساس ہوتا ہے کہ مضمون تو اچھا تھا۔ ایڈیٹر نے اپنی نالائقی۔ قدر ناشناسی یا کسی اور وجہ سے واپس کر دیا۔ چنانچہ اگر مضمون لکھنے والے کو مضمون کے بلند اور بہتر ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ مضمون کو بھیجتا ہی کیوں۔ یا اسے مضمون کی غلطیوں کا احساس ہوتا تو وہ بھیجنے سے پہلے اپنی غلطیوں کو درست کر لیتا۔

مضامین کے سلسلہ میں ذیل کا ایک واقعہ لکھتا ہوں جو زندگی بھر میری رہبری کا باعث ہوا اور جس کے بعد میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہی رنگروٹ، نالائق یا ایک طالب علم سمجھا اور میرا یہی احساس میری جرنلزم کی زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا باعث ہے۔

لالہ شام لال کپور (ایڈیٹر "گورو گھنٹال") لاہور سے ایک روزانہ اردو اخبار "بلیٹن" نکالتے تھے۔ آپ سنسنی پیدا کرنے والے مضامین میں بہت مشاق تھے اور اس اعتبار سے شاید اس زمانہ میں لاہور کا کوئی اخبار نویس آپ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا مگر علم و ادب، افسانہ یا نظم وغیرہ سے آپ کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ میں اس زمانہ میں لالہ شام لال کے اخبار میں روزانہ چند گھنٹے کام کرتا تھا اور کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں شام کو سینما بھی جایا کرتے۔ ایک روز کام ختم کرنے کے بعد ہم سیر کے لیے جا رہے تھے تو ہمیں سامنے سے آتے ہوئے مہاشہ سدرشن جی جن کی اس زمانہ میں بطور افسانہ نویس بہت بڑی شہرت تھی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور آجکل بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں بطور ڈرامانویس دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں) ملے۔ نمستے نمستے ہونے کے بعد لالہ شام لال نے مہاشہ سدرشن سے کہا: "سدرشن صاحب! میں تو زندگی بھر یہی سمجھتا رہا کہ افسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے کئی برس کی ضرورت ہے مگر آپ حیران ہوں گے۔ آج میں نے افسانہ لکھنے کی پہلی بار کوشش کی اور میں نے نصف گھنٹہ کے اندر بہت اچھا افسانہ لکھ لیا جو کل کے اخبار میں شائع ہو گا۔

مہاشہ سدرشن نے لالہ شام لال کے یہ الفاظ سن کر جو جواب دیا وہ یہ تھا:

"شام لال جی! آپ نے تو نصف گھنٹہ میں افسانہ لکھ لیا۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ پانچ سات سال تک مسلسل افسانہ لکھتے رہیں تو پانچ سات برس کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ افسانہ کہتے کسے ہیں۔ آپ کو افسانہ لکھنا پھر بھی نہ آئے گا۔ یعنی افسانہ کو صرف سمجھنے کے لیے ہی پانچ سات برس کا عرصہ چاہیئے لکھنا تو بہت بڑی بات ہے۔"

Marfat.com

جو لوگ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنا چاہیں یا جن اصحاب کو مضمون نگاری یا افسانہ نویسی کا شوق ہو وہ اگر مہاشہ سدرشن کے ان الفاظ کو ذہن میں رکھیں تو ان کے لیے کامیابی حاصل کرنا مشکل نہیں کیونکہ دنیا میں کسی فن کو وہی شخص سیکھ سکتا ہے جو بطور طالب علم سیکھنے کی کوشش کرے اور اگر نالائق اور ناواقف ہوتے ہوتے اس نے اپنے آپ کو لائق اور بلند سمجھا تو اس نے اپنی ترقی کی راہیں محدود کر لیں۔

ستاروں کے اثرات

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب کہ جرنلزم کا پیشہ اختیار کیے مجھے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔ میں لاہور میں تھا۔ مختلف اخبارات میں دو دو تین تین گھنٹے کام کرتا۔ مالی حالت اچھی نہ تھی اور اپنی زندگی کو انتہائی ناکام سمجھتے ہوئے کچھ مایوس سا تھا۔

میرا کچھ وقت مرحوم لالہ رچھپال سنگھ شیدا اور مرحوم لالہ بانکے دیال کے ساتھ صرف ہوتا۔ ایک روز ان دونوں حضرات سے پنڈت راج نرائن ارمان کھٹ شاستری ملنے کے لیے آئے۔ اور باتیں ہو رہی تھیں تو پنڈت جی نے فرمایا۔ کہ بھرگو سنگتا کا کچھ حصہ ان کے پاس موجود ہے۔ یہ سن کر ان دونوں حضرات کے دل میں بھرگو سنگتا دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اگلے روز ہم تینوں بھرگو سنگتا دیکھنے کے لیے پنڈت راج نرائن جی کے مکان پر گئے۔

بھرگو سنگتا کیا ہے۔ اس کے متعلق بعد میں جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں وہ یہ ہیں کہ یہ نادر و نایاب کتاب علم جوتش کے موجد بھرگو رشی کی تصنیف ہے جسے ہزارہا برس ہوئے تصنیف کیا گیا۔ یہ کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر حصہ دو دریاؤں کے درمیانی حصہ کے لوگوں کے حالات کے متعلق ہے۔ یعنی ہر دو آبہ کے لیے علیحدہ جلد ہے۔ تمام کی تمام مکمل کتاب کا وزن کئی من بتایا جاتا ہے اور مختلف لوگوں کے پاس مختلف حصے ہیں۔ اس کتاب کے کچھ حصے تو جرمنی کے پروفیسر میکس مولر (یہ بزرگ سنسکرت زبان کے بہت بڑے عالم تھے) ہندوستانی پنڈتوں سے خرید کر جرمنی لے گئے اور انہوں نے وہاں کے سرکاری کتب خانے میں رکھے۔ بعض حصے ہندوستان میں چھپ بھی گئے ہیں۔ مگر زیادہ تعداد ایسی ہے جو ابھی نہیں چھپی۔ اس کتاب میں دنیا میں پیدا ہو چکے اب موجود اور آئندہ پیدا ہونے والے ہر انسان کا زائچہ اور زندگی کے حالات ہیں اور صرف اس زندگی کے حالات ہی نہیں بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ انسان پچھلے جنم یعنی اب پیدا ہونے سے پہلے کی زندگی میں کہاں تھا اور مرنے کے بعد پھر کہاں پیدا ہو گا۔

ہم لوگ پنڈت جی کے پاس پہنچے نمسکار اور نمستے ہونے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو ہم لوگوں نے بھرگو سنگتا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پنڈت جی کے پاس ایک حصہ تھا۔ ہم لوگ اپنی کنڈلیاں یعنی زائچے ساتھ لے گئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی کنڈلی پنڈت جی کو دی۔ انہوں نے بہت کافی وقت صرف کر کے

Marfat.com

میری کنڈلی کو بھر گو سنگتا کی ہزارہا کنڈلیوں میں سے ایک کے ساتھ ملاتی۔ کنڈلی کے ملنے کے بعد اس کنڈلی کا جو پھل یعنی نتیجہ پنڈت جی نے پڑھا وہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جو یہ تھا:

"یہ انسان اپنے باپ کے لیے بہت ہی نقصان کا باعث ہو۔ حمل میں ہوگا تو والد کی صحت گرنی شروع ہو گی۔ پیدا ہونے کے بعد چھ ماہ کے اندر اس کا باپ انتقال کر جائے گا۔ اس انسان کو علم کچھ نہ ہو مگر بہت ہوشیار ہو۔ اٹھارہ برس کی عمر میں زمین ملے۔ سترہ برس کی عمر میں ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو اور بہت تکلیف اٹھائے۔ اس لڑکی کے ساتھ اس انسان کا پچھلے جنم میں بھی تعلق تھا اس نے اس لڑکی کو پچھلے جنم میں تکلیف دی تھی۔ یہ لڑکی پچھلے جنم کا بدلہ اس کے اس جنم میں لے گی۔ جب کہ اس انسان کی عمر سترہ برس کی ہو گی یہ انسان پچھلے جنم میں بنارس کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا اور آئندہ جنم میں بھی بنارس میں ہی پیدا ہو گا۔ یہ انسان بہت خوش نصیب اور خوش بخت ہے۔ زندگی بھر لاکھوں انسانوں کے دماغوں پر حکومت کرے۔ چڑھنے کے لیے اسے سواری نصیب ہو۔ لاکھوں روپیہ پیدا کرے اور لاکھوں خرچ کرے۔ ہمیشہ مقروض رہے۔ زندگی بھر دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہے اور ان کو نیچا دکھاتا رہے۔ راجوں مہاراجوں کے لیے خوفناک ہو۔ اس کا رزق اس کے وطن سے مشرق کی طرف ہو۔ اسی برس کی عمر کے بعد یک لخت حرکتِ قلب کے بند ہونے کے باعث اس کی موت واقع ہو۔"

یہ مختصر حالات جب میں نے سنے تو میں حیران تھا کہ اس وقت تک کے گزر چکے تمام واقعات درست ہیں مگر اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ میری آئندہ زندگی اس قدر شاندار ہو گی۔ کیونکہ میں اس وقت کی حالت سے بہت مایوس تھا۔ چنانچہ گزر چکے حالات یہ تھے۔ میرے والد کا انتقال جب ہوا تو میری عمر صرف چالیس دن کی تھی علم سکول میں صرف پانچویں جماعت تک حاصل کیا۔ اس کم تعلیمی میں ہی لاہور کے اخبارات کو ایڈیٹ کر رہا تھا اٹھارہ برس کی عمر تھی۔ جب ہماری زمین تقسیم ہوئی اور مجھے میرا حصہ ملا۔ سترہ برس کی عمر تھی۔ جب کہ میں وطن کو (ضلع فیروزپور) میں تھا اور مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی۔ میں نے اس لڑکی سے کبھی کوئی بات تک نہ کی۔ مگر ایک برس تک رات کو مجھے نیند نہ آتی اور بے چین رہتا (اگر میری بات پر یقین کیا جائے تو میں سچ کہتا ہوں۔ کہ اس عمر میں مجھے عورت اور مرد کے تعلقات کا قطعی کوئی علم نہ تھا۔ اور اپنے ہم عمروں میں اس اعتبار سے انتہائی بے وقوف اور ناواقف سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے اس زمانہ میں جب باتیں کرتے ہوئے ایک صاحب سے حیض کا لفظ سنا تو میں نے پوچھا۔ کہ حیض کسے کہتے ہیں تو میرے اس سوال کو سن کر میرا مذاق اڑایا گیا۔ اور ایک صاحب بابو نور محمد نے کہا۔ کہ میں بہت ہی احمق ہوں) دو سال تک اس لڑکی کے عشق میں مبتلا رہا۔ اس کے بعد اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اور مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ جب میں نے اس کے انتقال کی خبر سنی تو میرے ہاتھوں میں کچھ سامان تھا جو ہاتھوں میں سے گر گیا اور اب بھی جب کبھی اس لڑکی اور اس کے گھر کے لوگوں کا خیال کرتا ہوں تو ایک ناقابلِ بیان کیفیت کے باعث جسم میں کچھ سنسنی سی پیدا ہوتی ہے۔ یہ واقعات

Marfat.com

تو ایسے تھے جو میری زندگی میں اس سے پہلے گزر چکے تھے اور چونکہ یہ واقعات میری زندگی میں پیش آئے کوئی وجہ نہ تھی کہ آئندہ کے خوش گوار زمانہ کے متعلق بھی مجھے یقین نہ آتا۔ مگر جب اس طاقت کی حالت پر غور کرتا تو خیال آتا۔ کہ بھرگو سنگتا کے کچھ حالات شاید درست ہوں اور کچھ غلط۔ کیونکہ یہ تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ کہ لاکھوں روپیہ پیدا کروں گا اور پبلک میں اتنی شہرت ہوگی۔

بھرگو سنگتا سے یہ حالات معلوم کرنے کے بعد جوتش کے متعلق مجھے بہت دلچسپی ہو گئی۔ میں نے مختلف جوتشیوں سے اپنی جنم پتری اور ورش پھل بنوانے شروع کیے اور ہمیشہ تمام حالات ملتے رہے جن میں سے کچھ واقعات اور اپنے ذاتی تجربات بیان کرتا ہوں۔

میں نابھہ میں ملازم تھا۔ مرحوم مہاراجہ نابھہ مجھ پر بہت خوش اور مہربان تھے کیونکہ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ نے مجھے لالہ شام لال کپور ایڈیٹر "گورو گھنٹال" کی معرفت چالیس ہزار روپیہ دینا چاہا تاکہ میں مہاراجہ نابھہ سے غداری کر کے نابھہ سے چلا جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ مہاراجہ نابھہ سے میں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ان کی طبیعت مشکوک تھی۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ اگر میں نے ان سے ذکر کیا تو ان کو ممکن ہے میرے متعلق کوئی شبہ پیدا ہو مگر مہاراجہ کو دوسرے ذرائع سے اس کا علم ہو گیا۔ تو میری تنخواہ دوگنی کر دی گئی۔ اور مہاراجہ مجھے رہائش کے لیے ایک کوٹھی اور زمین دے کر اپنی رعایا بنانے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اس حالت میں جب کہ مہاراجہ مجھ پر بہت خوش اور مہربان تھے۔ ریاست کوچین کے ایک جوتشی کا لکھا ہوا میرا ورش پھل (رسالانہ) جو میں نے مسٹر ٹنگا ار کی معرفت ان کے خسر کے ایک سنت جوتشی سے بنوایا تھا۔ دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ میں اس برس میں ملازمت سے موقوف کیا جا کر جیل میں قید کر دیا جاؤں۔ اس ورش پھل کے لکھے ہوئے حالات اور مہاراجہ کی مہربانی دونوں متضاد صورتیں تھیں اور یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ مگر اس ورش پھل کے آنے کے دو ماہ بعد مہاراجہ نابھہ گدی سے اتر گئے۔ ایڈمنسٹریشن انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی اور میں نہ صرف موقوف کر دیا گیا بلکہ انگریز ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی (جو بعد میں سیکرٹری ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند تھے) نے مجھے بغیر مقدمہ چلائے یا جرم بتائے نابھہ میں قید کر دیا اور ستاروں کا اثر ٹل نہ سکا۔

موجودہ مہاراجہ نابھہ جب پیدا ہوئے تو ان کے والد مرحوم مہاراجہ نابھہ نے بچہ کی جنم پتری تیار کرنے کے لیے کئی جوتشی بلائے۔ اس زمانہ میں نابھہ میں وزیراعظم مسٹر نرسنگا راؤ تھے۔ ان کی معرفت بھی جنوبی ہندوستان سے ایک مشہور جوتشی دو سو روپیہ روزانہ فیس پر آئے اور نابھہ میں ایک ماہ کے قریب ٹھہرے۔ اس جوتشی نے مہاراجہ کو بتایا۔ کہ یہ بچہ پیدا ہونے کے بعد اپنے باپ کی جگہ حاصل کریگا۔ یعنی نابھہ کے تخت پر بیٹھے گا۔ مہاراجہ کو اس وقت تو اس کا یقین نہ آیا۔ بلکہ اس جوتشی کے متعلق مہاراجہ کے خیالات کچھ نفرت کے سے ہو گئے تھے۔ مگر مہاراجہ کی یہ نفرت بدنصیبی اور بُرے ستاروں کے اثرات کو کیونکر بدلتی۔ بچہ کی پیدائش کے بعد ہی بُرے دن شروع ہوئے اور یہ برخوردار ابھی دو تین برس کا ہی تھا کہ باپ گدی سے علیحدہ ہو گئے اور اس جوتشی کے قول کے مطابق بیٹے نے باپ کی جگہ یعنی گدی

Marfat.com

پر قبضہ کر لیا۔

نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کا مونشنگ آباد والا مقدمہ چل رہا تھا مجسٹریٹ نے ایڈیٹر "ریاست" کو تین سال قید کی سزا دی۔ سیشن جج نے یہ سزا نو ماہ کردی۔ مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا تو سزا موقوف ہو کر مقدمہ کو پھر نئے سرے سے شروع کرنے کا حکم ہوا۔ مقدمہ کے پھر دوبارہ شروع ہونے پر مجسٹریٹ نے نو ماہ کی سزا دی۔ تو اس کی اپیل ڈائریکٹ ہائی کورٹ میں ہوئی (ہندوستان میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجسٹریٹ کی اپیل ڈائریکٹ ہائی کورٹ میں گئی) ایڈیٹر "ریاست" مع اپنے وکلاء مسٹر توکلی اور سردار بھگوان سنگھ اپیل کے سلسلہ میں ناگپور گئے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہاں سیتا بلدی میں ایک مرہٹہ مسٹر گرگے جوتش میں بہت لائق ہیں۔ یہ پہلے اکوٹنٹ جنرل کے دفتر میں اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد تفریحاً جوتش کا کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت سن کر میں اُن سے ملنے گیا۔ میری جنم کنڈلی (زائچہ) میرے ساتھ تھی۔ ان کے مکان پر پہنچ کر میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو لینے کے لیے باہر آ گئے۔ مقدمہ کی کارروائی چھ سال سے اخبارات میں چھپ رہی تھی اور یہ اخبارات پڑھا کرتے تھے۔ بہت عزت کے ساتھ پیش آئے۔ میں نے بتایا کہ آپ کی شہرت سن کر آیا ہوں۔ کنڈلی دکھانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں ان کو اپنی کنڈلی دے آیا۔ انہوں نے تین روز کے بعد آنے کے لیے کہا۔ میں تین روز کے بعد پھر گیا تو انہوں نے کہا:

"جس طرح بھی ممکن ہو۔ آپ ۲۱ فروری تک مقدمہ کو لمبا لے جایئے اگر یہ مقدمہ ۲۰ فروری سے پہلے فیصلہ ہوا تو آپ لازمی طور پر قید ہو جائیں گے۔ گو قید میں آپ کے جسم یا آپ کی آتما (روح) کو کوئی تکلیف نہ ہوگی مگر آپ کی آزادی لازمی طور پر ایک جگہ محدود ہو جائے گی اور اگر اس مقدمہ کا فیصلہ ۲۰ فروری کے بعد ہو تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس مقدمہ میں قید نہیں کر سکتی۔ آپ لازمی طور پر اس تاریخ کے بعد بری ہوں گے۔"

یہ واقعہ آخر نومبر کا ہے۔ میں نے گرگے صاحب سے کہا۔ کہ مقدمہ ہائی کورٹ میں ہے۔ چھ سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ پہلے کئی بار ہائی کورٹ میں پیشیاں ہوئیں۔ یہ آخری پیشی ہے۔ کیونکہ ہائیکورٹ اس مقدمہ کو خود ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔ تاریخ کے تبدیل یا مقدمہ کے ملتوی ہونے کی کوئی صورت نہیں گرگے صاحب نے بتایا۔ کہ اگر مقدمہ ملتوی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر قید کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مگر ۲۰ فروری کے بعد میں جیل میں نہ رہ سکوں گا۔

پنڈت جی سے باتیں کر کے میں واپس چلا آیا۔ مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ تین روز تک بحث ہوتی رہی میری طرف سے ڈاکٹر کدار (جو اسمبلی میں مخالف پارٹی کے لیڈر تھے اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) مسٹر ریف شریف (جو سی پی کے منسٹر تھے) مسٹر ڈی بی توکلی ایڈوکیٹ دہلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ بیرسٹر اجمیر وغیرہ وکلاء تھے۔ اور نواب بھوپال کی طرف سے ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ سر سی پی راما سوامی آئر (جو بعد میں گورنمنٹ ہند کے ممبر انتظامیہ کونسل اور وزیر اعظم ریاست ٹراونکور تھے) سر عبدالرحمن (جو جج لاہور ہائیکورٹ تھے) وغیرہ تھے۔ ججان میں ایک ہندوستانی مسٹر نیوگی اور ایک انگریز تھے۔ عدالت نے

Marfat.com

فیصلہ کے متعلق کہا۔ کہ پھر سنایا جائے گا۔ یہاں واپس دہلی چلا آیا۔ عدالت نے مجھے حکم دیا۔ کہ میں ۵ ر دسمبر کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں حکم سننے کے لیے پہنچ جاؤں۔ حکم وہاں بھیج دیا جائیگا۔

دہلی پہنچ کر میں اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا اور مجھے پورا یقین تھا۔ کہ میں بری ہو جاؤں گا کیونکہ نواب بھوپال کے وکلا کے پاس اس قانونی پوائنٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔ کہ اخبار دہلی میں چھپا اور شائع ہوا اور ہوشنگ آباد کی عدالت جس کی جورسڈکشن ضلع ہوشنگ آباد تک محدود ہے اور جس کی اشاعت کو نواب بھوپال ہوشنگ آباد کے علاقہ میں ثابت نہیں کر سکے۔ ملزم کو دہلی میں کیے گئے جرم کے لیے سزا دے۔ مگر مجھے ۴ ر دسمبر کو دوپہر کے وقت ڈاکٹر کدار کا تار ملا۔ کہ مجھے تین ماہ کی سزا ہوئی ہے۔ اور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں ۵ ر دسمبر کو پہنچ جاؤں۔ تار کے ملنے پر میں شام کو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں سوار ہوا اگلے روز شام کو ناگپور پہنچا۔ تاکہ کدار صاحب سے فیصلہ کے متعلق مزید واقفیت حاصل کروں۔ وہاں ڈاکٹر کدار سے دو تین گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد رات کو دس بجے سوار ہوا۔ ۵ ر دسمبر کی صبح ہوشنگ آباد پہنچا۔ ڈاک بنگلہ میں جہاں ہمیشہ قیام ہوا کرتا تھا۔ گیا۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور بریک فاسٹ کھا کر دس بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یورپین تھے۔ بہت اخلاق سے پیش آئے انہوں نے کاغذات کی ضروری خانہ پری کی اور ایک سب انسپکٹر پولیس کے ساتھ مجھے ہوشنگ آباد جیل میں بھیج دیا۔

میں ہوشنگ آباد جیل میں غالباً دس روز رہا۔ وہاں جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے انسپکٹر جنرل جیل خانجات سی پی کو لکھا۔ کہ دیوان سنگھ اے کلاس کا قیدی ہے۔ اس چھوٹے جیل میں اے کلاس کے قیدیوں کے لیے معقول انتظام نہیں اس لیے اسے سنٹرل جیل ناگپور میں بھیجا جائے۔ وہاں سے جواب آیا میں ناگپور گیا۔ وہاں اس کمرہ اور احاطہ میں مجھے رکھا گیا۔ جہاں اس سے پہلے ڈاکٹر کھرے اور سی پی کے دوسرے لیڈر رہ چکے تھے اور جہاں میرے بعد حروں کے لیڈر پیر پگاڑو بھی قید رہے ہیں۔ میں یہاں بہت آرام سے تھا جیل کے حکام دن میں کئی کئی بار آ کر میری ضروریات کے متعلق پوچھتے اور دوستانہ سپرٹ کا اظہار کرتے بلکہ اکثر شام کو میرے ہاں ہی چائے پیتے۔ کئی روز گزرنے کے بعد مجھے خیال آیا۔ کہ جب اس مقدمہ میں پہلی بار مجسٹریٹ نے تین سال کی سزا دی اور اس سزا کے سننے کے بعد میں ہوشنگ آباد جیل میں گیا تو ضمانت کے نہ ہونے تک ایک ہفتہ جیل میں رہا۔ اس کے بعد جب سیشن جج نے مجھے نو ماہ کی سزا دی تو اس وقت بھی ہائی کورٹ سے ضمانت ہونے تک ایک ہفتہ رہا یعنی دو ہفتہ میں جیل میں پہلے رہ چکا ہوں۔ یہ دو ہفتے میری موجودہ تین ماہ کی قید میں سے کیوں مجرا نہ دیئے جائیں۔ میں نے اس اپنے خیال کو اگلے روز کرنل موڈی آئی ایم ایس سپرنٹنڈنٹ جیل پر ظاہر کیا تو کرنل موڈی نے کہا۔ کہ چونکہ مقدمہ کی پہلی تمام کارروائی بحکم ہائیکورٹ رد اور ناقابلِ عمل قرار دی جا چکی ہے۔ اس لیے اس کارروائی کے دوران میں بھگت چکی دو ہفتہ کی سزا قانوناً مجرا نہ دی جائے گی۔ میں نے کرنل موڈی سے پھر کہا۔ کہ چاہے مجرا دی جائے یا نہ دی جائے۔ آپ میری درخواست بھیج دیجئے۔ کرنل موڈی نے کہا۔ درخواست بھیج دو مگر اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ چنانچہ میں نے اسی روز درخواست لکھی کہ اس مقدمہ میں ہی گو ڈی نوو ٹرائیل یعنی نئی کارروائی ہوئی مگر میں اسی جرم میں دو ہفتہ سزا بھگت چکا

Marfat.com

ہوں۔ ان تین ماہ میں سے مجھے وہ دو ہفتہ مجرا دیئے جائیں۔

یہ درخواست میں نے قانون کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کو بھیجی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خود فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کہ شاید ملزم رہائی کے بعد ان دو ہفتوں کے عرصہ کے لیے جلسں بیجا کا مقدمہ دائر کر دے۔ یا کوئی اور جھگڑا ہو۔ اس نے ذمہ داری نہ لینے کے لیے میری یہ درخواست ہائی کورٹ کو بھیج

شروع دسمبر میں میرے مقدمہ کا فیصلہ ہوتے ہی مقدمہ کے فیصلہ کی نقل گورنمنٹ ہند کے لاء ممبر اور پرلیٹیکل سیکرٹری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اور لاء ممبر نے فیصلہ کو دیکھ کر اس پر ریمارک کیے۔ کہ جس جرم کے لیے ملزم کو سزا دی گئی اس میں ملزم کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ جرم مجسٹریٹ کی جورسڈکشن میں نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ خلاف قانون ہے۔ لاء ممبر کے یہ ریمارک ہائی کورٹ کے ججوں کی اطلاع کے لیے میری اس درخواست سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ اور وہ اپنے غلط فیصلہ کو محسوس کر چکے تھے۔ میری یہ درخواست جب پہنچی تو انہوں نے اس پر حکم لکھ دیا۔ کہ ملزم کو دو ہفتہ کا عرصہ تین ماہ کی سزا میں سے کم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق میں ۱۲ر فروری کی صبح کو یعنی مسٹر گرگے جوتشی کے حساب کے مطابق ٹھیک اس روز جس دن میرے ستاروں میں تبدیلی ہوئی۔ میں خلافِ توقع اور خلافِ قانون طور پر جیل سے رہا کر دیا گیا۔

جوتش کے متعلق ایک واقعہ اور دلچسپ ہے اور جس کا ثبوت شاید اب بھی نوٹوں والے میرے مقدمہ کی مثل سے مل سکے۔ نوٹوں کے مقدمہ میں جب میری تلاشی ہوئی تو تلاشی میں رلئے صاحب گوپال داس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے وہ کاپی بھی دیکھی۔ جس میں میرے ورش پھل کے ہر ماہ کے علیحدہ علیحدہ آنے والے واقعات تاریخ وار درج تھے۔ اس کاپی میں لکھا تھا کہ میں دسمبر میں پھر گرفتار کیا جاؤں گا۔ چنانچہ میری گرفتاری دسمبر میں ہی ہوئی تھی۔ یہ کاپی پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جس نے تلاشی کی برآمد شدہ اشیاء کے ساتھ اس کاپی کو بھی شاملِ مثل کیا اور میرا خیال ہے کہ اگر مثل تلف نہیں ہوئی۔ تو یہ کاپی اب بھی مثل کے کاغذات کے ساتھ شامل ہے جس پر میری گرفتاری دسمبر میں لکھی ہے۔

میری جنم کنڈلی یعنی میرے زائچہ کو دیکھا جائے تو سورج پہلے گھر میں ہے جس کا اثر یہ ہے کہ جسم رعب دار، آنکھوں میں سرخ ڈورے، مشکلات پر غالب۔ لوگ مسخر ہوں اور محبت کریں۔ مجھے کشمکش میں ہمیشہ فتح نصیب ہو۔ شخصیت با اثر۔ سورج کے علاوہ میرے دوسرے ستاروں کے اثرات یہ ہیں۔ جس کے متعلق تمام جوتشی متفق ہیں۔ میں زندگی بھر حکومت کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ مجھ پر مقدمات قائم ہوں گے اور ہمیشہ ہی ستارہ برہسپت مجھے بچاتا رہے گا۔ میں ہمیشہ فضول خرچ رہوں گا۔ اور زندگی بھر کبھی بھی قرض نہ اتر سکے گا۔ حالانکہ لاکھوں روپیہ پیدا کروں گا۔ میری صحت اچھی رہے گی۔ روپیہ سے کبھی محبت نہ کروں گا۔ بیوی سے تعلقات کشیدہ رہیں گے۔ زندگی میں کئی ملازم غدار پیدا ہوں گے مگر کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ وہ خود نقصان اٹھائیں گے۔ میں غیر ممالک کا سفر کروں گا اور مجھ سے محبت کرنے والے مخلص دوست میری زندگی میں بہت کثرت کے ساتھ ملیں گے۔ میرے زائچہ میں چندرمان یعنی

Marfat.com

چاند ایسے خانہ میں ہے جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ میری شہرت دور تک پہنچے اور میری پوزیشن بڑے سے بڑے لوگوں یہاں تک کہ راجوں اور مہاراجوں کے لیے بھی قابل رشک ہو۔

میں آئندہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہو اور ستاروں کے اثرات کیا صورت پیدا کریں مگر جہاں تک گزشتہ واقعات کا تعلق ہے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو جوتش کے مطابق نہ ہو اور اس علم کے متعلق مجھے اتنا ہی یقین ہے۔ جتنا دن کی روشنی کو دیکھ کر سورج نکلنے کا ہو سکتا ہے۔

جوتش کے ذریعہ حالات معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پیدائش کا ٹھیک وقت جس میں ایک منٹ کا بھی فرق نہ ہو۔ تاریخ، دن اور مقام کا علم ہو۔ اگر یہ معلوم نہ ہوں تو پھر درست حالات معلوم کرنے کا کوئی سوال نہیں۔ کیونکہ ٹھیک وقت کے معلوم نہ ہونے کے باعث کنڈلی غلط بنے گی اور کنڈلی کے غلط بننے کی صورت میں حالات کا غلط ہونا لازمی ہے۔

کیریکٹر کا بننا اور بگڑنا

ہندوستان کی آبادی میں ہر دس برس کے بعد کئی کروڑ نفوس کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ملک میں بچے تو اس زیادتی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں مگر بچوں کے کیریکٹر کو بنانے یا بلند کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بہت اعلیٰ طبقہ کے خاندان کے بچوں کو چھوڑ کر چھوٹے اور درمیانہ خاندان کے بچوں کی یہ حالت ہے کہ یہ جھوٹ بولنا، دوسرے کی شے کا اٹھانا۔ گالی دینا اور بدچلنی وغیرہ کو عیب نہیں سمجھتے۔ بلکہ غنڈہ پن کو بہادری اور شجاعت قرار دیا جاتا ہے۔ اور بچوں کی اس آوارگی میں فلم انڈسٹری نے اور اضافہ کیا۔ بازاروں میں دیکھیئے یا گلی کوچوں میں۔ بچے فحش اور عشقیہ فلمی گیت گاتے نظر آئیں گے اور ایک اہل الرائے بزرگ کے قول کے مطابق ہندوستان کی آئندہ نسل ملک کے لیے جیلوں کے موجودہ سزا یافتہ مجرموں سے زیادہ ذلت کا باعث ہو گی اور کسی بچے کے والدین کو خیال نہیں کہ اس کی اولاد کا انجام کیا ہو گا۔

انسانی کیریکٹر کے بنانے یا بلند لے جانے کے لیے بچپن کی عمر بہت زیادہ موزوں ہے میں اپنی زندگی کے چند واقعات عرض کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اچھا یا بُرا بنانے میں بہت حصہ لیا۔

میری عمر دس برس کی ہو گی۔ ہمارے گھر میں یہ معمول تھا۔ کہ میری والدہ صبح تین چار بجے کے قریب جاگتیں ہمارے گھر کی دیوار کے ساتھ ملا ہوا ایک مکان مولوی صاحب کا تھا مولوی صاحب تو میری پیدائش سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ ان کے مکان میں ان کی ضعیف بوڑھی بیوہ رہا کرتیں۔ اور دلچسپی کے لیے اس بوڑھی خاتون نے کچھ بکریاں پال ہوئی تھیں۔ اس خاتون کو ہم تمام لوگ "بیوی" یا "بی بی" کہا کرتے۔ اس کے اپنے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ بیچاری گلی محلہ کے لوگوں کے بچوں سے محبت کر کے اپنے مامتا کے جذبات کی تسکین کر لیتیں۔ جو ایک ماں کے دل میں اپنے بچوں کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ میں اور میری عمر کے دوسرے بچوں کا دن بھر میں کچھ وقت ان "بیوی" کے گھر میں بھی بسر ہوتا۔ کیونکہ بچے اس شخص سے فوراً مانوس ہو جاتے ہیں جو ان

Marfat.com

سے محبت کرے۔ یہ بوڑھی خاتون نماز روزہ کی بہت پابند تھیں۔ اور علی الصباح تین چار بجے تہجد کی نماز بھی ضرور پڑھتیں۔

میری والدہ کا معمول تھا۔ یہ علی الصباح تین چار بجے جاگتیں تو ان بیوی صاحبہ کو آواز دیتیں کہ کیا جاگ گئیں۔ بیوی صاحبہ کا فوراً جواب آتا: "ہاں بیٹا! میں جاگ رہی ہوں۔" اگر میری والدہ کو کبھی جاگنے میں دیر ہوتی تو بیوی کی پہلے آواز آتی اور والدہ اس کا جواب دیتیں کہ ہاں میں جاگ رہی ہوں۔"

میری والدہ جاگنے کے بعد گھر میں جھاڑو دیتیں۔ برتن وغیرہ صاف کرتیں اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میراں بائی کا بھجن گنگنایا کرتیں جس کے الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں:

"میرے تو من رام نام دوسرا نہ کوئی"

اگر میراں بائی کے یہ بھجن نہ ہوتے تو گرنتھ صاحب کے شبد ہوتے۔ میں اس تمام کیفیت کو نیم خوابیدہ حالت میں سنا کرتا یعنی نہ تو میں پورے طور سے سویا ہوتا اور نہ ہی جاگتا۔

سورج نکلنے سے پہلے والدہ مجھے جگاتیں۔ اور یہ مستقل اور ہمیشہ کے لیے میرا فرض قرار دیا گیا تھا کہ میں اس وقت گوردوارہ جاؤں۔ وہاں ہی رہٹ کے تازہ پانی سے غسل کروں غسل کے بعد گوردوارہ میں گرنتھ صاحب کے سامنے متھا ٹیکوں یعنی سجدہ کروں۔ اور کچھ دیر پاٹھ سن کر پھر واپس آؤں۔ میرے واپس پہنچنے سے پہلے میرے لیے زرد رنگ کے نمکین چاول تیار رہتے۔ یہ میرا ناشتہ تھا۔ ان چاولوں یا جیسے پلاؤ بھی کہا جا سکتا ہے، میں وہ لذت تھی جو اس کے بعد کبھی والیانِ ریاست کے دسترخوان پر بھی نصیب نہیں ہوئی۔

گرمیوں میں تو صبح گوردوارہ (ہمارے گھر سے یہ گوردوارہ نصف میل ہوگا) جانا اور وہاں غسل کرنا زیادہ دقت کا باعث نہ تھا مگر سردیوں میں اسے میں ایک بہت بڑی مصیبت سمجھتا تھا مگر کیا کرتا۔ جس روز میں گوردوارہ نہ جاؤں اور وہاں غسل نہ کروں، مجھے ناشتہ نہ ملتا تھا اور والدہ کی ناراضی الگ تھی۔ میں کبھی کبھی طبیعت کے اچھا نہ ہونے یا سر میں درد کا بہانہ کر کے صبح کے اس غسل کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیتا۔ مگر ایسا ہر روز ممکن نہ تھا۔

سردیوں کا زمانہ تھا میں حسبِ معمول سورج نکلنے سے پہلے جاگا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہوئے جاتے تھے قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ گوردوارہ گیا۔ وہاں حسبِ معمول مردانہ میں سینکڑوں مرد اور زنانہ میں سینکڑوں عورتیں غسل کر رہی تھیں۔ مگر میرا نہانے کو جی نہ چاہا۔ میں نے ہاتھ دھوئے، منہ دھویا۔ پاؤں دھوئے اور گوردوارہ کے اندر گرنتھ صاحب کی حاضری دے کر واپس آ گیا۔ انسان نے غسل کیا ہو تو وہ فوراً معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ جسم میں چستی اور تازگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں جب گھر پہنچا تو والدہ نے مجھے دیکھتے ہی محسوس کیا کہ میں نے غسل نہیں کیا۔ پوچھا۔ کیا نہا آئے۔ میں نے فوراً غیر ضروری چستی اور جرأت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں۔ والدہ نے میرے ہاتھ دیکھے۔ پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ دُھلے ہوئے تھے۔ گردن کے پاس کوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو میرا جسم ویسے ہی تھا۔ جیسے بغیر غسل کیے شخص کا ہو سکتا ہے۔ والدہ نے کہا کہ سچ بتاؤ۔ جھوٹ مت بولو۔ کیا نہا آئے۔ میں نے پہلے سے زیادہ جوش اور جرأت کے ساتھ جواب دیا۔

Marfat.com

کر ہاں نہایا ہوں۔ میرا یہ کہنا تھا۔ کہ والدہ نے مجھے پکڑ لیا۔ اور پیٹنا شروع کیا۔ مجھے بہت مار۔ کیونکہ میرے دو جرم تھے۔ ایک نہ نہانا۔ اور دوسرے جھوٹ بولنا۔ کچھ دیر پٹنے کے بعد میں نے اقرار کر لیا۔ کہ میں نہ نہایا تھا اور میں نے جھوٹ بولا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میں سالہا سال تک گورودارہ جا کر وہاں غسل کرتا رہا اور بچپن کے غسل کی اس عادت کا نتیجہ یہ ہے کہ میں زندگی بھر ہمیشہ ہی ہر روز غسل کرتا رہا۔ پورے سال میں شاید ہی پانچ سات دن ایسے ہوتے ہوں۔ جب کہ میں نے بیماری یا کسی دوسری وجہ سے غسل نہ کیا ہو اور کپڑے نہ بدلے ہوں۔ ورنہ سردی ہو گرمی ہو۔ سفر ہو۔ مصیبت میں ہوں یا راحت میں۔ میرے لیے غسل اور کپڑے بدلنے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کھانا۔ اور نہانا میری ایک فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ میں کھانے کے بغیر رہ سکتا ہوں مگر غسل کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن میں ہر روز غسل کرنا میرے کیریکٹر کی بناوٹ کے ساتھ ساتھ بطور عادت کے مجھے نصیب ہوا۔

میں موگا کے ہسپتال میں تھا۔ موگا عیسائیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ وہاں متعدد امریکن پادری رہتے تھے۔ ایک پادری کی پشت پر کینسر ہوا۔ اس کا اوپریشن ہوا تو وہ سرکاری ڈاک بنگلہ میں چلا گیا۔ کیونکہ وہاں رہنے کے لیے جگہ اچھی تھی۔ میں اس پادری کے زخم کی ڈریسنگ کے لیے ہر روز وہاں جاتا۔ ایک روز یہ امریکن پادری غسل خانہ میں تھا۔ اور میں اس کے کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ میں نے اس کے میز پر پڑا ہوا ”السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا“ (میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں اس رسالہ کا نام ”ٹائمز آف انڈیا السٹریٹڈ ویکلی“ تھا) اٹھا لیا۔ اور اس میں سے تصاویر دیکھنا شروع کر دیں۔ میں تصاویر دیکھ رہا تھا۔ کہ یہ پادری غسل خانہ سے باہر آیا۔ میرے ہاتھوں میں اپنا رسالہ دیکھ کر بہت برا منایا۔ مگر پادری لوگ بہت حلیم الطبع ہوتے ہیں میں عمر کے لحاظ سے بھی بچہ ہی تھا۔ اس نے نہایت نرمی کے لہجہ میں مجھ سے کہا:

”کسی شخص کی کتاب، اخبار، خطوط، کاغذ یا کوئی دوسری شے بغیر مالک کے پوچھے یا بغیر اجازت کے اٹھانا بہت بڑی بداخلاقی ہے۔ یہ کبھی نہ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے لوگ اس عیب کو محسوس نہیں کرتے۔“

میں اس زمانہ میں بھی بہت ذکی الحس تھا۔ پادری کی اس شریفانہ تنبیہہ کو میں نے بہت محسوس کیا مگر کیا کر سکتا تھا۔ ایک تو میری غلطی تھی۔ دوسرے اس زمانہ میں سفید رنگ کے پادری انگریز حاکموں کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ ڈریسنگ کر کے میں واپس آیا۔ بے حد نادم تھا۔ کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اس واقعہ کے بعد میری تمام زندگی میں شاید ایک واقعہ بھی ایسا نہیں۔ کہ میں نے کسی عزیز سے عزیز دوست کی کتاب، اخبار یا دوسری کسی شے کو بغیر اجازت کے کبھی چھوا ہو اور اب جب ملنے والے اصحاب آتے ہیں اور بیٹھتے ہی میرے دفتر کے اخبارات اور رسائل کو بے تکلفی کے ساتھ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو میں بہت کوفت محسوس کرتا ہوں۔ ورن میں ایک آدھ بار بعض اصحاب کے سامنے مجھے پادری کے ان الفاظ کو دہرانا بھی پڑا ہے مگر یہ افسوس ناک ہے کہ ان اصحاب پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اگر انسان اپنے کیریکٹر کو درست کرنا چاہے

Marfat.com

تواس کے لیے قدم قدم پر نصیحت موجود ہے اور اگر اپنی کمزوریوں کو درست کرنا نہ چاہے یا اپنی غلطی ہی تسلیم نہ کرے تو اس کا کیا علاج ہے۔

میں چالیس روز کا تھا جب میرے والد کا انتقال ہُوا۔ والد مرحوم تو بڑی پوزیشن کے تھے مگر میری پرورش ہوش سنبھالتے ہی افلاس میں ہوئی۔ جب گھر میں کھانے کے لیے نہ ہو اور بچہ باپ کے سایہ سے محروم ہو جائے تو بچّہ کو تربیت کون دے۔ میری والدہ مذہبی خیالات کی تھیں۔ اس لیے مذہب سے متعلقہ یعنی غسل وغیرہ ایسی باتوں کا تو مجھ پر اثر ہُوا۔ مگر کیریکٹر کے دوسرے حصوں کے اعتبار سے میری تربیت نہ ہو سکی۔ چنانچہ بچپن میں میرے پاس رومال نہ ہوتا۔ رومال کے نہ رکھنے کی عادت آئندہ زندگی میں بھی نہ بدل سکی۔ سینکڑوں بار رومال خریدے۔ درجنوں رومال کپڑے کی الماریوں اور بکسوں میں پڑے رہتے۔ اور بار بار رومال نہ ہونے کے باعث ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑی۔ مگر کیریکٹر کی یہ کمزوری جس کی بنیاد بچپن میں رکھی گئی۔ اب تک دُور نہیں ہو سکی۔ چنانچہ مجھے یاد ہے۔ چند برس ہوئے۔ مرحوم مہاراجہ نابھ سے ملنے کے لیے کوڈائی کنال پہاڑ (صوبہ مدراس) پر گیا۔ طویل سفر کی تکان اور گرمی سے سرد پہاڑ پر جانے اور آب و ہُوا کی تبدیلی کے باعث مجھے شدت کا زکام ہوگیا۔ میں مہاراجہ کے پاس بیٹھا ہُوا باتیں کر رہا تھا اور زکام کا اثر نمایاں تھا۔ مگر میرے پاس رومال نہ تھا۔ مہاراجہ نے میری اس حالت کو محسوس کیا اور آپ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا۔ کہ ایک نیا رومال لائے۔ جب رومال آیا تو مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے اور رومال دیتے ہوئے کہا: "یہ لیجیے رومال آپ کو زکام کی تکلیف ہے۔" اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ کے اس کہنے پر مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی ہوگی کیونکہ میں زکام میں مبتلا تھا۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا اور میرے پاس رومال بھی نہ تھا۔ یعنی بچپن میں کیریکٹر بنتے ہوئے جو کمزوری پیدا ہو گئی وہ اب تک موجود ہے اور بار بار ندامت اٹھانے کے بعد بھی یہ کمزوری رفع نہ ہو سکی۔ رومال کپڑے والی الماری یا بکس میں پڑے رہتے ہیں مگر جیب میں نہیں رکھے جاتے اور اگر کبھی جیب میں رکھ بھی لیا تو خیال ہی نہیں آتا۔ کہ رومال جیب میں پڑا ہے۔

جو لوگ اپنے بچوں کے بچپن سے لاپروا ہو کر ان کے کیریکٹر میں خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ والدین اپنے بچوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں کیونکہ انسان کو بچپن کی تربیت سے جو خیالات حاصل ہوں گے وہ چاہے اچھے ہوں یا بُرے۔ عمر بھر تبدیل نہ ہو سکیں گے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بچپن کے زمانہ میں پیدا ہو چکی کیریکٹر کی کمزوریوں کا دور ہونا ممکن ہی نہیں۔ جب تک قوت ارادی بہت ہی مضبوط نہ ہو۔ اور انسان ان کمزوریوں کو دُور کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ کے ساتھ کئی برس تک جنگ نہ کرے۔ اور جو لوگ قوتِ ارادی سے محروم ہیں۔ وہ مجبور ہیں کہ بچپن کے زمانہ میں پیدا ہو چکی کمزوریوں کا زندگی بھر شکار ہوتے رہیں!

انگریزوں کے کیریکٹر کی بلندی

مجھے کتوں کے رکھنے کا بہت شوق ہے اور میں سب سے زیادہ ڈاکر سپینیل نسل کے کتے پسند

Marfat.com

کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ نسل اپنے مالک سے بہت محبت کرتی ہے۔ میں نے "سٹیٹس مین" میں اشتہار دیکھا جو مس وار برٹن کی طرف سے پلوں کی فروخت کے متعلق تھا مس وار برٹن (یہ خاتون پنجاب کے مشہور انسپکٹر جنرل پولیس مرحوم مسٹر وار برٹن کی صاحبزادی تھیں۔ جنہوں نے پنجاب سے ٹھگی، ڈکیتی اور دوسرے جرائم کا خاتمہ کیا۔ ڈاکوؤں کے پاؤں میں پہنائی جانے والی بھاری وزن کی بیڑیاں اب بھی تھانوں اور جیلوں میں "وار برٹنی بیڑیاں" کہلاتی ہیں۔ اور ضلع شیخوپورہ میں ایک گاؤں بھی ان مسٹر وار برٹن کے نام پر وار برٹن آباد ہے) اس زمانہ میں کسولی میں مقیم تھیں۔ ان سے خط و کتابت ہوئی تو انہوں نے بتایا۔ کہ وہ فی پلہ ایک سو روپیہ میں دیں گی۔ اور بچے بہت خوبصورت لمبے کانوں والے سیاہ رنگ کے ہیں۔ میں نے ایک جوڑا دو سو روپیہ میں لینے کا فیصلہ کیا اور لکھا۔ کہ پلوں کو لینے کے لیے میں اپنا آدمی کسولی بھیجوں گا۔ اس فیصلہ کے بعد مس وار برٹن کا خط پہنچا۔ کہ پلوں کا دادا کئی برس ہوئے پلوں کے باپ کے پیدا ہونے کے بعد دیوانہ ہو گیا تھا۔ اور اگر مجھے کوئی شک ہو تو میں سودا فسخ کر سکتا ہوں۔ ان کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ چنانچہ مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ پلے بھی بڑے ہو کر اپنے دادا کی طرح دیوانے نہ ہو جائیں۔ میں نے ان پلوں کے لینے سے انکار کر دیا۔

اس واقعہ کا اہم پہلو یہ ہے کہ سودا ہو چکا تھا اور اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ کہ پلوں کا دادا کبھی پاگل ہوا مگر انگریزوں کا کیریکٹر دیکھئے۔ اس خاتون نے کسی بات کو چھپانا گناہ سمجھا اور صاف لکھ دیا۔ کہ پلوں کا دادا ہائیڈروفوبیا یعنی دیوانگی میں مبتلا ہوا تھا۔ ان کی جگہ اگر کوئی ہندوستانی ہوتا تو کبھی یہ نہ لکھتا۔

"ریاست" جب سے جاری ہوا ہے۔ اس میں انگریزی۔ امریکن اور ہندوستانی فرموں کے اشتہارات ہمیشہ ہی شائع ہوتے رہے۔ مگر یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ "ریاست" کی پچھلی تمام زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں کہ کسی امریکن یا انگریزی فرم نے روپیہ مار لیا ہو اور ادا نہ کیا ہو بلکہ اکثر ایسا ہوا۔ کہ دفتر "ریاست" نے غلطی سے بل کی رقم کم لکھ دی تو ان فرموں نے غلطی کو درست کر کے رقم پوری بھیج دی۔ اس کے مقابلہ پر ہندوستانی فرموں میں شاید دو درجن سے زیادہ ایسی فرمیں نہ ہوں گی۔ جنہوں نے روپیہ وقت پر خود ہی بھیج دیا ہو یا جن کی نیت روپیہ مارنے کی نہ ہو۔ باقی تمام فرمیں اس کوشش میں رہتی ہیں کہ اگر ممکن ہو تو روپیہ کم ادا کیا جائے یا مار لیا جائے۔ یہ حالت تو مشتہرین کی ہے۔ ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ اور جہاں انگریزی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں سے آج تک کبھی کسی ایک نے بھی روپیہ نہیں مارا۔ اور ایک ایک پائی ادا کرنا یہ اپنی ساکھ اور تجارتی کیریکٹر کے لیے ضروری سمجھتی ہیں اور "ریاست" کے بند ہونے کے بعد بھی انہوں نے پورا روپیہ ادا کیا وہاں ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے پچھتر فیصدی تو ایسی ہیں۔ جن کا سرمایہ۔ دفتر۔ فرنیچر سٹاف یا بینک بیلنس وغیرہ اگر کچھ ہے تو وہ صرف ان کے نام کے چھپے ہوئے لیٹر فارم کی صورت میں گویا کہ فرضی نام کی ایک کمپنی کے لیٹر فارم چھپوالئے اور کام شروع کر دیا۔ نہ ان کے پاس کوئی آرٹسٹ۔ نہ بلاک بنانے کا سامان نہ اشتہار تیار کرنے کا تجربہ۔ اور بطور ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے اگر ان کو اخبار سے پچیس فیصدی کمیشن ملا تو مشتہر کو بیس یا بائیس بلکہ بعض اوقات پچیس کا۔ پچیس فی صدی کمیشن دے کر ان سے اشتہار

Marfat.com

لیا اور اخبار کو بھیج دیا۔ اور دہ کسر اخبار کا روپیہ کم ادا کر کے بالکل مار کر پوری کر لی۔ اور شاید ہندوستان کے ہزار ہا اخبارات میں سے ایک اخبار بھی ایسا نہیں جو اس قسم کی ہندوستانی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی نادہندگی کا شکار نہ ہوا ہو۔ چنانچہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے ذمہ ہمارا ۱۹۴۲ء کا روپیہ تھا۔ اخبار بند ہوا تو اس ایجنسی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ روپیہ ہضم کر سکے گی۔ مگر اس کی بدنصیبی کہ ۱۹۴۴ء میں اخبار جاری ہو گیا۔ اس کو ۱۹۴۲ء کے روپیہ کی ادائیگی کے لیے درجنوں خطوط لکھے۔ جواب ندارد۔ رجسٹرڈ نوٹس دیے پھر بھی کوئی جواب نہیں۔ اور آخر جب مسٹر رضا مرزا وکیل نے مقدمہ کی تیاری کر لی تو پروپرائٹر صاحب دہلی پہنچے اور وعدہ کیا۔ کہ روپیہ ادا کر دیں گے مقدمہ نہ کیا جائے۔ مگر یہ وعدہ صرف میعاد گزرنے تک کے لیے تھا۔ چنانچہ آخر اس "فرم" سے تعلقات منقطع کر لیے گئے اور اب اس کی معرفت کوئی اشتہار شائع نہیں کیا جاتا ——

گویا کہ انگریزی و امریکن ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں جہاں اپنے مستقبل اور اپنی ساکھ کے خیال سے کسی کی ایک پائی رکھنا بھی اخلاقی اور تجارتی جرم سمجھتی ہیں۔ ہندوستانی ایجنسیوں میں زیادہ ایسی ہیں جو اشتہارات کو بھی چار سو بیس کا ایک نیا میدان سمجھ کر اس پیشے میں داخل ہو گئیں اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات کسی ناواقف انگریزی یا امریکن ایجنسی کا بزنس تو آنکھیں بند کر کے چھاپ دیتے ہیں مگر کوئی ہندوستانی ایجنسی اشتہار بھیجے تو اعتماد کرتے ہوئے ہچکچاہٹ سی پیدا ہوتی ہے کیونکہ انگریزوں و امریکنوں میں کیریکٹر ہے مگر ہم ہندوستانی تجارتی کیریکٹر سے محروم ہیں۔

لندن سے ایک اخبار "نیوز آف دی ورلڈ" شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کا بہت زیادہ حصہ لندن کی عدالتوں کے مقدمات سے پر ہوتا ہے۔ اس اخبار کو اگر غور کے ساتھ دیکھا جائے تو سو مقدمات میں سے شاید دو تین بھی ایسے نہ ہوں گے جن میں ملزموں نے اپنے جرم کا اقرار نہ کر لیا ہو کیونکہ انگریز مجرم ہوتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا اپنی اخلاقی موت سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر ہندوستان کی عدالتوں میں ملزموں کو تو چھوڑیئے۔ وہ تو اپنی جان کے بچانے کے لیے جھوٹ بولنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہی ہیں۔ یہاں تو گواہوں میں سے بھی پچانوے فیصدی لوگ ایسے ہیں "جو ایمان سے کہتا ہوں سچ کہوں گا" یا "دھرم سے کہتا ہوں سچ کہوں گا" کہہ کر حلفیہ جھوٹ بولتے ہیں اور شہادت دینے سے پہلے جھوٹی گواہی دینے کی ٹریننگ لیتے ہیں۔ گویا کہ انگریز ملزم ہونے کے بعد بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ مگر ہندوستانی بغیر ملزم ہوتے بھی جھوٹ بولتا ہے۔ آپ بازار میں سودا خریدنے جایئے۔ ہندوستانی ایک روپیہ کہہ کر آہستہ آہستہ آٹھ آنے پر آجائیں گے اور انگریزی فرم میں دوسری بات کرنا بھی باعث شرم سمجھا جاتا ہے اور قدم قدم پر انگریزوں اور ہندوستانیوں کے کیریکٹر کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

انگریزوں کے کیریکٹر کی بلندی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے غیر قوم ہوتے ہوئے بھی ہم تجارتی اعتبار سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ ان کی ہر بنی ہوئی شے پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اور دوگنی و سہ گنی قیمت پر بھی ان کا مال خریدتے ہیں کیونکہ یہ لوگ نہ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ دھوکہ دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے پر ہم جو کچھ ہیں کاش کہ ہم اس پر شرم محسوس کریں۔ کیونکہ ہمارا اعمال نامہ نہ صرف ہماری تجارت کے لیے نقصان کا باعث

Marfat.com

ہے بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی ہم اپنے ملک کی رسوائی و ذلت کا باعث ہیں۔

نفس کو دھوکہ

انگریزی میں ایک لفظ ہے: "اوورایسٹیمیشن" اس لفظ کا اردو زبان میں ہم معنی لفظ باوجود تلاش کرنے کے بھی مجھے مل نہیں سکا۔ اس لفظ کے معنی ہیں۔ اصل سے زیادہ اندازہ کرنا یا اپنے نفس کو دھوکہ دینا۔ مثلاً ایک شخص کمزور ہو مگر اپنے کو مضبوط سمجھے۔ نالائق ہو مگر لائق یقین کرے۔ یا مضمون نہ لکھ سکتا ہو مگر اپنے تئیں مضمون نویس سمجھے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ میں نے اب تک جتنے ناکام لوگ دیکھے۔ ان کی ناکامی کا زیادہ سبب ان کا اپنے متعلق اوورایسٹی میٹ کرنا یا غلط اندازہ لگانا ہی تھا۔ اور یہ اوورایسٹی میشن انسان کو بالکل تباہ کر دیتا ہے اور اپنی عقل، قابلیت، دولت اور قوت کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ یا اسے سمجھا جائے تو کامیابی کے لیے راہیں زیادہ فراخ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

جب "ریاست" کو جاری ہوئے ایک سال ہوا۔ اس کو دوسرے اخبارات کے مقابلہ پر بہت کافی کامیابی ہوئی اور اخبار کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی تھی تو اس کے لیے بڑی بڑی انگریزی فرموں کے اشتہارات لینے کی کوشش کی گئی۔ اس سے پہلے انگریزی فرموں کے اشتہارات اردو اخبارات میں نہ ہوتے تھے یا ہوتے تھے تو شاید زیادہ سے زیادہ دو چار۔ وہ بھی "پلیسہ اخبار" اور "اخبار عام" جیسے بہت پرانے اخبارات میں۔ جن کو جاری ہوئے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس ہو چکے تھے۔ اور اردو اخبارات میں یہ فخر "ریاست" کو ہی حاصل ہے کہ سب سے پہلے انگریزی اور بڑی فرموں سے اشتہارات حاصل کرنے کا سلسلہ اس نے ہی شروع کیا۔ چنانچہ انگریزی فرموں کو یہ یقین دلانے کے لیے بہت محنت کی گئی کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے اور ملک کے ہر حصہ میں اس کو بولنے اور پڑھنے والے موجود ہیں۔

اشتہارات حاصل کرنے کے لیے پراپاگنڈا شروع کیا گیا تو بعض فرموں کا جواب آیا۔ کہ "ریاست" کو جاری ہوئے کتنے برس ہو چکے ہیں۔ گویا کہ ان فرموں کی نظر میں ایک نیا اخبار چاہے دس ہزار چھپے۔ اس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ پرانا اخبار دو سو چھپنے والا بھی ان کے خیال میں زیادہ قابل قدر تھا۔ ہم جب ان کو لکھتے کہ ایک سال ہوا جاری کیا گیا۔ تو یہ انگریزی فرمیں پھر کوئی جواب ہی نہ دیتیں۔ جب اس طرح بے نتیجہ کوشش سے ہم تنگ آ گئے۔ تو یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ کسی بہت پرانے اور بند ہو چکے اخبار کو برائے نام خریدا جائے تاکہ انگریزی فرموں کو جواب دیا جا سکے۔ کہ یہ آج سے چالیس یا پچاس سال پہلے جاری کیا گیا تھا، اور اس کا یہ نام تھا۔ چنانچہ کسی پرانے اخبار کی تلاش شروع ہوئی جو بند ہو چکا تھا۔

میں نے ملا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" سے بھی اس کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی، کہ کسی بہت پرانے اور بند ہو چکے اخبار کا انتظام کر دیا جائے اور اس مرچکے اخبار کے ورثاء کو پچاس ساٹھ روپے دے دیئے جائیں گے۔ ملا واحدی صاحب نے بتایا کہ پچاس ساٹھ برس ہوئے ان کے کوچہ چیلاں

Marfat.com

ہی سے ایک اخبار شائع ہوتا تھا۔ اخبار نکالنے والے بہت برس ہوئے انتقال کر چکے ہیں اور ان کے اولادِ نرینہ بھی کوئی نہیں۔ صرف ایک نواسہ ہے۔ ان سے بات چیت کی جائے گی۔ چنانچہ دو روز کے بعد کا وقت مقرر ہُوا۔ میں بھی واحدی صاحب کے ہاں حاضر ہُوا اور وہ صاحب بھی تشریف لائے میں نے ان حضرت سے تمام بات صاف صاف کہہ دی کہ ہمیں یہ دقت ہے۔ اگر وہ ایک خط لکھ دیں کہ ان کے نانا کا اخبار پروپرائٹر "ریاست" کے پاس فروخت کر دیا گیا ہے تو اس خط کے معاوضہ میں ان کو پچاس روپے دے دیے جائیں گے۔ تاکہ ہم اس اخبار کا نام استعمال کر سکیں۔ جس کو بند ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں۔ ہماری اس درخواست کے جواب میں ان حضرت نے فرمایا کہ غور کر کے جواب دیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز انہوں نے جواب دینے کا وعدہ فرمایا:

میں دوسرے روز پھر واحدی صاحب کے ہاں گیا۔ واحدی صاحب نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو تشریف لانے کے لیے کہلوایا تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ بہت مصروف ہیں۔ آج نہیں آ سکتے۔ میں اگلے روز پھر گیا۔ پھر وہی جواب۔ تیسرے روز پھر گیا پھر وہی مصروفیت کا بہانہ۔ ایک ہفتہ کے بعد میں پھر واحدی صاحب کے ہاں گیا۔ اور پھر بلوا بھیجا۔ تو آپ نے جواب دیا۔ کہ طبیعت اچھی نہیں اس لیے نہیں آ سکتے آخر میں واحدی صاحب نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلوایا کہ دیوان سنگھ کئی بار آ چکا ہے۔ اگر آپ کو بات کرنی ہو تو دو منٹ کے لیے آ جائیے۔ ورنہ اس کے بعد وہ نہ آئے گا۔ ہماری اس درخواست پر یہ حضرت تشریف لائے۔ تشریف لانے پر بہت تکلّف اور فخریہ انداز کے ساتھ بات چیت شروع کی جس طرح کوئی مہاراجہ یا نواب کسی غلام کو دوامی جاگیر عطا کرنے والا ہو۔ آپ نے مجھ سے فرمایا:

"نانا جان فرمایا کرتے تھے۔ کہ جب ان کا اخبار جاری تھا تو یہ وائسرائے تک کے ہاں جاتا تھا اور پانچ چھ سو چھپتا تھا اور اس کی تمام ملک میں دھوم تھی۔ ایسے بڑے اخبار کا معاوضہ کم از کم دس ہزار روپیہ ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ واحدی صاحب نے سفارش کی ہے اس لیے میں اس اخبار کی قیمت پانچ ہزار روپیہ قبول کر لوں گا۔"

پانچ ہزار روپیہ سن کر میں حیران ہو گیا۔ کیونکہ میں نے تو "ریاست" جاری ہی ڈیڑھ ہزار روپیہ کے ساتھ کیا تھا۔ اور وہ بھی یہ روپیہ ایک دوست کی معرفت ایک بنئیے سے قرض لے کر۔ میں نے جواب دیا۔ کہ جناب میں تو زیادہ سے زیادہ ایک سو روپیہ دے سکتا ہوں۔ کیونکہ نہ تو یہ اخبار جاری ہے۔ نہ کوئی رجسٹر ہے۔ نہ کوئی خریدار اور نہ کوئی اشتہار۔ اخبار کو دفن ہوئے بھی پچاس برس ہو چکے۔ یہ حضرت نہیں مانے اور میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔

میں نے واپس آ کر سوچا کہ اگر میں پچاس برس کے دفن ہو چکے اخبار کا نام استعمال کروں تو یہ میرے لیے فخر کی بات نہ ہو گی۔ اس کے علاوہ بند ہو چکے اخبار کا "ریاست" میں شامل کرنا قانوناً چاہے ناجائز نہ ہو مگر اخلاقاً یہ ایک قسم کا دھوکہ ہے اور مجھے اس سے بلند رہنا چاہیئے۔ چاہے اشتہارات حاصل کرنے میں مزید کچھ عرصہ لگ جائے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ ایسا نہ کروں گا اور یہ یقین دلانے

Marfat.com

لیے یہ کہ اس کی اشاعت اتنی ہے اور اشتہارات کے لیے یہ پرانے سے پرانے اخبارات سے اچھا ہے۔ میں نے مشتہرین کو بھیجنے کے لیے خط کا نیا مضمون تیار کر لیا۔

اخبار فروخت کرنے والے حضرت دو ہفتہ تو میرا انتظار کرتے رہے کہ میں پہلے کی طرح پھر اُن کی خوشامد کروں گا اور پانچ ہزار نہیں تو چار ہزار ہی دے دوں گا۔ دو ہفتہ کے انتظار کے بعد جب ان کی خدمت میں کوئی حاضر نہ ہُوا۔ تو وہ واحدی صاحب کے پاس آئے اور فرمایا:

"اس معاملہ کا کیا ہُوا۔ اگر پانچہزار زیادہ رقم ہو تو چار ہزار ہی دلوا دیجئے۔"

واحدی صاحب نے یہ پیغام میرے پاس پہنچایا میں نے جواب دیا۔ کہ مجھے ضرورت نہیں۔ دو روز کے بعد یہ حضرت واحدی صاحب کے پاس آئے۔ تین ہزار پر فروخت کرنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اب آپ نے مسلسل آنا شروع کیا۔ تین ہزار سے دو ہزار۔ دو ہزار سے ایک ہزار پھر پانچ سو چار سو۔ تین سو۔ آخر یہ پچاس روپیہ تک اُتر آئے۔ اور کہا۔ کہ پچاس روپیہ لے کر ہی یہ اپنے نانا کی "اخباری جائیداد" فروخت کر دیں گے۔ مگر یہاں تو یہ خیال ہی بدل چکا تھا۔ گویا کہ پچاس برس پہلے کے بند ہو چکے اخبار کی قیمت دس ہزار روپیہ سمجھنے والے اور اپنی "اخباری جائیداد" کی حیثیت کا اوور اسٹیمیٹ کرنے والے حضرت پچاس روپیہ بھی کھو بیٹھے۔

نواب بھوپال نے جب ایڈیٹر "ریاست" پر مقدمات دائر کیے تو اس کے ساتھ ہی مجھ پر پٹیالہ اور خیرپور میرس کی ریاستوں نے بھی میانوالی اور سکھر میں مقدمات دائر کر دیئے۔ اس ایک ہی وقت میں مجھ پر چار مقدمات تھے۔ ایک ہوشنگ آباد میں دہلی سے چھ سو میل جنوب کی طرف۔ ایک دہلی میں۔ ایک میانوالی میں دہلی سے ساڑھے پانچ سو میل شمال کی طرف اور ایک سکھر (سندھ) میں دہلی سے چھ سو میل مغرب کی طرف۔ ان مقدمات کا مقصد یہ تھا۔ کہ میں پریشان ہو کر ہتھیار پھینک دوں۔ میرے مقدمات کی جب یہ حالت سردار سردول سنگھ کویشر نے دیکھی اور محسوس کیا۔ کہ ہر جگہ پیشیوں پر پہنچنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ آپ نے رائے دی کہ میں اخبار کا پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کسی دوسرے کو مقرر کر دوں تاکہ والیانِ ریاست مجھ پر مقدمات نہ چلا سکیں اور جھوٹے و بے بنیاد مقدمات کا جواب اس صورت میں دیا جائے۔ اس مشورہ کے بعد میں نے ریاست نابھہ کے ایک شخص سردار دھرم سنگھ کو "ریاست" کا ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر مقرر کر دیا۔ یہ صاحب ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر چند ماہ رہے تھے۔ تو ان کو خیال آیا یا کسی دوسرے نے پٹی پڑھائی۔ کہ اخبار میں اگر کوئی اہم شخصیت ہوتی ہے تو وہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر ہی ہوتا ہے اور یہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک روز فرمایا کہ ڈاک خانہ سے جو منی آرڈر آئیں گے اُن پر یہ خود دستخط کریں گے۔ جب مجھے معلوم ہُوا کہ انہوں نے یہ کہا ہے تو میں حیران رہ گیا۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ کہ ہاں کہا ہے اور یہ آئندہ تمام حساب کتاب بھی دیکھیں گے۔ کیونکہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر ہیں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی پوزیشن کا غلط اندازہ نہ لگائیے۔ آپ دفتر میں ملازم ہیں۔ میرے کہنے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور یہ مسلسل غلط فہمی میں مبتلا رہے۔ ان کے اس ارادہ کو دیکھ کر میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھا کہ میں سردار

Marfat.com

دھرم سنگھ پرنٹر اور پبلشر کو موقوف کرتا ہوں۔ ان کی جگہ پنڈت دیونانک داس کا ڈیکلریشن بطور پرنٹر پبلشر منظور کیا جائے۔ پنڈت دیونانک میرا خط اور پرنٹر پبلشر کا فارم خانہ پری کے بعد لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے۔ قاعدہ کے مطابق اس ڈیکلریشن کو داخل کرنے میں چند منٹ صرف ہوتے ہیں۔ پنڈت جی یہ داخل کر کے سہ پہر کو واپس دفتر پہنچے تو میں نے سردار دھرم سنگھ کو بلایا اور ان کی بقایا تنخواہ دے کر کہا کہ رسید لکھ دیجئے اور تشریف لے جائیے۔ آپ کی ضرورت نہیں۔ سردار دھرم سنگھ اپنے ذہن میں اکاونٹ کی کتابوں، منی آرڈروں اور بنک کے چیکوں پر دستخط کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہاں ملازمت سے ہی جواب مل گیا۔ پریشان کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بہت خوشامد کی۔ کہ پوری نہیں تو نصف تنخواہ پر ہی رکھ لیا جائے۔ مگر میں نے ان کو جواب دے دیا کہ مفت بھی رکھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے بعد یہ اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہاں غالباً وہی ہل چلانے کا کام کرتے ہیں جو ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر ہونے سے پہلے کرتے تھے۔ یہ سردار دھرم سنگھ بھی اوور ایسٹیمیشن کا شکار ہوئے ورنہ شاید زندگی بھر یہاں آرام سے رہتے۔

یہ واقعات تو دوسروں کے اوور ایسٹیمیشن کے متعلق ہیں۔ میرے ذاتی اوور ایسٹیمیشن کا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جب ریاست نابھ میں ملازمت کے سلسلہ میں مہاراجہ سے انٹرویو کے لیے گیا تو مہاراجہ نے مجھ سے بہت سے سوالات کیے۔ ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا، "آپ کیا کام کر سکتے ہیں؟" اس سوال کا میں نے فوراً جواب دیا: "ہر کام کر سکتا ہوں اور آپ کی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کے ہر صیغہ کو کامیابی سے چلا سکتا ہوں۔" میرے اس جواب پر مہاراجہ نے کہا تو کچھ نہیں مگر وہ مسکرا دیئے۔ مہاراجہ نے مجھے ایڈمنسٹریشن میں کوئی ذمہ داری کا اہم کام سپرد نہ کیا۔ مگر ملازمت دے دی ہیں اب جب کبھی مہاراجہ کی اس مسکراہٹ کا خیال کرتا ہوں تو اپنی بے وقوفی یا اپنے اوور ایسٹیمیشن پر شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے کبھی کہیں بھی ایڈمنسٹریشن کے صیغہ میں تجربہ حاصل نہ کیا تھا اور نہ ایڈمنسٹریشن سے واقف تھا مگر میں نے اوور ایسٹیمیٹ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ ایڈمنسٹریشن کے ہر صیغہ کو کامیابی کے ساتھ چلا سکتا ہوں۔

قابلِ معافی گناہ

دہلی میں ایک صاحب منشی عبدالقدیر ہیں۔ یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں مگر ان کا خاندان پچاس برس سے دہلی میں مقیم ہے۔ آپ کانگریسی خیالات کے بزرگ ہیں۔ بے حد نیک، غیر معمولی دیانتدار، بہت مخلص، بے ریا اور بے غرض کارکن۔ چنانچہ پچھلے پندرہ بیس برس کے اندر کانگرس کے جو پمفلٹ، پوسٹر یا دوسرا لٹریچر جس کو گورنمنٹ نے باغیانہ قرار دیا۔ دہلی میں شائع ہوا اسے منشی عبدالقدیر نے شائع کیا۔ کسی زمانہ کی بھی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جس میں منشی جی کی تلاشی، گرفتاری یا نظربندی نہ ہوئی ہو۔

Marfat.com

آپ اب تک غالباً اٹھارہ بار جیل یا حوالات میں گئے۔

دہلی پولیس منشی جی کی تلاشیوں اور گرفتاریوں سے عاجز آ گئی اور کبھی ایسا نہ ہوا۔ کہ آپ کے گھر سے کاغذ کا ایک پرزہ بھی پکڑا گیا ہو کیونکہ آپ ہمیشہ محتاط رہا کرتے اور ایک محدود حلقہ کے دوستوں کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرتے۔ پولیس جب آپ کی ان سیاسی مصروفیات سے تنگ آ گئی تو کوشش جاری ہوئی کہ کسی دوسرے مقدمہ کی لپیٹ میں ہی آپ کو رکھ لیا جائے۔ تاکہ دہلی میں "باغیانہ" لٹریچر کی اشاعت بند ہو۔

دہلی میں اخبار "الامان" کے اڈیٹر مولانا مظہرالدین کا قتل ہو گیا۔ مولانا مسلم لیگی تھے اور وطن پرست مسلمانوں کے حلقہ کی آپ کے ساتھ سخت عداوت تھی۔ مولانا کو قتل کرنے والے دو نو مسلم نوجوان تھے جو مولانا کی پالیسی کو ناپسند کرتے تھے۔ قتل کے وقت موقع پر تو ملزم گرفتار نہ ہوئے مگر چند روز کے بعد اتفاقاً گرفتار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی پولیس نے منشی عبدالقدیر کو بھی گرفتار کر لیا۔ حالانکہ منشی جی کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور آپ عدم تشدد کے پابند تھے۔ اس قتل کے جرم میں جب منشی عبدالقدیر کی گرفتاری ہوئی تو دہلی کے کانگرسی اور قومی حلقوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ کیونکہ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو منشی جی کے حالات سے واقف اور ان کے اخلاص اور ان کی حب الوطنی کا مداح نہ ہو۔ منشی جی تو حوالات سے بعد جیل خانہ میں بھیج دیے گئے۔ مگر ان کے دوست ان کے مقدمہ کے باعث بے حد پریشان تھے اور آپ کے ان پریشان دوستوں اور مداحوں میں سے ایک "اڈیٹر ریاست" بھی تھا۔ کیونکہ قتل کا الزام۔ مقدمہ سنگین۔ پولیس کی پوری کوشش اور منشی جی بے گناہ۔

میں ایک عرصہ تک سوچتا رہا۔ کہ منشی جی کے متعلق کیا کرنا چاہیے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر یہ مقدمہ سیشن کورٹ میں چلا گیا۔ کیونکہ قتل کے ملزموں کے مقدمہ کی سماعت کسی مجسٹریٹ کے ہاں نہیں ہو سکتی۔ مجسٹریٹ صرف ابتدائی کارروائی کرتا ہے۔ مقدمہ جب سیشن میں گیا تو اس زمانہ میں سیشن جج مسٹر ایس ایس مونگیا تھے۔ یہ سیشن جج غیر معمولی دیانت دار اور قانون میں ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔

مسٹر مونگیا جب دہلی میں پہلے روز آئے تھے تو ان کے مکان کا انتظام نہ ہوا تھا۔ یہ لالہ دیس راج پاہوہ سیشن جج کے دوست تھے۔ ان کے مکان پر ٹھہرے۔ لالہ دیس راج پاہوہ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے بھتیجے ہیں اور میرے دونوں کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ بلکہ لالہ دیس راج کی والدہ میری والدہ کو اپنی والدہ کی طرح سمجھتی تھیں۔ میں اس زمانہ میں لالہ دیس راج کے ہاں دوسرے تیسرے روز جایا کرتا تھا۔ مسٹر مونگیا سے بھی ملاقات ہوئی۔ مسٹر مونگیا نے چار پانچ روز لالہ دیس راج کے مکان پر قیام کیا۔ اس کے بعد ان کے لیے کوٹھی کا انتظام ہو گیا۔ اور وہ راجپور روڈ کی ایک کوٹھی میں چلے گئے۔

مسٹر مونگیا کے لالہ دیس راج کے ہاں سے چلے جانے کے بعد آپ سے ملنے کا مجھے بہت کم اتفاق ہوتا۔ کبھی لالہ دیس راج کے ساتھ راجپور روڈ کی طرف سیر کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ تو چند منٹ کے لیے مسٹر مونگیا سے بھی مل لیے۔ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا مظہرالدین کے مقدمہ کی جب کئی پیشیاں مسٹر مونگیا کی عدالت میں ہو چکیں۔ سرکاری گواہوں

Marfat.com

کی شہادتوں کے بعد فرد جرم، ملزموں کا بیان اور صفائی کی شہادت بھی ختم ہو گئی اور بحث ہونے والی تھی۔ تو مجھے خیال آیا۔ کہ اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کرنا چاہیئے۔ بعد میں کوشش لا حاصل ہو گی۔ میں لالہ دلیس راج کے ہاں بیٹھا لالہ دلیس راج اور ان کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔ تو مسٹر مونگیا کا ذکر چل پڑا۔ لالہ دلیس راج نے بتایا۔ کہ مسٹر مونگیا غیر معمولی دیانت دار اور جرأت مند سیشن جج ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے بھی ان کی بہت تعریف سنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی وہ یہاں آئیں تو ان سے باتیں کی جائیں۔ لالہ دلیس راج کو کیا انکار تھا۔ انہوں نے اگلے روز مجھے اور مسٹر مونگیا کو ڈنر پر آنے کے لیے دعوت دی۔ میں نے ملاقات کی نیت اور اپنے خیال کے متعلق لالہ دلیس راج سے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ کیونکہ وہ بھی بہت دیانت دار ہیں۔ اس کے علاوہ مسٹر مونگیا ان کے افسر تھے۔ میں اپنا خیال ظاہر کرتا تو شاید تمام کھیل ہی بگڑ جاتا اور وہ مجھے منشی عبدالقدیر کے متعلق ذکر کرنے سے روک دیتے۔ یا ہم دونوں کو بیک وقت کھانے پر ہی نہ بلاتے اور میری سکیم رہ جاتی۔ مقررہ وقت پر میں اور مسٹر مونگیا لالہ دلیس راج کے مکان پر پہنچ گئے۔ پہلے ڈرائنگ روم میں مختلف موضوع پر باتیں ہوئیں تو پھر ہم ڈائننگ روم میں گئے اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے کی میز پر میں لالہ دلیس راج لالہ دلیس راج کی بیوی اور مسٹر مونگیا تھے۔ ہم کھانا کھا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ منشی عبدالقدیر کے متعلق بات کس طرح شروع کروں کہ مسٹر مونگیا نے میرے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"سردار صاحب! سنا ہے۔ آپ پر ریاستوں اور گورنمنٹ نے کئی مقدمے قائم کیے اور عدالتوں نے ان مقدمات کے متعلق متعلقہ پولیس افسروں اور والیان ریاست کے خلاف سٹرکچر بھی پاس کیے۔"

مسٹر مونگیا کا یہ کہنا تھا کہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے جواب میں کہا:

"مونگیا صاحب۔ آپ تو مقدمات کے متعلق پولیس کو جانتے ہیں۔ کہ یہ کیوں کر جھوٹے مقدمات بناتی ہے۔ آپ کی عدالت میں تو اب تک ہزار ہا جھوٹے مقدمات پیش ہوئے ہوں گے۔ پولیس والوں کی عداوت ذاتی ہوتی ہے اور اس عداوت کی کسر نفسی مقدمات سے نکالتے ہیں۔ میرے خلاف ایک درجن سے زیادہ مقدمات انگریزی علاقہ کی پولیس اور والیان ریاست نے چلائے۔ مگر ان سب میں اُن کو ندامت اٹھانی پڑی اور مجھ تک ہی کیا محدود ہے۔ دن رات جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں اور بے گناہ جیل خانوں میں قید کر دیے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں دہلی میں ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا۔ ایک صاحب منشی عبدالقدیر کانگرسی ہیں۔ غیر معمولی طور پر شریف نیک اور دیانت دار۔ زندگی بھر کبھی ایک پیسہ کسی فنڈ سے نہ لیا اور نہ کسی عہدہ یا شہرت کا لالچ ان کو رہا۔ پولیس ان کی اب تک پندرہ سولہ بار تلاشی لے چکی ہے۔ مگر منشی جی قابو میں نہ آئے۔ اب پچھلے دنوں یہاں کے ایک اخبار نویس مولانا مظہر الدین کا قتل ہو گیا۔ قتل کرنے والے اور لوگ تھے مگر منشی جی کو بھی دھر لیا گیا۔ کیونکہ ان کو جیل بھیجنے کی دوسری کوئی صورت نہ تھی اور اب منشی جی کا مقدمہ غالباً کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا ہے۔ اس طرح جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں۔"

میں نے اتنا کہا تھا۔ کہ مسٹر مونگیا نے فرمایا:

Marfat.com

"قتل کا یہ مقدمہ تو میری عدالت میں ہے اس پر آجکل بحث ہو رہی ہے۔"

مسٹر مونگیا کے یہ الفاظ سن کر میں نے فوراً کہا:

"اوہ! مجھے علم نہ تھا۔ کہ مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے۔ جس صورت میں مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے آپ سے تو اس کا ذکر بھی نہ کرنا چاہیئے تھا۔"

چنانچہ میں نے فوراً دوسرے موضوع پر بات شروع کر دی اور کسی نے محسوس نہ کیا۔ کہ میری مسٹر مونگیا سے اس ملاقات کی غرض کیا تھی۔

اس واقعہ کے پانچ سات روز بعد مسٹر مونگیا نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ایک ملزم کو پھانسی کی سزا دی۔ ایک کو عمر قید اور منشی عبدالقدیر کو باعزت بری کر دیا گیا۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اگر منشی عبدالقدیر کے متعلق مسٹر مونگیا کو اصل حالات نہ بتاتا۔ تو وہ گواہوں کی شہادتوں کو دیکھ کر منشی جی کے متعلق کیا فیصلہ کرتے۔ مگر میں اپنے اس فعل پر شرمندہ نہیں ہوں اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے ایک بے گناہ اور بے قصور قومی ورکر کو پولیس کے جھوٹے مقدمہ سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

اس واقعہ کا یہ تاریک پہلو ہے اور میرا مسٹر مونگیا سے یہ کہنا کہ مجھے اس مقدمہ کے ان کی عدالت میں ہونے کا علم نہیں، بلاشبہ جھوٹ تھا مگر سوال یہ ہے کہ کیا کسی بے گناہ کو بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز یا نامناسب ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ پر اگر مہاتما گاندھی کی رائے لی جاتی تو وہ بلاشبہ فوراً جواب دیتے کہ ناجائز اور غیر مناسب ہے۔ کیونکہ وہ کسی صورت میں جھوٹ بولنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مگر مجھ جیسے لوگ جو دن بھر میں نہ معلوم کتنی بار دانستہ اور نادانستہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر کسی نیک کام یا کسی معصوم و بے گناہ کی زندگی کو بچانے کے لیے بلا کسی غرض کے جھوٹ بولیں تو میرا خیال ہے کہ یہ گناہ یا کمزوری قابلِ معافی قرار دی جانی چاہیئے۔

ریاستی وزراء کا اقبال و زوال

"ریاست" کو جاری ہوئے دو برس ہوئے تھے کہ سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ آپ پٹیالہ میں ایک سازش کا شکار ہوئے۔ جس میں کرنل امریک سنگھ۔ مسٹر رفیق احمد خاں اور پٹیالہ کے چند اہلکار شریک تھے۔ سر دیا کشن کول ریاستوں کے وزراء میں بہت لائق اور تجربہ کار تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے زمانہ میں شاید تمام ریاستوں میں لائق ترین وزیر تھے۔ جو والئی ریاست اور رعایا دونوں کی نبض پہچانتے ہوں۔

جب سر دیا کشن پٹیالہ سے چلے گئے تو پٹیالہ میں یہ عام خیال تھا۔ کہ سر دیا کشن پھر واپس پٹیالہ آجائیں گے کیونکہ آپ کا وائسرائے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ پر بہت کافی اثر تھا اور وائسرائے مہاراجہ

Marfat.com

پٹیالہ پر سردیا کشن کے پھر واپس بلائے جانے کے لیے زور دیں گے۔ اس خیال سے متاثر ہو کر کرنل امریک سنگھ اور مسٹر رفیق احمد خاں نے سوچا کہ کوئی ایسی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ اور سردیا کشن کے درمیان کشیدگی بہت زیادہ بڑھ جائے۔ تاکہ ان دونوں کے تعلقات آئندہ کبھی اچھے ہو ہی نہ سکیں اور سردیا کشن کا واپس پٹیالہ آنا ممکن نہ رہے۔ چنانچہ اس سکیم کو عملی صورت دینے کے لیے اس پارٹی نے لاہور سے دو اخبار نویسوں کو بلایا۔ ان کو پانچ پانچ سو روپیہ بطور پیشگی دیا گیا۔ آئندہ کے لیے بہت شاندار وعدے کیے اور ہدایت کی کہ سردیا کشن کول کی ذات کے خلاف اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعہ پراپاگنڈا کیا جائے۔ تاکہ سردیا کشن پبلک میں رسوا ہوں۔ اس سکیم کا مقصد یہ تھا۔ کہ اگر سردیا کشن خاموش رہے تو پبلک میں رسوا ہوں گے اور چونکہ یہ پراپاگنڈا پٹیالہ کے روپیہ سے ہو رہا ہے۔ اگر سردیا کشن نے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو یہ قدم مہاراجہ اور سردیا کشن کے درمیان خلیج کو اور زیادہ وسیع کرنے کا باعث ہو گا اور سردیا کشن کا پھر پٹیالہ میں بطور وزیر اعظم آنا ممکن ہی نہ ہو گا۔

سردیا کشن کے خلاف لاہور میں جب مضامین اور پوسٹر بازی شروع ہوئی۔ تو سردیا کشن نے لاہور سے ایڈیٹر "ریاست" کے پاس دہلی پیغام بھیجا۔ کہ میں لاہور آ کر ان سے مل لوں۔ سردیا کشن سے ایڈیٹر "ریاست" کی اس سے پہلے واقفیت ہو چکی تھی۔ اور سردیا کشن نے اپنے بھائی راجہ ہری کشن کول (جو اس زمانہ میں جالندھر کے کمشنر تھے) کو بھی بتا دیا تھا۔ کہ سردیا کشن کول کے والد راجہ سورج کول اور ایڈیٹر "ریاست" کے والد دونوں گہرے دوست تھے اور دونوں میانوالی وغیرہ کئی اضلاع میں اکٹھے ملازم رہے (یہ واقعہ ایڈیٹر "ریاست" کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ راجہ سورج کول میانوالی میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور ایڈیٹر "ریاست" کے والد وہاں ڈاکٹر تھے)۔

میں جب لاہور گیا اور راجہ سردیا کشن کول اور ان کے پھوپھی زاد بھائی پنڈت جیون لال مٹو سے ملا تو تمام حالات معلوم ہوئے۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ "ریاست" میں مہاراجہ پٹیالہ کے جاری کیے گئے پراپاگنڈا کے خلاف لکھا جائے۔ میں نے جب تمام حالات سنے تو میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اخبار میں لکھنا تو کوئی مشکل نہیں اور شاید مہاراجہ پٹیالہ کو بہت بُری طرح سے بے نقاب کیا جا سکتا ہے کیونکہ مہاراجہ کی کمزوریاں ہی اس قابل ہیں مگر میرے آپ کے ساتھ ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ اس لیے میں کوئی غلط رائے نہیں دے سکتا۔ آپ کا اس گندے پراپاگنڈا کے خلاف ایک لفظ لکھنا یا لکھوانا آپ کے لیے نقصان کا باعث ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ بغیر کچھ لکھے یا لکھوائے کسی دوسرے طریقہ سے اس پراپاگنڈے کو بند کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ تعلقات مہاراجہ پٹیالہ سے اچھے ہو جائیں۔ تاکہ کرنل امریک سنگھ اینڈ کو کی سکیم ناکام ہو۔ چنانچہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ اگلے ہفتہ چیمبر آف پرنسس کا اجلاس ہونے والا ہے۔ راجہ سردیا کشن اجلاس کے موقعہ پر دہلی آ کر مہاراجہ پٹیالہ سے ملنے اور تعلقات اچھے کرنے کی کوشش کریں۔

میں دہلی واپس آ گیا اور چار پانچ روز کے بعد راجہ سردیا کشن بھی دہلی تشریف لے آئے۔ یہاں

Marfat.com

ان کا قیام لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید کی کوٹھی میں ہوا۔ راجہ صاحب نے دہلی پہنچتے ہی اپنے پہنچنے کی مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی اور میں حالات سے باخبر رہنے اور مشورہ دینے کے لیے دن میں پانچ چھ بار ٹیلی فون پر بات کر لیا کرتا۔

راجہ سر دیاکشن کو دہلی میں پہنچے دو تین روز ہوئے تھے۔ دہلی میں والیان ریاست اور ان کے وزرائ وسٹاف کے باعث دجو چیمبر آف پرنسس کے موقعہ پر آئے تھے، کافی رونق ہو گئی۔ اس زمانہ میں مسٹر اسی ایس رنگا آئر ممبر اسمبلی میرے مکان پر مقیم تھے۔ میں نے کھانے پر باتوں باتوں میں ان سے ذکر کیا کہ یہ والیان ریاست اپنے روپیہ سے انگریزی علاقہ میں بری حرکتیں کرتے ہیں اور مہاراجہ پٹیالہ کے روپیہ سے راجہ سر دیاکشن کول کے خلاف لاہور میں ایسے گندے پوسٹر شائع کیے جا رہے ہیں جن کو کوئی شریف آدمی پڑھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مسٹر رنگا آئر نے اسے تعجب کے ساتھ سنا اور کہا۔ کہ آپ اسمبلی میں اس پوسٹر بازی کے متعلق سوالات دریافت کرنے کا نوٹس دیں گے اور گورنمنٹ سے پوچھیں گے کہ کیا یہ واقعہ ہے یا نہیں۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ کے روپیہ سے انگریزی علاقہ میں لاہور کے اندر انگریزی رعایا کے خلاف گندے پوسٹر چھپے اور شائع ہوئے۔ مسٹر رنگا آئر نے کھانا کھانے کے بعد ان سوالات کا مضمون تیار کیا اور جب سوالات ٹائپ کرا کر تیار کر لیے گئے تو میں نے کہا: مسٹر رشبرک ولیمز فارن منسٹر ریاست پٹیالہ بھی آجکل دہلی میں ہیں۔ سوالات دریافت کرنے سے پہلے کیوں نہ ان سوالات کے متعلق ان کو بتا دیا جائے تاکہ اگر یہ پراپگنڈا بند کرا سکیں تو سوالات دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے اور سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مسٹر رنگا آئر نے میری اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ مسٹر رشبرک ولیمز گورنمنٹ آف انڈیا کے پبلسٹی افسر رہ چکے تھے اور مسٹر رنگا آئر کے دوست تھے۔ آپ نے اسی وقت ان کو ٹیلی فون کر کے اگلے روز صبح ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔ آپ ملنے کے لیے گئے۔ تمام واقعات اور سوالات کے متعلق بتایا تو مسٹر رشبرک ولیمز بہت حیران ہوئے کیونکہ پوسٹر بازی ان کی لاعلمی میں کی جا رہی تھی۔ ان کو یہ حالات سن کر بے حد افسوس ہوا اور آپ نے مسٹر رنگا آئر سے درخواست کی کہ سوالات اسمبلی میں دریافت نہ کیے جائیں۔ وہ مہاراجہ پٹیالہ سے بات کر کے اس گندے اور لچر پراپگنڈا کو فوراً بند کرا دیں گے۔ رنگا آئر نے واپس آ کر مجھے بتایا۔ کہ ان کی مسٹر رشبرک ولیمز سے کیا بات چیت ہوئی۔

یہ بات تو صبح ہوئی۔ شام کو پانچ بجے کے قریب قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم ریاست دتیا ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لیے دفتر "ریاست" میں تشریف لائے اور باتیں ہوئیں تو میں نے ان کو بتایا۔ کہ کس طرح کرنل امریک سنگھ وغیرہ راجہ سر دیاکشن کول کے خلاف گندا پراپگنڈا کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب مہاراجہ پٹیالہ کے بہت گہرے دوست تھے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں نے شرارتاً کہا۔ کہ میں اس معاملہ کو "ریاست" میں لے رہا ہوں اور میں مہاراجہ پٹیالہ کو بتاؤں گا کہ وہ کس طرح انگریزی علاقہ میں لوگوں کے خلاف گندگی پھیلا سکتے ہیں۔ قاضی صاحب بہت دوست نواز، نرم دل، نیک بزرگ تھے۔ جب انہوں نے مجھ سے یہ سنا۔ کہ میں مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف ریاست میں سلسلہ مضامین شروع

Marfat.com

کر رہا ہوں ۔ تو آپ پریشان سے ہوئے اور آپ نے کہا: نہیں نہیں ۔ سردار صاحب! آپ ایسا نہ کیجئے آپ کو معلوم نہیں کہ مہاراجہ پٹیالہ بہت اچھے آدمی ہیں ۔ ان کو تو شاید اس پوسٹر بازی کا علم بھی نہ ہو اور یہ سب کچھ خود غرض لوگ ان کو اطلاع دیئے بغیر کر رہے ہوں ۔ میں ابھی مہاراجہ کے پاس جا کر دریافت کرتا ہوں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔ جو مہاراجہ کے شان کے شایاں نہیں ۔"

قاضی صاحب کے ایسا کہنے پر میں نے جواب دیا: "قاضی صاحب آپ کوشش کر لیجئے ۔ اگر یہ شرمناک پوسٹر بازی بند نہ ہوئی تو میں پھر اس معاملہ کو ہاتھ میں ضرور لوں گا ۔ سر دیا کشن کول کی میں اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا ہوں ۔"

قاضی صاحب اس گفت گو کے بعد سیدھے کنگز وے تشریف لے گئے ۔ جہاں ریلوے سٹیشن پر مہاراجہ پٹیالہ کی سیلون کھڑی تھی ۔ مہاراجہ کو اطلاع ہوئی تو مہاراجہ نے قاضی صاحب کو فوراً بلا لیا ۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد قاضی صاحب نے مہاراجہ سے کہا ۔

"سرکار ۔ حضور کی عزت موتیوں کی طرح صاف اور قیمتی ہے ۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ حضور کے حکم سے سر دیا کشن کول کے خلاف گندہ پراپاگنڈا کیا جا رہا ہے اور ان پوسٹروں کے جواب میں اب حضور کے خلاف لکھا جانے والا ہے ۔ کتنے افسوس کی بات ہے ۔ حضور کی شان ایسی باتوں سے بہت بلند ہونی چاہیئے ۔"

قاضی صاحب نے جب یہ الفاظ کہے تو مہاراجہ کا رنگ غصہ کے باعث سرخ ہو گیا اور آپ نے چوبدار سے کہا: "بلاؤ امریکے کو" (مہاراجہ جب غصہ میں آتے تو اپنے ملازمین کو آدھے نام سے پکارتے تھے ۔ مثلاً امریک سنگھ کو امریکے ۔ رفیق محمد کو رفیقے اور نرنجن سنگھ کو نرنجنے وغیرہ) چوبدار ساتھ والے سیلون سے کرنل امریک سنگھ کو بلا لایا ۔ اور کرنل صاحب جب آئے تو مہاراجہ ان پر برس پڑے اور گالیاں دے کر کہا کہ "تم لوگ مجھے بے عزت کرانا چاہتے ہو ۔ تم کو شرم نہیں آتی ۔ اگر دیا کشن نے میرے خلاف گندے پوسٹر نکلوائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا ۔ اس پراپاگنڈا کو فوراً بند کرو ۔ اگر بند نہ ہوا تو تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا ۔" یہ سب ڈانٹ ڈپٹ قاضی صاحب کی موجودگی میں ہوئی ۔ قاضی صاحب نے واپس آ کر مجھے بتایا کہ ان کی موجودگی میں کیا کچھ ہوا ۔

اس کے بعد اطلاع ملی کہ مسٹر رشبرک ولیمز رات کو مہاراجہ کے ساتھ ڈنر کھانے کے لیے آئے تو آپ نے کہا کہ پوسٹروں وغیرہ کے متعلق سنٹرل اسمبلی میں سوالات دریافت کیے جانے والے ہیں ۔ مہاراجہ ڈنر پر ہی کرنل امریک سنگھ کو بلا کر پھر ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ اس پراپاگنڈے کو فوراً بند کر دیا جائے ۔

میں راجہ سر دیا کشن کو ٹیلیفون پر تمام حالات کی اطلاع دیتا رہتا تھا ۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ لاہور کے پوسٹر شائع کرنے اور اخبارات میں لکھنے والے دونوں حضرات روپیہ کی مزید قسطیں وصول کرنے کے لیے دہلی کے رائل ہوٹل میں مقیم ہیں اور صبح و شام کرنل امریک سنگھ کی زیارت کے لیے

Marfat.com

کنگڑ ہے سٹیشن تشریف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ اس روز شام کو جب گئے تو کرنل امریک سنگھ نے ان سے کہا: "فوراً واپس لاہور چلے جائیے ہمیں پراپاگنڈا کی ضرورت نہیں اور نہ ہم سے کبھی ملنے کے لیے تشریف لائیے۔" یہ دونوں حضرات بڑی امیدوں سے آئے تھے۔ اور شاید لاکھوں روپیہ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ حیران ہوتے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ان کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ دیوان سنگھ نے ایسا کیا ہو گا۔

سردیاکشن کول ان تمام حالات سے بیحد خوش ہوتے اور آپ نے لاہور جانے سے پہلے آخری روز ٹیلی فون پر فرمایا: "سردار صاحب! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا اور آپ کی قابلیت اور اخلاص کا پہلے سے ہزار گنا زیادہ مداح ہوں۔ اگر خدا نے موقع دیا تو میں آپ کے اس احسان کو اتارنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے ٹیلی فون پر ہی جواب دیا۔

"راجہ صاحب! میں آپ کی اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے اور میرے والد کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ باوجود ان تعلقات کے میں نے پنجاب کے اخبارات میں جب کہ میں ان کو ایڈٹ کرتا تھا۔ پٹیالہ کو بے نقاب کرتے ہوئے آپ کے خلاف بھی بارہا لکھا۔ اب آپ پٹیالہ سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور پرائیویٹ لائف میں ہیں۔ اگر میں اس سلسلہ میں آپ کی کوئی خدمت کی تو میں نے اپنے گزشتہ گناہوں کو دھویا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا خدا کرے کہ میں آئندہ بھی پرائیویٹ حیثیت سے آپ کی کبھی کوئی خدمت کر سکوں۔"

سردیاکشن کول نے اپنے دہلی کے اس قیام میں مہاراجہ پٹیالہ سے بھی مل کر غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی راہ میں مہارانا دھولپور مخل ہوتے۔ کیونکہ مہارانا دھولپور ہی سردیاکشن کو پٹیالہ سے علیحدہ کرانے میں شریک تھے۔ اس کے بعد کئی برس تک مہاراجہ پٹیالہ سردیاکشن سے نہیں ملے۔ والیان ریاست فطرتاً بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ کئی برس کے بعد جب پبلک ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر وائسرائے نے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تو مہاراجہ پٹیالہ نے سردیاکشن سے امداد کے لیے درخواست کی۔ سردیاکشن ریاستی قسم کے نمک حلال تھے۔ آپ نے پچھلے تمام حالات اور مہاراجہ کی زیادتیوں کو بھول کر اس کمیشن میں پھر امداد دی اور اس امداد کے باعث ہی مہاراجہ کو کوئی سزا نہ ملی۔

اس واقعہ کے بعد سردیاکشن کول کئی برس زندہ رہے۔ آپ سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا تو بہت محبت سے پیش آتے اور میں بھی ان کی اپنے بزرگوں کی طرح عزت کرتا۔ مرحوم میں بھی ریاستی اہل کاروں جیسی کمزوریاں ہوں گی اور تھیں۔ مگر آپ بہت خوبیوں کے انسان اور بہت مضبوط کیریکٹر کے بزرگ تھے جس کے دشمن ہیں اسے کچلے بغیر آپ کو صبر نہ آتا اور جس کے دوست اس کے لیے آنکھیں بچھا دیتے بہت فیاض۔ بہت بہادر۔ بہت بڑے سیاست دان اور بہت ہی مخلص۔ مرحوم مہاراجہ نابھہ راقم الحروف اور دوسرے دوستوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ "مہاراجہ پٹیالہ کی خوش نصیبی ہے کہ ان کے پاس سردیاکشن جیسا مشیر ہے اور میری بدنصیبی ہے کہ میرے پاس سردیاکشن کے پایہ کا کوئی آدمی نہیں۔"

Marfat.com

چنانچہ مہاراجہ نابھ نے گدی سے دست برداری کے بعد بھی راجہ سردیا کشن سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے چاہے اور مجھے منصوری وڈیرہ دون سے آپ کے پاس لاہور بھیجا۔ مگر راجہ سردیا کشن نے مہاراجہ نابھ کی اس خواہش کو لبیک کہنا مناسب نہ سمجھا۔

بھروسہ کا مستحق ہر شخص نہیں

کئی برس ہوئے بھگت سنگھ کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور پنجاب کے کالجوں کا ہر طالب علم اپنے آپ کو انارکسٹ سمجھتا تھا۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر مہاتما گاندھی اس زمانہ میں جرأت کے ساتھ اس تحریک کی علانیہ مذمت نہ کرتے تو یہ تحریک زیادہ زور پکڑتی۔ اس میں لوگ زیادہ شامل ہوتے۔ زیادہ وارداتیں ہوتیں۔ زیادہ مقدمات چلتے۔ زیادہ لوگ سرکاری گواہ بنتے اور زیادہ لوگوں کو پھانسیاں ملتیں۔ کیونکہ پنجاب کے لوگ فطرتاً کسی سازش کے اہل نہیں۔ یہ لوگ جتنی جلدی کسی سازش میں شامل ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ سرکاری گواہ بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پنجاب میں یہ مثل مشہور ہے کہ اگر وہاں کسی سازش میں بارہ ملزم ہوں تو تیرہ سرکاری گواہ بننے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں (یعنی یہ بارہ کے بارہ ملزم تو سرکاری گواہ بننے کے لیے تیار ہوتے ہی ہیں۔ ان کے قریب کے کسی پڑوسی کو سرکاری گواہوں کے بننے کی اطلاع ملے تو وہ بھی پولیس سے کہتا ہے کہ اسے سرکاری گواہ بنا لیا جائے) پنجاب کے لوگوں کی اس فطرت کا نتیجہ ہے کہ یہاں کبھی بھی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ اور پولیس کو سب کچھ پتہ چل جاتا ہے۔ حالانکہ بنگال میں کسی ایک سازش کا بھی کبھی انکشاف نہیں ہوا۔ اور وہاں اگر کوئی انارکسٹ پکڑا گیا تو اس نے سازش کے انکشاف کے خوف سے سائنیڈ آف پوٹاش کا زہر کھا کر فوراً ہی اپنی زندگی ختم کر لی۔

لارڈ ارون کی ٹرین کے نیچے جب بم رکھا گیا تو اس سے چند ماہ پہلے پنجاب کے کچھ نوجوان دہشت انگیزی یا انارکزم پھیلانے کی نیت سے دہلی آئے۔ اتنا بڑا اہم کام اور کالجوں سے نکلے ہوئے ناتجربہ کار نوجوان، کوئی رہبری کرنے والا نہیں۔ جیب میں پیسے نہیں اور فاقہ کشی تک ہو جائے بلند اور قربانی کے جذبات۔ یہ لوگ جب دہلی آئے تو دہلی کے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ کچھ لوگ ایک اہم کام کے لیے پنجاب سے آئے ہیں اور بہت محب الوطن ہیں، فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ دہلی سے قریب بہادر گڑھ یا بہادر گڑھ کے قریب مقیم ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے لیے کچھ روپیہ چاہیئے۔ میں نے اس شخص کو ایک سو روپیہ دے دیا اور تاکید کی کہ آئندہ مجھ سے ان لوگوں کی کسی مصروفیت کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ یہ شخص میرے اس جواب پر حیران تھا اور اس نے پوچھا کہ میں اتنی غیر دلچسپی کا اظہار کیوں کر رہا ہوں حالانکہ دوسرے لوگ ایسے واقعات کو کرید کرید کر پوچھتے اور دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ

Marfat.com

ایسی سازشوں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ بارہ ملزم ہوں تو تیرہ سرکاری گواہ بن جاتے ہیں میں نے روپیہ دیا ہے تو ان کے کسی فعل کے لیے نہیں بلکہ ان کی حب الوطنی اور ان کی تنگ دستی سے متاثر ہو کر۔ یہ صاحب روپیہ لے کر چلے گئے۔ اس کے بعد یہ آٹھویں، دسویں یا پندرھویں دن تشریف لے آتے اور ایک یا دو سو روپیہ لے جاتے اور باوجود اس بات کے کہ میں کوئی بات سننا نہ چاہتا۔ مگر ان کو صبر نہ آتا۔ یہ کچھ نہ کچھ حالات سنا ہی جاتے۔

یہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ یہ نوجوان ملنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں ایڈیٹر "ریاست" کے لیے بہت عزت و احترام ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں ان کی عزت و محبت کا شکر گزار ہوں مگر ملنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں محتاط ہوں۔ نہ معلوم ان لوگوں میں سے کون کون اور کب سرکاری گواہ بنے اور کیا کیا بیان دے۔ میں کسی صورت میں بھی ان سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا میرے دل میں ان کے حب الوطنی کے جذبات کی قدر ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں کہ جب کبھی ان کو مالی مشکلات ہوں۔ یہ کسی آدمی کو بھیج دیا کریں۔ مجھ سے جو کچھ ممکن ہو سکے گا۔ میں ان کی نذر کر دوں گا۔ اس سے زیادہ کسی قسم کا تعلق رکھنا میرے بس کا کام نہیں۔ اس کے بعد یہ صاحب اکثر آتے رہے اور روپیہ لے جاتے رہے۔ ایک روز تشریف لائے تو انہوں نے کہا۔ کہ کار کی ضرورت ہے۔ میں اپنی کار دے دوں۔ میں نے پوچھا۔ کیا ضرورت ہے تو انہوں نے کہا۔ کہ وہ نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں اپنی کار نہیں دے سکتا اور نہ ان کی مصروفیات کے متعلق کوئی بات سننا چاہتا ہوں اور مذاقاً کہا۔ کہ اگر کار کی ہی ضرورت ہو تو ان میں سے کوئی صاحب کار چلا سکتے ہوں تو شام کو سینماؤں کے سامنے درجنوں کاریں لاوارث کھڑی ہوتی ہیں کسی ایک کار کو لے سکتے ہیں۔ انارکزم کے مقابلہ پر چوری کون سا بڑا جرم ہے۔ انارکزم کے لیے تو پھانسی کی سزا ہے۔ چوری کے لیے زیادہ سے زیادہ دو سال قید ہو گی اور پھر چوری بھی چوری کی نیت سے نہیں میرے اس مذاق کے بعد ان صاحب نے کار کے لیے پھر بار بار کہا مگر میں نے انکار کر دیا اور اپنے وہی الفاظ دہرائے۔ کہ میں تم لوگوں کی مصروفیات کے متعلق نہ تو کوئی بات سننا چاہتا ہوں نہ کوئی حصہ لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر تم لوگوں نے کچھ کیا تو نہ معلوم تم میں سے کون کون سرکاری گواہ بنے گا۔ کیا کیا بیان دو گے اور کس کس کو پھانسی پر لٹکواؤ گے۔

ان واقعات کے بعد ایک روز صبح کا وقت تھا۔ کہ غالباً دسمبر کا مہینہ۔ بہت سخت سردی تھی اور چاروں طرف کہر ہی کہر تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہ آتا تھا۔ میں صبح اٹھ کر غسلخانہ میں گیا۔ واپس آیا۔ تو مسٹر سری کرشن آف ایسوسی ایٹڈ پریس کا ٹیلیفون آیا۔ کہ ابھی آدھا گھنٹہ ہوا پرانے قلعہ کے پاس لارڈ ارون کی ٹرین کو بم کے ذریعہ اڑانے کی کوشش کی گئی مگر چونکہ کہر زیادہ تھی خوش قسمتی سے نشانہ درست نہ لگا۔ اور وائسرائے بچ گئے۔ مسٹر سری کرشن نے تو دوستانہ طور پر اطلاع دی اور جب بھی کوئی بہت اہم خبر ہوتی تو آپ ٹیلیفون پر مجھے بتا دیا کرتے مگر میرے لیے یہ خبر خلاف توقع نہ تھی میں

Marfat.com

سمجھ گیا۔ کہ یہ پنجاب کے ان نوجوانوں کی مصروفیت کا ہی نتیجہ ہے۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے۔ ان انارکسٹ لڑکوں میں سے کچھ تو گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ ابھی گرفتار نہ ہوئے تھے۔ مجھے اس زمانہ میں سینما کا بہت شوق تھا۔ مفت کے مستقل پاس تھے اس زمانہ میں سینماؤں والے ایڈیٹران اخبارات کو مستقل پاس دیا کرتے تھے کہ جب بھی چاہو چلے آؤ۔ آجکل یہ لوگ صرف ایک شو کے لیے پاس جاری کرتے ہیں۔ جو دوبارہ استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پھر جانا ہو تو پھر نیا پاس حاصل کیا جاتا ہے۔ میں اب ایک عرصہ سے پاسوں سے سینما دیکھنا کچھ معیوب سا سمجھتا ہوں۔ ٹکٹ خرید کر ہی سینما دیکھتا ہوں اور میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے دفتر کا کوئی شخص بھی پاس لے کر سینما نہ دیکھے کیونکہ جس صورت میں کہ ہم فلم والوں سے اشتہارات کی اجرت لیتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان سے پاس طلب کیے جائیں۔ میں کوئی فلم نہ چھوڑتا تھا بلکہ بعض فلموں کو تو دو دو بار دیکھتا۔ میں نولکھا کے پاس میجسٹک سینما میں اوپر آخری اور کنارہ کی ایک کرسی پر بیٹھا فلم دیکھ رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ باہر سے کوئی شخص آ کر میرے پاس کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے اس شخص کو دیکھا تو یہ سردار کرم سنگھ انسپکٹر سی آئی ڈی تھے جو بعد میں سردار بہادر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ یہ چونکہ باہر روشنی میں سے آئے تھے۔ سینما میں اندر پہنچے تو ان کو بیٹھے ہوئے لوگ نظر نہ آتے تھے۔ اور یہ وہاں بیٹھے لوگوں کو اپنی آنکھوں پر زور دے کر غور کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے جب سردار کرم سنگھ کو دیکھا۔ کہ یہ اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہے ہیں تو میری ہنسی نکل گئی اور میں نے طنزاً کہا۔ سردار جی کس شکار کی تلاش میں ہو۔ سردار کرم سنگھ میرے واقف تھے اور واقفیت کی یہ صورت تھی کہ یہ میری تلاشیوں اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں متعدد بار میرے مکان پر تشریف لا چکے تھے۔ اور اس کے بعد جب ملتے ست سری اکال ہو جاتا۔ شکار کے الفاظ سن کر یہ میری ساتھ والی کرسی پر ہی بیٹھ گئے اور میرے طنز کا انہوں نے طنز میں ہی جواب دیا۔

ٹھیک ہے۔ شکار ہم کریں اور روپیہ تم دو۔

میں نے کہا۔ سردار جی میں آپ کے ان الفاظ کو سمجھ نہ سکا۔ کہ روپیہ کس کو دیا۔ اس پر سردار کرم سنگھ نے کہا۔ ہمارے پاس ایک شخص کا بیان موجود ہے کہ وہ ان انارکسٹوں کے لیے آپ سے روپیہ لاتا رہا جنہوں نے وائسرائے کی ٹرین کو اڑانے کی کوشش کی۔ میں نے بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے کہا کہ اگر پولیس کے گواہ ایسے ہی معتبر ہیں تو گورنمنٹ کی تباہی میں کوئی شک نہیں ہم سینما بھی دیکھتے جاتے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں ظاہرا طور پر تو ان کے گواہوں کا مذاق اڑا رہا تھا اور مصنوعی ہنسی کے ساتھ ان پر اس بات کا اظہار کر رہا تھا۔ کہ میں قطعی بے خبر اور لاعلم ہوں مگر باتوں باتوں میں سردار صاحب کو کرید کرید کر پوچھتا تھا کہ مزید حالات کیا ہیں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ پولیس کے پاس میرے متعلق اور مواد کیا ہے۔ سردار کرم سنگھ سے معلوم ہوا کہ ان نوجوانوں کی جب گرفتاریاں شروع ہوئیں تو وہ حضرت بھی گرفتار ہوئے جو مجھ سے روپیہ لے جایا کرتے تھے گرفتار

Marfat.com

کیے جانے کے بعد یہ مسٹر پیل، سپرنٹنڈنٹ پولیس دیہ افسر یوپی پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وہاں سے وائسرائے کی ٹرین کو اڑانے والے سازش کے مقدمہ کی تحقیقات پر خاص طور سے لگائے گئے اور تحقیقات کے سلسلہ میں سپیشل ڈیوٹی پر کئی ماہ دہلی میں رہے) کے سامنے پیش کیے گئے۔ تو مسٹر پیل نے پولیسانہ آنکھیں دکھاتے ہوئے ان سے کہا کہ ملزموں کے کٹہرہ میں آنا چاہتے ہو یا بطور سرکاری گواہ کے دونوں میں سے کس کو انتخاب کرتے ہو۔ مسٹر پیل کے یہ الفاظ سن کر یہ حضرت گھبرا گئے اور رو پڑے اور انہوں نے کہا کہ ان کو ملزم نہ بنایا جائے۔ یہ تباہ ہو جائیں گے اور سرکاری گواہ بھی نہ بنایا جائے۔ سرکاری گواہ بننے کی صورت میں یہ آئندہ پبلک میں بھی کھڑے نہ ہو سکیں گے۔ یہ تمام حالات من وعن راز میں بتا دیتے ہیں اور گرفتاریوں میں بھی امداد دیں گے۔ ان کو ملزموں یا گواہوں میں نہ رکھا جائے۔ چنانچہ اس بات چیت کے بعد انہوں نے تنیس صفحہ فل سکیپ سائز کے کاغذ پر اپنا بیان دیا ہے اور اس بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایڈیٹر "ریاست" سے ملزموں کے لیے روپیہ لاتا رہا۔ جس سے ان کے کھانے پینے کے اخراجات چلتے تھے۔ میں نے سردار کرم سنگھ سے جب یہ حالات سنے تو مجھے معلوم ہو گیا کہ معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔ میں نے مزید کرید نے کے لیے تمام واقعات کا پھر مذاق اڑاتے اور فرضی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا کہ اگر آپ کے پاس یہ بیان موجود ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" نے ان انارکسٹوں کو روپیہ دیا تو آپ نے ایڈیٹر "ریاست" کو گرفتار کیوں نہ کیا۔ اس کے جواب میں سردار کرم سنگھ نے کہا کہ یہ شہادت کافی نہ تھی۔ صرف ایک آدمی کی شہادت مقدمہ کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ اس شخص نے بتایا ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" سوائے ذاتی اخراجات کے اور کوئی امداد دینے یا حصہ لینے کے لیے تیار نہ تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ بیان گرفتاری یا مقدمہ چلانے کے لیے کافی نہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد کا ذکر ہے۔ رات کے بارہ بجے تھے اور میں ابھی کام کر رہا تھا۔ ایک بنگالی نے نیچے کا دروازہ آ کر کھٹکھٹایا۔ ملازم نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا وہ دیوان سنگھ سے ملنا چاہتا ہے۔ ملازم میرے پاس اوپر آیا اور اس نے بتایا۔ کہ ایک شخص ننگے سر جو بدراسی یا بنگالی معلوم ہوتا ہے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ پوچھو نام کیا ہے وہ اس وقت کیوں ملنا چاہتا ہے اور کام کیا ہے؟ ملازم نے پوچھا تو اس نے کہا۔ کہ وہ نام بتانا نہیں چاہتا مگر ایک بہت ضروری کام ہے۔ وہ ملنے پر بتائے گا کہ کیا کام ہے اور کیا نام ہے۔ اگر کوئی شخص اپنا نام بھی نہ بتائے تو میں ملنے سے انکار کر دیا کرتا ہوں اور اکثر ایسا ہوا کہ نہیں ملا۔ کیونکہ جو شخص اپنا نام بھی نہ بتائے اس کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کا وقت ضائع کرے مگر چونکہ رات کے بارہ بجے تھے۔ میں یہ سمجھا۔ کہ شاید کسی ریاست سے کوئی شخص پوشیدہ طور پر آیا ہوا اور وہاں کے مظالم بتانا چاہتا ہو۔ میں نے اس کو بلا لیا اور پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ کلکتہ کا رہنے والا ایک انارکسٹ ہے۔ پنجاب کے ببر اکالیوں (سکھوں میں ببر اکالی تحریک شروع ہوئی تھی جس کا کام پولیس کے افسروں اور سرکاری گواہوں کو قتل کرنا تھا) سے ملنے کے لیے امرتسر جا رہا ہے۔ اس کے پاس اخراجات ختم ہو گئے ہیں اور اس کو ایک

Marfat.com

سو روپیہ کی ضرورت ہے میں ایسے لوگوں کے متعلق بہت محتاط رہا ہوں اور ہر شخص کے متعلق یہ سوچ لیتا ہوں کہ اگر یہ سرکاری گواہ بنا تو مجھے کس حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں نے اس پر سوال کیا کہ تم کو دیوان سنگھ کے متعلق علم کیوں کر ہوا کہ وہ اس مکان میں رہتا ہے اور وہ تمہیں روپیہ دے گا۔ اس نے جواب دیا کہ کلکتہ میں وہ سردار نرنجن سنگھ طالب (جو مرحوم مہاراجہ نابھہ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے جس پر مسٹر سبھاش چندر بوس سے تعلق رکھنے کا الزام تھا اور جو پانچ سال تک مختلف جیلوں میں رکھے جانے کے بعد رہا ہوئے) سے ملا کرتا تھا اور ایڈیٹر "ریاست" کے متعلق وہاں اکثر ذکر آیا کرتا تھا۔ میں نے پھر سوال کیا کہ کیا دہلی میں کسی شخص کو جانتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ کہ ہاں لالہ شنکر لال ٹراپیکل انشورنس والوں کو، مسٹر آصف علی کو اور مولانا عارف ہسوی کو۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تمہیں جانتا نہیں کہ تم کون ہو آیا انارکسٹ ہو یا سی آئی ڈی کے ملازم ہو اگر تم انارکسٹ ہو تو مجھے تمہارے انارکزم سے کوئی تعلق نہیں میں بطور انسان کے ایک دوسرے ضرورت مند انسان کی امداد کر سکتا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے اور میں ہمیشہ کرتا ہوں مگر اس خیال سے کہ یہ امداد غلط طریقہ پر ضائع نہ ہو آپ ان تینوں اصحاب میں سے کسی ایک کے پاس چلے جائیے اور مجھے ٹیلیفون کرا دیجئے۔ کہ وہ آپ کو جانتے ہیں میں آپ کو روپیہ دے دوں گا مگر بغیر واقفیت کے نہیں دے سکتا۔ یہ بنگالی حضرت چلے گئے اس کے بعد نہ یہ واپس آئے اور نہ کوئی ٹیلیفون آیا۔ میرا یقین ہے کہ یہ شخص سی آئی ڈی کے لوگوں میں سے تھا یا سی آئی ڈی والوں کا بھیجا ہوا تھا۔

ان حالات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو امداد دینے میں کوئی ہرج نہیں بلکہ یہ ہر انسان کا فرض ہے اور میں اسے خوش نصیب سمجھتا ہوں جس کا محنت سے پیدا کیا ہوا روپیہ دوسرے لوگوں کے کام آئے۔ اس کے علاوہ میری رائے میں ہماری ہمدردی اور امداد کا ہر وہ شخص مستحق ہے جو محب وطن ہے۔ اور ملک کی خدمت کرتا ہے مگر ہر چمکنے والی شے کو سونا سمجھنا۔ احتیاط نہ کرنا۔ ہر شخص پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ شامل ہو جانا بالکل ایسا ہے جیسے اپنے گلے میں خود ہی پھانسی کی رسی ڈال لی جائے چنانچہ میں اگر روپیہ لے جانے والے بنگالی پر زیادہ اعتماد کرتا اور بے تعلق نہ رہتا تو یہ غیر ممکن نہ تھا۔ کہ مجھے بھی ملزموں کے ساتھ شامل کر لیا جاتا۔

میں جب فیروزپور جیل میں نظر بند تھا اور سنٹرل اسمبلی میں میری گرفتاری اور نظر بندی کے متعلق سوالات دریافت کیے گئے تو ہوم ممبر نے ایڈیٹر "ریاست" کی گرفتاری کی وجوہ بیان کرتے ہوئے جواب دیا تھا کہ ایڈیٹر "ریاست" چونکہ فطرتاً اور عادتاً انقلاب پسند ہے اس لیے اس کو نظر بند کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہوم ممبر کا اسمبلی میں یہ جواب غالباً پولیس کی اس قسم کی بنیادوں پر ہی تھا۔ کیونکہ پولیس کے لیے مبالغہ آمیزی اور ایک پیسہ کو ایک روپیہ میں بدل دینا تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ مگر میری رائے ہے ابتدا شروع سے یہ رائے ہے کہ انارکزم ہندوستان کی آزادی کے لیے مفید نہیں۔ اگر انارکزم کی سپرٹ ملک میں پیدا ہوتی تو گورنمنٹ اس کو آسانی کے ساتھ کچل سکتی تھی۔ بے ہتھیار لوگوں کے لیے آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے عدم تشدد جسے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا۔

Marfat.com

طوائف کی ناقابلِ تبدیل فطرت

ریاست اودے پور میں ایک جاگیر ناتھ دوارہ ہے۔ جس کے جاگیردار مہنت دامودر داس تھے۔ یہ مہنت عمر میں پینتیس برس کے ہوں گے۔ شادی شدہ ایک جوان لڑکی اور چار پانچ برس کا ایک لڑکا جسے جاگیر کے ولی عہد ہونے کا حق حاصل تھا۔ ان کی اولادیں تھیں۔ ناتھ دوارہ کی اس جاگیر یا گدی کی سالانہ آمدنی پندرہ سولہ لاکھ روپیہ کی ہے۔ اس کے علاوہ کروڑوں روپے کے زیورات اور جواہرات موجود ہیں جو معتقدین نے اس گدی کو نذر کیے اور ہر سال ہزارہا کی تعداد میں زائرین اس گدی اور گدی کے وارث مہنت صاحب کی زیارت کے لیے ناتھ دوارہ پہنچتے ہیں۔

کئی برس ہوئے ناتھ دوارہ میں سالانہ مذہبی اُتسو (تقریب) تھا۔ ہزارہا کی تعداد میں زائرین جمع ہوتے۔ کاٹھیاواڑ اور بمبئی تک سے لوگ آئے۔ مہنت دامودر داس جی نے اس اُتسو پر ٹھاکر جی کے سامنے رقص کرنے کے لیے حسبِ دستور مختلف مقامات سے کچھ طوائفیں بھی بلائیں۔ ان طوائفوں میں دہلی کی ایک مشہور طوائف ہنسا بھی تھی۔ ہنسا کی عمر اس وقت چالیس پینتالیس برس کی ہو گی یعنی مہنت دامودر داس جی سے آٹھ دس سال بڑی تھی۔ طوائفیں اپنے شباب کو قائم رکھنے کے اعتبار سے بہت محتاط ہوتی ہیں مگر دھوئیں کے باعث سیاہ ہو چکی دیوار پر سفیدی کے جتنے بھی کوٹ چاہو کر لو۔ سیاہی کا بالکل چھپنا ممکن نہیں۔ یہ سیاہی ضرور ظاہر ہو گی۔ چاہے مٹیالے یا ہلکے سرخی نما رنگ میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہنسا کے کافی "میک اپ" کرنے کی صورت میں بھی اس کے چہرہ کی جھریاں اس کے بڑھاپے کی بدگوئی کرنے سے باز نہ آتی تھیں۔

مہنت دامودر داس بہت ہی مخلص اور سادہ وسیدھے شخص تھے بلکہ ان کی سادگی بے وقوفی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے جب ہنسا بائی کو دیکھا تو ان کے دل پر ہنسا بائی کا کچھ اثر سا ہوا۔ اس اثر کو ہنسا بائی نے محسوس کیا تو اس نے اپنے طوائفانہ ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہوئے دامودر داس جی کو مزید بے وقوف بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنسا بائی مستقل طور پر ناتھ دوارہ میں ہی رکھ لی گئیں۔

ہنسا بائی جب ناتھ دوارہ میں مقیم ہوئی تو اس پر لوگوں میں چرچا ہوا۔ مہنت پر بدچلنی کے الزامات لگنے شروع ہوئے اور مہارانا اودے پور نے بھی اعتراض کیا تو مہنت صاحب کے عشق میں اس مخالفت کے باعث اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ عشق و محبت کے معاملہ میں انسانی فطرت ہے کہ جوں جوں مخالفت اور رسوائی ہو۔ انسان اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قدم جماتا ہے اور عزت و دستار کی قربانی پر نازاں ہوتا ہے۔ آخر جب اس مخالفت نے بہت ہی زور پکڑا تو مہنت صاحب ہنسا بائی کے ایما سے دہلی تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے پرتھوی راج روڈ پر ایک کوٹھی کرایہ پر لی۔ ہنسا سے شادی کر لی اور ہنسا کے پچھلے تمام دوست آشنا، ملنے والے، میراثی، سارنگیئے اور اس کے رشتہ دار دامودر داس پر مکھیوں کی طرح گر پڑے۔

Marfat.com

ناتھدوارہ کے روپیہ کو لوٹنے کی وسیع سازش ہوئی۔ مہنت صاحب دہلی پہنچنے سے پہلے آٹھ دس لاکھ کے قریب ہنسا اور ہنسا کے والدین کو دے چکے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد کوشش یہ تھی کہ ناتھدوارہ کے ٹھاکر صاحب کے کپڑے بھی اتار کر ٹھاکر صاحب کی موتی کو بالکل ننگا کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سازش میں مقامی سناتن دھرم کے ایک لیڈر بھی شامل تھے جن کا کام یہ تھا کہ یہ مہنت دامودر داس اور ہنسا سے روپیہ لے کر ان دونوں کے تعلقات کو مذہبی اعتبار سے جائز و باعث سعادت قرار دیں۔

دامودر داس جی کے دہلی پہنچنے پر ان کے متعلق یہاں موافق و مخالف دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ان دونوں گروہوں کا مقصد یہ تھا کہ مہنت سے روپیہ حاصل کیا جائے۔ ایک گروہ اس بات کا مدعی کہ مہنت صاحب نے اچھا کیا کہ ایک طوائف سے شادی کی اور آپ ایک طوائف کو راہ راست پر لانے والے ریفارمر ہیں۔ دوسرا گروہ اس بات کا دعویدار کہ مہنت صاحب بدچلن ہیں۔ انہوں نے ناتھدوارہ کی گدی کو پلید کیا اور ان کو گدی سے علیحدہ کر کے ان کی تمام جائیداد اور آمدنی بحق پبلک یا بحق ریاست اودے پور ضبط کر لی جائے۔ ان دونوں فریقوں کے ساتھ بعض اخبارات بھی شامل تھے۔ دامودر داس کے حمایتی اور مخالف حضرات میں کئی اصحاب ایڈیٹر "ریاست" کے بھی دوست تھے۔

جب یہ مخالفت زوروں پر تھی اور مہنت دامودر داس بہت پریشان تھے تو ایک دوست جو جوہری تھے میرے پاس تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ مہنت دامودر داس مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا کام ہے تو انہوں نے بتایا کہ کچھ مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ صاحب ایک دوست کا پیغام بھی لائے جو دہلی میں بہت با اثر اور ایک بہت معزز خاندان کے رکن تھے۔ میں نے ان سے شام کو آنے کا وعدہ کیا۔ میں شام کو چھ بجے کے قریب پرتھوی راج روڈ پر مہنت صاحب کی کوٹھی گیا۔ مہنت صاحب منتظر تھے۔ بہت بڑی کوٹھی۔ سامنے اور پچھلی طرف بہت وسیع صحن۔ درجنوں کمرے۔ مہنت صاحب۔ مہنت صاحب کی پہلی بیوی۔ پہلی بیوی سے جوان لڑکی۔ چھوٹا بچہ۔ ہنسا بائی۔ ہنسا کی ماں، بہنیں، رشتہ دار، میراثی، سارنگیے، استاد جی اور ملازم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاٹھیاواڑ کے کوئی بڑے والیٔ ریاست اپنے تمام خاندان اور سٹاف کے ساتھ مقیم ہیں۔ میں جب پہنچا۔ تو مہنت صاحب مجھے اپنے کمرہ میں لے گئے۔ اس کے بعد ہنسا بائی بھی وہاں آ گئیں اور باتیں شروع ہو گئیں۔ مہنت صاحب نے لوگوں کی مخالفت کا گلہ کرتے ہوئے کہا:۔

"سردار صاحب! دیکھئے۔ کیا میں نے بُرا کام کیا ہے جو ایک طوائف کی زندگی سدھار دی۔ میں نے لوک لاج کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ایسی مثال قائم کی جس کی کسی بڑے سے بڑے ریفارمر سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا یہ مخالفت جائز ہے۔ مجھے ہنسا بائی جی سے پریم تھا۔ میں نے شادی کر لی۔ اب میری جاگیر کو ضبط کرانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ میں نے آپ کی اور آپ کے اخبار کی بہت تعریف سنی ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دی کہ آپ

Marfat.com

سے مشورہ کروں۔"

میں اس کے متعلق کیا جواب دیتا۔ میں نے یہی کہا کہ اگر آپ لوگوں کے درمیان فی الحقیقت محبت ہے اور یہ عارضی جذبات کا نتیجہ نہیں تو آپ نے شادی کرکے اچھا کیا۔ اور چاہے آپ کو گدی سے الگ ہونا پڑے۔ آپ کو اس پر قائم رہنا چاہیئے اور اگر آپ نے عارضی جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کیا تو اسے اصلاح نہیں کہا جا سکتا۔ آپ اپنی گدی کو بھی رسوا کرنے کا باعث ہوئے۔ مہنت صاحب نے پھر زور دے کر کہا۔ کہ اس شادی کا باعث خالص طور پر محبت ہے۔ ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں اور میں واپس آنے والا تھا تو ہنسا بائی باتیں کرنے کے لیے مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ مہنت صاحب کی پہلی بیوی سے بالکل ملحقہ تھا مگر اس کمرہ کی آواز اس کمرہ میں نہ جا سکتی تھی۔ ہنسا نے جب باتیں شروع کیں تو اسی طوائفانہ انداز سے جو اس کی فطرت تھی۔ جسم کے ہر حصہ کو حرکت دینا۔ بات بات میں مسکرانا۔ تکلف، نمائش حسن اور سیمابیت وغیرہ۔ اس کی باتوں کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کے فلاں دوست کا دوست ہوں اور اس کے فلاں ملنے والے سے میرے تعلقات ہیں اور یہ مظلوم ہے اور ہمدردی کی مستحق ہے وغیرہ۔ جب ہنسا یہ باتیں کر رہی تھی۔ تو میں نے اس کے ذہن کی کیفیت معلوم کرنے اور تمام حالات کی درست و صحیح پوزیشن سمجھنے کے لیے اس سے سوال کیا۔

"تم نے اب تک اس الّو سے کتنا روپیہ حاصل کیا اور کیا یہ گدھا تمہارے پنجہ سے نکل تو نہ جائے گا؟"

میرے اس سوال کا جو جواب ہنسا نے دیا اس نے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے اور وہ الفاظ مجھے اب تک یاد ہیں۔ اس نے کہا۔

"کیا آپ مجھے اتنی بے وقوف سمجھتے ہیں کہ میں اس حرام زادہ کو اپنے چنگل سے نکلنے دوں گی اس کا خیال تک بھی نہ کیجئے۔"

مہنت وامودرداس تو اپنے آپ کو ریفارمر سمجھ رہے ہیں۔ لاکھوں روپیہ اور وہ عزت جو کروڑو روپیہ صرف کرنے پر بھی نہ مل سکے۔ اس طوائف کی نذر کر دی۔ گدی سے اتر نے والے ہیں اور جگہ جگہ سے آپ کے خلاف بدچلن اور عیاش ہونے کے فتوے دیئے گئے۔ مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔ تاکہ آپ "عشق و محبت" کی لاج رکھ سکیں۔ مگر ادھر ہنسا طوائف۔ جس کے لیے آپ نے یہ سب کچھ کیا۔ آپ کو بے وقوف سمجھ کر گندی گالیوں کا نشانہ بنا رہی ہے۔

ہنسا سے باتیں کرکے میں واپس اپنے دفتر چلا آیا۔ دفتر پہنچ کر میں نے مہنت صاحب کو ایک خط لکھا کہ آپ کے عشق اور بے وقوفی میں کوئی فرق نہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ اگر اپنی عزت کی پروا نہیں کرتے تو کم از کم اپنی پہلی بیوی اور جوان لڑکی کی عزت کی پروا ضرور کیجئے جو میراثیوں اور سازنگیوں کی فضا میں ہیں اور اس عشق بازی کو چھوڑ کر واپس ناتھ دوارہ چلے جائیے۔ مہنت صاحب نے نہ تو میرے اس خط کا کوئی جواب دیا۔ نہ غالباً کوئی پروا کی اور شاید یہ خط آپ نے ہنسا کو ہی دے دیا ہو۔ یہ معاملہ

Marfat.com

ان کا پرائیویٹ تھا۔ اس میں کسی اخبار کو دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا۔ میں نے اس کے متعلق "ریاست" میں لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ صرف ایک نوٹ شائع ہوا۔ کہ ناتھ دوارہ کے انتظام کے لیے ذمہ دار اور دیانت دار اصحاب کی کمیٹی بنائی جانی چاہیئے۔ تاکہ یہ مذہبی وقف تباہ نہ ہو۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ریاست اودے پور کے حکم سے مہنت صاحب کو ناتھ دوارہ سے روپیہ ملنا قطعی بند ہو گیا۔ مہنت صاحب کے لیے تنگ دستی کے دن آ گئے۔ جو روپیہ تھا ختم ہو چکا۔ جواہرات اور زیورات نصف اور چوتھائی قیمت پر جوہریوں کی دکانوں میں پہنچ گئے۔ قرض خواہوں نے بار بار آنا شروع کیا۔ مہنت صاحب بیمار ہو گئے۔ اچھی طرح سے علاج بھی نہ ہوا۔ بیماری کی حالت میں ہی اودے پور گئے۔ وہاں آپ کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ کے انتقال کے بعد ہنسا بائی یعنی مہنتنی صاحبہ نمبر ۲، اودے پور سے واپس دہلی تشریف لائیں اور دہلی سے واپس اپنے خاندانی اڈہ پر یعنی اپنے وطن المورڑہ چلی گئیں۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ طوائفیں لوگوں کو کیوں کر الو بناتی ہیں۔ ناواقف لوگ اپنی بے وقوفی کو کیوں کر عشق و محبت قرار دیتے ہیں اور طوائفوں کے لیے چاہے لاکھوں روپیہ کی قربانی کی جائے۔ ان کی نگاہوں میں قربانی کرنے والے احمق اور بے وقوف ہی رہتے ہیں۔

خواب و خیال

میرے والد کا جب انتقال ہوا تو میری عمر صرف چالیس روز کی تھی اور مجھ سے بڑے ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ہندوؤں یا سکھوں میں عورت کے لیے بیوہ ہونا بہت بڑی مصیبت ہے اور جس صورت میں کہ چھوٹے چھوٹے بچے یتیم رہ جائیں یہ مصیبت ناقابلِ برداشت حد تک تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میری والدہ اس غم کے باعث دن رات روتی رہتیں۔ ایک روز میری والدہ نے خواب میں میرے والد کو دیکھا۔ والد نے کہا کہ "رویا نہ کرو۔ میں حافظ آباد کے قریب موضع چویاں کے ٹھٹھہ میں فلاں شخص کے گھر فلاں تاریخ کو پیدا ہوں گا۔ وہاں صرف دو ماہ رہوں گا۔ پھر میری مکتی (نجات) ہو جائے گی جو سامان جہلم (جہاں میرے والد ڈاکٹر تھے) سے لایا گیا ہے۔ اس سامان میں ایک بڑا بکس ہے اس بکس کے اندر ایک چھوٹی صندوقچی ہے۔ اس صندوقچی کے خانہ میں سو روپیہ کا ایک نوٹ اور پندرہ روپیہ کی ایک رسید پڑی ہے۔ یہ رسید لالہ جوتی رام کپور کو دے کر پندرہ روپیہ منگا لیجئے۔"

میری والدہ نے اس خواب کا ذکر میری دادی سے کیا۔ دادی بھی خواب سن کر رونے لگ گئیں۔ انہوں نے دادا سے کہا۔ دادا بہت عبادت گزار سکھ تھے۔ اور خوابوں پر یقین نہ رکھتے تھے انہوں نے کہا۔ کہ خواب ہر شخص کو ہر روز آتے ہیں۔ ان کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ میری والدہ نے سامان میں سے لکڑی کے بکس کو کھولا۔ اس میں سے صندوقچی نکالی۔ والدہ کو اس صندوقچی کا کوئی علم نہ تھا کیونکہ

Marfat.com

سامان کو جہلم سے لانے کا انتظام میرے چچا سردار بھگوان سنگھ نے کیا تھا۔ اس صندوقچی کو کھولا۔ تو اس کے خانہ میں ایک سو کا نوٹ اور پندرہ روپیہ کی ایک رسید موجود تھی۔ میری والدہ نے میرے بھائی کے ہاتھ یہ رسید لالہ جوتی رام کپور کو بھیجی تو لالہ جوتی رام کپور نے میرے بھائی کو اس رسید کے پندرہ روپے دیدیئے۔ یہ رسید "سراج الاخبار" (جو اس زمانہ میں جہلم سے نکلتا تھا) کے دفتر کی تھی۔ لالہ جوتی رام اس اخبار کے خریدار تھے اور میرے والد نے لالہ جوتی رام کے حساب میں "سراج الاخبار" والوں کو پندرہ روپے دیئے تھے۔ میری والدہ کو نہ تو اخبار کا علم تھا نہ رسید کا اور نہ اس صندوقچی کا۔ مگر خواب کے مطابق تمام واقعات درست نکلے۔ میری والدہ نے میری دادی کی معرفت دادا سے کہلوایا۔ کہ جویاں کے ٹھٹھہ جاکر معلوم کرنا چاہیئے کہ فلاں شخص کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوا یا نہیں۔ میرے دادا نے جانے یا آدمی بھیجنے سے انکار کر دیا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ تو میرے دادا ایک مقدمہ کی پیشی کے لیے گوجرانوالہ گئے۔ اس زمانہ میں نہ ریل تھی نہ ٹانگے تھے۔ لوگ گھوڑوں پر جایا کرتے۔ دادا بھی گھوڑے پر گوجرانوالہ گئے اور تین چار روز حافظ آباد سے غیر حاضر رہے۔ ان کی غیر حاضری میں میری والدہ نے میری دادی اور میرے چچا کو ساتھ لیا اور یہ تینوں جویاں کے ٹھٹھہ (جو حافظ آباد کے قریب ہی ہے) گئے۔ وہاں اس شخص کے گھر پہنچے جس کا نام خواب میں بتایا گیا تھا۔ تو وہاں کی عورتوں نے بتایا کہ ہاں فلاں تاریخ کو لڑکا پیدا ہوا۔ جو دو ماہ زندہ رہ کر مر گیا۔ میری والدہ وغیرہ یہ سن کر واپس آ گئے اور خواب کا ہر حصہ درست ثابت ہوا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میں مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں تھا۔ والدہ بھی وہاں تھیں۔ والدہ نے ایک روز صبح کہا کہ "پرمیشور خیر کرے۔ رات کو میں نے گوردیوی (میری ماموں زاد بہن) کو بُری حالت میں دیکھا ہے۔ اس کے بال کھلے ہیں اور رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تو گوردیوی نے کہا۔ کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔"

اس خواب کے بعد تیسرے روز گجرات (جہاں کہ یہ لڑکی بیاہی ہوئی تھی) سے خط پہنچا کہ گوردیوی کا شوہر انتقال کر گیا ہے۔ چنانچہ اس خط کے پہنچتے ہی والدہ ماتم پرسی کے لیے حافظ آباد روانہ ہوگئیں۔ میں نابھہ میں قید تھا۔ مہاراجہ کی گدی سے دست برداری کے بعد انگریزی ایڈمنسٹریشن نے مجھے وہاں گرفتار کر لیا تھا۔ میں وہاں غالباً اڑھائی ماہ رہا۔ والدہ چونکہ میری گرفتاری کے باعث بہت غمگین تھیں۔ میری بڑی بہن میری والدہ کو اپنے پاس لاہور لے آئیں تاکہ غم غلط ہو سکے۔ میں نابھہ سے کوئی خط بھی نہ لکھ سکتا تھا نہ مجھے خط مل سکتا تھا۔ ایک روز دوپہر کے وقت میری والدہ کی آنکھ لگ گئی تو وہ دفعتاً جاگیں اور انہوں نے میری بہن سے پوچھا۔ کہ "کیا دیوان سنگھ آ گیا ہے"۔ میری بہن نے کہا۔ نہیں ابھی تو نہیں آیا۔ والدہ نے کہا کہ "ابھی دیکھا۔ کہ دیوان سنگھ اس مکان سے باہر گلی میں آوازیں دے رہا ہے"۔ میری بہن نے تسلی دی اور کہا کہ چونکہ آپ کا خیال ہر وقت دیوان سنگھ کی طرف ہے

Marfat.com

اس لیے خواب دیکھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں ٹھیک اسی روز اور اسی وقت جب کہ والدہ نے خواب دیکھا نابھہ سے رہا کیا گیا۔ اور میں رہا ہونے کے بعد نابھہ سے سیدھا ڈیرہ دون مہاراجہ سے ملنے چلا گیا۔ ایک روز وہاں رہا اور تیسرے روز لاہور پہنچ گیا۔

میرے والد کے ایک چھوٹے بھائی سردار گورمکھ سنگھ کی بیوی یعنی میری چچی تھیں۔ ان کا نام مہری تھا یہ بچاری جوانی کے عالم میں ہی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا تھا جو بچپن میں ہی انتقال کر گیا۔ ان کے سوتیلے بیٹوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ اس لیے یہ بچاری اپنی زندگی کے دن گزارنے کے لیے مستقل طور پر اپنے میکے چلی گئیں۔ اور اپنے بھائی کے پاس چنیوٹ رہتی تھیں۔ چند سال کا ذکر ہے ایک روز میں دوپہر کو کام کر رہا تھا کہ مجھے دفعتہً اس چچی کا خیال آیا۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس سے پانچ سات سال پہلے تک مجھے اس بچاری کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا کیونکہ کئی برس سے نہ ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا نہ کوئی خط ملا۔ اور نہ کبھی کوئی اطلاع آئی۔ دوپہر کو کام کرتے ہوئے خلافِ توقع اس بچاری کا خیال آیا۔ اور اس خیال میں ہی تھا تو سوچنے لگا۔ کہ یہ بچاری کہتی ہوں گی کہ اس کے سسرال والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کبھی یہ بھی پوچھا ہو کہ یہ زندہ ہے یا مر گئیں۔ سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا۔ کہ اس چچی کو دو سو روپیہ بھیج دوں۔ کیونکہ غور کیا جائے تو میرے لیے یہ ایسی ہی قابلِ عزت ہیں جیسے میری والدہ۔ میں نے پھر اسی سے منی آرڈر فارم منگایا اور منی آرڈر فارم لکھنے لگا۔ تو خیال آیا۔ کہ شاید وہ آجکل چنیوٹ نہ ہوں کسی اور جگہ ہوں۔ اور پتہ درست بھی معلوم نہیں۔ کیونکہ صرف اتنا یاد تھا۔ کہ ان کے بھائی کا نام لالہ ہری چند کپور تھا۔ اور یہ کئی برس ہوئے چنیوٹ میں بزازی کی دکان کرتے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے خط لکھ کر پتہ دریافت کر لینا چاہیئے۔ پھر منی آرڈر بھیجا جائے۔ چنانچہ میں نے لالہ ہری چند کپور بزاز چنیوٹ کے پتہ پر خط لکھا کہ چچی صاحبہ کہاں ہیں۔ ان کا پتہ کیا ہے؟ میں ان کو کچھ روپیہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس خط کے لکھنے کے چھ سات روز بعد میرے پاس جواب پہنچا جس میں لکھا تھا کہ چچی ٹھیک اس روز اور اس وقت انتقال کر گئیں جس روز کہ میں منی آرڈر لکھنا چاہتا تھا اور میں نے چنیوٹ خط لکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اتنے برس کے بعد عین اس روز اور اس وقت اس چچی کا خیال کیوں آیا اور روحانیت کے ماہر اس کی وجہ کیا بیان کریں گے مگر میرا خیال ہے کہ شاید مرتے ہوئے اس بچاری کو اپنے سسرال کے لوگوں کا بھی خیال آیا ہو اور ان لوگوں میں سے اس نے مجھے بھی یاد کیا ہو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس یاد کا میرے ذہن پر بھی اثر ہوا۔

یہ چند واقعات خواب اور خیال کے متعلق ہیں جن کا ذاتی تجربہ ہوا۔ ان کے علاوہ میں نے جب کبھی خواب میں سانپ دیکھا تو چند روز کے بعد ہی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا اور اگر میں نے خواب میں سانپ کو ہلاک کر دیا تو دشمن کو شکست دی۔ اور سانپ بھاگ گیا۔ یا خواب میں سانپ نے مجھے کاٹ لیا تو دشمن نے مجھے نقصان پہنچایا۔ مجھے جب بھی کوئی تکلیف ہونے والی ہو۔ میرے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہو۔ دشمن مجھے نقصان پہنچانے کے لیے سوچ رہا ہو۔ یا میرے کسی عزیز دوست کو تکلیف ہو تو میں اپنے قلب پر ایک ناقابلِ بیان سا اثر محسوس کرتا ہوں جسے ڈیپریشن یا گھبراہٹ ہی کہنا چاہیئے۔

Marfat.com

چنانچہ میں کہہ دیا کرتا ہوں کہ کوئی نئی مصیبت پیش آنے والی ہے اور میرا اندازہ ہمیشہ ہی درست ثابت ہوتا ہے میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ قبل از وقت محسوس کرنے یا خوابوں کے بعد میں درست ثابت ہونے کی اصل وجہ کیا ہے اور اس میں روح کو دخل ہے یا نہیں۔ بہرحال میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ کوئی ایسا ذریعہ ضرور موجود ہے جس کے باعث ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے اور پیش آنے والے واقعات کا جس کے باعث پہلے سے احساس ہو جاتا ہے۔

والیانِ ریاست کا انتقام اور ریاستی عدالتیں

مرحوم مہاراجہ گورچرن سنگھ آف نابھہ (موجودہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے والد جو معزول و جلاوطن ہوئے اور جنہوں نے کوڈائی کنال (مدراس) میں چند سال ہوئے انتقال کیا) میں بہت سی خوبیاں اور بہت سی کمزوریاں تھیں۔ آپ بہت وطن پرست۔ برطانیہ کے سخت دشمن۔ علم دوست اور کٹ مرنے مگر پیچھے نہ ہٹنے والی شخصیت تھے۔ اور کمزوریوں کے اعتبار سے ان میں بھی وہ تمام نقائص تھے۔ جو والیانِ ریاست میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کی طبیعت میں انتقام کے جذبات بھی انتہائی صورت میں تھے۔ اور آپ دشمن کو کبھی معاف نہ کرتے۔

جب آپ ابھی ولی عہد تھے تو آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری نابھہ کے ایک رئیس سردار جنرل شیو دیو سنگھ مقرر ہوئے (جو پانچ چھ سال نابھہ کے وزیر اعظم رہے اور پٹیالہ یونین کے ایک منسٹر بھی تھے) جو مہاراجہ کے ولی عہدی کے زمانہ میں مہاراجہ کے ساتھ انگلستان بھی گئے۔ چنانچہ مہاراجہ نابھہ اور جنرل سردار شیو دیو سنگھ کے تعلقات کی کشیدگی کی ابتدا انگلستان میں ہی ہوئی۔ جب کہ مہاراجہ آپ پر ناراض ہو گئے اور آپ کو واپس ہندوستان بھیج دیا گیا۔

مہاراجہ ہیرا سنگھ کا انتقال ہوا اور مہاراجہ گورچرن سنگھ گدی پر بیٹھے تو سردار شیو دیو سنگھ ملازمت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ مگر مہاراجہ کے انتقام کے جذبات بدستور مشتعل تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سردار شیو دیو سنگھ کے سوتیلے بھائی سردار جنگ سنگھ کی لڑکی کا دفعتہً انتقال ہو گیا۔ سردار جنگ سنگھ کو یہ شبہ ہوا یا اس نے مہاراجہ کے کہنے سے سردار شیو دیو سنگھ پر یہ غلط الزام لگایا۔ کہ اس لڑکی کے انتقال کی وجہ زہر دیا جانا تھا اور جائیداد کے جھگڑوں کے باعث سردار شیو دیو سنگھ نے ہی اس لڑکی کو زہر دلوایا۔ سردار جنگ سنگھ کا سردار شیو دیو سنگھ پر لگایا گیا یہ الزام مہاراجہ کے ہاتھوں میں انتقام لینے کے لیے بنا ہتھیار آ گیا۔ سردار شیو دیو سنگھ کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ یو پی کے ایک ریٹائرڈ سیشن جج پنڈت پتمبر جوشی کو اس مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر کیا گیا۔ عدالت میں شہادتیں گزریں اور سردار شیو دیو سنگھ سردار جنگ سنگھ کی لڑکی کو زہر دینے اور ہلاک کرنے کے جرم میں عمر قید کر دیے گئے۔

سردار شیو دیو سنگھ جب جیل میں بھیج دیے گئے تو انہوں نے اس سے پہلے اور جیل جانے کے

Marfat.com

بعد بھی پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند کے پاس مہاراجہ کے خلاف شکایتیں لکھ کر بھیجیں۔ مہاراجہ نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند سے خبریں حاصل کرنے کے لیے ڈیپارٹمنٹ کے کلرکوں سے انتظام کر رکھا تھا اور ان کلرکوں کو اس کام کے لیے کافی روپیہ دیا جاتا تھا۔ مہاراجہ کو ان کلرکوں کے ذریعہ علم ہوا کہ سردار شیودیو سنگھ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے پاس مہاراجہ کے خلاف شکایتیں لکھ کر بھیجتے ہیں چنانچہ یہ اطلاع سن کر مہاراجہ کے انتقام کی سپرٹ میں اور اضافہ ہوا اور مہاراجہ نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ سردار شیودیو سنگھ کو مزید اذیتیں دی جائیں۔

سردار شیودیو سنگھ کو ذہنی اذیت دینے کے لیے مہاراجہ نے اپنے دو نفروں (ریاستوں میں نفر مہاراجہ کے ان ملازموں کو کہتے ہیں جو مہاراجہ کے ذاتی کام مثلاً کھانا کھلانا، کپڑے بدلوانا، غسل کرانا وغیرہ خدمت انجام دیں) بیر سنگھ اور ایک دوسرے شخص کو مقرر کیا۔ کہ کسی نہ کسی طریقہ سے سردار شیودیو سنگھ کی بیوی کو جو بھدوڑ (ریاست پٹیالہ) کی رہنے والی تھیں۔ اور مہاراجہ پٹیالہ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھیں۔ نابھ لایا جائے تاکہ وہ اپنے شوہر کے خلاف ہو اور اسے اس کے شوہر کے خلاف بطور ٹول استعمال کیا جائے۔

سردار شیودیو سنگھ کی بیوی بہت نیک خاتون تھیں اور اس خاتون کے والد سردار نانک سنگھ مرحوم رئیس اعظم بھدوڑ بھی غیر معمولی طور پر نیک شخصیت تھے۔ یہ بیچاری اپنے شوہر کے جیل جانے کے بعد اپنے میکے یعنی بھدوڑ آ گئی تھیں اور وہاں ہی مستقل طور پر مقیم تھیں۔ بیر سنگھ نفر اور اس کا ساتھی دونوں بھدوڑ پہنچے۔ اور انہوں نے اس خاتون کو بہت لالچ دیئے۔ کہ یہ نابھ چلے مگر اس خاتون نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بیر سنگھ اور اس کا ساتھی برنالہ جو بھدوڑ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے اور بھدوڑ کا ریلوے سٹیشن وتھارز بھی ہے) کے تھانیدار عبدالعزیز کے پاس پہنچے اور خواہش ظاہر کی کہ اگر یہ سب انسپکٹر سردارنی شیودیو سنگھ کے خلاف کوئی جھوٹا مقدمہ قائم کرے تو اس کو دس ہزار روپیہ معاوضہ دیا جائے گا۔ اس جھوٹے مقدمے کا مقصد یہ تھا۔ کہ مقدمہ کے خوف سے سردارنی شیودیو سنگھ نابھ چلی جائے گی۔ ایک سب انسپکٹر پولیس کے لیے دس ہزار روپیہ کا لالچ کم نہ تھا اور پولیس کے لوگ جھوٹے مقدمے بنانے کے اعتبار سے کافی سنگدل ہوتے ہیں مگر چونکہ سردارنی شیودیو سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور عبدالعزیز ریاست پٹیالہ کے ملازم تھے اس لیے عبدالعزیز کو یہ حوصلہ نہ ہوا۔ کہ وہ رشوت لے کر سردارنی شیودیو سنگھ پر جھوٹا مقدمہ قائم کرے۔

اس واقعہ کو دو تین ماہ گزر گئے اور بیر سنگھ وغیرہ دوسری کوششوں میں مصروف رہے مگر ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد یہ لوگ کک اینڈ کیلوے کمپنی (یہ انگریزی کمپنی جواہرات زیورات اور قیمتی گھڑیوں وغیرہ کا بزنس کرتی تھی اور اس کا زیادہ کاروبار ریاستوں میں تھا) کے ہاں گئے اور کہا کہ بھدوڑ کے رئیس اعظم سردار نانک سنگھ مرحوم کی چھوٹی لڑکی کی شادی ہے اور اس شادی کے لیے زیورات وغیرہ سامان چاہیئے کک اینڈ کیلوے کے مینیجر نے جیسا کہ وہ عام طور پر کرتے تھے۔ اپنے ایک کلرک کو چالیس پچاس ہزار روپیہ کا سامان دے کر بیر سنگھ اور اس کے ساتھی کے ساتھ بھدوڑ بھیج دیا۔

Marfat.com

یہ لوگ اس بابو کو بھدوڑ لے گئے۔ وہاں انہوں نے پہلے سے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا وہاں بابو کو ٹھہرایا۔ بہت خاطر تواضع کی۔ دو دن کے بعد انہوں نے سردار نانک سنگھ کا مکان گلی میں سے دکھایا اور کہا کہ یہ مکان سردارنی نانک سنگھ کا ہے۔ سردارنی صاحب کے ہاں اس وقت بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں اور ان کو فرصت نہیں۔ سردارنی صاحبہ نے آپ کے کرایہ وغیرہ کے لیے ایک سو روپیہ دیا ہے۔ آپ واپس چلے جائیے۔ جب پھر آپ کو تار دیا جائے تو آپ تشریف لائیے اور زیادہ سامان لائیے۔ کیونکہ سامان کافی خریدا جائے گا۔ بابو صاحب کو ایک سو روپیہ کرایہ کے طور پر مل گیا۔ وہ واپس چلے گئے۔ دس روز کے بعد ککِ اینڈ کیلوے کے پاس تار پہنچا کہ بابو کو پھر بھیجئے۔ کک اینڈ کیلوے نے اپنے بابو کے ہاتھ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ قیمت کا مال پھر روانہ کیا۔ بابو جی برنالہ کے ریلوے سٹیشن پر اترے تو ریلوے سٹیشن پر بیر سنگھ اور اس کا ساتھی دو اونٹ لے کر موجود تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ چند گھنٹے یہ ریلوے سٹیشن پر ٹھہرے۔ جب شام ہو گئی تو یہ اونٹوں پر روانہ ہوئے۔ اونٹ جیتؔ نالہ اور بھدوڑ کے درمیان جنگل میں پہنچے تو اونٹ بٹھا دیئے گئے۔ بیر سنگھ اور اس کے ساتھی نے بابو جی کو رسیوں کے ساتھ ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور زیورات والا بکس لے کر یہ دونوں اونٹوں پر نابھ روانہ ہو گئے۔ بابو جی کو جب وہاں درخت کے ساتھ بندھے ہوئے دو تین گھنٹے ہو گئے اور قریب سے کچھ لوگ گزرے تو بابو نے زور سے آوازیں دیں اور ان لوگوں نے آ کر بابو جی کی رسیاں کھولیں۔

بابو جی پیدل واپس برنالہ پہنچے۔ ریلوے سٹیشن سے انہوں نے اپنے مالکان یعنی کک اینڈ کیلوے کو تار دیا کہ ڈاکہ پڑا ہے اور سامان لوٹ لیا گیا ہے۔ کک اینڈ کیلوے نے ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب داس زمانہ میں کرنل منچن اے۔ جی۔ جی تھے) کو تار دیا۔ اور ایجنٹ گورنر جنرل نے ریاست پٹیالہ کو تار بھیجا۔ چنانچہ دوسرے تیسرے روز پنجاب اور پٹیالہ دونوں جگہ کی پولیس تجربہ کار افسروں کے ساتھ تحقیقات کے لیے برنالہ پہنچ گئی۔ بابو کے نشان دینے پر پولیس بھدوڑ سردارنی نانک سنگھ کے مکان پر پہنچی۔ ان خواتین نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیونکہ نہ تو ان بیچاریوں کے ہاں کوئی شادی تھی اور نہ زیور خریدنے کا سوال تھا اور ان کو علم تک نہیں کہ ڈاکو کون تھے اور ڈاکہ کیوں پڑا۔

جب پولیس کو چار پانچ روز تحقیقات کرتے گزر گئے اور کوئی پتہ نہ چل سکا تو سب انسپکٹر عبدالعزیز کو خیال آیا کہ یہ کارروائی غالباً نابھ کے ان دو اشخاص کی ہے جو اسے دس ہزار روپیہ رشوت دے کر سردارنی شیو دیو سنگھ کے خلاف جھوٹا مقدمہ قائم کرانا چاہتے تھے۔ اس نے ان لوگوں کی ملاقات وغیرہ کے تمام کے تمام حالات اور رشوت پیش کرنے کا واقعہ ایک خط کے ذریعہ سر دیا کشن کول وزیر اعظم پٹیالہ کو بھیجا۔ سر دیا کشن نے جب یہ خط دیکھا تو آپ نے عبدالعزیز کو تار دیا کہ فوراً پٹیالہ پہنچو۔ آپ نے عبدالعزیز سے تمام حالات سنے تو عبدالعزیز کو ترقی دے کر انسپکٹر پولیس بنا دیا گیا۔ اور صرف اس مقدمہ کی تحقیقات کے لیے سپیشل ڈیوٹی پر مقرر کیا۔

عبدالعزیز انسپکٹر ہونے کے بعد تحقیقات کے لیے نابھ پہنچا۔ اس کو ان دونوں ملزموں کا نام

تک معلوم نہ تھا۔ ہاں یہ ان کو پہچان سکتا تھا۔ یہ منصوری (جہاں کہ مہاراجہ نابھہ مقیم تھے) گیا تاکہ مہاراجہ کے ملازموں میں سے بہ ملزموں کو پہچان سکے مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد یہ کئی روز تک نابھہ میں چکر لگاتا رہا۔ مگر اسے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ جب مہاراجہ نابھہ کو ڈاکہ کا علم ہوا اور یہ پتہ چلا۔ کہ پنجاب و پٹیالہ کی پولیس تحقیقات کر رہی ہے تو آپ نے ملزموں کی رہائش کا انتظام نابھہ کے شاہی محلات "پکا باغ" کے اندر کر دیا تھا جہاں کوئی شخص نہ آ سکتا تھا نہ جا سکتا تھا۔

عبدالعزیز جب نابھہ میں کئی روز پھرتا رہا اور اس نے مختلف جگہوں پر مختلف لوگوں کے فوٹو دیکھے تو وہ بیر سنگھ کا فوٹو ایک جگہ دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس فوٹو کے متعلق پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ مہاراجہ کے نفر بیر سنگھ کا ہے۔ یعنی اس فوٹو کے ذریعہ یہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ ڈاکہ ڈالنے والوں میں سے ایک شخص بیر سنگھ نفر ہے۔ اب بیر سنگھ نفر کی تلاش جاری ہوئی مگر کامیابی نہ ہو سکی کیونکہ بیر سنگھ تو شاہی محلات میں رکھا ہوا تھا۔

نابھہ پولیس عبدالعزیز کی مصروفیات کی نگرانی کر رہی تھی مگر اس کے پاس عبدالعزیز کو نابھہ سے نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کیونکہ عبدالعزیز مقدمہ کی تحقیقات کے لیے آئے ہوئے تھے اور ان کے پاس ملزموں کی گرفتاری کے لیے ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب اور پٹیالہ فارن منسٹر دونوں کے دستخطی وارنٹ گرفتاری موجود تھے۔ آخر نابھہ پولیس نے عبدالعزیز کو پھنسانے کے لیے ایک سازش کی۔ نابھہ کے ایک سب انسپکٹر پولیس دولت سنگھ (یہ صاحب غالباً بعد میں ریاست نالہ گڑھ میں انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) عبدالعزیز کے پاس گئے اور کہا کہ اگر عبدالعزیز پٹیالہ سے دولت سنگھ کو کافی روپیہ دلوا دیں اور یہ وعدہ کریں کہ پٹیالہ میں اچھی ملازمت بھی دیں گے تو دولت سنگھ بیر سنگھ کو گرفتار کرا دے گا۔ عبدالعزیز اس سازش کا شکار ہوئے۔ آپ نے دولت سنگھ کو دو ہزار روپیہ بطور ایڈوانس دے دیا۔ تین ہزار روپیہ بیر سنگھ کی گرفتاری کے بعد دینے کا فیصلہ ہوا۔ اور یہ وعدہ بھی ہوا کہ گرفتاری کے بعد دولت سنگھ کو پٹیالہ میں انسپکٹر پولیس بنا دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ہونے کے تیسرے چوتھے روز دولت سنگھ عبدالعزیز کے پاس آئے اور کہا کہ ابھی چلیے۔ بیر سنگھ ایک مکان کے اندر اس وقت موجود ہے اسے گرفتار کر لو۔ عبدالعزیز دولت سنگھ کے ساتھ ایک نیم طوائف (جو پرائیویٹ طور پر پیشہ کرتی تھی کیونکہ نابھہ میں کسی طوائف کو پیشہ کرنے کی قانوناً اجازت نہ تھی) کے مکان پر گئے اور دولت سنگھ نے گلی میں سے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس مکان کے اندر بیر سنگھ موجود ہے گرفتار کر لو اور یہ کہتے ہوئے کہ دولت سنگھ کی مخبری کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ دولت سنگھ مکان دکھا کر چلا گیا۔ عبدالعزیز کی جیب میں اس وقت ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب اور فارن منسٹر پٹیالہ کے دستخطی وارنٹ اور ایک ہتھکڑی تھی۔

اس نیم طوائف کا نام خیران تھا اور یہ نابھہ پولیس کے ہاتھوں میں ٹول تھی۔ عبدالعزیز جب بیر سنگھ کو گرفتار کرنے کے لیے خیران کے مکان کے اندر پہنچے تو نابھہ پولیس کی سکیم کے مطابق عبدالعزیز کے

Marfat.com

اندر پہنچتے ہی خیراں نے عبدالعزیز کو گریبان سے پکڑ لیا اور جوتے مارتی مارتی ان کو گھر سے باہر گلی میں لے آئی۔ گلی میں شور سن کر پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔ لوگوں نے خیراں سے پوچھا۔ کہ کیا بات ہے خیراں نے کہا کہ یہ کوئی بدمعاش ہے۔ جو زنا بالجبر کی نیت سے مکان کے اندر گھس آیا۔ ایسے موقع پر پبلک سائیکالوجی کے اعتبار سے ہر شخص کی ہمدردی کا عورت کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ خیراں کی کفش کاری کے ساتھ ساتھ تمام لوگوں نے بھی عبدالعزیز کو جوتے مارنے شروع کیے۔ کوئی کہتا "بدمعاش تو اس گلی میں آیا کیوں" کوئی کہتا "کیا تمہارے گھر میں بہن بیٹی نہیں تھی" "تم کو جیل خانہ میں بھجوانا چاہیے" —— کتنی جرات ہے دن کے وقت عورت کے گھر میں چلے جانا" وغیرہ۔

نابھہ پولیس نے تمام انتظام کر رکھا تھا۔ جب بچارے عبدالعزیز کو پیٹا جا رہا تھا تو قریب ہی سے پولیس آ گئی۔ اس نے عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا۔ عدالت میں زیر جرم زنا بالجبر چالان ہوا۔ شہادتیں گزریں اور مجسٹریٹ نے عبدالعزیز صاحب کو تین سال قید سخت کی سزا دی اور عبدالعزیز اس وقت جیل سے رہا ہوئے۔ جب کہ مہاراجہ نابھہ کی گدی سے دست برداری کے بعد انگریزوں نے نابھہ ایڈمنسٹریشن پر قبضہ کیا۔

اس واقعہ کے بعد بیر سنگھ بڑودہ میں گرفتار ہوا۔ اس گرفتاری کے حالات بہت دلچسپ ہیں اور کسی دوسری جگہ درج ہیں۔

ریاستوں کے جرائم

مہاراجہ نابھہ کا نفر بیر سنگھ بھدوڑ کے قریب لک اینڈ کیلوے کے سامان پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد نابھہ کے سرکاری محلات میں رکھا گیا اور جب مہاراجہ اور کرنل منچن ایجنٹ گورنر جنرل ریاستہائے پنجاب کے درمیان مہاراجہ کی گدی سے دست برداری کے متعلق خط و کتابت ہو رہی تھی اور مہاراجہ کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ آپ گدی سے علیحدہ کر دیئے جائیں گے۔ تو سوال یہ پیدا ہوا کہ بیر سنگھ کے مسئلہ کا حل کیا ہو۔ کیونکہ بیر سنگھ گرفتار ہوتا ہے تو لک اینڈ کیلوے کے ڈاکہ کے متعلق اقراری بیان دے دیگا اور اس مقدمہ میں بھی مہاراجہ کا تعلق ثابت ہو گا اور اگر یہ گرفتار نہ ہو تو اسے کہاں بھیجا جائے جہاں کہ یہ اپنی زندگی پوشیدہ طور پر بسر کر سکے۔ چنانچہ سوچنے کے بعد مہاراجہ نے اس کو پانچ سو روپیہ اخراجات کے لیے دیا اور کہا کہ یہ کسی دوسری ریاست میں چلا جائے۔ جہاں کہ یہ گرفتار نہ ہو سکے۔ اس کو موٹر میں بٹھا کر گوبند گڑھ ریلوے سٹیشن (جو ریاست نابھہ کی حدود میں تھا) پر چھوڑا گیا۔ جہاں سے یہ اپنے ماموں کے ساتھ بڑودہ پہنچ گیا۔ بڑودہ پہنچتے ہوتے اس کو چند روز ہی ہوئے تھے کہ اس کے پاس روپیہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ انسان اگر پردیس میں پوشیدہ طور پر رہنا چاہے تو اسے ایک روپیہ کی جگہ چار روپے صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس نے اپنے ماموں کو مہاراجہ کے پاس پھر واپس نابھہ بھیجا تاکہ یہ مہاراجہ سے

Marfat.com

اخراجات کے لیے مزید روپیہ لا سکے۔ اس وقت تک نہ تو برطانوی پولیس میں سے کسی شخص کو علم تھا کہ بیر سنگھ کہاں ہے نہ پٹیالہ کی پولیس کو۔ بیر سنگھ کا ماموں جب بڑودہ سے واپس نابھ پہنچا اور مہاراجہ سے روپیہ حاصل کرنے کے لیے ملا تو ان لوگوں کو اس شخص کی حرکات پر شبہ ہوا جو مہاراجہ پٹیالہ کے مخبر نابھ کے محلات میں تھے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے مہاراجہ پٹیالہ کو اطلاع دی کہ بیر سنگھ کا ماموں نابھ میں ہے اور مہاراجہ سے ملا ہے۔ پٹیالہ والوں نے اس کی اطلاع برطانوی پولیس کے لوگوں کو دی جو پٹیالہ میں تھے۔ چنانچہ برطانوی پولیس کی سی آئی ڈی کے لوگ نابھ میں بیر سنگھ کے ماموں کی نگرانی پر لگا دیے گئے۔ بیر سنگھ کا ماموں روپیہ کے لیے چار پانچ روز نابھ میں رہا۔ اس کے بعد یہ روپیہ لے کر بڑودہ کو روانہ ہوا تو سی آئی ڈی کے لوگ بھی اس کے ساتھ تھے مگر اس کو ان کا کچھ علم نہ تھا۔

بیر سنگھ بڑودہ میں اپنے ماموں کے انتظار میں تھا اور جب اس کے ماموں کو بڑودہ سے گئے ہوئے کئی روز ہو گئے تو اس نے بے صبری کے عالم میں فرنٹیر میل کے وقت ریلوے سٹیشن پر بھی آنا شروع کر دیا۔ تاکہ یہ دیکھ سکے کہ اس کا ماموں آیا ہے یا نہیں۔ جس روز اس کا ماموں بڑودہ سٹیشن پر فرنٹیر میل سے اترا۔ تو بیر سنگھ اس وقت بھی اپنے ماموں کے انتظار میں بڑودہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس کا ماموں گاڑی سے اترا اور بیر سنگھ سے ملا تو سی آئی ڈی کے اُن لوگوں نے جو نابھ سے ساتھ آئے تھے۔ بیر سنگھ کو ریلوے کے پلیٹ فارم پر ہی گرفتار کر لیا اور اسے پٹیالہ لایا گیا تاکہ اس پر ڈاکے کا مقدمہ چلایا جائے۔ پٹیالہ پہنچ کر بیر سنگھ نے من وعن تمام حالات بتا دیے اور مہاراجہ نابھ کے خلاف وہ بیان دے دیا جس کی برطانوی اور پٹیالہ کی پولیس کو ضرورت تھی۔ بیر سنگھ پر مقدمہ چلا اور اس مقدمہ میں بیر سنگھ کو دس سال قید سخت کی سزا ہوئی۔

بیر سنگھ کا قصہ یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ڈاکے کے اس واقعہ سے ایک عرصہ پہلے بیر سنگھ بمبئی گیا تھا وہاں اس نے کسی دوسرے شخص کے ساتھ دھوکہ کیا تو اس شخص نے بیر سنگھ کے خلاف پولیس میں زیر دفعہ ۴۲۰ رپورٹ درج کرائی۔ اور پولیس نے مقدمہ قائم کیا مگر بمبئی پولیس بیر سنگھ کو گرفتار نہ کر سکی۔ جب بیر سنگھ کے پٹیالہ میں قید ہونے کی اطلاع بمبئی پولیس کو ملی۔ تو اس نے بھی اپنے ۴۲۰ کے مقدمہ میں پھر نئی زندگی پیدا کی اور چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت سے بیر سنگھ کو بمبئی بھیجے جانے کے وارنٹ حاصل کیے۔ بمبئی پولیس یہ وارنٹ لے کر پٹیالہ پہنچی پٹیالہ کے فارن منسٹر نے حسب قاعدہ حکم دیا کہ بمبئی کے مقدمہ کی کارروائی کے لیے بیر سنگھ کو بمبئی پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ کاغذات پٹیالہ پولیس کے پاس گئے اور پٹیالہ پولیس نے بیر سنگھ کو پٹیالہ جیل سے حاصل کر کے بمبئی پولیس کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ مگر پٹیالہ پولیس کی حماقت سمجھیئے، یا بیر سنگھ کی خوش نصیبی کہ جب بیر سنگھ کو بمبئی پولیس کے حوالے کیا گیا تو پٹیالہ پولیس کا غذات حوالگی میں یہ لکھنا بھول گئی کہ ملزم دس برس کے لیے پٹیالہ میں قید کاٹ رہا ہے۔ بمبئی کے مقدمہ سے

Marfat.com

فارغ ہونے کے بعد اس کو قید کے ایام کاٹنے کے لیے واپس پٹیالہ بھیجا جائے۔
بمبئی کی پولیس بیر سنگھ کو لے کر بمبئی پہنچی۔ بیر سنگھ کو لے جانے والے کانسٹیبلوں نے اس کو بمبئی جیل کے حوالے کیا۔ دو تین روز کے بعد اس کی پیشی چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی۔ چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ نے مثل دیکھی اور پوچھا کیا جرم ہے تو ملزم اور سرکاری وکیل نے بتایا کہ ۴۲۰ یعنی دھوکا ۔۔۔ ۴۲۰ کا جرم تعزیرات ہند کے مطابق قابل ضمانت ہے چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ ملزم پانچ سو روپیہ کی ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ یہ حکم بیر سنگھ کی قسمت میں نئے باب کے اضافے کا باعث ہوا۔ اس نے بمبئی کے اپنے ایک پرانے دوست سے پانچ سو روپیہ کی ضمانت کے لیے کہا۔ اس دوست نے پانچ سو روپیہ کی ضمانت دے دی اور بیر سنگھ جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد اب تک بیر سنگھ کا نہ تو برطانوی پولیس کو کوئی سراغ لگ سکا۔ نہ پٹیالہ کی پولیس کو۔ اور بیر سنگھ مفرور ہے۔

کئی برس کی بات ہے۔ مرحوم مہاراجہ نابھ زندہ تھے اور ایڈیٹر "ریاست" بھی ان کے پاس منصوری میں مقیم تھا۔ میں بازار میں سیر کے لیے گیا تو ایک شخص مجھ سے ملا۔ اس نے مہاراجہ کے نام ایک لفافہ دیا۔ اور کہا کہ وہ اگلے روز شام کو اسی مقام پر جواب کا انتظار کرے گا۔ مہاراجہ سے جواب لا دیا جائے۔ میں نے بیر سنگھ کو کبھی دیکھا نہ تھا نہ مجھے شبہ ہوا کہ یہ بیر سنگھ ہے اور نہ میں نے اس سے دریافت کرنے کی ضرورت سمجھی کہ یہ کون ہے۔ کیونکہ میں دوسروں کے معاملات میں بہت کم دخل دیا کرتا ہوں۔ میں نے یہ خط مہاراجہ کو دیا۔ تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ خط بیر سنگھ کا ہے اور منصوری میں ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ نے بیر سنگھ سے ملنے سے انکار کر دیا اور زبانی کہلایا کہ وہ منصوری سے چلا جائے اور کبھی یہاں نہ آئے۔ مہاراجہ اس سے ملنا نہیں چاہتے اگلے روز میں نے بیر سنگھ کو یہی جواب دے دیا۔ مجھے علم نہیں کہ اس کے بعد بیر سنگھ کہاں گیا۔ وہ کہاں ہے اور اس کا کیا حشر ہوا۔

بیر سنگھ کے سلسلہ میں کک اینڈ کیلوے کے جواہرات کا قصہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں جب مہاراجہ گدی سے دست بردار ہوئے تو نابھ سے روانہ ہونے سے پہلے یہ مسئلہ بھی مہاراجہ کے سامنے تھا۔ کہ بیر سنگھ کو تو بڑودہ بھیج دیا گیا۔ جیولری کے اس بکس کا کیا ہو جو بیر سنگھ نے کک اینڈ کیلوے کے بابو سے بھدوڑ اور برنالہ کے درمیان بذریعہ ڈاکہ حاصل کیا۔ اتنے عرصہ تک یہ بکس ہیرا محل نابھ کے اندر مہاراجہ کے بیڈ روم میں پڑا رہا۔ گدی سے دست برداری اور مہاراجہ کے نابھ سے ڈیرہ دون روانہ ہونے سے چار روز پہلے مہاراجہ نے یہ بکس ایک دوسرے نفر بھان سنگھ کو دیا اور کہا کہ اس بکس کو کسی حالت میں کسی دریا۔ کنوئیں یا کسی ایسی جگہ پھینک دو جہاں سے یہ واپس حاصل نہ ہو سکے۔ صدمہ کے باعث مہاراجہ کے دماغ کا توازن اس وقت قائم نہ رہا تھا۔ بھان سنگھ نے مہاراجہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بکس مہاراجہ سے لے لیا اور یہ اسے

Marfat.com

اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ بھان سنگھ چھوٹی حیثیت کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے کوارٹر کے اندر ہی اس بکس کے تالے کو توڑا۔ تاکہ دیکھے کہ اس کے اندر کیا ہے جو مہاراجہ ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ بکس کو کھولنے کے بعد اس نے دیکھا کہ قیمتی جیولری ہے۔ اس نے سمجھا کہ مہاراجہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو مہارانی کی جیولری کا بکس ضائع کرنے کے لیے اس نے دے دیا۔ ادھر تو مہاراجہ کا حکم جس کی تعمیل سے انکار کرنے کی وزراء میں بھی جرأت نہ تھی۔ یہ بچارا نفر کیوں کر حکم کی تعمیل نہ کرتا۔ اُدھر قیمتی جیولری کا بکس۔ اس کا دل نہ چاہا کہ اس کو ضائع کرے۔ آخر اس کش مکش کے بعد اس نے سونے کی چوڑیوں اور سونے کے دوسرے سامان کو الگ کیا اور گھڑیوں، ہیروں اور موتیوں کے جڑاؤ سامان کو الگ اس نے سونے کے تمام سامان کو لوہا مار مار کر چور چور کیا اور ہیرا محل سے دور فاصلے پر ایک کنوئیں میں پھینکا۔ قیمتی گھڑیوں اور جڑاؤ سامان کو اس نے پھر اس بکس میں بند کیا اور اس بکس کو کسی پوشیدہ مقام پر زمین کے اندر دفن کر دیا اور ہیرے کی ایک انگوٹھی جس کی قیمت پانچ ہزار روپیہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی انگلی میں پہن لی۔

نابھہ میں ایک صاحب مسٹر شام جی داس کپور جیولر تھے۔ بہت ملنسار، با اخلاق اور شریف ان کی دکان پر آٹھ دس کرسیاں پڑی رہتیں اور ریاست کے افسر اکثر ان کے ہاں آتے۔ یہ لالہ شام جی داس مہاراجہ کے طلب کرنے پر بھی جیولری کی خرید کے وقت اکثر ہیرا محل جاتے۔ اور تمام اہل کاران کو عزت کی نظر سے دیکھتے۔ مہاراجہ کی دست برداری کو غالباً ایک ہفتہ ہوا تھا کہ بھان سنگھ نفر اپنے ہاتھ کی انگلی میں قیمتی انگوٹھی پہنے ہوئے لالہ شام جی داس کی دکان پر گیا اور کچھ دیر وہاں بیٹھا۔ لالہ شام جی داس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پانچ چھ ہزار روپیہ کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہے مگر یہ بھان سنگھ سے کچھ کہہ نہ سکے۔ مہاراجہ کی دست برداری کے بعد نابھہ کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی تھے (یہ مسٹر اوگلوی بعد میں ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا میں سیکرٹری تھے) جب مسٹر اوگلوی سرگودھا میں ڈپٹی کمشنر تھے تو یہ وہاں کے ایک ہیڈ کنسٹیبل پولیس نتھو رام پر بہت مہربان تھے۔ مسٹر اوگلوی جب نابھہ میں ایڈمنسٹریٹر ہوئے تو اس نتھو رام کو بھی اپنے ساتھ نابھہ لے آئے اور وہاں آپ نے اس کو انسپکٹر جنرل پولیس مقرر کر دیا۔ یہی نتھو رام بعد میں انگریزی علاقہ کے اندر سب انسپکٹر پولیس مقرر ہوئے۔ پھر مسٹر اوگلوی کی کوشش سے پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنائے گئے۔ مسٹر اوگلوی جب دہلی میں آئے تو ان کو یہاں دہلی میں سٹی مجسٹریٹ مقرر کرا دیا گیا۔ دہلی میں لالہ نتھو رام رائے بہادر اور او۔ بی۔ ای وغیرہ ہوئے اور یہاں انہوں نے وار فنڈ اور قرضہ جنگ میں پبلک سے مختلف طریقے استعمال کرتے ہوئے لاکھوں روپیہ گورنمنٹ کی امداد کے لیے حاصل کیا۔ لالہ نتھو رام جب نابھہ میں انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے تو آپ وہاں اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے سرگودھا کے علاقہ سے ساٹھ ستر مسلمان کنسٹیبل بھرتی کر کے لے گئے۔ اس علاقہ کے لوگ فوج اور پولیس کے لیے موزوں ترین ہیں۔ اپنی جان اور اپنے ضمیر کی پروا کم کرتے ہیں۔ لالہ نتھو رام کے نابھہ میں برسر اقتدار (کیونکہ آپ مسٹر اوگلوی کے دست راست

Marfat.com

بگئے ہونے پر شہر کے لوگوں نے خوشامد کے طور پر آپ کے پاس جانا شروع کیا۔ ایک روز لالہ شام جی داس کپور جوہری بھی گئے تو آپ نے لالہ ٹھکور رام سے معزول مہاراجہ کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ کہ مہاراجہ نے ریاست کو تباہ کر دیا۔ نفر لوگ وزراء پر حکومت کرتے تھے۔ پبلک تو بھوکی مر رہی ہے مگر نفر مالا مال ہیں۔ چنانچہ آپ نے مثال دیتے ہوئے باتوں باتوں میں کہا کہ بھان سنگھ نفر ان کے ہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلی میں پانچ چھ ہزار کی قیمتی انگوٹھی ہے۔ نہ معلوم مہاراجہ نے اس کو یہ انعام میں دی یا اس نے مہاراجہ کی چوری کی۔ بہر حال تیس روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے نفر کے پاس پانچ چھ ہزار روپیہ کی ہیرے کی انگوٹھی کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ نابھہ میں مہاراجہ کے وقت کیونکہ چوروں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز تھے۔

لالہ ٹھکور رام نے جب یہ واقعہ سنا تو انہوں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا۔ کہ وہ بھان سنگھ نفر کے مکان پر جا کر اسے بلا لائے۔ یہ کنسٹیبل بھان سنگھ کو لانے کے لیے گیا تو بھان سنگھ اپنے پہلے اقتدار کو ابھی بھول نہ سکا تھا۔ نفروں سے وزراء تک خوف کھاتے تھے کہ کہیں یہ مہاراجہ سے شکایت نہ کر دیں۔ بھان سنگھ نے کنسٹیبل سے کہا کہ ”جاؤ۔ جا کر کہہ دو ٹھکور رام سے۔ میں نہیں آتا۔ انسپکٹر جنرل پولیس کی حیثیت کیا ہے کہ وہ مجھے کنسٹیبل بھیج کر طلب کرے۔“ کنسٹیبل نے اسی طرح آ کر لالہ ٹھکور رام سے کہا۔ لالہ ٹھکور رام نے اپنے ساتھ لائے ہوئے سرگودھا کے جوانوں میں سے دو جوانوں کو بھیجا کہ بھان سنگھ کو لے آؤ۔ اگر وہ آنے سے انکار کرے تو اسے وہاں ہی سے جوتے لگانا شروع کر دو۔ یہ لوگ گئے۔ تو بھان سنگھ کو تھپیڑ مار کر اور گردن سے پکڑ کر ساتھ لے آئے۔ جب بھان سنگھ لالہ ٹھکور رام کے پاس پہنچا تو لالہ ٹھکور رام نے بغیر کچھ کہے، دریافت کیے یا پوچھے۔ حکم دیا کہ اس کو الٹا لٹا دو۔ سرگودھا کے جوانوں نے بھان سنگھ کو الٹا لٹا دیا۔ لالہ ٹھکور رام کے حکم سے اس کے چوتڑوں پر کفش کاری شروع ہوئی اور سرگودھا کے جوانوں نے گن کر ایک سو جوتے لگائے۔ بھان سنگھ چلا رہا تھا مگر کفش کاری جاری تھی۔ جب ایک سو کی گنتی ختم ہوئی تو بھان سنگھ کو کھڑا کیا گیا اور لالہ ٹھکور رام نے کہا۔ کہ اب بتاؤ تم نے آنے سے انکار کیوں کیا۔ اس کے بعد لالہ ٹھکور رام نے پوچھا۔ کہ وہ انگوٹھی کہاں ہے۔ جو تم نے مہاراجہ کے ہاں سے چوری کی۔ اس گفتگو سے پہلے نہ تو لالہ ٹھکور رام کو علم کہ یہ انگوٹھی ٹک اینڈ کیلوے کے مال میں سے ہے نہ لالہ شام جی داس کپور کو کچھ پتہ کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی۔ بھان سنگھ کفش کاری کے باعث خوف زدہ تھا اس نے انگوٹھی بھی اپنے گھر سے منگا دی اور تمام کا تمام واقعہ بتا دیا کہ مہاراجہ نے اس کو بکس دیا وہ بکس اس نے اپنے کوارٹر میں کھولا اور سامان فلاں کنوئیں میں پھینکا ہے۔ بھان سنگھ کے بیان کے بعد کنوئیں کے اندر آدمی اتارے گئے اور وہاں سے سامان نکلوایا گیا تو لالہ ٹھکور رام کو یہ خیال ہوا کہ شاید یہ سامان ٹک اینڈ کیلوے کا ہو۔ چنانچہ ٹک اینڈ کیلوے کو تار دیا گیا۔ سامان کی شناخت کے لیے وہاں سے بابو جی تشریف لائے۔ انہوں نے سامان کو پہچانا تو سامان وہی تھا جو ہیرا سنگھ نے ڈاکہ ڈال کر بابو جی سے لیا تھا۔ بھان سنگھ حوالات بھیج دیا گیا۔ ایک طویل عرصہ تک بھان سنگھ حوالات میں رہا۔ مہاراجہ

Marfat.com

چونکہ گدی سے دست بردار ہو چکے تھے اس لیے اس بکس کے متعلق مزید کارروائی نہ کی گئی۔ جیولری کی قیمت جو غالباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ تھی نابھہ کے سرکاری خزانہ سے بحکم ایڈمنسٹریٹر لنگ اینڈ کیلوے کو ادا کر دی گئی۔

ہندوستانی ہوٹل

اخبار "ریاست" کے جاری کرنے سے پہلے جب دہلی سے خواجہ حسن نظامی اور میں نے مشترکہ طور پر ایک روزانہ اخبار "رعیت" جاری کیا تو اخبار جاری ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر میں کئی روز تک ڈفرن برج کے قریب ایک ہوٹل میں مقیم رہا۔ اس ہوٹل کے مالک ایک پنجابی کھتری تھے اور ہوٹل میں بیس پچیس کمرے ہوں گے۔

میری زندگی کا یہ معمول رہا ہے کہ میں رات کو نو دس بجے کے قریب سو جاتا ہوں۔ علی الصباح چار بجے جاگ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر کام شروع کر دیتا ہوں اور دس گیارہ بجے تک سکون اور تنہائی میں اپنا کام ختم کر لیتا ہوں اسی عادت کے مطابق اس ہوٹل میں بھی یہی پروگرام رہا۔ ایک روز تھکا ہوا ہوٹل میں واپس آیا۔ اور نو بجے رات کو کھانا کھا کر سو گیا۔ گیارہ بجے میں نے ساتھ والے کمرہ میں کچھ شور سا سنا تو میری آنکھ کھل گئی۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا اور اس دروازہ میں بھی متعدد شیشے لگے ہوئے تھے یعنی اگر کوئی شخص آہستہ سے بات کرے تو وہ بھی سنائی دیتی تھی میں نے جب غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ اس کمرے میں ایک مرد اور ایک عورت ہے اور مرد نے شراب پی ہوئی ہے۔ یہ لوگ دہلی کی "کرخن دار" کلاس (جس کو پنجاب میں مہاجا گاجا یا سینماؤں میں چار آنہ والی کلاس کہتے ہیں) میں سے ہیں اور عیش و عشرت میں مصروف ہیں۔ شراب کے نشہ میں ہی شور پیدا کیا جا رہا ہے اور بعض اوقات گندی گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ میں دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے کوشش کی کہ پھر سو جاؤں مگر سو نہ سکا کیونکہ ان لوگوں کا شور جاری تھا۔ آخر تنگ آ کر میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ہوٹل کے دفتر کے کمرہ میں گیا وہاں ایک گارڈ سو رہا تھا۔ اس کو جگایا۔ اس سے مینجر کو بلانے کے لیے کہا۔ جو کہ ہوٹل کے ان کمروں میں سے ہی آخر کے کمروں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ مینجر تشریف لائے تو ان سے سب کیفیت بیان کی اور کہا کہ ابھی کوتوالی ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع کرتا ہوں کہ تم ہوٹل میں عورتیں سپلائی کرتے ہو۔ مینجر نے کہا کہ مسافر خود لے آیا ہوگا۔ چنانچہ مینجر اس کمرہ میں گیا اور مسافر کو آوازیں دیں مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ ہماری باتوں کو سن کر "کرخن دار" بالکل خاموش ہو گئے اور صبح ہونے سے پہلے ہوٹل سے چلے گئے۔

میں معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہمیشہ کوشش کیا کرتا ہوں اور جب تک تمام حالات کا علم نہ ہو جائے۔ ایک قسم کی جستجو سی رہتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں غالباً آٹھ دس دن ہوٹل میں رہا۔ ہوٹل

Marfat.com

کے ملازموں کی معرفت میں نے ہوٹل کے تمام حالات معلوم کر لیئے تو پتہ چلا کہ ہوٹل کے مالک کو ہوٹل کے کرایہ سے زیادہ آمدنی دلالی کی ہے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والے لوگ (خصوصاً پنجاب سے آنیوالے حضرات) ہوٹل کے ملازموں کی معرفت عورتیں منگاتے ہیں۔ یہ ملازم ان بے وقوف مسافروں کو مزید اُلّو بنانے کے لیئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ عورت فلاں رائے بہادر کی بھتیجی ہیں اور فلاں خان بہادر کی نواسی ہیں اور اس کے شوہر گورنمنٹ ہند کے فلاں بڑے دفتر میں ملازم ہیں وغیرہ۔ مگر در اصل یہ عورتیں بہت ادنیٰ درجہ کی پہاڑ کی رہنے والی ہندو یا دہلی کی آتشک اور سوزاک زدہ مسلمان طوائفیں ہوتی ہیں جو ہوٹل میں قیام کرنے والے عیاش لوگوں کو زندگی بھر کے لیے خطرناک سرٹیفیکیٹ بھی دے دیتی ہیں۔

میں اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہاں سامان فروخت کرنے والے لوگ بھی آیا کرتے کیونکہ مسافروں کے پاس یہ زیادہ قیمت پر اپنا سامان فروخت کر سکتے تھے۔ ایک روز میں دوپہر کے وقت کھانا کھا کر قیلولہ کر رہا تھا کہ کمرے کے دروازے پر ایک شخص آیا۔ اس کے پاس چھپکلی کی قسم کے متعدد جانور تھے اس نے کہا کہ "سانڈے کا تیل ہے۔ اگر چاہو زندہ سانڈے میں سے ابھی تیل نکال کر دوں گا۔" میں نے اس سے پہلے کبھی سانڈے کو نہ دیکھا تھا اور نہ سانڈے کے تیل کی خصوصیات سے واقف تھا میں نے پوچھا کہ یہ سانڈے کا تیل کس کام آتا ہے اس نے میرے اس سوال کا جو جواب دیا وہ یہ تھا:-

"سانڈے کا تیل نامردی، کمزوری اور سستی کو دور کرتا ہے۔ یہ جانور جنگل میں ملتا ہے ہم لوگ پکڑ کر لاتے ہیں اور اس کا تیل نکالتے ہیں۔ یہ تیل دہلی سے دُور دُور جاتا ہے آپ کی (چونکہ میں سکھ تھا) قوم کے سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ، سردار جوگیندر سنگھ اور سردار بہادر بوٹا سنگھ بھی متعدد بار ہم سے یہ تیل لے گئے اور انہوں نے بار بار منگایا۔ آپ بھی لیجئے۔ بہت کام کی چیز ہے۔ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

رائے بہادر بوٹا سنگھ سے تو میں واقف نہ تھا مگر سردار سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور سردار سر جوگیندر سنگھ (جو وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر تھے) سے مل چکا تھا اور ان دونوں بزرگوں کی نیک دلی۔ بلند کیریکٹر، شرافت اور اخلاق کی بلندی سے واقف تھا۔ ان کا نام سانڈے کے تیل کی خصوصیات کے ساتھ سن کر مجھے بیحد غصہ آیا۔ میں جب غصہ کی حالت میں ہوں تو گالیاں اور جسمانی سزا دینے کے لیے بھی بے قابو سا ہو جاتا ہوں۔ (یہ بہت بڑی کمزوری ہے اور اسے بد اخلاقی بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس کا مجھے بعد میں ہمیشہ ہی افسوس ہوتا ہے) میں نے اس شخص کو ماں بہن کی گالیاں دینی شروع کیں۔ اور کہا کہ کمینہ کُتے! تو چند پیسوں کے لالچ میں نیک اور فرشتہ خصلت لوگوں کو رسوا کرتا ہے اور ان بیچاروں کا جرم صرف یہ ہے کہ یہ لوگ ملک میں مشہور شخصیت ہیں اور تمہارے جیسے کتے بھی ان کے نام سے واقف ہیں۔ میری گالیوں کو سن کر اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا اور یہ بھیگی بلّی کی طرح ہوٹل سے چلا گیا

اس ہوٹل کے واقعہ سے چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی میں آیا۔ میرے ساتھ مانسہ ریاست

پٹیالہ کے ٹھیکیدار سردار بچنا ور سنگھ بھی تھے یہ صاحب غالباً آجکل رام پورہ ریاست پٹیالہ میں رہتے ہیں ہم لوگ ریلوے سٹیشن کے قریب سرائے احمد بائی میں ٹھہرے ۔ دن بھر سیر کرنے اور سامان خریدنے میں مصروف رہے ۔ رات کو دس بجے کے قریب سرائے میں پہنچے ۔ سردیوں کا زمانہ تھا جب سونے والے تھے تو سردار بچنا ور سنگھ نے کہا ۔ کہ ان کو رات کے وقت دودھ پینے کی عادت ہے ۔ دودھ پینے کے لیے بازار جا رہے ہیں ابھی واپس آتے ہیں ۔ جب بچنا ور سنگھ دودھ پینے کے لیے چلے گئے تو مجھے اکیلا دیکھ کر سرائے کے ایک ملازم کو جرأت ہوئی ۔ وہ آیا اور اس نے کہا ۔ کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیے ۔ میں نے جواب دیا کہ ایک لوٹا پانی کا بھر کر کرسی پر رکھ دیجئے وہ پانی لے آیا تو اس نے پھر کہا "کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے ۔" جب اس نے دوبارہ یہی کہا تو مجھے خیال آیا کہ یہ جو اتنی خاطر تواضع کر رہا ہے اور بار بار پوچھتا ہے ۔ یہ علت سے خالی نہیں اور اس کی ہمدردی کی تہ میں کوئی اور بات ہے میں نے پوچھا کیا خدمت ہے ؟ میں سمجھا نہیں اس پر اس نے کہا کہ اگر کسی عورت کی ضرورت ہو تو لا دوں بڑے بڑے خان بہادروں اور رائے بہادروں کی لڑکیاں لا سکتا ہوں ۔ اس کی اس پیشکش کو سن کر مجھے شرارت سوجھی ۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو اس کام سے نفرت کرتا ہوں اور تھکا ہوا ہوں ۔ اب سو جاؤں گا ۔ میرے ساتھ جو سردار جی ہیں پٹیالہ کے رہنے والے بہت بڑے عیاش ہیں ۔ یہ اس مقصد کے لیے ہی دہلی آئے ہیں ۔ بازار سے ابھی واپس آ رہے ہیں ۔ ان سے پوچھ لو اور ان کیلئے انتظام کر دو ۔ میں یہ کہہ کر اور کروٹ لے کر دوسری طرف منہ کر کے سو گیا ۔ سردار بچنا ور سنگھ مذہبی خیال کی شخصیت تھے ۔ اس زمانہ میں سنگھ سبھا کی تحریکوں میں حصہ لیتے اور دن میں کئی کئی جپ جی صاحب جاپ صاحب اور رہ راس کا پاٹھ کرتے اور گوردوارہ ہر روز باقاعدہ جاتے ۔ جب یہ واپس آئے ۔ تو ہوٹل کے ملازم نے ان سے صاف الفاظ میں وہی کچھ کہا جو مجھے کہا تھا ۔ یہ سن کر سردار بچنا ور سنگھ کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اس کو بہت گالیاں دیں ۔ میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا تو سردار بچنا ور سنگھ نے (اپنے خیال میں) مجھے جگا کر اس سرائے کی دلالی پر توجہ دلائی اور بتایا کہ ملازم نے ان سے کیا کہا ۔ میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "سردار صاحب دہلی کے ہوٹلوں والے ایسے ہی بدمعاش ہیں ۔ اور یہاں آنے والے بھی ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں ۔ ان بیچاروں کو کیا علم کہ آپ دن رات پاٹھ کرتے ہیں اور گوردوارہ میں جاتے ہیں ۔" اس کے بعد ہم سو گئے اور اگلے روز واپس جالندھر چلے گئے ۔

ایک ریاست کی بیگم صاحبہ کا خط میرے پاس پہنچا کہ وہ اپنی ریاست سے بمبئی جا رہی ہیں ۔ میں بمبئی میں ان سے ملوں وہ اپنے حالات بیان کرنا چاہتی ہیں ۔ یہ ملاقات قطعی راز میں رہے اور کسی کو اس کا علم نہ ہو ۔ اس خط کے ملنے پر میں بمبئی گیا ۔ وہاں کرافرڈ مارکیٹ کے قریب ایک بڑے ہندوستانی ہوٹل میں مقیم ہوا ۔ ہوٹل میں پہنچنے کے بعد میں نے اس ذریعہ سے اس خاتون تک اطلاع پہنچائی جو ذریعہ اس نے بتایا تھا ۔ بیگم صاحبہ نے جواب میں کہا ۔ کہ وہ خود اس ہوٹل میں پہنچ جائیں گی ۔ چنانچہ اگلے روز یہ خاتون اپنی رولز رائس موٹر میں (اس زمانہ میں رولز رائس پچاس ساٹھ ہزار روپیہ میں ملتی تھی ۔ اب تو یقیناً

Marfat.com

اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپیہ سے کم نہ ہوگی اکیلی تشریف لائیں کیونکہ وہ میری اور اپنی ملاقات کو کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھیں، میں جس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا اس کا اور دوسرے کمروں کا برآمدہ ایک ہی تھا جس طرح ہوٹلوں کے متعدد کمروں کا ایک ہی برآمدہ ہوتا ہے۔ جب یہ خاتون میرے کمرے میں تشریف لے آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ دوسرے کمروں کے مسافر جب برآمدہ میں سے گزرتے ہیں تو اس خاتون کو جس کا لباس بہت قیمتی تھا اور جو بے حد حسین تھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور بعض کم بختوں نے تو اسی طرح سے برآمدے میں چکر لگانے شروع کر دیے ہیں جس طرح جنسی ناآسودہ لوگ ریلوے پلیٹ فارموں پر زنانہ ڈبوں کے سامنے ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں اور گاڑی میں بیٹھی خواتین کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو میں نے کمرے کے سامنے کا دروازہ بند کر دیا اور پچھلے دروازے کھول دیے۔ تاکہ یہ خاتون آوارہ لوگوں کی بری نظروں سے محفوظ رہیں۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے کے قریب باتیں کرتے رہے تو اس کے بعد بیگم صاحبہ اپنی کار میں واپس تشریف لے گئیں جہاں کہ ان کے شوہر مقیم تھے۔ جب یہ خاتون چلی گئیں تو نصف گھنٹے کے بعد ہوٹل کا بیرا چار روپیہ کا ایک بل لے آیا۔ میں حیران کہ یہ چار روپیہ کا بل کیسا ہے۔ اس پر صرف چار روپیہ لکھا تھا۔ کسی شئے کا نام نہ تھا۔ میں نے پوچھا: یہ بل کس چیز کا ہے تو بیرا نے بے تکلفی سے کہا: "جو صاحب بائی جی کو بلائیں چاہے وہ بائی جی کو خود لائیں یا ہماری معرفت بلائیں ہم چار روپیہ چارج کرتے ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ چار روپیہ دلالی کی فیس ہے۔ بل کو اور بیرا کو لے کر میں ہوٹل کے مینیجر کے کمرے میں گیا اور مینیجر سے پوچھا کہ یہ چار روپیہ کا بل کیسا ہے۔ مینیجر نے بھی بیرا والے الفاظ دہرائے مجھے بہت غصہ آیا۔ دل چاہتا تھا کہ اس مینیجر کا منہ پھیر دوں مگر میں نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا: "تم نے بائی جی کو خود دیکھا۔" مینیجر نے کہا: "ہاں میں نے خود دیکھا۔" میں نے کہا: "وہ موٹر میں آئی تھیں۔" مینیجر نے جواب دیا: "ہاں سیاہ رنگ کی بہت خوبصورت اور بڑی موٹر تھی۔" میں نے پھر سوال کیا: "اگر یہ بائی جی بدمعاشی کے لیے آئیں تو اس نے مجھ سے کتنے روپیہ لیے ہوں گے۔" اس نے سر کھجاتے اور کھسیانا صورت بناتے ہوئے کہا: "مجھے کیا علم۔ پچاس ساٹھ تو لیے ہوں گے۔" مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا: کمینے اور ذلیل شخص جو عورت ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کی قیمتی ساڑھی پہنے پچاس ہزار روپیہ کی موٹر میں آئی تمہارے خیال میں وہ بدمعاشی کی غرض سے آئی ہوگی اور تمہارے ہوٹل میں کسی شریف عورت کا آنا ممکن ہی نہیں۔ میں نے جب مینیجر کو برا بھلا کہا تو وہ بہت شرمندہ اور نادم ہوا اور اس نے اپنی غلطی کی معافی چاہی۔

یہ چند واقعات ہندوستانی ہوٹلوں اور سراؤں کے متعلق ہیں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستانی ہوٹلوں میں سو میں سے ننانوے ہوٹل بدچلنی اور بدمعاشی کے اڈے ہیں۔ ان میں کھانا نہایت ردی اور بدمزہ پکتا ہے کیونکہ دلالی کی آمدنی کے مقابلے پر یہ لوگ اچھا کھانا پکانے پر توجہ نہیں دیتے۔ ان کے غسل خانے گندے اور ملازم لاپروا اور گستاخ۔ مگر ان کے مقابلے پر انگریزی ہوٹلوں میں سے شاید ایک ہوٹل بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو عورتیں سپلائی کرنے کا کمینہ کام کرتا ہو۔ ان ہوٹلوں میں بھی بدچلنی

Marfat.com

ہوتی ہے مگر وہاں جو شخص چاہے کسی عورت کو بطور ایک دوست کے اپنے کمرے میں لا سکتا ہے۔ نہ ساتھ کے کمرے والوں کو کوئی دلچسپی نہ مالک ہوٹل کو کوئی اعتراض۔ نہ کسی کو آنے کا خیال نہ جانے کی فکر۔ فرش، غسل خانے اور کمرے صاف۔ ملازم چست اور فرماں بردار اور کھانا لذیذ اور زود ہضم۔ چنانچہ میں اب کئی برس سے سوائے مجبوری کے کبھی کسی ہندوستانی ہوٹل میں نہیں ٹھہرتا اور اگر کسی ہندوستانی ہوٹل میں کبھی ٹھہرتا ہوں تو اس صورت میں جب کہ کسی انگریزی ہوٹل میں جگہ نہ ملے۔

مرحوم مہاراجہ نابھہ کی گرفتاری

مرحوم مہاراجہ گورچرن سنگھ ۱۹۲۳ء میں اختیارات سے محروم کر دیئے گئے اور دست برداری میں جو شرائط تھیں ان کے مطابق مہاراجہ دریائے جمنا سے مغرب کی طرف یعنی پنجاب میں نہ جا سکتے تھے آپ کو ہز ہائی نس مہاراجہ کا خطاب اور توپوں کی سلامی کا حق دیا گیا تھا اور آپ کے لیے پچیس ہزار روپیہ ماہوار یعنی تین لاکھ روپیہ سالانہ پنشن یا الاؤنس مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ ۱۹۲۸ء میں الہ آباد کے مقام پر گرفتار کیے گئے۔ آپ کی گرفتاری کے حالات یہ ہیں:-

گورنمنٹ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے مہاراجہ کو الہ آباد میں گرفتار کرنے اور کوڈائی کنال (مدراس) میں نظر بند کرنے کی وجہ کچھ بھی ظاہر کی ہو مگر دراصل اس کا سبب گورنمنٹ کا آپ کے خلاف ہونا تھا۔ چنانچہ کاغذات میں اس گرفتاری اور آپ کے خطاب چھین لیے جانے اور الاؤنس کم کرنے کی وجہ جو بتائی گئی۔ وہ یہ تھی۔ کہ مہاراجہ نے امرتسر کے ایک گورمکھی ہفتہ وار اخبار میں اپنے نام سے ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مہاراجہ پٹیالہ پر الزام لگایا گیا تھا۔ کہ مہاراجہ پٹیالہ نے وائسرائے کو خوش کرنے کے لیے کسی جنگل سے ایک شیر منگایا۔ یہ شیر پٹیالہ کے قریب چھوڑ دیا گیا تاکہ وائسرائے اس کا شکار کریں اور خوش ہوں اور یہ شیر پٹیالہ کے قریب کی پبلک کے لیے خطرہ کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس مضمون کو مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف اخباری پراپیگنڈا قرار دیا گیا اور ظاہرا طور پر اس مضمون کی بنیاد دلیل پر ہی گرفتاری و کوڈائی کنال میں نظر بندی کی عمارت تعمیر کی گئی۔

گورنمنٹ نے جب مہاراجہ کو گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ کام یوپی کے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر پیل (یہ وہی مسٹر پیل ہیں جو لارڈ ارون کی ٹرین کو بم کے ذریعہ اڑا دینے والی سازش کے مقدمہ کے انچارج تھے۔ اور دہلی میں اس مقدمہ کی پیروی کرتے رہے) کے سپرد کیا گیا۔ گورنمنٹ نے پہلے فیصلہ کیا کہ مہاراجہ کو ڈیرہ دون میں گرفتار کیا جائے۔ پھر یہ خیال بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہاں مہاراجہ کی بیوی اور بچے تھے تاکہ ایجی ٹیشن نہ ہو۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ آپ کو اس وقت گرفتار کیا جائے جب آپ ڈیرہ دون سے باہر ہوں۔ چنانچہ مہاراجہ دہلی آئے۔ آپ کے اس سفر کا مقصد وائسرائے سے ملنا تھا۔ آپ یہاں سوس ہوٹل میں مقیم ہوئے تو آپ کی گرفتاری کا مکمل انتظام کر دیا گیا۔

Marfat.com

ہوٹل کے ارد گرد کئی درجن سی آئی ڈی کے لوگ منڈلاتے رہے اور ریلوے سٹیشن پر کمانڈر انچیف کی سپیشل آپ کو لے جانے کے لیے تیار رکھی گئی تھی کہ گورنمنٹ کو علم ہوا کہ آپ قانونی مشورہ کے لیے الہ آباد جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ اطلاع ملتے ہی دہلی میں گرفتاری کا ارادہ بھی بدل دیا گیا اور یہ انتظار کیا جانے لگا۔ کہ آپ الہ آباد جائیں اور وہاں گرفتاری ہو تاکہ دہلی میں بھی ایجی ٹیشن پیدا نہ ہو۔ جہاں اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کا مرکز تھا۔ مہاراجہ دہلی سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوئے تو اس گاڑی کے بعد جو گاڑی الہ آباد کو جاتی تھی اس میں مسٹر پیل۔ مسٹر اوکانز ڈپٹی انسپکٹر پولیس سی آئی ڈی یوپی اور سردار بہادر کشن سنگھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ متعدد اور افسر بھی تھے۔ یہ لوگ مہاراجہ کے پیچھے پیچھے الہ آباد پہنچے اور کمانڈر انچیف کی سپیشل کے لیے الہ آباد کے قریب ایک ریلوے سٹیشن فتح پر ہسوہ ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا۔ تاکہ الہ آباد میں اس گرفتاری کا شبہ یا علم نہ ہو۔

مہاراجہ نابھہ دو روز الہ آباد کے ایک ہوٹل میں مقیم رہے۔ سردار بہادر کشن سنگھ ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں ٹھہرے اور انتظار کیا جانے لگا۔ کہ مہاراجہ کب الہ آباد سے روانہ ہوں اور ریلوے سٹیشن پر یا راستہ میں آپ کی گرفتاری کی جائے۔ مہاراجہ کے الہ آباد میں قیام کے دو روز بعد دہلی جانے والی گاڑی میں جگہ ریزرو ہو چکی تھی۔ اور رات کو دس بجے مہاراجہ کے سیکرٹری (مسٹر بھارگو) اور ملازم سامان لے کر ریلوے سٹیشن پہنچ گئے اور سردار بہادر کشن سنگھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ریلوے سٹیشن سے ان افسروں کو اطلاع دیتے رہے۔ چنانچہ دس بجے سردار بہادر نے سامان پہنچنے کی اطلاع ان افسروں کو کلب میں دی جہاں کہ یہ موجود تھے۔ یہ افسر یعنی مسٹر اوکانز ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر پیل سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ مسٹر پیریس سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مسٹر لاجرس اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے علاوہ سات آٹھ کے قریب انسپکٹر، سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل، کنسٹیبل ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ مہاراجہ موٹر میں ساڑھے دس بجے ریلوے سٹیشن پہنچے اور آپ ریلوے پلیٹ فارم پر جب پل کے پاس کھڑے تھے تو یہ افسر آپ کے پاس آئے اور مسٹر اوکانز نے مہاراجہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو میں بحکم گورنمنٹ ہند گرفتار کرتا ہوں۔"

ان افسروں کا خیال تھا کہ شاید مہاراجہ اس خبر کو سن کر تشدد استعمال کریں یا خودکشی کی کوشش کی جائے اس لیے یہ لوگ بہت محتاط تھے۔ مہاراجہ نے پوچھا کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ تو اس کے جواب میں مسٹر اوکانز نے کہا:

"یہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کو علم ہے۔ ہمیں صرف آپ کی گرفتاری کا حکم ہے۔"

اس حکم کو سنانے کے بعد یہ افسر مہاراجہ کو ساتھ لے کر پولیس کلب میں آئے اس وقت مہاراجہ کے ملازموں سے کہا گیا۔ کہ مہاراجہ کے ساتھ دو ملازم جا سکتے ہیں جو جانا چاہے وہ بتائے۔ ان ملازموں میں سے سب نے مہاراجہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ صرف ایک نوجوان کشمیرا سنگھ آپ کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا۔ مہاراجہ کو کلب کے ایک کمرے میں پہرے کے اندر بٹھا دیا گیا

Marfat.com

اور دوسرے کمرے میں مشورہ ہوا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ مسٹر او کانر نے کہا۔ کہ مہاراجہ اور پولیس ایک لاری میں فتح پور ہسوہ جائے۔ مہاراجہ کو وہاں تھانہ میں بند کر دیا جائے اور پھر صبح کوڈائی کنال (مدراس) کے لیے روانگی ہو۔ اس پر سردار بہادر کشن سنگھ نے کہا کہ یہ بہت بڑا غلط قدم ہو گا۔ مہاراجہ کی پوزیشن ایک رولنگ پرنس کی تھی اور آپ ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن کے مطابق نظر بند کیے جا رہے ہیں۔ کوئی بات بھی مہاراجہ کی شان کے خلاف ہوئی تو گورنمنٹ اس پر اعتراض کرے گی اور ایجی ٹیشن پیدا ہو گی۔ چنانچہ مشورہ کے بعد مسٹر اجرٹن اور سردار بہادر کشن سنگھ سٹیشن ماسٹر الہ آباد کے پاس پہنچے اس سے ایک فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا انتظام کیا گیا۔ یہ کمپارٹمنٹ فتح پور ہسوہ جانے والی مال گاڑی کے ساتھ لگانے کا انتظام کیا گیا۔ مہاراجہ مع افسروں کے ریلوے سٹیشن آئے اور مہاراجہ کو اس میں بٹھا کر یہ کمپارٹمنٹ مال گاڑی کے ساتھ لگا دیا گیا۔ الہ آباد سے فتح پور ہسوہ ستر میل کے قریب ہے جب گاڑی روانہ ہوئی تو چلتی گاڑی میں مہاراجہ کی تلاشی لی گئی۔ مہاراجہ نے اپنا پستول خود ہی دے دیا جب گاڑی فتح پور ہسوہ پہنچی۔ وہاں کمانڈر انچیف کی اسپیشل انتظار میں کھڑی تھی۔ مہاراجہ اس میں بیٹھے اور مہاراجہ کے ساتھ پولیس کے چھوٹے افسروں اور کنسٹیبلوں کے علاوہ مسٹر پیل اور سردار بہادر کشن سنگھ تو کوڈائی کنال تک گئے۔ باقی بڑے افسر یعنی مسٹر او کانر وغیرہ فتح پور ہسوہ سے واپس الہ آباد چلے گئے۔

فتح پور ہسوہ کے سٹیشن پر اس وقت پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کا ایک نوجوان انگریز افسر بھی دہلی سے پہنچ گیا تھا جس نے مہاراجہ کو گورنمنٹ کا حکم دستی دیا۔ یہ سپیشل فتح پور ہسوہ سے کانپور، کانپور سے جھانسی، جھانسی سے منماڑ، منماڑ سے ڈھونڈ اور ڈھونڈ سے مدراس گئی کیونکہ اس زمانہ میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس والی لائن نہ تھی۔

یہ حالات ایڈیٹر "ریاست" کو مختلف ذرائع سے معلوم ہوئے۔ مہاراجہ نابھہ نے کوڈائی کنال میں ایک واقعہ بیان کیا جس کی سردار بہادر کشن سنگھ نے بھی تصدیق کی۔ مہاراجہ جب مدراس جا رہے تھے تو راستہ میں سردار بہادر کشن سنگھ نے حکام کے اشارے پر مہاراجہ کی ذہنی کیفیت معلوم کرنے کے لیے یا ویسے ہی باتوں باتوں میں پوچھا: "آپ کی اس گرفتاری اور نظر بندی کے بعد مہارانی نابھہ کیا پوزیشن اختیار کریں گی وہ ڈیرہ دون میں رہیں گی۔ نابھہ جائیں گی یا آپ کے پاس کوڈائی کنال آئیں گی اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"۔ مہاراجہ نے سردار بہادر کشن سنگھ کو جو جواب دیا وہ یہ تھا:

"سردار صاحب! میں اس سوال کا جواب تب دے سکتا تھا۔ اگر میری بیوی دیہات کے رہنے والے کسی جاٹ کی لڑکی اور غیر تعلیم یافتہ ہوتی یا میری ماں زندہ ہوتی تو میں بتا تا کہ میری ماں میری گرفتاری کے بعد کیا کرے گی۔ مہارانی ولایت کی تعلیم یافتہ ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ کیا کرے گی اس کا جو دل چاہے گا کرے گی"۔

مہاراجہ نابھہ نے یا تو سردار بہادر کشن سنگھ کے اس سوال سے متاثر ہو کر یا ویسے احتیاط کے طور پر ہی مجھے اور سردار سردول سنگھ کویشر کو ایکسپریس تار دیئے۔ جن میں لکھا کہ آپ میری بیوی اور بچوں کی ڈیرہ دون میں حفاظت کیجئے۔ یہ تار سردار بہادر کشن سنگھ کو بھیجنے کے لیے دیئے گئے۔ انہوں نے مسٹر

Marfat.com

پیل کو دکھا کر یہ تار ریلوے سٹیشن بیناسے تار گھر کو دیئے۔ ایڈیٹر ریاست کے نام کا تار چند گھنٹوں میں دہلی پہنچ گیا۔ اس تار کے مضمون کو نہ تو سردار بہادر کرشن سنگھ سمجھ سکے نہ مسٹر پیل۔ اس تار کا اصل مطلب یہ تھا۔ کہ مہارانی نابھ اور بچے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور مہاراجہ پٹیالہ سے کوئی تعلق پیدا کر کے ان کے ہاتھوں میں ٹول ثابت نہ ہوں۔ محتاط رہو۔ میں تار کا مطلب فوراً سمجھ گیا اور اسی شام کو ڈیرہ دون روانہ ہو گیا۔ میں جب ڈیرہ دون میں مہاراجہ کی کوٹھی اندر روڈ پہنچا تو وہاں نقشہ بدلا ہوا پایا۔ سر جیمس فٹز پیٹرک ڈیرہ دون میں مقیم ہیں۔ میرے جانے سے پہلے وہ ولی عہد نابھ (موجودہ مہاراجہ) کو خریلیٹ پیش کر چکے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ تم آج سے نابھ کے حکمران اور مہاراجہ ہو۔ مہاراجہ کے ملازم مستعدی اور تیزی سے سامان باندھنے میں مصروف ہیں۔ لکڑی کے کئی بکس تو سامان رکھ کر بند بھی کیے جا چکے ہیں اور سر جیمس فٹز پیٹرک کے ساتھ نابھ جانے ۔ وہاں شاہی داخلہ ہونے اور مستقل طور پر قیام کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد سردار سردول سنگھ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر مہارانی سے جب باتیں ہوئیں تو ہم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ شوہر کے گرفتار ہونے کے بعد آپ کا نابھ جانا اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں میں کھیلنا نہ صرف غیر مناسب ہے بلکہ آپ کی ذلت و رسوائی کا باعث بھی ہو گا۔ کیونکہ سکھوں میں ایجی ٹیشن ہو گی اور جہاں لوگ مہاراجہ کے حق میں ہوں گے وہاں آپ کو اپنے شوہر کا غدار سمجھتے ہوئے گالیاں دی جائیں گی۔ ہمارے اس کہنے پر مہارانی کے خیال میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ سامان کا باندھنا بند کر دیا گیا اور اس کے بعد مہارانی باوجود پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے زور دینے کے کئی برس تک نابھ نہ گئیں اور نہ آپ نے بچوں کو نابھ بھیجا۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ آپ کوڈائی کنال اپنے شوہر کے پاس نہیں گئیں بلکہ میاں بیوی کے تعلقات زیادہ کبیدہ ہوتے چلے گئے۔

مرہٹوں کا بڑھاپے میں جوش

مرحوم پروفیسر ابھینکار (فرگوسن لا کالج پونا) انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے اور آپ کانسٹی ٹیوشن لا کے اعتبار سے ہندوستان میں ایک اتھارٹی تسلیم کیے جاتے تھے۔ میرے جب اُن سے دوستانہ تعلقات ہوئے تو آپ کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی۔ آپ اپنے عزیزوں کی طرح مجھ سے محبت کرتے۔ جب کبھی پنجاب یا دہلی آتے۔ تو دفتر ریاست میں ضرور تشریف لاتے اور مختلف موضوع پر گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ اس عمر میں بھی آپ کے اندر جوانوں جیسا جوش زندگی تھا اور آپ صحیح معانی میں مرہٹہ تھے۔

مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف جب انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس نے ایجی ٹیشن جاری کی اور پٹیالہ کے واقعات سے متعلق تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا تو اس تحقیقاتی کمیشن کے ایک ممبر آپ بھی تھے یہ تحقیقاتی کمیشن لوگوں کی شہادتیں لینے کے لیے لاہور پہنچا۔ پرانی انارکلی کی ایک بلڈنگ میں اس کمیشن کا

Marfat.com

اجلاس شروع ہوا۔ ریاست پٹیالہ کے سینکڑوں لوگ شہادتیں اور بیانات دینے کے لیے آئے جن میں عورتیں بھی تھیں اور ان لوگوں میں زیادہ تر سکھ تھے۔ جن کی کمر میں اڑھائی اڑھائی فٹ کی لمبی کرپانیں لٹک رہی تھیں جب شہادتیں ہو رہی تھیں تو کوئی شخص یہ بیان دیتا تھا کہ مہاراجہ پٹیالہ اس کی بیٹی کو اغوا کرکے لے گیا۔ کوئی یہ شہادت دیتا۔ کہ اس کی بہن کو مہاراجہ نے جبراً اپنے محلات میں رکھ چھوڑا ہے۔ کوئی کہتا کہ اس کی بیوی کے ساتھ مہاراجہ نے زنا بالجبر کیا وغیرہ۔ جب یہ شہادتیں ہو رہی تھیں تو ان شہادتوں کو سن کر پروفیسر ابھینکار کا چہرہ غصہ کے باعث سرخ ہو گیا۔ آپ برداشت نہ کر سکے اور آپ نے شہادت دینے والے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"مہاراجہ پٹیالہ نے تو خیر وہ کچھ کیا جس کی کسی شریف انسان سے توقع نہیں مگر تم لوگ جیسا کمینہ، بے عزت اور بے حیا بھی میں نے دنیا میں کوئی نہیں دیکھا۔ تم لوگوں کو کمر میں کرپانیں لٹکائے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔ کہ تمہاری بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں تو مہاراجہ پٹیالہ نکال لے گیا اور تم کرپانیں کمر میں لٹکائے بے غیرتوں کی طرح زندہ پھر رہے ہو۔ تم مر کیوں نہیں جاتے تمہارے جیسے بے حیا لوگ اس دنیا میں کیوں موجود ہیں اور تمہیں کرپانیں لٹکاتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی۔"

پروفیسر ابھینکار کے ان الفاظ سے کمرے کے اندر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کرپانیں لٹکائے ہوئے سکھوں کے چہرے ندامت کے باعث پانی پانی ہو گئے اور ہر شخص اس بہادر مرہٹہ کے الفاظ سے متاثر تھا۔ پروفیسر ابھینکار نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کے مقدمہ پرنسس پروٹیکشن ایکٹ کی پیروی کے لیے چند بار ہوشنگ آباد بھی گئے۔ آپ مہاراشٹر اور سی پی میں بہت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ہوشنگ آباد کے وکلاء نے آپ کو ایک ٹی پارٹی بھی دی۔ جس میں مقامی وکلاء، مجسٹریٹ اور جج وغیرہ شامل ہوئے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے بہت کوشش کی کہ آپ فیس قبول کریں مگر آپ نے ریلوے کا کرایہ تک نہ لیا۔

ہوشنگ آباد کا ایک واقعہ بھی بہت دلچسپ اور آپ کی غیرت و حمیت اور سچائی کا مظہر ہے۔ ہم لوگ ڈاک بنگلہ میں مقیم تھے۔ صبح کا وقت تھا اور آپ کے ساتھ مسٹر بی۔ بی توکلی۔ سردار بہادر بھگوان سنگھ اور ہوشنگ آباد کے دوسرے مقامی وکلا مقدمہ کی تیاری میں مصروف تھے تو اخبار فروخت کرنے والا لڑکا "ٹائمز آف انڈیا" دے گیا۔ پروفیسر ابھینکار نے "ٹائمز آف انڈیا" دیکھنا شروع کیا تو ایک خبر تھی کہ مہاتما گاندھی نے تمام کانگرس کمیٹیوں کو ایک سرکلر لیٹر بھیجا ہے جس میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ کوئی کانگرس کمیٹی نیلا ناگنی (یہ امریکن یا انگلش نوعمر خاتون کچھ عرصہ مہاتما گاندھی کے آشرم سیواگرام میں رہی یہاں اس کا ناجائز تعلق دہلی کے ایک شخص سے جو وہاں مقیم تھا ہو گیا۔ اور جب مہاتما گاندھی نے اس خاتون سے بازپرس کی تو اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔) کو پناہ یا امداد نہ دے۔ پروفیسر ابھینکار نے جب اس خبر کو پڑھا تو غصہ کے باعث آپ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ آپ کرسی پر بیٹھ نہ سکے اور کھڑے ہو گئے۔ آپ کے

Marfat.com

ہاتھوں میں اخبار تھا۔ آپ نے کھڑے ہو کر غصہ کی حالت میں کہا:

"کس قدر ظلم ہے کہ ایک نوجوان لڑکی نے جذبات سے مجبور ہو کر ایک غلطی کر دی تو اس کو نہ صرف آشرم سے نکال دیا گیا بلکہ اب سر کولر بھیجا گیا ہے کہ اس کو کوئی شخص امداد یا پروٹیکشن نہ دے۔ کیونکہ اس بچاری نے اپنے عشق و محبت کے جرم کا اقرار کر لیا مگر اس فاحشہ لیڈرانی کو کوئی نہیں پوچھتا جس نے اپنی جوانی میں ایک بھی پولیٹیکل لیڈر نہ چھوڑا تھا۔ زندگی بھر بدچلن رہی۔ بدچلنی پھیلاتی رہی اور سب لوگوں میں پُرہان بنی پھرتی ہے کیونکہ اس نے اپنی بدچلنی کا کبھی اقرار نہیں کیا۔"

ہم لوگ پروفیسر ابھینکار کے یہ الفاظ سن کر حیران بھی تھے اور آپ کی سچائی و جرأت کی داد بھی دے رہے تھے۔

ان دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرہٹے جو ایک مارشل یعنی فوجی خصوصیات کی قوم ہے بڑھاپے میں بھی کس قدر غیور، جوشیلے اور حق پسند ہیں۔ اور ایک سو سال کی غلامی کے بعد بھی ان کے اندر وہ حمیت موجود ہے جو اڑھائی تین سو سال پہلے سیوا جی مرہٹہ میں تھی۔

وضعداریاں

مرحوم قاضی صاحب سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم دتیا میں جہاں اور درجنوں خوبیاں تھیں وہاں وضعداری کے اعتبار سے بھی وہ بہت ہی قابل احترام شخصیت تھے۔ جب کسی شہر میں جاتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے پرانے ملنے والے دوستوں کے ہاں نہ پہنچتے اور اگر کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو خط لکھ کر معافی نہ چاہتے۔

قاضی صاحب مرحوم دہلی میں ہمیشہ سیسل ہوٹل میں قیام کرتے اور شاید اس ہوٹل کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا واحد واقعہ ہے کہ قاضی صاحب تیس برس کے طویل عرصہ میں جب کبھی دہلی آئے اس ہوٹل میں ہی مقیم ہوئے اور کسی بھی دوسرے ہوٹل میں نہ ٹھہرے۔ اس ہوٹل کی مالکہ ایک انگریز خاتون تھیں۔ اس خاتون کے دل میں بھی قاضی صاحب کے لیے بہت عزت تھی۔ اگر کمرے خالی نہ ہوں تو یہ خاتون دوسروں کے لئے تو کمرہ دینے سے انکار کر سکتی تھیں مگر یہ ممکن نہ تھا کہ قاضی صاحب کو ان کے پہنچنے پر یہ کہہ دیتیں کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اگر کبھی ہوٹل کا کوئی کمرہ خالی نہ

Marfat.com

ہوا اور قاضی صاحب تشریف لے آئے تو اس بیچارے نے اپنا ذاتی کمرہ قاضی صاحب کے لیے خالی کر دیا اور خود کسی سٹور روم وغیرہ میں ایک دو دن قیام کر لیا۔ مگر قاضی صاحب کو جواب نہ دیا۔ قاضی صاحب سے راقم الحروف نے کئی بار کہا کہ نئی دہلی میں امپیریل ہوٹل بہت اچھا ہوٹل ہے۔ اس کی فضا بہت اچھی ہے اور سوسائٹی کے اعتبار سے بھی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا مرکز ہے۔ وہاں ٹھہرا کیجئے۔ تو قاضی صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ اتنے برس سے سیسل ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ وضعداری اس میں ہی ہے کہ زندگی میں جب کبھی دہلی آؤں اسی ہوٹل میں ہی ٹھہروں۔"

دہلی میں ایک حجام تھا جس کا میں نام بھول گیا ہوں اس کو "رائل باربر" کہا جاتا تھا اس حجام نے درجنوں بادشاہوں، درجنوں وائسرائے، کمانڈر انچیفوں، گورنروں اور والیان ریاست کی حجامت بنائی۔ چنانچہ لارڈ کرزن اور لارڈ کچنر کے بعد کے تمام وائسرایوں اور کمانڈر انچیفوں کے اس کے پاس سرٹیفکیٹ تھے۔ افغانستان کے کنگ حبیب اللہ اور امان اللہ کے علاوہ بہت سے ممالک کے ان بادشاہوں کی بھی اس نے حجامت بنائی جو ہندوستان میں آئے اور یہاں وائسرائے ہوس میں بطور مہمان مقیم ہوئے۔ اور جب جارج پنجم کا دربار ہوا تو یہ شخص بھی سرکاری طور پر انگلستان میں مدعو کیا گیا اور وہاں اس نے کنگ جارج پنجم، کنگ ایڈورڈ جو گدی سے دست بردار ہوئے ان کی بھی حجامت بنائی۔ قاضی صاحب مرحوم جب کبھی دہلی آتے۔ یہ حجام ان کی حجامت کے لیے ہر روز صبح پانچ بجے سیسل ہوٹل میں پہنچ جاتا قاضی صاحب اس کو حجامت کی اجرت پانچ روپیہ روزانہ دیتے۔ اور یہ شخص بھی منتظر رہتا۔ کہ قاضی صاحب کب تشریف لائیں اور یہ سیسل ہوٹل جانا شروع کرے۔ چنانچہ یہ حجام اگر کبھی راقم الحروف کو راہ میں مل جاتا تو خیریت پوچھنے کے بعد یہی سوال کرتا کہ قاضی صاحب کب تشریف لا رہے ہیں۔ ایک روز میں بھی قاضی صاحب سے ملنے کے لیے صبح پانچ بجے سیسل ہوٹل گیا (قاضی صاحب سے ملنے کا بہتر وقت یہی تھا کیونکہ سکون سے باتیں کر سکتے تھے ورنہ سورج نکلنے کے بعد تو ان سے ملنے والوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا) تو یہ حجام قاضی صاحب کی حجامت بنا رہا تھا۔ حجامت سے فارغ ہوا تو قاضی صاحب نے اسے اپنے ملازم سے پانچ روپیہ دلوا دیئے۔ جب حجام پانچ روپیہ لے کر چلا گیا اور قاضی صاحب ہاتھ منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں تھے تو قاضی صاحب کے ایک ملازم نے قاضی صاحب کی فضول خرچی کا شکوہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ دوسرے نائی تو دو چار آنہ میں حجامت بنا دیتے ہیں۔ یہ شخص قاضی صاحب سے ہر روز پانچ روپیہ لے جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے اس ملازم کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو میں مسکرا دیا۔ میرے مسکرانے پر قاضی صاحب نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ آپ کی فضول خرچی کا ذکر ہے کہ دوسرے حجام تو دو یا چار آنے شیو کا لیتے ہیں۔ آپ پانچ روپیہ دیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا "سردار صاحب! یہ شخص بیس پچیس برس سے حجامت بنا رہا ہے۔ اب تک تو میں اس وضعداری کو نبھائے جا رہا ہوں۔ خدا کرے زندگی تک نبھائے چلا جاؤں۔ ہر شخص اپنی قسمت کا لیتا ہے کون کسی کو دیتا ہے اور کون کسی سے لیتا ہے۔ نہ معلوم خدا ان لوگوں کے لیے ہی مجھے دیتا ہو۔"

Marfat.com

بھیا شیخ احسان الحق میرٹھ کی بھیا فیملی میں سے ہیں۔ یہ وہی فیملی ہے جو یوپی کے بہت بڑے زمیندار میں سے ہے اور جس نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد برٹش گورنمنٹ کو کئی لاکھ روپیہ دے کر جامع مسجد دہلی واپس لی۔ بھیا احسان کی وضعداری کے قصے بہت دلچسپ ہیں اور اس وضعداری کے باعث آپ نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپیہ دوستوں پر صرف کیا۔ بھیا ایک روز دفتر "ریاست" میں بیٹھے تھے تو راقم الحروف نے دیکھا کہ آپ کی ایک انگلی میں سیاہی مائل رنگ کا ایک چھلا پڑا ہے۔ یہ چھلا تنگ ہے اور انگلی موٹی ہے ایڈیٹر "ریاست" نے مذاقاً کہا کہ بھیا اگر چھلا پہننے کا ہی شوق ہے تو اس چھلے کو نکال دیجئے اور اس سے بڑا چھلا بازار سے خرید کر پہن لیجئے۔ تاکہ انگلی کو تکلیف نہ ہو۔ بھیا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے لیکن ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے آپ نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ جب زیادہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: "پچیس تیس برس ہوئے بواسیر کی شکایت ہو گئی تھی۔ بیوی نے بواسیر کا یہ چھلا کہیں سے منگا کر اپنے ہاتھ سے پہنا دیا۔ اس کے دو چار برس بعد بیوی بیمار ہو گئیں۔ دماغ پر دیوانگی کا اثر ہے پہچان بھی نہیں سکتیں اور نہ کوئی بات کر سکتی ہیں اب اس چھلے کو اتارنے کو جی نہیں چاہتا محبت کے جذبات کے ساتھ بیوی نے پہنایا تھا اسے جدا کرنا گوارا نہیں"۔ بھیا احسان نے یہ کہا اور ان کی آنکھیں اور زیادہ ڈبڈبا آئیں۔

آج سے پچیس تیس یا چالیس برس پہلے تو عام لوگوں میں بھی وضعداری تھی اور یہ اپنی بات کا پاس کرتے تھے۔ اب تو ہزارہا لوگوں میں سے شاید ایک آدھ ایسا نکل آئے جو اپنی وضع پر قائم ہو۔ اور جس کو اپنی زبان یا اپنے شعار کا خیال ہو۔ پندرہ برس کا عرصہ ہوا۔ دہلی کی ایک نامور طوائف کا تعلق یہاں کے ایک ہندو رئیس سے تھا۔ یہ رئیس زیور، کپڑا اور دوسرے تمام اخراجات کے علاوہ اس طوائف کو پانچ سو روپیہ ماہوار (جو آج کے دو ہزار روپیہ کے برابر سمجھنا چاہیئے) دیتا تھا اور یہ طوائف امیرانہ زندگی گزارتی تھی۔ اس طوائف نے اپنی عمر کے درمیانی حصہ میں ایک پروفیسر سے شادی کر لی۔ اور اور اپنی زندگی کو قطعی بدل دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس طوائف نے اپنے نکاح کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنا تمام زیور، کپڑا اور دوسرا سامان جمع کر کے ایک گاڑی میں رکھوایا اور اس رئیس کے ہاں واپس بھیج دیا۔ اور ساتھ کہلا بھیجا کہ "یہ تمام نے دیا تھا۔ اب میں نے اپنی زندگی بدل لی ہے نہ اس سامان پر میرا کوئی حق ہے اور نہ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں"۔ یہ رئیس بہت فیاض اور فراخ دل تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ اس سامان کو یہ طوائف رکھ لے۔ تاکہ اس کی آئندہ زندگی میں اس کے یا اس کے شوہر اور بچوں کے کام آئے مگر اس طوائف نے انکار کر دیا۔ اور پھر کہلا بھیجا کہ جس صورت میں میرا اب آپ سے کوئی تعلق نہ ہو گا یہ وضعداری کے خلاف ہے۔ کہ میں آپ کے دیئے ہوئے سامان کو رکھوں یا استعمال کروں"۔

موری دروازہ کے ڈفرن برج کے بالکل قریب ایک صاحب لالہ رام چند رہتے تھے۔ یہ بھی بزرگ تھے جنہوں نے ۱۹۰۳ء کے دہلی دربار کے موقع پر دہلی میں سب سے پہلے موٹر منگائی تھی اور

Marfat.com

اس موٹر کو دیکھنے کے لیے والیانِ ریاست تک آئے تھے۔

۱۹۰۶ء میں لالہ رام چندر کے مرحوم سر اسرار حسن خاں (سابق ہوم منسٹر ریاست بھوپال و وزیر اعظم ریاست خیرپور) سے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ اس زمانہ سے مرحوم سر اسرار حسن خاں جب کبھی دہلی آتے تو لالہ رام چندر جی کے ہاں قیام کرتے۔ لالہ رام چندر اور سر اسرار حسن خاں کا انتقال ہوئے بہت برس ہو گئے۔ سر اسرار حسن خاں جب تک زندہ رہے لالہ رام چندر کے ہاں اسی مکان میں قیام فرمایا کرتے۔ سر اسرار حسن خاں کے عروج کو دیکھ کر جنوں اصحاب نے اپنی بڑی بڑی کوٹھیاں پیش کیں اور کوشش کی کہ آپ ان کے ہاں قیام کریں مگر آپ نے ہمیشہ ہی انکار کیا اور ایک بار راقم الحروف سے کہا: "دوستوں کی جھونپڑی میں بھی وہ لطف ہے جو بڑے بڑے محلات میں بھی میسر نہیں۔ اگر میں اس مکان میں قیام کرنا چھوڑ دوں تو یہ میری وضعداری اور دوستی کے شعار کے خلاف ہے۔"

ان چند واقعات سے اندازہ کیجئے کہ آج سے چوتھائی صدی پہلے کے لوگ بھی کتنے وضعدار اور بامروت تھے اور اب ہماری حالت کیا ہے۔

ریاستوں کی رعایا کا احساس کمتری

انگریزی علاقہ کے رہنے والے لوگ جو کبھی ریاستوں میں نہیں گئے وہ ریاستوں کی رعایا کے احساس کمتری (جس کو والیانِ ریاست وفاشعاری قرار دیتے تھے) کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور ریاستوں کے لوگ والئی ریاست کو دل سے چاہے کتنی نفرت کرتے اور مظالم سے نالاں تھے مگر اس طوائف کی طرح جو کسی گندے میلے بدبودار اور معمر سیٹھ کو خوش کرنے کے لیے اپنے چہرے پر فرضی مسکراہٹ لائی ہوئی سیٹھ صاحب سے اظہارِ محبت کرتی ہے۔ ریاستوں کی پبلک بھی اپنے حکمران کی وفاشعاری کا مصنوعی طور پر دم بھرتی اور احساس کمتری کا یہ اثر صرف والیانِ ریاست کی اپنی رعایا پر ہی نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتے جو ریاستوں کی عارضی طور پر ملازمت اختیار کرتے۔

ایڈیٹر "ریاست" جب نابھ میں ملازم ہوا تو ملازمت سے پہلے وہ اپنے آپ کو بطور ایک اخبار نویس کے بہت ہی انڈی پنڈنٹ سمجھتا تھا اور وائسرائے تک کی پروا نہ کرنے کا دم بھرتا تھا مگر ریاست نابھ کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد یہ آہستہ آہستہ خودداری سے محروم ہو گیا۔ خودداری کی جگہ احساس کمتری نے لے لی۔ مہاراجہ نابھ کو مراعن الخطا اور ان داتا سمجھا جانے لگا۔ اگر مہاراجہ کبھی ملنے کے لیے طلب کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی بہت بڑی عزت یا خطاب بخش دیا گیا اور اگر دوسرے لوگوں کو طلب کرنے کے بعد ایڈیٹر ریاست کو یاد نہ فرمایا جاتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے بہت بڑی توہین کر دی ہے اور یہ احساس کمتری مجھ تک ہی محدود نہ تھا۔ اس میں

Marfat.com

وہاں کا ہر منسٹر، ہر افسر، ہر اہل کار، ہر ملازم اور ہر باشندہ مبتلا تھا اور صرف احساس کمتری ہی نہیں بلکہ حالت یہ تھی کہ اگر کسی سے مہاراجہ خوش تو ان کی تمام رعایا اس سے خوش اور اگر مہاراجہ ناراض تو ان کی تمام رعایا اس کی دشمن۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اگر میں کبھی مہاراجہ سے ملنے کے لیے ہیرامحل گیا۔ مہاراجہ بہت خوش ہوئے اور بہت تپاک سے ملے اور میں واپسی کے وقت اپنے گھر پیدل آیا (میرا مکان ہیرامحل سے دو فرلانگ کے قریب ہوگا) تو راستہ میں لوگوں نے میرے پیدل آنے سے اندازہ کر لیا کہ مہاراجہ ناراض ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگ دیکھ کر منہ پھیر لیتے اور کوئی سلام تک نہ کرتا اور اگر میں ہیرامحل کسی اپنے کام یا پرائیویٹ سیکرٹری سے ملنے کے لیے جاتا۔ مہاراجہ کو میرے وہاں آنے کا علم تک بھی نہ ہوتا۔ واپسی کے وقت کوئی سرکاری موٹر اتفاق سے شہر کی طرف آ رہی ہوتی اور میں اس موٹر میں اپنے مکان تک بیٹھ جاتا تو لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ مہاراجہ بیحد خوش ہیں جو موٹر میں واپس گھر بھیجا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ راستہ میں جو ملتا جھک جھک کر اور مسکرا مسکرا کر گویا کہ یہ بھی میرے لیے خدا کا شکرانہ ادا کر رہے ہیں اسلام کرتا۔ اس زمانہ میں ریاست نابھہ میں سوائے سرکاری موٹروں کے کسی شخص کے پاس موٹر نہ تھی۔ حالانکہ وہاں درجنوں جاگیردار موٹریں رکھ سکتے تھے۔ موٹروں کی عدم موجودگی کا باعث لوگوں کا یہ احساس کمتری تھا کہ اگر موٹر خرید لی گئی تو سواری کے اعتبار سے یہ مہاراجہ کی برابری اور مقابلہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو احساس کمتری کی حالت یہ تھی کہ لوگ اس زمانہ میں گھوڑا گاڑی رکھنا بھی تکبر، غرور اور سرکار کی برابری کرنا سمجھتے تھے۔

اس زمانہ میں نابھہ میں دو یا تین تعلیم یافتہ اصحاب کا آپس میں ملنا بھی ایک قسم کی سازش قرار دیا جاتا تھا اور پبلک میں یہ احساس تھا کہ مہاراجہ کی مشکوک طبیعت لوگوں میں آپس میں ملنا گوارا نہیں کرتی چنانچہ اگر ایک تعلیم یافتہ شخص کسی دوسرے تعلیم یافتہ سے ملتا تو چوروں کی طرح چھپ چھپ کر۔ جس زمانہ میں ایڈیٹر "ریاست" نابھہ میں تھا۔ اس زمانہ میں مسٹر ایس رنگا آئینگر جو پہلے اخبار "لیڈر" الہ آباد میں تھے اور بعد میں "رائز ویکلی" دہلی کو ایڈیٹ کرتے رہے، ایک بنگالی مسٹر ہری پرشاد سور جو وہاں اسسٹنٹ سیکرٹری تھے اور مسٹر ہری رام سرکاری وکیل (جو بعد میں نابھہ میں جج ہائیکورٹ تھے) ایڈیٹر "ریاست" کے دوستوں میں سے تھے۔ ہم چاروں شام کے وقت نابھہ سے دو تین میل دور سیر کے لیے نکل جاتے۔ یہ وقت گپ بازی میں اچھا گزر جاتا اور ہم ہمیشہ اس سڑک پر جاتے جہاں مہاراجہ جانا پسند نہ کرتے تاکہ مہاراجہ ہم چاروں کو ایک جگہ اکٹھے نہ دیکھ لیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ ہم سیر کے لیے گئے اور واپسی کے وقت حسب معمول کچھ اندھیرا سا ہو گیا تو ہم نے دیکھا کہ ایک موٹر بہت تیز روشنی کے ساتھ اسی سڑک پر آ رہی ہے۔ ہمیں فوراً احساس ہوا کہ یہ کار مہاراجہ کی ہے اور مہاراجہ ہم چاروں کو اکٹھے سیر کرتے دیکھ کر ناخوش ہوں گے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ سڑک سے ایک طرف دور چلے جائیں تاکہ مہاراجہ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ موٹر تیزی کے ساتھ آ رہی تھی۔ ہم نے بھی مناسب یہی سمجھا کہ بھاگ کر سڑک سے دور فاصلے پر چلے جائیں۔ تاریکی کافی تھی

Marfat.com

دوڑ رہے تھے۔ راستہ میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوڑتے ہوئے سر ٹیلا سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے دونوں کے گھٹنوں پر بہت سخت چوٹ آئی۔ گھٹنے میں سے خون نکل گیا۔ سر ٹکا آپ تو تکلیف کے باعث رو رہے تھے۔ دونوں زخمیوں کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل تھا۔ تو اس ہنسی میں ہمدردی کے جذبات بھی تھے۔ جب سر نکال کر نیچے پڑے تھے اور کچھ لنگڑاتے ہوئے ہمارے ساتھ واپس آئے تھے تو میں نے ان سے مذاق کیا کہ آپ بدبخت ہیں تو اردو اخبار کو ایڈیٹ کرتا رہا اور اردو اخبارات کے سب سے بڑا تنخواہ ہے۔ آپ جیسے جاہل وحشی کی رہا ہوں۔ انگریزی کے اخبارات تو ملک میں بہت ہی ہیں۔ تم نے یہاں آنے کی جھک کیوں ماری۔

مہاراجہ کی موٹر کے متعلق یہ لوگوں کے لیے یہ بہت دقت تھی کہ اگر کوئی شخص موٹر کو دور سے آتے ہوئے دیکھ کر ہاتھ باندھے ہوئے ادب سے کھڑا نہ ہو اور مہاراجہ اس موٹر کے اندر موجود ہوں تو یہ مہاراجہ کی ہتک اور توہین سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر مہاراجہ کی موٹر کو آتے دیکھ کر وہ ہاتھ باندھے ادب سے کھڑا ہو اور جب معلوم ہو کہ موٹر میں مہاراجہ موجود نہیں ہیں۔ صرف ڈرائیور خالی کار کو لیے جا رہا ہے تو ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہونے کا ڈرائیور نے مذاق اڑایا۔ چنانچہ ایک بار رات کا وقت تھا میں سیر سے واپس آ رہا تھا تو سامنے سے موٹر آ گئی۔ میں بھی احساس کمتری کے باعث دونوں ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ جب موٹر قریب آئی۔ تو موٹر کھڑی ہو گئی میں نے دیکھا کہ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری سردار بہادر گوردیال سنگھ بیٹھے ہیں۔ سردار گوردیال سنگھ بہت اچھی طبیعت کی شخصیت تھے اور ایڈیٹر ریاست کے مخلص دوست تھے۔ آپ نے میرے کھڑا ہونے پر بتایا کہ کار میں صرف وہ ہیں۔ مہاراجہ نہیں ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ میرا ہاتھ باندھے کھڑا ہونا غلط فہمی کا باعث ہے۔ سردار گوردیال سنگھ کے اس ارشاد پر میں نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

> ریاست نابھہ میں مہاراجہ صاحب کو ٹھاکروں کی پوزیشن حاصل ہے اور مہاراجہ کی موٹر ٹھاکر دوارہ ہے۔ ٹھاکر دوارہ میں گو ٹھاکر نہ ہوں پھر بھی لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ٹھاکر دوارہ کو سجدہ کریں۔

میرے یہ الفاظ سن کر سردار گوردیال سنگھ قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور پھر دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

احساس کمتری صرف نابھہ کے لوگوں میں ہی موجود نہ تھا بلکہ اس وبا سے ہندوستان کی کوئی ریاست بھی خالی نہ تھی اور احساس کمتری کی لعنت سے ریاستوں کو پاک کرنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ والیان ریاست کا اقتدار ختم کر کے ریاستوں میں پبلک کی ذمہ دار حکومتیں قائم کی جائیں۔

Marfat.com

شہرت باعثِ راحت نہیں

جس طرح شادی نہ ہونے کی صورت میں انسان کے دل میں انتہائی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شادی ہو اور جب شادی ہو جائے تو شادی ہونے کا اسے باربار افسوس ہوتا ہے۔ اس طرح ہی شہرت حاصل کرنے کی بھی کیفیت ہے۔ انسان جب تک شہرت حاصل نہ کرے۔ قدرتی طور پر اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو اور لوگ اس کو جانیں مگر لوگ جب اسے جاننے ہوں اور اس کی شہرت ہو جائے تو اسے رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ اسے کیوں جانتے ہیں اور وہ گمنامی کی زندگی بسر کیوں نہیں کر رہا کیونکہ پبلک میں شہرت ہونے کی صورت میں اس کی زندگی کا ہر کام۔ ہر فعل اور ہر قدم چاہے وہ کتنا ہی پرائیویٹ اور نجی حیثیت رکھتا ہو۔ پبلک کی نظروں میں قابلِ تنقید قرار دیا جاتا ہے اور شہرت نہ ہونے کی صورت میں چاہے انسان کوئی بُرے سے بُرا کام کرے وہ قابلِ تعزیر نہیں سمجھا جاتا۔

اخبارات کے دفاتر میں پبلک کی طرف سے جو خطوط آتے ہیں وہ ورائٹی کے اعتبار سے بہت کافی مواد کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا وہ حصہ تو بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے جس میں مضامین یا نظمیں بھیجنے والے اصحاب اپنے نام کے ساتھ خود ہی "عالی جناب" "مایہ ناز ادیب" "شاعرِ بے مثال" "خطیبِ ہند" "شاعرِ انقلاب" "جناب حضرت" اور "آفتابِ سخن" وغیرہ لکھ دیتے ہیں تاکہ یہ القابات اس طرح سے ہی شائع ہو جائیں اور پبلک میں ان کو شہرت نصیب ہو کیونکہ ان بیچاروں کو علم نہیں کہ شہرت یافتہ ہونے کی صورت میں انسان کے لیے کتنی بڑی مصیبت ہے اور گمنامی میں کتنی راحت اور آرام ہے۔

یہ درست ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" کو بھی پبلک میں آنے سے پہلے شہرت کی خواہش تھی مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ خواہش تھی تو یقیناً یہ بہت ہی محدود تھی اور راقم السطور نے جرنلزم کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد تو ہمیشہ ہی کوشش کی کہ یہ عام لوگوں کی نظروں سے دُور رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "ریاست" کو پڑھنے اور اس کا اعتراف کرنے والوں کا حلقہ تو بہت کافی وسیع ہے مگر ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے والوں کا حلقہ بہت ہی محدود ہے اور ایڈیٹر "ریاست" اگر کبھی بازار میں جائے تو گنتی کے صرف چند لوگ ہوں گے جن کو اس سے ملنے یا کبھی دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ چنانچہ یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ اگست ۱۹۴۲ء میں ایڈیٹر "ریاست" جب کانگریسی حضرات کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی جیل گیا تو وہاں دہلی کے ساٹھ کے قریب پولیٹیکل قیدیوں میں سے "ریاست" سے تو تمام ہی واقف تھے مگر ایڈیٹر "ریاست" کو ذاتی طور پر جاننے والے شاید چار یا پانچ سے زیادہ اصحاب نہ تھے اور یہی کیفیت ملتان جیل میں تھی۔ وہاں چھ سو کے قریب پولیٹیکل نظر بند تھے

Marfat.com

مگر ایڈیٹر "ریاست" سے ذاتی طور پہ واقف۔ شاید ایک درجن سے زیادہ اصحاب نہ ہوں گے اور افسوس ہوتا تھا جب ان میں سے اکثر نئے اصحاب اخلاص و محبت کا اظہار کرنے کے لیے ملنے آتے کیونکہ تعلقات کو محدود رکھنے کی وہاں کوئی صورت ممکن نہ تھی اور ذہنی اعتبار سے میرے لیے وہی شہرت کافی باعث کوفت تھی۔ جو اس سے پہلے مجھے بطور ایک اخبار نویس کے حاصل ہو چکی تھی۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ سنٹرل اسمبلی کے میرے ایک دوست کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ آپ اسمبلی کے سیشن کے لیے دہلی آئے اور یہاں کام کی زیادتی کے باعث ان کا جی تفریح اور گانا سننے کے لیے چاہا تو آپ شہرت کے باعث دہلی کی کسی طوائف کے ہاں جا نہ سکتے۔ اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ وہ کسی طوائف کو اپنے ہاں بلا سکیں (اب گورنمنٹ کی مہربانی سے اچھی طوائف کا گانا ریڈیو پر گھر میں ہی سنا جا سکتا ہے) تو بچارے لوگوں کی نظروں سے بچ کر میرٹھ جاتے اور وہاں اپنا گانا سننے کا شوق پورا کر آتے۔ ان کی اس مہنگی تفریح کا ایک بار ذکر آیا۔ تو آپ نے ایڈیٹر "ریاست" سے کہا کہ میرٹھ جا کر گانا سننا مہنگی تفریح ہے مگر اس صورت میں کہ یہ تفریح دہلی میں ہو زیادہ مہنگی ثابت ہو گی۔ کیونکہ یہاں اکثر لوگ مجھے جانتے ہیں۔ لوگوں میں یہ چرچا ہو گا کہ میں ممبر اسمبلی ہوتے ہوئے طوائفوں کے ہاں جاتا ہوں۔ حالانکہ میں زندگی میں کبھی بھی کسی طوائف کے ہاں بدچلنی کی نیت سے نہیں گیا اور میری تفریح صرف موسیقی تک ہی محدود ہے۔ یعنی ان صاحب کے لیے ممبر اسمبلی ہونے کی شہرت وبال جان تھی۔ حالانکہ یہ شہرت ان لوگوں کے لیے باعث کشش و رغبت ہے جو اسے حاصل نہیں کر سکے۔

ایک رانی صاحبہ نے شہرت کے سلسلے میں راقم الحروف سے بہت دلچسپ بات کہی۔ آپ نے فرمایا کہ عورتوں میں بے معنی باتیں کرنے کی بہت عادت ہے اور جب ملیں تو یہ سوال عام طور پر پوچھتی ہیں: "تمہارے شوہر کیا کام کرتے ہیں"، "تمہارے میکے کہاں ہیں؟"، "خدا کے فضل سے تمہارے کتنے بچے ہیں"، "تمہارے شوہر کیا تنخواہ پاتے ہیں" وغیرہ۔ ان ایسے سوالات کا کیا جواب دیا جائے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ آپ فلاں ریاست کی رانی ہیں تو مزید سوالات کی وہ بوچھاڑ ہو کہ جو کئی ہفتوں تک ختم نہ ہو۔ چنانچہ آپ پچھلے چند برس سے اپنے شوہر کے متعلق تو صرف یہی جواب دے دیا کرتیں کہ "میرے پتی فوج میں ملازم ہیں اور لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کہ کب واپس آئیں"۔

اس خاتون نے کہیں جانا ہو تو سیکنڈ کلاس میں سفر کرتی ہیں تاکہ لوگ ان کو رانی نہ سمجھیں کیونکہ رانی ہونے کی شہرت بھی ان کے لیے کافی مصیبت کا باعث ہو سکتی ہے اور لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست" بھی جب سفر میں ہو تو وہ کبھی یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے۔ اور اگر کوئی سوال کرے تو جواب بے اعتنائی کے ساتھ صرف یہ ہوتا ہے "میں گوجرانوالہ کے ضلع کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں اور اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہوں" تاکہ ہم سفر مزید سوالات زیادہ نہ کریں۔ کیونکہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میرا اخبار "ریاست" سے تعلق ہے تو سوالات شروع ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

"کیا ہٹلر فی الحقیقت مرگیا۔ یا زندہ ہے" "سوبھاش بابو کب تک ظاہر ہو جائیں گے" "فلاں مہاراجہ کے کتنی بیویاں ہیں" "نظام دکن کے پاس کتنا روپیہ ہوگا؟" "مسٹر جناح انگریزوں سے ملے ہوتے تھے یا نہیں" وغیرہ۔ یہ لوگ اپنی معلومات کو وسیع کرنے کے لیے صرف سوالات کرنا جانتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ نہ تو اخبارات کے ایڈیٹروں کے ساتھ ہٹلر کی خط و کتابت ہے نہ سوبھاش چندر بوش کبھی ان سے بذریعہ وائرلیس بات کرتے ہیں۔ نہ یہ نظام کے خزانہ کے خزانچی ہیں اور نہ ان لوگوں کی بیویاں شمار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تمام بے معنی سوالات صرف اس جرم میں کیے جاتے ہیں کہ اخبارات کی لوگوں میں شہرت ہے اور لوگ ایڈیٹروں کے نام سے واقف ہیں۔

اگر شہرت کے نتائج پر غور کیا جائے تو شاید ہندوستان میں سب سے زیادہ مصیبت میں شخصیت مہاتما گاندھی کی تھی۔ جن بیچاروں کے پاس چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جو ان کا اپنا ذاتی کہا جاسکے اور جو اگر سفر اختیار کرتے تو چاہیے یہ بیمار ہوتے اور ان کی زندگی ہی خطرہ میں کیوں نہ ہوتی یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ رات کے وقت بھی لوگ ان کے درشن کے لیے ریلوے سٹیشنوں پر جمع نہ ہوتے اور ان کی نیند میں مُخل ہو کر ان کے لیے وبالِ جان ثابت نہ ہوتے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شہرت انسان کے لیے باعث راحت اور سرمایۂ اطمینان و مسرت ہے وہ غلطی پر ہیں۔ شہرت میں صرف اس وقت تک ہی کشش ہے جب تک کہ یہ حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب شہرت حاصل ہو جائے تو انسان کو افسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس کو جانتے کیوں ہیں اور وہ گمنامی کی زندگی کیوں بسر نہیں کر رہا۔ مگر یہ افسوس لاحاصل ہوتا ہے۔ شہرت کا داغ مٹانے سے کہاں مٹے اور اس وقت تک تو اس کے مٹنے کا سوال ہی نہیں۔ جب تک کہ انسان پبلک لائف میں ہو اور اس کے دیئے گئے بیانات یا لکھے گئے مضامین پبلک میں آ رہے ہوں۔

تجارتی ہتھکنڈے

روزانہ "رعیت" جو میں نے اور خواجہ حسن نظامی نے دہلی سے جاری کیا تھا نقصان کے باعث بند کر دیا گیا تو میں دیوبند کے ایک بنئے لالہ اگرسین کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ جہاں لالہ جی نے اگرسین اینڈ کمپنی کے نام سے آڑھت کا کاروبار جاری کیا۔ میں ان کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ملازم تھا۔ لالہ اگرسین تجارتی ذہنیت کے بزرگ تھے۔ آپ نے بمبئی میں جب سبز کیلا بہت کثرت کے ساتھ فروخت ہوتے دیکھا تو آپ نے کیلا فروخت کرنے والوں سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ یہ کیلا کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کہاں اس کی مارکیٹ ہے اور کہاں کہاں جاتا ہے۔ تاکہ اس کاروبار کو جاری کر سکیں۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ نے مجھے بمبئی سے کچھ فاصلے پر بسین بھیجا۔ یہ بسین مغربی ہندوستان

Marfat.com

میں کیلے کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اس علاقہ میں ہی سبز کیلا ا جسے بمبئی کا کیلا کہا جاتا ہے پیدا ہوتا ہے اور تمام ہندوستان میں فروخت کے لیے جاتا ہے۔

میں لسین ریلوے سٹیشن پہنچا وہاں سے ٹانگہ میں سوار ہو کر شہر گیا۔ جہاں کہ کیلے کی مارکیٹ ہے اس مارکیٹ میں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کیلے کی بھری ہوئی درجنوں گاڑیاں ہر روز شمالی اور وسطی ہندوستان کو جاتی ہیں اور تمام کی تمام مارکیٹ پنجاب کے تین چار اصحاب کے ہاتھوں میں ہے جو ایک ہی خاندان میں سے ہیں۔ کوئی دوسرا شخص یہ کاروبار نہیں کرتا۔ اور ان اصحاب نے اس تجارت سے لاکھوں روپیہ پیدا کیے ہیں۔

میں یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد سیدھا ان پنجابیوں کی دکان پر گیا۔ ان لوگوں نے مجھے پنجابی دیکھا تو بہت تپاک سے ملے۔ چند منٹ دکان پر بات چیت کرنے کے بعد اپنے گھر لے گئے کھانا کھلایا۔ پوچھا کہ لسین کس طرح آئے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ سنا تھا۔ یہاں کیلا کثرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب سے بمبئی آیا تھا۔ سیر کے لیے یہاں آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں پھر ان کے ساتھ ان کی دکان پر واپس آ گیا اور باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے بتایا۔ کہ یہ تمام ایک ہی خاندان سے ہیں۔ بیس برس سے لسین میں کاروبار کرتے ہیں۔ تمام مارکیٹ ان کے ہاتھوں میں ہے اور اب تک لاکھوں روپیہ پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے یہ بتانے کے بعد میں نے ان سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ کاروبار تمام کا تمام آپ کے ہاتھوں میں ہے اور کوئی گجراتی، پارسی یا مرہٹہ یہ کام نہیں کرتا۔ میرے اس سوال پر ان چاروں بھائیوں میں سے ایک نے بہت فخر کے ساتھ اپنی ہوشیاری اور قابلیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"ہم کسی بیوپاری کو یہاں قدم جمانے نہیں دیتے۔ اگر کوئی شخص یہاں کیلے کا کاروبار کرتا ہے تو ہم مارکیٹ میں سے فوراً گراں نرخ پر کیلا خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ارزاں نرخوں پر دساور میں فروخت کرتے ہیں۔ ہم دو چار ماہ میں دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ کا نقصان اٹھا لیتے ہیں اور وہ نیا بیوپاری بھی ہمارے ساتھ اتنا ہی نقصان اٹھاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیا بیوپاری اپنا دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ سرمایہ نقصان میں دے کر یہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد ہم مارکیٹ میں قیمت پھر کم کر دیتے ہیں اور جو نقصان ہوا تھا وہ دو چار ماہ میں پھر پورا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے بیس برس سے ہم نے کسی کو موقع نہیں دیا کہ وہ یہاں جم کر کاروبار کر سکے۔"

میں نے اس ملاقات میں اُن سے باتوں باتوں میں تمام راز دریافت کر لیے کہ یہ کس نرخ پر مال خریدتے ہیں کس نرخ پر دساور بھیجتے ہیں۔ ان کا مال کس کس جگہ جاتا ہے اور ان کو ماہوار کتنی آمدنی ہے۔ میں تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد بمبئی واپس پہنچا۔ سیٹھ اگر سین کو تمام حالات

Marfat.com

بتائے۔ سیٹھ صاحب یہ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان میں یہ اہمیت نہ تھی یا وہ تجارتی اعتبار سے اس نقصان کو برداشت کرنا نہ چاہتے تھے۔ جو کیلے کے ان پنجابی سوداگروں کے تجارتی ہتھکنڈوں کے مقابلہ میں ان کو برداشت کرنا پڑتا۔ چنانچہ سیٹھ اگرسین نے کیلے کا کاروبار کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اگر تجارتی دنیا پر غور کیا جائے تو تجارت نام ہی ہتھکنڈوں کا ہے۔ تجارتی رقیبوں کو گرانا۔ خود آگے بڑھنا اور ایک روپیہ کے چار روپیہ بنانا وغیرہ۔ یہ سب ہتھکنڈے ہیں۔ جھوٹ، فریب اور بے ایمانی تجارتی اعتبار سے جائز اور قابلیت سمجھی جاتی ہے اور اس بدعت میں ہر تاجر مبتلا ہے۔ جو انتہائی افسوسناک ہے۔

مہاتما گاندھی سے ملنے کی آرزو

اخبار "ریاست" کو جاری ہوئے ایک یا ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ مہاتما گاندھی نے مرحوم مولانا محمد علی کے مکان کوچہ چیلاں دریا گنج پر اکیس روز کا فاقہ شروع کیا۔ اس فاقہ کے شروع ہونے سے چند روز پہلے اور فاقہ شروع ہونے کے بعد چند روز تک مرحوم مولانا۔ مہاتما جی کو سیر کے لیے شام کے وقت موٹر پر لے جاتے۔ مرحوم مولانا محمد علی ایڈیٹر "ریاست" پر بہت کرم فرماتے اور نہ صرف آپ کے دل میں "ریاست" کی پالیسی کی قدر تھی۔ ذاتی اعتبار سے بھی وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے جیسا بزرگ اپنے عزیزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک روز میں دہلی دروازہ کی طرف سے (جہاں کہ میرا رہائشی مکان تھا) شہر کی طرف پیدل آ رہا تھا اور مولانا موٹر میں مہاتما جی کے ساتھ سیر کے لیے شہر کی طرف سے دہلی دروازہ کی طرف جا رہے تھے۔ مولانا نے جب مجھے دیکھا تو آپ نے ڈرائیور کو اپنی موٹر کھڑی کرنے کے لیے کہا۔ جب موٹر کھڑی ہوئی تو میں نے سمجھا کہ شاید اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے گاڑی کھڑی کی گئی ہوگی میں نے توجہ نہیں دی۔ کیونکہ موٹر اپنی بائیں طرف کو جا رہی تھی اور میں موٹر کے داہنی طرف پٹڑی پر تھا۔ گاڑی کھڑا ہوتے ہی مولانا نے مجھے آواز دی تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا نے مجھ سے بات کرنے کے لیے ہی گاڑی کھڑی کی ہے۔ میں تیز قدمی کے ساتھ موٹر کے قریب پہنچا اور مولانا اور مہاتما جی کو سلام کیا تو مولانا نے تعارف کراتے ہوئے مہاتما جی سے کہا "یہی دیوان سنگھ صاحب ایڈیٹر "ریاست" ہیں جن کے متعلق میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" اس تعارف کے بعد مہاتما جی نے اپنے خاص گاندھیانہ انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ "مولانا صاحب نے آپ کی اور آپ کے اخبار کی بہت تعریف کی ہے۔ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ آپ اچھے ہیں؟" میں نے اس کے جواب میں کہا "آپ کی مہربانی ہے۔" اس واقعہ کے بعد آج تک مجھے مہاتما گاندھی سے ملنے یا ہم کلام ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ہاں لاہور کانگرس کے دنوں میں دو تین روز مہاتما جی کو دیکھنے کا اتفاق ضرور ہوا۔

اخبارات کے ایڈیٹر خبریں حاصل کرنے یا اپنے تعلقات کو بڑھانے کے لیے دوسرے عام

Marfat.com

لوگوں کے مقابلے پر بہت مستعد ہوتے ہیں اور بغیر ضرورت کے بھی ہر جگہ گھس جاتے ہیں مگر راقم الحروف طبعاً اور فطرتاً اس کی قطعی طور پر ضد ہے۔ چنانچہ شاید یہ حیرانی کے ساتھ سنا جائے گا کہ میں مرکزی گورنمنٹ کے موجودہ منسٹروں سے بھی سوائے دو تین کے کسی سے کبھی نہیں ملا۔

ہر سال دہلی میں لیڈروں کے دو چار پروسیشن نکلتے ہیں اور بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ میں کبھی کسی جلسے یا جلوس کو دیکھنے کے لیے نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ دہلی کانگرس کمیٹی کا دفتر کہاں ہے اور اگر میں یہ بتا دوں کہ میں آخری بار دہلی میں سکھوں کے کسی گوردوارہ میں کب گیا تو شاید اکالی میرے سکھ نہ ہونے کا فتویٰ ہی صادر کر دیں۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہ میں طبعاً متکبر یا مغرور ہوں۔ تکبر اور غرور کو تو میں کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ میں بغیر کام کے کسی شخص سے ملنا یا اس کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ جلسوں اور جلوسوں میں شامل ان لوگوں کو ہونا چاہیئے جو زندہ باد کے نعرے لگانے والے ہوں یا نعرے لگوا کر خوش ہوں اور گوردواروں یا عبادت گاہوں میں جانے اور عبادت کرنے کے متعلق میرا نظریہ عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔

باوجود درشن کرنے اور درشن کرانے والوں سے طبعاً اس قدر اختلافات کے کئی برس سے یہ آرزو تھی کہ میں مہاتما گاندھی کے قریب دو تین ہفتہ قیام کروں۔ ان کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کروں اور اگر ممکن ہو تو اپنے کیریکٹر کے لیے ان سے کچھ حاصل کروں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ حق و صداقت کے اعتبار سے موجودہ دور تو کیا پچھلے سو برس سے بھی مہاتما گاندھی جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔

راجپوتانہ کے قومی ورکر مسٹر رام نرائن جی چودھری کئی برس تک مہاتما گاندھی کے پاس رہے وہ سیوا گرام آشرم میں اکثر آتے جاتے اور کئی کئی ماہ قیام کرتے۔ چودھری صاحب ایڈیٹر "ریاست" کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ آپ جب کبھی دہلی تشریف لاتے اور ایڈیٹر "ریاست" سے ملتے تو جتنی دیر ایڈیٹر "ریاست" سے ملتے مہاتما گاندھی کے کیریکٹر، خصوصیات اور حالات کا ہی ذکر ہوتا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں چودھری صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ جب چودھری صاحب سیوا گرام آشرم میں موجود ہوں تو ایڈیٹر "ریاست" آئے اور وہاں دو ہفتہ قیام کرے۔ چودھری صاحب نے اس خواہش کو سن کر پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ مہاتما گاندھی سے مل کر تاریخ مقرر کریں گے۔ چودھری صاحب نے سیوا گرام آشرم میں پہنچ کر مہاتما گاندھی سے ذکر کیا تو مہاتما جی اور چودھری صاحب کے درمیان ایڈیٹر "ریاست" کے متعلق یہ بات چیت ہوئی:

مہاتما گاندھی: یہ ایڈیٹر "ریاست" کیسا آدمی ہے۔ میں نے سنا ہے۔ کئی راجوں اور نوابوں نے اس پر مقدمے چلائے مگر اس نے کبھی پروا نہیں کی۔

چودھری صاحب: یہ بہت اچھا آدمی ہے۔ بڑا بے خوف۔ نڈر اور بہادر ہے۔ جو جی چاہتا ہے کرتا ہے کسی کی پرواہ نہیں کرتا اور سینٹی مینٹل سا آدمی ہے۔ اگر وہ یہاں آیا اور اس کو یہ آشرم پسند آ گیا تو شاید یہیں سے اپنے دفتر کو خط لکھ دے کہ اخبار بند کر دو اور یہ یہاں ہی ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔ دہلی واپس ہی نہ جائے۔

مہاتما گاندھی: ایسے آدمی سے تو ضرور ملنا چاہیئے۔ آپ لکھ بھیجئے کہ جگہ کی قلت ہے۔ نئی جگہ طیار ہو

Marfat.com

رہی ہے۔ دو ہفتہ میں طیار ہو جائیگی۔ اس وقت آ جائیں تاکہ ان کو رہائش کی تکلیف نہ ہو۔
رام نرائن جی چودھری نے مجھے خط لکھا کہ دو ہفتہ تک نئے کمرے طیار ہو جائیں گے۔ اس وقت آ جائیے۔ مہاتما جی سے پوچھ لیا ہے۔ اب فوراً آنے کی صورت میں رہائش کی تکلیف ہو گی۔ میں نے چودھری صاحب کو اس خط کا جواب لکھا کہ آپ مہاتما جی سے عرض کیجئے کہ میں سیواگرام آشرم میں ایک بھکشو گداگر یا طالب علم کی حیثیت سے آؤں گا۔ میرے آرام کا کیا سوال ہے۔ میں تو کسی جھونپڑی کے برآمدہ کو بھی شاہی محل سے کم نہ سمجھوں گا۔ یا میں رام نرائن جی کے کمرہ میں ہی ایک کونہ میں بستر ا بچھا لوں گا۔ مجھے آرام و راحت کی کوئی پروا نہیں۔ میرے اس خط کے جواب میں چودھری صاحب کا پھر خط آیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ میں ہفتہ تک سیواگرام آشرم میں پہنچ جاؤں اور میں جب تک وہاں قیام کروں گا چودھری صاحب بھی وہاں موجود رہیں گے۔
میں سیواگرام جانے کے لیے طیار ہو رہا تھا اور دفتر کے انتظام کے لیے دفتر والوں کو ہدایتیں دے رہا تھا کہ میری روانگی سے تین روز پہلے نوٹوں کے مقدمے میں میری گرفتاری ہو گئی اور میں ضمانت نامنظور ہونے کے باعث جیل بھیج دیا گیا۔ اس مقدمہ میں دو سال سے زیادہ عرصے تک مصروف رہا اور سیواگرام آشرم نہ جا سکا۔ میری اس گرفتاری کے موقعہ پر بھی مہاتما گاندھی اور رام نرائن جی کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ چودھری جی نے مجھے بتایا کہ مہاتما گاندھی نے میری گرفتاری کے ایک دو روز بعد ٹائمز آف انڈیا میں میری گرفتاری کی خبر پڑھی اور اس خبر کو پڑھتے ہی آپ نے رام نرائن جی کو ان کے کمرے سے طلب فرمایا۔ مہاتما جی اس وقت جسم پر پالش کرا رہے تھے۔ جب رام نرائن جی آئے۔ تو مہاتما جی نے رام نرائن جی کو "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ دیتے ہوئے کہا:

"رام نرائن جی! آپ نے یہ خبر پڑھی۔ آپ کے دوست دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" جعلی نوٹوں کے مقدمے میں گرفتار ہو گئے۔"

رام نرائن جی نے اخبار لے کر اس خبر کو پڑھا۔ تو پڑھنے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا:

"یہ خلاف توقع نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ دیوان سنگھ سے دنیا کے ہر کام کی توقع کی جا سکتی ہے وہ کام چاہے کتنا ہی اچھا ہو یا برا ہو۔ کیونکہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے۔"

رام نرائن جی کے ان الفاظ کو سن کر مہاتما جی نے کہا: کہ

"ایسے آدمی سے تو ضرور ملنا چاہیئے مگر اب تو وہ اس مقدمہ کے باعث شاید نہ آ سکیں۔"

ایڈیٹر "ریاست" ۱۹۴۱ء کے دسمبر میں نوٹوں کے مقدمہ میں رہا ہوا اور جب کاروبار پر دو چار ماہ توجہ دی اور دفتر کے حالات درست ہو گئے تو پھر یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ سیواگرام آشرم چلنا چاہیئے۔ چنانچہ رام نرائن جی دہلی تشریف لائے تو پھر ان سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا۔ رام نرائن جی اس وقت ڈائری فارم کی ٹریننگ کے لیے سیواگرام آشرم سے بنگلور جانے والے تھے اور میں چاہتا تھا۔ کہ سیواگرام آشرم میں چونکہ میں اجنبی ہوں گا۔ اس لیے میرا رام نرائن جی کی موجودگی میں ہی جانا مناسب ہو گا۔ رام نرائن جی نے مہاتما جی سے سیواگرام آشرم میں پہنچ کر پھر بات چیت کی کہ دیوان سنگھ کب وہاں آئے۔ آخر فیصلہ ہوا

Marfat.com

کہ رام نرائن جی اگست ۱۹۴۲ء کے شروع میں بنگلور سے واپس سیواگرام آشرم پہنچ جائیں گے اور مہاتما گاندھی آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس سے فارغ ہو کر اگست کے دوسرے ہفتے واپس سیواگرام آ جائیں گے۔ میں اس وقت سیواگرام پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں نے پھر طیاری شروع کی تو اطلاع آئی۔ کہ مہاتما جی ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو دوسرے تمام کانگرسی لیڈروں اور کارکنوں کے ساتھ بمبئی میں گرفتار کر لیے گئے۔ مہاتما جی کی اس گرفتاری سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ دو تین ہفتہ سیواگرام آشرم میں قیام کروں۔ آپ کی اس گرفتاری سے دس روز بعد یعنی ۱۸ اگست کو میں بھی گرفتار کر کے دہلی اور پنجاب کے کانگرسی حضرات کے ساتھ جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے ستمبر ۱۹۴۳ء کو رہا کیا گیا تو سوال ذریعہ معاش اور آئندہ زندگی کے گزارنے کا تھا۔ چنانچہ "ریاست" جو میری نظربندی کے زمانہ میں بند ہو چکا تھا کو پھر جاری کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ ادھر مہاتما گاندھی نئی گورنمنٹ کے قیام اور ملک کے فسادات میں مصروف تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان کو کب فرصت ہو اور مجھے میری دیرینہ خواہش کے پورا کرنے کا موقعہ ملے۔ مگر میرا یقین تھا کہ مہاتما گاندھی جیسی موجودہ دور کی مقدس ترین شخصیت کے پاس قیام اور وہاں سے کچھ حاصل کرنے کا اتفاق تب ہی ہو گا جب ستاروں کے اعتبار سے قسمت میں کسی بڑے مہاپرش سے فائدہ حاصل کرنا لکھا ہو گا۔

غلط فہمی سے بچنے کی ضرورت

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس بطور ایک ماہر چشم یا آئی سرجن کے جو شہرت تمام ہندوستان میں رکھتے ہیں وہ تو ان کی طبی خدمات کے باعث ہے جو انہوں نے خدا کی مخلوق کی اپنی زندگی میں ادا کیں۔ مگر ذاتی کیریکٹر کے اعتبار سے وہ اس سے بھی زیادہ عزت کے مستحق ہیں۔ اور اگر یہ مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ اور میری ذاتی معلومات پر یقین کیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر مہاتما نہیں ایک انتہائی بلند انسان تو ضرور سمجھے جانے چاہئیں۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں سوائے اپنی بیوی کے دنیا کی ہر عورت کو اپنی ماں، بہن یا بیٹی سمجھا اور شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی منہ کے قریب تک نہ آنے دیا اور اپنی تمام عمر گناہوں کے اعتبار سے نہ صرف خدا سے ڈرتے رہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ خدا سے قدم قدم پر بد کتے بھی رہے۔

میں موگا میں ان کے ماتحت کام کرتا تھا اور موگا ہسپتال آنکھوں کے اوپریشنوں کے لیے ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں بھی شہرت حاصل کر چکا تھا اور آنکھوں کے اوپریشن سیکھنے کے لیے بہت سے ڈاکٹر بھی ہندوستان کے دوسرے صوبہ جات کے علاوہ غیر ممالک سے وہاں آتے اور کئی کئی روز قیام کرتے۔ اس زمانہ میں جو ڈاکٹر وہاں کام سیکھنے کے لیے آئے۔ ان میں ایک لیڈی ڈاکٹر ہیرا دیوی بھی تھیں۔ میرا خیال ہے یہ خاتون بعد میں ریاست کپورتھلہ میں ملازم ہو گئیں اور میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ آجکل کہاں ہیں لیڈی

Marfat.com

ڈاکٹر ہیرا دیوی عمر میں جوان، تعلیم یافتہ لڑکیوں کی طرح صاف ستھری اور خوش پوش تھیں اور وہ موگا کے ہسپتال میں کئی روز تک ڈاکٹر صاحب سے آنکھوں کے اوپریشن کا کام سیکھتی رہیں۔ یہ خاتون نیک اور اچھے گھرانہ کی تھیں۔ ان کا قیام ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہی زنانہ میں ہُوا۔ جہاں کہ ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیوی رہا کرتیں اور مردانہ میں دوسرے مرد ڈاکٹر رہتے جو وہاں کام سیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر متھرا داس کی پہلی بیوی (یعنی ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادہ کرنل تیرتھ رام آئی ایم ایس کی حقیقی والدہ) بہت نیک خاتون تھیں۔ غیر معمولی شریف اور پرانے زمانہ کی ان عورتوں میں سے جو کسی مرد کی کسی غیر عورت کے ساتھ مسکراہٹ کو بھی برداشت نہ کر سکیں اور کسی غیر مرد اور غیر عورت کا آپس میں بات کرنا وہ بات چاہے سیاسیات۔ لٹریچر یا روحانیت کے متعلق ہی کیوں نہ ہو، بھی بدچلنی سمجھیں۔ ڈاکٹر ہیرا دیوی کا مسلسل کئی روز تک ڈاکٹر صاحب کے ہاں قیام کرنا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اوپریشن کرانا۔ اوپریشن سیکھنا۔ کئی کئی گھنٹے تک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیماروں کو دیکھنا اور ڈاکٹر صاحب کا اس خاتون کی سہولت کا خیال رکھنا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو بہت ناگوار گزرا اور ڈاکٹر ہیرا دیوی کو وہاں قیام کرتے جتنا زیادہ عرصہ گزرتا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے دل میں شکوک پیدا ہوتے چلے گئے اور ان شکوک کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو یہ وہم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب اس خاتون سے شادی کرنے والے ہیں اور شادی کی غرض سے ہی یہ خاتون اس گھر میں مقیم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی منہ سے کچھ کہہ نہ سکتیں کیونکہ اگر کچھ کہتیں تو اس الزام کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور الزام کی بنیاد ہی غلط فہمی اور وہم پر قائم تھی۔ اس غلط فہمی اور وہم کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے کھانا چھوڑ دیا۔ ہر وقت اداس رہتیں اور جب وہ سوکن کے آنے کا خیال کرتیں تو اکثر رو پڑتیں۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میری والدہ کو جب اس غلط فہمی کا علم ہُوا اور میری والدہ نے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو سمجھایا کہ وہ وہم میں مبتلا نہ ہوں اور کھانا کھا لیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے میری والدہ (جن کو ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی دونوں ہی اپنی حقیقی ماں کی طرح عزت کرتے تھے) سے کہا۔

"ماسی جی۔ میں کھانا کیا کھاؤں۔ مجھ سے تو میری تمام زندگی کے لیے روٹی چھینی جا رہی ہے۔ میں تو تباہ ہو جاؤں گی۔ اس سے تو میرا مر جانا ہی اچھا ہے۔ میرے بچوں کا کیا ہو گا اگر میرے شوہر نے دوسری شادی کر لی میں تو برباد ہو جاؤں گی۔"

میری والدہ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کے حالات اور فطرت سے ڈاکٹر صاحب کے بچپن سے ہی واقف تھیں مگر یہ غلط فہمی رفع نہ ہو سکی۔ کیونکہ ایک عورت سب کچھ برداشت اور قربان کر سکتی ہے مگر اس کا اس کے شوہر کی محبت سے محروم ہونا ممکن نہیں۔ چاہے محبت سے محروم ہونا غلط فہمی اور وہم کی بنیادوں پر ہی کیوں نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی اس غم میں ہی بخار میں مبتلا ہو گئیں اور یہ بخار نمونیا کی صورت میں تبدیل ہُوا۔

اس زمانہ نہ پنسلین ایجاد ہوئی تھی نہ ایم بی ۶۹۳ تھی۔ نمونیا کے بیماروں کی دوا صرف برانڈی اور

Marfat.com

معمولی اد ویات تھیں۔ یہ نیک اور فرشتہ خصلت خاتون نمونیا میں دو چار روز مبتلا رہ کر انتقال کر گئیں اور موت کی دراصل وجہ صرف غلط فہمی تھی۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ اگر اس خاتون کے احساس کا خیال کرتے ہوئے (اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ احساس بے بنیاد ہے) غلط فہمی پیدا نہ ہونے دی جاتی تو یہ خاتون نوعمری میں اپنی زندگی سے محروم نہ ہوتیں۔ یہ حالات تو اس خاتون کے ہیں جن کو میں آج تک بھول نہیں سکا۔ مگر ان کے صاحب زادہ تیرتھ رام پاہوہ کے وہ آنسو تو میرے لیے آئندہ زندگی میں شاید کبھی بھی قابل فراموش نہ ہوں گے۔ جب کہ تیرتھ رام دہلی آئے۔ میرے ہاں مقیم تھے۔ ہم گرمیوں کے زمانہ میں چھت پر لیٹے ہوئے رات کو باتیں کر رہے تھے اور اوپر کے حالات جب میں نے تیرتھ رام جی کو سنائے تو تیرتھ رام اپنی ماں (جب تیرتھ رام کی ماں کا انتقال ہوا تو تیرتھ رام کی عمر پانچ سال کی تھی) کو یاد کر کے زار زار رونے لگ گئے اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

غلط فہمی سے بچنے کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ میں ریاست نابھ میں ملازم تھا۔ مہاراجہ منصوری پہاڑ پر مقیم تھے اور میں بھی وہاں تھا۔ مرحوم سردار بہادر سردار گوردیال سنگھ پرائیویٹ سیکرٹری سے ہر روز باتیں ہوا کرتیں۔ ایک دن منصوری کے پُر فضا پہاڑ کا ذکر آ گیا تو سردار صاحب نے کہا: "آپ منصوری کو اچھا سمجھتے ہیں اور منصوری فی الحقیقت اچھا پہاڑ ہے۔ مگر میں تو اس پہاڑ کے قیام سے تنگ آ چکا ہوں۔ مہاراجہ سال بھر میں نو ماہ یہاں رہتے ہیں۔ یہ نو ماہ ہم لوگوں کو بیوی بچوں سے الگ رہنا پڑتا ہے اور صرف تین ماہ جب کہ سردی زیادہ ہوتی ہے تو ہم لوگ نابھ جاتے ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔"

میں نے سردار صاحب سے کہا کہ "منصوری میں ریاست نابھ کی درجنوں کوٹھیاں ہیں جو اکثر خالی رہتی ہیں۔ آپ ان کوٹھیوں میں سے ایک کوٹھی لے کر اپنی بیوی اور بچوں کو یہاں منگا لیا کیجئے۔ یا اگر ان کوٹھیوں میں سے آپ کوئی کوٹھی بغیر کرایہ کے لینا پسند نہ کریں تو کوئی دوسری کوٹھی کرایہ پر لے سکتے ہیں۔ آپ نو ماہ بغیر بیوی بچوں کے کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔" میرے اس سوال پر سردار گوردیال سنگھ نے جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے کہا:

"سردار صاحب ہم لوگوں کو صرف نیک رہنے کی ہی ضرورت نہیں۔ نیک ہوتے ہوئے بھی غلط فہمی سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ اگر میں اپنی بیوی اور بچوں کو یہاں منصوری لے آیا کروں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ مہاراجہ میری بیوی یا میری کسی عزیزہ عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں گے مگر اس غلط فہمی کا کیا علاج ہے۔ میرے بیوی بچوں کے یہاں آنے پر اگر نابھ کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ مہاراجہ کا میری بیوی سے بھی کوئی تعلق ہے اور اس لیے ہی میری بیوی منصوری گئیں۔ میں غلط فہمی سے بچنے کے لیے اپنی بیوی بچوں کو کبھی منصوری نہیں لاتا۔ اور پچھلے بیس برس سے اس طرح ہی تکلیف اٹھا رہا ہوں۔"

سردار گوردیال سنگھ جب تک زندہ رہے۔ پبلک کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے ہمیشہ اکیلے ہی منصوری وغیرہ گئے اور آپ کبھی اپنی بیوی کو وہاں نہ لے گئے۔ جہاں کہ مہاراجہ مقیم ہوتے۔

Marfat.com

اوپر کے دو واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کو صرف نیک ہونے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ غلط فہمی سے اپنی ذات کو بچانے کے لیے بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ مہاتما گاندھی جیسے مقدس شخص بھی جب رات کو سوتے تھے تو پبلک کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے کبھی اکیلے نہیں سوتے تھے ان کی چارپائی کے پاس متعدد دوسرے اصحاب کی چارپائیاں ہوتی تھیں تاکہ کسی شخص کو غلط بیانی اور غلط فہمی کا موقع نہ دیا جائے ؂

جھوٹ بولنے کی فطرت

مجھے اپنی زندگی میں جھوٹ بولنے والے بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑا ۔ مگر مرحوم مہاراجہ بھرت پور کا مقابلہ غالباً کوئی شخص بھی نہیں کر سکتا تھا ۔

مرحوم مہاراجہ بھرت پور کو گدی سے علیحدہ کیے جانے کا مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش تھا ۔ اصل واقعہ تو یہ تھا کہ آپ پولیٹیکل ایجنٹوں کی پرواہ نہ کرتے تھے ۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے تمام افسر آپ کے رویہ سے نالاں تھے ۔ مگر آپ گدی سے علیحدہ اس جرم میں کیے جانے والے تھے کہ آپ کے ایک اے ۔ ڈی ۔ سی نے بھرت پور کی ایک نرس کی عصمت دری کی ۔ ایک پہاڑی طوائف جو مہاراجہ کے پاس تھی کا قتل ہوا ۔ اس قتل میں مہاراجہ کا ہاتھ تھا اور مہاراجہ کے زمانہ میں ریاست بھرت پور ساٹھ ستر لاکھ روپے کی مقروض ہو گئی ۔ نرس اور پہاڑی طوائف کا مسئلہ تو ابھی شروع ہی نہ ہوا تھا کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے سب سے پہلے ریاست بھرت پور کی مالی تباہی کے مسئلے کو ہاتھ میں لیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف اس مسئلہ پر ہی خاموشی کے ساتھ مہاراجہ کو بے اختیار کیا جائے ۔ اور مہاراجہ برائے نام گدی پر رہیں ۔ چنانچہ پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند اور ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے ہاں سے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا ۔ جس میں مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ ریاست کی مالی حالت تباہی تک پہنچ چکی ہے اس ریاست کی ایڈمنسٹریشن پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں میں دے دی جائے ۔

اس زمانہ میں بھرت پور میں وزیر اعظم راؤ بہادر چودھری لال چند تھے (جو بعد میں پنجاب میں پنجاب منسٹر رہے) چودھری لال چند مہاراجہ کے دیانت دار اور مخلص دوستوں میں سے تھے اور آپ کا اس زمانہ کے پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند سر جان تھامپسن پر بھی بہت اثر تھا چودھری لال چند چاہتے تھے کہ جس صورت میں بھی ممکن ہو مہاراجہ بے اختیار نہ ہوں اور ان کے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں ۔ چنانچہ چودھری صاحب نے مہاراجہ سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ سر جان تھامپسن کو بھرت پور آنے کی دعوت دی جائے اور یہاں بات چیت کر کے سر جان کو مطمئن کیا جائے ۔

Marfat.com

سرجان تھامپسن کو چودھری صاحب نے بھرت پور آنے اور وہاں شکار کھیلنے کی دعوت دی۔ سرجان چودھری لال چند کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ اگر مہاراجہ لکھتے تو شاید سرجان انکار کر دیتے مگر آپ کے دل میں چودھری صاحب کے لیے بہت عزت اور قدر تھی۔ آپ نے اس دعوت کو منظور کر لیا اور آپ تاریخ مقررہ پہ بھرت پور پہنچ گئے۔

سرجان تھامپسن جب بھرت پور پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر مہاراجہ اور چودھری لال چند نے آپ کا استقبال کیا اور تینوں اصحاب ایک کار میں ریاست بھرت پور کے مقام ڈیگ کو روانہ ہوئے۔ ڈیگ بھرت پور سے غالباً سولہ یا بیس میل کے فاصلے پر ہے اور یہ بہت اچھی شکار گاہ ہے۔ اس کار کو مہاراجہ بھرت پور خود چلا رہے تھے۔ ان کے بائیں طرف اگلی سیٹ پر سرجان تھامپسن تھے اور پچھلی سیٹ پر چودھری لال چند۔ کار چل رہی تھی تو مہاراجہ نے سرجان تھامپسن کے ساتھ باتیں شروع کیں۔ باتوں باتوں میں مہاراجہ نے سرجان سے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

بعض لوگ مجھ پر فضول خرچی کا اور مقروض ہونے کا الزام لگاتے ہیں مگر لوگوں کو علم نہیں کہ میرے پاس پوشیدہ خزانہ ہے۔ اور اس خزانے میں ساٹھ لاکھ روپیہ نقد چاندی کا موجود ہے۔ میں یہ پوشیدہ خزانہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بار چودھری لال چند کو دکھایا اور وہ بھی اس طرح کہ اس خزانہ سے بہت دور ایک مقام پر چودھری لال چند کی آنکھیں باندھ دی گئیں تاکہ ان کو کچھ نظر نہ آ سکے۔ میرے معتمد آدمیوں نے چودھری صاحب کو اٹھا لیا اور یہ اس خزانہ کے اندر لے گئے۔ خزانہ کے اندر لے جا کر چودھری صاحب کی آنکھیں کھول دی گئیں۔ اور چودھری صاحب سے کہا گیا۔ کہ آپ چاندی کے روپیہ کی ان تھیلیوں کو گن لیجئے۔ چودھری لال چند نے ان تمام تھیلیوں کو گنا۔ تو یہ ساٹھ لاکھ روپیہ تھا۔ ہم نے چودھری صاحب کی آنکھیں پھر باندھ دیں اور میرے آدمی چودھری صاحب کو اٹھا کر خزانہ سے باہر اس مقام پر لے گئے جہاں سے کہ چودھری صاحب کو لایا گیا تھا۔"

مہاراجہ یہ کہانی بیان کر رہے تھے اور سرجان تھامپسن ہُوں ہُوں کہہ کر سنتے چلے جا رہے تھے اور چودھری لال چند حیران تھے کہ مہاراجہ کو کیا ہو گیا۔ جو آپ پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند کے سامنے اس قدر لچر اور بیہودہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جس کا نہ سر ہے نہ پاؤں اور اس جھوٹ کا نتیجہ کیا ہو گا۔

موٹر ڈیگ کے مقام پر پہنچی وہاں مہاراجہ اور مہمانوں کے لیے علیحدہ علیحدہ کوٹھیاں ہیں۔ یہ کار ڈیگ پہنچتے ہی مہمان خانے میں گئی۔ جہاں کہ سرجان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ کار ٹھہری۔ سرجان اس میں سے اترے اور مہاراجہ نے چودھری صاحب کو حکم دیا کہ آپ یہاں ہی ٹھہرئیے اور سرجان کے آرام کا انتظام کیجئے۔ تاکہ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ کہہ کر مہاراجہ اپنی کوٹھی چلے گئے۔ سرجان تھامپسن بہت ہی لائق اور ہوشیار سویلین میں سے تھے۔ آپ نے بنگلے کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے چودھری لال چند سے سوال کیا۔

"ڈیئر چودھری صاحب! مہاراجہ نے یہ جو ساٹھ لاکھ روپیہ کا قصہ سنایا ہے اس میں کہاں تک

Marfat.com

سچائی ہے :

چودھری لال چند جواب کیا دیتے۔ وہ کوئی ادنیٰ سا جھوٹ بولنا بھی اپنے لیے باعث شرم سمجھتے تھے۔ اس اہم، بے بنیاد اور لچر جھوٹ کو کیوں کر قبول کر لیتے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ سوال کار میں ہی مہاراجہ کے سامنے نہ کر دیا ورنہ میری پوزیشن بہت ہی نازک ہو جاتی۔"

جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کہانی میں کوئی سچائی نہیں۔

مہاراجہ بھرت پور اپنے انتقال سے پہلے ایک عرصے تک دہلی میں رہے۔ پہلے آپ کا قیام اس سڑک پر تھا جو سبزی منڈی سے کالف کلب کو جاتی ہے۔ پھر آپ راجپور روڈ پر اس کوٹھی میں چلے گئے جو پیلے رنگ کی دو منزلہ ہے اور بعد میں سردار سوبھا سنگھ کی کوٹھی میں نئی دہلی چلے آئے۔ جہاں کہ آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دہلی کے اس قیام میں ایڈیٹر "ریاست" کو آپ سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا۔ ان ملاقاتوں میں شاید ایک ملاقات بھی ایسی نہ ہو گی جس میں آپ کی دروغ بیانیوں کا ذہن پر ناقابلِ برداشت اثر نہ ہوا ہو۔

جو لوگ زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ بولنا ان کی فطرت میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر نہیں بولتے بلکہ دروغ بیانی کو وہ ایک معمولی سی بات سمجھتے ہیں۔

ایسے لوگ نفرت کے اتنے مستحق نہیں جتنے کہ یہ قابلِ رحم قرار دیے جانے چاہئیں۔ کیونکہ سالہا سال تک مسلسل جھوٹ بولنے کے بعد ان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جھوٹ نہ بولیں اور اپنی اس عادت کو ترک کر سکیں۔

جیل کی "بدمعاشیاں"

جیل میں اگر کوئی شے ناجائز طریقہ سے منگائی جائے یا بھیجی جائے تو اسے پنجاب کے جیلوں کی زبان میں "بدمعاشی" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر جیل کے ہسپتال میں کونین نہ ہو اور بخار میں مبتلا کوئی شخص کسی اردلی کو دو چار آنہ رشوت یا انعام دے کر بازار سے کونین منگا لے تو یہ بھی جیل کی "بدمعاشی" ہے جس کی سزا جیل کے قوانین کے مطابق دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ سگریٹ منگانا۔ حکام کی اطلاع کے بغیر خط بھیجنا یا منگانا۔ کھانے پینے کی کوئی شے منگانا۔ روپیہ پیسہ رکھنا۔ کاغذ، قلم دوات کا ہونا یا بٹن لگانے کے لیے ایک سوئی کی موجودگی بھی یہ تمام جیل کی "بدمعاشیاں" ہیں اور جیل کا قانون ان میں سے کسی "بدمعاشی" کی اجازت نہیں دیتا۔

میں جیل میں کئی بار گیا اور وہاں سینکڑوں سیاسی و غیر سیاسی قیدیوں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مگر میں نے ان تمام میں سے شاید ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس کو جیل کی "بدمعاشیوں" سے بالکل پاک قرار دیا جا سکے۔ ہر شخص کسی نہ کسی صورت یا کسی نہ کسی طریقہ سے

Marfat.com

بدمعاشی میں مبتلا رہتا ہے اور جہاں تک جیل کے اندر کیریکٹر کی پاکیزگی کا سوال ہے۔ شاید تمام ہندوستان میں ایک مہاتما گاندھی ہی ایسی شخصیت تھے جن کا دامن اس اعتبار سے قطعی بے داغ رہا چنانچہ مہاتما گاندھی کا ذیل کا واقعہ دلچسپی کے ساتھ سنا جائے گا جو آپ کے اس قسم کے درجنوں واقعات میں سے ایک ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مہاتما گاندھی یارودا (پونا) جیل میں قید تھے وہ اپنی فطرت کے مطابق وہاں بھی اپنے کیریکٹر کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے اور جیل کے احکام کی سو فیصدی تعمیل کی جاتی تھی اس زمانہ میں قیدیوں کے اندر اخبارات پڑھنے کی ممانعت تھی اور کسی زبان کا کوئی اخبار جیل کے اندر نہ جا سکتا تھا تاکہ قیدی جیل سے باہر کے حالات سے قطعی ناواقف رہیں اور سیاسی ایجی ٹیشن سے متاثر نہ ہوں یارودا جیل کا سپرنٹنڈنٹ انگریز آئی ایم ایس تھا جو اپنے ڈاکٹری پیشہ کے باعث نیک دل تھا۔ ایک روز ٹائمز آف انڈیا میں مہاتما گاندھی کے متعلق ایک بہت اہم خبر شائع ہوئی۔ یہ سپرنٹنڈنٹ جیل چاہتا تھا کہ مہاتما گاندھی اس خبر کو پڑھ لیں مگر جیل کے قوانین اور گورنمنٹ کے احکام اجازت نہ دیتے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ مہاتما گاندھی کو یہ اخبار دے یا اس مضمون کا ذکر بھی کرے۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک ترکیب سوچی وہ مہاتما گاندھی کی کوٹھڑی میں مہاتما جی سے ملنے کے لیے گیا تو مہاتما جی کی صحت وغیرہ کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اپنے جیب میں سے دوسرے سامان کے ساتھ یہ اخبار بھی نکال کر مہاتما جی کی چارپائی پر ایک طرف رکھ دیا اور پھر دوسرا سامان تو جیب میں واپس ڈال لیا مگر اخبار نہ اٹھایا تاکہ مہاتما جی اس کے جانے کے بعد یہ اخبار پڑھ لیں۔ سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد مہاتما جی نے دیکھا کہ ان کی چارپائی پر ایک طرف اخبار پڑا ہے۔ اس اخبار کو دیکھتے ہی آپ کوٹھڑی کے کونے میں ایک طرف چلے گئے تاکہ نہ تو اخبار کو چھونے کا اتفاق ہو اور نہ اخبار کا کوئی لفظ آنکھوں کو نظر آئے۔ اور آپ رات بھر کوٹھڑی کے اس کونہ میں ہی بیٹھے رہے۔ اگلے روز صبح سپرنٹنڈنٹ حسب قاعدہ پھر مہاتما جی کی کوٹھڑی میں آیا تو اس نے دیکھا کہ جس پوزیشن میں اخبار رکھا تھا۔ بالکل اسی پوزیشن میں پڑا ہے اس کو چھوا تک نہیں گیا اور مہاتما جی کوٹھڑی کے ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے آتے ہی جب یہ کیفیت دیکھی تو اظہار ندامت کے طور پر کہا: "مجھے افسوس ہے کہ میں کل غلطی سے اخبار بھول گیا" مہاتما جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "ہاں مگر مجھے تو رات بھر کونہ میں بیٹھے رہنے کی سزا دی"

یہ کیفیت تو کیریکٹر کے اور صداقت کے فرشتہ مہاتما گاندھی کی ہے۔ اب ایڈیٹر "ریاست" اور اس قماش کے دوسرے "سیاسی ستیہ گرہیوں" کے واقعات سنیئے:—

اگست ۱۹۴۲ء میں جب ہم لوگ دہلی جیل میں بھیجے گئے تو یہاں غالباً دو ہفتہ رہے۔ دہلی میں سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر البیر (ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) تھے۔ یہ نہ صرف مذہباً عیسائی بلکہ نیک دلی کے اعتبار سے بھی سو فیصدی حضرت مسیح کے مقلد تھے۔ یہاں اخبارات کے پڑھنے کی اجازت تھی، اور گھر سے سامان بھی منگایا جا سکتا تھا۔ یہاں ساٹھ کے قریب سیاسی قیدیوں میں چار آدمی تو اے کلاس

Marfat.com

میں تھے۔ باقی تمام کے تمام بی کلاس میں۔ اے کلاس میں" ایڈیٹر ریاست" لالہ دیش بندھو گپتا ممبر سنٹرل اسمبلی، مسٹر چمن لال جرنلسٹ اور چوتھے غالباً" شری برج کشن جی چاندی والے تھے۔ مگر جہاں تک رہنے سہنے کا سوال ہے کسی میں کوئی فرق نہ تھا۔ میرا کھانا دونوں وقت گھر سے آتا تھا جو انگریزی اور دیسی دونوں طریقوں کا ہوتا۔ کیونکہ میں گھر میں بھی اس زمانہ میں زیادہ تر انگریزی طریقہ سے پکا ہوا کھانا کھاتا تھا اور کبھی کبھی دیسی طریقہ کا۔ یہاں ہم لوگ آپس میں پورے طور سے مساوات کا ثبوت دیتے اور وقت کا زیادہ حصہ گپیں ہانکنے۔ کھانا کھانے۔ اخبارات پڑھنے۔ تاش کھیلنے اور کوئٹ انڈیا" انگریزوں کو نکال دو" اور" جیل خانہ توڑ دو" وغیرہ کے نعرے لگانے میں صرف ہوتا۔ دو ہفتہ کے بعد ہم ملتان اولڈ سنٹرل جیل میں بھیجے گئے۔ راستہ میں کوئی سٹیشن ایسا نہ تھا جہاں" انگریزوں کو نکال دو" اور" بغاوت کرو" کے نعرے ہم نے نہ لگائے ہوں۔ ملتان پہنچنے تک ہم نے قید کو غنیمت سمجھا۔ نہ کام۔ نہ دفتر کی کوفت۔ نہ کوئی ڈگری نہ قرقی۔ اچھا کھانا۔ اچھا پہننا۔ کتابیں اور اخبارات پڑھنا۔ گپیں ہانکنا اور نعرے لگانا۔ ملتان جیل کے دروازہ کے اندر داخل ہوتے تو معلوم ہوا کہ پنجاب کے چھ سو کے قریب سیاسی قیدی اس جیل میں جمع ہو چکے ہیں اور ان میں اسمبلی کے ممبر بھی ہیں اور رئیس و امراء کا طبقہ بھی۔ اور پنجاب گورنمنٹ نے حکم دیا ہے کہ نہ کوئی اے کلاس ہوگی نہ بی کلاس۔ معمولی قیدیوں کا سا کھانا ملے گا۔ اخبارات کے پڑھنے کا تو کیا۔ جیل کے اندر کسی اخبار کے داخل ہونے کا بھی کوئی سوال نہیں۔ چارپائیاں نہ ہوں گی، ان کی جگہ مٹی کے چبوتروں پر سونا پڑے گا اور ہمیں دنیا کے حالات سے بے خبر رکھا جائے گا تاکہ جاپانیوں کے کامیاب حملوں کی خبریں سن کر ہمارے دلوں میں گدگدی پیدا نہ ہو۔ یہ اطلاع سنی تو ہمیں قدرتی طور پر تشویش پیدا ہوئی کہ دن کیسے کٹیں گے۔ یہ تشویش غصہ میں تبدیل ہوئی۔ اور مختلف بہانے بنا کر ہم نے جیل کے حکام کے ساتھ تعلقات کشیدہ کر لئے۔ چنانچہ ہمارے جیل کے اندر جاتے ہی بسم اللہ گاندھی ٹوپی سے ہوئی۔ جیل والے کہتے تھے کہ وہ جیل کے اندر کسی گاندھی ٹوپی کے جانے کی اجازت نہ دیں گے۔ ہم لوگ کہتے تھے کہ یہ ہماری سیاسی توہین ہے چنانچہ غصہ و جوش میں ہم نے بطور پروٹیسٹ تمام کپڑے اتار دیئے اور جیل کے قیدیوں کے عام کپڑے پہن لئے۔ مجھے کوئی کرتہ فٹ نہ آیا تو میں بغیر کرتہ کے ہی جیل میں داخل ہوا۔ اور جب تک درزی نے میرے سائز کا کرتہ نہ سی دیا میں ایک ہفتہ کے قریب ننگے سادھوؤں کی طرح ہی رہا۔ یہ سب کچھ ہم نے گاندھی ٹوپی کے نام پر کیا۔ مگر دراصل اس کی وجہ آرام نہ ملنے کی تشویش اور تشویش سے پیدا شدہ غصہ تھا۔ کہ ہم دہلی جیل کے بہشت سے ملتان جیل کے دوزخ میں بھیج دیئے گئے۔

ملتان جیل میں کھانے پینے کی تکلیف تو برداشت کی جا سکتی تھی۔ مگر دنیا کے حالات سے بے خبر رہنے کی کوفت ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ اسمبلی کے ایک ممبر نے کوشش کر کے اپنے ایک ہم وطن وارڈر کو اڈے لگا لیا۔ اور یہ انتظام کیا گیا کہ" ٹریبیون" کے دو پرچے وہ علی الصباح چار بجے ان کے پاس پہنچا دیا کرے اور ان دو پرچوں کی قیمت دو روپیہ اس وارڈر کو دی جائے گی۔ اس تجارت میں

Marfat.com

سے ایک روپیہ چودہ آنہ کی ہر روز بازیافت ہوگی۔ اور اگر یہ موقوف ہو گیا تو اس کی ملازمت کا کسی دوسری جگہ انتظام کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس طریقہ سے "ٹریبیون" کے دو پرچے آتے رہے۔ اور ملتان جیل میں یہ پہلی "بدمعاشی" تھی جس کا ہم لوگوں نے انتظام کیا۔ چھ سو سیاسی قیدیوں میں دو پرچے ناکافی تھے اور بعض اوقات پرچہ کی دوسرے تیسرے روز باری آتی تھی چنانچہ اس ذہنی کوفت کے ساتھ ساتھ ہمارے غصہ میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ بہت کوشش کرتے کہ ہم "پر امن" رہیں۔ ہم لوگ اظہارِ ناراضی کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال ہی لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیدیوں نے جیل کے حکام کے ساتھ نان کوآپریشن شروع کر دیا۔ جوں جوں ہم افسروں کو تنگ کرتے وہ ہمارے لئے زیادہ سختیاں پیدا کرتے چلے جاتے۔

اِدھر سختیاں شروع ہوئیں اور اُدھر میں نے "ہوائی ڈاک" (بغیر حکام کی اطلاع کے جیل سے جو خط و کتابت کی جائے قیدیوں کی اصطلاح میں اُسے ہوائی ڈاک کہا جاتا ہے) کا انتظام کر لیا۔ ہر روز خط پوسٹ کرنے کے لئے جیل سے باہر بھیج دیتا۔ اور خطوط کا جواب اُسی ذریعے سے میرے پاس پہنچ جاتا۔ اور یہ "ہوائی ڈاک" اس قدر روزنی ہوگئی کہ اکثر بیس بیس پچیس پچیس خطوط ہر روز بھیجے جاتے۔ مجھے پوسٹ آفس سمجھ لیا گیا۔ اور جس شخص کو جیل سے باہر خط بھیجنا ہوتا وہ مجھے اپنا خط دے جاتا۔

مولانا امداد صابری نے ایک روز کہا کہ ملتان جیل میں آکر زندگی بے لطف ہوگئی۔ کوشش ہونی چاہیئے کہ ہم واپس دہلی یا کسی دوسرے جیل میں چلے جائیں۔ میں نے کہا یہ کیا مشکل ہے ایک ہفتہ میں چلے جائیں گے۔ میں انتظام کر دیتا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل سردار رام سنگھ قیدیوں کو دیکھنے کے لئے ہر روز صبح آیا کرتے۔ اگلے صبح آئے تو انہوں نے حسبِ دستور میرے قریب آکر پوچھا: "سردار صاحب مزاج اچھے ہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟" میں نے جواب دیا "تکلیف کا کیا سوال ہے یہاں ہم برات کے ساتھ تو نہیں آئے جو آرام و راحت کی تلاش میں ہوں، اور نہ ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ مگر سردار صاحب سنا ہے کہ آپ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ اور آپ کی پوزیشن ایک مجسٹریٹ کی بھی ہے" سردار رام سنگھ نے جواب دیا "ہاں میں مجسٹریٹ بھی ہوں" اس پر میں نے کہا "میرا یقین ہے کہ بطور مجسٹریٹ آپ جھوٹ نہیں بولیں گے بعض سیاسی قیدیوں کو ہم سے دور لے جا کر کوٹھڑیوں میں پیٹا گیا۔ ہم یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔ پوچھتا ہوں کیا یہ واقعہ سچ ہے یا جھوٹ ہے۔ اور اگر سچ ہے تو کس قانون کے تحت آپ کے آدمیوں نے یہ کمینہ فعل کیا۔ آپ کو اس واقعہ کی جوابدہی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ میں نے سختی کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔ اور اس سے دو چار روز پہلے ہم قیدیوں کو پیٹنے وغیرہ کے واقعات دہلی کے اخبار "تیغ" (جس کے ایڈیٹر مولانا امداد صابری تھے) کو بھیج چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سردار رام سنگھ نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کو رپورٹ کی۔ کہ دیوان سنگھ اور

Marfat.com

اس کے ساتھ آٹھ دس دوسرے اصحاب بہت گستاخ اور ایجی ٹیٹر ہیں ۔ ان کو اس جیل سے فوراً بدل دیا جائے ۔ ورنہ یہ تمام قیدیوں کو ورغلا دیں گے ۔ سردار رام سنگھ کی اس رپورٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دس کے قریب سیاسی قیدی، جن میں لدھیانہ کے منشی نعیم بھی تھے، ملتان جیل سے انبالہ جیل میں تبدیل کر دیئے گئے ۔ اور جو گارد ہمیں انبالہ جیل میں پہنچانے کے لئے ملتان سے گئی اس کے پاس مہریں لگا ہوا ایک لفافہ بھی تھا ۔ اس لفافہ میں ہر قیدی کا اعمالنامہ تھا اور میرے اعمالنامہ میں لکھا تھا کہ یہ خطرناک قسم کا ایجی ٹیٹر ہے ۔ اس سے بہت احتیاط کی جائے ۔

انبالہ جیل میں سپرنٹنڈنٹ لالہ ہری چند تھے جو مجھے پہلے سے جانتے تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک بار لالہ شام لال کپور ایڈیٹر "گورو گھنٹال" کے ساتھ لاہور میں مجھ سے مل بھی چکے ہیں، مگر مجھے یاد نہ تھا کہ وہ کب ملے ۔ لالہ ہری چند بہت شریف طبیعت افسر تھے ۔ وہ کسی کو تکلیف دینا نہ چاہتے تھے ۔ اس کے علاوہ ہمارے ملتان کے بھیجے گئے اعمالنامہ کا بھی کچھ اثر تھا ۔ لالہ ہری چند نے اپنے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو زبانی ہدایت دی کہ دیوان سنگھ بہت خطرناک قسم کا آدمی ہے ۔ یہ اپنے مقدمات میں کئی سرکاری ملازموں کے لئے مصیبت کا باعث ثابت ہوا ۔ اور نہ صرف یہ کہ اس کے مخالف ہونے کی صورت میں ملازمت کا ہی خطرہ ہے یہ بھی کوئی خلافِ توقع نہیں کہ یہ کوئی ایسی مصیبت کھڑی کر دے جس سے نہ صرف ملازمت سے موقوفی ہو بلکہ افسر قید بھی ہو جائے ۔ اس لئے یہ جیسا کہتا ہے کرتے جاؤ اس کو ناراض نہ ہونے دیا جائے ۔ اس ہدایت کے متعلق تو مجھے تب معلوم ہوا جس روز چھ ماہ کے بعد ہم لوگ انبالہ جیل سے فیروزپور جیل میں تبدیل کر دیئے گئے اور انبالہ سے روانہ ہوئے ۔ مگر اس ہدایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک ہم انبالہ جیل میں رہے میرے راستہ میں کوئی مخل نہیں ہوا ۔ درجنوں خطوط باہر جاتے اور ان کا جواب آتا ۔ جو شے میں چاہتا بازار سے منگاتا ۔ اخبارات پڑھتا ۔ جیل کے تمام ملازم لحاظ کرتے ۔ اس جیل میں میرا ایک سو روپیہ ماہوار کے قریب خرچ تھا اور آرام ایسا کہ جیل سے باہر پانچ سو روپیہ ماہوار میں بھی ایسی راحت میسر نہ ہو ۔ کیونکہ جو ملازم جیل سے باہر چالیس روپیہ ماہوار میں مل سکتا، ویسی سروس جیل میں پانچ روپیہ ماہوار میں حاصل ہوتی ۔ چنانچہ اس جیل میں جیل کی کوئی ایسی "بدمعاشی" نہ تھی جو میں نے نہ کی ۔ ہر روز خطوط آتے، خطوط جاتے ۔ غیر سیاسی قیدیوں کی ضروریات پوری کرتا ۔ جو سامان چاہتا بازار سے منگاتا ۔ یہاں تک کہ جیل سے سنٹرل اسمبلی کے بعض ممبروں اور ممبران انتظامیہ کونسل وائسرائے تک کو بھی پیغام بھیجتا اور ان کے جوابات منگا لیتا اور چیف کمشنر دہلی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے دفاتر سے بھی اپنے متعلق تمام اطلاعات حاصل کر لیتا ۔

انبالہ جیل میں رہتے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ گورنمنٹ نے دہلی کے تمام سیاسی قیدیوں کو فیروزپور جیل میں ایک جگہ جمع کر دیا ۔ اور میں بھی وہاں بھیج دیا گیا ۔ فیروزپور جیل میں پہنچنے

Marfat.com

کے بعد "بدمعاشیوں" کو جیل کے باہر سے منگانے کا نیا انتظام کرنا پڑا۔ اور نئے وارڈروں کو اڈے لگایا گیا۔ دوسرے سامان کے بغیر تو گزارہ ہو سکے، خط و کتابت کے بغیر کیونکر رہا جائے۔ انبالہ جیل میں خطوط لے جانے والے وارڈر کو آٹھ آنہ فی خط دیا کرتا تھا۔ اسی ریٹ پر فیروزپور میں انتظام کر لیا گیا۔ چند روز "ہوائی ڈاک" جاری رہی تو میرے متعلق وہاں کے سپرنٹنڈنٹ جیل کو کسی وارڈر کی مخبری کے باعث علم ہو گیا کہ میں اپنے پاس جیل کے قوانین کے خلاف روپیہ رکھتا ہوں۔ اور میرے خطوط جاتے اور آتے ہیں۔ مگر سپرنٹنڈنٹ کو یہ علم نہ ہو سکا کہ خطوط کون لاتا ہے۔ چنانچہ صرف شک میں جیل کے ہسپتال کا ایک کمپونڈر وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ حالانکہ اس بے چارے کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ یہ ایک روز مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور مخبر نے ہمیں باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اس کمپونڈر کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی شک ہوا اور ان کی ڈیوٹی دوسرے وارڈوں میں لگا دی گئی۔ جب میری خطوط کی "بدمعاشی" جاری ہوئے بہت دن گزر گئے تو ایک روز اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر ڈوگرہ (یہ صاحب آجکل غالباً انبالہ جیل میں ہیں) میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر مٹو کے دل میں میرے لئے بہت عزت ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ مجھے کوئی تکلیف ہو اور نہ سخت قدم اٹھائیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ بند ہونا چاہیئے۔ کیونکہ گورنمنٹ کے اعلیٰ افسر مٹو صاحب کو تنگ کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ چونکہ آپ پرائیویٹ طور پر بطور دوست پوچھ رہے ہیں میں جھوٹ بولنا یا مکاری کرنا نہیں چاہتا۔ میں خطوط بھیجتا اور منگاتا ہوں۔ میرا ان کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خط و کتابت کے بغیر میں اپنے دفتر اور دوستوں کے حالات سے بےخبر رہتا ہوں۔ میری اس سچائی پر انہوں نے تعجب کا اظہار کیا، اور کہا کہ کیا روپیہ بھی رکھتے ہو، میں نے کہا ہاں۔ روپیہ کے بغیر کون کسی کا کام کرتا ہے۔ ان باتوں کے بعد کچھ مذاق اور کچھ سنجیدگی کے ملے ہوئے جذبات کے ساتھ انہوں نے میرے کمرہ کی تلاشی لی۔ اس میں ان کو کچھ نہ ملا۔ اپنی خجالت کو مٹانے کے لئے انہوں نے کہا "آپ ویسے ہی گپ ہانکتے ہیں۔ آپ کے پاس کوئی روپیہ ہوتا تو آپ کے بکس یا سامان میں ہوتا۔" میں نے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا فی الحقیقت میرے پاس روپیہ ہے اور بغیر روپیہ کے میں کبھی کسی جیل میں نہیں رہا۔ کیونکہ دوسرے لوگوں کو بطور حق الخدمت دینا ہوتا ہے۔ میرے اس جواب پر ڈوگرہ صاحب نے کہا "کیا دھرم سے کہتے ہو کہ روپیہ ہے" میں نے کہا "میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ اور اگر آپ کی تسلی دھرم سے ہوتی ہے تو میں دھرم سے کہتا ہوں کہ میرے پاس روپیہ ہے اور اس بکس میں ہی پڑا ہے، جس کی آپ نے تلاشی لی۔" مسٹر ڈوگرہ حیران، کہ روپیہ کہاں ہے جو تلاشی پر بھی نہ نکلا۔ آپ نے پھر دوبارہ میرے بکس کی تلاشی لی، ایک ایک کپڑا اور کپڑے کی ایک ایک جیب، کتابوں کا ایک ایک ورق جوتے اور تمام سامان کو چھان مارا۔ یہاں تک کہ سالٹ کے شیشیوں تک کو خالی کر دیا مگر کچھ نہ نکلا اور

Marfat.com

مسٹر ڈوگرہ مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر چلے گئے "یار تم تو جھوٹ بولتے ہو اور مجھے بے وقوف بناتے ہو تمہارے پاس کوئی روپیہ نہیں۔" میں نے پھر کہا۔ دھرم کی قسم پر اعتبار کیجئے میرے پاس روپیہ موجود ہے اور اس بکس میں ہی ہے۔

اس وقت میرے پاس دس دس روپیہ کے دس نوٹ تھے اور یہ نوٹ کرسچن سالٹ کی شیشیوں کے ڈھکنوں میں گتے کے نیچے رکھے ہوئے تھے اور کرسچن سالٹ کی یہ شیشیاں اس بکس میں ہی پڑی تھیں جن کو خالی کر کے اور سالٹ باہر نکال کر مسٹر ڈوگرہ نے دوبارہ دیکھا تھا چنانچہ فیروزپور جیل میں میری جیل کی "بدمعاشیاں" آخری روز تک جاری رہیں۔ کیونکہ یہ "بدمعاشیاں" قانوناً ممنوع تھیں۔ مگر جہاں تک اخلاق کا سوال ہے میں ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتا، اور آئندہ بھی ان کو کروں گا۔ گورنمنٹ کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق ہمیں خطرناک سمجھتے ہوئے جیل میں بند کرے۔ مگر ہمارے بے گناہ ہوتے ہوئے اسے ہماری خط و کتابت اور ہمارے کھانے پینے کی اشیاء پر پابندی لگانے کا حق حاصل نہیں۔ اور ان پابندیوں کو صرف مہاتما گاندھی جیسی بلند شخصیتیں ہی قبول کر سکتی تھیں جو جیل کے ڈسپلن کو توڑنا بھی ستیہ آگرہ کے خلاف سمجھیں۔

جرائم پر فطرت کا اثر

دوسرے لوگ تو جیلوں میں جا کر اپنا وقت گذار کر چلے آتے ہیں۔ مگر میں جب کبھی جیل گیا، انسانی فطرت کے متعلق میں نے ہمیشہ ہی اپنی معلومات کا فی اضافہ کیا۔ کیونکہ وہاں پڑھنے اور سوچنے کے لئے اتنا وقت ملتا ہے کہ جیل سے باہر اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ میں جب شروع شروع میں جیل گیا اور کسی قیدی سے اس کے جرم کے متعلق پوچھا تو ہر شخص اپنے جرم کو بتاتے ہوئے ہچکچاتا۔ کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی جرائم پیشہ ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے چوری، دھوکہ یا اس قسم کے دوسرے اخلاقی جرائم کا اقرار کرے۔ چنانچہ جس قیدی سے میں پوچھتا کہ وہ کیا جرم کر کے آیا ہے تو جواب دینے والا قیدی یا تو ٹالنے کی کوشش کرتا یا اپنے جرم کو غلط بتاتا۔ آخر میں نے ایک ترکیب سوچی جب کبھی کسی سے پوچھتا تو یہ سوال نہ کرتا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا؟ اس سے کہتا تمہارے خلاف پولیس نے کس جرم میں جھوٹا مقدمہ بنایا ہے؟ میرے اس سوال کا قیدی کی ذہنیت پر ہمدردی کا سا اثر ہوتا، اور وہ فوراً جواب دیتا۔ زنا بالجبر۔ چوری، ڈاکہ یا دھوکے کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میں سمجھ جاتا کہ یہ حضرت کس جرم میں تشریف لائے ہیں اور ان کا کیریکٹر کیا ہے؟

میں دہلی جیل میں تھا۔ ایک روز شام کو چار بجے کے قریب ایک انگریز قیدی تشریف لائے اور میرے ساتھ سپیشل کلاس کے کمروں میں رکھے گئے۔ ان کے پہنچنے پر میں نے ان سے بھی

Marfat.com

نے سوال کیا "پولیس نے آپ پر کس جرم میں جھوٹا مقدمہ بنایا؟" اس انگریز نے فوراً جواب دیا۔ ۴۲۰ (یعنی دھوکہ) چونکہ یہ ابھی آئے تھے میں نے باورچی سے چائے تیار کرنے کے لئے کہا۔ چائے پیتے ہوئے باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے فرمایا۔ کہ آپ کا نام مسٹر واٹسن ہے پیشہ کے اعتبار سے آپ بیرسٹر ہیں۔ کسی مخالف بیرسٹر نے سازش کر کے آپ کے خلاف جھوٹا مقدمہ قائم کر دیا اور مقدمہ لین دین کا تھا جس کو دھوکا بنا لیا گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پریکٹس کہاں کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ پہلے اجمیر میں پریکٹس کرتے تھے اب لاہور میں پریکٹس کرتے ہیں۔

رات کو بھی مسٹر واٹسن سے باتیں ہوتی رہیں تو معلوم ہوا کہ تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری اس شخص کو حفظ یاد ہیں۔ اور ہائیکورٹوں کے فیصلے اور نظائر سے بھی یہ خوب واقف ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص بیرسٹر ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے مقدمے کے متعلق بھی اس سے مشورہ لیا۔ اور چونکہ میں نے اس سے مشورہ لیا اس لئے میں نے "بیرسٹر صاحب" کی خاطر و تواضع کرنا اپنا فرض سمجھا۔ میرا کھانا گھر سے آیا کرتا تھا۔ رات کو انہوں نے ڈنر میرے ساتھ کھایا اور صبح بھی انڈے ٹوسٹ اور بریک فاسٹ کی چائے میرے ساتھ پی۔ اگلے روز دوپہر کے تین بجے تھے کہ مجھ سے ملنے کے لئے ایک قیدی پیارا سنگھ آئے۔ پیارا سنگھ پہلے پوسٹ ماسٹر تھے اور میرے لئے ان کے دل میں بہت مخلصانہ جذبات تھے۔ انہوں نے میرے پاس مسٹر واٹسن کو بیٹھے دیکھا تو آتے ہی بے تکلف ہو کر کہا "ہیلو مسٹر واٹسن"۔ مسٹر واٹسن نے جب پیارا سنگھ جی کو دیکھا تو وہ کچھ حیران سا ہو گیا اور کھسیانا حالت میں پیارا سنگھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ہیلو پیارا سنگھ"۔ پیارا سنگھ جی ہمارے پاس بیٹھ گئے تو آپ نے مسٹر واٹسن سے سوال کیا "لاہور جیل سے کب آئے؟" "کس کس جیل میں رہے۔ کیا کوئی اور اسامی ملی؟" وغیرہ۔ ان باتوں سے میں سمجھ گیا کہ مسٹر واٹسن جیل کے "اولڈ برڈ" ہیں۔ پیشہ ور مجرم ہیں۔ اور زیادہ مقدمات کا ڈیفنس پیش کرتے کرتے، تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد پیارا سنگھ جی نے مجھے بتا دیا کہ یہ دھوکے میں سولہ بار کے سزا یافتہ ہیں، پیشہ ور ۴۲۰ ہیں۔ عمر کا زیادہ حصہ جیلوں میں گذرا اور بہت بڑے دھوکہ باز ہیں۔

مسٹر واٹسن کے جھوٹ بولنے کا مجھ پر بہت برا اثر ہوا۔ میرے دل میں اس کے لئے نفرت پیدا ہو گئی۔ مگر یہ شخص بہت ہی ہوشیار تھا اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کے پہلے روز ہی جھوٹ بولنے کا مجھ پر برا اثر ہوا ہے تو اس نے اپنے جھوٹ بولنے کا اقرار کر لیا، ندامت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ آئندہ جھوٹ نہ بولے گا۔ چنانچہ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ پچھلی زندگی میں اس نے کیا کیا جرائم کئے۔ اس کے اقرار کے باعث اس نفرت میں کچھ کمی ہوئی جو اس کے لئے میرے دل میں پیدا ہو چکی تھی۔ اور چونکہ ہم ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ بات چیت نہ کرتے یا ایک دوسرے کے ہمدرد نہ ہوتے۔

Marfat.com

اس کو جیل میں آئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ یہ اپنے مقدمہ کی پیشی کے لئے ڈسٹرکٹ کورٹ میں لے جایا گیا۔ عدالت سے یہ واپس آیا تو بہت مغموم صورت ۔ میں نے پوچھا کیا ہوا، تو اس نے بتایا کہ عدالت میں تو پیشی پڑ گئی مگر اس کی بیوی کا خط ملا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ وہ فاقے کر رہی ہے۔ کھانے کے لئے ایک پیسہ نہیں، اور بچے بھی فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ میں نے اس کی مصیبت میں ہمدردی کا اظہار کیا تو اس نے مزید مغموم صورت بناتے ہوئے کہا کہ میں اس کو پچیس روپے دوں تا کہ یہ اپنی بیوی کو لاہور بھیج دے۔ جب اس نے اس مغموم صورت میں پچیس روپے طلب کئے تو میں انکار نہ کر سکا۔ میں نے اپنے دفتر میں ایک رقعہ لکھ دیا کہ پچیس روپے دے دیئے جائیں۔ اس نے یہ رقعہ ایک آدمی کے ہاتھ بھیج کر پچیس روپے میرے دفتر سے منگا لئے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد اس نے کہا کہ اس کا لڑکا لاہور میں سخت بیمار ہے۔ پھر چند روز کے بعد اور بہانہ کیا۔ چنانچہ دو ماہ کے عرصے میں میرے رقعے لے جا کر اس نے میرے دفتر سے ڈیڑھ سو کے قریب روپے منگا لئے۔ دو ماہ گزرنے کے بعد جب یہ پیشی پر عدالت گیا تو وہاں سے سارجنٹ پولیس (جو اسے پیشی کے لئے موٹر سائیکل پر لے جایا کرتا تھا اور واپس لاتا تھا) کو ساتھ لے کر دفتر "ریاست" میں پہنچا اور اس نے منیجر سے کہا کہ دیوان سنگھ نے پچاس روپے منگائے ہیں۔ دفتر والوں نے کہا کہ ان کو روپیہ دینے میں عذر نہیں مگر رقعہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے بغیر رقعہ کے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اگلے روز مجھے اطلاع ملی کہ واٹسن نے اس طرح بغیر میری اجازت کے روپے طلب کئے تو میں نے اسے بہت شرمندہ کیا۔ مگر اس شرمندگی کا کیا اثر ہو سکتا تھا، دھوکہ دینا تو اس کی فطرت میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد گو اس نے میری رحمدلی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مصائب بیان کر کے مجھے دھوکہ دینا چاہا مگر میں نے جیل میں اس کا اعتبار نہیں کیا اور نہ کچھ دیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد واٹسن نے بھی اپنی رہائش دہلی میں اختیار کر لی کشمیری دروازہ کی طرف ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور اس نے اپنی ایک نوجوان لڑکی اور لڑکے کو لاہور سے اپنے پاس منگا لیا۔

میں اس کی فطرت سے واقف ہو چکا تھا اس کے دھوکہ میں نہ آتا۔ مگر اس نے میرے جیل سے آنے کے بعد میرے ہاں آنا شروع کیا۔ کبھی اپنی لڑکی اور لڑکے کو لے کر آ جاتا کبھی اکیلے۔ جب بھی آتا دو چار دس روپے طلب کرتا۔ اور وہ یہ کہہ کر کہ کل سے کھانا نہیں کھایا لڑکے کو بخار ہے دوائی کے لئے پیسہ نہیں، تانگہ پر ہسپتال لے جانے کے لئے دام نہیں ہیں۔ وغیرہ۔ میں اس سے انتہائی نفرت کرتا مگر اس کی حالت کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ دینے کو مجبور ہو جاتا اور وہ بھی اس طرح جیسے کوئی شخص کسی فقیر سے پیچھا چھڑانے کے لئے دیتا ہے۔

Marfat.com

ایک روز شام ۶ بجے کے قریب اپنی لڑکی اور لڑکے کو لے کر میرے قرول باغ والے مکان پر پہنچ گیا اور اپنی لڑکی سے کہلوایا کہ وہ سینما جانا چاہتی ہے۔ اس کو سینما کے ٹکٹ کے لئے کچھ دیا جائے۔ لڑکی کی زبان سے یہ سن کر مجھے بہت غصہ اور افسوس ہوا میں نے واٹسن کو ڈانٹا کہ جوان لڑکی کو لے کر اس کا دوسرے لوگوں کے گھروں میں جانا مناسب نہیں اور اگر اس کے پاس کھانے کو نہیں تو وہ سینما دیکھنے کا خیال بھی کیوں کرتا ہے۔ میں نے کچھ دینے سے انکار کیا تو وہ چلا گیا۔ اس کے کئی روز بعد ایک بار پھر آیا اور کہا کہ چند گھنٹے کے لئے ایک صوفہ سیٹ دیا جائے۔ یہ ورائٹی شو کرنا چاہتا ہے۔ ایک بلڈنگ تو ہے مگر وہاں فرنیچر نہیں ہے۔ اس کمبخت کو کیا جواب دیتا جس صورت میں کہ یہ صوفہ سیٹ صرف چند گھنٹوں کے لئے طلب کر رہا تھا۔ میں نے اس کو دے دیا جو آج تک واپس نہیں آیا اور نہ اس کے بعد اس کو جرأت ہوئی کہ وہ میرے سامنے آئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ واٹسن آجکل کہاں ہے عرصہ ہوا سنا تھا کہ یہ فوج میں عارضی طور پر ملازم ہو گیا ہے۔

میری زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ طویل عرصہ سے جرائم کرتے ہوں جرائم ان کی فطرت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ اور وہ اگر جرائم کو چھوڑنا بھی چاہیں تو قوتِ ارادی کی کمزوری کے باعث وہ جرائم کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اور چاہے سزا کے طور پر وہ کافی عمر جیل میں رہیں۔ جیل سے باہر آنے کے بعد وہ ان جرائم کے پھر مرتکب ہوتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی اور جیل سے رہا ہو چکے متعدد اشخاص پر اعتبار کیا۔ مگر ان میں سے شائد ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو قابلِ اعتماد ثابت ہو۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ فطرت کو بدلنے کے لئے بہت طویل عرصے کی ضرورت ہے۔ اور وہ بھی اگر یہ طویل عرصہ گذشتہ جرائم پر ندامت اور ضمیر میں پاکیزگی پیدا کرنے کی کوشش میں گزارا جائے۔

بد اچھا بدنام بُرا

میں ۱۹۴۲ء کے شروع میں جعلی نوٹوں کے مقدمہ میں گرفتار ہوا۔ اس سے پہلے مجھ پر کوکین رکھنے، چوری کرنے یا کرانے اور امانت میں خیانت کرنے وغیرہ کے کئی چھوٹے مقدمات چل چکے تھے جو والیانِ ریاست کے پیڈ ایجنٹوں نے چلائے اور میں ان تمام مقدمات میں عدالتوں سے باعزت بری ہوا۔ ان مقدمات کے متعلق تو شروع سے ہی تمام لوگوں کو یہ علم تھا کہ مقدمات بے بنیاد ہیں۔ اور ہر شخص میرا ہمدرد تھا۔ مگر نوٹوں والے اس مقدمے کے متعلق ایک طبقہ اس مقدمے کو جھوٹا اور بناوٹی نہ سمجھتا تھا بلکہ بعض حلقے تو اس کوشش میں تھے کہ میں نوٹوں کے "سٹاک" میں ان کو بھی شریک کر لوں تاکہ وہ ان کے ذریعے لاکھوں روپیہ پیدا کر سکیں۔ اس سلسلہ میں چند دلچسپ

Marfat.com

واقعات عرض کرتا ہوں :۔
مقدمہ جب شروع ہوا اور میں پہلی پیشی پر جیل سے عدالت میں لایا گیا تو دہلی کے متعدد اخبار نویس بطور ہمدردی عدالت میں موجود تھے۔ ان اخبار نویسوں میں ایک دوست جن کا ایک مقامی روزنامہ انگریزی اخبار سے تعلق تھا مجھے دوسرے لوگوں سے چند قدم کے فاصلے پر لے گئے۔ اور آپ نے میرے کان سے اپنا منہ لگا کر سنجیدگی کے ساتھ کہا "آپ میرے دوست ہیں۔ سالہا سال سے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اگر واقعی نوٹ موجود ہوں اور ابھی نہ چلے ہوں تو مجھے دیجئے میں ان تمام کو احتیاط کے ساتھ چلالوں گا۔ اور جو روپیہ ان نوٹوں سے حاصل ہوگا وہ نصف نصف کر لیا جائے گا" ان کی اس بات کو سن کر میں مسکرا دیا لیکن کوئی جواب نہ دیا اور ان کے ساتھ دوسرے دوستوں کے پاس واپس آ کر ایک لطیفہ بیان کیا جو یہ ہے :۔ ایک میراثی کو یہ معلوم ہوا کہ گوردوارہ میں صبح ہر روز کڑاہ پرشاد (حلوہ) مفت تقسیم ہوتا ہے۔ میراثی ایک روز حلوہ تقسیم ہونے کے وقت گوردوارہ میں جا بیٹھا۔ اور وہ بائیں طرف کی قطار میں بیٹھا تھا۔ جب حلوہ تقسیم ہونے کا وقت آیا تو حلوہ تقسیم کرنے والے گرنتھی نے داہنی طرف کی قطار سے حلوہ تقسیم کرنا شروع کیا۔ میراثی نے جب دیکھا کہ حلوہ تقسیم کرنے والے نے داہنی طرف کی قطار سے حلوہ تقسیم کرنا شروع کیا ہے، تو وہ صبر نہ کر سکا۔ اور اس خیال سے کہ بائیں طرف پہنچتے پہنچتے تمام حلوہ ختم ہو جائے گا اور اس کے لئے باقی نہ بچے گا۔ اس نے حلوہ تقسیم کرنے والے گرنتھی سے کہا "سردار جی! حلوہ پہلے اس قطار کی طرف سے تقسیم کرنا شروع کیجئے"! گرنتھی کے لئے یہ آواز خلافِ توقع تھی۔ کیونکہ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی شخص نے حلوے کے لالچ کا اظہار کیا ہو۔ گرنتھی نے پوچھا "تم کون ہو؟" میراثی نے فوراً جواب دیا "میں تمہارا خادم میراثی ہوں"۔ گرنتھی نے جب یہ سنا کہ میراثی گوردوارے کے اندر گھس آیا ہے تو اس نے ایک دوسرے سکھ سے کہا "مارو اس میراثی کو، یہ کیوں یہاں گھس آیا"؟ میراثی کو جب مار پڑنے لگی تو اس نے کہا "سردار جی میں نے تو حلوے کے لئے کہا تھا کہ ادھر بائیں طرف کی قطار سے شروع کرو اگر پٹنے کا ہی سوال ہے تو پھر داہنی طرف سے شروع کیجئے جہاں سے حلوہ تقسیم ہونا شروع ہوا تھا"! یہ لطیفہ بیان کرنے کے بعد میں نے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ہمارے دوست صرف حلوہ کھانے والوں میں سے ہیں، پٹنے والوں میں سے نہیں۔ فرماتے ہیں بنے بنائے نوٹ دے دو چلا دیں گے۔ اور میں عرض کرتا ہوں کہ پہلے جیل میں میرے ساتھ آئیے پھر آپ کا حصہ دے دوں گا۔ دوستوں نے تو اس لطیفے کو قہقہے مار کر سنا مگر نوٹوں کے وہ خواہش مند دوست کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ اور کھسیانی حالت میں ہی ان کو بھی قہقہوں میں شریک ہونا پڑا۔

نوٹوں کے مقدمے کے فیصلے اور بری ہونے کے آٹھ ماہ بعد جب میں اگست ۱۹۴۲ء میں کانگرسی اصحاب کے ساتھ نظر بند کیا گیا۔ اور ملتان جیل میں پہنچا تو لاہور کے ایک کانگرسی لیڈر جو آج کل

Marfat.com

پنجاب اسمبلی میں ایم ۔ ایل ۔ اے ہیں۔ مجھے دوسرے دوستوں سے علیحدہ لے گئے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرنے کے بعد آپ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "سنائیے کتنے نوٹ ابھی باقی ہیں جو پولیس کے ہاتھوں سے بچ گئے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے دیجئے۔ میں تمام کو بازار میں چلوا دوں گا میرے پاس نوٹ چلوانے کے ذریعے موجود ہیں" میں ان کو کیا جواب دیتا میں نے بہت کہا کہ آپ کا خیال غلط ہے میرے پاس کوئی نوٹ موجود نہیں مگر یہ نہ مانے سو ہاں دوسرے تیسرے روز مطالبہ کیا کرتے کہ میں دہلی اپنے قابل اعتماد آدمیوں کو ہدایت کردوں کہ وہ ان دوست کے قابل اعتماد آدمی کو بقایا تمام نوٹ دے دیں۔ چنانچہ یہ اب بھی جب کبھی ملتے ہیں تو یہی شکوہ کرتے ہیں کہ میں نے ان پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا اور نوٹ نہ دیئے۔

عرصہ ہوا دفتر "ریاست" محلہ گڑھیا میں تھا تو ضلع مردان (سرحد) سے ایک مسلمان بزرگ تشریف لائے۔ ان کے بیٹھنے کے بعد میں نے کہا فرمایئے کس طرح تشریف لائے، کیا کام ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کو لے کر دوسرے کمرے میں گیا۔ اور وہاں بیٹھنے کے بعد میں نے پوچھا فرمایئے۔ تو آپ نے دس روپے کا ایک جعلی نوٹ نکال کر مجھے دکھایا اور کہا کہ اس کے ساتھ کے ہزار دو ہزار یا دس ہزار جتنے نوٹ میں چاہوں ان سے نصف قیمت پر میں لے سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میں یہ سودا نہیں کرتا۔ میرا کام اخبار ایڈیٹ کرنا ہے جعلی نوٹ فروخت کرنا نہیں۔ میرے اس جواب پر آپ نے فرمایا "مجھے تو معلوم ہوا تھا کہ آپ جعلی نوٹوں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ میں اسی لئے مردان سے آیا، مگر آپ انکار کر رہے ہیں۔ کچھ کم و بیش کر کے معاملہ کر لیجئے" میں نے پھر ان سے سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ آپ کو غلط اطلاع ملی ہے میں نوٹوں کا بیوپاری نہیں ہوں۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے اس لئے میں آپ کے اعتماد کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ورنہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو پولیس کو اطلاع کر دیتا اور آپ گرفتار ہو جاتے مہربانی فرما کر یہاں سے چلے جایئے اور پھر کبھی دوبارہ یہاں تشریف نہ لایئے۔ میرے یہ کہنے کے بعد وہ حضرت تشریف لے گئے۔

کافی عرصہ کا ذکر ہے میں صبح آٹھ بجے کے قریب مضمون لکھ رہا تھا تو نیچے سے چپڑاسی نے آکر کہا کہ ایک لالہ جی لاہور سے آئے ہیں اور ان کا بستر بھی ان کے ساتھ ہے میں سمجھا کہ کوئی صاحب بطور مہمان تشریف لائے ہیں۔ میں نے بلایا اور پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں تو آپ نے فرمایا "میں دکان کرتا ہوں پچاس ساٹھ روپے کی ماہوار آمدنی ہو جاتی ہے۔ بیڈن روڈ پر ایک کپور صاحب ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ جعلی نوٹوں کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ میرا موجودہ کاروبار تسلی بخش نہیں، میں آپ کی امداد چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے ارزاں نرخ پر جعلی نوٹ دیں تو میں بھی اس میں سے منافع حاصل کر سکوں" میں حیران کہ یہ کون شخص ہے۔ بیٹھے ستر برس کے قریب، صحت خراب، طبعاً بالکل سادہ لوح اور لے رہا۔ جب زیادہ باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ کوئی کپور صاحب ہیں انہوں نے اس بے چارے کو سادہ لوح سمجھ کر بے وقوف بنایا۔ اور کہا کہ دکاندار؟

Marfat.com

میں زیادہ منافع نہیں۔کیا پچاس ساٹھ روپے میں جھک مارتے ہو۔ دیوان سنگھ کے پاس دہلی جاؤ وہاں سے نصف قیمت پر جعلی نوٹ لاؤ۔ میں نے اس بے چارے کو سمجھایا کہ کپور صاحب نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔کوئی شخص آپ کو بے وقوف سمجھ کر ٹھگ لے گا ؛ اور نقصان اٹھاؤ گے چنانچہ یہ بے چارہ پندرہ بیس روپے کرایہ پر خرچ کر کے اور سفر کی تکلیف اٹھا کر واپس لاہور آ گیا۔

اب تو نہیں مگر کچھ عرصہ پہلے حالت یہ تھی کہ میں جب کبھی بازار جاتا۔ سامان خریدنے کے لئے دکاندار کو سو روپے کا نوٹ دیتا اور دکاندار مجھے جانتا تو نوٹ اپنے ہاتھوں میں لے کر کبھی میری طرف دیکھتا کبھی نوٹ کی طرف کبھی اس کے واٹر مارک (جو نوٹ کے کاغذ کے اندر سفید لکھا ہوتا ہے) کو غور سے پڑھتا اور پھر مجھ کو دیکھ کر مشکوک نگاہوں کے ساتھ نوٹ کو اپنے کیش بکس میں رکھتا یعنی اس کو شک ہوتا کہ یہ نوٹ جعلی ہے یا اصلی۔ چنانچہ میں نے اس زمانہ میں اپنی جیب میں سو روپے کا نوٹ رکھنا ہی بند کر دیا تھا۔ اس کی جگہ دس دس روپے کے نوٹ رکھتا کیونکہ جن جعلی نوٹوں کے متعلق مقدمہ چلا وہ سو سو روپے کے تھے۔

جیل میں میرے ساتھ دہلی کے ایک مخلص اور سچے گاندھی بھگت برج کرشن جی تھے۔ جن کا خاندان چاندی والا کہلاتا ہے۔کیونکہ ان کے بزرگ پہلے غالباً چاندی کا کاروبار کرتے تھے۔ دہلی میں برج کرشن جی بھی چاندی والے مشہور ہیں۔ فیروز پور جیل میں ایک بذلہ سنج دوست نے کہا "برج کرشن جی چاندی والے کے مقابلہ پر دیوان سنگھ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔کیونکہ برج کرشن جی تو چاندی والے ہیں۔مگر دیوان سنگھ نوٹوں والا ہے۔ نوٹوں کے مقابلہ پر بھلا چاندی کی کیا حیثیت ہے۔"

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے " مجھے ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی ہے جو بے نقاب ہو گئے" اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دنیا گنہ گاروں کی ہے۔ جن لوگوں کے گناہوں کا کسی کو علم نہ ہوا وہ تو نیک ہیں۔مگر جن لوگوں کے گناہوں کا لوگوں کو علم ہو گیا یعنی بے نقاب ہو گئے چاہے وہ سچے تھے یا جھوٹے وہ گنہ گار کہلائے۔

اس انگریز کے قول کے مطابق برا شخص اتنا برا نہیں جتنا کہ بدنام شخص۔کیونکہ اگر کوئی برا ہے مگر لوگ اس کی برائیوں کو نہیں جانتے تو وہ عوام میں نیک تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بدنام ہے چاہے وہ گنہگار ہے یا نہیں وہ لوگوں کی نظروں میں گنہگار قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کہاوتوں میں کہا جاتا ہے، بدا اچھا بدنام برا۔

Marfat.com

خیالات میں انقلاب کا باعث

میری عمر جب اٹھارہ بیس برس کی تھی تو میں بہت ہی متعصب قسم کا سکھ تھا۔ اور اس کا سبب وہ سکھ ماحول تھا جو بطور دوستوں کے حلقے کے مجھے فیروز پور کے قیام میں نصیب ہوا۔ میرے یہ دوست مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے دشمن تھے۔ دن رات اپنی علیحدہ قوم، علیحدہ مذہب اور علیحدہ پنتھ کے خبط میں رہتے۔ یہ سنگھ سبھا کی تحریک کے سرگرم ورکروں میں سے تھے۔ اور ان کی ذہنیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نے گورمکھی زبان کی تبلیغ و اشاعت کے لئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں سوائے گورمکھی کے اردو، انگریزی یا کسی دوسری زبان میں کچھ نہ لکھیں گے اور نہ پڑھیں گے۔ چنانچہ یہ اصحاب اگر مدراس، کلکتہ یا بمبئی خط لکھتے تو خط کا ایڈریس گورمکھی زبان میں لکھا جاتا جو ان صوبوں کے ڈیڈ لیٹر آفس کی سیر کرنے کے بعد واپس آ جاتا۔ ان دوستوں کی اس سپرٹ کا مجھ پر بھی اثر ہوا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جس طرح ایک نو مسلم دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ پر ہندوؤں کا زیادہ دشمن ہوتا ہے یا دشمن ہونا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کو مسلمان زیادہ مخلص اور اسلام کا پرستار سمجھیں۔ میں بھی ہندوؤں کا عموماً اور آریہ سماجیوں کا خصوصاً بہت دشمن تھا۔ میں ہندو تہواروں اور رسم و رواج کا مذاق اڑاتا اور جب کبھی بحث ہوتی تو ویدوں اور ستیارتھ پرکاش پر بھی اعتراض کرتا۔ حالانکہ نہ کبھی میں نے ستیارتھ پرکاش پڑھا تھا نہ گرنتھ صاحب سے کافی واقفیت تھی اور ویدوں کو تو کبھی دور سے دیکھنے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ میری مذہبی معلومات کی یہی پوزیشن اسلام اور عیسائیت کے متعلق تھی۔ یعنی بغیر ان مذاہب کی واقفیت کے ان پر بھی اعتراض کرتا۔

انسان کے ذہن میں تبدیلی کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

میں منصوری پہاڑ پر تھا اور چند روز کے قیام کے بعد واپس آنے والا تھا۔ جس روز شام کو وہاں سے روانہ ہونا تھا منصوری پہاڑ کا کچھ سامان یعنی چھڑیاں وغیرہ خریدنے کے لئے بازار میں گیا۔ بازار میں دیکھا کہ سینما کے پاس عیسائی طلبہ و طالبات کا مجمع ہے۔ اور یہ لوگ اپنے پادریوں کی معیت میں سینما کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا میں نے پوچھا کہ کیا یہاں آج عیسائیوں کا کوئی جلسہ ہے کیونکہ سینما شو شام کے وقت ہوا کرتے تھے۔ ایک پادری نے جواب دیا کہ حضرت مسیحؑ کی زندگی کے متعلق فلم "کنگ آف کنگز" دکھائی جائے گی۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں بھی اس فلم کو دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے ٹکٹ کی قیمت دینے کے لئے کہا۔ مگر پادری نے قیمت لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس شو میں ٹکٹ فروخت نہ کئے گئے تھے۔

میں یہ فلم "کنگ آف کنگز" دیکھتا رہا۔ میں ذہنی اعتبار سے کسی فلم کی تمام سٹوری کو یاد رکھنے کا اہل نہیں۔ اور تمام زندگی میں کبھی ایسا نہ ہوا۔ کہ کسی فلم کی پوری کہانی کو ذہن میں رکھا ہو کیونکہ فلم دیکھتے

Marfat.com

یا کسی سے باتیں کرتے چند منٹ کے بعد ہی ذہن دوسرے خیالات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ میں میرے لیئے ایک پوری فلم کا دیکھنا یا نصف دیکھ کر انٹرول میں چلے آنا ایک جیسا ہے! اسی طرح دوستوں کی پوری بات پر متوجہ نہ ہونے کے باعث مجھے اکثر شرمندہ بھی ہونا پڑتا ہے۔ میں فلم "کنگ آف کنگز" کی تمام سٹوری پر تو غور نہ کر سکا۔ اور نہ مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔ مگر حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کا واقعہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور یہ فلم ہی اس اعتقاد اور احترام کی بنیاد ثابت ہوئی جو آج میرے دل میں عیسائی مذہب کے بانی یعنی حضرت مسیح کے متعلق ہے۔ چنانچہ اگر میں اپنے دل کی ترجمانی کر سکتا ہوں تو مجھے اس کا اقرار کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ گو میں عیسائی نہیں اور میں نے بپتسمہ نہیں لیا مگر جہاں تک حضرت مسیحؑ کی قربانیوں اور قدرسیت کا سوال ہے میں حضرت مسیح کا عیسائیوں سے کم معتقد نہیں ہوں۔

اسلام سے مجھے واقفیت نہ تھی۔ اور نہ میں نے رسول اللہ کی زندگی یا قرآن کے مطالعہ کا کبھی خیال کیا۔ کیونکہ مذہبی لوگوں کے اعمال کو دیکھ کر مذاہب سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو چکی تھی چنانچہ اگر کسی جگہ مذہب کے متعلق کوئی بات ہو تو میرے لیئے وہاں چند منٹ گذارنا بھی طبیعت پر بار گذرتا تھا۔ میں دہلی جیل میں تھا وہاں میرا قیام لاہور کے احراری مولوی عبدالقیوم (جو آجکل مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر یا ورکر ہیں) کے ساتھ تھا۔ مولوی عبدالقیوم ایک مخلص شخصیت ہیں۔ مولوی لوگوں کی عملی زندگی چاہے کچھ ہو یہ مذہب کو کسی وقت بھی نہیں بھولتے۔ اور کوئی بات ہو اس کے متعلق مذہبی سند پیش کرنے میں مشاق ہوتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ دن رات رہتا اور یہ ہر بات میں مذہبی سند پیش کر دیتے۔ جس پر میں نے کبھی توجہ نہ کی۔ چنانچہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی یہ مذہبی سندیں پیش کرنا مجھے ناگوار سا محسوس ہوتا۔ ایک روز مہاتما گاندھی کی زندگی اور حق پرستی کا ذکر ہو رہا تھا۔ کیونکہ میں مہاتما گاندھی کی حق پرستی کا سالہا سال سے معتقد یا معترف ہوں اور میرا ایمان ہے کہ موجودہ دَور کے مشاہیر میں سے کوئی لیڈر بھی مہاتما گاندھی کا حق و صداقت کے اعتبار سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مہاتما گاندھی کی سچائیوں اور صاف بیانیوں کے ذکر کے بعد مولوی عبدالقیوم نے ایک حدیث پڑھی جس میں رسول اللہ نے فرمایا ہے "کہ دنیا میں سب سے بڑا جہاد بادشاہ کے منہ پر حق و صداقت کی آواز بلند کرنا ہے۔ اور اگر یہ شخص کسی سزا کی پرواہ نہیں کرتا تو اس شخص کا یہ فعل تمام جہادوں میں سب سے بڑا جہاد قرار دیا جائے گا۔" مولوی عبدالقیوم کے منہ سے یہ حدیث سن کر میں سوچنے لگا کہ جو رسول حق و صداقت کی آواز بلند کرنے کو جہادوں میں سے افضل ترین جہاد قرار دیتا ہے اس رسول کے بلند، حق پرست اور قابلِ احترام ہونے سے انکار کرنا کس قدر شرمناک اور باطل پرستی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم کے اس حدیث کے بیان کرنے کے بعد اسلام کے متعلق میرے ذہن میں انقلاب پیدا ہوا۔ اس کے بعد جب بھی موقع ملا میں نے

Marfat.com

رسول اللہ کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مختلف موضوع پر قرآن کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دل میں گو بعض مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر ان کے لئے نفرت ہے۔ اور ان کے اعمال نامے کو عالم اسلام کے لئے رسوائی و ذلت کا باعث سمجھتا ہوں۔ مگر رسول اللہ، قرآن اور اسلام کے لئے اپنے دل میں اتنی ہی عزت و احترام اور محبت کے جذبات رکھتا ہوں جتنے کہ ایک مسلمان کے دل میں ممکن ہیں۔

ان دو واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے ذہن کی تبدیلی کے لئے بعض اوقات ایک آدھ واقعہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اور یہ واقعہ نہ صرف اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے بلکہ یہ نفرت کو محبت اور حقارت کو عشق میں تبدیل کرنے کا باعث بھی ممکن ہے۔

گھریلو ملازموں کی بددیانتیاں

کئی برس ہوئے گوا کا رہنے والا، میرا باورچی کو لیو وطن چلا گیا۔ تو اس کی جگہ میں نے دہلی کا ایک باورچی کھچیڑو رکھ لیا۔ جو پہلے دہلی الیکٹرک سپلائی کمپنی کے منیجر کے پاس تھا، مگر الیکٹرک سپلائی کمپنی کے منیجر کی چھ ماہ کی رخصت پر ولایت جانے کے باعث یہ بے کار تھا۔ میں گھریلو ملازموں اور چپڑاسیوں کی بددیانتیوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اور میری کوشش ہوتی ہے کہ ان کو کافی معاوضہ ملے تاکہ یہ بددیانت نہ ہوں۔ کھچیڑو جب میرے پاس ملازمت کے لئے آیا تو میں نے پوچھا کہ الیکٹرک سپلائی کمپنی کا صاحب کیا تنخواہ دیتا تھا۔ اس نے بتایا پندرہ روپے ماہوار بغیر خوراک۔ میں نے کھچیڑو سے کہا وہ چوری نہ کرے اسے پندرہ روپے ماہوار کے ساتھ کھانا بھی دیا جائے گا۔ اس نے شکریہ کے ساتھ "بہت اچھا" کہا اور کام شروع کر دیا۔

میں ملازموں کی دیانت داری اور بددیانتی کو دیکھنے کے لئے ان پر کسی دوسرے ملازم کو نگران مقرر کر دیا کرتا ہوں۔ میرے پاس گھر میں اس زمانہ میں ایک دوسرا پہاڑی ملازم راما تھا جسے میں نے کھچیڑو کی نگرانی پر لگا دیا۔ کھچیڑو کو کام کرتے ہوئے تین روز ہوئے تھے۔ یہ رات کو دس بجے کام سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا تو اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ راما نے مجھے بتایا کہ کھچیڑو اپنے گھر جا رہا ہے۔ گرمی کے باعث جسم پر کرتہ پہننا بھی دشوار ہے مگر یہ چادر اوڑھے جا رہا ہے غالباً کوئی شے چوری کر کے لئے جا تا ہوگا۔ میں نے راما کو بھیجا کہ اس کو بلا لائے۔ راما اس کے پیچھے گیا اور اسے واپس بلا لایا، تو میں نے کھچیڑو سے پوچھا تم چادر اوڑھے جا رہے ہو تمہاری طبیعت تو اچھی ہے۔ اس نے جواب دیا ویسے طبیعت تو ٹھیک ہے مگر ذرا جسم ٹوٹ رہا ہے اور خفیف سی حرارت محسوس ہو رہی ہے اس لئے چادر اوڑھے جا رہا ہوں۔ میں نے اس

Marfat.com

کو چادر اتارنے کے لئے کہا۔ اُس نے چادر اتاری تو دیکھا کہ اس کے پاس ایک برتن ہے اور اس برتن میں ایک پاؤ کے قریب گھی ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیوں لے جا رہا ہے؟ کیا جواب دیتا شرمندہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اُس کی تنخواہ کم ہے تو اس میں پانچ روپیہ ماہوار کا اضافہ کرتا ہوں۔ مگر وہ آئندہ چوری نہ کرے۔ اس نے پھر شکریہ کے ساتھ کہا کہ "حضور میں آئندہ چوری نہ کروں گا"

کھیڑو اب بیس روپے ماہوار اور کھانا لیتا تھا۔ اس زمانہ میں یہ تنخواہ ایک اچھے باورچی کے لئے کافی تھی۔ مگر اس نے چند روز کے بعد پھر چوری کی۔ میں نے اس کی تنخواہ میں پانچ روپے کا اور اضافہ کیا اور اس سے حلف لیا کہ اب چوری نہ کرے گا۔ مگر اس کی چوری کا سلسلہ بند نہ ہوا یہ کبھی نہ کبھی "باورچی ازم" کا ثبوت دے ہی دیتا۔

کھیڑو کو کام کرتے ہوئے چار پانچ ماہ ہوئے تھے کہ یہ ایک روز میرے پاس آیا اور کہا کہ ملازمت چھوڑنا چاہتا ہے کیونکہ اس کا الیکٹرک سپلائی کمپنی والا صاحب ولایت سے واپس آگیا ہے اور یہ اپنے صاحب کے پاس واپس چلا جانا چاہتا ہے۔ میں نے کھیڑو سے پوچھا کہ وہ وہاں اب کیا تنخواہ لے گا۔ اس نے بتایا کہ وہی پہلی تنخواہ پندرہ روپے بغیر کھانا۔ میں نے کہا کہ یہاں پچیس روپے اور کھانا لیتا ہے پھر کیوں چھوڑتا ہے۔ اُس نے انکساری سے جواب دیا کہ یہ اپنے صاحب کے پاس کئی برس سے ملازم ہے۔ اپنے صاحب کا بہت وفا شعار ہے صاحب چھ ماہ کی رخصت پر ولایت گیا تھا اس لئے دوسری جگہ ملازمت کی اور وہ اپنے صاحب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا یہ جواب سن کر میں حیران رہ گیا کہ چوری کرنے والوں میں بھی کس قدر وفا شعاری ہے۔ میں نے راما سے کہا کہ وہ اپنی طرف سے کھیڑو سے بات کرے اور پوچھے کہ اُسے کیا تکلیف ہے جو پچیس روپے ماہوار اور کھانا چھوڑ کر بغیر کھانے کے پندرہ روپے پر پھر جا رہا ہے۔ راما نے پوچھا تو اُس نے کہا "میں پچیس روپے ماہوار اور کھانے کو کیا کروں۔ بجلی کمپنی کے صاحب کے ہاں میں صرف لکڑی اور کوئلہ میں سے ہی بارہ چودہ آنے روزانہ پیدا کر لیتا تھا۔ دوسرے سامان کی خرید سے الگ وصول کرتا تھا۔ یہاں سامان خریدنے والا دوسرا آدمی ہے اور ایک پیسے کی بالائی آمدنی نہیں۔ اس لئے میں تو اپنے صاحب کے پاس ہی جاؤں گا۔ جہاں کہ میں ڈیڑھ دو روپیہ اوپر سے بنا لیتا تھا"

میرے پاس ایک موٹر ڈرائیور تھا۔ چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ لیتا تھا۔ میں موٹر ہمیشہ خود چلایا کرتا اور ڈرائیور کو کبھی ساتھ نہ لے جایا کرتا۔ ڈرائیور کا کام گاڑی کو اچھی حالت میں رکھنا اور مہمانوں کو لے جانا ہوتا تھا۔ اس ڈرائیور کو جب ملازم رکھا تو چند روز کے بعد اس نے گاڑی کا پچھلا دھرا (جو دونوں پہیوں کے درمیان ہوتا ہے) نکال کر دکھایا اور کہا کہ یہ ٹوٹ گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے (یعنی دیوان سنگھ نے) گاڑی احتیاط سے نہیں چلائی۔ اس زمانہ

Marfat.com

میں مارس گاڑی کا دُھرا بیس پینتیس روپے میں آتا تھا۔ میں نے دُھرے کی قیمت اس کو دی اور اُس نے ایک دُھرا لاکر دکھایا۔ اور اگلے روز کہا کہ اُس نے ٹوٹے ہوئے کی جگہ نیا بدل دیا ہے۔ اس واقعہ کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد پھر اُس نے کہا کہ دُھرا ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ پھر اُس نے نیا دُھرا لا کر دکھا دیا۔ اور کہا کہ بدل دیا۔ جب آٹھ نو ماہ کے عرصہ میں تین چار دُھرے ٹوٹ گئے۔ اور میں نے تحقیقات کی تو پتہ چلا۔ کہ یہ کمبخت ایک پرانا ٹوٹا ہُوا دُھرا مجھے دکھا دیا کرتا۔ نیا دھرا دکھانے کے بہانے ایک دکان سے لے آتا اور پھر واپس کر دیتا۔ چنانچہ اس طرح دوسرے تیسرے ماہ بیس پینتیس روپے اُڑا لیتا۔ جب مجھے اس کی اس حرکت کا علم ہُوا تو میں نے اس کو نکال دیا اس کے بعد یہ نئی دہلی کے ٹھیکیدار خان بہادر راجہ اکبر علی کے پاس ملازمت کے لئے گیا۔ راجہ صاحب نے پوچھا کہ ملازمت کہاں کہاں کی۔ تو دوسرے لوگوں کے علاوہ اس نے میرا نام بھی بتایا۔ راجہ صاحب میرے دوست تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون پر مجھ سے اس ڈرائیور کے چال چلن کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ چال چلن سب ٹھیک ہے۔ صرف گاڑی میں دوسرے تیسرے ماہ دُھرا بدلنا پڑے گا۔ چنانچہ راجہ صاحب نے بھی میری اس "سفارش" پر اسے ملازم نہ رکھا، اور انکار کر دیا۔

میں جیل سے واپس آیا تو اپنے کپڑے خود دھویا کرتا۔ دھوبی سے کپڑے دھلوانے سے نفرت سی ہو گئی۔ کیونکہ دھوبی ہر قسم کے گندے کپڑے ملا کر دھوتے ہیں۔ کپڑے دھونے کے لئے میں کپڑے دھونے کا ٹاٹا کمپنی کا صابن ایک درجن ڈنڈے منگایا کرتا۔ اور جب یہ ڈنڈے ختم ہو جاتے تو نئے ڈنڈے منگا لیا کرتا۔ ایک روز میں نے ایک درجن ڈنڈے منگائے تو اگلے روز ان میں سے ایک ڈنڈا غائب ہو گیا اور اس کے بعد اگلے روز ایک اور غائب۔ مجھے کسی شے کے چوری ہونے کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا چوری کی واردات کا، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ چوری کرنے والا مجھے بے وقوف اور اپنے آپ کو چالاک سمجھ کر چوری کرتا ہے اور نقصان کے مقابلہ پر بے وقوف بننا زیادہ تکلیف کا باعث ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چور کو پکڑنا چاہیئے۔ یہ صابن دوسرے کمرے میں رکھا تھا۔ میں نے اس صابن کو دو دو گھنٹے کے بعد جا کر دیکھنا شروع کیا۔ دن بھر دیکھتا رہا مگر کوئی ڈنڈا غائب نہ ہُوا۔ دفتر میں پارٹ ٹائم پر کام کرنے والے دوسرے کلرکوں اور ٹائپسٹوں کے علاوہ ایک ٹائپسٹ سات بجے شام سے دس بجے تک آیا کرتا تھا اور یہ سب سے آخر میں جایا کرتا۔ جب دوسرے ٹائپسٹ ۹ بجے کے قریب چلے گئے تو میں نے صابن کے ڈنڈے گن لئے وہ پورے تھے۔ یہ ٹائپسٹ دس بجے فارغ ہو کر جانے والا تھا تو مجھے گڈ بائی کہنے کے لئے آیا۔ میں نے کہا ایک منٹ تشریف رکھئے میں ابھی آتا ہوں۔

یہ میرے کمرہ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور میں صابن والے کمرے میں ڈنڈے گننے کے لئے گیا تو دیکھا کہ ایک ڈنڈا اور کم ہے اور ابھی غائب ہُوا ہے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور اس

Marfat.com

ٹائپسٹ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے گرم کوٹ کے بائیں طرف کا حصہ کچھ ابھرا ہوا ہے۔ میں نے فوراً اس سے سوال کیا "کیا صابن تو نے چوری کیا؟" میرا یہ سوال سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ مگر اس نے جواب دیا "آپ ایک شخص پر غلط اور بے بنیاد الزام لگاتے ہیں۔" اس کے جواب پر میں نے اس کے کوٹ کے بٹن کھولے تو اندر صابن کا لمبا ڈنڈا موجود تھا۔ میں نے پوچھا "یہ ڈنڈا کہاں سے لیا؟" اس نے فوراً جواب دیا بازار سے خریدا تھا۔ میں صبر نہ کر سکا میں نے وہی ڈنڈا اس کے منہ پر مارا۔ صابن نرم ہوتا ہے صابن کے منہ پر پڑتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے اسے تھپڑوں سے پیٹنا شروع کیا اور کہا تب چھوڑوں گا اگر سچ سچ بتاؤ گے کہ اب تک کیا کچھ چوری کیا۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ یہ صابن کے کئی ڈنڈے، پنسلیں، قلم، نبیں وغیرہ چوری کر چکا ہے۔ اس کے جرم کا اقرار کرنے پر میں نے اس کا حساب صاف کیا۔ جو کچھ اس کی تنخواہ کا نکلتا تھا دیا، اور اُسے نکال دیا۔ یہ بابو چوری یا تغلب کے مقدمہ میں ہی تین سال قید کاٹ چکا تھا۔ جیل میں ہی اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی اور اس واقفیت کے باعث ہی اسے دفتر میں جگہ دی تھی۔

میں نے یہ چند واقعات بتائے ہیں اور میرا پچھلا تجربہ ہے کہ گھریلو ملازموں میں سے انگریزی کھانا پکانے والے باورچیوں میں ایک بھی میں نے آج تک ایسا نہیں دیکھا جو دیانتدار ہو کیونکہ یہ انگریزوں کی ملازمت کرتے ہوئے ناواقف مالکان کو بہت بے وقوف بناتے ہیں اور لوٹتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کسی ہندوستانی کے ہاں ملازمت کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ہندوستانی آقاؤں کی بیویاں ان ملازموں کی نگرانی کرتی ہیں اور اس نگرانی کے باعث ملازموں کو بددیانتی کا بہت کم موقع ملتا ہے اور یہ لوگ انگریزوں کے ہاں ملازمت کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ وہاں ان کی نگرانی نہیں ہو سکتی اور یہ دل کھول کر بددیانتی کرتے ہیں۔ ہندوستانی کھانا پکانے والے ملازموں یا چپڑاسیوں میں سے کچھ لوگ دیانتدار ملتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہندوستانی آقا ان کی شروع ہی سے نگرانی کرتے ہیں اور ان کو موقع کم ملنے کے باعث ان میں بددیانتی کا چسکا کم ہوتا ہے۔

گھریلو ملازموں کی بددیانتی کے متعلق دو رائیں ہیں: ایک حلقہ تو وہ ہے (جن میں سے میں بھی ایک ہوں) جو بددیانتی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اور جو چوری کو دفتر یا گھر میں برکت نہ ہونے کا باعث سمجھتا ہے۔ یعنی جہاں چوری ہو گی وہاں برکت نہ ہو گی۔ دوسرے حلقہ کا خیال ہے کہ جس صورت میں کہ مالکان بڑی بڑی چوریاں اور بددیانتیاں کرتے ہیں یعنی غلط اور قابلِ اعتراض طریقوں سے لاکھوں روپیہ پیدا کرتے ہیں چھوٹے ملازموں کی چھوٹی چوریوں اور بددیانتیوں کو نظر انداز کر دیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ ایڈیٹر "ریاست" کے دوست بھیا شیخ احسان الحق تو اپنے گھر کے بجٹ میں گھریلو ملازموں کی تنخواہ کے علاوہ ان کی چوریوں اور بددیانتیوں کے لئے بھی دس فیصدی ریزرو

Marfat.com

رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا یقین ہے کہ ہندوستان میں ادنیٰ ملازم چوری اور بددیانتی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور ان کو اس "حق" سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال گھریلو ملازم چوری کو چوری نہ سمجھتے ہوئے چوری کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کی اُس وقت تک توقع نہیں کی جا سکتی جب تک کہ ان کا معیار یورپ اور امریکہ کے ملازموں کی طرح بہت کافی بلند نہ ہو۔

سی۔آئی۔ڈی کی "کارگزاری"

میں اب نیشنل گورنمنٹ کے زمانہ کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا کہ سی آئی ڈی میری نگرانی کرتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ میں اب کئی کئی ہفتے تک گھر سے باہر نہیں جاتا۔ کام میں مصروف رہتا ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ میرا پیچھا کیا جاتا ہے یا نہیں۔ مگر چند سال پہلے تک تو سی۔آئی۔ڈی کے ایک یا دو نمائندے دفتر "ریاست" والی گلی کے باہر بیٹھے رہتے اور اڈیٹر "ریاست" کہیں جاتا تو یہ ساتھ ہو لیتے۔ سی۔آئی۔ڈی کے ان کارندوں یا نمائندوں کی کارگزاری اور ان کی رپورٹیں بہت دل چسپ ہیں۔ اڈیٹر "ریاست" نے ان کو درجنوں بار بے وقوف بنایا۔ ان واقعات میں سے چند عرض کرتا ہوں:۔

چند برس ہوئے اڈیٹر "ریاست" لاہور گیا۔ وہاں گوجرانوالہ سے لالہ بشن داس چوپڑہ وکیل (جو رائے صاحب اور ریاست بیکانیر میں ریلوے کمشنر تھے) ملنے کے لئے آئے۔ چوپڑہ صاحب نے کہا کہ ان کی بھانجی کے لئے رشتہ کی ضرورت ہے۔ "ٹریبیون" میں ایک اشتہار شادی کے متعلق چھپا ہے جس میں مشتہر کے نام و پتہ کی جگہ صرف نمبر معرفت "ٹریبیون" درج ہے۔ یہ پتہ لے دیا جائے کہ مشتہر کا نام و پتہ کیا ہے تاکہ اس رشتے کے متعلق خط و کتابت کی جائے۔ میں لالہ بشن داس کو لے کر دفتر "ٹریبیون" میں گیا۔ وہاں مینجر سے ملا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں اور واپس آیا۔ واقعہ تو صرف اتنا تھا۔ سی۔آئی۔ڈی کے لاہور کے کارندے نے جو رپورٹ اپنے مقامی افسروں کو کی، اور یہ رپورٹ دہلی کے بڑے دفتر میں آئی وہ یہ تھی: "دیوان سنگھ اڈیٹر "ریاست" لاہور آیا، یہ امپیریل ہوٹل میں مقیم ہوا۔ یہاں اس کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ اڈیٹر "ٹریبیون" کو رشوت دے کر اسے مہاراجہ نابھہ کے حق میں مضامین لکھنے پر آمادہ کرے۔ یہ دفتر "ٹریبیون" میں گیا۔ وہاں نصف گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک ٹھہرا اور اس نے اڈیٹر "ٹریبیون" کو کافی روپیہ بطور رشوت دیا روپے کی اصل رقم معلوم نہیں ہو سکی۔"

سی۔آئی۔ڈی کے اس کارندے کو ایسی رپورٹ مرتب کرنے کا خیال اس لئے ہوا کہ اس کو میرا پیچھا کرنے کے لئے جب ایک افسر نے ہدایت کی تو کہا کہ دیوان سنگھ مہاراجہ نابھہ کا دوست ہے اور ایجی ٹیٹر ہے۔ اس کے متعلق پتہ لو یہ کہاں کہاں جاتا ہے اور کس کس سے ملتا ہے۔ اس

Marfat.com

ہدایت کے مطابق ہی اس کارندے نے اپنے ذہن سے یہ رپورٹ تیار کر لی۔

اس قسم کی جھوٹی رپورٹوں کا مجھ پر تو کوئی اثر نہ تھا۔ مگر بعض اوقات میرے دوستوں کو پریشانی ہوتی تھی۔ جن سے میرے جانے کے بعد میرے متعلق مختلف سوالات کر کے پوچھا جاتا۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندوں (جن کی تنخواہ بیس پچیس روپے ماہوار، جن کی قابلیت چپڑاسیوں کی سی اور جن کا عہدہ کنسٹیبل یا ہیڈ کنسٹیبل ہوتا ہے) کو بے وقوف بنایا جائے اور ان کو پتہ نہ چلے کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کس سے ملتا ہوں۔

میں لاہور گیا، میرا معمول تھا کہ سٹیشن سے ٹیکسی لیتا اور جتنے دن رہنا ہوتا ٹیکسی والے سے پٹرول کا اصل خرچ اور گاڑی کا روزانہ کرایہ مقرر کر لیتا۔ ان ٹیکسی والوں میں سے ایک دو کے ساتھ بار باران کی گاڑی لینے کے باعث تعلقات بھی ہو چکے تھے۔ اور یہ بے چارے میرا راز کسی کو بتاتے نہ تھے۔ میں نے ریلوے سٹیشن پر پہنچتے ہی ٹیکسی لی اور انار کلی کے امپیریل ہوٹل میں پہنچا۔ میں اس زمانہ میں اسی ہوٹل میں ٹھہرتا تھا۔ اس ہوٹل کے مالک لالہ درگا داس نہ کھانے کی قیمت لیتے نہ ہوٹل کا کرایہ۔ اور بعض اوقات تو وہاں کھانے پر میرے آٹھ آٹھ دس دس دوست بھی جمع ہو جاتے۔ چنانچہ اس ہوٹل میں بعد میں نہ ٹھہرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لالہ درگا داس کا کرایہ وغیرہ نہ لینا مجھ پر بار سا گزرتا تھا۔ ہوٹل میں پہنچنے پر میں نے غسل کیا، کپڑے بدلے اور باہر جانے کے لئے نیچے اترا تو سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے صاحب مع اپنی سائیکل کے موجود تھے۔ اگر تانگہ ہو تو یہ فرزندانِ برطانیہ اپنی سائیکل پر تانگے کے ساتھ ساتھ نگرانی کر سکتے تھے اور اگر موٹر ہو تو پھر سائیکل پر نگرانی کیونکر کی جا سکتی تھی۔ موٹر کی صورت میں ان کی معلومات دوسروں سے دریافت کرنے تک ہی محدود رہتی تھیں۔ میں نے جب اس شخص کو ہوٹل سے باہر سامنے کی دکان پر بیٹھے دیکھا تو میں نے لالہ درگا داس سے کہا کہ اگر یہ کمبخت میرے متعلق پوچھے کہ میں کہاں گیا ہوں تو کہہ دینا کہ رائے بہادر لالہ گنج بہاری تھاپر کے ہاں گیا ہوں۔ (رائے بہادر گنج بہاری تھاپر اس زمانہ میں پنجاب گورنمنٹ کے سب سے بڑے گرگے تھے اور پبلک آواز اور پبلک تحریکوں کو کچلنے کے اعتبار سے ان کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا) میں لالہ درگا داس سے کہہ کر موٹر میں جہاں جانا تھا چلا گیا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے صاحب سائیکل پر رائے بہادر گنج بہاری تھاپر کی کوٹھی پہنچے۔ اس شخص میں کوٹھی کے اندر جانے یا دریافت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس نے سائیکل کو کوٹھی کی چھوٹی دیوار کے سہارے کھڑا کیا اور سڑک پر کوٹھی کے دروازے کے پاس اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ دیوان سنگھ باہر نکلے تو یہ پھر اس کا پیچھا کرے۔ اس کو وہاں بیٹھے بیٹھے چار پانچ گھنٹے ہو گئے۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ ملنے کے لئے گیا ہوگا ابھی واپس آجانے گا۔ زیادہ دیر ہوئی تو اس نے سمجھا کہ شائد دوپہر کا کھانا یعنی لنچ کھا کر آئے گا۔ جب لنچ کا وقت گذرے بھی کافی عرصہ ہو گیا تو اس نے کوٹھی سے باہر نکلنے والے ایک ملازم سے پوچھا کہ دہلی کا سکھ دیوان سنگھ جو رائے بہادر سے

Marfat.com

ملنے گیا ہے کب واپس آئے گا! ملازم نے بتایا کہ رائے بہادر تو اکیلے بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ملنے والا نہیں آیا۔ یہ جواب سن کر یہ حضرت واپس ہوٹل میں پہنچے اور لالہ درگا داس پر برس پڑے۔ کہ اُسے غلط پتہ بتایا گیا۔ لالہ درگا داس نے کہہ دیا کہ جو کچھ اسے پتہ تھا اس نے کہہ دیا۔ وہ مسافروں کی حرکات و سکنات کا ذمہ دار نہیں۔ چنانچہ اس بے چارے کا یہ تمام دن ضائع گیا نہ معلوم اس نے اپنی کارگذاری کی کیا رپورٹ کی۔ اُس نے ٹیکسی والے سے بھی پوچھا تو ٹیکسی والے نے میری ہدایت کے مطابق رائے بہادر گنج بہاری تھاپر کے علاوہ اور دو چار خان بہادروں اور رائے بہادروں کے نام لے دیئے کہ وہاں بھی گئے تھے۔

مَیں اور لالہ امیر چند کھنہ دہلی سے حافظ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں کے پاس سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ دہلی سٹیشن سے روانہ ہوئے تو سی۔ آئی۔ ڈی کے دہلی سٹیشن کے کارندے نے میرے ٹکٹ کا نمبر لیا اور نمبر لے کر اس نے لاہور ریلوے سٹیشن کی سی۔ آئی۔ ڈی کو تار دیا کہ نمبرا ا (سی۔ آئی۔ ڈی کی فہرست میں ان تمام لوگوں کے نمبر ہوتے جن کی نگرانی کی جاتی یہ فہرست سی۔ آئی۔ ڈی کے تمام دفتروں میں موجود ہوتی۔ اور جب یہ لوگ تار کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ اطلاع دیتے تو نام نہ لکھتے صرف نمبر لکھتے۔ میرا اس زمانہ کی فہرست میں نمبر ۱۱ تھا) فرنٹیئر میل میں آ رہا ہے اور اس کے ٹکٹ کا فلاں نمبر ہے اس کی نگرانی کرو۔ ہم جب لاہور پہنچے تو وہاں میرے خیر مقدم کے لئے دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے موجود تھے۔ جنہوں نے ٹکٹ کلکٹر کی معرفت میرا ٹکٹ دیکھا اور وزیر آباد تار دیا کہ نمبر ۱۱ آ رہا ہے، اس کی نگرانی کرو۔ گاڑی کے لاہور سے روانہ ہونے کے بعد مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے لالہ امیر چند سے کہا کہ اپنا ٹکٹ مجھے دیجئے اور میرا آپ لے لیجئے۔ اور وزیر آباد جہاں ہم نے گاڑی بدلنی تھی پہنچ کر آپ فوراً ہی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں چلے جایئے اور وزیر آباد سے اگلے سٹیشن پر پھر سیکنڈ کلاس میں آ جایئے۔ لالہ امیر چند نے ایسا ہی کیا۔ وہ گاڑی کے وزیر آباد پہنچتے ہی حافظ آباد جانے والی گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جا بیٹھا اور میں اس گاڑی کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جا بیٹھا۔ میرے وہاں سامان رکھنے اور بیٹھنے کے بعد سی آئی ڈی کا کارندہ ٹکٹ کلکٹر کو لے آیا۔ اس نے نمبر دیکھا یہ نمبر کارندہ کو دیا تو ٹکٹ کا یہ نمبر وہ نہ تھا جو اس کی برادری نے دہلی اور لاہور میں دیکھا تھا۔ چنانچہ یہ بھاگا بھاگا ہوا اپنے ریلوے کے تھانہ میں گیا وہاں اس نے یورپین سارجنٹ کو رپورٹ کی۔ یورپین سارجنٹ آیا۔ ٹکٹ کلکٹر کی معرفت میرے ٹکٹ کا نمبر پھر دیکھا۔ اس نمبر کو تار کے ساتھ ملایا یہ بہت پریشان کہ نمبر ۱۱ کہاں چلا گیا۔ لاہور تک صحیح و سلامت آیا تھا۔ راستہ میں اتر گیا یا کیا ہوا۔ یہ لوگ بھاگے ہوئے سیالکوٹ کی گاڑی کی طرف گئے کہ شائد اس گاڑی میں سوار نہ ہو گیا ہو۔ وہاں کے سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے ٹکٹ چیک کئے گئے۔ میرے لاہور والے ٹکٹ کا نمبر وہاں بھی نہ ملا یہ پھر واپس آ گئے۔ ایک نے ٹکٹ کلکٹر کو لا کر پھر نمبر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ نام کیا ہے کیا کام

Marfat.com

کرتے ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میں نے جواب دیا دہلی سے آیا ہوں، نام سندر سنگھ ہے اور وہاں ٹھیکیداری کرتا ہوں۔ میرا یہ جواب سن کر سی۔ آئی۔ ڈی کے یہ کارندے سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ میں کوئی اور آدمی ہوں اور نمبر ۱۱ جس کا نام دیوان سنگھ ہے کہیں راستہ میں ہی اتر گیا ہے۔ میں ان لوگوں کی اس پریشانی کا تماشا دیکھ رہا تھا کیونکہ وزیر آباد جنکشن ہونے کے باعث گاڑی ایک گھنٹہ بعد وہاں سے چلتی تھی۔ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا کہ اتنے میں سامنے کے دوسرے پلیٹ فارم سے مجھے وزیر آباد کے وکیل لالہ چرنجیت لال نے دیکھ لیا۔ جو اپنے کسی دوسرے کام سے سٹیشن پر آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر یہ میرے پاس آئے اور حسبِ عادت مجھ سے لپٹ گئے سی۔ آئی۔ ڈی والے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے لالہ چرنجیت لال سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ لالہ چرنجیت لال نے بتایا کہ یہ دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" ہے۔ یہ سن کر ان کارندوں کی جان میں جان آئی۔ کہ نمبر ۱۱ گم نہیں ہوا، اور وہ صحیح و سلامت وزیر آباد تک پہنچ گیا ہے۔

میں ایک بار اندور گیا، وہاں ایک دوست کے خلاف مقدمہ تھا۔ جب میں وہاں جانے کے لئے تیار ہوا تو خیال آیا کہ جہاں جاتا ہوں، سی آئی ڈی کے لوگ میرے واپس آنے کے بعد ان لوگوں سے میرے آنے اور میری حرکات سکنات کے متعلق تحقیقات کرتے ہیں اور جہاں ٹھہرتا ہوں ان بے چاروں کو پریشان ہونا پڑتا ہے۔ میں یہاں ان لوگوں سے بچ کر جاؤں تاکہ اندور کے میرے میزبان کو پریشان نہ ہونا پڑے۔ اس زمانہ میں میرے پاس اشتہارات لانے کے لئے ایک اینگلو انڈین کنویسر مسٹر مارٹن تھا۔ میں نے مارٹن سے کہا کہ وہ میرا سامان سٹیشن پر لے جائے اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں میرا بستر بچھوا دے۔ میں عین وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ مارٹن کو میں نے ہدایت دے کر بھیج دیا۔ گرمیوں کا موسم تھا میں بغیر کوٹ کے صرف قمیص پہنے سٹیشن پر گیا ریلوے اسٹیشن پر سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس یہ لوگ منڈلاتے رہتے تھے۔ میں سٹیشن کے اندر داخل ہوتے ہی بک سٹال پر گیا اور رسائل دیکھنے شروع کئے تاکہ یہ لوگ محسوس کریں کہ میں دہلی سے باہر کہیں نہیں جا رہا صرف سٹیشن پر تفریحاً رسائل دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے لاپرواہی کے ساتھ رسائل دیکھنے کی صورت میں اور یہ محسوس کر کے کہ نہ تو میرے ساتھ کوئی ملازم ہے نہ سامان اور میں صرف ایک قمیص کے ساتھ ہوں۔ ان کو یقین ہو گیا کہ میں صرف سٹیشن تک آیا ہوں یہ لوگ میرے متعلق بے فکر اور لاپرواہ ہو گئے۔ بک سٹال پر کتابیں دیکھنے کے بعد میں فرنٹیئر میل پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک دو چکر لگائے جیسے نظارہ بازی کر رہا ہوں۔ ان کو میری اس حرکت سے اور یقین ہو گیا کہ میں تفریحاً سٹیشن پر آیا ہوں۔ چنانچہ یہ مجھے چھوڑ کر کسی دوسرے شکار کے لئے چلے گئے۔ اور جب گاڑی نے حرکت کی تو میں فوراً گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی کے جانے کے بعد یہ پریشان کہ میں کہاں گیا۔ اور وہ رپورٹ کیا کریں۔ میں اندور دو روز رہا۔ واپسی کے متعلق بھی میں

Marfat.com

مارٹن کو ہدایت دے گیا تھا کہ وہ پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ جب میں دہلی پہنچا تو مارٹن موجود تھا۔ میں نے اپنا ٹکٹ جو اندور سے دہلی کا تھا اس کو دیا۔ یہ میرا سامان لے کر باہر آگیا اور اس کا پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر میں چند منٹ کے بعد پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ جب میں نے ٹکٹ لینے والے بابو کو پلیٹ فارم ٹکٹ دیا تو سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے پریشان کہ میں گاڑی سے اترا ہوں اور پلیٹ فارم ٹکٹ دے رہا ہوں مگر کیا کر سکتے تھے۔ کار اسٹیشن پر موجود تھی۔ مارٹن میرے پہنچنے سے پہلے سامان اس میں رکھ چکا تھا۔ میں سوار ہو کر اپنے مکان پر پہنچ گیا۔

میرے اس طرح جانے اور واپس آنے کے باعث سی۔ آئی۔ ڈی والے پریشان کہ میں کہاں گیا تھا، کیوں گیا۔ اور کس کس سے ملا۔ ان کو کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر چار روز کے بعد سردار کرتار سنگھ انسپکٹر پولیس تشریف لائے۔ یہ لوگ دوسروں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ مگر اپنی چالاکی کے باعث خود بے وقوف بنتے ہیں۔ انہوں نے تشریف لانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ مگر میں فوراً سمجھ گیا یہ معلوم کرنے کے لئے آئے ہیں کہ میں کہاں گیا تھا کیونکہ ان کی مسل کے پیٹ کا بھرنا ضروری ہے۔ چند منٹ باتیں کرنے کے بعد انہوں نے دوستانہ انداز میں پوچھا کہ "تین چار روز ہوئے کہاں گئے تھے؟" میں نے جواب دیا میں جانتا ہوں آپ یہ دریافت کرنے کے لئے ہی آئے ہیں۔ میں رتلام گیا تھا۔ پوچھا کیوں؟ میں نے کہا وہاں کے متعلق چند لوگوں کو سخت شکایت تھی۔ حالات دیکھنے خود گیا تھا۔ پوچھا کہاں ٹھہرے تھے! میں نے جواب دیا ریلوے اسٹیشن رتلام پر۔ میری اس "معتبر" اطلاع کے بعد سردار صاحب تشریف لے گئے۔ اور آپ نے غالباً یہی کچھ لکھ کر "شامل مسل" کر دیا ہوگا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے کارکن اپنے افسروں کو رپورٹیں کرتے ہوئے کن "کارگذاریوں" کا ثبوت دیتے ہیں۔ کاغذات کیا کچھ لکھ کر "شامل مسل" کئے جاتے ہیں اور یہ محکمہ کیونکر جنت الحمقاء ہے۔

بھوتوں کا وجود

ایک مرتبہ "ریاست" کے "ناقابلِ فراموش" کالم کے زیر عنوان ایک صاحب نے بھوتوں کے متعلق اپنا ایک تجربہ بیان کیا۔ اس واقعہ کے شائع ہونے کے بعد کئی خطوط دفتر "ریاست" میں پہنچے جن میں تعجب کا اظہار کیا گیا کہ ایسا واقعہ "ریاست" میں کیوں شائع کیا گیا جس کو عقل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور بھوتوں کا اقرار ضعیف الاعتقادی ہے وغیرہ۔

بھوتوں یا جنات کا وجود دنیا میں ہے یا نہیں۔ گو ان کا ذکر اکثر مذہبی کتابوں میں ہے میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہر شخص اپنے تجربے کا خود ذمہ دار ہے مگر میں ایک چشم دید واقعہ

Marfat.com

بیان کرتا ہوں۔

میں دہلی جیل میں تھا۔ وہاں گودام کے انچارج سردار جاگیر سنگھ سٹور کیپر تھے۔ میں وقت کاٹنے کے لئے دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے سردار جاگیر سنگھ کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ ایک روز جیل کا ایک ملازم جو ریلوے اسٹیشن پر مال لے جانے اور لانے کا کام کرتا تھا اور بیل گاڑی چلاتا تھا۔ وہاں آیا تو سردار جاگیر سنگھ نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ یہ شخص بھوتوں کے علم سے واقف ہے۔ رات کو دو دو تین تین بجے تک قبرستانوں، مرگھٹوں اور جنگلوں میں پھرتا ہے اور جو شے چاہے بھوتوں کے ذریعے منگا سکتا ہے۔ سردار جاگیر سنگھ کا یہ بیان سن کر میں حیران رہ گیا۔ اور مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں اس معاملہ میں مزید تحقیقات کروں۔ چنانچہ میں اس شخص سے مخاطب ہوا۔ بھوتوں کے متعلق پوچھتا رہا اور میں نے اس سے کہا کہ اگر تم اس کا ثبوت دو تو مشکور رہوں گا۔ مجھے بھوتوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق ہے۔ میری اس درخواست کو انکسارانہ طریقے سے انکار کرتے ہوئے اُس نے ٹال دیا۔ مگر میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا، اور اُسے پھر کہا کہ کچھ دکھاؤ۔ سردار جاگیر سنگھ کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس سے کہیں۔ میرے بار بار زور دینے پر یہ شخص تیار ہو گیا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور دوپہر کا وقت۔ اس کے جسم پر صرف ایک کرتہ اور ایک پاجامہ تھا۔ اُس نے ایک چادر طلب کی جو گودام میں سے ہی اس کو دے دی گئی۔ وہ چادر کو لپیٹ کر بیٹھ گیا اور منہ سے کچھ پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کہا کیا چاہتے ہو۔ میں نے جواب دیا گرم اور تازہ مٹھائی منگا دو۔ جیل کے اندر مٹھائی کا لانا، بنانا یا رکھنا قانوناً ممنوع ہے۔ میں اسی لئے اس سے مٹھائی منگانے کے لئے کہا۔ چنانچہ چند منٹ کے بعد اُس نے چادر کو اٹھایا تو پتوں کے ایک بڑے ڈونے میں مختلف قسم کی تازہ اور گرم مٹھائی موجود تھی۔ میں نے یہ مٹھائی نہیں کھائی کیونکہ اس شخص کے قبرستان اور مرگھٹ میں راتوں کو پھرنے اور بھوتوں کے ذریعے مٹھائی لائے جانے کے باعث میرے دل میں نفرت سی پیدا ہو چکی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے کئی قیدیوں نے یہ مٹھائی لے لی، اور ہمارے سامنے کھائی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے اس شخص سے مختلف سوالات کئے اور پوچھا کہ تم پچیس تیس روپے ماہوار کے ملازم ہو۔ بھوتوں کے ذریعے سرکاری خزانہ یا بنیوں کی تجوریوں سے روپیہ کیوں نہیں منگا لیا کرتے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر وہ چاہے تو روپیہ وغیرہ ہر جگہ سے منگا سکتا ہے۔ مگر یہ روپیہ لازمی طور پر اپنی جگہ واپس رکھنا ہو گا۔ کیونکہ اگر خیانت کی جائے تو پھر بھوت بے قابو ہو جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

میں بھوتوں یا جنات کا نہ پہلے کبھی قائل تھا اور نہ اب ہوں۔ مگر اوپر کا واقعہ میرا چشم دید ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

عورتوں کا نازک احساس

دہلی ریڈیو سٹیشن پر ایک اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر مسٹر روپ لال ملک تھے۔ یہ آجکل لندن میں اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اور پچھلے چند برس میں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ پیدا کرنے کے علاوہ بطور بزنس مین مزے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مسٹر روپ لال جب ریڈیو کے محکمہ میں ملازم تھے تو ان کا ذہن غریبوں کی مصیبت سے فوراً متاثر ہو جاتا تھا۔ کسی شخص کے ساتھ محکمہ میں زیادتی ہوتی تو یہ اپنا فرض سمجھ کر اس کی حمایت میں کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ جہاں اس محکمہ کے ملازم اور سازندے وغیرہ ان کی عزت و احترام کرتے۔ اور ان کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات رکھتے۔ آپ اپنے افسروں کی نظروں میں کھٹکتے اور آپ کو ایک طرح کا لیبر لیڈر سمجھا جاتا۔

انگریزی کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ وہ لوگ ہمدردی کے مستحق ہیں جو بے نقاب ہو گئے۔ اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ہر شخص گنہگار ہے اور گنہگار ہوتے ہوئے ہر شخص بے گناہ ہے کیونکہ وہ بے نقاب نہیں ہوتا اور وہ شخص پبلک کی نگاہوں میں اس وقت گنہگار قرار دیا جاتا ہے جبکہ وہ بے نقاب ہو جائے۔ چنانچہ سرکاری دفتروں میں دن رات رشوت ہے۔ بددیانتی، سفارش بازی ہے اور تلاش کرنے پر شاذ ہی کوئی کلرک، بابو یا افسر دیانتدار مل سکے۔ مگر یہ سب ہی دیانتدار اور شریف ہیں کیونکہ بے نقاب نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی بے نقاب ہو جائے تو وہ بددیانت بھی، ملازم بھی اور قابلِ تعزیر مجرم بھی۔ روپ لال ملک نے غلطی سے یا لحاظ و مروت سے ایک شخص کو تقریروں کے سلسلہ میں پانچ چھ روپے زیادہ دیدیئے یا بغیر تقریر کے دے دیئے۔ روپ لال کا یہ جرم افسروں کی نظروں میں توجہ کا مرکز بن گیا۔ اعلےٰ افسروں کو رپورٹ ہوئی۔ اور روپ لال کو تب ہی علم ہوا جب کہ ان کی موقوفی کا حکم آ پہنچا۔ جب یہ حکم ان کو سنا دیا گیا تو یہ اپنے گھر گئے ان کی نوجوان بیوی کھانا تیار کئے شوہر کے انتظار میں تھیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کو موقوفی کی خبر سنائی تو بیوی پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کچھ بول نہ سکیں۔ عرصہ کی بیکاری کے بعد شوہر کو سرکاری ملازمت ملی تھی۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ میاں بیوی آرام سے گذر کر رہے تھے۔ اس صدمہ سے اس خاتون کو بخار ہو گیا۔ ایک ہفتہ بخار نہیں اترا۔ ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ ایک پھیپھڑے پر تپ دق کا اثر ہو چکا ہے۔ روپ لال جی نے بہت علاج کیا مگر جب بیوی کو بیماری کیساتھ شوہر کے بیکار ہو جانے کا غم ہو تو اس کا تپ دق سے بچنا کیونکر ممکن تھا۔ صرف یہ صدمہ ہی اس خاتون کی زندگی کو ختم کر دینے کا باعث ہوا۔

ریاست کے پرنٹر و پبلشر مسٹر ظفر احمد کی والدہ کی صحت بہت اچھی تھی۔ اس خاتون کو اپنے بھائی کی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنی اس بھتیجی کے متعلق ایک بری خبر سنی تو یہ خاتون اس خبر کو سننے ہی فوراً اپنے دماغی توازن سے محروم ہو گئیں۔ دو تین روز بعد پاگلوں کی سی باتیں شروع کر دیں

Marfat.com

حالت دن بدن بگڑتی گئی اور کئی برس کے علاج کے بعد بھی یہ اچھی نہیں ہو سکیں اور دماغ بالکل جواب دے چکا تھا۔ یعنی صرف ایک ناخوش گوار خبر سنتے ہی اس خاتون کے دماغ پر پاگل پن کا اثر ہوا اور اس بیچاری کے اچھا ہونے کی توقع نہ رہی۔

ایڈیٹر "ریاست" کے ماموں زاد بھائی سردار ہرنام سنگھ کپور لاہور ڈسٹرکٹ کورٹ کے خزانہ کے ہیڈ خزانچی تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی سے ایک روز مذاقاً کہا کہ وہ دوسری شادی کر لیں گے۔ بات بالکل مذاق میں کہی گئی۔ یہ خاتون بہت نیک اور کئی بچوں کی ماں ہیں۔ مگر اس مذاق کا ہی اس بیچاری کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ ان کے محلہ میں کسی کے ہاں شادی ہوتی تو سردار ہرنام سنگھ کے گھر میں غم والم کی گھٹائیں چھا جاتیں۔ یہ خاتون سمجھتی تھیں کہ شاید ان کے شوہر دوسری شادی کرنے والے ہیں۔ ان کے گھر میں کسی عورت یا فلم ایکٹرلیس کی کوئی تصویر نہ جا سکتی تھی۔ اگر جاتی فوراً پھاڑ دی جاتی۔ رشتہ میں سے کوئی عورت آئے تو اسے بھی مشتبہ نظر سے دیکھا جاتا۔ کہ شاید یہ ان کے شوہر کی شادی کے لیے کوئی بات چیت کرنے آئی ہو۔ کوئی شخص کسی کی شادی کے متعلق بات نہیں کر سکتا تھا اور سب سے زیادہ دلچسپ کیفیت یہ کہ جب اخبار "ریاست" ان کے ہاں جاتا اور اس میں کسی خاتون کی تصویر ہوتی تو بیوی شوہر سے کہتی "دیوان سنگھ کہاں کا شریف آدمی ہے جو عورتوں کی تصویریں چھاپ چھاپ کر اپنے بھائی کو بھیجتا ہے۔ اس کو شرم نہیں آتی کہ بھائی کے بچے ہونے ہوئے بھائی کی شادی کی کوشش کرتا ہے۔" پھر غصہ کے ساتھ پوچھتیں: "اس اخبار میں سے کون سی عورت سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ سچ کیوں نہیں بتاتے؟" چنانچہ اگر "ریاست" میں کسی عورت کی تصویر ہوتی تو یہ پرچہ ہی پھاڑ دیا جاتا اور کبھی کبھی دماغی حالت اس قدر خراب اور خطرناک ہو جاتی کہ بیچاری کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس خاتون کی یہ کیفیت صرف ایک واقعہ کے باعث ہوئی جو مذاق تھا اور جس میں سچائی کا ایک شائبہ بھی نہ تھا۔ ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں مرد دن رات مصائب اور مشکلات کے باعث بھی اپنے ہوش و حواس سے محروم نہیں ہوتا اور وہ جدوجہد میں بڑے بڑے صدمے برداشت کرتا ہے عورت کے لیے بعض اوقات صرف ایک چھوٹی سی بات بھی ناقابلِ برداشت اور بعض صورتوں میں ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ہمارا تجارتی چلن

ہندوستان کی حالت جہاں سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے انتہائی قابلِ رحم ہے وہاں تجارتی اعتبار سے بھی ہندوستانی تاجر یورپ یا امریکہ کے تاجروں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل نہیں۔ اور ہماری یہ تجارتی کمزوریاں نہ صرف ہماری رسوائی و ذلت کا باعث ہیں بلکہ ہمارے لیے مالی اعتبار سے بھی نقصان پہنچانے کا باعث ہو رہی ہیں۔ کیونکہ ہمارے اندر تجارتی ساکھ یا بزنس کے متعلق مارکیٹ

Marfat.com

میں کریڈٹ کا نہ ہونا ہمارے لیے بد اعتمادی پیدا کرنے کا باعث ہے۔ حالانکہ ان کمزوریوں کا اظہار بعض اوقات کسی وجہ بد نیت کے باعث نہیں ہوتا۔

بہت برس ہوئے۔ اخبار کی اشاعت کے پراپاگنڈا کے سلسلہ میں دفتر "ریاست" کو تھیکر سپنک کمپنی کی ڈائرکٹری کی ضرورت محسوس ہوئی تو کلکتہ سے تینتیس روپیہ میں تھیکر ڈائرکٹری منگا لی گئی۔ اس ڈائرکٹری کو جب دیکھا گیا تو اس میں ان والیانِ ریاست اور ریاستی افسروں کے نام بھی تھے جو مر چکے تھے۔ چنانچہ جب یہ دیکھا گیا تو اس ڈائرکٹری کو استعمال کرنا لاحاصل سمجھا گیا اور "ریاست" میں اعلان کیا گیا کہ تھیکر ڈائرکٹری جو ابھی دو ہفتے ہوئے تینتیس روپیہ میں خریدی گئی ہے۔ سولہ روپے میں دے دی جائے گی جو صاحب خریدنا چاہیں سولہ روپے بھیج کر منگا سکتے ہیں۔

اس پرچہ کے شائع ہونے کے بعد دوسرے روز صدر بازار دہلی کے ایک سوداگر کا ملازم دفتر "ریاست" میں آیا اور سولہ روپے دے کر یہ ڈائرکٹری لے گیا۔ ڈائرکٹری کے فروخت ہونے کے ایک ہفتہ بعد بنگلور سے دفتر "ریاست" میں سولہ روپے کا ایک منی آرڈر پہنچا جو اس غرض کے لیے تھا کہ ڈائرکٹری ان کو بھیج دی جائے۔ یہ منی آرڈر وصول کر لیا گیا۔ حالانکہ تجارتی اور اخلاقی اعتبار سے ہمارا فرض تھا کہ اس منی آرڈر کو وصول نہ کرتے۔ منی آرڈر کے وصول ہونے اور چٹھی رسان کے چلے جانے کے بعد جب ایڈیٹر "ریاست" کو اس منی آرڈر کے متعلق یہ علم ہوا کہ یہ ڈائرکٹری کے متعلق ہے تو اس نے اُس زمانہ کے مینیجر ماسٹر عبدالکریم سے کہا کہ سولہ روپے بذریعہ منی آرڈر بنگلور واپس بھیج دیے جائیں۔ ماسٹر جی نے کہا کہ "بہت اچھا بھیج دوں گا" دوسرے روپیہ کے ساتھ یہ سولہ روپیہ بھی دفتر میں خرچ ہو گئے۔ اور ماسٹر جی نے روپیہ فوراً واپس بھیجنے کو اہمیت نہ دی اور سوچا کہ ایک دو دن میں بھیج دیں گے اس واقعہ کے آٹھ دس روز بعد بنگلور سے خط آیا کہ ڈائرکٹری ابھی تک نہیں پہنچی۔ حالانکہ منی آرڈر کی رسید پہنچ چکی ہے۔ اس خط کے پہنچنے پر ایڈیٹر "ریاست" نے ماسٹر عبدالکریم کو تاکید کی کہ سولہ روپیہ بنگلور بھیج دیئے جائیں۔ ماسٹر عبدالکریم نے پھر کہا کہ "بہت اچھا" ماسٹر عبدالکریم کے "بہت اچھا" کہنے کے بعد ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ بنگلور سے پھر خط آیا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے ماسٹر عبدالکریم کو پھر تاکید کی اور نتیجہ وہی "بہت اچھا" آخر بنگلور سے رجسٹری خط آیا۔ جس میں خطوط کے جواب نہ دینے اور ڈائرکٹری کے نہ پہنچنے کی شکایت کی گئی تھی۔ اس رجسٹرڈ خط کے آنے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" ماسٹر عبدالکریم پر ناراض ہوا اور منی آرڈر بھیجا گیا اور روپیہ بھیجنے والے کو ندامت اور شرمندگی کے ساتھ لکھا گیا کہ ڈائرکٹری فروخت ہو چکی ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سولہ روپے کو ہضم کرنے کی نیت نہ تھی اور نہ بے ایمانی کرنے کا کوئی سوال تھا۔ اگر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کیا گیا۔ یا بد اعتمادی پیدا ہوئی تو تجارتی چلن کی کمزوری کے باعث۔ کیونکہ ہمیں اول تو چاہیے تھا۔ کہ منی آرڈر وصول ہی نہ کرتے اور اگر غلطی سے کیا گیا تھا تو اسی روز روپیہ بذریعہ منی آرڈر واپس کر دیا جاتا۔ مگر ہم نے بالکل اسی طرح ہی بزنس کے کیریکٹر کی کمزوری کا اظہار کیا جس طرح کسی بنیئے کی تجوری میں

Marfat.com

ہزار دو ہزار روپیہ موجود ہوں مگر پانچ روپیہ لینے والا کوئی شخص آئے تو لالہ جی فوراً کہہ دیتے ہیں "کل آکر لے جانا۔" حالانکہ لالہ جی جانتے ہیں۔ کہ رات بھر پانچ روپیہ رکھ کر وہ اس پانچ روپیہ کے سود سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور اس کے مقابلے پر وہ اپنے اس فعل سے اس شہرت کو زیادہ شہرت دینے کا باعث ہوتے ہیں جو پبلک میں ان کی نادہندگی کے متعلق ہے۔

یورپ اور امریکہ کے تاجروں میں تجارتی کریڈٹ یا اعتماد کو بہت اہمیت دی جاتی ہے مگر اس کے مقابلے میں ہندوستان میں اس کی پروا نہیں کی جاتی۔ چنانچہ ایڈیٹر "ریاست" کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ "ریاست" کی پچھلی عمر میں کسی ایک انگریزی یا امریکن فرم نے بھی اس کا روپیہ نہ مارا۔ بلکہ ہمارے دفتر کی نالائقی کے باعث اگر کسی بل میں رقم کم لکھی گئی تو ان امریکن و یورپین تجارتی فرشتوں نے اس رقم کو پورا لکھ لیا۔ اس کے مقابلے پر تجارتی دنیا میں جو ہماری حالت ہے اسے قابلِ رحم ہی نہیں بلکہ باعثِ شرم بھی قرار دیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری یہ حالت ہمارے لیے نہ صرف باعثِ رسوائی بلکہ باعثِ نقصان بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم اپنے اندر تجارتی کیریکٹر پیدا کریں تو یہ کیریکٹر ہمیں مارکیٹ میں بہت بلند لے جانے کا باعث ہو سکتا ہے۔

بچپن کا زمانہ اور والدین کا فرض

"ریاست" کا دفتر جب اجمیری دروازہ سے باہر تھا تو اس وقت کے سامنے ایک سکھ سردار اوتار سنگھ رہتے تھے جو لکڑی اور لوہے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان سردار اوتار سنگھ کے بہنوئی دہلی میں سردار بہادر مہتاب سنگھ سپرنٹنڈنٹ انڈسٹریز تھے جو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر پر کافی اثر رکھتے تھے۔

سردار اوتار سنگھ کا ایک لڑکا رویل سنگھ (مجھے نام ٹھیک یاد نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہی نام تھا) اس زمانہ میں غالباً سات آٹھ برس کا ہو گا۔ یہ لڑکا ہر روز دفتر "ریاست" والی بلڈنگ کے اس حصے میں آیا کرتا جہاں کہ ایڈیٹر "ریاست" کے رہائشی کمرے تھے۔ پڑوسیوں کے دوسرے بچوں کی طرح اس بچہ کے ساتھ بھی ہمارے گھر میں محبت کا سلوک کیا جاتا۔

بچوں کی فطرت ہے کہ ان کو دنیا میں صرف دو باتیں متاثر کر سکتی ہیں۔ اور یہ صرف ان دو سے ہی خوش ہو سکتے ہیں۔ ایک کھانے کے لیے ان کو کچھ دیا جائے۔ دوسرے ان سے اخلاص و محبت کے ساتھ پیش آیا جائے۔ اگر کسی بچہ کو یہ دونوں اشیا اپنے خاندان کے کسی دشمن سے بھی نصیب ہوں تو یہ بچہ اپنے گھر والوں کو بھول کر دشمن خاندان کے لوگوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کا یہ ایمان ہے کہ مالی، ذہنی اور روحانی خوش حالی کے لیے ضرورت مند غریب لوگوں اور بچوں کی دعائیں بہت ہی پُراثر ہوتی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں

Marfat.com

نے جب تک ضرورت مند دوستوں، غریب لوگوں اور معصوم بچوں کی امداد کی۔ مجھے روپے پیسے کے اعتبار سے کبھی کمی نہ ہوئی اور میں نے جب بھی ان لوگوں کی خدمت گزاری سے ہاتھ کھینچا میری مالی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور سفاقہ کشی شروع ہو گئی۔ چنانچہ مجھے جب کبھی زیادہ ذہنی کوفت ہو تو میں پانچ، سات یا دس روپے کے اچھے اچھے پھل اور مٹھائیاں منگا کر محلہ کے غریب بچوں میں تقسیم کر دیا کرتا ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنی کوفت اور تشویش سے فوراً ہی نجات مل جاتی ہے اور حالات درست ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت تو تشویش یا ذہنی کوفت کو دور کرنے کے متعلق ہے۔ عام طور پر بھی محلہ اور پڑوسیوں کے بچے مجھ سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان بچوں کے والدین سے نہ میں نے کبھی تعلقات پیدا کیے اور نہ میں نے ان لوگوں کے نام اور حالات سے واقف ہونے کی کبھی کوشش کی۔ میری اس فطرت سے متاثر ہو کر یہ لڑکا رویل سنگھ بھی پڑوس کے بچوں کے ساتھ ہمارے گھر میں اکثر آیا کرتا۔

ایک روز نابھہ سے ایک شخص جس کا نام عنایت تھا اور جو وہاں کبھی میرے پڑوس میں رہتا تھا، ملنے کے لیے دہلی آیا اور میرے ہاں مقیم ہوا۔ اس شخص کو آئے ہوئے چار پانچ روز ہوئے تھے کہ ایک روز میرے ذاتی کمرے میں سے فونٹن پین گم ہو گیا۔ اس کمرے میں فرصت کے وقت میں کبھی کبھی عنایت کو بھی باتیں کرنے کے لیے بلا لیا کرتا تھا۔ قلم کے گم ہونے پر مجھے شبہ ہوا کہ یہ قلم چونکہ قیمتی تھا اسے عنایت نے چوری کر لیا ہے۔ شبہ ہونے پر میں نے اس کو بلایا۔ اس سے قلم کے متعلق پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا مجھے اس کے انکار پر یقین نہ آیا۔ میں نے اس کو سخت سست کہا اور نابھہ کے ٹکٹ کے لیے اس کو پانچ روپے دے کر کہا کہ وہ فوراً چلا جائے۔ یہاں نہ رہے۔ عنایت پہلے جب کبھی آتا تو میں اس کے رخصت ہوتے وقت چالیس پچاس روپے دیتا۔ مگر میں غصہ میں تھا۔ اس کو صرف ریلوے کا کرایہ دے کر بھیج دیا۔ عنایت جاتے ہوئے بہت مغموم تھا۔ ایک چوری کا الزام دوسرے وہ توقع پوری نہ ہوئی جس کے لیے آیا تھا۔

عنایت کے جانے کے ایک ہفتہ بعد ایک روز میرے پرائیویٹ کمرے کی میز پر دو روپیہ پڑے تھے۔ میں غسل خانہ میں گیا تو واپس آ کر دیکھا کہ وہ دو روپے وہاں سے غائب ہیں یہ چوری چند منٹ کے اندر ہوئی۔ صبح کا وقت تھا۔ دفتر ابھی کھلا تھا۔ میں نے گھر کے ملازم راما کو آواز دی اور پوچھا کہ ابھی کون شخص یہاں آیا۔ راما نے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ اس نے سامنے والوں کا لڑکا رویل سنگھ زینے سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ رویل سنگھ کو بلا لائے۔ وہ سامنے والے مکان میں گیا اور رویل سنگھ کو بلا لایا۔ میں نے اس بچہ کو دھمکایا اور ہاتھوں میں رول لے کر کہا۔ سچ بتاؤ کیا تم نے یہاں سے دو روپے لیے اور اگر تم نے سچ نہ بتایا تو اس رول سے مار مار کر تمہیں سرخ کر دوں گا اور پھر پولیس والوں کے پاس تھانہ میں بھیج دوں گا۔ لڑکا خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ ہاں اس نے دو

Marfat.com

روپے اٹھائے ہیں۔ اس کے اس اقرار کے بعد میں نے نرمی کا لہجہ اختیار کیا اور اس سے کہا کہ اچھا میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا اور تم نہ پٹو گے۔ یہ بتا دو کہ اس سے پہلے تم نے اور کیا کچھ لیا۔ اور اگر تم نہ بتاؤ گے تو تمہیں ابھی پولیس کے تھانہ میں بھیجتا ہوں۔ میرے اس کہنے پر اس نے بتایا۔ کہ اس نے کئی بار میز پر سے سامان اٹھایا۔ چنانچہ میرے دھمکانے پر اس نے فونٹن پین اور ڈاک کے ٹکٹ وغیرہ کئی اشیا اپنے گھر سے لا دیں۔ جو اس نے وہاں اپنے والدین سے پوشیدہ طور پر چھپا رکھی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد میں نے اس لڑکے کا اپنے ہاں آنا بند کر دیا۔ مگر بعد میں اس کے حالات کا علم ہوتا رہا۔ کہ اس پر اب تک چوری اور مختلف قسم کے دوسرے جرائم کے بیس کے قریب مقدمات چل چکے ہیں جن میں سے بعض میں تو سردار بہادر مہتاب سنگھ کے اثرات کے باعث یہ چھوڑ دیا جاتا رہا اور بعض میں اس کو سزا ہوئی یعنی اس بچہ میں چوری کی جو کمزوری سات آٹھ برس کی عمر میں پیدا ہوئی تھی نگرانی نہ ہونے کے باعث ترقی کرتے کرتے یہ کمزوری اس کی تمام عمر کو تباہ کرنے کا باعث ہوئی اور اس کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب شاید زندگی میں کبھی بھی اس کی اصلاح نہ ہو سکے اور اس کی آئندہ تمام زندگی ہی جرائم کرنے اور ان جرائم کی سزا بھگتنے میں صرف ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس بچہ کے کیریکٹر کا اگر شروع ہی سے خیال رکھا جاتا اور اس کی مجرمانہ ذہنیت کی سختی کے ساتھ نگرانی کی جاتی۔ تو یہ بچہ سوسائٹی کے لیے نقصان کا باعث ہونے کی جگہ اپنی ذات اور سوسائٹی کے لیے مفید ہوتا۔

میرا لڑکا مہندر سنگھ جب چار پانچ برس کا تھا تو ایک روز کھانے کے کمرے میں اکیلا کھیلتے ہوئے شرارتیں کر رہا تھا۔ شرارتیں کرتے ہوئے یہ اس شیلف پر چڑھ گیا۔ جس شیلف میں شیشے اور چینی کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ جب یہ اس شیلف پر چڑھا تو وہ شیلف الٹ کر گر پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے برتن گر کر ٹوٹ گئے اور برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز اوپر کی منزل تک پہنچی۔ جہاں کہ میری والدہ کا کمرہ تھا۔ شیلف کے گرنے پر یہ سہما ہوا اوپر گیا تو میری والدہ نے اس سے پوچھا کہ نیچے سے یہ آواز کیسی آئی۔ والدہ کے اس سوال پر اس نے جواب دیا۔ کہ "برتن سردار جی یعنی دیوان سنگھ نے توڑ دیے ہیں۔" میری والدہ حیران کہ برتن کیوں توڑے۔ انہوں نے پھر پوچھا تو کہا کہ نوکروں کو مار رہے تھے۔ مارتے مارتے غصہ میں برتن توڑ دیے۔ میری والدہ نے اس بیان کا یقین کر لیا اور وہ خاموش ہو گئیں۔ میں اس وقت گھر پر موجود نہ تھا۔ دو گھنٹہ کے بعد باہر سے واپس آیا اور اوپر گیا تو والدہ نے مجھ سے کہا "تم نوکروں کو مارتے ہو اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ تمہیں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ غریب لوگوں کو مارنا اور ان کی بددعائیں لینا اچھا نہیں۔ اب نوکروں کو مارنے کے ساتھ برتن توڑ دیے۔ تم اپنے غصہ کو ضبط کیوں نہیں کرتے۔ میں حیران کہ معاملہ کیا ہے۔ جب پوچھا اور اصل حالات معلوم کیے تو پتہ چلا کہ بچہ نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے جھوٹ بولا ہے۔

میری عمر جب آٹھ دس برس کی تھی تو میری والدہ مجھے بازار سے سودا لانے کے لیے روپیہ دیا کرتیں۔ اس روپے کے پیسے ختم ہو جاتے تو وہ اور روپیہ دے دیتیں۔ چنانچہ ایک روپیہ میں سے

Marfat.com

ایک دو آنے کا سودا آتا اور باقی کی ریزگاری دروازہ کے اوپر طاق میں رکھ دی جاتی۔اس ریزگاری میں سے ایک دونی (اس زمانہ میں دونی چاندی کی چھوٹی سی ہوا کرتی) لے کر اسے میں باقی کی ریزگاری سے ذرا دُور رکھ دیتا۔اس ریزگاری کے ختم ہونے پر اگر والدہ کو حساب یاد رہتا اور وہ پوچھتیں کہ دو آنے کم کیوں ہیں تو میں سٹول پر چڑھ کر فرضی طور سے طاق میں پیسے تلاش کرتا اور پھر اپنی دیانت داری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔کہ دونی یہ پڑی ہے۔اگر غور کیا جائے تو ہر بچہ فطرتاً چوری کرنے، جھوٹ بولنے اور نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔یعنی ایک بچہ بھی ایسا نہ ہوگا جو بچپن میں چوری کرنا چاہتا ہو جھوٹ نہ بولتا ہو۔وہ دوسروں کی نقل نہ کرے یا اپنے گھر والوں یا دوسروں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش نہ کرے۔بچوں کا یہ زمانہ والدین کے لیے بہت ہی احتیاط کرنے کا زمانہ ہے۔ان کے کیریکٹر کی اگر عقل مندی و طریقہ کے ساتھ نگرانی کی جائے تو یہ بچے اپنی آئندہ زندگی میں اپنی ذات اپنے خاندان اور سوسائٹی کے لیے مفید اور بلند ثابت ہوتے ہیں۔اور اگر ان کے بچپن کے اس زمانہ سے لاپرواہی کا سلوک کیا جائے تو یہ بڑے ہو کر بالکل تباہ ہو جاتے ہیں۔

فربہ جسم ایک لعنت ہے

میں اگست ۱۹۴۲ء میں جب کانگریسی حضرات کے ساتھ نظر بند کیا گیا تو میرا جسم تین من دس سیر کا تھا۔میں دیکھنے میں کلو کے علاقے کا ایک ریچھ معلوم ہوتا تھا۔اور دوسروں کو تو کیا اپنے جسم سے مجھے خود بھی نفرت تھی مگر کیا کرتا۔صبح پانچ بجے سے رات کے نو دس بجے تک جو شخص کرسی پر بیٹھا کام کرتا ہے۔اگر گھر یا دفتر سے باہر بھی نکلے تو موٹر میں اور کئی کئی ماہ تک ایک فرلانگ چلنے کا بھی اتفاق نہ ہو اس کے جسم میں تناسب قائم رہنے کا سوال ہی کیا تھا۔جیل خانے میں جانے کے بعد میں نے سوچا کہ نہ معلوم اس نظر بندی سے رہائی کب نصیب ہو۔دن بھر سوائے کتابیں پڑھنے کے دوسرا کام نہیں کیوں نہ ورزش شروع کی جائے۔چنانچہ میں نے جیل میں ورزش شروع کی۔سب سے پہلے صبح جیل کے اندر دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چکر لگاتا اور ایک گھنٹہ کے قریب چلتا۔تاکہ تین میل کی مسافت طے ہو جائے۔اس کے بعد ایک گھنٹہ تک ڈنڈ پیلنا اور پیٹ کو کم کرنے کی ورزش کرتا۔اسی طرح شام کو۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پیرول پر دس دن کے لیے جون ۱۹۴۳ء میں رہا کیا گیا تو میرا وزن دو من دس سیر تھا۔یعنی ایک برس میں میرے وزن میں ایک من یا اسی پونڈ کی کمی ہو گئی۔گویا کہ دوسرے لوگوں نے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں قوم کے لیے روپیہ دیا اور خون بہایا اور میں نے قوم کو ایک من چربی نذر کر دی۔میں گھر میں بھی ہمیشہ قمیص اور پاجامہ کے ساتھ رہتا ہوں۔کوٹ کبھی نہیں پہنتا اور سردیوں میں جسم کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے گرم واسکٹ پہنتا ہوں۔جیل سے روانہ ہوتے وقت جب کوٹ پہنا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھوڑے کے منہ پر ڈھیلا توبرا ہو۔یا کسی سادھو نے ایسا چولا پہن رکھا ہو جو وہ دن کو پہننے اور رات کو سونے کے کام میں بھی لے آتا ہو۔میں کوٹ پہن کر جب

Marfat.com

جیل سے باہر نکلا تو کچھ شرم سی محسوس کرتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دیکھنے والے میرا ہر کوٹ چوری کے ذریعہ اُڑایا ہوا سمجھتے ہیں جو میرے جسم پر فٹ نہیں۔

رہا ہونے کے بعد میں لاہور میں اپنے ماموں زاد بھائی سردار ہرنام سنگھ کے مکان پر پہنچا۔ تو سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا۔ کہ درزی کو بلا کر اپنے تمام گرم و سرد کوٹ فٹ کرائے درزی نے ہر کوٹ میں سے ۵۔ انچ کپڑا داہنی طرف سے اور ۵ انچ کپڑا بائیں طرف سے نکالا۔ یعنی ہر کوٹ کا گھیر دس دس انچ کم کر دیا گیا۔ میں دو دن لاہور رہا۔ جس دوست سے ملتا وہ مجھے کمزور سمجھ کر اظہار ہمدردی کرتا۔ "جیل میں انسان کمزور ہو جاتا ہے"۔ "جیل کی زندگی دوزخ کے برابر ہے"۔ "تم تو پہلے سے آدھے رہ گئے"۔ "جیل میں غم کرتے ہو گے"۔ "گورنمنٹ بڑی ظالم ہے۔ بے گناہ کو پکڑ لیا اور صحت تباہ کر دی وغیرہ"۔ میں ان کم بختوں کو کیا جواب دیتا۔ میں چربی کم ہونے کے باعث پہلے سے زیادہ طاقت محسوس کرتا تھا۔ کام زیادہ کر سکتا تھا۔ طبیعت میں بشاشت زیادہ محسوس ہوتی۔ یا صحیح معانی میں انسان بن گیا تھا۔ مگر یہ اظہار ماتم کرنے والے مجھے کمزور سمجھتے۔ گویا کہ ان کے خیال میں چربی ہی قوت اور طاقت کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ چربی ضرورت سے زیادہ ہو تو جسم کے لیے ایک لعنت ہے۔

ستمبر ۱۹۴۳ء میں جیل سے رہا ہو کر دہلی پہنچا اور دہلی شہر میں نظر بند کر دیا گیا۔ کاروبار غیر حاضری میں ختم ہو چکا تھا۔ اخبار بند تھا اور بعض ملازم "نمک حلالی" کا ثبوت دیتے ہوتے سامان کو بھی فروخت کر کے ہضم کر چکے تھے۔ اگر میں دہلی میں نظر بند نہ ہوتا اور یہاں تھانہ میں ہر روز حاضری کی پابندی نہ ہوتی تو کسی دوسرے شہر میں کسی دوست کے پاس یا اپنے وطن حافظ آباد چلا جاتا۔ مگر یہ بھی ممکن نہ تھا آخر ایک مکان کرایہ پر لیا اور اخبار جاری کرنے کی تیاری شروع ہوئی۔ گورنمنٹ نے پہلے تو اخبار جاری کرنے کی اجازت دے دی مگر اخبار جب پریس میں چھپنے کے لیے گیا تو گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اخبار جاری کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کے بعد اسمبلی میں سوالات ہوئے اور سرو ایس سین آف ایسوسی ایٹڈ پریس، مسٹر پی ڈی شرما آف یونائیٹڈ پریس اور مسٹر پوتھن جوزف ایڈیٹر "ڈان" گورنمنٹ کے سیکرٹریوں اور ممبروں سے ملے تو نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کی اجازت مل گئی۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں اخبار نکل آیا۔ اخبار جاری ہونے کے بعد جو دوست احباب ملنے کے لیے ہر روز یا دوسرے تیسرے روز آتے ان میں کپتان چراغ حسن حسرت بھی تھے جو "فوجی اخبار" کے ایڈیٹر تھے۔ حسرت صاحب نے ایک روز بتایا کہ کرنل مجید ملک (جو پہلے "مسلم آوٹ لک" کے ایڈیٹر تھے) اور ملٹری کے جنرل ہیڈ کوارٹر میں ڈپٹی پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں، ملنا چاہتے ہیں۔ وہ خود آتے مگر چونکہ ملٹری کے ملازموں کے لیے شہر کے اس حصہ میں جہاں کہ دفتر "ریاست" ہے جانے کی ممانعت ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان (یعنی حسرت صاحب کے ہاں کھانے پر میں بھی آؤں اور ملک صاحب بھی آئیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ ملک صاحب سے ملے بہت برس ہو گئے میرا جی خود ملنے کے لیے چاہتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ تیسرے روز میں اور کرنل صاحب

Marfat.com

حسرت صاحب کے ہاں کھانے پر آئیں۔

دہلی میں "ریاست" کو جاری ہوئے اور دن رات محنت کرتے ہوئے اب ایک سال کے قریب عرصہ ہو چکا تھا۔ دفتر کے قریب ہی ایک کمرے میں رہائش تھی۔ کئی کئی ہفتے تک باہر نہ جاتا۔ گرمیوں میں اسی قمیض و پاجامہ کے ساتھ اور سردیوں میں کشمیری گرم کپڑے کی واسکٹ۔ تیسرے روز جب ڈنر کے لیے حسرت صاحب کی کوٹھی پر جانا تھا تو صبح کے وقت حسرت صاحب کا آدمی آیا جس نے کہا کہ بھول نہ جانا۔ آج شام کو کھانے پر کرنل مجید ملک کے علاوہ میجر فیض (جو آجکل "پاکستان ٹائمز" لاہور کے ایڈیٹر ہیں) اور ڈاکٹر تاثیر بھی آئیں گے۔ میں نے کہا۔ بہت اچھا۔

اس روز بارش ہو رہی تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور صبح اولے بھی پڑ چکے تھے۔ شام کو میں ڈنر پر جانے کے لیے کپڑے بدلنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے وزن اور چربی میں دن رات بیٹھنے کے باعث پھر اضافہ ہو گیا ہے۔ میرے کوٹوں میں اگر واسکٹ نہ بھی پہنوں تو کوئی کوٹ فٹ نہیں آتا نہ گرم نہ سرد۔ اگر واسکٹ پہنوں تو سامنے کے بٹنوں اور شگافوں کے درمیان دو انچ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اگر واسکٹ نہ پہنوں تو بٹن پھر بھی بہت مشکل کے ساتھ بند ہوتے ہیں اور اس حالت میں اگر کھڑا رہوں تو بٹن نہ ٹوٹیں گے۔

اور اگر بند بٹنوں کے ساتھ بیٹھ جاؤں تو بٹنوں کے ٹوٹنے اور جسم کے کسے جانے کا سوال ہے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ دسمبر کی سردی، اولے، بارش، دانت سے دانت بج رہے ہیں۔ کوئی کوٹ فٹ نہیں آتا اور ادھر وعدہ کر چکا ہوں کہ ضرور آؤں گا۔ قہر درویش بر جان درویش" بغیر واسکٹ کے گرم کوٹ پہن لیا۔ موٹر تو میں جب جیل میں تھا فروخت ہو چکی تھی۔ تانگہ میں سوار ہوا۔ حسرت صاحب کی کوٹھی نئی دہلی میں دفتر "ریاست" سے تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رات کو آٹھ بجے جب تانگہ میں سامنے سے اولے زدہ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے مجھے لگتے تو میری حالت کیا ہوتی ہو گی۔

حسرت صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو کرنل مجید ملک۔ میجر فیض اور ان کی یورپین بیوی اور ڈاکٹر تاثیر اور ان کی یورپین بیوی ڈنر کے لیے موجود تھے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تو میرے کوٹ کے بٹنوں میں کھچاؤ پیدا ہوا اور نہ صرف بٹنوں کے ٹوٹنے کا خیال بلکہ کوٹ کے سامنے کا حصہ ایسا معلوم ہوتا جیسے بڑے سائز کے تکیئے پر چھوٹے سائز کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ میرے لیے اب سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ بٹنوں کو کھول دیتا۔ چنانچہ میں نے کوٹ کے بٹن کھول دیے۔ ان تینوں اصحاب اور دونوں لیڈیز نے تو کئی کئی گرم کپڑے پہن رکھے تھے یعنی سویٹر گرم قمیض، گرم واسکٹ، گرم کوٹ اور گرم اوور کوٹ مگر یہاں لٹھے کی قمیض اور کھلے بٹنوں کا کوٹ۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان یورپین لیڈیز نے میرے لباس کو دیکھ کر کیا خیال کیا ہو اور شاید ان بیچاریوں نے سمجھا ہو کہ ہندوستان میں سکھوں کے ڈنر کا قومی لباس یہی ہے یا میں کسی ایسی بیماری

Marfat.com

ہیں مبتلا ہوں کہ پچاس ساٹھ درجے کی سردی میں بھی گرمی محسوس کرتا ہوں مجھ سے میری اس "جنٹلمینیت" کے متعلق تو کسی نے سوال کیا نہ کسی جنٹلمین نے۔ بلٹنوں کی کھلی حالت میں ہی ڈنر اور گپ بازی میں شامل رہا اور رات کو بارہ بجے بارش اور اولوں کی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے واپس آیا۔

میں جب واپس آ رہا تھا تو رہ رہ کر دل میں خیال کرتا۔ کہ درویشوں کی کالی کملی اور گاندھی بھگتوں کی کشمیری گرم چادروں میں کتنا آرام ہے کہ جن میں سکڑنے کا سوال ہے نہ پھیلنے کا اور جو سردی سے محفوظ رکھنے کے اعتبار سے ہر حالت میں مفید ہے۔

جو لوگ چربی کی زیادتی یا موٹاپے کو صحت سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ چربی کا جسم کے تناسب اور ضرورت سے زیادہ ہونا نہ صرف جسم میں کاہلی اور سستی پیدا کرنے کا باعث ہے اور اس سے عمر بھی کم ہو جاتی ہے بلکہ موٹاپا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں مذاق وحقارت کا باعث بھی ہے اور موٹاپا کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بالکل ننگا قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے جسم کو دیکھے تاکہ اس کے دل میں اپنے فربہ جسم کے لیے نفرت پیدا ہو اور وہ اپنی قوتِ ارادی کو استعمال کرتے ہوئے ورزش کرے۔ کم کھائے اور ضرورت ہو تو فاقے بھی کرے۔

طوائفوں کی قابلِ رحم زندگی

میں اس سے پہلے ایک مضمون میں اپنے صحیح جذبات کا اظہار کر چکا ہوں کہ مجھے طوائفوں سے بے حد نفرت ہے اور میرے لیے گندگی کے کسی ڈھیر کے قریب سے گزرنا اتنا ناگوار نہیں جتنا طوائفوں کے بازار میں سے اور میرا یقین ہے کہ سوائے بے وقوفوں کے حلقہ کے طوائفوں کے متعلق ہر شخص کی یہی پوزیشن ہے۔ کیونکہ ایک صحیح الدماغ شخص کا ایسی عورت سے محبت کرنا کیونکر ممکن ہے جس کی عصمت درجنوں نہیں سینکڑوں کے لیے وقف ہو اور جو اگر مسکراتی بھی ہو تو صرف روپیہ کے لیے۔ مگر باوجود ان جذبات کے انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے کے لیے میں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں طوائفوں سے باتیں کیں۔ ان کا گانا سنا اور ان کے پرائیویٹ حالات معلوم کیے۔

کئی برس ہوئے میں برسات کے موسم میں بمبئی گیا۔ مرحوم لالہ دینا ناتھ (ایڈیٹر "ہندوستان" و "دیش" لاہور) وہاں بناسپتی گھی کا کاروبار کرتے تھے۔ لالہ صاحب کے دل میں میرے سیلف میڈ ہونے کے باعث بہت عزت تھی اور وہ میرے ہم وطن بھی تھے لہٰذا جتنے روز بمبئی میں رہا لالہ جی ہر روز ملتے رہے اور مختلف موضوع پر باتیں ہوا کرتیں۔

لالہ دینا ناتھ میں تجارتی اعتبار سے چاہے کتنی کمزوریاں تھیں اور کاروبار کے اعتبار سے ان کے دوستوں کو چاہے ہزار شکایتیں ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ مرحوم لالہ دینا ناتھ چال چلن کے اعتبار سے بہت ہی بلند تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی اپنے حلق کے اندر

Marfat.com

نہ جانے دیا اور آپ نے غیر عورت کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ لالہ دینا ناتھ سے بمبئی میں ایک روز باتیں ہو رہی تھیں تو زیر بحث موضوع طوائفوں کی زندگی تھا۔ لالہ دینا ناتھ کا خیال تھا کہ ان کی زندگی بہت آرام و راحت کی ہے۔ میں کہتا تھا کہ نہیں ان کی زندگی جہنم سے کم تکلیف دہ نہیں۔ باتوں باتوں میں فیصلہ ہوا کہ طوائفوں کی حالت اور ان کے جذبات کا مطالعہ کیا جائے! چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد ہم دونوں معہ مرحوم مولانا عرفان سیکرٹری خلافت کمیٹی طوائفوں کے دورہ پر روانہ ہوئے۔

ہم سب سے پہلے ایک ایسی طوائف کے ہاں گئے جس کو سینما کے چار آنہ کلاس کی طرح طوائفوں کی چار آنہ کلاس میں سے کہا جا سکتا ہے۔ اس طوائف کا گھر بارہ مربع فٹ کا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے کے نصف حصے میں ایک پلنگ تھا جس پر میلی سی چادر بچھی تھی اور ایک میلا سا تکیہ رکھا تھا۔ یہ بیچاری شکار کی تلاش میں یا راہ گزرنے والوں کو دعوت حسن و عشق دینے کے لیے خود دروازہ میں بیٹھی تھی اور اس کا لباس سرخ رنگ کی ساڑھی اور سرخ رنگ کی بنڈی تھا۔ جیسا کہ مہاراشٹر کے علاقہ میں غریب عورتیں پہنتی ہیں۔ اس کمرے میں دو تین تصویریں بھی دیواروں پر لٹک رہی تھیں۔ جو دیوی دیوتاؤں کی تھیں۔ ہم لوگ اس طوائف کے دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے تو اس بیچاری نے مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم لوگ اس کمرے کے اندر گئے۔ اس نے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ایک چارپائی کے علاوہ بیٹھنے کے لیے کوئی دوسری جگہ نہ تھی اور اس پلید اور میلے بستر سے کراہت بھی محسوس ہو رہی تھی مگر اور کوئی صورت نہ تھی۔ ہم تینوں اس چارپائی پر بیٹھ گئے۔

یہ بیچاری اس خیال میں تھی کہ ہم تینوں پنجاب کے فوجی تلنگے ہیں اور نفسانی خواہشات سے مجبور ہو کر سویلین لباس میں طوائفوں کے بازار میں دھکے کھا رہے ہیں۔ چنانچہ گفت گو شروع ہونے سے پہلے تک اس بیچاری کے چہرے پر فرضی مسکراہٹ قائم رہی اور یہ خوش تھی کہ کیسا سعید و مبارک دن ہے۔ ایک نہیں تین شکار ہاتھ آئے۔ جو اگر دو دو روپیہ بھی فیس ادا کریں گے تو چھ روپے مل جائیں گے۔ چنانچہ ڈیپوٹیشن کی ترجمانی کا فرض لالہ دینا ناتھ نے ادا کیا اور ذیل کی گفتگو ہوئی۔

لالہ دینا ناتھ: آپ کب سے اس بازار میں ہیں۔

طوائف: مجھے گھر سے آئے ہوئے چار پانچ برس ہو گئے۔

لالہ دینا ناتھ: آپ کمرے کا کیا کرایہ دیتی ہیں۔

طوائف: اس کھولی کا کرایہ ایک روپیہ روز ہے۔

لالہ دینا ناتھ: کتنی ماہوار آمدنی ہو جاتی ہے۔

طوائف: آپ کو آمدنی سے کیا۔ تم کام کی بات کرو جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔

لالہ دینا ناتھ: ہمارا ارادہ شادی کرنے کا ہے۔ اگر تم کو اس مکان سے اچھا مکان۔ اچھا کھانا اچھا کپڑا اور آرام کی زندگی ملے تو کیا تم شادی کر لو

طوائف: آئے شادی کرنے والے۔ تمہارے جیسے سینکڑوں موالی (بدمعاش) پھرتے ہیں۔

Marfat.com

جو بچاری عورتوں کو بھگا لے جاتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی بازار میں درجنوں عورتیں موالیوں کی جان کو رو رہی ہیں۔ ان کے گھر برباد ہو گئے۔

اس طوائف نے یہ کہا اور کہنے کے ساتھ ہی اس نے پڑوس کی ایک بوڑھی عورت کو بلا لیا۔ جو اس کی رشتہ دار یا پڑوسن تھی۔ اس بوڑھی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا: "دیکھو یہ مولوی مجھے شادی کرنے کو کہتا ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ ہی یہ ہے کہ شریف عورتوں کو بھگا لے جائیں اور گھروں کو برباد کریں۔" اس بوڑھی عورت نے بھی ہم لوگوں کو ترچھی اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ لالہ دینا ناتھ نہ صرف خود معقولیت پسند تھے۔ دوسرے شخص کو قائل کرنے کے اعتبار سے بھی آپ بہت قابل تھے۔ آپ نے بوڑھی عورت پر اصل پوزیشن ظاہر کر دی اور کہا۔ کہ ہم لوگ تو طوائفوں کی اصلاح چاہتے ہیں اور اس خیال سے ہی بات چیت کر رہے ہیں۔ چنانچہ اصل واقعہ ظاہر ہونے کے بعد فضا بالکل بدل گئی۔ ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان بچاریوں کی زندگی دوزخ سے کم نہیں۔ جو آمدنی ہو سب کچھ خرچ ہو جاتی ہے۔ ایک پیسہ باقی نہیں بچتا۔ جب تک شباب قائم رہے تب تک تو گزارہ چلتا ہے۔ اس کے بعد ان بچاریوں کو گداگری کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بدچلن بدمعاش اور فرض ناشناس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شادی کرنے کے بعد یا تو ان کو فروخت کر دیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں۔ شرفاء کا طبقہ طوائفوں سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ان حالات میں طوائفوں کو شادی سے بے حد نفرت ہے اور اگر اچھے فرض شناس اور شریف شوہر ملیں تو دنیا میں شاید ایک طوائف بھی اس پیشہ میں نہ رہے۔ سب ہی شادی کر لیں۔ اس طوائف سے انٹرویو کے بعد ہم لوگوں نے رات کو گیارہ بجے تک (کیونکہ طوائفوں کی دکانداری کا وقت مغرب کی نماز کے بعد اور رات کو گیارہ بجے ریڈیو کے آخری آداب عرض تک ہوتا ہے) کئی دوسری طوائفوں کے ہاں جا کر بھی بات چیت کی۔ اور ان تمام طوائفوں کی بات چیت کا نتیجہ وہی ہے جو اوپر بتایا جا چکا ہے۔

دہلی میں پرو (پریم بائی) اور لالی دو مشہور طوائفیں تھیں۔ لالی بہت اچھی گانے والیوں میں سے تھیں۔ اور مرحوم مہاراجہ چرکھاری کے پاس ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم تھیں۔ پرو دہلی کے ایک بہت بڑے رئیس کے ہاں ملازم تھیں اور دہلی کے اس رئیس کے ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ بہت ہی گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان رئیس صاحب کے ہاں جب کبھی پرائیویٹ دعوت ہوتی۔ تو آپ کے دوستوں کے علاوہ پرو لالی اور دوسری متعدد طوائفیں بھی اس دعوت میں شریک ہوا کرتیں۔ ایک روز ایڈیٹر "ریاست" بھی دعوت میں شریک تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے لالی سے کہا کہ جس صورت میں تمہارے پاس کافی روپیہ اور جائیداد موجود ہے۔ تم حرام کی زندگی کو ترک کیوں نہیں کر دیتیں۔ میرے اس سوال پر لالی نے جو جواب دیا میں اسے زندگی میں بھول نہیں سکتا اس نے کہا۔

Marfat.com

"اگر ہم حرام کی زندگی بسر کرتی ہیں تو دنیا میں حلال کی زندگی کون بسر کرتا ہے آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں اگر کوئی میلا کچیلا، گندہ سیاہ۔ بدصورت ، بھدہ ، توند نکلی ہوئی ، منہ سے بدبو اور کمینہ و کنجوس ، خصلت کا سیٹھ آئے ہمارا دل چاہتا ہے کہ اس شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں مگر روپیہ کے لیے ہم اس کو خوش کرنے کے لیے سنگار کر کے اس کے سامنے بیٹھتی ہیں مسکراتی ہیں۔ محبت سے باتیں کرتی ہیں۔ اپنے دل کو مار کر اخلاص کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے منہ کی بدبو کی پرواہ تک نہیں کرتیں اور یہ جو کچھ بھی چاہے ہم کرتی ہیں تو آپ ہی ایمان داری کے ساتھ بتائیے کہ کیا ہماری یہ کمائی حرام کی ہے یا حلال کی۔ لوگ ہمارے روپیہ کو حرام کا روپیہ کیوں کہتے ہیں۔ حالانکہ ہم دنیا کے ہر شخص کے مقابلے پر روپیہ زیادہ محنت سے اپنی جان مار کر پیدا کرتی ہیں۔"

لالی کی اس دلیل کا میرے پاس کیا جواب تھا۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ طوائفوں کے دل کا محبت کے ایک مرکز پر قائم نہ رہنا ہی ان کے لیے ایک ایسی سزا ہے جس کا ہزار دوزخ بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بہت برس ہوئے ملک میں جب کھدر اور چرخہ کا زور تھا اور باوجود چرخہ اور کھدر سے انتہائی نفرت ہونے کے بھی ایڈیٹر "ریاست" نے فضا سے متاثر ہو کر کھدر کے کوٹ سلوا لیے تھے ایک بار ایک طوائف سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس طوائف نے کھدر کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جب کھدر کا لباس دیکھا تو یہ حیران رہ گیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ مہاتما گاندھی کی کھدر پوشی کی سپرٹ ہر اچھے اور برے شخص پر اثر انداز ہے۔ راقم الحروف سے رہا نہ گیا اور اس نے اس طوائف سے سوال کیا کہ آپ نے کھدر کیوں پہنا۔ عورت تو صرف خوب صورتی کے لیے پیدا ہوئی ہے اور کھدر کپڑوں میں سب سے زیادہ بدنما اور بدصورت کپڑا ہے۔ میرے اس سوال کا اس طوائف نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

"ہم طوائفوں کا نہ کوئی ضمیر ہے نہ ایمان۔ ہم دوسروں کی خوشی کے لیے پیدا ہوئیں اور دوسروں کی خوشی پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ کھدر پہنتے ہیں اور کھدر کو پسند کرتے ہیں۔ اس خیال سے میں نے بھی کھدر کا لباس اختیار کیا اور ریشمی کپڑے ترک کر دیے کہ شاید لوگوں کی نگاہوں میں میرا کھدر کا لباس زیادہ کشش کا باعث ہو۔ لوگ مجھے زیادہ پسند کریں اور میری آمدنی میں اضافہ ہو۔ ورنہ جب ہم طوائفوں کا کوئی دھرم ایمان ہی نہیں۔ روپیہ کے لیے ہندو ہوتے ہوئے مسلمانوں سے اور مسلمان ہوتے ہوئے ہندوؤں سے تعلقات پیدا کر لیتی ہیں۔ ہمارے دل میں گاندھی یا کھدر کے لیے کیا محبت ہو سکتی ہے۔"

Marfat.com

دہلی میں ایک طوائف مجیدن بہت اچھی گانے والیوں میں سے شمار ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دہلی کی گزشتہ یا موجودہ تین یا چار بہترین گانے والیوں میں سے وہ ایک ہے۔ چند برس ہوئے دہلی کے زندہ دل مسلمانوں نے مرحوم مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد مولانا کی یادگار قائم کرنی چاہی اور فیصلہ ہوا کہ سینما میں طوائفوں کے رقص اور گانے کی محفل منعقد کی جائے اور اس شو سے جو آمدنی ہو وہ مولانا کے یادگاری فنڈ میں دی جائے۔ مجیدن سے اس شو میں گانے کے لیے درخواست کی گئی تو بیچاری مولانا محمد علی کا نام سن کر بغیر کسی معاوضہ کے گانے کے لیے طیار ہو گئی۔ حالانکہ اس کو گانا چھوڑے عرصہ ہو چکا تھا اور موسیقی کے فن کے شوقین اس کے گانے کو ترستے تھے مجیدن عمر میں کچھ بڑی تھی اور اس شو میں جو دوسری طوائفیں ناچنے اور گانے کے لیے آئیں نوجوان تھیں۔ میں اس شو میں موجود تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجیدن کا گانا سننے کے لیے ہی گیا تھا۔ پہلے تھرکنے اور بھڑکنے والی چھوکریوں کا ناچ ہوا۔ لوگوں نے جی کھول کر تالیاں بجائیں اور داد دی۔ اس کے بعد مجیدن کا تعارف ہوا تو لوگوں نے مجیدن کا نام سن کر تالیاں بجائیں کیونکہ موسیقی کے اعتبار سے دہلی میں اس کی بہت شہرت تھی مگر بیچاری جب گانے لگیں تو لوگوں کا شور ہوا۔ تالیاں بجائی گئیں "بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ فلاں بائی کو بھجوا دو اور فلاں جان کو بھیجو" کے نعرے بلند ہوئے۔ یہ شور سن کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوست (جو موسیقی کے بہت شوقین اور میوزک کانفرنس کو کامیاب بنانے والوں میں سے تھے) شکایت کی تو اس دوست نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا:

"طوائف کی زندگی اس کے شباب کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ مجیدن کے شباب کا زمانہ جا چکا ہے یہ بڑھاپے میں قدم رکھ رہی ہے اور اکثر بیمار رہتی ہے مگر لوگ چاہتے ہیں کہ یہ سولہ سترہ برس کی کم سن لڑکی بن کر گائے اور اس بیچاری سے اب یہ کیوں کر ممکن ہے۔"

اس شور میں مجیدن کی خودداری نے بھی گوارا نہ کیا کہ وہ گاتیں۔ وہ پردہ کے پیچھے چلی گئیں۔ اس کے بعد پندرہ سولہ سولہ برس کی طوائفوں نے رقص کیا اور گایا جن کو نہ موسیقی کا علم تھا نہ سُر تال کا اور جن کے فلمی گیتوں پر لوگوں نے فراخ دلی کے ساتھ داد دی۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے لوگ تو پچاس، ساٹھ، اسی یا سو سال تک زندہ رہتے ہیں اور لوگ ان کو قبول نہیں سکتے مگر کامیاب سے کامیاب طوائف کی زندگی بھی اس وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ اس کے شباب اور بڑھاپے کے اتصال کا زمانہ نہیں آ جاتا۔ اس کے بعد تو وہ اگر چاہے بھی کہ لوگ اس کو دیکھیں اور یاد رکھیں۔ پبلک دیکھنے کے لیے تیار ہے نہ یاد رکھنے کے لیے یعنی شباب کے گزرنے کے بعد اس کی پبلک موت ہو جاتی ہے۔

جو لوگ طوائفوں کی زندگی کو آرام و راحت کی زندگی یا جو عورتیں طوائفوں کے رہنے سہنے کے

Marfat.com

طریقہ اور ان کے حالات کو باعثِ کشش محسوس کرتی ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ طوائفوں کی زندگی انتہائی غلیظ، دوزخ نما، انتہائی تکلیف دہ اور انتہائی قابلِ رحم ہے اور اگر ان کو یہ یقین ہو جائے کہ کوئی شخص شادی کرنے کے بعد ان سے اچھا سلوک کرے گا تو یہ طوائفیں اپنے پیشہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتی ہیں۔

پولیس کے گُرگوں کی کارگزاریاں

چند برس ہوئے دہلی میں ایک شخص عبدالستار تھا جو ظاہراً طور پر موٹروں کی مرمت کا کام کرتا تھا مگر اس کا پیشہ دراصل کوکین فروشی، سیٹھوں، ساہوکاروں اور بنیوں کو دھمکا کر روپیہ وصول کرنا اور کرایہ کے لوگوں سے قتل کرانا یا خود قتل کرنا تھا مگر میری معلومات کے مطابق جہاں تک قتل کے الزام کا سوال ہے یہ قتل کرنے کے بہانہ سے قتل کرانے والوں کو اُتو بنا کر ان سے روپیہ اُڑا لیتا تھا۔ چنانچہ اس عبدالستار کو دہلی گورنمنٹ نے غنڈہ ایکٹ کے ماتحت صوبہ دہلی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا۔

دہلی سے نکلنے کے بعد اس شخص نے پہلے تو راولپنڈی میں قیام کیا اور پھر لاہور میں۔ اور یہ ہمیشہ ہی اس کوشش میں رہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ دہلی واپس چلا جائے تاکہ وہاں اپنے غنڈہ پن کا سکہ پھر رائج کر سکے۔ چنانچہ لاہور میں اس نے وہاں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سعید احمد (مجھے یاد نہیں رہا۔ ان کا نام یا تو سعید احمد تھا یا سید احمد۔ یہ صاحب غالباً اب پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں) کے ہاں آنا جانا شروع کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اس کو خدمات کا موقع دیا جائے۔ یہ پولیس کی خدمات انجام دے اور ان خدمات کے معاوضہ میں دہلی گورنمنٹ سے سفارش کر کے اسے دہلی رہنے کی پھر اجازت دلوائی جائے۔ پولیس افسروں کے دوستوں، خوشامدیوں اور حواریوں کا زیادہ حلقہ بدمعاش اور جرائم پیشہ لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے ان کو مقدمات کی تفتیش میں امداد ملتی ہے۔ عبدالستار بھی ان مسٹر سعید احمد کے رازداروں، حواریوں اور درباریوں میں شامل ہو گئے۔ اور دن رات آنا جانا شروع ہوا۔

لاہور کے جناح مسلم کالج فار وومن (زنانہ اسلامیہ کالج) میں ایک پروفیسر مسٹر عبدالعزیز تھے یہ صاحب عمر کے اعتبار سے نوجوان مگر خیالات کے اعتبار سے بوڑھے تھے۔ یعنی دن رات قرآن نماز، روزہ حدیث اور دوزخ بہشت کا خیال۔ خاکسار جماعت کے ممبر اور علامہ مشرقی کے عزیز مریدوں میں سے۔ عبدالستار کو جب یہ علم ہوا کہ پروفیسر صاحب مذہبی خیال کے خاکسار ہیں۔ تو اس نے آپ کے ہاں بھی آنا جانا شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو خاکسار ظاہر کیا۔ نماز باجماعت شروع ہوئی۔ مذہبی مسائل اور دوزخ وبہشت کے نتائج پر بحث ہوا کرتی۔ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور عبدالستار کا کافی وقت پروفیسر عبدالعزیز کے مکان (جو سعدی پارک مزنگ میں تھا) پر گزرنے لگا

Marfat.com

اور پروفیسر صاحب کو یقین ہو گیا کہ عبدالستار پکا خاکسار اور اسلامی اخوت کے رنگ میں رنگا ہوا جانباز ہے۔

عبدالستار نے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سعید احمد سے ایک روز کہا کہ اسے ایک بہت بڑی سازش کا علم ہوا ہے اور یہ سازش خاکساروں کی طرف سے سر سکندر حیات کو قتل کرنے کی ہے۔ اور یہ اس سازش کو پکڑوا سکتا ہے۔ یہ اطلاع سن کر سعید احمد صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ نے وعدہ کیا کہ اگر عبدالستار اس سازش کو پکڑوا دے تو پنجاب گورنمنٹ دہلی گورنمنٹ سے سفارش کر کے عبدالستار کے دہلی میں داخلہ کی ممانعت کا حکم منسوخ کرا دے گی۔ چنانچہ ادھر تو عبدالستار سعید احمد کو سازش کے متعلق غلط اطلاعات دیتے رہے اور ادھر پروفیسر عبدالعزیز سے تعلقات مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔

عبدالستار نے ایک روز سعید احمد صاحب سے کہا کہ ایک خاکسار پروفیسر عبدالعزیز مسلح ہو کر آج شام کو سات بجے سر سکندر کو ہلاک کرنے کے لیے سر سکندر کی کوٹھی جانے والے ہیں اور ان کو راستہ میں گرفتار کر لیا جائے۔ مسٹر سعید احمد نے تیاری کر لی۔ اور شام کے لیے متعدد انسپکٹر، سب انسپکٹر اور کانسٹیبل ریوالوروں سے لیس جمع کر لیے گئے اور فیصلہ ہوا کہ پروفیسر کو سعدی پارک اور سر سکندر کی کوٹھی کے درمیان سڑک پر گرفتار کر لیا جائے۔

اسی روز عبدالستار نے پروفیسر عبدالعزیز سے کہا کہ شام کو سینما چلیں۔ پروفیسر عبدالعزیز اس پر رضامند ہو گئے اور یہ فیصلہ ہوا۔ کہ شام کو چھ بجے کے قریب عبدالستار، پروفیسر صاحب کے مکان پر آ جائیں گے اور پھر ان کے ساتھ سینما چلیں گے۔ چنانچہ شام کو چھ بجے عبدالستار پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچے اور کچھ پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسے ایک ضروری کام ہے یہ اس ضروری کام سے فارغ ہو کر سیدھا سینما پہنچ جائے گا اور اس ریوالور جو عبدالستار کی جیب میں تھا اور جسے عبدالستار نے رازداری میں اپنے جیب سے نکال کر پروفیسر صاحب کے جیب میں ڈال دیا کو اپنے ساتھ لے جائیے۔ کیونکہ جہاں وہ ضروری کام کے لیے جا رہا ہے ریوالور ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ عبدالستار بطور خاکسار اور جانباز کے پروفیسر عبدالعزیز کے اعتماد میں آ چکا تھا۔ پروفیسر صاحب نے بھروسہ کیا اور آپ ریوالور جیب میں رکھ کر سینما کو روانہ ہو گئے۔ جس سینما میں جانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ یہ سینما پروفیسر صاحب کے سعدی پارک والے مکان اور سر سکندر حیات کی کوٹھی کے درمیان ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے مکان سے نصف فرلانگ گئے ہوں گے کہ مسٹر سعید احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مع مسلح انسپکٹروں، سب انسپکٹروں اور کانسٹیبلوں کے پروفیسر عبدالعزیز کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ تاکہ پروفیسر صاحب حملہ نہ کر سکیں۔ گرفتاری کے بعد تلاشی ہوئی تو پروفیسر صاحب کے جیب سے ریوالور برآمد ہوا۔ گواہوں نے جامہ تلاشی کی فہرست پر دستخط کیے اور اگلے روز صبح کے اخبارات میں چار چار کالم کی جلی سرخیوں اور عنوانات کے ساتھ پہلے صفحے پر خبریں شائع ہوئیں۔ "سر سکندر حیات کو قتل کرنے

Marfat.com

کی سازش، خاکساروں کی گرفتاری، پروفیسر عبدالعزیز کے جیب سے بھرا ہوا چھ گولی کا ریوالور برآمد، پولیس کا کامیاب چھاپہ۔

پروفیسر صاحب کی گرفتاری کے بعد ان پر مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ نے آپ کو سر سکندر حیات کو قتل کرنے کی نیت اور کوشش کے جرم میں کئی برس کی سخت سزا دی اور پروفیسر صاحب سنٹرل جیل لاہور میں تشریف لے آئے۔ آپ کے وہاں آنے سے پہلے ایڈیٹر "ریاست" سنٹرل جیل میں موجود تھا اور آپ بھی اس کمرے میں ہی مقیم ہوئے جہاں کہ ایڈیٹر "ریاست" تھا۔

ایڈیٹر "ریاست" نے دیکھا کہ پروفیسر صاحب پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے۔ قرآن کی تلاوت میں بھی ناغہ نہ ہوتا۔ اور خاموش سی زندگی بسر کرتے۔ جیل میں چاہے سینکڑوں تکلیفیں ہوں مگر جیل کی زندگی کا یہ روشن پہلو ہے کہ وہاں کوئی شخص اپنی فطرت کو چھپا نہیں سکتا اور ایک دوسرے کے اصل حالات اور خصائل سے انسان واقف ہو جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے لیے میرے دل میں نہ صرف عزت بلکہ کچھ محبت کے جذبات بھی پیدا ہو گئے۔ میں جب وہاں سے رہا ہوا تو پروفیسر صاحب کے مقدمہ کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر کی جا چکی تھی۔ اور پروفیسر صاحب جیل میں ہی موجود تھے۔

میں جیل سے رہا ہونے کے بعد جب دہلی پہنچا تو پروفیسر صاحب کی بے گناہی اور سزایابی میرے دل میں ایسے ہی کھٹک رہی تھی جیسے جسم کے کسی حصہ میں پھانس ہو۔ ہر وقت یہی خیال کہ پروفیسر صاحب کے لیے کیوں کر مفید ثابت ہو کر اپنا فرض ادا کروں۔ مقدمہ کی اپیل ہائی کورٹ میں داخل ہو چکی تھی۔ اگر اخبار میں لکھتا ہوں تو توہین عدالت کا نیا مقدمہ۔ اور اگر نہیں لکھتا تو پروفیسر صاحب سالہا سال جیل میں اور میں فرض ناشناسی کا مجرم۔ میں دو تین روز سوچتا رہا۔ آخر فیصلہ کیا۔ کہ توہین عدالت کا مقدمہ چلے اس کی پروا نہیں۔ فرض سے پیچھے قدم ہٹانا بزدلی ہوگی۔ اخبار میں ضرور لکھنا چاہیئے۔ چنانچہ "ریاست" میں ایک نوٹ لکھا گیا جس میں اس تمام سازش اور عبدالستار کی بدتماشیاں اور اس کے دہلی کے پچھلے واقعات کو بے نقاب کر دیا گیا۔ مضمون کے شائع ہونے کے بعد اس کا کٹنگ میں نے سر ڈگلس ینگ چیف جسٹس ہائی کورٹ کو بھیجا اور ساتھ خط لکھا کہ آپ کے عہد میں اس طرح سے بے گناہ اور معصوم لوگ غنڈوں اور پولیس کا شکار ہو رہے ہیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ چونکہ مقدمہ عدالت میں ہے۔ میرا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو لکھنا خلاف قانون اور توہین عدالت ہے مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ مگر اس لکھنے کا اثر یہ ہوا کہ جب پروفیسر صاحب کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو مقدمہ سننے والے جج نے عدالت میں کہا: "میں مانتا ہوں کہ پروفیسر عبدالعزیز سر سکندر کو قتل کرنے کے لیے نہ جا رہے تھے اور ان کے خلاف عبدالستار کی سازش ہے مگر پروفیسر کے جیب سے ریوالور نکلا۔ پروفیسر کو علم تھا۔ کہ یہ ریوالور ہے۔ کسی دوسرے شخص نے ان کے علم کے بغیر ان کی جیب میں نہیں رکھا۔ ایسی صورت میں پروفیسر ایکٹ اسلحہ سے بری کیونکر ہو سکتے ہیں۔" چنانچہ پروفیسر صاحب کی طویل برسوں کی قید میں تخفیف کی گئی۔ اور جو سزا ان کو ملی وہ ریوالور رکھنے کے جرم میں ملی اور آپ سر سکندر کو قتل کرنے کی سازش کے

Marfat.com

الزام سے بری کیے گئے۔
اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے گُرگے بے گناہوں کو پھنسانے کے لیے کیونکہ پولیس کے دستِ راست ثابت ہوتے ہیں۔

اخبار نویسوں کا امتحان طلب صبر

"ریاست" کو جاری ہوئے دو تین برس ہوئے تھے کہ اس کے اشتہارات کے لیے جو کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں میں ایک کوشش یو پی کی عدالتوں کے سرکاری اشتہارات کے لیے بھی تھی۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہاں کی قریب قریب ہر دیوانی عدالت سے اشتہارات آنے شروع ہوئے اور باوجود اس کے کہ اس زمانہ میں عدالتی اشتہارات کی اجرت بہت کم تھی "ریاست" میں صرف یوپی کی عدالتوں کے اشتہارات سے آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہوار تک پہنچ گئی۔ اور یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ کیونکہ یوپی کے اردو اخبارات نہ اچھا مواد دیتے تھے۔ نہ دلچسپ تھے اور "ریاست" میں ان کے مقابلے پر زیادہ کشش تھی۔ عدالتوں کے منصف اپنے اشتہارات شائع کرنے کے لیے "ریاست" میں بھیجتے۔

یوپی کی عدالتوں کے اشتہارات "ریاست" میں کثرت کے ساتھ شائع ہوتے رہے تو ایک روز المورڈہ کے ایک منصف (جو عیسائی تھے) کا خط دفتر "ریاست" میں پہنچا۔ کہ آپ آئندہ "ریاست" ان کے نام نہ بھیجئے۔ کیونکہ ان کو ہائیکورٹ سے حکم ملا ہے کہ آئندہ کوئی اشتہار چھپنے کے لیے "ریاست" میں نہ بھیجا جائے۔ اور وہ آئندہ اشتہارات نہ بھیجنے کے لیے مجبور ہیں۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد اسی ہفتہ سے یوپی کی عدالتوں کے اشتہارات "ریاست" میں آنے قطعی بند ہو گئے یعنی ایک ہزار روپیہ ماہوار ریونیو میں فوراً کمی ہو گئی۔

"ریاست" کے عدالتی اشتہارات بند ہونے کے بعد میں الہ آباد گیا تاکہ معلوم تو کیا جائے کہ اس حکمِ امتناعی کی وجہ کیا ہے۔ میں الہ آباد پہنچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرا وہاں معلوم کیا کہ انفرمیشن بیورو کے کون صاحب انچارج ہیں تو معلوم ہُوا کہ مسٹر جوشی ہیں۔ جو پہلے اخبار "لیڈر" کے سب ایڈیٹر تھے۔ میں جب نابھہ میں تھا تو یوپی کے ایک ریٹائرڈ سیشن جج رائے بہادر تمبر جوشی نابھہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ مجھے رائے بہادر جوشی سے ہی نابھہ میں معلوم ہُوا تھا۔ کہ ان کے صاحب زادے الہ آباد کے اخبار "لیڈر" کے سب ایڈیٹر ہیں۔ مجھے فوراً خیال ہُوا۔ کہ شاید یہ انفرمیشن بیورو کے مسٹر جوشی رائے بہادر تمبر جوشی کے صاحب زادے ہوں۔ چنانچہ میں نے معلوم کیا تو میرا خیال درست نکلا۔ میں مسٹر جوشی کے گھر پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ براہمنوں کی سادہ زندگی۔ سفید دھوتی پہنے سفید چاندنی کے فرش پر بیٹھے تھے۔ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ اندر بلا لیا۔ بہت تپاک اور اخلاص کے ساتھ ملے

Marfat.com

کرایا تو پنڈت موتی لال جی نے کہا:

میں سردار صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ پنڈت موتی لال جی اس وقت خربوزے کھا رہے تھے میں اس سے پہلے خربوزے چاقو سے کئی پھانکیں کر کے کھایا کرتا تھا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ پنڈت جی خربوزے کو تربوز کی طرح درمیان سے دو ٹکڑے کر کے چمچہ کے ساتھ کھا رہے تھے۔ پنڈت جی نے ہمیں بھی خربوزہ کھانے کے لیے کہا۔ ہم زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ بیٹھے اور واپس چلے آئے۔

جرنلسٹوں کو یہ خدا کی مار ہے کہ جس طرح پولیس والے کسی فوٹوگرافر کے ہاں اپنی تصویر اتروانے کے لیے جائیں تو وہاں لٹکے ہوئے فوٹوؤں میں سے بھی اشتہاری ملزموں کے چہروں کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ اخبار نویس چلتے پھرتے، باتیں کرتے ہوئے ہمیشہ ہی نئی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ان کے لیے کسی دلچسپ خبر کو ضبط کرتے ہوئے اخبار میں شائع نہ کرنا بہت ہی امتحان طلب مسئلہ ہوا کرتا ہے۔ میں نے واپسی کے وقت پنڈت شیام لال جی سے بھوپال کے متعلق مزید دریافت کرنا چاہا مگر ان کو زیادہ کچھ معلوم نہ تھا اور نہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ میں اپنے اخبار کے لیے مواد حاصل کر رہا ہوں۔

واپس آنے کے بعد میں تھوڑی دیر پنڈت شیام لال جی کے مکان پر بیٹھا اور پھر پنڈت جی مجھے میرے ہوٹل چھوڑ گئے۔ میں شام کو الہ آباد کی سیر کے لیے گیا تو مرحوم سید اکبر الہ آبادی کی یاد تازہ ہو گئی۔ مرحوم سید اکبر کا انتقال ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ جی چاہا کہ اس مکان کو پھر دیکھوں جس میں مرحوم رہا کرتے تھے اور جہاں میں نے مرحوم کے ساتھ کئی روز تک دن میں کئی کئی گھنٹے باتیں کی تھیں۔ میں سید اکبر کے مکان پر پہنچا۔ مکان بند تھا۔ صحن کی گھاس بھی اچھی حالت میں نہ تھی کیونکہ مرحوم کے صاحبزادے سید عشرت حسین الہ آباد سے باہر ملازم تھے اور اس مکان میں صرف ایک ملازم تھا جس کا کام سوائے کھانے اور سونے کے دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں اس مکان کو حسرت کی نگاہوں کے ساتھ دیکھ کر واپس ہوٹل پہنچا — آہ وہ مکان آج سنسان پڑا ہے جہاں اردو زبان کے اس شاعر اعظم کی زبان سے الہام نازل ہوا کرتا تھا۔

میں رات کو الہ آباد سے سوار ہو کر واپس دہلی آیا اور اسی ہفتہ ایک نوٹ نواب بھوپال کے متعلق لکھا۔ جس میں نواب بھوپال پر الزام لگایا گیا کہ وہ پبلک آواز کو دبانے کے لیے ملک کے لیڈروں کو دعوتیں دیتے ہیں اور قانونی مشورہ کے نام پر بیس بیس ہزار روپیہ نذر کیا جاتا ہے۔ جسے رشوت قرار دیا جا سکتا ہے۔ نواب بھوپال "ریاست" کے مضامین سے بہت تنگ آ چکے تھے اور نواب صاحب کی مطلق العنانی اور بھوپال ایڈمنسٹریشن کو بے نقاب کرنے میں "ریاست" نے اس سے پہلے کافی حصہ لیا تھا۔ اس مضمون کو دیکھ کر نواب صاحب نے اپنے سیکرٹری مسٹر شعیب قریشی (جو آجکل کسی ملک میں پاکستان کے سفیر ہیں) کو پنڈت موتی لال نہرو کے پاس بھیجا اور کہا کہ آپ پر بھی رشوت لینے کا الزام لگایا گیا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو فطرتاً بہت ضدی اور غیر ضروری طور پر خوددار تھے۔ شعیب قریشی کی انگیخت

Marfat.com

سے متاثر ہوئے اور آپ نے ڈاکٹر کاٹجو (جو آجکل مدھیہ پردیش کے صوبے میں وزیر اعلیٰ ہیں) کی معرفت ایڈیٹر "ریاست" کو معافی مانگنے، تردید کرنے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں مقدمہ دائر کرنے کا نوٹس دیا۔ اس نوٹس کے پہنچتے ہی ایڈیٹر "ریاست" نے الزام کے صرف روپیہ اور رشوت کے حصہ کی تردید کر دی یعنی پنڈت موتی لال نہرو پر لگایا گیا الزام تو واپس لے لیا مگر نواب بھوپال پر لیڈروں کے ذریعہ پبلک آواز کو دبانے کا الزام واپس نہ لیا۔

اس تردید کے بعد نواب بھوپال کی طرف سے پنڈت موتی لال نہرو پر زور دیا گیا کہ وہ ایڈیٹر "ریاست" سے نواب بھوپال کے متعلق بھی تردید کرائیں۔ اور ادھر سر دول سنگھ کولیشر (جو اس زمانہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے) اور لالہ گردھاری لال امرتسری (جو پنڈت موتی لال نہرو کے دوستوں میں سے تھے) نے پنڈت جی سے کہا کہ وہ نواب بھوپال کے مسئلہ کو چھوڑ دیں۔ نواب بھوپال سے دیوان سنگھ خود نپٹ لے گا۔ پنڈت جی کی ذات کے متعلق تردید ہو چکی ہے۔ اسے کافی سمجھا جائے۔ چنانچہ کئی ماہ کی اس کش مکش کے بعد پنڈت جی نے نواب بھوپال پر لگائے گئے الزام سے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کر دیا اور اسی مضمون کی بنا پر ہی نواب بھوپال نے ایڈیٹر "ریاست" پر ہوشنگ آباد میں پرنسس پروٹیکشن ایکٹ کے تحت فوجداری مقدمہ چلایا جو چھ سال تک چلتا رہا، کئی بار ہائیکورٹ میں گیا اور طوالت کے اعتبار سے یہ مقدمہ ہندوستان کے تمام گزشتہ فوجداری مقدمات سے زیادہ طویل تھا۔ اس مقدمہ کے واقعات میں آئندہ صفحات میں عرض کروں گا۔

پنڈت موتی لال نہرو نے نوٹس دیا، مقدمہ کی دھمکی دی مگر بطور ایک اخبار نویس کے میری زبان یا میرے قلم سے آج سے پہلے یہ اشارتاً بھی کبھی ظاہر نہ ہوا کہ بیس ہزار روپیہ کی اطلاع دینے والے ان کے حقیقی بھتیجے پنڈت شیام لال نہرو تھے۔ میں مرحوم پنڈت شیام لال پر الزام نہیں لگاتا۔ انہوں نے یہ واقعہ معمولی طور پر باتیں کرتے ہوئے نیک نیتی سے بیان کیا۔ اور ان کو خیال بھی نہ تھا کہ میں ان کی اس اطلاع کو استعمال کروں گا اور آج بھی اس واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں تو صرف اس لئے کہ اس دلچسپ واقعہ کو بیان کرنے سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور آج اس کی حیثیت محض ایک دلچسپ واقعہ سے زیادہ نہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک اخبار نویس کے لئے جہاں کسی اہم اطلاع کو ہضم کر جانا اور اخبار میں شائع نہ کرنا بہت مشکل ہے وہاں اطلاع دینے والوں کے نام کا اظہار کرنا بھی خلافِ اخلاق، خلافِ ایمان اور اعتماد کشی قرار دیا جاتا ہے اس کے لئے چاہے اخبار نویسوں کو مصائب بھی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔

Marfat.com

مقدمہ ہوشنگ آباد

سنہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے مجھے پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند کی ایک ذریعہ سے اطلاع ملی کہ نواب بھوپال مقدمہ نواب بھوپال بنام اخبار "طاقت" دہلی میں ایڈیٹر "طاقت" سے معافی منگوانے اور یہ لکھوانے کے بعد کہ آئندہ وہ اخبار کسی والیٔ ریاست کے خلاف کبھی بھی کچھ نہ لکھے گا۔

بطور فاتح بہت مغرور ہو چکے ہیں۔ اور اسی طرح سے ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف بھی پرنسس پروٹیکشن ایکٹ کے تحت مقدمہ چلانے کی گورنمنٹ ہند سے منظوری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور سکیم یہ ہے کہ پے در پے متعدد اخبارات کے خلاف مقدمات چلا کر اس آواز کو بالکل بند کر دیا جائے جو ریاستوں کے مظالم کے متعلق اخبارات کے ذریعے اٹھائی جا رہی ہے اور اس طرح نواب بھوپال والیان ریاست سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ لے کر اپنے چانسلر ہونے کے لئے میدان تیار کریں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سر چارلس واٹسن پولٹیکل سیکرٹری نے اس وجہ سے کہ نواب بھوپال نے اخبار "طاقت" والا مقدمہ بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے عدالت سے واپس لے لیا۔ حالانکہ گورنمنٹ ہند کی منظوری کے ساتھ چلایا گیا تھا۔ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف مقدمہ چلانے کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر جب نواب بھوپال کی طرف سے پھر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ نواب بھوپال اس مقدمہ میں ہاریں یا جیتیں وہ ذمہ دار ہوں گے اور گورنمنٹ چاہے تو کوئی امداد نہ دے۔ سر چارلس نے غصہ میں آکر اور مجبور ہو کر منظوری دے دی۔ چنانچہ اس اطلاع کے ملنے پر "ریاست" میں ایک نوٹ شائع ہوا۔ جس میں پبلک کو اطلاع دی گئی کہ نواب بھوپال "ریاست" کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والے ہیں۔

نواب بھوپال نے یہ مقدمہ ریاست بھوپال کے قریب ہوشنگ آباد میں دائر کیا۔ جہاں سے کہ ریاست بھوپال کی حد ایک میل پر ملتی ہے۔ (یعنی دونوں علاقوں کے درمیان دریائے نربدا ہے) اس سے پہلے نواب بھوپال نے اخبار "طاقت" کے خلاف مقدمہ دہلی میں دائر کیا تھا مگر ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف دہلی سے چھ سو میل کے فاصلے پر ہوشنگ آباد دائر کیا گیا (اتنی دُور مقدمہ دائر کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایڈیٹر "ریاست" مقدمہ کی پیروی نہ کر سکے گا۔ اس کے راستہ میں قدم قدم پر مشکلات پیدا ہوں گی۔ اور یہ تو یہ کرتے ہوئے آئندہ نہ صرف نواب بھوپال بلکہ کسی والیٔ ریاست کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھے گا۔ معافی مانگ لے گا یا اس کے اخبار کو بند کرنے کے لئے مجبور کر دیا جائے گا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں لاہور کس کام کے لئے گیا ہوا تھا وہاں ایک دو دن رہا۔ جب وہاں

Marfat.com

سے واپس آنے کے لئے سوار ہوا تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنجاب کانگریس کے لیڈر ڈاکٹر سیتہ پال ملے ۔ ڈاکٹر صاحب میرے بہت مخلص دوستوں میں سے تھے ۔ اور "ریاست" کو قدر اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس گاڑی میں ہی دہلی کے لئے سوار ہوئے ۔ ہم لوگ جب دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سٹیشن پر اترتے ہی بھوپال کے انسپکٹر جنرل پولیس خواجہ محمد اکرم ، ریلوے پولیس کے ایک سب انسپکٹر (جن کو خواجہ اکرم اپنے ساتھ بھوپال ریلوے پولیس سے لائے تھے) اور بھوپال پولیس کے متعدد انسپکٹروں ، سب انسپکٹروں اور کنسٹیبلوں نے پلیٹ فارم پر اترتے ہی مجھے آگھیرا اور کہا کہ میرے وارنٹ گرفتاری و تلاشی ہیں ۔ اتنے میں دوسرے ڈبے سے ڈاکٹر سیتہ پال میرے پاس آ گئے ۔ ان کو لینے کے لئے دہلی کے کانگرسی لیڈر لالہ شنکر لال بھی سٹیشن پر آئے ہوئے تھے ۔ لالہ سیتہ لال کو تعجب ہوا کہ ریلوے سٹیشن پر ہی گرفتاری کی جا رہی ہے ۔ لالہ شنکر لال کے ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ تعلقات نہ تھے (بعد میں کافی دوستانہ اور اخلاص کے تعلقات قائم ہوئے) ڈاکٹر سیتہ پال نے لالہ شنکر لال کو ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ کوتوالی بھیجا تاکہ وہ وہاں ضمانت دیدیں ۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں میرا خیال ہے کہ غالباً ڈاکٹر سیتہ پال بھی ہمارے ساتھ ہی کوتوالی گئے ۔ پولیس کی جمعیت بھی ہمارے ساتھ تھی ۔ کوتوالی میں لالہ شنکر لال نے میری دو ہزار روپے کی ضمانت دی ۔ کہ میں آئندہ پیشی پر ہوشنگ آباد حاضر ہو جاؤں گا ۔ (مجھے کئی روز بعد معلوم ہوا کہ لالہ شنکر لال میری ضمانت دینا نہ چاہتے تھے ۔ کیونکہ ڈاکٹر انصاری لالہ شنکر لال کی انشورنس کمپنی وغیرہ کے ڈائریکٹر تھے اور ڈاکٹر انصاری نواب بھوپال کے دوست اور ریاست بھوپال کے وظیفہ خوار تھے ۔ یہ معلوم کر کے مجھے بے حد تکلیف ہوئی کیونکہ میں کسی شخص پر بار ثابت ہونا یا ایسے شخص کا احسان برداشت کرنا ، جو نہ چاہتا ہو ، میرے ذہن کے لئے ایک اذیت ہوا کرتا ہے ۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا مجھے علم اس وقت ہوا جبکہ میں ہوشنگ آباد کی عدالت میں حاضر ہو چکا تھا اور لالہ شنکر لال کی ضمانت کی میعاد گذر چکی تھی ۔ ورنہ میں فوراً لالہ شنکر لال کی جگہ کسی دوسرے دوست کی ضمانت دلوا دیتا) کوتوالی میں ضمانت دینے کے بعد پولیس کے ساتھ ہی دفتر "ریاست" میں آیا ۔ اور دفتر "ریاست" کی تلاشی شروع ہوئی ۔ تلاشی کئی گھنٹے تک ہوتی رہی ۔ پولیس بھوپال کے نامہ نگاروں کے خطوط حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ ان کے نام معلوم ہوں اور ان پر مظالم کئے جا سکیں ۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا ۔ ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط — بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

پولیس خریداروں اور ایجنٹوں کے رجسٹر اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی ۔

تلاشی ہو رہی تھی کہ دوستوں اور اخبار نویسوں نے آنا شروع کیا ۔ تلاشی سے فارغ ہوا تو میں نے سوامی راما نند جی کو (جو سوامی شردھانند جی کے کسی زمانہ میں دست راست تھے ۔ اور اس زمانہ

Marfat.com

ہیں دہلی کے سیاسی لیڈر تھے) بلا بھیجا وہ میرے بہت مخلص دوست تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ آج ہی رات کی گاڑی سے ہوشنگ آباد جائیں۔ وہاں کے مجسٹریٹ کے متعلق معلوم کریں کہ وہ کون ہے۔ کیا اس کا تعلق نواب بھوپال سے ہے یا نہیں۔ اور دوسرے حالات معلوم کرنے کے علاوہ وہاں نئی ضمانت کا انتظام بھی کریں۔ کیونکہ لالہ شنکر لال کی ضمانت تو صرف عدالت میں حاضر ہونے تک کے لئے تھی۔ سوامی رامانند جی رات کی گاڑی سے ہوشنگ آباد تشریف لے گئے۔ وہاں یہ کانگرسی اور ہندوؤں کے لیڈروں سے ملے۔ حالات معلوم کئے، مسٹر شنبھوناتھ مصرا (ممبر مرکزی اسمبلی) سے ضمانت دینے کا فیصلہ ہوا اور معلوم ہوا کہ مجسٹریٹ مسٹر نگم ہیں جن کا بھوپال سے کوئی تعلق نہیں۔ سوامی جی تمام انتظام کرنے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد میں نے مسٹر پی بی توکلی ایڈووکیٹ سے مشورہ کیا۔ اجمیر سے سردار بہادر بھگوان سنگھ بیرسٹر بھی تشریف لے آئے۔ اور مقدمہ کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہم لوگ معہ سوامی رامانند جی کے ہوشنگ آباد روانہ ہوئے۔ ہوشنگ آباد میں ہم لوگ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے۔ معلوم ہوا کہ نواب بھوپال نے مقدمہ کے لئے خان بہادر عبدالرحمٰن (جو بعد میں لاہور ہائیکورٹ کی ججی سے ریٹائر ہوئے) کو وکیل مقرر کیا ہے۔ خان بہادر کے علاوہ نصف درجن کے قریب دوسرے وکیل بھی کئے گئے ہیں اور بھوپال سے دو درجن سے زیادہ پولیس افسر اور ملازم آئے ہیں۔ اور ان سب کے لئے خیمے نصب کئے گئے ہیں اور کھانے کی دیگیں پک رہی ہیں جیسے کہ کوئی عرس ہو۔

دس بجے کے قریب ہم عدالت میں پہنچے۔ مجسٹریٹ مسٹر نگم تھے۔ جو خیالات کے اعتبار سے رادھا سوامی تھے۔ مجھے عدالتوں کے متعلق ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ مجسٹریٹ غیر جانب دار ہو۔ رادھا سوامیوں کے گورو مرحوم صاحب جی مہاراج "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کے بہت مداح تھے۔ دہلی کے ڈاکٹر بھیم سین (جو رادھا سوامی ہیں) کی معرفت صاحب جی مہاراج کو پیغام بھیج دیا گیا تھا کہ وہ مسٹر نگم سے غیر جانب دار رہنے کی تاکید کر دیں۔ چنانچہ ہمارے ہوشنگ آباد پہنچنے سے پہلے ہی صاحب جی مہاراج کا پیغام پہنچ چکا تھا کہ انہوں نے مسٹر نگم کو تاکید کر دی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہم مطمئن تھے۔ کہ اگر مسٹر نگم ہمارے ہمدرد نہ ہوں گے تو نواب بھوپال کے باعث ہمارے خلاف بھی نہیں ہو سکتے۔ مقدمہ پیش ہونے پر جب میرے وکیلوں نے مسل کے کاغذات دیکھے تو معلوم ہوا کہ مقدمہ ضلع ہوشنگ آباد کی عدالت میں دائر نہیں کیا گیا بلکہ ریلوے مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں دائر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ مسٹر نگم کو ضلع ہوشنگ آباد، اور ریلوے مجسٹریٹ دونوں کے اختیارات حاصل ہیں (یعنی دونوں علاقوں کا ایک ہی مجسٹریٹ ہے) اس لئے یہ مقدمہ مسٹر نگم کی عدالت میں آیا۔ اور مسٹر نگم کے فیصلہ کی اپیل سیشن کورٹ ہوشنگ آباد اور ہائیکورٹ ناگپور میں نہ جائے گی بلکہ پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال کے پاس بطور سیشن جج اور ایجنٹ گورنر جنرل سنٹرل انڈیا کے پاس بطور جج ہائیکورٹ جائے گی۔ اور مسٹر نگم کے بعد اگر اپیل ہوئی

Marfat.com

تو اس اپیل کے لئے ہمیں نواب بھوپال کے علاقہ میں بھوپال جانا ہوگا۔ ہم نے مقدمہ کی جب یہ نوعیت دیکھی تو حیران رہ گئے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

اُس روز عدالت میں شہادت کے لئے تاریخ مقرر ہوئی اور ہم واپس دہلی چلے آئے۔

دہلی پہنچنے کے بعد میں نے اسمبلی کے اہل الرائے ممبر دوستوں سے مشورہ کیا اور اسمبلی میں سوالات دریافت کرنے کا نوٹس دلوایا۔ جن میں گورنمنٹ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ واقعہ ہے یا نہیں کہ جب پرنسس پروٹیکشن ایکٹ اسمبلی میں پاس ہو رہا تھا تو گورنمنٹ نے ہاؤس کو یقین دلایا تھا کہ اس ایکٹ کے مطابق جن مقدمات کی گورنمنٹ ہند منظوری دے گی اُن مقدمات کی اپیل ہائیکورٹ میں جائے گی۔ تاکہ ملزم کے ساتھ کسی قسم کی بے انصافی نہ ہو۔ مگر اس ہوشنگ آباد والے مقدمہ کی اپیل پولٹیکل ایجنٹ کے پاس جائے گی۔ ان سوالات کے اسمبلی میں نوٹس دلوانے کے بعد میں سرچارلس واٹسن پولٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند سے ملا۔ وہ بہت نیک فطرت انگریز تھے۔ میں جب ان کو مقدمہ کی تمام پوزیشن بتا رہا تھا تو وہ نواب بھوپال کی خلاف آئین چالاکی پر بہت نفرت اور غصہ کا اظہار کر رہے تھے اور کچھ جھنجھلا سے رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے کہا کہ "میں ان ہی حرکتوں کے باعث مقدمہ کی منظوری نہ دیتا تھا۔ اچھا میں اب انتظام کروں گا کہ آپ کے ساتھ خلاف آئین ظلم نہ ہو"۔

مَیں سرچارلس سے ملنے کے بعد واپس آیا۔ چند روز کے بعد ہم جب اگلی پیشی پر ہوشنگ آباد گئے تو مجسٹریٹ نے بتایا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم کے مطابق مقدمہ کی کارروائی روک دی گئی ہے اور آج کوئی کارروائی نہ ہوگی۔ مستغیث اور ملزم دونوں تا اطلاع ثانی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ اس حکم کا نہ مجھے علم تھا اور نہ بھوپال کے نمائندہ خواجہ محمد اکرم انسپکٹر جنرل پولیس کو۔ یہ حکم سن کر ہم لوگ حیران رہ گئے اور خواجہ اکرم کا رنگ فق ہو گیا۔ اور وہ سر کھجانے لگے (خواجہ اکرم کی اعصاب کے اعتبار سے کچھ عادت سی ہے کہ وہ جب تشویش میں ہوں تو اپنے سر کو کھجلانے لگ جاتے ہیں) یہ حکم سن کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ اطلاعات حاصل کرنے کے لئے ناگپور میں بھی انتظام کر لیا تھا۔ اُس دوست نے اطلاع دی کہ پولٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند نے سی۔ پی کی گورنمنٹ کو نہ صرف مقدمہ کی کارروائی روکنے کے لئے تار بھیجا ہے بلکہ ایک خط کے ذریعے یہ بھی لکھا ہے کہ گورنمنٹ ہند کی نواب بھوپال کے ساتھ اس مقدمہ کے سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ گورنمنٹ ہند کی نہ مستغیث سے ہمدردی ہے اور نہ ملزم سے۔ گورنمنٹ ہند قطعی غیر جانبدار ہے۔ اور جب بھی عدالت میں کوئی کارروائی ہو تو عدالت کی کارروائی کی پوری نقل گورنمنٹ ہند کو بھیجی جائے۔ اس اطلاع کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب اس مقدمہ بازی کا لطف آئے گا۔ اور میں دیکھوں گا کہ نواب بھوپال اپنی نوابی کا کیونکر ناجائز استعمال کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

گورنمنٹ ہند کا مقدمہ کی کارروائی کو روکنے کا یہ حکم نواب بھوپال کے پرسٹیج اور راثر پر بہت بڑی ٹھوکر تھی۔ ان لوگوں نے بہت بھاگ دوڑ کی، کبھی نواب بھوپال وائسرائے سے مل رہے ہیں۔ اور کبھی ان کے وزرا پولیٹیکل ایجنٹ۔ ایجنٹ گورنر جنرل اور پولیٹیکل سیکرٹری گورنمنٹ ہند سے۔ ادھر اسمبلی کے تمام ممبر ہمارے ساتھ کئی روز تک جدو جہد جاری رہی۔ آخر سر آبرے میٹکاف فارن سیکرٹری گورنمنٹ ہند (جو اسمبلی میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے تھے) نے مسٹر بی داس ممبر اسمبلی سے خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے ملوں۔ چنانچہ اگلے روز میں سر آبرے میٹکاف سے ملنے کے لئے ان کے دفتر میں گیا جو پولیٹیکل سیکرٹری کے دفتر کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو سر آبرے نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں ملا اور باتیں شروع ہوئیں تو آپ سے مقدمہ کے متعلق ذیل کی گفتگو ہوئی:۔

سر آبرے میٹکاف:۔ ویل سردار دیوان سنگھ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی اور نواب بھوپال کی صلح ہو جائے۔ اگر آپ چاہیں تو میں کوشش کر کے صلح کراتا ہوں۔ تاکہ نواب صاحب مقدمہ واپس لے لیں۔

میں:۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مرحوم جنرل میٹکاف جو بہت بہادر انگریز تھے۔ اور جن کے نام پر یہاں دہلی میں میٹکاف ہاؤس بطور یادگار قائم ہے کے آپ پوتے ہیں۔

سر آبرے میٹکاف (مسکراتے ہوئے):۔ ہاں میں مرحوم جنرل میٹکاف کا حقیقی پوتا ہوں۔

میں:۔ آپ اس بہادر میٹکاف کے پوتے ہوتے ہوئے مجھے نواب بھوپال سے صلح کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ بہادر انسان صلح کے مقابلے پر جنگ کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ میرے حقیقی دادا نے اپنے ماموں کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے گجرات کے مقام پر انگریزوں کے ساتھ جنگ کی۔ آپ سولجر میٹکاف کے پوتے ہوتے ہوئے چاہے صلح کے لئے کہیں، مگر میں اپنے سولجر دادا کا پوتا ہوتے ہوئے صلح کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور میرے لئے اسی میں لطف ہوگا کہ میں نواب بھوپال کو قدم قدم پر شکست دوں۔

سر آبرے میٹکاف میرے یہ الفاظ سن کر حیران سے ہو گئے۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوئیں۔ مجھے سر آبرے نے یقین دلایا کہ اس مقدمہ میں گورنمنٹ ہند بالکل غیر جانب دار رہے گی۔

ہماری اور نواب بھوپال کی کئی روز کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ آخر یہ نکلا کہ مقدمہ ریلوے مجسٹریٹ کی عدالت سے واپس لے لیا گیا۔ اور پھر ڈسٹرکٹ کورٹ ہوشنگ آباد کی عدالت میں دائر ہوا۔ جس کی اپیل سیشن جج ہوشنگ آباد اور ہائیکورٹ ناگپور میں کی جا سکے گی۔ چنانچہ کئی ہفتوں کے بعد یہ مقدمہ دوسری عدالت میں منتقل ہو گیا۔ اور نواب بھوپال کو کافی ندامت اٹھانی پڑی۔

Marfat.com

ہوشنگ آباد کے مقدمہ کا تماشہ

مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" کی کارروائی گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے بند ہونے اور پھر جاری ہونے میں کئی ہفتہ صرف ہوئے۔ اتنے میں پہلے مجسٹریٹ مسٹر نگم (جو راد معا سوامی تھے) تبدیل ہو چکے تھے اور اُن کی جگہ ایک معمر مجسٹریٹ مسٹر رائے زادہ تشریف لائے۔ یہ پرانے ڈھانچہ کے بزرگ۔ نہایت اخلاق سے پیش آنے والے۔ اگر استغاثہ کے وکیل خان بہادر عبدالرحمٰن نے دبالیا تو وہاں نرمی اختیار کر لی۔ اور اگر ملزم کے وکیل مسٹر توکلی نے سختی سے جواب دیا تو وہاں لچک گئے۔ اگر کسی سوال پر مستغیث کے وکیل نے اعتراض کیا تو کہہ دیا "سوال کی اجازت نہیں" اور اگر ملزم کے وکیل نے کہہ دیا کہ سوال کی اجازت ہونی چاہیئے تو کہہ دیا کہ "اچھا سوال کرنے کی اجازت" ہے۔ اس مجسٹریٹ کا یہ پہلو بے حد دلچسپ تھا۔ کہ عدالت کے شروع ہونے کے وقت دس بجے اگر استغاثہ کے لوگ پہنچ گئے اور ملزم اور اُس کے وکیل ابھی نہ پہنچے۔ تو آپ نے استغاثہ کے وکیل کے ساتھ محبت کی باتیں شروع کر دیں اور باتوں باتوں میں آپ کہہ دیتے "اخبارات کے ایڈیٹر بہت بدمعاش ہوتے ہیں۔ بڑے بڑوں کی پگڑیاں اتار دیتے ہیں، ان سے والیانِ ریاست بھی محفوظ نہیں" اور اگر نواب بھوپال کی پارٹی کے لوگ ابھی نہیں پہنچے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" اپنے وکلاء مسٹر برج بہاری توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ کے ساتھ عدالت میں پہنچ گیا۔ تو آپ مسٹر توکلی سے باتیں شروع کر دیتے "یہ والیانِ ریاست بہت بدمعاش ہیں۔ ان کے ہاتھوں نہ رعیت کی جان محفوظ ہے نہ عزت، عورتیں تک نکال کر لے جاتے ہیں۔ اخبارات کا کام ہے کہ وہ ان بدمعاشوں کے خلاف آواز پیدا کریں وغیرہ"۔

چنانچہ یہ رائے زادہ صاحب دونوں پارٹیوں کو اپنی اپنی جگہ خوش کرنے کی کوشش کرتے اور دونوں پارٹیاں کچہری سے باہر ان کا مذاق اڑاتیں۔ مسٹر رائے زادہ کی عدالت کا تماشہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اتنے میں رائے زادہ صاحب کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور آپ ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد آپ کئی ہفتہ تک ہوشنگ آباد ہی رہے۔ اور اس کئی ہفتہ کے عرصہ میں ایڈیٹر "ریاست"، مسٹر توکلی اور سردار بہادر بھگوان سنگھ جب کبھی ان کی کوٹھی کے پاس سے گذرتے ہم لوگ ان سے باتیں کرنے کے لئے ان کی کوٹھی پر چلے جاتے۔

ایک روز ایڈیٹر "ریاست" نے تفریحاً و مذاقاً آپ سے پوچھا کہ "رائے زادہ صاحب یہ تو بتایئے کہ اگر آپ ریٹائر نہ ہوتے اور آپ اس مقدمہ کا فیصلہ کرتے تو آپ کا فیصلہ کیا ہوتا"۔

اس پر رائے زادہ صاحب نے بے تکلف فرمایا "آپ لوگ پبلک کی بہت خدمت کر رہے ہیں یہ والیانِ ریاست بہت بدمعاش ہیں۔ میں آپ کو بے قصور سمجھتا ہوں۔ مگر میں آپ کو پچاس روپیہ

Marfat.com

جرمانہ کرتا۔ اس سے زیادہ سزا نہ دیتا" یہ جواب سن کر ہم سب لوگ ہنس پڑے۔ کیونکہ ابھی تک استغاثہ کے گواہ نہ ہوئے۔ ڈیفنس نہ لیا گیا۔ فردِ جرم نہیں لگا۔ مگر رائے زادہ صاحب نے مجھے مجرم قرار دے دیا۔ آپ بے حد نیک اور سادہ لوح تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے تھے۔ لکھنؤ سے یہ مجھے اکثر خط لکھتے رہا کرتے۔ اور جب مجسٹریٹ مسٹر احمد حسن نے مجھے اس مقدمہ میں سزا دی تو آپ کا خط آیا جس میں لکھا تھا" بہت بے انصافی ہوئی۔ اگر میں مجسٹریٹ ہوتا تو آپ کو بری کرتا۔"

مسٹر رائے زادہ صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد ان کی جگہ ایک مجسٹریٹ مسٹر احمد حسین تشریف لائے جو یو۔پی کے رہنے والے تھے۔ اور دیانت داری کے اعتبار سے سی۔پی کے تمام صوبہ میں مشہور تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ دیانت داری کی شہرت کے باعث ہی ہوشنگ آباد بھیجے گئے ہیں تاکہ اس مقدمہ میں انصاف کریں۔ اور ان پر نواب بھوپال کے روپیہ کا کوئی اثر نہ ہو۔

مسٹر احمد حسین بہت چالاک مجسٹریٹ تھے۔ یہ عدالت میں کوئی بات ایسی نہ کرتے جس سے ہمیں ان کے متعلق کوئی شبہ ہو۔ چنانچہ ہمیں اطلاعیں ملا کرتیں کہ نواب بھوپال کی شخصیت کا ان پر اثر ہے اور نواب بھوپال کے تعلق والے لوگ ان سے ملتے ہیں۔ مگر عدالت میں ان کے رویّہ کے باعث ہم ایسی اطلاعات کو غلط سمجھتے اور پروا نہ کرتے۔

مسٹر احمد حسین کو مقدمہ کی سماعت کرتے ایک عرصہ گذر گیا۔ تو ایک روز دہلی میں خان بہادر تصدق حسین (جو ایڈیٹر "ریاست" کے بہت بڑے دوستوں میں سے تھے۔ اور جن کا گورنمنٹ آف انڈیا کے ہر بڑے سے بڑے افسر پر اثر تھا) نے پوچھا کہ ہوشنگ آباد میں مقدمہ کس مجسٹریٹ کے پاس ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ایک صاحب مسٹر احمد حسین ہیں۔ جو یو۔پی کے رہنے والے ہیں انہوں نے پوچھا کہ کیا احمد حسین علی گڑھ کے فلاں ڈپٹی کلکٹر کے بھائی تو نہیں؟ میں نے کہا یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے بھائی کا نام کیا ہے۔ مگر یہ مجھے علم ہے کہ ان کے ایک بھائی یو۔پی میں غالباً ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اس واقعہ سے ایک ہفتہ بعد خان بہادر تصدق حسین ملنے کے لئے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا:

> "احمد حسین صاحب کے فلاں قریبی عزیز میرے گہرے دوست ہیں۔ میں اُن سے علی گڑھ میں ملا تھا۔ اُن سے بات چیت ہوئی تو میں نے کہا کہ وہ احمد حسین صاحب سے کہیں کہ وہ سردار دیوان سنگھ کا خیال رکھیں۔ سردار دیوان سنگھ میرے دوست ہیں۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس سے پہلے احمد حسین صاحب سے نواب بھوپال کی سفارش کر چکے ہیں۔ ایسی حالت میں سردار دیوان سنگھ کے متعلق کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

Marfat.com

یہ پہلا موقع تھا مجھے مسٹر احمد حسین کے متعلق شبہ ہُوا کہ ان پر نواب بھوپال کا اثر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ہم لوگ مسٹر احمد حسین کے متعلق بالکل بے فکر اور مطمئن تھے۔ خان بہادر تصدق حسین کی اس اطلاع نے مقدمہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ اس اطلاع سے پہلے ہم مسٹر احمد حسین سے انصاف اور غیر جانب داری کی توقع رکھتے تھے۔ اب ہم نے ان کو اپنے دل میں دشمن سمجھنا شروع کیا۔ ایڈیٹر "ریاست" جب کسی مجسٹریٹ سے انصاف کی توقع نہ رکھے تو پھر اس کی مہربانی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اگر وہ مجسٹریٹ کوئی رعائیت بھی کرے تو اُس رعائیت کو میں مگرمچھ کے آنسو سمجھا کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مسٹر احمد حسین کو اب دشمن سمجھنا چاہیئے۔ چاہے عدالت میں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہونے دینے جن سے ان کی جانب داری محسوس ہو چنانچہ ہم نے مجسٹریٹ کے احساس کی پروا نہ کرتے ہوئے مقدمہ کی مسل کی بنیادوں کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ تاکہ یہ مجسٹریٹ اگر سزا بھی دے۔ تو اپیل میں بریت حاصل ہو۔

مقدمہ چل رہا تھا تو میں نے کوشش شروع کر دی کہ اس مجسٹریٹ کو یہاں سے تبدیل کرایا جائے۔ پٹنہ کے مشہور بیرسٹر مرحوم مسٹر جیسوال سے ایڈیٹر "ریاست" کے کچھ تعلقات تھے۔ ان کا لڑکا دو تین بار دہلی آیا تو وہ ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں مقیم ہُوا۔ چنانچہ یہ تعلقات اور زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ مسٹر جیسوال کے اُس لڑکے کی سگائی سی پی کے منسٹر رائے بہادر مسٹر جیسوال کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔ اور مسٹر جیسوال نے پٹنہ سے رائے بہادر جیسوال کو خط لکھا کہ دیوان سنگھ اُن کا دوست ہے۔ اگر کسی امداد کی ضرورت ہو تو بالکل دریغ نہ کیا جائے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں سی پی کے ہوم ممبر مسٹر راگھوندر راؤ (جو بعد میں وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر ہوئے اور دہلی میں ہی آپ کا انتقال ہُوا) سے ملوں اور تمام حالات کے علاوہ نواب بھوپال کی مسٹر احمد حسین سے کی گئی سفارش کا ذکر کر کے احمد حسین کے تبادلے کا مطالبہ کروں چنانچہ میں ہوشنگ آباد سے ناگپور گیا۔ وہاں کے انگریزی اخبار "ہتوادا" کے ایڈیٹر میرے دوست تھے ان کے ہاں قیام کیا۔ صبح کا وقت تھا اُن کے ہاں سے اسی وقت رائے بہادر جیسوال کو ٹیلیفون کیا کہ میں ناگپور میں ہوں۔ اور ایڈیٹر "ہتوادا" کے مکان پر مقیم ہوں۔ رائے بہادر جیسوال کو جب یہ علم ہُوا تو انہوں نے کہا کہ وہ ابھی اپنی کار بھیج رہے ہیں میں اُن ہی کے ہاں ناشتہ کروں۔ چنانچہ دس منٹ میں ان کا سرکاری چوبدار کار لے کر پہنچ گیا۔ میں اتنے میں غسل سے فارغ ہو چکا تھا۔ کار میں رائے بہادر جیسوال کے ہاں پہنچا۔ راستہ میں مجھے خیال آیا۔ نواب بھوپال جیسی بڑی شخصیت نے مقدمہ چلایا۔ میں اس صوبہ میں ایک ملزم کی حیثیت سے ہوں۔ لیکن یہاں کے منسٹر کا چوبدار لینے کے لئے آیا ہے۔ منسٹر کی کار ہے اور منسٹر کے ہاں کھانا ہوگا۔ یہ سب ستاروں کا اثر ہے۔ ورنہ

Marfat.com

نواب بھوپال نے جب مقدمہ شروع کیا تو وہ سمجھتے تھے کہ دو پیشیوں میں ہی دیوان سنگھ معافی مانگ لے گا اور اسے کچل دیا جائے گا۔ میں رائے بہادر جیسوال کے ہاں پہنچا، وہ منتظر تھے اُن کے ساتھ کھانا کھایا، اور کھانا کھاتے ہوئے بتایا کہ واقعات کیا ہیں۔ اور میں احمد حسین سے کسی انصاف کی توقع نہیں کر سکتا۔ میری اطلاع کے مطابق احمد حسین کے پاس نواب بھوپال کی سفارش پہنچ چکی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں اور رائے بہادر سیکرٹریٹ میں آ گئے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے مسٹر راگھوندرا راؤ ہوم ممبر اپنے دفتر پہنچ چکے تھے۔ رائے بہادر اپنے ساتھ مجھے مسٹر راگھوندرا راؤ کے کمرہ میں لے گئے۔ مسٹر راؤ سے میرا تعارف کرایا۔ تعارف کرانے کے بعد رائے بہادر تو اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ میں نے مسٹر راؤ سے باتیں شروع کیں۔ مسٹر راؤ مقدمہ کے تمام حالات سے واقف تھے۔ جب میں نے ان کو علی گڑھ کی گفتگو کے حالات سنائے تو انہوں نے کہا:

"میں نے مسٹر احمد حسین کو صرف اس لئے ہوشنگ آباد بھیجا ہے کہ وہ تمام صوبہ میں دیانت دار اور غیر جانب دار مشہور ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ احمد حسین پر کسی سفارش کا اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا ملازمت کا پچھلا تمام ریکارڈ بے داغ ہے۔ میری رائے ہے کہ مقدمہ کسی دوسرے مجسٹریٹ کے پاس نہ جانا چاہیئے۔ اور اگر آپ پھر بھی مطمئن نہ ہوں اور آپ کو یقین ہو کہ احمد حسین انصاف نہ کرے گا، تو آپ مجھے بتایئے، میں احمد حسین کو کسی دوسرے ضلع میں تبدیل کر دوں گا۔"

مسٹر راگھوندرا راؤ کے اس یقین دلانے پر مجھے خیال آیا کہ یہ درست ہے۔ کہ احمد حسین صاحب سے نواب بھوپال نے سفارش کرائی۔ مگر جیسا کہ مسٹر راگھوندرا راؤ کہتے ہیں ممکن ہے کہ اس سفارش کا مسٹر احمد حسین پر کوئی اثر نہ ہو۔ میں نے مسٹر راؤ سے کہا۔

"بہت اچھا۔ میں اپنے وکیلوں سے مشورہ کر لوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں پھر آپ کو تکلیف دوں گا۔"

میں یہ کہہ کر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رائے بہادر جیسوال کے کمرہ میں آیا۔ اُن کو بتایا کہ کیا کچھ بات چیت ہوئی۔ رائے بہادر بھی اس بات سے متفق تھے کہ ابھی مقدمہ دوسری عدالت میں لے جانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ ہم نے مجسٹریٹ کو تبدیل کرانے کا خیال چھوڑ دیا گو میرا ذہن مسٹر احمد حسین کے متعلق مطمئن نہ تھا۔

یہ مقدمہ چھ سال تک چلتا رہا، جس کے واقعات بے حد دلچسپ ہیں۔

Marfat.com

والیانِ ریاست کا "پریسٹیج"

ایک صاحب کرنل امیر احمد بھوپال میں نواب صاحب کے ملٹری سیکرٹری تھے۔ سیلف میڈ، بڑی سے بڑی جگہ پہنچ جانے والے ۔ بہت با اثر اور ہر شخص کو شیشہ میں اتارنے کے اعتبار سے بڑے ایکسپرٹ۔ آپ بچپن میں کسی بڑے ہوٹل میں بیرا یا بوائے تھے۔ مسافروں میں اُمرا کے طبقہ کی خدمت کرتے ۔ آخر ترقی کرتے کرتے ریاست بھوپال میں ملٹری سیکرٹری کے عہدہ پر پہنچے۔ آپ کے اثر کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ آپ جب انگلستان جاتے تو وہاں شاہی محلات میں مدعو کئے جاتے اور نئی دہلی میں آتے تو اکثر وائسرائے کے ہاں قیام ہوتا۔ آپ کو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں پر بھی کافی رسوخ حاصل تھا۔

نواب بھوپال مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر "ریاست" میں صلح چاہتے تھے۔ مگر اس صلح کے راستہ میں آپ کا "پریسٹیج" حائل تھا۔ کیونکہ نواب صاحب والیانِ ریاست کے چانسلر ہوتے ہوئے محسوس کرتے تھے کہ اگر مقدمہ واپس لیا تو دوسرے والیانِ ریاست کو کیا جواب دیں گے۔ یعنی مقدمہ کیوں کیا اور پھر واپس کیوں لیا۔ چنانچہ آپ کی کوشش یہ تھی کہ ایڈیٹر "ریاست" معافی مانگ لے یا کم از کم اظہارِ افسوس کر دے تو مقدمہ واپس لے لیا جائے اور آپ دوسرے والیانِ ریاست میں سُرخ رو ہوں۔ اس صورت میں آپ بہت کافی روپیہ ایڈیٹر "ریاست" کو بطور اخراجاتِ مقدمہ (ایڈیٹر "ریاست" کے خیال میں بطور احمقانہ جرمانہ) بھی دینے کے لئے تیار تھے۔ اور بقول بھوپال کے ایک میونسپل کمشنر (جو ایک بار ایڈیٹر "ریاست" سے گفت و شنید کرنے کے لئے جھانسی اور بھوپال کے درمیان للت پور آئے) یہ رقم ایک لاکھ روپے تک ممکن تھی۔ چنانچہ نواب صاحب نے صلح کے اس مشن کے سلسلے کرنل امیر احمد کو مقرر کیا اور کرنل امیر احمد دہلی تشریف لائے۔

اس زمانہ میں مرحوم ہز ہائینس نواب میر صاحب خیرپور دریا گنج کی ایک کوٹھی میں مقیم تھے۔ کرنل امیر احمد میر صاحب سے ملنے کے لئے گئے۔ تو آپ نے میر صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ اس مسئلہ میں میر صاحب بھی امداد کریں۔ چنانچہ وہاں میر صاحب کے پاس میجر ملک حبیب احمد (یہ بزرگ پہلے ریاست بھوپال میں مجسٹریٹ تھے وہاں سے علیحدہ ہوئے تو خیرپور پہنچے۔ وہاں سے نکالے گئے تو بیرکھاری میں گئے۔ وہاں سے موقوف کر دیئے گئے تو پونا کی کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوئے) بھی موجود تھے۔ میر صاحب خیرپور نے اپنی طرف سے میجر ملک حبیب احمد کو مقرر کیا کہ وہ کرنل امیر احمد کی امداد کریں۔

ریاستوں کا ہر اہلکار اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا تھا۔ اور اس کا خیال ہوتا تھا کہ سوائے

Marfat.com

اُس کے تمام دنیا بے وقوفوں کی ہے۔ کرنل امیر احمد بھی ان جذبات سے محروم نہ تھے۔ آپ نے میجر ملک حبیب احمد کو ہدایت کی کہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کو میر صاحب خیر پور کی کوٹھی میں گفت وشنید کے لئے لائیں۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" کو یہ علم نہ ہو کہ کرنل امیر احمد ملنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہاں بھی نواب بھوپال کے بڑے "پرسٹیج" کے ساتھ کرنل امیر احمد کا چھوٹا "پرسٹیج" کام کر رہا تھا۔ میجر ملک حبیب احمد تشریف لائے تو آپ نے سارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا اور ایڈیٹر "ریاست" کو راز میں لیتے ہوئے کہا۔ کہ کرنل امیر احمد ملنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی خواہش ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" پر یہ ظاہر نہ ہو کہ کرنل امیر احمد ملنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ نواب بھوپال نے صلح کے لئے بھیجا ہے ورنہ کرنل امیر احمد میں یہ جرأت کہاں کہ آپ اپنے آقا نواب بھوپال کی اجازت اور ہدایت کے بغیر ایڈیٹر "ریاست" کے قریب بھی آ سکیں۔

میں ملک حبیب احمد کے ساتھ دریا گنج میر صاحب خیر پور کی کوٹھی گیا۔ میر صاحب زنانہ میں تھے۔ میں اور ملک صاحب ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں بیٹھے دو تین ہی منٹ ہوئے تھے کہ کرنل امیر احمد تشریف لائے جو ایک دوسرے کمرہ میں ہمارا انتظار کر رہے تھے جب آپ آئے تو ملک صاحب نے تعارف کرایا "آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" اور آپ مسٹر خان ٹھیکیدار بمبئی"۔ ہم نے ہاتھ ملایا، اور بیٹھ گئے۔ میرے اور کرنل امیر احمد کے درمیان یہ بات چیت شروع ہوئی:-

کرنل امیر احمد:- آپ سے مل کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ میں کئی برس سے مسلسل آپ کا اخبار پڑھتا ہوں اور میری رائے ہے کہ اُردو زبان کا یہ تمام ہندوستان میں بہترین اخبار ہے۔

ایڈیٹر "ریاست":- آپ کی مہربانی ہے۔

کرنل امیر احمد:- نہیں میں مبالغہ نہیں کر رہا۔ میری ایمانداری کے ساتھ یہی رائے ہے۔

ایڈیٹر "ریاست":- آپ کے خیالات کا شکرگزار ہوں۔

کرنل امیر احمد:- آپ ریاستوں کے مظالم کو بھی خوب بے نقاب کرتے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست":- والیانِ ریاست کی حالت ایسی ہی ہے، یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو اخبارات بے نقاب کریں۔

کرنل امیر احمد:- نواب بھوپال والا آپ کا مقدمہ بھی پبلک میں بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے آپ خوب مقابلہ کر رہے ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست":- مقدمہ تو نواب بھوپال نے کیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ ڈیفینڈ کروں۔

کرنل امیر احمد:- ہاں۔ مگر نواب صاحب ذاتی طور پر بڑے شریف ہیں۔ صرف ان کے خوشامدیوں نے ان کو خراب کیا۔ جنہوں نے مقدمہ چلانے کی رائے دی۔

ایڈیٹر "ریاست":- خوشامدیوں کے ہاتھوں میں ٹول بننا بھی تو ایک عیب ہے۔ جس کا انسان کو خمیازہ

Marfat.com

بھگتنا پڑتا ہے اور خوشامدیوں کے ہاتھوں میں بیوقوف بننا صرف نواب بھوپال ہی تک محدود نہیں ہر والئے ریاست اس میں مبتلا ہے۔

یہ باتیں چند منٹ ہوئی تھیں تو کرنل امیر احمد کھل گئے۔ آپ نے فرمایا:۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں مسٹر خان ٹھیکیدار نہیں ہوں۔ میں کرنل امیر احمد ملٹری سیکرٹری بھوپال ہوں۔ ایک طویل عرصہ سے میری خواہش تھی کہ میں آپ سے ملتا۔ اور چونکہ میں نواب صاحب بھوپال سے پوشیدہ طور پر آپ سے ملنے کے لئے آیا اس لئے تعارف میں نام غلط بتانا پڑا۔"

میں نے کہا اس کا خیال نہ کیجئے۔ مجھے ریاستوں کے افسروں سے ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔ آپ نواب صاحب سے پوشیدہ طور پر ملنے کے لئے آئے ہیں یا نواب صاحب کی ہدایت کے مطابق۔ میرے لئے اس میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے بعد کرنل صاحب زیادہ کھلے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جو پارٹی مقدمہ چلانے یا مقدمہ کو جاری رکھنے کے حق میں ہے اس پارٹی کے لوگ کرنل امیر احمد کے مخالفین میں سے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ مقدمہ کا خاتمہ ہو۔

مقدمہ کو ختم کرنے کے متعلق دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کہ کیا صورت اختیار ہو۔ کرنل صاحب اس بات پر بضد تھے کہ ایڈیٹر "ریاست" اگر معافی نہ مانگے تو کم از کم افسوس کا اظہار کر دے مقدمہ واپس لے لیا جائے اور جو روپیہ ایڈیٹر "ریاست" کا مقدمہ میں اب تک خرچ ہوا وہ یا اس سے زیادہ روپیہ ایڈیٹر "ریاست" کو دے دیا جائے اور ایڈیٹر "ریاست" کا مطالبہ یہ تھا کہ مقدمہ نواب بھوپال نے شروع کیا وہ واپس لے لیں۔ ایڈیٹر "ریاست" معافی کے لئے تیار ہے نہ اظہارِ افسوس کے لئے۔ اس بحث کے بعد کرنل امیر احمد نے کہا:۔

"سردار صاحب! ذرا یہ تو سوچئے کہ اگر آپ اظہارِ افسوس بھی نہ کریں تو نواب صاحب اپنی رعایا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ کیا بھوپال کی رعایا یہ خیال نہ کرے گی کہ نواب صاحب نے مقدمہ جاری کیا اور جب وہ مقدمہ میں مقابلہ نہ کر سکے تو مقدمہ جھک مار کر واپس لے لیا گیا۔ آپ اس پر غور تو کیجئے نواب صاحب کا پرسٹیج کیا باقی رہ جائے گا۔"

میں نے جواب دیا:۔

"کرنل صاحب! آپ تو صرف ایک ریاست بھوپال کی رعایا کے متعلق فرماتے ہیں۔ ذرا یہ تو سوچئے کہ اگر میں اظہارِ افسوس کر دوں تو میں چھ سو ریاستوں کی رعایا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیا ان چھ سو ریاستوں کی رعایا یہ خیال نہ کرے گی کہ ایڈیٹر "ریاست" نے پہلے تو نواب صاحب کے خلاف لکھا اور الزام لگائے۔ مگر

Marfat.com

جب مقدمہ میں ایڈیٹر"ریاست" نواب صاحب کا مقابلہ نہ کرسکا تو اس نے جھک مار کر معافی مانگ لی۔ آپ اس پر غور تو کیجئے کہ اخبار"ریاست" کا پریسٹیج کہاں باقی رہ جائے گا۔"

میرے اس جواب کے بعد کرنل امیر احمد کو یقین ہو گیا کہ میں معافی نہ مانگوں گا۔ چنانچہ سلسلۂ گفتگو ختم ہو گیا۔ کیونکہ نواب صاحب اپنے پریسٹیج پر دھبہ لگانے کے لئے تیار نہ تھے اور ایڈیٹر "ریاست" جو ملازم کے پریسٹیج پر دھبہ لگوانے کے لئے تیار نہ تھا۔ مقدمہ چھ سال تک چلا۔ نواب صاحب کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور ایڈیٹر"ریاست" کے اس مقدمہ میں اسّی ہزار کے قریب روپیہ صرف ہوا۔ چنانچہ اب جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ نواب بھوپال والے مقدمہ کا کیا نتیجہ ہوا تھا۔ تو میں جواب دیتا ہوں۔ چھ سال قید اسّی ہزار روپیہ جرمانہ۔ یعنی چھ سال کا قیمتی وقت مقدمہ کی پیروی میں صرف ہونا قید سے کم نہیں۔ اگر یہی چھ سال کا زمانہ اخبار پر خرچ کی جاتی اور مقدمہ کے مصارف کا اسّی ہزار روپیہ اخبار کو زیادہ بہتر بنانے میں صرف ہوتا۔ تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ"ریاست" میں کتنی مزید خوبیوں کا اضافہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر انسان کو اپنے پریسٹیج کے لئے قربانی کرنا ہی پڑتی ہے۔

ایڈیٹر"ریاست" پر جھوٹا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا الزام

ہوشنگ آباد کے مقدمہ نواب بھوپال بنام ایڈیٹر"ریاست" کا ایک دلچسپ واقعہ سنیئے:۔

مقدمہ کی پیشی مقرر ہو چکی تھی اور نواب بھوپال کے گواہ پیش ہونے تھے۔ نواب صاحب کے نمائندے اپنے وکیل خان بہادر عبدالرحمٰن (جو بعد میں لاہور ہائیکورٹ کے جج تھے۔ سر عبدالرحمٰن یہی اور فلسطین والے کمیشن میں گورنمنٹ ہند کے نمائندہ تھے) اور اپنے ایک درجن کے قریب ماتحتوں اور دو درجن کے قریب گواہوں کو لے کر پیشی پر ہوشنگ آباد پہنچے۔ کیونکہ فیصلہ تھا کہ مقدمہ اس تاریخ تک ہر روز ہو گا۔ جب تک کہ نواب صاحب کے گواہ ختم نہ ہو جائیں۔ چنانچہ گواہوں کے لئے خیمے نصب ہو چکے تھے۔ پلاؤ، قورمہ اور کباب پک رہے تھے اور ان لوگوں کے دو ہفتہ تک وہاں قیام کا انتظام تھا۔

اس پیشی سے پہلے ایڈیٹر"ریاست" کئی ایک پیشیوں پر نہ جاسکا تھا۔ اور اس نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا تھا۔ اور نواب بھوپال کے نمائندوں کو یہ خیال تھا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ اور ڈاکٹر سے غلط سرٹیفکیٹ لے کر بھیج دیتا ہوں۔ اس پیشی سے ایک روز پہلے میں نے پھر میڈیکل سرٹیفکیٹ لیا۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاکٹر شیورام چوپڑہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نے دیا۔ اور اس پر مجسٹر

Marfat.com

اسپیشل سول سرجن نئی دہلی (جو بعد میں پنجاب میں انسپکٹر جنرل سول ہاسپٹلز تھے) نے دستخط (کونٹر سائن) کئے۔ اور میں نے شام کو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں اپنے آدمی کے ہاتھ یہ سرٹیفکیٹ ہوشنگ آباد بھیج دیا۔

انسپکٹر جنرل پولیس بھوپال اور خان بہادر عبدالرحمٰن نے یہاں دہلی میں اپنے آدمی چھوڑ رکھے تھے کہ وہ میرے متعلق بذریعہ تاران کو ہوشنگ آباد اطلاع دیتے رہیں۔ یہ لوگ میرے اس آدمی کو نہ جانتے تھے جو میڈیکل سرٹیفکیٹ لے کر ہوشنگ آباد گیا۔ یہ دہلی اور نئی دہلی کے سٹیشنوں پر ہر گاڑی میں مجھے تلاش کرتے۔ اور تلاش کرنے کے بعد تار دیتے کہ فلاں گاڑی میں بھی روانہ نہیں ہوا۔ چونکہ میرے آدمی کو نہ جانتے تھے اس لئے اس کے متعلق یہ اطلاع نہ دے سکے۔ جب گرینڈ ٹرنک ایکسپریس (جو ہوشنگ آباد کے لئے آخری ٹرین تھی) بھی دہلی سے چلی گئی اور انہوں نے میرے روانہ نہ ہونے کے متعلق تار دے دیا تو اس کے بعد یعنی تقریباً سات بجے شام کو انہوں نے ایک اور ایکسپریس تار دیا جس میں لکھا تھا کہ "دیوان سنگھ گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کے جانے کے بعد اپنے مکان اجمیری دروازہ سے چاوڑی بازار کو جاتے ہوئے دیکھا گیا یہ اپنی موٹر خود چلا رہا تھا" یہ تار ان لوگوں کو رات کو ہی یا علی الصبح ہوشنگ آباد پہنچ گیا اور انہوں نے تیاری کر لی کہ اب دیوان سنگھ کی ضمانت منسوخ کرا کر چھوڑیں گے۔ عدالت میں مجسٹریٹ گیارہ بجے تشریف لائے۔ مجسٹریٹ کے پہنچنے پر میرا بھیجا ہوا آدمی عدالت کے اندر داخل ہوا۔ اور اس نے میرا میڈیکل سرٹیفکیٹ مجسٹریٹ کو دیا۔ مجسٹریٹ نے سرٹیفکیٹ دیکھ کر خان بہادر عبدالرحمٰن کو دکھایا۔ اب مجسٹریٹ بھی پریشان اور خان عبدالرحمٰن بھی۔ مجسٹریٹ اس لئے کہ اس نے کام کے اعتبار سے دو ہفتے بالکل خالی رکھے تھے۔ اور یہ عرصہ صرف اس مقدمہ کے لئے ہی وقف کیا تھا۔ تاکہ مقدمہ ڈے ٹو ڈے (رہرروز) ہو کر استغاثہ کے تمام گواہ ختم کر دیئے جائیں اور کئی برس کا لٹکا ہوا مقدمہ جلدی ختم ہو۔ اور خان بہادر عبدالرحمٰن اس لئے کہ گواہوں کو دور دور سے منگایا۔ تمام اہتمام کیا۔ دو ہفتہ کے لئے دہلی کے مقدمات کی تاریخیں بدلوائیں اور ہوشنگ آباد رہنے کے لئے خیمے نصب ہوئے۔ خان بہادر عبدالرحمٰن نے کہا کہ دیوان سنگھ جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج کر ہمیں پریشان کرتا ہے۔ اور دہلی کے تار بتاتے ہیں کہ وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ والے روز شام کو سیر کے لئے اپنی موٹر میں پھر رہا تھا اور موٹر خود چلا رہا تھا۔ چنانچہ یہ تار بھی آپ نے عدالت میں پیش کر دیئے۔ اس پر مجسٹریٹ نے کہا کہ جس صورت میں سول سرجن دہلی کا سرٹیفکیٹ موجود ہے اس سرٹیفکیٹ پر کیوں اعتبار نہ کیا جائے۔ اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی تو فیصلہ یہ ہوا کہ خان بہادر عبدالرحمٰن حلفیہ بیان دیں کہ دیوان سنگھ بیمار نہیں ہے اور اس نے جھوٹا سرٹیفکیٹ بھیجا ہے۔ عدالت سول سرجن دہلی (جو اس صوبہ کا چیف میڈیکل آفیسر اور میجر اسپتال کا افسر تھا اس کا مجھے نام یاد نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کرنل

Marfat.com

ولسن تھے جو بعد میں سی۔پی کے انسپکٹر جنرل سول ہاسپٹلز مقرر ہوئے) کو بذریعہ تار دیوان سنگھ کا معائنہ کرنے کے لئے ہدایت کرے۔ چنانچہ سول سرجن کی فیس ایک سو روپیہ جبو پال والوں سے جمع کرائی گئی اور عدالت نے چیف میڈیکل آفیسر دہلی کو تار دیا کہ وہ بغیر اطلاع کے دفعۃً دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کا معائنہ کرے اور بذریعہ تار اس عدالت کو نتیجہ سے اطلاع دی جائے۔ یہ واقعہ گیارہ اور بارہ بجے دوپہر کے درمیان کا ہے۔

دوپہر کے تین یا چار بجے تھے میں دفتر کے اوپر کی منزل (جہاں میرا پرائیویٹ دفتر تھا) میں تھا۔ نیچے سے چپڑاسی آیا جس نے وزٹنگ کارڈ دیا۔ یہ کارڈ چیف میڈیکل آفیسر کا تھا۔ میں کارڈ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ ورنہ یہ حضرت تشریف لانے کی تکلیف نہ اٹھاتے میں نے چپڑاسی سے کہا کہ صاحب کو ساتھ لے آؤ۔ صاحب تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں مریضوں کا معائنہ کرنے والا ڈاکٹروں کا بیگ تھا۔ آتے ہی انہوں نے دیکھا کہ میں چارپائی پر لیٹا ہوں۔ ان کے اور میرے درمیان یہ بات چیت ہوئی:۔

سول سرجن: گڈ آفٹرنون۔

میں:۔ گڈ آفٹرنون!

سول سرجن:۔ کیا تکلیف ہے۔

میں:۔ درد گردہ ہے۔

سول سرجن:۔ کس کا علاج کر رہے ہو۔

میں:۔ ڈاکٹر چوپڑہ کا۔

سول سرجن:۔ کیا علاج کیا۔

میں:۔ پہلے مارفیا کا انجکشن دیا تھا پھر (نسخہ دکھا کر) یہ نسخہ پی رہا ہوں۔

سول سرجن:۔ دوائی کہاں ہے؟

میں نے دوائی والی شیشی جو وہاں پڑی تھی دے دی۔ اس کے بعد اس نے میری پشت کے نیچے یعنی گردہ والی جگہ کے اردگرد ٹٹولنا شروع کیا اور معائنہ شروع کیا۔ جب اس نے گردہ والی جگہ کو انگلیوں سے دبایا تو میں نے "سی" کیا۔ یعنی میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ معائنہ کرنے کے بعد پھر یہ گفتگو ہوئی:۔

سول سرجن:۔ تم لوگ اپنی صحت کی پروا نہیں کرتے۔ جسم کا وزن زیادہ ہے اس کو کم کرنا چاہیئے چربی جسم کی بڑھی ہوئی ہے۔

میں:۔ آپ کے خیال میں مجھے چربی کم کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

سول سرجن:۔ چربی اور گھی والی اشیاء اور مٹھاس بالکل چھوڑ دو اور ورزش کیا کرو۔

میں:۔ بہت اچھا۔ آپ کے خیال میں درد گردہ کا یہ نسخہ ٹھیک ہے۔

Marfat.com

سول سرجن :۔ ہاں ٹھیک ہے مگر اس میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے۔ میں نے نسخہ صاحب کو دیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اس میں ایک دوائی کا اور اضافہ کر دیا۔

میں :۔ اور کوئی ہدایت ۔

سول سرجن :۔ خوراک کا بہت خیال رکھو، سادہ اور زود ہضم کھانا کھایا کرو۔

میں :۔ کئی برس سے انگریزی کھانا کھاتا ہوں اور وہ صرف اس خیال سے کہ دیسی کھانا جلدی ہضم نہیں ہوتا اور چربی بڑھاتا ہے۔

سول سرجن :۔ آپ بہت اچھا کرتے ہیں ورزش بھی کیا کیجئے ۔

میں :۔ بہت اچھا، ایسا ہی کروں گا ۔ میں آپ کے مشورہ کا بہت شکر گزار ہوں ۔ کیا میں اب پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں گوارا کی !

سول سرجن :۔ مجھے مجسٹریٹ ہوشنگ آباد نے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کا معائنہ کروں ۔

میں :۔ تو آپ کی میری بیماری کے متعلق اب کیا رائے ہے ۔

سول سرجن :۔ آپ فی الحقیقت بیمار ہیں ۔

میں :۔ اور میں ہوشنگ آباد جانے اور سفر کے قابل نہیں ہوں ۔

سول سرجن :۔ بالکل نہیں ۔

میں :۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ ڈاکٹر ہیں ۔ ایک نیک پیشے سے تعلق رکھتے ہیں ، اور خدا کی مخلوق کو آپ سے فائدہ پہنچتا ہے ۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو میں اس پر آج ہی مکان میں ناجائز مداخلت کا فوجداری دعویٰ دائر کر دیتا کہ آپ میری اجازت کے بغیر تشریف کیوں لائے ۔

سول سرجن :۔ میں خود نہیں آیا ، ایک مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق آیا ہوں ۔ اور یہ خلافِ قانون نہیں ۔

میں :۔ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ اگر آپ یہاں دہلی کے مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق تشریف لاتے تو آپ کا آنا بلاشبہ خلافِ قانون نہ تھا ۔ مگر میں اور آپ ہوشنگ آباد کے مجسٹریٹ کی جورسڈکشن میں نہیں ۔ ہوشنگ آباد کا مجسٹریٹ میرے معائنہ کرنے کا جس صورت میں کہ میں دہلی میں ہوں حکم نہیں دے سکتا ۔ آپ کا آنا لازمی طور پر خلافِ قانون اور جرم ہے ۔

سول سرجن نے جب میرے یہ الفاظ سنے تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور اس نے محسوس کیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں قانونی اعتبار سے اس کے اندر جان ہے اور ہوشنگ آباد کے مجسٹریٹ کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کو لکھتا کہ وہ سول سرجن سے میرا معائنہ کرائے ۔ اور سول سرجن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق میرا معائنہ کرتا ۔

اس گفتگو کے بعد سول سرجن نے شریفانہ انداز سے اظہارِ افسوس کیا اور وہ واپس چلا گیا ۔ اس کے

Marfat.com

جانے کے بعد میں نے مسٹر بی۔ توکلی ایڈووکیٹ کو ٹیلیفون کیا۔ وہ تشریف لائے۔ تمام حالات سُنے تو وہ سول سرجن کی کوٹھی پر گئے۔ اور کہا کہ دیوان سنگھ سول سرجن کے معائنہ کے لئے آنے کو اپنی توہین محسوس کر رہا ہے، اور بہت غصہ میں ہے مگر وہ نہیں چاہتا کہ سول سرجن کے خلاف کوئی اقدام اُٹھائے۔ اور اگر وہ فی الحقیقت بیمار ہے جیسا کہ سول سرجن نے دیکھا تو بیماری کا سرٹیفکیٹ دے دیا جائے۔ سول سرجن نے مسٹر توکلی سے بھی اظہارِ افسوس کیا اور کہا کہ اس سے غلطی ہوئی۔ چنانچہ اس نے سرٹیفکیٹ دیا کہ دیوان سنگھ فی الحقیقت دردِ گردہ میں بیمار ہے اور ہوشنگ آباد جانے کے قابل نہیں۔

سول سرجن نے مجسٹریٹ ہوشنگ آباد کو بھی بذریعہ تار جواب دے دیا کہ دیوان سنگھ فی الحقیقت بیمار ہے۔ چنانچہ نواب بھوپال کے نمائندے اپنے خیمے لپیٹ کر اور کھانا پکانے والی دیگیں صاف کر کے واپس بھوپال تشریف لے گئے اور مقدمہ دو ہفتہ کے لئے پھر ملتوی ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ایڈیٹر "ریاست" نے دہلی کی عدالت سٹی مجسٹریٹ میں خان بہادر عبدالرحمٰن پر اس الزام میں فوجداری مقدمہ دائر کر دیا کہ آپ نے ایڈیٹر "ریاست" پر ہوشنگ آباد کی عدالت میں یہ الزام لگایا اور حلفیہ بیان دیا کہ دیوان سنگھ بیمار نہیں۔ یہ بہانہ کر رہا ہے اور دیوان سنگھ کا سول سرجن دہلی سے معائنہ کرا کر اس کی توہین کی گئی وغیرہ۔ یعنی اُدھر تو ہوشنگ آباد کے مقدمہ نواب بھوپال بنام دیوان سنگھ میں دیوان سنگھ ملزم اور دہلی کے مقدمہ دیوان سنگھ بنام خان عبدالرحمٰن میں نواب بھوپال کے وکیل خان بہادر عبدالرحمٰن ملزم۔ وکیل لوگ دوسروں کے مقدمہ بازی میں مبتلا ہونے کی صورت میں تو روپیہ خوب پیدا کرتے ہیں۔ اور مرغوں کی طرح قانونی لڑائیاں بھی مزے سے لڑتے ہیں۔ مگر جب یہ خود مقدمہ میں ملزم ہوں تو ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ اب کبھی تو توکلی صاحب کے پاس عبدالرحمٰن صاحب کے پیغامات آ رہے ہیں کہ مقدمہ واپس کراؤ، کبھی دیوان سنگھ کے دوستوں سے کہلوایا جا رہا ہے اور کبھی اور کوششیں ہو رہی ہیں۔ اِدھر ہم ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ اس طرح سے کئی روز گذر گئے تو دہلی کے ایک سینیئر وکیل مسٹر شیو نرائن (جو خان بہادر عبدالرحمٰن کے گہرے دوستوں میں سے تھے) کا خط توکلی صاحب کے پاس پہنچا جس میں لکھا تھا کہ عبدالرحمٰن صاحب اس مقدمہ کے باعث بیحد پریشان ہیں، مقدمہ واپس لے لیا جائے یہ ان پر احسان ہوگا۔ اور وہ ذاتی طور پر بھی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی کے ایک دوست مجسٹریٹ نے ایڈیٹر "ریاست" سے ذاتی تعلقات کی بنا پر درخواست کی کہ میں مقدمہ واپس لے لوں اور خان بہادر کو معاف کر دیا جائے۔ چنانچہ ان حالات میں عدالت سے درخواست کی گئی کہ میں مقدمہ واپس لیتا ہوں اور خان بہادر کو معاف کرتا ہوں۔

Marfat.com

خواب اور اُس کی تعبیر

خواب عام طور پر پیٹ بھر کر کھانے کے باعث زیادہ آتے ہیں۔ مگر پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا جائے۔ نصف رات گذرنے کے بعد خواب آئے اور وہ خواب دن کو یاد رہے تو یقیناً اس خواب کی تعبیر کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ خواب کے متعلق میں چند ذاتی واقعات اور تجربات بیان کرتا ہوں:۔

میں نے جب کبھی خواب میں سانپ کو دیکھا (بشرطیکہ رات کو سوتے وقت سانپوں کی باتیں نہ ہوئی ہوں اور ان باتوں نے ذہن پر اثر نہ چھوڑا ہو۔ جو خواب میں بھی خیال کی صورت میں قائم رہے) تو لازمی طور پر مجھے دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس خواب میں اگر میں نے سانپ کو کچل دیا تو اس کا نتیجہ دشمن پر فتح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اگر سانپ نے مجھے ڈس لیا تو دشمن نے مجھے نقصان پہنچایا۔ میں لاہور کے روزنامہ اخبار "پلتھ" کو ایڈیٹ کر رہا تھا۔ رات کو میں نے خواب میں سانپ کو دیکھا۔ اُس نے میرے کندھے پر ڈسا۔ اور ڈس کر بھاگ گیا جب یہ بھاگ کر اپنے بل میں گھس رہا تھا تو میں نے اُس کی دُم پکڑ لی۔ اور پھر اُس کے سر کو پکڑ کر اُسے کچل دیا۔ اس خواب کے بعد تیسرے روز مرحوم راجہ پٹیالہ نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ میرے مکان میں کوکین رکھوائی۔ مجھے گرفتار کرایا، مقدمہ چلا اور مقدمہ میں نہ صرف میں باعزت بری ہوا، اور مجھے فتح نصیب ہوئی۔ بلکہ مجسٹریٹ نے پٹیالہ کے خلاف سخت ریمارک بھی کئے اور یہ معاملہ گورنمنٹ ہند تک پہنچ کر مہاراجہ پٹیالہ کے لئے بہت ہی مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہوا۔

بھوپال کے مقدمہ ہوشنگ آباد سے ایک ہفتہ پہلے میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک چٹان پر کھڑا ہوں اور یہ دفعتاً یہ چٹان ہلنی شروع ہوئی۔ میری والدہ بھی قریب ہیں۔ اور والدہ نے گھبرائے ہوئے کہا۔ کہ یہ زلزلہ معلوم ہوتا ہے۔ اتنے میں چند جھٹکے آنے کے بعد چٹان کا ہلنا موقوف ہو گیا تو میں نے والدہ سے کہا ہاں زلزلہ تھا۔ اب کوئی بات نہیں زلزلہ بند ہو گیا ہے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد مقدمہ ہوشنگ آباد میں میری گرفتاری ہوئی اور گو یہ مقدمہ چھ سال تک جاری رہا اور کافی روپیہ اور وقت ضائع ہوا۔ مگر میں نے اس مقدمہ کی پرواہ نہ کی اور نہ مجھے کوئی تکلیف محسوس ہوئی۔

میں میر پور ماتھیلو (ضلع سکھر سندھ) میں تھا۔ رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں جا رہا تھا تو ایک دیوانہ کتا میرے پیچھے سے میرے قریب آگیا ہے وہ مجھے کاٹنا ہی چاہتا ہے کہ میں نے شور پیدا کر دیا۔ میرا شور سن کر قریب کا ایک شخص لاٹھی لے کر پہنچا اور اس نے دیوانے کتے کو ہلاک کر دیا

Marfat.com

اس خواب کے بعد اسی شام کا واقعہ ہے میں ریلوے کی پٹڑی پر سیر کے لئے جا رہا تھا تو دیکھا کہ ایک سانپ ہے۔ میرے پاس کوئی لکڑی نہ تھی۔ مگر قریب ہی ریلوے پھاٹک تھا جہاں چوکیدار کھڑا تھا۔ میں نے اس کو آواز دی کہ سانپ ہے، وہ لاٹھی لے کر بھاگا ہوا آیا۔ اور اس نے سانپ کو ہلاک کر دیا۔

مسٹر ڈی۔ ایم نرسنگا راؤ وزیر اعظم ریاست اندور نے مجھے بتایا کہ باؤلہ کے قتل کا واقعہ ابھی نہیں ہوا تھا۔ قتل کے واقعہ سے چند روز پہلے مہاراجہ نے خواب میں دیکھا کہ دشمن کی فوج فاتحانہ انداز میں اندور کے قلعہ کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس خواب کے چند روز بعد باؤلہ کا قتل ہوا اور مہاراجہ گدی سے اتار دیئے گئے۔

چند برس کا واقعہ ہے۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ شمشان بھومی (مردے جلانے کی جگہ) میں ہزار ہا لاشیں پڑی ہیں۔ اور مردے جلائے جا رہے ہیں۔ میں جب جاگا۔ تو اس وحشت ناک خواب کا ذہن پر بہت بڑا اثر تھا۔ میں نے دفتر میں ایک دو اصحاب سے کہا کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ چنانچہ اس خواب کے دو تین روز بعد ہی دہلی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور لوگ قتل کئے گئے۔

علاج کے لئے تشخیص کی ضرورت

کئی برس ہوئے مرحوم نظام دکن کے سابق ذاتی طبیب مرحوم حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری (حکیم نابینا صاحب جو مرحوم ڈاکٹر انصاری کے حقیقی بڑے بھائی تھے) موجودہ نظام دکن کے مظالم سے تنگ آ کر حیدر آباد سے دہلی چلے آئے اور یہاں آپ نے اپنا مطب جاری کر دیا۔ آپ کا یہ مطب اسپلینیڈ روڈ پر دفتر "ریاست" کے بالکل قریب تھا۔ جہاں ہر روز سینکڑوں مریض آتے۔ حکیم صاحب نے مرحوم لالہ لاجپت رائے اور مرحوم ڈاکٹر اقبال کا علاج کیا۔ جس کے باعث آپ کی شہرت شمالی ہندوستان میں بھی بہت کافی ہو گئی۔ کیونکہ ان دونوں لیڈروں کے علاج کا ذکر اخبارات میں ہوتا رہا۔

ایڈیٹر "ریاست" کے ایک رشتہ دار کا خط لائلپور سے آیا کہ ان کی بیوی ہسٹیریا میں مبتلا ہیں اور یہ حکیم نابینا صاحب کا علاج کرانا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جواب دیا کہ تشریف لائیے۔ چنانچہ یہ عزیز مع اپنی بیوی کے تشریف لے آئے اور میں ان کو حکیم صاحب کے پاس لے گیا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی، حالات پوچھے اور دیر تک تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا "سردار دیوان سنگھ ہمارے عزیز دوست ہیں کوئی فکر نہ کیجئے۔ علاج پورے غور سے

Marfat.com

کیا جائے گا جگر میں گرمی ہے۔ اور دماغ میں خشکی انشاء اللہ بہت جلدی بالکل اچھی ہو جائیں گی۔" ایڈیٹر "ریاست" ایک عرصہ تک میڈیکل پریکٹس کرتا رہا۔ اور وہ جانتا تھا کہ ہسٹیریا کو نہ دماغ کی خشکی سے تعلق ہے۔ نہ جگر کی گرمی سے۔ یہ نتیجہ ہے رحم میں اری ٹیشن کا۔ اس اری ٹیشن کا سبب چاہے کچھ ہی ہو، مگر نہ تو میں کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ کوئی میری سننے والا تھا کیونکہ ریاست حیدرآباد کے شاہی حکیم معالج اور چار سو میل دُور لائلپور سے آئے ہوئے معتقد مریض۔ حکیم صاحب نے تسلّی و تشفی دینے کے بعد نسخہ لکھا جو ایک سخت جلاب تھا۔ کیونکہ جس طرح عدالتوں میں جاؤ تو وہاں کی الف ب بلے کورٹ فیس سے شروع ہوتی ہے۔ حکیموں کے ہاں ہر بیماری کا علاج سخت قسم کے جلاب خصوصًا جمال گوٹے سے شروع کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ دوائی لے کر چلے آئے۔ حکیم صاحب کے تمام خاندان کے ساتھ ایڈیٹر "ریاست" کے گھرے دوستانہ مراسم تھے۔ حکیم صاحب نے نہ تو کوئی فیس لی اور نہ دوائی کی قیمت۔ گھر واپس آنے پر مریضہ نے دوائی کھائی۔ کئی دست آئے۔ اور مریضہ کو جہاں پہلے دن میں کئی بار ہسٹیریا کے غش آتے۔ دستوں کے آنے کے بعد یہ غش بالکل بند ہو گئے۔

جب غش بند ہو گئے تو مریضہ اور مریضہ کا شوہر بہت مطمئن و خوش کہ دوائی کیا تھی جادو تھا جو ایک دو خوراک میں ہی کئی برس کی بیماری دُور ہو گئی۔ یہ لوگ بہت خوش تھے مگر ایڈیٹر "ریاست" مطمئن نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہسٹیریا کا نہ دماغ کی خشکی سے کوئی تعلق ہے نہ جگر کی گرمی سے۔ اور اگر تعلق ہو بھی تو یہ کئی برس کی پُرانی "گرمی اور خشکی" دوائی کی ایک دو خوراک سے کیونکر دور ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ لوگ بہت ہی خوش۔ اور حکیم صاحب کے دستِ شفا کے پہلے سے زیادہ معتقد۔ چنانچہ مریضہ کے شوہر بازار گئے۔ انہوں نے وہاں سے ایک بہت بڑا تھال خریدا۔ یہ تھال گھنٹہ والے حلوائی کے ہاں سے مٹھائی خرید کر پُر کیا گیا۔ اور ان لوگوں نے اس مٹھائی کے ساتھ ایک سو روپیہ نقد رکھا۔ اور ہم اگلی صبح پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب ویسے تو ہر مریض کے ساتھ محبت و توجہ کے ساتھ پیش آتے۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" کے کرم فرما تھے۔ آپ نے مریضہ کی نبض کو دیکھا، اور دیر تک حالات پوچھنے کے بعد ارشاد فرمایا "پہلے سے دماغ کی خشکی اور دل کی گرمی میں بہت کمی ہے۔ اور مرض میں بہت کافی افاقہ ہے۔ انشاء اللہ تین چار روز میں قطعی آرام ہو جائے گا۔ دیوان سنگھ ہمارے عزیز ہیں، میں پوری توجہ سے علاج کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ بہت جلدی اور مکمل فائدہ ہو گا۔" ہم لوگ دوائی لے کر واپس آئے۔ اب حکیم صاحب نے جلاب نہیں دیا کوئی اور دوائی دی۔ جس کا علم ایڈیٹر "ریاست" کو نہیں، مگر خیال یہ ہے کہ یہ دوائی دماغ کی خشکی اور دل کی گرمی کے متعلق ہی ہو گی۔

اس دوائی کو کھائے دو روز ہوئے تھے کہ مریضہ کو پھر غش کے دَورے شروع ہو گئے۔ اور بالکل پہلے کی طرح دن میں کئی کئی بار۔ مریضہ اور اس کا شوہر پہلے تو خوش تھے مگر اب ان کے چہرہ پر کچھ تشویش اور حیرانی ظاہر ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم لوگ پھر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حکیم

Marfat.com

صاحب نے پھر نبض کو دیکھا اور پہلے کی طرح انشاء اللہ کہتے ہوئے پھر تسلی دی۔ اور کہا کہ جگر کی گرمی اور دماغ کی خشکی کا ابھی اثر باقی ہے، رفتہ رفتہ دُور ہو جائے گی۔ حکیم صاحب نے آج پھر پہلے جیسا والا جلاب دیا اور ہم واپس آ گئے۔

یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ جاری رہا۔ حکیم صاحب جلاب دیتے تو مریضہ کے غش مفقود ہو جاتے اور حکیم صاحب دوسری دوائی دیتے تو یہ غش پھر جاری ہو جاتے۔ ان غشوں کے آنے اور بند ہونے سے یہ لوگ بیچارے کبھی پریشان اور کبھی خوش۔ ایڈیٹر "ریاست" کی پوزیشن نازک۔ کیونکہ اگر ان لوگوں کو دوسرے ڈاکٹر کا علاج بدلنے کے لئے کہے تو شاید یہ لوگ بُرا مانیں۔ اور خیال کریں کہ میں ان حالات سے تنگ آ گیا ہوں۔ اور ان کو جانے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ چند روز کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں نے مریضہ کے شوہر سے کہا۔ کہ یہ طریقہ علاج غلط ہے۔ ہسٹیریا کوئی بیماری نہیں۔ یہ صرف رحم کی مختلف بیماریوں کا نتیجہ یا علامت ہے۔ جس طرح بخار خود کوئی بیماری نہیں، مختلف بیماریوں کا ایک نتیجہ ہے۔ مثلاً نمونیہ ہو تب بخار، تپ دق ہو تب بخار۔ ملیریا ہو تب بخار۔ اس طرح کسی وجہ سے بھی رحم میں انفکشن (خارش) ہو، ہسٹیریا ہو جاتا ہے۔ میرے اس سمجھانے پر یہ فیصلہ ہوا کہ سب سے پہلے تشخیص کرائی جائے اور کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا جائے تاکہ معلوم ہو کہ بیماری کیا ہے اور اس کے بعد علاج ہو۔ یہ علاج چاہے کسی اچھے ڈاکٹر کا ہو یا حکیم صاحب کا۔ اس زمانہ میں سول ہسپتال دہلی کے انچارج ڈاکٹر دینیق داس کپور تھے۔ جن کے ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ ذاتی دوستانہ تعلقات تھے۔ ان ڈاکٹر صاحب سے ایک تعارفی خط لیڈی ہارڈنگ زنانہ میڈیکل کالج کی پرنسپل (میرا خیال ہے کہ ان کا نام غالباً مس کیمبل تھا) کے نام لیا۔ ہم لوگ مریضہ کو لے کر لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج گئے۔ وہاں پرنسپل صاحبہ سے ملے انہوں نے دوسری ڈاکٹر بہنوں کے ساتھ مل کر مریضہ کو دیکھا۔ تو رحم پر ایک زخم تھا۔ اس زخم سے تھوڑا سا مواد لیا گیا۔ اور اس مواد کو خورد بین سے دیکھا گیا تو اس میں ایک پوشیدہ بیماری کے جراثیم تھے۔ چنانچہ بیماری کے پچھلے حالات سنے گئے تو معلوم ہوا کہ کئی برس ہوئے مریضہ کے شوہر ایک پوشیدہ بیماری میں مبتلا ہوئے۔ اس بیماری کے جراثیم ان کی بیوی میں منتقل ہوئے۔ ان جراثیم کے باعث ہی مریضہ کے رحم پر زخم ہوا۔ اور اس زخم میں جب اری ٹیشن ہوتی ہے تو مریضہ بیہوش ہو جاتی ہے جسے ہسٹیریا کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اور جلاب کا اثر یہ ہوتا کہ انتڑیاں جب صاف ہو جاتیں تو ان انتڑیوں کا بوجھ یا اثر رحم پر نہ پڑتا۔ رحم راحت محسوس کرتا اور مریضہ بیہوش نہ ہوتی۔

اس کے بعد لیڈی ڈاکٹروں اور ڈاکٹر کپور کے مشورہ سے مریضہ کے رحم کو دواؤں سے دھویا جاتا اور اس کے ساتھ ان کے شوہر کا علاج بھی شروع کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریضہ چند ماہ میں بالکل اچھی ہو گئی۔ اور اب یہ خاتون کئی بچوں کی ماں ہے۔

نئی سائنس نے علاج کے لئے تھرما میٹر، سٹیتھسکوپ۔ مائیکرسکوپ۔ ایکس رے۔ بلڈ پریشر

Marfat.com

کا آلہ۔ پیشاب دیکھنے کا آلہ اور اس قسم کے درجنوں دوسرے ذرائع پیدا کر دیئے جو بیماریوں کی تشخیص میں معاون و مددگار ہیں۔ ان ذرائع کی امداد سے محروم ہونا اور علاج سے پہلے اچھی طرح تشخیص نہ کرانا نہ صرف حماقت بلکہ بدنصیبی بھی ہے۔ اور درست طریقہ یہ ہے کہ ہر مرض کی پہلے اچھی طرح تشخیص کرائی جائے اور تشخیص کے بعد علاج چاہے کسی ڈاکٹر سے کرایا جائے، یا کسی حکیم اور وید سے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

والیانِ ریاست کی سازشیں

مرحوم مہاراجہ پٹیالہ بہت فیاض تھے اور فیاضی کے اعتبار سے اُن جیسا بلند کوئی نواب یا مہاراجہ نہ گذشتہ والیانِ ریاست میں پیدا ہؤا اور نہ ان کے دَور میں کوئی دوسرا تھا۔ آپ کی فیاضیاں نہ صرف عوام بلکہ والیانِ ریاست اور اُن کے رشتہ داروں اور عزیزوں تک وسیع تھیں۔

چنانچہ چھوٹے چھوٹے کئی والیانِ ریاست آپ سے امداد حاصل کرتے رہے اور والیانِ ریاست کے سینکڑوں عزیز و اقارب ایسے تھے جو مرحوم سے زندگی بھر وظائف پاتے رہے۔

مرحوم مہاراجہ پٹیالہ کی امداد یا ماہوار وظائف حاصل کرنے والوں میں سے مرحوم نواب مالیر کوٹلہ کے ایک قریبی عزیز بھی تھے جو نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے دل سے دشمن تھے۔ مگر ظاہرا طور پر نواب صاحب کی وفا شعاری کا دم بھرتے تھے۔ مہاراجہ اگر ان حضرات کی امداد کرتے تو صرف اس خیال سے کہ یہ ایک ریاست کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ صاحب جن کو خاندانی اعتبار سے نواب صاحب ہی کہا جاتا تھا۔ پٹیالہ میں اکثر آتے اور کئی کئی ماہ تک وہاں قیام کرتے۔

جب مہاراجہ پٹیالہ اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان کش مکش زوروں پر تھی اور مہاراجہ "ریاست" کے مضامین کو بند کرنے کے لئے اپنی تمام کوششیں صَرف کر چکے تو ان نواب صاحب نے مہاراجہ سے عرض کیا کہ "سرکار دیوان سنگھ کو کچلنا کیا مشکل ہے، میں انتظام کرتا ہوں کہ اُسے پٹیالہ لایا جائے اور پٹیالہ جیل میں عذاب دے دے کر ہلاک کیا جائے۔" چنانچہ ان نواب صاحب نے مہاراجہ سے دس ہزار روپیہ اخراجات کے لئے حاصل کیا اور آپ اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے۔

اُس زمانہ میں ایڈیٹر "ریاست" دریا گنج کی کوٹھی نمبر ۹ میں رہتا تھا۔ نواب صاحب نے اس کوٹھی کے بالکل قریب ہی وہ کوٹھی کرایہ پر لے لی۔ جس میں کسی زمانہ میں ایک با اثر مسلمان کانگرسی بیرسٹر رہتے تھے۔ (میں مرحوم بیرسٹر صاحب کا نام بھول گیا ہوں، میرا خیال ہے کہ ان کا نام مسٹر عبدالرؤف

Marfat.com

تھا) اس کوٹھی میں مقیم ہونے کے بعد یہ حضرت میرے پاس ملنے کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے اپنا تعارف کرایا کہ آپ نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے قریبی عزیز ہیں۔ نواب مالیر کوٹلہ بہت ظالم ہیں اور آپ مالیر کوٹلہ سے ہجرت کر کے دہلی میں آگئے ہیں۔ کیونکہ مالیر کوٹلہ میں آپ کی عزت و جان محفوظ نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے نواب صاحب مالیر کوٹلہ کی عیاشیوں کے ثبوت میں ایک خط بھی دیا یہ خط مالیر کوٹلہ کے ایک بڑے ہندو ڈاکٹر کی پوتی کا لکھا ہوا نواب صاحب کے نام تھا جو لاہور کے ایک زنانہ کالج سے لکھا گیا۔ اور اس میں نواب صاحب کی محبت کا ذکر تھا اور یہ بھی خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ نواب صاحب اس لڑکی کو اپنی زندگی کا باقاعدہ ساتھی بنالیں ورنہ وہ مجبور ہو گی کہ نواب صاحب سے تعلق منقطع کر کے کسی دوسرے کے ساتھ چلی جائے۔

میں نے زندگی بھر یہ کوشش کی کہ "ریاست" میں کبھی کوئی ایسا مضمون شائع نہ ہو جس میں اشارتاً بھی کسی خاتون کے کیریکٹر پر حملہ کیا گیا ہو۔ یہ خط تو پنجاب کے ایک بہت بڑے معزز خاندان کی لڑکی کا تھا۔ اس کا "ریاست" میں شائع ہونا کیونکر ممکن تھا۔ اس خط کو دیکھنے کے بعد مجھے اس لڑکی اور لڑکی کے والدین کی عزت کے متعلق کئی بار خیال آیا۔ تین چار روز کی ذہنی کشمکش کے بعد میں نے لڑکی کے دادا کو ایک رجسٹری خط لکھا جس میں یہ الفاظ تھے:

"آپ کی پوتی کا ناجائز تعلق نواب صاحب سے ہے۔ اور جو حالات میرے پاس پہنچے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی اپنے مستقبل سے لاپروا ہو کر آپ کی عزت کو بھی مٹی میں ملانے والی ہے۔ میری رائے ہے کہ اس لڑکی کی کہیں شادی کر دو اور اسے موقع نہ دو کہ یہ نواب صاحب سے خط و کتابت کر سکے یا مل سکے آپ اطمینان رکھئے، میں اس لڑکی کے کیریکٹر کے متعلق اخبار میں کچھ لکھنا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔"

میں نے رجسٹری خط اس لئے بھیجا کہ یہ خط ان ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر معلوم ہوا کہ آپ چند روز بعد ہی نواب صاحب کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

یہ نواب صاحب پہلی ملاقات کے دو روز بعد پھر تشریف لائے۔ بہت محبت و اخلاص کا اظہار کیا۔ ایک گھنٹہ تک باتیں کرنے کے بعد ارشاد کیا کہ میں رات کو کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ چنانچہ رات کو میں کھانا کھانے کے لئے اُن کی کوٹھی حاضر ہوا۔ شاہانہ ٹھاٹھ۔ ایک نوخاندانی نواب دوسرے مہاراجہ پٹیالہ کا رد یہ۔ میز پر قسم قسم کی شرابیں۔ نواب صاحب کے گھر کی تین چار نوجوان اور خوبصورت خادمائیں (جن کی حیثیت لونڈیوں کی تھی) بے پردہ کمرہ میں اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں اور یہ میز پر کھانا لانے میں مصروف ہیں۔ نواب صاحب کبھی کبھی ان لڑکیوں میں سے کسی کسی سے فحش مذاق بھی کر لیتے ہیں۔ اور لڑکیاں مسکرا کر چلی جاتی ہیں۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے نواب صاحب نے ارشاد

Marfat.com

کیلئے تیار ہو گئے۔ میں نے دو تین بار انکار کیا، اور جب بار بار زور دیا گیا تو میں نے کہا۔ کہ اچھا صرف نصف پیگ برانڈی۔ نواب صاحب یہ سن کر حیران ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں غٹ ہو جاؤں گا۔ اور وہ اپنی سکیم کو عملی صورت دے سکیں گے۔

شراب کے متعلق بعض اصحاب کو میرے متعلق بہت غلط فہمی ہے۔ میرے بعض مہمان ایسے آتے ہیں جو بوتلوں کی بوتلیں ختم کر سکتے ہیں۔ اور ان دوستوں کی اس پوزیشن کے باعث بعض اصحاب مجھے بھی انہی سٹینڈرڈ کا "پیاک" سمجھتے ہیں۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے اور میرے حالات سے میرے تمام گھر کے دوست واقف ہیں کہ مجھے شراب سے فطرتاً نفرت ہے۔ میں چھ چھ ماہ یا ایک ایک سال تک شراب کو چھوتا تک نہیں۔ سردیوں میں جب زیادہ کام کے باعث تھکاوٹ محسوس کروں تو رات کو کھانا کھانے سے پہلے ایک اونس کے قریب برانڈی سوڈے میں ملا کر پی لیا کرتا ہوں۔ یا کبھی زکام ہوا تو ایک اونس برانڈی گرم پانی میں ملا کر پی لی، جس سے نصف گھنٹہ میں ہی اچھا ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ برانڈی کی ایک بوتل بعض اوقات میرے لئے تو ایک ایک سال تک کام دیتی ہے۔ مگر کوئی پینے والا دوست تشریف لے آئے تو اسے دو گھنٹہ میں ہی ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ شراب کے متعلق میری فی الحقیقت اور ایمانداری کے ساتھ پوزیشن یہی ہے۔ میں نہ تو شراب پینے کے حق میں ہوں اور نہ اس سے ایسا بدکتا ہوں جیسے مذہبی لوگ بدکتے ہیں۔

نواب صاحب کی سکیم یہ تھی کہ وہ کسی روز مجھے شراب میں غٹ کر کے اپنی موٹر میں ڈال لیں گے مجھے اسی حالت میں ہی مہاراجہ پٹیالہ کے حضور پیش کیا جائے گا۔ پھر مہاراجہ جو چاہیں اپنے دشمن کے ساتھ سلوک کریں۔ اسی سکیم کے لئے وہ دس ہزار روپیہ پیشگی لائے اور بعد میں جتنے روپیہ کی ضرورت ہو منگا سکتے ہیں۔

نواب صاحب کی اسی پہلی دعوت کے بعد ہی میں نے پٹیالہ میں ایک دوست کو خط لکھا۔ جو مہاراجہ کے علاقہ میں رہتا تھا اور پبلک سپرٹ سے متاثر ہو کر مجھے اطلاعیں دیا کرتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ نواب صاحب کیسے آدمی ہیں۔ انہوں نے معلوم کرنے کے بعد مجھے اطلاع دی کہ ان حضرت کی سکیم ایڈیٹر ریاست کو دہلی سے پٹیالہ لانے کی ہے۔ اور پرائیویٹ سکرٹری کے دفتر سے دس ہزار روپیہ پیشگی لے گئے ہیں۔ اس اطلاع کے ملنے کے بعد میں بہت محتاط ہو گیا اور یہ جب کبھی ملتے ہیں ویسے تو ان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا تاکہ یہ تاریکی میں رہیں، اور یہ سمجھیں کہ مجھے کوئی علم نہیں مگر مجھے ان سے دلی نفرت ہو گئی۔

پہلی دعوت میں صرف کھانا تھا اور نواب صاحب کی خواہش تھی کہ میں بے تکلف ہو جاؤں اور ان کی خادماؤں سے بار بار گندہ مذاق کرنے سے تو خیال ہوتا تھا کہ شائد وہ مجھے بھی اس سلسلہ میں بے تکلف اور اپنے ساتھ شریک کر لینا چاہتے ہیں۔ کھانا بہت پر تکلف اور نوابی وضع کا تھا یعنی دیسی و انگریزی دونوں قسم کی ڈشیں۔ کھانے کے بعد مالیر کوٹلہ، پٹیالہ اور دوسری ریاستوں کا

Marfat.com

ذکر رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں واپس آگیا اور میرے شراب میں مخمور نہ ہونے کے باعث نواب صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کھوئے کھوئے سے ہیں اور مایوسی محسوس کر رہے ہیں۔

اس دعوت کے بعد مجھے پھر دعوت دی گئی۔ اس سے پہلے میرے پاس ان نواب صاحب کی سکیم کی اطلاع پٹیالہ سے پہنچ چکی تھی، اور میں بہت محتاط تھا مگر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا تاکہ دیکھوں یہ کیا کرتے ہیں۔ اس دوسری دعوت کے متعلق آپ نے بہت زور دیا۔ میں مصروفیت کے بہانہ سے انکار کرتا رہا۔ آخر آپ نے جب کئی بار آکر تنگ کیا تو میں نے اس شرط پر دعوت میں حاضر ہونے کا اقرار کر لیا کہ اگر لالہ امیر چند کھنہ وغیرہ دو تین اور دوستوں کو بھی دعوت دی جائے۔ تاکہ گپ بازی میں زیادہ لطف ہو۔ نواب صاحب کو کیا انکار تھا۔ لالہ امیر چند کھنہ کو بھی مدعو کیا گیا دوسرے جو دوست آئے ان کے متعلق مجھے یاد نہیں رہا کہ کون تھے۔ یہ دعوت پہلے سے بھی زیادہ پر تکلف تھی۔ اور نواب صاحب نے گانے کے لئے مالیر کوٹلہ کی ایک طوائف اور سازندوں کو بھی منگا رکھا تھا۔ اس طوائف کا نام غالباً نوابن یا نواب بیگم تھا جو دہلی کے چاوڑی بازار میں "پریکٹس" کرتی تھی اور میرا خیال ہے یہ بغیر کسی فیس یا معاوضہ کے منگائی گئی۔ کیونکہ والیان ریاست اور ان کے رشتہ دار اپنی رعایا سے مفت کام لینا تو ان پر ایک قسم کا احسان سمجھتے ہیں۔ اس دعوت پر بھی وہی تھوڑی سی "توپیو اور کچھ تو پیو" کا اصرار، اور میرا وہی انکار۔ کھانے کے بعد نوابن کا گانا ہوا اور ہم لوگ واپس آئے۔ نواب صاحب کو مایوسی ہوئی۔ ایک تو میں نے شراب نہ پی، دوسرے میرے ساتھ لالہ امیر چند کھنہ وغیرہ تھے۔

اس دعوت کے بعد نواب صاحب کئی ماہ دہلی میں رہے اور مجھ سے اکثر ملا کرتے اور دعوت پر آنے کے لئے کہتے۔ مگر میں ہمیشہ ہی انکار کرتا رہا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا:-

"نواب صاحب! آپ کی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نہ میں شرابی ہوں کہ میں بیوقوف بن کر بے ہوش ہو جاؤں۔ اس کے علاوہ بہت محتاط ہوں۔ آپ مجھے پٹیالہ نہیں لے جا سکتے۔ اگر آپ باز نہ آئے تو یہ غیر ممکن نہ ہوگا کہ آپ کی نوابیت دھری رہ جائے اور آپ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کے جرم میں دہلی کے کسی تھانہ کی حوالات میں بند ہوں۔"

نواب صاحب میرے یہ خلاف توقع الفاظ سن کر حیران اور ناراض سے ہو گئے۔ اور میری "غلط فہمی" کا شکوہ کرنے لگے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد نواب صاحب تشریف نہیں لائے۔ میرے اس کہنے کے دو تین روز بعد ہی دہلی سے واپس پٹیالہ چلے گئے۔

اس واقعہ کے بعد نواب صاحب سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں ایک جرنلسٹ کے متعلق سنٹرل اسمبلی میں سوالات دریافت کرانے کے لئے سردار سنت سنگھ ممبر اسمبلی سے ملنے لائلپور جا رہا

Marfat.com

تھا تو اتفاق سے آپ ریلوے اسٹیشن لاہور پر مل گئے مجھے دیکھ کر ویسے تو تپاک کے ساتھ بغلگیر ہوئے مگر اُن کا چہرہ ظاہر کر رہا تھا کہ بہت نادم ہیں۔

میرا یقین ہے کہ اگر مجھے شراب کی لت ہوتی تو میں یقیناً اس سازش میں نواب صاحب کے پھندے میں گرفتار ہو کر اُس وقت پٹیالہ جیل میں ہوتا۔ اور نہ معلوم مرحوم مہاراجہ پٹیالہ انتقام کے جذبات کے باعث میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔

گُناہوں کی سزا

پچاس ساٹھ برس کا عرصہ ہؤا دہلی میں اُردو زبان کے جو بہترین اخبارات تسلیم کئے جاتے تھے۔ اُن میں "کرزن گزٹ" کو بہت بلند پوزیشن حاصل تھی۔ اس اخبار کے ایڈیٹر مرزا حیرت تھے۔ دنیا آگے نکل گئی اور "کرزن گزٹ" دنیا کے ساتھ نہ چل سکا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ "کرزن گزٹ" بند ہو گیا۔ جس طرح چور چوری چھوڑ دے۔ ہیرا پھیری کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ایک جرنلسٹ کے لئے بھی یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اخبارات سے تعلق منقطع کر کے علیحدگی کی زندگی بسر کرے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ایک جرنلسٹ نے زندگی میں کئی کئی بار اخبار جاری کئے اور ناکام ہو کر ان کو بند کر دیا۔ مگر اخبار جاری کرنے اور پھر بند کر دینے کا یہ سلسلہ جاری ہی رہا، اور سال دو سال بعد نیا اخبار پھر جاری کر دیا گیا۔ مرزا حیرت بوڑھے ہو چکے تھے۔ آپ کا ذریعہ معاش دریبہ میں دہسپتال کی طرف سے دریبہ میں جاتے ہوئے بائیں طرف کو دس بارہ دکانیں چھوڑ کر آپ کی دکان تھی) کتابوں کی دکان تھی۔ مگر آپ کا اخبار جاری کرنے یا جاری رکھنے کا "مَرَض" پورا نہ ہؤا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں جب کہ "ریاست" کا دفتر سڑک پریڈ پر تھا مرزا حیرت "درہ عمر" کے نام سے ایک روزانہ اخبار نکالتے تھے۔ یہ اخبار چھوٹے سائز کے چار صفحہ کا تھا۔ اور اس کی قیمت غالباً ایک پیسہ تھی۔ مرزا حیرت کے اس اخبار "درہ عمر" میں خواجہ حسن نظامی کے خلاف بھی مضامین شائع ہوتے۔ خواجہ حسن نظامی کی مکاریوں کو بہت بُری طرح سے بے نقاب کیا جاتا، اور خواجہ صاحب نے بہت کوشش کی کہ مضامین کا یہ سلسلہ بند ہو جائے۔ مگر یہ بند نہ ہؤا۔ چنانچہ خواجہ صاحب اس اخبار سے بہت ہی تنگ آ گئے۔

دفتر "ریاست" مرزا حیرت کی دکان کے بالکل قریب تھا۔ یعنی ان دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی تھی جو ایک طرف تو سڑک پریڈ پر نکلتی تھی اور دوسری طرف دریبہ میں۔ اس زمانہ میں ایڈیٹر "ریاست" اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان گھرے تعلقات تھے اور خواجہ حسن نظامی ہفتہ میں دو تین بار "دفتر ریاست" میں تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز خواجہ صاحب آئے تو اُن کے ساتھ دو نوجوان خوب صورت لڑکے بھی تھے۔ یہ لڑکے اس زمانہ میں خواجہ

Marfat.com

حسن نظامی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لوگوں میں ان لڑکوں کے متعلق بہت چرچا تھا۔ اور یہ لوگ اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی کے چال چلن پر بھی الزام لگاتے۔ مگر یہ الزامات قطعی بے بنیاد اور غلط تھے اور راقم الحروف کو ذاتی واقفیت ہے کہ خواجہ حسن نظامی خلاف وضع فطری شراب، زنا یا اس قسم کی چال چلن کے متعلق تمام کمزوریوں سے بلند تھے۔ خواجہ حسن نظامی ان دونوں لڑکوں کے ساتھ دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ یہ سب آپس میں کچھ دیر مشورہ کرتے رہے۔ مشورہ کے بعد یہ دونوں لڑکے مرزا حیرت کی دکان پر گئے۔ اور انہوں نے بازار میں کھڑے ہو کر مرزا حیرت پر جوتا پھینکا۔ مرزا حیرت دکان کے اندر بیٹھے تھے۔ یہ دونوں لڑکے جوتا پھینک کر واپس دفتر "ریاست" میں بھاگ آئے۔ واپس آنے کے بعد یہ اپنی کارگزاری پر بہت خوش تھے اور خواجہ حسن نظامی نے بھی ان کو ان کی اس بہادری پر داد دی۔ ایڈیٹر "ریاست" کو اس واقعہ کا ان کے واپس آنے پر علم ہوا۔ یہ حالات سن کر ایڈیٹر "ریاست" کو بہت افسوس ہوا۔ مگر اخلاقی جرأت نہ ہونے کے باعث اس نے نہ تو افسوس کا اظہار کیا اور نہ ہی اس غنڈہ پن پر ملامت کی بلکہ حالات سن کر نیم دل کے ساتھ یہ بھی مسکرا دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس ننگ اخلاق واقعہ کو اگر یہ پسند نہیں کرتا تو دوستانہ تعلقات کے باعث اس پر ملامت بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ان لڑکوں نے بیان کیا کہ مرزا حیرت پر جب جوتا پڑا تو مرزا حیرت حیران تھے اور مرزا صاحب کے دکان سے باہر نکلنے یا شور پیدا کرنے سے پہلے یہ وہاں سے بھاگ آئے۔

ویسے تو خواجہ حسن نظامی کے بلند نہ ہونے کے سلسلہ میں ایڈیٹر "ریاست" کو کئی دوسرے واقعات کا بھی تجربہ تھا۔ مگر اس واقعہ کا تو دل پر بہت ہی برا اثر ہوا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس واقعہ کے بعد گو ایڈیٹر "ریاست" اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان گہرے تعلقات رہے مگر ان تعلقات میں عزت واحترام کے جذبات نہ تھے۔ کیونکہ کیریکٹر کے اچھے یا برے ہونے کا اثر انسان کے گھر والوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ برے لوگوں کے عزیز و اقارب بھی ان کو عزت واحترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اور اچھے لوگوں کے کیریکٹر کے دشمن بھی مدّاح ہوتے ہیں۔

یہ واقعہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ اس واقعہ کے انیس برس بعد یعنی ۱۹۴۵ء میں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ اجمیری دروازہ کے باہر عربک کالج میں ہونے والا تھا۔ یہ جلسہ محب الوطن مسلمانوں کے خلاف تھا۔ اور محب الوطن مسلمانوں کی خواہش تھی کہ یہ جلسہ کامیاب نہ ہو۔ چنانچہ کالج کے دروازے سے باہر سڑک پر احراری وغیرہ محب الوطن والنٹیر لوگوں کو جلسہ میں جانے سے روک رہے تھے اور بتا رہے تھے اس جلسہ کی اصل غرض کیا ہے۔ اتنے میں پروگرام کے مطابق خواجہ حسن نظامی بھی موٹر میں تشریف لائے۔ کیونکہ آپ جلسہ میں تقریر کرنے والے تھے۔ خواجہ حسن نظامی تقریریں کرنے کے لیئے دہلی میں مشہور تھے۔ یہاں کے لوگ ان سے ہر جلسہ میں تقریریں کرا لیا کرتے۔ یہ جلسہ چاہے آریہ سماجیوں

Marfat.com

کا ہونا - اکالیوں کا - سناتن دھرمیوں کا - انگریزوں کے خوشامدیوں کا یا انگریزوں کے مخالفین کا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی جلسہ کے لئے کوئی تقریر کرنے والا نہ ملتا، تو یہ حضرت تقریر کے لئے ضرور آجاتے اور ان سے جس قسم کی چاہتے تقریر کرا لیتے ان بچاروں نے کبھی انکار نہ کیا) جب آپ کالج کے دروازے پر پہنچے تو لوگوں میں جلسہ کے خلاف بہت جوش تھا۔ پبلک خواجہ حسن نظامی کی ابن الوقتیوں پرو برٹش پالیسی اور ننگ حریت حرکتوں سے پہلے ہی تنگ تھی۔ لوگوں نے خواجہ حسن نظامی کو کار میں دیکھا تو اس میں سے اترنے نہ دیا۔ ان کو کار میں ہی جوتیاں لگائیں، ان کے منہ پر تھوکا اور زمین سے مٹی اٹھا کر ان کے منہ اور سر پر ڈال دی۔ خواجہ حسن نظامی چونکہ انگریزوں کے خوشامدی تھے ان کو حکام پر بہت ناز تھا۔ یہ کار لے کر کالج کے دروازے سے بھاگ گئے اور اجمیری دروازہ کے پاس ایک جگہ پہنچے جہاں ٹیلی فون تھا۔ ٹیلی فون پر انہوں نے حکام اور پولیس کو اطلاع دی کہ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ پولیس موقع پر پہنچی - خواجہ حسن نظامی پولیس کا انتظار فرما رہے تھے اتنے میں حملہ کرنے والے لوگ جلسہ میں گڑبڑ پیدا کر کے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ پولیس اب گرفتار کرے تو کس کو۔ اب خواجہ حسن نظامی بھی اسی طرح ہی ٹھنڈے ہو کر صبر کرتے ہوئے اپنے گھر کو تشریف لے گئے۔ جس طرح مرزا حیرت نے انیس برس پہلے خواجہ حسن نظامی کے جوتیوں والے حملہ پر صبر کیا تھا۔

ایڈیٹر "ریاست" نہیں کہہ سکتا کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس مسئلہ پر غور کرنے کی نہ فرصت ہے نہ قابلیت۔ اور وہ نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ سزا اور جزا دینے والا کون ہے۔ مگر یہ اپنے پچھلے تجربوں کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ ظلم کی سزا یقیناً ملتی ہے۔ یہ چاہے فوراً ملے یا کچھ عرصہ کے بعد (یا شاید اگلے جنم یعنی مرنے کے بعد بھی) اور یہ ہو نہیں سکتا کہ گناہوں کی سزا سے انسان بچ سکے۔

والیانِ ریاست کا روپیہ اور پبلک خدمت

میری مالی حالت ہمیشہ ہی کمزور رہی۔ اور پچھلی تمام زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں جبکہ میں مقروض نہ تھا۔ چنانچہ میری مالی کمزوریوں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ مرحوم لالہ رام رچھپال سنگھ، شیدا ایڈیٹر "ہندوستان" لاہور میرے ہاں مقیم تھے۔ مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے تھے، جیسی بزرگ اپنے بچوں یا چھوٹے بھائیوں سے۔ اور محبت و شفقت کے ان جذبات کے باعث ہی وہ کئی کئی ماہ تک میرے پاس رہا کرتے۔ میں نواب بھوپال والے مقدمہ کی پیشی کے لئے ہوشنگ آباد جانے والا تھا اور سامان باندھا جا رہا تھا۔ مسٹر پوتھن جوزف ایڈیٹر "ہندوستان ٹائمز" بھی

Marfat.com

ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ شیدا صاحب نے بزرگانہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: "تم گاڑی میں احتیاط سے رہا کرو، خصوصاً جب ٹرین بھوپال کے علاقہ سے گذرے تو اپنا ریوالور جیب میں رکھنا۔ ان والیانِ ریاست کا کوئی اعتبار نہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی حملہ کر دے"۔

شیدا صاحب کے یہ الفاظ سُن کر مسٹر پوتھن جوزف نے مسکراتے ہوئے کہا "شیدا صاحب! اطمینان رکھیئے۔ دیوان سنگھ کو نہ تو نواب بھوپال مار سکتا ہے نہ اُس کے آدمی۔ اس کو تو اگر کوئی مار سکتا ہے تو دیوانی عدالتوں کے پیادے ہی مار سکتے ہیں، جو دیوانی مقدمات کے سمن اور قرقیاں لایا کرتے ہیں"۔

مسٹر جوزف کا مطلب یہ تھا کہ دیوان سنگھ پر والیانِ ریاست کے مقدمات اور حملے کوئی اثر نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے پریشان کُن ہیں تو دیوانی عدالتوں کے لینے دینے کے مقدمات۔

میری مالی پریشانیوں کی وجہ کیا ہے۔ عام لوگ تو شائد نہ جانتے ہوں مگر مجھ سے واقف حلقہ جانتا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں روپیہ سے محبت نہیں کرتا۔ میری فطرت روپیہ جمع کرنے کے خلاف ہے۔ میں اپنی ہر شے کو دوستوں اور ضرورت مندوں کی خدمت پر صَرف کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی دوست یا ضرورت مند روپیہ طلب کرے، اور روپیہ میرے پاس ہو تو میں انکار نہیں کر سکتا اور میں عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے نہ تو ماضی کو سامنے رکھتا ہوں اور نہ مستقبل کو۔ اور روپیہ پیسہ کے معاملہ میں اگر میں غور کر سکتا ہوں تو صرف حال کے زمانہ پر۔ چنانچہ میں نے اپنی زندگی میں اپنے کاروبار کے لئے اتنی محنت کی کہ شائد کسی جرنلسٹ نے نہ کی ہوگی، اتنا روپیہ پیدا کیا کہ کسی اخبار نویس نے نہ کیا ہوگا۔ اور اتنا روپیہ صَرف کیا کہ بہت کم اخبارات کے ایڈیٹروں کو اس کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اور آمدنی اور خرچ کا تو اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ "ریاست" میں چالیس چالیس صفحہ کے مستقل اشتہارات رہے۔ جن سے ہر ہفتہ ہزار ہا روپیہ کا ریلوے ویو وصول ہوتا، اور تجارت کے ذریعہ حاصل کی گئی اس مستقل آمدنی کے علاوہ اگر مجھے کبھی روپیہ کی دفعتاً ضرورت ہوئی تو میرے دوستوں نے کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ اور ان دوستوں میں والیانِ ریاست، ریاستوں کے وزراء، کانگرسی لیڈر، صوبہ جات کے وزراء، وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر اور انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس جیسی پبلک کی نمائندہ آرگنزیشین بھی شامل تھی اور گو مالی دقتیں ہمیشہ رہیں مگر میرا کام کبھی نہ رُکا۔ اور قدرت نے یا میرے ستاروں نے (جوتش کے مطابق منگل کا ستارہ میرے لئے ہمیشہ مالی اور دوسری پریشانیاں پیدا کرتا ہے اور برہسپت ہمیشہ ہی میری مشکلات آسان کرتا ہے) میری ہمیشہ امداد کی۔ اور خرچ کے اعتبار سے یہ کہنا کہ فلاں ضرورت مند کو یہ دیا اور فلاں دوست کو یہ دیا کمینہ پن ہوگا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض دوستوں اور ضرورت مندوں کے لئے بیس بیس اور پچیس پچیس ہزار روپیہ بھی صَرف ہوا۔ اور میرے اندازہ کے مطابق "ریاست" کی آمدنی میں سے اب تک پچاس ہزار روپیہ سے زیادہ تو ڈاکٹروں اور کیمسٹوں

Marfat.com

کی جیب میں گیا۔ جو دوستوں اور ضرورت مندوں کا علاج کرتے رہے۔ اتنا روپیہ صرف کرنے کا میرے ذہن پر کیا اثر ہوا۔ اس کے متعلق اگر میری زبان پر یقین کیا جائے تو میں ایمان داری کے ساتھ سچ کہتا ہوں کہ روپیہ صرف کرتے ہوئے مجھے وہ اطمینان و مسرت نصیب ہوتی رہی جو شائد خدا کی عبادت میں اولیاء اللہ کو اور ممالک فتح کرنے میں بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اتنی آمدنی اور اتنے مصارف کے ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنی ذات پر کیا کچھ صرف کیا، اس کا اندازہ تو اسی سے ہی کر لیجئے کہ میں کرایہ کے مکان میں رہتا ہوں۔ زندگی میں اپنے لئے ایک کوٹھڑی بنانا بھی نصیب نہ ہوا۔ کئی کئی ہفتہ نہیں کئی کئی ماہ تک بازار کے تنوروں اور ہوٹلوں سے روٹی منگا کر کھا لیتا ہوں اور کیش بکس میں شام کو دو تین یا چار روپیہ سے زیادہ کبھی بھی نصیب نہ ہوئے۔

مسٹر امرت لال سیٹھ ایڈیٹر روزانہ گجراتی اخبار "جنم بھومی" انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ اور آپ نے ریاستوں کی رعایا میں بیداری پیدا کرنے کے اعتبار سے ملک کی بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ آپ کے دل میں "ریاست" اور ایڈیٹر "ریاست" کے لئے ہمیشہ عزت و محبت کے جذبات رہے۔ آپ محسوس کرتے کہ "ریاست" نے شمالی ہند کی ریاستوں کی پبلک میں بیداری پیدا کرنے کے اعتبار سے ملک کی خدمت انجام دی ہے۔ اور آپ کی کوشش ہوتی کہ ایڈیٹر "ریاست" ہر کمزوری سے بلند رہ کر پبلک کی خدمت انجام دے۔ چنانچہ راقم الحروف ایک بار بمبئی میں تھا۔ وہاں ایک پرائیویٹ صحبت میں انڈین سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے چند لیڈر موجود تھے۔ چائے پر باتیں ہو رہی تھیں، تو باتوں باتوں میں مسٹر امرت لال نے کہا:-

> "ریاستوں کے ورکرز کے لئے مناسب ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی کسی والیئے ریاست سے چاہے وہ کتنا بھی دوست کیوں نہ ہو کسی قسم کی کوئی امداد نہ لیں۔"

مسٹر امرت لال نے تو یہ بات ویسے ہی نصیحتاً کہی۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ جو لیڈر اور پبلک ورکرز ریاستوں میں بیداری پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں، وہ والیانِ ریاست سے روپیہ لیتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ امرت جی لال کا روئے سخن شائد میری طرف ہو۔ میں نے کہا۔

> "امرت لال جی! اگر آپ کا روئے سخن میری طرف ہے۔ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ آپ نے تو پبلک خدمت پبلک کے روپیہ کے ساتھ کی یعنی پبلک کی جیب سے چندے لے کر۔ اور ہم نے پبلک خدمت کی بعض دوست والیانِ ریاست کی جیب سے روپیہ لے کر۔ آپ ہمیں بددیانت تب کہیں اگر ہم اس روپیہ سے اپنی کوئی ذاتی جائداد بناتے ہوں، یا روپیہ اپنی ذات پر صرف کرتے

Marfat.com

ہوں۔ والیانِ ریاست کی جوتیاں اور روالیانِ ریاست کا سر۔ اس میں کیا حرج ہے۔ اگر مہاراجہ نابھہ جیسے معزول محبُ الوطن اور دوست والیئے ریاست سے روپیہ لیا اور یہ روپیہ مہاراجہ پٹیالہ جیسے ظالم والیئے ریاست کے مظالم کو بے نقاب کرنے پر صرف کر دیا۔ آپ ہی بتا دیئے کہ پبلک سے روپیہ لے کر پبلک پر خرچ کرنے والا شخص ملک کی زیادہ خدمت کرتا ہے یا والیانِ ریاست سے روپیہ لے کر پبلک پر خرچ کرنے والا شخص زیادہ خدمت انجام دیتا ہے۔"

میرے اس جواب کو سن کر تمام دوست قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ مسٹر امرت لال بھی ایک حد تک لاجواب ہوگئے اور آپ نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"میں یہ بات عام ورکرز کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ کیوں کہ اگر ہمارے ہاتھ بالکل پاکیزہ ہوں تو ہمارے کام کا پبلک پر زیادہ اثر ہوگا اور ہم پبلک میں زیادہ بیداری پیدا کر سکیں گے۔"

مسٹر امرت لال میرے حالات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اگر میں کسی دوست والیئے ریاست سے روپیہ لیتا ہوں تو یہ روپیہ یا تو اخبار کے کام آتا ہے یا اس روپیہ سے میں دوستوں اور ضرورت مندوں کی خدمت کرتا ہوں۔ میں اپنی ذاتی جائداد نہیں بناتا۔ ان وجوہ کے باعث ہی وہ ہمیشہ میری کمزوریوں کو نظر انداز کرتے رہے۔ اور ان کے اخلاص و محبت میں کبھی کمی نہ ہوئی۔

میں ۱۹۴۳ء میں نظر بندی سے رہا ہو کر آیا۔ تو میری غیر حاضری میں دفتر کے بعض ملازم سب کچھ خُرد بُرد کر چکے تھے۔ اور یہ کمینے قسم کے غدار اخبار "ریاست" کے پچھلے فائل تک ردّی میں فروخت کر کے کھا گئے۔ رہائی کے بعد سوال پیدا ہوا کہ روپیہ کہاں سے آئے اور اخبار کیونکر جاری ہو۔ چند دوستوں کو خطوط کے ذریعے حالات لکھے تو ایک دوست نے جو سرکاری ملازم تھے، تین ہزار روپیہ بھیج دیا۔ جس میں سے اڑھائی ہزار روپیہ تو اخبار کی ضمانت کے طور پر سرکاری خزانہ میں داخل کر دیا۔ کیونکہ پہلی ضمانت ضبط ہو چکی تھی اور نئی ضمانت اڑھائی ہزار روپیہ کی طلب کی گئی تھی۔ پانچ سو روپیہ لاہور کے ایک تاجر چرم نے بھیج دیا جو "ریاست" کے مدّاح تھے۔ کچھ روپیہ دہلی کے ایک دوست سے قرض لیا۔ اور ایک دوست والیئے ریاست کا پیغام آیا کہ وہ عنقریب ہی دس ہزار روپیہ بھیج رہے ہیں۔ چنانچہ کچھ روپیہ پہنچا تھا۔ وہ پہلے چار پانچ پرچوں میں ہی صرف ہو گیا۔ میں نے حافظ آباد کی زمین فروخت کرنے کا انتظام کیا تھا مگر وہاں سے ابھی روپیہ نہ آیا تھا اور مالی پریشانی تھی کہ ایک روز شام کو سنٹرل انڈیا کی ریاستوں کی پبلک کے ایک لیڈر تشریف لائے اور آپ نے کہا:۔

"ہم تین روز سے آپ کی تلاش میں ہیں۔ مکان نہ ملتا تھا۔ مسٹر امرت لال سیٹھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کارونیشن ہوٹل میں مقیم ہیں۔ انہوں نے کئی دوستوں سے

Marfat.com

آپ کے مکان کا پتہ پوچھا۔ مگر کوئی پتہ نہ چلتا تھا۔ اب بڑی مشکل سے پتہ چلا"۔ میں نے مذاقاً کہا:

"جب انسان اچھی حالت میں نہ ہو تو وہ اکڑ کر سڑک کے درمیان نہیں چلتا بلکہ ایک طرف کنارہ پر گردن نیچی کئے ہوئے چلتا ہے۔ میرا کاروبار ابھی چلا نہیں اس لئے میں نے اپنے مکان کا کسی دوست کو پتہ نہیں دیا جب کاروبار چل جائے گا تو پھر سب دوستوں کو اطلاع دے دوں گا"۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں رات کو دس بجے امرت لال جی سے کارونیشن ہوٹل میں ملوں گا۔ یہ صاحب امرت لال جی کے پاس ہوٹل میں پہنچے۔ تو پھر واپس پیغام لائے کہ امرت لال جی کا کسی دوست کے ہاں رات کو ڈنر ہے۔ ممکن ہے رات کو وہاں دیر ہو جائے اور صبح آٹھ بجے فرنٹیر میل میں واپس بمبئی جا رہے ہیں اور ملنا ضرور چاہتے ہیں اس لئے میں آٹھ بجے صبح سٹیشن پر ان سے ملوں۔

میں صبح آٹھ بجے ریلوے سٹیشن پہنچا۔ امرت لال جی وہاں موجود تھے۔ بہت تپاک کے ساتھ ملے۔ کیونکہ کئی برس کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ باتیں شروع ہوئیں تو آپ نے کہا:۔

"میں یہاں چار پانچ روز سے تھا، آپ کو تین چار روز متواتر تلاش کرتا رہا۔ یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اخبار "ریاست" جاری ہو گیا ہے، مگر مکان کا پتہ نہ تھا۔ سنایئے اخبار کا کیا حال ہے کیا اخبار کے جاری کرنے کے لئے روپیہ کا انتظام ہو گیا"۔

میں امرت لال جی سے اپنی مالی پریشانی کیا بیان کرتا، میں نے یہی جواب دیا کہ "ہاں روپیہ کا انتظام ہو گیا ہے"۔ میرے اس جواب کے بعد امرت لال جی نے دوستانہ نصیحت کے انداز میں پھر کہا:۔

"دیوان سنگھ جی! اتنا عرصہ بند رہنے کے بعد "ریاست" کا نیا جنم ہوا ہے۔ اس اخبار کو ہر حلقہ میں عزت اور محبت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، اور بڑے سے بڑے طبقہ میں اس کی قدر ہے۔ اب آپ ایک کام کیجئے کہ آئندہ کسی والیئے ریاست سے چاہے وہ آپ کا کتنا بھی عزیز دوست کیوں نہ ہو کسی قسم کی امداد قبول نہ کیجئے۔ اور آپ کو روپیہ کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہیئے۔ میرے پاس کافی روپیہ موجود ہے دو، چار، دس، بیس ہزار روپیہ میں آپ کو دے سکتا ہوں، مجھ سے لیجئے۔ مگر کسی والیئے ریاست سے نہ لیجئے۔ اور اب اپنے ہاتھوں کو بالکل پاکیزہ رکھیئے"۔

میں ان کی اس نصیحت کا کیا جواب دیتا۔ میں نے ٹالنے کے لئے یہی کہا "بہت اچھا" میرے بہت اچھا کہنے کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور پھر کہا:۔

Marfat.com

"آپ مجھے ورڈ آف آنر دیجئے کہ آپ آئندہ کبھی کسی والیئے ریاست سے کوئی امداد قبول نہ کریں گے ؟"

میں اس کا کیا جواب دیتا، میں نے ٹالنے کی کوشش کی، مگر ان کا بار بار ورڈ آف آنر کا مطالبہ جاری رہا۔ آخر مجھے مجبوراً ورڈ آف آنر دینا پڑا، کہ میں کسی والیئے ریاست سے روپیہ قبول نہ کروں گا۔

اس کے بعد امرت لال جی بمبئی روانہ ہو گئے۔ میں گردن نیچی کئے سوچتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر آیا، ٹانگہ کیا اور خیالات میں غرق، کہ ایک پیسہ پاس نہیں، اخبار کی آمدنی ابھی شروع نہیں ہوئی۔ چار پانچ ہزار روپیہ ماہوار کا خرچ ہوگا، ادھر یہ ورڈ آف آنر کا پنگا۔ اب اخبار جاری رہ سکے گا تو کیونکر۔ انہیں خیالات میں غرق، واپس دفتر پہنچا۔

اب اگر روپیہ نہ ہو تو اخبار بند۔ اور اگر امرت لال جی کو روپیہ بھیجنے کے لئے لکھوں تو کس مُنہ سے۔ کیونکہ ان کے دریافت کرنے پر کہہ چکا تھا کہ روپیہ کا انتظام ہے۔ سوچنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ امرت لال جی کو روپیہ بھیجنے کے لئے لکھوں۔ میں نے تمام حالات بمبئی مسٹر ہنس لال (جو کئی برس تک بمبئی میں "ریاست" کے نمائندہ رہے۔ میرے ہم وطن اور عزیز ہیں اور اب وہاں اپنا کاروبار کرتے ہیں) کو لکھے اور ہدایت کی کہ وہ مسٹر امرت لال جی سے مل کر تمام حالات بیان کریں۔ میرے اس لکھنے کے بعد امرت لال جی نے دو ہزار روپیہ بھیج دیا۔ اگلے مہینہ پھر بھیجا، اور اس کے بعد اگلے مہینہ پھر بھیج دیا۔ اتنے میں اخبار کی آمدنی شروع ہو گئی اور کام چل نکلا۔

مسٹر امرت لال کو دہلی سے گئے غالباً ایک ماہ ہوا تھا کہ پنجاب کے ایک دوست کا خط پہنچا جو وہاں ایک اعلیٰ عہدہ پہ سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے لکھا کہ پنجاب کی ایک ریاست میں جاکر وہاں ایک صاحب سے ملوں۔ وہ مجھے روپیہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کا جواب ان کو لکھا کہ میں کسی ریاست سے روپیہ قبول نہیں کر سکتا۔ یہ جواب میں نے مسٹر امرت لال جی کو ہی بھیج دیا کہ وہ یہ جواب خود بمبئی سے پوسٹ کر دیں۔ اس کے بعد پنجاب کے ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تشریف لائے جو آج کل دہلی میں رہتے ہیں۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں سنٹرل انڈیا کی ایک ریاست کو بے نقاب کروں اور وہاں کی پبلک کے چند لوگ مجھے روپیہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے روپیہ لینے سے تو انکار کر دیا کیونکہ روپیہ لے کر اس کے معاوضہ کے طور پر پبلک کے حق میں لکھنا ایک اخلاقی گناہ سمجھتا ہوں۔ مگر "ریاست" میں ان مظالم کے متعلق کئی مضامین لکھے۔ اس کے بعد کئی اور اصحاب بھی تشریف لائے مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے کسی والیئے ریاست یا اس کے کسی افسر سے ورڈ آف آنر دیئے جانے کے بعد کوئی پیسہ وصول نہیں کیا۔ اور میرے اس عہد پہ قائم رہنے سے مجھے جو مسرت و اطمینان نصیب ہوا۔ وہ ناقابلِ

Marfat.com

بیان ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ یہ خوشی اور حظ شاید کروڑوں روپیہ کے صَرف کرنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک ضمیر کا سوال ہے میں چونکہ مسٹر امرت لال جی سے وعدہ کر چکا ہوں میں نے ورڈ آف آنر کے بعد کوئی روپیہ کسی والیئے ریاست سے چاہے وہ کتنا ہی دوست ہو قبول نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ مگر جہاں تک اصول کا سوال ہے میری اب بھی یہی رائے ہے کہ اگر پبلک کام کرنے والے پبلک خدمت کے لئے والیانِ ریاست سے روپیہ لیں، اور اس روپیہ کو ایک امانت سمجھتے ہوئے پبلک کے لئے خرچ کیا جائے۔ اس روپیہ سے پبلک ورکر اپنی جائدادیں نہ بنائیں، اور اس روپیہ کے باعث پبلک پر کسی قسم کا بُرا اثر نہ ہو۔ یعنی پبلک کی آواز بلند کرنے یا پبلک خدمت کرنے میں کمی نہ ہو تو روپیہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اور میرا تجربہ ہے کہ تمام ہندوستان میں شاید پانچ سات لیڈر ایسے ہوں گے جنہوں نے پبلک کے لئے والیانِ ریاست سے روپیہ نہ لیا ہو یا لینا نہ چاہتے تھے۔

سیاسی پراپاگنڈے

گجرات (صوبہ بمبئی) میں ایک چھوٹی سی جاگیر آمود ہے۔ جس کی آمدنی چند ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ اس جاگیر کے مالک ٹھاکر نرسنگھ جی تھے، جن کے بزرگ دو سو برس کے قریب عرصہ ہوا مسلمان ہو گئے تھے مگر اس خاندان نے نہ تو اپنے نام تبدیل کئے اور نہ اپنا خاندانی لقب یا خطاب "ٹھاکر" چھوڑا۔ اس جاگیر کے مالک ٹھاکر نرسنگھ جی سے خواجہ حسن نظامی کو احمد آباد (گجرات) میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب ایسے لوگوں سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے تھے۔ آپ نے ٹھاکر صاحب سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے۔

خواجہ حسن نظامی نے ٹھاکر نرسنگھ جی کو لیڈری کی روشنی دکھائی اور ان سے تحریک کی کہ یہ مسلمانوں کے کسی بڑے جلسے میں شامل ہوں۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تشریف لائیں۔ اور آپ نے انجمن کے کارکنان سے خط و کتابت کے ذریعہ یہ بھی انتظام کر لیا، کہ انجمن کے جلسہ میں ایک روز کی کارروائی کے صدر یہ ٹھاکر صاحب بھی ہوں۔ اس فیصلہ کے بعد خواجہ حسن نظامی کا ٹھاکر صاحب کے حق میں (بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اپنے حق میں) پراپاگنڈا شروع ہوا۔ "صوبہ بمبئی کی ایک بڑی ریاست کا حکمران مسلمان ہو گیا۔" مہارانا نرسنگھ جی کا نام آئندہ نواب نصراللہ خان بہادر ہو گا۔"

Marfat.com

"اسلام کا آفتاب عروج پر" ، "تبلیغی سرگرمیوں کے نتائج" وغیرہ عنوان کے ساتھ پوسٹر اور اشتہارات میں مضامین شائع ہوئے اور بذریعہ تار ہندوستان کے اخبارات کو عموماً اور پنجاب و یوپی کے اخبارات کو خصوصاً یہ اطلاعیں بھیجی گئیں کہ نومسلم نواب نصراللہ خاں بہادر انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ کی صدارت کے لئے فلاں تاریخ کو صبح آٹھ بجے والی ایکسپریس میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوں گے۔ اخبارات کے علاوہ لاہور اور دہلی و لاہور کے درمیان تمام شہروں میں پوسٹر بھی چسپاں کئے گئے کہ نومسلم نواب صاحب کے استقبال کے لئے لوگ ریلوے سٹیشنوں پر آئیں۔

اتفاق ایسا ہوا کہ میں بھی لاہور جانے والا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے ساتھ فیصلہ ہوا کہ اکٹھے ہی چلیں گے۔ چنانچہ جب میں صبح آٹھ بجے کے قریب ریلوے سٹیشن پہنچا تو یہ "نومسلم" ٹھاکر صاحب اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ ہم لوگ سیکنڈ کلاس کے ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے۔ غازی آباد کے سٹیشن پر تو "نومسلم نواب صاحب" کی زیارت کرنے والے نصف درجن سے زیادہ آدمی نہ تھے مگر گاڑی جب میرٹھ پہنچی، تو پلیٹ فارم بھرا ہوا تھا۔ گاڑی کے پہنچتے ہی اللہ اکبر کے نعروں سے آسمان گونج اُٹھا۔ ہر شخص نومسلم راناکو دیکھنے اور ہاتھ ملانے کے لئے بے تاب و بے چین تھا۔ میرٹھ کے کئی اُمراء مہارانا صاحب کے لئے پرتکلف کھانا لائے تھے۔ کیونکہ میرٹھ کے کباب تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ اور کھانے کا وقت قریب تھا۔ کھانا دینے والوں کو گاڑی تک پہنچنے کے لئے راستہ نہ ملتا تھا۔ ان لوگوں نے بہت مشکل کے ساتھ گاڑی میں کھانا رکھا۔ کھانا اتنا زیادہ تھا کہ ایک سو اشخاص پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ کھانا لانے والے شائد یہ سمجھتے ہوں گے کہ "نومسلم" مہارانا صاحب کے ساتھ اُن کی ایک آدھ پلٹن بھی ہوگی۔ اس ہجوم کے باعث گاڑی کئی منٹ لیٹ ہوگئی۔ مگر لوگ نعرے لگا رہے تھے، اور ان کی آنکھیں "نومسلم مہارانا" کو دیکھ کر سیر نہ ہوتی تھیں۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ تو اس چار سو بیس کی عظیم الشان کامیابی پر نومسلم مہارانا کی آنکھیں احسان کے باعث جھکی ہوئی تھیں۔ اور تیر کے نشانہ پر لگنے کے باعث خواجہ حسن نظامی کی گردن اکڑ رہی تھی۔ اور ان کے چہرے ظاہر کرتے تھے کہ ایک تو احسان محسوس کر رہا ہے اور دوسرا فخر۔ ہجوم کی یہ کیفیت صرف میرٹھ کے سٹیشن تک محدود نہ تھی۔ بلکہ جس جس سٹیشن پر گاڑی ٹھہری پلیٹ فارم مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور "اللہ اکبر" "اسلام زندہ باد" "نومسلم مہارانا زندہ باد" "خواجہ حسن نظامی زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور امرتسر ریلوے سٹیشن پر تو جگہ کم ہونے کے باعث لوگ ریلوے لائن کے ساتھ بھی کھڑے تھے۔ تاکہ اگر نومسلم مہارانا نظر نہ آئیں تو کم از کم اُس گاڑی کو تو دیکھ لیں جس گاڑی میں مہارانا سوار ہیں یعنی ٹھاکر صاحب کے درشن نہ ہوں۔ ٹھاکر دوارہ کو تو نمسکار کر لی جائے۔

Marfat.com

گاڑی رات کو آٹھ بجے کے قریب لاہور ریلوے سٹیشن پہنچی - اندھیرا ہو چکا تھا مگر استقبال کرنے والوں کے دل روشن تھے - شہر کے معزز مسلمان کثرت کے ساتھ استقبال کے لئے ریلوے سٹیشن آئے ہوئے تھے اور عوام کا تو شمار ہی نہ کیا جا سکتا تھا - شہر جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا - ہم لوگ گاڑی سے اترے تو بہت مشکل کے ساتھ ہجوم میں سے نکلے - ہر مسلمان پلیٹ فارم پر "نو مسلم مہارانا" سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا - مہارانا کے بعد لوگ خواجہ حسن نظامی سے ہاتھ ملاتے - اور اس کے بعد مجھے غور کے ساتھ دیکھتے ہوئے مجھ سے بھی ہاتھ ملاتے - راستہ میں بھی کھڑکیوں میں مہارانا اور خواجہ حسن نظامی کے بعد مجھ سے ہاتھ ملایا جاتا رہا - اور ہر شخص مجھے غور سے دیکھتا - ان کا خیال تھا کہ یا تو میں "نو مسلم مہارانا" کا سیکرٹری ہوں یا ان کی ریاست کا کوئی بڑا افسر ہوں یا میں بھی مشرف بہ اسلام ہونے کا کوئی امیدوار ہوں جس کا کریڈٹ عنقریب خواجہ حسن نظامی کو ملنے والا ہے -

لاہور ریلوے سٹیشن پر اتر کر ہم لوگ میاں عبدالعزیز پریذیڈنٹ لاہور میونسپلٹی کی کوٹھی پہنچے - جو دہلی دروازہ کے باہر گول سڑک پر ہے کیونکہ وہاں ہی ہمارے قیام کا انتظام تھا یہ لوگ تو موٹروں سے اتر کر اس کوٹھی میں مقیم ہوئے - میں اجازت لے کر امپیریل ہوٹل میں چلا گیا جہاں کہ ہمیشہ ٹھہرا کرتا تھا -

ہم لوگ تین چار روز لاہور میں رہے - میں دن کو "نو مسلم رانا" اور خواجہ حسن نظامی سے ملنے کے لئے اکثر جایا کرتا - ان تین چار دنوں میں رنگ برنگی جھنڈیوں کا نظارہ "نو مسلم مہارانا" کو دیکھنے والوں کی بیقراری - اللہ اکبر، نو مسلم مہارانا اور خواجہ حسن نظامی زندہ باد کے نعرے - انجمن حمایتِ اسلام کی رونق اور نو مسلم مہارانا کا استقبال اور تقریریں ایسی تھیں - جن کو اب تک نہیں بھول سکا - مگر مسلمان پبلک کی بے وقوفی تو شائد تمام زندگی کے لئے ہی ناقابلِ فراموش ہے کیونکہ ٹھاکر نرسنگھ جی کے بزرگ دو سو برس ہوئے مسلمان ہوئے - مگر ان کی اولاد کو دو سو برس کے طویل عرصہ کے بعد آج تازہ نو مسلم ظاہر کرتے ہوئے پبلک سے خراجِ تحسین حاصل کیا گیا -

وکیلوں کی طفل تسلیاں

میں نے اس وقت تک دفتر "ریاست" میں فرموں کے اشتہارات حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں کنویسر رکھے - ان کنویسروں میں زیادہ سے زیادہ بیس فیصدی دیانت دار ہونگے اسی فی صدی یقیناً بد دیانت تھے - کیونکہ کنویسنگ کے کام میں ایک شخص اتنا ہی زیادہ کامیاب

Marfat.com

ہوگا۔ جتنا کہ وہ ہوشیار ہو۔ اور اگر ہوشیار ہے اور اس کی ہوشیاری کے ساتھ چالاکی بھی شامل ہے تو وہ اپنے مالک کو بھی اپنی چالاکی کا شکار بنا سکتا ہے۔ چنانچہ کنویسروں کے متعلق یہ عام پوزیشن ہے۔ کہ وہ اگر ہوشیار اور چالاک ہے تو بددیانت بھی ہے۔ اور اگر شریف اور سیدھا ہے تو وہ کنویسنگ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اور کنویسنگ کی لائن میں بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو شریف بھی ہوں اور اچھے کنویسر بھی۔

چند برس ہوئے ایک صاحب دفتر "ریاست" میں تشریف لائے جنہوں نے اپنا نام مسٹر جی۔ ڈی کنور بتایا۔ اور کہا کہ یہ لاہور کے اخبار "گوروگھنٹال" وغیرہ میں اشتہارات کے کنویسنگ کا کام کرتے رہے ہیں، ان کا اصلی نام گنیش داس تھا اور لاہور کے ایک اچھے شریف کھتری گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب ان سے باتیں ہوئیں تو آدمی ہوشیار معلوم ہوئے۔ ان کو امتحاناً ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پہ ایک ماہ کے لئے بطور کنویسر رکھ لیا گیا۔ اس ایک ماہ میں یہ کئی کئی روز غائب رہا کرتے۔ اور اگر دفتر میں آتے بھی تو اکثر لیٹ۔ ان کو کئی بار تنبیہہ کی گئی کہ وقت پر آیئے اور ناغہ نہ کیجئے۔ مگر یہ کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے پھر غائب ہوجاتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ لاہور سے کوئی عورت نکال کر لائے ہیں اور شراب وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں۔ میں ان کی پرائیویٹ لائف میں کیوں دخل دیتا۔ میں نے ان پر یہ ظاہر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا کہ ان کے متعلق کیا اطلاعیں ہیں۔ جب یہ ایک ماہ کام کر چکے تو میں نے ان کی تنخواہ کا حساب کرکے ان کو چیک دے دیا۔ رسید لے لی، اور یہ لکھا لیا کہ انہوں نے کسی پارٹی سے کوئی روپیہ (سوائے اس روپیہ کے جو انہوں نے دفتر "ریاست" میں جمع کرادیا تھا) وصول نہیں کیا یہ میں نے احتیاطاً ان سے لکھوا لیا اور جب کسی کنویسر کو جواب دیتا ہوں تو حساب کرنے کے بعد عموماً لکھوا لیا کرتا ہوں۔

جب یہ دفتر "ریاست" سے علیحدہ ہوگئے تو اگلے روز میں نے دفتر کے مینجر سے کہا کہ وہ ان تمام پارٹیوں کے پاس جائیں جن سے یہ کنور صاحب اشتہارات لائے تھے۔ اور دیکھیں کہ کوئی ایسی پارٹی تو نہیں جس سے یہ روپیہ لے چکے ہوں اور وہ روپیہ انہوں نے دفتر میں جمع نہ کرایا ہو۔ دفتر کے مینجر ان پارٹیوں کے پاس گئے تو معلوم ہوا کہ یہ ان پارٹیوں میں سے کئی سے روپیہ وصول کر چکے تھے جو انہوں نے دفتر میں جمع نہیں کیا۔ اس اطلاع کے بعد مینجر کو پھر بھیجا کہ وہ اچھی طرح تسلّی کرلیں اور کنور صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسیدیں بھی دیکھ آئیں۔ جب یہ بھی اچھی طرح سے تسلّی کرلی گئی تو میں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انچارج کوتوالی کو خط لکھا جس میں تفصیل کے ساتھ تمام حالات بتائے، اور اطلاع دی کہ ملزم اس وقت لیڈی ہارڈنگ سرائے کے ایک کمرہ میں رہتا ہے۔ میرا یہ خط جب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہنچا تو انہوں نے ایک سب انسپکٹر پولیس کو تحقیقات پر مقرر کیا۔ شام کو سات بجے کا وقت ہوگا۔ یہ سب انسپکٹر تحقیقات کے لئے

Marfat.com

دفتر "ریاست" میں آئے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ملزم کی شناخت کے لئے کسی آدمی کو ساتھ بھیجا جائے۔ اس وقت دفتر کے تمام لوگ جا چکے تھے۔ میں خود ان کے ساتھ نئی دہلی ریلوے سٹیشن کے قریب لیڈی ہارڈنگ سرائے کے منیجر سے کنور صاحب کے کمرہ کا نمبر پوچھ کر وہاں پہنچا جہاں یہ حضرت ٹھہرے تھے۔ میں نے جب کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو مجھے دیکھ کر یہ حیران تو ہوئے مگر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ ان کو خیال ہوا کہ میں نے ان کو موقوف کر کے شائد اپنی غلطی محسوس کی ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ یہ پھر دفتر میں کام کریں۔ مجھے دیکھ کر کمرہ سے باہر نکل آئے۔ میں ان سے باتیں کرتا ہوا ان کو ساتھ ہی نیچے لے آیا۔ اور جب ہم سرائے سے باہر دروازہ پر پہنچے تو سب انسپکٹر انتظار میں تھے۔ میں نے تعارف کرایا کہ یہ کنور صاحب ہیں۔ سب انسپکٹر ہمیں ساتھ لے کر پھر کنور صاحب کے کمرہ میں آئے۔ گواہ بلائے گئے، کمرہ کی تلاشی لی گئی تو کچھ گراموفون ریکارڈ بھی ملے۔ جن کے متعلق انہوں نے اقرار کیا کہ یہ گراموفون کمپنی سے ریڈیو کے لئے لائے تھے مگر راستہ میں ہی ہضم کر گئے۔ تلاشی کے بعد سب انسپکٹر ان کو تھانہ میں لے گیا اور یہ حوالات میں بند کر دیئے گئے۔

اگلے روز انہوں نے اپنے دوستوں کو پیغام بھیجا جن کی دہلی میں ان سے تازہ تازہ واقفیت ہوئی تھی۔ اور جن کا ان کے کمرہ میں آنا جانا تھا۔ عدالت میں پیش ہوئے تو دو ہزار روپیہ کی ضمانت ہو گئی۔ ایسے مقدمات قابلِ ضمانت ہیں۔ ضمانت کے بعد انہوں نے ایک وکیل کیا۔ وکیل صاحب نے جب مقدمہ کے حالات سنے تو کہا۔ کہ مقدمہ بالکل بے جان ہے۔ پہلی پیشی پر ہی بری ہو جاؤ گے۔ وکیل صاحب کا اطمینان دلانا تھا کہ یہ بہت خوش اور مطمئن۔ بلکہ اس خیال میں کہ ایڈیٹر "ریاست" سے ہرجانہ بھی وصول کریں گے۔ چنانچہ ایک روز یہ حضرت لالہ امیر چند کھنہ سے جامع مسجد کے پاس سیر کرتے ہوئے ملے تو انہوں نے کھنہ صاحب سے کہا "مقدمہ میں کوئی جان نہیں، پہلی پیشی پر بری ہو جاؤں گا۔ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ اس مقدمہ کو دائر کس طرح کیا گیا، پولیس کو حق حاصل نہ تھا کہ وہ گرفتاری بھی کرتی۔ آپ دیکھیں گے کہ میں ہرجانہ وصول کرتا ہوں۔" لالہ امیر چند نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تو میں مسکرا دیا۔ کیا جواب دیتا، یہی کہا کہ وکیلوں کی طفل تسلیوں کے بھروسہ پر تو لوگ پھانسی پر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر وکیل مقدمہ بے جان نہ کہیں تو موکل ان کو اپنا وکیل ہی کیوں مقرر کریں ان کو وکیل تب ہی مقرر کیا جاتا ہے جب یہ بری ہونے کا ملزم کو یقین دلا دیتے ہیں۔

اس مقدمہ میں پانچ چھ پیشیاں ہوئیں، وکیل صاحب نے اپنے پیشہ کے مطابق گواہوں پر جرح اور بحث کی۔ مگر مجسٹریٹ نے دس ماہ قید سخت کی سزا دی۔ سزا کا حکم سننے سے پہلے کنور صاحب غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ مقدمہ میں جان نہیں یہ مقدمہ چلانے والے سے ہرجانہ وصول کر سکیں گے۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ وکیل مستغیث اور ملزم

Marfat.com

یا مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو ہی طفل تسلیاں دیتے ہیں۔ اگر یہ طفل تسلیاں نہ دیں تو ان کو مقدمہ کون دے۔ سزا کا حکم سننے کے بعد ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اس سے پہلے یہ مقدمہ کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے انہوں نے اپنے گھر والوں کو بھی اطلاع نہ دی تھی۔ سزا سننے کے بعد انہوں نے گھر والوں کو لاہور اطلاع دی۔ تو ان کی بیوہ ماں دہلی آئیں اور یہ اپنے ساتھ لاہور سے میرے رشتہ داروں کی سفارش لائیں۔ اور مظلومیت بیان کرتے ہوئے زار زار روتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا لڑکا نالائق ہے۔ ایک عورت کو لاہور سے نکال کر لایا ہے۔ یہ عورت اس لڑکے کی تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔ مگر پھر بھی اس کے سینہ میں ماں کا دل ہے یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کا بچہ تکلیف اٹھائے۔ اس غریب کی حالت کو دیکھ کر میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ وکیل سے پوچھ لو، اگر میرا عدالت میں معاف کر دینے کا بیان مفید ہو سکے تو میں جا کر بیان دے دوں گا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں۔ تیسرے روز سیشن جج کی عدالت میں پہلی پیشی تھی۔ سیشن جج نے مقدمہ کے حالات سنے اور فیصلہ پڑھا تو پہلی پیشی میں مقدمہ خارج کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کنور صاحب کو دس ماہ جیل میں رہنا پڑا۔

دہلی کے ایڈووکیٹ مسٹر بی۔ بی۔ توکل جو میرے مقدمات کی ہمیشہ ہی پیروی کرتے رہے بہت دل چسپ اور لطائف پسند طبیعت کے بزرگ ہیں۔ وہ وکیلوں سے متعلق بھی اکثر لطائف سنایا کرتے ہیں۔ ایک ساہوکار مع اپنے ہمراہی کے ان کے پاس تشریف لائے۔ جو مقدمہ دینا چاہتے تھے۔ مقدمہ بہت کمزور تھا اور لالہ جی کے مقدمہ جیتنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ توکل صاحب نے حسبِ عادت صاف صاف کہہ دیا کہ مقدمہ کمزور ہے۔ آپ کے مقدمہ میں جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ سن کر لالہ جی کے کان کھڑے ہوئے۔ اور آپ نے فوراً کہا کہ "اچھا بابو جی ہم کل آئیں گے، مشورہ کر لیں۔" لالہ جی یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور تشریف لے گئے۔ لالہ جی جب زینہ سے اتر رہے تھے تو اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے "یہ وکیل تو لائق ہے مگر اس نے مقدمہ کا پینٹ (پوائنٹ) نہیں پکڑا۔ چلو کسی دوسرے وکیل کے پاس چلیں۔" اس کے بعد یہ ایک دوسرے وکیل کے پاس گئے تو وکیل نے طفل تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ مقدمہ بہت مضبوط ہے۔ پہلی پیشی پر ڈگری ہو جائے گی۔ یہ سن کر لالہ جی نے وکیل صاحب کو مقدمہ کی فیس دے دی اور خوشی و فخر کے ساتھ اپنے ہمراہی سے کہا "دیکھا ان وکیل صاحب نے مقدمہ کا پینٹ (پوائنٹ) پکڑ لیا۔ توکل صاحب کی سمجھ میں پینٹ نہ آیا تھا۔" لالہ جی کے مقدمہ کا بھی وہی حشر ہوا جو کمزور مقدمات کا ہوا کرتا ہے۔ مگر وکیلوں کی طفل تسلیوں کا کیا علاج۔ یہ اگر طفل تسلیاں نہ دیں تو ان کو مقدمہ کون دے۔ چنانچہ وکیلوں کا تو پیشہ ہی یہ ہے کہ وہ بے جان مقدمہ کو بھی جاندار ظاہر کریں۔ حماقت تو ان مؤکلوں کی ہے جو مقدمہ کو کمزور سمجھتے ہوئے

Marfat.com

بھی ان طفل تسلیوں پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور مقدمہ کی کامیابی کے خواب دیکھتے ہیں ۔

نئے اخبارات کی ناکامی

کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ جس روز کوئی نہ کوئی نیا اخبار جاری نہ ہو ۔ اور یہ اخبار ایک ہفتہ ، دو ہفتہ یا چار ، پانچ ہفتہ جاری رہ کر بند نہ کر دیا جاتا ہو ۔ چنانچہ صرف ایک سال میں نئے اخبارات کے جو ڈیکلریشن صرف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں داخل کئے جاتے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے ۔ مگر ان ڈیکلریشن داخل شدہ اخبارات میں سے محکمہ پریس برانچ کی اطلاع کے مطابق پانچ فی صدی اخبارات بھی زندہ نہیں رہتے ۔ بعض تو ڈیکلریشن کے بعد جاری ہی نہیں ہوتے ۔ یعنی ان اخبارات کے مالکان صرف ڈیکلریشن داخل کر کے ہی اپنا ٹھرک پورا کر لیتے ہیں ، اور بعض اخبارات چند بار شائع ہو کر بند ہو جاتے ہیں ۔ اتنے زیادہ اخبارات کے جاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اخبار کے ایڈیٹر بننے کا شوق ہے ۔ جو شخص چند غلط سطریں لکھ لے یا کسی دوسرے اخبار سے کوئی افسانہ نقل کر سکتا ہو وہ اپنے آپ کو جرنلسٹ سمجھتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اگر مہاشا کرشن "پرتاپ" یا مولانا ظفر علی خاں "زمیندار" کے باعث بام شہرت پر پہنچ سکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں پہنچ سکتا ۔ اور ان لوگوں کے ناکام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو فن صحافت سے واقف ہوتے ہیں کہ اپنے اخبار کو مقبول بنا سکیں اور نہ اخبار کے انتظامیہ امور سے کہ اخبار اپنا خرچ خود نکالنے کے قابل ہو سکے ۔ چنانچہ نئے اخبارات جاری کرنے والے اخبار کے ان دونوں پہلوؤں سے ناواقف ہونے کے باعث نقصان اٹھا کر بیٹھ جاتے ہیں ۔

اخبارات میں غلط طریقہ سے روپیہ کیونکر ضائع کیا جاتا ہے ۔ اس کے متعلق ایک واقعہ سنیئے اخبار "ریاست" کو جاری ہوئے چند برس ہوئے تھے اور اشتہارات کے حاصل کرنے کے لئے کوشش جاری تھی کہ دفتر "ریاست" سے ایک صاحب لالہ ساوتری پرشاد کو بطور کنویسر ملازم رکھ کر لاہور بھیجا گیا ۔ ان کو وہاں کے امپیریل ہوٹل کے پروپرائٹر لالہ درگا داس کے نام خط دیا ۔ کہ لالہ جی کی رہائش و خوراک کا انتظام اپنے ہوٹل میں کر دیجئے ۔ اور دوسرے اخراجات کے لئے کچھ روپیہ بطور نمونہ مفت تقسیم کرنے کے لئے دو سو پرچے اور اشتہارات کے متعلق لٹریچر دے دیا گیا ۔ لالہ جی ویسے تو تعلیم یافتہ اور ہوشیار معلوم ہوتے تھے مگر اخبارات کے کام سے ناواقف تھے ۔ اور غلطی ہوئی کہ ان کو صرف کالم انچ صفحہ وغیرہ سمجھا دیا گیا ۔ اور یہ نہ بتایا کہ وہاں کس کس مشتہر کے پاس جائیں اور کوشش کریں ۔ لالہ ساوتری پرشاد لاہور گئے وہاں پندرہ

Marfat.com

دن تک رہے۔ پندرہ روز کے بعد واپس آئے تو وہ ایک انچ اشتہار بھی نہ لائے۔ ان کے خالی واپس آنے پر بہت افسوس ہوا کہ پندرہ روز یہ لاہور رہے۔ روپیہ بھی خرچ ہوا۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں۔ کچھ افسوس اور کچھ غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا گیا کیا آپ ہوٹل میں سوئے رہتے تھے کہ ایک اشتہار بھی نہ لا سکے۔ لالہ جی نے فرمایا:

"میں دھرم سے سچ کہتا ہوں کہ میں دن بھر پھرتا رہتا تھا۔ کسی روز ایک منٹ کے لئے آرام نہیں کیا۔ وہاں سب سے بارونق بازار انار کلی ہے۔ میں نے آپ کے دیئے ہوئے دو سو پرچے اور اشتہارات کے متعلق لٹریچر ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام دکانداروں کو دیئے اور ان کے پاس بار بار گیا۔ مگر سب نے یہی کہا کہ اچھا غور کریں گے۔"

اس جواب کو سن کر میں سمجھ گیا کہ یہ پرچے اور لٹریچر غلط لوگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ میں نے پھر پوچھا وہاں کس کس کو نمونہ اور لٹریچر دیا گیا تو لالہ جی نے فرمایا:۔

"سردار صاحب دوسرے لوگ تو کیا میں نے وہاں حلوائیوں تک کو بھی نہیں چھوڑا۔ ان سے بھی ملا اور کوشش کی۔"

اس جواب سے علم ہوا کہ لالہ جی بجائے ان لوگوں سے ملنے کے جو اس وقت دوسرے اخبارات میں اشتہار دے رہے ہیں ایسے لوگوں کے ہاں دھکے کھاتے رہے جنہوں نے کبھی اشتہار نہیں دیا تھا اور نہ وہ اشتہار دے سکتے تھے۔ مثلاً ایک حلوائی یا معمولی بساطی جس کی روزانہ آمدنی پانچ سات روپیہ ہے یا ایک نانبائی جس کو علم نہیں کہ اشتہار دینا کس جانور کا نام ہے کس طرح اشتہار دے سکتا تھا۔

جو لوگ نئے اخبارات جاری کرتے ہیں، اور دو چار پرچے نکال کر بند کر دیتے ہیں ان کی ناکامی کے اسباب یہ ہیں:۔

(۱) یہ بغیر سرمایہ کے پرچہ جاری کرتے ہیں۔ حالانکہ آج سے بیس برس پہلے تو ایک ہفتہ وار اخبار کے لئے پانچ ہزار روپیہ اور ایک روزانہ اردو اخبار کے لئے پچاس ہزار روپیہ کافی تھا۔ مگر آج ایک ہفتہ وار کو کامیاب بنانے کے لئے کم از کم پچاس ہزار روپیہ اور ایک روزانہ اردو اخبار کو سیلف سپورٹنگ کی حالت تک پہنچانے کے لئے کم از کم اڑھائی لاکھ روپیہ (اگر پریس لگانا ہو تو اس کی قیمت اس کے علاوہ ہوگی) چاہیئے۔

(۲) اخبار جاری کرنے والوں میں نہ زور قلم ہے نہ حسن تحریر۔ نتیجہ یہ ہے کہ پہلا پرچہ دیکھنے کے بعد ہی لوگ ناک چڑھاتے ہیں۔ اور دوسرا پرچہ خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

(۳) اخبار جاری کرنے والوں کو نہ تو اخبار کے انتظامیہ امور سے واقفیت ہے اور نہ تجربہ۔ یہ لوگ اسی طرح ہی اپنا روپیہ غلط طریقہ پر ضائع کرتے ہیں۔ جس طرح ایڈیٹر "ریاست" نے

Marfat.com

لالہ ساوتری پرشاد کو بغیر ٹریننگ دیئے لاہور بھیج کر حماقت کی تھی۔ جو اخبار جاری ہوتا ہے جاری کرنے والا پہلے ہفتہ میں ہی کافی روپیہ صرف کر کے اپنا نمائندہ بمبئی اور کلکتہ بھیج دیتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ ولائیتی اور ہندوستان کی اچھی فرموں کے مستقل اشتہارات صرف بمبئی اور کلکتہ آدمی بھیجنے سے مل جاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اچھی ایڈورٹائیزنگ ایجنسیاں کسی اخبار کو اشتہار دینے کا اُس وقت تک خیال بھی نہیں کرتیں جب تک کہ اس اخبار کو جاری ہوئے چند سال کا عرصہ نہ ہو جائے اور یہ دیکھ نہ لیں کہ اخبار کی پچھلی اور آئندہ کی جنم پتری میں کیا کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ جو لوگ بمبئی جاتے ہیں وہ وہاں ایڈورٹائیزنگ ایجنسیوں سے ملتے ہیں۔ ایڈورٹائیزنگ ایجنسیاں اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے یہی جواب دیتی ہیں کہ "بہت اچھا غور کریں گے"۔ یہ بے وقوف "غور کرنے" کو ہی کامیابی اور اشتہارات کا پروگرام سمجھ لیتے ہیں۔ اور واپس آکر اپنے مالکان کو کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے اس روپیہ کو حلال کرتے ہیں جو یہ بمبئی یا کلکتہ میں صرف کر آئے۔ مگر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی اشتہار نہیں ملتا۔ ادھر لوگ اخبار خریدتے نہیں اور پروپرائٹر صاحب گھر کا دو چار ہزار روپیہ "سواہا" کر کے اخبار بند کر دیتے ہیں۔

جو لوگ اخبار جاری کرنا چاہیں۔ وہ جاری کرنے سے پہلے تمام حالات پر غور کر لیا کریں۔ یا کم از کم لالہ ساوتری پرشاد والے واقعہ کی طرح غلط طور پر روپیہ تو صرف نہ کریں۔ جو ایڈیٹر "ریاست" کے لئے اب تک ناقابلِ فراموش ہے۔ چنانچہ اب بھی جب کبھی لالہ جی تشریف لاتے ہیں تو آپ کی لاہور کی "محنت" یاد آجاتی ہے۔

بدحواسیاں

دماغی اعتبار سے میں بچپن سے ہی بدحواس سا ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض دوسرے لوگ بھی ایسے ہوں۔ مگر جہاں تک میرا تجربہ ہے میں نے اپنی زندگی میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں دیکھا کہ جو میری طرح ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہے اور بدحواس ہو۔ اس بدحواسی کے سلسلہ میں چند واقعات عرض کرتا ہوں:-

دفتر "ریاست" ہملٹن روڈ پر تھا۔ اور میرا ذاتی دفتر اوپر کی منزل میں تھا۔ میں نے دفتر میں تاکید کر رکھی تھی کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کئے مجھ سے ملنے کے لئے نہ آئے۔ یعنی ملنے والے پہلے چٹ پر اپنا نام، پتہ اور کام لکھیں۔ یہ چٹ چپڑاسی میرے پاس لائے اور میں پھر کہوں تو ان صاحب کو ملنے کے لئے لایا جائے تاکہ میرا وقت ضائع نہ ہو۔ میرے چچا زاد بھائی سردار رنجودھ سنگھ

Marfat.com

کھنہ کی بیوی اپنے بھائی کے پاس حافظ آباد سے نئی دہلی آئیں۔ تو ایک روز وہ میرے دفتر میں بھی تشریف لائیں۔ کیونکہ میں اُن کا دیور تھا، اور سردار رنجودھ سنگھ سے قریبی رشتہ کے علاوہ اُن سے میرے ذاتی تعلقات بھی اخلاص و محبت کے تھے۔ جب یہ دفتر میں آئیں تو انہوں نے چپڑاسی سے پوچھا کہ "دیوان سنگھ کہاں ہے؟" چپڑاسی نے بے تکلفی کے یہ الفاظ ایک خاتون سے سُن کر محسوس کیا کہ یہ خاتون کوئی رشتہ دار ہے۔ اُسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان کا نام وغیرہ پوچھتا۔ اور مجھے اطلاع دیتا۔ یہ ان کو اپنے ساتھ اوپر کے کمرہ میں لے آیا۔ یہ خاتون جب اوپر میرے کمرہ میں تشریف لائیں، تو یہ مسکرا رہی تھیں، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے تکلف ہیں۔ سالہاسال سے جانتی ہیں اور مجھے اپنا عزیز سمجھتی ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا، ان کا استقبال کیا اور ان سے صوفہ پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ جس کی عمر دس برس کی ہو گی۔ ان کے بیٹھنے کے بعد میں حیران کہ یہ کون ہیں۔ انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ خیریت دریافت کی، جس کا میں نے جواب دیا۔ ایک دو منٹ گذرے ہوں گے کہ میں نے حیرانی کی صورت میں کہا۔ "معاف کیجئے میں آپ کو پہچان نہیں سکا کہ آپ کون ہیں؟" میرے یہ الفاظ سن کر وہ اور مسکرائیں اور مسکراتے ہوئے کچھ طنز کے جذبات کے ساتھ پنجابی زبان میں کہا: "پھٹے مُنہ ای۔ کدی گھر دیاں نوں وی بھُل جائیدا اے؟" (لعنت ہے تم پر کبھی اپنے گھر کے لوگوں کو بھی انسان بھول جاتا ہے؟) اس جواب سے میں شرمندہ تو بے حد ہُوا مگر باوجود ذہن پر زور دینے کے بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ کون خاتون ہیں۔ چند بار سوچنے کے بعد میں نے شرمندگی کی حالت میں پھر کہا" میں فی الحقیقت نہیں سمجھ سکا؟" اس پر اس خاتون نے اپنے بیٹے سے کہا (چونکہ ہندو یا سکھ عورتیں ادب کے خیال سے اپنے شوہر کا نام نہیں لیتیں) کہ اپنے باپ کا نام لو۔ جب انہوں نے بیٹے سے یہ کہا: تو بیٹے نے کہا "رنجودھ سنگھ"، رنجودھ سنگھ کا نام سن کر میں جس قدر نادم ہُوا بیان نہیں کر سکتا۔ خیر اُس وقت تو حافظ آباد اور وہاں کے عزیزوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں مگر اس خاتون کے چہرہ سے میں محسوس کرتا تھا کہ میرا ان کو نہ پہچاننا بہت ناگوار گذرا ہے اور یہ میری بدحواسی کو قابلِ معافی نہیں سمجھتیں چنانچہ اس کے بعد میں جب کبھی حافظ آباد گیا اور سردار رنجودھ سنگھ جی سے ملا تو اُس خاتون نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے ہمیشہ ہی یہ کہا کہ "تم بہت اکڑ گئے ہو اور مغرور ہو جو اپنے گھر کے لوگوں کو نہیں پہچان سکتے؟" میں ہمیشہ ہی اس کے جواب میں ندامت کے ساتھ اپنی بدحواسی کا ڈیفنس پیش کرتا۔ مگر اس خاتون نے میرے اس ڈیفنس کو کبھی قابلِ سماعت نہ سمجھا، اور میں ہمیشہ ہی قابلِ الزام قرار دیا گیا۔

میں اب تو سینما بہت کم دیکھتا ہوں۔ اور شائد پچھلے دو برس میں ایک بھی فلم نہیں دیکھی مگر آج سے دس پندرہ برس پہلے میں کوئی فلم نہ چھوڑتا تھا، بلکہ ایک ایک فلم کو کئی کئی بار دیکھتا

Marfat.com

تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی ایک فلم کو بھی غور کے ساتھ نہیں دیکھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ فلم کی سٹوری کیا ہے۔ میں نوّے فی صدی صورتوں میں انٹرول کے وقت چلا آتا تھا۔ اور تمام کی تمام فلم مجبور ہو کر صرف اُس صورت میں دیکھتا جب کسی ساتھ والے دوست کے ساتھ بیٹھے رہنا ضروری ہوتا اور میری فلم کی تفریح صرف موسیقی، رقص اور گانا سننے تک محدود ہوتی ہے کیونکہ یہ میرے بس میں نہیں کہ میں کسی سٹوری، کسی شخص کی بات یا کسی مسئلہ پر مسلسل پندرہ بیس منٹ توجہ دے سکوں۔ میرا دماغ ہر وقت کام کرتا ہے۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں۔ اور سوچتے ہوئے خیالات بدلتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کر رہا ہوں تو میں کچھ اور سوچنے لگ جاتا ہوں۔ اور بات کرنے والے سے بات کرنے کے بعد پھر پوچھتا ہوں کہ فلاں واقعہ کے بعد کیا ہوا۔ چنانچہ اس بدحواسی کا سبب میرے دماغ کا غیر حاضر رہنا ہی ہے۔ جسے انگریزی میں "ایبسینٹ مائینڈڈ" کہا جاتا ہے۔

میرا کھانے پینے پر اتنا ذاتی خرچ نہیں جتنا غسل اور ادویات پر ہوتا ہے۔ غسل کے لئے میں سکرب امونیا ضرور استعمال کرتا ہوں۔ یہ امونیا جسم کو صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ خطرناک زہر ہے۔ اگر اسے پی لیا جائے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں غسل خانہ میں غسل کر رہا تھا، اور غسل کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ میں نے دانت صاف کئے تو دانتوں کے صاف کرنے کے بعد بجائے گارگل والی شیشی کے امونیا کی شیشی اُٹھا لی۔ اور گارگل کے لئے امونیا منہ میں ڈال لیا۔ اس امونیا کا منہ میں ڈالنا تھا کہ میرا دم گھٹ گیا۔ یہ غنیمت ہوا کہ میں نے امونیا کو منہ میں ڈالتے ہی اسے محسوس کر لیا اور فوراً منہ سے اسے نکال کر پانی کے غرارے کر لئے ورنہ اگر اس کے چند قطرے بھی حلق کے اندر چلے جاتے تو میں نصف یا ایک منٹ کے بعد مر جاتا۔ اس بدحواسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری زبان اور منہ میں آبلے پڑ گئے اور دو ہفتہ تک ڈاکٹر کے علاج کرنے سے اچھا ہوا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھے بہت سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ ملازم کو آواز دیتا ہوں کہ وہ آئے اور اس کو کھانا لانے کے لئے کہوں۔ ملازم آتا ہے تو اتنے میں کچھ سوچنے لگ جاتا ہوں ملازم آ کر پوچھتا ہے، کہ کیوں آواز دی تھی، کیا کام ہے۔ میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ واپس چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب اپنے خیال سے فارغ ہوتا ہوں تو پھر چلاتا ہوں، اور ملازم کو ڈانٹتا ہوں، کہ وہ اب تک کیوں نہیں آیا وہ جواب دیتا ہے کہ وہ آیا تھا۔ مگر میں نے کوئی کام نہ بتایا۔ ملازم کے اس جواب کو سن کر ندامت محسوس کرتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ بھوک لگ رہی ہے کھانا جلدی لاؤ۔

میری بدحواسیوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے ملے تو میں چند روز کے بعد اُس کا نام بھی بھول جاتا ہوں، اور اُسے پہچان بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ دماغ

Marfat.com

کی اس کیفیت ہی عجیب کہ کئی اصحاب ہر روز ملنے کے لئے آئیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص کا نام یاد رکھوں، اور ملتے ہی پہچان جاؤں کہ یہ فلاں صاحب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص تپاک سے ملے تو میں اسے نہ پہچانتے ہوئے بے حد ندامت سی محسوس کرتا ہوں اور شرمندگی کے عالم میں پوچھتا ہوں کہ "آپ کا نیاز تو حاصل ہؤا تھا مگر معاف کیجئے مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا" میرے اس جواب سے ملنے والا مطمئن نہیں ہوتا اور وہ میرے اس نہ پہچاننے کو غرور اور تکبرّ خیال کرتا ہے، حالانکہ میں غرور اور تکبرّ کو طبعاً اور فطرتاً کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اس ندامت سے بچنے کے لئے میں ملنے والوں کو دعا سلام کے بعد پوچھنا شروع کر دیتا ہوں کہ "آپ کے مزاج اچھے ہیں؟" "آپ کے بال بچے تو خیریت سے ہیں" لطف یہ ہے کہ یہی سوال بعض اوقات اُن اصحاب سے بھی پوچھ لئے جاتے ہیں۔ جن کے بال بچے تو کجا بے چاروں کی شادی بھی نہ ہوئی ہو۔

ہر زیادہ سوچنے اور دماغ سے کام لینے والا بدحواسیوں میں مبتلا رہتا ہے مگر میں اپنے لئے تو اسے ایک مرض ہی سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں اور دوسرے وہ بدحواس لوگ یقیناً معافی کے مستحق ہیں۔ جو دماغ کی غیر حاضری کے باعث ملنے والوں کی خواہش کے مطابق پوری توجہ نہیں دے سکتے۔

بُزدلی یا بے لبسی

جب پنجاب کے فسادات کا اثر دہلی تک آ پہنچا اور شہر میں قتل و خونریزی کے واقعات شروع ہو چکے تھے تو ایک روز صبح کے وقت پولیس کے دو کنسٹیبل کوچہ قطبی بیگم (جہاں کہ پہلے دفتر "ریاست" تھا) میں آئے اور مسلمانوں سے کہا۔ فسادات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور چونکہ اس کوچہ میں زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے (اس گلی میں آٹھ دس گھر مسلمانوں کے اور باقی تمام کے تمام ہندوؤں کے تھے) اور مسلمانوں کی جان کو خطرہ ہے۔ اس لئے تمام مسلمان ان کنسٹیبلوں کے ساتھ مسلم محلوں میں چلے جائیں۔ چنانچہ محلّہ کے تمام مسلمان اپنے بال بچوں کو لے کر ان کنسٹیبلوں کے ساتھ مسلمانوں کے محلوں میں چلے گئے۔ اپنے گھروں کو چھوڑنے والے ان مسلمانوں کو تیاری کے لئے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا وقت ملا ہو گا۔ کیونکہ کنسٹیبل گلی میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اندازہ ہو سکتا ہے کہ پانچ منٹ کے عرصہ میں یہ لوگ اپنے گھروں کا کیا سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جب یہ لوگ گئے تو اس خیال میں تھے کہ یہ صرف دو چار روز کے لئے جا رہے ہیں۔ جب فرقہ پرستی کا جوش پبلک میں کم ہو گا تو واپس آ جائیں گے

Marfat.com

کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی بار یہ لوگ اسی طرح عارضی طور پر جا چکے تھے۔ ان جانے والوں میں سے ایک تو دفتر "ریاست" والی بلڈنگ کے مالک انور صاحب اپنا گھر ایڈیٹر "ریاست" کے سپرد کر گئے اور یہ اپنے کسی کمرہ کو تالہ تک نہ لگا سکے۔ ان کے ساتھ والے مکان میں ان کی خالہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہ گھر بھی نگرانی کے لئے ایڈیٹر "ریاست" کے سپرد کر دیا گیا۔ اور ان کے مکان کے ساتھ ایک اور بوڑھے مسلمان رہتے تھے۔ جاتے جاتے وہ بھی کہہ گئے "سردار صاحب میں غریب آدمی ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے گھر کا بھی خیال رکھنا کہیں لوٹ نہ لیا جاؤں۔" گویا اس گلی کے تین مکانات کا تو میں "آنریری کسٹوڈین" مقرر کر دیا گیا۔ ویسے میری یہ دلی خواہش تھی کہ جب تک میں اس گلی میں موجود ہوں کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

مسلمانوں کے محلّہ سے چلے جانے کے بعد دوسرے یا تیسرے روز میں دفتر "ریاست" میں بیٹھا مضمون لکھ رہا تھا کہ گلی کا ایک بچہ میرے پاس آیا، اور اس نے کہا کہ گلی میں جو مسجد ہے لوگوں نے اس کا تالہ توڑ لیا ہے اور وہ اس کا سامان لے جا رہے ہیں۔ اس بچہ نے جب یہ کہا۔ تو میں نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ شہر میں دوکانوں کے لوٹ لئے جانے کی وارداتیں ہو رہی تھی۔ لوگ دکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ اور کہیں کہیں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں نے اس واقعہ کو یہ سمجھ کر اہمیت نہ دی، کہ چھوٹی سی مسجد ہے اس میں کیا رکھا ہو گا۔ وضو کرنے کے چند پرانے لوٹے اور بیٹھنے کے لئے ٹوٹی ہوئی چند چٹائیاں ہوں گی۔ لوٹنے والے کمبختوں کو لوٹ لینے دو۔

اس بچہ کی اطلاع کو ابھی دس منٹ ہوئے تھے کہ ایک دوسرا بچہ آیا۔ اس نے کہا کہ لوگ مسجد کو گرا رہے ہیں۔ میں یہ اطلاع سن کر پہلے تو کچھ دم بخود سا ہو گیا۔ مگر چند سیکنڈ کے بعد میری کیفیت یہ ہوئی کہ غصہ کے باعث میں سوچ بھی نہ سکا، اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ گلی میں گیا جہاں کہ مسجد تھی۔ وہاں دیکھا کہ پانچ چھ اشخاص جو کہار ٹائپ کے تھے، مسجد کے میناروں کو گرا رہے ہیں۔ مسجد کے اندر کا کچھ سامان تو یہ لوگ لے جا چکے ہیں، اور کچھ سامان لے جانے کے لئے مسجد سے باہر رکھا ہے۔ یہ سامان ایک آدھ چارپائی، پانی گرم کرنے کا حمام، چٹائیاں اور لکڑی کی ایک آدھ چوکی جس پر بیٹھ کر وضو کرتے ہیں وغیرہ تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو غصہ کے باعث میں ایک حد تک اپنے دماغی توازن سے محروم ہو چکا تھا۔ میں نے جاتے ہی مسجد گرانے والوں کو گالیاں دیں۔ اور زور سے کہا کہ کم بخت کے بچو! اگر مسلمانوں کو مسجد کے گرانے کا علم ہو گیا تو وہ تمہارے گھروں کو آگ لگا دیں گے۔ تم مسجد پر اگر رحم نہیں کر سکتے اور انسانیت سے قطعی محروم ہو چکے ہو تو کم از کم اپنی ذات پر رحم کرو۔ اپنی جائداد کی تباہی کے خیال سے ہی اس کمینہ پن سے باز آؤ۔ میری آواز اور ڈانٹ ڈپٹ سن کر یہ کہار بھاگ گئے۔ محلّہ میں جو دوسرے کہار اور غریب لوگ تھے

Marfat.com

انہوں نے اپنے دروازے بند کر لئے تاکہ مسجد کے گرانے کا الزام اُن پر عائد نہ ہو۔ میں نے دفتر کے ایک آدمی کی امداد سے جو میرے ساتھ ہی وہاں گیا تھا۔ مسجد کے سامان کو گلی میں سے اٹھا کر مسجد کے اندر رکھا، اور مسجد کے دروازہ کو بند کر دیا۔ میں دروازہ بند کر رہا تھا تو قریب کے مکان کی کھڑکی میں سے ایک پنجابی شرنارتھی نے جو ابھی چند روز ہوئے پنجاب سے آئے تھے۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہاں آپ مسجد نہیں گرانے دیتے۔ آپ کے گوردوارے مسلمانوں نے پنجاب میں گرا دیئے۔" میں نے اس کا جواب دیا کہ "یہ تو کوئی دلیل نہیں کہ کلکتہ میں کوئی چوری کرے تو اس کے ہمنام کو بمبئی میں پکڑ لیا جائے۔ جن لوگوں نے پنجاب میں گوردوارے گرائے وہ بلاشبہ سخت سے سخت سزا کے مستحق ہیں۔ مگر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ اس کا بدلہ دہلی کی مسجدیں گرا کر لیا جائے۔" میری اس دلیل کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا، کیونکہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پنجاب سے تباہ ہو کر آئے ہیں اور اپنے دماغی توازن سے محروم ہیں۔ انہوں نے مسجد کے گرانے پر زور دیا۔ میں اس کو شرمناک فعل سمجھتا تھا، معاملہ تو تو میں میں تک پہنچا۔ اگر میری جگہ دہلی کا کوئی شخص ہوتا تو یہ پنجابی شرنارتھی شائد اُس کی دلیل کا جواب ہاتھوں سے دیتے۔ مگر میں پنجابی اور سکھ تھا ان کو کھڑکی میں سے نیچے اترنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں اس تو تو میں میں کے بعد اپنے مکان پر چلا آیا۔ اس وقت تک اس محلّہ میں نہ تو کوئی گھر لٹا تھا اور نہ کوئی قتل ہوا تھا۔

اس مسجد کے متعلق میرے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محلہ کی کہار کلاس اور دوسرے ادنیٰ قسم کے لوگوں کو جو لوٹ مار پر آمادہ تھے (میرا تجربہ ہے کہ لوٹ مار کرنے والوں میں نوّے فی صدی لوگ ادنیٰ قسم کے مزدور پیشہ تھے، اور دس فی صدی دہلی کی بابو کلاس) ان کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ گلی میں میرے موجود ہوتے ہوئے مسلمانوں کے مکانوں کو لوٹتے۔ ویسے وہ دانت پیستے رہتے کہ ان کو لوٹنے کا موقع نہیں مل رہا۔ اور یہ لوگ جب بھی مجھے دیکھتے۔ بڑی ترچھی نظروں سے۔ گویا کہ میں ہندو جاتی کا غدّار یا کوئی بڑا مجرم ہوں۔

مسلمان جب اس محلّہ میں آباد تھے تو ہر جمعرات کو گداگری کے لئے علی الصبح ایک فقیر آیا کرتا، اس کا گلا بہت سُریلا تھا۔ میری عادت صبح چار بجے سے کام شروع کر دینے کی ہے۔ میرے کان بھی ہر جمعرات کو علی الصبح اس فقیر کے گانے کی آواز سے محظوظ ہوا کرتے اس بچارے کو علم نہ تھا کہ اس محلّہ کے تمام مسلمان چند روز پہلے محلّہ خالی کر چکے ہیں۔ اور اس کی گدا نوازی کے لئے کوئی موجود نہیں۔ یہ فقیر ہمیشہ کی طرح اس جمعرات کو بھی علی الصبح گداگری کے لئے محلّہ میں آیا۔ مگر ابھی گلی کے اندر پہنچا نہ تھا کہ گلی کے سرے پر کسی نے اس کو چھرے سے ہلاک کر دیا۔ جب دن نکلا، میرا آدمی چائے کے لئے دودھ لینے بازار گیا۔ تو اُس نے

Marfat.com

دیکھا کہ اس فقیر کی لاش گلی کے سرے پر پڑی ہے ۔ یہ سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی ، مگر کیا ہو سکتا تھا ۔ جس صورت میں کہ خیرات دینے والے لوگوں کی زندگی کی ہی کوئی قیمت نہ رہی ۔ خیرات لینے والے فقیروں کی زندگی کی کیا قیمت تھی ۔ دوپہر کو پولیس آئی اور لاش لے گئی ، نہ رپورٹ ، نہ تفتیش ، نہ جرم ، نہ سزا ۔ قتل کا یہ واقعہ اس محلّہ میں پہلا واقعہ تھا ۔

محلہ کے مسلمان جب محلہ سے جا رہے تھے تو ان مسلمانوں کو لے جانے والے کنسٹیبلوں نے اس کوچہ قطبی بیگم سے بالکل ملحقہ گلی لوہیاں میں رہنے والے ایک مسلمان سے بھی چلنے کے لئے کہا ۔ یہ مسلمان آنکھوں سے اندھا ، بوڑھا اور قریب قریب مفلوج تھا ۔ جو کئی برس سے ایک کوٹھڑی میں پڑا رہتا ۔ اور پڑوسی اس کو کھانے کے لئے دے دیتے ۔ کنسٹیبلوں نے اس کو بھی مسلمانوں کے محلہ میں چلنے کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ یہ کئی برس سے یہاں رہتا ہے ۔ عمر کا کافی حصہ یہاں گذر گیا ، معذور ہے ، اس کا کوئی دشمن نہیں ۔ اس کو کیا خطرہ ہے ، اور یہ نہیں جانا چاہتا ۔ چنانچہ یہ کنسٹیبلوں کے ساتھ نہ گیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز صبح اس کی لاش گلی میں پڑی تھی ۔ آہ ! انسان جب انسانیت سے محروم ہو جائے تو پھر یہ وحشیانہ پن میں حیوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے ۔

مسلمانوں کے محلہ چھوڑنے کے بعد اس گلی قطبی بیگم سے باہر اس قسم کے قتل کے کئی واقعات ہوئے ۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ شاید کوئی دن بھی ایسا نہ تھا جب کہ صبح ایک آدھ لاش نہ ملتی ۔ مگر گلی لوٹ مار سے محفوظ تھی ، اور لوٹنے والا طبقہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا گیا تو ایڈیٹر "ریاست" ان کو گرفتار کرا دے گا ۔ یہ گلی کئی روز لوٹ سے محفوظ رہی اور میرے پاس اطلاعیں آتی رہیں کہ محلہ کا سیوم سنگھی اور ادنٰے طبقہ مجھے اپنے راستہ میں ایک رکاوٹ سمجھتا ہے ۔

ایک روز دوپہر کو مجھے اطلاع ملی کہ لوٹنے والا ایک گروہ قریب کی کسی دوسری گلی سے زینہ لگا کر اس گلی کے ایک مکان میں لوٹنے کے لئے داخل ہوا ہے ۔ اور اس وقت لوٹ رہا ہے میں فوراً اس مکان پر گیا تو دیکھا کہ لوٹنے والے پچھلی گلی کے ایک مکان سے داخل ہو کر اس مکان کو لوٹ رہے ہیں ۔ یہ مکان ایک مالدار مسلمان مقبول صاحب کا تھا ۔ میں نے اونچی آواز کے ساتھ لوٹنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی تو یہ لوگ بھاگ گئے ۔ جب یہ بھاگ رہے تھے تو میں جلدی سے اپنے مکان کی چھت پر چڑھ گیا ، تاکہ دیکھوں کہ یہ کون لوگ ہیں ، اور لوٹ کا سامان کہاں لے جا رہے ہیں ۔ جب میں نے ان کو سامان لے جاتے اور رکھتے ہوئے دیکھ لیا ۔ تو میں نے گلی کے ایک شخص کو تھانہ میں یہ کہہ کر بھیجا کہ سب انسپکٹر کو بلا لاؤ اور کہو کہ ابھی ابھی ایک مکان لوٹ لیا گیا ہے ، اور لوٹ کا سامان ایک دوسرے مکان میں موجود ہے ۔ میرے آدمی بھیجنے کے نصف گھنٹہ بعد تھانیدار صاحب معہ بندوقوں والے تین کنسٹیبلوں کے تشریف لائے ۔ مجھ سے

Marfat.com

حالات پوچھے، میں نے تمام حالات بتائے۔ اپنے مکان کی چھت پر ان کو لے جاکر بتایا کہ لوٹنے والے فلاں مکان کے اندر (یہ مکان میرے مکان سے بالکل پیچھے ایک مہنت کا مکان تھا۔ جس میں کرایہ کے دس بارہ گھر آباد تھے۔ اور آباد لوگوں میں زیادہ تر ادنیٰ قسم کے لوگ ہیں) سامان لے کر گئے۔ تھانہ دار صاحب مجھ سے تمام حالات پوچھ کر اُس مکان میں گئے اس کے بعد اِدھر اُدھر جا، اس سے باتیں کر، اُس سے باتیں کر، نصف گھنٹہ کے قریب تفتیش کرنے کے بعد یہ تھانہ دار صاحب واپس تھانہ میں گئے۔ جو آدمی میں نے اطلاع دینے کے لئے اُن کے پاس بھیجا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ تھا۔ تھانہ میں پہنچ کر تھانہ دار صاحب نے اس آدمی سے کہا، "حرامزادے ہندو ہوتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی، کہ تم ہندوؤں کے خلاف رپورٹ کر رہے ہو۔ پنجاب میں ہندوؤں کے ساتھ کیا ہوا۔ اگر یہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو لوٹ لیا ہے تو کیا جرم ہے" وہ آدمی تھانہ دار کی "امرت بانی" سن کر واپس آ گیا۔ اور اُس نے بتایا کہ تھانہ دار نے اُس سے کیا کہا۔ اس واقعہ سے پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ لوٹنے والوں اور سرکاری ملازموں کی پوزیشن مختلف ہے۔ تھانہ دار کے یہ الفاظ سن کر میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ فسادات کے بند ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

مجھے ٹھیک علم نہیں، مگر خیال ہے کہ تھانہ دار نے تفتیش کے وقت ملزموں کی حوصلہ افزائی کی۔ کیونکہ جن گھروں میں لوٹ کا مال گیا۔ اس کے بعد ان گھروں کے لوگ لوٹ مار کے لئے اور زیادہ تیار ہو گئے۔ اور میرے پاس اطلاع آئی کہ ان لوگوں نے اور محلہ کے سیوم سنگیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایڈیٹر "ریاست" کو قتل کیا جائے اور دفتر "ریاست" کو آگ لگا دی جائے۔ اور اس کے بعد محلہ کے مسلمانوں کے گھر صاف کئے جائیں۔ اس زمانہ میں اخبارات تو بند ہو چکے تھے، دفتر میں کاتبوں کا آنا ممکن ہی نہ تھا، کوئی پریس نہ چل رہا تھا اور دفتر کے چپڑاسی بھی غائب ہو گئے تھے۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ ان دنوں میرے مکان پر مسٹر گوپال پلے ایڈیٹر "پرنسلی انڈیا" مسٹر خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" سردار جنگ بہادر سنگھ ایڈیٹر "شیر پنجاب" اور سیالکوٹ کے حکیم عبدالعزیز (جن کا ہندو نام ہم نے رام لال رکھ چھوڑا تھا تاکہ یہ مسلمان ہونے کے جرم میں مارے نہ جائیں) مقیم تھے۔ ہم چاروں خود ہی کھانا تیار کرتے، برتن صاف کرتے، دن بھر افواہیں سنتے، واقعات رواں پر تنقید کی جاتی، اور رات کو باری باری پہرہ دیتے تاکہ محلہ کے مسلمانوں کے یا کم از کم دو تین مکانات محفوظ رہیں۔ جن کا میں "آنریری کسٹوڈین" تھا۔ کیونکہ انور صاحب کے ساتھ والے یعنی انور صاحب کی خالہ کے مکان میں ان کی خالہ کا کئی ہزار روپیہ اور زیور پڑا تھا۔ اور لوٹنے والی محلہ کی برادری اس کوشش میں تھی کہ سب سے پہلے اس مکان کو صاف کیا جائے۔

جب میرے پاس مجھے ہلاک کرنے اور دفتر "ریاست" کو آگ لگانے کی سکیموں کی اطلاعیں

Marfat.com

پہنچ رہی تھیں تو یہ اطلاع فارورڈ بلاک کے سیکرٹری سردار جگت سنگھ جی کو بھی مل گئی جو قریب کے محلہ میں رہتے تھے، بلکہ انہوں نے تو یہ بھی سُنا کہ دیوان سنگھ پر حملہ ہوا ہے۔ یہ بچارے پنڈت منو دیو شاستری کے ساتھ پریشانی کی حالت میں میرے پاس پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ کیا کچھ انہوں نے سُنا، اور بعض لوگوں کی کیا نیت ہے۔ میں نے ان کو تمام حالات سنائے یہ دونوں دوست چلے گئے۔ تو چند گھنٹہ کے بعد آٹھ دس معزز اصحاب کی ایک پنچایت تشریف لائی۔ تاکہ "غلط فہمی" دفع کی جائے۔ سردار جگت سنگھ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس پنچایت میں سے ایک بزرگ نے کہا:۔

"میں آپ کا اخبار کئی برس سے پڑھتا ہوں آپ بہت بڑے محب الوطن اور دیش سیوک ہیں۔ آپ نے زندگی میں پبلک کے لئے بہت تکالیف برداشت کیں، اور بڑے بڑے نوابوں اور راجوں کا مقابلہ کیا۔ یہ زمانہ بہت نازک ہے۔ مسلمانوں نے پنجاب کے ہندوؤں پر بہت مظالم کئے۔ آپ ہندوؤں کو لوٹنے سے روکتے ہیں، یہ درست ہے کہ آپ اپنی نیک دلی کے باعث ایسا کرتے ہیں، مگر لوگ آپ کے مکان کو آگ لگا دینے اور آپ کو ہلاک کر دینے کے متعلق سکیمیں بنا رہے ہیں۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سادھو اور مہاتما بن جایئے، یعنی آنکھیں بند رکھیئے۔ دنیا میں جو ہونا ہے ہونے دیجئے کسی کو کچھ نہ کہیئے۔"

ان بزرگ کی تائید دوسرے حضرات نے بھی کی اور انہوں نے بطور مخلص اور خیر خواہ کے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں لوٹنے والوں کو نہ روکوں۔ میں نے ان کی اس نصیحت کے بعد ان سے کہا کہ لوٹنا کانگرس اور مہاتما گاندھی کی سپرٹ اور شرافت کے خلاف ہے۔ جس کا جواب انہوں نے یہی دیا کہ لوگ نہ اب مہاتما گاندھی کو جانتے ہیں، نہ کانگرس کو اور نہ شرافت کو۔ اب تو ہر شخص آزاد ہے۔ یہ لوگ اس کے بعد چلے گئے اور میں سوچتا رہا۔ کہ جس صورت میں پبلک لوٹ کو ثواب سمجھتی ہے، قتل اور خونریزی دھرم کا ایک حصہ بن چکی، پولیس اپنے فرائض کو چھوڑ چکی، میں کیا راہ اختیار کروں، اور میں کسی کے لئے کیا مفید ہو سکتا ہوں۔ میں دن بھر اس ذہنی کوفت میں مبتلا رہا۔ اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

اس واقعہ کے اگلے روز گلی کے مسلمانوں کے گھروں کے دروازے ٹوٹ رہے تھے۔ دس دس، بیس بیس اور تیس تیس لوگوں کا گروہ سامان نکال کر لئے جا رہا تھا۔ لوہے کی آہنی الماریاں اور سیف ہتھوڑوں کی زد میں تھے اور پولیس کے سپاہی بندوقیں کندھوں پر رکھے کبھی کبھی گلی میں چکر لگا جاتے تھے گویا کہ یہ گھروں سے بھاگے مسلمانوں کے مکانات کی حفاظت نہیں بلکہ لوٹنے والوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اپنا حصہ ساتھ ساتھ وصول کرتے چلے جا رہے ہیں اور راقم الحروف نے

Marfat.com

اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک سب انسپکٹر پولیس ایک گھر سے بہت قیمتی پلنگ خود نکلوا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس لوٹ سنے وہ تین روز کے اندر گلی کے تمام مسلمانوں کے گھر (سوائے ان تین مکانوں کے جن کا ایڈیٹر "ریاست"، "آنریری کسٹوڈین" تھا، اور جن کا رات کو پہرہ دیا جاتا، اور دن کو لوٹنے سے باز رکھنے کے لئے لوٹنے والوں سے بک بک کی جاتی) صاف کر دیئے۔ چنانچہ یہ ناقابل فراموش واقعات جب کبھی یاد آجاتے ہیں، تو سوچتا ہوں کہ میری موجودگی میں محلہ کے لوگوں کا لوٹ لیا جانا میری بزدلی تھی یا بے بسی۔ مہاتما گاندھی کو تمام حالات بتا کر پوچھا جاتا تو وہ یقیناً اسے بزدلی قرار دیتے۔ مگر میں اپنے ذہن کو دھوکہ دینے کے لئے اسے اپنی بے بسی ہی سمجھتا ہوں۔

دفعہ ۹۰ تعزیرات ہند کا شکار

جنگ کا زمانہ تھا اور میں دہلی جیل میں تھا۔ ایک روز صبح ایک قیدی نے مجھے آکر بتایا کہ پچھلی شام کو جرمنی کا ایک جاسوس گرفتار کر کے جیل میں لایا گیا ہے۔ اور جیل کے افسروں کا حکم ہے کہ کوئی شخص اس یورپین سے بات نہ کرے۔ یہ خبر میرے لئے بے حد دلچسپی کا باعث تھی میں فوراً اس کے پاس گیا یہ جیل کے ہسپتال کے قریب بیٹھا تھا اور ایک نمبردار (جیل میں ایک معین عرصہ گذارنے اور نیک چلن رہنے کے بعد قیدی کو نمبردار بنا دیا جاتا ہے۔ جس کی ڈیوٹی خود کوئی کام نہ کرنا اور دوسرے قیدیوں سے کام لینا ہوتی ہے) اس کے قریب اس ڈیوٹی پر تھا، کہ کوئی قیدی اس سے بات چیت نہ کرے۔ جیل کے قیدی اور نمبردار میرا لحاظ کرتے تھے کیونکہ وہ مجھے اپنا ہمدرد اور پبلک کی خدمت کرنے والا سمجھتے تھے۔ میں جب جرمنی کے اس "جاسوس" کے پاس گیا تو اس نمبردار نے مجھے بات کرنے سے نہ روکا۔ میں نے اس "جاسوس" سے پوچھا کہ تم کس جرم میں گرفتار ہوئے۔ میرے اس سوال کا اس نے جواب دیا "خدا کے لئے مجھے چائے کی پیالی دو، میں بے حد تکلیف میں ہوں میں پھر بتاؤں گا کہ میں کس جرم میں گرفتار ہوا ہوں"

اس کے چائے کی پیالی طلب کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ چائے کی طلب بالکل اسی طرح محسوس کر رہا ہے جس طرح افیون کا عادی افیونی بغیر افیون کے بے چین ہو۔ مجھے معلوم ہوا کہ رات کو اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور صبح جب کوٹھڑی میں سے نکالا گیا تو یہ کچھ نڈھال سا تھا۔ ایک تو مناسب کھانا نہ ملنے کے باعث دوسرے جیل کے باعث ذہنی پریشانی اور تیسرے چائے کی طلب۔ اس کی نڈھالی کا باعث ہیں۔ نمبردار اس کو کوئی دوائی دلوانے کے لئے ہسپتال لایا تھا۔ میں فوراً اپنے کمرہ میں آیا، چائے تیار کرائی اور اس قیدی کے ہاتھ جو میرا کھانا تیار کیا کرتا تھا اس کو بھجوائی۔

Marfat.com

آٹھ نو بجے کے قریب سپرنٹنڈنٹ جیل تشریف لائے ۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ شخص یورپین ہے ۔ تو حکم دیا کہ اسے سپیشل کلاس (جہاں میں ۔ ایک اور یورپین اور دہلی کے ایک صاحب مقیم تھے) میں لے جاؤ ۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد یہ "جاسوس" ہمارے پاس ہی تشریف لے آئے ۔ میرا کھانا دونوں وقت گھر سے آیا کرتا ، اور یہ کھانا انگریزی اور ہندوستانی دونوں قسم کا اور تین چار آدمیوں کے لئے کافی ہوتا ۔ اس "جاسوس" نے جس کا نام مسٹر ٹامس تھا ۔ ہمارے ساتھ کھانا کھایا ۔

جیل میں اگر کسی قیدی سے پوچھا جائے کہ اس نے کیا جرم کیا تھا ، جس کے باعث جیل میں آیا ۔ تو یہ قیدی شرم محسوس کرتے ہوئے کبھی اپنا اصلی جرم نہیں بتاتا ، اور جھوٹ بولتے ہوئے کسی دوسرے جرم کا نام لے دیتا ہے ۔ مثلاً اگر وہ خلافِ وضع فطری ، چوری یا جیب کاٹنے کے جرم میں آیا تو یہی جواب دے گا کہ اس کی رشتہ داروں سے عداوت تھی ، آپس میں لڑائی جھگڑا تھا ، عداوت کا شکار ہوا وغیرہ ۔ اس لئے میں قیدیوں سے ایک خاص طریقہ سے ان کا جرم پوچھا کرتا ۔ ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھتا کہ " پولیس نے تم کو کس جرم میں پھنسایا ؟ " میرے اس سوال کا ان پر ایسا اثر ہوتا کہ وہ اپنے جرم کو چھپا نہ سکتے اور فوراً جواب دیتے کہ زنا بالجبر ۔ چوری یا جیب کترنے کے جرم میں ۔ میں نے مسٹر ٹامس سے بھی یہی سوال کیا کہ پولیس نے تمہیں کس جرم میں پھنسایا ۔ یہ بیچارا فی الحقیقت پھنسایا گیا تھا ، اور قطعی بے گناہ تھا ۔ اس نے جواب دیا " دفعہ ۱۰۹ یعنی آوارہ گردی کے جرم میں " ۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس کے پاس جب کسی جرم کے متعلق کوئی ثبوت نہ ہو تو یہ لوگ دفعہ ۱۰۹ (آوارہ گردی) کی امرت دھارا استعمال کرتے ہیں ۔ اس بیچارے پر یہی دفعہ استعمال کی گئی ہے ۔

اب اس ٹامس کے اصل حالات سنیئے : ۔ یہ شخص یورپ کے کسی ملک کا رہنے والا تھا ۔ پیشہ کے لحاظ سے موٹر کار کی مشینری کا ماہر اور بہت اچھا موٹر ڈرائیور ۔ ایک عرصہ تک فرانس ، اٹلی ، انگلستان مصر ، روس اور عرب وغیرہ میں رہا ۔ اور یہ فرانسیسی ، انگریزی ، روسی اور عربی وغیرہ کئی زبانوں کو بلا تکلف بول سکتا تھا ۔ اور جب بغداد میں تھا تو یہ کرنل لارنس آف عریبیا (جس نے عربوں کے متعلق ۱۹۱۴ء کی جنگ میں انگریزوں کی بہت خدمات انجام دیں ۔ اور جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا) کے پاس بطور موٹر ڈرائیور ملازم رہا ۔ یہ کرنل لارنس کے چشم دید واقعات ایڈیٹر "ریاست" کو سنایا کرتا ۔ جو بے حد دلچسپ ہیں ، اور ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کرنل لارنس نہ صرف غیر معمولی انسان تھے بلکہ بہت بلند بھی تھے ۔ کرنل لارنس کے پاس کئی برس رہنے کے بعد بمبئی آ گیا ۔ اور وہاں ایک معمولی ہوٹل ہی ہاؤس اختیار کر لی ۔ جس کو ایک یورپین لیڈی بطور بورڈنگ ہاؤس کے چلاتی تھی ۔ وہاں اس نے اخبارات میں ایک اشتہار دیکھا کہ گورنمنٹ کو ایسے ترجمان کی ضرورت ہے جو روسی زبان سے واقف ہو اور جو روسیوں کے ساتھ بات چیت کر سکے یہ اشتہار دیکھ کر اس نے ملٹری انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر کے پاس پونا درخواست بھیجی

Marfat.com

وہاں انٹرویو کے لئے گیا۔ انٹرویو کے بعد اس کو آٹھ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا گیا۔ ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی گئی اور اس کو ایک خط سربمہر کر کے ڈائریکٹر ملٹری انیٹلی جنس پشاور (جہاں سرحد پر بعض روسی پکڑے گئے تھے) کے نام دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ یہ فوراً پشاور جا کر ملازمت پر حاضر ہو جائے۔

یہ خط لینے کے بعد فرنٹیئر میل سے دہلی پہنچا۔ جیب میں روپیہ تھا۔ ایک برس پہلے بھی یہ دہلی آیا تو یہاں بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ وہاں کی یورپین نرس سے میل جول ہو گیا تھا۔ اب دہلی آیا تو وہ نرس یاد آ گئی۔ اس ہسپتال میں پہنچا، نرس سے ملا، اور اسے ہوٹل میں (جہاں مقیم تھا) کھانے پر آنے کی دعوت دی۔ نرس آئی، وسکی کے جام پیئے گئے اور کھانے کے بعد یہ دونوں ٹیکسی پر سوار ہو کر نئی دہلی سیر کے لئے گئے۔ دو تین دن یہ دہلی میں رہا۔ تیسرے روز رات کے آٹھ بجے فرنٹیئر میل میں سوار ہونے کے لئے ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں تھا تو قریب ہی داڑھی والے مولوی ٹائپ کے ایک مسلمان بھی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ وقت گذارنے اور یہ بتانے کے لئے کہ یورپین ہوتے ہوئے بھی عربی جانتا ہوں۔ اس نے مولوی صاحب سے عربی زبان میں پوچھا۔ آپ کا نام کیا ہے۔ اور کہاں رہتے ہیں۔ یورپین کے منہ سے عربی زبان کے الفاظ سن کر مولوی صاحب بے حد خوش ہوئے اور عربی میں بات چیت شروع ہو گئی۔ جب یہ باتیں کر رہے تھے تو پلیٹ فارم پر سی۔ آئی۔ ڈی کا ایک کنسٹیبل بھی اِدھر اُدھر چکر لگا رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ایک یورپین عربی زبان میں مولوی صاحب سے باتیں کر رہا ہے تو اس نے سمجھا کہ یقیناً یہ شخص جرمنی کا جاسوس ہو گا جو مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پراپاگنڈا کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ فوراً ریلوے سٹیشن کے تھانہ میں پہنچا۔ وہاں ایک گورا سارجنٹ ڈیوٹی پر تھا۔ اس گورے سارجنٹ سے سی۔ آئی۔ ڈی کے کنسٹیبل نے کہا کہ پلیٹ فارم پر جرمنی کا ایک جاسوس ایک مولوی صاحب سے عربی زبان میں بات چیت کر رہا ہے۔ گورے سارجنٹ کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ اور اس نے سمجھا کہ بہت بڑا شکار ہاتھ آیا۔ یہ تحقیقات کے لئے "موقع واردات" پر پہنچا تو اس نے اپنے کانوں سے یورپین کو عربی میں باتیں کرتے سنا۔ فوراً پھر تھانہ میں جا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی مسٹر ہیلر (یہ حضرت آجکل پاکستان میں کہیں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں) کو ٹیلی فون کیا۔ اور کہا کہ جرمنی کا ایک جاسوس پلیٹ فارم پر عربی زبان میں ایک مولوی صاحب سے باتیں کر رہا ہے۔ مسٹر ہیلر نے ٹیلی فون پر ہی کہا کہ فوراً گرفتار کرو۔ تلاشی لے کر سول لائن کے تھانہ کی حوالات میں بند کرو۔ اور صبح پیش کرو۔ چنانچہ مسٹر ٹامس جو گاڑی کے انتظار میں تھے پلیٹ فارم پر گرفتار کر لئے گئے۔ تھانہ سول لائینز میں لائے گئے تلاشی لی گئی اور حوالات میں بند کر دیئے گئے۔

اگلے روز دس بجے وہی گورا سارجنٹ موٹر سائیکل پر تھانہ پہنچا۔ موٹر سائیکل پر ہی پچھلی سیٹ

Marfat.com

پر ٹامس کو بٹھایا۔ سی۔آئی۔ڈی کے دفتر میں پہنچ کر مسٹر میلر کے سامنے پیش کیا۔ مسٹر میلر تلاشی کے سامان میں سے وہ لفافہ کھول کر دیکھ چکے تھے۔ جو ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس بیورو پونا نے سربمہر ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس پشاور کے نام بھیجا تھا۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ یہ جاسوس نہ صرف جرمنی کا جاسوس ہے بلکہ جعل ساز بھی ہے جو حکام کے نام کے خطوط جعلی تیار کر کے ہندوستان میں پھرتا اور اپنا کام نکالتا ہے۔ مسٹر ٹامس اور مسٹر میلر کے درمیان دفتر سی۔آئی۔ڈی میں انیٹروگیشن کے سلسلہ میں یہ بات چیت ہوئی:۔

میلر:۔ تم دہلی کیوں آیا۔

ٹامس:۔ پشاور ملازمت پر جا رہا تھا راستہ میں اترا۔

میلر:۔ تم دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہو، سی۔آئی۔ڈی کو نہیں۔ تم یہاں دہلی میں کس کس سے ملے۔

ٹامس:۔ ہوٹل میں مقیم ہوا، فلاں ہسپتال کی فلاں نرس سے ملا، ٹیکسی پر سیر کو گیا۔ دو دن اور دو رات رہا۔ اور کسی سے نہیں ملا۔

میلر:۔ یہ خط تم نے جعلی تیار کیا ہے، اچھے جعلساز ہو۔

ٹامس:۔ میں جعلساز نہیں۔ تم کو ذمہ داری کے ساتھ بات کرنی چاہیئے۔ کسی شریف آدمی پر الزام لگانا شرافت نہیں۔

میلر:۔ تم شریف نہیں ہو۔

اس کے بعد ٹامس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا، اور غصہ میں میلر کو سوائن (سور) تک کہہ دیا۔ جس پر میلر نے حکم دیا کہ دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی کے جرم میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے جیل بھیج دو۔ چنانچہ ٹامس مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹوں کی پوزیشن سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے بالکل ایسی تھی جیسے گاؤں کے کسی نمبردار کی ڈپٹی کمشنر کے سامنے۔ مجسٹریٹ نے ضمانت طلب کی۔ وہاں ضمانت دینے والا کون تھا اور اگر کوئی ضمانت دینے والا ہوتا بھی تو تعزیرات ہند کی دوسری دفعات موجود تھیں۔ کسی دوسری ناقابلِ ضمانت دفعہ کے ماتحت جیل بھیج دیا جاتا چنانچہ ٹامس صاحب مجسٹریٹ کے سامنے حاضری دینے کے بعد جیل میں بھیج دیئے گئے۔

اس کے بعد مسٹر میلر نے خط لکھنے والے ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس پونا کے نام کانفیڈنشل خط لکھا اور ”جعلی“ خط ساتھ بھیجا۔ کہ اگر ٹامس کے متعلق مزید معلومات ہوں تو لکھیئے۔ تاکہ اس جاسوس کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اور دہلی میں نرس، ٹیکسی ڈرائیور اور ہوٹل والوں کی سی۔آئی۔ڈی میں پیشیاں شروع ہوئیں۔ جو حیران کہ وہ جاسوس سے کیوں ملے۔ اتفاق ہوا کہ ڈائریکٹر صاحب پونا سے مدراس کی طرف دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ دو ماہ کے قریب دورہ پر رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو انہوں نے جواب دیا کہ ٹامس کو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے

Marfat.com

کہ اس نے ملٹری انیٹلی جنس کو بطور ترجمان ملازمت کے لئے درخواست دی اور اس کو ملازمت دے دی گئی۔ وہ خط اُن کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ہے، جعلی نہیں، اور ملازم رکھنے سے پہلے بمبئی سی۔آئی۔ڈی سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا تھا تو سی۔آئی۔ڈی بمبئی نے لکھا تھا کہ ٹامس شریف آدمی ہے اور عرصہ سے بمبئی میں رہتا ہے۔

اس جواب کے آنے سے پہلے ٹامس کو پولیس ہر دس پندرہ روز کے بعد مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرتی اور ریمانڈ لے لیتی۔ نہ مجسٹریٹ پوچھتا کہ ریمانڈ دفعہ ۱۰۹ (آوارہ گردی) میں کیوں لیا جا رہا ہے۔ اور نہ کوئی دوسرا افسر۔ تین ماہ تک ریمانڈ ملتے رہے اور ٹامس صاحب جیل میں ہمارے ساتھ رہتے رہے۔ اس بچارے کو اس سے پہلے جیل میں جانے کا کبھی اتفاق نہ ہُوا تھا۔ اور ہم جیل کے پرانے رسیا تھے۔ اس غریب کو رات بھر نیند نہ آتی۔ بہت پریشان رہا کرے ہم گہری نیند میں خراٹے لیا کرتے۔ تین ماہ کے قریب جیل میں رہا تو ایک روز گورا سارجنٹ اس کو جیل سے لینے کے لئے آیا۔ جیل سے اسے عدالت میں لے جایا گیا۔ وہاں پہلے انتظام ہو چکا تھا۔ پولیس کے ایک گرگے نے مسٹر ٹامس کی دو سو روپیہ کی ضمانت نیک چلنی داخل کی۔ اور ٹامس صاحب رہا ہوئے۔ حسب ہدایت گورا سارجنٹ ٹامس کو رہائی کے بعد سی۔آئی۔ڈی کے دفتر میں لایا۔ یہ گھبرا رہا تھا کہ کوئی نیا جال تیار نہ کر لیا ہو۔ مگر اسے تسلی دی گئی۔ یہ مسٹر میلر کے سامنے پیش کیا گیا، تو اس نے جو تکلیف بلاوجہ اٹھائی اس کی مسٹر میلر نے معافی مانگی اور کچھ روپیہ (مجھے ٹھیک یاد نہیں غالباً دو سو روپیہ تھا "بطور دوستانہ امداد" (یہ روپیہ نہ معلوم مسٹر میلر نے اپنی جیب سے دیا یا کسی خفیہ فنڈ سے) نذر کیا۔ اس کو ایک روز ہوٹل میں رکھا گیا تاکہ یہ آرام کرے۔ اس ہوٹل کا بل بھی مسٹر میلر کے مقرر کئے ہوئے ایک سب انسپکٹر نے ادا کیا اور ٹامس صاحب اپنا اصلی سفارشی خط (جو چند روز جعلی دستاویز رہا) لیکر اپنی ملازمت پر پشاور روانہ ہو گئے۔ گویا کہ یہ یورپین عربی بولنے کے جرم میں زیر دفعہ ۱۰۹ (آوارہ گردی) تین ماہ تک جیل میں ہز امپیریل میجسٹی کنگ جارج کا سرکاری مہمان رہا۔

فسادات کا کریکٹر پر اثر

فسادات کے دنوں کے کچھ حالات ایڈیٹر "ریاست" نے لکھے ہیں۔ جو اس کے چشم دید تھے ذیل میں کچھ مزید حالات لکھے جاتے ہیں جو دلچسپ ہیں، اور جن کا ایڈیٹر "ریاست" کو ذاتی علم ہے۔ انور صاحب ایڈیٹر رسالہ "بانو" جن کے مکان میں میں رہتا تھا۔ خیالات کے اعتبار سے کانگرسی ہیں، اور کانگرسی بھی بہت سخت قسم کے۔ یہ کانگرس کی تحریکوں میں حصہ بھی لیتے رہے تھے اور

Marfat.com

کانگرس کے ورکرز ان سے واقف تھے۔ان کو یہ یقین تھا کہ فسادات چاہے کتنا بھی زور پکڑ جائیں ان کے کانگرسی ہونے کے باعث ان کو کوئی کچھ نہ کہے گا۔ چنانچہ یہ فسادات کے دنوں میں ہر جگہ چلے جاتے۔ ایک روز یہ چاندنی چوک سے نئی سڑک پر آ رہے تھے۔ تو راستہ میں ہندوؤں کا ایک گروہ جو اس زمانہ میں مسلمانوں پر حملے کرنے کے لئے جمع ہو رہا تھا ، ان پر لپک پڑا۔ اور اس نے ان کو پیٹنا شروع کر دیا۔ انور صاحب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے اور ابھی ان پر کسی مہلک ہتھیار سے حملہ نہ ہوا تھا ، کہ اس گروہ میں سے ایک کانگرسی نے ان کو پہچان لیا۔ اور اپنے ہمراہیوں کو پکار کر کہا کہ یہ تو کانگرسی اور مسلم لیگ کا مخالف ہے۔ اس کو چھوڑ دو چنانچہ حملہ کرنے والوں نے جب یہ سُنا تو انہوں نے انور صاحب کو چھوڑ دیا۔ اور دو تین کانگرسی ان کو سہارا دے کر ان کے گھر پہنچا گئے۔ انور صاحب جب گھر پہنچے تو یہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے۔ اور ان کو اپنے پوشیدہ مقامات کو کپڑے سے چھپانے کا بھی احساس نہ تھا۔ ان کے پہنچنے پر ان کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ان کے حواس درست ہوئے۔ تو ان کی حالت کو دیکھ کر ایک صاحب نے کہا کہ یہ کانگریسی ہونے کے باعث بچے۔ کیونکہ بے خوف ہو کر شہر میں پھرتے تھے۔ میں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے مگر کانگرسی ہونے کے باعث ہی یہ بچ بھی گئے۔ اگر کانگرسی نہ ہوتے اور ان کو مجمع میں کانگرسی پہچان نہ لیتے تو یہ اُسی وقت ختم کر دیئے جاتے۔

چرخے والاں (جہاں دفتر "ریاست" تھا) میں مسلمانوں کے مکانات لوٹے جا رہے تھے۔ اور دس دس ، پندرہ پندرہ ، بیس بیس آدمیوں کے گروہ سامان لوٹنے کے لئے آ رہے تھے تو ایڈیٹر ریاست" نے دیکھا کہ دو سکھ جو جنٹلمین قسم کے تھے۔ یعنی آنکھوں پر عینک ، جسم پر سوٹ ، جیب میں فونٹین پین اور پاؤں میں بوٹ غسل کے ایک بہت بڑے ٹب کو اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ایک لڑکا ہے جس نے ساگوان کی ایک خوب صورت تپائی کو اٹھایا ہوا ہے۔ ان لوگوں کو یہ سامان لے جاتے ہوئے ایڈیٹر "ریاست" نے دیکھ لیا تو یہ کچھ جھینپ گئے اور اپنی ندامت کو چھپانے کے لئے ڈھیٹوں کی طرح ایک نے کہا "یہ ٹب شرنارتھیوں کے لئے لے جا رہے ہیں۔ کیمپ میں دال ڈالنے کے کام آ جائے گا۔" میں ان کو کیا جواب دیتا ، یہی کہا "بہت اچھا خیال ہے ، آپ بہت بڑی قومی سیوا کر رہے ہیں۔ ساگوان کی یہ تپائی روٹیاں رکھنے کے کام آ جائے گی۔" میرے اس طنز کو سن کر یہ مزید نادم ہوئے۔ انہوں نے گردنیں نیچی کر لیں۔ مگر ڈھیٹوں کی طرح چلے گئے۔

فسادات ابھی ختم نہ ہوئے تھے مگر ان کی شدت میں کمی آ چکی تھی کہ ایک روز چند ہندو کانگرسیوں کے ساتھ انور صاحب اپنے نئے مکان سے (جہاں وہ فسادات کے باعث چلے گئے تھے)

Marfat.com

ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لئے دفتر "ریاست" میں آئے۔ یہ مل کر واپس جا رہے تھے، تو ان کو جانتے ہوئے راستہ میں ایک کانگرسی نے دیکھا۔ جو سپیشل مجسٹریٹ بھی مقرر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اگلے روز ان سپیشل مجسٹریٹ نے (جو فسادات میں امن قائم کرنے کے لئے سپیشل مجسٹریٹ بنائے گئے تھے) ان کانگرسیوں سے جو انور صاحب کو ملانے کے لئے دفتر "ریاست" میں لائے اور واپس لے گئے تھے۔ کہا :-

"تم کہاں کے ہندو ہو جو ایک مسلمان کو نہ صرف ختم نہ کیا۔ بلکہ اس کو حفاظت میں لے گئے" اس پر ان کانگرسیوں نے کہا کہ "وہ تو کانگرسی تھا" اس کے جواب میں اس اسپیشل مجسٹریٹ نے فرمایا "چاہے کانگرسی تھا مگر تھا تو مسلمان"! فسادات ختم ہوئے تو ان اسپیشل مجسٹریٹ کو معلوم ہو گیا کہ اس واقعہ کا ایڈیٹر "ریاست" کو علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ آپ دفتر "ریاست" میں تشریف لائے اور اپنی کرتوت پر اظہار ندامت کیا اور معافی چاہی۔ ایڈیٹر "ریاست" ان سے کیا کہتا۔ اپنے دل میں ہی کہا کہ جب دنیا نے ہی قتل اور لوٹ مار کرنا پاپ اور گناہ نہ سمجھا اسے ثواب سمجھ لیا گیا تو اس بچارے کانگرسی سپیشل مجسٹریٹ کا کیا قصور ہے۔

دفتر "ریاست" کے قریب ایک مسلمان بڑھئی رہتا تھا۔ جو ایڈیٹر "ریاست" کے وہاں جانے سے پہلے اپنے غنڈہ پن کا ثبوت دیتے ہوئے خوانچہ والے ہندوؤں سے اشیا لے کر کھا جاتا مگر ان کو پیسے نہ دیتا۔ محلہ کے تمام لوگ اس کے غنڈہ پن سے عاجز تھے۔ جسے چاہتا گالیاں دیتا اور جسے چاہتا دھمکاتا۔ محلہ کے بنیا کلاس کے ہندو اس سے دب کر رہتے۔ ایک دفعہ دفتر "ریاست" کے سامنے والے مکان میں ایک نئے کرایہ دار جو سکول ماسٹر تھے آئے تو اس غنڈہ نے ان کو بلاوجہ دھمکایا۔ اور کہا کہ کس سے پوچھ کر رہائش اختیار کی ہے۔ گویا کہ یہ غنڈہ اس گلی کا "میر محلہ" ہے۔ مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو میں نے تکلیف محسوس کی۔ اس غنڈہ کا باپ شریف آدمی تھا جو اپنے بیٹے سے عاجز تھا۔ اس کو بلا کر میں نے کہا کہ اپنے بیٹے سے کہہ دیجئے کہ وہ آئندہ اس محلہ میں غنڈہ پن کا ثبوت نہ دے ورنہ میں افسروں کو تو بعد میں کہوں گا پہلے خود اس کی مرمت کروں گا۔ میری اس تنبیہ کے بعد اس نے کبھی کسی کو تنگ نہ کیا۔ اور اس سے پہلے جہاں یہ گلی میں اکڑ کر اور چھاتی تان کر چلتا، اس کے بعد گردن نیچے کئے چلتا۔ فسادات جب شروع ہوئے تو یہ بھی محلہ سے چلا گیا، اور اس کو بھی لوٹ لیا گیا۔ اس کے گھر میں سوائے بڑھئی کے اوزاروں اور لکڑی کے چند بڑے چھوٹے ٹکڑوں کے کچھ نہ تھا۔ فسادات ختم ہوئے اور لوگوں نے اپنے لٹ چکے سامان کے نقصان کی فہرستیں دیں۔ تو اس نے اپنے سامان کی قیمت کا اندازہ پانچ ہزار روپیہ لکھوایا۔ اس کا خیال تھا کہ جو لکھا یا جائے گا مل جائے گا۔ مگر اس کو کیا علم کہ "قومی لوٹ" میں سود تو کیا اصل بھی نہیں ملا کرتا۔ اس لوٹ اور قتل نے اس غنڈہ کی

Marfat.com

کمر کے بل بھی نکال دیئے۔ اور اب نہ تو اس کا غنڈہ پن باقی ہے اور نہ یہ اس محلہ میں جا سکتا ہے جہاں کہ یہ گردن تان کر چلا کرتا تھا۔

فسادات کے دنوں میں نہ کوئی ہندو مسلمانوں کے محلہ میں جا سکتا تھا۔ نہ مسلمان ہندوؤں کے محلہ میں۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اور کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ کہ اچھا کون ہے اور بُرا کون ہے۔ ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں پیغام کا آنا جانا بھی ممکن نہ تھا۔ فسادات کے دنوں میں مجھے اپنی اتنی فکر نہ تھی۔ جتنی دوستوں کی وہ چاہے ہندو تھے، مسلمان یا سکھ۔ میں ظفر صاحب سے (جو "ریاست" کے سالہا سال سے پرنٹر و پبلشر تھے) ملنے اور اُن کی خیریت دریافت کرنے کے لیئے بے چین رہتا۔ چنانچہ ملاقات کا طریقہ یہ تھا کہ میں ہندو محلوں سے ہوتا ہُوا تھانہ فیض بازار میں پہنچتا۔ وہاں سے پولیس کے کسی مسلمان کنسٹیبل یا کسی مسلمان کانگریسی کو ظفر صاحب کے گھر بھیج کر اُن کو بلواتا اور ہم تھانے میں بیٹھ کر باتیں کر لیتے کیونکہ تمام شہر میں صرف پولیس کے تھانے ہی محفوظ مقام تھے جہاں کہ بندوقوں کا پہرہ ہوتا اور کسی حملہ کا خدشہ نہ تھا۔

کوچہ قطبی بیگم کے مسلمانوں کے ایک گھر میں ستر پچھتر ہزار روپیہ کا سامان تھا۔ فسادات کا جوش کچھ کم ہُوا تو مالکہ مکان کی لڑکی دو مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے کر اپنا گھر دیکھنے آئی۔ یہ اپنے گھر پہنچی تو نقشہ بدلا ہُوا تھا، گھر کا سامان، فرنیچر، بجلی کے پنکھوں، برتنوں اور دوسری اشیاء کا کیا سوال ہے لوٹنے والے دیواروں پر سے بجلی کے تار بھی نکال کر لے گئے تھے۔ اور گھر میں شرنارتھیوں کے تین چار خاندان آباد تھے۔ یہ لڑکی جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو گھر کی دیواروں کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی جیسے کوئی دیوانہ دیکھتا ہے۔ اس کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ خواب دیکھ رہی ہے یا کہ مکان کی حالت فی الحقیقت ایسی ہو چکی ہے۔ مکان کو دیکھنے کے بعد اُس نے کہا۔ اچھا خدا کی مرضی یہی تھی۔ تم لوگ خوشی سے اس مکان میں رہو مگر مکان کو آگ نہ لگانا۔ اس نے آگ نہ لگانے کی اس لیئے التجا کی۔ کیونکہ اُس نے سُنا تھا کہ اگر کسی مکان سے شرنارتھیوں کو نکالا جائے تو شرنارتھی مکان کو آگ لگا دیتے ہیں۔

میں شام کے وقت بیٹھا تھا کہ ہمدرد دواخانہ کے مالک حکیم عبدالحمید صاحب کے چھوٹے بھائی سعید صاحب ایک سکھ سب انسپکٹر اور دو مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ دفتر "ریاست" میں آ گئے۔ میں حیران کہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے ایک خط دیا جو حکیم صاحب کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ فوراً آ کر مِل جاؤ، ضروری کام ہے۔ میں نے چلنے کے لیئے کوٹ پہن لیا اور روانہ ہُوا تو زینہ میں اترتے ہوئے سب انسپکٹر نے خیر خواہی کے انداز میں کہا: یہ مسلمان ہیں، ان کا اعتبار نہ کرو۔ خطرہ ہے، آپ کو جانا نہ چاہیئے۔ یہ سن کر میں مسکرا دیا۔ یہ سب انسپکٹر بچارا نہ حکیم صاحب کو جانتا تھا نہ مجھے اس

Marfat.com

کا علم صرف یہاں تک ہی محدود تھا کہ حکیم صاحب مسلمان ہیں، اور میں سکھ ہوں ۔ میں نے کہا پروا نہ کیجئے میں حکیم صاحب کو جانتا ہوں ۔ گلی سے باہر آیا تو حکیم صاحب کی موٹر کھڑی تھی ۔ اس میں سوار ہو کر ہم لوگ دریا گنج حکیم صاحب کی کوٹھی گئے ۔ جہاں سینکڑوں آدمی کام کرتے تھے وہاں اب ایک سناٹا چھایا ہوا تھا کیونکہ فسادات کے باعث کسی کاریگر کا آنا ممکن نہ تھا ۔ کوٹھی میں صرف حکیم صاحب کے پانچ چھ ملازم تھے ۔ ارد گرد بلکہ دور تک تمام ہندوؤں کی کوٹھیاں اور مکانات ۔ صرف اکیلے حکیم صاحب مسلمان تھے جن کا یہ کارخانہ تھا ۔ کوٹھی کے اندر گیا، حکیم صاحب کوٹھی کے پچھلی طرف دریا کے کنارہ والے کمرہ میں ایک کرسی پر بیٹھے تھے ۔ حکیم صاحب سے ملا، خیریت دریافت کی تو حکیم صاحب نے بتایا کہ کئی راستوں سے کوٹھی پر حملہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور پچھلی رات دو سو کے قریب ہندوؤں کا مجمع رات کو گیارہ بارہ بجے حملہ کرنے کے لئے آ بھی رہا تھا کہ اتفاق سے پہرہ دینے والی فوجی گارد آ گئی ۔ اس گارد کو دیکھ کر یہ لوگ بھاگ گئے ۔ رات کو بندوقوں کے فائر کئے جاتے ہیں ۔ اور بعض سرکاری افسر بھی اس کوشش میں ہیں کہ کوٹھی پر حملہ ہو اور کوٹھی لوٹ لی جائے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، ہر لمحہ حملہ کا خطرہ ہے ۔ تمام حالات بتاتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا ۔ میں اپنے غیر مسلم دوستوں میں سے آپ پر بہت بھروسہ کرتا ہوں ۔ مجھے رائے دیجئے کہ کیا کروں اور آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں ۔" میں نے جواب دیا کہ آپ کوٹھی تو ملازموں اور پولیس کی حفاظت میں دیجئے اور فوراً یہاں سے اپنے شہر والے مکان میں جو مسلم محلہ میں ہے منتقل ہو جائیے ۔ آپ کا یہاں چند گھنٹے رہنا غیر مناسب اور خطرہ کا باعث ہے اور مقامی حکام سے مل کر کوٹھی کی حفاظت کرنی چاہیئے ۔ میں آپ کی کوٹھی کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہوں اور دن رات پہرہ دوں گا ۔ مگر میری غیر حاضری میں انور صاحب کا، ان کی خالہ کا اور میرے پڑوس کے ایک غریب مسلمان کا مکان لوٹ لیا جائے گا، جو اب تک بچا ہوا ہے ۔ اگر وہاں کا انتظام ہو جائے تو میں فسادات کے دنوں تک کے لئے آپ کی کوٹھی میں آ جاتا ہوں ۔ اس مشورہ کے بعد میں اور حکیم صاحب مسٹر رندھاوا ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی گئے تو وہاں ملازموں نے بتایا کہ رندھاوا صاحب تو کئی روز سے کوٹھی پر نہیں آئے ۔ اگر آتے ہیں تو کبھی رات کے وقت ۔ فسادات دور کرنے میں دن رات مصروف ہیں ۔ اور ٹاؤن ہال میں ملیں گے ۔ ہم لوگ ٹاؤن ہال پہنچے ۔ وہاں سے پتہ چلا کہ مسٹر رندھاوا انتظام کے سلسلہ میں لال قلعہ میں گئے ہیں ۔ ان کا کچھ دیر انتظار کیا ۔ پھر ہم لالہ ساوتری پرشاد سے ملے اور تمام حالات بیان کئے تو انہوں نے ایک دوسرے مجسٹریٹ مسٹر گپتا سے کہا کہ حکیم صاحب کی کوٹھی کا فوراً انتظام کیا جائے ۔ مسلح پولیس تھوڑی دیر کے بعد وہاں جائے اور کوٹھی کو ہر صورت میں خطرہ سے محفوظ رکھا جائے ۔ اس وقت کچھ اندھیرا ہو چکا تھا ۔ ہم لوگ ٹاؤن ہال سے بلی ماراں میں ہوتے ہوئے چوڑی والاں پہنچے ۔ بلی ماراں بالکل سنسان ۔ تمام بازار میں ایک آدمی نظر نہ آیا چوڑی والاں سنسان، کوئی آدمی موجود نہ تھا ۔ چوڑی والاں اور بلی ماراں کے درمیانی بازار میں ایک شخص کی ایک لاش پڑی تھی جس کو کسی نے تھوڑی دیر پہلے ہلاک کیا تھا ۔ یہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا اتصال ہے یعنی اس

Marfat.com

جگہ سے چرختے والان کی طرف تو ہندوؤں کی آبادی ہے اور بلی ماران کی طرف مسلمانوں کی۔ ہمیں معلوم نہیں کہ لاش ہندو کی تھی یا مسلمان کی۔ حکیم صاحب نے مجھے چرختے دالان میں اتار دیا، اور خود اپنی کوٹھی تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پولیس نے کوٹھی کی حفاظت کا انتظام کر دیا تھا۔ اور ایک روز مولانا ابوالکلام بھی حکیم صاحب کی خیریت دریافت کرنے وہاں گئے تھے۔

فسادات کے دنوں میں مجھے ایک خط ملا، جو ایک مسلمان کا تھا (مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ اُن کی لڑکی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی تھیں۔ اور وہ "ریاست" میں مضامین بھی لکھا کرتی تھیں) اس میں لکھا تھا کہ یہ دہلی سے جا رہے ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" کو مکان کی ضرورت ہے۔ یہ فوراً آکر مکان پر قبضہ کر لیں۔ یہ خط تو اُس وقت لکھا گیا جب فسادات کے شروع ہونے کا خطرہ تھا، اور کہیں کہیں حملے ہو رہے تھے۔ مگر خط ڈاک خانہ کا کام معطل ہونے کے باعث پندرہ روز بعد ملا۔ یہ خط کچھ دن میری جیب میں بھی پڑا رہا، میں ایک روز ایک دوست کے ساتھ ٹاؤن ہال (جو ان دنوں شہر کے انتظام کے لئے ایک مرکز تھا) میں گیا تو خیال آیا کہ وہ مکان دیکھنا چاہیئے۔ میں نے میر مشتاق احمد سے یہ خیال ظاہر کیا تو انہوں نے وہاں ایک جیپ گاڑی کا انتظام کر دیا۔ منشی عبدالقدیر اور ڈاکٹر خالد وہاں موجود تھے وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ ڈاکٹر خالد کے پاس بندوق تھی۔ ہم لوگ گلیوں کے چکر کاٹتے ہوئے اس مکان میں جا رہے تھے تو راستہ میں دیکھا کہ ایک لُٹے ہوئے مکان میں سے دو تین عورتیں اور دو تین مرد نکلے ہیں۔ ڈاکٹر خالد کے ہاتھوں میں بندوق تھی۔ انہوں نے پوچھا "تم کون لوگ ہو جو یہاں پھر رہے ہو؟" ڈاکٹر خالد نے تو اس خیال سے کہا کہ یہ لوگ بھی شاید مکانوں میں سے بچا کھچا سامان لے جا رہے ہیں۔ اس "قومی قافلہ" میں سے بوڑھی عورت نے جواب دیا "کوئی بات نہیں ہم ہندو ہیں" گویا کہ ہندوؤں کو لوٹنے کا لائسنس ملا ہوا تھا۔ اس خاتون نے مجھے اور منشی عبدالقدیر کو ان کی داڑھی کے باعث سکھ سمجھا اور ڈاکٹر خالد کو ہندو۔ اس لئے ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اس نے بے تکلف کہا، "کوئی بات نہیں ہم ہندو ہیں" اس عورت کا یہ جواب سن کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور کہا "کوئی بات نہیں ہم سب ہندو بھائی ہیں" اس کے بعد ہم لوگ اس مکان میں پہنچے جس کے متعلق خط آیا تھا۔ مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک نوجوان سردار صاحب نکلے انہوں نے ہم لوگوں کو مع بندوق کے دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔ میں نے کہا مکان دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے مکان دکھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا ہم لوگ صرف مکان دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں آپ دیکھ لینے دیجئے بجائے ہمیں مکان دکھانے کے انہوں نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا اور مکان دکھانے سے انکار کیا۔ اس پر مجھے غصہ آگیا میں نے کہا "سردار جی میں بھی سکھ ہوں اور پنجابی ہوں دہلی کا بنیا نہیں، ہم صرف مکان کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں کتنی گنجائش ہے۔ اگر آپ نے تو تراق کی تو آپ کا سر نالی میں دے دوں گا" اس پر سردار جی سیدھے ہو گئے اور آپ نے مکان دیکھنے کی اجازت دے دی۔ پھر ہم نے مکان دیکھا۔ اوّل تو اُس میں گنجائش ہی کم تھی، دفتر کے لئے جگہ کافی نہ تھی، دوسرے میں اس قدر بے رحم نہ تھا کہ کسی کو وہاں سے نکال کر قبضہ کرتا۔ مکان کو دیکھنے

Marfat.com

کے بعد جب اس کو پتہ چلا کہ میں فلاں شخص ہوں اور مقصد صرف مکان کو دیکھنے کا تھا تو پھر اس نے خوشامدانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم واپس آگئے۔ اب ڈاکٹر خالد جب کبھی ملتے ہیں تو "مذاقاً" ان سے کہتا ہوں "سنایئے ہندو ڈاکٹر صاحب کیا حال ہے"۔

اندھوں میں قوتِ احساس

میں جب فیروز پور میں تھا۔ اس زمانہ میں وہاں ایک کامیاب ترین وکیل سردار چنداسنگھ تھے جن کی پریکٹس کا مقابلہ شائد ہی کوئی وکیل وہاں کر سکتا تھا۔ یہ سردار چنداسنگھ قوتِ بینائی سے بالکل محروم اور پیدائشی اندھے تھے اور ان کی آنکھوں کی نہ پتلیاں تھیں، نہ سفیدی نہ کچھ اور۔ یعنی یہ آنکھوں سے بالکل ہی محروم تھے جن کے اپریشن یا علاج کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ آپ کچہری میں جاتے یا کسی اور جگہ ایک آدمی ان کو سہارا دینے کے لئے ضرور ساتھ ہوتا۔ اور ان کی پریکٹس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ زیادہ تر قتل کے مقدمات کے سلسلہ میں سیشن کورٹ میں پیش ہوتے۔ ان سردار چنداسنگھ کی قوتِ احساس اس قدر تیز تھی کہ یہ گھوڑے پر صرف ہاتھ پھیر کر بتا دیتے کہ گھوڑے کا رنگ سفید ہے، سرخ یا سیاہ۔

ایک بار ان کے ہاتھوں میں مختلف رنگ کے اُون کے لچھے دیئے گئے۔ آپ تھوڑی دیر ان لچھوں کو ٹٹولتے رہے۔ اور ٹٹولنے کے بعد آپ نے ہر لچھے کے متعلق بتا دیا کہ ان کا کون کونسا رنگ ہے۔ ان سردار چنداسنگھ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ آپ پبلک کی ایک میٹنگ میں شامل ہوئے۔ اس میٹنگ میں مسٹر باسورتھ سمتھ ڈپٹی کمشنر تقریر کر رہے تھے اور تقریر بھی پرانے زمانہ کے ممبران انڈین سول سروس کے جذبات میں انتہائی مطلق العنانہ تھی۔ سردار چنداسنگھ صبر نہ کر سکے۔ آپ نے کھڑے ہو کر مسٹر باسورتھ سمتھ کو ٹوک دیا۔ باسورتھ سمتھ بہت ہی اکھڑ اور راجئیڈ قسم کے افسر تھے۔ معاملہ تو تو میں میں تک پہنچ گیا۔ مسٹر باسورتھ سمتھ نے سردار چنداسنگھ کے خلاف اور سردار چنداسنگھ نے مسٹر باسورتھ سمتھ کے خلاف گورنمنٹ کے خلاف شکایتیں کیں اور نوٹس بازی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردار چنداسنگھ کا پریکٹس کا لائسنس ضبط کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد سردار چنداسنگھ مسٹر باسورتھ سمتھ کے پیچھے لگے رہے۔ مارشل لاء میں باسورتھ سمتھ نے پبلک پر بہت مظالم کئے۔ شکایتیں ہوئیں، میانوالی میں آپ نے وہاں کے ایک نواب کو گالیاں دیں۔ نواب نے اپنے ملازموں سے باسورتھ سمتھ کو بہت پٹوایا۔ یہ تمام حالات اور سردار چنداسنگھ کی مخالفت ایک جگہ جمع ہو گئے تو مسٹر باسورتھ سمتھ ملازمت سے موقوف کر دیئے گئے۔ اس موقوفی کی اطلاع سن کر سردار چنداسنگھ نے مسٹر باسورتھ سمتھ کو ایک خط لکھا جس میں اوپر توالقاب کی جگہ لکھا گیا "بخدمت مسٹر باسورتھ سمتھ ڈسمسڈ ڈپٹی کمشنر" اور

Marfat.com

نیچے لکھا "آپ کا خادم چند اسنگھ ڈسمنڈ ایڈووکیٹ"۔

گیانی شیر سنگھ سکھوں میں بہت اہم شخصیت تھے۔ ایک بہترین مقرر۔ اچھے مصنف اور جرنلسٹ۔ اور خیالات کے اعتبار سے بہت اچھے فلسفی۔ مگر آنکھوں کی بینائی سے قطعی محروم۔ ایڈیٹر "ریاست" جس زمانہ میں لاہور کے ہفتہ وار "خالصہ اخبار" کو ایڈٹ کیا کرتا آپ ملنے کے لئے تشریف لایا کرتے۔ اور آپ سے گہرے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ آپ آنکھوں سے قطعی محروم تھے، مگر آپ کی قوتِ احساس اس قدر تیز تھی، کہ آپ اگر کسی کمرہ میں چلے جاتے تو فضا کو محسوس کرتے ہوئے کمرہ میں کھڑے ہو کر بتا دیتے کہ یہ کمرہ اس فٹ لمبا ہے اور اتنے فٹ چوڑا ہے۔ ان گیانی شیر سنگھ سے ملے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے کہ ایڈیٹر "ریاست" ایک روز امرتسر گیا وہاں ہال دروازہ سے باہر ریلوے اسٹیشن کو جا رہا تھا صبح چھ بجے کا وقت تھا دیکھا کہ ریلوے کے پل کے قریب گھاس کے فرش پر گیانی صاحب اپنے پرسنل اسسٹنٹ کو اپنے اخبار (جو گورمکھی زبان میں تھا اور امرتسر سے شائع ہوتا تھا) کے لئے مضمون لکھا رہے ہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" تانگہ سے اتر کر آپ کے پاس گیا اور آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شیک ہینڈ کیا۔ گیانی صاحب نے پوچھا کہ کون ہے۔ میں نے نہ صرف خود کوئی جواب نہ دیا بلکہ ان کے پرسنل اسسٹنٹ کو بھی اشارہ سے کہہ دیا کہ وہ کچھ نہ بتائے۔ گیانی جی نصف منٹ کے قریب میرے ہاتھ کو ٹٹولتے رہے تو آپ نے کہا کہ " ہاتھ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہلی کے دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کا ہاتھ ہے"۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور حیران تھا کہ دس گیارہ برس کے بعد بھی گیانی صاحب نے کیونکر صرف ہاتھ ٹٹول کر مجھے پہچان لیا۔

مسٹر ہارنیمن کی فیاضی

مسٹر بی۔ جی۔ ہارنیمن مرحوم اُن چند نیک دل انگریزوں میں سے تھے جو انصاف پسند ہونے کے باعث ہندوستان سے محبت رکھتے تھے۔ اور جنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ مرحوم مہاراجہ نابھہ گدی سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی گورنمنٹ کے معتوب تھے اور یہ خطرہ تھا کہ گورنمنٹ آپ کے خلاف شائد زیادہ سخت قدم اٹھائے۔ مہاراجہ جن لوگوں سے (مع مسٹر جناح مرحوم) رائے لیتے تمام لوگ ہی مہاراجہ کو پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تعاون کرنے کی رائے دیتے۔ مگر مہاراجہ اس تعاون کے معنی غلامی سمجھتے۔ کیونکہ وہ فطرتاً تعاون پسند نہ تھے۔ مہاراجہ جب انصاف سے قطعی مایوس ہو چکے تو آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ گورنمنٹ اگر آپ پر مزید ظلم کرے تو اس ظلم کو بے نقاب کرنے کے لئے پریس اور پبلک کے لیڈروں کی امداد لی جائے۔ چنانچہ لیڈروں میں سے تو پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، دیوان چمن لال، سر سنکرن نائر، سر سی۔ پی راما سوامی آئر

Marfat.com

مسٹر ٹی پرکاشم، مسٹر سی۔ ایس۔ رنگا آئر اور سرچمن لال سیتلواد وغیرہ درجنوں سیاست دان حضرات سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے گئے۔ اور پریس کی امداد کے لئے لکھنؤ کا روزانہ انگریزی اخبار "انڈین ڈیلی ٹیلی گراف" خرید لیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ مسٹر ہارنیمین (جو ان دنوں بے کار تھے اور "بمبئی کرانیکل" سے الگ ہو چکے تھے) کو روپیہ دے کر انگریزی کا ایک نیا شاندار روزانہ اخبار جاری کیا جائے۔ چنانچہ مہاراجہ نے ایڈیٹر "ریاست" کو بمبئی بھیجا کہ اس سلسلہ میں مسٹر ہارنیمین سے بات چیت کی جائے۔

ایڈیٹر "ریاست" منصوری سے بمبئی گیا، مسٹر ہارنیمین سے ملاقاتیں ہوئیں، تو فیصلہ ہوا کہ مسٹر ہارنیمین میرے ساتھ منصوری چلیں۔ مسٹر ہارنیمین زندگی بھر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ کیونکہ وہ فطرتاً فیاض تھے، روپیہ بے دردی کے ساتھ صرف کرتے تھے۔ میں نے وقتی اخراجات کے لئے چند سو روپیہ ان کو دے دیا۔

میں بمبئی سے جب چلا تو مہاراجہ کے بچوں کے لئے کچھ کھلونے اور سفید رنگ کا افریقہ کا ایک طوطا میں نے خریدا۔ میں اور مسٹر ہارنیمین فرسٹ کلاس میں سوار ہوئے۔ کیونکہ مسٹر ہارنیمین افلاس میں بھی فرسٹ کلاس میں سفر کیا کرتے۔ دوسرے سامان کے ساتھ سفید رنگ کا یہ افریقن طوطا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ راستہ میں مسٹر ہارنیمین نے مجھ سے متعدد بار کہا کہ میں طوطے کو پنجرے سے نکال کر آزاد کر دوں۔ پرندوں کو پنجروں میں رکھنا بہت بڑا ظلم ہے۔ میں نے طوطے کو پنجرے سے تو نہ نکالا اور اس کو منصوری ساتھ لے گیا۔ مگر مسٹر ہارنیمین کے متعلق اس واقعہ کے باعث میرے دل میں بہت ہی عزت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے اور مرحوم کی نیک دلی کا یہ پہلا اثر تھا جو اب تک میرے ذہن پر موجود ہے، اور اس واقعہ کا ہی اثر ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد کبھی کسی جانور کو پنجرہ میں نہیں ڈالا۔ اور شائد درجنوں بار دوسرے لوگوں سے پرندوں کو آزاد کرنے کے لئے کہا۔

مسٹر ہارنیمین گوشت نہ کھاتے تھے اور گوشت کھانا بے رحمی سمجھتے تھے، آپ کو کتوں وغیرہ جانوروں سے بے حد محبت تھی۔ اور آپ کے پاس سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا سا کتا تھا۔ جس سے ایک روز کے لئے بھی علیحدہ نہ ہوتے۔ چنانچہ جب منصوری آئے تو یہ کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ کتا ایک روز منصوری میں گم ہو گیا۔ مسٹر ہارنیمین کی کتے کی جدائی میں جو حالت ہوئی، بیان نہیں کی جا سکتی۔ آپ نے کھانا چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت اداس رہتے۔ مہاراجہ اور مہارانی بھی مسٹر ہارنیمین کی اس حالت کو دیکھ کر متاثر تھے۔ ہم نے کئی آدمی کتے کی تلاش میں لگا دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین روز کے بعد کتا مل گیا، اور مسٹر ہارنیمین نے کھانا کھایا۔ مسٹر ہارنیمین کے جانوروں سے اس قدر محبت کرنے کا ہم تمام لوگوں پر اثر تھا، اور ہر شخص آپ کی رحمدلی کو محسوس کرتا تھا۔

Marfat.com

مسٹر ہارنیمین اپنے ماتحتوں اور ملازموں سے محبت کرنے کے اعتبار سے بھی بہت نمایاں خصوصیت رکھتے تھے، اور ان کو آپ دوست سمجھتے اور ان لوگوں کو بھی آپ سے بے حد محبت تھی۔ آپ کے تمام ماتحت اور ملازم آپ کو گورنر کہہ کر مخاطب کرتے۔ منصوری میں آپ آئے تو آپ کے ساتھ ایک ملازم ممتاز بھی تھے (یہ ممتاز آج کل فلم ڈائرکٹر ہیں جو کئی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ اور ماسٹر ممتاز علی کے نام سے مشہور ہیں) مسٹر ہارنیمین یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ان کا کوئی ماتحت یا ملازم آرام سے نہ رہے۔ چنانچہ ممتاز کی رہائش کا انتظام بھی مسٹر ہارنیمین کے ساتھ ہی ہیکمین ہوٹل میں کیا گیا۔ اور جب مسٹر ہارنیمین منصوری میں رہے ممتاز بھی ہیکمین ہوٹل میں ہی رہے جس کا پندرہ روپیہ روزانہ کے حساب سے کرایہ دیا جاتا۔

مسٹر ہارنیمین منصوری میں دو ماہ کے قریب رہے۔ ان کی مہاراجہ سے ہر روز ملاقات ہوتی۔ بلکہ قریب قریب ہر روز راقم الحروف اور مسٹر ہارنیمین لنچ اور ڈنر پر مہاراجہ کے ہاں جمع ہوتے۔ ان ملاقاتوں کے بعد مہاراجہ نے مسٹر ہارنیمین کی سکیم مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ "انڈین نیشنل ہیرلڈ" جاری کرنے کے لئے دیا اور مسٹر ہارنیمین کا اندازہ تھا کہ اگر پریس نہ لگایا جائے تو یہ رقم ایک روزانہ انگریزی اخبار کو سیلف سپورٹنگ بنانے کے لئے کافی ہوگی۔ مگر مسٹر ہارنیمین اور روپیہ دونوں متضاد تھے، مسٹر ہارنیمین پر کنٹرول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور آپ کا اس روپیہ پر بلا شرکت غیرے اقتدار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ روپیہ تین ماہ کے اندر ہی ختم ہوگیا۔ ورنہ جس اخبار کو مسٹر ہارنیمین جیسا ایڈیٹر نصیب ہو۔ اگر اخبار کا انتظام بھی اچھے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو یہ اخبار آج یقیناً پندرہ بیس ہزار روپیہ ماہوار آسانی کے ساتھ منافع دے سکتا تھا۔ کیونکہ اگر کوئی اخبار گھاٹے میں چلے تو گھر کی اینٹیں فروخت کر دیتا ہے۔ اور اگر منافع ہو۔ تو اس میں سے کئی ہزار روپیہ ماہوار منافع بالکل معمولی بات ہے۔

مسٹر ہارنیمین روپیہ کو کس طرح صرف کرتے تھے۔ اس کے متعلق کئی واقعات میں سے صرف ایک واقعہ ہی سنیئے۔ راقم الحروف اور مسٹر ہارنیمین دونوں منصوری میں تھے۔ وہاں اطلاع آئی کہ مرحوم مہاراجہ پٹیالہ ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف ایک جھوٹے اور بے بنیاد مقدمہ میں گورنمنٹ سے ایکسٹرا اڈیشن کے وارنٹ نکلوانے والے ہیں۔ میں نے مسٹر ہارنیمین سے اس اطلاع کا ذکر کیا تو آپ نے ایک مضمون لکھا۔ جو بہت طویل اور زوردار تھا۔ یہ مضمون چھپنے کے لئے بمبئی جانا تھا۔ آپ نے کہا کہ یہ مضمون بذریعہ تار بمبئی بھیجا جائے۔ میں نے کہا۔ دو روز میں بذریعہ ڈاک وہاں پہنچ جائے گا۔ مگر آپ نہیں مانے۔ اور یہ مضمون بذریعہ تار بمبئی بھیجا گیا۔ جس پر پریس ٹیلیگرام ریٹ ایک آنہ کے چھ الفاظ کے نرخ سے پچہتر روپے صرف ہوئے۔ بمبئی جہاں دو دن کے وقت کی بچت کے لئے ایک مضمون پر پچہتر روپے صرف کر دیئے جائیں وہاں کفایت شعاری کا کیا سوال ہے۔

"انڈین نیشنل ہیرلڈ" بند ہو چکا تھا، تو ایڈیٹر "ریاست" کو بمبئی جانے کا اتفاق ہوا وہاں دوسرے

Marfat.com

دوستوں کے علاوہ مسٹر ہارنیمین سے ملنے کے لئے بھی اُن کے مکان پر گیا۔ باتیں کرتے ہوئے دیر ہوگئی تو مسٹر ہارنیمین نے کہا کہ میں لنچ بھی ان کے ساتھ کھاؤں۔ اور لنچ کے بعد وہ بھی میرے ساتھ فورٹ کی طرف چلیں گے۔ میں نے اُن کے ساتھ لنچ کھایا اور ساتھ چلنے کا وقت آیا تو وہ پس وپیش کر رہے تھے ملازم کبھی آتا ہے، اور کبھی جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دقت ہے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بدلنے کے لئے کپڑے موجود نہیں۔ دھوبی نہ صرف اس دھلائی کی اجرت طلب کرتا ہے، بلکہ پچھلی دھلائی کی بھی۔ بغیر اجرت کے وہ کپڑے دینے سے انکار کر رہا ہے اور مسٹر ہارنیمین کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد تکلیف ہوئی۔ ہندوستان کا فاضل ترین اور بین الاقوامی شہرت کا جرنلسٹ۔ جس کی بڑے سے بڑا لیڈر بھی عزت کرے، اُس کے پاس دھلائی کی اجرت دینے کے لئے بھی دام نہ ہوں۔ میں نے ایک سو روپیہ کا نوٹ ممتاز کو دیا کہ وہ کپڑے دھوبی سے منگائے اور باقی رقم اخراجات کے لئے گھر میں رکھ لے۔ اس کے بعد مسٹر ہارنیمین سے میں نے مشورہ کیا کہ ان کا مستقبل کیا ہو۔ بمبئی میں وہ بیکار ہیں۔ کسی کے ماتحت کام نہیں کر سکتے۔ فیاضی فضول خرچی کی حد تک کیریکٹر پر اثر انداز ہو چکی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ اور ضروری اخراجات سے بھی تنگ ہیں۔ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا کہ مسٹر ہارنیمین دہلی چلیں۔ وہاں میں اور مسٹر ہارنیمین دونوں مل کر انگریزی کا ایک ہفتہ وار اخبار جاری کریں۔ مسٹر ہارنیمین اخراجات کے لئے پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ لیں۔ اور اخبار کے تمام اخراجات کے بعد اگر کوئی بچت ہو تو وہ نصف نصف۔ اور اس بزنس پر ایڈیٹر "ریاست" دس ہزار روپیہ صَرف کرے۔ دھوبی کے ہاں سے کپڑے آگئے اور ہم فورٹ کی طرف گئے۔ اگلے روز میں نے ضروری اخراجات کے لئے مسٹر ہارنیمین کو پانچ سو روپے دیئے تاکہ وہ بمبئی چھوڑ سکیں، اور واپس دہلی آگیا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ میں دہلی میں ہفتہ وار انگریزی اخبار کے لئے تیاری کروں۔ اور مسٹر ہارنیمین پندرہ روز تک دہلی پہنچ جائیں گے۔ میں دہلی واپس آگیا تو ایک ہفتہ کے بعد مسٹر ہارنیمین کا تار آیا کہ ان کو پانچ سو روپیہ اور بھیجا جائے۔ اس تار کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ جو قدم اٹھایا جا رہا ہے وہ کامیاب نہ ہوگا۔ اور دفتر "ریاست" اتنے اخراجات کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ مگر قدم کو پیچھے لے جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وعدہ کے علاوہ مسٹر ہارنیمین کے افلاس کا خیال بھی تکلیف دہ تھا۔ میں نے پانچ سو روپیہ اور بذریعہ تار بھیج دیا اور مسٹر ہارنیمین دہلی تشریف لے آئے۔

جب ہارنیمین سے دہلی آنے کا وعدہ ہوا تو یہ بات صاف کر دی گئی تھی کہ وہ فی الحال صرف اکیلے دہلی آئیں۔ میرے مکان پر ہی قیام کریں۔ میرے ملازم اُن کی خدمت کے لئے حاضر ہوں گے اور اُن کا کوئی خرچ نہ ہوگا پانچ سو روپیہ ماہوار ان کے جیب خرچ کے لئے کافی ہیں۔ جب وہ آئے تو میں دہلی میں موجود نہ تھا۔ مقدمہ کی پیشی کے لئے ہوشنگ آباد گیا ہوا تھا۔ واپسی پر پتہ چلا کہ مسٹر ہارنیمین دہلی پہنچ چکے ہیں اور سول لائن کی طرف ایک انگریزی ہوٹل میں مقیم ہیں۔ میں ہوٹل پہنچا

Marfat.com

تو دیکھا کہ وہاں آپ نے کئی کمرے لئے ہوئے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ ممتازہ کے علاوہ دو اور ملازم بھی ہیں۔ میں اس تمام "خاندان" کو دیکھ کر پریشان کہ اس بجٹ کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا، ہوٹل میں چالیس روپیہ روزانہ کہاں سے دیا جائے گا۔ میں اگلے روز صبح مکان کی تلاش میں نکلا۔ اور اپنے دو ملازموں کو بھی مکان تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ کیونکہ میرے گھر میں چار مستقل مہمانوں کے لئے گنجائش نہ تھی۔ صرف مسٹر ہارنیمین کے لئے تو ایک دو کمروں کا انتظام کر دیتا۔ نئی دہلی میں رائے بہادر سردار نرائن سنگھ بہت مہربان دوست تھے۔ ان سے ملا تو انہوں نے کہا کہ وہ اپنی ایک کوٹھی کا ایک حصہ دے دیں گے۔ چنانچہ مسٹر ہارنیمین کو اس کوٹھی میں جو جنتر منتر روڈ پر تھی، منتقل کیا گیا۔ اور کام شروع ہوا۔ مسٹر ہارنیمین کا نام اس زمانہ کی گورنمنٹ کے لئے ایک ہوّا تھا۔ دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی۔ اڑھائی ہزار روپیہ کی "ویکلی ہیرلڈ" چھاپنے کے لئے ایک مشین خریدی گئی، کافی مقدار میں ٹائپ لیا گیا، اور یہ کام شروع ہوا۔ مسٹر ہارنیمین کے قلم میں بہت زور تھا۔ پہلی اشاعت سے ہی اڑھائی ہزار کی تعداد میں پرچہ بمبئی گیا۔ مسٹر ہارنیمین کا نام بمبئی کے اخبار پڑھنے والے طبقہ میں کرنسی نوٹوں کی حیثیت رکھتا تھا، یعنی ان کے نام پر ہی اخبار فروخت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اخبار بہت مقبول ہوا۔ مسٹر ہارنیمین کے جرنلسٹ دوست بمبئی میں سول ایجنٹ مقرر ہوئے، جو بکری کا تمام روپیہ خود کھا جاتے۔ ایک پیسہ دہلی نہ بھیجتے۔ روپیہ کے متعلق لکھا جاتا تو جواب ہی نہ دیتے۔ ادھر مسٹر ہارنیمین کا ذاتی خرچ ایک ہزار روپیہ ماہوار سے کم نہ تھا۔ اخبار کے ابتدائی اخراجات کی مصیبت الگ تھی۔ میرا اخبار چند ہفتہ میں ہی دس ہزار روپیہ نگل گیا۔ اس سے زیادہ روپیہ صرف کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ اور اگر کرتا تو یہ اخبار "ریاست" کو لے بیٹھتا۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ جب تک بمبئی کی فروخت کا روپیہ نہ پہنچے اخبار بند کر دیا جائے۔ بمبئی سے روپیہ پہنچنا کیونکر ممکن تھا کیونکہ وہ روپیہ تو مسٹر ہارنیمین کے معتمد دوست ہر ہفتہ ہضم کرتے جا رہے تھے۔ ان تمام مشکلات میں "ویکلی ہیرلڈ" بند کر دیا گیا، اور ضمانت کا جو روپیہ مسٹر ہارنیمین کے نام پر گورنمنٹ کے خزانہ میں جمع تھا، وہ مسٹر ہارنیمین نے لے لیا جو شائد دو تین ہفتہ میں ہی ختم ہو گیا ہو گا اور مسٹر ہارنیمین واپس بمبئی چلے گئے۔ کیونکہ نہ ایڈیٹر "ریاست" اُن کے لئے مفید ہو سکتا تھا اور نہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کے لئے۔ اس زمانہ میں ایک ہفتہ وار اخبار کے لئے دس ہزار روپیہ بہت کافی سمجھا جاتا تھا۔ کاش مسٹر ہارنیمین میری رائے پر عمل کرتے ہوئے کفایت شعاری سے کام لیتے تو یہ "ویکلی ہیرلڈ" آج دہلی کے بہت بڑے روزانہ انگریزی اخبارات میں سے ہوتا اور مسٹر ہارنیمین اس میں سے دس ہزار روپیہ ماہوار آسانی سے پیدا کر سکتے تھے۔

مسٹر ہارنیمین بہت صفات کے انسان تھے۔ کسی کی تکلیف کو دیکھ کر برداشت نہ کر سکتے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ فیاض اس قدر کہ اگر کوئی گداگر ہاتھ پھیلائے تو ایک روپیہ سے کم نہ دیتے۔ سفر میں قلیوں کو پانچ روپیہ سے کم دینا قلیوں کی حق تلفی سمجھتے۔ ہندوستان کے انتہائی

Marfat.com

مخلص اور ہمدرد۔ زندگی بھر شادی نہ کی۔ گوشت کھانے کے اصولاً خلاف۔ شراب سے ان کو انتہائی نفرت تھی۔ دوستوں سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور بہت خوبیوں کے انسان تھے۔ مگر غیر ضروری فیاضی یا فضول خرچی کے باعث زندگی بھر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ملازمت میں اکثر ہفتہ وار تنخواہ لیا کرتے کیونکہ ماہوار تنخواہ کی صورت میں اپنی تنخواہ دو روز میں ہی صرف کر دیتے۔

اس فدائے ہندوستان میں اگر یہ کمزوری نہ ہوتی تو یہ اپنی زندگی آرام و راحت سے بسر کرتا۔ اور اسے افلاس کی تکالیف برداشت نہ کرنی پڑتیں۔

عشق اور شباب کی مجبوریاں

انگریزی کے ایک مصنف نے لکھا ہے "مجھے اُن گنہگاروں کے ساتھ ہمدردی ہے جو بے نقاب ہو گئے"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سب ہی گناہ کرتے ہیں۔ مگر گنہگار وہی قرار دیئے جاتے ہیں جن کے گناہوں کا لوگوں کو علم ہو جائے اور وہ لوگ گناہ کرتے ہوئے بھی معصوم و بے گناہ رہتے ہیں جو بے نقاب نہیں ہوئے۔ گناہ اور گنہگاروں کی اس پوزیشن میں ہندی کے فاضل اجل شاعر بہاری اپنے ایک دوہے میں فرماتے ہیں "شباب اور سیلاب کی تباہ کاریوں کو دنیا میں کوئی روکنے والا پیدا نہ ہوا"۔ چنانچہ دنیا میں شائد ہی کوئی انسان ایسا ہو گا (بشرطیکہ صحت کے اعتبار سے مردہ اور دماغی اعتبار سے بے حس نہ ہو) جس نے شباب کے زمانہ میں ٹھوکریں نہ کھائی ہوں اور مہاتما گاندھی بھی اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اپنے شباب کے زمانہ کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

شباب کے زمانہ کی غلطیوں یا مجبوریوں کے متعلق میرے مشاہدات بہت وسیع ہیں اور میں سچ کہتا ہوں کہ جب کبھی کسی شخص کے شباب و محبت کے واقعات۔ محبت کی غلطیاں۔ مجبوریاں۔ رسوائی۔ نتائج اور محبت کی سزا دیکھتا ہوں۔ تو میرے دل میں اس کے لئے بے حد ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

کئی برس کی بات ہے میں ہملٹن روڈ والے دفتر "ریاست" میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ریلوے سٹیشن سے ایک ٹیلیفون آیا۔ جس میں بتایا گیا کہ پنجاب کی ریاست کے ایک سابق منسٹر ریلوے اسٹیشن پر گرفتار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایڈیٹر "ریاست" فوراً ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائے یہ منسٹر میرے دیرینہ ملنے والے تھے۔ میں کار میں ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ وہاں وٹینگ روم میں گیا تو دیکھا کہ دہلی کے ایک مسلمان ٹھیکہ دار۔ انسپکٹر پولیس مسٹر غلام سرور۔ دو کنسٹیبل۔ ایک بکنگ کلرک اور وہ سابق منسٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ غلام سرور صاحب کو میں جانتا تھا۔ وہ نواب سر لیاقت حیات اور سر سکندر حیات کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور نواب لیاقت حیات کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات تھے میں جب پہنچا تو غلام سرور صاحب نے جو حالات بتائے وہ یہ تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب دریا گنج میں

Marfat.com

رہتے ہیں۔ ان کا دفتر اور رہائش الگ الگ جگہ پر ہے۔ اور ٹھیکہ دار صاحب کی بیوی کا ٹھیاواڑ کی ہیں منسٹر صاحب کو دہلی میں آئے ہوئے اور ٹھیکہ دار صاحب کے گھر کا طواف کرتے ہوئے تین روز ہو گئے ہیں اور تین روز تک ملازم کے ذریعہ خط وکتابت کرنے کے بعد منسٹر صاحب ٹھیکہ دار کی بیوی کو سٹیشن کے ریٹائرنگ روم میں بلوانے میں کامیاب ہوئے۔ ٹھیکہ دار صاحب کے ملازم نے پہلے روز ہی ٹھیکے دار صاحب کو بتا دیا تھا کہ ایک صاحب اُن کے گھر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ اور اسی ملازم کے ذریعہ خط وکتابت جاری ہے۔ اور بیوی ملاقات کے لئے جگہ اور وقت مقرر کریں گی۔ چنانچہ بیوی بہانہ کر کے ڈولی میں جب اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئیں تو ٹھیکے دار صاحب ان کے پیچھے کار میں دمع غلام سرور صاحب) ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ اور جب یہ خاتون منسٹر صاحب والے ریٹائرنگ روم میں داخل ہوئیں تو ٹھیکہ دار صاحب اور غلام سرور صاحب ریٹائرنگ روم کے دروازہ پر پہنچ گئے اور منسٹر صاحب کو اغوا کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ منسٹر صاحب نے محبت کے جو خطوط اس خاتون کو لکھے تھے ٹھیکہ دار صاحب نے ملازم سے حاصل کر لئے تھے جو اس وقت ان کے پاس تھے۔ اور بکنگ کلرک اس الزام میں گرفتار تھے کہ انہوں نے خلافِ قانون ایک دوسرے شخص کے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ پر منسٹر صاحب کو ریٹائرنگ روم میں ٹھہرنے کا ٹکٹ دیا۔ اور یہ ٹکٹ ہر روز بدل لیا جاتا۔ کیونکہ کوئی شخص ۲۴ گھنٹہ سے زیادہ ریٹائرنگ روم میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

اس تمام ڈرامہ میں دردناک حالت اُس خاتون کی تھی جو محبت سے مجبور ہو کر اپنے شوہر سے جھوٹ بولتے ہوئے ریلوے سٹیشن پہنچی۔ اپنے محبوب سے ملنے کے لئے کمرہ میں داخل ہوئی تو شوہر پولیس کو لے کر دروازہ پر پہنچ گئے۔ اب دروازہ پر پولیس کنسٹیبل پہرہ دے رہا ہے تاکہ یہ خاتون اندر ہی رہے۔ باہر نہ نکل سکے۔ اور قریب کے کمرہ میں اس کے اور اس کے محبوب کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے "تحقیقاتی کمیشن" بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے جب تمام حالات سُنے تو اس خاتون کی نظربندی کی کیفیت سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی کیونکہ اس کا ایک ایک سیکنڈ اُس طرح ہی ایک ایک سال کی طرح طویل اور ناقابلِ برداشت تھا جس طرح جیل میں کسی پھانسی کا حکم سُن چکے مجرم کے لئے رات بسر کرنی مشکل ہو جاتی ہے اور اُس کا ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر طویل اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ غلام سرور صاحب نے جب تمام حالات بیان کئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیئے تو میں نے کہا۔ منسٹر صاحب کی حالت قابلِ شرم ہے۔ ٹھیکہ دار صاحب کے ساتھ ہر شریف انسان کو ہمدردی ہونی چاہیئے۔ بکنگ کلرک اس جرم میں موقوف کیا جا سکتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ دردناک حالت اُس خاتون کی ہے جو شباب کی غلطیوں کے باعث موت سے زیادہ تکلیف دِہ لمحے گذار رہی ہے۔ میری رائے میں یہ معاملہ یہاں ہی ختم کر دیا جانا چاہیئے کیونکہ گو منسٹر صاحب تو قید ہو جائیں گے مگر ٹھیکہ دار صاحب کی رسوائی اور ان کی بیوی کی عدالتوں میں مٹی پلید ہوگی۔

Marfat.com

میری رائے میں اس ٹھیکیدار صاحب اور غلام سرور صاحب دونوں نے اتفاق کیا۔ منسٹر صاحب سے معافی نامہ لکھوا لیا گیا۔ اور معافی نامہ میں انہوں نے لکھا کہ وہ آئندہ اس خاتون کو اپنی بہن سمجھیں گے۔ منسٹر صاحب مقدمہ کے خوف کے باعث بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی خواہش پر میں ان کو اپنی کار میں ہی اپنے ساتھ لے آیا۔ میں جب سٹیشن سے روانہ ہونے لگا تو میں نے ٹھیکیدار صاحب سے علیحدگی میں کہا۔ دنیا میں ہر شخص سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور آپ کی بیوی سے جو غلطی ہوئی اگر آپ اپنی آئندہ زندگی خوشگوار بنانا چاہتے ہیں تو میری رائے ہے کہ یا تو اپنی بیوی کو طلاق دے دیجئے اور یا ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ اسے معاف کر دینے کا اس پر یقیناً اثر ہو گا۔ اور وہ آئندہ زندگی میں پھر ایسی غلطی نہ کرے گی۔ اور دونوں صورتوں میں میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی بیوی کو اس جرم میں کوئی سزا نہ دیجئے۔ اس نے اپنی غلطی کی ریٹائرنگ روم میں ایک گھنٹہ بند رہ کر اتنی سزا بھگت لی ہے جو کئی بار پھانسی لینے کی سزا اور تکلیف سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا اور میرے زور دینے پر حلف لیا کہ وہ اپنی بیوی پر اس جرم کے سلسلہ میں کوئی ظلم نہ کریں گے۔ چنانچہ وہ اپنی کار میں اپنی بیوی کو لے گئے۔ میں منسٹر صاحب کو لے کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ انسپکٹر صاحب کوتوالی چلے گئے اور بکنگ کلرک اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیکیدار صاحب نے واپس گھر جا کر اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیونکہ اس کے بعد نہ ٹھیکیدار صاحب کبھی ملے۔ اور نہ میں نے دریافت کرنا مناسب سمجھا۔ ہاں اگر وہ اپنے حلفیہ وعدہ پر قائم تھے، تو یقیناً انہوں نے اپنی بیوی کی غلطی کے سلسلہ میں اسے مزید سزا نہ دی ہو گی۔

میں نابھہ میں تھا اور میرے پاس ایک بہت اچھی نسل کی سیاہ رنگ کی خوب صورت کاکر سپنیل کتیا تھی جو میں نے شملہ کے ایک انگریز سے خریدی تھی۔ یہ کتیا جب جوان ہوئی اور اس کے "بہار" کے دن تھے، تو محلہ کے کتوں نے اس کا پیچھا کیا۔ میں اس کو بہت محفوظ رکھتا۔ اور دن رات دروازہ بند رہتا تاکہ کوئی کتا نہ آ جائے۔ اور میں نہ چاہتا تھا کہ اتنی اچھی نسل کی کتیا سے کوئی "کم ذات" کتا تعلق پیدا کرے۔ اور اس کے بچے بھی اینگلو انڈین قسم کے ہوں۔ دروازوں کے بند ہونے کی صورت میں بھی ایک کتا قریب کے مکان کی چھت پر سے اندر آ گیا۔ اس کو مکان کے اندر دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس کتے کو پکڑ لیا، اور اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر صحن میں لٹکا دیا تاکہ یہ عشق بازی کو بھول جائے اور پھر دوبارہ مکان میں آنے کی جرأت نہ کرے۔ رسی کے ساتھ جب میں نے اسے لٹکایا تو یہ دیوار کے ساتھ تڑپنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے رحم آ گیا۔ میں نے اس کی رسی کھول دی اور مکان سے باہر نکال دیا۔ اس کتے کو صحن میں لٹکنے سے یقیناً بہت اذیت پہنچی۔ اور میرا یقین تھا کہ اب یہ عشق بازی کو بھول جائے گا۔ مگر اس روز تو اس نے میرے مکان کا رخ نہ کیا۔ اگلے روز میں نے دیکھا کہ وہ پھر پڑوس کی چھت پر سے اندر آ گیا ہے۔ اس کے مکان میں

Marfat.com

داخل ہونے پر میں نے اسے بہت پیٹا اور مکان سے نکال دیا۔ مگر اس کے اگلے روز پھر دیکھتا ہوں کہ چھت سے کود کر اندر آگیا ہے۔ اور اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت رحم آیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ انسان ہی نہیں جانور بھی عشق کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہیں۔ چنانچہ میں نے پھر اسے کچھ نہ کہا گویا کہ انٹر کاسٹ میرج کی اجازت دے دی گئی۔

یہ کیفیت بے حد دلچسپ ہے کہ ہر شخص شباب کے زمانہ میں غلطیاں کرتا ہے اور باوجود تنبیہہ کیے جانے اور بار بار ٹھوکریں کھانے کے بھی باز نہیں آتا۔ مگر یہی شخص جب عمر میں زیادہ ہو جائے تو نوجوانوں کو عشق و محبت سے دُور رہنے کی نصیحتیں شروع کر دیتا ہے اور نہیں سوچتا کہ نہ تو اس نے جوانی میں کسی کی نصیحت سنی اور نہ یہ سنیں گے۔ جن کے سامنے وہ نصائح کے دریا بہا رہا ہے۔ کیونکہ شباب اور عشق کے ہاتھوں وہ خود مجبور تھا۔ اور جن کو نصیحتیں کر رہا ہے وہ بھی مجبور ہیں۔

میری رائے میں جو لوگ اپنی اولاد یا اپنے عزیزوں کو صرف نصائح کے ذریعہ عشق و محبت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کی سعی قطعی لاحاصل ثابت ہوتی ہے اور محبت نصیحت کی محتاج نہیں۔ ہاں اگر یہ ممکن ہو کہ جس سے محبت کی جاتی ہے، اس کے متعلق محبت کرنے والے کو غیر دغا شعاری کا یقین دلایا جا سکے۔ تو محبت کرنے والے کے دل میں نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔

عورت اور شباب جیل میں

ناگپور سنٹرل جیل کے بڑے دروازہ سے اندر داخل ہوں۔ تو اندر جاتے ہی داہنی طرف کو سب سے پہلے سپرنٹنڈنٹ جیل کا دفتر ہے۔ اس دفتر کے بالکل پچھلی طرف اے کلاس کے پولیٹیکل قیدیوں کے لئے کوٹھی نما بڑا کمرہ ہے۔ اور اس کمرہ کے ساتھ زنانہ جیل کی دیوار ملتی ہے۔ یعنی سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر اور زنانہ جیل کے درمیان اے کلاس کے قیدیوں کے لئے جگہ ہے۔

میں ۱۹۳۶ء میں جیل گیا تو ناگپور کے اِسی اے کلاس والے کوٹھی نما کمرہ میں رکھا گیا۔ اس کمرہ میں مجھ سے پہلے سی۔ پی کے قریب قریب تمام موجودہ وزراء رہ چکے تھے۔ یعنی جن کے حالات جیل کے قیدی اور افسر مجھے سنایا کرتے۔

اس زنانہ جیل میں (جس کا دروازہ مردانہ جیل کے اندر کی طرف ہے) ایک سو کے قریب قیدی عورتیں رہا کرتی تھیں۔ ان قیدی عورتوں کی عمر عام طور پر پندرہ اور پچیس برس کے درمیان تھی کیونکہ ان میں

Marfat.com

سے نوّے فی صدی عورتیں اپنے شوہروں کو زہر دینے کے جرم میں قید تھیں۔ جس کا باعث یہ تھا کہ ان کے شوہر ان پر ظلم کرتے۔ یہ ان مظالم سے عاجز آ جاتیں۔ اور ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس صرف تین ہی راستے تھے: یا تو کسی غیر کے ساتھ گھر سے نکل جائیں۔ یا اپنے شوہروں کو زہر دے کر ہلاک کر دیں اور یا خودکشی کر کے اپنی زندگی ختم کر لیں۔ جو خودکشی کر لیتیں ان کا تو جیل میں آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن جو اپنے شوہروں کو زہر دیتیں ان کو جیل میں قید کی سزا بھگتنی پڑتی۔ چنانچہ یہ بچاری پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس میں (کیونکہ سی۔ پی میں لڑکیوں کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر دی جاتی ہے) جیل کے اندر داخل ہوتیں اور شباب کا زمانہ جیل کی نذر کر کے پچیس چھبیس برس کی عمر میں رہا کی جاتیں۔

عورت آخر عورت ہے۔ اور شباب آخر شباب۔ یہ دونوں چاہے جیل میں ہی کیوں نہ ہوں۔ میرے کمرہ اور زنانہ جیل کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ اور اس دیوار کے نیچے بارش کا پانی جانے کے لئے ایک بڑا سوراخ تھا۔ جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ جیل کی یہ عورتیں اور لڑکیاں دن بھر خوش فعلیاں کرتیں۔ کبھی روتیں، کبھی قہقہے مار کر ہنستیں۔ کبھی چیختیں، کبھی لڑتیں۔ کبھی جھگڑتیں۔ ان کی خوش فعلیوں کی آواز میرے کانوں تک بھی پہنچتی۔ جیل میں مجھے سوائے آرام کرنے کے کوئی کام نہ تھا۔ جو شخص زندگی بھر مصروف رہا ہو، اس کے لئے جیل میں وقت کاٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ میں دن رات کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا۔ اور جب کتابوں سے اُکتا جاتا تو سوچا کرتا۔ ایک روز اپنے خیالات میں غرق تھا تو میں نے قدرت کے اس احسان کو محسوس کیا۔ کہ میرے ادبی ذوق، موسیقی شناس ذہن، حسن پرستی اور آرٹ پسند طبیعت کا خیال کرتے ہوئے جیل میں بھی مجھے ایسی جگہ دی گئی۔ جہاں عورت کی آواز (خود موسیقی ہے) میرے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ میں جیل کی ان خواتین کی شرارتوں کی آواز سے کئی کئی گھنٹہ لطف اندوز ہوا کرتا اور میرا وقت کٹ جاتا۔

لڑکیاں فطرتاً شریر ہوتی ہیں اور ان کی اس فطری شرارت پر جیل کیونکر غالب آتا۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ یہ دیوار کے نیچے کے سوراخ میں سے جھانک تانک کی کوشش کرتی ہیں اور شرارتاً کبھی کبھی دیوار کے اوپر سے کنکر پھینک دیتی ہیں۔ میں ان کی اس شرارت پر ہنس دیتا اور ان بچاریوں کو قابلِ رحم اور قابلِ ہمدردی سمجھتا۔ چنانچہ جیل سے رہائی حاصل کرنے کے بعد میں نے قیدی عورتوں کے متعلق متعدد مضامین لکھے اور ان کے کٹنگ گورنمنٹ کو بھیجے۔ ان مضامین میں یہ لکھا گیا کہ عورتوں کو پھانسی دینے اور پانچ برس سے زیادہ عرصہ تک قید رکھنے کا سلسلہ موقوف کیا جائے یہ بے رحمی ہے۔

میں ایک روز کتاب پڑھ رہا تھا اور میرے پہرے پر یو۔ پی کا ایک نوجوان سپاہی بیٹھا تھا اتنے میں زنانہ جیل کی طرف سے کسی لڑکی نے شرارتاً ایک کنکر پھینکا۔ جب یہ کنکر میرے قریب آ

Marfat.com

کرگرا۔ تو اس نوجوان پوربیئے سپاہی نے جو میرے پاس بیٹھا تھا۔ اس شرارت کا جواب فوراً ہی شرارت کی صورت میں یہ دیا۔ کہ اس نے سنگترے کا ایک چھلکہ (جو وہاں پڑا تھا) لے کر زنانہ جیل کی طرف پھینک دیا۔ یہ چھلکا جب زنانہ جیل میں پہنچا، تو وہاں اسے جیل کی وارڈن نے دیکھ لیا۔ وارڈن نے داروغنی (لیڈی داروغہ) کے پاس رپورٹ کی۔ اور معاملہ سپرنٹنڈنٹ جیل تک پہنچ گیا۔ چنانچہ تحقیقات شروع ہوئی۔ تو بتایا گیا کہ یہ چھلکا اسے کلاس کے کمرے کی طرف سے پھینکا گیا ہے۔ اسے کلاس میں صرف میں ہی اکیلا قیدی تھا جس پر کہ یہ الزام لگایا جا سکتا تھا۔

جیل کے سپرنٹنڈنٹ ایک پارسی بزرگ کرنل موڈی تھے۔ جو نہایت شریف اور میرا بہت ہی لحاظ کرتے تھے۔ اور میری سہولت اور آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ اگلے روز جب آپ میرے پاس لئے تو خیریت دریافت کرنے کے بعد آپ نے کہا:۔

"سردار صاحب! میرے پاس زنانہ جیل سے ایک شکایت پہنچی ہے کہ وہاں آپ کے کمرے کی طرف سے سنگترے کا ایک چھلکا پھینکا گیا۔ یہ شکایت بہت ہی افسوس ناک ہے۔"

میں نے کرنل موڈی سے جب یہ الفاظ سنے تو میں شرم کے باعث پانی پانی ہو گیا۔ حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ میں نے کرنل موڈی سے کہا۔ کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس قدر غیر ذمہ دار اور بے وقوف نہیں ہوں کہ چھلکا پھینکتا۔ ہاں مجھے علم ہے کہ کس نے پھینکا۔ اور جس شخص نے پھینکا، اس نے بھی کسی بری نیت سے نہیں پھینکا۔ صرف شرارتاً پھینکا۔ اگر آپ مجھ سے اخلاقاً یہ وعدہ کریں کہ آپ اس جرم میں چھلکا پھینکنے والے کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ تو میں اس کا نام بھی بتانے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ کرنل موڈی نے وعدہ کیا کہ وہ چھلکا پھینکنے والے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ چھلکا پھینکنے والا لڑکا بھی کرنل موڈی کے پاس ہی کھڑا تھا میں نے کہا اس لڑکے نے یہ شرارت کی تھی۔ مگر شرارت کے جواب میں دفعتاً بطور ڈیفنس کیونکہ پہلے زنانہ جیل کی طرف سے کسی لڑکی نے شرارتاً کنکر پھینکا تھا۔ اصل واقعہ بتانے پر کرنل موڈی اور دوسرے تمام لوگ ہنس پڑے اور معاملہ ختم ہو گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عورت اور شباب دونوں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ ایک ایسا سیلاب ہے جس کو جیل کی دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔ اور ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے قول کے مطابق اس سیلاب کی کوشش ہوتی ہے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو یہ تباہی کے سامان پیدا کرے۔

Marfat.com

لیڈری اور اخبارات

دفتر "ریاست" اجمیری دروازہ سے باہر جی۔ بی روڈ پر تھا۔ ایک روز مسٹر آپسن سابق ایڈیٹر "مسلم آوٹ لک" لاہور ایک دوسرے انگریز کے ساتھ دفتر "ریاست" میں آئے۔ مسٹر آپسن نے دوسرے انگریز سے تعارف کرایا کہ یہ میجر وینزن ہیں۔ اور دہلی سے انگریزی کا ایک روزانہ اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں۔ میں مسٹر آپسن کو پہلے سے جانتا تھا۔ وہ نسل کے اعتبار سے انگریز تھے اور مذہب کے اعتبار سے مسلمان۔ مسٹر آپسن بہتر لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور روپے پیسے کے معاملہ میں بھی وہ صحیح معانی میں جرنلسٹ تھے۔ یعنی تنخواہ آنے سے پہلے قرض لے کر خرچ کر ڈالتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر آپسن اس ناواقف شخص کو اپنا تختہ مشق بنانا چاہتے ہیں۔ اس بچارے کے پاس دس پندرہ ہزار روپیہ ہوگا۔ ایک آدھ مہینہ میں اس کو کنگال کر دیں گے۔ میں نے اس شخص سے ہمدردی کے لہجہ میں پوچھا "آپ انگریزی کے روزانہ اخبار کے لئے کتنا روپیہ صرف کر دیں گے" میرے اس پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس نے پندرہ بیس ہزار روپیہ کہا تو میں اس سے کہوں گا کہ یہ روپیہ ضائع نہ کرے۔ مگر اس نے جواب دیا "چند لاکھ روپیہ" یہ جواب سن کر میں حیران رہ گیا کہ یہ کون حضرت ہیں جو کئی لاکھ روپیہ اخبار جاری کرنے پر صرف کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مزید باتیں ہوئیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ میجر وینزن فوج کے ریٹائرڈ افسر اور ضلع منٹگمری کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کو ہزارہا ایکڑ زمین دی ہوئی ہے۔ ان کے رینالہ خورد (ضلع منٹگمری) میں میلوں تک سنگترے اور مالٹے کے باغ ہیں۔ سینکڑوں اچھی نسل کے گھوڑے ان کے پاس ہیں جو گھوڑ دوڑ میں کام آتے ہیں۔ بعض گھوڑوں کی قیمت دس دس بیس بیس ہزار روپیہ بلکہ پچاس پچاس ہزار روپیہ تک ہے۔ اور ان کے لئے چند لاکھ روپیہ خرچ کر دینا بہت معمولی بات ہے۔ میجر وینزن اور مسٹر آپسن کے مجھ سے ملنے کا مقصد یہ تھا کہ میں ان کے لئے مکان حاصل کرنے اور اخبار کے متعلق دوسری ضروریات کے سلسلہ میں ان کی امداد کروں۔ اور مشورہ دوں۔ میجر وینزن نے تو میڈن ہوٹل میں قیام کیا تھا، اور مسٹر آپسن نے ڈرلینڈ ہوٹل میں۔ باتیں کرنے کے بعد چائے پی اور چائے پینے کے بعد میجر وینزن نے خواہش ظاہر کی کہ میں رات کو کھانا ان کے ساتھ میڈن ہوٹل میں کھاؤں۔ تاکہ ہم اخبار کے متعلق تفصیل کے ساتھ باتیں کر سکیں۔

میں رات کو کھانے کے وقت میڈن ہوٹل گیا۔ میجر وینزن اپنے کمرہ میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے اور وسکی پی رہے تھے۔ میں پہنچا اور بیٹھا تو آپ نے کہا "آپ وسکی پئیں گے؟" میں نے جواب دیا کہ مجھے وسکی پینے کی عادت نہیں اور چھ چھ ماہ تک مجھے شراب کو کبھی چھونے کا اتفاق بھی نہیں ہوتا مگر میں کبھی کبھی تھوڑی سی پی لینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ وسکی میرے گھر پر دوستوں

Marfat.com

کے لئے تو ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ مگر میں خود وسکی نہیں پیتا۔ کبھی کبھی تھوڑی سی برانڈی پی لیتا ہوں۔ میرے اس جواب کے بعد آپ نے برانڈی کا ایک پیگ منگایا۔ اور اس پیگ میں سوڈا ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جو لوگ شراب نہیں پیتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے دل میں اخلاص، سچائی اور پاکیزگی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دل کی صفائی کے لئے شراب سے بڑھ کر کوئی شے دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوئی۔“ میں نے جواب دیا کہ شراب تھوڑی مقدار میں جتنی مفید ہے زیادہ مقدار میں اتنی ہی نقصان کا باعث ہے۔ اور چونکہ لوگ اپنی طبیعت پر کنٹرول نہیں کر سکتے زیادہ پی جاتے ہیں۔ اسی لئے اس دیوتاؤں کی پینے والی شے (سنسکرت میں دیوتا کو سُر اور شراب کو سرا پان یعنی دیوتاؤں کے پینے والی شے) کی مذاہب نے ممانعت کر دی۔ اور اسے حرام قرار دیا۔ میجر وینزن نے مجھے بتایا کہ حضرت مسیح کے ایک خلیفہ نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا کہ جب کبھی تمہارا معدہ خراب ہو تو تھوڑی سی شراب پی لیا کرو۔ چنانچہ عیسائیوں میں شراب پینے کی مذہباً ممانعت نہیں ہے اور اس کا پینا جائز ہے۔ کھانے پر مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ اور اخبار کے متعلق بھی میں نے ان کو بتایا کہ کیا کچھ کرنا چاہیئے۔

میجر وینزن بہت ہی مخلص اور فیاض شخصیت تھے۔ روپیہ کو مٹی کے برابر سمجھتے۔ اور ان کو نہ تو جرنلزم سے کوئی دلچسپی تھی نہ سیاسیات سے۔ ایک پیسہ کی جگہ ایک روپیہ صرف کرتے۔ اخبار کے جاری ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے دفتر میں بھاری بھاری تنخواہوں پر کئی انگریز اور ہندوستانی ملازم بھرتی کر لئے۔ ان کے اخبار جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو نائٹ بننے کی خواہش تھی مسٹر آیسن نے ان کو پٹی پڑھا دی تھی کہ اگر انہوں نے ایک سال بھی انگریزی کا روزانہ اخبار جاری تھا تو یہ نائٹ (یعنی سر) ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے مجھے باتوں باتوں میں بتایا کہ ان کے اخبار جاری کرنے کا مقصد کیا ہے۔ اس پر میں نے ان کو صاف کہہ دیا کہ اخبار جاری کرنے کے کئی برس بعد تو وہ نائٹ ہو سکتے ہیں۔ ایک سال میں نائٹ ہونا مشکل ہے۔ اور جس طریقہ کے ساتھ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اس طرح تو سال میں چار پانچ لاکھ روپیہ صرف ہو جائے گا۔

میجر وینزن اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ روپیہ بے تحاشا صرف کرتے رہتے۔ پانچ پانچ ہزار روپیہ کی پرنٹنگ مشین کے لئے بیس بیس ہزار روپیہ دے دیا۔ دو دو سو روپیہ ماہوار کے ملازم کی تنخواہ پانچ پانچ سو روپیہ مقرر کر دی گئی۔ اور جو کام چار آدمی کر سکتے تھے اس کے لئے دس آدمی رکھ لئے گئے۔ مجھ سے جب کبھی رائے لیتے۔ میں ان کو تجارتی کفایت شعاری کی رائے دیتا۔ مگر اس کا ان کی طبیعت پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ ایک تو وہ طبعاً فیاض اور فضول خرچ، دوسرے نائٹ کا خطاب حاصل کرنے اور لیڈر بننے کی خواہش۔ چنانچہ ایک سال میں خطاب اور لیڈری کی توقع پوری نہ ہوئی۔ روپیہ البتہ میٹ کے مقابلہ پر آٹھ گنا زیادہ صرف ہو گیا۔ فوجی قسم کے آدمی تھے ایک روز محسوس کیا کہ خطاب حاصل کرنے کے لئے یہ غلط قدم ہے۔ اور اس احساس کے بعد آپ نے کئی لاکھ روپیہ

Marfat.com

صرف کرنے کے بعد اخبار بند کر دیا اور آپ واپس اپنی زمینداری پر منٹگمری چلے گئے۔

میجر وینزن کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ کروڑوں روپے کی جائیداد چھوڑ کر انتقال کیا۔ اس جائیداد کی وارث غالباً آپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بہت عرصہ ہوا میں نے اخبارات میں پڑھا کہ میجر وینزن کی بیوہ اپنے زمینداری کے کام کے سلسلے میں جب منٹگمری سے کراچی جا رہی تھیں تو راستہ میں کسی بے رحم نے روپے کے لالچ میں اس خاتون کو قتل کر دیا۔ یہ پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔

بعض لوگ اخبارات صرف لیڈر بننے کے لئے جاری کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے میجر وینزن کا اخبار جاری کرنا عبرت کا باعث ہونا چاہیئے، کیونکہ اخبارات ایک ایسی تجارت ہے جس میں بہت کافی روپیہ صرف کرنے کے بعد کسی منافع کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور لیڈری حاصل کرنے کے لئے اخبار جاری کرنا تو ایک حماقت ہے۔

لیڈری کی خواہش رکھنے والے اصحاب کے لئے بہتر ہے کہ وہ کبھی بھی اپنا اخبار جاری نہ کریں۔ ان کا ایک اخبار جاری کرنا درجنوں دوسرے اخبارات کو دشمن بنانے کا باعث ہوگا۔ ان کے لئے بہتر ہے کہ جو روپیہ وہ اپنے ذاتی اخبار کے نکالنے پر صرف کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ وہ روپیہ دوسرے اخبارات کے ایڈیٹروں کی دعوتوں اور خاطر و تواضع پر صرف کریں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر اخبار ان کا دوست اور ان کی لیڈری میں معاون ثابت ہوگا۔

رشوت اور سفارش

ہندوستان کی ملازمتیں، ہندوستانیوں کے مقدمات، ہندوستان کی ٹھیکہ داریاں یا دوسرے کاروبار وغیرہ ان سب کا دارومدار زیادہ تر رشوت اور سفارش پر ہے۔ یعنی کوئی مقدمہ ہو، تو اس میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ یا تو سفارش ہے، یا رشوت۔ ملازمت حاصل کرنی ہو تو اس کے لئے سفارش کرائی جاتی ہے، یا رشوت دی جاتی ہے۔ اور کوئی کاروبار کرنا ہو تو اس کے لئے سوچنا پڑتا ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے کس کس کو رشوت دی جائے گی اور کس کس کو سفارش کے ذریعہ اپنے قابو میں کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ دونوں بد دیانتیاں ہماری زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہیں۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سب رشوت اور سفارش میں مبتلا ہیں۔ اور نہ تو سفارش کرانے اور رشوت دینے والا اس میں کوئی عیب سمجھتا ہے اور نہ سفارش ماننے اور رشوت لینے والا۔ حالانکہ غور کیا جائے تو سفارش کرانا یا سفارش ماننا اتنا ہی عیب ہے جتنا کہ رشوت دینا یا لینا۔ میرا اندازہ ہے کہ ہر بڑے آدمی کے پاس اہل غرض سفارش کرانے کے لئے ہر روز درجنوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں۔ اور یہ بڑے آدمی ہر شخص کو ہی طفل تسلیاں دے کر

Marfat.com

ان کو تاریکی میں رکھتے ہوئے ان کے لئے نقصان اور تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ سفارش کرانے والا مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنا کام نکالنے کے لئے انتظام کر لیا۔ اب اسے کوئی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ مگر سفارش کرنے والا یہی کافی سمجھتا ہے کہ اس نے اہل غرض کو طفل تسلی دے کر اسے بے وقوف بنا لیا۔ میں سفارشوں کے سلسلہ میں چند واقعات عرض کرتا ہوں، جن سے معلوم ہوگا کہ بڑے لوگ (جن کے پاس ہر روز درجنوں اہل غرض سفارش کے لئے آتے ہیں اور جن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ہر شخص کی سفارش کر سکیں) کیونکہ اہل غرض کو بے وقوف بناتے ہوئے اُن کے لئے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔

میرا ایک مقدمہ چل رہا تھا اور ضمانت نہ ہونے کے باعث میں جیل میں تھا۔ میری غیر حاضری میں "ریاست" کے پرنٹر و پبلشر مسٹر ظفر احمد مقدمہ کے باعث بہت پریشان تھے۔ تو اتفاق سے ان کے قریبی رشتہ دار جو پنجاب گورنمنٹ کے ایک بہت بڑے عہدے پر ہیں دہلی تشریف لائے اور ظفر صاحب سے ملے۔ تو باتوں باتوں میں ظفر صاحب کو انہوں نے بتایا کہ دہلی کے سٹی مجسٹریٹ سردار بہادر نریندر سنگھ (جن کی عدالت میں یہ مقدمہ تھا) ان کے بہت گہرے ذاتی دوست ہیں اس بات چیت میں ہی انہوں نے ظفر صاحب کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے کہا کہ فکر نہ کیجئے۔ وہ سردار بہادر نریندر سنگھ سے سفارش کریں گے۔ اور سفارش کئے بغیر دہلی سے نہ جائیں گے۔ اس بات چیت کے بعد اگلے روز یہ بزرگ ظفر صاحب سے ملے، تو آپ نے فرمایا کہ وہ سردار بہادر نریندر سنگھ سے ملے تھے انہوں نے سفارش کر دی ہے۔ اور سردار بہادر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دیوان سنگھ کو بری کر دیں گے۔ کیونکہ دیوان سنگھ بے قصور ہے ظفر صاحب کو ان ایسے سفارش بازوں کا تجربہ نہ تھا۔ میں جب ضمانت پر جیل سے باہر آیا تو مجھے حالات معلوم ہوئے۔ میں نے اس قسم کی سفارشوں کے رحم پر اپنے آپ کو کبھی نہیں چھوڑا۔

میں نے اپنے ذرائع سے ایک دوست کی معرفت پتہ کیا، تو معلوم ہوا کہ سفارش کرنے والے بزرگ ایک طویل عرصہ سے سردار بہادر نریندر سنگھ سے ملے ہی نہیں۔

سفارش کرنے کا تو سوال ہی کیا ہے۔ چنانچہ میں نے ظفر صاحب کو بتایا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اور اگر ہم اس سفارش کے رحم پر رہتے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ اس کے بعد ظفر صاحب اپنے ان بزرگ سے ملے اور ان پر ظاہر کیا کہ ہمیں اصل حالات اور آپ کا جھوٹ بولنا معلوم ہو چکا ہے تو یہ حضرت شرمندہ ہوئے اور اب جب بھی ظفر صاحب سے ملتے ہیں تو شرم محسوس کرتے ہوئے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔

میرا مقدمہ چل رہا تھا، ہائیکورٹ نے پہلے تو یہ حکم دیا کہ اس مقدمہ کی مسٹر ایسر کی عدالت میں سماعت ہو۔ مگر مسٹر ایسر نے ہائیکورٹ کو رپورٹ کی کہ چونکہ آپ کے دیوان سنگھ کے ساتھ ذاتی تعلقات ہیں اس لئے آپ مقدمہ کی سماعت کرنا نہیں چاہئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیف جج نے اس

Marfat.com

رلپورٹ پر مقدمہ گوڑگاؤں بھیج دیا۔ مقدمہ کے گوڑگاؤں جانے کا پبلک کو علم نہ تھا۔ ایک روز میں کسی کام کے لئے ریلوے سٹیشن پر گیا۔ وہاں سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے سامنے کھڑا ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ دہلی کے ایک بہت بڑے ٹھیکہ دار جو خطاب یافتہ سردار بہادر بھی ہیں مجھے ملے۔ آپ نے کچھ تھوڑی سی وسکی بھی پی ہوئی تھی۔ وسکی پینے کے بعد انسان فراخدلی کے ساتھ اظہار محبت کرتا ہے۔ آپ جب ملے تو آپ ایڈیٹر "ریاست" سے لپٹ گئے۔ اور اظہار ہمدردی اور اظہار محبت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "مسٹر ایلسر میرے گہرے دوست ہیں۔ وہ کل مجھ سے ملے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ دیوان سنگھ میرا گہرا ذاتی دوست ہے۔ آپ خیال رکھئے اور مسٹر ایلسر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مقدمہ میں ضرور بری کر دیں گے"۔ ان سردار جی کو علم نہ تھا کہ مقدمہ کئی روز ہوئے گوڑگاؤں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور مسٹر ایلسر نے مقدمہ کی سماعت سے انکار کر دیا ہے۔ آپ نے حسب عادت ایڈیٹر "ریاست" پر احسان جتانے کے لئے بلاوجہ جھوٹ بولا۔ ایڈیٹر "ریاست" اس سے اگلے روز مسٹر ایلسر سے ملا اور ان سردار بہادر کی لفنگ بازی کے متعلق پوچھا تو مسٹر ایلسر نے بتایا کہ آپ کئی ماہ سے ان سردار بہادر سے ملے تک نہیں۔ اور سردار بہادر کا ارشاد سو فیصدی جھوٹ ہے۔

ایک دوست جیل میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ یہ دہلی تشریف لائے اور ملے تو انہوں نے بتایا کہ آپ ایک ممبر اسمبلی سے ملنے دہلی اس لئے آئے تھے کہ وہ ممبر اسمبلی مسٹر بھیم سین سچر وزیر جیل خانہ جات پنجاب سے سفارش کر دیں۔ میں نے باتوں باتوں میں اس دوست پر ظاہر کر دیا کہ آپ ایسی سفارشوں پر بھروسہ نہ کیجئے۔ یہ ممبران اسمبلی لوگوں کو غلط توقعات دلانے اور تاریکی میں رکھ کر جھوٹ بولنے میں مشاق ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر ممبر اسمبلی کے پاس روزانہ چالیس پچاس سفارش کرانے والے جاتے ہیں ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ اتنے لوگوں کی سفارش کریں۔ چنانچہ ایک روز یہ ممبر اسمبلی میرے ہمسفر تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے بتایا اور اقرار کیا کہ سفارش کرانے والے چالیس پچاس اصحاب ہر روز آتے ہیں۔ ان کو اگر صاف جواب دیا جائے تو یہ دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مجبوراً سب کی خانہ پری کرتے ہوئے سب سے ہاں کر لی جاتی ہے۔ اور کسی کی بھی سفارش نہیں کی جاتی۔ یا زیادہ سے زیادہ سفارشی خط لکھ دیا جاتا ہے۔ جس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سفارشی خط لکھنا ایک رسم سی ہے، جس کو ہر ممبر اسمبلی ادا کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ رسم بھی ادا نہ کی جائے تو ووٹر دشمن ہو کر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ریلوے کے ایک ٹکٹ کلکٹر مقدمہ میں گرفتار تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص چند منٹ کے لئے بھی ملے تو وہ دوست ہوتا ہے اور اس "دوست" سے ہر قسم کا کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ مقدمہ کے سلسلہ میں یہ درجنوں ممبران اسمبلی اور بڑے بڑے لوگوں سے مل چکے تھے جن سے تھوڑی بہت واقفیت تھی تاکہ مجسٹریٹ کے پاس ان کی سفارش کی جائے۔ ان ممبران اسمبلی اور بڑے لوگوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے ان کو سفارش کرنے کا یقین نہ دلایا ہو اور یقین دلانے کے بعد سفارش کی ہو۔ یہ صاحب اب جب بھی ملتے ہیں اپنے "دوستوں" کا شکوہ کرتے ہیں۔ مگر محسوس نہیں کرتے کہ دوستی اور واقفیت میں فرق ہے اور ہر وقت

Marfat.com

سے دوستی کی توقع کرنا عقلمندی نہیں۔

رشوت کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ رشوت کا روپیہ (جس کو ہمارے ایک دوست چاندی کی جوتی کہا کرتے ہیں) ہر سخت سے سخت دل کو نرم کر سکتا ہے۔ مگر سفارشوں پر بھروسہ کرنے والے یقیناً غلط توقعات اور غلط امیدوں پر تباہ ہو رہے ہیں۔ اور ان کا سفارش کی کوشش کرنا یقیناً ایسا گناہ ہے جو گناہ بھی ہے۔ اور جس کا کوئی اچھا نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔

اہلِ فن اور اُن کی قدر ناشناسی

اخبار "ریاست" کے جاری ہونے سے پہلے میں ایک بار ریاست حیدرآباد گیا اور حیدرآباد پہنچنے سے پہلے ایک ہفتہ کے قریب حضور صاحب (ناندیڑ جہاں کہ گورو بند سنگھ کا وصال ہوا) میں قیام کیا۔ حضور صاحب کے گوردوارہ میں شبد کیرتن کرنے کے لئے ایک بھائی تھمن سنگھ راگی مقرر تھے۔ جن کا خاندان کئی پُشت سے یہی کام کرتا تھا۔ یہ بھائی تھمن سنگھ موسیقی کے فن میں ماہر تھے۔ اور انہوں نے خود ہی ایک ساز تیار کیا تھا۔ جس پر ساٹھ ستر کے قریب تار تھے، اور جو سُریلا ہونے کے اعتبار سے سارنگی یا ستار سے زیادہ دلکش تھا۔ بھائی تھمن سنگھ کے پاس بڑے بڑے لوگوں کے سینکڑوں سرٹیفکیٹ تھے۔ اور ان سرٹیفکیٹوں میں مرحوم مسٹر میکالف آئی۔ سی۔ ایس (جنہوں نے سکھ ازم کے متعلق مشہور تصنیف "سکھ ریلیجن" لکھی) اور سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ وغیرہ کے سرٹیفکیٹ بہت اہم تھے۔ میں جتنے دن حضور صاحب رہا، علی الصبح بھائی تھمن سنگھ کی موسیقی سے محظوظ ہوتا رہا۔

بھائی تھمن سنگھ نے بتایا کہ میرے وہاں جانے سے عرصہ پہلے سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ (مرحوم مہاراجہ نابھہ کے اتالیق جو بعد میں ریاست پٹیالہ میں فارن منسٹر تھے) حضور صاحب گئے۔ اور آپ بھائی تھمن سنگھ کی موسیقی سے بہت خوش ہوئے تو آپ نے پٹیالہ کے فارن منسٹر ہونے کے بعد مرحوم مہاراجہ پٹیالہ سے بھائی تھمن سنگھ کی بہت تعریف کی۔ جس پر مہاراجہ پٹیالہ نے بھائی تھمن سنگھ کو پٹیالہ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ اس دعوت پر بھائی تھمن سنگھ پٹیالہ گئے۔ وہاں سرکاری مہمان خانہ میں قیام کیا۔ اور کئی ہفتہ کے انتظار کے بعد آپ کو موتی باغ محل (جہاں مرحوم مہاراجہ پٹیالہ رہا کرتے تھے) میں طلب کیا گیا۔ بھائی تھمن سنگھ جب موتی باغ پہنچے تو آپ کا مہاراجہ پٹیالہ سے تعارف کرانے کے لئے سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ وہاں موجود تھے۔ چنانچہ بھائی تھمن سنگھ بھی ویٹنگ روم میں بھائی کاہن سنگھ کے پاس جا بیٹھے۔ ویٹنگ روم میں بھائی کاہن سنگھ اور بھائی تھمن سنگھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے، تو ساتھ والے کمرہ سے گدھے (پنجاب کی ریاستوں نابھہ، پٹیالہ، جیند

Marfat.com

اور اضلاع فیروزپور و لدھیانہ میں عورتیں برسات کے زمانہ میں دیہاتی رقص کرتی اور گاتی ہیں۔ جسے وہاں گِدھا کہا جاتا ہے) کی آواز آ رہی تھی۔ بھائی تھمن سنگھ نے ایک اے۔ڈی۔سی سے دریافت کیا کہ یہ شور کیسا ہے۔ تو اے۔ڈی۔سی نے بتایا کہ سری حضور مہاراجہ صاحب گدھا میں مشغول ہیں اور دیہات کی عورتیں بلائی گئی ہیں، جو رقص کر رہی ہیں اور گا رہی ہیں۔ بھائی تھمن سنگھ بہت بڑے آرٹسٹ اور موسیقی کی باریکیوں سے واقف تھے۔ آپ نے مہاراجہ کے گدھے میں مصروف ہونا اپنی طبیعت پہ ایک بار سا محسوس کیا اور آپ نے بھائی کاہن سنگھ سے کہا:۔

"بھائی صاحب، موسیقی کا علم بہت ارفع علم ہے جس کی کوئی موسیقار توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جو مہاراجہ گدھا سن سکتا ہے اس کو راگ کی باریک سریں سنانا موسیقی کی توہین ہے اس لئے مجھے معاف کیجئے میں مہاراجہ پہ اپنی راگ ودیا کا اظہار کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں واپس چلا جاؤں"۔

سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ نے بھائی تھمن سنگھ کو بہت سمجھایا کہ والیانِ ریاست ہر قسم کے اشغال میں مصروف رہا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اور مہاراجہ کو گانا سنانے میں کوئی حرج نہیں مگر بھائی تھمن سنگھ نہ مانے۔ واپس مہمان خانہ میں آ گئے۔ اور آپ نے اگلے روز واپس حضور صاحب جانے کی تیاری کر لی۔ چنانچہ شام کو بھائی کاہن سنگھ مہمان خانہ میں پہنچے۔ اور جب بھائی تھمن سنگھ کسی صورت سے بھی مہاراجہ کو گانا سنانے پر رضامند نہ ہوئے۔ تو آپ نے مہاراجہ کی طرف سے بھائی تھمن سنگھ کو چند ہزار روپیہ بطور رخصتانہ دے دیا۔ اور بھائی تھمن سنگھ واپس حضور صاحب چلے گئے۔

یہ تو درست ہے کہ اہلِ فن مالی اعتبار سے ہمیشہ پریشان رہے۔ کیونکہ فن کی قدر کرنے والے اس دنیا میں کمیاب ہیں۔ مگر اہلِ فن کے لئے فاقہ کشی کرنے کے مقابلہ پر اپنے فن کی توہین برداشت کرنا زیادہ تکلیف دہ ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اچھے شعراء، اچھے جرنلسٹ، اچھے مصوّر، اچھے بت تراش اور اچھے موسیقار و آرٹسٹ اپنی خودداری کے باعث کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے اور فاقہ کشی ہی میں اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔

ٹیلی فون پر شرارتیں یا مذاق

آٹومیٹک ٹیلی فون جہاں رازداری کے اعتبار سے سائنس کی ایک نعمت ہے۔ وہاں شرارتیں یا مذاق کرنے کے لحاظ سے اسے ایک مصیبت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں اپنے چند واقعات عرض کرتا ہوں:۔

Marfat.com

"ریاست" کا دفتر اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ اور اُس زمانہ میں میرٹھ کا مقدمہ سازش چل رہا تھا۔ اس مقدمہ میں لالہ کدار ناتھ سہگل اور سردار سوہن سنگھ جوش وغیرہ کئی دوست ماخوذ تھے۔ جن سے ملنے کے لئے میں مہینہ میں ایک آدھ بار میرٹھ جایا کرتا۔ اور اس مقدمہ کے انچارج وکیل پٹنہ کے ایڈووکیٹ مسٹر دیو کی پرشاد سنہا ممبر مرکزی اسمبلی تھے۔ مسٹر دیو کی پرشاد سنہا نواب زادہ لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان کے ہم زلف تھے۔ یعنی بیگم لیاقت علی (جو اس زمانہ میں ایک عیسائی خاتون مس پنت تھیں اور بعد میں جن کی شادی لیاقت علی خاں صاحب سے ہوئی) مسز سنہا کی حقیقی بہن ہیں۔ مسٹر سنہا ایڈیٹر "ریاست" کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ آپ، آپ کی فیملی یا مس پانت (بیگم لیاقت علی) وغیرہ جب کبھی میرٹھ سے دہلی تشریف لاتے تو یہ ایڈیٹر "ریاست" کے مکان پر ہی قیام کرتے۔ یہ سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا۔

ایک بار تین روز کی مسلسل چھٹیاں تھیں۔ اور سپیشل جج میرٹھ کی عدالت (جہاں مقدمہ سازش کی سماعت ہو رہی تھی) بھی بند تھی۔ مسٹر سنہا مع اپنی فیملی کے دہلی آ گئے اور ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں مقیم ہوئے۔ آپ کو دہلی آئے دو روز ہوئے تھے اور ابھی چھٹیوں کا ایک روز باقی تھا کہ مسٹر سنہا شام کے وقت میرٹھ واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے آپ سے کہا کہ ابھی کچہری ایک روز اور بند ہے۔ میرٹھ جا کر کیا کرو گے۔ کل شام کو چلے جائیے۔ مگر مسٹر سنہا نہ مانے اور آپ نے کہا کہ آپ ضرور جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کھانے پر بھی ان سے کہا گیا کہ آپ نہ جائیے۔ مگر آپ مسلسل انکار کرتے رہے۔ اس پر ایڈیٹر "ریاست" نے آپ سے کہا کہ چاہے کچھ ہو آپ کو نہیں جانے دیا جائے گا۔ اور مسٹر سنہا نے کہا کہ چاہے کچھ ہو آپ ضرور جائیں گے۔ کھانا ختم ہوا تو آپ نے اپنی کار میں سامان رکھوایا۔ اور آپ اپنے بال بچوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر میرٹھ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب آپ چلنے لگے تو آپ سے پھر کہا گیا کہ نہ جائیے۔ رات کے نو بج چکے ہیں۔ دو گھنٹہ کا سفر ہے۔ رات کو گیارہ بجے میرٹھ پہنچو گے تکلیف ہو گی، کل چلے جائیے مگر مسٹر سنہا نہ مانے اور روانہ ہو گئے۔

ان کے دفتر "ریاست" سے روانہ ہونے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" کو شرارت سوجھی۔ اس نے جمنا پل کی پولیس کی چوکی کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں ایک ہیڈ کنسٹیبل پہرہ پر تھا، اسے کہا "میں کوتوالی سے بول رہا ہوں۔ ابھی ایک موٹر کار سیاہ رنگ کی جس کا فلاں نمبر ہے (یہ نمبر مسٹر سنہا کی کار کا تھا) پُل کی طرف آ رہی ہے اس کو فوراً روکو۔ میرٹھ کی طرف جانے مت دو۔ کیونکہ اس کار میں کوکین کا شبہ ہے؟" ہیڈ کنسٹیبل "بہت اچھا حضور" کہہ کر اور ٹیلیفون بند کر کے پُل کے راستہ پر کھڑا ہو گیا۔ چار پانچ منٹ کے بعد اسی نمبر اور سیاہ رنگ کی کار پہنچی تو اُسے ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا گیا اور کہا گیا کہ کوتوالی سے حکم پہنچا ہے آپ کی کار میں کوکین ہے آپ آگے نہیں جا سکتے۔

Marfat.com

مسٹر سنہا حیران کہ ان کی موٹر میں کوکین کہاں سے آگئی۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ آپ نے ہیڈ کنسٹیبل سے کہا کہ آپ ممبر اسمبلی اور مقدمہ سازش میرٹھ کے انچارج وکیل ہیں اور مقدمہ کی پیروی کے لئے میرٹھ جا رہے ہیں۔ مگر ہیڈ کنسٹیبل نے ایک نہ سُنی اور جواب دیا کہ آپ چاہے وائسرائے بھی ہوں نہیں جا سکتے کیونکہ کوتوالی سے آپ کو روکنے کے لئے حکم ملا ہے۔ مسٹر سنہا کئی منٹ تک اس ہیڈ کنسٹیبل کو سمجھاتے رہے کہ وہ موٹر کو جانے دے۔ مگر وہاں کون سنتا تھا۔ آخر مسٹر سنہا نے دفتر" ریاست" میں ٹیلی فون کیا کہ یہ ناگہانی مصیبت نازل ہوئی ہے اور میں کوتوالی میں ٹیلی فون کر کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہوں کہ ان کی کار کو نہ روکا جائے۔ مسٹر سنہا کی اس کیفیت کو سن کر ایڈیٹر" ریاست" اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور بتایا کہ خود اس نے ہی یہ شرارت کی ہے۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ ٹیلی فون کو بند کر دیجئے۔ ہیڈ کنسٹیبل کو ابھی حکم دیا جاتا ہے۔ مسٹر سنہا نے ٹیلی فون بند کر دیا تو ایڈیٹر" ریاست" نے پھر اس جمنا کے پل کے ٹیلی فون کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجنے پر ہیڈ کنسٹیبل نے ٹیلی فون اُٹھایا تو اُسے کہا گیا" میں کوتوالی سے بول رہا ہوں۔ ڈپٹی صاحب نے حکم دیا ہے کہ کار جو روکی ہوئی ہے اس کو جانے دو۔ غلطی سے اس کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔" ہیڈ کنسٹیبل نے" بہت اچھا حضور" کہا اور سنہا صاحب میرٹھ تشریف لے گئے۔

لدھیانہ کے سردار گوپال سنگھ خالصہ (ممبر اسمبلی تھے) ایڈیٹر" ریاست" کے مکان پر مقیم تھے۔ سردی کا زمانہ تھا، رات کو کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو اس کے بعد لطائف کا دور شروع ہوا لطیفہ بازی میں رات کے تین بج گئے۔ اس وقت ہمیں شرارت سوجھی" ہندوستان ٹائمز" کا آخری فرمہ اس وقت تیار ہوتا تھا اور چار یا پانچ بجے کے قریب پرچہ شائع ہو جاتا تھا۔ سردار گوپال سنگھ نے ایک بنئے کی گھبرائی ہوئی آواز میں" ہندوستان ٹائمز" کے نائٹ ایڈیٹر سے ٹیلیفون پر ذیل کی گفتگو کی:۔

سردار گوپال سنگھ:۔" بابو جی۔ بابو جی! غازی آباد کے سٹیشن پر بم سے کتنے آدمی مرے ہیں اور کتنے زخمی ہوئے ہیں"؟

نائٹ ایڈیٹر:" کیا غازی آباد میں بمب پھٹا ہے"؟

سردار گوپال سنگھ:۔" بابو جی! آپ اکھبار نکالتے ہیں آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ میں نے چار مرے ہوئے دیکھے ہیں، پتہ نہیں جکھمی کتنے ہوئے۔ پولیس پر بمب پھینکا گیا"

یہ کہتے ہی سردار گوپال سنگھ نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ رات کے تین بجے تھے اور چار بجے اخبار شائع ہونا تھا" ہندوستان ٹائمز" والوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا کہ اس خبر کی تصدیق کرتے اور اتنی" اہم" خبر سے اپنے ناظرین کو محروم بھی نہ کر سکتے تھے۔ پہلے صفحہ کی دوسری ضروری خبریں نکال کر چار کالموں کی سرخیوں کے ساتھ خبر شائع کی گئی۔" غازی آباد میں بمب پھٹا، چار مرے کئی زخمی"۔ صبح

Marfat.com

"ہندوستان ٹائمز" آیا تو یہ "سنسنی خیز" خبر تھی۔ اس خبر کے شائع ہونے کے چار روز بعد "ہندوستان ٹائمز" نے غلط خبر کی اشاعت پر یو پی گورنمنٹ سے معافی مانگی۔ اور اس معافی کو اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیا۔ اس خبر کے شائع ہونے کے بعد "ہندوستان ٹائمز" کے ایڈیٹر مسٹر پوتھن جوزف جب ملے تو "ہندوستان ٹائمز" کی تازہ ترین خبروں کی داد دی گئی۔ اور جب اس شرارت کا ان کو علم ہوا تو آپ نے سردار گوپال سنگھ کو داد دی۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سیکرٹری مرحوم چوہدری عبدالغنی نے خلافت کمیٹی اور پبلک لائف سے بددل ہو کر دہلی میں بزنس شروع کر دیا تھا۔ وہ امپورٹ اور ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ شام کو آپ ہر روز دفتر "ریاست" میں تشریف لایا کرتے تھے۔ بہت خوبیوں کے مخلص دوست تھے گھنٹوں باتیں ہوا کرتیں۔ ایک روز آپ نے اپنی آواز بدل کر ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلی فون کیا کہ مہاراجہ بیکانیر کے پرائیویٹ سیکرٹری دہلی آئے ہوئے ہیں۔ رائل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ اور ایک ضروری معاملہ کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے مہاراجہ نے ان کو بھیجا ہے۔ تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں رائل ہوٹل کے کمرہ نمبر ۸ میں ان سے مل جاؤں۔ میں چوہدری صاحب کی آواز نہ پہچان سکا۔ حالانکہ ہر روز ملا کرتے۔ اس ٹیلی فون کے بعد میں فوراً کار میں رائل ہوٹل پہنچا۔ رائل ہوٹل کے مالک لالہ ٹھاکر داس پرانے ملنے والے اور شملہ کی ایک ریاست کے رہنے والے تھے۔ میں ہوٹل پہنچا تو بہت تپاک سے ملے۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کس غرض کے لئے ہوٹل آیا ہوں۔ میں تمام معاملہ راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ ان کو بھی میرے مہاراجہ بیکانیر کے سیکرٹری سے ملنے کا علم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ ایک دوست کے متعلق اطلاع تھی کہ وہ یہاں آٹھ نمبر کے کمرہ میں ہیں۔ ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ لالہ ٹھاکر داس نے بتایا کہ آٹھ نمبر کا کمرہ تو کئی روز سے خالی ہے۔ میں واپس آ گیا۔ شام کو چوہدری صاحب آئے تو آپ نے پوچھا کہ رائل ہوٹل میں کیسی گذری۔ کیا جواب دیتا، یہی کہا کہ میں آپ کی آواز پہچان گیا تھا۔ اس لئے رائل ہوٹل گیا ہی نہیں۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا، ہمیں شرارت سوجھی سردار نانک سنگھ آئرن مرچنٹ (جو دہلی کی پبلک لائف میں بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اور یہاں کے سکھوں میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے) کہ ایک دوست نے ٹیلی فون پر آواز تبدیل کر کے انگریزی میں اس طرح بات کی۔ جس طرح کوئی کم انگریزی جاننے والا جاپانی ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور جاپانی لہجہ میں بات کرتا ہے۔ سردار نانک سنگھ سے کہا گیا۔

"میں جاپان کا ٹریڈ منسٹر ہوں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مقامات کی سیر کر رہا ہوں۔ میرا مذہب بدھ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں گورو نانک بہت بڑے ریفارمر ہو

Marfat.com

چکے ہیں۔ اور سکھوں کا ٹمپل دہلی میں بھی ہے۔ اس ٹمپل کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔
سردار نانک سنگھ ٹیلی فون پر" جاپانی ٹریڈ منسٹر" کی یہ خواہش سن کر بے حد خوش ہوئے۔ شام کو چھ بجے گوردوارہ دیکھنے کا وقت مقرر ہوا۔ سردار نانک سنگھ نے ٹیلی فون پر دہلی کے تمام بڑے بڑے سکھ ٹھیکہ داروں اور سرداروں کو یہ مسرت افزا اطلاع دی۔ تمام ٹھیکہ دار خوش ہوئے گویا کہ تمام کا تمام جاپان سکھ مذہب قبول کرنے والا ہے۔ شام کو ۶ بجے ایڈیٹر"ریاست" اپنے اس دوست کے ساتھ جس نے آواز بدل کر سردار نانک سنگھ کو ٹیلی فون کیا تھا موٹر پر سے چاندنی چوک سے ہوتا ہؤا گوردوارہ سیس گنج کے سامنے سے گذرا، تو دیکھا کہ کئی بڑے بڑے ٹھیکہ دار اور سردار ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے گوردوارہ کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ ان سرداروں کو جاپانی "ٹریڈ منسٹر" کے انتظار میں کھڑے دیکھ کر تکلیف تو ہوئی مگر ہم اپنی شرارت کی کامیابی پر مسرور تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بزرگ کتنے بجے تک" جاپانی منسٹر" کا انتظار کرتے رہے۔

کئی برس ہوئے ایڈیٹر"ریاست" نے ایک مقامی روزانہ انگریزی اخبار کے ایڈیٹر سے دلچسپ مذاق کیا۔ جس طرح آجکل تیسری عالمگیر جنگ اور روس کے ایٹم بم کا چرچا ہے۔ اس زمانہ میں جرمنی ور ہٹلر کی دہشت تمام دنیا پر طاری تھی۔ اور جرمنی کے نئی جنگ جاری کرنے کی افواہیں گرم تھیں ایڈیٹر "ریاست" اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ مقامی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کا ٹیلی فون آیا کہ کوئی کام نہ ما اس لئے گپ بازی کو جی چاہتا ہے کیونکہ آپ جب کبھی کام سے فارغ ہوتے تو ٹیلی فون پر باتیں شروع کر دیتے۔ آپ نے پوچھا کہ میرے پاس اور کون بیٹھا ہے۔ میں نے جواب دیا جرمنی کے انفارمیشن بیورو سے ایک صاحب ہندوستان آئے ہیں۔ اُن کی غرض اس ملک میں جرمنی کے حق میں پراپیگنڈہ کرانے کی ہے۔ سنا ہے لاہور کے اخبارات میں ساٹھ ستر ہزار روپیہ تقسیم کر آئے ہیں اب یہ دہلی کے اخبارات کے ایڈیٹروں کو مل رہے ہیں۔ ان سے بات کر رہا ہوں۔ ان کا بیان تو یہ ہے کہ جرمنی کی صنعت و حرفت کے حق میں مضامین لکھے جائیں۔ دراصل ان کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کا سیاسی پراپیگنڈہ کیا جائے تاکہ آئندہ جنگ میں عوام جرمنی کے حق میں ہوں۔ میری یہ اطلاع سن کر ایڈیٹر صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ اخبار کے خود مالک نہ تھے۔ انہوں نے چاہا کہ میں ان کی ملاقات کا دفتر "ریاست" میں انتظام کروں۔ اور ان کے اخبار کے مالک کو علم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ فی الحال ٹیلی فون بند کر دیجئے۔ میں ان سے مشورہ کرنے کے بعد ابھی آپ کو اطلاع دیتا ہوں تھوڑی دیر کے بعد میں نے ان کو ٹیلی فون پر کہا۔ کہ وہ صاحب اب تو وہاں جا رہے ہیں جہاں وہ مقیم ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ آپ کل دوپہر کو اُن سے سیسل ہوٹل میں ملیں۔ اور ریخ ان کے ساتھ کھائیں تاکہ اُس وقت باتیں بھی ہو سکیں۔ ایڈیٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ وہ اگلے روز دوپہر کو ایک بجے سیسل ہوٹل میں پہنچے۔ اور انتظار شروع ہؤا ڈیڑھ بج گیا، دو بج گئے، اڑھائی بج گئے،

Marfat.com

اور تین بج گئے۔ مگر جرمنی کے "انفرمیشن آفیسر" کا کوئی پتہ نہیں۔ آپ نے بار ہوٹل کے کلرک سے دریافت کیا مگر وہاں سے لاعلمی کا اظہار ہوا۔ آخر تین بجے مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا کہ وہ صاحب اب تک نہیں پہنچے ہیں کیا جواب دینا۔ میں نے بتایا کہ مذاق کیا تھا۔ آپ بہت ناراض ہوئے اور آپ کی ناراضی کا سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا۔

شہرت کا غلط شوق ذلّت کا باعث

مرحوم مہاراجہ نابھہ کو لٹریچر اور سیاست کا بہت شوق تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سیاسی دلچسپیاں ہی ان کی معزولی کا باعث ہوئیں۔ آپ جب کبھی کوئی مضمون انگریزوں یا انگریز پرستوں کے خلاف لکھا دیکھتے تو بیحد خوش ہوتے اور انگریزوں کی تعریف میں کوئی کلمہ برداشت نہ کرسکتے اور مہاراجہ کے تمام دوست ان کی اس نبض کو پہچانتے تھے۔

لاہور سے گورمکھی کا ایک ہفتہ وار اخبار "پنتھ سیوک" شائع ہوتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر ماسٹر چندا سنگھ تھے۔ ماسٹر چندا سنگھ کو سکھوں کی پرو گورنمنٹ پارٹی چیف خالصہ دیوان اور مہاراجہ پٹیالہ کے مخالفین میں شمار کیا جاتا تھا اور اس لئے مہاراجہ اس اخبار کو وقتاً فوقتاً مالی امداد دیا کرتے تھے ماسٹر چندا سنگھ میں بہت بڑی کمزوری یہ تھی کہ اگر کوئی دوسرا شخص بھی ان کے اخبار میں مضمون لکھتا تو یہ اُسے اپنے نام کے ساتھ شائع کرتے۔

مہاراجہ نابھہ کے ایک دوست سردار سوہن سنگھ راہی گوجر خان (ضلع راولپنڈی) میں رہتے تھے یہ بھی اچھے لکھنے والوں میں سے تھے اور کبھی کبھی اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ سردار سوہن سنگھ راہی نے ایک مضمون لکھا جس میں انگریزوں کی حکومت پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اور مہاراجہ پٹیالہ کو بھی بےنقاب کیا گیا تھا۔ سردار سوہن سنگھ نے اس مضمون کی ایک کاپی گوجر خان سے براہِ راست مہاراجہ کو نابھہ بھیج دی۔ اور ایک کاپی شائع کرنے کے لئے اخبار "پنتھ سیوک" میں مضمون شائع ہونے سے پانچ چھ روز پہلے پہنچ گئی مگر ماسٹر چندا سنگھ کو علم نہ تھا کہ سردار سوہن سنگھ مضمون کی ایک کاپی مہاراجہ نابھہ کو بھی براہِ راست بھیج چکے ہیں۔

سردار سوہن سنگھ کا یہ مضمون "پنتھ سیوک" میں بطور لیڈر شائع ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایڈیٹر صاحب نے خود یہ مضمون لکھا۔ مضمون بہت اچھا تھا۔ مضمون کے شائع ہونے کے پانچ چھ روز بعد ماسٹر چندا سنگھ اس مضمون والے دو تین پرچے ساتھ لے کر نابھہ گئے تاکہ مہاراجہ سے کچھ روپیہ بطور امداد حاصل کریں۔ وہاں گیسٹ ہاؤس میں بطور سرکاری مہمان مقیم ہوئے اور مہاراجہ سے انٹرویو ہوا۔ تو باتیں کرتے ہوئے مہاراجہ نے کہا:۔

Marfat.com

"بھائی صاحب! وہ جو مضمون اس ہفتہ پنتھ سیوک میں بطور لیڈر شائع ہوا ہے بہت ہی زوردار اور اچھا ہے۔"

مہاراجہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا اور وہ اپنی بات ختم نہ کر سکے تھے کہ بات کاٹتے ہوئے ماسٹر چندا سنگھ نے کہا:۔

"سرکار کیا عرض کروں یہ مضمون ایک دن اور ایک رات میں لکھا گیا۔ کئی کتابوں کو دیکھنا پڑا۔ اس مضمون کے باعث میرے سر میں کئی گھنٹہ تک درد رہا، مجھے فخر ہے کہ مضمون ایسا اچھا لکھا گیا۔"

ماسٹر چندا سنگھ کا یہ جواب سن کر مہاراجہ کے دل میں ماسٹر صاحب کے لئے بے حد نفرت پیدا ہوئی۔ کیونکہ مہاراجہ کو یہ مضمون سردار سوہن سنگھ راہی ایک ہفتہ پہلے بھیج چکے تھے۔ اور ان کو علم تھا کہ مضمون کو لکھنے والے سردار سوہن سنگھ ہیں، نہ کہ ماسٹر چندا سنگھ۔ مگر مہاراجہ اخلاقاً بہت بلند تھے۔ انہوں نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان کے پاس مضمون کی کاپی مضمون کے چھپنے سے پہلے سردار سوہن سنگھ گوجرخان سے بھیج چکے تھے۔ ماسٹر چندا سنگھ کی یہ غلط بیانی اور کیریکٹر کی کمزوری مہاراجہ کے دل میں انتہائی نفرت پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ اور اس نفرت کا نتیجہ یہ تھا کہ مہاراجہ نے اس کے بعد اپنا دستِ امداد کھینچ لیا۔

"ریاست" کے جاری ہونے کے بعد آج تک اس میں درجنوں مترجم کام کرنے پر مقرر ہوئے جن کے ذمہ فرض صرف یہ تھا کہ وہ ایڈیٹوریل، رازِ درونِ پردہ، گلزار، کارٹون، اقتباسات اور مقالات (جن کو راقم الحروف لکھتا یا مرتب کرتا) کے علاوہ باقی کے مضامین انگریزی یا دوسری زبانوں کے رسائل سے ترجمہ کرتے۔ یا جب کبھی ایڈیٹر "ریاست" دہلی سے غیر حاضر ہوتا تو ایڈیٹوریل کے کالموں کی یا تو یہ لوگ خود خانہ پُری کر لیتے۔ یا کسی دوسرے مقامی روزانہ یا ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر سے لکھوا لیتے۔ مگر یہ واقعہ بے حد دلچسپ ہے کہ ان مترجموں میں سے نصف کے قریب ضرور ایسے تھے جنہوں نے ہمیشہ ہی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے دوسرے لوگوں کے پاس ڈینگیں ماریں اور "ریاست" کے ایڈیٹوریل نوٹوں کو اپنے ساتھ منسوب کیا۔ اور بلاوجہ داد حاصل کی۔ اور ان کی غلط بیانی سے متاثر ہو کر اگر کسی دوسرے اخبار نے ان کو اپنے ہاں بطور ایڈیٹر رکھ لیا تو یہ چند روز میں ہی بے نقاب ہو گئے۔ اور جو لوگ ان کی غلط بیانی کے باعث ان کے مداح تھے اُن لوگوں کے دلوں میں ہی اُن کے لئے نفرت و حقارت پیدا ہوئی۔

کئی برس کی بات ہے راقم الحروف نے ایک کتاب دیکھی جس پر مصنف کا نام "حسن عزیز جاوید ایڈیٹر ریاست" لکھا تھا۔ اس کتاب کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ یہ حضرت کئی برس پہلے صرف چند ہفتہ دفتر "ریاست" میں ترجمہ کا کام کرتے رہے۔ اور اپنے آپ کو ایڈیٹر "ریاست" لکھ رہے ہیں۔ میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا نوٹس نہیں لیا کرتا مگر مجھے اس شرمناک جسارت پر غصہ آیا۔ میں نے کتاب

Marfat.com

پر پتہ دیکھ کر ان کو نوٹس دیا۔ تو آپ نے اپنے کیریکٹر کی کمزوری کا اقرار کرتے ہوئے لجاجت کے ساتھ معافی طلب کی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ حضرت ایڈیٹر۔ سب ایڈیٹر اور مترجم میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ اور اگر کسی اخبار میں چند روز کام کریں، تو اس اخبار کا نام غلط طور پر استعمال کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اگر دوسرے کے لکھے ہوئے مضامین کو اپنے نام سے منسوب کرنا ذلّت و رسوائی کا باعث ہے تو اس غلط فہمی کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اگر عوام میں کسی لکھنے والے کے متعلق یہ افواہ پھیل جائے کہ یہ خود نہیں لکھتا بلکہ کسی دوسرے سے لکھواتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ایک واقعہ سنیئے۔ مسٹر ساغر نظامی کا ابتدائی دَور تھا اور یہ حضرت سیمابؔ کے شاگرد ہونے کے باعث دن رات سیمابؔ صاحب کے ساتھ رہتے۔ ساغر صاحب کا کلام بھی اخبارات میں شائع ہوتا۔ مگر لوگوں میں یہ افواہ تھی کہ ساغر صاحب ڈمی شاعر ہیں۔ یہ خود شعر نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ سیماب صاحب اور ساغر صاحب دہلی تشریف لائے۔ اور خواجہ حسن نظامی سے ملنے کے لئے بھیّا احسان الحق صاحب کے مکان گلی دالاں (اردو بازار) میں گئے تو وہاں باتوں باتوں میں بھیّا احسان الحق نے صاف کہہ دیا کہ ساغر ڈمی شاعر ہیں۔ اور ان کی نظمیں سیمابؔ صاحب لکھتے ہیں۔ بھیا احسان کے اس الزام کی سیمابؔ صاحب نے تردید کی۔ مگر بھیّا نہ مانے۔ آخر ساغر صاحب کو مصرع طرح دیا گیا کہ وہ اس پر اشعار لکھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساغر صاحب نے چند منٹ میں نظم کہہ دی اور تمام حاضرین کو ساغرؔ صاحب کی قابلیت کا اقرار کرنا پڑا اور ساغر صاحب کے متعلق اس غلط افواہ کی بنیادیں تو اسی وقت بالکل ہی اُکھڑ گئیں جب سیماب صاحب کی زندگی میں سیماب صاحب اور ساغر صاحب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور کشیدہ تعلقات کے زمانہ میں بھی ساغرؔ صاحب اخبارات میں نظمیں لکھتے رہے۔

دوسروں سے نظمیں، غزلیں اور مضامین لکھوا کر اپنے نام سے اخبارات یا رسائل میں شائع کرانا یا ان کو مشاعروں اور ادبی مجلسوں میں پڑھنا انتہائی ذلّت کا باعث ہے۔ کیونکہ مٹی کا سونا یا سونے کا مٹی ہونا ممکن نہیں۔ شہرت کی خواہش رکھنے والوں کے لئے بہتر ہے کہ وہ خود اشعار کہنے اور مضامین لکھنے کی کوشش کریں۔ تاکہ وہ فی الحقیقت بطور شاعر یا مضمون نویس درست و صحیح عزت حاصل کر سکیں۔

سوامی شردھانند اور خواجہ حسن نظامی

میں میٹرک پریڈ والے دفتر "ریاست" میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ سوامی راما نند جو سوامی

Marfat.com

شردھانند کی شدھی کی تحریکوں کے انچارج تھے) کا ٹیلی فون آیا کہ سوامی شردھانند کو ابھی ایک مسلمان نے قتل کر دیا ہے۔ سوامی شردھانند بہت ہی بلند انسان تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" پر بہت مہربانی فرمایا کرتے تھے۔ یہ اطلاع ایڈیٹر "ریاست" کے لئے خلافِ توقع اور بے حد افسوس کا باعث تھی۔ میں فوراً سوامی جی کے نیا بازار والے مکان پر پہنچا۔ اس وقت واقعہ کو ہوئے ایک گھنٹہ سے کم عرصہ ہوا تھا۔ سوامی جی مقتول حالت میں خون سے لت پت لکڑی کے تخت پوش پر پڑے تھے۔ قاتل عبدالرشید حراست میں تھا۔ ہزارہا لوگ جمع تھے اور شیخ نذیرالحق انسپکٹر پولیس ابتدائی تحقیقات میں مصروف تھے۔ میں نے جب عبدالرشید کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا۔ کیونکہ ایک یا دو سال پہلے یہ دفتر "ریاست" میں کتابت کا کام کر چکا تھا۔ عبدالرشید نے جب مجھے دیکھا تو اس نے سلام کیا۔ یہ ہجوم کے باعث بہت ہی پریشان تھا۔ اور اس کا رنگ زرد تھا۔ میں نے حالات کو دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ قتل عبدالرشید کی مذہبی دیوانگی کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کی دیوانگی کی علامات ایک عرصہ پہلے ذیل کی صورت میں دفتر "ریاست" میں ظاہر ہو چکی تھیں اور وہ واقعات یہ تھے:۔

افغانستان میں کنگ امان اللہ کے حکم سے چند احمدی سنگسار کر دیئے گئے جو وہاں اپنے احمدی خیالات کی تبلیغ کرتے تھے۔ سنگساری کے ان واقعات کو سن کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں حیران تھا کہ کیا موجودہ زمانہ میں بھی انسان انسانوں کو مذہب کے نام پر پتھر مار مار کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے افغان گورنمنٹ کے خلاف ایک سخت ایڈیٹوریل نوٹ لکھا اور یہ نوٹ اس کاتب عبدالرشید (سوامی شردھانند کے قاتل) کو کتابت کے لئے دیا۔ عبدالرشید نے ابھی چند سطروں کی کتابت کی تھی کہ وہ میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرہ پر غصہ کے جذبات تھے اور اس نے کہا: "آپ کو شرعی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق حاصل ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق سنگساری جائز ہے اور احمدیوں کو ضرور سنگسار کیا جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ اپنے مرزا قادیان کے نبی ہونے کے دعوے دار ہیں۔ میں یہ کافرانہ نوٹ نہیں لکھ سکتا۔" میں نے جب اس کو انتہائی غصہ کی حالت میں دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا دماغی توازن قائم نہیں۔ میں نے اس سے نوٹ واپس لے کر دوسرے کاتب کو دے دیا اور اس کا حساب کر کے اس کو اپنے دفتر سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد عبدالرشید کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ ہجرت کی تحریک میں یہ افغانستان چلا گیا تھا اور وہاں سے جب مہاجر واپس ہندوستان آئے تو یہ بھی واپس آ گیا اور آتے ہوئے وہاں سے پوشیدہ طور پر ایک ریوالور اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس ریوالور سے ہی اس نے سوامی شردھانند کو قتل کیا۔

سوامی شردھانند جی کے مکان پر جب عبدالرشید حراست میں تھا تو مجمع میں لوگ اس قتل کی ذمہ داری خواجہ حسن نظامی پر ڈال رہے تھے اور کہا جا رہا تھا کہ قاتل خواجہ حسن نظامی کا ایجنٹ اور بھیجا ہوا ہے۔ چونکہ میں عبدالرشید کے حالات سے واقف تھا۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ آیا اور

Marfat.com

میں برداشت نہ کرسکا اور میں نے جرأت کے ساتھ کہا کہ "جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ" میں قاتل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ شخص مذہبی پاگل پن میں مبتلا ہے۔ اور یہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی قتل میں حصہ لے سکیں۔" جس صورت میں کہ لوگ علانیہ طور پر خواجہ حسن نظامی پر قتل کا الزام لگا رہے تھے۔ میرے یہ الفاظ ان کے لئے خلافِ توقع اور انتہائی ناخوشگوار تھے مگر سوامی راما نند اور شیخ نذیر الحق انسپکٹر پولیس کی موجودگی اور میرے سکھ یا غیر مسلم ہونے کے باعث یہ کچھ کہہ نہ سکے اور خاموش ہو گئے۔ چنانچہ چند روز کے بعد شیخ نذیر الحق نے میری گفتگو کا ذکر میری عدم موجودگی میں خواجہ حسن نظامی سے کیا۔ تو اُن کے اور اُن کے دوستوں کے دل پر میری حق وصداقت کی آواز اور جرأت کا بہت اثر ہوا۔ اور شیخ نذیر الحق بعد میں جب کبھی ملتے وہ اُس واقعہ کا ذکر کیا کرتے حالانکہ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے اس وقت جو کچھ کہا وہ کسی شخص کو خوش یا ناراض کرنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ خواجہ حسن نظامی پر غلط اتہام لگایا جا رہا ہے اور قتل کی ذمہ داری صرف عبدالرشید کی گردن پر ہے۔ جسے میں مذہبی دیوانگی میں مبتلا دیکھ چکا تھا۔

میں اس کے بعد واپس اپنے مکان پر آگیا۔ اور اگلے روز سوامی جی کا جنازہ اُٹھا جس میں لاکھوں ہندو شامل ہوئے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد خواجہ حسن نظامی پر کسی نے گولی چلائی اور گولی خواجہ صاحب کو تو نہ لگی۔ اس گولی سے اُن کے خسر خواجہ محمد صادق ہلاک ہو گئے جو خواجہ صاحب کے انتظار میں اُن کے موٹر گیرج کے پاس کھڑے تھے۔ چونکہ رات کا وقت تھا اور رات بہت تاریک تھی۔ خواجہ صاحب یا ان کا کوئی ہمراہی قاتل کو نہ پہچان سکا۔ کیونکہ گولی کچھ فاصلہ سے آئی تھی۔ اور گولی چلانے کے بعد قاتل مرزا غالب کے مقبرہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد مجھے بذریعہ ٹیلی فون اطلاع ملی۔ میں نظام الدین گیا، میرے جانے سے پہلے بھیّا احسان الحق اور واحدی صاحب وغیرہ دوست پہنچ چکے تھے۔ اور اگلی صبح کو "الامان" کے مولوی مظہر الدین وغیرہ مسلم لیگی بھی پہنچ گئے جنہوں نے خواجہ حسن نظامی کو یہ پٹی پڑھانی شروع کی۔ کہ آپ پولیس کو ایسا بیان دیں جس سے یہ ثابت ہو کہ قاتل کوئی ہندو تھا۔ میں یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اور جب یہ ہیرا پھیری جاری تھی تو میں رہ نہ سکا۔ میں خواجہ صاحب کو الگ لے گیا اور کہا کہ خواجہ صاحب انسان کے لئے امتحان کا وقت روز روز نہیں آیا کرتا۔ اور صرف بڑے لوگ ہی امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ پر یہ امتحان کا وقت ہے۔ مناسب ہے کہ آپ جھوٹ نہ بولئے۔ اگر آپ ایمانداری کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ قاتل کوئی ہندو تھا تو آپ ضرور ہندو کا نام لیجئے۔ اور اگر آپ کو قاتل کے ہندو ہونے کا یقین نہیں تو اس مجروا از مولانا مظہر الدین ایڈیٹر "الامان" کو تمام لوگ ان کے اعمالنامہ کے باعث مجروا کہا کرتے تھے کے کہنے پر عمل نہ کیجئے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جھوٹ نہ بولیں گے۔ اور یہ

Marfat.com

واقعہ ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ پر قائم رہے۔ قتل کے جرم میں ان کے ایک رشتہ دار کا عدالت میں چالان ہوا۔ جو ان کا خاندانی دشمن تھا۔ مگر ثبوت نہ ہونے کے باعث یہ ملزم سیشن کورٹ سے بری ہو گیا۔

سوامی شردھانند اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان سخت عداوت تھی۔ مگر میرے دونوں کے ساتھ تعلقات مخلصانہ تھے۔ کیونکہ یہ تعلقات کسی غرض کی بنیادوں پر نہ تھے، اور دونوں کے دلوں میں میرے لئے عزت و محبت کے جذبات تھے۔ مگر میں نے سوامی شردھانند جی کے انتقال یا خواجہ حسن نظامی کے خسر کے قتل کے موقع پر اگر آواز پیدا کی تو دوستانہ تعلقات سے قطعی لا پرواہ ہو کر صرف حق و صداقت کے خیال سے، اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے میری رائے کی قدر کی۔ چنانچہ میرا یقین ہے کہ اگر انسان تعلقات کی پروا نہ کرتے ہوئے حق و صداقت کی آواز پیدا کرے تو اس کو مخالفین بھی برا محسوس نہیں کرتے۔

پُراسرار مسٹر سوامی

بہت برس ہوئے کرزن روڈ نئی دہلی پر ایک صاحب مسٹر سوامی رہا کرتے تھے جن کے پاس کئی کوٹھیاں تھیں اور یہ بزرگ والیانِ ریاست کو اپنے ہاں مہمان رکھنے کے بہت خواہشمند تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کئی والیان ریاست اُن کے مہمان رہا کرتے۔

ان مسٹر سوامی نے مرحوم خان بہادر قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر اعظم ریاست دتیا سے کئی بار درخواست کی کہ آپ اور مہاراجہ دتیا اُن کے ہاں بطور مہمان رہیں۔ قاضی صاحب بہت محتاط تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مہاراجہ دتیا مسٹر سوامی کی کوٹھی پر مہمان رہیں تو کیا اس میں کوئی حرج تو نہیں۔ اور یہ مسٹر سوامی کیسے آدمی ہیں! میں مسٹر سوامی سے قطعی ناواقف تھا۔ صرف اتنا سنا تھا کہ یہ لاکھوں یا کروڑوں روپیہ نقد اور کئی کوٹھیوں کے مالک ہیں۔ بڑے سے بڑے لوگوں کو بطور ایڈوائزر ملازم رکھتے ہیں اور یہ ایک راز ہے کہ ان کے پاس یہ لاکھوں یا کروڑوں روپیہ کہاں سے آیا۔

میں نے جب قاضی صاحب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے دہلی کے چیف کمشنر سر جان تھامپسن کو یہی کچھ لکھا کہ مسٹر سوامی کون ہیں اور اگر مہاراجہ دتیا ان کے ہاں مہمان رہیں تو کیا گورنمنٹ کو اعتراض تو نہیں۔ سر جان تھامپسن نے یہی خط مقامی سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ کو تحقیقات کے لئے بھیجا۔ ایک ہفتہ کے بعد قاضی صاحب کو سر جان کا خط ملا جس میں آپ نے لکھا "مسٹر سوامی کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے۔ تحقیقات میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکی جس کا خیال کرتے ہوئے ان کے ہاں مہاراجہ دتیا کے قیام کو قابلِ اعتراض کہا جا سکے"۔ اس جواب کے بعد قاضی صاحب نے مسٹر سوامی کی دعوت کو قبول

Marfat.com

کر لیا اور چند روز کے بعد چیمبر آف پرنسس کے موقع پر مہاراجہ دتیا مسٹر سوامی کے ہاں بطور مہمان مقیم ہوئے۔

قاضی سر عزیز الدین بہت ہی بلند اور وضع داری کے پابند انسان تھے۔ جب کبھی دہلی تشریف لاتے تو ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لئے دفتر "ریاست" میں ضرور آیا کرتے۔ اور میں قریب قریب ہر روز اُن سے ملنے اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے متعلق حالات معلوم کرنے علی الصبح پانچ بجے (کیونکہ یہی وقت ان کی تنہائی کا ہوا کرتا تھا ورنہ دن بھر اُن کے پاس آنے والوں کا جمگھٹا رہتا) سیسل ہوٹل جہاں کہ وہ قیام فرماتے جایا کرتا اور شام کو کبھی کبھی ان کو اپنی کار میں سیر کے لئے لے جاتا۔ صبح کو قاضی صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو قاضی صاحب نے مسٹر سوامی کے تمام حالات بتائے۔ اور فرمایا کہ مہاراجہ دتیا ان کی کوٹھی پر قیام فرما ہیں۔ چنانچہ شام کو میں قاضی صاحب سے پھر ملنے کے لئے گیا تو آپ مجھے بھی مسٹر سوامی کی کوٹھی لے گئے۔ میں جب ان کی کوٹھی پر گیا تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ دتیا کے علاوہ مہاراجہ پنا وغیرہ اور متعدد والیانِ ریاست بھی بطور مہمان وہاں قیام پذیر ہیں۔ درجنوں موٹریں کھڑی ہیں، ریاستوں کے وزراء سیکرٹری آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ بے حد دلچسپ ہے کہ ان مسٹر سوامی نے اس زمانہ میں پانچ پانچ چھ چھ ہزار روپیہ ماہوار پر ریٹائرڈ انگریز کرنل، جرنل اور انڈین سول سروس کے ممبر بطور ایڈوائزر رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان اصحاب میں وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ریٹائرڈ ممبر سر سی۔ پی راما سوامی آئیر بھی تھے۔ چنانچہ پنجاب کی ریاستوں کے ایجنٹ گورنر جنرل سر جیمس فٹز پیٹرک نے بھی ایڈیٹر "ریاست" کو بتایا تھا کہ جب وہ ریٹائر ہونے والے تھے تو مسٹر سوامی نے ان کو پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھنا چاہا مگر سر جیمس نے انکار کر دیا تھا۔

مسٹر سوامی سے اس زمانہ میں کبھی کبھی ملنے کا اتفاق ہوا کرتا مگر معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے پاس یہ لاکھوں یا کروڑوں روپیہ کہاں سے آیا اور ان کے بڑے بڑے ریٹائرڈ افسروں اور لیڈروں کو ملازم رکھنے میں راز کیا ہے۔

یہ عقدہ نہ صرف ایڈیٹر "ریاست" سے حل نہ سکا بلکہ کرزن روڈ (جہاں کہ مسٹر سوامی رہا کرتے تھے) کے رہنے والے دوسرے اصحاب بھی اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ یہ لطیفہ بہت دلچسپ ہے کہ مئی یا جون ۱۹۵۳ء کے مہینہ میں ایک روز شام کو مسٹر سوامی کا ٹیلیفون آیا کہ آپ ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جب چاہیئے تشریف لایئے۔ آپ ایک گھنٹہ بعد تشریف لے آئے۔ اس وقت ایڈیٹر "ریاست" کے پاس چند دوست بیٹھے تھے۔ آپ نے تنہائی میں تھوڑی دیر باتیں کیں اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ اس وقت دوسرے لوگ بیٹھے ہیں آپ اگلے روز دوپہر کو آئیں گے۔ اگلے روز آپ اور آپ کے صاحبزادہ تشریف لائے۔ تین چار گھنٹہ باتیں ہوئیں۔ آپ نے فرمایا کہ آپ چاہتے ہیں کہ چند روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات جاری کئے جائیں اور آپ اس مقصد کے لئے دس پندرہ یا

Marfat.com

بیس لاکھ روپیہ صَرف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اخبارات جاری کرنے کی غرض صرف پبلک خدمت ہے تین چار گھنٹے باتیں کرنے اور رائے لینے کے بعد آپ چلے گئے۔ مگر اس کے بعد معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کہاں ہیں اور آپ کی اس پندرہ بیس لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے روزنانہ اخبارات جاری کرنے کی سکیم کا کیا ہوا۔

ذہن میں انقلاب

میں جن دنوں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا تو بنوڑ (ریاست پٹیالہ) کے قریب موضع جنگ پورہ میں ایک دوست کی دعوت پر آنکھوں کے اپریشن کرنے کے لئے وہاں گیا اور چند روز مقیم رہا۔ اس مقام پر ایک دوست پرائمری سکول کے ماسٹر ناہر سنگھ رہا کرتے تھے۔ یہ ماسٹر ناہر سنگھ بہت مضبوط، بہادر، مستعد اور وضعدار طبیعت کی شخصیت تھے۔ اور دوسروں کے لئے خود تکلیف اٹھانا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ میرے جنگ پورہ سے چلے آنے کے بعد بھی ماسٹر ناہر سنگھ سال میں ایک آدھ مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے ہمیشہ آتے رہے اور ان کی یہ وضعداری اب بھی قائم ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب فسادات شروع ہوئے تو اتفاق سے یہ دہلی میں موجود تھے اور جب چند روز یہاں مقیم رہے تو ایک دن انہوں نے کہا کہ یہ اپنے گاؤں ضلع انبالہ میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ فسادات ہو رہے ہیں دہلی میں ہی رہو۔ جب فسادات ختم ہو جائیں گے تو چلے جانا۔ مگر ماسٹر جی نے جواب دیا کہ نہیں جانا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کے علاقہ کے اکالیوں کا ان کے پاس پیغام پہنچا ہے وہ وہاں کے مسلمانوں کو ختم کر رہے ہیں اور ان کو بھی وہاں طلب کیا ہے تاکہ یہ بھی مسلمانوں کو قتل کرنے میں حصہ لیں۔ میں نے جب یہ سُنا تو میں کانپ اُٹھا اور ماسٹر جی سے بہت کہا کہ وہ قتل کی اس وبا میں حصہ نہ لیں۔ یہ سکھ ازم اور انسانیت کے خلاف ہے مگر ماسٹر جی نہ مانے اور دہلی سے اپنے گاؤں چلے گئے۔

ماسٹر ناہر سنگھ جب اپنے گاؤں پہنچے تو وہاں کے علاقہ میں مسلمانوں کا قتل عام جاری تھا۔ اکالیوں کی تلواروں کو خون لگا ہوا تھا، اور جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آتا اس کو ختم کر دیا جاتا۔ ماسٹر ناہر سنگھ اپنے گاؤں پہنچنے کے بعد اگلے روز صبح ضروری حاجات سے فارغ ہونے کے لئے گاؤں سے باہر (جیسا کہ دیہات میں دستور ہے) کھیتوں میں گئے تو وہاں پانی کی چھوٹی سی نہر (جو اس گاؤں کے قریب تھی اور جس میں تین چار فٹ کے قریب پانی بہہ رہا تھا) میں ایک سَر نظر آیا۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا ماسٹر جی حیران کہ اس وقت اس نہر میں کون شخص گردن نکالے کھڑا ہے۔ ماسٹر جی نے کنارہ پر کھڑے ہو کر اس شخص کو پوچھا کہ کون ہے۔ ماسٹر جی کے اس سوال پر جواب ملا کہ "ماسٹر جی

Marfat.com

ہیں ہوں" یہ آواز ماسٹر جی کے ایک مسلمان شاگرد لڑکے کی تھی جسے ماسٹر جی کچھ عرصہ پہلے سکول میں پڑھایا کرتے تھے۔ ماسٹر جی نے اس لڑکے کو نہر سے باہر آنے کے لئے کہا۔ لڑکا نہر سے باہر آگیا تو یہ کانپ رہا تھا اور اس نے بتایا کہ چونکہ مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ نہر میں چھپا کھڑا تھا۔ اور اس نے اپنا سر پانی سے اوپر سانس لینے کے لئے نکالا ہوا تھا اور التجا کی کہ اس کو ہلاک نہ کیا جائے۔ یہ کیفیت دیکھ کر ماسٹر ناہر سنگھ کے ذہن میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ بچہ کو یہ اپنے گھر لے آئے اور کپڑے پہنائے۔ گاؤں کے لوگوں میں اس واقعہ سے ماسٹر ناہر سنگھ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پیدا ہو گئے کہ انہوں نے ایک مسلمان لڑکے کو پناہ دی ہے۔ ماسٹر ناہر سنگھ بہت بہادر اور شجاع ہیں۔ آپ کئی بار ڈاکوؤں کا مقابلہ کر چکے تھے اور خود بھی ڈاکہ کے الزام میں گرفتار ہو کر پٹیالہ جیل میں رہ چکے تھے آپ نے اپنی کرپان (تلوار) کو میان سے نکال لیا، اور گاؤں کے لوگوں کو للکار کر کہا کہ جو شخص اس بچہ پر ہاتھ اٹھائے گا اس "تلوار سے اس کو ختم کر دیا جائے گا۔ اور اگر یہ بچہ قتل ہوا تو گاؤں کا ایک شخص بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ ماسٹر ناہر سنگھ کا یہ چیلنج سن کر تمام لوگ خاموش ہو گئے ماسٹر جی نے اس بچہ کو اپنے ساتھ لیا اور وہ اس کو اپنے ساتھ گاؤں سے کافی فاصلہ پر اس کیمپ میں لے گئے جہاں کہ مسلمانوں کو حفاظت کے لئے رکھا جا رہا تھا۔

ماسٹر ناہر سنگھ جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچے تو وہاں آپ نے دیکھا کہ مسلمان بہت مغموم ہیں، ان کے عزیز و اقارب قتل کر دیئے گئے ان کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ کوئی سامان اور عورتیں اور بچے ایک قیامت میں مبتلا ہیں۔ اور اس منظر کو دیکھ کر ماسٹر ناہر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو آپ دیہات سے مسلمانوں کو نکال کر ان کو بچائیں گے چاہے ان کو اس راہ میں خود بھی ہلاک ہونا پڑے۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت سے ہی دیہات کا شروع کیا اور جو بھی مسلمان ملتا اس کو نکال کر کیمپ میں پہنچا آتے۔ آپ نے اس طرح دو ہزار کے قریب مسلمانوں کو اکالیوں کے ہاتھوں سے بچا کر کیمپوں میں پہنچایا۔ ماسٹر ناہر سنگھ کا بیان ہے کہ کیمپوں کے یہ مسلمان جب پاکستان کو روانہ ہوتے تو ماسٹر ناہر سنگھ سے گلے مل کر اظہار شکر گزاری کرتے ہوئے زار زار روتے اور ایک ضعیف اور بوڑھی مسلمان عورت کے آنسو نہ تھمے۔ جب اس نے جدا ہوتے وقت ماسٹر جی کی پیشانی کو چوم لیا اور کہا "بیٹا تم اگر نہ ہوتے تو آج ہم اس دنیا میں زندہ نہ بچ سکتے"۔ اس ضعیف خاتون کو کیا معلوم کہ پاکستان کیا ہے اور کہاں ہے۔ اس نے ماسٹر جی سے بہت کہا کہ یہ بھی اس قافلہ کے ساتھ چلیں اور یہ خاتون ان کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھے گی۔ مگر نہ تو ماسٹر ناہر سنگھ پاکستان جا سکتے تھے اور نہ یہ خاتون ہندوستان میں رہ سکتی تھیں۔ یہ خاتون اور ماسٹر صاحب دونوں ہی آنسو بہاتے ہوئے علیحدہ ہوئے۔

ماسٹر ناہر سنگھ آجکل راجپورہ (ریاست پٹیالہ) میں رہتے ہیں اور اپنی وضعداری کو نبھانے کے لئے کبھی کبھی دہلی آیا کرتے ہیں۔ جب بھی آتے ہیں تو میں ان کی زبان سے ان حالات کو پھر سن لیا کرتا ہوں

Marfat.com

کیونکہ آپ کا مسلمانوں کو قتل کرنے کے ارادہ سے اپنے گاؤں جانا اور شاگرد کو قابل رحم حالت میں دیکھ کر ان کے ذہن میں انقلاب پیدا ہونا ایسا واقعہ ہے جس کو بار بار سننے اور اس پر بار بار غور کرنے کو جی چاہتا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را　　　تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مسٹر باسورتھ سمتھ آف مارشل لائ کا وحشیانہ پن

بہت برس ہوئے ہیں جب موگا (ضلع فیروز پور) کے ہسپتال میں کام کرتا تھا تو فیروز پور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر باسورتھ سمتھ تھے۔ ان مسٹر باسورتھ سمتھ کا والد لندن کی ایک کی ایک بہت نامور یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور ان پروفیسر صاحب کی کوشش سے ہی یہ مسٹر باسورتھ سمتھ انڈین سول سروس میں داخل کرائے گئے ورنہ ذہنی لحاظ سے یہ انتہائی بیوقوف، اُجڈ، ظالم اور نیم پاگل شخص تھے۔

ایک سکھ انجنیئر سردار ہیرا سنگھ بہت کٹر قسم کے سکھ تھے اور مسٹر باسورتھ سمتھ ان پر بہت مہربان تھے۔ فیروز پور آنے سے پہلے مسٹر باسورتھ سمتھ جہاں بھی ڈپٹی کمشنر رہے انہوں نے سردار ہیرا سنگھ کو اپنے ساتھ رکھا۔ اور یہ جب فیروز پور آئے تو انہوں نے ان کو بھی ڈسٹرکٹ بورڈ فیروز پور کا انجنیئر مقرر کر دیا۔ مسٹر باسورتھ سمتھ گو فیروز پور کے ڈپٹی کمشنر تھے مگر دراصل عملی طور پر فیروز پور کی حکومت سردار ہیرا سنگھ کے ہاتھوں میں تھی۔ کیونکہ مسٹر باسورتھ سمتھ ہر معاملہ میں سردار ہیرا سنگھ کی رائے لیتے اور کوئی کام ان کے مشورہ کے بغیر نہ کرتے۔ سردار ہیرا سنگھ کٹر قسم کے سکھ تھے اور چیف خالصہ دیوان کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکھوں کو فائدہ پہنچے۔ چنانچہ آپ نے مسٹر باسورتھ سمتھ کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ سکھ بطور ایک قوم کے بہت ہی نیک، بہادر اور برطانیہ کے وفاشعار ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ بُرے سے بُرے سکھ کو بھی نیک اور اچھا سمجھتے۔ اور آپ نے سردار ہیرا سنگھ کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے ضلع فیروز پور کے دیہات میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے روپیہ سے سکھوں کے سینکڑوں پرائمری سکول جاری کرا دیئے تھے اور آپ کی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ سکھوں کو فائدہ پہنچے۔

مسٹر باسورتھ سمتھ کو جب سردار ہیرا سنگھ نے بار بار یہ یقین دلایا کہ سکھ مجموعی طور پر بہت نیک اور برطانیہ کے وفاشعار ہیں تو ایک روز مسٹر باسورتھ سمتھ نے سردار ہیرا سنگھ سے پوچھا کہ تمام کی تمام قوم یا تمام کا تمام ملک تو نیک نہیں ہو سکتا۔ کیا کوئی ایک سکھ بھی بدمعاش نہیں۔ سردار ہیرا سنگھ بہت ہوشیار آدمی تھے۔ آپ نے جواب دیا کہ ہاں سکھوں میں بھی کوئی کوئی بدمعاش ہے۔ اس جواب پر مسٹر باسورتھ سمتھ نے پوچھا کہ جو سکھ بدمعاش ہو اس کی پہچان کیا ہے۔ تو ہیرا سنگھ نے بتایا کہ بدمعاش

Marfat.com

سکھ کی پہچان یہ ہے کہ اس کی داڑھی کچھ کٹی ہوتی ہے یعنی وہ اپنی داڑھی کے بال ترشواتا ہے (چونکہ سکھوں میں مذہبًا بالوں کے کٹوانے کی سخت ممانعت ہے۔ سردار ہیرا سنگھ نے مذہب کی پابندیوں سے آزاد سکھوں کو بدمعاش کہا تاکہ اگر مسٹر باسورتھ سمتھ کا قہر نازل ہو تو صرف ان سکھوں پر جو پکے سکھ نہیں اور سکھ ازم کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتے) مسٹر باسورتھ سمتھ کے ذہن میں یہ بات نقش ہو گئی کہ سکھوں میں صرف وہ شخص بدمعاش ہوتا ہے جس نے داڑھی ترشوا دی ہو۔ چنانچہ آپ جب دیہات میں جاتے اور نمبردار وغیرہ اور دوسرے لوگ صاحب بہادر کی پیشوائی کے لئے پہنچتے تو جس شخص نے داڑھی ترشوائی ہوتی مسٹر باسورتھ سمتھ اس کو بدمعاش سمجھ کر دوسرے لوگوں سے الگ کر لیتے اور کہتے کہ چونکہ وہ بدمعاش ہے اس کی نمبرداری یا ذیلداری ضبط کر لی جائے گی۔ مسٹر باسورتھ سمتھ کئی برس تک فیروز پور میں رہے اور "بدمعاشوں" کی گرفت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ دیہات کے لوگوں نے ذلت کے خوف سے داڑھیاں ترشوانا چھوڑ دیا، اور جو لوگ داڑھیاں ترشواتے وہ ڈپٹی کمشنر کے سامنے آنے کی جرأت نہ کرتے۔

یہ مسٹر باسورتھ سمتھ مارشل لا کے زمانہ میں شیخوپورہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہاں انہوں نے لوگوں پر بہت ظلم کئے اور جب مارشل لا کے متعلق کمیشن مقرر ہوا تو شہادتیں اس قسم کی دی گئیں جن سے مسٹر باسورتھ سمتھ کا وحشیانہ پن ثابت ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ انڈین سول سروس کی ملازمت سے موقوف کر دیئے گئے۔

مسٹر باسورتھ سمتھ جب فیروز پور میں تھے تو آپ نے اپنے وحشیانہ پن سے مجبور ہو کر ایک جلسہ میں وہاں کے ایک فاضل اور نابینا وکیل سردار چندا سنگھ کی بے عزتی کی جس کے باعث دونوں کے درمیان سخت عداوت ہو گئی۔ دونوں نے لفٹیننٹ گورنر اور ہائیکورٹ کے پاس شکایتیں کیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار چندا سنگھ کا وکالت کا لائسنس ضبط کر لیا گیا۔ لائسنس کی اس ضبطی کے چند سال بعد جب مسٹر باسورتھ سمتھ بھی انڈین سول سروس کی ملازمت سے موقوف ہوئے تو آپ نے ایک خط مسٹر باسورتھ سمتھ کو دہلی سسل ہوٹل کے پتہ پر (جہاں کہ آپ موقوفی کے بعد مقیم تھے) لکھا جس میں اوپر خطاب کرتے ہوئے "بخدمت مسٹر باسورتھ سمتھ ڈسمسڈ ڈپٹی کمشنر پنجاب" اور نیچے بھیجنے والے کی جگہ لکھا "آپ کا صادق چندا سنگھ ڈسمسڈ وکیل" چنانچہ یہ خط کافی عرصہ تک فیروز پور اور دوسرے مقامات کے واقفکار حلقوں میں دلچسپی کا باعث رہا۔

مسٹر باسورتھ سمتھ ایک زمانہ میں میانوالی میں ڈپٹی کمشنر تھے اور کالا باغ دورہ پر گئے تو وہاں آپ نے وہاں کے ایک بڑے جاگیردار کو سؤر کہہ دیا۔ یہ جاگیردار اس گالی کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنے کاشتکاروں کو حکم دیا کہ صاحب بہادر کی مرمت کی جائے۔ چنانچہ کاشتکاروں نے مسٹر باسورتھ سمتھ کو بہت مارا مگر آپ نے بدنامی کے خوف سے اس واقعہ کو ہمیشہ چھپائے رکھا اور پھر کالا باغ جانے کی کبھی جرأت نہ کی۔

Marfat.com

مسٹر باسورتھ سمتھ کے ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی سفارش کے ذریعہ بعض ہونق اور ظالم لوگ کیونکر انڈین سول سروس میں بھرتی کر لئے جاتے تھے اور انہوں نے کیونکہ ہندوستانیوں کو انسان نہ سمجھا۔

پولیس کے نہلے پر ایڈیٹر "ریاست" کا دہلا

اگست ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے فوراً بعد جب تمام ملک میں سرکاری عمارتوں اور سامان کو نقصان پہنچانے کی تحریک شروع ہوئی اور ہر صوبہ میں ہزارہا کانگرسی گرفتار ہوئے تو ایک روز صبح پانچ بجے کے قریب چوہدری بھیم سنگھ انسپکٹر پولیس سی۔ آئی۔ ڈی (جو بعد میں غالباً امرتسر میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) ایڈیٹر "ریاست" کے مکان قرول باغ میں تشریف لائے۔ ایڈیٹر "ریاست" صبح چار بجے سے کام شروع کرنے کا عادی ہے۔ اس وقت یہ ایڈیٹوریل لکھ رہا تھا۔ چوہدری صاحب نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور دروازہ کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ مع کنسٹیبلوں کے کھڑے ہیں۔ آپ اندر تشریف لائے اور ان سے صبح ہی صبح آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے بتایا کہ میری گرفتاری کے وارنٹ ہیں اور میں سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کیا جا رہا ہوں۔ میں چودھری صاحب سے پہلے واقف نہ تھا۔ ان کے رویّہ سے معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی شریف اور ہمدرد فطرت انسان ہیں۔ آپ نے کہا کوئی جلدی نہیں۔ میں چائے وغیرہ پی لوں اور پھر ان کے ساتھ کوتوالی چلوں۔ چائے پینے کے بعد میں نے اپنے کاغذات کو درست کیا اور اپنے ملازم کو یہ ہدایت دے کر کہ میرا بسترہ اور پہننے کے کپڑے کوتوالی بھیج دیئے جائیں۔ میں ان کے ساتھ موٹر میں کوتوالی روانہ ہوا۔ کوتوالی پہنچنے کے بعد مجھے حوالات کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مجھے وہاں پہنچے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس کمرہ میں لالہ ہنونت سہائے (جن پر لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کی سازش میں مقدمہ چلا تھا اور جو دہلی میں بہت نیک دل، محب الوطن اور قابلِ احترام شخصیت تسلیم کئے جاتے ہیں) بھی تشریف لے آئے اور کنسٹیبل نے ان کو بھی حوالات کے اندر داخل کر کے حسبِ دستور باہر سے تالا لگا دیا۔ لالہ ہنونت سہائے بہت ہی قابلِ محبت بزرگ ہیں۔ ان سے باتیں شروع ہوئیں تو اتنے میں دس بارہ اور کانگرسی لیڈر اور ورکر بھی حوالات کے اندر داخل کر دیئے گئے۔ میں نے لالہ ہنونت سہائے کو ایک لطیفہ سنایا کہ ایک مولوی صاحب کا انتقال ہوا۔ مولوی صاحب کی بیوی رو پیٹ رہی تھی اور لوگوں نے صبر کی تلقین کی تو بیوی نے کہا کہ شوہر کا مرنا بہت ہی صدمہ کا باعث ہے۔ مگر اس محلہ میں ایک دوسرے شخص کا بھی آج ہی انتقال ہوا ہے۔ اس لئے خدا کا شکر ہے کہ شوہر اس دنیا سے اکیلے نہیں گئے۔ ایک ساتھی بھی اُن کے ہمراہ گیا ہے۔ مولوی صاحب کا راستہ میں دل لگا رہے گا۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ

Marfat.com

ایڈیٹر "ریاست" اکیلا جیل نہیں جا رہا لالہ ہنونت سہائے بھی اس کے ساتھ ہیں، دل لگا رہے گا۔ اس لطیفہ پر تمام دوست ہنس پڑے۔ دو گھنٹہ تک حوالات میں رکھنے کے بعد ہمیں دہلی کے ڈسٹرکٹ جیل لے جایا گیا وہاں کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ تھی اور اخبارات پڑھنے کے لیے مل جاتے تھے چند روز دہلی جیل میں رکھنے کے بعد ہم لوگ جو تعداد میں سات کے قریب تھے ملتان سنٹرل جیل میں لے جائے گئے جہاں کہ پنجاب کے کئی سو لیڈر اور قومی کارکن پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

سنٹرل جیل ملتان میں کھانے پینے کی تو کوئی تکلیف نہ تھی۔ سب سے زیادہ ذہنی کوفت تو یہ تھی کہ وہاں پنجاب گورنمنٹ کے حکم سے کوئی اخبار جیل کے اندر داخل نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہم میں سے کوئی شخص کسی سے خط و کتابت کر سکتا تھا تاکہ ہم دنیا اور ہندوستان کے حالات سے قطعی بے خبر اور تاریکی میں رہیں۔ ایک اخبار نویس کو کھانا نہ ملے تو یہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کرتا مگر اس کو اخبار کا نہ ملنا اس کے لئے ناقابلِ برداشت کوفت اور اذیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اخبار کے متعلق تو اسمبلی کے ایک ممبر دوست نے جیل کے ایک ملازم کو اپنے اڈے لگا لیا۔ اس ملازم کو "ٹربیون" کے دو پرچوں کا معاوضہ روزانہ دو روپے دے دیا جاتا (حالانکہ ایک پرچہ کی قیمت ایک آنہ تھی) ان دو پرچوں کو تمام لوگ باری باری پڑھ لیتے اور شام تک ہر شخص کو معلوم ہو جاتا کہ دنیا اور ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ اخبار نہ ملنے کی مشکل تو اس طریقہ سے حل ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ دفتر "ریاست" کے حالات کیونکر معلوم ہوں۔ اور دہلی کے ساتھ خط و کتابت کیونکر جاری رہ سکے کیونکہ سرکاری طور پر جیل والوں کی معرفت کسی شخص کا خط بھیجنا یا وصول کرنا دونوں ناممکن تھے۔

کچھ روز تو میں سوچتا رہا کہ اس مسئلہ کا حل کیونکر ہو۔ کیونکہ دفتر "ریاست" سے بے خبر رہنا ذہن کے لیے بہت بڑی کوفت تھی۔ آخر جیل کے ایک افسر کو آمادہ کر لیا۔ اور یہ صاحب دوستانہ طور پر بغیر کسی معاوضہ کے یہ خطرہ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے کہ جیل سے تو یہ خطوط لے جا کر ڈاک خانہ میں پوسٹ کرا دیا کریں۔ اور ان کا جواب ایک شخص کی معرفت ملتان شہر میں پہنچے جہاں سے کہ ان کی معرفت یہ جواب ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پہنچ جایا کرے۔ اور چونکہ دفتر "ریاست" کی ڈاک کئی برس سے سنسر ہوتی تھی۔ میں نے خط و کتابت دہلی ملا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" کے نام شروع کر دی۔ کیونکہ واحدی صاحب کی ڈاک سنسر نہ ہوتی تھی۔ وہ سیاسی ایجی ٹیٹر بھی نہ تھے۔ اور میونسپل کمیٹی کے ممبر ہونے کے باعث حکام ان کو خطرناک بھی قرار نہ دیتے تھے یعنی میں باہر کے لفافہ پر تو واحدی صاحب کا ایڈریس لکھتا اور اس کے اندر وہ لفافے نام لکھ کر رکھ دیتا۔ جن کو خطوط پہنچانے مطلوب ہوتے اور واحدی صاحب یہ خطوط دوستوں کو پہنچا دیتے۔ یہ سلسلہ کچھ روز چلتا رہا۔ میرے خطوط ملتان کے ڈاک خانہ سے جیل کے اس افسر کی معرفت پوسٹ ہوتے۔ اور ان کا جواب ان کے ذریعہ ہی میرے پاس پہنچ جاتا۔ مگر کچھ روز کے بعد دہلی پولیس کو معلوم ہوا کہ ملتان جیل سے نظربندوں کی خط و کتابت کا دہلی کے لوگوں کے ساتھ تسلسل جاری ہے اور گورنمنٹ کی تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئی ہیں تو دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر بیلر جو بہت ہوشیار تھے، نے دہلی کے ڈاک خانہ کو حکم دیا کہ تمام

Marfat.com

خطوط کا بنڈل جو ملتان کے ڈاک خانہ سے دہلی کے ڈاک خانہ پہنچے (ڈاک خانہ کے قواعد کے مطابق اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں پانچ یا پانچ سے زیادہ خطوط جائیں تو ان کا رسّی سے بنڈل باندھ کر اُس پر اُس شہر کا نام لکھ دیا جاتا ہے جس شہر میں کہ یہ بنڈل جا رہا ہو تاکہ راستہ میں ڈاک کو سارٹ کرنے والے ریلوے میل سروس کے ملازموں کو تکلیف نہ ہو اور ڈاک جلدی سارٹ ہو سکے) وہ بند کا بند بنڈل بغیر کھولے سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر میں پہنچایا جائے۔ چنانچہ یہ بنڈل ملتان سے دہلی کے ڈاک خانہ میں پہنچا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر میں کھولا گیا اور تمام لفافوں کو دیکھا گیا تو اس میں میرا ایک لفافہ بھی تھا جس پہ پتہ واحدی صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ مسٹر میلہ حیران کہ میں کس ترکیب سے تمام دوستوں کے نام خطوط واحدی صاحب کی معرفت بھیجتا ہوں تاکہ میرے خطوط کو ڈاک سنسر کرنے والے دیکھ نہ سکیں۔ جب سی۔ آئی۔ ڈی نے میرا یہ خط دیکھا تو یہاں سے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس (مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ رادھا سوامی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اب یہ ریٹائر ہو چکے ہیں) تحقیقات کے لئے ملتان پہنچے اور انہوں نے دوسرے لوگوں کے علاوہ جیل کے اُس افسر سے بھی سوالات کیے جس کی معرفت میں خطوط بھیجتا تھا کیونکہ ایک خط میں اُن کے متعلق لکھا گیا تھا کہ اگر کسی شخص کو ملتان بھیجا جائے تو یہ شخص ملتان جیل کے رہائشی کوارٹروں میں اس افسر سے مل کر مجھ سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سپرنٹنڈنٹ پولیس چار پانچ روز ملتان میں رہے۔ جیل کا جو افسر میرے خطوط پوسٹ کرتا تھا اس نے بتایا کہ تحقیقات میں اس کو بھی لپیٹا جا رہا ہے۔ کیونکہ میرے ایک خط میں ان کا بھی ذکر تھا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے جو رپورٹ کی وہ یہ تھی کہ گو شبہ تو یہی ہے کہ جیل کا ایک افسر خطوط پوسٹ کرتا رہا مگر کوئی ثبوت نہیں۔ اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تو مع آٹھ دس دوسرے دوستوں کے ملتان جیل سے انبالہ جیل میں تبدیل کیا گیا اور جیل کے یہ افسر اس جرم میں ہی گورداسپور تبدیل ہوئے۔

انبالہ جیل میں پہنچنے کے بعد نئے سرے سے پھر دقت ہوئی کہ خط و کتابت کا سلسلہ کیونکر جاری ہو اور دفتر "ریاست" کے حالات کیونکر معلوم ہوتے رہیں۔ دو تین روز سوچنے کے بعد میں نے انبالہ جیل کے ایک ملازم کو راز میں لے لیا اور اس کو خط پوسٹ کرنے کا معاوضہ فی خط آٹھ آنے دینے شروع کیے (کیونکہ گو جیل میں روپیہ رکھنے کی سخت ممانعت تھی اور یہ قابل سزا جرم تھا مگر میں پچاس ساٹھ یا سو روپیہ پوشیدہ طور پر اپنے پاس ضرور رکھتا تھا) اور ان کا جواب انبالہ شہر کے ایک شخص کے پتہ پر منگا لیا کرتا جس کے لئے بھی فی خط آٹھ آنے جیل کے اس ملازم کو دیدیئے جاتے۔

انبالہ پہنچنے کے بعد سب سے اہم سوال یہ تھا کہ چونکہ ملتان کے ڈاک خانہ سے دہلی کے ڈاک خانہ جانے والی تمام کی تمام ڈاک سنسر ہوتی تھی اور اب سی۔ آئی۔ ڈی والے انبالہ کے ڈاک خانہ سے دہلی کے ڈاک خانہ میں پہنچنے والی تمام کی تمام ڈاک سنسر کرتے ہوں گے، خطوط دہلی میں کس طریقہ سے پہنچیں۔ آخر سوچنے کے بعد فیصلہ یہ کیا گیا کہ میں اپنے خطوط ایک بڑے لفافہ میں اپنے ایک دوست کے نام پشاور بھیجوں اور پشاور کا دوست اندر کے لفافوں کو وہاں سے دہلی کو پوسٹ کر دے کیونکہ دہلی کی سی آئی ڈی

Marfat.com

تو صرف ان بنڈلوں کو سنسر کرتی تھی جو بنڈل اُن مقامات سے مثلاً انبالہ یا ملتان سے پوسٹ ہوتے جن مقامات کے جیلوں میں دہلی کے نظر بند مقید تھے۔ چنانچہ یہ سلسلہ بے حد کامیاب رہا۔ دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کو کچھ پتہ نہ چل سکا کہ انبالہ جیل سے دہلی خطوط کے پہنچنے کا کیا ذریعہ ہے۔ اور میں جب انبالہ جیل سے فیروزپور جیل میں بھیجا گیا تو وہاں سے بھی اسی ترکیب کے ذریعہ خطوط دہلی پہنچائے جاتے رہے۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی کو آخری وقت تک کچھ پتہ نہ چل سکا۔ جو یقیناً دہلی سی۔ آئی۔ ڈی کے نہلے پہ ایڈیٹر "ریاست" کا دہلہ تھا۔

میں یہ قانون شکنی کرتا رہا مگر میرا ضمیر مطمئن تھا کہ جس صورت میں انگریزوں کی حکومت نے لوگوں کی خط و کتابت پر بھی ناجائز پابندیاں عائد کیں اور اس نے چاہا کہ ہم قطعی تاریکی میں رہیں، میرا قانون شکنی کرنا جائز تھا اور مجھے یہ قانون شکنی کرنی چاہیئے تھی۔

کمیونسٹوں کی قوتِ ارادی

میں جب فیروزپور جیل میں تھا تو ہم وہاں ساٹھ کے قریب دہلی کے نظر بند تھے جو ۱۹۴۲ء کی کانگریس تحریک کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور ان ساٹھ میں کانگریسی بھی تھے، کیمونسٹ بھی، انارکسٹ بھی اور مجھ جیسے کسی پارٹی سے تعلق نہ رکھنے والے بھی، مگر یہ واقعہ ہے اور میں ان تمام کا زیرِ بارِ احسان ہوں کہ گو یہ سب اپنی پارٹی بازیوں کے باعث ایک دوسرے کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتے تھے مگر مجھ سے تمام ہی محبت اور مہربانی کا سلوک کرتے۔

ایک دن صوبہ دہلی کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری مسٹر عبدالقیوم فاروقی ملنے کے لئے میرے کمرہ یعنی جیل کی کوٹھڑی میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ ان کے ہاں شام کو چائے پر آؤں۔ میں نے اس دعوت کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور شام کو اُن کے خیمے میں حاضر ہوا۔ وہاں سردار بھگت سنگھ اور دوسرے چار پانچ کیمونسٹ تشریف فرما تھے اور میرا انتظار ہو رہا تھا۔ میرے پہنچنے کے بعد پُرتکلف چائے کا دَور شروع ہوا (جیل میں پُرتکلف چائے کی ذیل میں صرف چائے، حلوہ، پوریاں اور پکوڑے ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شے بغیر سپرنٹنڈنٹ کی منظوری کے بازار سے جیل میں منگائی نہیں جا سکتی) چائے پر دوسری گپ بازی کے علاوہ وہی باتیں ہوتی رہیں جو کیمونسٹوں کے دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ مثلاً سٹالن نے شباب کے زمانہ میں کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں ایم۔ این رائے نے کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ دغا کی، روس کے انقلاب کا دنیا پر کیا اثر ہوا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا مستقبل کیا ہے۔ وغیرہ۔ میری دماغی کیفیت بچپن سے یہ ہے کہ میں ہر وقت ہی سوچتا رہتا ہوں اور یہ غیر ممکن ہے کہ میں کسی شخص کی بات مسلسل پانچ منٹ بھی غور کے ساتھ سُن

Marfat.com

سکوں اور یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کسی جلسہ میں کوئی تقریر سُننے نہیں جاتا۔ اس چائے پارٹی میں بھی ہاں ہاں تو کرتا رہا مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے کچھ بھی نہ سنا کہ ان لوگوں نے مجھے کمیونزم کا درس دیتے ہوئے کیا کچھ کہا ہے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کمرہ یعنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز شام کو تین بجے کے قریب فاروقی صاحب پھر تشریف لائے اور پوچھا کہ کیا سیر کو چلو گے جیل میں میرے پاس کافی وقت تھا میں ہر روز تقریباً تین گھنٹے سیر اور ورزش میں صرف کرتا اور جیل میں سیر یہ ہوا کرتی کہ جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا۔ چنانچہ میں صبح اٹھتے ہی ضروری حاجت سے فارغ ہونے کے بعد ورزش کرتا اور پھر سیر میں مصروف ہو جاتا۔ ایک گھنٹہ دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا، ایک گھنٹہ میں "تین میل کے قریب پیدل سیر ہو جاتی اس کے بعد واپس اپنی کوٹھڑی میں آتا اور پھر ورزش شروع کر دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں جیل میں گیا تو میرا وزن تین من دس سیر تھا اور جب جیل سے رہا ہوا تو وزن دو من دس سیر تھا (یعنی میں نے ایک من یا اسی پونڈ چربی جیل میں قوم کی نظر کی) میں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ حاضر ہوں۔ چنانچہ میں اور فاروقی صاحب دونوں سیر کو نکلے اور میں ہر روز کی طرح ایک گھنٹہ فاروقی صاحب کے ساتھ دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگاتا رہا۔ اس ایک گھنٹہ میں بھی فاروقی صاحب مجھے وہی درس دیتے رہے۔ سٹالن کی حکومت میں کیا خرابیاں ہیں، مارکس نے دنیا سے کیا کہا، لینن نے انقلاب کی راہ میں کیا کیا اور کمیونسٹ جنگ میں انگریزوں کے ساتھ کیوں شامل ہوئے وغیرہ۔ میں سنتا رہا اور ہاں ہاں کرتا رہا مگر اپنی دماغی حالت کے مطابق کچھ اور ہی سوچتا رہا اور مجھے کچھ پتہ نہیں کہ فاروقی صاحب نے کیا کہا۔ سیر کے بعد ہم واپس اپنی اپنی جگہ پر چلے گئے۔

اگلے روز فاروقی صاحب صبح تشریف لائے اور فرمایا کہ میں دوپہر کا کھانا اُن کے ساتھ کھاؤں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ اس دعوت کو بھی قبول کیا اور دوپہر کو میں کھانے پر گیا۔ وہاں "پرتکلف" کھانا یعنی سبزی، دال، حلوہ اور پراٹھے تھے۔ اور کیمپ کے پانچ چھ کمیونسٹ تشریف فرما تھے۔ کھانے پر وہی باتیں، مارکس کی تعلیم کیا ہے، روس اور برطانیہ اگر جنگ میں کامیاب ہوئے تو دنیا میں کیا ہوگا ہٹلر ظالم ہے اور سرمایہ پرستی کو دنیا میں سے کیونکر ختم کیا جا سکتا ہے۔ میں سنتا رہا اور ہاں ہاں کرتا رہا۔ مگر میں اب بھی اپنے خیالات میں غرق تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا کالج کا نوجوان عیسائی پادریوں کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اُس کے کانوں میں چاروں طرف سے "حضرت مسیح نجات دہندہ ہیں"، "خدا کا بیٹا آسمان سے نازل ہوا" اور "حضرت مریمؑ معصوم تھیں"۔ وغیرہ صدائیں آ رہی ہوں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرہ میں واپس آ گیا۔

شام کو تین بجے فاروقی صاحب پھر تشریف لائے اور سیر کو چلنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں فوراً تیار ہو گیا کیونکہ انسان اکیلا سیر سے اُکتا جاتا ہے اور اگر سیر کرنے والے دو یا زیادہ ہوں تو

Marfat.com

سیر دلچسپ رہتی ہے اور انسان زیادہ عرصہ تک چل سکتا ہے۔ ہم دونوں جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور فاروقی صاحب مجھے درس دینے میں مصروف تھے۔ یہ درس بھی وہی تھا جو چائے، کھانے اور سیر میں پہلے دیا جاتا رہا۔ جب ہم ایک گھنٹہ چلتے رہے اور گھڑی میں دیکھا کہ چلتے چلتے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے اور ہم نے تین میل کے قریب چل لیا ہے، ہم نے سیر بند کر دی اور واپس اپنی اپنی کوٹھڑی میں جانے کے لئے تیار ہو گئے تو مسٹر فاروقی نے مجھ سے سوال کیا کہ میرا کمیونزم کے متعلق اب کیا خیال ہے۔ میں دوستوں کے پاس کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ فاروقی صاحب مجھے کچھ پتہ نہیں کہ آپ نے اب تک کیمونزم کے متعلق کیا کہا ہے۔ میں آپ کے ارشاد کو سنتا رہا اور ہاں ہاں کرتا رہا مگر میرا دماغ تو کچھ اور ہی سوچنے میں مصروف تھا۔ میرا یہ جواب سن کر فاروقی صاحب حیران ہو گئے اور ان کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے پھر تعجب کے ساتھ پوچھا کہ کیا فی الحقیقت میں نے ان کے درس پر غور نہیں کیا تو میں نے ان کو یقین دلانے کے لئے قسم کھا کر کہا کہ کس بدذات نے آپ کی کوئی بھی مکمل بات سنی ہے مسٹر فاروقی کو میرا یہ جواب سن کر یقین تو آ گیا کہ میں نے اُن کے درس کو نہیں سنا مگر یہ کچھ مایوس سے ہو گئے اور ہم واپس اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں چلے گئے۔

میری زندگی کا تجربہ ہے کہ قوتِ ارادی کے لحاظ سے کیونسٹوں اور بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹوں کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خدا ان کے ہاتھوں سے سادہ دل لوگوں کو بچائے کیونکہ کمیونسٹ جب کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو یہ اُس کا پیچھا اُس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک کہ یہ اپنے گھر والوں سے فارغ خطی لے کر کھانا کپڑا اور پندرہ روپیہ ماہوار جیب خرچ پر کمیونسٹ ورکروں میں شامل نہ ہو جائے چاہے یہ کسی برلا یا ڈالمیا کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اور بیمہ کمپنی کے کنویسر پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک کہ یہ اپنی آسامی کا ڈاکٹری معائنہ کرا کر بیمہ کی پہلی قسط وصول نہ کر لیں۔ میرے اس جواب پر بھی فاروقی صاحب نے اپنی ہمت کو نہ چھوڑا اور چونکہ "ریاست" کی پالیسی ہمیشہ ہی کیمونزم کی معترف رہی۔ اُن کا خیال تھا کہ ایڈیٹر "ریاست" پچاس فی صدی تو مہاتما سٹالن کا چیلا ہے لہٰذا باقی پچاس فیصدی کوشش سے یہ مرید ہو جائے گا تو "ریاست" جیسا چلا چلایا شاندار اخبار بغیر ایک پیسہ صرف کئے کیونسٹوں کا آرگن ہو گا۔ چنانچہ جب تک میں فیروزپور جیل میں رہا فاروقی صاحب نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ موقع ملنے پر مجھے کیونسٹوں اور روس کے درس دیتے ہی رہے اور مجھے اکثر ان کے ہاں دعوت کھانے کی عزت بھی نصیب ہوئی۔

فیروزپور جیل سے رہائی کے بعد جب میں اور فاروقی صاحب دہلی واپس پہنچ گئے اور "ریاست" پھر شروع ہوا تو فاروقی صاحب نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ ہفتہ میں ایک آدھ بار ضرور تشریف لاتے اور کبھی کبھی دعوت بھی دیتے۔ چنانچہ ان کے ذاتی مکان میں جو کشمیری دروازہ کی فصیل کے اندر تھا، وہاں بھی کھانے پر گیا۔ جہاں کہ میرا تعارف تین چار برس کی

Marfat.com

ایک چھوٹی سی خوب صورت بچی سے کرایا گیا۔ اور اس بچی نے تعارف کے بعد مجھے کیمونسٹوں کا لال سلام کیا۔

فاروقی صاحب ایک سال تک مسلسل میرا پیچھا کرتے رہے اور مایوس ہونے کے بعد بھی اُن کو امید تھی کہ میں ان کا چیلا بن جاؤں گا۔ چنانچہ بھوپال کے ایک مستعد اور خوب صورت نوجوان مسٹر کامل یا کمال کو بھی انہوں نے میرے ہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ لڑکا ایم۔ اے تک تعلیم یافتہ تھا اور بھوپال کے کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بھی مجھے کیمونزم کا درس دیا کرتا اور میں اس پر رحم کھاتے ہوئے کہا کرتا کہ اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔ دنیا میں کوئی کام کر کے خوب روپیہ پیدا کرو اس روپیہ سے غریب اور مستحق لوگوں کی بھی امداد کرو اور وقت ضائع نہ کرو مگر کیمونسٹ ورکرز کسی نصیحت کے محتاج نہیں ہوا کرتے یہ اپنی دھن اور قوتِ ارادی کے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ لڑکا بھی کافی عرصہ تک میرا پیچھا کرتا رہا۔ اور نہیں معلوم کہ اب یہ نوجوان کیمونسٹ پارٹی کا کہاں کام کرتا ہے۔

مسٹر فاروقی اب مجھ سے قطعی مایوس ہو چکے ہیں اور گو میرے متعلق ان کے اخلاص میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور جب کبھی ان کو دعوت دوں تو تشریف لاتے اور کبھی ضروری کام ہو تو ٹیلیفون پر بات کر لیتے ہیں۔ مگر یہ اب محسوس کرتے ہیں کہ گو "ریاست" ہمیشہ کی طرح کیمونزم کا مداح ہے مگر ایڈیٹر "ریاست" اُن کا چیلا نہیں ہو سکتا۔ اور میں گو ان کا چیلا نہ بن سکا، مگر کیمونسٹوں کی قوتِ ارادی، اِن کی شب و روز کی محنت اور ان کے ایثار کا بہت مدّاح ہوں اور میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص پبلک خدمت کے میدان میں آنا چاہے تو وہ کیمونسٹوں کی ان صفات کی پیروی ضرور کرے۔

ہندوستان کی پولیس اور ظلم

۱۹۴۷ء کے انقلاب نے پنجاب کے مالدار ترین لوگوں کو تنگ دستی اور صاحبِ جائداد لوگوں کو غریب الوطنی کے لئے مجبور کر دیا۔ میرے ماموں زاد بھائی سردار ہرنام سنگھ کپور (جو آج کل امرتسر کے خزانہ کے انچارج ہیں) حافظ آباد کے اچھے خوشحال لوگوں میں سے تھے۔ اور ان کے وہاں نصف درجن سے زیادہ مکانات تھے اور کرایہ کی آمدنی کافی تھی۔ اس انقلاب کے سلسلہ میں جب یہ مشرقی پنجاب آئے تو دفتر "ریاست" کی اوپر کی منزل کے ایک کمرہ میں مع اپنے بال بچوں کے مقیم ہوئے یہاں چند ماہ مقیم ہونے کے بعد اُن کے مستقل طور پر آباد ہونے کا سوال تھا اور یہ چاہتے تھے کہ دہلی یا دہلی کے قریب کسی قصبہ میں آباد ہوں۔

Marfat.com

کچھ عرصہ کی دَوڑ دھوپ کے بعد دہلی کے قریب سونی پت کے مجسٹریٹ مسٹر کرشن لال کپور سے ملے تو مسٹر کرشن لال نے کہا کہ کوئی مکان بتایئے جو آپ کے نام الاٹ کر دیا جائے ۔ سردار ہرنام سنگھ نے سونی پت میں ایک مکان دیکھا جو کسی مسلمان کا تھا اور یہ خالی تھا ۔ چنانچہ یہ مکان سردار ہرنام سنگھ کے نام الاٹ کر دیا گیا ۔ مکان کے الاٹ ہونے کے بعد جب سردار ہرنام سنگھ منتقل ہونے کے لئے سونی پت پہنچے تو وہاں ملتان کے کوئی شرنارتھی اس مکان میں داخل ہو چکے تھے ۔ سردار ہرنام سنگھ نے ان سے کہا کہ یہ مکان ان کو الاٹ ہو چکا ہے اور یہ کسی دوسرے مکان میں چلے جائیں ۔ یہ ملتانی شریف اور معقولیت پسند تھے ۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ یہ ایک ہفتہ میں کوئی دوسرا مکان تلاش کر کے اس میں چلے جائیں گے اور مکان خالی کر دیں گے ۔ سردار ہرنام سنگھ واپس دہلی آ گئے ۔

ایک ہفتہ کے بعد سردار ہرنام سنگھ نے اپنے ملازم کو سونی پت بھیجا کہ یہ وہاں جا کر دیکھ آئے کہ مکان خالی ہو چکا ہے یا نہیں تا کہ اگر خالی ہو چکا ہو تو یہ اپنے بال بچوں کے ساتھ دہلی سے سونی پت منتقل ہو جائیں ۔ یہ ملازم شام کی ٹرین میں دہلی سے روانہ ہوا تا کہ یہ سونی پت پہنچ کر صبح ہی صبح مکان کی کیفیت دیکھ کر اگلے روز دوپہر تک واپس دہلی آ جائے ۔ جب یہ سونی پت کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا اس نے سوچا کہ یہ اب اس وقت سونی پت کے شہر میں کہاں جائے گا ۔ رات یہ ریلوے سٹیشن پر ہی سو رہے اور صبح ہی مکان دیکھ کر پھر واپس ریلوے سٹیشن پر آ کر دہلی چلا جائے گا ۔ کیونکہ ریلوے سٹیشن اور شہر کے درمیان میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہے گرمیوں کا زمانہ تھا یہ ملازم ریلوے پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر سو گیا ۔ اس کو سوئے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ پولیس کا ایک کنسٹیبل آیا ۔ اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ ملازم نے جواب دیا کہ یہ سردار ہرنام سنگھ کپور کا ملازم ہے ۔ دہلی سے مکان دیکھنے کے لئے آیا ہے کہ خالی ہو گیا ہے یا نہیں ۔ اور چونکہ سٹیشن سے شہر ایک میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے یہ رات یہیں گذار رہا ہے تا کہ صبح شہر میں مکان دیکھنے جائے اور پھر واپس دہلی چلا جائے ۔

ہندوستان کی پولیس کا کیریکٹر یہ ہے کہ اس پولیس کے ملازم دنیا میں ہر شخص کو مجرم سمجھتے ہیں یہ اپنے باپ، بھائی اور بیٹے کو بھی مشتبہ قرار دیتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ان سے ہو سکے یہ لوگوں کو ایذا پہنچائیں اور جیل بھجوائیں ۔ چنانچہ دہلی کے سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر الیسر کہا کرتے ہیں کہ اگر پولیس کا کوئی ملازم اپنے حقیقی بھائی کو گرفتار کرے اور اس کی ماں اس سے سفارش کرے کہ تم اپنے بھائی کا چالان نہ کرو ۔ تو پولیس کا یہ ملازم ماں کے کہنے پر بھائی کا چالان تو نہ کرے گا مگر بہت ذہنی تکلیف کے ساتھ مجبور ہو کر کیونکہ کسی شخص کا چالان کرنا ۔ وہ چاہے کتنا بھی بے گناہ اور اس کا حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو پولیس کے ملازم کے لئے مسرت اور اطمینان کا باعث ہوتا ہے ۔ کنسٹیبل نے کہا کہ تم تو چور ہو اور واردات کرنے کے لئے یہاں لیٹے ہو ۔ تھانہ میں چلو کنسٹیبل اس کو تھانہ میں لے گیا اور جاتے ہی وہاں اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں کہ کئی لوگ

Marfat.com

پہلے ہی بند تھے۔ یہ ملازم رات بھر حوالات میں بند رہا۔ صبح ہوئی اور سب انسپکٹر صاحب غسل اور ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد نو بجے اپنے کوارٹر سے برآمد ہوئے۔ ان کے تشریف لانے سے پہلے تھانہ کے صحن میں میز اور کرسیاں بچھائی جا چکی تھیں۔ آپ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ رات کی کارگزاری معلوم کرنے کے لئے تھانہ کا محرّر حاضر ہوا اور ایک ایک ملزم پیش کیا گیا۔ جب سردار ہرنام سنگھ کا ملازم پیش کیا گیا تو تھانہ دار صاحب اور اس ملازم کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:۔

تم کون ہو؟

حضور میں پنجاب کا شرنارتھی ہوں۔

حرامزادے یہ بتاؤ تم رہتے کہاں ہو!

حضور میں دہلی میں رہتا ہوں۔

تم سونی پت کیوں آئے!

میں سردار ہرنام سنگھ کپور کا ملازم ہوں ان کو سونی پت میں ایک مکان الاٹ ہوا ہے یہ دیکھنے کے لئے آیا تھا کہ مکان خالی ہوا ہے یا نہیں۔

ہرنام سنگھ کون ہے!

حضور وہ حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے کپور کھتری ہیں۔

یہ ہرنام سنگھ کہاں رہتا ہے؟

حضور یہ اخبار "ریاست" کے دفتر میں رہتے ہیں۔

یہ اخبار "ریاست" کے دفتر میں کیوں رہتا ہے!

حضور یہ اس اخبار کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کے بھائی ہیں۔

یہ دیوان سنگھ ایڈیٹر اخبار "ریاست" کا بھائی ہے؟

جی ہاں! دیوان سنگھ کے ماموں زاد بھائی ہیں۔

یہ جواب سنتے ہی سب انسپکٹر صاحب نے اس کنسٹیبل کو طلب فرمایا جو اس "ملزم" کو ریلوے اسٹیشن سے گرفتار کر کے لایا تھا۔ کنسٹیبل سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر سویا ہوا تھا۔ اور اس نے کہا تھا کہ یہ مکان دیکھنے کے لئے آیا ہے۔ یہ جواب سن کر سب انسپکٹر نے اس کنسٹیبل کو سخت سست کہنا شروع کیا "تم لوگ دیکھتے نہیں کہ جس کو گرفتار کر رہے ہو یہ کون ہے!" "تم انسان کو پہچاننے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے، تم لوگ کسی روز خود بھی مرو گے اور مجھے بھی مرواؤ گے۔" "تم دیوان سنگھ کو نہیں جانتے یہ بہت مقدمہ باز ہے۔ اس نے نواب بھوپال اور مہاراجہ پٹیالہ کے دانت کھٹے کئے۔ یہ ہائیکورٹ تک مقدمہ لڑا کرتا ہے۔ یہ نہ صرف اپنے مخالفوں کو موقوف بلکہ قید بھی کراتا ہے۔ یہ بہت انتقام لینے والا شخص ہے۔ تم نے اس شخص کو گرفتار کر کے بہت غلطی کی۔" وغیرہ۔

Marfat.com

سب انسپکٹر صاحب جب گرفتار کرنے والے کنسٹیبل کو بہت سخت سست کہہ چکے۔ تو آپ نے اپنے گھر کے ملازم کو بُلوا بھیجا۔ ملازم جب آیا تو اس کو حکم دیا گیا کہ دہی کی لسی اور پراٹھے لاؤ۔ چنانچہ سردار ہرنام سنگھ کے ملازم کے ناشتہ کے لئے پراٹھے اور لسی لائی گئی۔ اور سردار ہرنام سنگھ کے ملازم سے کہا گیا کہ "بیٹا غلطی سے تم گرفتار کئے گئے تھے۔ تم نے اپنی گرفتاری کے متعلق سردار دیوان سنگھ سے کچھ نہ کہنا۔ اور یہ ناشتہ کھالو اور مکان دیکھنے چلے جاؤ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اس بیوقوف کنسٹیبل نے تم کو گرفتار کیا"۔ چنانچہ ملازم ناشتہ کرنے کے بعد مکان دیکھنے گیا۔ اور مکان دیکھ کر واپس دہلی آیا اور اس نے بتایا کہ یہ کیونکر رات بھر حوالات میں رہا اور صبح پراٹھے اور لسی کا اس کو ناشتہ کرایا گیا۔

یہ ہے ہندوستان کی پولیس جو صرف اُن لوگوں پر ظلم کرتی ہے جو ظلم برداشت کریں اور اُن لوگوں پر ظلم نہیں کرتی جو ظلم برداشت نہ کرتے ہوں۔

ریاستوں کے "خوش خور"

ہندوستان کی ریاستوں میں والیانِ ریاست کو خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے جن کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی اور جن کا کام کبھی کبھی والیئے ریاست کو خوش کرنا تھا اور ان میں پہلوان، موسیقار، شاعر اور دوسرے اہلِ فن ہوا کرتے۔

ریاست نابھہ میں ایک صاحب کپتان شیو دیو سنگھ تھے۔ جو مہاراجہ کے دُور کے رشتہ دار بھی تھے۔ عہدہ کے لحاظ سے آنریری کپتان، تنخواہ ایک سو روپیہ ماہوار اور کام صرف یہ کہ جب کبھی مہاراجہ طلب کریں حاضر ہو جائیں۔

کپتان شیو دیو سنگھ بہت شریف، ملنسار، سادہ طبیعت اور "خوش خوری" کے اعتبار سے آپ "آفتاب خوش خوری" یا "رستم خوش خوری" (موسیقار کے خطاب آفتاب موسیقی اور پہلوانوں کے خطاب رستم ہند کی طرح) کے خطاب کے مستحق تھے اور اس فن کے اعتبار سے شائد تمام ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص آپ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

نابھہ میں ڈیرہ بابا اجے پال سنگھ کے نام سے ایک تاریخی گوردوارہ ہے جہاں کہ ہر پورنماشی کو مہاراجہ کی طرف سے اڑھائی سو روپیہ کا کڑاہ پرشاد (حلوہ) چڑھایا جاتا۔ اس زمانہ میں کھانے کی ہر شے مثلاً گھی، کھانڈ اور گندم بہت ارزاں تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اڑھائی سو روپیہ کا کڑاہ پرشاد مقدار میں کتنے من ہوتا ہوگا۔ پورنماشی کے روز دوپہر کو اس گوردوارہ میں چند سو کے قریب سرکاری ملازم، افسر اور دوسرے لوگ آیا کرتے۔ اور چونکہ کڑاہ پرشاد کئی من ہوتا وہاں

Marfat.com

شامل ہونے والے ہر ایک کو اتنا کڑاہ پرشاد دیا جاتا جو بمشکل دونوں ہاتھوں میں آسکتا تاکہ یہ سب میں تقسیم ہو جائے۔ ایک آدمی کے حصہ کا کڑاہ پرشاد کھانے کے بعد اس کو کھانا کھانے کی ضرورت ہی نہ رہتی چنانچہ ہر لوپر نماشی کو کپتان شیو دیو سنگھ بھی آتے تو آپ کے قریب بیٹھے آٹھ دس سرکاری افسر بالکل تھوڑا سا کڑاہ پرشاد اپنے لئے رکھ کر باقی تمام کا تمام کپتان صاحب کو دے دیتے اور کپتان صاحب تمام کے حصہ کا کڑاہ پرشاد وہاں بیٹھے بیٹھے کھا جاتے جس کی مقدار کسی صورت میں بھی چھ سات سیر سے کم نہ ہوتی۔

مہاراجہ نے ایک بار کپتان صاحب کو طلب فرمایا۔ آموں کا موسم تھا اور بنارس و لکھنؤ سے آموں کے ٹوکرے آئے تھے۔ مہاراجہ نے فرمایا کہ کپتان صاحب اگر آموں کا ایک پورا ٹوکرا بغیر ہاتھ لگائے کھا جاؤ تو آپ کو دو سو روپیہ انعام ملے گا۔ کپتان صاحب نے اس شرط کو منظور کیا اور آپ بغیر ہاتھ لگائے تمام کے تمام آم کھا گئے اور دو سو روپیہ وصول کیا۔

سرکاری شکاری ایک روز جنگل سے ہرن مار کر لائے، مہاراجہ نے کپتان صاحب کو طلب کیا اور کہا کہ اگر ایک دن میں تمام کا تمام ہرن کھا جاؤ تو پانچسو روپیہ انعام ملے گا۔ کپتان صاحب نے یہ شرط منظور کر لی۔ ہرن کو صاف کیا گیا، سرکاری باورچی خانہ میں پکایا گیا اور کپتان صاحب بارہ گھنٹے میں ہرن کے اس تمام گوشت کو کھا گئے۔

مہاراجہ نے ایک بار کپتان صاحب کو طلب کیا اور فرمایا کہ اگر پانچ سیر دودھ میں دو سیر جلیبیاں ڈال کر کھا جائیں تو دو سو روپیہ انعام ملے گا۔ چنانچہ پانچ سیر دودھ میں دو سیر جلیبیاں ڈالی گئیں۔ اور کپتان صاحب نے کھانا شروع کیا۔ جب آپ دودھ اور جلیبیوں کا مکسچر بہت کافی کھا چکے اور بہت تھوڑا سا باقی رہ گیا تو آپ کے معدے نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آپ کا جی متلانے لگا مگر آپ نے پھر بھی پروا نہ کی اور متلی پر غالب آتے ہوئے اس مکسچر کو ختم کر گئے اور انعام حاصل کیا۔

ایک روز سرکاری شکاری جنگل سے بہت سے تیتر مار کر لائے۔ مہاراجہ نے کپتان شیو دیو سنگھ کو طلب فرمایا اور کہا کہ اگر بغیر پکائے ایک تیتر کچا کھا جاؤ تو دو سو روپیہ انعام ملے گا۔ کپتان صاحب نے یہ شرط بھی منظور کر لی اور آپ بغیر پکائے تیتر کھا گئے اور انعام حاصل کیا۔

ایڈیٹر "ریاست" نے ایک بار چھ سات سرکاری افسروں کی اپنے ہاں دعوت کی۔ جب تمام لوگ آ گئے اور کھانا تیار ہو چکا تو فیصلہ ہوا کہ پہلے کپتان شیو دیو سنگھ کو کھانا کھلا دیا جائے اور بعد میں دوسرے لوگ کھانا کھائیں۔ چنانچہ کپتان صاحب نے کھانا شروع کیا اور آپ چھ سات آدمیوں کے لئے پکے ہوئے پراٹھے، پلاؤ، مختلف قسم کے سالن اور پڈنگ وغیرہ سب ختم کر گئے اور اس کے بعد باورچی کو نئے سرے سے آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانی پڑیں اور وقت تنگ ہونے کے باعث مہمانوں کو صرف انڈے تل کر کھانا کھلایا گیا۔

Marfat.com

ریاستوں کے ختم ہونے کا اثر پہلوانوں، موسیقاروں، شعراء اور دوسرے اہل فن لوگوں کے علاوہ کپتان شیو دیو سنگھ جیسے خوش خوروں پر بھی پڑا جس کا بہت حد تک افسوس ہے۔

کھانے کی لذّت

میری عمر دس بارہ برس کی تھی کہ اُس زمانہ میرے وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں ایک دکاندار سُرین سنگھ ہوا کرتا۔ یہ ذات کا غالباً کہار تھا اور اس کی دکان میں کچا اور پکا ہوا گوشت فروخت ہوتا اور تمام قصبہ میں جھٹکے کی غالباً صرف یہی ایک دکان تھی۔ کچا گوشت اس زمانہ میں چھ پیسے یا دو آنہ سیر ملتا اور پکا ہوا گوشت دو پیسہ کا اتنا مل جاتا جتنا آج چار آنہ کا ملتا ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" کو زندگی میں درجنوں والیانِ ریاست کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ اور ہندوستان کے اچھے سے اچھے انگریزی اور دیسی ہوٹلوں میں کھانا کھایا مگر یہ واقعہ ہے کہ جو لذت اس سرین سنگھ جھٹکئی کی دکان کے پکے ہوئے دو پیسے کے گوشت میں تھی، وہ لذت نہ تو کبھی والیانِ ریاست کے دسترخوان پر نصیب ہوئی اور نہ ہندوستان کے بہترین ہوٹلوں میں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ یعنی سرین سنگھ فی الحقیقت گوشت اچھا پکاتا تھا۔ یا اُس زمانہ میں میرے ذائقہ اور لذت کی حس محدود تھی۔ یعنی معمولی کھانا بھی بہت لذیذ محسوس ہوا کرتا۔

میں جب نابھہ میں ملازم تھا تو وہاں افسروں کے ہاں خوشامد کرنے یا ان سے تعلقات بڑھانے کے لئے اکثر لوگ آیا کرتے۔ اور میرے ہاں جو لوگ آتے اُن میں ایک نیک دل شخصیت پنڈت دیونایک بھی تھے جو ہندی بہت اچھی جانتے اور میں نے ہندی ان سے ہی سیکھی۔ یعنی یہ میرے ہندی کے استاد بھی تھے۔ ایک روز پنڈت جی بیٹھے تھے اور میرا باورچی کھانا پکا رہا تھا۔ تو پنڈت جی نے باورچی سے کہا کہ وہ سبزی خود پکائیں گے۔ چنانچہ پنڈت جی نے آلو کی سبزی پکائی اور میں نے کھانا کھایا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس سے پہلے ایسی لذیذ سبزی کھانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے پنڈت جی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ تو پیاز استعمال کرتے ہیں نہ لہسن اور معمولی نمک اور مرچ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد پنڈت جی سے کبھی کبھی سبزی پکانے کی درخواست کی جاتی تو آپ پکا دیا کرتے۔ پنڈت جی کا بیان ہے کہ اُن کی شادی کے بعد ان کی بیوی ستائیس برس زندہ رہیں اور ستائیس برس میں آپ نے کبھی ایک دن بھی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا ہمیشہ اپنا کھانا خود پکایا کرتے اور بیوی کو بھی کھلایا کرتے۔ میرے نابھہ سے چلے آنے کے بعد وہ میرے پاس دہلی آ گئے۔ اور یہاں کئی برس میرے پاس رہے۔ یہاں بھی کبھی کبھی سبزی پکا دیا کرتے اور یہ واقعہ ہے کہ جو لذت اس سبزی میں ہوتی کبھی کسی دوسرے شخص کی پکائی ہوئی سبزی میں نہ ہوتی۔ اور میں نے ان سے اس کا راز پوچھا تو آپ نے

Marfat.com

بتایا کہ لذیذ کھانا پکانے کے لئے ضروری ہے کہ اچھا خالص گھی ہو، صاف ستھری جگہ میں پیدا ہوئی سبزی ہو، اچھی لکڑی کا کوئلہ ہو جس پر کھانا پکایا جائے۔ صاف ستھری اور اچھی کوالٹی کی گندم ہو جس کا آٹا پیسا ہو۔ اور پکانے والا نیت کے لحاظ سے لالچی اور کمینہ نہ ہو۔ ان تمام میں سے اگر ایک شے بھی خراب ہو گی تو کھانا لذت سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ میرا بھی تجربہ ہے کہ اگر کھانا پکانے والا باورچی کمینہ، ٹائپ کا لالچی ہو اور وہ کھانا دیگچی میں سے فراخدلی کے ساتھ نہ نکالے اور کھانا دیتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو تو اس کا پکا ہوا کھانا لذت سے قطعی محروم ہوتا ہے۔

میں مسٹر توکلی ایڈووکیٹ دہلی اور مسٹر لبش داس چوہدری (جو راجپوتانہ میں کسی جگہ کمشنر تھے) ہم تینوں ریاست خیرپور (سندھ) کے چلائے گئے ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے سکھر (سندھ) گئے۔ وہاں سے واپس آ رہے تھے تو میں نے روہڑی کے ریلوے سٹیشن سے ابوہر (ضلع فیروزپور) لالہ لال جی مل جل آنر (جو کسی زمانہ بیکانیر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے) کو تار دیا کہ ہم براستہ بھٹنڈہ دہلی جا رہے ہیں۔ شام کو ریلوے سٹیشن ابوہر پر تین آدمیوں کا کھانا بھیجا جائے۔ لالہ لال جی مل کھانا لے کر خود سٹیشن پر آئے۔ ہم تینوں نے سیکنڈ کلاس کی گاڑی میں بیٹھے کھانا کھایا، تینوں کا بیان ہے کہ ایسا لذیذ کھانا بہت کم کھانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اور اب بھی کبھی کبھی اس کھانے کے متعلق میرا اور توکلی صاحب کا ذکر آ جاتا ہے۔ حالانکہ اس کھانے میں معمولی گوشت، سبزی، دال اور پراٹھے تھے۔

مرحوم مہاراجہ نابھہ ایک بار گوردوارہ کی زیارت کے لئے ناندیڑ (ریاست حیدرآباد) گئے۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے انہوں نے ریلوے سٹیشن بینا سے مجھے تار دیا کہ اگلی صبح کو کھانا دہلی ریلوے سٹیشن پر لایا جائے۔ میں نے ایک باورچی کا انتظام کیا۔ جو دہلی کے شاہی باورچیوں کے خاندان میں سے تھا۔ اور جس کا پیشہ ہی دعوتوں میں کھانا پکانا تھا، اس سے اجرت کا فیصلہ ہونے کے بعد سامان منگایا گیا۔ رات کو نو بجے کھانا پکنا شروع ہوا، اور صبح چھ بجے تک کھانا پکتا رہا۔ بیس قسم کا کھانا تھا اور اس کے لئے کئی نئے ٹفن کیریئر خریدے گئے تھے۔ اس کھانے پر اڑھائی سو روپے کے قریب صرف ہوا۔ میں کھانا لے کر صبح سات بجے ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں مہاراجہ سے ملنے کے لئے مرحوم مولانا محمد علی بھی موجود تھے۔ کھانا مہاراجہ کے ملازموں کے سپرد کر دیا۔ مہاراجہ ڈیرہ دون جا رہے تھے۔ آپ نے گیارہ بجے کے قریب سہارنپور پہنچ کر کھانا کھایا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد مہاراجہ نے سہارنپور سے شکریہ کا تار بھیجا جواب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس تار میں کھانے کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ اس کے بعد مہاراجہ یا مہارانی جب کبھی دہلی سے گذرتے کھانا کھانے کے لئے تار دیتے اور بعد میں جب ملتے تو کھانے کی تعریف کرتے۔ چنانچہ ایک بار میں مہارانی اور بچوں کے لئے جب وہ ولایت سے واپس آ رہے تھے۔ دہلی ریلوے سٹیشن پر کھانا لے کر گیا تو کھانا سرجیمس فٹز پیٹرک ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب نے بھی کھایا جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ سرجیمس نے بھی کھانے کی بہت تعریف کی تھی۔ دہلی کے یہ باورچی اب ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ

Marfat.com

جب کھانا پکوانے والے ہی نہ رہے تو پکانے والے اور یہ فن کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔

میں محلہ گڑھیا میں رہتا تھا۔ تو وہاں میرے پڑوس میں مسلمانوں کا ایک شریف گھرانہ تھا۔ دہلی کے مسلمانوں کے ہاں اڑد کی ایک خاص قسم کی دال پکا کرتی ہے جسے پھریری دال کہتے ہیں۔ یہ دال بیحد لذیذ ہوتی ہے۔ اس گھر میں جب یہ دال پکتی۔ تو گھر کی مالکہ اپنے ملازم کے ہاتھ مجھے یہ دال ضرور بھیجتیں۔ میں نے ایک روز اس خاتون کو کہلا بھیجا کہ میں کسی عورت کا انتظام کرتا ہوں جو پردہ نہ کرتی ہو۔ آپ اس عورت کو دال پکانا سکھا دیجئے، تاکہ وہ مجھے سکھا دے۔ میری اس درخواست پر اس خاتون نے جو جواب دیا وہ یہ تھا، اُس نے کہا:-

"میں دال پکانا اس عورت کو سکھا تو دُوں گی۔ مگر یہ تو اپنا اپنا ہاتھ ہے۔ تمام عورتیں ہی کھانا پکاتی ہیں مگر کوئی لذیذ پکاتی ہے، کوئی بدمزہ۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ عورت یا آپ بھی دال ایسی ہی پکا سکیں گی۔"

اس جواب پر میں نے دال پکانا سیکھنے والی عورت کو بھیجنے کا خیال بدل دیا۔

ہندی زبان کے مشہور شاعر بہاری نے ایک دوہا لکھا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں۔ کہ بغیر عورت کے داخل ہوئے نہ تو باورچی خانہ پوتر (پاک) ہوتا ہے، اور نہ عورت کا ہاتھ لگے بغیر کھانا لذیذ پک سکتا ہے چاہے کوئی مرد باورچی کتنی بھی کوشش کرے۔ چنانچہ بہاری نے ایک جگہ تو عورت کو باورچی خانہ کی توُر بھی لکھا ہے اور کہا ہے کہ اس توُر کے بغیر باورچی خانہ کو برکت اور رونق نصیب نہیں ہو سکتی۔

میں خود بھی کھانا پکا لیتا ہوں۔ اور جو دوست یہ کھانا کھاتے ہیں ہمیشہ تعریف کرتے ہیں، کیونکہ میں نے کھانا پکانا اچھے باورچیوں اور کھانا پکانے والی عورتوں سے سیکھا ہے۔ اور جو دوست شام کو دفتر "ریاست" میں تشریف لا کر ذرّہ نوازی کا ثبوت دیتے ہیں وہ کھانے کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں، چنانچہ حضرت احمق پھپھوندوی جب پھپھوند سے آتے ہیں تو آتے ہی ارشاد ہوتا ہے کہ شام کو دال ضرور پکائی جائے۔ اور دہلی کے ادیب اور مشاعرہ گر مسٹر گن بیر پرشاد ماتھر جب کبھی شام کو تشریف لانے والے ہوں تو آپ اکثر صبح یا دوپہر کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ تاکہ شام کو دال یا سبزی تیار کی جائے۔ حالانکہ ماتھر صاحب کایستھ ہیں۔ اور خوش خوری کے اعتبار سے کایستھوں کو مسلمان ہی سمجھنا چاہئیے۔

کھانے کے متعلق میرا تجربہ یہی ہے کہ جس طرح اخبار کی تیاری کے لئے کاغذ، کتابت، چھپائی، ایڈیٹنگ، چھاپہ خانہ کی سیاہی اور مشین مین وغیرہ، اگر تمام ہی اچھے ہوں، تو اخبار اچھا، دلچسپ اور صاف ستھرا شائع ہو سکتا ہے۔ اور اگر ان میں سے ایک بھی نقص ہو تو تمام کے تمام اخبار کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہی کھانے کے لئے بھی اچھا گھی، اچھی سبزی، اچھا نمک، اچھا کوئلہ اور نیت کا اچھا پکانے والا اور کھلانے والا بھی طبعاً فیاض ہو، تو ہی کھانا لذیذ ہوگا۔ اور اگر ان میں سے ایک میں بھی نقص ہو تو کھانا بدمزہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر عورت کھانا نہ بھی پکائے

Marfat.com

تو بقول مہاں کوی بہارؔی کے عورت صرف کھانے کو ہاتھ ہی لگا دے تو اس کھانے میں لذت پیدا ہو جاتی ہے۔

کتّوں کی وفاشعاری

کتّوں کے پالنے کا مجھے بچپن ہی سے شوق ہے اور اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ میری عمر جب ۱۲ برس کی تھی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے وطن حافظ آباد سے پانچ چھ کوس دُور جلہن کے مقام پر ایک کتیا نے بہت خوب صورت بچے دیئے ہیں۔ تو میں اپنے چند ہم عمر بچوں کے ساتھ اس گاؤں میں کتے کا بچہ لینے چلا گیا۔ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر گیا، اور جب شام تک واپس نہ آیا تو میرے اور اُن ہم عمر بچوں کے گھروں میں ایک کہرام سا پیدا ہو گیا تھا۔ اور سب نے یقین کر لیا کہ یا تو ہم لوگ اغوا کر لئے گئے ہیں یا گھر سے بھاگ نکلے ہیں اور کسی دوسرے شہر کو چلے گئے ہیں۔ مگر جب ہم لوگ واپس آئے تو تمام میرے کتوں کے شوق پر حیران تھے اور مذاق اُڑا رہے تھے۔

بچپن کے اس واقعہ کے بعد میں نے اپنی زندگی کے ہر زمانہ میں کتے رکھے۔ اور میرا یہ یقین ہے کہ کتے کی وفاشعاری کا مقابلہ کوئی دوسرا جانور تو کیا کوئی انسان بھی نہیں کر سکتا۔ اور کتا اپنے مالک کا جتنا وفاشعار ہے، اتنا کوئی مُرید اپنے پیر کا بھی نہیں، کوئی چیلا اپنے گورو کا اور کوئی ملازم اپنے آقا کا وفاشعار نہیں۔ میں جب نابھہ میں تھا تو شملہ کے ایک انگریز سے میں نے سیاہ رنگ کا کرسپینیل بچہ خریدا۔ اُس زمانہ میں اتنی گرانی نہ تھی۔ یہ بچہ میں نے پندرہ روپیہ میں خریدا۔ کیونکہ شملہ میں کتوں کے بچے عام طور پر مل جاتے تھے۔ یہ بچہ میں نابھہ لے آیا اور یہ میرے پاس رہا۔ میں جب مہاراجہ کی معزولی کے بعد گرفتار ہو کر نابھہ کی ایک سرکاری بلڈنگ میں نظر بند کر دیا گیا تو میں آتے ہوئے یہ کتیا اپنے پڑوس کی ایک خاتون کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لئے دے آیا۔ دو تین روز کے بعد میں نے اسے پہرہ والی گارد کا سپاہی بھیج کر اپنے پاس منگا لیا۔ اور میں جب تک نظر بند رہا یہ کتیا میرے پاس رہی۔ اور اس نے میری نظر بندی کے زمانہ میں بھی میرا ساتھ دیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات سے پہلے سردار سرودل سنگھ کولیشر نے نئی دہلی کی ایک میم سے سلکی سڈنی نسل کے تین بہت ہی خوب صورت بچے خریدے۔ یہ میم جنرل آکنلک کمانڈر انچیف افواج ہند کی دوست تھی اور یہ بچے اس میم کی کتیا اور جنرل آکنلک کے کتے دونوں کی مشترکہ اولاد تھی۔ ان تین بچوں میں سے ایک بچہ سردار سرودل سنگھ نے مجھے دے دیا۔ کتوں کی سڈنی سلکی نسل بھی بہت محبت کی نسل ہے۔ یہ کتا جس کا نام راجہ تھا میرے پاس ۱۹۶۵ء تک رہا۔ یہ چند منٹ کے لئے بھی میری جدائی پسند نہ کرتا تھا۔ اگر میں پلنگ پر سو جاؤں تو یہ میرے جوتوں پہ سر رکھ کر سو جاتا تاکہ میں اس کی بے خبری کے عالم میں کہیں چلا نہ

Marfat.com

جاؤں، اور جب جوتے پہن کر جاؤں تو یہ بھی ساتھ جائے۔ میں غسل خانہ میں جاتا تو جب تک غسل خانہ سے باہر واپس نہ آتا باہر دروازہ پر بیٹھا رہتا اور یہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ سے جدا ہونا پسند نہ کرتا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ میں اس زمانہ میں ماسٹر تارا سنگھ کے چلائے گئے ایک مقدمہ میں جب پیشی پر امرتسر جاتا تو یہ باوجود ملازم کی کوشش کے کچھ نہ کھاتا۔ اور دن رات میری چارپائی کے قریب بیٹھا رہتا۔ ایک بار میں دو روز امرتسر رہا، تو اُس نے دو روز اور تین رات کچھ نہ کھایا۔ اور جب واپس پہنچا تو اُس نے کھانا کھایا۔ یہ کتا میرے پاس کئی برس رہا۔ بہت چھوٹے قد کا خوب صورت تھا۔ اور اس کے بال سلک یعنی ریشم کی طرح ملائم اور سفید تھے۔ اس بچہ کو کوئی شخص گلی میں سے اُٹھا کر لے گیا۔ اس کے چوری ہونے کے بعد لے تمام شہر میں تلاش کروایا گیا مگر آج تک نہیں مل سکا۔ اور اس کا اب بھی جب کبھی خیال آتا ہے تو اُس کے گم ہونے کا بے حد افسوس ہوتا ہے۔

چند برس ہوئے میں نے ایک مادہ بچہ السیشین نسل کا خریدا۔ یہ نسل دوسرے تمام قسم کے کتوں سے زیادہ وفا شعار اور خونخوار ہوتی ہے۔ اور یہ اپنے مالک کی تو بہت ہی وفادار ہے، اس کے لئے اپنی جان بھی دے دیتی ہے۔ مگر دوسروں کی بہت دشمن ہے۔ چنانچہ اس قسم کی مثالیں موجود ہیں کہ اس نسل کے کتے کے مالک نے اگر اپنی بیوی کی طرف بھی اشارہ کیا تو اس نے بیوی پر حملہ کر دیا حالانکہ بیوی اس گھر میں کئی برس سے رہتی تھی۔ میرے پاس جو کتیا تھی، اس کا نام بیگم تھا۔ اس بیگم کی موجودگی میں چاہے دروازے کھلے رہیں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص میرے کمروں میں آسکے۔ اس بیگم کے واقعات بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کے مطابق کسی کے گھر میں بغیر آواز یا اطلاع دیئے جانا ایک عام کمزوری ہے۔ اس کمزوری کا جواب یہ بیگم تھی۔ یعنی اگر کوئی شخص میرے مکان میں بغیر اطلاع دیئے داخل ہو گیا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بیگم کے حملہ سے بچ سکے۔ چنانچہ جو لوگ جانتے تھے وہ پہلے اطلاع کرتے اور میں بیگم کو زنجیر سے باندھتا تو پھر وہ محفوظ صورت میں آسکتے۔

یہ بیگم بھنگن کی بہت سخت دشمن تھی۔ بھنگن جب ہر روز صفائی کے لئے آتی اور کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ٹوکرا بھر کر لے جاتی تو یہ بیگم محسوس کرتی کہ یہ ہر روز ہمارے گھر کو لوٹنے کے لئے آتی ہے۔ اس پر لپک پڑتی۔ چنانچہ بھنگن جب آتی تو گلی میں سے ہی آواز دیتی، کہ کتیا کو باندھ لو۔ اس وارننگ پر بیگم کو زنجیر سے باندھ دیا جاتا اور بھنگن صفائی کرتی۔ مگر جب تک کہ بھنگن صفائی کرتی رہتی بیگم زنجیر کو توڑ کر بھی اس پر حملہ کی ناکام کوشش میں مصروف رہتی۔ چنانچہ ایک روز یہ بھنگن بیمار ہو گئی۔ اور اس کی جگہ گھر کی صفائی کرنے کے لئے اس کی کوئی دوسری رشتہ دار بھنگن آئی۔ اس بھنگن کو بیگم کا علم نہ تھا۔ یہ جب صفائی کرنے کے لئے زینہ پر چڑھی تو بیگم اس پر لپک پڑی۔ اور اس کی ٹانگ کو پکڑ لیا۔ دو اینچ کے قریب گہرا زخم آیا۔ اور اس بھنگن کا ہسپتال میں علاج کرانا پڑا۔

جب کوئی نیا ملازم رکھا جاتا تو کوشش کی جاتی کہ اس کے ہاتھوں سے دو چار روز بیگم کو کھانا

Marfat.com

کھلایا جائے تاکہ بیگم میں اس ملازم کے لئے اُنس پیدا ہو۔ اور دو چار روز ملازم کے ہاتھوں سے کھانا کھلانے کے بعد یہ ہوتا کہ بیگم ملازم کو نہ کاٹتی۔ اور جب یہ کھانا کھلاتا تو دُم ہلا کر اظہارِ محبت کرتی۔ مگر یہ ملازم کی وفاشعار کبھی نہ ہوتی۔ چنانچہ ایک ملازم کئی ماہ سے کام کر رہا تھا۔ ایک روز میں اس سے ناراض ہوا، اور اس کو تھپیڑ مارا۔ بیگم پاس بیٹھی تھی میرے تھپیڑ مارنے کو دیکھتے ہی ملازم پر لپک پڑی اور بہت مشکل کے ساتھ ملازم کو بچایا گیا۔

ایک روز دھوبی کپڑے لینے کے لئے آیا۔ کپڑے گنے اور لکھے گئے۔ ہم کئی آدمی تھے اور بیگم بھی پاس ہی خاموش بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ اور جب دھوبی کپڑوں کی گٹھڑی لے جانے لگا تو یہ اس پر لپک پڑی۔ کیونکہ اس نسل کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ کسی کو کوئی شئے گھر سے لے جانے دے۔

سردار بہادر بھگوان سنگھ بیرسٹر اجمیر نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس ایک السیشین (سب سے پہلے یہ نسل جرمنی میں ایک بھیڑیئے اور کتیا کے ملاپ سے پیدا کی گئی تھی۔ اور جرمنی سے یہ نسل ہندوستان لائی گئی) کا کتا تھا۔ گھر کے لوگ جب سینما جاتے تو وہ بچوں کو اس کتے کی حفاظت میں چھوڑ جاتے۔ چنانچہ ایک روز شام کو سردار بھگوان سنگھ واپس گھر آئے۔ گھر کے تمام لوگ سینما گئے ہوئے تھے۔ سردار صاحب کا دو برس کا پوتا چارپائی پر سو رہا تھا۔ اور یہ کتا اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا بچہ کے جسم پر ایک پاؤں رکھے تھا تاکہ کوئی شخص بچہ کو اُٹھا نہ لے جائے۔

السیشین نسل کے کتے اب پولیس کو تفتیش میں بہت اہم خدمات انجام دیتے ہیں اور فوج میں بھی ان کے لئے ایک نیا محکمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس نسل کے کتوں میں سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اگر کوئی قتل ہو تو یہ سونگھ کر جہاں جہاں قاتل گیا ہو اس کا سُراغ لگا لیتے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف کا یہ چشم دید واقعہ ہے، کہ اگر پندرہ بیس منٹ پہلے بلی گھر میں داخل ہوئی، اور داخل ہونے کے بعد چلی گئی تو میری کتیا بیگم اس بلی اس کا سراغ اس راستہ کو سونگھ سونگھ کر لگا لیتی جس راستہ سے کہ بلی گئی۔

بیگم جب تک میرے پاس رہی یہ ممکن نہ تھا کہ رات کو دس گیارہ بجے کے بعد اور صبح تک اگر کوئی شخص گلی میں گذرے اور اس نے گھر کے اندر ہی بیٹھے بھونک کر اس کا خیر مقدم نہ کیا ہو۔ یعنی مجھے سوتے ہوئے علم ہو جاتا تھا کہ گلی میں سے کوئی شخص گذر رہا ہے۔ دو برس ہوئے میری ماموں زاد بہن آئیں تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ بیگم کا ایک بچہ ان کو دیا جائے کیونکہ ان کے بیٹے جو دہلی چھاؤنی کی ایک پلٹن میں کرنل ہیں کی کوٹھی میں چوری ہو گئی ہے۔ ان کے آنے سے پہلے بیگم کے تمام بچے دوستوں میں تقسیم ہو چکے تھے میں انکار نہ کر سکا اور میں نے کہا کہ آپ بیگم کو ہی لے جائیے۔ اگر چوروں کا زیادہ خوف ہو۔ کیونکہ ان کی کوٹھی جنگل میں تھی۔ چنانچہ ان کا بیٹا کرنل کھنہ بیگم کو اپنی کوٹھی لے گیا۔ اب بیگم وہاں ہی رہتی ہے اور ان کا بیان ہے کہ اس کے وہاں پہنچنے کے بعد پہلے ہفتہ ہی پوسٹ ماسٹر کا خط آیا کہ اپنی ڈاک ڈاکخانہ سے منگا لیا کرو کیونکہ کتیا خطوط دینے کے لئے پوسٹمین کو کوٹھی کے اندر جانے نہیں دیتی۔ دودھ دینے والے نے آکر دودھ دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ بیگم اس پر لپک پڑی تھی۔ اور ان کی کوٹھی کا کیا سوال ہے۔ اب بیگم

Marfat.com

پڑوس کی ساتھ والی تین کوٹھیوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اور رات کو کوئی چور تو کیا کوئی سادھو بھی ان کوٹھیوں کے قریب نہیں جا سکتا۔

کتے اور بلی کی فطرت میں بہت بڑا فرق ہے، کتا اپنے مالک کا وفا شعار ہوتا ہے اور بلی اپنے گھر سے اُنس رکھتی ہے۔ یعنی کتے کا مالک گھر میں ہو یا سفر میں یا وہ مکان بدل لے کتا اپنے مالک کو نہیں چھوڑتا۔ یہ اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر بلی کو اپنے مالک سے قطعی محبت نہیں ہوتی۔ اس کو صرف مکان سے اُنس ہوتا ہے یعنی ایک مکان میں رہائش رکھنے کے لئے دس خاندان بدل جائیں بلی وہاں ہی رہے گی۔ مگر کتا اپنے مالک کے ساتھ نقل مکانی کرتا رہے گا۔ بلی کے متعلق بھی ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ کئی برس ہوئے میں ہملٹن روڈ والے مکان میں رہتا تھا اور وہاں ایک بلی بہت "تنگ کرتی تھی۔ میں نے ایک روز فیصلہ کیا کہ اس بلی کو پکڑ کر دور چھوڑنا چاہیئے۔ چنانچہ جب بلی ایک کمرہ میں تھی۔ تو اس کمرے کے دروازے بند کر کے بلی کو پکڑ لیا گیا اور اس کو ایک خالی بوری میں بند کر کے موٹر میں رکھ کر میں اس کو اپنے مکان سے چھ میل دور شہر سے باہر جنگل میں لے گیا۔ وہاں بوری کھول کر اس کو چھوڑ دیا اور کار میں واپس آ گیا۔ میں مطمئن تھا کہ نہ تو بلی کو ہلاک کرنا پڑا اور اس سے چھٹکارا بھی ہو گیا۔ مگر چار روز کے بعد دیکھا کہ وہی بلی پھر واپس گھر میں آ گئی تھی۔ حالانکہ جب میں اس کو لے گیا تو یہ بوری میں بند تھی، اس نے راستہ نہ دیکھا تھا۔ مگر اس میں سونگھنے کی قوت اتنی تیز تھی کہ یہ راستہ کو سونگھ سونگھ کر یہ واپس اپنے گھر آ گئی اور شاید یہ اب بھی اس مکان میں ہی رہتی ہو۔ کیونکہ بلی جب تک زندہ رہے اُسی مکان میں رہتی ہے۔ اور کتا جب تک زندہ رہے اپنے مالک کو نہیں چھوڑتا۔ کتوں کا پالنا بہت مشکل ہے کیونکہ جب ان کا بچپن کا زمانہ ہو تو یہ جگہ جگہ پاخانہ کر دیتے ہیں۔ ان کو سدھانے میں بہت کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ اور ان کی صحت کا خیال کرتے ہوئے ان کو چست و چالاک رکھنے کے لئے دوائی دینی اور ان کو ورزش کرانی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک بیماری ڈسٹیمپر ہو جاتی ہے جس سے یہ ہلاک ہو جاتے ہیں (اس بیماری ڈسٹیمپر کی اب ویکسین تیار ہو گئی ہے جس سے یہ سال بھر اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے)

پھانسی کے منتظر

عام پبلک میں تو بہت ہی کم لوگوں کو پھانسی کے منتظر قیدیوں سے بات چیت کرنے یا پھانسی لگنے یا دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو گا۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" کو پھانسی کے درجنوں منتظر لوگوں سے بات چیت کرنے اور کئی ایک کو پھانسی لگتے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔

سب سے پہلے تو ایڈیٹر "ریاست" نے پھانسی لگتے انسان کو فیروزپور کے جیل میں دیکھا جبکہ اس کی عمر صرف سولہ برس کی تھی اور یہ فیروزپور جیل کے ہسپتال میں ملازم تھا۔ پھانسی لگتے وقت جیل کے ملازموں

Marfat.com

کے علاوہ ایک مجسٹریٹ (جو یہ تصدیق کرتا ہے کہ اس شخص کو فی الحقیقت پھانسی دی گئی) اور ایک اسسٹنٹ سرجن یا سول سرجن (جو یہ تصدیق کرتا ہے کہ پھانسی پانے والے کی جان نکل گئی ہے، اور یہ فی الحقیقت مرچکا ہے) کا ہونا ضروری ہے۔

پھانسی کے متعلق پوزیشن یہ ہے کہ جس روز ملزم کو سیشن جج پھانسی کی سزا کا حکم سنائے اُس روز سے ہی اس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے اور اس کے عدالت سے واپس جیل پہنچتے ہی اس کی بہت احتیاط کے ساتھ تلاشی لی جاتی ہے تاکہ یہ باہر سے اپنے ساتھ کوئی زہر نہ لے جائے اور پھانسی ملنے سے پہلے یہ خودکشی نہ کرے۔ جیل میں پہنچنے کے بعد اس کو دوسرے قیدیوں سے بالکل الگ ایک کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے جو ایسے مجرموں کے لئے بنائی گئی ہیں۔ یہ کوٹھڑیاں پتھر اور سیمنٹ کی پختہ ہوتی ہیں۔ جن میں نہ تو نقب لگائی جا سکتی ہے اور نہ وہاں کوئی شے چھپائی جا سکتی ہے۔ ان کے ہر قیدی کی لازمی طور پر دن میں دو بار یعنی صبح و شام تلاشی لی جاتی ہے۔ کوئی شخص ان کے قریب نہیں جا سکتا، تاکہ یہ کسی سے زہر حاصل نہ کر سکیں۔ رات کو تین تین گھنٹے کے بعد ان کو جگا کر اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ یہ شخص زندہ ہے۔ اور کوٹھڑی کے دروازہ پر دن رات سخت پہرہ رہتا ہے۔ اور پہرہ دینے والا ٹہلتے ہوئے نگرانی کرتا رہتا ہے۔ پھانسی کی اس کوٹھڑی میں ایک مجرم کو کئی کئی ماہ رہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ سیشن جج کے فیصلہ کے بعد اس کی اپیل ہائی کورٹ میں ہوتی ہے اور ہائی کورٹ کے بعد یہ اپنی قسمت کے آخری فیصلہ کے لئے سپریم کورٹ وغیرہ کسی اعلےٰ عدالت کا دروازہ اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جب اس کی اپیل کا آخری فیصلہ ہو جائے تو سزا دینے والی سیشن جج کی عدالت اس کو پھانسی دینے کی تاریخ اور وقت مقرر کرتی ہے۔ اور اسے پھانسی دینے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

جب پھانسی دینے کی تاریخ مقرر ہو جائے تو جیل سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو صبح سورج نکلنے سے پہلے کسی مجسٹریٹ کو بھیجنے کا انتظام کیجئے (پھانسی ہمیشہ سورج نکلتے ہی دی جاتی ہے۔ صرف مرحوم سردار بھگت سنگھ کو شام کے سات بجے پھانسی دی گئی تاکہ رات رات میں ہی ان کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے) اور سول سرجن کو لکھا جاتا ہے کہ تاریخ اور وقت مقررہ پر خود تشریف لائیے یا اسسٹنٹ سرجن کو بھیجئے۔ پھانسی پانے والے کے رشتہ داروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ کو پھانسی دی جائے گی۔ آخری ملاقات کے لئے اس تاریخ سے ایک روز پہلے جیل میں پہنچ جائیے۔ اور پھانسی دینے والے بھنگی (بھنگیوں کا یہ خاندان سال ہا سال سے پھانسی دینے کا کام کرتا ہے۔ اس کو ریلوے کے کرایہ کے علاوہ فی پھانسی کچھ روپیہ بطور الاؤنس ملتا ہے اور جہاں بھی پھانسی ملنی ہو یہ بھنگی ایک روز پہلے پہنچ کر پھانسی دینے کا سامان یعنی رسّہ وغیرہ کو دیکھ لیتا ہے) کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ سے پہلے پہنچ جاؤ۔

پھانسی ملنے کا عذاب تو چند منٹ کا ہوتا ہے۔ مگر پھانسی کے انتظار کا عذاب ناقابلِ بیان اور ناقابلِ

Marfat.com

برداشت ہے جس کو پھانسی ملنے کے عذاب سے ہزار گنا زیادہ تکلیف دہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ پھانسی پانے والے کو ایک ایک منٹ ایک ایک سال کی طرح طویل محسوس ہوتا ہے۔ پھانسی ملنے سے ایک روز پہلے مجرم کے رشتہ دار اور عزیز پہنچ جاتے ہیں۔ عام طور پر سہ پہر کے وقت ان کی ملاقات ہوتی ہے یہ نظارہ بہت ہی دردناک ہوتا ہے کیونکہ پھانسی پانے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اگلے روز یہ اس دنیا میں نہ ہوگا اور رشتہ دار یہ جانتے ہیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اس ملاقات کے بعد یہ صرف اس کی لاش کو ہی حاصل کر سکیں گے اسے زندہ حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ ملاقات کا یہ وقت جو نصف یا ایک گھنٹہ کے قریب ہوتا ہے اسے رونے، چیخنے، چلانے، نصیحت کرنے اور گھر والوں کو آیندہ کے لئے چند ہدائتیں دینے میں صرف ہو جاتا ہے۔ ملاقات کے بعد جب یہ لوگ علیحدہ ہوتے ہیں تو گھر والے اپنے عزیز کو مڑ مڑ کر حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

جس روز پھانسی ملنی ہو اس روز صبح جیل کی تمام بارکوں اور کوٹھڑیوں کے دروازے اور تالے بند رہتے ہیں تاکہ قیدی پھانسی میں رکاوٹ کا باعث نہ ہوں۔ ابھی اندھیرا ہی ہوتا ہے کہ پھانسی والے کی کوٹھڑی میں پانی کا ایک ٹین پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ یہ آخری غسل کر لے۔ غسل کے بعد اس کو سیاہ رنگ کا کرتہ اور پاجامہ پہنا دیا جاتا ہے اور جیل کے سپاہیوں کی ایک گارد اس کو پھانسی گھر تک لے جاتی ہے۔ جہاں کہ جیل کے افسر، سول سرجن یا اسسٹنٹ سرجن اور مجسٹریٹ موجود ہوتے ہیں۔ پھانسی پانے والوں میں شائد پانچ فی صدی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس وقت بغیر کسی سہارے کے خود بخود حوصلہ کے ساتھ کوٹھڑی سے پھانسی گھر تک چل سکتے ہیں۔ ورنہ ان کی حالت نیم مردہ کی سی ہوتی ہے جو چند قدم بھی بغیر سہارے کے چل نہیں سکتے۔ قیدی جب پھانسی گھر میں پہنچے تو اس کو سیاہ رنگ کی لمبی ٹوپی پہنا دی جاتی ہے جس میں اس کا تمام چہرہ بھی گردن تک چھپ جائے اور یہ باہر کی کسی شے کو دیکھ نہ سکے۔ یہ ٹوپ پہنانے کے بعد اس کی گردن میں پھانسی کا رسہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جو اوپر لٹکا ہوتا ہے۔ اس رسہ کے نیچے چند گز زمین گہری کھدی ہوتی ہے اور اس پر لوہے کے تختے لگے ہوتے ہیں جہاں کہ مجرم کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جب اس کے گلے میں رسہ باندھ کر اسے تختوں پر کھڑا کر دیا جائے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کہتا ہے:۔

"فلاں ولد فلاں ساکن فلاں بحکم سیشن جج مورخہ فلاں تم کو پھانسی دی جاتی ہے"

یہ سنتے ہی پھانسی دینے والا بھنگی جو رسہ گلے میں باندھتا ہے لوہے کے تختوں کو نیچے گرا دیتا ہے اور پھانسی پانے والے کی گردن رسہ کے ساتھ لٹک جاتی ہے۔ جب گردن لٹکتی ہے تو پھانسی پانے والے کا جسم تڑپتا ہے اور بھنگی نیچے جا کر مجرم کی ٹانگوں کو کھینچتا ہے تاکہ گردن میں رسہ اچھی طرح سے کسا جائے اور سانس آ اور جا نہ سکے۔ مجرم نصف گھنٹہ کے قریب لٹکتا رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گلے کا رسہ کھول کر اس کی لاش کو چارپائی پر لٹا دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر جو وہاں منتظر کھڑا رہتا ہے اس کی نبض وغیرہ کو دیکھ کر تصدیق کرتا ہے کہ مجرم مر گیا ہے اور اس میں زندگی باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد

Marfat.com

لاش والی چارپائی کو چار قیدی اٹھا کر جیل سے باہر لاتے ہیں۔ اگر تو پھانسی پانے والے کے رشتہ دار موجود ہوں تو لاش ان کے حوالہ کر دی جاتی ہے اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو یہ قیدی ہی ایک وارڈر کے ساتھ لاش کو مرگھٹ یا قبرستان میں لے جاتے ہیں۔

پھانسی کے امیدوار قیدیوں سے دوسرے عام قیدیوں کو ملنے یا بات چیت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مگر میں جس جیل میں رہا وہاں کے افسر میرا بہت ہی لحاظ رکھتے تھے۔ اس لحاظ کی وجہ چاہے تو یہ تھی کہ وہ میرے اخلاص، میری پبلک خدمت اور میری والیانِ ریاست کے ساتھ مقدمہ بازی سے متاثر تھے یا یہ خوف زدہ تھے کہ رہا ہونے کے بعد میں ان کو بے نقاب کروں گا اور ان کے لئے مصائب پیدا ہوں گی۔ بہرحال جیلوں میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کبھی کسی خواہش کا اظہار کیا ہو اور جیل کے افسروں نے خندہ پیشانی کے ساتھ اُسے پورا نہ کیا۔ میں نے دہلی جیل کے افسروں سے خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے پھانسی کی کوٹھڑیوں میں مجرموں سے ملنے اور بات چیت کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکوں۔ تو ان افسروں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دے دیا تھا کہ میں جب بھی چاہوں ان قیدیوں سے بات چیت کر سکوں۔ چنانچہ میں جب تک دہلی جیل میں رہا پھانسی کے منتظر قیدیوں سے اکثر مل کر باتیں کیا کرتا۔

سبزی منڈی دہلی کے ایک غنڈے کو چھرے کے ساتھ ایک دوسرے کے ہلاک کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ غنڈہ تمام سبزی منڈی کے غنڈوں میں ایک اہم شخصیت تھا۔ اس کی بیوی اور ایک چھوٹی سی تین برس کی بچی اس سے آخری ملاقات کے لئے پھانسی سے ایک روز پہلے جیل میں آئیں۔ جب ملاقات شروع ہوئی تو میں بھی وہاں پہنچ گیا اور غور کے ساتھ ان کی باتوں کو سنتا رہا۔ بیوی تو روتی اور چیختی ہوئی یہی کہتی رہی کہ آئندہ کیا کروں گی۔ بچی کی پرورش کیسے ہوگی۔ اور زندگی کیسے گذرے گی۔ غنڈہ (جو اس سے پہلے جیل میں بھی اپنے غنڈہ پن کی دھاک بٹھائے ہوئے ڈینگیں مارا کرتا تھا اور اپنے آپ کو پھانسی سے بھی بے نیاز سمجھتا تھا) جواب میں حوصلہ دیتا رہا مگر اس کی زبان صاف نہ چلتی تھی، اور اس میں لغزش سی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ پر پھانسی کا بہت بڑا اثر ہے۔ اور یہ موت سے خوف زدہ ہے۔ میں نے جب اس کی زبان کی یہ کیفیت دیکھی اور محسوس کیا کہ یہ اچھی طرح سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ تو میں نے مزید کریدنے کے لئے اس سے کہا" تم حوصلہ کرو، گھبراؤ نہیں، مردوں کی طرح موت کا مقابلہ کرو"۔ اس کے جواب میں بھی اس کی زبان اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی اور اس نے جواب دیا " سردار جی! میں۔ میں۔ میں حوصلہ میں۔ حوصلہ میں ہوں۔ میں۔ میں۔ گھبراتا۔ گھبراتا نہیں"۔ یعنی یہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ حوصلہ میں ہوں اور گھبرا نہیں رہا۔ مگر موت کے خوف کے باعث اس کے منہ سے صاف الفاظ بھی نہ نکلتے تھے۔ اگلے روز جب یہ غنڈہ پھانسی گھر لے جایا جا رہا تھا تو اس سے قدم نہ اٹھتا تھا اور جیل کے وارڈر اس کو سہارا دے کر لے جا رہے تھے۔

Marfat.com

پشاور کا ایک غنڈہ دہلی میں مقیم تھا۔ اس نے عشق و محبت کی راہ میں اپنی داشتہ طوائف کے ایکدوسرے آشنا کو قتل کر دیا تھا۔ پھانسی سے ایک روز پہلے اس کا کوئی دوست، عزیز یا رشتہ دار اس کی ملاقات کے لئے نہ پہنچا۔ اور جیل والوں نے جب پوچھا کہ تم کوئی وصیّت کرنا چاہتے ہو تو لکھا دو۔ تو اس نے جو وصیّت کی وہ یہ تھی کہ جب اس کو دفن کیا جائے تو اس کے بالوں کو (جو گردن تک خوب صورت پٹوں کی صورت میں تھے) سنوار کر دفن کیا جائے، اور اس کی لاش کو پشاور لے جا کر دفن کی جائے اس کا کوئی وارث ہی موجود نہ تھا۔ اس کی لاشس کو کون پشاور لے جاتا۔ جیل کے قریب ہی کے قبرستان میں اس کی لاش دفن کر دی گئی۔ اور بالوں کے متعلق اس کی آخری وصیّت اور خواہش کو سُن کر میں حیران تھا کہ انسان قبر کے متعلق بھی کس قدر غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ مٹی اور کیڑوں کے اثرات سے اس کی لاش ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اور اس کے بالوں کی تعریف کرنے والے قبر میں بھی موجود ہوں گے۔

جس نوجوان نے مولوی مظہر الدین ایڈیٹر "الامان" کو قتل کیا تھا میں اس سے اکثر ملا کرتا تھا۔ یہ لڑکا بہت خوب صورت تھا۔ اور اس کی عمر بائیس تیئس برس کی ہوگی۔ یہ لڑکا کانگریسیوں کی صحبت میں رہتا تھا اور مولوی مظہر الدین بہت ہی کٹر قسم کے مسلم لیگی تھے۔ اپنے اخبار میں ہر روز کانگرس اور کانگریسیوں کے خلاف لکھتے اور اس نوجوان کا مقصد مولوی مظہر الدین کو قتل کرنا نہ تھا بلکہ ان کی ناک کاٹنا تھا اور یہ اس ارادہ سے ہی ایک دوسرے شخص کے ساتھ دفتر "الامان" میں گیا تھا۔ مگر حملہ کے وقت چونکہ مولوی مظہر الدین اپنی کرُسی سے مقابلہ کے لئے اُٹھے اور انہوں نے حملہ آور کو گرفتار کرنا چاہا تو حملہ آور نے اس کشمکش میں ہی مولوی صاحب کے سینہ میں چاقو مارا جس کے باعث وہ ہلاک ہو گئے۔

میں اس نوجوان سے جب بھی ملتا تو یہ نوجوان مجھ سے سوال کرتا کہ پبلک کا اس کے متعلق کیا خیال ہے میں اس نوجوان کی دِلداری کے لئے جب یہ کہتا کہ لوگ اس کے فعل کی بہت تعریف کرتے ہیں اور اس کو بہادر سمجھتے ہیں تو اس کا چہرہ پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی خوشی کے ساتھ سرخ ہو جاتا یعنی شہرت کا خیال اس کے لئے پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی مسرّت اور اطمینان کا باعث تھا۔

اس نوجوان کے پھانسی ملنے کے ایک روز پہلے جب اس کے گھر کے لوگ اس سے ملنے کے لئے آئے تو میں وہاں موجود تھا۔ اور میں اس منظر کو زندگی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کی ماں کی عمر ۴۰ برس کے قریب ہوگی۔ جب یہ آخری ملاقات کے لئے جیل میں آئی تو نیم پاگل سی تھی۔ یہ برقعہ پہنے ہوئے تھی مگر اس میں برقعہ کو سنبھالنے کا احساس ہی نہ تھا۔ اور یہ برقعہ کو چہرے پر سے اٹھائے جیل کی بارکوں کو پاگلوں کی طرح دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ جب یہ اپنے اکلوتے، نوجوان اور خوب صورت بچے سے آخری ملاقات کر رہی تھی تو اس کے حواس اس کے قابو میں نہ تھے۔ اور شدّت غم کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور یہ قطعی خاموش اور گم سم اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔ اس کا باپ بیٹے سے باتیں کرتا رہا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ماں کے مقابلہ پر باپ کم غم زدہ ہے یا باپ کچھ حوصلہ میں ہے

Marfat.com

جب تک ملاقات جاری رہی ماں گم سم بیٹھی اپنے بچہ کو دیکھتی رہی۔ بچہ روتا رہا، باپ بچہ کو حوصلہ دیتا رہا اور چھوٹی بچیاں اپنے بھائی کو روتا دیکھ کر رو رہی تھیں۔ جب اس نوجوان کی ماں ملاقات کے بعد جیل سے باہر جا رہی تھی تو اس وقت بھی یہ پاگلوں کی طرح جیل کی بارکوں کو دیکھتی جاتی تھی۔ اس نوجوان نے ملاقات کے وقت اپنی جن آخری خواہشات کا اظہار کیا ان میں ایک یہ بھی خواہش تھی کہ اس کی نماز جنازہ جامع مسجد میں پڑھی جائے۔ اور چونکہ اس کے جنازہ کے ساتھ کانگرسی مسلمان اور دوسرے لوگ کثرت کے ساتھ ہوں گے، اس کے جنازہ کو بانس باندھ دیئے جائیں تاکہ زیادہ لوگ اس کے جنازہ کو کندھا دے سکیں۔ چنانچہ جنازہ کی نماز تو جامع مسجد میں پڑھی گئی مگر شائد ایک کانگریسی مسلمان بھی اس غریب کے جنازہ کے ساتھ شامل نہ ہوا۔ اور جنازہ کے بانس باندھنے کے بعد کھول دینے پڑے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان فطرتاً یہ چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اسے اچھی شہرت نصیب ہو۔

ایک نوجوان ہندوستانی عیسائی جس کا نام غالباً ڈلفس تھا کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ شخص نئی دہلی کے ایک گرجا میں بطور چپڑاسی ملازم تھا۔ گرجا کے قریب سرکاری کوارٹروں میں سے سکھوں کا ایک خوب صورت بچہ گرجا کے باہر کی چھوٹی سی دیوار کو پھاند کر پھول توڑنے کے لئے گرجا کی باغیچی میں داخل ہوا، تو اس ڈلفس نے بچہ کو پکڑ لیا اور اپنے کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اس نے بچہ کے ساتھ خلاف وضع فطری کی۔ اور جب بچہ نے شور پیدا کیا تو اس نے گرفتار ہونے کے خوف سے بچہ کو ہلاک کر دیا۔ کچھ عرصہ بچہ کے والدین بچہ کو تلاش کرتے رہے، بچہ نہ ملا۔ آخر جب کسی نے بتایا کہ بچہ پھول توڑنے کے لئے گرجا کی حدود میں دیوار پھاند کر گیا تھا۔ تو گرجا میں تلاش شروع ہوئی۔ اور بچہ کی لاش چپڑاسی کے گھر سے ملی اور ڈلفس گرفتار ہوا۔ اس گرفتاری کے صدمہ کا اثر ڈلفس کے دماغ پر ہوا، اور جب میں اس سے باتیں کرتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ یہ پچھتر فی صدی پاگل ہے۔ اس پاگل پن کے باعث ڈلفس دنیا کے تفکرات سے قطعی بے نیاز تھا۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی خوش رہتا۔ میں جب اس سے باتیں کرتا تو یہ مسکراتا، اور میں مقدمہ کا ذکر کرتا تو یہ جواب دیتا کہ رات کو حضرت مسیح تشریف لائے تھے اور وہ کہتے تھے کہ مقدمہ میں بری ہو جائے گا۔ ڈلفس جب پھانسی کی کوٹھڑی سے پھانسی گھر کو جا رہا تھا تو اس وقت بھی اس کے چہرے پر کوئی تشویش یا فکر کے اثرات نہ تھے۔ یہ مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اور تمام لوگ محسوس کرتے تھے کہ بے چارہ پاگل ہے۔ مگر میں سوچتا تھا کہ پاگل پن بھی خدا کی ایک نعمت ہے جس کے باعث انسان دنیا کے تفکرات بلکہ موت کے خوف سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔

پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند پھانسی کے منتظر قیدیوں سے ملاقات کر کے سائیکالوجی کا ایک طالب علم بہت کافی مواد حاصل کر سکتا ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا اور یقیناً یہ ملاقاتیں ناقابلِ فراموش ہوتی ہیں۔

Marfat.com

گناہوں کی سزا اِسی جنم میں

اگر کبھی متحدہ پنجاب کے جیلوں کی تاریخ لکھی گئی تو اس تاریخ میں ایک داروغہ جیل جن کا نام غالباً رائے صاحب لالہ رام دتہ مل تھا بہت اہم پوزیشن حاصل کریں گے۔ ان لالہ رام دتہ مل نے قیدیوں کو "ڈسپلن" میں رکھنے کے اعتبار سے جیلوں میں جو مظالم کیئے اس کی تاریخ دنیا کے کسی ملک میں نہیں مل سکتی۔ اس زمانہ میں عادی مجرموں کے لئے جیل میں لوہے کے پنجرے ہوا کرتے، جن میں یہ رات کو بند کر دیئے جاتے۔ یہ پنجرے ساڑھے چھ فٹ چوڑے اور پانچ فٹ اونچے تھے۔ یہ پنجرے بارک کے اندر ایک لائن میں ہوا کرتے اور جب تمام قیدی ان میں داخل کر دیئے جاتے تو ان تمام کو ایک ہی زنجیر میں باندھ کر تالا لگا دیا جاتا جس کا مقصد یہ تھا کہ جب تک تالا کھولنے کے بعد تمام زنجیر کو نہ نکالا جائے۔ کسی ایک پنجرے کا کھلنا ممکن نہ تھا۔ اس پنجرے کے اندر ایک پینے کے لئے پانی کا برتن اور دوسری طرف پاخانہ اور پیشاب کے لئے ایک برتن ہوتا تاکہ رات کو اگر قیدیوں کو پاخانہ یا پیشاب کی حاجت یا پانی کی ضرورت ہو تو ان کو پنجرے سے نکالنے کی ضرورت نہ پڑے۔ راقم الحروف نے یہ پنجرے فیروزپور جیل میں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، جب اس کی عمر سولہ برس کی تھی اور یہ اس جیل میں ملازم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان پنجروں کو انسانوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ بنانے کے ذمہ دار بھی لالہ رام دتہ مل تھے۔ اور آج جیلوں کی چار دیواری کے اندر جو پتر اسسٹم (یعنی پہرہ دینے والے کا ہر وقت دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے رہنا) موجود ہے۔ یہ بھی ان رام دتہ مل کی ایجاد ہے اور ہمارے ایک دوست کے بیان کے مطابق اس زمانہ میں جب کوئی قیدی زیادہ ہی شرارت کرتا تو لالہ رام دتہ مل کے حکم سے اس قیدی کو جلتے ہوئے تنور (اب جیلوں میں تنور موجود نہیں۔ اب روٹی توے پر پکائی جاتی ہے مگر اُس زمانہ میں روٹیاں پکانے کے لئے بڑے بڑے تنور ہوا کرتے تھے) میں ڈال دیا جاتا اور سرکاری کاغذات میں لکھا جاتا کہ قیدی اس تنور میں اتفاق سے گر گیا ہے۔

یہ رام دتہ مل جب جیل محکمہ میں ملازم تھے تو گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے عہدہ کے لئے ڈائریکٹ بھرتی کیا جائے۔ اس سے پہلے ہر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یعنی داروغہ کو ایک اسسٹنٹ سے ترقی کر کے بیس پچیس برس کے بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر پہنچنا ہوتا تھا گورنمنٹ نے جب ڈائریکٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھرتی کرنے کا اعلان کیا، اور اس سکیم پر عمل کیا گیا تو پہلے بیچ میں جو نوجوان بھرتی کئے گئے ان میں لالہ رام دتہ مل کے ایک صاحبزادے مسٹر چمن لال بھی تھے۔ جنہوں نے ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ مسٹر چمن لال کے قد کا انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ سات فٹ کے قریب قد، معمولی انسان سے دوگنا بلکہ سہ گنا زیادہ وزن۔ بہت موٹے موٹے ہونٹ اور کان۔ اور جسم کے دوسرے اعضا بھی معمولی انسانوں سے دوگنا موٹے اور ہیبت ناک شکل

Marfat.com

جس سے خوف محسوس ہو۔ مسٹر چمن لال جب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل مقرر ہوئے تو ان کی تقرری سب سے پہلے اولڈ سنٹرل جیل ملتان میں ہوئی۔ جہاں کہ اس زمانہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر ایک بہت ہی نیک دل اور خدا ترس میجر حبیب اللہ شاہ تھے۔ میجر شاہ پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ اور مذہبی اعتبار سے قادیانی کے احمدی اور احمدیوں کے موجودہ پیشوا کے قریبی رشتہ دار۔ آپ کو ولایت کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور ان کے گھر میں بھی یورپین بیوی تھیں۔ مگر نیکی، پارسائی، نماز اور روزہ کے اعتبار سے آپ ایک پکے مسلمان تھے۔

مسٹر چمن لال کو ملازم ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ کانگریس کی تحریک شروع ہوئی اور سینکڑوں کی تعداد میں کانگریسی قید ہو کر ملتان جیل میں آ گئے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی اپنے جوبن پر تھی۔ کانگریسی قیدیوں کو جو رضائیاں اوڑھنے کے لئے دی گئیں ان میں ایک تو روئی کم تھی (جس کی وجہ غالباً رضائیاں تیار کرنے والے ٹھیکے داروں کی کفائیت شعاری اور رضائیاں تیار کرانے والے جیل کے بعض افسروں کی بے ایمانی اور بد دیانتی تھی) اور دوسرے ان کی لمبائی اور چوڑائی کم تھی۔ جیل کے نیک دل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر میجر شاہ جب ان کانگریسی قیدیوں کو دیکھنے کے لئے ان کے وارڈ میں گئے تو ایک کانگریسی قیدی نے سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کی کہ جو رضائی اس کو دی گئی ہے اس میں روئی کم ہے اور لمبائی میں بھی یہ چھوٹی ہے۔ یہ رضائی رات کو سردی سے اسے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اس شکایت کو سن کر سپرنٹنڈنٹ نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر چمن لال کی طرف دیکھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ روئی اور لمبائی کم کیوں ہے۔ جب میجر شاہ نے مسٹر چمن لال کو اس طرح دیکھا۔ تو مسٹر چمن لال جو خاندانی اعتبار سے انگریزوں کے پروردہ تھے نے فوراً جواب دیا "جناب یہ کانگرسی بدمعاش ہے! اور جھوٹی شکایت کرتا ہے"۔ میجر شاہ نے جب یہ جواب سنا تو انہوں نے اس جواب کو تکلیف کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ جانتے تھے کہ کانگریسی کسی اپنی ذاتی غرض یا جرم کے باعث جیل میں نہیں آئے۔ مگر چونکہ مسٹر چمن لال انگریزوں کے خاندانی گرگے تھے۔ میجر شاہ نے صرف یہ حکم دیا کہ یہ رضائی بدل دی جائے۔ اس کے علاوہ آپ مسٹر چمن لال سے کچھ نہ کہہ سکے۔

مسٹر چمن لال کو اولڈ سنٹرل جیل ملتان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ وہاں سکھ قیدیوں کی دو پارٹیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مسٹر چمن لال بچپن سے ہی باپ دادوں سے جیل کے "ڈسپلنری ایکشن" کی داستانیں سنتے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے آئے تھے۔ آپ نے سکھ قیدیوں کی ان دونوں پارٹیوں کے دو سرکردہ لیڈروں کے لئے حکم دیا کہ ان کو لاٹھیوں سے زدو کوب کر کے ان کو الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جائے، اور ان کو رات کو اوڑھنے کے لئے کپڑا نہ دیا جائے۔ چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق پہلے تو دونوں پارٹیوں کے دونوں لیڈروں کو لاٹھیوں سے "ٹھکس" کی گئی اور پھر ان کو دو کوٹھڑیوں میں الگ الگ بند کر دیا گیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور پھر ملتان کی خشک سردی اپنے جوبن پر تھی۔ رات بھر کسی نے ان دونوں قیدیوں کی حالت کو نہ دیکھا۔ صبح جب کوٹھڑیوں کے دروازے

Marfat.com

کھولے گئے تو پتہ چلا کہ دونوں قیدیوں کی کئی کئی جگہ سے لاٹھیوں کے باعث ہڈیاں ٹوٹی ہیں اور ان میں سے ایک قیدی رات کی سردی کے باعث نمونیہ کا شکار ہو کر مر چکا ہے۔

اس موت کی اطلاع صبح ہی میجر شاہ کو ان کی کوٹھی پر پہنچائی گئی۔ وہ فوراً موقع پر پہنچے۔ مسٹر چمن لال نے چاہا کہ اس معاملہ کو بھی اس طرح ہی "ہش اپ" کر دیا جائے جس طرح ان کے باپ قیدیوں کو جلتے تنور میں ڈالا کرتے تھے۔ مگر میجر شاہ نیک دل اور انصاف پسند شخصیت تھے۔ آپ نے مرنے والے قیدی کی لاش کو تو پوسٹ مارٹم کے لئے سول سرجن کے پاس سول ہسپتال بھیجا اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کو واقعہ کے متعلق تفصیلی تار دیا۔ چنانچہ سول سرجن نے تو پوسٹ مارٹم میں قرار دیا کہ مقتول کی کئی جگہ سے ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں جو ضربات کا نتیجہ ہیں اور انسپکٹر جنرل اگلے روز تحقیقات کے لئے لاہور سے ملتان پہنچ گئے۔ معاملہ پولیس کے سپرد کیا گیا۔ اور پولیس نے لاٹھیاں مارنے والے جیل کے ملازموں کے علاوہ مسٹر چمن لال کو بھی زیر دفعہ ۳۲۵ تعزیرات ہند (کسی کو لاٹھیوں سے ضرب شدید پہنچانا) گرفتار کر لیا۔ اور مقدمہ عدالت میں گیا۔

اس مقدمہ میں مسٹر چمن لال کو مجسٹریٹ نے دو سال قید سخت کی سزا دی۔ مسٹر چمن لال نے سیشن کورٹ میں اپیل کی تو سیشن جج نے یہ سزا چھ ماہ رہنے دی۔ سیشن جج کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر چمن لال نے ہائیکورٹ میں اپیل کی۔ تو یہ مقدمہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ کے سامنے پیش ہوا۔ سر ڈگلس نے جب مسل میں تمام واقعات کو پڑھا تو آپ نے محسوس کیا کہ مقتول کے ساتھ جیل میں ظلم ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مقدمہ کا فیصلہ بہت سخت الفاظ میں لکھتے ہوئے ملزم کو پانچ سال قید سخت کی سزا (جو اس دفعہ کے مطابق زیادہ سے زیادہ دی جا سکتی تھی) دی اور لکھا کہ اگر ہائیکورٹ کے اختیار میں ہوتا تو آپ دفعہ ۳۲۵ (ضرب شدید کسی کند آلہ سے) کو دفعہ ۳۰۲ (قتل) کی صورت میں بدل کر ملزم کو موت کی سزا دیتے مگر چونکہ ہائی کورٹ قانوناً دفعہ کو تبدیل نہیں کر سکتی اس لئے دفعہ ۳۲۵ کے مطابق زیادہ سے زیادہ یعنی پانچ سال کی سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ مسٹر چمن لال پانچ سال کی سزا کا سرٹیفکیٹ لے کر لاہور سنٹرل جیل میں تشریف لے آئے۔

ایڈیٹر "ریاست" جب سنٹرل جیل میں گیا تو مسٹر چمن لال وہاں موجود تھے اور اتفاق کی بات ہے کہ جس سپیشل وارڈ میں یہ رہتے تھے اسی سپیشل وارڈ میں ایڈیٹر "ریاست" کو جگہ دی گئی۔ اور مسٹر چمن لال سے دن رات باتیں کرنے کا اتفاق ہوتا۔ اس زمانہ میں سنٹرل جیل لاہور کے سپرنٹنڈنٹ وہی ڈاکٹر میجر شاہ تھے جو ملتان میں مسٹر چمن لال کے افسر تھے۔ یعنی ملتان میں تو میجر شاہ سپرنٹنڈنٹ تھے اور مسٹر چمن لال ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ۔ اور اب لاہور میں میجر شاہ سپرنٹنڈنٹ ہیں اور مسٹر چمن لال قیدی۔

ایک روز سردیوں کا زمانہ تھا اور سردی اپنے جوبن پر تھی۔ میجر شاہ ہمارے وارڈ میں قیدیوں کو دیکھنے کے لئے آئے۔ مسٹر چمن لال نے میجر شاہ سے درخواست کی کہ جناب سردی بہت سخت ہے میرا قد لمبا ہے اور جو رضائی گئی ہے اس میں روئی کم ہے اور لمبائی چوڑائی بھی کافی نہیں۔ رات کو مجھے

Marfat.com

سردی بہت محسوس ہوتی ہے اور نیند نہیں آتی ۔ مہربانی فرما کر میرے لئے زیادہ روئی کی لمبی رضائی کا حکم دیا جائے ؛؛ میجر شاہ نے مسٹر چمن لال سے جب یہ الفاظ سنے تو آپ کو ملتان کے کانگریسی قیدی کی رضائی کا واقعہ یاد آ گیا ۔ آپ نے فوراً جواب دیا ؛؛ مسٹر چمن لال تمہیں یاد ہے کہ ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں ایک کانگریسی قیدی نے شکایت کی تھی کہ اس کی رضائی میں روئی کم ہے اور لمبائی بھی کم ہونے کے باعث اس کو سردی محسوس ہوتی ہے تو تم نے کہا تھا کہ یہ قیدی بدمعاش ہے اور جھوٹ بولتا ہے ۔ میں اب تمہاری اس درخواست پر کہتا ہوں کہ تم بدمعاش ہو اور جھوٹ بولتے ہو؛؛ یہ کہہ کر میجر شاہ آگے چل دیئے اور مسٹر چمن لال کی نگاہیں شرم کے باعث زمین کی طرف جھک گئیں ۔

مجھے معلوم نہیں کہ مسٹر چمن لال اب کہاں ہیں ۔ چند برس ہوئے ایک روز دفتر ؛؛ ریاست ؛؛ میں آئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کو کسی جگہ ملازم کرا دیا جائے ۔ مگر میں ان کی اس خواہش کو پورا نہ کر سکا سُنا تھا کہ آجکل مشرقی پنجاب میں کسی جگہ انشورنس کے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں ۔ خدا کرے کہ ان کے گناہ معاف ہوں اور ان کی آئندہ زندگی آرام سے گزرے ۔

یتیم ہونا بھی ایک نعمت ہے

مرحوم خان بہادر قاضی سر عزیز الدین احمد وزیر دتیا کے حقیقی بھائی خان بہادر قاضی خلیل الدین احمد کی پہلی بیوی کے بطن سے جب بچہ پیدا ہوا تو یہ بیوی بچہ پیدا ہونے کے چند روز بعد انتقال کر گئیں ۔ بچہ چند روز کا تھا اور یہ سوال درپیش تھا کہ خاندان میں کون عورت اس بچہ کی پرورش کرے ۔ کیونکہ عام طور پر بچہ کے اپنی ماں سے محروم ہونے کی صورت میں یا تو بچہ کی پرورش نانی کرتی ہے یا دادی ۔

قاضی سر عزیز الدین احمد اور ان کے بھائی خان بہادر قاضی خلیل الدین احمد دونوں یو۔پی کی پراونشل سول سروس میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور انگریزوں کے حلقہ میں ان دونوں بھائیوں کے اخلاص کا بہت گہرا اثر تھا اور اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر بہت کم ہندوستانی ایسے ہوں گے جن کا حلقہ احباب انگریزوں میں قاضی سر عزیز الدین احمد سے زیادہ وسیع ہو ۔ چنانچہ آپ ہر سال ایک ہزار سے زیادہ کرسمس کارڈ تو انگریز دوستوں کو انگلستان وغیرہ غیر ممالک میں بھیجتے ۔ قاضی خلیل الدین احمد کی بیوی کے انتقال کی خبر جب لکھنؤ کے انگریزوں کے حلقہ میں پہنچی ۔ تو یہ لوگ اظہار افسوس کے لئے قاضی صاحب کے ہاں پہنچے ۔ ان انگریزوں میں ایک صاحب انڈین سول سروس کے ممبر بھی تھے ۔ جو یو۔پی کے پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدہ پر تھے ۔ ان پوسٹ ماسٹر جنرل کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا ۔ ان کی بیوی نے جب قاضی خلیل الدین احمد کے چند روزہ کے بچہ کو دیکھا تو آپ نے قاضی سر عزیز الدین احمد سے خواہش کی ۔ کہ یہ بچہ اس خاتون کو پرورش کے لیے دے دیا جائے ....

Marfat.com

چنانچہ قاضی صاحب اور ان کے بھائی اس پر آمادہ ہو گئے اور چند روز کا یہ بچہ جس کا نام وارث الدین احمد رکھا جا چکا تھا اس خاتون کو پرورش کے لئے دے دیا گیا۔

ایڈیٹر "ریاست" کے قاضی سر عزیز الدین احمد اور ان کے بھائی خان بہادر قاضی خلیل الدین احمد دونوں کے ساتھ گھرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" ان کے گھریلو معاملات سے بھی واقف تھا اور گو وارث الدین سے کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہؤا تھا مگر راقم الحروف کو اس بچہ کی پرورش کے تمام واقعات کا علم تھا۔ چنانچہ اخبار "ریاست" کو جاری ہوئے چند برس ہوئے تھے کہ ایڈیٹر "ریاست" کو لکھنؤ جانے اور وہاں دو دن قیام کرنے کا اتفاق ہؤا۔ ان دو دِنوں میں دوستوں سے ملنے کے علاوہ یہ خواہش بھی تھی کہ وارث الدین کو بھی دیکھوں۔ جن کی عمر اس وقت سولہ سترہ برس کی تھی اور چونکہ پوسٹ ماسٹر جنرل ریٹائر ہونے کے بعد لکھنؤ میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ ان کی بیوی وارث الدین کے ساتھ لکھنؤ کی ایک کوٹھی میں مستقل طور پر مقیم تھیں اور انہوں نے واپس اپنے وطن انگلستان جانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔

صبح نو بجے کا وقت ہوگا۔ میں اس سڑک کو جہاں کہ اس خاتون کی کوٹھی تھی، دریافت کرتے اس کوٹھی میں پہنچا۔ نہ تو میں نے اس سے پہلے کبھی وارث کو دیکھا تھا نہ وارث نے مجھے، مگر ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے کیونکہ قاضی خلیل الدین احمد نے بارہا اپنے بیٹے کا مجھ سے اور میرا اپنے بیٹے سے ذکر کیا تھا۔ میں جب اس خاتون کی کوٹھی پہنچا تو دیکھا کہ ایک معمر بوڑھی یورپین خاتون کوٹھی کے برآمدہ میں صوفہ پر بیٹھی سویٹر وغیرہ کچھ بُن رہی ہیں اور ان کے زانوؤں پر سر رکھے ایک سولہ سترہ برس کا بچہ اس طرح لیٹا ہے جیسا وہ اپنی ماں سے محبت کی باتیں کر رہا ہو۔ میں جب برآمدہ کے قریب پہنچا تو میں نے اس خاتون سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا یہ مکان مسز ـــــ کا ہے (میں اب اس خاتون کے شوہر کا نام بھول چکا ہوں۔ اُس وقت مجھے یاد تھا) اس خاتون نے جواب دیا۔ ہاں۔ میں نے کہا کہ میں وارث سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں دہلی سے آیا ہوں اور میرا نام دیوان سنگھ ہے۔ میرے اس جواب کو سن کر وارث مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ دونوں نہایت اخلاص اور تپاک سے مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ چائے پینے کے لئے کہا مگر میں چائے مسٹر رنگا ایڈیٹر "انڈین ڈیلی ٹیلیگراف" (جہاں کہ میں مقیم تھا) کے ہاں پی کر گیا تھا۔ نصف گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں۔ میرے دل پر اس خاتون کے اخلاص کا بہت بڑا اثر تھا۔ اور میں اب تک محبت کے ان اثرات کو بھول نہیں سکا جو وارث اور اُن کی گاڈ مدر کو دیکھ کر میرے ذہن پر ہوئے۔ باتیں تو مختلف ہوتی رہی مگر مجھے اب تک یاد ہے میں نے اس خاتون سے کہا تھا کہ دنیا کے قریب قریب تمام پیغمبر اور بڑے خوش نصیب لوگ یتیم تھے۔ اور وارث بھی یقیناً خوش نصیب ہے جس کو آپ جیسی محبت کرنے والی مخلص ماں نصیب ہوئی۔ میرے ان الفاظ کو سن کر اس خاتون کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں اور یہ کچھ کہہ نہ سکی تھیں۔

اس واقعہ کے عرصہ بعد یہ خاتون بیمار ہو گئیں۔ کافی ضعیف تھیں۔ اس خاتون کے بھائی اور شوہر

Marfat.com

کے کچھ عزیز انگلستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی تھے اور ان سب کو علم تھا کہ اس خاتون نے ایک وصیت کی ہے اور یہ وصیت لکھنؤ کے ایک بنک میں محفوظ رکھی ہے جو اس کے مرنے کے بعد کھُلے گی۔ اس بیماری میں خاتون کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کی خبر سن کر اس خاتون اور اس کے مرحوم شوہر کے تمام عزیز مسرور اور خوش تھے کہ مرحوم کا روپیہ اور جائیداد ان کو ملے گی۔ اور اگر دنیا میں کوئی مغموم اور مایوس تھا تو صرف وارث جو محسوس کرتا تھا کہ آج وہ ایک شفیق اور ضعیف خاتون کے سایہ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا، جو اس سے بے غرض محبت کرتی تھیں۔ اور جس نے اس کی چند روز کی عمر سے لے کر جوان ہونے تک پرورش کی تھی۔

اس خاتون کے انتقال کے چند روز بعد خاتون کے وہ عزیز و اقارب بھی لکھنؤ پہنچ گئے جو ہندوستان میں تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے یہ وصیت کھولی گئی تو اس میں لکھا تھا کہ تمام جائیداد مع لندن کے ایک مکان اور بنکوں کے روپیہ کے جو غالباً ایک لاکھ روپیہ کے قریب تھا وارث کو دیا جائے اور دوسرا کوئی شخص اس میں سے ایک پیسہ بھی حاصل نہ کرے۔ چنانچہ تمام جائیداد اور روپیہ اس وصیت کے مطابق وارث کو دے دیا گیا۔

لکھنؤ کی اس ملاقات کے بعد مسٹر وارث الدین احمد سے ایک بار دہلی میں ملنے کا اتفاق ہوا جب آپ اپنی بیوی (جو غالباً راجہ صاحب جہانگیر آباد کی بیٹی ہیں) کے ساتھ یہاں تشریف لائے اور بمبئی بڑودہ ریلوے کی چھوٹی لائن پر ریواڑی میں اسسٹنٹ ٹرافک سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اس کے بعد تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں آپ پاکستان چلے گئے اور غالباً آجکل کراچی میں ریلوے کے بڑے افسر ہیں۔

میں جب کبھی کسی بچہ کے یتیم ہونے کی خبر سنتا ہوں یا کسی یتیم کو دیکھتا ہوں تو مجھے فوراً خیال آتا ہے کہ شاید یہ بچہ اپنی زندگی میں آئندہ بڑی پوزیشن حاصل کرے۔ کیونکہ اکثر پیغمبر اور بڑے لوگ یتیم تھے اور قدرت ہمیشہ ہی یتیموں کی امداد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ یتیم بچوں پر کنٹرول کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ بچے اگر درست راستہ پر چلیں تو تیز رفتاری کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے ہیں کیونکہ ان کو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ستاروں کے اعتبار سے بھی کسی بچہ کے یتیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اپنا راستہ صاف کرتا ہے تاکہ اس کے راستہ پر کوئی مخل نہ ہو۔ اور جو لوگ دنیا میں بلند پایا کامیاب ہوئے ان میں زیادہ تعداد یتیموں کی ہے کیونکہ انہوں نے جس رفتار سے چاہا۔ دنیا کی دوڑ میں حصہ لیا اور قدرت نے ان کی امداد کی۔ اور گو یتیم ہونا ایک بچہ کے لئے دردناک حادثہ ہے مگر قدرت یقیناً اس بچہ کی امداد کرتی ہے۔ جسے قدرت کی طرف سے ایک نعمت قرار دیا جانا چاہیئے۔

Marfat.com

"صحافتی مراسم"

دہلی کے ایک صاحب مسٹر عنایت نے کلکتہ سے اخبار "چوپخ" جاری کر رکھا تھا۔ مسٹر عنایت بہت دلچسپ آدمی تھے۔ مجھے علم نہیں کہ خاندانی اعتبار سے وہ میراثی تھے یا نہیں۔ مگر طبعاً میراثیوں سے زیادہ لطیفہ گو۔ حاضر جواب اور پھبتی باز تھے۔ میں اس زمانہ میں ہر سال کرسمس کے دنوں کلکتہ جایا کرتا یہ صبح سے رات تک میرے پاس رہتے۔ اچھے سے اچھے موسیقاروں کا بغیر ایک پیسہ صرف کئے مفت گانا سنواتے ہوٹل میں جہاں میں مقیم ہوتا اپنے دوستوں کو ملنے کے لئے لاتے اور مجھے دوستوں کے ہاں دعوت پر بلواتے اور جتنے روز میں کلکتہ میں رہتا یہ دن میرے بہت ہی دلچسپی کے ساتھ گذرتے۔

مسٹر عنایت کا اخبار "چوپخ" نکالتے اور اخبار مزاح کے اعتبار سے اردو کے چوٹی کے اخبارات میں سے تھا۔ گران کا پروگرام یہ تھا کہ صبح سے شام تک طوائفوں، فلم ایکٹرسوں اور شعرا کے ہاں چکر لگاتے شام کو طوائفوں کے ہاں ہی شراب پیتے اور کھانا کھاتے اور کلکتہ کی ایک بھی طوائف یا فلم ایکٹریس ایسی نہ تھی جس سے ان کے دوستانہ مراسم نہ ہوں۔ کیونکہ کسی طوائف کے خلاف لکھنے اور کسی کے حق میں اور فلموں کے پروڈیوسر سیٹھ کرنانی وغیرہ تو فلم ایکٹریسوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے کے باعث عنایت صاحب کے بینک تھے جہاں سے جب چاہا روپیہ منگا لیا۔

میں کلکتہ پہنچا اور عنایت صاحب کو میرے وہاں پہنچنے کا علم ہوا تو آپ فوراً تشریف لے آئے چند گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد مجھ سے کوئی بات کئے بغیر کلکتہ کی مشہور فلم ایکٹریس جہاں آرا کجن (جس کی اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں شہرت تھی اور جو فلموں کے علاوہ تھیٹر میں بھی چوٹی کے پارٹ ادا کرنے والوں میں سے تھی) کے ہاں تشریف لے گئے۔ اور مس کجن کو بتایا کہ اخبار "ریاست" کا ایڈیٹر دیوان سنگھ کلکتہ آیا ہوا ہے اور ہوٹل میں مقیم ہے۔ "ریاست" ہندوستان میں بہترین اخبار ہے۔ دیوان سنگھ کی دعوت کی جانی چاہیئے۔ "ریاست" میں اگر چند سطور بھی اس کے آرٹ کی تعریف میں شائع ہو جائیں تو فلم اور آرٹ کی دنیا میں یہ سطور ایک سند کی حیثیت رکھیں گی۔ مس کجن "ریاست" پڑھا کرتی تھی۔ یہ میری کلکتہ میں موجودگی کی خبر سن کر بہت خوش ہوئی۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز دوپہر کو لنچ پر راقم الحروف کی دعوت کی جائے۔ مسٹر عنایت یہ فیصلہ کرنے کے بعد میرے ہوٹل میں آئے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کسی فلم ایکٹریس یا طوائف کے ہاں دعوت پر جانا پسند نہیں کرتا۔ انہوں نے مس کجن کی تعریف کے پل باندھنے شروع کئے کہ ایسا گاتی ہے اور ایسی اچھی ایکٹریس ہے وغیرہ۔ تاکہ میں خود ملنے کا اشتیاق ظاہر کروں۔ مگر میں سنتا رہا اور میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مس کجن کی خواہش ہے کہ میں ان کے ہاں دعوت پر جاؤں۔ میں نے جب یہ سنا تو میں نے عنایت صاحب سے کہا کہ آپ ٹال دیجئے۔ میں کسی فلم

Marfat.com

ایکٹریس کے ہاں دعوت پر جانا نہیں چاہتا۔ میرے انکار کے بعد دوسری باتیں شروع ہوگئیں۔ مگر عنایت صاحب محسوس کر رہے تھے کہ میرا یہ انکار ان کے پرسٹیج میں (جو طوائفوں اور فلم ایکٹرسوں پر تھا) کمی کرنے کا باعث ہوگا۔ شام کو ہم دوسرے دوستوں سردار نرنجن سنگھ طالب ایڈیٹر "دلیش درپن" وغیرہ کے ساتھ سیر کے لئے چلے گئے۔ اگلے روز عنایت صاحب صبح آٹھ بجے تشریف لے آئے انہوں نے میرے ساتھ ہی بریک فاسٹ کھایا۔ باتیں ہوتی رہیں اور گیارہ بجے کے قریب چلے گئے۔

بارہ بجے کے قریب عنایت صاحب مس کجن کے ساتھ تشریف لے آئے۔ اور مس کجن نے کہا کہ میں ان کے ہاں کھانے پر چلوں۔ میں حیران تھا کہ کل میں نے انکار کر دیا تھا مگر یہ آج تشریف لے آئیں میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیونکہ مس کجن نے آتے ہی شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کی دعوت قبول کی ہے۔ اس کے اس کہنے پر میں عنایت صاحب کی طرف دیکھتا تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا مگر عنایت صاحب مسکراتے رہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ حضرت دوستوں کے تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی دعوت کی تہ میں آپ صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کا "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر پر اثر ہے۔ مگر میں مجبور تھا کہ ایک خاتون لینے کے لئے آئیں تو انکار نہ کروں چنانچہ میں ان کے ساتھ ان کی کار میں چلا گیا۔ مس کجن کے مکان پر دعوت کا بڑا اہتمام تھا۔ چھ سات دوسرے اصحاب میرا انتظار کر رہے تھے۔ مس کجن نے سب سے پہلے اپنے گراموفون ریکارڈ سنائے جو ابھی پبلک میں نہ آئے تھے۔ اور جو ابھی حال میں گراموفون کمپنی نے تیار کیے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے۔ کھانا بہت پُرتکلف تھا۔ سازندے موجود تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مس کجن نے گانا سنایا۔ اور دو بجے کے قریب مس کجن کی کار پر عنایت صاحب کے ساتھ واپس آیا۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو عنایت صاحب کو بُرا بھلا کہا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ عنایت صاحب پیدائشی طور پر ڈھیٹھ تھے۔ میرے سخت سُست الفاظ سُنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد عنایت صاحب دہلی تشریف لائے اور دفتر "ریاست" میں پہنچے تو میں نے پوچھا کہ قیام کہاں ہے تو آپ نے فرمایا کہ آپ محلہ کونڈے والاں میں بمبئی کی مشہور فلم ایکٹریس نسیم کی والدہ شمشاد بیگم (شمشاد دہلی کی بہترین گانے والی طوائفوں میں سے تھیں۔ ان کی بیٹی نسیم ہندوستان کی ایک بہترین فلم ایکٹریس تھیں۔ شمشاد بیگم کا تعلق دہلی کے ایک بہت بڑے انجنیئر کے ساتھ تھا اور لاکھوں روپیہ کی مالک تھیں) کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ میرے ہاں قیام فرماتے تو آپ نے جواب دیا کہ وہاں اعلیٰ قسم کی شراب اور بہترین قسم کا کھانا مفت ملتا ہے۔ ان طوائفوں کی جیب سے جو کچھ نکل آئے وصول کر لینا چاہیئے۔ یہ جواب معقول تھا۔ عنایت صاحب دو ہفتے کے قریب دہلی میں رہے۔ قریب قریب ہر روز تشریف لاتے اور دو دو تین تین گھنٹے گپ بازی ہوتی۔ عنایت صاحب کو دہلی میں آئے تین چار روز ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں پسند کروں تو چھمیا (یہ شمشاد بیگم کا گھریلو نام تھا) میری دعوت کرنا چاہتی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ یہ دعوت اوکھلا کے پُرفضا

Marfat.com

مقام پر ہو اور وہ وہاں ہی گانا سنائے ۔ میں عنایت صاحب کی فطرت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ یہ "ریاست" کے اثرات کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں چھمیا کے گانے کو بے حد پسند کرتا ہوں ۔ اور میں ریڈیو پر ان کا گانا اکثر سنا کرتا ہوں اس لئے اوکھلے میں اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ۔ مسز عنایت نے پھر زور دیا کہ چھمیا کی خواہش ہے کہ وہ گانا سنائے ۔ مگر میں نے پھر انکار کیا اور کہا کہ ٹال دیجئے میرے پاس وقت نہیں کہ میں اوکھلے جا کر گانا سنوں۔ عنایت صاحب میرے انکار سے کچھ مایوس سے تھے مگر میں نے پروا نہ کی ۔

اس واقعہ کے چار روز بعد راجہ اکبر علی خاں ٹھیکہ دار (راجہ اکبر علی بہت ہی مخلص، بلند اور دوست نواز شخصیت تھے ۔ ان کی کوٹھی پر ہر وقت دوستوں کا مجمع رہتا ۔ کھانے پر ہمیشہ دس پندرہ دوست ہوتے اور ان کا مہمان خانہ جو کوٹھی کے ایک طرف تھا ہمیشہ بھرا رہتا اور دہلی کی شائد ہی کوئی بڑی شخصیت ہوگی جس کو آپ کی دوستی کا فخر حاصل نہ تھا) کا ٹیلی فون آیا کہ آج شام کو میں کھانا ان کے ساتھ کھاؤں ۔ کبھی کبھی یہ مجھے کھانے پر مدعو کیا کرتے تھے ۔ میں نے بہت اچھا کہا اور شام کو میں اپنی کار میں سیر کے بعد ان کے ہاں گیا ۔ میں جب وہاں پہنچا تو گھاس پر دس پندرہ کرسیاں بچھی تھیں۔ ان کرسیوں پر راجہ صاحب، شمشاد بیگم یعنی چھمیا ان کی بیٹی فلم ایکٹریس نسیم (جو چند روز کے لئے اپنی والدہ سے ملنے بمبئی سے آئی تھیں) محمد سلیمان صاحب چیف انجنیئر اور راجہ کے دو تین مصاحب بیٹھے تھے ۔ میں جب پہنچا تو تمام لوگ کھڑے ہو گئے، علیک سلیک ہوئی ۔ اور جب مجھے بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے تو راجہ صاحب نے بے تکلفی کے ساتھ پنجابی زبان میں فرمایا۔ "توں ایہہ دس ۔ ایہناں وچاریاں نے تیرا کی وگاڑیا اے ۔" (تم یہ بتاؤ ان بچاریوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے) میں نے جواب دیا کہ راجہ صاحب۔ میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ راجہ صاحب نے پھر کہا" ایہناں وچاریاں تیرا کی وگاڑیا اے جو ایہناں دے پچھے پیا ایں ۔" (ان بچاریوں نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے جو ان کے پیچھے تم پڑے ہو) میں نے پھر کہا کہ راجہ صاحب میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ میرے اس جواب پر شمشاد بیگم نے کہا:۔

"سردار صاحب ۔ کیا آپ نے کبھی بھی گانا سنانے کے کہا اور میں نے انکار کیا ؟ ہمارے لئے تو یہ عزت کا باعث ہے کہ آپ ہمارا گانا سنیں ۔ عنایت صاحب نے بتایا ہے کہ آپ ہم پر سخت ناراض ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں مجھ سے جب عنایت صاحب نے کہا کہ آپ ناراض ہیں تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ راجہ صاحب کی معرفت آپ سے ناراضی کا سبب پوچھوں ۔ خدا کی قسم ہمارے دل میں تو آپ کے لئے انتہائی عزت ہے ۔ آپ جہاں حکم کیجئے میں گانے کے لئے حاضر ہو جاؤں ۔ عنایت صاحب نے بتایا کہ چونکہ میں نے آپ کو کبھی گانا نہیں سنایا اس لئے آپ مجھ سے بے حد خفا ہیں اور دشمن ہو رہے ہیں ۔"

Marfat.com

میں یہ سن کر حیران رہ گیا اور میں نے بتایا کہ عنایت صاحب تو مجھ سے یہ کہتے تھے کہ آپ کی خواہش گانا سنانے کی ہے اور میں ادھلے جا کر گانا سننے کی دعوت قبول کر لوں۔ مگر میں نے اسے نامناسب سمجھ کر انکار کر دیا اور کہا کہ میں ریڈیو پہ آپ کا گانا سن لیا کرتا ہوں۔

میرے اس جواب کو سن کر عنایت صاحب کے متعلق چھمیا نے کہا۔ یہ کمبخت شرارتوں سے باز نہیں آتا۔ بغیر اطلاع دیئے اور کہے بطور مہمان چلا آتا ہے۔ دن بھر شراب پیتا ہے اور ہمارے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے میں تو تنگ آ چکی ہوں۔ یہ بھی مناسب نہیں کہ مہمان کو گھر سے چلے جانے کے لئے کہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی کئی شرارتیں کر چکا ہے مجھے تو آخر کہنا ہی پڑے گا کہ کسی دوسری جگہ تشریف لے جایئے۔ میں خود سوچتی تھی کہ اب تک آپ سے کبھی بات چیت کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا آپ راجہ صاحب اور سلیمان صاحب کے دوست ہیں پھر ہمارے دشمن کیوں ہوں۔

اس بات چیت کے بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے اور کھانے کی میز پر بھی عنایت صاحب کے پچھلے کارناموں کا ہی ذکر رہا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر راجہ صاحب سے باتیں ہوتی رہیں اور میں نو بجے گھر واپس پہنچا۔

اگلے روز عنایت صاحب تشریف لائے اور میں نے ان کی غلط بیانی پر ملامت کی تو مسکرانے لگے اور میں نے جب پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو آپ نے بے تکلف جواب دیا۔ دوستوں کے حلقہ کو وسیع کرنا چاہتا ہوں۔ تم دوست ہو اور میں چاہتا تھا کہ تمہارے چھمیا اور نسیم سے بھی مراسم ہوں۔

اگلے روز عنایت صاحب واپس کلکتہ چلے گئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ چھمیا نے ان کو تشریف لے جانے کے لئے کہا یا کہ یہ خود ہی چلے گئے۔

ہندوستان کا مام دین

میں ۱۹۴۷ء میں ایک روز اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ایک گیروے یعنی سادھوؤں والے کپڑے پہنے ایک سوامی جی تشریف لائے۔ جن کے پاس اردو کے مشہور شاعر حضرت احمق پھپھوندوی کا تعارفی خط تھا۔ اور اس خط میں لکھا تھا کہ سوامی پارس ناتھ جی اس غرض کے لئے دہلی آ رہے ہیں کہ یہ جمہوریہ ہندوستان کی صدارت کے امیدوار ہیں۔ اور اس عہدہ کے حاصل کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن امداد کی جائے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد میں نے سوامی جی سے باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی مخلص اور قابلِ محبت انسان ہیں۔ مگر ان کے دماغ کی ایک چول نہیں، کئی چولیں ڈھیلی ہیں چنانچہ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ہندی زبان کے اچھے شاعر ہیں۔ آگرہ کے ہندی زبان کے ایک ماہوار رسالہ کو ایڈیٹ کرتے رہے ہیں۔ پچیس برس سے ہندی کی ایک مشہور شاعرہ جو الہ آباد کی رہنے

Marfat.com

والی ہیں، کے عاشق ہیں۔ ان کو اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا پچیس برس ہوئے صرف ایک بار اتفاق ہوا تھا۔ پچھلے پچیس برس میں یہ خاتون بوڑھی ہو چکی ہیں مگر سوامی جی کے خیال میں یہ شباب کے دَور میں ہی ہیں۔ میں نے سوامی جی کی رہائش کا اپنے مکان کے ایک کمرہ میں انتظام کر دیا اور یہ دو سال کے عرصہ تک میرے ہاں بطور مہمان مقیم رہے جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

’’ریاست‘‘ کا دفتر اور اس کے ایڈیٹر کا رہائشی مکان ہمیشہ ایک ہی بلڈنگ میں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں کام کرنے کی بہت سہولت رہتی ہے۔ صبح سے شام تک کام کرتے رہو کہیں جانے آنے کی ضرورت نہیں اور اخراجات میں بھی کفایت رہتی ہے۔ اور چونکہ ایڈیٹر ’’ریاست‘‘ تنہا رہتا ہے۔ شام کے وقت دو چار، پانچ سات دوست تشریف لے آتے ہیں دن بھر کے کام کے بعد ایک دو گھنٹے تفریح کے گذر جاتے ہیں چنانچہ سوامی جی سے ملنے کا وقت بھی شام کو دوستوں کی موجودگی میں ہی ہوتا اور وہ دن بھر اپنے کمرہ میں یا تو کچھ لکھتے پڑھتے رہتے یا آرام فرماتے۔

سوامی جی کی زندگی کے پچھلے واقعات بھی بے حد دلچسپ ہیں اور ان واقعات کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ان واقعات میں سے صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ چونکہ آپ ہندی کے شاعر ہیں۔ پچیس برس ہوئے ایک دوست کے ساتھ الہ آباد گئے تو ہندی کے ایک دوسرے شاعر کے ساتھ وہاں کی مشہور شاعرہ جو وہاں کے ایک زنانہ کالج میں پرنسپل بھی ہیں کے مکان پر چلے گئے۔ وہاں چند منٹ بیٹھے اور یہ شاعرہ دوسرے شاعر کے ساتھ باتیں کرتی رہیں اور سوامی جی سے مخاطب بھی نہ ہوئیں۔ مگر سوامی جی اس ملاقات میں ہی وہاں سے عشق خرید لائے اور واپس اپنے وطن پھپھوند (ضلع اٹاوہ یو۔پی) پہنچ کر اس شاعرہ سے یکطرفہ خط و کتابت شروع کر دی۔ یعنی سوامی جی ہفتہ میں ایک دو عشقیہ خط ضرور لکھتے، اور وہاں سے کوئی جواب نہ آتا۔ سوامی جی اس ’’ون وے ٹریفک‘‘ سے تنگ آ گئے تو آپ الہ آباد چلے گئے وہاں دریائے گنگا کے کنارے آپ نے ایک کوٹھڑی میں قیام کیا۔ اور جب کوئی شخص وہاں سے اس سڑک کی طرف جاتا جہاں کہ آپ کی ’’محبوبہ‘‘ کی کوٹھی تھی (یہ خاتون ہندوستان میں ہندی کی بہترین شاعرہ ہونے کے علاوہ الہ آباد میں بہت با اثر ہیں۔ ان کے نہرو فیملی سے بھی کافی مراسم ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی صاحبزادی ان سے پڑھتی رہی ہیں۔ تمام یو۔پی میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں اور ایک کوٹھی میں امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتی ہیں) تو آپ اس کے ہاتھ اپنی محبوبہ کو خط بھیج دیتے جس میں کہ بے اعتنائی کی شکایت کی جاتی، اور آپ خط لے جانے والے ہر شخص کو خط لے جانے کا معاوضہ آٹھ آنہ دیتے۔ آپ نے ایک روز ایک لڑکے کو خط دیا کہ یہ خط ان کی محبوبہ کو پہنچا دیا جائے۔ یہ لڑکا چالاک ٹائپ کا تھا۔ اس نے خط پڑھا اور دیکھا کہ سوامی جی عشق بازی میں مبتلا ہیں تو اس نے خط پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کہہ دیا کہ اس نے خط پہنچا دیا ہے۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔ سوامی جی خط اور آٹھ آنہ دیتے۔ لڑکا خط پھاڑ دیتا اور واپس آکر کہہ دیتا کہ خط پہنچا دیا ہے۔ ایک روز لڑکے نے اپنی بہن (جو ہندی پڑھی ہوئی تھی) سے سوامی جی کے نام اس خاتون کی طرف سے خط لکھوایا جس میں تمام خطوط پہنچنے

Marfat.com

کا اقرار کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ گھر والوں کی سختی اور نگرانی کے باعث جواب نہ دینے کے لئے مجبور تھیں۔ آپ لکھنؤ جا رہی ہیں۔ آپ کے پاس اخراجات کے لئے روپیہ نہیں، ساٹھ روپیہ بھیج دیجئے۔ سوامی جی نے جب اس جواب کو دیکھا تو شدت مسرت کے باعث آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ آپ کے پاس اس وقت پچپن روپیہ تھے۔ آپ نے اپنے پاس ایک پیسہ رکھے بغیر پچپن روپیہ اس لڑکے کے حوالہ کیے۔ سوامی جی کا بیان ہے کہ یہ لڑکا اگلے روز نئے سلے ہوئے کپڑے اور نئی رسٹ واچ پہن کر آیا تو آپ نے سمجھا کہ ان کے ساتھ یہ دھوکہ ہوا ہے۔ چنانچہ آپ نے آئندہ اس لڑکے کا اعتبار کرنا تو چھوڑ دیا مگر خطوط کا سلسلہ جاری رہا، جو دوسرے راہ چلتے لوگوں کے ذریعہ بھیج دیئے جاتے۔

خطوط کو بھیجنے کا یہ سلسلہ چھ ماہ کے قریب جاری رہا اور یہ خاتون ان خطوط سے تنگ آگئیں تو اس خاتون نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو خط لکھا کہ ایک پاگل شخص ان کو خطوط بھیج کر تنگ کرتا ہے۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ سوامی جی نے بتایا کہ اس زمانہ میں الہ آباد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک انگریز مسٹر موریس تھے۔ انہوں نے ایک کنسٹیبل بھیج کر سوامی جی کو بلایا۔ سوامی جی جب آئے تو مسٹر موریس نے پوچھا کہ آپ اس خاتون کو عشقیہ خطوط کیوں لکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں سوامی جی نے فرمایا کہ یہ خاتون ان کی پچھلے جنم کی بیوی تھی اور اس جنم کی روحانی محبوبہ اس لیے خط لکھتے ہیں۔ مسٹر موریس نے جب یہ جواب سنا تو آپ سمجھ گئے کہ سوامی جی اپنے دماغ کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ آپ نے سوامی جی کو حکم دیا کہ پہلی گاڑی سے الہ آباد سے چلے جاؤ ورنہ حوالات میں دے دیئے جاؤ گے۔ اس حکم کو سن کر سوامی جی کو بادل نخواستہ واپس پھپھوند آنا پڑا۔ پھپھوند واپس آنے پر سوامی جی نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ان کی محبوبہ تو ان کو چاہتی تھیں مگر اس خاتون کے رشتہ دار راستہ میں مخل ہوتے تھے اور انہوں نے ہی پولیس کے سپرنٹنڈنٹ سے کہہ کر الہ آباد سے نکلوا دیا۔

اوپر کا واقعہ تو پچیس برس پہلے کا ہے، اب سوامی جی کی دہلی کی مصروفیات سنیئے۔ سوامی جی سے جب باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ آپ گانجا استعمال کرتے ہیں۔ تو ان میں بہت بڑی "روحانیت" پیدا ہو جاتی ہے اور اس وقت کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور سیاست دان بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سوامی جی کو دہلی تشریف لائے چند دن ہوئے تھے تو آپ کے لئے انگریزی کے بہت شاندار وزٹنگ کارڈ چھپوائے گئے۔ جن پر لکھا تھا "سوامی پارس ناتھ اگر یکچر۔ دفینہ اور روحانیت کے ایکسپرٹ" کیونکہ سوامی جی کا ارشاد تھا کہ آپ کو زمین کے اندر تمام کی تمام دولت کا علم ہے اور آپ کروڑہا من سونا نکلوا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں غلہ کی پیداوار کو دس گنا زیادہ پیدا کر سکتے ہیں اور روحانی اعتبار سے چاہیں تو ہندوستان کی تمام بھڑیں، بچھو اور سانپ جمع کر کے غیر ممالک کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے بھیج دیں۔ جب وزٹنگ کارڈ تیار ہو گئے تو ایڈیٹر "ریاست" نے عرض کیا کہ اصل مقصد تو ہندوستان کی صدارت حاصل کرنے کا ہے جس کے لئے آپ پھپھوند سے تشریف لائے اور اس کے لئے

Marfat.com

انتہائی کوشش کی جائے گی مگر یہ عہدہ طریقہ کے ساتھ حاصل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ سوامی جی اس پر آمادہ ہو گئے اور فیصلہ ہوا کہ پہلے تو کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کی ممبری حاصل کی جائے اور کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کی ممبری کے بعد جمہوریہ ہندوستان کی صدارت حاصل ہو۔ چنانچہ ایک درخواست تیار کر کے ٹائپ کی گئی جو وزیر اعظم پنڈت نہرو کے نام تھی۔ اس درخواست میں لکھا گیا کہ سوامی جی ہندوستان کے دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گداگروں کے پیشوا ہیں۔ ان سادھوؤں کا ایک نمائندہ کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی میں ہونا چاہیئے تاکہ ان کے حقوق محفوظ رہیں اور سوامی جی بطور ان کے پیشوا اور لیڈر کے ان کے بہترین نمائندہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کو کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کا ممبر نامزد کیا جائے۔ اس درخواست کے ساتھ آپ کو پنڈت نہرو کے پاس بھیجا گیا۔ اس زمانہ میں پنڈت نہرو ہر شخص سے مل لیا کرتے تھے۔ آپ جب پنڈت نہرو کی کوٹھی پہنچے اور آپ نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا تو پنڈت جی نے آپ کو اندر طلب فرمایا۔ آپ نے جاتے ہی پنڈت جی کو وہ درخواست دی۔ پنڈت جی اس درخواست کو پڑھ کر حیران سے ہو گئے کہ یہ کون حضرت ہیں جو کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کے ممبر ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کے اور پنڈت جی کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی:۔

آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

میں پھپھوند ضلع اٹاوہ۔ یو۔ پی کا رہنے والا ہوں۔

آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟

میں دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں اور گداگروں کا پیشوا اور نمائندہ ہوں۔ میرا اصل مقصد تو ہندوستان کا صدر بننا ہے مگر میں فی الحال کانسٹی ٹیونٹ کا ممبر ہونا چاہتا ہوں۔

آپ پھپھوند میں کیا کرتے ہیں؟

میں زراعت، دفینہ اور روحانیت میں ماہر ہوں۔ زمین کا تمام دفن شدہ سونا اور جواہرات نکال کر ملک کو مالا مال کر دوں گا اور اگر ضرورت ہوئی تو دشمن ملک کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے ہندوستان کی تمام بھڑوں ، بچھوؤں، سانپوں اور مچھروں کو بھیج دوں گا۔

آپ دہلی کب سے تشریف فرما ہیں؟

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ کے قریب ہو گیا ہے۔

آپ دہلی میں کہاں مقیم ہیں؟

میں اخبار "ریاست" کے دفتر میں اس اخبار کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کا مہمان ہوں۔

سوامی جی کا بیان ہے کہ جب پنڈت جی نے اخبار "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر دیوان سنگھ کا نام سنا تو آپ نے مسکراتے ہوئے کہا "خوب! میں اب سمجھا کہ آپ بہت بلند شخصیت ہیں۔ میری بھی رائے ہے کہ کانسٹی ٹیوانٹ اسمبلی کی ممبری کے لئے آپ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص مستحق نہیں۔ یقیناً آپ اس کے حقدار ہیں اور آپ کو ضرور اسمبلی کا ممبر بنایا جائے گا" یہ کہتے ہوئے پنڈت جی نے سوامی جی کی درخواست

Marfat.com

کو سامنے پڑی فائیلوں کے اوپر رکھ دیا۔ اور کہا کہ آپ جا سکتے ہیں، آپ کو ضرور ممبر بنایا جائے گا۔ چنانچہ سوامی جی جب دفتر "ریاست" میں واپس آئے۔ تو بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ایک مرحلہ تو طے ہو گیا ہے اب بھگوان نے چاہا۔ تو صدارت بھی مل جائے گی۔

پنڈت نہرو سے ملنے کے بعد اگلے روز سوامی جی دوستوں کے مشورہ کے مطابق بابو راجندر پرشاد (جو اس زمانہ میں فوڈ منسٹر تھے) کے پاس پہنچے۔ کیونکہ سوامی جی بھی جنم کے لحاظ سے کایستھ ہیں۔ اور بابو راجندر پرشاد بھی کایستھ۔ ایک کایستھ کو اپنے کایستھ بھائی کی امداد ضرور کرنی چاہیئے۔ سوامی جی جب بابو راجندر پرشاد کی کوٹھی گئے تو آپ نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ بابو جی نے سوامی جی کو بلا لیا۔ اور دونوں کے درمیان یہ باتیں ہوئیں۔

فرمائیے کس طرح تشریف لائے؟

میں دس لاکھ سادھوؤں، فقیروں، اور گداگروں کا نمائندہ اور پیشوا ہوں۔ اور میں کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی کا ممبر ہونا چاہتا ہوں۔ تاکہ ان کے حقوق کی حفاظت کر سکوں۔ آپ کایستھ ہیں۔ اور میں گو اب سادھو ہوں۔ مگر جنم کے لحاظ سے میں بھی کایستھ ہوں۔ آپ کا فرض ہے۔ کہ آپ میری امداد کریں۔ اور مجھے کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی کا ممبر بنا دیں۔ میں پنڈت نہرو سے بھی مل آیا ہوں۔ اور انہوں نے وعدہ فرما لیا ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے جب یہ سُنا۔ تو وہ بھی چکر آگئے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے ٹالنا چاہا۔ تو سوامی جی کو اپنی برادری کی بے مہری کا خیال آگیا۔ اور آپ نے خفا ہو کر کہا۔ آپ ایگریکلچر منسٹر بنے پھرتے ہیں۔ مگر آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ کہ ایگریکلچر کیا ہے۔ بھلا آپ بتائیے۔ کہ جوی کیا ہوتی ہے۔ سوامی جی کے اس سوال پر بابو راجندر پرشاد مسکرا دیئے اور فرمایا۔ کہ فی الحقیقت آپ کو علم نہیں کہ جوی کیا ہوتی ہے۔ سوامی جی نے جواب دیا۔ بس یہی زراعت کے متعلق آپ کی معلومات ہیں۔ اب اگر کہو تو میں بتاتا ہوں۔ کہ جوی کیا ہوتی ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے کہا فرمائیے جوی کیا ہوتی ہے؟ تو سوامی جی نے فرمایا۔ جوی جَو کے گھر والی یعنی جَو کی بیوی ہوتی ہے! اس گفتگو کے بعد سوامی جی واپس دفتر "ریاست" میں تشریف لے آئے۔ مگر آپ بابو راجندر پرشاد اور اپنی کایستھ برادری دونوں پر بہت خفا تھے۔ کہ انہوں نے سوامی جی کی قدر نہ کی۔

تیسرے روز آپ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کے لیے گئے۔ مگر آپ کے سیکریٹری مسٹر اجمل خاں نے کہہ دیا۔ کہ مولانا مصروف ہیں۔ سوامی جی واپس آگئے۔ اور بہت ناراض تھے۔ اور ان کو سخت شکایت تھی۔ کہ مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور ان کی شخصیت اور علمیت کی قدر نہ کی گئی۔

اگلے روز آپ مہاتما گاندھی جی سے ملنے کے لیے ہری جنوں کی بستی میں گئے۔ جو ریڈنگ روڈ نئی دہلی پر ہے۔ مہاتما لوگوں سے ملاقاتیں کر رہے تھے اور ہر ایک کو دو دو منٹ دیئے جاتے تھے۔ اس وقت ان کے پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض مسٹر برج کرشن چاندی والے ادا کر رہے تھے۔ سوامی جی تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے۔ تو مسٹر برج کرشن جی نے سوامی جی کو مہاتما جی کے پاس اندر جانے کو کہا۔ سوامی جی اندر گئے۔ تو آپ نے وہی درخواست جو آپ پنڈت نہرو کو دے چکے تھے۔ مہاتما جی کو بھی دی۔ مہاتما جی اس درخواست کو پڑھ کر خاموش رہے۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ آپ کسی بے معنی بات پر ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کرتے تھے۔ اور سیاسی معاملات کے تفکرات کے باعث بہت سنجیدہ تھے۔ مہاتما جی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور دو منٹ پورے ہو گئے۔ اتنے میں مسٹر برج کرشن جی نے کہا۔

Marfat.com

سوامی جی دو منٹ ہو چکے ہیں۔ تشریف لے چلیئے کیونکہ دوسرے اصحاب منتظر ہیں۔ سوامی جی کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور واپس دفتر ریاست" میں پہنچے۔ مگر بہت غمناک تھے ۔ مَیں نے پوچھا سوامی جی کیا بات ہے۔ آج رنجیدہ کیوں ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ کہ مہاتما گاندھی سے مل کر آیا ہوں۔ مَیں نے پوچھا وہاں کیا ہُوا؟ میرے سوال پر آپ نے جو جواب دیا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"مَیں مہاتما گاندھی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور اپنی درخواست بھی دی۔ انہوں نے درخواست پڑھی۔ مگر کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مہاتما گاندھی پاگل ہیں۔ اور ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہا۔ ورنہ کچھ تو جواب دیتے۔"

سوامی جی کا یہ جواب سن کر مَیں نے اپنے دل میں تو یہی کہا۔ کہ انسان جیسا ہو۔ دوسرا بھی اس کو ویسا ہی نظر آتا ہے۔ سوامی جی پاگل ہیں، تو اب ان کو مہاتما جی بھی پاگل نظر آتے ہیں۔ مگر ان سے مَیں نے کہا۔ سوامی جی کوئی خیال نہ کیجیے۔ مہاتما جی مصروف ہوں گے۔ اس لیے فی الحال کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر غور کرنے کے بعد جواب بذریعہ ڈاک بھیج دیں گے۔ میرے اس کہنے پر سوامی جی کا غم و غصہ کم ہُوا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ ایک درجن کے قریب دوست بیٹھے تھے۔ جن میں زیادہ تعداد شعراء و اخبار نویس حضرات کی تھی۔ سوامی جی بھی گانجا پینے کے بعد تشریف فرما تھے۔ اور ان کا روحانی فیض جاری تھا۔ سوامی جی نے فرمایا۔ کہ دنیا کے تمام سینما بند کر دینے چاہئیں۔ یہ فضول خرچی ہے۔ اور صرف ایک سینما زمین اور آسمان کے درمیان قائم کیا جائے۔ جسے ہر ملک دیکھ سکے۔ یہ طریقہ تمام ممالک کی اقتصادیات میں بچت کا باعث ہوگا۔ سننے والے تمام اصحاب نے اس تجویز کی تعریف کی۔ اور ایک صاحب نے کہا۔ کہ سوامی جی نہ صرف ایگریکلچر، دفینہ اور روحانیت میں ماہر ہیں۔ بلکہ اقتصادیات میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ سن کر سوامی جی مسکرا دیئے۔ گویا کہ وہ اپنے ماہر اقتصادیات ہونے پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ حضرت جوش ملیح آبادی تشریف لے آئے۔ جوش صاحب نے بھی جب انٹرنیشنل سینما کی اس سکیم کو سنا۔ تو آپ نے بہت تعریف کی۔ اس کے بعد مَیں نے جوش صاحب سے کہا۔ کہ اگر وہ چاہیں۔ تو مَیں سوامی جی سے درخواست کر سکتا ہوں۔ کہ سوامی جی آپ کو اپنا شاگرد بنالیں۔ جوش صاحب نے کہا۔ کہ ان کے لئے اس سے زیادہ عزت کا باعث اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جوش صاحب نے اپنی جیب سے دو روپے نکال کر سوامی جی کی نذر کئے۔ اور جوش صاحب کو شاگرد بنانے کی رسم ادا کی گئی۔ اب سوامی جی دہلی میں کسی سے ملیں۔ یا دہلی سے باہر۔ تو باتوں باتوں میں جوش صاحب کے شاگرد ہونے کا ذکر ضرور کرتے ہیں کیونکہ جب جوش صاحب نے بطور شاگرد دو روپیہ نذر کئے۔ اور پھر وہ لوگوں سے اپنے استاد ہونے کا ذکر کیوں نہ کریں۔ اس کے علاوہ یہ مان لیا گیا۔ کہ جوش صاحب اس وقت اردو اور فارسی کے بے مثل اور انقلاب پسند شاعر ہیں۔ مگر "روحانیت" کے مراحل تو انہوں نے طے نہیں کئے۔

ایک روز سوامی جی کا دربار دفتر "ریاست" میں لگا ہُوا تھا۔ اور چند اخبار نویس اور شاعر حضرات تشریف فرما تھے۔ کہ آل انڈیا ریڈیو کے مسٹر مضطر ہاشمی تشریف لے آئے۔ مَیں نے مضطر صاحب سے کہا۔ کہ مضطر صاحب کہ اگر آپ ریڈیو پر سوامی جی کی تقریر کرائیں۔ تو یہ نہ صرف آل انڈیا ریڈیو بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا پر بھی احسان ہوگا۔ اور یہ تقریر دفتر "ریاست" سے نشر کی جائے۔ اگلے روز سوامی جی کی تقریر نشر کرانے کا اہتمام کیا گیا۔ چالیس کے قریب

Marfat.com

دوست جمع ہوئے۔ ایڈیٹر "ریاست" کے پاس ورزش کرنے کی ایک مشین ہے۔ جس میں بجلی کا ایک موٹر لگا ہے۔ اور یہ بجلی سے گھومتی ہے۔ سوامی جی نے اس مشین کو کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔ یہ مشین سوامی جی سے پوشیدہ طور پر گودام میں سے نکلوا کر اوپر منگائی گئی۔ سوامی جی کو اس مشین کے سامنے یہ کہہ کر بٹھا دیا گیا۔ کہ یہ براڈ کاسٹنگ مشین ہے سوامی جی سنجیدہ صورت میں مشین کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور مشین کی موٹر چلا دی گئی۔ سوامی جی کو براڈ کاسٹنگ کے لئے ہدایت دینے کا کام لالہ امیر چند کھنہ اور مظفر صاحب کے سپرد تھا۔ اس مشین کو ایک لیمپ لگا دیا گیا۔ اور سوامی جی سے کہا گیا۔ کہ وہ لیمپ کے قریب ہو کر تقریر کریں۔ اور اپنی تقریر میں الٰہ آباد والی اپنی محبوبہ کو بھی جو پیغام دینا ہو وہ دے دیں۔ چنانچہ پندرہ منٹ کے قریب سوامی جی نے تقریر کی۔ اور جب سوامی جی نے اپنی محبوبہ کے نام پیغام دیا۔ تو سوامی جی کچھ کانپ رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں تقریر ختم ہونے سے پہلے یہ انتظام کر لیا گیا تھا۔ کہ جو دوسرے دوست سوامی جی سے دفتر "ریاست" سے باہر ملیں تو اس تقریر کی تعریف کریں۔ چنانچہ اس تقریر کے بعد سوامی جی دفتر "ریاست" سے بازار میں گئے۔ تو وہاں ایک صاحب نے کہا۔ کہ سوامی جی آج تو آپ کی ریڈیو والی تقریر بہت دلچسپ اور عالمانہ تھی۔ اس کے بعد آپ محلہ سوئیوالان میں گئے۔ تو وہاں ایک صاحب نے کہا۔ کہ سوامی جی آپ کی تقریر بیحد دلچسپ تھی۔ پھر آپ اردو بازار میں گئے۔ تو وہاں یار لوگوں نے کہا۔ کہ سوامی جی آج تو آپ نے تقریر میں کمال کر دیا۔ اس کے علاوہ اگلے روز پانچ چھ خطوط لکھے گئے۔ جن کے اوپر مختلف شہروں مثلاً لکھنو، جھانسی، مراد آباد اور الٰہ آباد وغیرہ کے نام تھے۔ اور یہ تمام سوامی جی کے نام لکھے گئے تھے۔ ان میں مختلف لوگوں کی طرف سے لکھا گیا۔ کہ یہاں آپ کی ریڈیو والی تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔ چنانچہ ان خطوط میں ایک خط ہندی میں ایک خاتون کی طرف سے بھی تھا۔ جس میں تقریر کی تعریف کے ساتھ اظہار عشق بھی کیا گیا تھا۔ اس خاتون کا یہ خط سوامی جی کے پاس اب تک موجود ہے۔ اور آپ اس خط کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں۔ یہ تمام خطوط ریلوے ٹرین میں پوسٹ کئے گئے۔ تاکہ سوامی جی کو ڈاک خانہ کی مہر سے پتہ نہ چل سکے۔ کہ یہ دہلی سے ہی پوسٹ کئے گئے ہیں۔

ایک دن ہم لوگوں نے فیصلہ کیا۔ کہ سوامی جی کی "ان کی محبوبہ" سے ٹیلیفون پر ملاقات کرائی جائے چنانچہ سوامی جی سے ان کی شریمتی جی کے نام خط لکھوایا گیا۔ کہ آپ آئندہ اتوار کو شام کے چھ بجے ٹرنک ٹیلیفون پر سوامی جی سے بات کر لیں۔ سوامی جی بہت مضطرب ہیں۔ یہ خط سوامی جی سے لے کر اور اس پر ٹکٹ لگا کر چپڑاسی کو دیا گیا۔ کہ یہ فوراً پوسٹ کر دیا جائے مگر اس کے کان میں کہہ دیا گیا۔ کہ خط پوسٹ نہ کیا جائے۔ اسے پھاڑ دیا جائے۔ ادھر میں نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ کہ ان کی بیوی ٹیلیفون پر سوامی جی سے اتوار کی شام کو چھ بجے بات کریں۔ اور یہ بتائیں کہ الٰہ آباد سے ان کی محبوبہ بات کر رہی ہے چنانچہ اتوار کی شام کو چھ بجے سے پہلے ہی سوامی جی ٹیلیفون کے انتظار میں اوپر تشریف لے آئے چھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے ٹیلیفون اٹھایا جب ٹیلیفون اٹھایا۔ تو میرے اس دوست نے اپنی بیوی سے بات کرنے سے پہلے کہا۔ الٰہ آباد سے ٹیلی فون آیا ہے۔ سوامی پارس ناتھ جی ہیں؟ میں نے فوراً گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے سوامی جی کو آواز دی۔ سوامی جی جلدی آیئے۔ الٰہ آباد سے ٹیلیفون آیا ہے۔ جب سوامی جی نے ٹیلیفون کا رسیور کان پر لگایا۔ تو میرے اس دوست نے اپنی مردانہ آواز میں پوچھا۔ سوامی پارس ناتھ ہیں۔ سوامی جی نے کہا۔ کہ ہاں میں سوامی پارس ناتھ بول رہا ہوں۔ اس پر میرے دوست نے

Marfat.com

کہا کہ الہ آباد سے بات کرو۔ سوامی جی اس وقت ریسیور ہاتھوں میں تھامے لرز رہے تھے۔ ان کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میرے دوست کی بیوی اور سوامی جی کے درمیان ٹیلی فون پر یہ باتیں ہوئیں۔

سوامی جی ہیں؟

جی ہاں میں سوامی پارس ناتھ بول رہا ہوں۔

سوامی جی آپ کے خطوط پہنچتے رہتے ہیں۔ مگر یہ کمبخت میرے گھر کے لوگ میری نگرانی کرتے ہیں۔ اس لئے میں جواب نہیں دے سکتی۔ اب بھی بہت مشکل کے ساتھ یہ ٹیلی فون ایک دوسری جگہ سے کر رہی ہوں۔

آپ دہلی میں کیوں نہیں آ جاتیں؟ میں آج دہلی میں رہتا ہوں۔

آپ ہندوستان کے پریزیڈنٹ ہو جائیے تو میں فوراً آپ کے پاس آ جاؤں گی۔

میں پریزیڈنٹ تو بعد میں ہو جاؤں گا۔ آپ ضرور آ جائیے۔

اُوہنہ، آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں، کیا جلدی ہے، میں آ جاؤں گی۔

اتنی بات ہوئی تھی۔ کہ میرے دوست جو اپنی بیوی سے ٹیلی فون پر بات کرا رہے تھے۔ نے فوراً کہا "تین منٹ ہو چکے ہیں، بات ختم کرو۔"

سوامی جی ٹیلی فون سُننے کے بعد بار بار کہتے رہے۔ "اُوہنہ آپ تو ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں" کیا میٹھی زبان تھی، جیسے امرت ہو۔ چنانچہ سوامی جی اب بھی اس ٹیلیفون کو اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور ایک خاص انداز میں کہا کرتے ہیں، "اُوہنہ آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔"

جب سوامی جی کا براڈ کاسٹنگ اور ٹیلی فون ہو چکا۔ تو اُردو بازار کی قومی درسگاہ یعنی مولانا سمیع اللہ کی کتابوں کی دوکان (مولانا سمیع اللہ، مرحوم مفتی کفایت اللہ کے داماد ہیں۔ آپ جیسا مخلص اور مہمان نواز بھی شائد دہلی میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ صبح سے شام تک آپ کی دوکان پر علم دوست، اخبار نویس، شعرا اور ممبران اسمبلی و پارلیمنٹ وغیرہ حضرات آتے رہتے ہیں۔ اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ اور علم و سیاست پر بحث ہوتی ہے۔ اور مولوی صاحب کو چاہے۔ دو روپیہ کی کتاب ایک روپیہ میں پڑ دسیوں کو دینی پڑے، آپ ان سب کی چائے سے تواضع کرتے ہیں) پر کسی نے سوامی جی سے کہہ دیا۔ کہ براڈ کاسٹنگ اور ٹیلی فون وغیرہ دیوان سنگھ کی شرارت ہے۔ ورنہ نہ براڈ کاسٹنگ ہوا۔ نہ الہ آباد سے ٹیلی فون آیا۔ سوامی جی نے جب یہ سُنا۔ تو ان کو شک ہوا۔ کہ شائد یہ تمام "جعلسازی" ہی ہو۔ سوامی جی تشریف لائے۔ تو بہت خفا اور مغموم تھے۔ میں نے پوچھا۔ سوامی جی کیا بات ہے۔ آج جی تو اچھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ دیکھو سچ بتاؤ یہ ٹیلیفون اور براڈ کاسٹنگ جعلسازی تھی۔ یا کہ در اصل ٹیلیفون اور براڈ کاسٹنگ ہوا کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ جعلسازی تھی۔ میں نے جب سوامی جی سے سُنا تو میں نے بہت غصہ کی حالت میں کہا۔ "سوامی جی آپ دوسروں کو بے ایمان سمجھتے ہیں، مجھے بہت افسوس ہے۔ کہ آپ نے میری خدمات کی قدر نہ کی۔ ہم لوگ آپ کے لئے کوشش کرتے کرتے مر گئے۔ اور پچیس سال کے بچھڑوں کو ٹیلی فون پر ملا دیا۔ مگر ان خدمات کا معاوضہ آج یہ مل رہا ہے۔ کہ مجھے بے ایمان اور جھوٹا سمجھتے ہیں۔" سوامی جی کو جب میں نے ڈانٹا۔ تو سوامی جی نے کہا۔ کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ براڈ کاسٹنگ بھی ہوا اور ٹیلی فون بھی۔ کیونکہ براڈ کاسٹنگ کے متعلق دہلی سے باہر کے شہروں سے بھی خطوط آئے۔ اور ٹیلیفون میں "اُوہنہ آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں" کون کہہ سکتا تھا؟ مگر لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ سب جعلسازی تھی جب سوامی جی میرے

Marfat.com

غصہ کے باعث ٹھنڈے ہوئے۔ تو میں پھر نرم ہو گیا۔ اور میں نے اپنے غصہ کے متعلق سوامی جی سے معافی طلب کی۔ اور سوامی جی سے حلف لیا۔ کہ ان کو میرے اخلاص اور میری خدمات و سچائی کے متعلق کوئی شک نہیں۔

سوامی جی چند سال ہوئے دہلی سے بریلی چلے گئے۔ کیونکہ وہاں کے رادھے شام پریس والوں نے ان کو ہندی کی ایک تصنیف کے سلسلہ میں وہاں بلا لیا۔ بریلی میں سوامی جی نے وہاں کے لوگوں سے براڈ کاسٹنگ اور الہ آباد سے ٹرنک ٹیلیفون کا ذکر کیا۔ تو ان لوگوں نے بھی سوامی جی سے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ نہ براڈ کاسٹنگ ہوا۔ اور نہ ٹیلیفون آپ لوگوں کے کہنے سے پھر متاثر ہو گئے۔ اور آپ نے مجھے ایک خط لکھا۔ کہ میں جھوٹا اور بے ایمان ہوں۔ نہ براڈ کاسٹنگ ہوا۔ اور نہ ٹیلیفون اور میں نے سوامی جی کو بے وقوف بنایا۔ سوامی جی کا جب یہ خط مجھے ملا۔ تو مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سوامی جی کو رجسٹرڈ نوٹس دیا۔ کہ آپ نے مجھے جھوٹا اور بے ایمان لکھ کر میری توہین کی ہے۔ آپ پانچ ہزار روپیہ بطور ہرجانہ ادا کرو۔ ورنہ آپ پر فوجداری اور دیوانی دعویٰ دائر کر دیا جائے گا۔ میرا یہ نوٹس جب سوامی جی کے پاس پہنچا۔ تو آپ بہت گھبرائے۔ اور آپ نے خط لکھا۔ کہ آپ تو فقیر ہیں، آپ کے پاس ہرجانہ دینے کے لئے پانچ ہزار روپیہ کہاں ہے مگر آپ صدق دلی کے ساتھ معافی چاہتے ہیں۔ اور اقرار کرتے ہیں۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" سچا اور ایمان دار آدمی ہے۔

اس جواب کے بعد سوامی جی کے ساتھ پھر خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اور سوامی جی نے "ریاست" کے "جذباتِ مشرق" کے کالم کے لئے پھر ہندی کے دوہے ہندی کی کتابوں سے منتخب اور ترجمہ کر کے بھیجنے شروع کر دیئے۔ اور ہماری صلح ہو گئی۔ مگر سوامی جی کو براڈ کاسٹنگ اور ٹرنک ٹیلیفون کے متعلق کچھ شک سا رہا۔ سوامی جی بریلی کے کام سے فارغ ہو کر دہلی آ گئے۔ تو پہلے کی طرح آپ نے دفتر "ریاست" میں رہائش اختیار نہ کی۔ بلکہ آپ نے جمنا سے پار ایک گاؤں میں قیام کر لیا جس کا صاف مطلب یہ تھا۔ کہ آپ مجھ پر ناراض ہیں۔ چنانچہ ایک دن میں نے ایک دوست کی ڈیوٹی لگائی۔ کہ سوامی جی کو دفتر "ریاست" میں لایا جائے۔ یہ دوست سوامی جی کو لے آئے۔ تو ان کے آتے ہی میں نے سب سے پہلے ان کے پاؤں چھوئے اور اس کے بعد شکوے اور شکایت کے دفتر کھول دیئے۔ کہ آپ مجھ سیوک کو بھول گئے، آپ نے میری خدمات فراموش کر دیں۔ آپ کا خون سفید ہو گیا ہے۔ آپ کی صورت دیکھنے کو میں ترس گیا ہوں اور مجھ جیسے مخلص دوستوں کو تو بھولنا نہ چاہیئے تھا۔ وغیرہ۔ سوامی جی میری ان التجاؤں سے بہت متاثر ہوئے۔ تو میں ان سے لپٹ گیا۔ اور کہا۔ کہ تب تک نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آپ کا دل میرے متعلق صاف نہ ہو جائے، چنانچہ سوامی جی نے نہ صرف اس کا اقرار کیا۔ بلکہ قسم کھائی کہ ان کا دل بالکل صاف ہے۔ اور وہ ایڈیٹر "ریاست" کو سچا ایماندار مخلص اور خیرخواہ سمجھتے ہیں۔ اس ڈرامہ کے بعد سوامی جی نے وعدہ کیا۔ کہ آپ کبھی کبھی دفتر "ریاست" میں درشن دیتے رہا کریں گے۔ اور اب آپ نے ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آنا شروع کر دیا ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر "ریاست" آپ کا شکرگزار اور احسان مند ہے۔ کیونکہ ایسے صاف دل، معصوم، مخلص اور محبت کے "روحانی" بزرگ کہاں؟

اس مضمون سے پاکستان کے رہنے والے اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اگر پاکستان نے گجرات (پنجاب) کے امام دین کو پیدا کیا۔ تو ہندوستان میں بھی ایک ہندو امام دین یعنی سوامی پارس ناتھ موجود ہیں۔ جو پاکستان کے امام دین کا علم شاعری اور "روحانیت" وغیرہ سب اعتبار سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آہ! افسوس کہ پاکستان کا امام دین انتقال کر گیا۔ خدا ہندوستان کے امام دین کو رہتی دنیا تک یا کم از کم اس زمانہ تک جب تک کہ ایڈیٹر "ریاست" زندہ ہے سلامت رکھے۔ آمین۔

Marfat.com

عدالتوں میں ضمیر کا سودا

"ریاست" کے جاری ہونے سے پہلے کوئی اخبار کسی والیٔ ریاست یا کسی ریاست کی ایڈمنسٹریشن کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی نواب یا مہاراجہ کے متعلق لکھا بھی جاتا۔ تو ان کی تعریف میں اور پبلک مطالبات کے خلاف۔ اور نوابوں اور مہاراجوں کو مبرا من الخطا یعنی گناہوں سے پاک سمجھا جاتا۔ شمالی ہند میں "ریاست" غالباً پہلا اخبار تھا جس نے ریاستوں کے مظالم کے خلاف آواز پیدا کرنے کو اپنا شعار قرار دیا۔ کیونکہ ریاست نابھہ کی ملازمت کے باعث ایڈیٹر "ریاست" کو ذاتی علم تھا۔ کہ ریاستوں میں کیونکر ننگِ انسانیت مظالم ہوتے ہیں۔

"ریاست" نے ایک نئی وضع نئی پالیسی اور نیا شعار اختیار کیا تھا۔ اس کے جاری ہوتے ہی اس کے سینکڑوں معترف پیدا ہو گئے۔ جو ایسے اخبار کی زندگی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اور یہ لوگ ضرورت کے وقت اس کی امداد بھی کرتے اور "ریاست" روز بروز ترقی کی طرف قدم بڑھاتا چلا گیا۔ "ریاست" کی اس کامیابی کو دیکھ کر ہمدردوں اور معترفین کے ساتھ اس کے حاسد اور دشمن اخبارات بھی پیدا ہو گئے۔ ان حاسد اور دشمنوں میں سے کسی نے تو "ریاست" کے والیانِ ریاست پر لگائے گئے الزامات کی تردید کو اپنا شعار قرار دیا۔ تاکہ وہ ان نوابوں اور مہاراجوں کو خوش کر کے ان سے روپیہ لے سکے۔ بعض میں ریاستوں کی صرف تعریف کی جاتی۔ اور اکثر اخبارات نے "ریاست" کے ٹائیٹل کی نقل کرتے ہوئے اپنی شکل و صورت بھی "ریاست" جیسی بنائی۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو "ریاست" کے مقابلہ پر کھڑا کر سکیں۔ یہ اخبارات اپنی انتہائی کوشش کے باوجود زندہ نہ رہ سکے۔ اور کوئی دو ماہ۔ کوئی چار ماہ اور کوئی چھ ماہ زندہ رہ کر بند ہو جاتا۔ اور یہ تماشا سالہا سال تک جاری رہا۔

"ریاست" کو جاری ہوئے تین چار برس ہوئے تھے۔ کہ دہلی سے ایک اخبار جاری ہوا جس کا نام "الخلیل" تھا۔ اس کا دفتر جامع مسجد کے قریب اردو بازار میں تھا۔ اس اخبار نے "ریاست" کی پالیسی کی تقلید کرتے ہوئے نہ صرف والیانِ ریاست بلکہ ریاستوں کے حکام کے خلاف بھی لکھنا شروع کیا۔ مگر بہت عامیانہ زبان اور پست معیار کے ساتھ۔ اس اخبار نے بھوپال کے ایک انجینئر کے خلاف ایک مضمون لکھا جس میں اس انجینئر پر رشوت وغیرہ کے الزامات کے علاوہ اس پر لڑکوں کے ساتھ خلاف وضع فطری کے غلیظ الزامات بھی لگائے کیونکہ اس انجینئر کے دو تین نوجوان لڑکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ اور یہ لڑکے کچھ خوب صورت بھی تھے۔ ان الزامات والے پرچے مختلف پتوں پر بھوپال بھیجے گئے۔ اور وہاں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ ان پرچوں کو جب ان نوجوانوں نے جن کے متعلق یہ مضمون تھا۔ پڑھا۔ تو ان میں انتہائی جوش اور غصہ پیدا ہوا۔ یہ بغیر انجینئر یا اپنے گھر والوں کو اطلاع دیئے دہلی آئے یہاں اس اخبار کے دفتر میں پہنچے۔ اور انہوں نے ایڈیٹر صاحب پر چاقو سے حملہ کیا۔ حملہ کے وقت ہاتھا پائی ہوئی اور شور پیدا ہوا۔ تو یہ ایڈیٹر صاحب کو معمولی سا زخم کرنے کے بعد گرفتاری کے خوف سے بھاگ گئے۔ اور بھاگتے ہوئے ان میں سے ایک اردو بازار میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس لڑکے کی گرفتاری کے بعد مقدمہ پولیس کے ہاتھوں میں گیا۔ دوسرا لڑکا بھی گرفتار ہو گیا۔ شہر میں بہت سنسنی تھی۔ کہ ریاست بھوپال کے لوگوں نے دہلی کے ایک اخبار کے ایڈیٹر پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اخبارات میں ہیجان خیز مضامین کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ جن میں نواب بھوپال پر بھی الزامات لگائے گئے۔ اور عدالت میں پریس رپورٹروں اور پبلک معاملات میں دلچسپی لینے والوں کا ہجوم۔ یہ مقدمہ ایک آنریری مجسٹریٹ رائے صاحب لالہ سنت رام پنشنر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

Marfat.com

کی عدالت میں تھا جن کو دفعہ تیس کے اختیارات بھی حاصل تھے یعنی آپ سات برس تک قید سخت کی سزا دے سکتے تھے۔

مقدمہ عدالت میں گیا۔ تو انجینئر صاحب کے دوست اور لڑکوں کے ورثا مقدمہ کی پیروی کے لیئے دہلی پہنچے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کو اطلاع ملی کہ ان لوگوں نے ایڈیٹر صاحب کو دو ہزار روپیہ دے دیا ہے۔ اور یہ دوسرے موقع کے گواہوں کو بھی اپنے قبضہ میں کر رہے ہیں۔ مگر مجھے یقین نہ آیا کیونکہ اگر ہاتھا پائی کے وقت شور نہ ہوتا۔ تو ایڈیٹر صاحب اس وقت قبر یا کم از کم ہسپتال میں ہوتے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے ان ایڈیٹر صاحب سے پوچھا۔ تو اہنوں نے لاحول ولاقوۃ کہتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ کہ اہنوں نے نہ تو روپیہ لیا۔ اور نہ بھوپال والوں سے کوئی بات کی ہے۔

عدالت میں ابتدائی کاروائی کے بعد ملزم کے خلاف شہادتیں شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے ایڈیٹر صاحب کی شہادت ہوئی۔ جنہوں نے قاتلانہ حملے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے جرح میں ارشاد فرمایا۔ کہ آپ ملزموں کو پہچان نہیں سکتے۔ اور جو ملزم عدالت میں موجود ہیں اہنوں نے حملہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ اور لوگ تھے جنہوں نے حملہ کیا تھا۔ اس قسم کی شہادت ہی دوسرے موقع کے گواہوں کی تھی جس میں بتایا گیا تھا۔ کہ قاتلانہ حملہ تو ضرور ہوا۔ مگر حملہ کرنے والے دوسرے لوگ تھے۔ اور یہ لڑکے نہ تھے۔ اس شہادت کے ذریعہ مقدمہ کا کچومر نکال دیا گیا۔ اور بھوپال کے لوگ خوش کہ ملزم صاف بری ہو جائیں گے۔ شہر میں افواہیں جن میں ایڈیٹر صاحب کے خلاف ملامت کے کلمات استعمال کیئے جاتے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کو افسوس کہ اس طرح قاتلانہ حملہ کے بعد ملزم کا بری ہونا انصاف کے خلاف اور دوسرے ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ چنانچہ بہت غور کرنے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" اصل حالات دریافت کرنے کے لیئے مجسٹریٹ لالہ سنت رام کے مکان پر گیا۔ جو سبزی منڈی میں تھا۔ لالہ سنت رام کے دل میں "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کے لیئے بہت عزت کے جذبات تھے۔ آپ بہت اچھی طرح سے پیش آئے۔ اور جب مقدمہ کے متعلق بات چیت ہوئی تو لالہ سنت رام نے کہا۔

> "سردار صاحب میں یہ جانتا ہوں۔ کہ مقدمہ سچا ہے۔ اور ان لڑکوں نے قاتلانہ حملہ کیا۔ اب جس شخص پر حملہ کیا گیا۔ اگر وہی اپنے بیان میں یہ کہتا ہے۔ کہ حملہ کرنے والے دوسرے لوگ تھے۔ یہ لڑکے نہ تھے۔ تو بتائیے کہ دنیا کی کون سی عدالت ہے۔ جو ملزم کو سزا دے۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ کہ ان بیانات کی موجودگی میں ملزموں پر فرد جرم بھی نہ لگنی چاہیئے۔ ان کو سزا ملنے کا سوال ہی کیا ہے میں قطعی بے بس ہوں۔ مثل کے بیانات کو تو قانون کے ذریعہ ہی ناپا اور تولا جا سکتا ہے۔"

یہ جواب سن کر میں واپس آ گیا۔ اور چند روز کے بعد ملزم بغیر فرد جرم لگائے ناکافی شہادت ہونے کے باعث ڈسچارج یعنی رہا کر دیئے گئے۔ مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد ایڈیٹر صاحب اپنے وطن یو۔پی چلے گئے۔ تاکہ بھوپال کے روپیہ سے کوئی تجارت کریں۔ اور بھوپال کے لوگ فاتح کی حیثیت سے واپس بھوپال پہنچ گئے۔ یہ لوگ جب واپس بھوپال گئے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد ایڈیٹر "ریاست" کے ایک دوست نے ان انجینئر صاحب سے اس مقدمہ کے متعلق بات چیت کی۔ تو انجینئر صاحب نے کہا:-

"دنیا میں ہر شخص کے ضمیر کی قیمت مقرر ہے۔ اور وہ اس قیمت میں خریدا جا سکتا ہے۔ ان ایڈیٹر صاحب کے ضمیر کی قیمت دو ہزار روپیہ تھی۔ یہ روپیہ ادا کر کے ہم نے ان کو خرید لیا۔ اور لڑکے بری ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایڈیٹر صاحب

Marfat.com

صرف زخمی ہوئے تھے۔ اگر قتل ہو جاتے۔ تو ہزار کی جگہ شاید بیس دس بیس یا پچاس ہزار روپیہ صرف کرنے پڑتے۔"

مسٹر ہارنیمن کی تنگدستی

ہندوستان کی صحافت کی تاریخ میں "بمبئی کرانیکل" اور "انڈین سینٹی نل" کے ایڈیٹر مرحوم مسٹر بی۔ جی ہارنیمن کا نام بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسٹر ہارنیمن نہ صرف خود ایک فاضل ترین، بے خوف، انصاف پسند اور غریبوں کے ہمدرد جرنلسٹ تھے۔ بلکہ آپ کی شاگردی میں مرحوم مسٹر عبداللہ بریلوی مرحوم مسٹر سید حسین اور مسٹر پوتھن جوزف جیسے اچھے اخبار نویسوں نے تربیت حاصل کی اور انگریز ہونے ہوئے بھی آپ زندگی بھر ہندوستان کی آزادی کا علم بلند کرتے رہے۔ چنانچہ یہ تاریخی واقعہ تو بہت ہی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ جب ہندوستان کی انگریزی گورنمنٹ نے آپ کے ہندوستان میں داخل ہونے پر پابندی عائد کر دی۔ تو آپ بغیر پاسپورٹ پانڈیچری (فرانس) کے راستے ہندوستان چلے آئے۔ اور اپکی پوزیشن کے خوف سے گورنمنٹ ہند کو جرأت نہ ہوئی کہ یہ مسٹر ہارنیمن کو گرفتار کرتی۔

ایڈیٹر "ریاست" کے مسٹر ہارنیمن کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مسٹر ہارنیمن جب کبھی دہلی آتے۔ تو ایڈیٹر "ریاست" کے مہمان ہوتے اور ایڈیٹر "ریاست" جب کبھی بمبئی جاتا۔ تو مسٹر ہارنیمن سے ہر روز ملاقات ہوتی۔ اور مسٹر ہارنیمن دہلی آئیں یا ایڈیٹر ریاست بمبئی جائے۔ مسٹر ہارنیمن ہمیشہ ہی ایڈیٹر "ریاست" سے دو چار یا پانچ سو روپیہ لیتے۔ کیونکہ آپ غیر معمولی فیاض تھے۔ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ آپ ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھتے اور باوجود کافی تنخواہ پانے کے ہمیشہ ہی مقروض رہتے۔

ایڈیٹر "ریاست" ہر سال بمبئی جایا کرتا۔ اور عام طور پر دس جون کو بمبئی پہنچتا۔ کیونکہ دس جون کے قریب وہاں بارش شروع ہو جاتی ہے۔ اور جب دہلی سے یہاں بارش ہونے کا تار پہنچتا (دہلی میں بارش عام طور پر بیس جون کے قریب شروع ہو جاتی ہے۔ اگر مون سون کی ہوا سست رفتار نہ ہو) تو میں دہلی کے لئے بمبئی سے روانہ ہو جاتا۔ میرا یہ معمول کئی برس رہا۔ اس زمانہ میں مقدمات کے باعث میری مالی حالت اچھی نہ تھی۔ ہزارہا روپیہ ماہوار کا خرچ تھا۔ اور چھتیس ہزار روپیہ کے قریب قرضہ ہو چکا تھا اور قرضخواہوں میں سے دو تین نے دیوانی مقدمات بھی دائر کر دیئے تھے۔ جن کی عدالت سے اقساط مقرر ہو چکی تھیں۔ بمبئی کے لئے دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے ان مقدمہ کرنے والوں میں سے ایک کا سمن میں نے اپنے جیب میں رکھ لیا۔ اور فیصلہ کیا۔ کہ چونکہ میری اپنی مالی حالت اچھی نہیں۔ اب مسٹر ہارنیمن کو اس سفر میں ایک پیسہ نہ دوں گا۔ چاہے مسٹر ہارنیمن کتنی بھی التجائیں کریں۔ روانہ ہوتے وقت میرے پاس پانچ سو روپیہ موجود تھا۔ اور خیال تھا کہ اگر اور ضرورت ہوگی تو "ریاست" کے بمبئی میں نمائندہ مسٹر ہرہنس لال سے لے لوں گا۔ جن کے پاس دفتر کا روپیہ جمع رہتا تھا۔ میں بمبئی پہنچا اور اوزنیٹ ہوٹل میں مقیم ہوا۔ دوسرے روز ٹیکسی میں بمبئی کے ایک نواحی علاقہ میں مسٹر ہارنیمن سے ملنے کے لئے ان کے گھر گیا۔ مسٹر ہارنیمن رات کو سونے کے سوٹ میں تشریف فرما تھے۔ اور مضمون لکھ رہے تھے۔ بہت تپاک سے ملے۔ چند منٹ باتیں ہوئیں۔ تو میں نے پوچھا۔

Marfat.com

کہ اس وقت بارہ بج رہے ہیں۔ اور آپ سلیپنگ سوٹ میں ہی تشریف فرما ہیں۔ کیا دفتر نہ جائیں گے۔ تو آپ نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا کہ ہاں دفتر جاؤں گا۔ اس کے بعد پھر باتیں شروع ہوئیں۔ تو آپ نے پوچھا کہ ریاست کی مالی حالت آج کل کیسی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بہت بری۔ اور میں نے اپنی مالی مشکلات کے ثبوت میں اپنی جیب سے وہ سمن نکالا جو میں ساتھ لے گیا تھا۔ اور کہا کہ یہ دیکھو مجھ پر دیوانی مقدمات بھی چل رہے ہیں۔ اس وقت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ سمن کو دیکھ مسٹر ہارنیمن مسکرا دیئے۔ میں نے کہا کہ سمن کو دیکھ کر تو آپ کو میرے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیئے تھی۔ مگر آپ مسکرا رہے ہیں۔ مسٹر ہارنیمن نے میرے اس سوال کا جو جواب دیا وہ یہ تھا:۔

"میں بھی ہمیشہ مقروض رہتا ہوں۔ اور قرضخواہوں کے تقاضے کے باعث بہت تنگ آجاتا ہوں۔ کیونکہ ان کے ساتھ جھوٹے وعدے کرنے پڑتے ہیں۔ اور جواب دینا اور ٹالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر جب کوئی قرض خواہ مقدمہ کر دے اور میرے پاس سمن آ جائے۔ تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں۔ کہ یہ کمبخت اب تقاضہ کرنے کے لیئے تو نہ آئے گا۔ اور مجھے تنگ تو نہ کرے گا۔ تم بھی خوش نصیب ہوں۔ کہ تمہارے پاس سمن پہنچ گیا۔ اور اب اس قرض خواہ کے زبانی تقاضہ سے تمہیں نجات حاصل ہو گی"۔

قرض خواہوں کے تقاضہ سے نجات حاصل کرنے کا یہ نسخہ دلچسپ تھا۔ اس کے بعد مسٹر ہارنیمن نے اپنی مالی پریشانیاں بیان کرنی شروع کیں۔ مگر میں نے صاف کہدیا۔ کہ میں ایک پیسہ نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ تو میں نے اجازت چاہی اور کہا ٹیکسی موجود ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیئے۔ آپ کو آپ کے دفتر چھوڑ دوں گا۔ اس پر ہارنیمن نے کہا۔ کہ آپ میرے ساتھ ضرور چلتے مگر آپ کی تپلون دھوبی کے پاس ہے اور دھوبی نے تپلون دینے سے انکار کر دیا ہے۔ جب تک کہ اس کے پچھلے پیسے بھی (جو چھ سات روپیہ کے قریب تھے) نہ دے دیئے جائیں۔ اور گھر میں ایک پیسہ موجود نہیں جس کے باعث وہ میرے لیئے چائے بھی تیار نہ کرا سکے۔ میں یہ سن کر سکتہ کی حالت میں تھا۔ ہندوستان کا بہترین اور آل انڈیا شہرت کا جرنلسٹ مسٹر ہارنیمن اور چائے کے لیئے بھی پیسہ نہیں۔ میں نہ رہ سکا۔ ان کے ملازم ممتاز (جو آج کل فلم ایکٹر ممتاز کے نام سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اور کئی فلموں میں کام کر چکے ہیں) کو ایک سو روپیہ کا نوٹ دیا۔ دھوبی سے تپلون آئی چائے تیار ہوئی۔ اور میں نے اور مسٹر ہارنیمن دونوں نے چائے پی۔ اور ہم ٹیکسی میں بمبئی آئے۔ اور میں نے مسٹر ہارنیمن کو ان کے دفتر چھوڑا۔

مسٹر ہارنیمن ایک زمانہ میں بمبئی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ حکومت ان کے قلم سے کانپتی تھی۔ اور پبلک ان کے ساتھ تھی۔ بمبئی کے بڑے بڑے لیڈر ان کے دروازہ پر سجدہ کرتے تھے۔ اور ہندوستان کا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا۔ جو اخبارات پڑھتا ہو۔ اور مسٹر ہارنیمن کے نام سے واقف اور ان کی قابلیت کا مداح نہ ہو۔ مگر مسٹر ہارنیمن زندگی بھر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ اور اکثر آپ نے فاقے بھی کیئے۔ کیونکہ آپ فطرتاً فیاض تھے۔ آپ کی عمر کے آخری زمانہ میں آپ کے چند دوستوں نے آپ کی مالی امداد کے لیئے "ہارنیمن فنڈ" جاری کیا جس میں صرف چند ہزار روپیہ جمع ہو سکا۔ کیونکہ روپیہ اخبارات میں اپیل کرنے سے جمع نہیں ہوا کرتا۔ اس کے

Marfat.com

جمع کرنے کے لئے تو ذاتی اثرات استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ہارنمین کی زندگی کا آخری زمانہ بھی تنگدستی میں بسر ہوا۔ گو آیندہ زمانہ میں ہندوستان کی آئندہ نسل اس شخص کے نام کے کتبے آویزاں کرے گی۔ اور آیندہ زمانہ میں آپ کی یادگاریں قائم کی جائیں گی۔

جہیز کا شکار

کئی برس ہوئے نئی دہلی میں کلکتہ کے ایک ہندو بنگالی کلرک تھے۔ تنخواہ ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار کے قریب تھی۔ ان کی بیوی مر چکی تھیں۔ کوئی لڑکا نہ تھا۔ اور صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام شیلا تھا۔ اس زمانہ میں ہر شے ارزاں تھی۔ اور ان بابوجی کے صرف ایک بچی تھی۔ اس لئے آپ اس بچی پر کافی روپیہ صرف کرتے۔ اور آپ نے اس لڑکی کی تعلیم کا انتظام دہلی کے کوئن میری سکول تیس ہزاری میں کیا تھا۔ جہاں مصارف کی زیادتی کے باعث شرفاء امراء کی لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ شیلا جب چودہ برس کی تھی۔ تو ان کے والد انتقال کر گئے۔ اور گھر میں (جو سرکاری کوارٹر تھا) کوئی نہ رہ گیا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب ایک نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکی صرف اکیلی رہ جائے۔ تو اس کے دل اور ذہن کی کیا کیفیت ہوگی۔ میرے پاس ایک خاتون کا پیغام پہنچا۔ کہ لڑکی اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کے رشتہ دار کلکتہ میں ہیں۔ اور جب تک اس کے چچا اس کو لینے کے لئے نہ آجائیں۔ اس لڑکی کے رہنے کا انتظام کسی خاتون کے ہاں کر دیا جائے۔ لڑکی جوان تھی۔ اور ذمہ داری کا بھی سوال تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس لڑکی کو کوچہ چیلاں کی ایک خاتون کے ہاں بھجوا دیا جائے۔ یہ خاتون بہادر شاہ بادشاہ کے خاندان میں سے اور کوئن میری سکول ہی کی تعلیم یافتہ تھیں۔ یہ "ریاست" اور اس کے ایڈیٹر کی مداح تھیں۔ اور اس خاتون کا کبھی کبھی خط آیا کرتا تھا۔ میں نے ظفر احمد صاحب (جو "ریاست" کے پرنٹر و پبلشر تھے۔ اور دفتر میں کام کرتے تھے۔) کو بھیج کر لڑکی کو کوچہ چیلاں کی اس خاتون کے ہاں بھجوانے کا انتظام کر دیا۔ اور اس خاتون نے اس لڑکی کے لئے اپنے مکان کی اوپر کی منزل میں ایک کمرہ دے دیا۔ اور چونکہ یہ لڑکی ہندو تھی۔ اس کے کھانے کا انتظام اس خاتون نے دریا گنج کے ایک ہندو ہوٹل میں کر دیا۔ جہاں سے ہوٹل کا ملازم دونوں وقت کھانا دے جاتا۔ اور میں نے کلکتہ اس کے چچا کو تار بھجوایا۔ کہ شیلا اکیلی ہے۔ اسے آکر لے جائے۔

دنیا میں زوال کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ملتا۔ شیلا کے چچا نے جب سنا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور شیلا دہلی میں اکیلی ہے۔ تو اس نے بھی کچھ زیادہ پرواہ نہ کی۔ اور لڑکی کو کلکتہ لا کر رکھنا ایک بوجھ سمجھا۔ اور جب اسے بار بار لکھا گیا۔ تو یہ کئی روز بعد دہلی پہنچا۔ اور شیلا دو ہفتہ کے قریب کوچہ چیلاں کی اس خاتون کے ہاں رہیں۔ اس دو ہفتہ کے قیام میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ صرف ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ میرے پاس اطلاع پہنچی۔ کہ شیلا کو بخار ہے۔ میں نے ظفر صاحب کو بھیجا۔ کہ وہ کسی ڈاکٹر کو دکھا کر دوائی کا انتظام کر دیں۔ ظفر صاحب کوچہ چیلاں گئے۔ شیلا کو اس وقت بخار نہ تھا۔ ظفر صاحب نے کہا۔ کہ وہ ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیتے ہیں۔ تو شیلا نے کہا۔ کہ ڈاکٹر کو فیس دینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود ڈاکٹر کے ہاں جا کر اور نبض دکھا کر دوائی لے آئیں گی۔ ظفر صاحب نے ڈولی منگائی (اس زمانہ میں دہلی میں ڈولیوں کا رواج بہت تھا اور عورتیں ڈولیوں میں ہی جایا کرتی تھیں) شیلا جب ڈولی میں سوار ہونے لگی۔ تو کمزوری کے باعث یہ کچھ لڑکھڑا سی گئی۔ ظفر صاحب نے جب دیکھا۔ کہ یہ کمزور ہیں۔ تو چاہا

Marfat.com

کہ سہارا دے کر ڈولی میں بٹھادیں۔ مگر جب ظفر صاحب سہارا دینے والے تھے۔ تو شیلا نے بے اختیاری کے عالم میں کہا "بھائی صاحب مجھے ہاتھ نہ لگانا میں خود بیٹھ جاؤں گی"۔

شیلا ڈولی میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئیں۔ ظفر صاحب ساتھ تھے۔ ڈاکٹر کو نبض دکھائی گئی۔ اور شیلا دوائی لے کر واپس کوچہ چیلاں پہنچ گئیں۔ ظفر صاحب جب دفتر میں واپس آئے۔ تو انہوں نے بتایا۔ کہ جب وہ سہارا دینے والے تھے۔ تو شیلا نے کہا "بھائی صاحب مجھے ہاتھ نہ لگانا میں خود بیٹھ جاؤں گی"۔ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔ اور مجھے وہ زمانہ یاد آگیا۔ جب آج سے چالیس پچاس برس پہلے ہر ہندو عورت کسی غیر مرد کو چھونا بھی پاپ یا گناہ سمجھتی تھی۔

شیلا کو کوچہ چیلاں کی اس خاتون کے گھر قیام کئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ کہ اس کے چچا شیلا کو لینے دلی پہنچے۔ وہ پہلے اپنے بھائی کے کوارٹر میں گئے۔ وہاں پڑوسیوں نے بتایا کہ شیلا کوچہ چیلاں فلاں مسلمان خاندان کے گھر رہتی ہے۔ شیلا کے چچا نے جب یہ سُنا۔ تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور اس نے یہ سمجھ لیا۔ کہ شیلا مسلمان ہو گئی ہے۔ وہ کوچہ چیلاں میں اس خاتون کے یہاں پہنچا اور دروازہ پر شور پیدا کر دیا جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ تم لوگ ایک معصوم لڑکی کو اغوا کر کے لائے ہو۔ شیلا اوپر کے کمرے میں تھی۔ جب اس نے یہ شور سُنا۔ تو نیچے آئی۔ اور چچا کو دیکھا۔ کہ وہ غصہ کی حالت میں دشنام طرازی کر رہا ہے۔ شیلا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اس نے اپنے چچا کو تمام اصل حالات بتائے۔ اور کہا۔ کہ دریا گنج کے ایک ہندو ہوٹل سے کھانا آتا ہے صرف ازراہ ہمدردی اسے یہاں رکھا گیا ہے۔ شیلا کے چچا کو جب اصل حالات معلوم ہوئے۔ تو بے حد شرمندہ ہوا اس نے معافی چاہی۔ اور وہ شیلا کو لے کر رات کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہو گیا۔

شیلا جب کلکتہ پہنچی تو خاندان میں اس کی شادی کا سوال پیدا ہوا۔ اور لڑکے کی تلاش شروع ہوئی۔ بنگالی ہندوؤں میں بغیر جہیز کے کسی لڑکی کی شادی کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ لڑکے والے دس دس پندرہ پندرہ اور بیس بیس ہزار روپیہ طلب کرتے ہیں۔ اور اگر کسی کے پانچ لڑکے ہوں۔ تو اس کا خاندان امیر ہو جاتا ہے۔ شیلا کا باپ معمولی کلرک تھا۔ جو اپنی بیٹی پر فراخدلی کے ساتھ روپیہ صرف کرتا رہا۔ شیلا کے چچا کے پاس بھی روپیہ نہ تھا۔ اور اگر ہوتا۔ تو شاید وہ پھر بھی شیلا کے جہیز میں ہزاروں روپیہ نہ دیتا۔ جہیز کے لئے روپیہ نہ ہونے کے باعث شیلا کے چچا نے اس کی سگائی ایک معمر بنگالی کے ساتھ کر دی۔ جو انبالہ چھاؤنی میں لڈس کلرک تھا۔ شیلا کی شادی ہونے کے چھ ماہ بعد شیلا کا شوہر جگر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ یہ رخصت لے کر علاج کے لئے کلکتہ گیا۔ وہاں ہسپتال میں داخل ہوا۔ اور ہسپتال میں ایک ماہ زیر علاج رہنے کے بعد انتقال کر گیا۔

شیلا کے بیوہ ہوتے ہی گھر کے لوگوں نے اس کو مجبور کیا۔ کہ یہ رواج کے مطابق اپنے بال کٹوا دے تاکہ بدصورت نظر آئے۔ شیلا کوئین میری سکول کی اچھے گھرانے کی لڑکیوں کے ساتھ پڑھی ہوئی تعلیم یافتہ خوب صورت اور نوعمر لڑکی تھی۔ اس نے خواہش ظاہر کی۔ کہ اس کے بال نہ کاٹے جائیں۔ (بنگالی عورتوں کے بال بے حد حسین ہوتے ہیں۔ اور بنگالی عورتیں اپنے بالوں کو لمبے چمکیلے اور خوب صورت بنانے پر کافی محنت کرتی ہیں۔) مگر گھر والوں نے خاندان

Marfat.com

کے وقار کے خیال سے شیلا کے بال کاٹ دیئے۔ شیلا کو ایک کمرے میں بند رہنے پر مجبور کیا گیا۔ تاکہ اس کی منحوس صورت شادی شدہ عورتیں نہ دیکھیں۔ اور ان کا سہاگ قائم رہے۔ کیونکہ بنگالیوں کے خیال کے مطابق سہاگن عورتوں کو صبح ہی صبح بیوہ عورتوں کی صورت نہ دیکھنی چاہیئے۔ شیلا کی جب یہ کیفیت ہوئی۔ تو اس نے مجھے انگریزی میں ایک خط لکھا۔ (کیونکہ وہ اُردو نہیں جانتی تھی۔ اور مَیں بنگالی زبان سے واقف نہ تھا) جس میں اس کے شادی ہونے اور بیوہ ہونے کے تمام حالات تفصیل سے درج تھے۔ اور لکھا تھا۔ کہ ظفر صاحب کو کلکتہ بھیج دو۔ تاکہ وہ دہلی چلی آئے۔ کیونکہ اس کی موجودہ زندگی ناقابلِ برداشت حد تک اذیت میں ہے۔ جب یہ خط پہنچا۔ تو مجھے بے حد افسوس ہُوا۔ مَیں نے ظفر صاحب کو کلکتہ بھیجا۔ کہ وہ شیلا کو دہلی لے آئیں۔ اور یہاں ان کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ظفر صاحب کلکتہ گئے۔ تو وہاں ان کے پہنچنے سے ایک روز پہلے شیلا زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کر چکی تھی۔ ظفر صاحب نے بتایا۔ کہ اس بے گناہ اور معصوم لڑکی کی شادی بعمر اور بیمار شخص کے ساتھ کر کے سوسائٹی نے اس پر بہت بڑا ظلم کیا۔ کیونکہ جہیز کے لئے روپیہ نہ تھا۔ اور جہیز بغیر کوئی اچھا لڑکا شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے اس ظلم کے مقابلہ پر موت کو ترجیح دی۔ یہ دن رات ایک کمرہ میں پڑی رہتی۔ جب اس کی موت ہوئی تو اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ اور صبح گھر والوں نے دیکھا۔ کہ اس کی لاش چارپائی پر پڑی ہوئی ہے۔ ظفر صاحب یہ حالات سُن کر واپس آگئے۔ مجھے حالات سن کر بے حد تکلیف ہوئی۔ مگر سوائے اخبار میں غم و غصّہ اور اظہارِ افسوس کے کر ہی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ اسی ہفتہ شیلا کی موت پر ریاست میں ایک دردناک نوٹ لکھا گیا جس میں جہیز کی لعنت پر آنسو بہائے گئے۔

۱۹۴۷ء کا بیت المال

۱۹۴۷ء میں میرے پاس ایک چپڑاسی رن سنگھ بہت ہی محنتی شریف اور دیانت دار تھا۔ اور یہ ایک عرصہ سے کام کر رہا تھا۔ کیونکہ اگر کوئی ملازم محنتی اور دیانت دار نہ ہو۔ تو اس کا میرے پاس چند روز کام کرنا بھی ممکن نہیں۔ اور جو شخص چند ماہ بھی دفتر ریاست میں کام کرے تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ محنتی اور دیانت دار ہے۔ رن سنگھ کے متعلق مجھے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور نہ اس کو میرے متعلق کسی قسم کی شکایت تھی۔ کیونکہ مَیں ملازموں کے ساتھ ہمیشہ ہی ایسا سلوک کرتا ہوں جیسے یہ اپنی فیملی کے ممبر ہوں۔ یہ رن سنگھ ضلع انبالہ کی تحصیل کھرڑ کا رہنے والا تھا۔

فسادات ہو رہے تھے۔ ایک روز میں محسوس کیا۔ کہ رن سنگھ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے یعنی یہ کام اس طرح نہیں کر رہا تھا جیسا کہ یہ ہمیشہ کرتا تھا۔ مَیں نے ہمدردی کے لہجہ میں اس سے پوچھا۔ کہ تمہارا جی تو اچھا ہے۔ رن سنگھ نے جواب دیا۔ ہاں مَیں بالکل اچھا ہوں۔ مَیں نے پھر پوچھا۔ کہ آج تم دل لگا کر کام کیوں نہیں کر رہے۔ تو اس کے جواب میں اس نے ایک خط میرے سامنے رکھ دیا۔ جو اس کو اپنے گھر سے پہنچا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا۔ کہ "اب تم کو ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً اپنے گھر واپس چلے آؤ۔ مسلمانوں سے لوٹا ہُوا مال ہم نے بہت کافی حاصل کر لیا ہے۔ اور بہت کافی تعداد میں خوب صورت سے خوب صورت مسلمان عورتیں بھی موجود ہیں۔ جتنا مال تم چاہو لے لینا اور اگر عورت کی ضرورت ہو گی۔ تو عورت بھی لے لینا۔ تم فوراً اپنے گاؤں پہنچ جاؤ۔" اس خط کو دیکھ کر مَیں حیران کہ دنیا کو کیا ہو گیا۔ مَیں نے رن سنگھ کو سمجھایا۔ کہ دوسروں کا مال حاصل کرنا گناہ اور پاپ ہے۔ مگر یہ نہ مانا اور ملازمت چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ بعد میں

Marfat.com

معلوم ہوا۔ کہ اس نے کوئی عورت تو حاصل نہ کی۔ کیونکہ یہ شادی شدہ تھا۔ مگر سکھوں کے "بیت المال" میں سے اس نے اپنا حصہ لے لیا۔ اور اس نے اپنے گاؤں میں رہنا شروع کیا۔ یہ کسی زمانہ میں فوج کے ایک ہسپتال میں بطور وارڈ کا کام کرتا تھا۔ اور ٹنکچر آیوڈین اور آیوڈو فارم کو استعمال ہوتے دیکھا کرتا تھا۔ اس نے گاؤں میں بھی پانچ سات ادویات اپنے گھر میں رکھ لیں۔ اور مجھے خط لکھا کہ اس نے ڈاکٹری شروع کر دی ہے۔ اور آئندہ جب اس کو خط لکھا جائے تو ڈاکٹر ... سنگھ کے پتہ پر بھیجا جائے۔

قرول باغ دہلی میں کچھ سکھ رہتے تھے۔ جو موٹر ڈرائیوری وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ فسادات کے دنوں میں انہوں نے لوٹ میں حصہ لیا۔ اور کناٹ پلیس کی ایک ریڈیو کی دکان میں سے یہ دس بارہ ریڈیو اٹھا لائے۔ یہ لوگ ضلع انبالہ کے رہنے والے تھے۔ اور ان کو علم نہ تھا۔ کہ ریڈیو بغیر بجلی کے کام نہیں دے سکتا۔ یہ جب ریڈیو اپنے گھر لے آئے تو ان کے گھر میں بجلی نہ تھی۔ انہوں نے بہت کوشش کی۔ کہ ریڈیو بولنا شروع کریں۔ اور انہوں نے ریڈیو چلانے والے پرزوں کو بہت گھمایا۔ مگر ریڈیو نہ بولے تو یہ پڑوس کے ایک دوست کو لائے جس کے گھر میں ریڈیو تھا۔ اور پوچھا کہ یہ ریڈیو کس طرح چلایا جائے۔ ان کے اس دوست نے بتایا۔ کہ یہ بغیر بجلی کے نہیں چل سکتا۔ تو یہ مایوس ہو گئے۔ اور انہوں نے سو روپیہ کا مال پچیس روپیہ میں فروخت کر دیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ کہ یہ ریڈیو سیٹوں کو اپنے گاؤں لے جائیں گے۔ مگر وہاں بھی بجلی نہ تھی۔ اس لئے ان کے پاس اس "بیت المال" کو فروخت کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایڈیٹر "ریاست" ۱۹۴۲ء میں جن دنوں فیروز پور جیل میں نظر بند تھا۔ وہاں ہمارے ساتھ دہلی کے ایک وکیل بھی نظر بند تھے۔ جو کانگرس کے حلقوں میں کافی معتبر سمجھے اور قومی تحریکوں میں حصہ لینے کے اعتبار سے پیش پیش تھے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دنوں میں مجھے اطلاع ملی۔ کہ حضرت بھی لوٹ میں حصہ لے رہے ہیں۔ اور ایک شخص نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ لوہے کی الماریوں کی ایک دکان میں سے لوہے کے بکس لوٹ رہے ہیں۔ فسادات کے دن تھے۔ ڈاکخانہ بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ اخبارات شائع نہ ہو رہے تھے۔ اور "ریاست" بھی بند تھا۔ اگر اخبار جاری ہوتا۔ تو میں ان وکیل صاحب کے اس "کانگرس ازم" کو بے نقاب کر دیتا۔ میں نے اس کا ذکر چند کانگرسی حضرات سے کیا۔ تو انہوں نے اس وکیل سے دریافت کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اگلے روز یہ وکیل صاحب دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ اور انہوں نے اس خیال سے معافی چاہی۔ کہ اخبار جاری ہونے پر ان کی مٹی پلید نہ ہو۔ اور کہا۔ کہ یہ لوٹ کا مال واپس کر دیں گے۔ اس واقعہ کے بعد کبھی معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ انہوں نے کسی قومی تحریک میں حصہ لیا ہو۔ میرا خیال ہے۔ کہ چونکہ کانگرسی حضرات کو ان کے اعمال نامہ کا علم ہو چکا تھا۔ یہ خود ہی شرم محسوس کرتے ہوئے قومی دلچسپی سے الگ ہو گئے۔

فسادات کے زمانہ میں ایک دوست تشریف لائے۔ یہ مرکزی گورنمنٹ کے دفتر میں ملازم تھے۔ ان کے پاس پارکر کا نیا قلم تھا۔ اور میرے قلم کا نب گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس لئے میں معمولی قلم دوات کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ آج کل قلم بہت ارزاں ہیں۔ میں پارکر کا ایک نیا قلم کیوں نہیں خرید لیتا۔ میں نے جواب دیا۔ کہ پارکر کا قلم ساٹھ ستر روپیہ سے کم قیمت میں نہیں مل سکتا۔ اور اخبار بھی فسادات کے باعث بند

Marfat.com

ہے۔ اتنی قیمت ادا کرنے کی ہمت نہیں۔ میرے اس جواب پر آپ نے اپنا نیا قلم دکھایا۔ اور فرمایا۔ کہ انہوں نے یہ قلم بیس روپیہ میں خریدا ہے۔ اور جتنی تعداد میں ضرورت ہو۔ یہ قلم بیس بیس روپیہ میں مل سکتے ہیں۔ میں حیران کہ بازار میں یہ قلم ساٹھ ستر روپیہ میں نہیں مل سکتا۔ اسے بیس روپیہ میں کون دے گا۔ میں نے جب زیادہ تفصیل کے ساتھ پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے فسادات کے دنوں میں مال لوٹا ہے۔ وہ یہ قلم بیس بیس روپیہ میں فروخت کر رہے ہیں۔ اس دوست نے چاہا۔ کہ میں ان کا قلم مفت ہی لے لوں۔ مگر میرے ضمیر نے اجازت نہ دی۔ اور میں نے جواب دیا۔ کہ اگر سیٹھ ساہوکار کا یا والیٔ ریاست کی دوکان کا لوٹا ہوا مال ہوتا۔ تو میں شاید لے لیتا، غریبوں کی دوکان کا لوٹا ہوا مال خریدنے یا مفت لینے کی ہمت نہیں۔ کیونکہ مجھے خوف ہے۔ کہ یہ قلم شاید مجھے دس قلموں کی قیمت ادا کرنے کے بعد میرے ایمان اور ضمیر کو بھی لے ڈوبے۔ اس دوست نے بار بار کہا۔ کہ میں یہ قلم ان سے لے لوں۔ مگر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ میں "بیت المال" کے اس قلم سے لکھ ہی نہ سکوں گا۔

مرحوم شیخ ضیاالحق کی علم دوستی

غالباً ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ ہندوستان کے تین محبانِ وطن (۱) صوفی انبا پرشاد (۲) سردار اجیت سنگھ (مشہور انقلاب پسند مرحوم سردار بھگت سنگھ کے حقیقی چچا) اور (۳) شیخ ضیاالحق (مولانا عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو کے حقیقی بھائی) غیر ممالک کی امداد کے ذریعے ہندوستان کو انگریزی حکومت سے نجات دینے کے لئے ہندوستان سے باہر گئے۔ ان میں سے صوفی انبا پرشاد کا تو ایران میں انتقال ہو گیا۔ سردار اجیت سنگھ ایران سے روپوش ہو کر یورپ چلے گئے اور شیخ ضیاالحق برطانوی سفیر متعینہ ایران کے ایما سے طہران میں گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کے بعد ہندوستان لائے گئے یہاں سات برس تک قید رہے۔ اور اس کے بعد رہا ہوئے۔

شیخ ضیاالحق مرحوم مولانا محمد علی کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ اور آپ نے مرحوم مولانا محمد علی کو خواجہ حسن نظامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ مشہور خط دیا تھا جس کی بنیاد پر مرحوم مولانا نے خواجہ حسن نظامی پر انگریزوں کی جاسوسی کا الزام لگایا۔ اور جو خط خواجہ حسن نظامی کی موت کا باعث ہوا۔

"ریاست" کے جاری ہونے کے دو برس بعد شیخ ضیاالحق نے مجھے کئی خطوط لکھے۔ کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ مجھے خواجہ حسن نظامی کی پارٹی کے احباب نے بتایا تھا۔ وہ خطرناک قسم کے آدمی ہیں۔ یہ خطوط دو سال کے مسلسل عرصہ میں لکھے گئے۔ مگر شیخ ضیاالحق میرے جواب نہ دینے سے بھی مایوس نہ ہوئے انہوں نے اپنے ایک گہرے دوست لالہ کیدار ناتھ سہگل (جو بعد میں پنجاب اسمبلی کے ممبر تھے۔ اس زمانہ میں انارکسٹوں کے ساتھ تعلق رکھنے میں مشہور تھے۔ اور میرے بھی گہرے دوست ہیں) کو میرے پاس بھیجا۔ اور دریافت کیا۔ کہ میں شیخ صاحب کے خطوط کا کیوں جواب نہیں دیتا۔ اور کیوں نہیں ملتا۔ میں نے جواب دیا۔ کہ شیخ ضیاالحق خطرناک قسم کے آدمی ہیں۔ جو پرائیویٹ تحریروں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں ایسے شخص سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مگر لالہ کیدار ناتھ نے کہا۔ کہ مجھے غلط بتایا گیا ہے۔ شیخ ضیاالحق غیر معمولی اچھے، بہادر، انتہائی محب الوطن اور حریت پرست دوست ہیں اور میں ضرور ان سے ملوں۔ لالہ کیدار ناتھ کے زور دینے پر میں نے کہہ دیا بہت بہتر، شیخ صاحب تشریف لا سکتے ہیں۔

Marfat.com

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد شیخ ضیاء الحق ملنے کے لیے تشریف لائے۔ اس پہلی ملاقات میں بہت باتیں ہوئیں مگر میں محتاط تھا۔ کہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکل جائے جس کا یہ ناجائز فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ ریاستوں کے حالات دریافت کرتے رہے۔ اور میں جواب دیتا رہا۔ کیونکہ یہ ریاستوں کے متعلق بہت اکسپرٹ تھے۔ ریاستوں کے مظالم کو بے نقاب کرنے کے لیے درجنوں پمفلٹ لکھ چکے تھے۔ گرفتار بھی ہوئے اور مسلمان والیانِ ریاست ان سے بہت خوفزدہ تھے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ تک رہی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد پھر تشریف لائے۔ اس کے بعد کبھی کبھی تشریف لاتے۔ اور میں نے محسوس کیا۔ کہ بہت ہی مخلص اور محبت کے شیدائی ہیں۔ جتنا ان کے قریب جاؤں ان کے لئے اتنی ہی عزت و محبت کے جذبات میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک دو برس کی ملاقات کے بعد ان کے ساتھ میرے تعلقات اس قدر گہرے ہو گئے۔ کہ ہر اتوار کی صبح کو اپنی بیوی سے بہت اچھا اور لذیذ کھانا پکوا کر دس بجے کے قریب ہاپڑ سے دہلی میرے ہاں پہنچتے۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ شام کے چار بجے تک باتیں کرتے اور اس کے بعد واپس ہاپڑ چلے جاتے۔ اور آپ کا یہ معمول کئی برس تک جاری رہا۔

شیخ ضیاء الحق کی عمر اس وقت غالباً پچھتر برس کی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ انرجی والا انسان نہیں دیکھا۔ صوفہ یا کرسی پر دس منٹ سے زیادہ نہ بیٹھ سکتے۔ اور ٹہلنے لگتے۔ کسی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے غصہ میں آتے تو کھڑے ہو کر اس شخص کو گالیاں دینے لگ جاتے۔ آپ اعلیٰ درجہ کی شراب تھوڑی مقدار میں پیتے۔ جس کے باعث آپ کی صحت بہت اچھی اور چہرہ کا رنگ سرخ تھا۔ آپ بہت بڑے وضعدار۔ دوستوں کے لئے مرنا بھی اپنے لئے باعث فخر سمجھتے۔ بہت بڑے مہمان نواز اور مخلص اور میرے نہ صرف بہت بڑے مداح بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ مجھ سے اپنے عزیزوں کی طرح محبت کرتے تھے جس کے باعث مولانا عبدالحق بھی مجھ پر کرم فرماتے ہیں۔

میں ایک روز بیمار تھا۔ بخار کی حالت میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور میرے پاس لالہ کانشی رام کپور (رائے بہادر ڈاکٹر مہاراج کرشن کپور کے حقیقی بھائی اور میجر کپور، آف انڈین پولیٹیکل سروس کے حقیقی چچا) بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ شیخ ضیاء الحق ہاپڑ سے تشریف لے آئے۔ شیخ صاحب جب بیٹھے۔ تو میں نے لالہ کانشی رام کپور سے ان کا تعارف کراتے ہوئے مذاق سے کہا۔ "آپ شیخ ضیاء الحق ہیں۔ جو میری پیدائش سے بھی کئی برس پہلے سے ریاستوں کے متعلق دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور والیانِ ریاست کے خلاف درجنوں پمفلٹ لکھ چکے ہیں۔" لالہ کانشی رام نے جب یہ سنا۔ تو آپ نے شیخ ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے مذاق سے کہا۔ "باباجی اس اپنے برخوردار (یعنی دیوان سنگھ) کو بزرگانہ دعائیں دیجئے۔ تاکہ یہ اپنے فن (یعنی والیانِ ریاست کے خلاف لکھنے) میں زیادہ کامیاب ہو۔" لالہ کانشی رام کپور کے یہ الفاظ سن کر شیخ ضیاء الحق نے فوراً جواب دیا۔ "میں اس برخوردار کو کیا دعائیں دوں۔ والیان ریاست کو بے نقاب کرنے کے اعتبار سے تو یہ میرا بھی باپ پیدا ہو گیا۔" شیخ ضیاء الحق کے یہ الفاظ سن کر ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور لالہ کانشی رام نے شیخ صاحب کے اس دلچسپ جواب کی خوب داد دی۔

شیخ ضیاء الحق خود بھی بہت فیاض اور مہمان نواز تھے۔ اور ان لوگوں کی بہت داد دیا کرتے جو فیاضی کے ساتھ روپیہ صرف کرتے۔ یا مہمان نواز ہوتے۔ میں شیخ ضیاء الحق کے لئے اپنے گھر میں اعلیٰ درجہ کی برانڈی یا بیئر تیار

Marfat.com

ضرور رکھتا۔ کیونکہ یہ آپ کو بہت مرغوب تھی۔ اور جب آتے دو تین پیگ ضرور پیتے۔ ایک پیگ مجبور کرکے مجھے بھی پلاتے کیونکہ میں شراب پینے کا عادی نہیں۔ کئی کئی ماہ کے بعد کسی دوست کے مجبور کرنے سے زیادہ سے زیادہ ایک پیگ پی لیا کرتا ہوں۔ ایک روز میں صدر بازار گیا۔ تو وہاں کراکری کی دوکان پر بہت خوب صورت گلاس کٹ صراحی پڑی تھی۔ جو شراب رکھنے کے لئے تھی۔ اس صراحی کو دیکھ کر مجھے شیخ صاحب یاد آگئے۔ میں نے وہ صراحی اٹھارہ روپیہ میں خرید لی۔ اور گھر پہنچنے کے بعد برانڈی کی ایک بوتل اس میں ڈال دی۔ کیونکہ اس میں اتنی مقدار کے لئے ہی جگہ تھی۔ تین روز کے بعد شیخ صاحب تشریف لائے اور آپ نے برانڈی طلب کی۔ تو میں نے بکس میں سے صراحی نکال کر شیخ صاحب کے سامنے رکھی۔ شیخ صاحب بہت خوش ہوئے اور آپ نے اس میں سے دو تین پیگ پیئے۔ اور باتیں کرتے رہے۔ ان کے پینے کے بعد میں نے یہ صراحی بکس میں رکھوا دی۔ تو چار بجے کے قریب جب ریلوے اسٹیشن کو جانے لگے۔ تو آپ نے اس بکس میں سے صراحی نکال لی۔ اور اسے اپنی بغل میں دبا کر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے کہا "شیخ صاحب یہ صراحی کہاں لئے جا رہے ہو۔ میں تو اسے بہت شوق کے ساتھ اٹھارہ روپیہ خرچ کرکے لایا ہوں۔" شیخ صاحب نے میرے کہنے کا جو جواب دیا وہ مجھے اب تک یاد ہے آپ نے فرمایا "میں یہ جانتا ہوں۔ کہ یہ صراحی تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ دوسری اشیاء کی طرح تم سے یہ صراحی بھی کوئی نہ کوئی لے جائے گا۔ اور جب کوئی دوسرا لے جائے گا۔ تو میں ہی کیوں نہ لے جاؤں۔"

یہ کہتے ہوئے شیخ صاحب چلے گئے۔ اور جب اگلے اتوار کو آئے۔ تو آپ نے کہا کہ آپ صرف اس خوف سے صراحی لے گئے تھے۔ کہ اسے کوئی نہ کوئی دوسرا اڑا لے جائے گا۔ یہ صراحی بہت خوب صورت ہے۔ یا پڑی میں محفوظ ہے۔ اور اگر میں یہ حلفاً اقرار کروں۔ کہ میں کسی دوسرے کو نہ دوں گا۔ تو آپ اگلے ہفتہ یہ صراحی واپس دے جائیں گے۔

شیخ ضیاء الحق بہت بڑے علم دوست تھے۔ ہزارہا کتابوں کے علاوہ آپ کے پاس آج سے ساٹھ ستر برس پہلے کے اخبارات اور رسائل بھی موجود تھے۔ جو اس وقت قطعی نایاب ہیں۔ بلکہ ایک فائیل تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کے ایک اردو اخبار کی بھی تھی جب کبھی کسی واقعہ کا ذکر ہوتا۔ تو آپ اپنی دلیل کی تائید میں اس زمانہ کے اخبار کا فائل پیش کر دیتے۔ اور کتابوں کے متعلق تو پوزیشن یہ تھی۔ کہ شاید ہی اردو زبان کی کوئی اہم کتاب ایسی ہوگی۔ جو آپ کے پاس نہ تھی۔ اور آپ کے فائلوں میں پچھلے پچاس برس کے خطوط بھی موجود تھے۔ جو بڑے لوگوں نے آپ کو لکھے۔ آپ کی کتابوں اور اخبارات کی فائلوں کا جب کبھی ذکر آتا۔ تو میں شیخ صاحب سے مذاقاً کہا کرتا۔ شیخ صاحب ایک وصیت کر جائیے۔ کہ آپ کے مرنے کے بعد آپ کا یہ تمام سٹاک مجھے دیا جائے۔ شیخ صاحب میری اس خواہش پر مسکرا دیتے۔ مگر میں جانتا تھا۔ کہ جو شخص پچاس ساٹھ برس سے اخبارات اور رسائل کے فائل جمع کر رہا ہو۔ اس کے لئے یہ علمی خزانہ جدا کرنا ممکن نہیں شیخ ضیاء الحق کا جب انتقال ہوا تو میں جیل میں تھا۔ جیل سے واپس آنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں "ریاست" پھر جاری کیا۔ تو ایک روز دوپہر کے وقت دیکھا۔ کہ مرحوم شیخ ضیاء الحق کے صاحبزادہ کتابوں سے بھری ہوئی چار بیل گاڑیوں کے ساتھ دفتر "ریاست" میں تشریف لائے ہیں۔ میں حیران کہ

Marfat.com

یہ کیا بات ہے۔ شیخ صاحب کے صاحبزادہ سے پوچھا۔ تو آپ نے بتایا کہ آپ کے ابا یعنی شیخ ضیاء الحق نے انتقال سے ایک روز پہلے کہا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد تمام فائل اور کتابیں دیوان سنگھ کو بھیج دی جائیں۔ اور آپ وہ کتابیں اور فائل لائے ہیں۔ یہ سُن کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے کیونکہ میں کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ کسی دن لاہور جا کر شیخ صاحب کے مقبرہ پہ حاضری دوں۔ ان بیل گاڑیوں سے کتابیں اور اخبارات و مثل کے فائل اتروائے گئے۔ اور ایک کمرہ میں رکھوائے۔ تو اس بیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرہ میں ایک گز اونچی جگہ پہ یہ علمی خزانہ رکھا گیا۔ یہ فائل اور کتابیں دو ماہ تک اس کمرہ میں رہیں۔ جو دوست آتا دس بیس یا پچاس کتابیں اٹھائے جاتا۔ کیونکہ بعض کتابیں ایسی تھیں۔ جو اس وقت کہیں نہیں مل سکتیں۔ میری حالت یہ کہ نہ تو مجھے ان کتابوں اور فائلوں کے پڑھنے کی فرصت، نہ ان کو محفوظ رکھنے کا سلیقہ اور نہ لائبریری کا شوق۔ کیونکہ اگر شوق ہوتا تو میرے پاس اپنی ہی اس وقت کئی ہزار کتابیں ہوتیں۔ ان کے علاوہ یہ بھی خیال۔ کہ دوست ان تمام کو آہستہ آہستہ ختم کر دیں گے۔ میں نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا۔ کہ یہ تمام سٹاک کسی لائبریری کو دیا جائے۔ تاکہ پبلک اس سے فائدہ اٹھا سکے چنانچہ نذیریہ کتب خانہ (جو شمس العلما مولانا ڈاکٹر نذیر احمد کی یادگار میں قائم کیا گیا ہے) کے منتظم مولوی محمد عبد الرؤف کو بلوایا اور اخبارات کے تھوڑے سے فائل خود رکھ کر ان تمام سٹاک کی کتابوں اور فائلوں پہ مہر لگائی گئی جس پر لکھا تھا "یہ کتاب مرحوم شیخ ضیاء الحق نے لائبریری کو نذر کی"۔ اور تمام کا تمام سٹاک اس لائبریری کو بھیج دیا گیا۔ تاکہ یہ لوگوں کے کام آ سکے۔

شیخ ضیاء الحق ان مخلص، بہادر اور محب الوطن لوگوں میں سے تھے۔ جن پر مادر وطن فخر کر سکتی ہے۔ مگر چونکہ ہمارے وطن میں فدایانِ وطن کے حالات قلمبند کرنے کا نہ شوق ہے۔ نہ ذریعہ۔ اس لئے آج سے پچاس برس کے بعد شاید ہی کوئی شخص آپ کے نام سے واقف ہو۔

ہندوستانی وضعداریاں

ہم دو بھائی تھے اور ہماری دو بہنیں تھیں۔ میری بڑی بہن کا جب انتقال ہوا۔ تو میری عمر غالباً پانچ برس کی ہو گی۔ اور مجھے اس بہن کی نہ تو شکل یاد ہے۔ اور نہ کوئی بات صرف اتنا یاد ہے۔ کہ جب ان کا انتقال ہوا۔ تو میں خاندان کے دوسرے بچوں کے ساتھ گھر کے لوگوں کا گوردوارہ میں انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ مرگھٹ گوردوارہ کے قریب تھا۔ اور لاش کو جلانے کے بعد گھر کے لوگوں نے مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے گوردوارہ میں آنا تھا۔ میری اس بہن کی عمر ان کے انتقال کے وقت غالباً اٹھارہ برس کی ہو گی۔ ان کی شادی رائے صاحب لالہ لال چند ملہوترہ سب ڈویژنل آفیسر کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور شادی کے بعد یہ بہت تھوڑا عرصہ زندہ رہیں اور ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ ویسے تو چونکہ میری اس بہن کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اور ان کے انتقال کے بعد میرے بہنوئی لالہ لال چند نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ہمارا اس خاندان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہنا چاہئیے تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ لالہ لال چند جب تک زندہ رہے۔ اُن کا ہمارے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ میری والدہ جب کبھی لاہور جاتیں (لالہ لال چند لاہور کے رہنے والے تھے) یہ لالہ لال چند اور ان کی دوسری بیوی سے ملے بغیر واپس

Marfat.com

نہ آئیں۔ یہ لالہ رام چند کی بیوی سے اپنی بیٹی جیسا سلوک کرتیں۔ جب بھی ملنے کا اتفاق ہوتا۔ ان کو رسم کے طور پر اپنی بیٹی سمجھتے ہوئے دو چار روپیہ ضرور دیتیں۔ لال چند جی کے ساتھ ہمیشہ خط وکتابت جاری رہی۔ اور چند برس ہوئے یہ اپنے انتقال سے پہلے جب علاج کے لئے دہلی آئے تو انہوں نے مجھے اپنا عزیز سمجھتے ہوئے حکیم محمد احمد خاں صاحب کو دکھانے وغیرہ کا موقع دیا۔ اور اب بھی جب کبھی مرحوم لال چند کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں ایک خوشگوار سی یاد کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ جن کو قلمبند کرنا ممکن نہیں۔

کئی برس ہوئے میری والدہ ہردوار گئیں۔ تو میرے وطن حافظ آباد سے دوسرے جو لوگ ان کے ساتھ گئے ان میں لالہ دیس راج پاہوہ سیشن جج (جو پچھلے دنوں ڈپٹی کسٹوڈین جنرل تھے) کی والدہ بھی تھیں۔ اور چند روز میری والدہ اور دیس راج جی کی والدہ ہردوار رہیں تو وہاں دیس راج جی کی والدہ نے گنگا کے کنارہ میری والدہ کی بیٹی بننے کی رسم ادا کر دی۔ اس رسم کے ادا کرنے کے بعد میری والدہ اور دیس راج جی کی والدہ کے درمیان وضعداری کی کیفیت یہ تھی۔ کہ میری والدہ فی الحقیقت دیس راج جی کی والدہ کو اپنی بیٹی یعنی میری حقیقی بہن سے زیادہ عزیز سمجھتی تھیں اور دیس راج جی کی والدہ مجھے اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ عزیز سمجھتیں۔ میرے اور دیس راج جی کے تعلقات اس قدر گہرے رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ اور اس سلسلہ کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ میرے نوٹوں کے مقدمہ میں رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس میرے صفائی کے گواہ تھے۔ اور جب یہ شہادت کے لئے عدالت میں آئے تو ان سے سوال کیا گیا۔ کہ آپ کی اور دیوان سنگھ کی رشتہ داری کیا ہے۔ (لالہ دیس راج چونکہ رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے بھتیجا ہیں۔ اور پولیس کے افسروں کی یہ اطلاع تھی۔ کہ لالہ دیس راج دیوان سنگھ کے بھانجہ ہیں۔ اس لئے پولیس اور سرکاری وکیل دونوں کو یہ یقین تھا۔ کہ ڈاکٹر متھرا داس بھی دیوان سنگھ کے قریبی رشتہ دار ہوں گے) اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر متھرا داس نے کہا۔ کہ ان کی دیوان سنگھ کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں۔ اس جواب کو سن کر پولیس کا نمائندہ اور سرکاری وکیل دونوں بہت غصہ میں متعجب ہوئے۔ گویا کہ ڈاکٹر متھرا داس جیسی بڑی پوزیشن کی اور نیک شخصیت عدالت میں جھوٹ بول کر حلف دروغی کر رہی ہے۔ مگر جب مزید جرح کی گئی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے صاف کہا۔ کہ دیوان سنگھ کھتری ہے اور آپ پاہوہ اروڑہ ہیں۔ اور کوئی رشتہ داری نہیں۔ اور نہ کھتریوں اور اروڑوں میں کوئی رشتہ داری ہو سکتی ہے۔

یہ جواب جرح کرنے والوں کو لاجواب کرنے کا باعث ہوا۔ یعنی اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ لالہ دیس راج دیوان سنگھ کا بھانجہ ہیں۔ مگر ان کو یہ پتہ نہیں۔ کہ یہ رشتہ داری صرف ہردوار کی رشتہ داری ہے۔ جسے ہندوستان کی وضعداری کہنا چاہیئے۔

میری پہلی بیوی کے ساتھ میرے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے۔ اور ان ناخوشگوار تعلقات کے باعث ہی میں نے دوسری شادی کی۔ ان ناخوشگوار تعلقات کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا۔ کہ میری پہلی سسرال والے میرے دشمن ہوتے۔ مگر ہندوستانی گھرانوں کی یہ وضعداری ہے۔ کہ باوجود ناخوشگوار تعلقات رہنے اور میری اس بیوی کے انتقال کے کئی برس بعد بھی میرے ان سسرال والوں کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہیں یہ لوگ جب بھی دہلی آئیں۔ تو بغیر

Marfat.com

ملے نہیں جاتے. کبھی نہ کبھی کوئی شے کرنال (جہاں کہ یہ فیملی تبادلہ آبادی کے بعد اب مقیم ہے)، سے بھیجتے رہتے ہیں۔ اور میری اس بیوی کے بھائی روشن لال پاس جب بھی دہلی آئیں. تو وہ میرے ہاں ہی مقیم ہوتے ہیں حالانکہ میری اس بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور ان تعلقات کے درمیان کوئی کڑی نہ رہنے کے باعث یہ تعلقات ختم ہو جانے چاہئیں تھے۔

ہندوستانی معاشرت میں ہزاروں کمزوریاں سہی مگر جہاں تک ہندوستانی تمدن میں وضعداری کی موجودگی کا سوال ہے، یہ یقیناً ہماری سوسائٹی کے لئے ایک ایسی رحمت ہے جس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں مل سکتی اور اس کو زندہ و جاری رکھنا چاہیے۔

ریاست پٹیالہ کے سیشن ججوں کا بنچ

پیغمبر اسلام حضرت محمد صاحب کی اردو زبان میں آج تک جتنی سوانح حیات لکھی گئیں ان سب میں قاضی محمد سلیمان کی تصنیف "رحمت العالمین" غالباً ممتاز ترین حیثیت رکھتی ہے۔ قاضی محمد سلیمان ان دنوں بھٹنڈہ (ریاست پٹیالہ) میں سیشن جج تھے۔ جن دنوں میں مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں میڈیکل پریکٹس کرتا تھا اور مرحوم قاضی صاحب سے نہ صرف اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا. بلکہ وہ مجھے شفقت کی نظر سے بھی دیکھتے. کیونکہ ان کے عزیزوں میں سے کئی ایک کے ساتھ میرے ذاتی مراسم تھے۔ مرحوم قاضی صاحب نہ صرف ایک فاضل ترین شخصیت تھے۔ بلکہ انتہائی دیانت دار اور بلند کیریکٹر بھی تھے۔ اس زمانہ میں ریاست پٹیالہ میں ہر جگہ دو سیشن جج ہوا کرتے اور یہ دونوں ایک بورڈ یا بنچ کی حیثیت سے ہر مقدمہ کا مل کر فیصلہ کرتے۔ اور قاضی صاحب کے ساتھ دوسرے سیشن جج کرنل سندر سنگھ تھے۔ جو صرف گورمکھی زبان میں دستخط کرنا جانتے اور جو اردو زبان سے بھی ناواقف تھے. مگر دیانتداری وغیرہ کے اعتبار سے یہ بھی بہت بلند تھے. یعنی اس سیشن بورڈ یا سیشن بنچ کے دونوں ممبر ریاستوں کے اہلکاروں کی روائتی بددیانتی کے خلاف دیانت دار تھے. مگر ایک تو فاضل ترین شخصیت اور دوسرے تعلیم سے قطعی ناآشنا. چنانچہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ سیشن کورٹ کے مقدمات قتل وغیرہ کے قانونی نکات کو کرنل سندر سنگھ کیا سمجھتے ہوں گے۔ اور اس بنچ میں اگر یہ اکیلے ہی ہوتے. تو ملزموں کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوتا۔

ایک روز قاضی صاحب اور کرنل سندر سنگھ قتل کے ایک مقدمہ کی سماعت فرما رہے تھے۔ اور سرکاری وکیل قانونی نکات بیان کر رہا تھا۔ کرنل سندر سنگھ ان نکات کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے ان نکات میں دلچسپی لینا بھی ممکن نہ تھا۔ سرکاری وکیل دو گھنٹہ تک بحث کرتا رہا. کرنل سندر سنگھ بحث سے تنگ آ گئے. آپ نے بہت کوشش کی. کہ سرکاری وکیل اپنے دلائل ختم کرے۔ اور ان کا اس بحث سے چھٹکارا ہو. مگر سرکاری وکیل نے بحث ختم نہ کی۔ آخر کرنل سندر سنگھ سے نہ رہا گیا۔ اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے. اور آپ نے قاضی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا. قاضی صاحب آپ اس بحث کو سن لیجئے میں ذرا اپنی کوٹھی پر جا کر اپنے گھوڑوں کو دیکھ لوں (کرنل صاحب کو گھوڑوں کا بہت شوق تھا. اور آپ کے اصطبل میں متعدد اچھے گھوڑے ہوا کرتے)، چنانچہ کرنل صاحب اپنی

Marfat.com

کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ اور اس وقت واپس آئے۔ جب قاضی صاحب سرکاری وکیل کے تمام دلائل سن چکے تھے۔

مذاق کا کفّارہ

ایڈیٹر ریاست کے گہرے دوستوں میں سے ایک صاحب مسٹر محمد یوسف جمالی ہیں۔ جو ملک کی تقسیم کے زمانہ میں دہلی سے لاہور چلے گئے۔ یہ یوسف صاحب بہت مخلص۔ بہت خوب صورت، دہلی کی تہذیب و تمدن کے نمو اور علم و ادب کے پرستار تھے۔ کئی برس ہوئے۔ یہ ریاست جوناگڑھ کے مہمان خانہ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ اور وہاں ان کے تعلقات دوسری بڑی اور مشہور شخصیتوں کے علاوہ مشہور فلم ایکٹرس اور موسیقار وحیدن بائی آگرہ والی (فلم ایکٹرس نمی کی والدہ) سے بھی ہو گئے۔ کیونکہ یہ اس مہمان خانہ میں نواب جوناگڑھ کی مہمان کے طور پر مقیم ہوتیں جو نواب کی سالگرہ کے موقع پر اپنی موسیقی کے کمالات دکھانے کے لئے اپنی بڑی بہن کے ساتھ جوناگڑھ گئی تھیں۔ یوسف صاحب کا بیان ہے۔ کہ وحیدن بائی پر یوسف صاحب کی خوب صورتی کا اثر ہوا۔ اور وہ چاہتی تھیں۔ کہ جوناگڑھ میں کچھ روز اور قیام کرتیں۔ مگر ان کی بہن نے یہ دوستانہ تعلقات ناپسند کئے اور وہ بمبئی چلی گئیں۔ یوسف صاحب کے جوناگڑھ کی ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ کا کئی برس تک یہ معمول رہا۔ کہ وہ شام کو پانچ بجے میرے ہاں آتے دوسرے دوستوں کے ساتھ چائے پیتے۔ چائے پینے کے بعد ہم دونوں جھنجھے کے قریب کار میں سیر کیلئے چلے جاتے۔ سیر سے آٹھ بجے واپس پہنچتے۔ دوسرے دوستوں کیساتھ کھانا کھاتے۔ نو بجے ریڈیو پر خبریں سنتے۔ خبریں سننے کے بعد میں تو سو جاتا۔ اور میرا موٹر ڈرائیور یوسف صاحب کو انکے گھر چھوڑ آتا۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اور اس زمانہ میں ہی ایک دوسرے دوست مسٹر ایس ڈی کرپا رام جو بمبئی میں فلمی گاندھی کے نام سے مشہور ہیں جو بہت نیک منش انسان ہیں۔ اور اس زمانہ میں دہلی کے فلمی انگریزی رسالہ "موویز" کو ایڈیٹ کرتے تھے، بھی قریب قریب ہر روز شام کو تشریف لایا کرتے۔ یہ مسٹر کرپا رام فلمی لائن میں بہت ایکسپرٹ اور قابل قدر و قابل محبت دوست ہیں۔ ایک روز میں، مسٹر کرپا رام اور یوسف صاحب چائے پی رہے تھے۔ اور ریڈیو چل رہا تھا ـــــ تو ریڈیو پر مس وحیدن بائی کا ریکارڈ بجایا گیا۔ جب وحیدن کا ریکارڈ شروع ہوا۔ تو میں نے یوسف صاحب سے مذاقاً کہا۔ "یہ تو تمہاری وحیدن گا رہی ہیں"۔ وحیدن فلمی لائن میں بہت ہر دلعزیز تھیں۔ اور مسٹر کرپا رام فلمی رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ آپ نے جب میرے منہ سے یوسف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے "تمہاری وحیدن" کے الفاظ سنے تو انہوں نے پوچھا۔ یوسف صاحب کی وحیدن کیوں؟ مجھے فوراً ایک شرارت سوجھی۔ میں نے کرپا رام جی کو جواب دیا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں۔ کہ یوسف صاحب کی مس وحیدن سے شادی ہو چکی ہے"۔ یہ جواب میں نے مسکرائے بغیر سنجیدہ صورت بنا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کرپا رام جی کو اس شادی کا یقین آ گیا۔ اور یہ خبر ان کے لئے نئی بلکہ بہت حد تک سنسنی خیز بھی تھی۔ اور آپ نے اگلے روز ہی اس "شادی" کے متعلق اپنے فلمی حلقوں میں اکثر دوستوں سے ذکر کیا۔ کہ وحیدن بائی نے دہلی کے یوسف صاحب سے شادی کر لی ہے۔

مسٹر کرپا رام جب شام کو دفتر ریاست" میں آتے تو دفتر "ریاست" میں پہنچنے سے پہلے چند منٹ کے لئے وہ ناولٹی سینما میں بھی ضرور جاتے۔ تاکہ وہاں اپنے فلمی دوستوں سے دہلی آئی فلموں کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق معلومات حاصل کر لیں۔ مسٹر یوسف کی اس فرضی شادی کی اطلاع کے ایک ہفتہ بعد مسٹر کرپا رام ناولٹی

Marfat.com

سینما کے صحن میں کھڑے تھے۔ یوسف صاحب بھی سڑک پر دفتر "ریاست" کو جا رہے تھے۔ کرپا رام جی نے جب یوسف صاحب کو سڑک پر جاتے دیکھا۔ تو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ اور جب یوسف صاحب ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے سینما کے مالک سیٹھ جگت نرائن جی سے فخریہ انداز میں تعارف کراتے ہوئے کہا۔ کہ "آپ یوسف صاحب ہیں جنہوں نے حال میں مشہور فلم ایکٹریس مس وحیدن سے شادی کی ہے"۔ سیٹھ جگت نرائن نے جب یہ سنا۔ تو ان کے دل میں بھی یوسف صاحب کے لئے قدر کے جذبات پیدا ہوئے۔ اور آپ یوسف صاحب اور کرپا رام جی دونوں کو سینما میں لے گئے۔ وہاں سب سے اعلیٰ درجہ کی سیٹوں پر ان کو بٹھایا۔ اور آئس کریم سے ان کی تواضع کی کیونکہ سیٹھ صاحب فلمی دنیا میں بہت بلند پوزیشن رکھتے تھے۔ اور قدرتی طور پر انہوں نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ وحیدن کے شوہر کی خاطر مدارت ہونی چاہئیے۔ اس خاطر تواضع کے بعد یوسف صاحب اور کرپا رام جی دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ تو انہوں نے بتایا۔ کہ سیٹھ جگت نرائن نے یوسف صاحب کی بہت تواضع کی۔ اس واقعہ کے بعد کرپا رام جی نے کئی دوستوں سے یوسف صاحب کا بطور وحیدن کے شوہر کے تعارف کرایا۔ اور کئی سینماؤں میں یوسف صاحب نے مفت میں فلم دیکھے۔ کیونکہ ہر سینما والا اس خیال میں تھا۔ کہ اگر کبھی کسی فلم کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں وحیدن کی سفارش کی ضرورت ہوئی۔ تو یوسف صاحب کام آئیں گے۔

ایک روز یوسف صاحب کسی دوست کو جو بمبئی سے لاہور جا رہا تھا۔ ملنے کے لئے ریلوے سٹیشن پر گئے۔ تو وہاں سیکنڈ کلاس کے بکنگ آفس کے پاس کرپا رام جی کھڑے تھے۔ علیک سلیک کے بعد کرپا رام جی نے پوچھا۔ کہ "کہاں تشریف لے جا رہے ہیں"۔ یوسف صاحب نے جواب دیا کہ "کمبخت وحیدن بمبئی سے آ رہی ہیں۔ ان کو لینے آیا ہوں"۔ وحیدن کا نام سنتے ہی کرپا رام جی نے کہا۔ کہ اگر آپ فرمائیے تو وہ بھی وحیدن کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔ یوسف صاحب نے جواب دیا۔ "آپ کا شکریہ مگر وہ اب پردہ کرتی ہیں شاید وہ آپ کا جانا پسند نہ کریں"۔ یہ جواب سن کر کرپا جی خاموش ہو گئے اور یوسف صاحب پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ فرنٹیر میل میں جس دوست نے بمبئی سے لاہور جانا تھا۔ یوسف صاحب ان سے ملے اور جب واپس آ رہے تھے۔ تو آپ نے دیکھا کہ کرپا رام جی ابھی تک وہاں ہی سیکنڈ کلاس بکنگ آفس کے پاس کھڑے ہیں۔ کرپا رام جی نے پوچھا۔ کیا وحیدن نہیں آئیں۔ تو یوسف صاحب نے جواب دیا۔ کہ شاید وہ نئی دہلی کے اسٹیشن پر اتر گئی ہوں گی۔ کیونکہ مکان وہاں سے بھی قریب ہے۔ یوسف صاحب اگلے روز دفتر "ریاست" میں پہنچے تو انہوں نے کرپا رام جی کے سٹیشن پر ملنے کا واقعہ بیان کیا۔ ہم کرپا جی کی اسٹیشن کی اس ملاقات کا لطف لے رہے تھے۔ تو کرپا رام جی کا ناولٹی سینما سے ٹیلی فون پہنچا۔ کہ یوسف صاحب ہیں۔ میں نے جواب دیا ہاں تشریف فرما ہیں۔ آپ نے پوچھا۔ کہ کل وحیدن دہلی پہنچی تھیں یا نہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ ہاں نئی دہلی کے سٹیشن پر اتر گئی تھیں۔ اور اس وقت چائے پر تشریف فرما ہیں۔ اس جواب کے بعد کرپا رام جی نے پوچھا۔ کہ کیا وہ دفتر "ریاست" میں آ جائیں۔ تو میں نے کہا۔ کہ ذرا ٹھہرئیے۔ میں یوسف صاحب اور وحیدن سے پوچھ لوں۔ اس کے بعد میں نے ٹیلیفون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر تاکہ کرپا رام جی میری بات سن نہ سکیں۔ میں نے یوسف صاحب سے کہا۔ کہ کرپا رام جی آنا چاہتے ہیں۔ کیا جواب دوں۔ یوسف صاحب اور میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ آخر میں نے اپنی آواز میں سنجیدگی پیدا کی۔ اور ٹیلیفون پر میرے اور کرپا رام جی کے درمیان یہ بات چیت ہوئی

میں ۔ وحیدن کہتی ہیں کہ وہ اب شادی شدہ ہیں ۔ اور کسی غیر آدمی کے سامنے ہونا نہیں چاہتیں ۔
کرپارام جی ۔ اگر وہ پردہ کی اتنی ہی پابند ہیں ۔ تو تمہارے سامنے کیوں آئیں ؟
میں ۔ ان کے میاں نے مجھ سے پردہ نہیں کرایا ۔ اور مسلمانوں میں میاں جس شخص سے پردہ کرانا نہ چاہے ۔ بیوی اس سے پردہ نہیں کرتی ۔
کرپارام جی ۔ اگر وہ پردہ کی اتنی ہی پابند ہیں ۔ تو پھر فلم میں کس طرح کام کریں گی ؟
میں ۔ اس کے متعلق میں وحیدن بائی سے پوچھ کر جواب دیتا ہوں ۔
(میں نے تھوڑے وقفہ کے بعد جواب دیا)
میں ۔ وحیدن بائی کہتی ہیں ۔ کہ وہ تو بزنس کی بات ہے ۔ فلم کے وقت تو بغیر پردہ آنا ہی پڑتا ہے ۔
کرپارام جی ۔ تو اس کا مطلب یہ ہے ۔ کہ یوسف اور وحیدن میرا دفتر "ریاست" میں آنا اور ملنا پسند نہیں کرتے ۔
میں ۔ میں کیا عرض کروں ۔ انہوں نے ایسا ہی کہا ہے ۔ ویسے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لے آئیں ۔ اور یوسف صاحب آپ سے بھی وحیدن کا پردہ نہ کرائیں ۔ اس میں کوئی حرج نہیں ۔
یہ کہنے کے بعد کچھ غصہ اور مایوسی کی حالت میں کرپارام جی نے ٹیلی فون بند کر دیا ۔ اور اگلے روز شام کو آپ نے پھر ٹیلیفون پر پوچھا ۔ تو میں نے کہا ۔ کہ آج وحیدن نہیں ہیں ۔ یوسف صاحب اکیلے ہیں ۔ آپ تشریف لے آئیے چنانچہ کرپارام جی تشریف لائے تو مجھ سے ناخوش تھے ۔ یوسف صاحب سے کھچے کھچے سے تھے ۔ میں نے یہ کہہ کر دونوں کو بے تکلف کر دیا ۔ کہ ہر شوہر کو حق حاصل ہے ۔ کہ وہ اپنی بیوی کا جس شخص سے چاہے پردہ کرائے اور جس سے چاہے پردہ نہ کرائے ۔ اور کرپارام جی کو شکایت نہ کرنی چاہیے ۔
اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد تک کرپارام جی یوسف صاحب سے وحیدن بائی کے متعلق ہر روز خیریت دریافت کر لیتے ۔ اور پوچھ لیتے کہ کب تک قیام ہے ۔ یوسف صاحب معمولی سا رسمی جواب دے دیتے اور دو ہفتہ کے بعد یوسف صاحب نے کرپارام جی سے کہا ۔ کہ وحیدن واپس بمبئی چلی گئی ہیں ۔
ایک ماہ ہو چکا تھا ۔ کہ کرپارام جی کسی فلم ڈسٹری بیوٹر کے کام سے بمبئی جانے والے تھے ۔ انہوں نے یوسف صاحب سے کہا ۔ کہ وہ بمبئی جا رہے ہیں ۔ اگر وحیدن کو کوئی پیغام دینا ہو ۔ یا کوئی سامان بھیجنا ہو ۔ تو مجھے دیں ۔ یوسف صاحب نے کرپارام جی کو ٹالتے ہوئے کہا ۔ چھوڑو جی ۔ ان طوائفوں کا کیا ہے ۔ میں تو محسوس کرتا ہوں ۔ کہ میں نے شادی کر کے غلطی کی ۔ اور میں تو سوچتا ہوں ۔ کہ اسے طلاق دے دوں ۔" یہ سن کر میں نے کہا ۔ دیکھیے یوسف صاحب ایسا خیال نہ کیجیے ۔ اس بیچاری کا کیا جرم ہے ۔ جو اس کو طلاق دیں ۔ آپ کو تعلقات قائم رکھنا چاہئیں ۔ اور کوئی غلط فہمی ہو ۔ تو دور کر لی جائے ۔ کرپارام جی یوسف صاحب کے اس جواب سے کچھ مایوس سے ہوئے ۔ کیونکہ آپ چاہتے تھے ۔ کہ کوئی پیغام یا تعارفی خط مل جاتا ۔ تو آپ وحیدن بائی کے ہاں بے تکلف جا سکتے ۔
کرپارام جی بمبئی گئے ۔ ان کے دل میں فلمی خیال سے وحیدن بائی سے بے تکلف ہونے کی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی ۔ پھر نہ رہ سکے ۔ اور وحیدن بائی کے ہاں جا پہنچے ۔ آپ نے وہاں پہنچنے کے بعد ملازم کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا جس پر انگریزی میں "پی ۔ ڈی کرپارام ایڈیٹر "موویز دہلی" لکھا تھا ۔ ملازم یہ کارڈ اندر لے گیا ۔ اور وحیدن کو دیا ۔ وحیدن

Marfat.com

نے یہ سمجھ کر کہ ایک فلمی رسالہ کا ایڈیٹر ملنے کے لئے آیا ہے (فلم ایکٹریسوں اور ایکٹروں کے پاس فلمی ایڈیٹر کثرت سے ساتھ آتے جا … رہتے ہیں) کرپارام جی کو بلایا۔ کرپارام جی نے جاتے ہی کہا "سردار صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اور … ی آیا تھا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ آپ کا نیاز حاصل کرتا جاؤں"۔ وحیدن نے کچھ نہیں سمجھا کہ کس سردار صاح… نے تعریف کی کیونکہ فلم ایکٹریسوں کے معترفین اور عشاق میں ہزارہا سردار صاحب، خاں صاحب اور لالہ صا… مارے مارے پھرتے ہیں۔ وحیدن نے جواب دیا "آپ کی مہربانی ہے جو تشریف لائے میں کس قابل ہوں"۔ کرپا … ام جی بیٹھ گئے۔ وحیدن نے چائے منگائی کیونکہ فلمی ایڈیٹروں کو بے وقوف بنانے اور اپنی تعریف میں قصیدہ خوانی کرانے کے لئے فلم ایکٹریسیں ان کی بہت خاطر تواضع کرتی ہیں۔ تھوڑی دیر آپ فلموں کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ اور واپس تشریف لے آئے۔

بمبئی کے اس دورہ کے بعد کرپارام جی دہلی پہنچے تو اگلے روز شام کو دفتر "ریاست" میں تشریف لائے یوسف صاحب ابھی نہیں پہنچے تھے۔ کرپارام جی نے بیٹھتے ہی بتایا۔ کہ آپ بمبئی میں وحیدن سے ملے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میرا رنگ فق ہو گیا۔ اور میں نے محسوس کیا۔ کہ ہمارا مذاق بے نقاب ہو گیا ہو گا۔ میں نے بیقراری کے عالم میں پوچھا کہ وحیدن سے کیا باتیں ہوئیں۔ تو کرپارام جی نے بتایا۔ کہ وحیدن کے مکان پر پہنچتے ہی آپ نے وزٹنگ کارڈ بھیجا۔ ملازم کارڈ لے کر اندر گیا۔ تو فوراً ان کو بلا لیا گیا۔ انہوں نے پہنچتے ہی بیٹھنے سے پہلے کہا۔ کہ سردار صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اس لئے ملنے چلا آیا۔ وحیدن بہت تپاک سے پیش آئیں۔ چائے پلائی۔ اور فلموں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔ اور کیا باتیں ہوئیں۔ اور وہاں کیا حالات ہیں۔ تو آپ نے بتایا کہ اور تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ مگر ایک واقعہ دیکھ کر ان کو بہت افسوس ہوا۔ کہ وحیدن کے ہاں دو تین مشٹنڈے کلاس کے ملازم تھے۔ جیسے طوائفوں کے ہاں ہوتے ہیں۔ یوسف کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کو گھر پر نہ رہنے دیں۔ یہ سن کر میں نے انتہائی ہمدردی کے لہجہ میں کہا "بہت افسوسناک واقعہ ہے۔ وحیدن کو چاہئیے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنے گھر پر نہ رکھے۔ کیونکہ اب وہ شادی شدہ ہے۔ یوسف کو علم ہو گیا۔ تو نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ کرپارام جی آپ اس کا ذکر یوسف سے نہ کیجئے۔ ہمیں لوگوں کے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئیے"۔ کرپارام جی نے اس کا جواب دیا "مجھے یوسف صاحب سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ کہ وحیدن نے شادی کر لی۔ مگر اس نے اپنے ہاں ابھی تک مشٹنڈے رکھے ہوئے ہیں"۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے۔ کہ یوسف صاحب آ گئے۔ ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ تو کرپارام جی نے صرف اتنا کہا۔ کہ وہ بمبئی اپنے بزنس کے سلسلہ میں گئے تھے۔ کرپارام جی کے جانے کے بعد میں نے یوسف صاحب کو کرپارام جی کے وحیدن کے انٹرویو اور مشٹنڈوں کا قصہ بیان کیا۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اگلے روز بابا احسان الحق تشریف لائے تو میں نے ان کو بمبئی کا تمام قصہ سنایا۔ اس سے پہلے ان کو یوسف کی فرضی شادی کا قصہ معلوم ہو چکا تھا۔ بھیا بھی دیر تک ہنستے رہے۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے۔ کہ کرپارام جی تشریف لے آئے بھیا احسان میں یہ بہت کمزوری ہے۔ کہ کوئی راز نہیں رکھ سکتے۔ اور غیر ضروری طور پر صاف بیانی کر دیتے ہیں۔ آپ نے کرپارام جی کو ہمارے

Marfat.com

سامنے ہی کہہ دیا۔ کہ یہ دونوں یعنی دیوان سنگھ اور یوسف آپ سے مذاق کر رہے ہیں۔ نہ تو یوسف کی وحیدن سے شادی ہوئی۔ اور نہ وہ دہلی آئی۔ بھیا نے جب یہ کہا۔ تو وہ ہنس بھی رہے تھے۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے فوراً کہا۔ "بھیا صاحب آپ لالہ کرپارام جی کو کیوں بے وقوف بناتے ہیں۔" میرے اس کہنے پر کرپارام جی فوراً بول اٹھے "بھیا صاحب آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں جب بمبئی گیا، تو میں نے وحیدن سے خود کہا۔ کہ سردار صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ میں اس لئے چلا آیا۔ اور وحیدن نے اس کے جواب میں کہا تھا۔ کہ مہربانی ہے۔" کرپارام جی نے ابھی بات ختم ہی کی تھی۔ تو میں نے فوراً کہا۔ "بھیا صاحب آپ ہر شخص سے کیوں مذاق کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے چائے کی پیالی میں چائے ڈالی اور کہا "چھوڑیئے مذاق کو، ایسے مذاق کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا کرتا۔ چائے پیجئے۔" اس روز ہم نے کرپارام جی سے بہت مشکل سے چھٹکارا کرایا۔ ورنہ اس دن بھیا نے ہمیں بے نقاب کر دیا تھا۔

چھ ماہ کے عرصہ تک کرپارام جی کو یہی یقین رہا۔ کہ یوسف صاحب کی وحیدن سے شادی ہو چکی ہے۔ چھ ماہ کے بعد کرپارام جی کو بمبئی میں لوگوں نے بتایا۔ کہ وحیدن کی شادی کی اطلاع غلط ہے۔ اس اطلاع کی تصدیق کے لئے آپ غالباً وحیدن سے بھی ملے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کرپارام جی اس مذاق کے باعث یوسف اور مجھ سے خفا ہو گئے انہوں نے نہ صرف میرے ہاں آنا بلکہ مجھ سے ملنا بھی ترک کر دیا۔ اور اکثر یہ میرے خلاف باتیں کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا کرتے۔ میں نے بہت چاہا۔ کہ کرپارام جی مجھ جیسے نیازمند پر ناراض نہ ہوں۔ اور مذاق کو مذاق سمجھتے ہوئے معاف کر دیں گے مگر ان کا دل صاف نہ ہوا۔

اس کے بعد کرپارام جی بمبئی چلے گئے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ یہ فوج میں بطور کپتان کے بھرتی ہو گئے۔ اور مجھ پر نوٹوں والا مقدمہ قائم ہو گیا۔ میں جب اس مقدمہ میں بری ہوا۔ لاہور ہائیکورٹ کے جج مسٹر مڈ نے پولیس کے خلاف کھلی عدالت میں سخت ریمارک پاس کئے۔ اور اس مقدمہ کو بے بنیاد قرار دیا۔ تو میرے لاہور سے دہلی پہنچنے پر کرپارام جی کا ایک خط میرے پاس پہنچا۔ جو کاغذات میں کہیں محفوظ ہے۔ اس خط کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے:۔

"تم بہت ذلیل قسم کے آدمی ہو۔ جو دوستوں سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تمام عمر تم سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ اور نہ کبھی کوئی خط لکھوں گا۔ مگر اب جب کہ تم مقدمہ میں باعزت بری ہوئے ہو۔ مبارک باد دیتا ہوں۔"

کرپارام جی کا جب یہ خط میرے پاس پہنچا۔ تو میں نے بازار سے ایک سرکاری یعنی عدالتی کاغذ منگوایا۔ اور اس پر ایک روپیہ کا عدالتی ٹکٹ چسپاں کر کے ذیل کا حلف نامہ لکھ کر کرپارام جی کو بمبئی بھیجا۔

"منکہ دیوان سنگھ ولد سردار ندھان سنگھ قوم کھتری کھنہ ساکن حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ حال ایڈیٹر اخبار "ریاست" دہلی بہ حلفیہ اقرار کرتا ہے کہ لالہ کرپارام جی سابق ایڈیٹر رسالہ "مودیٹہ" اگر مجھے دل سے معاف کر دیں۔ تو میں آیندہ کبھی بھی ان سے پہلے کی طرح مذاق نہ کروں گا۔ اور یہ تحریر بطور سند لکھ دیتا ہوں کہ بوقت ضرورت کام آئے۔

نیازمند

دیوان سنگھ"

Marfat.com

میرے اس حلفیہ بیان کو بھی شاید لالہ کرپارام جی نے مذاق مزید یا مذاق جدید سمجھا کر میری اس التجا پر بھی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد کئی بار دہلی آئے۔ مگر انہوں نے اس اپنے دیرینہ نیازمند سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ چنانچہ میں اس "ناقابلِ فراموش" کے ذریعہ آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ میرے اور یوسف صاحب کے قصور کو معاف کر دیں (اگر وہ چاہیں۔ تو یوسف صاحب کے قصور کو معاف نہ کریں کیونکہ وہ اب ایک پاکستانی ہیں) میں ان کا فی الحقیقت نیازمند اور مخلص دوست ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں۔ کہ آئندہ ان سے کبھی ایسا مذاق نہ کروں گا۔

مہاراجہ بھرت پور کا انجام

مرحوم مہاراجہ بھرت پور، (کئی برس ہوئے جن کا انتقال دہلی میں ہوا) نہ صرف ذاتی طور پر عیاش تھے۔ بلکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بے حد کشیدہ تھے۔ اور گورنمنٹ جب آپ کے اختیارات سلب کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی تو جاٹ کمیونٹی کے لیڈر، رائے بہادر چوہدری لال چند آف روہتک نے محسوس کیا۔ کہ اس جاٹ ریاست بھرت پور کو نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔ اور مہاراجہ بھرت پور نے بھی چوہدری صاحب سے درخواست کی۔ کہ وہ ریاست بھرت پور میں بطور وزیر اعظم چلے آئیں۔

رائے بہادر چوہدری لال چند، ذاتی طور پر بے حد شریف لائق اور مخلص شخصیت تھے۔ اور آپ کا انگریزوں پر بھی بے حد اثر تھا۔ اور اس زمانہ کے پولیٹیکل سکرٹری گورنمنٹ ہند سرجان تھامپسن تو آپ کے گہرے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ کیونکہ سرجان اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں روہتک میں سیشن جج رہ چکے تھے۔ اور جب آپ پنجاب گورنمنٹ کے چیف سکرٹری تھے۔ تو چوہدری صاحب اس زمانہ میں پنجاب کونسل کے ممبر یا وزیر تھے۔ مہاراجہ بھرت پور نے جب چوہدری لال چند سے بھرت پور کا قلمدانِ وزارت سنبھالنے کے لئے درخواست کی۔ تو آپ نے سرجان تھامپسن سے یہ [illegible] تھا۔ کہ وہ مہاراجہ کو نقصان نہ پہنچائیں گے۔ اور مہاراجہ بھرت پور نے سرجان سے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ ریاست [illegible] پور کی ایڈمنسٹریشن میں دخل نہ دیں گے۔ تاکہ اس ریاست کی بدانتظامی دور ہو۔ اور گورنمنٹ کو کوئی شکایت نہ رہے۔

مہاراجہ بھرت پور کے خلاف گورنمنٹ کو شکایت یہ تھی۔ کہ مہاراجہ کی فضول خرچیوں کے باعث آپ کی ریاست دیوالیہ ہو چکی ہے۔ مہاراجہ تمام آمدنی اپنی عیاشی پر خرچ کر دیتے ہیں۔ رشوت کا زور ہے۔ ریاست کا انتظام اچھا نہیں۔ اور ریاست بہت کافی مقروض ہے۔ چوہدری لال چند نے بطور وزیر اعظم بھرت پور جانے کے بعد بہت کوشش کی۔ کہ وہاں کی ایڈمنسٹریشن اچھی ہو جائے۔ مگر مہاراجہ طوائفوں اور خوشامدیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ اور یہ لوگ ایڈمنسٹریشن پر بھی اثر انداز تھے۔ چوہدری صاحب اگر کسی معاملہ میں اصلاح کرنا بھی چاہتے۔ تو مہاراجہ اپنا حکم جاری کر کے چوہدری صاحب کو بے بس بنا دیتے۔ یعنی ایک طرف تو چوہدری صاحب کے احکام میں مداخلت کی جاتی اور دوسری طرف چوہدری صاحب کو یہ خوف کہ اگر ایڈمنسٹریشن کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ اور گورنمنٹ نے مداخلت کی۔ یا مہاراجہ کو نقصان پہنچا۔ تو ان کی بھی رسوائی ہو گی۔ چوہدری صاحب نے اس کشمکش میں چند ماہ گزارے۔ تو آپ نے مہاراجہ کی طرف سے سرجان تھامپسن پولیٹیکل سکرٹری گورنمنٹ ہند جو وائسرائے کے بعد ریاستوں کے متعلق ہندوستان

Marfat.com

میں سب سے بڑی انفارٹی تھے۔ کو ایک دعوتی خط بھیجا جس میں لکھا کہ آپ شکار کے لئے بھرت پور تشریف لائیں۔ اس دعوت کا مقصد یہ تھا۔ کہ مہاراجہ اور سرجان کے درمیان تعلقات زیادہ خوشگوار اور دوستانہ قائم کئے جائیں۔ اور سرجان دوستانہ سپرٹ میں مہاراجہ کو طوائفوں اور خوشامدیوں کے نرغے سے نکلنے کا مشورہ دیں۔ چنانچہ شکار کے لئے بھرت پور سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام ڈیگ تجویز ہُوا۔ جہاں کہ بہت بڑی شکار گاہ ہے۔ اور مہاراجہ کی ایک کوٹھی اور گیسٹ ہاؤس بھی ہے۔

سرجان تھامپسن بھرت پور پہنچے۔ مہاراجہ اور چوہدری لال چند نے آپ کا استقبال کیا۔ اور آپ مہاراجہ کی موٹر میں ڈیگ روانہ ہوئے۔ اس کار کو مہاراجہ خود چلا رہے تھے۔ مہاراجہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر سرجان تھامپسن تھے۔ اور پچھلی سیٹ پر چوہدری لال چند بیٹھے تھے۔ بھرت پور سے ڈیگ جاتے ہوئے مہاراجہ اور سرجان باتیں کرتے جا رہے تھے۔ تو باتوں باتوں میں مہاراجہ نے اپنی مالی پوزیشن کا سکہ بٹھاتے اور اپنی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے سرجان سے کہا۔

"بعض لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ میں ریاست بھرت پور کا روپیہ بے دردی کے ساتھ عیاشی پر صرف کر رہا ہوں۔ اور ریاست بھرت پور مقروض ہے حالانکہ یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ ریاست بھرت پور کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔ اس وقت ریاست بھرت پور کے ایک پوشیدہ خزانہ میں جو زمین کے اندر ہے۔ ساٹھ لاکھ روپیہ نقد موجود ہے۔ چوہدری لال چند کے بھرت پور میں وزیر اعظم مقرر ہونے کے چند روز بعد میں چوہدری صاحب کی آنکھوں پر رومال باندھ کر ان کو اس پوشیدہ خزانہ میں لے گیا تھا۔ اس خزانہ میں پہنچنے کے بعد میں نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور کہا کہ اس روپیہ کو گن لیجئے۔ یہ ساٹھ لاکھ روپیہ ہے۔ چوہدری صاحب نے خود روپیہ کی تھیلیاں گن لیں۔ اور دیکھ لیا کہ یہ ساٹھ لاکھ روپیہ ہے۔ اس کے بعد میں نے ان کی آنکھیں پھر رومال سے باندھ دیں اور ان کو اس پوشیدہ خزانے سے باہر لے آیا"

سرجان تھامپسن انڈین سول سروس کے لائق ترین ممبروں میں سے اور بہت ہوشیار شخصیت تھے آپ یہ سب کچھ سنتے اور ہوں ہوں کرتے رہے۔ مگر حیران تھے۔ کہ جس صورت میں کہ چوہدری لال چند خود ساٹھ لاکھ روپیہ دیکھ چکے ہیں۔ تو گورنمنٹ ہند کے پاس پولیٹیکل ایجنٹ نے ریاست بھرت پور کے مقروض ہونے کی رپورٹ کیوں کی۔ چوہدری لال چند بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ اور پریشان تھے۔ کہ مہاراجہ کیوں یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اور سوچ رہے تھے۔ کہ اس جھوٹ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ مہاراجہ کی موٹر ڈیگ پہنچی تو وہاں کے گیسٹ ہاؤس میں سرجان تھامپسن کے قیام کا انتظام تھا۔ موٹر اس گیسٹ ہاؤس کے دروازہ پر کھڑی ہوئی۔ سرجان، مہاراجہ اور چوہدری صاحب اس میں سے اترے تو مہاراجہ سرجان اور چوہدری صاحب کو اس گیسٹ ہاؤس میں چھوڑ کر خود اپنی کوٹھی میں چلے گئے۔ سرجان گیسٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں پہنچے ہی تھے۔ تو صوفہ پر بیٹھنے سے پہلے آپ نے چوہدری لال چند سے سوال کیا۔ کہ کیا یہ درست ہے۔ کہ آپ کی آنکھیں رومال سے باندھی گئیں۔ آپ کو ایک پوشیدہ خزانہ میں لے جایا گیا۔ اور آپ نے ساٹھ لاکھ روپیہ کی تھیلیاں خود دیکھیں؟ چوہدری لال چند یہ سن کر پریشان۔ کہ وہ مہاراجہ کے اس جھوٹ اور

Marfat.com

بے بنیاد گپ کا کیا جواب دیں۔ چوہدری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ کہ آپ نے یہ سوال موٹر ہی میں مہاراجہ کے سامنے نہ پوچھا؟ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ اس گپ کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد تک چوہدری لال چند نے بہت کوشش کی۔ کہ ریاست بھرت پور کی ایڈمنسٹریشن کی اصلاح ہو۔ اور مہاراجہ کو گدی سے نہ اتارا جائے مگر مہاراجہ نے اپنی عیاشی، فضول خرچی، خوشامدیوں کے ہاتھوں میں کھیلنا اور ایڈمنسٹریشن میں مداخلت کرنا جاری رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چوہدری صاحب نے مجبوراً بھرت پور کی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ مہاراجہ اور پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے تعلقات زیادہ کشیدہ ہوئے۔ اور ایڈمنسٹریشن کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اور آخر گورنمنٹ ہند نے مہاراجہ کو حکم دیا۔ کہ وہ بھرت پور سے چلے جائیں۔ اور اپنی ریاست کے علاقہ سے ایک سومیل دور رہیں۔ چنانچہ مہاراجہ اپنی رہائش بھرت پور سے ایک سومیل دور دہلی میں رکھنے پر مجبور رہے۔ آپ یہاں بھی طوائفوں کے جھرمٹ میں رنگ رلیاں منایا کرتے۔ اور یہاں ہی نئی دہلی کی ایک کوٹھی میں غریب الوطنی کے عالم میں آپ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ وہ نظارہ عبرت انگیز تھا۔ کہ جب مہاراجہ کا انتقال ہوا۔ مہاراجہ کی لاش ابھی بھرت پور کو روانہ نہ ہوئی تھی۔ کہ بحکم گورنمنٹ ہند طوائفوں کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ اور تلاشی لینے کے بعد ان کو ان کے وطن میرٹھ اور نینی تال وغیرہ جانے دیا گیا۔

اگر مہاراجہ بھرت پور رائے بہادر چوہدری لال چند کے نیک مشورہ پر عمل کرتے اور غیر مستحق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلتے۔ تو آپ کا یہ افسوس ناک انجام نہ ہوتا۔

"بہن جی" کہنے کا اثر

۱۹۴۷ء کے فسادات جاری تھے۔ مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے صوبجات میں چلے آ رہے تھے۔ اور ان کی بہت بڑی تعداد دہلی پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ دہلی کے تجارتی مرکز ہونے کے باعث مغربی پنجاب کے تاجروں کے لئے دہلی میں کافی کشش تھی۔ جہاں کہ یہ اپنے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تلاش کر سکتے تھے۔

اس زمانہ میں "ریاست" کا دفتر محلہ چرخے والاں میں تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کہ پشاور کی ایک خاتون تشریف لائیں۔ اس خاتون کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ اس کا شباب ختم ہو چکا تھا۔ اور بڑھاپے کی آمد تھی۔ مگر اس کے ہونٹوں پر سرخی، ریشمی لباس، بالوں کو خوب صورت بنانے کی کوشش اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کا جبر ظاہر کرتا تھا۔ کہ یہ اپنے آپ کو نوجوان لڑکیوں کی صف میں شمار کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے۔ کہ اس کے دیکھنے والوں کے دلوں میں تلاطم پیدا ہو۔ اس خاتون کے ساتھ ایک سکھ تھا جس کے لباس اور چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ لوفر کلاس میں سے ہے۔ یہ خاتون بغیر اطلاع اور بغیر کسی سے دریافت کئے میرے کمرے میں تشریف لے آئیں۔

اگر کوئی شخص میرے کمرے میں بغیر اطلاع چلا آئے۔ تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ ایسے اصحاب سے میں ملنا پسند نہیں کرتا۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ میں ان کا نام پوچھے اور بات کئے بغیر ہی اسے واپس چلے جانے کے لئے کہہ

Marfat.com

دیتا ہوں۔ مگر یہ عورت تھیں۔ میں نے انہیں واپس چلے جانے کے لئے تو نہ کہا۔ کچھ بے اعتنائی کا سا اظہار کرتے اور اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے ہوئے کہا۔ "بیٹھئے فرمائیے کیا حکم ہے" ؟ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ کام کی بات کیجئے اور تشریف لے جائیے۔ اس خاتون نے بتایا۔ کہ یہ پشاور کی رہنے والی ہیں۔ وہاں ان کی لاکھوں روپیہ کی جائیداد تھی باغ تھے، کوٹھیاں تھیں، اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور فسادات کے باعث یہ بغیر ایک پیسہ ساتھ لئے تین کپڑوں کے ساتھ (شرنارتھی اس زمانہ میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ یہ تین کپڑوں یعنی قمیض پاجامہ اور صافہ کے ساتھ اپنے گھر سے خالی ہاتھ چلے آئے ہیں۔ چاہے ان کی جیب میں ہزارہا روپیہ کے نوٹ ہوتے) چلی آئی ہیں۔ ان کے پاس رہائش کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اور یہ چاہتی ہیں۔ کہ ان کو اس یعنی دفتر "ریاست" کی بلڈنگ میں ایک کمرہ رہائش کے لئے دیا جائے۔ چونکہ فسادات کے متعلق ہر شخص کو دلچسپی تھی۔ میں نے کمرہ کے متعلق تو کہہ دیا۔ کہ اس بلڈنگ میں کوئی کمرہ خالی نہیں۔ مگر فسادات اور شرنارتھیوں کے متعلق میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اور میرے اور خاتون کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ لوگ پشاور میں کیا کام کرتے تھے؟

ہمارے باغ تھے۔ کوٹھیاں تھیں۔ جائیداد تھی، زمین تھی، پھلوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور لاکھوں روپیہ کے مالک تھے۔

آپ وہاں سے کتنا روپیہ ساتھ لائے ہیں؟

ہم صرف ان تین کپڑوں کے ساتھ جان بچا کر آئے ہیں۔

راستہ میں تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟

نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ سپیشل ٹرین میں آئے ہیں۔ فوج کا پہرہ تھا۔

آپ کے گھر کے کتنے ممبر ہیں؟

میرا باپ اور بھائی تھا۔ وہ قتل ہو گئے۔ میں، میری ماں اور میری چھوٹی بہن یہاں پہنچ گئے ہیں۔

یہ آپ کے ساتھ جو سکھ ہے۔ یہ کون ہے؟

یہ میرا بھائی ہے۔

کیا حقیقی بھائی ہے؟

ہاں میرا یہ حقیقی بھائی ہے۔

یہ وہاں کیا کام کرتا تھا؟

یہ پشاور میں ٹانگہ چلاتا تھا۔

آپ تو لاکھوں روپیہ کے مالک تھے۔ مگر آپ کا بھائی ٹانگہ چلاتا تھا؟

ہاں پہلے اس نے پھلوں کی دکان جاری کی تھی۔ نالائق ہے دوکان بند کر دی۔ تو ٹانگہ چلاتا تھا۔

آپ یہاں دہلی میں کیا کاروبار کریں گی؟

جو مل جائے کریں گے۔ آخر زندگی کے دن تو پورے کرنے ہی ہیں۔

Marfat.com

یہ کہنے کے بعد اس نے مسکراہٹ سے انگڑائی لی اور کہا۔ کہ سردار جی ہمیں ایک کمرہ تو ضرور دے دیجئے۔"
اس مسکراہٹ اور انگڑائی کا مطلب یہ تھا کہ میں مسحور ہو جاؤں۔ اور ان کو اپنے ہاں مہمان رکھ لوں۔
میں نے محسوس کیا۔ کہ یہ عورت آوارہ کلاس کی ہے۔ ساتھ والا شخص دلال ہے۔ اور شاید یہ مغربی پنجاب یا پٹنہ وغیرہ میں یہی پیشہ کرتی ہو گی۔ کیونکہ اس عورت میں حیا نہ تھی۔ اور ہندی زبان کی کہاوت کے مطابق اس کا انگ انگ پھڑکتا تھا یعنی اس کے جسم کے حصے عشق کی دعوت دیتے تھے۔

باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا۔ آپ نے بہت مہربانی کی درشن دیئے۔ اب میں کام کر رہا ہوں میرے پاس کوئی کمرہ ہوتا۔ تو شاید دے دیتا۔ مگر یہاں کوئی کمرہ خالی نہیں۔ میں خود تکلیف میں ہوں" میرے اس کہنے کا مطلب یہ تھا۔ کہ آپ تشریف لے جائیے۔

میرے اس کہنے پر یہ خاتون مایوس نہیں ہوئی۔ اور اس نے اظہار توجہ (یعنی نمائش حسن کی ناکام کوشش) کرتے ہوئے پھر انگڑائی لی۔ اور کہا کہ ہم تو کمرہ لئے بغیر یہاں سے نہ جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو"

میں حیران کہ اس خاتون سے کیا کہوں۔ اول تو میرے پاس کوئی کمرہ خالی نہیں۔ اور اگر ہو بھی۔ تو میں اس کلاس کے لوگوں کو کمرہ یا جگہ نہیں دے سکتا۔ میں نے اس عورت کی سائیکالوجی کو بدلنے کے لئے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بہن جی۔ میرے پاس نہ تو کوئی کمرہ ہے۔ اور نہ دے سکتا ہوں۔ مجھے اب ضروری کام ہے اب آپ تشریف لے جائیے۔ ست سری اکال" یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب نہ ۔۔۔ ضرور ہی تشریف لے جائیے۔

میرے بہن جی کہنے کا مطلب بھی یہ تھا۔ کہ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کیجئے۔ کوئی اور گھر تلاش کیجئے جہاں آپ مہمان رہ سکیں۔

اس کے بعد یہ خاتون کبھی میرے ہاں نہیں آئی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا۔ کہ اس نے بازار سیتارام میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ جہاں یہ پیشہ کرتی رہی اور اس کے ساتھ جو سکھ آیا تھا۔ وہ اس کا دلال تھا۔ جو آسامیاں لایا کرتا۔

میری رائے میں جو عورتیں اظہار عشق کرنے والے مردوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیں۔ ان کو بات چیت کرتے وقت "بھائی صاحب" کہنا چاہیے۔ اور مردوں کو ایسی عورتوں کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے بہن جی کہنا کافی ہے۔ اور یہ نسخہ ننانوے فی صدی کامیاب ہوتا ہے۔

عورتوں پر صدمہ کا اثر

ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا ہی تھا۔ کہ یہاں سب سے پہلے اس محکمہ کے ڈائریکٹر مسٹر ذوالفقار بخاری (جو آج کل پاکستان ریڈیو کے کنٹرولر ہیں) مقرر ہوئے۔ دہلی اسٹیشن کے بعد دوسرے مقامات پر بھی نئے اسٹیشن جاری ہونے والے تھے۔ تو سٹیشنوں کے سٹاف کے لئے بھرتی شروع ہوئی۔ سٹیشنوں کی پوسٹ کے لئے اخبارات میں اشتہار دیا گیا۔ اور ہزار ہا امیدواروں کی جو درخواستیں آئیں

Marfat.com

ان میں ایک درخواست پشاور سے مسٹر آر ایل ملک کی بھی تھی جو تعلیم کے لحاظ سے گریجویٹ تھے۔ اور اس سے پہلے مختلف جگہوں پر کام کر چکے تھے۔ مسٹر آر ایل ملک کی درخواست جب دہلی پہنچی۔ تو درخواستیں پڑھنے والے مسلمان افسر نے (نہیں کہا جا سکتا کہ بڑا افسر مسٹر بخاری تھے یا کوئی دوسرے صاحب) یہ خیال کرتے ہوئے کہ درخواست کنندہ کوئی مسلمان گریجویٹ ہے۔ ان کی درخواست کو منظور کر لیا اور پشاور مسٹر ملک کو حکم بھیجا کہ آپ بطور اسسٹنٹ ریڈیو سٹیشن دہلی حاضر ہو جائیں۔ آپ کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ چنانچہ اس حکم کے پہنچتے ہی مسٹر آر۔ ایل ملک دہلی پہنچ گئے۔ اور ان کو بطور اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا۔

اس زمانہ میں عام طور پر آل انڈیا ریڈیو میں پنجابی یا سرحدی نوجوان گریجویٹ ہی مقرر کئے جاتے تھے کیونکہ نیا کام ہونے کے باعث ایک تو دن رات محنت کرنے کا سوال تھا۔ اور دوسرے صوبہ جات کے لوگ پنجابیوں اور سرحدیوں جیسی محنت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ پنجابی افسر چاہتے تھے۔ کہ ان کے عزیز رشتہ دار اور دوست ملازم ہو جائیں چنانچہ یہ واقعہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں جب محنتی اور پھرتیلے پنجابی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اچھے لباس میں کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے اس زمانہ کے سکریٹری مسٹر ایس این رائے آئی۔ سی۔ ایس نے دیکھا تو کہا تھا۔ کہ میں ریڈیو اسٹیشن پر ان تعلیم یافتہ پنجابی نوجوانوں کو دیکھ کر ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ نوجوان آکسفورڈ یونیورسٹی کے طلباء ہیں۔ جو انڈین سول سروس کی تیاریوں میں مصروف ہیں"

یعنی ریڈیو اسٹیشن کے یہ نئے اسسٹنٹ اس محکمہ کے لئے باعث فخر تھے۔ اور ان اسسٹنٹوں میں مسٹر آر ایل ملک بھی تھے۔ جو اپنا مستقبل اس محکمہ میں بہت شاندار محسوس کرتے تھے۔

مسٹر آر۔ ایل ملک کو آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتے ہوئے کئی ماہ ہو گئے۔ اور کسی کو یہ علم نہ ہو سکا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ان کے تمام ہمراہی ان کو مسلمان ہی سمجھتے۔ ایک روز یہ مسٹر ذوالفقار بخاری کے ساتھ بیٹھے کام میں مصروف تھے۔ کہ مسٹر بخاری اور ان کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

میں پشاور کا رہنے والا ہوں۔

آپ پشاور کے کون سے ملک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیا آپ کی رشتہ داری ملک فیروز خاں نون کے خاندان سے بھی ہے۔

جی نہیں۔ میں تو برہمن ہوں۔ پشاور کے برہمن ملک خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور میرا نام روپ لال ملک ہے۔

یہ بات چیت تھی۔ جو سب سے پہلے مسٹر آر۔ ایل ملک کو ریڈیو اسٹیشن دہلی کے اعلیٰ مسلمان افسروں کی گڈ بکس میں سے خارج کرنے کا باعث ہوئی۔ کیونکہ یہ اعلیٰ افسر مسٹر روپ لال ملک کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کو مسلمان سمجھ کر ملازمت دی گئی۔ مسلمان سمجھتے ہوئے ہی ان پر مہربانی اور کرم رہا۔ مگر یہ کم بخت ہندو نکلے۔

سرکاری ملازمت حاصل کرنا بے حد مشکل ہے۔ مگر جب کوئی ملازم ہو جائے تو اس کو ملازمت سے علیحدہ کرنا اس سے بھی مشکل ہے۔ مسٹر روپ لال فطرتاً غریبوں کے خیر خواہ تھے۔ اور اگر راہ چلتے ہوئے بھی یہ کسی غریب پر ظلم ہوتا دیکھتے۔ تو یہ اپنے وقت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مظلوم کی حمایت پر کھڑے ہو جاتے ان کے اس کیریکٹر کی مجبوری سمجھیے

Marfat.com

یا بدقسمتی کہ ریڈیو اسٹیشن پر جب کسی سازندے یا آرٹسٹ کے ساتھ زیادتی ہوتی تو یہ اس مظلوم کا ساتھ دیتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ سازندوں اور آرٹسٹوں میں تو بے حد ہردلعزیز تھے۔ مگر محکمہ کے بڑے افسران کو ٹیڑھی ہی نظروں سے دیکھتے۔ ان کو ریڈیو اسٹیشن دہلی پر ملازمت کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو گیا۔ تو ایک روز دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ ان کا آنا مسٹر ذوالفقار بخاری کے ایما سے تھا۔ کیونکہ "ریاست" اس محکمہ کی بد انتظامیوں کے خلاف سخت مضامین شائع کر رہا تھا۔ اور مسٹر بخاری چاہتے تھے۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو "ریاست" کے مضامین کا یہ سلسلہ ختم ہو۔ کیونکہ کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مسٹر ایس این رائے آئی۔ سی۔ ایس ایڈیٹر "ریاست" کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے دل میں "ریاست" کے لئے عزت اور قدر جذبات تھے۔ یہ تعلقات مرحوم مسٹر کے سی رائے مینجنگ ڈائرکٹر ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعہ قائم ہوئے کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" اور مسٹر ایس این رائے دونوں مسٹر کے سی رائے کی کوٹھی پر اکثر جاتے اور وہاں دونوں کو اکثر ڈنر میں شامل ہونے اور بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ مسٹر رائے جب ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کا نواب بھوپال کے ساتھ مقدمہ چل رہا تھا۔ تو مسٹر رائے نے درجنوں بار مجھے مقدمہ کے متعلق قیمتی اطلاعیں دیں، اور جب ریڈیو ڈیپارٹمنٹ کے متعلق "ریاست" میں کوئی مضمون شائع ہوتا۔ تو آپ اس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ حکام سے فوراً جواب طلب کرتے۔ مسٹر روپ لال ملک اس سے پہلے کبھی دفتر "ریاست" میں نہ آئے تھے۔ آپ جب پہنچے۔ تو ان کے اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی۔

میں ریڈیو اسٹیشن سے آیا ہوں۔ میرا نام آر ایل ملک ہے۔ بہت دیر سے آپ کا نیاز حاصل کرنے کی خواہش تھی۔

آپ نے بہت کرم فرمایا۔ تشریف رکھیئے۔

میرے آنے کی ایک خاص غرض یہ بھی ہے۔ کہ میں آپ سے ریڈیو پر تقریر کرنے کی درخواست کروں۔

میں تو ایک معمولی جرنلسٹ ہوں۔ کسی سبجیکٹ کے متعلق بھی اہل الرائے نہیں۔ اس لئے میں اپنے آپ کو اس کام کے لئے فٹ نہیں سمجھتا۔

مگر آپ دیکھتے ہوں گے۔ کہ اکثر اخبارات کے ایڈیٹر ریڈیو پر تقریریں کرتے ہیں۔ اور خواجہ حسن نظامی بھی اکثر تقریریں فرماتے ہیں۔

وہ لوگ اس کے لئے فٹ ہوں گے۔ میں فٹ نہیں ہوں۔ اور نہ آپ کی پیش کش کا مجھ پر کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس تقریر کے بعد "ریاست" میں ریڈیو سٹیشن کے متعلق شائع ہونے والے مضامین کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ تو آپ کی غلطی ہے۔

نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ ہماری سب کی خواہش یہ ہے۔ کہ آپ کسی نہ کسی موضوع پر ریڈیو پر تقریر کریں۔

میں فی الحقیقت اس خدمت کے لئے فٹ نہیں ہوں۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے۔ کہ اگر ہندوستان

Marfat.com

کے تمام الرائے مرجائیں۔ تو وقت ہونے کے لحاظ سے شاید پھر بھی میری باری نہ آئے۔

میرا یہ جواب سن کر مسٹر ملک خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے مسٹر بخاری کو تمام گفتگو بتائی جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ دیوان سنگھ تقریروں کے ذریعے خریدا نہیں جا سکتا۔

مسٹر روپ لال ملک کچھ روز کے بعد پھر مجھ سے ملے۔ مگر تقریر کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد یہ اکثر مجھ سے ملتے۔ دوسرے چوتھے روز ٹیلیفون پر بات چیت کر لیتے۔ اور اگر کوئی اچھے گانے والا یا اچھی گانے والی گانا شروع کرتی۔ تو مجھے اس گانے کے سننے کے لئے ٹیلیفون پر دعوت دی جاتی۔ کیونکہ میں اس زمانے میں پکے گانے کے سمجھنے کی مشق کر رہا تھا۔ اور کئی راگوں اور راگنیوں سے واقف ہو چکا تھا۔

ملک روپ لال کئی ماہ تک دہلی ریڈیو اسٹیشن کے دیہاتی پروگرام کے انچارج رہے۔ اور یہ ان کا معمول تھا۔ کہ جب دیہاتی پروگرام کے ختم ہونے کا اعلان کرتے۔ اور اس اعلان کو ان کی بیوی اپنے گھر پر سنتیں (مسٹر فیلڈن کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو نے اپنے سٹاف کے اکثر اصحاب کو اپنے گھروں پر رکھنے کے لئے ایک ایک ریڈیو مفت دے دیا تھا۔ تاکہ یہ اپنے گھروں میں بھی پروگرام سن سکیں اور پروگرام کی رفتار سے واقف رہیں) ۔ تو چولہے میں آگ جلا دیتیں۔ ملک صاحب کے گھر پہنچنے تک چولہا گرم ہو جاتا۔ اور ان کے پہنچتے ہی ان کو گرم کھانا ملتا۔

ملک روپ لال کو کام کرتے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک روز ان کے پروگرام میں ان کے ایک دوست کا بھی نام تھا۔ جس کو تقریر کے معاوضہ میں دینے کے لئے بیس روپے منظور ہو چکے تھے۔ مگر ان کے یہ دوست عین وقت پر نہ پہنچے۔ یہ تقریر ملک صاحب نے خود ہی پڑھ دی اور جب یہ تقریر پڑھ چکے۔ تو یہ دوست ریڈیو اسٹیشن پر تشریف لے آئے۔ ملک صاحب کی غلطی سمجھئے یا ان کی دوست نوازی کہ آپ نے اس دوست کے وہاں پہنچنے پر ان کو بیس روپیہ دے دیئے۔ حالانکہ یہ نہ دینے چاہیئے تھے۔ کیونکہ تقریر کرنے والے نے تقریر نہیں کی تھی۔ اور ان کا حق زائل ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ تو معمولی تھا۔ مگر مسٹر ملک اپنی مزدور پرست پالیسی یا فطرت کے باعث اپنے افسروں میں ہر دلعزیز نہ تھے۔ آپ پر یہ الزام لگایا گیا۔ کہ آپ نے بیس روپیہ کی سرکاری رقم بغیر تقریر کے اپنے ایک دوست کو دی۔ اور یہ سرکاری روپیہ کا تغلب یا ناجائز استعمال تھا۔ اور مسٹر ملک پر سرکاری روپیہ کی امانت میں خیانت کا فوجداری مقدمہ چلایا جائے۔

مسٹر ملک کو جب اس مقدمہ کی اطلاع ملی۔ تو آپ کے ہوش اڑ گئے کیونکہ آپ اپنا مستقبل اس محکمہ میں بہت شاندار محسوس کرتے تھے۔ مگر اب نہ صرف آپ ملازمت سے علیحدہ ہوں گے۔ بلکہ شاید عدالت آپ کو قید کی سزا بھی دے۔ آپ نے جب حکم سنا تو بہت پریشان تھے۔ معطلی کا حکم سننے کے بعد اپنے گھر پہنچے۔ چند روز پہلے ان کی بیوی کے بچہ ہوا تھا۔ بیوی کچھ کمزور تھیں شوہر وقت سے پہلے ہی گھر پہنچے۔ تو بیوی نے محبت کے جذبات کے ساتھ پوچھا۔ آج جلدی چلے آئے؟ اس کے جواب میں مسٹر ملک نے بتایا کہ ملازمت تو ختم ہو چکی اور شاید مقدمہ میں سزا بھی ہو۔ یہ سن کر بیوی بے ہوش سی ہو گئیں

Marfat.com

ملک صاحب نے حوصلہ دیا۔ گھبراؤ نہیں خدا مالک ہے۔ دونوں مشورہ کرتے رہے۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اور مستقبل کیا ہوگا۔ بیوی کو شدت غم کے باعث رات کو بخار ہوگیا۔ اگلے دن بھی حرارت تھی۔ سمجھا گیا۔ کہ ملیریا ہے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر کو دکھایا۔ تو ڈاکٹر نے کہا۔ ایک پھیپھڑہ پر تپ دق کا اثر ہے۔ اس زمانہ میں تپ دق کا علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ اور سٹیپٹو مائی سین بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ ملک روپ لال نے علاج کے لیے بہت کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اور یہ تپ دق ہی یا دوسرے الفاظ میں شوہر کی ملازمت سے علیحدگی ہی اس نیک خاتون کی زندگی کو ختم کرنے کا باعث بنی۔

مسٹر روپ لال ملک کو معطل ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ کہ یہ میرے پاس آئے تمام کیفیت بیان کی۔ میں کسی سے سفارش نہیں کیا کرتا۔ اور سفارش کرنے کو معیوب سمجھتا ہوں۔ مگر جب ظلم ہو۔ تو خود اپنی خوداری کو جواب دے کر بھی میدان میں کود پڑتا ہوں۔ جب تمام حالات سنے تو افسوس ہوا۔ میں اس زمانہ میں محکمہ ریڈیو کے خلاف سخت مضمون لکھ رہا تھا۔ ان دنوں محکمہ ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر مسٹر احمد شاہ بخاری تھے۔ (جو آج کل یونائیٹڈ نیشنز میں پاکستان کے نمائندے ہیں۔ اور جن کے بلند قابلِ محبت اور قابلِ احترام ہونے کا آپ کے مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں) میں اپنی خوداری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گیرج میں سے اپنی کار نکال کر بخاری صاحب کے گھر پہنچا۔ اور درخواست کی کہ مسٹر ملک کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ مسٹر بخاری بہت ہی دوست نواز اور بلند شخصیت ہیں۔ میرے مضامین کا کوئی اثر لئے بغیر انہوں نے اس کیس کی تمام پوزیشن بیان کی۔ اور بتایا۔ کہ معاملہ گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس جاچکا ہے۔ مگر وہ یہ کوشش کریں گے۔ کہ مسٹر روپ لال ملک پر فوجداری مقدمہ قائم نہ ہو۔ اور ان کو صرف ملازمت سے ڈسچارج کر دیا جائے۔ چنانچہ مسٹر بخاری نے ایسا ہی کیا۔ اور مسٹر روپ لال ملازمت سے علیٰحدہ کر دیئے گئے۔

مسٹر روپ لال ملک کی بیوی کی لاعلاج بیماری اور حالات نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے دوستوں کے لئے بھی تکلیف کا باعث بنے۔ میں نے ان کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر دفتر "ریاست" میں کنویسر مقرر کر دیا۔ کہ ان کی مالی پریشانی میں کچھ تو کمی ہو۔ میں جب نوٹوں کے مقدمہ میں گرفتار ہوا۔ تو اس وقت یہ دفتر "ریاست" میں ملازم تھے۔ میری گرفتاری کے بعد یہ ملازمت چھوڑنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اور کلکتہ چلے گئے۔ یہ آدمی بہت اولوالعزم ہیں۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ آپ جرأت اور بہادری کے ساتھ برما کی سرحد پر ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اور آپ نے بہت روپیہ پیدا کیا۔ اب جب کبھی دہلی آتے ہیں۔ تو دفتر "ریاست" میں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ ان کی موجودہ کامیاب زندگی کے ساتھ جب ان کی بیوی کو صدمہ پہنچنے اور اس صدمہ کے نتیجہ کا خیال آتا ہے۔ تو جسم کانپ اٹھتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں درجنوں ایسی عورتوں کو دیکھا۔ جو اپنے نازک احساس رکھنے کے باعث کوئی صدمہ نہیں برداشت کر سکیں۔ اور یہ یا تو تپ دق کا شکار ہوئیں۔ یا خودکشی پر آمادہ ہوگئیں۔ ان میں ایک مسز ملک بھی تھیں۔ جو اپنے شباب کے زمانہ میں اپنے شوہر کی تکلیف برداشت نہ کر سکیں۔ اور تپ دق کا شکار ہوئیں۔

Marfat.com

نظام دکن کا ظلم اور مہاتما گاندھی

ریاست حیدر آباد کے سابق ہزایگزالٹڈ ہائینس نظام دکن بار اس کے بعد کے راج پر بکھ میر عثمان علی خاں کو روپیہ جمع کرنے کا شوق پاگل پن کی حد تک تھا۔ اور آپ کے والد مرحوم میر محبوب علی خاں جتنے فیاض فراخدل اور ہر دلعزیز تھے۔ یہ عثمان علی خاں اتنے ہی بخیل کنجوس اور متعصب تھے۔ یعنی میر محبوب علی خاں کے پاس تو جو کوئی بھی گیا۔ وہ مالا مال ہو کر آیا۔ اور میر عثمان علی خاں کے ساتھ جس کی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی جیب خالی کر واپس آیا۔ اور میر محبوب علی خاں تو اپنی رعایا کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر فی الحقیقت محبوب تھے۔ میر عثمان علی خاں ہر غیر مسلم کے دشمن جو ہندوؤں کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ اور ہندوؤں کو نفرت اور حقارت کے ساتھ ہنڈوارے کہتے۔

میر عثمان علی خاں کے روپیہ کے جمع کرنے کے پاگل پن کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں تھے حیدر آباد کے رؤسا کی زندگی عذاب میں تھی۔ اور اگر کوئی رئیس ہندو تھا۔ تو وہ اپنی جاگیر اور عزت دونوں کو ہر وقت خطرہ میں سمجھتا چنانچہ ریاست حیدر آباد کی ایک جاگیر گدوال کو ضبط نہ کرنے کی ذمہ داری "ریاست" پر ہے۔ اس ریاست کی مالکہ ایک بیوہ رانی تھیں۔ جن کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ یہ رانی چاہتی تھیں۔ کہ اپنے نواسے کو ولی عہد قرار دیں مگر نظام اس جاگیر کو ضبط کرنے کی کوشش میں تھے۔ اس زمانہ میں رانی گدوال کے ایک عزیز مسٹر ریڈی مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے۔ جنہوں نے تمام حالات ایڈیٹر "ریاست" کو بتائے۔ "ریاست" میں اس ظلم کے خلاف کئی مضامین لکھے گئے۔ تو گورنمنٹ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے مداخلت کرتے ہوئے نظام کو اس جاگیر کے ضبط نہ کرنے کا حکم دیا۔

نظام کے مظالم کے سب سے بڑے شکار وہاں کے سابق وزیر اعظم مہاراجہ سر کرشن پرشاد تھے۔ کیونکہ مہاراجہ کی نگاہوں میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا۔ اور ان کی پرو اسلامک پالیسی کے باعث ہندو ان کو نیم مسلمان قرار دیتے تھے۔ مگر چونکہ مہاراجہ خاندانی لحاظ سے راجہ چندولال کے خاندان میں سے ہندو تھے۔ نظام اس کوشش میں رہے۔ کہ یہ جاگیر (مہاراجہ کشن پرشاد کی خاندانی جاگیر چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اور ان کی پیشکاری کی ذاتی تنخواہ پانچ ہزار روپیہ ماہوار تھی) ضبط کر لی جائے۔ مہاراجہ طبعاً بے حد فیاض تھے۔ اپنی فیاضیوں کے باعث زندگی بھر مقروض رہے۔ اور آپ کے ذہن کے لئے یہ خیال بھی اذیت کا باعث تھا کہ اگر یہ جاگیر ضبط ہو گئی۔ تو راجہ چندولال کے خاندان کا وقار ختم ہو جائے گا۔ اور جن لوگوں کا آپ سہارا تھے۔ وہ لوگ مالی مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مہاتما گاندھی کی شہرت روز بروز عروج حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اور برٹش گورنمنٹ مہاتما گاندھی کی تحریک کو کچلنے کی ناکام کوشش کے بعد مہاتما جی سے بات چیت کرنے کے لئے مجبور تھی۔ مہاراجہ سر کرشن پرشاد نے جب ملک کی اس فضا کو دیکھا۔ تو آپ سیر کے بہانہ دہلی آئے۔ آپ کے اور خواجہ حسن نظامی کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ اور گو خواجہ حسن نظامی نظام دکن سے بھی مراسم رکھتے تھے۔ اور ریاست حیدر آباد سے دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ مگر

Marfat.com

مہاراجہ نے خواجہ حسن نظامی کو راز میں لے کر مہاتما گاندھی سے ملاقات کا انتظام کیا۔ اور یہ ملاقات رازداری میں رات کے وقت بھیا شیخ احسان الحق کے ذاتی مکان محلی دالان (جہاں آج کل آزاد ہند ہوٹل ہے) میں ہوئی۔ تاکہ کسی شخص کو اس ملاقات کا علم نہ ہو۔ اور اس ملاقات کی اطلاع تک نہ پہنچ جائے۔ اس ملاقات میں مہاتما گاندھی مہاراجہ سرکشن پرشاد خواجہ حسن نظامی اور شیخ احسان الحق شامل تھے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ اور اس ملاقات کا لب لباب یہ تھا کہ مہاراجہ نے تو جاگیرداروں پر کئے جا رہے مظالم بیان کئے۔ اور مہاتما جی کی امداد چاہی۔ اور مہاتما گاندھی نے جواب دیا کہ "سچائی اور جرأت کے ساتھ کھلے طور پر میدان میں آجاؤ۔ چاہے اس راہ میں مٹ جاؤ۔ اور اگر یہ جرأت نہیں رکھتے۔ تو ظلم برداشت کرتے چلے جاؤ" مہاراجہ خاندانی رئیس تھے۔ ان کے اندر نظام کی کھلے طور پر مخالفت کی جرأت کہاں۔ یہ جواب سن کر آپ بہت مایوس ہوئے۔

مہاتما گاندھی کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کہ وہ کسی سازش میں شریک ہوتے۔ چاہے یہ سازش انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے اعتبار سے کامیاب ہی کیوں نہ ہوتی۔ کیونکہ آپ فطرتاً سازشوں کے خلاف تھے اور جو کچھ کرتے کھلے طور پر کرتے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی جی کی سیاسی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی یہ پالیسی تھی۔ کیونکہ گورنمنٹ کسی سازش کے نام پر آپ کو کچل نہ سکی۔ اور آپ نے اگر مہاراجہ سرکشن پرشاد کا ساتھ نہ دیا۔ تو اپنی فطرت سے مجبور ہو کر۔ اور اب اگر نظام اپنی زندگی میں ہی اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے۔ تو یہ قدرت کی طرف سے ان مظالم کی سزا ہے۔ جو آپ نے اپنی زندگی میں اپنی رعایا پر کئے۔

مجرمانہ ذہنیت اور اس کے نتائج

۱۹۴۷ء میں جو کھاتے پیتے اچھے آسودہ گھرانہ کے لاکھوں شرنارتھی تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں مغربی پنجاب سے ہندوستان آئے ان میں منٹگمری کے ایک بہت ہی شریف انیک دل اور معزز ٹھیکیدار لالہ نانک چند بھی تھے اور ہندوستان پہنچنے کے بعد ان کے سامنے نہ صرف اپنی آیندہ زندگی گذارنے کا سوال تھا۔ بلکہ اس سے زیادہ اہم سوال ان کے سامنے ان کی اولاد کا مسئلہ تھا۔ کیونکہ اپنے وطن میں تو ان کو اپنے بچوں کے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ زمینیں تھیں۔ جائیداد تھی۔ روپیہ تھا۔ اور یہ اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے تھے۔ اور وہاں لوگ ان کو جانتے تھے۔ بیاہ شادی کے سلسلہ میں بھی یہ وہاں احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا سکتے تھے۔ مگر اب ان کے رشتہ داروں میں کوئی دہلی میں ہے۔ تو کوئی امرتسر میں اور کوئی کلکتہ میں ہے۔ تو کوئی پٹنہ میں۔ بھائی بہن، خالہ، چچا، ماموں، پھوپھا اور رشتہ دار وغیرہ سب الگ الگ ہو گئے۔ لالہ نانک چند کے دو تین لڑکے تھے۔ اور دو تین لڑکیاں۔ جو سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آپ نے دہلی پہنچنے کے بعد اپنے گھر کے لوگوں کے سر چھپانے کے لئے قرول باغ میں دس ہزار روپیہ صرف کر کے ایک مکان خرید لیا۔ اور جو کچھ آپ کے پاس تھا۔ اس سے آپ نے اپنی زندگی کے دن گزارنے شروع کئے۔ اور بچوں نے تعلیم شروع کر دی۔

ان کو دہلی آئے پانچ برس کے قریب ہوئے تھے۔ تو یہ ایک روز دفتر "ریاست" میں تشریف لائے بہت سہمے ہوئے۔ اور پریشان۔ آپ "ریاست" کے مداح تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست کے لئے ان کے دل میں عزت کے

Marfat.com

جذبات تھے۔ آپ نے ایڈیٹر ریاست" کو راز میں لے کر بتایا کہ آپ منٹگمری کے رہنے والے ہیں۔ اور منٹگمری اور لاہور میں ٹھیکہ داری کرتے تھے۔ دہلی میں پہنچنے کے بعد اپنے مستقبل کے متعلق متفکر تھے۔ بڑی لڑکی جو جوان تھی۔ اس کی شادی کے متعلق پریشان تھے۔ آپ نے اخبار "ٹریبون" کے شادی کے اشتہارات کے کالموں میں ایک اشتہار دیکھا۔ جو بنارس کے کسی صاحب کے نام سے شائع کیا گیا۔ اور اشتہار میں لکھا تھا۔ کہ ایک نوجوان پنجابی جو گریجویٹ اور برسرکار ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے اس اشتہار بھیجنے والے کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔ لڑکے کا فوٹو منگایا گیا۔ اور شادی کی تاریخ مقرر کر کے شادی کر دی گئی۔ مگر شادی کے بعد جب لڑکی اپنے سسرال بنارس گئی۔ تو وہاں پڑوسیوں نے بتایا۔ کہ اس کا دولہا چار سو بیس کلاس کا جرائم پیشہ شخص ہے۔ برائے نام ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے۔ اور پہلے دھوکہ دے کر روپیہ کے لئے کئی شادیاں کر چکا ہے۔ ہندو مذاہب میں جب لڑکی کی شادی ہو جائے۔ تو یہ شادی نہ صرف اس کی موجودہ تمام زندگی بلکہ آئندہ جنم کے تعلقات کی بھی ایک گارنٹی ہوتی ہے۔ اور ہندو عورت کو چاہے کتنی بھی مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے۔ طلاق حاصل کرنے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اور شوہر چاہے پیدائشی طور پر مجرمانہ ذہنیت کا ہو۔ عورت کو اس کا دم بھرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ لالہ نانک چند کی صاحبزادی جب پہلی بار اپنی سسرال گئی۔ تو اس کے شوہر (جو لائل پور کا رہنے والا آہلو والیہ قوم میں سے تھا۔ اور جس کا پہلا نام امریک سنگھ تھا۔ اور جس نے اپنے ایک قتل کے جرم کو چھپانے کے لئے اپنا نام تبدیل کر کے امر سروپ رکھ لیا تھا) نے لڑکی سے سات ہزار روپیہ کے ایک چیک پر دستخط کروا لئے۔ جو روپیہ لالہ نانک چند نے اپنی لڑکی کے نام بینک میں جمع کرا دیا تھا۔ اس وقت تک لالہ نانک چند کو اپنے داماد کے متعلق سوائے "ٹریبون" کے اشتہار یا اس کے متعلق خط و کتابت کے اور کچھ علم نہ تھا۔ لڑکی جب سسرال سے واپس آئی اس بیچاری نے اپنی والدہ کو تمام حالات بتائے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

لالہ نانک چند نے یہ تمام حالات ایڈیٹر ریاست" کو بتائے۔ اور اس سے زیادہ انہوں نے اور کچھ نہ بتایا۔ اور نہ ہی ان کو اس داماد کی دوسری کوالیفیکیشنز کا کوئی علم تھا۔ آپ صرف اس غم میں ہی تھے۔ کہ آپ کی صاحبزادی کی شادی ایک نالائق اور بیکار شخص کے ساتھ ہوئی۔ اور آپ نے چاہا۔ کہ آپ کو اس معاملہ کے متعلق میں کوئی درست رائے دوں۔

میں نے لالہ نانک چند سے کہا۔ کہ جب آپ کا داماد دہلی آئے۔ تو وہ اسے میرے پاس لائیں۔ تاکہ میں اس پر جرح کر کے اس کے تمام حالات معلوم کر سکوں۔ اور کسی نتیجہ پر پہنچ سکوں۔ چند روز بعد ان کا داماد لڑکی کو لینے کے لئے دہلی آیا۔ تو لالہ جی نے اس سے کہا۔ کہ دیوان سنگھ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ مگر ان کے داماد نے ٹالتے ہوئے ایڈیٹر ریاست" سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور لالہ نانک چند کو دھمکی دی۔ کہ اگر وہ لڑکی کو اس کے ساتھ نہ بھیجیں گے۔ اور مزید روپیہ نہ دیں گے۔ تو یہ لالہ نانک چند اور ان کے تمام خاندان کو قتل کر دے گا۔ لالہ نانک چند نے یہ حالات بتائے تو وہ بہت سہمے ہوئے۔ خوفزدہ اور پریشان تھے۔ میں نے ان کو بہت حوصلہ دیا۔ کہ پرواہ مت کریں۔ میں ابھی نئی دہلی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر بھاٹیہ (جو ایڈیٹر ریاست" کے دوست اور ہم وطن تھے) کی معرفت ان کی حفاظت کا

Marfat.com

انتظام کرتا ہوں۔ لالہ نانک چند بہت ہی خوفزدہ اور پریشان تھے۔ آپ نے چاہا۔ کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں آجاتے ہیں۔ ان کو ایک کمرہ دے دیا جائے تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے کہا۔ جب چاہیں چلے آئیے۔ دفتر "ریاست" کے ایک دو کمرے خالی کر دیئے جائیں گے۔ مگر بہتر یہ ہے۔ کہ حوصلہ اور بہادری کے ساتھ اپنے مکان میں رہیئے۔ تاکہ ان کا داماد ان کے دل کی اس کمزوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ لالہ نانک چند سے یہ بات چیت ہوئی تھی۔ کہ آپ اس کے بعد دفتر "ریاست" میں نہ آئے۔ اور اگلے روز دہلی میں کسی شخص کو بھی اپنا پتہ بتائے بغیر اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی سے باہر چلے گئے۔ تاکہ ان کا داماد ان پر تاتلانہ حملہ نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ بیحد خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔

لالہ نانک چند کا کئی ماہ کے بعد پنجاب کے ایک مقام سے خط ملا۔ کہ آپ فلاں جگہ ہیں۔ فلاں شخص کی معرفت میں ان کو خط لکھ سکتا ہوں۔ اور ان کا پتہ کسی دوسرے شخص کو نہ بتایا جائے۔ میں نے ان کو جواب لکھا۔ کہ اطمینان رکھیئے۔ ان کے موجودہ پتہ کا کسی دوسرے کو علم نہ ہو گا۔

اس خط کو ملے کئی ماہ ہو گئے۔ تو ایک سکھ سردار راجندر سنگھ ملازمت کے لئے دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ ان سے بات چیت ہوئی۔ تو یہ فیصلہ ہوا۔ کہ یہ دفتر "ریاست" میں بطور کونسلر کام کریں گے۔ مگر ابھی وہ ایک ہفتہ تک کام شروع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں انبالہ جانا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کہ مقدمہ کیا ہے۔ تو آپ نے بتایا۔ کہ مقدمہ قتل کا ہے۔ ایک شخص بنارس میں تھا۔ اس نے روپیہ کے لالچ میں دھوکا دے کر ان کے انبالہ کے عزیزوں میں ایک لڑکی سے شادی کی۔ اور جب مزید روپیہ نہ ملا۔ تو اس نے اپنے خسر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے قرول باغ میں منٹگمری کے ایک شخص کی لڑکی سے شادی کی۔ اور پھر اس کے بعد ایک اور شادی کرنے کے لئے دہلی آیا تھا۔ کہ یہاں گرفتار ہو گیا۔ سردار راجندر سنگھ نے جب ان حالات میں بنارس اور منٹگمری کے ایک شخص کی لڑکی سے شادی کرنے کا واقعہ بتایا۔ تو مجھے فوراً لالہ نانک چند کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ کہ منٹگمری کے اس شخص کا نام کیا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ سنا ہے۔ کہ ان کا نام نانک چند ہے۔ اور انہوں نے اب اس نانک چند کو قرول باغ میں بہت تلاش کیا ہے مگر ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ سردار راجندر سنگھ نے جب یہ کہا۔ تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے مقدمہ کی مزید تفصیل پوچھی۔ تو انہوں نے جو حالات بتائے وہ یہ تھے۔

ایک شخص امریک سنگھ جو آہلو والیہ قوم میں سے ہے۔ (آہلو والیہ قوم پنجاب کی خوب صورت ترین اقوام میں سے ہے۔ مہاراجہ کپور تھلہ بھی اسی قوم میں سے تھے۔ اور راولپنڈی کی آہلو والیہ قوم کا تو خوب صورتی کے اعتبار سے ہندوستان کی کوئی قوم بھی مقابلہ نہیں کر سکتی) تبادلۂ آبادی سے پہلے لائل پور کا رہنے والا تھا۔ یہ بی۔ اے اور ایل ایل بی ہے۔ تبادلۂ آبادی کے بعد یہ شخص دہلی میں آ کر محکمہ سول سپلائی میں ملازم ہو گیا۔ اور یہاں سے فوج میں بھی ایک اعلیٰ عہدہ پر عارضی طور پر افسر مقرر ہو کر مدراس چھاؤنی میں تعینات ہوا۔ جبکہ فوج میں ملازم تھا۔ تو اس نے انبالہ کی ایک لڑکی سے شادی کی (یہ لڑکی سردار راجندر سنگھ کے رشتہ داروں میں سے تھی) لڑکی کے والدین کو تنگ کر کے روپیہ حاصل کرتا رہا۔ اور جب انہوں نے روپیہ دینے سے انکار

Marfat.com

کیا۔ تو قتل کی دھمکیاں دیا کرتا۔ اور آخر اس نے اپنے خسر کو قتل بھی کر دیا۔ اور قتل کرنے کے بعد یہ موقع پر ہی گرفتار ہوا۔ گرفتاری کے بعد امریک سنگھ نے انبالہ جیل میں قانون کے مطابق جیل کے رجسٹروں میں اپنے انگوٹھے اور انگلیوں کے امپریشن دیئے۔ کیونکہ جو قیدی جیل میں داخل ہو۔ شناخت کے لئے ان کی انگلیوں کے نشانات لئے جاتے ہیں۔ جیل میں جانے کے چند روز بعد اس نے اپنے دل کی کمزوری کا بہانہ کیا۔ اور درخواست کی کہ اسے کسی ہارٹ اکسپرٹ کو دکھایا جائے۔ چنانچہ جیل کے افسروں نے اس کو امرتسر کے سول ہسپتال میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اور جب پولیس کے سپاہی اس کو امرتسر لے جا رہے تھے۔ تو انبالہ شہر میں یہ پولیس والوں سے سہولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور یہ ان کے ساتھ کھانا کھانے اور پولیس والوں کو کھانا کھلانے کے بہانے اپنے ایک دوست کے مکان پر لے گیا۔ جہاں سے یہ اپنے پہرہ کے سپاہیوں کو چکمہ دے کر دوسرے دروازہ سے فرار ہو گیا۔ اس کے بعد پہرہ والے سپاہیوں پر غفلت شعاری کے جرم میں مقدمہ چلا۔ اور ان کو تین تین برس قید کی سزا ہوئی۔ اور انبالہ پولیس کو کچھ علم نہ ہو سکا۔ کہ امریک سنگھ کہاں ہے۔ کیونکہ اس نے اب بنارس میں جا کر امر روپ کے نام سے رہائش اختیار کر لی۔ اور وہاں ہومیو پیتھک ڈاکٹر بن گیا۔ کیونکہ ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے لئے ضروری نہیں۔ کہ وہ ڈاکٹری کی اے۔ بی۔ سی بھی جانتا ہو۔

بنارس پہنچنے کے بعد اس نے "ٹریبون" میں شادی کا پھر اشتہار دیا۔ اور اس اشتہار کے ذریعے اس نے قرول باغ کے لالہ نانک چند کو دھوکہ دیا۔ اور ان کی لڑکی سے شادی کی۔ جو بی۔ اے تک تعلیم یافتہ ہیں۔ اور جب لالہ نانک چند بغیر کسی کو اطلاع دیئے۔ دہلی سے پنجاب کے ایک دوسرے مقام پر چلے گئے۔ تو اس نے پھر "ٹریبون" میں شادی کا اشتہار دیا۔ اور دہلی میں دریا گنج کی ایک لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا۔ اور یہ لڑکی گو بی۔ اے تک تعلیم یافتہ تھی۔ مگر خوب صورت نہ تھی۔ اس لئے شادی کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی۔ کہ لڑکی کے والدین دولہا کو آٹھ ہزار روپیہ نقد اور زیورات وغیرہ دیں گے۔ چنانچہ جب یہ امریک سنگھ نئی شادی کرنے کے لئے بنارس سے دہلی پہنچا تو اتفاق ایسا ہوا۔ کہ ان سردار راجندر سنگھ نے ان کو ریلوے اسٹیشن دہلی کے پلیٹ فارم پر دیکھ لیا۔ اس وقت اس نے اپنے بال کٹوائے ہوئے تھے اور کلین شیو تھا۔ کیونکہ یہ لالہ نانک چند کی لڑکی سے شادی کرنے سے پہلے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے خیال سے سکھ ازم کو جواب دے چکا تھا۔ سردار راجندر سنگھ نے جب اس کو پہچان لیا۔ تو انہوں نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ کہ یہ امریک سنگھ قتل کے مقدمہ میں مفرور ہے۔ اس اطلاع پر پولیس نے امریک سنگھ کو گرفتار کر کے کوتوالی بھیج دیا۔ جہاں اسے حوالات میں بند کیا گیا۔ اور تحقیقات شروع ہوئی۔ اس تحقیقات کے سلسلہ میں امریک سنگھ کا بیان تو یہ تھا۔ یہ امریک سنگھ نہیں۔ اس کا نام امر سروپ ہے۔ چنانچہ اس کے بیان پر پولیس کے افسروں کو بھی یہ خیال ہوا۔ کہ یہ گرفتاری غلط شخص کی ہوئی ہے۔ مگر سردار راجندر سنگھ نے یقین دلایا۔ اور تحریری بیان دیا۔ یہ شخص فی الحقیقت امریک سنگھ ہے۔ جس نے ان کی رشتہ دار لڑکی سے شادی کی تھی۔ اور جو اپنے خسر کو قتل کرنے کے بعد مفرور ہو گیا تھا۔ چنانچہ تحقیقات کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ کہ جب سردار راجندر سنگھ اس کی شناخت کے لئے کوتوالی میں گئے۔ تو یہ خاموش رہا۔ تاکہ سردار سنگھ اس کی آواز کو سن نہ سکیں اور مزید تصدیق نہ کر دیں۔ اس پر انسپکٹر پولیس نے امریک سنگھ کے

Marfat.com

منہ پر زور سے تھپڑ مارا جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ چلائے۔ اور آواز نکالے اور سردار راجندر سنگھ اس کی آواذ کو بھی پہچان سکیں۔ چنانچہ اس تھپڑ سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ اور یہ چلایا۔ تو سردار راجندر سنگھ نے اس کی آواز کو بھی پہچان لیا۔ اس ابتدائی تحقیقات کے بعد امریک سنگھ مزید تفتیش کے لئے انبالہ جیل میں بھیجا گیا۔ تاکہ اس پر قتل کے جرم میں مقدمہ چلایا جا سکے۔ انبالہ جیل میں پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے ایک قیدی (جو جیل کے دفتر میں کام کرتا تھا) کے ساتھ سازش کر کے اس رجسٹر کے اوراق فنالع کرائے جن پر اس کے انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات اس وقت لگائے گئے تھے۔ جب کہ یہ قتل کے بعد فوراً موقع پر گرفتار کر کے انبالہ جیل بھیجا گیا تھا۔ اور اب انبالہ پہنچنے کے بعد اس کا ڈیفنس یہ تھا۔ کہ یہ امریک سنگھ نہیں۔ اس کا نام امردو پ ہے اور یہ غلطی سے گرفتار کیا گیا ہے۔ پولیس نے اس کی شناخت کے سلسلے میں جب مختلف ثبوت جمع کئے تو پتہ چلا کہ جیل کے رجسٹر میں سے وہ اوراق غائب ہیں۔ جن پر اس کے انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات تھے۔ جن سے کہ اس کا امریک سنگھ ہونا بلا شک و شبہ ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ نشانات اس کی گرفتاری کے فوراً بعد حاصل کئے گئے تھے۔ جب یہ اوراق رجسٹر میں موجود نہ تھے۔ تو نہ صرف پولیس کے لئے ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی۔ بلکہ جیل کے وہ سرکاری ملازم بھی لپیٹ میں آ گئے۔ جو ان رجسٹروں کو محفوظ رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ چنانچہ اس غفلت شعاری کے قصور میں جیل کے ایک افسر کو سخت سزا دی گئی۔

امریک سنگھ پر قتل کا مقدمہ چلا۔ ابتدائی کارروائی دہلی کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر بعوث کی عدالت میں ہوئی۔ اور ملزم سیشن سپرد ہوا۔ سیشن جج نے اس کو پھانسی کی مزادی اور ہائیکورٹ میں اس نے اپیل کی۔ تو یہ مقدمہ دو ججان مسٹر فالشا اور مسٹر ذلت کی عدالت میں پیش ہوا۔ کئی روز اس مقدمہ پر بحث ہوتی رہی۔ اور طویل بحث سننے کے بعد ہائی کورٹ کے ان ججوں نے امریک سنگھ کو قتل کے جرم جرم میں عمر قید کی سزا دی۔

سردار راجندر سنگھ نے جب یہ حالات سنائے تو اس وقت تک ہائی کورٹ نے فیصلہ نہ سنایا تھا اور وکیلوں کی بحث جاری تھی۔ چنانچہ راجندر سنگھ جی نے حالات سناتے ہوئے امریک سنگھ کا ایک فوٹو بھی مجھے دکھایا۔ جو اس کے سکھ ہونے کے زمانہ کا تھا۔ اس فوٹو کو دیکھ کر مجھے فوراً یاد آ گیا۔ کہ یہ شخص ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں جب کہ دفتر "ریاست" محلہ گڑھیا میں تھا۔ مجھ سے ایک دوسرے شخص کے ساتھ ملنے کے لئے آیا تھا۔ مگر مجھے یہ یاد نہیں۔ کہ اس کی یہ ملاقات ملازمت حاصل کرنے کے سلسلہ میں تھی یا کسی دوسری غرض سے۔ بہر حال مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ کہ یہ شخص اس زمانہ میں میرے پاس آیا تھا۔

ہائی کورٹ کے ججان نے امریک سنگھ کو قتل کے مقدمہ میں عمر قید کی سزا دی۔ مگر اس شخص نے جس بے رحمی کے ساتھ معزز گھرانہ کی کئی شریف خواتین کو تباہ کیا۔ اس تباہی کو دیکھا جائے۔ تو اس کو ایک بار نہیں۔ اگر ممکن ہوتا۔ تو کئی بار پھانسی کی سزا ملنی چاہیئے تھی۔ اور اب اس جرائم پیشہ شخص کو شاید اپنے آئندہ جنم میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ کیونکہ ایڈیٹر "ریاست" کا عقیدہ ہے۔ کہ گناہوں کی سزا صرف اس جنم میں بلکہ آئندہ جنم میں بھی ملتی ہے۔ اور یہ واقعہ ان والدین کے لئے آنکھیں کھولنے کا باعث ہونا چاہیئے۔ جو بغیر اچھی

Marfat.com

طرح سے جہاں ہیں کئے اپنے بچوں کی شادیاں صرف خط و کتابت کے ذریعہ طے کر دیتے ہیں۔

جیل کا "پاگل پن"

ایڈیٹر "ریاست" جب سے دہلی میں ہے۔ اور اس نے جب سے اخبار جاری کیا۔ اور اس عرصہ میں دہلی میں اس کو جن ایک درجن کے قریب بلند ترین دیانت دار ترین اور وضعدار ترین لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں دو شخصیتیں بہت اہم ہیں۔ ایک ملا واحدی ایڈیٹر "نظام المشائخ" اور دوسرے بھیا شیخ احسان الحق (رئیس اعظم میرٹھ) یہ دونوں شخصیتیں تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں دہلی سے کراچی چلی گئیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے چلے جانے کے بعد میں دہلی کے دوستوں میں بہت ہی کمی محسوس کرتا ہوں۔ اور جب کبھی ان کا خط آتا ہے۔ یا ان کے متعلق کوئی اطلاع پہنچتی ہے۔ تو جدائی اور محبت کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے آنسوؤں سے آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

واحدی صاحب کے ایک حقیقی چھوٹے بھائی مرتضیٰ صاحب ہیں جن کو خیالات کے اعتبار سے واحدی صاحب کی بالکل ضد کہنا چاہیئے۔ مگر چونکہ یہ واحدی صاحب کے بھائی تھے۔ اس لئے جس طرح باوا بچتر سنگھ سوداگر شیشہ گوردو صاحب کی اولاد ہونے کے باعث عزت و احترام کے خیال سے باوا صاحب یا کسی درگاہ کا مجاور نسل کے لحاظ سے سید ہونے کے باعث شاہ صاحب کہلاتا ہے۔ واحدی صاحب کے دوست بھی ان مرتضیٰ صاحب کا ہمیشہ خیال کرتے۔ کیونکہ آخر وہ واحدی صاحب کے بھائی ہیں۔ یہ مرتضیٰ صاحب پچھلی جنگ سے پہلے اٹلی سے شیشے کے بنے ہوئے گلے کے ہار، موتی یا چوڑیاں وغیرہ منگاتے۔ اور کاروبار کرتے یہ اٹلی سے مال منگوایا کرتے تھے۔ کہ دفعتاً اعلان جنگ ہو گیا۔ اور اٹلی انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گیا۔ اس اعلان جنگ سے پہلے کا لکھا اٹلی کا ایک خط مرتضیٰ صاحب کو اعلانِ جنگ کے بعد ملا۔ کہ وہ ان نرخوں پر مال منگا سکتے ہیں۔ مرتضیٰ صاحب کو یہ خیال نہ رہا۔ کہ اعلانِ جنگ کے بعد دشمن ملک کے کسی فرد سے خط و کتابت کرنا قانوناً جرم ہے۔ آپ نے اس خط کا جواب اٹلی کی اس فرم کو دیا۔ کہ آپ فلاں فلاں مال بھیج دیجئے۔ ہم روپیہ مال پہنچنے پر ادا کر دیں گے۔ یہ خط دہلی سے پوسٹ ہوا۔ تو ڈاکخانہ والوں نے اسے سی۔ آئی۔ ڈی کے پاس بھیجدیا۔ سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے اسے چیف سنسر بمبئی کے پاس بھیج دیا۔ اور وہاں جب اسے پڑھا گیا۔ تو چیف سنسر نے دہلی گورنمنٹ کو ہدایت کی۔ کہ خط لکھنے والے کے خلاف دشمن ملک کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے سنگین جرم میں فوجداری مقدمہ چلایا جائے جس کی سزا سات برس قید سخت تھی دہلی گورنمنٹ نے اس ہدایت کے ساتھ کہ خط لکھنے والے پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہ خط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھیجا۔ پولیس نے مقدمہ رجسٹر کیا۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ عدالت نے مرتضیٰ صاحب کے وارنٹ بلاضمانت جاری کئے۔ اور مرتضیٰ صاحب گرفتار کئے جا کر دہلی جیل میں لائے گئے۔

مرتضیٰ صاحب جب دہلی جیل میں آئے۔ تو میں اس سے پہلے دہلی جیل میں تھا۔ اور چونکہ واحدی صاحب میونسپل کمشنر اور معزز خاندان میں سے تھے۔ اور یہ واحدی صاحب کے حقیقی بھائی تھے۔ آپ کو بی کلاس دی گئی۔

Marfat.com

اور اس کمرہ میں ہی لائے گئے۔ جہاں میں اور دو یورپین پہلے سے موجود تھے۔ یعنی اس کمرہ میں ہم چار ہو گئے یہ یورپین تو پردیسی تھے۔ ایک لاہور کے اینگلو انڈین اور دوسرے بمبئی کے رہنے والے مسٹر ٹامس جو آرمینیا کے رہنے والے تھے۔ اور جاسوسی کے الزام میں گرفتار تھے۔ میرا کھانا گھر سے آیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں ہدایت کر دی تھی۔ کہ تین آدمیوں کے لئے کھانا آیا کرے۔ (میں اس زمانے میں انگریزی کھانا کھایا کرتا تھا)، ہم تینوں اکٹھا کھانا کھایا کرتے۔ مرتضیٰ صاحب کا کھانا بھی ٹفن کیریر میں گھر سے آجایا کرتا۔ اور ہمارا گپ بازی میں وقت صرف ہو جاتا۔

مرتضیٰ صاحب دہلی کے رہنے والے نازک مزاج شخصیت تھے۔ دل کے کمزور۔ کبھی جیل کا دروازہ تک نہ دیکھا۔ اور نہ زندگی میں کبھی بیوی بچوں جدا ہوئے۔ میں تو گپ بازی اور کتابیں پڑھنے میں اپنا وقت صرف کرتا۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ میں نے جیل اور اپنے گھر میں کبھی بھی فرق محسوس نہ کیا۔ یعنی جیسا گھر میں خوش رہتا ہوں۔ ویسا ہی جیل میں۔ بلکہ جیل میں مجھے یہ بھی فائدہ رہا کہ وہاں قرض خواہ تنگ نہ کر سکتے تھے مگر مرتضیٰ صاحب اداس پڑے رہتے۔ یا دل کی گھبراہٹ کی شکایت کرتے اور رات کو بیوی بچوں کی یاد میں روتے۔ مرتضیٰ صاحب جب کبھی بات کرتے۔ تو یہی۔ مقدمہ کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کتنی سزا ہوگی۔ کیا کوئی صورت مقدمہ میں بری ہونے کی ہے۔ یہ مجھے جوتشی اور وکیل سمجھتے ہوئے مجھ سے ہر وقت مقدمہ کے متعلق پوچھتے۔ کیونکہ بیچاروں کو اپنے مستقبل کے متعلق بے حد تشویش تھی۔ ان کو جیل میں آئے چند ہفتے ہوئے تھے۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ یہ بیچارے جیل میں رہنے کے لئے فٹ نہیں ہیں۔ اگر یہ زیادہ عرصہ رہے۔ تو اپنی صحت بھی تباہ کر لیں گے۔ میں نے سوچنے کے بعد ایک دلچسپ سکیم تیار کی۔ اور ان سے کہا۔ کہ میری رائے یہ ہے آپ عمل کریں۔ تو جیل سے رہا ہو سکتے ہیں میں نے ان کو سکیم بتائی اور یہ اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

رات کو دو بجے کے قریب میں نے مرتضیٰ صاحب سے کہا۔ کہ وہ اوٹ پٹانگ "باتیں" شروع کر دیں اور چلائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ تو میں نے پہرہ والوں کو آواز دی۔ کہ مرتضیٰ صاحب سخت بیمار ہیں۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ پہرہ والا جیل کے دروازہ پر گیا۔ وہاں سے سپاہی ڈاکٹر کے کوارٹر میں گیا۔ ڈاکٹر صاحب سو رہے تھے۔ ان کو جگایا گیا۔ اور وہ تشریف لائے۔ تو میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ کہ مرتضیٰ صاحب کے دماغ پر اثر ہے۔ یہ پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی چھت کی طرف دیکھتے ہیں۔ کبھی دروازہ کی طرف اور انہوں نے مجھے گالیاں بھی دی ہیں۔ میرا خیال ہے۔ یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی۔ سیتھسکوپ کے ساتھ دل دیکھا۔ اور کہا۔ کہ دل اور نبض تو ٹھیک حالت میں ہیں۔ دماغ پر شاید اثر ہو چنانچہ انہوں نے کہا۔ کہ وہ ابھی دوائی بھیجتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دیکھ کر چلے گئے۔ اور انہوں نے تین خوراک دوائی کی اس ہدایت کے ساتھ بھیجی کہ تین تین گھنٹے کے بعد ایک ایک خوراک پلائی جائے۔ دوائی جب آئی۔ تو اس میں سے ایک خوراک میں نے پھینک دی اور صبح ہوتے ہی باقی دو خوراکیں بھی پھینک دی گئیں صبح آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب پھر تشریف لائے۔ تو میں نے بتایا۔ کہ دوائی پینے کے بعد مریض کو کچھ سکون سا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرتضیٰ صاحب کو دیکھا۔ تو مرتضیٰ صاحب میری ہدایت کے مطابق پھر چھت کی طرف

Marfat.com

غور کے ساتھ دیکھتے رہے۔ جیسا کہ پاگل دیکھا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے دیکھنے کے بعد بتایا۔ کہ ان کے دماغ پر اثر ہے میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ کہ ڈاکٹر صاحب ہم تو کئی بار جیل آئے۔ اور جیل اور گھر میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ مگر یہ جیل کے قابل نہ تھے۔ خدا نے مصیبت کے دن دکھائے۔ اس لئے جیل کی فضا کا ان کے دماغ پر اثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور چلے گئے۔ جانے کے بعد ان کا کمپونڈر اس ہدایت کے ساتھ دوائی کی تین خوراکیں اور دے گیا۔ کہ یہ دوائی چار چار گھنٹے بعد پلائی جائے۔ میں مرتضیٰ صاحب کے نرس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ کہ دوائی وقت پر پلا دوں گا۔ کمپونڈر صاحب چلے گئے تو میں نے شیشی میں سے ایک خوراک پھینک دی اور اس طرح ہی چار چار گھنٹے کے بعد ایک ایک خوراک زمین پر پھینکتا رہا۔ تاکہ نہ معلوم ڈاکٹر صاحب کب اچانک آجائیں۔ اور وقت پر دوائی نہ دینے کا مجھ پر الزام لگایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب شام کو دیکھنے کے لئے پھر تشریف لائے۔ مرتضیٰ صاحب نے میری ہدایت کے مطابق اسی طرح ہی چھت کی طرف اور ادھر اُدھر دیکھنے کا ایکٹ کیا۔ میں نے کہا۔ کہ بیمار کو پہلے سے کچھ سکون ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور دوائی بھیجنے کا وعدہ کرکے آپ تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دوائی آگئی۔ اور اس میں سے ایک خوراک ضائع کر دی گئی۔

رات کو اڑھائی بجے مرتضیٰ صاحب نے میری ہدایت کے مطابق پھر شور پیدا کیا۔ میں نے پہرہ دار کو آواز دی۔ وہ جیل کے دروازہ پر گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے پر میں نے کہا۔ کہ رات کے ایک بجے تک تو سکون رہا۔ مگر اس کے بعد پھر دورہ پڑا ہے۔ اور کمرہ کے برآمدہ میں انہوں نے بھاگنا شروع کیا ہے۔ اور مجھے گالیاں دی ہیں۔ ڈاکٹر نے پھر دیکھا اور کہا۔ کہ صرف دماغ پر اثر ہے۔ ویسے دل اور نبض درست حالت میں ہیں۔ میں نے شکایت کی۔ کہ مجھے نہ پچھلی رات سونا نصیب ہوا۔ نہ اس رات۔ ڈاکٹر نے بھی شکوہ کیا۔ کہ ان کے آرام میں بھی خلل واقع ہوا ہے ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ اور میں نے کہا۔ کہ ان کو دوائی میں برومائیڈ دی جائے۔ تاکہ سکون ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کہ وہ برومائیڈ ہی دے رہے ہیں۔ اور اس برومائیڈ کے اثر سے ہی ان کو سکون ہے۔ اور یہ سو جاتے ہیں۔ میں نے تشویش کے لہجہ میں کہا۔ کہ مجھے تو یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ بیچارے کہیں اپنے دماغی توازن سے ہمیشہ کے لئے ہی محروم نہ ہو جائیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کل سول سرجن کو دکھائیں گے۔

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب کرنل شاہ (جو غالباً آج کل پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ سروسز ہیں)، تشریف لائے۔ ان کے آنے سے پہلے میں نے مرتضیٰ صاحب سے کہا۔ کہ وہ اپنی قمیض کا گریبان پھاڑ دیں تاکہ زیادہ پاگل قرار دیئے جا سکیں۔ مرتضیٰ صاحب فطرتاً بے حد کنجوس تھے۔ فرمانے لگے۔ کہ یہ قمیض نئی ہے۔ یہ سن کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اور کہا۔ کہ پرواہ مت کرو جیل سے رہائی کے لئے یہ قربانی کر دینی چاہیئے۔ مرتضیٰ صاحب نے دل پر جبر کر کے قمیض کا گریبان چاک کر دیا۔ اور میں نے ہدایت کر دی۔ کہ جب سول سرجن آئے۔ تو زیادہ پاگلوں کی سی باتیں کریں۔ سول سرجن صاحب جب تشریف لائے تو ان کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

Marfat.com

صاحب جیل اور جیل کے ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ مرتضیٰ صاحب مسلسل چھت کی طرف دیکھتے۔ اور منہ سے ماں بہن کی گالیاں بکتے رہے۔ میں نے پچھلے تین دن کے تمام حالات سول سرجن کو بتلائے۔ اور خطرہ کا اظہار کیا۔ سول سرجن نے غور کے ساتھ دیکھا اور کہا۔ کہ دل اور نبض تو درست ہے۔ ہاں دماغ پر ضرور اثر ہے۔ میں نے سول سرجن اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ کہ مریض کی اس حالت میں بہتر ہے۔ کہ مریض کے گھر کے لوگوں یعنی واحدی صاحب کو اطلاع کر دی جائے۔ تاکہ وہ بھی آکر بیمار کو دیکھ جائیں سول سرجن نے کہا۔ کوئی ہرج نہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ کہ وہ ابھی واحدی صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع کر دیں گے۔ تاکہ وہ آکر بیمار کو دیکھ جائیں۔

سول سرجن صاحب تشریف لے گئے۔ اور انہوں نے رپورٹ کی۔ کہ مرتضیٰ صاحب کے دماغ پر اثر ہے اور یہ خطرہ ہے۔ کہ شاید بیماری زیادہ اثر کرے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے واحدی صاحب کو اطلاع دی۔ کہ ان کا بھائی پاگل ہو گیا ہے۔ اور وہ جیل میں آکر دیکھ جائیں۔ دو بجے کے قریب واحدی صاحب بہت ہی مغموم اور افسردہ حالت میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ہمارے کمرہ میں تشریف لائے چونکہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی واحدی صاحب کے ساتھ تھے۔ مرتضیٰ صاحب میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے چھت کی طرف ہی غور سے دیکھتے رہے۔ اور انہوں نے بھائی کی طرف بھی نہ دیکھا۔ واحدی صاحب کے ساتھ دہلی کے تحصیلدار مسٹر محمد حسنین بھی تھے۔ جو واحدی صاحب کے گھر کے دوستوں میں سے تھے۔ واحدی صاحب نے جب اپنے بھائی کو گریبان چاک حالت میں چھت کی طرف نگاہیں کئے دیکھا۔ تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واحدی صاحب کی اس حالت کو دیکھ کر مجھے واحدی صاحب پر بہت رحم آیا۔ اور میں رہ نہ سکا۔ میں واحدی صاحب کو کمرہ سے باہر لے گیا۔ اور ان سے کہا۔ کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ سب ایک ڈرامہ ہے۔ تاکہ ان کو رہائی مل جائے۔ سول سرجن نے بھی رپورٹ کر دی ہے۔ آپ سٹی مجسٹریٹ (سردار بہادر نریندر سنگھ) پر بھی اثرات استعمال کیجئے۔ جن کی عدالت میں مقدمہ ہے۔ تاکہ رہائی ہو۔ واحدی صاحب نے جب میرے منہ سے یہ سنا۔ تو وہ سن کر دنگ رہ گئے۔ اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ میں واحدی صاحب کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ اور سب کے سامنے کہا۔ کہ یہ خطرہ ہے۔ کہ دماغ پر جو اثر ہے۔ یہ مستقل صورت اختیار نہ کر جائے۔ کوشش ہونی چاہئیے۔ کہ مرتضیٰ صاحب کو جیل سے نکالا جائے۔ اس بات چیت کے بعد تمام لوگ چلے گئے۔

اس واقعہ کے چار روز بعد مرتضیٰ صاحب کی پیشی تھی۔ یہ گریبان چاک حالت میں ہی پاگلوں کی طرح دیکھتے ہوئے عدالت میں لائے گئے۔ مجسٹریٹ کو پہلے ہی ان کی دماغی حالت کا علم ہو چکا تھا مقدمہ پیش ہوا۔ تو مجسٹریٹ نے تا عدالت برخاست قید کی سزا دی مرتضیٰ صاحب جیل میں تسبیح بہت چلایا کرتے تھے۔ عدالت میں بھی یہ تسبیح چلاتے رہے۔ تاکہ خدا شام کے چار بجے تک خوش رہے اور اس عرصہ کے درمیان میں کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ شام کے چار بجے جب عدالت برخاست ہوئی۔ تو مرتضیٰ صاحب چند گھنٹہ کی قید کاٹ کر گھر پہنچ گئے۔

Marfat.com

ریاست اور جسٹس سر ڈگلس ینگ

مجھ پر نوٹوں کا مقدمہ چل رہا تھا! اور یہ مقدمہ دہلی کے سٹی مجسٹریٹ سردار بہادر سردار نریندر سنگھ (جو آج کل غالباً پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں) کی عدالت میں تھا۔ اس مقدمہ کی پیروی سرکار کی طرف سے رائے بہادر گوپال داس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سی۔ آئی۔ ڈی۔ دہلی (سابق ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ریاست جے پور) کر رہے تھے۔ اور میری طرف سے دہلی کے ایڈووکیٹ مسٹر برج بہاری توکلی اور اجمیر کے بیرسٹر سردار بہادر بھگوان سنگھ تھے۔ میں ضمانت پر تھا۔ اور اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ کہ روز مجھے ٹیلیفون آیا۔ ٹیلی فون کرنے والے نے کہا۔ کہ وہ خواجہ مجید بول رہے ہیں۔ اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ آپ تشریف لے آئیے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ دفتر "ریاست" میں ملنا نہیں چاہتے میں نے جواب دیا۔ کہ آپ یہاں نہیں آسکتے۔ تو میں بھی کسی دوسری جگہ نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ضرورت آپ کو مجھ سے ملنے کی ہے۔ مجھے آپ سے ملنے کی نہیں۔ میں نے یہ کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

ٹیلی فون بند کئے ایک منٹ ہوا تھا۔ کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے رسیور اٹھایا۔ تو دہلی کے ٹھیکیدار راجہ اکبر علی خاں (راجہ اکبر علی خاں ان مخلص دوستوں میں سے تھے جن کا در وطن روز پیدا نہیں کرتی بے حد فیاض۔ بہت بڑے مہمان نواز۔ جن کے ہاں ہر وقت دس پندرہ مہمان موجود۔ بے تکلف قسم کے پنجابی دوسروں کے کام آنے والے اور لاکھوں روپیہ سالانہ آمدنی رکھتے ہوئے بھی عجز و انکساری کا مجسمہ) تھے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے پنجابی میں کہا۔

"ابھی جو ٹیلی فون تمہیں کیا گیا۔ یہ خواجہ مجید کی طرف سے تھا۔ یہ خواجہ مجید لاہور کے خواجہ نذیر احمد بیرسٹر کے حقیقی ماموں اور پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ کے گہرے دوست ہیں ہم نے ان کو بتایا تھا۔ کہ تم پر کیونکہ نوٹوں کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ تمام حالات دریافت کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ یہ جسٹس ڈگلس ینگ کو بتا سکیں۔ مگر تم عجیب شخص ہو۔ کہ ملنے سے انکار کر دیا۔"

راجہ اکبر علی خاں کا یہ ارشاد سن کر میں بے حد نادم ہوا۔ اور میں نے کہا۔ کہ خواجہ صاحب نے صرف خواجہ مجید کہا۔ مجھے کیا علم تھا۔ کہ خواجہ مجید کون ہیں۔ میں نے سمجھا کہ اور شخص ملنا چاہتا ہوگا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں۔ کہ میں ہر شخص سے دفتر سے باہر جا کر ملاقات کروں۔ اس لئے میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ آپ جہاں فرمائیے میں حاضر ہو جاؤں۔

راجہ اکبر علی خاں نے خواجہ مجید سے بات کی اور فیصلہ ہوا۔ کہ میں اگلے روز دس بجے مرحوم حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر شریف منزل بلی ماراں پہنچ جاؤں۔ کیونکہ مرحوم حکیم صاحب کے صاحبزادہ حکیم جمیل احمد خاں ان کے دوست ہیں۔

میں اگلے روز صبح دس بجے حکیم جمیل احمد خاں صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ خواجہ مجید میرا انتظار کر رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے مقدمہ کے تمام حالات بتائے تو خواجہ صاحب

Marfat.com

نے کہا۔ آپ چند روز سے جسٹس سر ڈگلس کے ساتھ سیر کے لئے کشمیر جا رہے ہیں اور آپ وہاں چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ سے اس مقدمہ کے متعلق حالات بیان کریں گے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا۔ کہ میں اس میں یقین نہیں رکھتا۔ کہ آپ جب کشمیر جائیں گے۔ تو سر ڈگلس سے بات کریں گے۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے۔ کہ جیسے کوئی شخص کسی گاؤں میں جا رہا ہو۔ اور اس سے کہہ دیا جائے۔ کہ جاتے جاتے ایک دوسرے گاؤں میں پیغام پہنچا دینا۔ یعنی اگر وہ اس دوسرے گاؤں نہ جائے۔ تو پیغام کا پہنچنا غیر ممکن۔ اگر آپ کر سکتے ہیں۔ تو یہ کیجئے۔ کہ میں جسٹس سر ڈگلس ینگ سے خود مل لوں۔ اور تمام حالات بتاؤں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ کہ بہت اچھا وہ کوشش کریں گے۔

جسٹس سر ڈگلس ینگ اس زمانہ میں ایڈیٹر "ریاست" کے بہت بڑے مخالفین میں سے تھے۔ کیونکہ ایک بار آپ نے مقدمات کو جلدی ختم کرنے کے خیال سے ایک دن میں قتل کے پانچ چھ مقدمات کی اپیلوں کے فیصلے کئے۔ تو ایڈیٹر "ریاست" نے آپ کی اس جلد بازی پر تنقید کرتے ہوئے "ریاست" میں لکھا تھا۔ کہ یہ فیصلے ہائی کورٹ نے کئے ہیں۔ یا کہ عدالت خفیفہ نے کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ ایک روز میں قتل کے پانچ چھ مقدمات کی سماعت اچھی طرح ہو سکے۔ اس نوٹ کا ترجمہ دہلی گورنمنٹ نے جسٹس سر ڈگلس ینگ کو بھیجا۔ تو سر ڈگلس کا ارادہ ہوا۔ کہ وہ توہین عدالت کے جرم میں ایڈیٹر "ریاست" پر مقدمہ کریں۔ مگر چونکہ ان کے اپنے صوبہ میں ان کی اپنی ذات پر تنقید تھی۔ اور ان کو لوگوں نے بتایا۔ کہ دیوان سنگھ مقدمہ لڑے گا۔ یہ معافی نہ چاہے گا۔ معاملہ دور تک جائے گا۔ اور توہین عدالت کا یہ مقدمہ شاید کسی دوسرے صوبہ کی ہائی کورٹ میں تبدیل ہو جائے۔ تو آپ نے ایڈیٹر "ریاست" پر توہین عدالت کے جرم میں مقدمہ کرنے کا خیال بدل دیا تھا۔ مگر دہلی و پنجاب کی عدالتوں کے اشتہارات حاصل کرنے والی فہرست (جس کی منظوری ہائی کورٹ دیتا تھا۔) میں سے "ریاست" کا نام نکال دیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر "ریاست" کو غالباً ایک ہزار روپیہ ماہوار کے اشتہارات کی آمدنی کا نقصان ہوا۔ ایڈیٹر ریاست نے خواجہ مجید کو یہ بھی بتا دیا۔ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا۔ کہ تھوڑا عرصہ ہوا۔ ایڈیٹر "ریاست" نے گورنمنٹ ہند کے لا ممبر سر محمد ظفر اللہ خاں کو یہ تمام حالات بتا دیئے ہیں۔ اور سر ڈگلس کے رویہ کی شکایت بھی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ایڈیٹر "ریاست" نے محسوس کیا۔ کہ دہلی گورنمنٹ اس کے خلاف ہے۔ اور اس مخالفت کا یہاں کے سٹی مجسٹریٹ سردار بہادر سردار نریندر سنگھ پر بھی اثر معلوم ہوتا ہے۔ اور ادھر سر ڈگلس ینگ کی مخالفت کے باعث پنجاب ہائی کورٹ سے بھی انصاف کی کوئی توقع نہیں تو ایڈیٹر "ریاست" نے شملہ جا کر گورنمنٹ ہند کے لا ممبر چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں جن کے ماتحت ہندوستان کے تمام ہائی کورٹ تھے۔ اور جو ایڈیٹر "ریاست" کے دیرینہ کرم فرما تھے۔ کو تمام حالات بتا کر چاہا۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" کا مقدمہ کسی دوسرے صوبہ میں بھیجا جائے۔ اور چوہدری صاحب سوچ رہے ہیں۔ کہ کیا کرنا چاہیئے۔

میں خواجہ مجید کو تمام باتیں بتا کر واپس اپنے دفتر آ گیا۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ خواجہ صاحب کچھ نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ سر ڈگلس میرے ذاتی مخالفین میں سے ہیں۔ اور ان پر خواجہ مجید کے کہنے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

Marfat.com

چنانچہ میں پھر بھی اس کوشش میں رہا۔ کہ میرا یہ مقدمہ کسی دوسرے صوبہ کی ہائی کورٹ عدالت کے ماتحت چلا جائے میں اس زمانہ میں کاروبار کے سلسلہ میں مہینہ میں ایک آدھ بار لاہور جایا کرتا تھا۔ اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد لاہور گیا۔ اور خواجہ نذیر احمد صاحب بیرسٹر (خواجہ مجید کے حقیقی بھانجہ) کو میرے لاہور آنے کا علم ہوا۔ تو انہوں نے مسٹر غلام نبی بٹ (فلم ایکٹر) کی معرفت، مجھے پیغام بھیجا۔ کہ میں ان سے مل لوں۔ یہ پیغام مجھے امپیریل ہوٹل میں ملا۔ اور میں اگلے روز خواجہ صاحب سے ملنے کے لئے ان کے دفتر میں ہائی کورٹ (خواجہ صاحب اس زمانہ میں ہائی کورٹ کے ریسور تھے۔ اور ان کا دفتر بھی ہائی کورٹ میں تھا) گیا۔ خواجہ صاحب سے ملا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ خواجہ مجید کی مقدمہ کے متعلق سرڈگلس ینگ سے تفصیل سے باتیں ہوئی تھیں۔ سرڈگلس مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور میں صبح ساڑھے آٹھ بجے خواجہ صاحب کی کوٹھی پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں اگلے روز صبح آٹھ بجے ٹیکسی پر خواجہ صاحب کی کوٹھی پہنچ گیا۔ خواجہ صاحب مجھے اپنی کار میں لے کر جسٹس سرڈگلس کی کوٹھی پہنچے۔ کوٹھی پر پہنچنے کے بعد خواجہ صاحب تو کوٹھی کے ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ جہاں سرڈگلس بریک فاسٹ کھا رہے تھے۔ میں برآمدہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے برآمدہ میں بیٹھے دس منٹ ہوئے ہوں گے۔ کہ خواجہ صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ کہ صاحب دفتر کے کمرہ میں آ گئے ہیں۔ اور میں ان کے ساتھ چلوں۔ میں ان کے ساتھ گیا۔ دفتر کے کمرہ میں داخل ہوا۔ تو خواجہ صاحب نے چاہا۔ کہ ایٹی کیٹ کے مطابق وہ خود کمرے سے باہر چلے جائیں۔ تاکہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آزادی کے ساتھ تنہائی میں کہہ سکوں۔ مگر جسٹس سرڈگلس نے خواجہ صاحب سے کہا۔ کہ آپ بھی بیٹھ جائیے۔ چنانچہ میں اور خواجہ صاحب دونوں بیٹھ گئے۔ اور چیف جسٹس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "ویل سردار صاحب۔ وٹ آئی کین ڈو فار یو" یعنی میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ (یہ انگریزوں کا ایٹی کیٹ ہے کہ وہ بات شروع کرتے وقت اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں) میں نے جواب دیا۔ میں آپ سے سوائے انصاف کے کچھ نہیں چاہتا۔ اگر آپ کر سکتے ہیں۔ تو انصاف کیجئے۔ میں نے مقدمہ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بتائے۔ دہلی گورنمنٹ رائے گوپال داس اور سردار بہادر نریندر سنگھ سی مجسٹریٹ کی پوزیشن بیان کی۔ اور وہ فہرست ان کے سامنے رکھی۔ جو میرے مقدمات کے متعلق چھپی ہوئی تھی اور جس میں تفصیل کیساتھ بتایا گیا تھا کہ کون کون سا مقدمہ کب شروع ہوا۔ کس دفعہ کے مطابق چلایا گیا۔ کس والئے ریاست نے چلایا۔ مستغیث کون تھا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوا وغیرہ جسٹس سرڈگلس نے جب یہ فہرست پڑھی۔ تو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھنے لگے۔ اور پوچھا۔ کہ آپ پر چودہ مقدمات چلائے گئے۔" میں نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے پھر فہرست کو پڑھنا شروع کیا۔ فہرست پڑھنے کے بعد پھر مجھے دیکھا۔ اور کہا۔ کہ آپ تمام مقدمات میں بری ہوئے" میں نے کہا۔ ہاں سوائے ایک پرنس پروٹیکشن ایکٹ کے مقدمہ کے جس میں مجھے ہوشنگ آباد میں تین ماہ قید ہوئی" یہ سن کر آپ نے کہا کہ "وہ مقدمہ تو پولیٹیکل تھا۔ یعنی ایک مضمون لکھنے کے جرم میں"۔ میں نے کہا ہاں۔ یہ سب پڑھنے اور سننے کے بعد آپ نے کہا۔

"میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس پر مختلف نوعیت کے چودہ سنگین مقدمات چلائے گئے ہوں۔ اور وہ تمام میں باعزت بری ہوا ہو۔ ونڈرفل"

Marfat.com

یہ کہہ کر آپ پھر میری طرف دیکھنے لگ گئے۔ اور ہوں ہوں ونڈرفل۔ ونڈرفل کہتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ (انگریز نے جب ملنے والے سے یہ کہنا ہو کہ اب آپ چلے جائیے۔ تو وہ گھڑی کی طرف دیکھا کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اب جائیے) تو میں نے اجازت چاہی۔ آپ نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ونڈرفل۔ سردار صاحب میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔" میں رخصت ہو کر خواجہ صاحب کی کار میں آ بیٹھا۔ میرے کار میں آنے کے تین چار منٹ بعد خواجہ صاحب بھی آ گئے تو آپ نے فرمایا۔ کہ میرے آنے کے بعد چیف جسٹس نے کہا۔ کہ :-

"میں اس شخص سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس سے کہہ دینا۔ کہ جب کبھی بھی لاہور آئے تو مجھ سے ملا کرے۔ میں نے ایسا بہادر شخص زندگی میں نہیں دیکھا۔ جس پر نوابوں اور مہاراجوں نے چودہ مقدمات چلائے۔ اور ان سب کا اس نے مقابلہ کیا۔ اس کے ساتھ ضرور انصاف ہوگا۔"

خواجہ صاحب مجھے اپنی کار میں اپنی کوٹھی لائے۔ وہاں سے میں نے ٹیکسی منگائی۔ اور ہوٹل واپس آیا۔ اس کے بعد میرا مقدمہ سردار بہادر نریندر سنگھ سٹی مجسٹریٹ کی عدالت سے تبدیل ہو کر دیوان سکھانند ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گوڑگانوں کی عدالت میں چلا آیا۔ دیوان سکھانند نے اپنے ایک دوست سے تو مقدمہ کے دنوں میں کہا۔ کہ اس مقدمہ میں بھی دیوان سنگھ کو بری ہونا چاہیے۔ مگر آپ نے سات برس قید کی سزا دی۔ ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ تو مقدمہ کی سماعت جسٹس مرزد جج ہائی کورٹ کی عدالت میں ہوئی۔ اور جسٹس مرزد نے کھلی عدالت میں نہ صرف دہلی کی پولیس بلکہ ماتحت عدالت کے خلاف بھی سخت الفاظ استعمال کئے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کو باعزت بری کیا۔ اس مقدمہ کا یہ دلچسپ پہلو ہے۔ کہ میں جب بری ہوا۔ تو سزا دینے والے دیوان سکھانند ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو میرے دوست اور مشہور مصنف و ڈرامہ نویس دیوان شرر کے حقیقی بھائی ہیں) نے مجھے مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ اور اب پچھلے سال وہ ایک شادی کی تقریب کے سلسلہ میں دہلی میں ملے۔ تو آپ نے اظہار محبت کرتے ہوئے اخلاص کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور الگ لے جا کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جس پر میں نے کہا۔ دیوان صاحب میرے تمام مقدمات کا فیصلہ کرنے والے تمام مجسٹریٹ ہی فیصلہ کے بعد میرے گہرے دوست رہے۔ اور آپ کو بھی میں اپنا دوست ہی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ آپ میرے دوست دیوان شرر کے بھائی بھی ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا۔ مجھے علم ہے۔ کہ آپ حالات سے مجبور تھے۔ انگریزوں کی خواہش کے خلاف فیصلہ دینے والے بہت کم مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے۔

آج جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ نہ تو ہندوستان میں جسٹس سر ڈگلس ینگ موجود ہیں۔ نہ جسٹس مرزد عرصہ ہوا۔ جسٹس ینگ ولایت چلے گئے۔ اور جسٹس مرزد کا انتقال ہو گیا۔ مگر جب کبھی ان دونوں کے انصاف کا خیال آتا ہے۔ تو عزت و احترام کے جذبات کے ساتھ نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ اور خواجہ مجید اور خواجہ نذیر احمد کو تو میں ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے حقیقی بھائی۔ اور ابھی دو برس ہوئے خواجہ نذیر احمد دہلی آئے۔ اور ملے تو ان کو دیکھ کر خوشی اور محبت کے باعث آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور سوچا۔ کہ ہندوستان تقسیم کے باعث میں کتنے اچھے، بلند اور مخلص دوستوں سے محروم ہو گیا۔

Marfat.com

نوبل پرائز کے اُمیدوار اور مولانا ناصر بلیاوی

ایڈیٹر ریاست' زندگی کے ہر زمانے میں ایک دو پاگلوں سے دوستانہ تعلق رکھتا رہا۔ کیونکہ پاگلوں (بشرطیکہ ان کے دماغ میں دس پندرہ یا بیس فیصدی سے زیادہ پاگل پن نہ ہو۔ اور یہ اس بیماری میں بالکل ہی مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ زیادہ پاگل ہونے کی صورت میں ان سے بات چیت کرنے میں کوئی لطف نہیں آتا) کے ساتھ بات کرنے میں بے حد لطف محسوس ہوتا ہے۔ اور دن بھر کی کوفت چند منٹ ہی میں دور ہو جاتی ہے چنانچہ ایڈیٹر ریاست" کا مولانا سمیع اللہ (مولانا صاحب مرحوم مفتی کفایت اللہ کے داماد ہیں۔ اور آپ دیسے تو اردو بازار میں کتابوں کی ایک مختصر دوکان کرتے تھے۔ مگر آپ کی دوکان علم دوست اصحاب اور شعرا کا ایک جنکشن اسٹیشن ہے۔ اور شام کو آپ کے ہاں درجنوں شعرا، ادیب، ممبران پارلیمنٹ اور اہل ذوق جمع ہوا کرتے ہیں) اور مسٹر جمنا داس اختر اور دوسرے چند دوستوں کے ساتھ یہ معاہدہ ہے۔ کہ ان میں سے جس کسی کے پاس کوئی پاگل آئے۔ وہ اس کو دوسرے دوستوں کے پاس بھی بھیجے۔ اور اگر کسی کے پاس رہنے کے لئے جگہ نہ ہو۔ تو اس کی رہائش کا انتظام دفتر "ریاست" کے ایک کمرہ میں کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ شام کو تمام دوست اس کی صحبت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اور اس سلسلہ میں ہی سوامی پارس ناتھ اور مسٹر نیم چند نیناجی وغیرہ اصحاب کئی کئی برس تک دفتر "ریاست" میں مقیم رہے۔

۱۹۵۴ء کے گرمیوں کے زمانہ میں ایک روز مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تشریف لائے۔ آپ کے ساتھ مولانا ناصر بلیاوی بھی تھے۔ مولانا ملیح آبادی نے تشریف لانے کے بعد تعارف کرایا۔ "آپ مولانا ناصر بلیاوی ہیں۔ جو عربی زبان کے فاضل اجل شاعر ہیں۔ ایک کتاب "حیات الہند" لکھ رہے ہیں۔ جس میں ہندوستان کے تمام پھلوں اور سبزیوں کا عربی اشعار میں ذکر ہے"۔ اور آپ سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" ہیں"

اس تعارف کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ تو معلوم ہوا۔ کہ مولانا ناصر کے دماغ کی کچھ چولیں ڈھیلی ہیں۔ اور اپنی کتاب کو الہام کا درجہ دیتے ہیں۔ اور آپ کو یہ بہت بڑی شکایت ہے۔ کہ دنیا نے ان کی اور ان کی کتاب کی قدر نہ کی۔ قدرناشناسی کی اس شکایت کو سن کر ایڈیٹر "ریاست" نے کہا۔ کہ کوئی بات نہیں۔ آپ کی کتاب نوبل پرائز کے مقابلہ کے لئے یورپ بھیجی جا سکتی ہے۔ مولانا کو نوبل پرائز کا علم نہ تھا۔ ان کو سمجھایا گیا۔ کہ جو کتاب دنیا میں سب سے اچھی ہو۔ اس کو نوبل پرائز کے فنڈ سے دس لاکھ روپیہ بطور انعام دیا جاتا ہے۔ مولانا یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس روز صرف یہی بات چیت ہوئی۔ اور مولانا نے وعدہ فرمایا۔ کہ آپ ہفتہ میں دو تین بار ضرور تشریف لایا کریں گے۔ تاکہ نوبل پرائز حاصل کرنے کی کوشش جاری رہے۔ مولانا ناصر اس زمانہ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں بطور امام ملازم تھے۔ کھانا تو محلہ کے لوگوں کے ہاں سے کھاتے۔ اور محلہ کے لوگ دوسرے اخراجات کے لئے آپ کو چندہ کے ذریعہ آٹھ دس روپیہ ماہوار جمع کر دیتے۔ اس مسجد میں آپ کو قیام فرمائے چند ماہ ہوئے تھے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ

Marfat.com

آپ نے مسجد کی امامت چھوڑ دی ہے۔ کیونکہ محلہ کے لوگ ان کی قدر نہیں کرتے۔ ان سے کہا گیا۔ کہ مسجد کی نالی صاف کرنا بھی آپ کا فرض ہے۔ اور مولانا نے یہ ادنیٰ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مولانا نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ اور آپ سے درخواست کی گئی۔ کہ اگر آپ چاہیں تو دفتر "ریاست" کے ایک کمرہ میں مستقل طور پر قیام کر سکتے ہیں۔ مگر ایڈیٹر "ریاست" چونکہ سکھ ہے۔ شاید آپ کو خیال ہو۔ کہ مولوی کلاس آپ کا کسی غیر مسلم کے ہاں قیام کرنا ناپسند کرے۔ آپ نے مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنا بستر اس مسجد سے اٹھا کر ایک دوسری مسجد میں چلے گئے۔ جہاں کا امام اُن سے واقف تھا۔

چھ ماہ کے قریب نوبل پرائز کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی کسی دوست نے یہ کہا۔ کہ اس سال نوبل پرائز ملتوی ہو چکا ہے۔ اور کبھی یہ کہ عربی زبان کی کتاب کو نوبل پرائز نہیں مل سکتا۔ مولانا چھ ماہ تک نوبل پرائز کے دس لاکھ روپیہ کے منتظر رہے۔ اور آپ دوسرے مولویوں سے کہتے رہے۔ کہ عنقریب آپ کو دس لاکھ روپیہ یورپ سے ملنے والا ہے۔ چھ ماہ کے بعد آپ جب کچھ مایوس سے ہوئے۔ تو سکیم تیار کی گئی۔ کہ گورنمنٹ ہند سے اس کتاب کا انعام کم از کم ایک لاکھ روپیہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ تیاریاں شروع ہوئیں۔ دوستوں نے اس کی تائید کی۔ اور مولانا نے ایک خط ہندوستان کے صدر مسٹر راجندر پرشاد کے نام لکھا جس میں آپ کا ارشاد تھا۔ کہ ہندوستان کا نام روشن کرنے کے لئے آپ نے ایک کتاب "حیات الہند" لکھی ہے۔ اور اس کتاب میں ان تمام سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں کے نام ہیں۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کتاب کے ذریعے ہندوستان کی شہرت دنیا کے تمام ممالک تک پہنچ جائے گی۔ مولانا نے جب یہ خط لکھا۔ اور ایڈیٹر "ریاست" اور دوسرے دوستوں نے دیکھا۔ تو اس خط کی بہت تعریف کی گئی۔ اور یہ خط پوسٹ کرنے کے لئے رکھ لیا گیا۔ اور مولانا سے کہا گیا۔ کہ یہ خط رجسٹری کرا دیا جائے گا۔ آپ اس کی رسید کل لے جائیے۔ مولانا کے جانے کے بعد اس خط کو تو پھاڑ دیا گیا۔ اور اس کی جگہ ایک دوسرا لفافہ لکھا گیا جس پر پتہ مسٹر راجندر پرشاد معرفت اخبار "ریاست" دہلی تھا۔ اور اس کے اندر ردی کاغذ کا پرزہ رکھ دیا گیا۔ اور اس لفافہ پر دس آنہ کے ٹکٹ لگا کر اسے رجسٹری کرا دیا گیا۔ ڈاکخانہ کے قواعد کے مطابق رجسٹری کی رسید پر ڈاکخانہ مکمل پتہ نہیں لکھتا۔ صرف نام لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ رسید بھیجنے والے کو دی جاتی ہے۔ ڈاکخانہ والوں نے بھی قاعدہ کے مطابق رسید پر مسٹر راجندر پرشاد لکھا۔ اور رسید دے دی۔ اگلے روز یہ رجسٹری دفتر "ریاست" کو ڈلیور ہو گئی۔ جو پھاڑ دی گئی۔ اور شام کو جب مولانا تشریف لائے تو رسید اُن کو دے دی گئی۔ جس پر مسٹر راجندر پرشاد لکھا تھا۔ مولانا اس رسید سے پورے طور پر مطمئن تھے۔ اور اب اس رجسٹری کے جواب کا انتظار ہونے لگا۔ مولانا نے یہ رسید بعض انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دکھائی۔ کہ اس پر کس کا نام درج ہے۔ اور جب انہوں نے بتایا۔ کہ رسید پر مسٹر راجندر پرشاد کا نام لکھا ہے۔ تو آپ بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ اس رجسٹری کے جواب کا انتظار کرتے جب کئی روز ہو گئے۔ تو مولانا کچھ مایوسی سی محسوس کر رہے تھے۔ تو بازار سے ایک بہت ہی اعلیٰ قسم کا سادہ لیٹر فارم اور لفافہ منگایا گیا۔ اور اس لیٹر فارم پر ٹائپ کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ مولانا کا خط ملا ہے۔ اور بہت خوشی ہوئی۔ کہ آپ کتاب "حیات الہند" لکھ رہے ہیں۔ جو ہندوستان کا سر تمام دنیا میں بلند کر دے گی۔ اس کتاب کی یقیناً بہت

Marfat.com

قدر کی جائے گی۔ اور کافی رقم میں انعام دیا جائے گا۔ اس خط کے بھیجنے والے کا نام راجندر پرشاد لکھا تھا۔ اور لفافہ پر پتہ حضرت نامر بلیاوی معرفت اخبار "ریاست" دہلی ٹائپ کیا گیا۔ یہ خط دو آنے کے ٹکٹ لگا کر لیٹر بکس میں ڈال دیا گیا۔ جو اگلے روز دفتر "ریاست" میں پہنچا۔ اور تیسرے روز جب مولانا تشریف لائے۔ تو یہ خط بغیر کھولے مولانا کو یہ کہہ کر دیا گیا۔ کہ آپ کے نام کا ایک خط معرفت "ریاست" آیا ہے۔ مولانا نے جب یہ خط دیکھا۔ تو خوشی و مسرت کے انتہائی جذبات میں تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ خط پڑھا جائے۔ اس وقت چند دوسرے دوست بھی بلا لئے گئے تھے۔ سب کے سامنے خط کھولا گیا۔ اور پڑھا گیا۔ تو چاروں طرف سے مولانا کو مبارک بادیں دی گئیں۔ اور مولانا بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ اب گورنمنٹ ہند کے انعام کا انتظار ہونے لگا۔ اور مولانا نے اس خط کے جواب میں سکریٹری کا ایک خط مسٹر راجندر پرشاد کے نام لکھا۔ جو مولانا سے پوسٹ کرنے کے لئے لے لیا گیا۔ اور مولانا کے جانے کے بعد پھاڑ دیا گیا۔ مولانا مسٹر راجندر پرشاد کے بھیجے ہوئے کئی لاکھ روپیہ کے چیک کا ایک ماہ تک انتظار کرتے رہے۔ اور مسٹر راجندر پرشاد کو ریمائنڈر بھیجنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اور یہ ریمائنڈر پہلے کی طرح ہی پھاڑ دیئے جاتے۔ مولانا مسٹر راجندر پرشاد والے فرضی خط کو دیکھ کر چھ ماہ تک خوش رہے۔ اور جب چھ ماہ تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تو آپ کچھ مایوس سے ہوئے اور مایوسی کے عالم میں گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ اور وہاں کسی کلرک کو وہ خط دکھایا۔ تو اس کمبخت کلرک نے آپ سے کہا۔ کہ یہ مذاق کیا گیا ہے۔ مسٹر راجندر پرشاد ایسے کاغذوں پر سرکاری خط نہیں لکھا کرتے۔ مولانا اس مایوسی کے عالم میں دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ تو آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا گیا۔ کہ وہ کلرک ہندو ہونے کے باعث حاسد تھا۔ جو نہ چاہتا تھا کہ کوئی مسلمان گورنمنٹ سے چند لاکھ مزید روپیہ حاصل کرے۔ روپیہ ضرور آئے گا۔ چنانچہ پھر انتظار شروع ہوا۔ اور اس انتظار کا سلسلہ مزید چھ ماہ تک جاری رہا۔ جس کے بعد مولانا قطعی مایوس ہو گئے۔ اور آپ کو یہ صدمہ تھا۔ کہ آپ کی لاجواب تصنیف کی گورنمنٹ ہند اور ہندوستان کے صدر نے بھی قدر نہ کی۔

مولانا جب راجندر پرشاد سے بھی مایوس ہوئے۔ تو فیصلہ ہوا۔ کہ چند دوستوں سے مولانا کی کتاب کے لئے بطور قدر دانی مالی امداد لی جائے۔ ایک دوست مسٹر پریم کوہلی قریب قریب ہر روز دفتر "ریاست" میں آنے والوں میں سے ہیں۔ تمام دوستوں اور مولانا کے سامنے ان سے کہا گیا۔ کہ وہ مولانا کو ایک ہزار روپیہ بطور دوستانہ امداد دیں۔ سکیم کے مطابق پہلے تو مسٹر پریم نے بنیوں کی سی بہانہ تراشی کی۔ اور جب دوستوں نے بار بار زور دیا۔ تو آپ آمادہ ہو گئے۔ اور آپ نے وعدہ کیا۔ کہ آپ ایک ہزار روپیہ دیں گے۔ چنانچہ اس ایک ہزار روپیہ کے لئے تقاضہ شروع ہوا۔ تو آپ نے بڑوں کے ایک صاحب سے جو گجرات (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ ایک پرانی چیک بک کا ایک چیک لیا جو گجرات کے ایک بنک کا تھا۔ اور یہ بنک تبادلہ آبادی سے دس برس پہلے کا بند ہو چکا تھا۔ پریم صاحب نے اس چیک پر ایک ہزار روپیہ لکھ کر دستخط کر دیئے۔ اور ساتھ اس چیک پر "پے ای اکونٹ اونلی" (یعنی یہ روپیہ بنک کے ذریعے صرف اسی شخص کو ملے جس کا بنک میں حساب ہو) لکھ کر مولانا کو دے دیا۔

Marfat.com

مولانا بے حد خوش کہ ان کو ایک ہزار روپیہ ملا ہے۔ آپ مسٹر پریم کا شکریہ ادا کرنے اور اپنی احسان شناسی کا ثبوت دینے کے لئے دہلی کے مسلم اخبارات کے دفاتر میں گئے۔ اور ان سے کہا۔ کہ وہ مسٹر پریم کی تعریف میں مضمون لکھیں۔ کیونکہ انہوں نے ہندو ہوتے ہوئے بھی عربی زبان کی ایک کتاب کی قدر کرتے ہوئے ایک ہزار روپیہ دیا ہے۔ چنانچہ "الجمعیۃ" اور دوسرے روزانہ مسلم اخبارات میں پریم کی تعریف میں ایک مراسلہ شائع ہوا۔ جو مولانا ناصر بلیاوی کی طرف سے تھا۔ اور یہ اخبارات لے کر آپ شام کو دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ تاکہ وہ مسٹر پریم کو ان کی تعریف کا یہ مضمون دکھا سکیں۔ اور تمام دوستوں کے سامنے یہ اخبارات مسٹر پریم کو دکھائے گئے۔ اس کے بعد ایک دوست سے مولانا کو کہلوایا گیا۔ کہ اس چیک کا روپیہ مولانا کو تب مل سکتا ہے۔ اگر ان کا حساب بنک میں ہو۔ اور کسی بنک میں حساب کھولنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ مولانا پہلے کم از کم دو سو روپیہ بنک میں جمع کرا دیں۔ مگر مولانا غریب کے پاس دو سو روپیہ کہاں۔ وہ تو محلہ کے مسلمانوں کی روٹیوں پر زندگی گزارتے تھے۔ اور دوسرے اخراجات کے لئے ایڈیٹر "ریاست" سے ساتویں آٹھویں روز دو تین روپیہ لے جاتے تھے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے کہ بنک سے روپیہ کیونکر نکلوایا جائے۔ دو تین ماہ اور گذر گئے۔ کیونکہ مولانا کو نہ تو یہ معلوم تھا۔ کہ بنک میں حساب کھولنے کی کیا صورت ہے۔ نہ روپیہ موجود تھا۔ اور اس کا تو علم ہی نہ تھا۔ کہ جس بنک کا یہ چیک ہے۔ وہ بنک آج سے پندرہ برس پہلے پاکستان میں تھا۔ اور اب بند ہو چکا ہے۔

بنک سے چیک کیش کرانے کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ کبھی تو مسٹر پریم کے خلاف شکایت کہ انہوں نے چیک پر "پےبے ای اکونٹ اونلی" لکھ دیا۔ اور کبھی اس مجبوری کا اظہار کہ ان کے پاس دو سو روپیہ موجود نہیں۔ تاکہ یہ بنک میں حساب کھول سکیں۔ بہرحال کئی ماہ اس جدوجہد میں گزر گئے اور جب مولانا کو ایک شخص نے یہ بتایا۔ کہ یہ چیک پاکستان کا ہے اور ہندوستان میں کیش نہیں ہو سکتا۔ (آپ کو اس کا علم اب تک نہیں۔ کہ اس بنک کو بند ہوئے بھی پندرہ برس ہو چکے ہیں) تو آپ بہت مایوس ہوئے۔ اور آپ اب تک مسٹر پریم سے خفا ہیں۔ کہ انہوں نے چیک پاکستان کے بنک کا دیا۔ جو ہندوستان میں کیش نہیں ہو سکتا۔

جب مولانا اس چیک سے بھی بے حد مایوس ہو گئے۔ تو سوال پیدا ہوا۔ کہ اب مولانا کی "مصروفیت" کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ایران کی امبیسی کے سیکریٹری مسٹر مرزا ہفتہ میں ایک آدھ بار دفتر "ریاست" میں تشریف لایا کرتے ہیں۔ آپ سے مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ چونکہ شاہ ایران کے حقیقی چھوٹے بھائی ہندوستان آ رہے ہیں۔ مولانا ان کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھیں۔ اور مسٹر مرزا شاہ ایران کے بھائی سے پچاس ہزار روپیہ بطور انعام دلوائیں۔ اس سکیم پر عمل درآمد کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں اور مولانا نے ایران کے شہزادہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جو مسٹر مرزا کو دے دیا گیا۔ اور چند روز بعد جب شہزادہ ایران دہلی تشریف لائے۔ تو مسٹر مرزا نے بتایا۔ کہ شہزادہ صاحب مولانا کو پچاس ہزار روپیہ بطور انعام دینا چاہتے ہیں چنانچہ اب اس روپیہ کو لینے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور مولانا سے فیصلہ ہوا۔ کہ اس پچاس ہزار روپیہ میں سے ساڑھے بارہ

Marfat.com

فی صدی یعنی سوا چھ ہزار روپیہ تو مسٹر مرزا بطور اپنا کمیشن لیں گے۔ اور سوا چھ ہزار روپیہ دیوان سنگھ اپنی کوشش کا معاوضہ لے گا۔ اور مولانا سے پروگرام طے ہونا شروع ہوا۔ کہ آپ کب شہزادہ سے ملیں۔ اور پچاس ہزار روپیہ ایرانی اشرفیوں کی صورت میں وصول کریں۔ چنانچہ مولانا نے شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے درزی کو سینے کے لئے کپڑے دیئے۔ اور ملاقات کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور ایک روز دس بجے کا وقت مولانا کی ملاقات کا مقرر کر دیا گیا۔ مولانا نے ایڈیٹر ریاست سے کچھ روپیہ لے کر درزی کو سینے کے لئے کپڑے تو دے دیئے۔ مگر آپ کے پاس سلائی کے لئے پیسے نہ تھے۔ کمبخت درزی نے ایک تو کپڑے سینے میں دیر کی اور مولانا رات بھر درزی کے پاس بیٹھ کر کپڑے سلواتے رہے۔ اور دوسرے جب کپڑے سل چکے۔ تو درزی نے بغیر اُجرت لئے کپڑے دینے سے انکار کر دیا۔ اور اتفاقاً درزی نے کپڑے اس وقت دیئے۔ جب کہ شہزادہ سے ملنے کا فرضی وقت گذر چکا تھا۔ یعنی دس بجے تو ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ اور مولانا نے کپڑے پہن کر اور اپنے کاندھے پر مولویوں کا سرخ رومال رکھ کر ساڑھے دس بجے دفتر ریاست میں پہنچے۔ تاکہ بس کے کرایہ کے لئے پیسے لے کر ایران کی ایمبیسی میں پہنچ سکیں۔ اگر مولانا وقت پر بھی پہنچ جاتے۔ تو ہمیں کوئی اور بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ مولانا خود ہی نصف گھنٹہ لیٹ پہنچے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مَیں نے فرضی طور پر مسٹر مرزا کو ٹیلیفون کیا۔ اور فرضی باتیں کرنے کے بعد مولانا کو بتایا۔ کہ مسٹر مرزا بے حد خفا ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں۔ کہ شہزادہ صاحب نے مولانا کو ملاقات کا شرف بخشنے کے لئے دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ مگر مولانا نہیں پہنچے۔ اور شہزادہ صاحب کہہ رہے تھے۔ کہ کوئی ہندوستانی بھی وقت کا پابند نہیں۔ اور مولانا کا انتظار کرنے کے بعد شہزادہ صاحب ابھی پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے چلے گئے ہیں۔ اور آج رات کو چار بجے ہوائی جہاز کے ذریعے واپس ایران جا رہے ہیں۔ چنانچہ مسٹر مرزا کا یہ فرضی جواب سن کر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ مولانا کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ مگر مولانا کو خود افسوس تھا۔ کہ جو قصور ہے اس کا اس کمبخت درزی کا ہے۔ جس نے وقت پر کپڑے تیار نہیں کئے۔

شام کو مسٹر مرزا تشریف لائے۔ مولانا بھی انتہائی مایوسی کی حالت میں موجود تھے۔ ہم تینوں نے بات چیت کی۔ مسٹر مرزا تو غصہ میں تھے۔ کہ مولانا وقت پر ایران کی ایمبیسی میں تشریف نہ لائے۔ اور مولانا انتہائی مایوس۔ کہ درزی کی غلطی سے پچاس ہزار روپیہ کا نقصان ہوا۔ اور مَیں دونوں سے خفا۔ کہ میرا ساڑھے بارہ فیصدی حصہ یعنی سوا چھ ہزار روپیہ کا نقصان ہوا۔ نصف گھنٹہ کی بات چیت کرنے کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ مولانا ہوائی جہاز کے اڈہ پر رات کے بارہ بجے تشریف لے جائیں۔ وہاں شہزادہ صاحب سے ملاقات ہو۔ اور پچاس ہزار روپیہ کی سونے کی ایرانی اشرفیاں حاصل کریں۔ اور چونکہ مولانا ہوائی اڈہ وغیرہ سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان کے پاس ٹیکسی کے لئے پیسے ہیں۔ دیوان سنگھ ان کے ساتھ ہوائی اڈہ پر جائے۔ اس فیصلہ کے بعد مَیں جب دوسرے کمرے میں گیا۔ تو مسٹر مرزا نے مولانا سے راز میں کہا۔ کہ مولانا صاحب سوچ لیجئے۔ پچاس ہزار روپیہ کا معاملہ ہے۔ دیوان سنگھ ایک سکھ اور کافر ہے۔ اور ہندوستان میں ہندو گورنمنٹ ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ جب آپ واپس آ رہے ہوں تو دیوان سنگھ روپیہ کے لالچ میں آپ کو قتل کر دے۔ ۱۹۴۷ء میں سکھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا۔ مَیں یہ صرف احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ کسی کافر کا اعتبار کرنا اسلام میں منع ہے۔ مولانا نے مسٹر مرزا

Marfat.com

سے جب یہ سُنا، تو آپ سناٹے میں آگئے۔ ایک طرف پچاس ہزار روپیہ ملنے کا سوال اور دوسری طرف زندگی کا خطرہ۔ آپ نے مسٹر مرزا سے فرمایا، کہ آپ نے اچھا کیا۔ جو وقت پر متنبہ کر دیا۔ مَیں تو کسی قیمت پر بھی رات کے وقت ایک سکھ کے ساتھ دہلی سے دس میل دور ہوائی اڈہ پر جانے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ اس بات چیت کے باعث مولانا پچاس ہزار روپیہ سے مایوس ہو گئے۔ جو اُن کو شہزادہ سے ملنے والا تھا۔

ایران کے شہزادہ کے واپس ایران چلے جانے کے بعد سوال پیدا ہُوا۔ کہ اب مولانا کی مایوسی کو دور کرنے اور آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی نئی سکیم تیار کی جائے۔ دہلی کی ایک علم دوست شخصیت مسٹر گن بیسر پرشاد ماتھر بھی کبھی کبھی شام کی محفل میں شامل ہونے کے لئے دفتر "ریاست" میں آیا کرتے ہیں۔ اور آپ بھی ان دلچسپیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ آپ سے درخواست کی گئی۔ کہ سیٹھ برلا آپ کے دوست ہیں۔ اور ان کے پاس کروڑوں روپیہ موجود ہے۔ وہ سیٹھ برلا سے مولانا کو کیوں نہ دس پندرہ ہزار روپیہ لے دیں۔ کیونکہ ان کا عربی زبان کی ایک کتاب کی قدر کرنا ان کے ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہونے کا ثبوت ہو گا۔ مسٹر گن بیسر پرشاد ماتھر نے جواب دیا۔ کہ ضرور کوشش کریں گے۔ اور سیٹھ برلا کو خط لکھیں گے۔ چنانچہ اب مولانا کی ماتھر صاحب کے ہاں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اور ان سے کہا جاتا رہا۔ کہ آج سیٹھ برلا دہلی آئے مگر مصروفیت کے باعث ماتھر صاحب ان سے مل نہ سکے۔ سیٹھ صاحب کلکتہ میں موجود نہیں۔ سیٹھ صاحب بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ اور سیٹھ صاحب عنقریب پھر دہلی آئیں گے وغیرہ۔ سیٹھ برلا کے روپیہ کی توقع پر بھی کئی ماہ گزر گئے۔ تو آخر مولوی صاحب نے فرمایا۔ کہ ماتھر صاحب بہت کاہل اور فرض ناشناس ہیں۔ اور کسی دوسرے کے کام آنے والے نہیں۔ ورنہ کوشش کرتے۔ تو یہ دس ہزار روپیہ ملنا کوئی مشکل نہ تھا۔ آخر مولوی صاحب سے یہ کہا گیا۔ کہ ماتھر صاحب تو بہت اچھے ہیں۔ اور انہوں نے بہت کوشش کی مگر سیٹھ برلا ہندو مہا سبھائی خیالات کے ہیں۔ وہ کسی مسلمان کو روپیہ دینا نہیں چاہتے۔ اگر کوئی ہندو ہوتا۔ اور کتاب سنسکرت میں لکھی جاتی۔ تو یہ دس ہزار روپیہ نہیں پچاس روپیہ دے دیتے۔ مولانا اس جواب سے بھی بے حد مایوس ہوئے۔ اور اب کوئی نئی سکیم سوچی جانے لگی۔

مولانا ناصر جب زیادہ ہی مایوس ہوئے۔ تو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا سے کہا۔ کہ جب کسی سکیم کے مطابق اکٹھا لاکھوں روپیہ آئے گا۔ تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال ایسا کیا جائے۔ کہ مولانا ناصر، مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک درخواست دیں۔ تا کہ گورنمنٹ ہند آپ کی پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دے۔ کیونکہ جس صورت میں کہ گورنمنٹ کے خزانے سے سینکڑوں ہندو اور مسلمان مصنف اور شاعر سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پنشن پا رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔ کہ مولانا ناصر جیسے لائق ترین مصنف کو پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن نہ دی جائے۔ کیونکہ شعرا اور ادبا نے تو صرف نظمیں اور مضامین لکھے۔ اور مولانا نے سبزیوں اور پھلوں کے متعلق عربی زبان میں کتاب لکھ کر ہندوستان کا سر تمام دنیا میں بلند کیا۔ چنانچہ درخواست لکھی گئی۔ اور اب انتظام شروع ہُوا۔ کہ مولانا کی پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہو۔ اور آپ نے مولانا

Marfat.com

عبدالرزاق ملیح آبادی کے گھر کے چکر لگانے شروع کئے۔ اور اس سلسلہ میں ملیح آبادی صاحب نے مسٹر اجمل خاں صاحب پرائیوٹ سیکرٹری مولانا ابوالکلام سے بھی تعارف کرایا۔ اور ان کو بھی راز میں لیا گیا۔ مولانا ناصر جب پنشن کے فیصلہ کا چھ ماہ تک انتظار کرتے رہے۔ اور مایوس ہوئے تو آپ کے کان میں کہا گیا۔ کہ مولانا ابوالکلام نے تو پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی تھی۔ اور ایجوکیشن منسٹری سے حکم بھی جاری ہو گیا تھا۔ مگر مولانا عبدالرزاق اور مسٹر اجمل خاں نے حسد کے باعث فائل کو ہی گم کر دیا ہے۔ اس لئے پنشن کا حکم سرکاری خزانہ میں نہ پہنچا۔ اس اطلاع پر مولانا ناصر نہ صرف بے حد مایوس ہوئے۔ بلکہ آپ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مسٹر اجمل خاں کے بھی خلاف ہو گئے۔ اور آپ نے مولانا ملیح آبادی کے ہاں جانا ترک کر دیا۔ اور جب بھی بات ہوتی۔ تو ارشاد ہوتا کہ "مولوی مولوی کا دشمن" کے مصداق مولانا ملیح آبادی نے مسٹر اجمل خاں سے سازش کر کے پنشن بند کرا دی۔ حالانکہ مولانا ابوالکلام نے تو علم دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیتے ہوئے پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن جاری کر دی تھی۔

پنشن کے بند ہونے پر مولانا بے حد مایوس ہوئے۔ تو ایڈیٹر "ریاست" نے ان سے کہا۔ کہ قرآن میں خدا نے کہا ہے کہ مسلمان کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن کے اس حکم کے مطابق آپ کا مایوس ہونا گناہ ہے۔ اور جب مولانا زیادہ ہی مایوس ہوئے۔ تو مسٹر مرزا نے ایک روز مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا کو مبارک باد دی۔ کہ ایران کے بادشاہ نے مولانا کو ایران سے پچاس ہزار روپیہ بھیجا ہے۔ اور آپ کو پچاس ہزار روپیہ کا ایران کی ایمبیسی سے چیک دیا جائے گا۔ اس خبر کو سن کر مولانا کو جو مسرت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اور اب اس چیک کا انتظار ہونے لگا۔ اور مولانا نے مسٹر مرزا کے گھر کے چکر لگانے شروع کئے۔ اور ٹیلی فون پر تقاضا شروع ہوا۔ کہ چیک جلدی بھیجا جائے۔ مگر مسٹر مرزا نے ٹال مٹول کا رویہ اختیار کیا۔ اور جب ٹال مٹول کرتے ہوئے بھی دو تین ماہ گزر گئے۔ اور آپ نے ایڈیٹر "ریاست" پر چیک منگانے کے لئے زیادہ زور دیا۔ تو اس کے کان میں کہا گیا۔ کہ مسٹر مرزا اس پچاس ہزار روپیہ میں سے اپنا روپیہ چاہتے ہیں۔ اس لئے چیک جاری نہیں ہونے دیتے۔ اور چونکہ ایڈیٹر "ریاست" بھی آپ کے لئے اتنے طویل عرصہ سے کوشش کر رہا ہے۔ اس کو بھی کچھ نہ کچھ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک روز مسٹر مرزا معہ اپنی بیوی کے تشریف لائے۔ اور مولانا بھی موجود تھے۔ تو ایک گھنٹہ کی بحث اور "گو اینڈ ٹیک" کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے فیصلہ ہوا۔ کہ اس پچاس ہزار روپیہ میں سے ساڑھے سینتیس ہزار روپیہ تو مولانا لیں۔ سوا چھ ہزار روپیہ مسٹر مرزا۔ اور سوا چھ ہزار روپیہ ایڈیٹر "ریاست" اور اس فیصلہ کے متعلق ایک خط بھی مسٹر مرزا کو لکھ دیا۔ تاکہ مولانا تمام کا تمام چیک خود ہی ہضم نہ کر جائیں۔ اس فیصلہ کے بعد چیک کا پھر انتظار شروع ہوا۔ اور مسٹر مرزا کبھی تو کہتے۔ کہ ایمبیسڈر صاحب شملہ گئے ہیں۔ کبھی دورہ پر ہیں۔ اور کبھی طبیعت اچھی نہیں۔ اس لئے چیک پر دستخط نہیں ہوئے۔ جب یہ سلسلہ بھی کئی ماہ تک چلتا رہا۔ تو مولانا بے حد خفا تھے۔ اور آپ نے دریافت کیا۔ کہ چیک نہ دینے کی اب وجہ کیا ہے۔ جب کہ تمام فیصلہ ہو چکا ہے۔ مولانا کی اس خفگی اور مایوسی کو دیکھ کر آپ کے کان میں پھر کہا گیا۔ کہ مسٹر مرزا سوا چھ ہزار روپیہ پر مطمئن نہیں ہیں اور وہ نصف یعنی پچیس ہزار روپیہ طلب کرتے ہیں۔ یہ سن کر مولانا غصہ کے باعث سرخ ہو گئے۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ کتاب لکھنے کی محنت

Marfat.com

تو آپ نے کی۔ اور کوشش دیوان سنگھ نے کی۔ اور یہ مسٹر مرزا ہیں۔ کہ پچاس ہزار روپیہ میں سے نصف اُڑانے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا مسٹر مرزا پر بے حد ناراض۔ اور آپ نے کہا۔ کہ آپ مسٹر مرزا سے ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع کر دینگے۔ کیونکہ مسٹر مرزا اپنی زبان پر قائم نہیں رہے۔ مولانا کے غصہ کو دیکھ کر ان سے کہا گیا۔ کہ تعلقات ہرگز منقطع نہ کیجیے۔ اور نہ اپنی ناراضی کا مرزا صاحب پر اظہار ہونے دیجیے۔ ورنہ ہم پچاس ہزار روپیہ سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ وزیر لوگ اپنے سیکرٹریوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوتے ہیں۔ سیکرٹری ان کو جو پڑھائیں یہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ میرے یہ کہنے پر مولانا کچھ ٹھنڈے ہوئے۔ مگر آپ ابھی تک پچیس ہزار روپیہ دینے پر رضا مند نہیں ہوئے۔ اور جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ پچاس ہزار روپیہ کے چیک کا مطالبہ جاری ہے۔ اور احتیاط کی گئی ہے۔ کہ جب تک یہ کتاب شائع نہ ہو۔ یہ تفریح جاری رہے۔ کیونکہ کتاب کے شائع ہونے کے بعد تو تمام دوست اس تفریح سے محروم ہو جائیں گے۔ اور کئی برس کی یہ تفریح مولانا کے لئے بھی مفید تھی۔ کیونکہ آپ کئی برس تک ان وعدوں کے باعث انتہائی خوشی و مسرّت محسوس کرتے رہے۔ اور کئی بار تو روپیہ کے انتظار میں آپ رات کو سو بھی نہ سکے۔

شراب کی زیادتی موت کا باعث

لکھنو کے نوجوان شاعر مرحوم مسٹر اسرار الحق مجازؔ ان لوگوں میں سے تھے۔ جن کو مادرِ وطن ہر روز پیدا نہیں کرتی۔ اور جو طویل عرصہ کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مرحوم کے ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ بہت ہی اخلاص و محبت کے تعلقات تھے۔ اور آپ جب کبھی دہلی آتے اور جتنے روز یہاں قیام کرتے۔ دن میں کئی کئی گھنٹہ دفتر "ریاست" میں گزارتے۔

دفتر "ریاست" محلہ گڑھیا میں تھا۔ جہاں کہ چھت پر سونے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ کیونکہ اوپر کی منزل میں دوسرے لوگ رہتے تھے۔ ایک روز گرمی کا زمانہ تھا۔ اور شام کا وقت تھا۔ کہ آپ اور مرحوم مسٹر اختر شیرانی دونوں تشریف لائے۔ اور چند منٹ بیٹھے تھے۔ کہ آپ نے شراب منگانے کے لئے کہا۔ مجھے وسکی یا دیسی شراب سے ایک طرح کی نفرت سی ہے۔ اور میں کبھی کبھی جب طبیعت اچھی نہ ہو۔ یا زیادہ تشویش ہو۔ تو نصف یا زیادہ سے زیادہ ایک پیگ برانڈی کا پی لیا کرتا ہوں۔ اور کئی کئی ماہ تک نہیں پیتا۔ چاہے گھر میں بوتل بھر رکھی ہو۔ مگر دوستوں کے لئے ہر زمانہ میں وسکی موجود رہی۔ کیونکہ اگر کوئی دوست شام کو پینے کے لئے یا کھانے پر آئے۔ تو کفائیت شعاری یا مذہب کا بہانہ کرتے ہوئے ان کو وسکی پیش نہ کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے

ان دونوں حضرات کے کہنے پر میں نے وسکی کی ایک بوتل اور سوڈے کی چند بوتلیں ان کے لئے ڈرائنگ روم میں رکھوا دیں۔ اور کہا۔ کہ آپ شغل فرمائیے۔ اور خود میں دفتر کے کمرہ میں کام میں مصروف ہو گیا۔ میں اس زمانہ میں رات کو مرحوم مسٹر شرما ایڈیٹر "انصاف" کے مکان پر چلا جایا کرتا تھا۔ تا کہ چھت پر ہوا میں سو سکوں۔ یہ دونوں رات کو نو بجے تک وسکی پیتے رہے۔ تو میں نے ملازم سے کہا۔ کہ یہ جب تک یہاں بیٹھے پیتے رہیں۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ اور جب یہ جائیں۔ تو پھر دروازہ بند کر دے۔ اور ان سے کہا۔ کہ میں سونے کے لئے مسٹر شرما

Marfat.com

کے مکان پر جا رہا ہوں۔ آپ پینے کے بعد جب چاہیں چلے جائیں۔ میں یہ کہہ کر مسٹر شرما کے مکان پر چلا گیا۔

میں مسٹر شرما کے مکان سے صبح چار بجے واپس دفتر آجایا کرتا تھا۔ تاکہ کام شروع کر سکوں۔ اگلی صبح چار بجے جب واپس آیا۔ تو یہ وسکی پی رہے تھے۔ میں نے سمجھا۔ کہ یہ بھی ابھی تشریف لائے ہیں۔ تو میں نے پوچھا۔ کہ آپ کس وقت تشریف لائے۔ مجاز صاحب نے کہا۔ کہ رات کو گیا کون تھا۔ یعنی یہ رات بھر وسکی پیتے رہے۔ (اور اس کے بعد دوپہر کو دس بجے کے بعد یہ واپس گئے۔ جہاں کہ مقیم تھے۔

زیادہ شراب پینے کا مرحوم مجاز کے دماغ پر بھی اثر تھا۔ اور عورتوں کے متعلق تو ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اگر کسی بس میں جا رہے ہوں جتنی دیر بس میں بیٹھتے کسی نہ کسی عورت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے۔ اور یہ محسوس کرتے۔ کہ یہ عورت ان پر عاشق ہے۔ ایک روز آپ اردو بازار میں سے گذر رہے تھے۔ بازار کی سڑک کی مرمت ہو رہی تھی۔ اور مزدوروں میں راجپوتانہ کی ایک نوعمر اور نوجوان لڑکی بھی کام کر رہی تھی۔ آپ نے جب لڑکی کو دیکھا۔ تو وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور شاید ایک گھنٹہ تک وہیں کھڑے رہے اور شام کو آئے۔ تو آپ نے اس لڑکی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ وہ لڑکی بھی ان کو پسند کرتی تھی۔ حالانکہ لڑکی کو خیال بھی نہ تھا۔ کہ یہ کون ہے۔ مگر یہ اس کے حسن میں مبتلا تھے۔ اور اس کے بعد کئی روز تک اس بازار کے چکر لگاتے رہے۔ کہ یہ کہیں نظر آجائے۔

مسٹر مجاز کو دماغ کی خرابی کے باعث رات کو نیند نہ آتی تھی۔ اور تمام رات کروٹیں لیتے رہتے۔ اور کبھی تو یہ رات کو تین بجے ہی دفتر "ریاست" کا دروازہ آکھٹکھٹاتے۔ اور کبھی چار بجے۔ میں علی الصبح چار پانچ بجے کام شروع کر دیا کرتا ہوں۔ یہ حضرت آتے۔ تو اپنی عشق بازی کے قصے سنانا شروع کر دیتے۔ اور اکثر ایسا ہوتا۔ کہ جو خاتون ان کے کلام کی مداح اور شاعرہ میں ان کے کلام کی داد دینے کی گنہگار ہوتیں۔ صبح چار پانچ بجے ہی ان کے ٹیلی فون کا نمبر ملا کر ان کو بیدار کیا جاتا۔ اور اشعار سنا کر اظہار عشق کیا جاتا اندازہ کیا سکتا ہے۔ کہ ان کی اس حرکت سے اس خاتون کی کیا حالت ہوتی ہو گی۔ اور اس کے گھر والے اس معصوم اور بے گناہ کے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے۔ چنانچہ ایک دوبار ان کے اس طرح ٹیلیفون کرنے کے بعد جب میں نے محسوس کیا۔ تو میں سختی کے ساتھ ان کو ٹیلی فون استعمال کرنے سے منع کر دیتا۔ اور یہ میرے منع کرنے پر ناراضی محسوس کرتے۔

مسٹر مجاز بہت ہی ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ایک روز شام کو حضرت جوش ملیح آبادی مجاز اور بسمل ٹونکی معہ ایک خاتون شاعرہ کے جو حسین بھی ہیں۔ دفتر "ریاست" میں تشریف لائے یہ لوگ وسکی بھی پی رہے تھے۔ اور اپنا کلام بھی سنا رہے تھے۔ اور یہ خاتون جب وسکی کے زیر اثر خوش الحانی کے ساتھ گا کر اپنا کلام سنا رہی تھیں۔ تو حضرت بسمل نے اس خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ "تم تو حسن۔ موسیقی اور شاعری کی تثلیث ہو۔" مسٹر مجاز نے جب سنا۔ تو فوراً کہا نہیں تثلیث نہیں۔ یہ کاک ٹیل۔ (کاک ٹیل میں برانڈی، وسکی، جن اور رم وغیرہ تمام قسم کی شرابیں ملائی

Marfat.com

جاتی ہیں۔ اور اس کا نشہ بہت دیر پا ہوتا ہے) ہیں۔ یعنی موسیقی، شاعری اور حسن کے علاوہ ان میں کئی اور بھی صفات ہیں۔ مجاز کا یہ استعارہ سُن کر حضرت جوش بھی پھڑک اٹھے۔ اور سب نے ان کی ذہانت اور حاضر جوابی کی داد دی۔

مرحوم مجاز ہر عورت کو اپنا عاشق سمجھتے تھے۔ جو ان کے شعر کی تعریف کر دے۔ یا ان سے مسکرا کر بات کرے۔ یوپی کی ایک ایم اے تک تعلیم یافتہ اور سخن شناس خاتون اپنے عزیزوں کے ساتھ دہلی میں مقیم تھیں۔ اور ان کے گھر کے تمام لوگ بڑی پوزیشن کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ ایک مشاعرہ میں جب مجاز نے اپنی نظم سنائی۔ تو اس خاتون نے بھی اپنی بدقسمتی کے باعث ان کے اشعار کی داد دے دی۔ بس پھر کیا تھا۔ مجاز نے سمجھ لیا۔ کہ یہ خاتون بھی ان کی عاشق ہے۔ چنانچہ اگلے روز رات کو دس بجے اس خاتون کے ہاں چلے گئے۔ کوٹھی کا دروازہ بند تھا۔ اور تمام لوگ سو رہے تھے۔ چوکیدار کی معرفت اطلاع کرائی۔ کہ مجاز صاحب اس خاتون سے بات چیت کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس خاتون کے متعلق اس کے گھر والوں نے کیا خیال کیا ہوگا۔ اور کسقدر غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اگر اس خاتون کے گھر والے مجاز کی دماغی کیفیت سے واقف نہ ہوتے جس کے متعلق وہ پہلے ہی سن چکے تھے۔ چنانچہ گھر والوں نے چوکیدار سے کہا۔ کہ کوٹھی کے اندر مت داخل ہونے دو۔ اور دروازہ بند کر دو۔ اور مجاز صاحب ایک ناکام عاشق کی طرح واپس چلے آئے۔

ایک روز دوپہر کو دفتر "ریاست" میں آئے۔ اور جب واپس جا رہے تھے۔ تو راستہ میں پڑوس کی ایک جوان لڑکی نل سے پانی لینے آ رہی تھی۔ آپ نے راستہ روک لیا۔ اور اس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ لڑکی بیچاری معصوم اور غیر شادی شدہ تھی۔ وہ واپس اپنے گھر چلی گئی۔ تو آپ تشریف لے گئے۔ جب آپ چلے گئے۔ تو یہ لڑکی میرے پاس آئی۔ اور اس نے نہایت غصہ کی حالت میں شکایت کی۔ میں کیا جواب دیتا۔ یہی کہا۔ کہ اس شخص کا دماغ خراب ہے۔ اس کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد اگلے روز تشریف لائے۔ تو میں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ کہ آپ تشریف نہ لایا کیجئے۔ آپ کا آنا رسوائی کا باعث ہے۔ چنانچہ آپ چلے گئے۔ اور چونکہ مجھے بہت سخت غصہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے بات چیت کرنے کے لئے کسی دوسری جگہ سے ٹیلی فون کیا۔ تو میں نے غصہ کی حالت میں ہی ٹیلی فون بند کر دیا۔ اور بات نہ کی۔ میرے اس رویہ کو آپ نے بھی محسوس کیا۔ اور اس کے دو روز بعد بغیر ملے لکھنؤ چلے گئے۔ اور چند ہفتہ بعد اطلاع آئی۔ کہ آپ رانچی کے پاگل خانہ میں بھیج دیئے گئے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بے حد صدمہ اور افسوس ہوا۔ میں نے رانچی کے مینٹل ہسپتال کے پتہ پر آپ کو خط لکھ کر آپ کی خیریت دریافت کی۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میرا خیال ہے۔ کہ میرا خط ان کو نہیں ملا۔ ورنہ وہ بہت ہی معصوم اور فیاض تھے۔ کسی دوست کے متعلق اپنے دل میں کدورت نہ رکھتے تھے۔ اگر خط ملتا۔ تو ضرور جواب دیتے۔

مجاز ہندوستان کے چوٹی کے ان شعرا میں سے ایک تھے جن پر آئندہ نسلیں بھی فخر کریں گی۔ ایک روز دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ تو میں والیان ریاست کے متعلق ایک مضمون لکھ رہا تھا۔

Marfat.com

آپ نے جب اس مضمون کو پڑھا۔ تو آپ نے قلم دوات لے کر ہندوستان کے حکمرانوں کے متعلق ذیل کے اشعار لکھے ؎

تاج جب مرد کے ماتھے پہ نظر آتا ہے — یک بیک خون مری آنکھوں میں اتر آتا ہے
جب نظر آتا ہے عورت کی جبیں پر مجھ کو — عجز و تسلیم کا ہر نقش ابھر آتا ہے

مرحوم مجاز کا جب انتقال ہوا۔ تو آپ عمر کے لحاظ سے ابھی جوان تھے۔ اور آپ کی موت کا باعث بھی حضرت اختر شیرانی اور حضرت منٹو کی طرح شراب کے استعمال کی کثرت تھی۔ اور میرا یقین ہے۔ کہ اگر شاعر انقلاب حضرت جوش بھی اپنے شراب کے اندازہ اور پینے کے وقت کے پابند نہ ہوتے۔ تو آج ہندوستان اور پاکستان اُردو زبان کے اس ملہم سے بھی محروم ہو گیا ہوتا۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ حضرت جوش جب شراب پیتے ہیں تو اپنے سامنے گھڑی رکھ لیتے ہیں تاکہ وقت کے پابند رہیں۔ اور زیادہ نہ پئیں۔ اور جب حضرت مجاز سے ایک دوست نے کہا۔ کہ آپ بھی گھڑی کو سامنے رکھ کر پیا کیجئے۔ تو آپ نے فوراً جواب دیا۔ آپ گھڑی نہیں شراب سے بھرے ہوئے گھڑے کو سامنے رکھ کر پینا چاہتے ہیں۔ آہ! مجاز شراب کثرت کے ساتھ پیتے تھے۔ اور شراب ان کو کھا گئی۔ جس کا اُن کے ہر دوست کو صدمہ ہے۔

روپیہ کی موجودگی میں افلاس

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد پچاس لاکھ کے قریب شرنارتھی پاکستان کے علاقہ سے ہندوستان آئے۔ اور جب یہاں پہنچے۔ تو اپنی جائیداد (یعنی زمین اور مکانات وغیرہ) کو تو اپنے ساتھ نہ لا سکے کیونکہ اس کا لانا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ مگر یہ روپیہ۔ زیورات یا دوسرا سامان جو بھی اپنے ساتھ لا سکتے تھے۔ اپنے ہمراہ لے آئے۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" کے ایک قریبی رشتہ دار اپنے وطن حافظ آباد سے آم کے اچار کا ایک ٹین بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ جو یہاں ایک مدت تک کھاتے رہے مگر یہ واقعہ ہے۔ کہ جس شرنارتھی سے پوچھا جاتا۔ کہ وہ اپنے ساتھ کیا کچھ لایا۔ تو جواب یہی ملتا۔ کہ یہ صرف اپنے تین کپڑوں (قمیض۔ پاجامہ اور صافہ) کے ساتھ اپنی جان بچا کر آیا ہے۔

تبادلۂ آبادی کے زمانہ میں دفتر "ریاست" چاوڑی بازار کے قریب محلہ چھتے والاں میں تھا۔ اس محلہ کے مسلمان جب مکانات خالی کر کے پاکستان یا دہلی کے مسلم زون میں چلے گئے۔ (کیونکہ اس محلہ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی) تو مسلمانوں کے ان خالی مکانات میں شرنارتھی داخل ہو گئے۔ اور دفتر "ریاست" کے بالکل قریب کے ایک مکان پر بھی شرنارتھیوں کے تین چار خاندان کے لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ ایڈیٹر "ریاست" کو پاکستان کے حالات سننے سے بہت دلچسپی تھی۔ اور جو شرنارتھی بھی ملتا۔ اس سے حالات پوچھتا۔ پڑوس کے اس مکان کے ایک شرنارتھی ملنے کے لئے آئے۔ اور اس سے باتیں ہوئیں۔ تو اس شرنارتھی نے بتایا۔ کہ وہ صرف تین کپڑوں کے ساتھ پاکستان سے آیا ہے۔ اور اس کے پاس سونے کے

Marfat.com

لئے بستر تک بھی نہیں ۔ اور اس کی ایک سال کی بچی ہے ۔ جو رات کو سردی میں بغیر لحاف کے ہی اپنی ماں کے ساتھ سو جاتی ہے ۔ اس کے یہ حالات سن کر ایڈیٹر ریاست نے محسوس کیا ۔ اس وقت دفتر "ریاست" میں پچیس روپے موجود تھے ۔ یہ اس شرنارتھی کو یہ کہہ کر دے دیئے گئے ۔ آپ لحاف بنا لیجئے ۔ تاکہ بچی رات کو سردی میں تکلیف نہ اٹھائے ۔ اور اس شرنارتھی نے یہ روپے شکریہ اور احسان کے جذبات کے ساتھ لے لئے ۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد اس مکان کے ہی ایک دوسرے شرنارتھی ملنے کے لئے آئے ۔ جو لاہور انارکلی میں گھڑیوں کے سوداگر تھے ۔ ان سے نصف گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں ۔ اور باتوں باتوں میں ان سے اس شرنارتھی (جس کو بچی کے لحاف کے لئے پچیس روپے دیئے گئے تھے) کے متعلق بھی پوچھا ۔ کہ اس کا کیا حال ہے ۔ تو گھڑیوں کے اس شرنارتھی سوداگر نے بتایا ۔ کہ اس کا اچھا حال ہے ۔ اور اس نے اور ایک دوسرے شرنارتھی نے پچیس پچیس ہزار روپیہ کے سرمایا سے چاندنی چوک میں کپڑے کی ایک دوکان شروع کر دی ہے ۔ اور اس کا کام چل رہا ہے ۔ یہ سننے کے بعد پوچھا گیا ۔ کہ اس نے پچیس ہزار روپیہ کہاں سے لے لیا ۔ تو اس نے بتایا ۔ کہ جب یہ لاہور سے آیا ۔ تو اس کے پاس پچاس ہزار کے قریب نقد تھا ۔ جو یہ پاکستان سے اپنے ساتھ لایا تھا ۔ اس میں سے پچیس ہزار روپیہ تو اس نے اپنے کاروبار میں لگا دیا ۔ اور پچیس ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے ۔ یعنی تین کپڑوں کے ساتھ پاکستان سے آنے اور بچی کے لئے لحاف نہ رکھنے والے شرنارتھی کے پاس پچاس ہزار روپیہ نقد موجود تھا ۔ اور زیورات یا دوسرے سامان کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا ۔ کہ کیا تھا ۔

کئی برس ہوئے ایڈیٹر ریاست کے ایک مرحوم دوست کے صاحبزادہ لاہور سے تشریف لائے ۔ آپ بیمار تھے ۔ اور آپ نے فرمایا ۔ کہ آپ علاج کے لئے دہلی آئے ہیں ۔ اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم ہیں ۔ اور آپ کے پاس علاج کے لئے ایک پیسہ نہیں ۔ ان کے یہ حالات سن کر تکلیف ہوئی ۔ اور ان کی خدمت میں علاج کے لئے ایک سو روپیہ نذر کر دیا گیا ۔ کیونکہ ان کے والد مرحوم کے ساتھ ایڈیٹر ریاست کے گہرے دوستانہ مراسم تھے ۔ پندرہ روز کے بعد آپ پھر تشریف لائے ۔ اور پھر اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا ۔ اور ان کی خدمت میں پھر ایک سو روپیہ نذر کر دیا گیا ۔ اور اس کے بعد یہ زیادہ بیمار ہو گئے ۔ اور ایڈیٹر ریاست ان کو دیکھنے کے لئے وہاں گیا جہاں کہ یہ مقیم تھے ۔ اور حالات پوچھے ۔ تو آپ نے بتایا ۔ کہ علاج کے لئے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں ۔ اور ان کی بیماری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ چنانچہ ان کی خدمت میں ایک سو روپیہ اور نذر کر دیا گیا ۔ اور دو تین ہفتہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سے ان کے دہلی آنے پر اظہار افسوس کیا گیا ۔ اور باتوں باتوں میں پوچھا گیا ۔ کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔ اور مرحوم کی بیوہ کے اخراجات کا کیا انتظام کیا گیا ۔ تو مرحوم کے بھائی نے جو جواب دیا وہ یہ تھا ۔

"مرحوم کی بیوہ کے پاس پچیس ہزار روپیہ کے قریب نقد موجود ہے ۔ جہاں تک گذران کا سوال ہے ۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہوگی ۔ مگر یتیم بچوں کا باپ کے سایہ سے محروم ہونا ۔ ایک دردناک مصیبت ہے ۔ اور اس مصیبت کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ۔"

یعنی پچیس ہزار روپیہ نقد ہوتے ہوئے بھی مرحوم کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا ۔ اور یہ دوستوں کا فرض تھا ۔ کہ

Marfat.com

وہ علاج کے لئے روپیہ دیتے۔

ایڈیٹر "ریاست" کے دہلی کے ایک مسلمان جرنلسٹ دوست بیمار ہو گئے اور جب ان کی صحت بہت ہی گر گئی۔ تو آپ نے ایڈیٹر "ریاست" کو طلب فرمایا۔ اور اپنی بیماری اور افلاس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا۔ کہ ان کے پاس علاج کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ ان کا یہ ارشاد تکلیف کا باعث تھا۔ اور ان کا اپنے حالات بتانے کا مقصد یہ بھی تھا۔ کہ ان کی امداد کی جائے۔ ایڈیٹر "ریاست" خود مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ اس نے حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر "شمع" کو ٹیلی فون پر تمام حالات بتلائے۔ حافظ صاحب دوستوں کی امداد کرنے کے اعتبار سے بہت ہی بلند اور فیاض ہیں۔ اور یہ ان کا کیریکٹر ہے۔ کہ یہ جب بھی کسی کی امداد کریں۔ تو اس کا یہ کسی سے ذکر نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے بیٹوں یا گھر والوں کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ اور امداد کرنے کے بعد اس کا اظہار کرنا یہ اخلاق کی پستی قرار دیتے ہیں۔ اور بقول ایک دوست کے یہ مسٹر رام رکھا خوشتر گرامی کی ضد ہیں۔ یعنی مسٹر خوشتر تو اگر کسی کی دعوت کریں۔ تو یہ اس دعوت کا بار بار دوسرے لوگوں سے ذکر کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ دعوت کھانے والے ان کے شامی کبابوں کی تعریف کریں۔ مگر حافظ صاحب اگر دائیں ہاتھ سے کسی کی امداد کریں۔ تو بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ حافظ صاحب سے میں نے اس اپنے بیمار جرنلسٹ دوست کے تمام حالات بتلائے۔ حافظ صاحب حالات سنتے رہے۔ اور انہوں نے نہ ہاں کی اور نہ انکار کیا۔ حافظ صاحب اگلے روز شام کو ان دوست کے گھر گئے۔ بیماری کے حالات پوچھتے رہے۔ اور خاموشی کے ساتھ ایک لفافہ دیا جس میں سو سو روپیہ کے پانچ نوٹ تھے۔ حافظ صاحب اس کے بعد ایڈیٹر "ریاست" سے ملے۔ مگر انہوں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور اس بیمار دوست نے ہی بتایا۔ کہ حافظ صاحب آئے تھے۔ اور علاج کے لئے پانچ سو روپیہ دے گئے ہیں۔

ایک ماہ بعد اس بیمار دوست کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ تو ان کے صاحبزادہ نے ٹیلی فون پر کہا کہ حالت زیادہ خراب ہے۔ اور علاج کے لئے ایک پیسہ موجود نہیں۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جواب دیا۔ کہ وہ حافظ یوسف صاحب سے مزید امداد کے لئے کہے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کہ حافظ صاحب سے نہ کہا جائے کیونکہ چند روز ہوئے۔ انہوں نے خود ہی حافظ صاحب سے کہا تھا۔ اور حافظ صاحب نے دو سو روپیہ اور بھیج دیا تھا۔ کسی دوسرے دوست سے کہا جائے۔ اس پر ان سے کہا گیا۔ کہ اور تو فی الحال کوئی دوست ایسا نظر نہیں آتا جس سے کہا جائے۔ مگر یہ کوشش کرے گا۔ کہ کوئی دوسرا دوست امداد کرے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد رات کو اس بیمار جرنلسٹ دوست کا انتقال ہو گیا۔ اور جب صبح کو کئی دوست جنازہ میں شامل ہونے کے لئے مرحوم کے گھر پہنچے۔ تو مرحوم کے صاحبزادہ نے بتایا۔ کہ کفن دفن کے لئے بھی ایک پیسہ موجود نہیں۔ چنانچہ مرحوم کے وہاں موجود دوستوں میں سے حافظ محمد یوسف۔ انور صاحب ایڈیٹر "بانو" اور دوسرے اصحاب نے تین چار سو روپیہ جمع کر کے میت کے کفن دفن کا انتظام کیا۔

مرحوم کے انتقال کے چار روز بعد انور صاحب دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ اور مرحوم کے متعلق باتیں شروع ہوئیں۔ تو انور صاحب نے بتایا کہ انتقال کے بعد اگلی صبح جب ان کی بیوی ماتم پرسی

Marfat.com

کے لئے مرحوم کے مکان پر گئیں۔ تو انھوں نے دیکھا۔ کہ مرحوم کے صاحبزادہ کی بیوی کے بازو سونے کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور کسی شے کو منگانے کے لئے جب اس خاتون نے اپنا بٹوہ کھولا۔ تو اس میں سو سو کے نوٹوں کی گڈی موجود تھی۔ اور یہ بھی بتایا۔ کہ دو برس ہوئے۔ مرحوم نے اپنے صاحبزادہ کو پندرہ ہزار روپے نقد دیئے تھے۔ جو صاحبزادہ کے پاس موجود ہیں۔ اور چونکہ انور صاحب اور مرحوم کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ صاحبزادہ نے دو ماہ پہلے بتایا تھا۔ کہ وہ پندرہ ہزار روپیہ تو آپ نے اپنے بچوں (یعنی مرحوم کے پوتوں) کے لئے الگ رکھا ہوا ہے۔ تاکہ یہ روپیہ آئندہ ان کی تعلیم وغیرہ کے کام آئے۔ انور صاحب کا یہ بیان سن کر ایڈیٹر "ریاست" کو جس قدر افسوس ہوا اور غصہ آیا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ پندرہ ہزار روپیہ نقد اور ہزارہا روپیہ کے زیورات ہوتے ہوئے بھی جو شخص اپنے باپ کے کفن و دفن کا انتظام دوستوں کی خیرات کے روپیہ سے کرتا ہے۔ اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

اس مرحوم دوست کے انتقال کے ایک ماہ بعد ان کے صاحبزادہ کے ایڈیٹر "ریاست" کو ٹیلی فون آنے شروع ہوئے۔ کہ یہ فاقہ کشی میں مبتلا ہے۔ اور کاروبار چلانے کے لئے بھی اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ یہ مشورہ (امداد) کے لئے آنا چاہتا ہے۔ پہلے تو اسے ٹالا گیا۔ مگر جب ٹیلی فون کا سلسلہ کافی تیز ہو گیا تو اس سے کہا گیا۔ کہ تشریف لائیے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آپ تشریف لائے۔ ان کو علم نہ تھا۔ کہ انور صاحب اس سے پہلے تمام حالات بتا چکے ہیں۔ آپ نے چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ کہ آپ اپنا کتابوں اور رسالہ کا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد ایڈیٹر "ریاست" نے جو دلچسپ جواب دیا وہ یہ تھا۔

"میں کیا عرض کروں۔ میری مالی حالت بھی اچھی نہیں۔ بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر رائے نے چند روز ہوئے۔ دس ہزار روپیہ اور راجپوتانہ کے لیڈر مسٹر ڈیاس نے پندرہ ہزار روپیہ بھیجا تھا۔ اس میں سے دس ہزار روپیہ کی تو ڈی۔ ایل۔ ایف والوں سے زمین خرید لی گئی۔ پانچ ہزار روپیہ اِدھر اُدھر صرف ہو گیا۔ زمین کی قیمت میں سے پانچ ہزار روپیہ ابھی ڈی۔ ایل۔ ایف والوں کو اور دینا ہے۔ وہ تقاضہ کر رہے ہیں۔ اس زمین پر کوٹھی بنانے پر پچیس ہزار روپیہ کے قریب صرف ہوگا۔ بہار کے ایک وزیر نے دس ہزار روپیہ کا وعدہ کیا تھا۔ مگر روپیہ اب تک نہیں آیا۔ یہ وزیر اپنے وعدہ کے پابند ہیں۔ پہلے بھی اپنے وعدہ کے مطابق روپیہ بھیج چکے ہیں۔ اور کبھی غلط وعدہ نہیں کرتے۔ یہ روپیہ تو ضرور بھیج دیں گے۔ دیکھئے کب بھیجتے ہیں۔ میرے یہ حالات ہیں۔ کوٹھی کے لئے پچیس ہزار روپیہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں۔ ورنہ میں ضرور آپ کی خدمت کرتا۔ میں قطعی مجبور ہوں۔"

میرے اس بیان کو سن کر ان صاحبزادہ کے چہرہ سے حسد اور حیرانی کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اور ابھی میں نے یہ کہا ہی تھا کہ میں نے اپنے بیان کی تائید میں دفتر کے دوسرے کمرہ سے دفتر ریاست کے مینیجر پنڈت سوم ناتھ کو آواز دی وہ ایسے معاملات میں خوب پارٹ ادا کرتے ہیں۔ میں نے اُن

Marfat.com

سے کہا۔ پنڈت جی کل ڈی ایل۔ ایف والوں کا پھر ٹیلی فون آیا تھا۔ کہ زمین کی قیمت کا تھایا پانچ ہزار ادا کیا جائے تاپ آج ان کے پاس جائیے۔ اور کہیئے کہ ہم دس ہزار روپیہ تو ادا کر چکے ہیں۔ تھایا پانچ ہزار روپیہ ادا کر دیں گے۔ ہم کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے۔ پنڈت سوم ناتھ ایسے مذاق میں اکثر حصہ لیا کرتے ہیں۔ آپ نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ کہ وہ آج جائیں گے۔ اور ڈی۔ ایل۔ ایف والوں سے کہیں گے۔ ہم چند روز تک پانچ ہزار روپیہ ادا کر دیں گے۔ ہمیں بار بار تنگ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد صاحب زادہ صاحب تشریف لے گئے۔ اور وہ مایوسی اور حیرانی کے باعث کچھ نہ کہہ سکے۔

اس واقعہ کے تین روز بعد رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس صاحب تشریف لائے۔ وہ بھی لطائف اور مذاق سے بہت محظوظ ہوا کرتے ہیں۔ میں نے ان کو شروع سے یعنی حافظ یوسف صاحب کے پانچ سو روپیہ لے کر مرحوم دوست کے صاجزادہ کے تشریف لانے اور بات چیت کرنے تک کے تمام واقعات سنانے کے بعد کہا کہ جس صورت میں کہ لوگ ہزار ہا روپیہ اپنے پاس رکھنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مفلس و قلاش ظاہر کرتے ہیں۔ تو میں مفلس اور قلاش ہوتے ہوئے اپنے آپ کو امیر اور دولت مند کیوں ظاہر نہ کروں۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ اور آپ نے فرمایا۔ کہ ان مرحوم دوست کی بیماری کے زمانہ میں جب ان کو بھی ٹیلی فون پر کہا گیا۔ کہ مرحوم کے پاس علاج کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ تو انہوں نے بھی بطور امداد کچھ روپیہ بھیجا تھا۔ کیونکہ مرحوم کے ساتھ ان کے بھی تعلقات تھے۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ دنیا میں لوگ کیونکر روپیہ رکھتے ہوئے بھی افلاس کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اگر میں نے مفلس ہونے اور گپ بازی کرتے ہوئے چند صوبہ جات کے وزیروں اور لیڈروں کے روپیہ بھیجنے کا مرحوم کے صاجزادہ سے غلط اقرار کر لیا۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ بعض لوگ تو اپنے آپ کو برادری میں امیر اور صاحب حیثیت کہلوانے کے لئے کم آمدنی ہوتے ہوئے بھی انکم ٹیکس دینے والوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور میں نے تو صرف ایک برخوردار پر ہی اپنی امیرانہ شان کا سکہ بٹھایا۔

مرحوم سر بابا کھیم سنگھ کے اثرات

میرے مرحوم والد کے مرحوم بابا سر کھیم سنگھ بیدی (کنور مہندر سنگھ بیدی ڈپٹی کمشنر پنجاب کے حقیقی دادا) کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ اور میری والدہ اور چچا وغیرہ بتایا کرتے تھے۔ کہ مرحوم بابا صاحب جب کبھی جہلم یا میانوالی وغیرہ جہاں کہ میرے والد بطور ڈاکٹر ملازم تھے، دورہ پر آتے۔ تو ہمارے ہاں ضرور تشریف لاتے۔ اور جب تک میرے والد حیات تھے۔ یہ مراسم جاری رہے۔ یہ واقعات میری پیدائش سے پہلے کے ہیں۔

"ریاست" جاری ہو چکا تھا۔ کہ ایک روز پنڈت رام چندر بھار دواج مالک روپی برادرس کشمیری گیٹ دہلی نے ذکر کیا۔ کہ مرحوم سر بابا کھیم سنگھ بیدی کے سب سے بڑے صاجزادہ بابا سر گور بخش سنگھ بیدی

Marfat.com

سردیوں کے زمانہ میں دو تین ماہ کے لئے گوڑگاؤں آیا کرتے ہیں۔ کیونکہ گوڑگاؤں کی آب و ہوا کو آپ پسند فرماتے ہیں۔ اور گوڑگاؤں شہر سے باہر پنڈت جی کی کوٹھی میں آپ رہائش اختیار کرتے ہیں۔ اور آج کل بھی وہاں تشریف فرما ہیں۔ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ میں بابا صاحب کا نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بابا صاحب سے ذکر کریں۔ اور اگر بابا صاحب پسند فرمائیں۔ تو میں حاضر ہوں گا۔ اور بابا صاحب کی خدمت میں عرض کر دیا جائے۔ کہ میں مرحوم ڈاکٹر نادعان سنگھ کا بیٹا ہوں۔ دوسرے یا تیسرے روز پنڈت جی نے فرمایا۔ کہ بابا صاحب سے ذکر آیا تھا۔ اور بابا صاحب کو مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ میں گوڑگاؤں آ کر ان سے ضرور ملوں۔ اس پیغام کے بعد میں اپنی کار میں پنڈت جی کے ساتھ گوڑگاؤں گیا۔ بابا صاحب تشریف فرما تھے۔ درجنوں ملازم۔ رئیسانہ فضا اور شان۔ اور شکاری کتے اور گھوڑے وغیرہ بندھے تھے۔ کیونکہ بابا صاحب جب گوڑگاؤں آتے۔ تو یہاں شکار سے بھی شغل فرماتے۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو بہت ہی تپاک کے ساتھ ملے۔ اور آپ نے اپنے خاندان اور میرے مرحوم والد صاحب کے تعلقات کے متعلق دیر تک ذکر کیا۔ اور بتایا۔ کہ ان کے والد بابا سر کھیم سنگھ اور ایڈیٹر "ریاست" کے والد کے درمیان بہت ہی اخلاص و محبت کے تعلقات تھے۔ میں بابا سر گوربخش سنگھ کی خدمت میں ایک گھنٹہ کے قریب بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اور واپس آنے کے بعد ان کی بزرگانہ شفقت اور محبت کو محسوس کر کے بار بار یہ خیال آیا۔ کہ آج سے پچاس یا سو برس پہلے کے لوگ۔ اخلاص بے ریائی اور محبت کے اعتبار سے کتنے بلند تھے۔ اور آج تلاش کرنے کے بعد بھی اس قابل قدر شعار کا کوئی انسان نہیں مل سکتا۔ کاش کہ میں بھی اس زمانہ میں پیدا ہوتا۔

میں موگا (ضلع فیروزپور) میں تھا۔ تو ہسپتال کے لئے کچھ سامان خریدنے ملتان گیا۔ کیونکہ وہاں کی فرم علی بھائی ولی جی تمام ہندوستان کے ہسپتالوں کو سامان سپلائی کرتی تھی۔ اور ان کا سامان یورپ کی بڑی سے بڑی فرموں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں ملتان سے جب واپس آ رہا تھا۔ تو گاڑی کے جس خانہ میں سوار تھا۔ اس خانہ میں منٹگمری سے ایک سکھ سوار ہوئے۔ جو شکل و شباہت سے ایک رئیس معلوم ہوتے تھے۔ میں فطرتاً کچھ خاموش سا ہوں۔ اور ٹرین میں تو کبھی بھی کسی ایسے شخص سے بات نہیں کرتا۔ جو واقف نہ ہو۔ اور اپنا وقت کتاب یا کوئی رسالہ پڑھ کر گذار لیتا ہوں۔ یہ صاحب جب اس خانہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ تو میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ منٹگمری سے دو سٹیشن جانے کے بعد ان بزرگ اور میرے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔

میں ملتان سے آ رہا ہوں۔

کہاں جاؤ گے۔

میں موگا جاؤں گا۔

کہاں کے رہنے والے ہو۔

میں حافظ آباد کا رہنے والا ہوں۔

Marfat.com

حافظ آباد کے رہنے والے ہمارے ایک گہرے دوست ڈاکٹر ہرنندمان سنگھ تھے جن کا بہت برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔

میں ان کا لڑکا ہوں۔

کیا تم کرتار سنگھ ہو۔

نہیں میں ان کا چھوٹا بھائی ہوں اور میرا نام دیوان سنگھ ہے۔

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے۔ کہ سردار صاحب بیتاب ہو کر مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے۔ بہت محبت اور اخلاص کا اظہار کیا۔ اور جب باتیں ہوئیں۔ تو معلوم ہوا۔ کہ آپ مرحوم بابا سر کھیم سنگھ کے دوسرے صاحبزادے بابا ہرا سنگھ ہیں۔ بابا ہرا سنگھ تو اس گاڑی میں لاہور جا رہے تھے۔ میں رائے ونڈ جنکشن پر اتر کر فیروزپور والی گاڑی سے موگا چلا آیا۔ اس واقعہ کو ہوئے بہت برس گذر گئے۔ مگر جب بھی یہ ایک یا دو گھنٹہ کی ملاقات یاد آتی ہے۔ تو ان بابا صاحب کے اخلاص و محبت کا خیال آتے ہی آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔

میں لاہور کے "خالصہ اخبار" کو ایڈیٹ کرتا تھا۔ تو اس زمانہ میں سر بابا کھیم سنگھ کے ایک پوتے بابا جسونت سنگھ ملا کرتے تھے۔ یہ کئی برس تک ملتے رہے۔ ان کے اخلاص اور محبت کا بھی اب تک دل پر نقش ہے۔ اور لاہور چھوڑنے کے بعد کچھ پتہ نہ چلا۔ کہ یہ بابا صاحب آج کل کہاں ہیں۔

یہ تو بابا سر کھیم سنگھ کے خاندان سے ایڈیٹر "ریاست" کے خاندانی تعلقات تھے۔ جن کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اور ان کا ذکر صرف اس خاندان کے اخلاص و محبت کے سلسلہ میں آ گیا جسے میں کبھی بھول نہ سکا۔

اب میں بابا کھیم سنگھ کے کچھ واقعات بتاتا ہوں۔ جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اور یہ واقعات مجھے ایک نائب تحصیلدار نے بتائے۔ جو وزیر آباد کے رہنے والے تھے۔ اور جن کا تعلق اس واقعہ تھا۔ کیونکہ اس زمانہ راولپنڈی میں یہ نائب تحصیلدار تھے۔ واقعہ یہ ہے۔

پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر (۱۹۱۹ء سے پہلے گورنر پنجاب کو لفٹیننٹ گورنر کہا جاتا تھا۔ اور گورنر صرف بنگال، بمبئی اور مدراس کے بڑے صوبہ جات میں تھے) دورہ پر راولپنڈی گئے۔ اور بابا سر کھیم سنگھ بیدی لفٹیننٹ گورنر سے ملنے کے لئے اپنے گاؤں کلر سے راولپنڈی آئے۔ لفٹیننٹ گورنر سے ملاقات ہوئی۔ تو باتوں باتوں میں بابا صاحب نے لفٹیننٹ گورنر سے کہا۔ کہ آپ راولپنڈی تو آئے ہی ہیں۔ آپ ہمارے ہاں بھی تشریف لے چلیئے۔ اور وہاں چائے پیجیئے۔ بابا صاحب نے لفٹیننٹ گورنر کو یہ دعوت معمولی بات چیت کرتے وقت صرف اخلاقاً دی۔ اور اس سے پہلے نہ تو بابا صاحب کو اس دعوت دینے کا خیال تھا۔ اور نہ لفٹیننٹ گورنر کا کوئی پروگرام ہی بابا صاحب کے گاؤں کلر جانے کا تھا۔ گورنر نے بابا صاحب کی اس خواہش کے جواب میں دعوت قبول کر لی۔ اور ڈپٹی کمشنر راولپنڈی سے کہا۔ کہ آپ اگلے روز شام کو کلر جائیں گے۔ لفٹیننٹ گورنر کا یہ حکم سن کر ڈپٹی کمشنر نے تحصیلدار کے نام حکم جاری کیا۔ کہ انتظام کیا جائے۔ تحصیلدار میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ آپ پریشان کہ یہ ناگہاں مصیبت نازل ہو گئی۔

Marfat.com

کیونکہ ایک روز کا تو درمیان میں وقفہ تھا۔ لیکن یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کہ سڑک وغیرہ کو درست کیا جا سکتا۔ کلر راولپنڈی سے غالباً بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس تحصیلدار نے محسوس کیا۔ کہ سڑک تو نا ہموار اور کچی ہے۔ اور اگر راستہ کا اچھا انتظام نہ ہو سکا۔ تو یہ قطعی ممکن ہے۔ کہ تحصیلدار پر لفٹیننٹ گورنر ناراض ہوں۔ اور ان کو نااہل سمجھتے ہوئے موقوف بھی کر دیں۔ تحصیلدار نے ڈپٹی کمشنر کو جواب میں لکھا۔ کہ وہ بیمار ہے۔ اور لفٹیننٹ گورنر کے اس دورہ کے انتظام کے لئے نائب تحصیلدار (جنہوں نے یہ تمام واقعہ ایڈیٹر "ریاست" کو بتایا) کو حکم دے دیا گیا ہے۔

نائب تحصیلدار یہ سن کر پریشان کہ اب ایک روز میں کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ یہ نائب تحصیلدار بابا سر کھیم سنگھ کے اثرات اور رسوخ سے واقف تھا۔ یہ ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنی بے بسی اور مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔ کہ بارہ میل کے قریب کچی سڑک ہے۔ جہاں کہ مٹی اڑ رہی ہے۔ اس سڑک کے درست ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ کہ اگر انتظام کے لئے بابا سر کھیم سنگھ صاحب کے ایک صاحبزادہ کو ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ تو سڑک درست ہو سکتی ہے۔ اور لاٹ صاحب کو سڑک پر جانے میں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ڈپٹی کمشنر نے بابا صاحب سے کہا۔ اور بابا صاحب نے اپنے چھوٹے صاحبزادہ بابا کرتار سنگھ کو نائب تحصیلدار کے ساتھ کر دیا۔ چنانچہ یہ نائب تحصیلدار بابا صاحب کے صاحبزادہ کے ساتھ شام کے وقت راولپنڈی سے دو گھوڑوں کی بگھی میں (کیونکہ اس زمانہ میں موٹریں نہ تھیں) روانہ ہوا۔ راستہ میں جو گاؤں آیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے گاؤں کے لوگوں سے کہا۔ کل دوپہر کو لفٹیننٹ گورنر صاحب کلر جا رہے ہیں۔ اور بابا سر کھیم سنگھ نے حکم دیا ہے۔ کہ رات رات میں سڑک تیار کر دی جائے۔ دیہات کے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے نائب تحصیلدار رات کو کلر پہنچ گئے۔ ادھر دیہات کے لوگوں نے جب بابا صاحب کا حکم سنا۔ تو انہوں نے مع عورتوں اور بچوں کے اپنے اپنے علاقہ کی سڑک کو ہموار کرنا شروع کیا۔ اور ہموار کرنے کے بعد اس سڑک پر دھان کا پھوس جس کو پنجاب میں پرالی کہتے ہیں۔ بچھا دیا گیا۔ نائب تحصیلدار نے رات کو کلر آرام کیا۔ اور یہ اسی بگھی میں سوار ہو کر صبح راولپنڈی واپس آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ تمام سڑک ہموار ہے۔ اور اس پر پرالی بچھا دی گئی ہے۔ تا کہ مٹی نہ اڑے۔ نائب تحصیلدار یہ دیکھنے کے بعد راولپنڈی پہنچا۔ اور اس نے سڑک کی تیاری کے متعلق ڈپٹی کمشنر سے رپورٹ کی۔ ڈپٹی کمشنر حیران۔ کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ رات رات میں بارہ میل سڑک تیار ہو جائے۔ جب کہ کوئی فوج بھی اتنی جلدی سڑک تیار نہیں کر سکتی۔ سہ پہر کو لفٹیننٹ گورنر۔ ڈپٹی کمشنر۔ اور بابا سر کھیم سنگھ بگھی میں راولپنڈی سے کلر روانہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا۔ کہ تمام سڑک تیار ہے۔ اور گورنر بھی حیران۔ کہ رات رات میں یہ سڑک کیونکر تیار کر لی گئی۔ یہ تینوں اصحاب دو گھنٹہ میں کلر پہنچ گئے۔ وہاں لفٹیننٹ گورنر نے چائے پی۔ اور چائے پر باتیں ہوئیں۔ تو لفٹیننٹ گورنر نے بابا صاحب پر سوال کیا۔ کہ اگر برطانیہ اور روس یا افغانستان کے درمیان جنگ ہو۔ اور روس یا افغانستان پشاور کے راستہ ہندوستان پر حملہ کرے۔ تو بابا صاحب اس جنگ میں انگریزوں کو کیا امداد دینگے۔ اس کے جواب میں بابا صاحب نے فرمایا۔ کہ فوج کے لئے دس ہزار ہندو اور سکھ جوان اور ایک لاکھ روپیہ نقد فوراً اور چند

Marfat.com

سفنۃ کے لبعد اس سے بہت زیادہ امداد دی جا سکے گی۔ لفٹیننٹ گورنر یہ سُن کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے۔ کہ بابا سر کھیم سنگھ کے اثرات کا نہ صرف اس زمانہ میں پنجاب کا کوئی ہندو یا سکھ لیڈر مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ بلکہ اس کے بعد بھی آج تک کسی سکھ یا ہندو لیڈر کو اتنا اقتدار نصیب نہ ہوا۔ جتنا کہ بابا سر کھیم سنگھ کو نصیب تھا۔ اور آپ کے اثرات نہ صرف پنجاب اور صوبہ سرحد بلکہ سندھ اور افغانستان کے ہندوؤں اور سکھوں تک بھی وسیع تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں تمام ہندو اور سکھ بابا صاحب کے گورو نانک صاحب کی اولاد ہونے کے باعث ان کو اپنا گورو اور روحانی پیشوا مانتے تھے۔ اور عبادت کرنے کے اعتبار سے بھی بابا سر کھیم سنگھ فی الحقیقت ایک مقدس ترین شخصیت تھے۔ اور ان کی اس عبادت گزاری کا اثر ان کے چہرہ پر بھی محسوس ہوتا تھا۔

لفٹیننٹ گورنر اس دورہ کے بعد لاہور پہنچے۔ تو آپ نے ایک حکم جاری کیا جس کے مطابق گورنمنٹ نے بابا سر کھیم سنگھ کو کئی ہزار ایکڑ زمین منٹگمری کے علاقہ میں دی۔ اور اس کے ساتھ ہی حکم دیا۔ کہ آئندہ بابا صاحب جب بھی کہیں جائیں۔ تو اپنے دورہ کی اطلاع گورنمنٹ کو دیں یعنی برٹش گورنمنٹ نے آپ کے اثرات سے خوفزدہ ہو کر آپ کی ایک طرح کی نظر بندی یا نگرانی شروع کر دی۔ اور بابا صاحب کے اثرات ہی اُن کی آزادی میں مخل ہوئے۔

مرحوم بابا سر کھیم سنگھ اور آپ کے خاندان کا اس زمانہ میں ہندوؤں اور سکھوں پر کتنا بڑا اثر تھا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس خاندان کا کوئی فرد جب کسی گاؤں۔ قصبہ یا شہر میں جاتا۔ تو وہاں کے تمام لوگ آپ کو نذر پیش کرتے۔ اور وہاں ایک میلہ سا لگ جاتا۔ جہاں کہ ان کا قیام ہوتا۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کو کپڑے کے تھانوں کی وہ تصاویر اب تک یاد ہیں۔ جو اس نے مانچسٹر اور لنکا شائر سے آئے ہوئے کپڑے پر لگی ہوئی بچپن کے زمانہ میں دیکھیں۔ اور ان تصاویر کے درمیان میں تو بابا سر کھیم سنگھ تھے۔ اور چاروں کونوں پر اُن کے چاروں صاحبزادے۔ اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ کہ اس تصویر میں ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کی عمر پندرہ سولہ برس کی معلوم ہوتی تھی یعنی شہرت اور اثرات کے لحاظ سے بابا صاحب کا نام غیر ممالک کے صنعتی کارخانے بھی استعمال کرتے تھے۔ تاکہ ان کا مال ہندوستان میں مقبول ہو۔

ضامن ہونا بھی ایک جرم ہے

مرحوم خواجہ حسن نظامی نے روپیہ قرض مانگنے والوں اور ضمانت دینے کی درخواست کرنے والوں سے تنگ آ کر ایک جگہ لکھا تھا۔ کہ ان کے والد جب انتقال کرنے والے تھے۔ تو آپ نے اپنے بیٹے (یعنی خواجہ حسن نظامی) کو نصیحت کی تھی۔ کہ تم نے نہ تو کسی کو کبھی روپیہ قرض دینا اور نہ کسی کی ضمانت دینا۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص آپ سے روپیہ قرض دینے کی درخواست کرتا یا ضمانت دینے کے لیے کہتا۔ تو آپ اپنے والد مرحوم کی وصیت یا نصیحت کا حوالہ دے کر انکار کر دیتے۔ اس زمانہ میں تو خواجہ صاحب کے دوست آپ کے اس قدم کا تمسخر اڑایا کرتے۔ اور یہ محسوس کرتے۔ کہ قرض اور ضمانت دینے سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ نسخہ دلچسپ ہے۔ کہ آپ اپنے والد مرحوم کی نصیحت پر عمل کر رہے ہیں مگر واقعہ یہ ہے۔ کہ اسلامی تعلیم کے مطابق قرض فی الحقیقت دوستانہ اور محبت کے تعلقات کو منقطع کرنے کے لئے ایک قینچی ہے

Marfat.com

اور ضمانت کا دینا دوسرے کی مصائب اور مشکلات کو اپنے ذمہ لینا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی زندگی میں غالباً کسی شخص کو کبھی قرض تو کبھی نہیں دیا۔ اور جب کسی نے قرض مانگا۔ تو روپیہ یہ کہہ کر دے دیا گیا۔ کہ واپس دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کی نذر ہے۔ اور ضمانت کے متعلق تین واقعات میری زندگی میں ایسے ہیں۔ جن کو میں کبھی بھی بھول نہیں سکا۔ اور یہ میرے لئے ہمیشہ ہی ناقابل فراموش ثابت ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں جب مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کے تمام ہندو، اور سکھ ہندوستان چلے آئے۔ تو ان میں مرحوم سردار امر سنگھ ایڈیٹر "شیر پنجاب" اور آپ کا خاندان بھی دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد یہ لوگ پریشان کیونکہ نہ رہنے کے لئے کوئی مکان اور نہ کوئی ذریعہ معاش۔ سردار امر سنگھ کے صاحبزادہ سردار جنگ بہادر سنگھ میرے پاس آئے۔ اور اپنی مشکلات بیان کیں۔ تو میں نے کہا۔ کہ جب تک آپ کے اخبار کے دفتر کا انتظام نہیں ہوتا۔ آپ اپنا دفتر "ریاست" کے دفتر کے ایک کمرہ میں رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے اخبار "شیر پنجاب" کا ڈیکلریشن اپنے نام سے عدالت میں داخل کر دیا۔ تاکہ فوراً منظور ہو جائے۔ اور غالباً دو برس تک قریب دفتر "ریاست" کے ایک کمرہ میں ہی ان کے اخبار کا دفتر رہا۔ اور یہ بطور دوستانہ ہمدردی کے بغیر کسی کرایہ کے تھا۔ اور رہائش کے لئے آپ نے غازی آباد میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ غازی آباد میں مکان لینے کے بعد آپ کشمیری دروازہ کی ایک فرنیچر کمپنی سیٹھ برادرس کے ہاں گئے۔ اور آپ نے فرنیچر کرایہ پر دینے کے لئے کہا۔ اس فرم نے کہا۔ کہ فرنیچر کرایہ پر دینے میں اس فرم کو انکار نہیں۔ مگر کوئی ضامن ہونا چاہئے۔ سردار جنگ بہادر سنگھ نے فرنیچر کی ضمانت دینے کے لئے مجھ سے کہا۔ ایک معمولی بات سمجھ کر میں نے ضمانت کے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ اور مجھے خیال بھی نہ رہا۔ کہ میں نے فرنیچر کی ضمانت دی ہوئی ہے۔ اس واقعہ کے تقریباً چار برس بعد سیٹھ برادرس کا آدمی میرے پاس پہنچا اور اس نے کہا۔ کہ اب تک نہ تو فرنیچر واپس کیا گیا۔ اور نہ ایک پیسہ کرایا ادا کیا گیا۔ گیارہ سو روپیہ سردار جنگ بہادر سنگھ کے ذمہ ہے۔ اور چونکہ آپ ضامن ہیں۔ یا تو روپیہ ادا کریں۔ ورنہ عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ فرم سردار جنگ بہادر سنگھ سے تقاضا کرتے کرتے تنگ آ چکی ہے۔ اور اب سوائے مقدمہ کرنے کے دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ سردار جنگ بہادر سنگھ پر میرے بار بار کہنے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ سیٹھ برادرس نے گیارہ سو روپیہ کا دیوانی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ اور میرے نام بھی سمن آ گئے۔ کیونکہ میں ضامن تھا۔ تاکہ اگر یہ روپیہ سردار جنگ بہادر سنگھ سے وصول نہ ہو۔ تو یہ فرم مجھ سے روپیہ وصول کرے۔ اس مقدمہ کے عدالت میں جانے کے بعد جب میں شہادت کے لئے عدالت میں گیا۔ اور مقدمہ کے پیش ہونے سے پہلے وہاں کے ریسٹورنٹ میں چائے پی رہا تھا۔ تو سردار جنگ بہادر سنگھ کے ایک نمائندہ تشریف لائے۔ اور آپ نے فرمایا۔ کہ

"اگر سردار جنگ بہادر سنگھ یہ روپیہ ادا نہ کر سکے۔ تو یہ روپیہ آپ کو دینا ہوگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ اس دستاویز اور اپنے دستخطوں سے انکار کر دیں۔ جو ضمانت کے متعلق ہیں۔ تاکہ آپ سے بھی ڈگری کا روپیہ وصول نہ ہو سکے۔"

میں نے جب یہ سنا۔ تو غصہ کے باعث میں کچھ بے قابو سا ہو گیا۔ اور میں نے سخت ترین لہجہ میں کہا۔

"تم لوگ نہ صرف خود بے ایمان اور بد دیانت ہو۔ جو واجب روپیہ ادا نہیں کرتے اور عدالت میں

Marfat.com

جھوٹے حلفیہ بیان دے کر اپنے آپ کو رسوا اور ذلیل کر رہے ہو۔ بلکہ دوسروں کو بھی بے ایمان اور بد دیانت بننے کی ترغیب دیتے ہو۔ تم لوگوں کو شرم محسوس ہونی چاہیئے۔ اگر یہ روپیہ میں نے خود دینا ہوتا۔ تو میں پھر بھی اس روپیہ سے انکار کرنا کمینہ پن سمجھتا۔ اور میں نے اپنی زندگی میں کسی بھی عدالت میں کبھی انکار نہیں کیا۔ میں تمہارے لئے جھوٹ کیونکر بول سکتا ہوں۔ اور جس صورت میں کہ میں فی الحقیقت ضامن ہوں۔ میں ضمانت کی دستاویز اور اپنے دستخطوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ چاہے میرے خلاف ڈگری ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اور مجھے یہ روپیہ ادا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

میرے یہ الفاظ سن کر سردار جنگ بہادر سنگھ کے یہ نمائندہ حیران اور مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پیشی ہوئی۔ میں نے دستاویز کے درست ہونے اور اپنے دستخطوں کا اقرار کر لیا۔ جرح میں سردار جنگ بہادر سنگھ کے وکیل نے اپنی وکالت کی نمائش کرتے ہوئے مجھ سے ایک سوال کیا۔ کہ

"کیا تم سردار جنگ بہادر سنگھ کے خلاف ہو"۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میں مخالفت کے باعث شہادت دے رہا ہوں۔ میں نے اس سوال کا جواب دیا۔ کہ

"میں سردار بہادر جنگ سنگھ کے خلاف نہیں ہوں۔ مگر اس شخص کے چار سو بیس ہونے کے باعث میرے دل میں اس کے لئے نفرت و حقارت کے جذبات ضرور موجود ہیں"۔ میرا یہ جواب عدالت میں بہت دلچسپی کا باعث ہوا۔ چنانچہ میرے بیان کے بعد اس رقم کی مدعی کے حق میں تو ڈگری ہو گئی۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ میرے اس بیان کے چند روز بعد جج نے ایک ٹی پارٹی میں قریب بیٹھے ایک وکیل دوست کے پاس میرے بیان کے لطیفہ کا ذکر کیا۔ اور کہا۔ کہ آپ نے اپنی پچھلی عدالتی زندگی میں جرح کے دوران سوال کا ایسا دلچسپ جواب کبھی نہیں سنا۔ کہ مدعا علیہ کے خلاف عداوت یا مخالفت کے جذبات نہیں۔ بلکہ نفرت اور حقارت کے جذبات ہیں۔ سردار جنگ بہادر سنگھ نے اس ڈگری کی اپیل اعلیٰ عدالت میں کی۔ اور اس اپیل کا وہی حشر ہوا۔ جو ماتحت عدالت میں ہوا تھا۔ اور اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں۔ کہ سردار جنگ بہادر سنگھ نے یہ روپیہ ادا کیا یا نہیں اور کیا تو کب۔ کیونکہ میرے پاس وصول ہونے کے لئے ڈگری ابھی تک نہیں پہنچی۔

تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں ایک صاحب سیالکوٹ سے دہلی تشریف لے آئے۔ جن کی شادی حافظ آباد میں ہوئی تھی۔ اور ان کے خسر میرے واقف یا دوست تھے۔ یہ صاحب دہلی پہنچنے کے بعد کبھی کبھی دفتر "ریاست" میں بھی تشریف لایا کرتے۔ اور کاروبار کے لحاظ سے یہ لاجپت رائے مارکیٹ میں بزازی کی دوکان کرتے تھے۔ میں ایک روز کسی کام کے لئے ڈسٹرکٹ کورٹ گیا تھا۔ اور وہاں یہ حضرت ملے اور آپ نے فرمایا۔ ان پر ایک پرونوٹ کے سلسلہ میں کسی نے ڈیڑھ ہزار روپیہ کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اور عدالت میں ڈیڑھ ہزار روپیہ کی ضمانت دینے کی ضرورت ہے۔ اور میں یہ ضمانت دے

Marfat.com

دول۔ مَیں نے ضمانت دینا معمولی بات سمجھا۔ اور ان کے ساتھ دیوانی عدالت میں چلا گیا۔ اور مَیں نے ضمانت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ تو فریق مخالف نے میرے ضمانت دینے پر اس لئے اعتراض کیا۔ کہ میری کوئی غیر منقولہ جائیداد دہلی میں نہیں۔ جج صاحب اخبار "ریاست" سے واقف تھے۔ آپ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کہ "کیا یہ واقعہ ہے۔ کہ آپ کی کوئی منقولہ جائیداد دہلی میں نہیں" مَیں نے جواب دیا۔ کہ "نہ صرف دہلی میں کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں۔ بلکہ کسی دوسری جگہ بھی نہیں"۔ جج صاحب نے یہ سوال صرف مزہ لینے کے لئے ہی کیا تھا۔ کیونکہ گو مَیں کبھی ان سے ملا نہ تھا۔ مگر وہ مجھے جانتے تھے۔ جج صاحب نے فریق مخالف کے وکیل سے کہا۔ کہ "آپ کے خیال میں سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" سے ضمانت کا پندرہ سو روپیہ وصول نہ ہو سکے گا"۔ فریق مخالف کے وکیل صاحب کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور جج نے ضمانت کو منظور کرتے ہوئے ضمانت نامہ پر دستخط کر دیئے۔

اس واقعہ کو گذرے دو برس کے قریب ہو گئے۔ اور مجھے خیال بھی نہ رہا تھا۔ کہ مَیں نے ضمانت دی ہوئی ہے۔ ایک روز صبح کا وقت تھا۔ اور مَیں ایڈیٹوریل لکھ رہا تھا۔ کہ دیوانی عدالت کے ایک پیادہ تشریف لائے۔ اور ان کے پاس دو ہزار روپیہ کی ڈگری کا سمن تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ ڈگری کا روپیہ عدالت میں فلاں تاریخ سے پہلے داخل کرو۔ مَیں نے جب یہ سمن دیکھا۔ تو میں حیران کہ میرے خلاف تو کوئی دیوانی مقدمہ نہ تھا۔ یہ ڈگری کہاں سے آ گئی۔ مَیں نے سمن غور سے پڑھا۔ اور مقدمہ کا عنوان دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ ڈگری اس ضمانت کے متعلق ہے۔ جو مَیں نے پندرہ سو روپیہ کی دی۔ اور باقی کا خرچہ ملا کر کل رقم دو ہزار روپیہ کے قریب ہے۔

اس روز دوپہر کے وقت مَیں نے اس شخص کی دکان پر لاجپت رائے آدمی بھیجا جس کی ضمانت دی ہوئی تھی۔ وہاں سے پتہ چلا۔ کہ یہ حضرت عرصہ ہوا دکان چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے آدمی کو پرانے قلعے میں بھیجا۔ جہاں کہ اس شخص کی رہائش تھی۔ میرا آدمی اس شخص کی بیوی سے ملا تو اس خاتون نے جواب دیا۔ کہ ان کے شوہر چھ ماہ ہوئے دہلی سے کسی جگہ باہر چلے گئے ہیں اور لاپتہ ہیں۔ اور ان کے پاس ضروری اخراجات کے لئے بھی ایک پیسہ نہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ اس جواب کو سن کر میرا آدمی واپس آ گیا۔ اور اس نے بتایا۔ کہ اس خاتون کے چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کو اپنے شوہر کا علم تو ہے۔ مگر یہ اپنے شوہر کی ہدایت کے مطابق ہر قر مخواہ سے یہی کہتی ہے۔ کہ اس کا شوہر لاپتہ ہے۔ تاکہ اس کا پتہ نہ کیا جائے۔ مَیں نے اگلے روز پھر اپنے آدمی کو لاجپت رائے مارکیٹ بھیجا۔ کہ وہ پڑوس کی دوکانوں سے پتہ لگائے۔ کہ یہ حضرت کہاں ہیں۔ چنانچہ بہت کوشش کے بعد پتہ چلا کہ یہ شخص ضلع انبالہ کے ایک مقام جمنا نگر میں ہے۔ اور وہاں ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر مَیں نے اس شخص کو اس بتائے ہوئے پتہ پر ایک خط لکھا۔ کہ آپ کے فائدہ کی بات ہے۔ کہ آپ فوراً اور پہلی گاڑی میں دہلی پہنچے۔ ورنہ آپ کا بہت نقصان ہو گا۔ مَیں نے فیصلہ کیا۔ کہ اگر اس شخص کا کوئی جواب نہ آیا۔ تو پھر جمنا نگر آدمی بھیج کر اسے یہاں بلواؤں گا۔ مگر اس خط کو پڑھتے ہی وہ چونکہ خط میں اس کے فائدہ اور نقصان کا

Marfat.com

ذکر تھا، یہ شخص اگلے روز دہلی چلا آیا اور دفتر "ریاست" میں پہنچا۔ اور اس کے اور میرے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

آپ آج کل کہاں رہتے ہیں؟

میں جمنا نگر رہتا ہوں۔ اور وہاں کسی روزگار کی تلاش میں ہوں۔

ابھی حال میں عدالت کا ایک بیلف میرے خلاف ڈگری لایا تھا۔ یہ ڈگری دو ہزار روپیہ کی تھی۔ اور ڈگری ضمانت کے روپیہ کے متعلق تھی؟

میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس تو ایک پیسہ نہیں۔

گویا آپ اس ڈگری کے متعلق اخلاقی اعتبار سے اپنا کوئی فرض نہیں سمجھتے۔

میرے پاس جب کہ ایک پیسہ موجود نہیں۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

گویا کہ مجھے یہ روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔

اور دوسری کیا صورت ہو سکتی ہے۔

گویا کہ آپ کا اس ڈگری کو ادا کرنا کوئی فرض ہی نہیں؟

میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

اب اس مقدمہ کی آپ نے اپیل کی ہے۔

ہاں اپیل کی ہے۔ اور یہ اپیل سیشن جج کی کورٹ میں ہے۔ اور اس کے لئے فلاں تاریخ مقرر ہے۔

تو آپ اس ڈگری کو ادا نہ کریں گے۔ اور اس ڈگری کا روپیہ مجھے لازمی طور پر ادا کرنا پڑے گا؟

ایسی ہی صورت ہے۔ میں تو مجبور ہوں۔

بہت اچھا۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہا اور یہ حضرت چلے گئے۔

میں نے وکیلوں سے مشورہ کیا۔ کہ کوئی صورت ہے۔ کہ اس مقدمہ میں دی گئی میری ضمانت منسوخ ہو۔ تو وکیلوں نے کہا کہ یہ غیر ممکن ہے۔ مقدمہ کے شروع میں جب تک کہ ماتحت عدالت سے فیصلہ نہ ہوا تھا میں اپنی ضمانت منسوخ کرا سکتا تھا۔ اب تو یہ غیر ممکن ہے۔ اس ڈگری کا روپیہ تو دینا ہی ہوگا۔

اتفاق دیکھئے۔ کہ یہ اپیل جب سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوئی۔ تو ماتحت عدالت کے فیصلہ میں کچھ قانونی نقائص تھے۔ اور عدالت کی کارروائی میں کچھ بے ضابطگیاں تھیں۔ سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں مقدمہ کی ان خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ کہ یہ مقدمہ نئے سرے سے شروع ہو۔ اور جو قانونی خامیاں رہ گئی ہیں۔ وہ دور کی جائیں۔ چنانچہ یہ مقدمہ پھر نئے سرے سے چلانے کے لئے ماتحت عدالت میں آگیا اور مجھے جب اس کا علم ہوا۔ تو میں نے فوراً وکیل کی معرفت اپنی ضمانت کے منسوخ کرنے کی درخواست دے دی۔ اور عدالت نے مدعا علیہ کو حکم دیا۔ کہ وہ نئی ضمانت داخل کرے۔ اس حکم کے مطابق میری دی گئی ضمانت تو منسوخ ہو گئی۔ اور مجھے معلوم نہیں۔ کہ دوسری ضمانت کس نے دی۔ اور اس مقدمہ کا کیا حشر ہوا۔

تبادلہ آبادی کے بعد جب مغربی پنجاب سے ہندو سکھ ہندوستان آئے۔ تو ان میں ایک صاحب لالہ مرداری لال بھی تھے۔ جو لائل پور میں ایک پریس یعنی چھاپہ خانہ کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ صاحب دہلی آئے۔ تو چونکہ لائل پور

Marfat.com

میں ایک پریس کے مالک تھے۔ انہوں نے کوشش کرکے اپنے نام الامان پریس الاٹ کرالیا کیونکہ اس پریس کی مالکہ (مولانا مظہرالدین ایڈیٹر اخبار "الامان" کی بیوہ) پاکستان چلی گئی تھیں۔ اس الامان پریس کے لالہ سرداری لال کے نام الاٹ کرنے کا جب فیصلہ ہوا۔ تو لالہ سرداری لال میرے پاس آئے۔ اور کہا کہ میں اس پریس کے متعلق سات ہزار روپیہ کی ضمانت دے دوں۔ کیونکہ کسٹوڈین تب اس پریس کا قبضہ دے سکتا ہے۔ اگر کوئی معتبر ضامن ہو۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ میری کوئی جائیداد غیر منقولہ دہلی میں نہیں۔ اس لئے میری ضمانت منظور نہ ہو گی۔ مگر آپ نے فرمایا۔ کہ ضمانت کے منظور ہونے کا انتظام وہ خود کرلیں گے۔ اسے اخلاقی جرأت کی کمی سمجھئے یا مروّت کے جذبات کا غلط استعمال۔ میں ضمانت دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اور میں نے اس پریس کے متعلق سات ہزار روپیہ کی ضمانت دے دی۔ اور کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اس ضمانت کے دو برس بعد میں نے لالہ سرداری لال سے درخواست کی۔ کہ اب کسی دوسرے سے ضمانت دلوا دیجئے۔ اور اس ضمانت سے میرا چھٹکارا کرائیے۔ مگر لالہ سرداری لال نے کوئی پروا نہ کی۔ اور پہلے تو ضمانت دلوانے کے لئے لالہ سرداری لال میرے مکان کے چکر کاٹتے تھے۔ اب کئی برس سے میرے آدمی لالہ سرداری لال کے مکان کے چکر کاٹ رہے تھے۔ چنانچہ آخر تنگ آکر میں نے کسٹوڈین کو درخواست دی۔ کہ میری ضمانت منسوخ کر دی جائے۔ ورنہ میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ میری اس درخواست پر کسٹوڈین نے ایک انسپکٹر کو تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔ اور اس کسٹوڈین نے تحقیقات کے بعد رپورٹ کی۔ کہ پریس میں اٹھارہ سو روپیہ کی پلیٹیں وغیرہ موجود نہیں۔ چنانچہ کسٹوڈین کا میرے پاس حکم پہنچا۔ کہ اٹھارہ سو روپیہ ادا کرو۔ تو ضمانت منسوخ کی جاسکتی ہے۔ میں نے پھر درخواست کی کہ آپ یہ اٹھارہ سو روپیہ پریس کے الاٹی سے وصول کرنے کی کوشش کیجئے۔ اور اگر یہ روپیہ الاٹی سے وصول نہ ہو۔ تو پھر مجھے اس روپیہ کی ادائیگی کا ذمہ دار سمجھا جائے۔ مگر میری اس درخواست کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو مجھ جیسے دوسرے ہزارہا ضامنوں اور مالکانِ جائیداد کا ہو رہا ہے۔ یعنی کسٹوڈین کا کوئی جواب ہی نہیں آتا۔ اور میں مسلسل سات ہزار روپیہ کا ضامن ہوں۔ اور نہیں کہا جا سکتا۔ کہ مسٹر سرداری لال مجھ پر رحم فرمائیں گے یا نہیں۔ اور رحم فرمائیں گے۔ تو کب اور میری ضمانت کا کیا حشر ہوگا۔ کیونکہ انسان جب اخلاقی وعدوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھے۔ تو پھر وہ "برہم گیانی" ہو جاتا ہے۔ جس پر عزت یا رسوائی کا کچھ بھی اثر نہیں ہوسکتا۔

ضمانت کے اس تجربہ کے بعد میری رائے یہ ہے۔ کہ کسی شخص کو بھی ضامن نہ بننا چاہیے۔ اور اگر وہ کسی کی امداد کرنا ہی چاہے۔ تو ضمانت یا قرض دینے کے مقابلہ پر بہتر یہ ہے۔ کہ روپیہ کے واپس لینے کا خیال چھوڑ کر امداد کر دی جائے۔ تاکہ نہ تو ضمانت کے منسوخ کرانے کی کوفت ہو۔ اور نہ قرض واپس لینے کا خیال ذہن کے لئے اذیت کا باعث ہو۔

گھر کا جوگی جوگڑہ

پنجابی زبان میں ایک کہاوت ہے "گھر کا جوگی جوگڑہ باہر کا جوگی سِدھ" اس کہاوت کے معنی ہیں۔ کہ اگر کسی ولی اللہ کی تمام دنیا میں بھی شہرت ہو۔ اور تمام دنیا اس کے سامنے سر جھکاتی ہو۔ اس کے گھر یا وطن کے

Marfat.com

لوگ پھر بھی اس کو ولی اللہ تسلیم نہیں کرتے۔ اور یہ اس کی مخالفت ہی کرتے رہتے ہیں۔ اور دوکار بنے والا سادھو چاہے دھوکا باز یا گداگر ہی ہو۔ لوگ اس کو درویش کامل سمجھتے ہیں۔ یعنی کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی ان کے عزیزوں رشتہ داروں اور ہموطنوں کی نظروں میں بلند اور قابل احترام قرار نہیں دی جا سکتی۔

میں فیروزپور جیل میں تھا۔ تو وہاں دہلی کے رہنے والے یا دہلی میں نظر بند کئے گئے ساٹھ کے قریب سیاسی قیدی تھے۔ جو ستیہ گرہ کی تحریک کے سلسلہ میں وہاں رکھے گئے تھے۔ اور ان لوگوں میں ایک صاحب رہتک کے رہنے والے پروفیسر گربرکشور (میرا خیال ہے کہ یہی یا اس سے ملتا جلتا نام تھا) بھی تھے۔ جو پندرہ برس سے مہاتما گاندھی کے سابرمتی آشرم میں طلبا کو پڑھایا کرتے۔ اور جن کو دس بارہ برس تک مہاتما جی کے ساتھ دن رات رہنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے جب یہ پتہ چلا۔ کہ پروفیسر صاحب اتنا طویل عرصہ تک مہاتما جی کے ساتھ رہے ہیں۔ تو موقع مل گیا۔ اور میں نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی۔ وہ جیل کی میری کوٹھڑی میں آجائیں۔ تاکہ ہم دونوں وقت اچھی طرح سے گذار سکیں۔ پروفیسر صاحب مجھے اور "ریاست" کو جانتے تھے۔ انہوں نے میری اس درخواست کو قبول فرما لیا۔ اور یہ اپنا بستر اور سامان میری کوٹھڑی میں لے آئے۔ اور ہم دونوں نے اکٹھا رہنا شروع کیا اور مجھے موقع مل گیا۔ کہ میں مہاتما جی کے متعلق اپنی معلومات وسیع کر سکوں۔

مہاتما گاندھی نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ اگر کوئی بھنگی صفائی پسند ہے۔ تو وہ بھنگی ہوتے ہوئے بھی برہمن کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اور اگر کوئی برہمن صفائی پسند نہیں۔ تو وہ برہمن ہوتے ہوئے بھی بھنگی ہے مہاتما جی کی اس آئیڈیالوجی کا تمام بھگتوں پر اثر ہے۔ اور میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا۔ کہ وہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کا عملی طور پر معتقد ہو۔ اور وہ صفائی پسند نہ ہو۔ چنانچہ یہ پروفیسر صاحب بھی بے حد صفائی پسند تھے میں تو صبح آنکھ کھلتے ہی ضروری حاجت سے فارغ ہو کر ورزش کے لئے جیل کے اندر جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ چلنا شروع کر دیتا۔ اور ایک گھنٹہ تک چلتا رہتا۔ تاکہ تین میل کی مسافت طے ہو جائے۔ اور اس عرصہ میں پروفیسر صاحب تمام کمرہ میں جھاڑو دیتے۔ تمام کپڑوں اور سامان کو جھاڑتے۔ اور میرا اور اپنا بستر درست کر کے بچھا دیتے۔ اور میں جب واپس آتا۔ تو کمرہ۔ سامان اور برتن وغیرہ شیشہ کی طرح صاف ملتے پروفیسر صاحب کچھ تو عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ اس کے علاوہ بے حد نیک دل اور بلند۔ میں کچھ شرم سی محسوس کرتا۔ کہ یہ میرے کپڑوں اور سامان وغیرہ کی بھی صفائی کر دیتے ہیں۔ میں آتے ہی ہر روز ان سے کہتا کہ "پروفیسر صاحب آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں آکر صفائی کرتا۔" اور یہ میرے اس کہنے پر مسکرا دیتے جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میں تو ہر روز یہ کہتا ہی چلا جاؤں کہ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ اور یہ پروفیسر صاحب اپنی فطرت کے مطابق صفائی کر دیا کریں گے۔ پیدل چلنے کے بعد میں کوٹھڑی میں پہنچ کر ورزش کرتا۔ جسے "انڈور ایکسر سائز" کہنا چاہئے اور یہ ورزش ایک گھنٹہ کے قریب جاری رہتی۔ تاکہ میرا وزن کم ہو جائے۔ (یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ میں جب جیل میں گیا۔ تو میرا وزن تین من دس سیر تھا۔ اور جب جیل سے رہا ہوا۔ تو میرا وزن دو من دس سیر تھا۔ یعنی میں نے ایک برس اور تین ماہ جیل میں رہ کر قوم اور ملک کو اسی پونڈ یا ایک من چربی نذر کی۔ اور میں ان لوگوں کے مقابلہ پر زیادہ فخر کر سکتا ہوں جنہوں نے قوم اور ملک کے لئے اپنا خون دیا) ورزش کرنے کے بعد

Marfat.com

مہاتما گاندھی کے متعلق باتیں شروع ہو جاتیں جب بھی وقت ملتا۔ مہاتما گاندھی کے پچھلے حالات سنتا۔ اور رات کو بھی کھانا کھانے کے بعد مہاتما گاندھی کے حالات کرید کرید کر پوچھتا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا۔ کہ میں مہاتماجی کے متعلق زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کروں۔ کئی روز تک باتیں ہوتی رہیں۔ اور میں نے مہاتماجی کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لیں۔ تو میں نے ایک روز پروفیسر صاحب سے سوال کیا۔ کہ

"کیا مہاتماجی کی بیوی کستورا بائی جی مہاتماجی کو نالائق سمجھتی تھیں؟ یا وہ بھی مہاتماجی کی بلندی کی قائل تھیں"۔

میرا یہ سوال سن کر پروفیسر صاحب کچھ حیران سے ہو گئے۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ "اس کا کیا مطلب؟" جس کے معنی یہ تھے۔ کہ میں ایک پھر سوال کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے سوال کو سنجیدگی کے ساتھ پھر دہرایا۔ اور کہا۔ کہ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا کے ہر پیغمبر اوتار یا ولی اللہ کے گھر والے اس کی بلندی کے قائل نہیں ہوتے۔ اور اسے نالائق ہی سمجھتے ہیں۔ کستورا بائی جی کا مہاتماجی کے متعلق کیا خیال تھا۔ وہ ان کو دوسرے لوگوں کی طرح ہی ایک مہاتما سمجھتی تھیں۔ یا ان کو نالائق شوہر تصور کرتی تھیں۔ کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے کسی بھی لیڈر کی غیر تعلیم یافتہ بیوی اپنے شوہر پر خوش نہیں۔ اور اسے وہ رہ رہ کر خیال آتا ہے۔ کہ اس لیڈر کے ساتھ شادی ہونے کی جگہ یہ کسی کلرک سے بیاہی جاتیں۔ تو اچھا تھا۔ کہ کلرک شوہر کو اس سے باتیں کرنے بازار سے سودا سلف لانے بچوں کو اٹھائے پھرنے اور اس کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت ہوتا۔ اور اب یہ لیڈر شوہر اول تو گھر میں قدم ہی نہیں رکھتا۔ اور گھر آئے بھی۔ تو یہ پبلک کے کاموں یا اخبارات پڑھنے میں مصروف رہتا ہے۔ میرا سوال تفصیل کے ساتھ سننے کے بعد پروفیسر صاحب سوچنے لگ گئے۔ اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد آپ نے فرمایا:۔

"ہاں یہ سچ ہے۔ کہ آشرم میں جب کوئی نیا شخص آتا۔ تو کستورا بائی جی کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اور جب راشن کی کمی ہوتی۔ تو اپنے شوہر کو کوسنے لگ جاتیں۔ کہ آشرم میں اتنے لوگوں کو کیوں پال رکھا ہے۔ جس کے جواب میں مہاتماجی مسکرا دیتے"۔

پروفیسر صاحب کا یہ جواب سن کر میں نے کہا۔ کہ میرا سوال اطمینان بخش صورت میں حل ہو گیا ہے۔ اور دوسرے پیغمبروں۔ اولیاء اللہ اور بڑے لیڈروں کی بیویوں کی طرح کستورا بائی بھی اپنے شوہر سے زیادہ مطمئن نہیں تھیں۔ اور ان کو بھی اپنے نظریہ کے مطابق یقیناً کبھی کبھی یہ خیال آتا ہوگا۔ کہ اس مہاتما شوہر کی جگہ اگر وہ کسی کلرک سے بیاہی جاتیں۔ تو خوش رہتیں۔ کیونکہ کلرک شوہر کو صرف اپنی بیوی کی فکر ہوتی۔ اس کو مہاتماجی کی طرح تمام دنیا کی فکر تو نہ ہوتی۔

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس پاہوہ بہت ہی بلند لوگوں میں سے ہیں۔ اور آپ نے اپنی زندگی میں لاکھوں انسانوں کی آنکھوں کے آپریشن کئے۔ اور جن کے باعث موگا (ضلع فیروزپور) کے قصبہ کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ کیونکہ آپ سالہا سال تک وہاں کے انچارج تھے۔ اور آپ سے آپریشن سیکھنے کے لئے یورپ اور امریکہ سے بھی آنکھوں کا آپریشن کرنے والے ڈاکٹر آیا کرتے۔ اور اس بات کو چھوڑ کر کہ آپ دنیا کے

Marfat.com

بہترین سپیشلسٹ ہیں۔ ذاتی طور سے بھی آپ کو فرشتہ کہا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے روپیہ سے کئی سکول، کالج اور ہسپتال قائم کئے۔ اور آپ سال ہا سال تک پانچ ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ان انسٹی ٹیوشنز کو بطور امداد دیتے رہے۔ میں ایک زمانہ میں جب بیکار تھا۔ تو چند ماہ اپنے وطن حافظ آباد رہا۔ ڈاکٹر صاحب بھی حافظ آباد کے رہنے والے تھے۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب موگا سے حافظ آباد آئے۔ اور آنکھوں کے مریضوں کو دیکھنے کے لئے اپنے گھر سے روانہ ہوئے۔ تو دو سو چالیس پچاس لوگوں کے ساتھ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو آگے آگے تیزی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اور میں اور دوسرے لوگ ان سے پیچھے تھے۔ اور جب آپ بازار میں سے گزر رہے تھے۔ تو دو دکان پر بیٹھے ہوئے دو بوڑھے اشخاص نے دیکھا۔ کہ ڈاکٹر صاحب اس مجمع کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ان دو میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ کہ یہ کون شخص چلا جا رہا ہے۔ جس کے ساتھ اتنے لوگ ہیں۔ تو دوسرے نے جواب دیا۔ کہ "یہ نانک چند پاہوہ کا لڑکا متھرا داس پاہوہ جا رہا ہے۔ جو موگا میں ڈاکٹر ہے۔ اور اس کے ساتھ جانے والے بیماروں کے رشتہ دار ہوں گے۔ جو اپنے عزیزوں کی آنکھیں دکھانا چاہتے ہیں۔"

رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس کے والد مرحوم لالہ نانک چند ڈاکٹر تھے۔ اور اپنے زمانہ کے اچھے مشہور ڈاکٹروں میں سے تھے۔ اور ڈاکٹر متھرا داس خود رائے بہادر بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ آئی سپیشلسٹ اور ایک بلند ترین شخصیت ہیں۔ مگر اپنے ہموطنوں کی نظروں میں ان کے والد ڈاکٹر نانک چند پاہوہ تو صرف نانک چند ہی رہے۔ اور رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس صرف متھرا داس ہیں۔ "یعنی گھر کا جوگی جوگڑہ باہر کا جوگی سدھ" کے مصداق۔ ڈاکٹر متھرا داس کو چاہے دنیا ایک بلند ترین مہاتما ہی سمجھتی ہے۔ مگر یہ اپنے عزیز و اقارب اور ہموطنوں کے خیال میں تو متھرا داس ہی ہیں۔ اور ہمیشہ متھرا داس ہی رہیں گے۔ کیونکہ آج تک کوئی بھی پیغمبر، اوتار، ولی اللہ یا بڑا شخص اپنے عزیزوں اور ہموطنوں کی نظروں میں بلند قرار نہ دیا جا سکا۔ اور نہ دیا جائے گا۔ رسول اللہ، حضرت مسیح اور گورو نانک کے ساتھ بھی ان کے ہموطنوں نے اچھا سلوک نہ کیا۔ کیونکہ انسان کا ہر ہم وطن اور رشتہ دار فطرتاً حاسد ہوتے ہوئے اپنے دل میں بغض اور عداوت کے جذبات رکھتا ہے۔ اور اس کا ایک ہم وطن اور رشتہ دار کو دیکھ کر خوش ہونا ممکن نہیں۔

سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ آف نابھہ

میں اپنی زندگی میں جن چند بلند ترین لوگوں سے ملا۔ ان میں نابھہ کے سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ ایک اہم شخصیت تھے۔ بھائی صاحب ریاست نابھہ کے رہنے والے تھے۔ عمر غالباً پچھتر برس کے قریب سفید داڑھی، چہرہ پر سرخی اور سپیدی جیسے نور برستا ہو۔ بہت عالم۔ کئی کتابوں کے مصنف بہت بڑے سیاستدان اور آپ نہایت پاکیزہ ہندی میں بات چیت کرتے۔

Marfat.com

بھائی صاحب کاہن سنگھ مرحوم مہاراجہ نابھہ (موجودہ مہاراجہ نابھہ کے والد) کے ٹیوٹر تھے۔ جب کہ مہاراجہ ابھی ولی عہد تھے۔ اور مہاراجہ کے گدی پر بیٹھنے کے بعد آپ ریاست نابھہ میں فارن منسٹر مقرر ہوئے۔ آپ وہاں فارن منسٹر تھے۔ کہ ریاست نابھہ اور پٹیالہ کے درمیان تعلقات کچھ کشیدہ ہو گئے اور ان کشیدہ تعلقات کے زمانہ میں آپ ایک روز اتوار کے دن اپنے صاحبزادہ سے ملنے کے لئے پٹیالہ چلے گئے۔ جہاں کہ صاحبزادہ کالج میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ گو آپ کو مہاراجہ کے ٹیوٹر ہونے کا فخر تھا۔ مگر مہاراجہ آخر مہاراجہ تھے۔ آپ کے پٹیالہ جانے کے بعد کسی مخبر نے مہاراجہ کو اطلاع دی۔ کہ نابھہ اور پٹیالہ کے تعلقات کشیدہ ہونے کی صورت میں بھی بھائی کاہن سنگھ پٹیالہ چلے گئے ہیں۔ آپ واپس آئے اور اگلے روز مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو مہاراجہ اور بھائی کاہن سنگھ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مہاراجہ: آپ کل کہاں تھے؟

بھائی صاحب: میں اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے پٹیالہ گیا تھا۔

مہاراجہ: آپ کس کی اجازت سے گئے۔

بھائی صاحب: میں قیدی تو نہیں ہوں۔ کہ پوچھ کر جاتا۔ کل اتوار کے باعث دفاتر بند تھے۔ اس لئے چلا گیا۔

مہاراجہ: آپ کے خیال میں آپ کا قیدی ہونا مشکل ہے۔

بھائی صاحب بہت نازک الحس تھے۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہے۔ اور آپ نے محسوس کیا۔ کہ مہاراجہ کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ آپ گھر واپس آئے۔ تو ملازم کو سفر کا سامان باندھنے کے لئے حکم دیا۔ اور ریل کی گاڑی سے بغیر کسی کو اطلاع دیئے سری نگر چلے گئے۔

بھائی کاہن سنگھ کے نابھہ سے جانے کے بعد مہاراجہ نابھہ نے اخبارات میں ایک بیان دیا۔ کہ سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ فارن منسٹر نابھہ سے بھاگ گئے ہیں۔ جس کے جواب میں بھائی کاہن سنگھ نے اخبارات میں ایک بیان دیا۔ کہ آپ گرمیوں کے زمانہ میں ہمیشہ پہاڑ پر جایا کرتے ہیں۔ اس لئے آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے آپ سری نگر آئے ہیں۔ نابھہ سے بھاگ کر نہیں آئے۔ اور آپ نابھہ کے خاندان کے بدستور وفا شعار اور خیر خواہ ہیں۔ یعنی بات تو معمولی تھی۔ آپ اپنے صاحبزادہ سے ملنے پٹیالہ گئے۔ مگر نابھہ اور پٹیالہ کے تعلقات کی کشیدگی اور غلط فہمی کا شکار ہوئے اور معاملہ اخبارات کے ذریعے پبلک تک پہنچ گیا۔ کیونکہ مہاراجہ نابھہ بھی سکھوں میں ایک لیڈر تسلیم کئے جاتے تھے۔ اور بھائی صاحب تو ایک لائق اور مصنف ہونے کے باعث سکھوں میں بہت ہی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور شاید پڑھا لکھا ایک سکھ بھی ایسا نہ ہو گا۔ جو آپ کے نام سے واقف نہ تھا۔ بھائی کاہن سنگھ کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں پر بھی کافی اثر تھا۔ اور انگریز آپ کی قابلیت کے مداح تھے۔ اس کے بعد نابھہ اور پٹیالہ کے تعلقات جب زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ تو مہاراجہ پٹیالہ کے زور دینے پر آپ ریاست پٹیالہ میں فارن منسٹر مقرر ہوئے۔ اور میری رائے میں یہ ان کی زندگی میں سب سے بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ ان کے لئے مناسب تھا۔ کہ آپ اگر نابھہ سے چلے گئے ہیں۔ تو مہاراجہ نابھہ کے مخالف

Marfat.com

مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں نہ جاتے۔ اور انگریزی علاقہ میں ہی رہتے۔ تاکہ آپ پر نابھہ کے غیر وفاشعار ہونے کا الزام نہ لگایا جاسکتا۔ چند برس بعد جب نابھہ اور پٹیالہ کے درمیان سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ باگڑیاں (جو نابھہ، پٹیالہ اور جیند کی ریاستوں کے مذہبی مشیر تھے) کی کوششوں سے صلح ہوئی۔ تو اس صلح میں ایک شرط یہ بھی تھی۔ کہ بھائی کاہن سنگھ کو واپس نابھہ بھیج دیا جائے گا۔ اور مہاراجہ نابھہ ان کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہ کریں گے چنانچہ صلح کی ان شرائط کے مطابق بھائی کاہن سنگھ نابھہ واپس آگئے۔ اور آپ نے اپنی رہائش اپنے گاؤں پیتھو میں اختیار کر لی۔ اور کبھی کبھی مہاراجہ نابھہ سے اجازت لے کر نابھہ چلے آتے۔ یا گرمیوں کے موسم میں انگریزی علاقہ کے کسی پہاڑی مقام پر چلے جاتے کیونکہ آپ نے زندگی بھر گرمیوں کا زمانہ ہمیشہ ہی پہاڑی مقامات پر گذارا۔ اور ہر سال پہاڑ کی رہائش بدل لیتے۔ یعنی اس سال کو لگ گئے ہیں۔ تو اگلے سال آپ منصوری جاتے۔ اور اس سے اگلے سال کوہ مری یا کسی دوسرے پہاڑ پر اس اعتبار سے بھی آپ کا معیار بہت بلند تھا۔ اور جب مہاراجہ نابھہ سیاسی مشکلات میں مبتلا ہوئے۔ اور گورنمنٹ مہاراجہ کے خلاف تھی۔ تو آپ کو مہاراجہ نابھہ بلوا لیا۔ تاکہ آپ مہاراجہ کو مشورہ دے سکیں۔

اس زمانہ میں جب بھائی کاہن سنگھ نابھہ میں مقیم ہوئے۔ تو میں ان کے پاس دوسرے تیسرے روز جایا کرتا۔ کیونکہ آپ سے ملنا اور بات چیت کرنا نہ صرف پُر لطف ہوتا۔ بلکہ یہ معلومات کے وسیع اور قابلیت میں اضافہ کرنے کا باعث بھی تھا۔ اس سال آپ گرمیوں میں پہاڑ پر نہ جاسکے۔ کیونکہ مہاراجہ کو آپ کے مشورہ کی ضرورت ہوتی۔ میں ایک روز آپ سے ملنے کے لیے گیا۔ تو آپ نے گرمی کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ کہ ان کی ایک ذاتی کوٹھی سولن پہاڑ کے مقام پر ہے۔ یہ کوٹھی ریاست پٹیالہ کے علاقہ میں ہے۔ اور چونکہ نابھہ اور پٹیالہ کے درمیان تعلقات پھر کشیدہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے آپ اپنی کوٹھی میں بھی نہیں جاسکتے۔ یہ سُن کر میں نے کہا کہ "بھائی صاحب آپ نے ایک ریاست کے علاقہ میں کوٹھی بنانے کی کیوں غلطی کی؟" اس کے جواب میں جو کچھ آپ نے کہا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"دیوان سنگھ جی۔ زندگی میں ایک غلطی کی ہو۔ تو اُس غلطی پر رویا بھی جائے۔ جب زندگی ہی غلطیوں سے بھری پڑی ہے۔ تو کس کس غلطی پر رویا جائے۔ اور سب سے بڑی غلطی تو یہ ہوئی۔ کہ ایک ریاست کے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ جس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اگر انگریزی علاقہ میں پیدا ہوتے تو ان مشکلات اور کشمکش کا شکار رہنا نہ پڑتا"

یعنی ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے کسی ریاست کے علاقہ میں پیدا ہونا بھی قدرت کی طرف سے ایک سزا سمجھا جاتا تھا۔

بھائی کاہن سنگھ نے اپنی زندگی میں کئی کتابیں لکھیں۔ اور ان کتابوں میں گورمت پربھاکر اور گورمت سدھاکر دو کتابیں تو سکھوں میں ایک اتھارٹی تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب میں آپ نے چند اشعار میں سکھ قوم کو ایک دعا دی ہے۔ اس دعا میں آپ فرماتے ہیں۔ ؎

تیری کرچھی کرپان نت چلتی رہے

دکھیا تقسیم کرنے والی تیری کرچھی یعنی چمچا اور ظالم کو ختم کرنے والی کرپان یعنی تلوار دونوں ہمیشہ ہی چلتی رہیں۔ ان کو کبھی بھی قرار اور سکون نصیب نہ ہو۔ یعنی تمہارے لنگر ہمیشہ جاری رہیں۔ اور تم دنیا میں سے

Marfat.com

ظلم کو ہمیشہ ہی ختم کرتی رہو)

بھائی کاہن سنگھ رہن سہن کے اعتبار سے بھی بہت بلند تھے۔ برف کی طرح سفید کپڑے زیب تن فرماتے غسل کے لیے قیمتی سے قیمتی سامان استعمال کرتے۔ سکون کی زندگی کو ترجیح دیتے۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ آپ نے اپنی زندگی بھر کبھی بھی بازار کی بکی ہوئی کوئی شے مثلاً مٹھائی یا کیک وغیرہ نہ کھائی۔ کیونکہ آپ کی صفائی پسند طبیعت کسی گندی، خراب یا مکھی بیٹھی ہوئی شے کا کھانا گوارا نہ کرتی تھی۔

بھائی کاہن سنگھ ایک لائق ترین سیاست دان تھے۔ اور آپ سے جب بھی مہاراجہ نابھہ نے مشورہ لیا تو آپ نے یہی رائے دی۔ کہ مہاراجہ پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے افسروں سے تعلقات کشیدہ نہ کریں مگر مہاراجہ پر اس نصیحت کا کبھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ اور رائے دینے والے اس شخص کو بزدل سمجھا جاتا۔ جو انگریزوں سے تعاون کرنے کی رائے دیتا۔ میں آپ سے اس مسئلہ پر ایک بار بات چیت کر رہا تھا۔ تو آپ نے فرمایا:-

"دیوان سنگھ جی۔ انگریز نہ دیوان سنگھ کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ نہ کاہن سنگھ کا۔ کیونکہ یہ اگر ان پر ظلم کریں۔ تو اس ظلم کے خلاف آواز پیدا کرنے کے لیے اسمبلیاں اور پارلیمنٹ موجود ہے۔ جہاں کہ اس ظلم کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ مگر انگریز اگر چاہیں۔ تو مہاراجہ نابھہ تو کیا نظام دکن کو بھی پیس کر رکھ دیں۔ نہ کوئی سننے والا ہے۔ نہ سنانے والا۔ کیونکہ ان کی رعایا خود ان سے نالاں ہے"۔

سردار بہادر بھائی کاہن سنگھ بہت ہی خوبیوں اور محبت کے انسان تھے۔ اگر آپ ریاست نابھہ میں پیدا نہ ہوتے۔ تو یقیناً آپ ملک کے پہلی قطار کے لیڈروں میں جگہ حاصل کرتے۔ مگر آپ کا ایک ریاست کے علاقہ میں پیدا ہونا آپ کی شہرت اور عزت کو صرف سکھوں کے حلقہ تک ہی محدود رکھنے کا باعث ہوا۔ اور ریاستیں جہاں ریاستوں کی پبلک کے لیے جہنم تھیں۔ وہاں یہ سینکڑوں بڑے اور بلند لوگوں کو بھی گمنامی کے گڑھے میں پھینکنے کا باعث ہوئیں۔

روپیہ اور فیّاضی

روپیہ اور فیاضی دونوں بہت کم صورتوں میں ایک جگہ جمع رہ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ اکثر صورتوں میں ایک دوسرے کی ضد بھی ہوتے ہیں۔ یعنی عام طور پر فیاض وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو مفلس ہوں۔ اور سرمایہ دار فیاض نہیں ہوا کرتے کیونکہ جو شخص فیاض ہوگا۔ وہ روپیہ صرف کرتا رہے گا۔ اس کے پاس روپیہ جمع ہونا مشکل ہے۔ اور روپیہ وہ ہی جمع کر سکتا ہے۔ جس کا دل فیاض نہ ہو۔ اور روپیہ کو اپنی چھاتی سے لگا کر رکھے۔ روپیہ اور دل کی فیاضی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہوں۔

پنجاب کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار خطاب یافتہ رائے بہادر اور لیڈر کلاس کے ایک بزرگ تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں پنجاب سے دہلی آگئے۔ ان کے نہ صرف پنجاب بلکہ یو پی میں بھی درجنوں کارخانے اور شوگر ملیں تھیں۔ تبادلہ آبادی کے باعث جب ان کو اپنی لاکھوں روپیہ کی جائیداد پنجاب میں چھوڑنی پڑی تو آپ اس صدمہ سے بیمار ہو گئے۔ اور غالباً دو برس تک بیمار رہے۔ یہ صدمہ ان کے لئے بہت ہی تکلیف

Marfat.com

وہ تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار یہاں شروع کر دیا۔ اور کاروبار کے سلسلہ میں کبھی کبھی اخبارات کو کچھ تھوڑا بہت اشتہار بھی بطور امداد دے دیا کرتے کیونکہ اخبارات کے رسیا ہیں۔ اور ادبی لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور یہ "ریاست" کے بھی بہت بڑے مداحوں اور معترفین میں سے اور ان کے خریدار ہیں۔

دفتر "ریاست" کے منیجر پنڈت سوم ناتھ ایک بار اشتہار کے سلسلہ میں ان سے ملنے گئے۔ تو آپ نے پنڈت جی کے پاس "ریاست" کی تعریف شروع کر دی۔ اور آپ ایک گھنٹہ کے قریب تعریف کرتے رہے اور آپ نے فرمایا۔ کہ آپ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے اخبارات پڑھا کرتے ہیں۔ اور ایڈیٹوریل زور قلم اور حق و صداقت کی آواز بلند کرنے کے اعتبار سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کے اردو اخبارات میں سے کوئی اخبار بھی "ریاست" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس تعریف کو سن کر پنڈت سوم ناتھ نے آپ سے کہا۔ کہ آپ "ریاست" کے اس قدر مداح ہیں۔ اور خدا کے فضل سے آپ لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں۔ اور ادھر "ریاست" مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ ان حالات میں آپ اگر "ریاست" کو اردو کا بہترین اور ــــ مفید ترین اخبار سمجھتے ہیں۔ تو پھر فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی مالی امداد کیوں نہیں کرتے۔ یہ آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔

پنڈت سوم ناتھ کے یہ الفاظ سن کر آپ نے جواب دیا۔ کہ آپ "ریاست" کی امداد کرنا چاہتے ہیں۔ اور ضرور امداد کریں گے۔ اس بات چیت کے تین یا چار روز بعد ان بزرگ کا ایک خط ملا جس کے ساتھ تین سو روپیہ کا چیک تھا۔ اور اس خط میں لکھا تھا۔ کہ چونکہ "ریاست" مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ اس لئے یہ تین سو روپیہ اس کی امداد کے لئے ارسال ہے۔ پنڈت سوم ناتھ نے ان کے ساتھ جو بات چیت کی تھی۔ اس کا علم مجھے پہلے ہو چکا تھا اور پنڈت جی توقع کر رہے تھے۔ کہ اب شائد سال دو سال کے لئے تو ہمیں مالی تفکرات سے نجات مل جائے گی۔ میں نے جب یہ خط پڑھا۔ اور چیک دیکھا تو میں نے محسوس کیا۔ کہ گو یہ بزرگ "ریاست" کے بہت مداح ہیں۔ مگر ان کا دل سرمایہ داری کی کمزوریوں سے پاک نہیں۔ اور یہ غیر ضروری کفایت شعاری میں مبتلا ہے۔ میں نے یہ چیک ان کو واپس بھیج دیا۔ اور ساتھ لکھا۔ کہ آپ کی اس محبت اور قدر دانی کا شکر گذار ہوں۔ مگر اب ہمیں روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یہ چیک واپس بھیج رہا ہوں۔

اس واقعہ کے چند روز بعد لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر "وطن" تشریف لائے۔ لالہ شیو نرائن ان کے دوستوں میں سے ہیں۔ اور یہ دونوں اکٹھے تاش بھی کھیلا کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں ان بزرگ کا ذکر آگیا۔ لالہ شیو نرائن کو علم تھا۔ کہ یہ "ریاست" کے بہت مداح اور معترف اور خریدار بھی ہیں۔ میں نے بتایا۔ کہ انہوں نے تین سو روپیہ کا چیک بھیجا تھا جو میں نے واپس بھیج دیا۔ یہ ذکر معمولی طور پر بات چیت میں ہوا۔ مگر لالہ شیو نرائن نے محسوس کیا۔ کہ یہ "ریاست" کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ اور کروڑوں روپیہ کے مالک ہیں۔ مگر دل کی حالت یہ ہے۔ کہ آپ نے تین سو روپیہ کا چیک بھیجا۔

اس واقعہ کے غالباً چھ ماہ بعد لالہ شیو نرائن اور یہ بزرگ تاش کھیل رہے تھے۔ کہ اخبارات کا ذکر آ گیا۔ اور انہوں نے "ریاست" کی پھر تعریف شروع کر دی جس پر لالہ شیو نرائن کو موقع مل گیا۔ اور آپ نے طنزاً کہا۔ کہ "ہاں جناب آپ نے بھی بطور قدر دانی "ریاست" کو تین سو روپیہ کا چیک بھیجا تھا۔ جو

Marfat.com

دیوان سنگھ نے آپ کو واپس کر دیا"۔ لالہ شیو نرائن ـــــ کے یہ الفاظ سن کر آپ نے فرمایا۔ "نہیں نہیں میں عنقریب "ریاست" کی زیادہ امداد کروں گا۔ میں "ریاست" کی بہت قدر کرتا ہوں"۔

لالہ شیو نرائن اور ان بزرگ کی اس بات چیت کے چند روز بعد میں "ریاست" کے اوپر کے کمرہ میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کہ چپڑاسی نے آکر بتایا۔ کہ ان بزرگ کے پرائیویٹ سیکرٹری ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ میں نے ان کو لانے کے لئے کہا۔ یہ تشریف لائے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ ان کے آقا نے پانچ سو روپیہ بھیجا ہے۔ میں نے کہا۔ کہ میں پہلے بھی ان کا تین سو روپیہ کا چیک واپس بھیج چکا ہوں۔ آپ ان کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیجئے۔ کہ میرے دل میں ان کے ایک لائق اور فاضل ترین شخصیت ہوتے کے باعث انتہائی عزت و احترام کے جذبات ہیں۔ اور ان کی اس قدر افزائی کا شکر گذار ہوں۔ مگر میں یہ روپیہ نہیں لے سکتا۔ میرے اس کہنے کے بعد ان سیکرٹری صاحب نے فرمایا۔ کہ "آپ اور کیا چاہتے ہیں"۔ میرا خیال ہے۔ کہ ان کو ہدایت تھی۔ کہ اگر دیوان سنگھ پانچ سو روپیہ نہ لے۔ تو کچھ تھوڑا بہت اور دے دیا جائے۔ میں نے اس کا جواب دیا۔ وہ یہ تھا۔

"دیکھئے۔ رائے صاحب بہت لائق بے حد شریف نیک اور اچھی شخصیت ہیں۔ اور میرے دل میں ان کے لئے بے حد عزت و احترام کے جذبات ہیں۔ اور اگر آپ کو یہ خیال ہے۔ کہ میں روپیہ نہ ملنے کے باعث ان کی مخالفت کروں گا۔ یا ان کا دشمن ہو جاؤں گا۔ تو میں خدا کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں۔ کہ میرے دل میں ان کے متعلق کدورت کا ایک شائبہ بھی نہیں۔ میں اگر اخبار کے لئے بطور امداد روپیہ لیا کرتا ہوں۔ تو صرف ان دوستوں سے جو فیاض ہیں۔ اور جو فیاض نہ ہوں۔ میں اُن سے روپیہ نہیں لیا کرتا۔ اگر آپ کے آقا دس ہزار روپیہ بھی دیں۔ تو میں سچ کہتا ہوں۔ کہ میں نہیں لوں گا۔ اور آپ میرے یہی الفاظ اپنے آقا سے کہہ دیجئے۔ اور یقین دلا دیجئے۔ کہ میں ان کا خیر خواہ اور دوست ہوں۔ اور پچھلے سال ہا سال کے ذاتی تعلقات میں کبھی بھی کمی نہ ہوگی"۔

میرے یہ الفاظ سن کر یہ سیکرٹری صاحب واپس چلے گئے۔ اور ایمانداری کے ساتھ خدا کی قسم کھا کر میں سچ کہتا ہوں۔ کہ میرے دل میں ان کے لئے نہ کسی قسم کا بغض ہے۔ نہ کینہ۔ اور کسی شخص کے مداح اور مالدار ہوتے ہوئے صرف روپیہ نہ دینے کی صورت میں اس کا مخالف ہونا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ گو میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ دوسرے سرمایہ داروں کی طرح ان کا دل بھی روپیہ کی زیادتی کے ساتھ ساتھ کفایت شعاری میں مبتلا ہو گیا۔ اور گورنمنٹ نے ڈیتھ ٹیکس لگا کر اچھا کیا۔ کہ جو لوگ روپیہ جمع کرنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ ان کی دولت ان کے مرنے کے بعد سرکاری اور قومی خزانہ کے لئے حاصل کی جائے گی۔ اور شاید سرمایہ داروں کو نئے ویلتھ اور دوسرے ٹیکسوں کے ذریعہ اپنی زندگی میں ہی یہ روپیہ گورنمنٹ کو دینا پڑے۔

Marfat.com

خاندانی وقار

میرے والد ڈاکٹر تھے۔ اور وہ اپنے زمانہ کے کامیاب ترین ڈاکٹروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور جب اُن کا انتقال ہوا۔ تو میری عمر چالیس روز کی تھی۔ اور میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میرے والد نے اپنی زندگی میں کتنا روپیہ پیدا کیا۔ مگر عزیز و اقارب کا بیان ہے۔ کہ میرے والد کے انتقال کے بعد سونے کے جو زیورات تولے گئے۔ ان کا وزن پندرہ سیر تھا۔ اور نقد روپیہ کے علاوہ میرے والد نے اپنی حیات میں ایک سو ایکڑ زمین اور چند مکانات خریدے جن پر ایک چچا نے قبضہ کر لیا۔ اور چونکہ میرے بڑے بھائی کی عمر بھی دس سال کے قریب تھی۔ اور اس زمانہ میں خواتین عدالتوں میں جانا اپنے خاندانی وقار کے خلاف سمجھتی تھیں ہم اپنے چچا سے اپنی جائیداد واپس نہ لے سکے۔

نقد روپیہ اور زیورات دس بارہ برس میں ختم ہو گئے۔ کیونکہ اس عرصہ تک یہ نقد روپیہ اور بعد میں زیورات فروخت کر کے اخراجات چلائے جاتے۔ اس کے علاوہ میری دو بہنوں اور بڑے بھائی کی دو شادیوں پر بھی کافی روپیہ صرف ہوا۔ کیونکہ خاندانی وقار کے لئے یہ ضروری تھا۔ چنانچہ میری عمر جب دس بارہ برس کی تھی۔ تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارے گھر میں زندگی گزارنے کے لئے ایک پیسہ موجود نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پانچویں جماعت کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور گذارہ کے لئے زیورات کے بعد دوسرا سامان فروخت ہونا شروع ہوا۔

میرے والد کے پاس میڈیکل بکس یعنی ڈاکٹری کے متعلق کتابوں کا ذخیرہ بھی کافی تھا۔ جو دوسرے سامان کے ساتھ میرے والد کے انتقال کے بعد جہلم سے حافظ آباد منتقل ہو گیا۔ اور ڈاکٹری کی ان کتابوں میں بعض کتابیں ایک ایک ہزار صفحہ کی ضخیم تھیں۔ جب گھر میں اخراجات کے لئے کچھ نہ رہا۔ تو ہم نے ان کتابوں کو ردی میں فروخت کرنا شروع کیا۔ اور ایک ایک کتاب جس کی قیمت غالباً چالیس چالیس پچاس پچاس روپیہ ہو گی۔ ردی کے نرخ پر آٹھ آٹھ اور دس دس آنے میں حلوائیوں اور دوسرے لوگوں کے پاس فروخت ہونا شروع ہوئیں۔ اتفاق دیکھئے۔ کہ میرے ایک چچازاد بھائی سردار صاحب ڈاکٹر امریک سنگھ رخصت پر اپنے وطن حافظ آباد گئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے شام کے وقت آدمی بھیج کر ایک حلوائی (جس کا نام لدھارام بانکا تھا) سے کھانے کے لئے پکوڑے منگوائے اور اس حلوائی نے ہماری ردی میں فروخت کی ہوئی ایک ضخیم میڈیکل بک کے ایک ورق میں یہ پکوڑے دیئے ڈاکٹر امریک سنگھ کے پاس جب یہ پکوڑے پہنچے۔ اور آپ نے ان پکوڑوں والا کاغذ دیکھا۔ تو وہ حیران رہ گئے۔ کہ یہ ورق ایک قیمتی اور ضخیم میڈیکل بک کا ہے۔ آپ فوراً لدھارام بانکے کی دوکان پر پہنچے اور پوچھا۔ کہ یہ ورق کس کتاب کا ہے۔ لدھارام نے یہ کتاب آپ کو دکھائی۔ جس میں سے یہ ورق لیا گیا تھا۔ پھر پوچھا یہ کتاب کہاں سے لی۔ تو لدھارام نے بتایا۔ کہ یہ کتاب ردی میں دیوان سنگھ دے گیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر امریک سنگھ ہمارے ہاں پہنچے۔ اور پوچھا کہ کیا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں۔ اور گو بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ مگر خاندانی وقار کو قائم رکھنے کے لئے میری والدہ نے کہا۔ کہ کوئی اور کتاب موجود نہیں۔ اور اس کے بعد ہم نے آہستہ آہستہ تمام کتابیں ردی میں فروخت کیں۔ اور کچھ عرصہ تک ان کتابوں کے ذریعہ ہی ہم کھانے پینے کا سامان خریدتے رہے۔

Marfat.com

جب کتابیں ختم ہو گئیں۔ تو سوال پیدا ہوا کہ اب زندگی گزارنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد برتنوں کے فروخت کرنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ کیونکہ برتن بہت کافی تعداد میں موجود تھے۔ اور برتنوں کے فروخت کرنے کی یہ صورت تھی۔ کہ میری والدہ اندر کے کمرے میں پیتل کا کوئی بڑا برتن مثلاً گاگر وغیرہ لیتیں۔ اس گاگر کو کسی بڑی اینٹ کے ساتھ توڑا جاتا۔ اور جب یہ گاگر ٹوٹ جاتی۔ اور اس کا حلیہ بگاڑ دیا جاتا۔ تو اس کو بازار میں یہ کہہ کر فروخت کر دیا جاتا۔ کہ برتن ٹوٹا ہوا ہے۔ اور اس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اس لئے فروخت کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک برتنوں کو توڑ کر گذارا چلتا رہا۔ اور یہ تمام برتن ایک ایک کر کے حافظ آباد کے ایک برتن فروش لالہ منگل داس ملہوترہ (جو ہمارے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔) کی دکان پر پہنچ گئے۔ کیونکہ اگر یہ برتن اپنی اصلی حالت میں فروخت کئے جاتے۔ تو ان کے باعث لوگوں کو ہمارے افلاس کا پتہ چلتا۔ جسے خاندانی وقار کے خلاف قرار دیا جا سکتا تھا۔

پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب میں نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ تو حالات کی مجبوری کے باعث میں نے بزازی کی ایک دوکان پہ پانچ روپیہ ماہوار پر ملازمت اختیار کر لی۔ اور وہاں میرا کام مالک دکان کے حکم کے مطابق گاہک کو اندر سے کپڑے کے تھان لا کر دکھانا تھا۔ یہاں مجھے ملازمت کرتے ہوئے چند روز ہوئے تھے۔ کہ عزیز و اقارب اور گلی کے لوگوں کو اس کا علم ہو گیا۔ ہماری گلی کے سرے پہ ایک چھوٹا سا ٹھاکر دوارہ تھا۔ اور اس ٹھاکر دوارہ کے مالک ایک براہمن چندر بھان تھے۔ جن کے والد پنڈت یا نارھا بوٹا رام سال میں ایک دو بار میرے والد کے پاس جہاں کہ وہ ملازم ہوتے۔ جایا کرتے۔ اور میرے والد ان پنڈت جی کو دو تین سو روپیہ کا سلوک کرتے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہی جاری رہا۔ اور میرے والد کے انتقال کے بعد پنڈت بوٹا رام کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے لڑکے پنڈت چندر بھان اس ٹھاکر دوارہ کے انچارج یا مالک تھے۔ جو دن بھر اس ٹھاکر دوارہ میں رہتے۔ اور گلی محلہ کی شادی وغیرہ کی رسوم ادا کرتے۔ ان پنڈت چندر بھان نے جب یہ سنا اور ایک روز مجھے جاتے دیکھا۔ تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ میں نے تعلیم کا سلسلہ کیوں منقطع کیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ افلاس اور تنگ دستی کے باعث ایسا کیا گیا۔ پنڈت چندر بھان احسان شناس تھے۔ اور ان کو معلوم تھا۔ کہ ان کے والد میرے والد کے پاس (جہاں کہ والد ملازمت میں ہوتے) جایا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ دو تین سو روپیہ کا سلوک کیا جاتا۔ پنڈت چندر بھان نے کہا۔ کہ اگر میں اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دوں۔ تو وہ میری تعلیم کے تمام مصارف برداشت کریں گے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموش رہا۔ میں جب گھر پہنچا۔ اور والدہ سے اس پیشکش کا ذکر کیا۔ تو والدہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ لوگ کہیں گے۔ کہ برہمنوں کی امداد سے تعلیم حاصل کی"۔ یعنی یہ خاندانی وقار کے خلاف ہو گا۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ آئندہ زمانہ میں ہندوستان کے لوگ خاندانی وقار کی کوئی قیمت سمجھیں گے یا نہیں مگر کچھ بھی ہو۔ ہندوستانی معاشرت میں اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور اس کے متعلق میری رائے ہے۔ کہ اگر آئندہ بھی ہندوستان میں یہ احساس قائم رہے۔ تو یہ دنیا کی نگاہوں میں ہندوستان کے لئے

Marfat.com

عزت و احترام کے جذبات پیدا ہونے کا باعث ہو گا۔ اور اس پر ہماری آئندہ نسلیں فخر کریں گی۔

"نیتاجی" نیم چند

میں ایک روز شام کو کام کرنے کے بعد تھک کر بیٹھا۔ انگریزی کا ایک ہفتہ وار رسالہ پڑھ رہا تھا۔ تو چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ نیتاجی نیم چند ملنے کے لئے آئے ہیں۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ میں نے ان کو لانے کے لئے چپڑاسی سے کہا۔ آپ تشریف لائے تو آپ نے مولانا سمیع اللہ مرحوم (مولانا مفتی کفایت اللہ کے داماد) کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ

"نیتاجی نیم چند تشریف لاتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کو آزاد کیا ہے۔ اور ان کے پاس نہ رہنے کو جگہ ہے۔ نہ کوئی ذریعہ معاش۔ اور ان کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام دفتر "ریاست" میں کر دیا جائے۔"

ان نیتاجی نیم چند سے باتیں ہوئیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ آپ چند برس پہلے دہلی کے جنرل پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ وہاں سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ اور مہاتما گاندھی کا تو لوگ بلاوجہ نام لیتے ہیں۔ کہ مہاتما جی نے ہندوستان کو آزاد کرایا ہے۔ جب انہوں نے یہ باتیں کیں۔ تو میں سمجھ گیا۔ کہ خدا نے دوسرے سوامی پارس نانتھ بھیج دیئے ہیں۔ اور کچھ مزید عرصہ تفریح کے ساتھ گذر سکے گا۔ میں نے اُن کی رہائش کا انتظام دفتر کے ایک کمرہ میں کر دیا۔ اور کھانے پینے کے لئے ان سے کہہ دیا۔ کہ جیسا غریبانہ میرے ہاں کھانے کا انتظام ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ کھا لیا کیجئے۔ اور جب دو چار روپیہ کی جیب خرچ کی ضرورت ہو۔ تو میں انتظام کر دیا کروں گا۔ چنانچہ "نیتاجی" کا قیام دفتر "ریاست" میں ہو گیا۔ دن بھر تو میں کام میں مصروف رہتا۔ اور شام کو جب دوست آ جاتے۔ تو "نیتاجی" کے ساتھ محفل گرم ہو جاتی۔

"نیتاجی" نیم چند کے حالات یہ ہیں۔ آپ دہلی کے جنرل پوسٹ آفس میں بطور کلرک ملازم تھے۔ وہاں کسی وجہ سے آپ کے دماغ کو صدمہ پہنچا۔ آپ کا دماغی توازن قائم نہ رہا۔ تو محکمہ ڈاک نے آپ کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ صرف لیڈری کے لئے وقف ہو گئے۔ کبھی تو بچوں کی ایک فوج جمع کر رہے ہیں۔ اور اس میں اپنا جھنڈا (جو ایک گز کپڑا لے کر آپ نے تیار کر لیا تھا) بلند کیا جا رہا ہے۔ کبھی مشاعروں میں جاتے ہیں۔ اور وہاں اپنی نظمیں پڑھنے کے لئے مُنتظرر دیتے ہیں۔ مشاعرہ والے جب نظم نہیں پڑھواتے۔ تو ان پر خفا ہوتے ہیں۔ اور آخر آپ کی "روحانیت" کی جب شہرت دہلی میں عام ہو گئی۔ تو مشاعروں کے کارکن یا تو آپ کی نظم مشاعرہ شروع ہونے سے بہت پہلے پڑھوا دیتے۔ اور تالیوں کے ذریعہ بہت داد دی جاتی۔ اور یا جب مشاعرہ ختم ہو جاتا اور لوگ چلے جاتے تو اس وقت آپ کو لاؤڈ سپیکر کے سامنے لایا جاتا۔ اور "نیتاجی" اس پر ہی مطمئن رہتے۔

"نیتاجی" نے جب "روحانیت" کے مرحلے کافی طے کر لئے۔ تو آپ کی بیوی اپنے دو بچوں کو اپنے ساتھ لے کر اپنے میکہ والوں کے ہاں جھانسی چلی گئی کیونکہ دہلی میں نہ تو اس بیچاری کے لئے کھانے پینے کا کوئی انتظام

Marfat.com

تھا۔ اور "نیتاجی" روحانیت کی منزلیں طے کرنے میں مصروف تھے۔ آپ کو جب کبھی اپنی بیوی کا خیال آتا۔ تو تکلیف محسوس کرتے۔ اور اپنے سسرال والوں کو کوستے کہ وہ کیوں ان کی بیوی اور بچوں کو جھانسی لے گئے ہیں چنانچہ جب بیوی اور بچوں کی جدائی کا زیادہ ہی خیال آیا۔ تو ایک روز آپ چاندنی چوک کی کوتوالی میں پہنچے۔ اور رپورٹ درج کرائی کہ آپ کی بیوی معہ بچوں کے اغوا کر لی گئی ہے۔ اور جھانسی کے فلاں شخص (رپورٹ میں انہوں نے اپنے خسر کا نام لکھوایا) اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اور اپنا پتہ انہوں نے اخبار "ریاست" کا دیا۔ کیونکہ یہ یہاں مقیم تھے۔ اس رپورٹ کی نقل جب پولیس کے بڑے افسروں کے پاس پہنچی۔ تو اخبار "ریاست" کا نام دیکھ کر انہوں نے تحقیقات کے لئے ایک سب انسپکٹر مقرر کیا۔ اور یہ سب انسپکٹر اگلے روز دفتر "ریاست" میں پہنچا۔ میں اس وقت باہر کے کمرہ میں کام کر رہا تھا۔ اور "نیتاجی" اندر کے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ یہ سب انسپکٹر جب آیا۔ تو میں نے پوچھا۔ کہ کس مقصد کے لئے تشریف لائے۔ اس سب انسپکٹر نے بتایا۔ کہ دفتر "ریاست" میں ایک صاحب مسٹر نیتاجی نیم چند رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی ہے۔ اور اعلیٰ افسروں نے ان کو تحقیقات پر مقرر کیا ہے۔ میں نے جب یہ سنا۔ تو صرف میں حیران بلکہ مجھے افسوس بھی ہوا۔ اگر یہ سب انسپکٹر تحقیقات کے لئے نیتاجی کی سسرال جھانسی چلا گیا۔ تو بیچاروں کی کتنی بدنامی ہو گی۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا۔ کہ یہ رپورٹ غلط ہے۔ اغوا کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اور رپورٹ لکھوانے والے کے دماغ میں خلل ہے۔ میں نے جب سب انسپکٹر کو تمام اصل حالات سنا دیئے۔ تو اندر سے "نیتاجی" کو بلوا لیا گیا۔ "نیتاجی" تشریف لائے۔ تو میں نے سب انسپکٹر سے آپ کا تعارف کرایا۔ "یہ نیتاجی نیم چند ہیں جنہوں نے ہندوستان آزاد کرایا۔ اور لوگ ملک کے آزاد کرانے کا کریڈٹ خواہ مخواہ مہاتما گاندھی کو دیتے ہیں"۔ میں نے اتنا کہا ہی تھا۔ اور سب انسپکٹر کے آنے کا مقصد بھی بتایا تھا۔ کہ نیتاجی کانگرس پر برس پڑے۔ اور کہا۔ کہ آپ نے تو ملک کو آزاد کرایا۔ اور یہ کانگرسی ہندوستان کے آزاد کرانے کا تمام کریڈٹ مہاتما گاندھی کو دیتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ قدر ناشناسی کا یہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہ باتیں ہوئیں۔ تو سب انسپکٹر سمجھ گیا۔ کہ نیتاجی نے پولیس میں رپورٹ کیوں درج کرائی۔ مگر آپ نے نیتاجی سے کہا۔ کہ شام کو کوتوالی ضرور پہنچ جائیے۔ تاکہ آپ کی اغوا شدہ بیوی کو واپس لا کر آپ کے حوالے کیا جائے۔ سب انسپکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔ اور اس نے اپنے حکام کو بتایا۔ کہ رپورٹ کرنے والا پاگل ہے۔ اور اس نے غلط رپورٹ کی ہے۔ شام کو "نیتاجی" بھی کوتوالی پہنچ گئے۔ اور سب انسپکٹر نے ان کو سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے پیش کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ کہ "یہ نیتاجی ہیں جنہوں نے دراصل ہندوستان کو آزاد کرایا ہے"۔ سب انسپکٹر نے اتنا ہی کہا تھا۔ کہ آپ نے کانگرس اور کانگرس گورنمنٹ پر قدر ناشناسی اور احسان فراموشی کے الزامات لگانے شروع کر دیئے۔ اور کہا۔ کہ ملک کو آزاد تو انہوں نے کرایا۔ اور لوگ نام مہاتما گاندھی کا لیتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے جب دیکھا۔ کہ "نیتاجی" روحانی بزرگ ہیں۔ تو آپ نے سب انسپکٹر سے تو یہ کہا۔ کہ فائل داخل دفتر کر دی جائے۔ اور نیتاجی سے کہا۔ آپ اطمینان رکھئے آپ کی بیوی واپس آ جائے گی۔ جھانسی کے مجسٹریٹ کو لکھا گیا ہے۔ کہ اغوا کرنے والے کو گرفتار کر کے دہلی بھیجا جائے۔ نیتاجی جب واپس آئے۔ تو بہت خوش تھے۔ اور آپ دوسرے تیسرے روز کوتوالی پہنچ کر حوالات

Marfat.com

کے ملازم دیکھ آتے۔ کہ ان کے خسر ابھی گرفتار ہو کر آئے ہیں۔ یا نہیں۔ یہ سلسلہ ایک ماہ جاری رہا۔ اور ایک ماہ کے بعد "نیتا جی" یہ کہہ کر اور صبر کر کے بیٹھ گئے۔ کہ پولیس نے رشوت کھالی ہوگی۔ جو اُن کے خسر کی اب تک گرفتاری نہیں ہوئی۔ اور ادھر بار لوگوں نے بھی آپ سے کہا۔ کہ جس صورت میں کانگریس اور کانگریس گورنمنٹ آپ کی دشمن ہے۔ گورنمنٹ کی پولیس آپ کی دشمن کیوں نہ ہو۔ پولیس سے مایوس ہونے کے بعد آپ نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں جانا شروع کیا۔ وہاں عدالتوں میں جا کر مجسٹریٹوں سے پوچھنا شروع کیا۔ کہ ان کی بیوی اور خسر گرفتار ہو کر ابھی آئے ہیں۔ کہ نہیں۔ وہاں سے کیا جواب ملتا۔ بیچارے کئی روز وہاں جاتے رہے۔ اور آخر مایوس ہو کر آپ نے عدالتوں میں جانا چھوڑ دیا۔

کچھ روز کے بعد دہلی اسمبلی کے انتخابات شروع ہوئے۔ تو یار لوگوں نے آپ کو رائے دی۔ کہ اسمبلی کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ تاکہ آئندہ صوبہ دہلی کے وزیر ہو کر پبلک کی زیادہ خدمت کر سکیں۔ آپ اس کے لئے کھڑے ہوگئے۔ آپ کے پاس ضمانت داخل کرنے کے لئے ایک پیسہ نہ تھا۔ آپ نے درخواست میں لکھا۔ کہ آپ مفلس ہیں۔ اور ضمانت کا روپیہ داخل نہیں کر سکتے۔ اور مفلسی میں ہی آپ کو کھڑا ہونے کی اجازت دی جائے جیسے کہ مفلسی میں لوگ عدالتوں میں مقدمہ دائر کرتے ہیں۔ اس وقت الیکشن کا کام مرحوم سردار ہرچند رسنگھ ڈھلوں ایڈیشنل مجسٹریٹ کے سپرد تھا۔ جنہوں نے یہ درخواست نامنظور کر دی۔ تو آپ کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ گورنمنٹ آپ کے خلاف ہے۔ اور وہ نہیں چاہتی۔ کہ آپ اسمبلی میں جا کر اس کی مخالفت کریں۔ درخواست کے نامنظور ہونے کے بعد بھی آپ الیکشن پر کھڑے ہو گئے۔ اور محلہ کے بچوں کو جمع کر کے اپنے حق میں "نیتا جی نیم چند زندہ باد" اور "نیتا جی نیم چند کو ووٹ دو" کے نعرے لگواتے۔ اور چھوٹے چھوٹے پروسیشن نکلواتے رہے۔ اور یہ واقعہ تو بے حد دلچسپ ہے۔ کہ جس روز ووٹ ڈالے جا رہے تھے۔ تو گلی میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اور آپ نے ووٹ دینے والوں کو کہنا شروع کیا۔ کہ آپ کو ووٹ دیا جائے۔ محلہ کے لوگ آپ سے واقف تھے۔ جو ادھر آتا مسکرا کر چلا جاتا۔

نیتا جی نیم چند اپنے پاگل پن کے باعث ڈاکخانہ کی ملازمت سے علیحدہ کئے گئے تھے۔ اور آپ سمجھتے تھے۔ کہ آپ کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ آپ نے مفلسی میں گورنمنٹ پر پچاس ہزار روپیہ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ عدالت نے قانون کے مطابق مفلسی کی تصدیق کے لئے درخواست تحصیلدار کو بھیجی۔ اور تحصیلدار نے لکھ دیا۔ کہ آپ فی الحقیقت مفلس ہیں۔ اور کورٹ فیس ادا نہیں کر سکتے۔ تحصیلدار کے ہاں سے کاغذات واپس جانے کے بعد مقدمہ شروع ہوا۔ اور پیشیاں ہوئیں۔ کیونکہ عدالت بغیر سماعت کے قانوناً کوئی مقدمہ خارج نہ کر سکتی تھی۔ جب آپ عدالت میں جاتے تو عدالت دلچسپی کا مرکز بن جاتی۔ آپ کا کوئی وکیل نہ تھا۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے ایک سرکاری وکیل پیش ہوا کرتا۔ ایک روز آپ کئی گھنٹہ تک عدالت کے باہر بیٹھے رہے۔ اور جب آپ کو آواز دی گئی۔ تو سرکاری وکیل کسی دوسرے مقدمہ میں مصروف تھا۔ جو دو تین گھنٹہ لیٹ پہنچا۔ "نیتا جی" نے عدالت سے درخواست کی۔ کہ چونکہ سرکاری وکیل غیر حاضر تھا اس لئے ان کو ہرجانہ دلوایا جائے۔ "نیتا جی" کی اس درخواست پر سرکاری وکیل نے فوراً اپنی جیب سے ایک

Marfat.com

روپیہ نکال کر "نیتاجی" کو نذر کیا۔ اس کے بعد آپ واپس دفتر "ریاست" پہنچے۔ تو فخر کے ساتھ آپ نے کہا۔ کہ آج آپ نے گورنمنٹ سے ہرجانہ وصول کیا ہے۔ چند پیشیوں اور قانونی کاروائی کے بعد یہ مقدمہ خارج ہو گیا۔ تو آپ عدالت پر بہت ناراض تھے۔ اور آپ نے کہا۔ کہ کوئی بات نہیں۔ اگر عدالت نے گورنمنٹ کے خلاف ڈگری نہیں دی تو نہ سہی۔ آپ خود ڈگری کر کے گورنمنٹ سے روپیہ وصول کریں گے۔ چنانچہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر ایک پوسٹر شائع کیا جس میں پبلک کو اطلاع دی گئی۔ کہ گورنمنٹ ہاؤس پچاس ہزار روپیہ میں قرق ہو چکا ہے۔ اور فلاں تاریخ کو یہ نیلام ہو گا۔ اس پوسٹر کے بعد پولیس نے پاگل سمجھ کر آپ کے خلاف کچھ نہ کیا۔ مگر آپ لوگوں سے کہا کرتے۔ کہ آپ پچاس ہزار روپیہ میں گورنمنٹ ہاؤس نیلام کر چکے ہیں۔

"نیتاجی نیم چند" اخبارات کے دفتر میں اکثر جایا کرتے۔ اور فرماتے۔ کہ ہندوستان آپ نے آزاد کرایا ہے۔ اور آپ کا بیان شائع کیا جائے۔ مگر کوئی اخبار آپ کا بیان شائع نہ کرتا۔ آپ نے "سیلف ہیلپ" کا ثبوت دیتے ہوئے ایک روز اپنے اخبار کا ڈیکلریشن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں داخل کر دیا۔ اور دفتر "ریاست" کے کاتب سے کتابت کی سیاہی اور کاغذ لے کر آپ نے اپنے اخبار کی خود ہی کتابت کی اور اس کا ایک پرچہ شائع کیا۔ جس میں پبلک کی ناقدر شناسی کے متعلق مضامین اور آپ کی تک بندی والی نظمیں تھیں۔ آپ نے لوگوں سے چند روپیہ لے کر نصف رم کاغذ کا انتظام کیا۔ اور پریس والوں کو یہ کہہ کر پرچہ چھپوا لیا۔ کہ چند روز تک چھپائی کی اُجرت دے دی جائے گی۔ یہ پرچہ دنیا کے تمام ممالک کے بادشاہوں پریزیڈنٹوں اور امبیسیڈروں کے نام پوسٹ کیا گیا۔ اور چونکہ نہ کوئی پرچہ فروخت ہوا۔ اور نہ کسی نے چندہ دیا۔ آپ کو دوسرا پرچہ نکالنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اور آپ نے یہ اخبار بند کر دیا۔

"نیتاجی نیم چند" کے پاگل پن کی وجہ غالباً گھریلو معاملات تھے۔ آپ دو برس کے قریب دفتر "ریاست" کے ایک کمرہ میں رہے۔ دن بھر اپنی پارٹی بنانے کی فکر میں پھرتے رہتے۔ اور جب واپس آتے۔ تو محلہ کی عورتوں سے شکائیت کی جاتی۔ کہ یہ ان کی شادی کا کوئی انتظام نہیں کرتیں۔ عورتیں ان سے واقف ہو چکی تھیں۔ کوئی تو روپیہ طلب کرتی اور کوئی پہننے کا سوٹ۔ تاکہ یہ کسی لڑکی کی تلاش میں جائیں۔ مگر نیتاجی کے پاس ایک پیسہ نہ تھا۔ آپ کو محلہ کی عورتوں سے ہمیشہ شکائیت رہتی۔ کہ انہوں نے ان کی شادی کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ حالانکہ عورتیں اگر چاہیں۔ تو ایک ہفتہ میں ہی شادی کرا سکتی ہیں۔ محلہ میں اگر کوئی شادی ہوتی۔ تو آپ کئی کئی گھنٹہ اس گھر میں رہتے۔ اور شادی کی رسوم دیکھتے۔ نیتاجی کبھی کبھی اپنے وطن بھی جایا کرتے۔ اور وہاں اپنے رشتہ داروں سے دو چار یا دس روپیہ لے آتے۔ ایک بار آپ اپنے گاؤں گئے۔ واپس آئے۔ تو آپ کے پاس دس بارہ روپیہ تھے۔ محلہ کے لڑکوں نے آپ سے یہ کہہ کر دعوت لی۔ کہ آپ کی شادی کرا دی جائے گی۔ اور ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے کہا۔ کہ آپ کے عزیزوں میں ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ جس سے شادی ہو گی۔ نیتاجی نے جب واپس آ کر بتایا۔ کہ اب شادی ہونے والی ہے۔ اور آپ ہونے والے سالے (یعنی جس نے کہا تھا کہ اس کے عزیزوں میں ایک لڑکی ہے) سے مل چکے ہیں۔ اور دعوت کھلا چکے ہیں۔ تو مجھے ان لڑکوں کی بے رحمی پر بہت غصہ آیا۔ مگر نیتاجی کئی ماہ اس انتظار میں رہے کہ عنقریب

Marfat.com

سگائی کی رسم ادا کی جائے گی۔

"نیتاجی" نیم چند بہت معصوم اور نیک تھے۔ میں نے بہت چاہا۔ کہ یہ اپنی زندگی آرام سے دفتر ریاست میں رہ کر گذاریں۔ اور ان کے اخراجات کے لئے بھی انتظام کر دیا تھا۔ مگر لیڈری کی دھن ان کو لئے پھرتی تھی۔ اور یہ سکون کے ساتھ نہ بیٹھتے تھے۔ اور اکثر دیہات میں جا کر "دیہات سدھار" کے نام پر دورہ کرتے۔ اب ایک عرصہ ہوا۔ آپ دہلی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اور آپ کے تمام خیر خواہ، مداح، محلہ کے لڑکے اور عورتیں کبھی کبھی آپ کے متعلق دریافت کر لیتے ہیں۔ مگر میں اس طرح ہی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ جس طرح کسی اغوا شدہ عورت کے گھر والے کوئی جواب نہیں دے سکتے اور کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ وہ عنقریب آ جائے گی۔ یعنی میں بھی اپنے دل کو اور دوسرے لوگوں کو تسلی دینے کے لئے کہہ دیا کرتا ہوں کہ "نیتاجی" عنقریب آنے والے ہیں۔ کیونکہ میرا یقین ہے۔ کہ جس طرح ان کے دوست اور مداح ان کو یاد کرتے ہیں۔ وہ بھی ہمیں ضرور یاد کرتے ہوں گے۔

گھریلو ملازموں کا جھوٹ اور چوری

ایک اہل الرائے کا قول ہے۔ کہ اگر ہندوستان میں پہاڑیئے ملازم نہ ہوتے۔ تو گھریلو ملازم رکھنے والے نصف سے زیادہ لوگوں کی بیویوں کو کھانا خود پکانا پڑتا۔ اور ان کو گھر کے برتن صاف کرنے پڑتے چاہے یہ کتنے بھی امیر ہوتے۔ اور اگر سکھ نہ ہوتے تو ہندوستان کی نصف موٹریں اور لاریاں بغیر ڈرائیوروں کے گیرجوں میں بند پڑی رہتیں۔ اور ان کو چلانے والے نہ ملتے۔ کیونکہ شہروں کے گھریلو ملازموں میں چھتر فی صدی لوگ نینی تال۔ الموڑہ۔ گھڑوالی۔ شملہ اور کانگڑہ کے علاقہ کے پہاڑیئے ہیں۔ اور تمام بڑے بڑے شہروں میں نصف سے زیادہ موٹر ڈرائیور سکھ ہیں۔ جو ہندوستان کے ہر صوبہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں تک سکھ موٹر ڈرائیوروں کا تعلق ہے۔ یہ پیدائشی طور پر جفاکش، محنتی۔ دیانتدار اور اپنے مالک کے وفاشعار ہیں۔ اور پہاڑیئے گھریلو ملازموں میں شاید پانچ فی صدی ایسے ہوں گے۔ جو جھوٹ نہ بولتے ہوں۔ اور چوری نہ کرتے ہوں۔ اور ان کی چوری صرف گھی شکر اور کھانے پینے کی اشیاء تک محدود ہے۔ کیونکہ بزدل ہونے کے باعث ان میں بڑی چوری کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی اور کوئی ہی ایسا پہاڑیا ملے گا جس نے زیورات یا روپیہ پر ہاتھ صاف کیا ہو۔ ان پہاڑیئے ملازموں کے متعلق میں چند اپنے تجربات بیان کرتا ہوں۔

میرے ہاں برانڈی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ کیونکہ میں کبھی کبھی جب طبیعت زیادہ نا ڈھال ہو۔ یا تھکاوٹ محسوس کروں۔ تو نصف یا نصف سے زیادہ ایک پیگ (ایک چھٹانک) پی لیا کرتا ہوں۔ اور ویسے کئی کئی ماہ تک اس کے پینے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ اور ویسی۔ ٹھرا۔ وسکی۔ رم یا جن سے مجھے بے حد نفرت ہے۔ اور میں کہہ نہیں سکتا۔ کہ کیوں نفرت ہے۔ مجھے کوئی اس کی کوئی خاص وجہ اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ حالانکہ شراب پینے والے سب سے زیادہ سکاچ وسکی کو پسند کرتے ہیں۔

میرے پاس ہینسی تھری سٹار برانڈی کی ایک بوتل موجود تھی۔ اور اس میں سے تھوڑی سی میں نے

Marfat.com

پی تھی۔ اور ایک ماہ کے عرصہ سے اس کے پینے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر میں نے دیکھا۔ کہ بوتل میں سے برانڈی ہر روز تھوڑی تھوڑی کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور اس میں نصف بوتل کے قریب باقی ہے۔ میں نے سوچا۔ کہ جس صورت میں کہ میں اسے پیتا نہیں۔ اس کے روز بروز کم ہوتے چلے جانے کی وجہ کیا ہے۔ میں نے یہ محسوس کر کے کہ کوئی نہ کوئی اس میں سے پیتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ چور کو پکڑنا چاہیئے۔ میں نے اگلے روز صبح ہی قلم اور سیاہی کے ساتھ اس بوتل پر نقطہ کا نشان لگا دیا۔ جہاں تک کہ برانڈی اس میں پڑی تھی۔ اور اس کے دو دو گھنٹہ بعد دیکھنا شروع کیا۔ کہ بوتل میں سے یہ کس وقت اُڑائی جاتی ہے۔ میں نے یہ نشان صبح چھ بجے لگایا۔ اور آٹھ بجے کے قریب دیکھا۔ تو برانڈی اس نشان سے نیچے نہ تھی یعنی اس میں سے کسی نے نکالی نہ تھی۔ پھر دس بجے دیکھا۔ تو پھر بھی یہ اتنی ہی تھی۔ بارہ بجے دیکھا تو اس وقت بھی یہ اتنی ہی تھی۔ اور بارہ بجے میں پہاڑیئے ملازم سے یہ کہہ کر غسل خانہ میں گیا۔ کہ میں غسل کر لیتا ہوں اور تم میرا کمرہ صاف کر دو۔ کیونکہ میں روز صبح چار پانچ بجے صبح سے بارہ بجے دوپہر تک کام کرتا رہتا۔ اور بارہ بجے غسل خانہ میں جا کر غسل کرتا۔ اور کپڑے بدلتا۔ میں غسل خانہ سے غسل کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آیا۔ اتنے میں اس ملازم نے کمرہ میں جھاڑو دے لیا۔ اور کمرہ صاف کر دیا۔ میں جب اس کمرہ میں پہنچا۔ اور میں نے الماری میں برانڈی کو دیکھا تو یہ بوتل میں اس نقطہ سے نیچے تھی۔ جہاں کہ میں نے یہ نقطہ صبح بطور نشان لگایا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ برانڈی میرے غسل خانہ میں جانے کے عرصہ میں چوری ہوئی۔ میں نے جب یہ دیکھا۔ تو اس ملازم کو اپنے پاس بلوا لیا۔ اور بغیر کچھ دریافت کئے اپنا سلیپر نکال کر پانچ سات رسید کئے۔ یہ پوچھتا رہا۔ کہ اس کو کیوں پیٹا جا رہا ہے میں نے اس کے پوچھنے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور جب باٹا بازی (کامریڈ بلونت سنگھ ملازم کے پٹنے کو باٹا بازی کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ پٹائی باٹا کے سلیپر سے ہوا کرتی ہے) ختم ہوئی۔ تو میں نے پوچھا۔ سچ بتاؤ تم نے الماری والی بوتل میں سے برانڈی پی ہے یا نہیں۔ اس نے فوراً انکار کیا۔ اور کہا۔ کہ اس نے نہیں پی۔ میں نے پھر باٹا کا سلیپر پکڑ لیا۔ اور باٹا بازی شروع کر دی۔ اور جب اس پر پھر باٹا بازی ہوئی۔ تو اس نے اقرار کر لیا۔ کہ ہاں اس نے پیا ہے۔ اس کے اقرار کرنے پر میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور پوچھا اب یہ بتاؤ۔ کہ برانڈی بوتل کو منہ لگا کر پیا کرتے تھے۔ یا گلاس میں ڈال کر۔ کیونکہ اگر تم بوتل کو ہی منہ لگا کر پیا کرتے تھے۔ تو باقی کی جوٹھی برانڈی تم کو دی جاتی ہے۔ اور اگر گلاس میں ڈال کر پیا کرتے تھے۔ تو پھر یہ برانڈی میں رکھ لیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے وہ گلاس بھی بتا دیا۔ جس میں یہ ہر روز برانڈی ڈال کر اور اس میں پانی ملا کر پیا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کا حساب کر کے اس کی تنخواہ کا جو بقایا نکلتا تھا۔ اس کو دیا۔ رسید لی۔ اور موقوف کر دیا۔ اس کے ایک سال بعد اس کا پھر اس کے وطن سے خط آیا۔ کہ یہ ملازمت کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو۔ تو یہ آ جائے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ اگر تم برانڈی کی چوری پھر نہ کرو۔ تو آ سکتے ہو۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ میں اس کی چوری کو بھولا نہیں۔ میرے خط کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ملازمت کے لئے پھر آیا۔

میں ملازموں کی چوری پکڑنے کا بہت مشتاق ہوں۔ اور جب کسی ملازم کو رکھتا ہوں تو دو تین روز میں ہی معلوم کر لیتا ہوں۔ کہ اسے چوری کی عادت ہے۔ کہ نہیں۔ ایک پہاڑیا کو میں نے ملازم رکھا۔ اور اگلے روز میں

Marfat.com

نے ایک روپیہ کی ریزگاری گن کر اور دونیوں اور چونیوں پر سیاہی سے ایک ایک نقطہ بطور نشان لگا کر قلمدان پر رکھ دی۔ خود غسل خانہ میں چلا گیا۔ اور اس سے مَیں نے کہا۔ کہ میرا کمرہ صاف کر دو۔ مَیں جب واپس آیا۔ تو مَیں نے ریزگاری گنی۔ اس میں سے ایک دونی کم تھی۔ مَیں نے اس سے کہا۔ کہ جو دونی تم نے یہاں سے اٹھائی ہے۔ رکھ دو۔ اس کمبخت کو یہ علم ہی نہ تھا۔ کہ مَیں نے تمام ریزگاری پر نشان لگایا ہوا ہے۔ اس نے فوراً انکار کیا۔ کہ اس نے دونی نہیں اٹھائی۔ اس کے انکار کرنے پر مَیں نے نہ صرف اس پر باٹا بازی شروع کر دی۔ بلکہ باٹا بازی کے بعد اس کی تلاشی لی۔ تو اس کے جیب میں وہ نشان زدہ دونی موجود تھی۔ اس کلاس کے لوگ تمام کے تمام پیسے نہیں اٹھایا کرتے۔ ریزگاری میں سے ایک آدھ دونی یا چونی اٹھا لیا کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی چوری کا علم نہ ہو سکے۔ اور مالک یہ سمجھے۔ کہ اگر اس نے چوری کرنی ہوتی۔ تو یہ تمام کے تمام پیسے اٹھا لیتا۔ چنانچہ اس سے دونی واپس لینے کے بعد مَیں نے اس کو دو دن کی تنخواہ دے دی۔ اور ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ یعنی اس نے اپنی دو دن کی تنخواہ بھی لے لی۔ اور بطور چوری کے الاؤنس کے باٹا بازی بھی وصول کی۔

ایک پہاڑیا میرے پاس ایک سال کے قریب ملازم رہا۔ اور اس کی بیوی بچے دہلی میں ہی تھے۔ یہ صبح دفتر میں آتا۔ اور رات کو مجھے کھانا کھلانے کے بعد اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ اور جب یہ گھر جاتا۔ تو مَیں اس کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیتا۔ تاکہ یہ اپنے بیوی بچوں کے لئے لے جائے۔ ایک روز مَیں نے محسوس کیا۔ کہ جاتے ہوئے گھی چوری کر کے لے جاتا ہے۔ مَیں نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔ اس کو علم نہ تھا۔ کہ مَیں اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ رات کو جاتے ہوئے ایک کٹوری میں گھی لے جاتا تھا۔ مَیں نے ایک روز اس کو بمعہ گھی کے پکڑ لیا۔ اور پوچھا۔ تو یہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ مَیں ویسے تو کسی کو کچھ دے دوں۔ مگر میں چوری اور جھوٹ کو برداشت نہیں کرتا۔ اور میرا یقین ہے۔ کہ جس گھر میں ملازم چوری کرے وہاں برکت نہیں ہوتی۔ مَیں نے اس کو زمین پر لٹا دیا۔ اور لٹانے کے بعد اس کا منہ کھول کر اس میں گھی کا ٹین (یہ ایک سیر گھی کا ٹین تھا۔ میں ہمیشہ ایگ مارک خالص گھی استعمال کرتا ہوں۔ اور مَیں نے اپنی زندگی میں بناسپتی گھی استعمال نہیں کیا) اُلٹ دیا۔ جس سے نہ صرف اس کا منہ گھی سے بھر گیا۔ بلکہ اس کا تمام چہرہ بھی گھی میں لپٹ گیا۔ اور گھی لٹانے کے بعد اس سے کہا۔ کہ "چوری کر کے بہت تھوڑا گھی لے جاتا ہے۔ اس صورت میں تو کافی گھی کھا سکے گا۔" گھی ڈالنے کے بعد میں نے باٹا کے سلیپر بھی رسید کئے۔ اور اس کا حساب کر کے اس کو نکال دیا۔

مَیں جب کسی پہاڑیئے یا دوسرے شخص کو ملازم رکھتا ہوں تو دو چار روز اس کی سخت نگرانی کرتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں۔ کہ نیت کے اعتبار سے یہ پست ہے۔ یا بلند ہے۔ چنانچہ اگر تو کھانا دیتے وقت اس کے ہاتھ کانپتے ہوں۔ اس کے منہ میں پانی آ جاتا ہو۔ (جیسے کہ کمینہ لوگ کسی کو کھانا کھاتے دیکھیں تو ان کے منہ میں پانی آ جاتا ہے) یا یہ فراخدلی کے ساتھ کھانا نہ دے تو اس کو کمینہ سمجھتے ہوئے دو چار روز کے بعد ہی اسے ملازمت سے الگ کر دیتا ہوں کیونکہ میرا یہ ایمان ہے۔ کہ جب کسی کمینہ اور پست فطرت شخص کے ہاتھ سے کھانا کھایا جائے۔ تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یا کھانے میں لذت باقی نہیں رہتی۔

ایک پہاڑیئے ملازم نے میرے غسل خانہ میں سے غسل کا سامان خود استعمال کر لیا۔ مجھے اس کا علم ہوا۔ اور اس سے پوچھا۔ تو اس نے جھوٹ بولتے ہوئے اس سے انکار کر دیا۔ اس کے جھوٹ کو مَیں برداشت نہ کر سکا۔ تو

Marfat.com

میں نے اس کو دو تین تھپڑ لگائے۔ اور کہا۔ کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ یہ کیفیت دفتر ریاست کے منیجر چاولہ صاحب دیکھ رہے تھے۔ یہ میرے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ اس بے چارے کو کیوں مارتے ہو۔ یہ جھوٹ کیوں نہ بولے۔ جب کہ یہ زندگی بھر جھوٹ بولتا رہا۔ اس کا باپ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی ماں جھوٹ بولتی ہے۔ اس کے بھائی جھوٹ بولتے ہیں۔ اور خاندانی اعتبار سے اس کا دادا اور نانا بھی جھوٹ بولتے رہے ہے۔ پہاڑیئے فطرتاً جھوٹ بولتے اور کھانے پینے کی چیزوں کی چوری کرتے ہیں۔ اور آئندہ یہ کرتے رہیں گے۔ اس کو چھوڑ دیجئے۔ اور اس کی پٹائی نہ کیجئے۔" چاولہ صاحب کے اس کہنے کے بعد میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور اس کا حساب کر کے اس کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ کیونکہ بقول چاولہ صاحب اس غریب کا قصور کیا تھا۔ جب کہ اس کے گھر والوں نے ہی اس کو جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تربیت نہ دی۔

ایک پہاڑیا ملازم ہر روز دیکھا کرتا۔ کہ مہمانوں کے کمرے میں مہمان کا غسل کا سامان ایک میز پر پڑا رہتا ہے۔ اور غسل کے اس سامان میں دانتوں کے منجن کی ایک ٹیوب بھی ہے۔ جسے مہمان اپنے دانتوں کے لئے ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ دانتوں کی اس پیسٹ کے ساتھ ہی اس مہمان کی ڈیٹ (بال اڑانے کی پیسٹ) بھی پڑی تھی۔ یہ پہاڑیا پڑھا ہوا نہ تھا۔ اس نے سمجھا۔ کہ یہ دونوں ٹیوبیں دانتوں کے لئے ہی ہیں۔ مہمان جب بازار گئے۔ تو اس کمبخت نے پوشیدہ طور پر ڈیٹ والی ٹیوب سے جا کر اپنے دانتوں پر مل لی۔ ڈیٹ کا ملنا تھا کہ اس کے تمام مسوڑے سوج گئے۔ اور ہونٹوں پر بھی اس کا اثر ہوا۔ جب اس کو زیادہ تکلیف ہوئی۔ تو یہ میرے پاس آیا۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور منہ کے اندر چھالے پڑے تھے۔ میں نے جب اس کو ڈانٹ کر پوچھا۔ کہ اس نے کیا شے استعمال کی ہے۔ تو اس نے بتایا۔ کہ مہمان کا دانتوں کا منجن استعمال کیا تھا۔ میں مہمان کے کمرہ میں گیا۔ تو پتہ چلا۔ کہ دانتوں کے منجن والی ٹیوب کے پاس ہی ڈیٹ کی ٹیوب تھی۔ اور اس بے وقوف کو پتہ نہ تھا۔ کہ دونوں ٹیوبوں میں کیا فرق ہے۔ اور اس نے ڈیٹ کو بطور منجن استعمال کیا ہے۔ مجھے اس بے وقوف کی جہالت پر غصہ بھی آیا۔ اور میں اپنا قہقہہ بھی ضبط نہ کر سکا۔ آخر اس سے بہت دیر تک پانی کے غرارے کرائے اور پانی کے غراروں کے بعد گلسرین کے غرارے کرائے۔ تو اس کو کچھ سکون ملا۔ ورنہ اگر ڈیٹ کا کچھ حصہ اس کے گلے میں چلا جاتا۔ تو شاید اس کا دم رک جاتا۔ اور پولیس گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کے جرم میں تحقیقات شروع کر دیتی۔ اگلے روز میں نے اس ملازم کو بھی اس کا حساب دے کر رخصت کیا۔ اور کہا۔ کہ پہلے کسی کیمسٹ کے ہاں ادویات اور سامانِ غسل کے استعمال کی ٹریننگ لے لو۔ پھر یہاں ملازمت کرنا۔ اور یہ تو اکثر دیکھا کہ پہاڑیئے ملازم نے کتے کے نہلانے کا صابن استعمال کیا ہے۔ اس سے ہی یہ اپنا منہ دھویا کرتے تھے۔

گھریلو ملازموں میں شاید پانچ یا دس فی صدی ایسے ہوں گے۔ جو چوری نہ کرتے ہوں۔ اور بابا احسان الحق کہا کرتے تھے۔ کہ اگر ملازم کو تیس روپیہ ماہوار تنخواہ دو۔ تو دس فیصدی یعنی تین روپیہ

Marfat.com

ماہوار اس کی چوری کا بھی ریزرو رکھ لیا کرو۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ کہ گھریلو ملازم چوری نہ کریں۔ اور یہ غنیمت ہے۔ کہ چونکہ یہ بزدل ہوتے ہیں۔ چوری صرف کھانے پینے کی اشیاء کی کرتے ہیں۔ اور پولیس سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ بزدل نہ ہوں۔ تو شاید گھروں کی صفائی ہی کر دیں۔ ان تمام تجربوں کے بعد میری رائے ہے۔ کہ گھریلوں ملازموں کی چوری اور جھوٹ کو ایک حد تک نظر انداز کر دیا جانا چاہیئے کیونکہ بقول چاولہ جب ان کے ماں۔ باپ۔ بھائی۔ اور تمام رشتہ دار ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ اور چوری کو جرم ہی نہیں۔ بلکہ ہوشیاری سمجھتے ہیں۔ تو بیچارے جھوٹ کیوں نہ بولیں اور چوری کیوں نہ کریں۔

اخبارات کی اشاعت کے متعلق دروغ بیانیاں

بہت برس ہوئے دفتر "ریاست" ہملٹن روڈ پر تھا۔ اور "ریاست" کی ضخامت اس زمانہ میں ساٹھ ستر صفحات کے قریب تھی۔ اور ان میں نصف کے قریب اشتہارات ہوتے۔ اور جو سالانہ بجٹ بنایا جاتا۔ اس کے مطابق تقریباً ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی اور خرچ تھا۔ اس زمانہ "ریاست" غالباً چھ ہزار چھپتا تھا۔ اگر کوئی مشتہر پوچھتا۔ تو اسے اس کی اشاعت دفتر والے سات آٹھ ہزار بتاتے۔ یعنی صرف پچیس فی صدی جھوٹ بولا جاتا۔ اور یہ جھوٹ کنوسیر یا دفتر "ریاست" کا مینیجر بولتا۔ جو اشتہارات کے متعلق ذمہ دار تھا۔ مگر دوسرے اکثر اخبارات دوگنا۔ سہ گنا یا دس گنا زیادہ اشاعت کا جھوٹ بولتے۔ اور اسی جھوٹ کا آڈیٹرس سے سرٹیفکیٹ لے کر مشتہرین کی جیب تراشی کرتے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے۔ کہ لاہور کا ایک روزانہ انگریزی اخبار اس زمانہ میں صرف پانچ سو چھپتا تھا۔ اور پبلک میں اس اخبار کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ مگر اس کے پاس اشاعت کے متعلق پچیس ہزار کا آڈیٹرس سرٹیفکیٹ تھا۔ یعنی یہ اشاعت کے متعلق پچاس گنا زیادہ یا دوسرے الفاظ میں کئی ہزار فی صدی جھوٹ بولتا تھا۔ اور اس کشتی میں ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات ہی سوار تھے۔

گو اخبارات اشاعت کے متعلق بہت ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے۔ کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں کو قریب قریب ہر اخبار کی اصل اشاعت کا علم ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ذرائع سے اخبارات کی اصل اشاعت معلوم کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز ایڈیٹر "ریاست" کو کلکتہ سے اخبارات میں اشتہارات دینے والی ایک سب سے بڑی کمپنی ڈی جے کیمر اینڈ کو (اس کمپنی کا ہیڈ آفس تو لندن میں ہے۔ اور اسکی برانچیں قریب قریب دنیا کے اکثر ممالک میں ہیں) کے جنرل منیجر مسٹر ہٹن ولیمز کا ایک خط پہنچا۔ جس میں آپ نے لکھا۔ کہ آپ دہلی آ رہے ہیں۔ وہاں آپ سیسل ہوٹل میں فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک قیام کریں گے۔ اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے خط پہنچنے کے بعد میں ایک روز میں ان سے ملنے کے لئے سیسل ہوٹل پہنچا۔ سردی کا موسم تھا۔ اور یہ گھاس پر کرسی بچھائے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ میں جب گیا۔ تو بہت تپاک کے ساتھ ملے۔ کیونکہ اس سے پہلے کئی بار مل چکے تھے۔ اور اس کمپنی کے ایک حصہ دار مسٹر آر کیمر سے بھی میرے کچھ مراسم تھے۔ میں وہاں بیٹھا۔ تو ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب بزنس کی باتیں شروع ہوئیں۔ تو آپ نے پوچھا۔ کہ "ریاست"

Marfat.com

کی اشاعت آج کل کتنی ہے۔ میں نے بتایا کہ مجھے ٹھیک تو معلوم نہیں۔ غالباً سات آٹھ ہزار کے درمیان ہو گی۔ یہ اشاعت میں نے وہی کہی۔ جو دفتر والے مشتہرین کے خطوط کے جواب میں لکھتے تھے۔ یا لوگوں سے کہتے تھے۔ مسٹر ہٹن ولیمز کو معلوم تھا۔ کہ "ریاست" کی فی الحقیقت اشاعت چھ ہزار ہے۔ آپ نے سات آٹھ ہزار کے درمیان کے الفاظ سن کر مسکراتے ہوئے جو کہا وہ مجھے اب تک اچھی طرح سے یاد ہے آپ نے فرمایا:-

"ویل سردار دیوان سنگھ۔ اگر "ریاست" کی اشاعت فی الحقیقت سات آٹھ ہزار ہے تو یہ بہت اچھی اشاعت ہے۔"

اس "فی الحقیقت" کے معنی یہ تھے۔ کہ مسٹر ہٹن ولیمز اس اشاعت کو غلط سمجھتے ہیں۔ اور انگریزوں کے بلند کیریکٹر کے مطابق شریفانہ انداز میں مجھ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے جب آپ سے یہ الفاظ سنے۔ تو میں شرم کے باعث پانی پانی ہو گیا۔ اور دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ اور تھوڑی دیر باتیں کر کے میں واپس چلا آیا۔

میں اپنی کار میں واپس آ رہا تھا۔ اور میرے ہاتھ تو سٹیئرنگ پر تھے۔ مگر میرا دماغ اپنی دروغ بیانی پر بے حد نادم اور شرمسار تھا۔ اور میں نے راستہ میں ہی یہ فیصلہ کیا۔ کہ چاہے نتائج کچھ بھی ہوں۔ میں آئندہ نہ صرف خود کبھی اخبار کی اشاعت کے متعلق جھوٹ نہ بولوں گا۔ بلکہ دفتر والوں کو بھی نہ بولنے دوں گا۔ چنانچہ میں نے دفتر پہنچنے کے بعد مینیجر اشتہارات اور کنویسروں کو ہدایت کی۔ کہ چاہے کچھ بھی ہو۔ اخبار کی اشاعت کے متعلق آئندہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولا جائے۔ مینیجر نے کہا۔ کہ اگر جھوٹ نہ بولا جائے گا تو اشتہارات کم ہو جائیں گے۔ کیونکہ دوسرے اخبارات دو دو ہزار چھپتے ہوئے بھی اپنی اشاعت بیس بیس ہزار بتاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اخبار جائے جہنم میں۔ یہ فیصلہ ہے۔ کہ اخبار کی اشاعت کے متعلق کبھی بھی جھوٹ نہ بولا جائے گا۔ اور اس واقعہ کے بعد میں نے یہ عہد کیا۔ کہ نہ صرف اپنے اخبار کی اشاعت کے متعلق کبھی جھوٹ نہ بولا جائے گا۔ بلکہ دوسرے اخبارات کے جھوٹ کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاکہ ہندوستانی جرنلزم میں سے جھوٹ کی یہ پلیدگی دور ہو۔ اور اس میں تجارتی پاکیزگی اور طہارت پیدا ہو چنانچہ ہمارے اس جھوٹ نہ بولنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشتہارات بند ہونے شروع ہو گئے۔ اور اشتہارات دینے والی کمپنیوں نے اپنے بجٹ میں سے "ریاست" کا نام خارج کرنا شروع کر دیا۔ اور اس وقت "ریاست" میں کسی بھی انگریزی یا امریکن فرم کا کوئی اشتہار نہیں۔ اور ان فرموں کے اشتہارات ان اخبارات کے پاس ضرور موجود ہیں۔ جن کی اشاعت چاہے دو چار سو ہی ہے۔ مگر یہ جھوٹ بول کر اپنی اشاعت دس دس اور پندرہ پندرہ ہزار بتاتے ہیں۔ اور اپنے جیب میں اشاعت کے متعلق جھوٹے اور جعلی سرٹیفکیٹ لئے بمبئی اور کلکتہ میں پھرتے ہیں۔

تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں اُردو کا ہفتہ وار اخبار "شیر پنجاب" بھی لاہور سے دہلی منتقل ہو گیا۔ اور چونکہ اس اخبار کے لئے دہلی میں دفتر کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور اس اخبار کے مالک سردار امر سنگھ کے ساتھ

Marfat.com

کچھ مراسم بھی تھے۔ اس اخبار کے لئے دفتر"ریاست" کے ایک کمرہ میں جگہ دے دی گئی۔ اور اس اخبار کا دفتر غالباً دو برس کے قریب دفتر"ریاست" کے ایک کمرہ میں رہا اور اس عرصہ میں معلوم ہوا۔ کہ یہ اخبار پانچ سو چھپتا ہے۔ اور اس پانچ سو میں سے ایک سو کے قریب تو اس کے پیڈ خریدار ہیں۔ ایک سو کے قریب یہ ایجنسیوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ایک سو کے قریب اس کے پرچے دفتر میں پڑے رہتے ہیں۔ اور دو سو کے قریب پرچے مشتہرین کو بھیجے جاتے ہیں۔ اور ان کو لکھا جاتا ہے۔ کہ یہ اخبار دس ہزار چھپتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اخبار سال میں تین چار خاص نمبر مثلاً بساکھی نمبر، آزادی نمبر اور گورونانک نمبر وغیرہ کے نام سے شائع کرتا ہے۔ اور یہ خاص نمبر بھی پانچ سو ہی چھاپے جاتے ہیں۔ مگر مشتہرین سے اشتہار لیتے وقت کہا جاتا ہے۔ کہ یہ خاص نمبر پچیس ہزار چھپے گا۔

"شیر پنجاب" کا دفتر دو برس کے قریب دفتر"ریاست" کے ایک کمرہ میں رہا۔ اور اس کے بعد یہ اپنا دفتر دوسری جگہ لے گیا۔ اور اطلاعیں آتی رہیں۔ کہ اس اخبار کا مالک سردار جنگ بہادر سنگھ نہ صرف اپنے اخبار کے متعلق مشتہرین کے ساتھ چار سو بیس کر کے یعنی دھوکہ دے کر اشتہارات حاصل کرتا ہے۔ بلکہ "ریاست" اور دوسرے اخبارات کے خلاف بھی مشتہرین کے پاس زہر اگلتا ہے۔ تاکہ دوسرے اخبارات کے اشتہارات کا حصہ بھی اس کو ہی دیا جائے۔ میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ مگر اس خیال سے خاموش رہا۔ کہ اگر ہندوستان کے نصف اخبارات دھوکہ پر زندہ ہیں۔ تو اس اخبار کی دھوکہ بازی کوئی زیادہ قابل تعریف نہیں۔

چند برس ہوئے گورنمنٹ نے ہندوستان میں ایک پریس کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اور بتایا کہ کمیشن کا مقصد اخبارات کے معیار کو بلند کرنا اور ہندوستانی اخبارات کے متعلق درست اشاعت دریافت کرنا ہے۔ میں نے گورنمنٹ کا جب یہ اعلان پڑھا۔ تو میں نے خیال کیا۔ کہ یہ موقع ہے۔ کہ اخبارات کی اشاعت کے متعلق جھوٹ کو بے نقاب کیا جائے۔ اور میں اس میں حصہ لوں۔ چنانچہ میں نے ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات کو ایک پوسٹ کارڈ ایک دوسری کمپنی کے نام سے لکھا۔ (تاکہ اخبارات کو یہ علم نہ ہو۔ کہ کوئی اخبار ہی ان کے متعلق اعداد و شمار حاصل کرنا چاہتا ہے)۔ کہ ہم اشتہار دینا چاہتے ہیں۔ آپ اپنا لٹریچر بھیجیے اور لکھیے کہ آپ کے اخبار کی اشاعت کتنی ہے۔ اور آڈیٹرس کا سرٹیفکیٹ بھی ساتھ بھیجیے۔ میں نے پریس ڈائریکٹری میں سے ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات کو یہ خط بھیجا۔ جس کے جواب میں ان اخبارات نے اپنی اشاعت لکھی۔ اور اشتہارات کے متعلق جو کچھ بھی ان کے پاس لٹریچر تھا۔ وہ انہوں نے بھیج دیا۔ اور ہندوستان کے قریب قریب تمام اخبارات کے اشاعت کے متعلق اعداد و شمار میرے پاس پہنچ گئے۔ اور میں حیران رہ گیا کہ اردو کے جو اخبارات دو دو سو چھپتے ہیں۔ ان کے پاس بھی آٹھ آٹھ دس دس ہزار اشاعت کے سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ میرے اس خط کا جواب "شیر پنجاب" کی طرف سے وصول نہ ہوا۔ کیونکہ اس اخبار کے مالک سردار جنگ بہادر سنگھ کو معلوم تھا۔ کہ جس پتہ سے خط آیا ہے۔ اس کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں "شیر پنجاب" کے جواب کا کئی روز انتظار کرتا رہا۔ اور جب کوئی جواب نہ آیا۔ تو میں نے پٹنہ کی یونائیٹڈ سرجیکل کمپنی کے مالک مسٹر کشن چند گپتا (جو میرے دوست ہیں) کو ایک خط لکھا کہ وہ اپنی طرف سے شیر پنجاب کو لکھ کر اس کی اشاعت دریافت کریں۔ مسٹر کشن چند گپتا نے یونائیٹڈ سرجیکل کمپنی کے نام پر ایک خط مینجر "شیر پنجاب" دہلی کے نام بھیجا۔

Marfat.com

سردار جنگ بہادر سنگھ کو کچھ علم نہ تھا۔ کہ اس فرم کا مالک کون ہے۔ اور اس کا تعلق دیوان سنگھ سے ہے یا نہیں۔ "شیر پنجاب" کی طرف سے فوراً ہی جواب گیا۔ کہ "شیر پنجاب" کی اشاعت دس ہزار ہے۔ اور یہ سکھوں میں بہت با اثر اور زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار ہے۔ "شیر پنجاب" کے اس خط کے ساتھ کوئی آڈیٹرز سرٹیفکیٹ نہ تھا۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد میری ہدایت کے مطابق مسٹر کشن چند گپتا نے پھر "شیر پنجاب" کو لکھا۔ کہ آپ اپنی اشاعت کی تائید میں آڈیٹرز سرٹیفکیٹ بھیجئے۔ اگر آپ کے پاس سرٹیفکیٹ ہو۔ اس خط کے جواب میں سردار جنگ بہادر سنگھ نے ایک سرٹیفکیٹ بھیجا۔ جو جے۔ این بھگت اینڈ کو لمیٹڈ آڈیٹرس چاندنی چوک دہلی کا تھا۔ اور ساتھ خط لکھا۔ کہ آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ ارسال ہے۔ آپ "شیر پنجاب" میں اشتہار ضرور دیجئے۔

یہ خط اور آڈیٹر کا سرٹیفکیٹ بھی مسٹر کشن چند نے مجھے بھیج دیا۔ خط پر تو سردار جنگ بہادر سنگھ کے دستخط تھے۔ اور خط میں یہ لکھا تھا۔ کہ اشاعت دس ہزار ہے۔ اور سرٹیفکیٹ اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ خط اور سرٹیفکیٹ جب میرے پاس پہنچا۔ تو اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ جے۔ این۔ بھگت اینڈ کو لمیٹڈ آڈیٹرس کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ اور نہ صرف اشاعت کے متعلق یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ ہے۔ بلکہ یہ سو فیصدی جعل سازی بھی ہے۔ میں نے اپنے دفتر کے مینجر کو بھیجا۔ کہ وہ جے۔ این۔ بھگت اینڈ کو کے پاس چاندنی چوک جائے۔ اور ان سے میرے ملنے کے لئے وقت مقرر کرے۔ اس ملاقات کا مقصد یہ تھا۔ کہ ایک تو میں یہ کہہ کر کہ مجھے بھی دس ہزار اشاعت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے۔ اس فرم سے معلوم کروں۔ کہ یہ کیا فیس لے گی۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس نے "شیر پنجاب" سے بھی یہی فیس لی ہو گی۔ دوسرے بات چیت کے بعد اس کے مالک کو ذلیل کروں۔ کہ یہ کیوں جھوٹے سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔ میرے دفتر کے مینجر نے چاندنی چوک میں اس فرم کو بہت تلاش کیا۔ اور دو گھنٹے تلاش کرنے میں صرف کئے۔ مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر ایک دوسرے آڈیٹر کو ٹیلی فون کیا۔ تو انہوں نے کہا ان کو تو کوئی علم نہیں۔ ہم اگر چاہیں تو آڈیٹرس کی ایسوسی ایشن کے دفتر سے معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ اس فرم کا پتہ کیا ہے۔ کیونکہ اس ایسوسی ایشن کے دفتر میں تمام آڈیٹرس کے پتے موجود ہیں۔ میں نے اس ایسوسی ایشن کو ایک خط لکھا۔ کہ اس فرم کا دفتر کہاں ہے۔ تو اس فرم نے جواب دیا۔ کہ اس نام کی کوئی فرم دہلی میں موجود نہیں۔ اس کے بعد میں نے ایک خط بذریعہ جے۔ این۔ بھگت اینڈ کو کے نام بھیجا۔ جو تیسرے روز واپس آ گیا۔ اور اس پر لکھا تھا۔ کہ اس نام کی کوئی فرم چاندنی چوک میں نہیں۔ یہ دو جواب پہنچنے پر میری آنکھیں کھلیں۔ کہ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ مگر میں اپنے شک کو مٹانے اور "چور کے گھر تک پہنچنے" کے مصداق میں نے دہلی گورنمنٹ کے اس دفتر کو خط لکھا۔ جہاں کہ تمام لمیٹڈ کمپنیاں رجسٹرڈ کی جاتی ہیں۔ کہ اس لمیٹڈ کمپنی کا پتہ کیا ہے۔ تو وہاں سے بھی جواب آیا۔ کہ اس نام کی کوئی لمیٹڈ کمپنی دہلی میں نہیں۔ یہ تمام ثبوت قبضہ میں کرنے کے بعد میں نے پریس کمیشن کے سیکریٹری کو ٹیلی فون کیا۔ کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ سیکریٹری ایک مہاشہ سرکھنڈ تھے۔ یہ میرے اور "ریاست" کے حالات سے واقف تھے۔ آپ نے اگلے روز ملنے کا وقت دیا۔ اور میں دس بجے

Marfat.com

ان کے دفتر میں پہنچا۔ وزیٹنگ کارڈ بھیجا۔ تو انہوں نے بلا بھیجا۔ یہ تپاک کے ساتھ ملے۔ اور آپ نے کہا فرمائیے گورو دیو کیا حکم ہے۔" میں نے گورو دیو کے الفاظ سن کر کہا۔ کہ آپ نے ایسا کیوں کہا۔ تو آپ نے جواب دیا۔ کہ "آپ ہندوستانی جرنلزم کے گورو دیو ہیں۔ اس لئے ایسا کہا ہے۔" باتیں شروع ہوئیں۔ تو میں نے کہا کہ پریس کمیشن کا مقصد اخبارات کی اشاعت کے جھوٹ کو ختم کرنا ہے۔ اور جو سرکاری سرکولر اخبارات کو بھیجا گیا۔ اس میں بھی صاف لکھا ہے۔ کہ جو اخبار کمیشن کے سوالات کے جواب میں غلط اشاعت بتائے گا۔ یا غلط جواب دے گا۔ اس پر فوجداری مقدمہ چلایا جائے گا۔ میں آپ کو مثال کے طور پر ایک اخبار کے متعلق ثبوت دیتا ہوں۔ کیا آپ اس اخبار پر غلط اطلاع دینے کے جرم میں مقدمہ چلائیں گے؟ آپ نے کہا۔ بتائیے کیا ثبوت ہے۔ میں اس سے پہلے تمام کاغذات کے فوٹو اتروا کر اصل کاغذات محفوظ رکھ چکا تھا۔ میں نے تمام حالات بتانے کے ساتھ فوٹو دکھائے۔ اور کہا کہ یہ اخبار "تیج پنجاب" صرف پانچ سو چھپتا ہے۔ جس کے ثبوت میں پریس کے واوچر اور بلوں کی نقلیں موجود ہیں۔ اور یہ نہ صرف دس ہزار کا جعلی سرٹیفکیٹ مشتہر کر دے کر دھوکہ دیتا ہے۔ اس اخبار نے پریس کمیشن کو بھی دھوکہ دے کر اپنی اشاعت پانچ ہزار لکھی ہے اور یہ ثبوت موجود ہے۔ تمام کاغذات دیکھنے کے بعد مسٹر کھنہ حیران ہو گئے۔ اور آپ نے کہا۔ کہ میں فوٹو کی کاپیوں کا ایک سیٹ ان کے پاس چھوڑ جاؤں۔ کمیشن کے صدر مسٹر راجہ ادھکشا جج ہائیکورٹ بمبئی، عنقریب دہلی آنے والے ہیں۔ اور یہ کیس ان کے سامنے پیش کریں گے۔

میں فوٹو کی ایک کاپی دے کر واپس آ گیا۔ چند روز بعد مسٹر کھنہ کا ٹیلیفون آیا۔ کہ کمیشن کے صدر اور ممبر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اگلے روز نو بجے براڈ کاسٹنگ کی بلڈنگ میں پہنچ جاؤں۔ اس بلڈنگ کی اوپر کی منزل میں کمیشن کا اجلاس ہو گا۔ اور آپ نو بجے میرا براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے نیچے کے ہال میں انتظار کریں گے میں وقت کا بہت پابند ہوں۔ نو بجے سے پانچ سات منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا۔ نو بجے کھنہ صاحب آئے اور مجھے اس بلڈنگ کے اوپر کے حصہ میں لے گئے۔ جہاں کہ کمیشن کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مجھے مسٹر راجہ ادھکشا صدر کمیشن کے سامنے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اور آپ کی دائیں اور بائیں طرف آٹھ سات دوسرے ممبر بیٹھے تھے مجھے صدر نے پوچھا۔ کہ اصل کاغذات کہاں ہیں۔ میں نے یہ کاغذات دکھائے۔ تو آپ نے پوچھا۔ کہ کیا اصل کاغذات (جن کے فوٹو ان کے پاس پہلے موجود تھے) وہ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ آپ کو دکھانے اور دینے کے لئے ہی لایا ہوں۔ اس کے بعد مجھ پر جرح ہوئی۔ جو مختلف ممبروں کی طرف سے تھی۔ اور میں نے بتایا۔ کہ میں صرف "تیج پنجاب" کو ہی بے نقاب نہیں کرنا چاہتا۔ میری غرض تمام اخبارات کے اشاعت کے جھوٹ کو بند کرنے کی ہے۔ چنانچہ میں نے دوسرے ایک درجن کے قریب غلط اشاعت بتانے والے اخبارات کے متعلق بھی کاغذات دیئے۔ اور ان اخبارات میں صوبہ جات اور مرکزی گورنمنٹ کے وزراء کے اخبارات بھی تھے۔ اور میں نے جب ہندوستان کے تمام اخبارات کے آئے ہوئے جوابات والی فائل دکھائی۔ تو تمام ممبر دنگ رہ گئے۔ کہ میں کس طرح سب اخبارات کی اصلی حالت کا پتہ لے لیتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے ایک اخبار کا ایک پرچہ دیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ یہ تین شہروں سے بیک وقت

Marfat.com

شائع ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ کبھی بھی سوائے ایک جگہ کے دوسری جگہ سے شائع نہ ہوا تھا۔

اس کے علاوہ مَیں نے "ریاست" کے پچھلے دو سو کے قریب کٹنگ دیئے۔ جن میں ہندوستان کے اخبارات کے جھوٹ اور بے ایمانیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا گیا تھا۔ کہ پریس میں طہارت پیدا کرنے کے لئے قدم اٹھایا جائے۔ اور قانون کے ذریعہ اخبارات کو مجبور کیا جائے۔ کہ یہ غلط اشاعت نہ بتائیں مَیں نے جب یہ دو سو کٹنگ ترتیب وار اور تاریخ وار دیئے۔ تو سوال پیدا ہوا۔ کہ یہ اُردو زبان میں ہیں۔ اور ممبروں میں کوئی بھی اُردو زبان جاننے والا نہیں۔ ان کو کون پڑھے۔ چنانچہ صدر نے سیکرٹری سے کہا۔ کہ مترجم مقرر کر کے تمام مضامین کا ترجمہ کرایا جائے۔ اور مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ یوپی وغیرہ سے مترجم منگائے گئے۔ جنہوں نے ایک ماہ میں ان تمام مضامین کا ترجمہ کیا۔ اور یہ ترجمہ کمیشن کے سامنے پیش ہوا۔

یہ ملاقات غالباً ایک گھنٹہ کے قریب ہوئی۔ مَیں تمام کاغذات دے کر واپس چلا آیا۔ اس کے چند روز بعد کمیشن کے سامنے میری پھر شہادت ہوئی۔ اور ایک گھنٹہ کے قریب یہ شہادت جاری رہی۔ اور مَیں نے بتایا۔ کہ ہم اخبارات والے اس مقدس پیشہ کو تجارت قرار دیتے ہوئے کیا کچھ کرتے ہیں۔ اور ہندوستان کا پریس بجائے ملک کے مفید ہونے کے خود جرائم کرتا ہے۔

مَیں جب "شیر پنجاب" کے متعلق مواد جمع کر رہا تھا۔ تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ یہ تو درست ہے۔ کہ یہ جعلی سرٹیفکیٹ دکھا کر مشتہرین کو دھوکہ دے رہا ہے۔ یہ کس طرح ثابت کیا جائے۔ کہ اس کی اشاعت فی الحقیقت پانچ سو ہے۔ اس مقصد کے لئے مَیں نے اس پریس سے واؤچروں اور بلوں کی اصلیں حاصل کر لیں۔ جس پریس میں یہ اخبار چھپتا تھا۔ اور جس میں تاریخ وار اس کی اشاعت پانچ سو درج تھی۔ چنانچہ بلوں کی یہ فائل بھی مَیں نے کمیشن کے حوالے کر دی۔ اور جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ تو "شیر پنجاب" میں ان تمام الزامات کو رد کرنے کے لئے یا دوسرے الفاظ میں مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے ایک مضمون میرے خلاف شائع کیا گیا۔ اس مضمون کے شائع ہونے ہی مَیں نے سردار جنگ بہادر سنگھ پر توہین کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ دائر ہوا ہی تھا۔ کہ یہ بھاگتے ہوئے میرے دوستوں کے پاس پہنچے۔ اور معاف کر دینے کے لئے سفارشیں شروع ہوئیں۔ کبھی تو مسٹر جمنا داس اختر آ رہے ہیں۔ کبھی سردار لچھمن سنگھ گل کو بھیجا جا رہا ہے۔ اور کبھی گیانی گورمکھ سنگھ کا ٹیلی فون آ رہا ہے۔ اور ایک بار گیانی کرتار سنگھ کا بھی فون آیا۔ کہ آپ ملنا چاہتے ہیں۔ مَیں سب سے انکار کرتا رہا۔ آخر سردار سنت سنگھ سابق ممبر اسمبلی و ایمبیسڈر اسی تھوپیا نے زور دیا۔ تو مَیں انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ ان کے مجھ پر احسانات تھے اور آخر اس شرط پر مقدمہ واپس لینے پر آمادہ ہوا۔ کہ جنگ کا یہ بہادر شیر لکھ کر عدالت میں معافی مانگے۔ اور بطور خرچہ ہرجانہ یا احمقانہ ساڑھے چار سو روپیہ ادا کرے۔ چنانچہ اس نے دو پوسٹ ڈیٹڈ چیک (ایک دو سو روپے کا اور دوسرا اڑھائی سو روپیہ کا) دیئے اور عدالت میں لکھ کر معافی مانگی۔ یہ دونوں چیک سردار سنت سنگھ کے نام کے تھے۔ ان میں سے دو سو روپیہ والا چیک تو کیش ہو گیا۔ اور اس کا روپیہ بھی سردار سنت سنگھ نے مجھے دے دیا۔ اور دوسرا چیک اب تک کیش نہیں ہوا۔ اور یہ چیک اب بھی

Marfat.com

سردار سنت سنگھ کے پاس پڑا ہے۔ اور اس مقدمہ کے واپس لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہلی پیشی والے دن ہی سردار جنگ بہادر سنگھ کے دل پر حملے شروع ہو گئے۔ اور رات کو چار بار ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے رحم آ گیا۔ اور میں نے جنگ کے اس بہادر شیر کا معافی نامہ قبول کر لیا۔ ورنہ یہ سردار صاحب جعلسازی یا حلف دروغی کے جرم میں جیل کی سیر کرتے۔ اور ان کے اخبار کا ایک اشتہار بھی باقی نہ رہتا۔ جس کی بنیاد صرف چار سو بیس اور جعل سازیوں پر ہے۔

حسن اور موسیقی کا اثر

بہت برس ہوئے میں لاہور کے ایک اخبار کو ایڈیٹ کرتا تھا۔ اور میرے ماتحت ایک سکھ سب ایڈیٹر تھے۔ ایک روز شام کو میں سینما جا رہا تھا۔ تو میں نے اس سب ایڈیٹر سے کہا۔ کہ اگر وہ بھی چاہیں۔ تو میرے ساتھ سینما چلیں۔ میرے اس کہنے پر آپ نے جواب دیا۔ کہ انہوں نے کبھی بھی کوئی فلم نہیں دیکھی۔ اور ان کو سینما سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں حیران کہ یہ کیسے انسان ہیں جن کو سینما سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے ان سے متعدد سوال کئے اور انہوں نے جو جوابات دیئے وہ یہ تھے۔

کیا آپ کو موسیقی سے کوئی دلچسپی ہے!

مجھے موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں جب گوردوارہ جاتا ہوں۔ تو وہاں شبد سن لیا کرتا ہوں۔

گورو گرنتھ صاحب کا تو تمام کا تمام کلام ہی راگوں اور راگنیوں میں ہے۔ کیا آپ کو راگ سے یا راگنیوں سے کوئی دلچسپی نہیں!

مجھے فی الحقیقت کسی راگ یا راگنی سے کوئی واقفیت نہیں۔

کیا موسیقی سن کر کبھی آپ کی آنکھیں تر نہیں ہوئیں!

میری ماں کا انتقال ہوا۔ میرے باپ کا انتقال ہوا۔ اور ایک بھائی کا بھی انتقال ہوا۔ مگر میری آنکھوں سے کبھی آنسو نہیں نکلا۔

کیا آپ پر حسن اور خوب صورتی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا!

میں چاہے کتنی بھی خوب صورت عورت کو دیکھوں۔ مجھ پر کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کیا آپ کو اچھی خوشبو سے کوئی دلچسپی ہے!

چاہے میری ناک میں عطر ڈال دیا جائے۔ مجھے خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔

آپ اچھے کھانے میں تو لذت محسوس کرتے ہوں گے!

جیسا مل جائے۔ کھا لیتا ہوں کوئی زیادہ شوق نہیں۔

یہ جواب انہوں نے نہایت سنجیدگی سے دیئے۔ جن میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہ تھی۔ اور مجھے معلوم ہوا۔ کہ خدا نے فی الحقیقت ان کو ان تمام نعمتوں سے محروم پیدا کیا ہے۔ میں نے ان کو بار بار کریدا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہ فی الحقیقت پیدائشی طور پر ہی ڈفر اور ان خدائی نعمتوں سے محروم ہیں۔ سب کچھ سننے کے بعد میں نے صرف یہی کہا۔ کہ

Marfat.com

"آپ اس سرزمین کے لئے کیوں بوجھ ہیں۔ اور جرنلزم یا لٹریچر کو گندہ کرنے کے لئے کیوں زندہ ہیں؟"

میرے اس کہنے پر وہ مسکرا دیئے۔ اور میں حیران تھا کہ دنیا میں انسانوں کے لباس میں کیسے کیسے گدھے بھرے پڑے ہیں۔ جن پر نہ حسن کا اثر ہو سکتا ہے۔ نہ موسیقی کا۔ نہ خوشبو کا۔ اور نہ اچھے لذیذ کھانے کا۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں صرف یہی ایک شخص دیکھا ہے جس پر حسن اور موسیقی کوئی اثر نہ کر سکتی تھی۔ اور اگر اس سب ایڈیٹر کا یہ شعار نیک چلنی قرار دیا جائے۔ تو مجھے دنیا میں اپنے آپ کو ایک بدچلن ترین انسان کہلانے میں کوئی انکار نہیں۔ جو زندگی بھر حسن اور موسیقی سے ہمیشہ متاثر رہا۔ اور اب بھی جب کسی حسین عورت کو دیکھتا ہوں یا اچھا گانا سنتا ہوں۔ تو جسم میں ایک برقی رو سی محسوس کرتا ہوں اور اس سلسلہ میں چند ذاتی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

میں منصوری پہاڑ پر تھا۔ اور وہاں مرحوم مہاراجہ نابھہ بھی مقیم تھے۔ اور ان دنوں چند روز کے لئے مرحوم پنڈت موتی لال نہرو بھی الٰہ آباد سے سیر و تفریح کے لئے منصوری تشریف لائے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو کے منصوری تشریف لانے پر مہاراجہ نابھہ نے آپ سے چند ملاقاتیں کیں اور آپ نے ان ملاقاتوں کے بعد پنڈت جی کے اعزاز میں ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا۔ یہ پارٹی وہاں کے ہوٹل ہیکمن میں دی گئی۔ پارٹی کے لئے ایک ہزار کے قریب دعوتی کارڈ جاری کئے گئے۔ اور ان کارڈوں میں سے ڈیڑھ سو کے قریب کارڈ پنڈت موتی لال جی کو بھی بھیجے گئے۔ تاکہ وہ منصوری آچکے اپنے دوستوں کو بھیج دیں۔ اور پنڈت جی کے دوست بھی پارٹی میں شامل ہوں۔ چنانچہ پنڈت موتی لال جی نے یہ کارڈ اپنی کشمیری برادری کے لوگوں اور دوستوں میں بھیج دیئے۔ ایک تو ایسی پارٹیوں میں ہر شخص اچھے لباس میں شامل ہوتا ہے۔ اور وہاں اعلیٰ سوسائٹی کے لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ اور عورتیں ایسی پارٹیوں میں شامل ہوتے وقت اپنی زیبائش پر تمام قوت صرف کر دیتی ہیں۔ اور ہر عورت چاہتی ہے۔ کہ وہ دوسری عورتوں کے مقابلہ پر زیادہ باعث کشش ہو۔ چنانچہ اس پارٹی میں بھی غالباً ایک سو کے قریب کشمیری پنڈت فیملی کی خواتین شامل ہوئیں۔ کیونکہ پارٹی دینے والے ایک مہاراجہ اور پارٹی جن کے اعزاز میں دی گئی۔ وہ بہت بلند لیڈر اور کشمیری پنڈتوں کی برادری میں بہت ہی ممتاز شخصیت تھے۔ کشمیری پنڈتوں کی قوم کا حسن اور خوب صورتی کے لحاظ سے شائد ہندوستان کی کوئی قوم بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سرخ اور سپید گلاب سا رنگ۔ سیاہ اور لمبے بال۔ پرکشش آنکھیں۔ اور دیکھنے والوں کو موہ لینے والے نقش اس کے علاوہ کشمیری پنڈتوں کی یہ خواتین بہترین لباس میں شامل ہوئیں۔ اور پارٹی کے تمام لوگوں کی نگاہیں ان کے حسن سے مسحور تھیں۔ جب چائے پی جا رہی تھی۔ تو میرے ساتھ میز پر دوسرے دو دوستوں کے ساتھ پنڈت جیون لال مٹو (جو مرحوم راجہ سر دیا کشن کول کے قریبی عزیزوں میں اور کشمیری پنڈت ہیں) بھی بیٹھے تھے۔ اور باتیں ہو رہی تھیں تو پنڈت جیون لال جی نے پارٹی کے متعلق کہا "پارٹی بہت کامیاب رہی۔ شاید ہی کوئی بڑا شخص ایسا ہوگا جو منصوری میں ہو اور اس پارٹی میں شامل نہ ہوا ہو۔ اور لیڈیز کافی تعداد میں شامل ہوئی ہیں"۔ میں نے پنڈت جیون لال جی

Marfat.com

کے اس ارشاد کو سُن کر جو کچھ کہا۔ وہ مجھے اب تک اچھی طرح سے یاد ہے۔ مَیں نے عرض کیا۔

"پنڈت جی کیا پوچھتے ہو۔ اب تو زندگی کی صرف ایک ہی خواہش باقی ہے۔ کہ جب میں مروں تو میرا جنم کسی کشمیری پنڈت کے خاندان میں ہو۔"

میرا یہ جواب سُن کر پنڈت جیون جی اور دوسرے دوست قہقہہ مار کر ہنس پڑے مگر فی الحقیقت میری خواہش یہی ہے۔ کہ اگر مسئلہ تناسخ کے مطابق میرے مرنے کے بعد میرا دوسرا جنم ہو۔ تو میں کشمیری پنڈتوں کے کسی خوب صورت خاندان میں پیدا ہوں۔ اور اگر خدا نے کسی بدصورت خاندان میں پیدا کرنا ہے تو بہتر ہے۔ کہ میرے اُس آئندہ جنم میں مجھے پیدا کرنے والی ماں بانجھ ہی رہے۔ اور مجھے پیدا نہ کرے۔

بہت برس ہوئے۔ اخبار "ریاست" کے جاری ہونے سے پہلے مَیں ایک بار حیدرآباد کے وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد کا سفارشی خط لے کر ملازمت حاصل کرنے کے لئے مرحوم مہاراجہ پرتاب سنگھ والئے کشمیر کے پاس جموّں گیا تھا۔ اور وہاں ایک ہفتہ کے قریب اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں مقیم ہوا۔ اس رشتہ دار کے مکان والی گلی میں سے گذر رہا تھا۔ تو مَیں نے اس گلی کے دوسرے مکان کی ایک ڈیوڑھی میں ڈوگرہ خاندان کی دو خوب صورت عورتوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان کو شاید چند سیکنڈ دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد ان کو پھر دوبارہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ سچ یہ ہے۔ کہ مَیں ان خواتین کی خوب صورتی اور حسن کو آج تک کبھی بھی بھول نہ سکا اور جب بھی ریاست جموّں کے کسی ڈوگرہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ تو فوراً ہی ان دونوں خواتین کا خیال ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ میں جب فیروز پور جیل میں نظر بند تھا۔ تو وہاں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر ڈوگرہ تھے۔ ان سے جب باتیں ہوتیں۔ تو مَیں ان سے کہا کرتا۔ کہ آپ تو بہشت کے رہنے والے ہیں۔ کیونکہ جموّں کی ڈوگرہ قوم بھی اپنی خوب صورتی کے اعتبار سے تمام ملک میں ایک ممتاز ترین پوزیشن رکھتی ہے۔

بہت برس ہوئے میرے ہاں ایک معمر اینگلو انڈین خاتون مسز سیلینڈ آیا کرتی تھیں۔ یہ دہلی کے ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھیں۔ اس خاتون کی عمر غالباً پچاس برس کی ہوگی۔ اور اس کا شوہر ساٹھ ستر برس کا تھا۔ جو ضعیفی اور بیماری کے باعث چل پھر نہ سکتا تھا۔ اور یہ کبھی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ آیا کرتا۔ ان میاں بیوی کی ایک لڑکی جس کا نام مرِل تھا۔ بہت ہی خوب صورت تھی۔ جس کی عمر اس وقت غالباً دس برس کی ہو گی۔ مَیں نے ایسے خوب صورت بچے بہت کم دیکھے ہیں۔ یہ لڑکی بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گئی۔ اور یہ جب بھی آتی۔ تو مَیں اس بچی کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتا۔ اور چونکہ بچوں کی فطرت یہ ہے۔ کہ یہ اشیاء دینے والے اور اخلاص و محبت سے پیش آنے والے لوگوں سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں۔ جب اسے ہمارے ہاں آئے چند روز ہو جاتے۔ تو یہ اپنی ماں کو مجبور کر کے اس کے ساتھ چلی آتی۔ مَیں نے ایک روز اس لڑکی کی ماں اور باپ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ اس لڑکی کو مجھے دے دیں۔ تو مَیں اسے بطور اپنی بیٹی کے اپنے پاس رکھوں گا۔ اور اس کی اعلیٰ تعلیم کے تمام اخراجات برداشت کروں گا۔ مگر یہ لوگ اس پر تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ یہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور ان

Marfat.com

کے ہاں اور کوئی اولاد نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ مسٹر اور مسز سیلینڈ آج کل کہاں ہیں۔ اور کیا یہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے۔ کہ ان کے دلی سے چلے جانے کے بعد مجھے جب بھی ریلوے کے کسی اینگلو انڈین ملازم سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا۔ تو میں ان کے متعلق ضرور دریافت کر لیا کرتا۔ اور مجھے کئی سال بعد معلوم ہوا۔ کہ اس لڑکی کی ایک اینگلو انڈین نوجوان سے شادی ہو گئی ہے۔ جو کہ ریلوے میں کہیں ملازم تھا۔ اور میں نے بہت کوشش کی کہ اس لڑکی اور اس کے شوہر کا کہیں پتہ چلے۔ تو میں ان کو اپنے ہاں دعوت دوں۔ یا ان کو کچھ تحائف ہی بھیجوں۔ مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ اور ہمیشہ افسوس رہا۔ کہ میں اس لڑکی کو اپنی بیٹی نہ بنا سکا۔ اس لڑکی کی خوب صورتی کو بھی میں اب تک بھول نہیں سکا۔

موسیقی کے متعلق ہندوستان میں ریڈیو کے جاری ہونے سے پہلے مجھے راگوں اور راگنیوں سے کوئی زیادہ واقفیت نہ تھی۔ صرف چند راگوں کو سمجھ لیتا۔ اور ان سے محظوظ ہو لیتا۔ اور ان راگوں میں دیس۔ جوگ اور آساوری بھیروں وغیرہ راگ میرے لئے بہت کشش کا باعث تھے۔ ریڈیو کے جاری ہونے کے بعد مجھے موسیقی سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور میں نے دوسرے راگوں سے واقفیت حاصل کر لی جس کا کریڈیٹ صرف ریڈیو کو ہی دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ چند برس تک تو ریڈیو سے ایک عشق کی کیفیت جاری رہی۔ میرا ریڈیو پروگرام کے وقت ہمیشہ کھلا رہتا۔ اور مجھے اس زمانہ میں علم تھا۔ کہ ہندوستان کے کون کون سے ریڈیو اسٹیشن پر اچھے گانے والے ہیں۔ صبح اٹھتے ہی ریڈیو کے رسالہ پر تمام اسٹیشنوں کے اچھے گانے والوں کے پروگرام پر نشان لگا لیتا۔ اور ان کو رات کے گیارہ بجے تک سنتا۔ اور یہ واقعہ ہے۔ کہ میں نے ایک رجسٹر میں ہندوستان کے تمام اچھا گانے والے اور گانے والیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اور ان کے آگے اچھا۔ بہت اچھا اور بہت ہی اچھا کے ریمارک تھے۔ اور ایک بار جب یہ رجسٹر ریڈیو کے کنٹرولر مسٹر احمد شاہ بخاری نے دیکھا۔ تو وہ حیران رہ گئے۔ اور انہوں نے اپنے پروگرام کے انچارج افسروں کو بلا کر یہ رجسٹر دکھاتے ہوئے شریفانہ انداز میں ان کو ملامت کی۔ کہ ان کو تو کچھ پتہ نہیں۔ کہ کون کون سے سٹیشن پر اچھے گانے اور گانے والیاں ہیں۔ مگر دیوان سنگھ نے ان تمام کے نام رجسٹر میں لکھے ہوئے ہیں۔ تاکہ وہ ان تمام کا گانا سننے اور ان کی موسیقی سے محروم نہ ہو۔

میں ریڈیو پر تو اس زمانہ میں تمام ہی اچھے گانے والوں اور گانے والیوں کا پروگرام سنا کرتا تھا۔ اور اب مصروفیت کے زیادہ اور شوق کے کم ہونے پر بھی جب کوئی اچھا گانے والا ہو۔ تو اس کا گانا سنتا ہوں۔ اور میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ کہ میں نے ہندوستان کے نامور ماہر موسیقی جناب وشنو دگمبر کا بھی گانا سنا ہے۔ جب کہ وہ ایک بار دہلی تشریف لائے تھے۔ اور ان کا گانا چرخے والاں کے ایک سکول میں ہوا تھا۔

حسن اور موسیقی کے متعلق میری رائے یہ ہے۔ کہ جو شخص حسن سے متاثر نہیں ہوتا۔ یا وہ کہتا ہے۔ کہ حسن کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ یا تو دنیا کا سب سے بڑا مکار ہے۔ اور یا یہ انسان کے جامہ میں گدھا ہے۔ کیونکہ حسن پرستی کا بدچلنی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اور اس سے دیوتا اور فرشتے بھی متاثر ہوتے

Marfat.com

رہتے۔ اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ کہ ایک بار مہاتما گاندھی ریاست ٹراونکور کے دورہ پر گئے۔ اور وہاں آپ نے مالابار کی عورتوں کے حسن اور صفائی کو دیکھا۔ تو آپ نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا۔ کہ وہاں کی عورتیں اینجل (فرشتے) ہیں۔ اور موسیقی کے متعلق میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ کہ جو شخص کسی راگ کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے لئے اس راگ کا کسی اچھے گانے والے سے سننا آب حیات سے کم نہیں۔ اور جو لوگ موسیقی اور راگوں اور راگنیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کے سامنے راگ کی باریکیاں فی الحقیقت بھینس کے سامنے بین بجانے کے مصداق ہیں۔

گناہوں کے اقرار کا اثر

ایڈیٹر ریاست" کے دوستوں میں ایک صاحب سردار دلیپ سنگھ گل ہیں۔ جو بہت ہی مستعد بہت محنتی۔ بہت ہوشیار۔ بہت دلچسپ اور باعث کشش شخصیت ہیں۔ یہ سردار دلیپ سنگھ گل ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گئے۔ ان کے وہاں جانے کے بعد جنگ شروع ہو گئی۔ اس زمانہ امریکہ میں مرحوم لالہ ہردیال کی انقلابی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا تھا۔ اس تحریک میں امریکہ میں رہنے والے تمام ہندو اور سکھ شامل ہو چکے تھے۔ اور تحریک بعد میں غدر پارٹی کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اور اس تحریک کے سلسلہ میں ہی سردار گوردت سنگھ ایک جاپانی جہاز کو ماگاٹا مارو لے کر کینیڈا گئے۔ چنانچہ سردار دلیپ سنگھ گل بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور جب جنگ کا زیادہ زور ہوا۔ تو آپ جرمنی کے بادشاہ قیصر ولیم کی دعوت پر دوسرے ہندوستانیوں کے ساتھ جرمنی چلے گئے۔

سردار دلیپ سنگھ نے جرمنی جانے کے بعد اس عالمگیر جنگ میں بہت کافی حصہ لیا۔ اور یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ٹرکی کے انقلاب پسند لیڈر انور پاشا کو ٹرکی سے برلن لے جانے والے یہ سردار دلیپ سنگھ ہی تھے۔ اور جب انور پاشا برلن گئے۔ تو اسی ہوائی جہاز میں سردار دلیپ سنگھ ان کے ہمراہ تھے۔ اس جنگ عظیم میں جرمنی اور ٹرکی دونوں کو شکست ہوئی۔ اور انگریز فتح یاب ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سردار دلیپ سنگھ جرمنی میں ہی رہنے پر مجبور ہوئے۔ کیونکہ انگلستان یا ہندوستان آتے۔ تو یہاں انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں آپ کو یقیناً پھانسی کی سزا دی جاتی۔ جیسے کہ اس زمانہ میں غدر پارٹی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں سکھوں اور ہندوؤں کو دی گئی۔

سردار دلیپ سنگھ کئی برس تک جرمنی میں رہے۔ اور آپ کے قیام کے زمانہ میں وہاں آپ کے تعلقات کئی جوان فیملیز میں ہو گئے۔ ان خاندانوں میں سے ایک خاندان کی خواتین سے بھی آپ کے گہرے مراسم ہو گئے۔ اور ان خواتین میں ایک لڑکی سے تو آپ کے گہرے محبت کے تعلقات بھی ہو گئے۔ جس کا نتیجہ بعد میں اس لڑکی سے آپ کی شادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

سردار دلیپ سنگھ گل کی شادی سے پہلے جب آپ کی ہونے والی بیوی سے تعلقات زیادہ گہرے ہو گئے

Marfat.com

تو اس لڑکی نے ہندوستان کے متعلق بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ آپ ہندوستان کے متعلق آپ سے اکثر سوالات پوچھا کرتیں۔ اور ایک روز بات چیت ہو رہی تھی۔ تو اس خاتون اور سردار دلیپ سنگھ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

خاتون: یہ جو آپ کا نام سردار دلیپ سنگھ گل ہے۔ اسکے کیا معنی ہیں؟

سردار دلیپ سنگھ:۔ سردار کے معنی رئیس یا لیڈر کے ہیں۔ جیسے برطانیہ میں لارڈ یا کونٹ ہوتے ہیں۔ دلیپ سنگھ میرا نام ہے۔ اور گل خاندانی لقب ہے۔

خاتون:۔ گویا کہ ہندوستان میں آپ کی پوزیشن ایک لارڈ یا کونٹ کی سی ہے۔

سردار دلیپ سنگھ:۔ ہاں۔

یورپ اور امریکہ میں ہندوستانی طلباء عام طور پر اپنے خاندان اور اپنی وجاہت کے متعلق بہت مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اور سردار دلیپ سنگھ گل نے بھی لارڈ یا کونٹ کے متعلق سوال کے جواب میں ہاں کہہ دیا۔ جو بعد میں ان کے لئے بہت ہی پریشانی کا باعث ہوا۔

جب اس خاتون نے یہ محسوس کیا۔ سردار دلیپ سنگھ ہندوستان کے لارڈوں کے خاندان میں سے ہیں۔ اور یہ کسی نہ کسی روز واپس ہندوستان جائیں گے۔ تو اس خاتون نے شادی کے متعلق سردار دلیپ سنگھ کی درخواست کو فوراً منظور کر لیا۔ شادی ہو گئی۔ اور اس خاتون نے اپنے نام کے ساتھ کونٹیس دلیپ سنگھ (یعنی لارڈ دلیپ سنگھ کی بیوی) لکھنا شروع کر دیا۔ اور یہ آئندہ ہندوستان جانے۔ وہاں ہاتھیوں پر سوار ہو کر شکار کھیلنے۔ دربار منعقد کرنے اور محلات میں زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھنے لگی چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ اس خاتون کی ایک حقیقی بہن کی شادی ایک امیر شخص سے ہو چکی تھی۔ جس کے ہاں موٹر بھی تھی۔ مسز دلیپ سنگھ کسی معاملہ میں اپنی بہن سے ناراض ہوئی۔ تو اس نے اپنی بہن سے کہا۔

"تمہارے پاس ایک موٹر ہے۔ ہندوستان میں ہمارے ہاں درجنوں موٹریں، ہاتھی اور گھوڑے ہیں۔ چند روز کی تکلیف ہے۔ ہم لوگ جب ہندوستان جائیں گے۔ تو ہماری زندگی تمہارے لئے قابل رشک ہوگی۔"

جب اس شادی کو ہوئے چند برس گذر گئے۔ اور جنگ ختم ہونے کے بعد حالات قطعی بدل چکے تھے۔ تو مرحوم مہاراجہ کپورتھلہ سیر کے لئے فرانس سے جرمنی گئے۔ سردار دلیپ سنگھ نے اخبارات میں پڑھا۔ کہ ہندوستان کے مہاراجہ کپورتھلہ سیر کے لئے جرمنی آئے ہیں۔ اور برلن کے فلاں ہوٹل میں مقیم ہیں۔ تو مہاراجہ سے ملنے کے لئے ان کے ہوٹل میں گئے۔ مہاراجہ سے ملے۔ بات چیت ہوئی۔ تو سردار دلیپ سنگھ نے مہاراجہ سے درخواست کی۔ کہ آپ برٹش گورنمنٹ پر اپنے اثرات استعمال کرتے ہوئے ان کو ہندوستان جانے کی اجازت لے دیں۔ مہاراجہ نے وعدہ کر لیا۔ مہاراجہ کا برٹش گورنمنٹ پر کافی اثر تھا۔ آپ لندن گئے۔ تو وہاں آپ نے سردار دلیپ سنگھ کے متعلق وزیر ہند سے کہا اور وزیر ہند

Marfat.com

اس شرط پر سردار دلیپ سنگھ کو ہندوستان جانے کی اجازت دینے پر تیار ہوئے۔ کہ مہاراجہ کپورتھلہ ان کی ضمانت دیں۔ اور سردار دلیپ سنگھ ہندوستان پہنچنے کے بعد برٹش گورنمنٹ کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہ لیں۔ چنانچہ مہاراجہ کی ضمانت پر سردار دلیپ سنگھ گل ہندوستان آ گئے۔ اور یہاں آپ نے جرمنی کی ایک بہت بڑی پرنٹنگ کمپنی کی ایجنسی لے لی۔ اور چھپائی کے آرڈر لے کر جرمنی میں بھیجنے شروع کر دیئے۔ جس سے ان کو تین چار سو روپیہ ماہوار آمدنی ہو جاتی۔ اور یہ آسودگی کے ساتھ اپنا گزارہ کر لیتے۔

سردار دلیپ سنگھ جب ہندوستان پہنچ گئے۔ اور یہاں انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ تو ان کی بیوی نے برلن سے تقاضے شروع کئے۔ جس میں ان کو بھی ہندوستان بلا لینے کا مطالبہ کیا جاتا۔ یہ تقاضے دو برس تک جاری رہے۔ اور سردار دلیپ سنگھ ان کو ٹالتے رہے۔ کہ ابھی گرمی زیادہ ہے اب سردی کا زور ہے۔ اور اب بارش کے زیادہ ہونے کے باعث سیلاب آ رہے ہیں۔ وغیرہ کیونکہ آپ محسوس کرتے تھے۔ کہ یہاں تو تین چار سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے اور ادھر ان کی بیوی اپنی ریاست یا جاگیر میں جانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ جہاں کہ موٹریں، ہاتھی گھوڑے ہوں گے۔ سردار دلیپ سنگھ دو برس تک اپنی بیوی کو ٹالتے رہے۔ اور آخر بیوی نے تنگ آ کر ہندوستان آنے کے لئے جہاز کا ٹکٹ لے لیا۔ اور تار دیا۔ کہ وہ فلاں جہاز میں فلاں روز بمبئی پہنچ رہی ہیں۔

سردار دلیپ سنگھ کو جب یہ تار پہنچا۔ تو آپ بے حد پریشان ہوئے۔ دہلی کے معمولی سے ہوٹل میں مقیم تھے۔ آپ یہ تار لے کر میرے پاس دفتر "ریاست" میں پہنچے۔ اور آپ نے بتایا۔ کہ آپ اپنی بیوی کو کیا سبز باغ دکھاتے رہے۔ دو برس تک ٹالنے کے بعد اب بیوی مزید انتظار نہ کر سکتی تھی۔ وہ جرمنی سے ہندوستان آنے والے جہاز پر سوار ہو چکی ہیں۔ اور فلاں روز بمبئی پہنچ رہی ہیں۔ اور انہوں نے مجھ سے مشورہ لینا چاہا۔ کہ ان کو اب اس پوزیشن میں کیا کرنا چاہیے۔

میں نے جب تمام حالات سُنے۔ تو میں نے محسوس کیا کہ ان بیچاروں کی پوزیشن بے حد نازک ہے۔ اور ایک تو میرے دل میں ان کے لئے رحم پیدا ہوا۔ اور دوسرے ان کے لارڈ دلیپ سنگھ ہونے کے واقعہ کو سن کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ جب یہ تمام حالات بیان کر چکے۔ تو میں نے ان تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد ان کو مشورہ دیا۔ کہ یہ اپنے اندر کیتھولک عیسائیوں کی طرح اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی جرأت پیدا کریں۔ (عیسائیوں کے ایک فرقہ کیتھولک میں یہ بہت بڑی قابل تقلید بلندی ہے۔ کہ جب ان سے کوئی گناہ سرزد ہو۔ تو یہ اگلی صبح گرجا میں جا کر پادری کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کر لیتے ہیں۔ تاکہ ان کا دل گناہ کی غلاظت سے پاک ہو جائے۔ اور اس میں طہارت پیدا ہو) اور جب اُن کی بیوی بمبئی پہنچے۔ تو بغیر کوئی بات چھپائے اپنی بیوی سے تمام اصل حالات بیان کر دیں۔ اور اپنے جھوٹ بولنے یا دھوکہ دینے کے متعلق بیوی سے معافی چاہیں۔ اور اگر انہوں نے اپنی بیوی سے کوئی بات بھی چھپائی۔ تو یہ ان کے لئے آئندہ بہت بڑی مصائب و مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔ مسٹر

Marfat.com

دلیپ سنگھ گل بہت ہوشیار ہیں۔ آپ میری اس رائے پر متفق ہو گئے۔ اور یہ فیصلہ ہوا۔ کہ انکی بیوی جب بمبئی پہنچیں۔ تو یہ تمام حالات اپنی بیوی سے کہہ دیں۔ اور یہ بھی بتا دیں۔ کہ جب اس خاتون کی شادی سردار دلیپ سنگھ سے ہوئی۔ تو یہ کنوارے نہ تھے۔ اور نہ صرف یہ شادی شدہ تھے۔ بلکہ جب یہ امریکہ تعلیم کے لئے گئے۔ تو ان کا ایک بچہ بھی موجود تھا۔ اور اب اس بچہ کے کئی بچے یعنی سردار دلیپ سنگھ کے پوتے اور پوتیاں بھی موجود ہیں۔

میرے مشورہ پر غور کرنے کے بعد سردار دلیپ سنگھ چلے گئے۔ اور میں نے ان سے کہا۔ کہ جب یہ اپنی بیوی کے ساتھ بمبئی سے روانہ ہوں۔ تو مجھے ایک تار کے ذریعے اطلاع دیں، تاکہ میں ان کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کر سکوں۔ اور ایسا نہ ہو۔ کہ یہ خاتون اپنے شوہر کو بالکل یتیم سمجھیں۔ سردار دلیپ سنگھ نے اس کے بعد فوراً کناٹ پلیس میں سردار صوبھا سنگھ کی بلڈنگ میں دو کمرے کرایہ پر لئے۔ اس زمانہ میں نئی دہلی میں مکانات کا کرایہ بہت کم تھا۔ یہ کمرے آپ نے چالیس روپیہ ماہوار پر لئے۔ کرایہ پر ہی فرنیچر لیا۔ اور اس مکان کو سجا کر آپ اپنی بیوی کو لینے بمبئی چلے گئے۔

یہ خاتون یعنی "کونٹیس دلیپ سنگھ" جب بمبئی پہنچیں۔ تو سردار دلیپ سنگھ ان کو ایک ہوٹل میں لے گئے۔ اور ہوٹل میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔ کہ وہ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ بیوی جب متوجہ ہوئیں۔ تو آپ نے شروع سے لے کر آخر تک کے تمام حالات بغیر کچھ چھپائے بیان کر دیئے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس خاتون کے دل پر ان تمام حالات کے سننے کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ اور آنکھ کھل جانے پر پچھلے خوابوں کے متعلق اس بیچاری کی کیا کیفیت ہو گی۔ مگر یہ خاتون بہت بہادر۔ بہت شریف۔ بہت نیک اور جسمانی لحاظ سے بہت صحت مند تھیں۔ تمام حالات سننے کے بعد یہ آئندہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اور آپ نے اپنے دل سے اپنے شوہر کی تمام غلطیوں کو معاف کر دیا۔

اس سے اگلے روز میرے پاس تار پہنچا۔ کہ سردار دلیپ سنگھ معہ اپنی بیوی کے شام کو فرنٹیئر میل میں نئی دہلی کے سٹیشن پر پہنچ رہے ہیں۔ میں نے فوراً اپنی کار کے علاوہ دو تین دوستوں کی کاروں کا انتظام کیا۔ پھولوں کے گلدستے اور ہار منگائے اور چند دوستوں کو لے کر میں گاڑی کے وقت ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ یہ جوڑا جب گاڑی سے اترا۔ تو ہم نے ان کا ایسا ہی شاندار استقبال کیا۔ جیسے نئی شادی ہونے والے دولہا اور دلہن کا کیا جاتا ہے۔ ان کے گلے میں ہار پہنائے گئے۔ اور موٹروں میں "برات" کناٹ پلیس کے اس مکان پر پہنچی۔ جو مکان سردار دلیپ سنگھ نے کرایہ پر لیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد سامان رکھوایا گیا۔ اور میاں بیوی کو ہم اکیلے وہاں چھوڑ کر اس طرح ہی واپس چلے آئے۔ جس طرح شادی کے بعد پہلی رات دولہا کی رشتہ دار خواتین دولہا اور دلہن کو ایک کمرہ میں الگ بھیج دیتی ہیں۔

اگلے روز میں ان کے ہاں گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ اور ان کی بیوی سے باتیں کرتا رہا۔ یہ خاتون ہندوستانی یا انگریزی زبان سے قطعاً ناواقف تھیں۔ اور میں جرمن زبان نہ جانتا تھا۔ سردار دلیپ سنگھ انٹرپریٹر یعنی مترجم کے فرائض ادا کرتے رہے۔ اور میں ان کو رات کے کھانے پر آنے کی دعوت دے کر واپس چلا آیا۔ یہ جوڑا رات کو کھانے پر میرے ہاں آیا۔ چند اور دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ کھانے پر قیصر ولیم (شہنشاہ جرمنی) کی بہادری اور جرمنی کے دوسرے

Marfat.com

حالات کا ذکر ہوتا رہا۔ اور کھانے کے بعد جب یہ جوڑا اپنے گھر کے لئے روانہ ہوا۔ تو میں نے مسز دلیپ سنگھ کو جاپانی کا ایک ٹی سیٹ دیا۔ جو میں نے ان کے لئے اس روز ہی خریدا تھا۔ یہ ٹی سیٹ دے کر بہت خوش ہوئیں۔ کیونکہ عورت کو اگر کوئی شے نذر کی جائے۔ تو اس کا اس پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اس سے اگلے روز ان کی دعوت پر میں ان کے ہاں چائے پر گیا۔ بہت دیر تک جرمنی اور ہندوستان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس خاتون کے دل پر میرے متعلق بہت اثر تھا۔ کیونکہ ایک تو سردار دلیپ سنگھ نے ان سے اخبار "ریاست" کے متعلق تمام حالات بیان کر دیئے تھے۔ اور دوسرے یہ بھی بتا دیا تھا۔ کہ دیوان سنگھ کے کہنے پر ہی ان کے شوہر نے ان کے پاس اپنی پچھلی تمام غلطیوں کا اقرار کیا۔ چائے سے جب ہم لوگ فارغ ہوئے۔ تو اس خاتون نے مجھے نپولین کا ایک چھوٹا سا بہت خوب صورت بت یہ کہہ کر دیا۔

"آپ نپولین کی طرح بہادر ہیں۔ جو ہندوستان کے مطلق العنان راجوں اور نوابوں کے حملوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو نپولین کا بت ہی پیش کرتی ہوں"۔

میں یہ خوب صورت بت لے کر واپس اپنے مکان پر چلا آیا۔ اور اس کے بعد یہ لوگ اکثر میرے ہاں آتے۔ اور میں ان کے ہاں جاتا۔ چند ماہ کے بعد یہ خاتون جرمنی واپس چلی گئیں۔ اور اپنے ساتھ اپنا ایک پوتا (سردار دلیپ سنگھ کی پہلی ہندوستانی بیوی کے بیٹے کا بیٹا) بھی لے گئیں۔ کیونکہ ان کے اپنے بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس بچہ کی انہوں نے وہاں ہی پرورش کی۔ اور تعلیم دی۔ اب یہ بڑا جوان ہے۔ پہلے یہ جرمنی کی ایک فرم میں انجنیئر تھا۔ اب یہ نئی دہلی کی ایک فرم میں غالباً ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہے اور جرمنی کی ایک لڑکی سے ہی شادی کرنے والا ہے۔ تاکہ انڈو جرمن اتحاد کا خاندانی سلسلہ قائم رہے۔

مسز دلیپ سنگھ چند برس ہوئے پھر ہندوستان آئیں۔ اور یہاں یہ ہیلی روڈ پر ایک کوٹھی کے دو تین کمروں میں اپنے شوہر کے ساتھ رہا کرتیں۔ آپ نے وہاں بھی مجھے کئی بار یہ کہہ کر کھانے پر مدعو کیا۔ کہ یہ کھانا خود پکائیں گی۔ یہ کھانا فی الحقیقت بہت اچھا پکاتی تھیں۔

یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد آپ ٹیش کی بیماری میں مبتلا ہوگئیں۔ اور اس بیماری میں ہی آپ کا اروِن ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ جس کا سردار دلیپ سنگھ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ اور اب بھی سردار دلیپ سنگھ جب کبھی آتے ہیں۔ تو اس خاتون کی نیکی۔ شرافت۔ اور شوہر پرستی کا ذکر ہو جاتا ہے۔

نفرت اور عداوت میں فرق

میرے وطن حافظ آباد (ضلع گوجرانوالہ) کے ایک ایڈووکیٹ ایک صاحب رائے صاحب لالہ کشن داس چوپڑہ ہیں۔ بہت مستعد، بہت ہوشیار، بہت ملنسار، بہت دلچسپ اور اگر کھڑے ہونے کے لئے جگہ مل جائے۔ تو بیٹھنے کے لئے خود جگہ بنا لینے والوں میں سے ہیں۔ آپ نے جب ایل ایل۔ بی کا امتحان پاس کر لیا تو گوجرانوالہ میں وکالت شروع کی۔ اور جس طرح آج کل نئے وکیلوں کی پریکٹس نہیں چلتی۔ آپ کو بھی اپنی وکالت میں کامیابی نہ ہوئی۔ یعنی صبح دس بجے کچہری چلے جاتے۔ اور شام کو خالی ہاتھ واپس آجاتے۔ آپ اس ناکامی سے تنگ آ

Marfat.com

گئے۔ تو مجھے ایک روز حافظ آباد (جب کہ میں نابھ کی ملازمت سے الگ ہوا۔ اور دو ماہ کے قریب حافظ آباد رہا) ملے اور تعارف ہوا۔ میں اس سے پہلے ان کو نہ جانتا تھا۔ تعارف سے معلوم ہوا۔ کہ وہ میرے کئی عزیزوں کے دوست ہیں۔ اور بعض کے ہم جماعت یا کالج فیلو بھی ہیں۔ اس کے بعد یہ مجھے اکثر ملتے رہے۔ اور دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ حافظ آباد کے اس قیام کے بعد میں نے دہلی سے "ریاست" جاری کیا۔ تو یہ کبھی کبھی دہلی بھی تشریف لے آیا کرتے۔ اور تعلقات میں کافی اضافہ ہو گیا۔ "ریاست" کو جب کامیابی نصیب ہوئی۔ اور اس کے اثرات میں اضافہ ہوا۔ تو آپ نے ایک روز خواہش ظاہر کی۔ کہ آپ کو کسی ریاست میں ملازمت دلوا دی جائے۔ کیونکہ آپ وکالت کی پریکٹس کی ناکامی سے تنگ آچکے تھے۔ ان کی اس خواہش پر میں نے ریاست دتیا کے وزیراعظم خان بہادر قاضی سر عزیز الدین احمد سے ذکر کیا۔ قاضی صاحب بہت وضع دار اور محبت کے انسان تھے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ آپ لالہ بشن داس کو تو فی الحال ریاست دتیا میں بغیر مہاراجہ سے منظوری حاصل کئے خود ہی ساٹھ روپیہ ماہوار کا تحصیلدار مقرر کر دیتے ہیں۔ اور تھوڑے عرصہ کے اندر ہی وہ ان کو کوئی اچھی جگہ دے دیں گے۔ میں نے قاضی صاحب کے اس جواب کا لالہ بشن داس سے ذکر کیا۔ لالہ بشن داس نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ اور ساٹھ روپیہ ماہوار پر ریاست دتیا میں تحصیلدار مقرر ہو گئے۔

قاضی صاحب بہت دور اندیش اور محتاط شخصیت تھے۔ ادھر تو آپ نے لالہ بشن داس چوپڑہ کی تقرری کا حکم جاری کر دیا۔ اور ادھر پولٹیکل ایجنٹ کو لکھا۔ کہ آپ گوجرانوالہ کے ایک صاحب لالہ بشن داس چوپڑہ بی۔ اے۔ ایل ایل بی کو تحصیلدار مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا گورنمنٹ کو ان کی تقرری پر سیاسی اعتبار سے کوئی اعتراض تو نہیں۔ (قاضی صاحب ہر نئے ملازم کے متعلق اس طرح ہی گورنمنٹ کو لکھ دیا کرتے تھے۔ تاکہ ایسا نہ ہو۔ کہ کوئی شخص پولٹیکل چال چلن کے اعتبار سے قابلِ اعتراض ہو۔ اور گورنمنٹ اس کی تقرری کو ناپسند کرتی ہو) پولٹیکل ایجنٹ نے قاضی صاحب کا یہ خط پنجاب گورنمنٹ کے چیف سیکرٹری کو بھیجا۔ چیف سیکرٹری نے تحقیقات کے لئے گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر کو۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ خط سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مقامی سی آئی ڈی کو یہ خط بھیجا۔ تو سی آئی ڈی نے لالہ بشن داس کے متعلق تحقیقات کرنے کے بعد رپورٹ کی۔ کہ ان کے سیاسی چال چلن کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے۔ یہ صاحب بے ضرر اور سیاسیات سے قطعی بے تعلق ہیں۔ صرف یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ ان کے ذاتی تعلقات دہلی کے ایک ایجی ٹیٹر دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اور نہ ان کی ملازمت پر کوئی اعتراض ہے۔ تحقیقات کا نتیجہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ۔ ڈپٹی کمشنر نے چیف سیکرٹری پنجاب گورنمنٹ کو اور وہاں سے پولٹیکل ایجنٹ کی معرفت قاضی صاحب کے پاس بھیجا۔ تو قاضی صاحب اس رپورٹ کو دیکھ کر ہنس دیئے کیونکہ اس رپورٹ میں لکھا تھا۔ کہ لالہ بشن داس کے خلاف صرف ایک ہی اعتراض ہے۔ کہ یہ دیوان سنگھ

Marfat.com

کا دوست ہے۔ اور ادھر صرف اسی واحد کوالیفیکیشن کے باعث قاضی صاحب لالہ بشن داس کو دتیا میں ملازمت دی۔ چنانچہ قاضی صاحب چندروز کے بعد دہلی آئے۔ تو انھوں نے یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا۔

لالہ بشن داس کو ریاست دتیا میں ملازم ہوئے غالباً دو برس ہوئے تھے۔ کہ ایڈیٹر "ریاست" پر نواب بھوپال نے پرنسس پروٹیکشن ایکٹ کے ماتحت ہوشنگ آباد میں مقدمہ قائم کیا۔ اس مقدمہ میں مرحوم قاضی صاحب نہ صرف بہت دلچسپی لیتے رہے۔ بلکہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کی ہر ممکن ذریعہ سے امداد بھی کرتے رہے۔ اور آپ نے لالہ بشن داس کو اجازت دے دی۔ کہ وہ مقدمہ کے سلسلہ میں جب بھی جائیں۔ بغیر رخصت حاصل کئے دہلی یا کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی ضرورت ہوتی۔ لالہ بشن داس دہلی آ جاتے۔ اور ایک بار آپ ہوشنگ آباد کے علاوہ ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ سکھر سندھ (جہاں کہ ریاست خیر پور میرس کے انگریز وزیر اعظم نے مقدمہ دائر کر دیا تھا) بھی گئے۔ کیونکہ اس زمانہ میں "ریاست" عروج پر تھا۔ اور سفر کے اخراجات کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ لالہ بشن داس کے مقدمات کے زمانہ میں دہلی آنے کے باعث تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور ان کی پوزیشن ایک فیملی ممبر کی سی ہو گئی تھی یعنی آپ جب کبھی دتیا سے شمالی ہندوستان کی طرف کسی جگہ جاتے۔ تو ایک دو روز دہلی میں ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں ضرور قیام کرتے۔ اور اگر کچھ عرصہ آنے کا اتفاق نہ ہوتا۔ تو ملنے کے لئے خاص طور پر دہلی آ جاتے۔

لالہ بشن داس جو پڑھ کو ریاست دتیا میں تحصیلدار ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے۔ تو آپ وہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنا دیئے گئے۔ اور ایک سال کے بعد آپ دتیا ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ یعنی آپ ڈیڑھ دو برس کے اندر دتیا میں آنریبل چیف جسٹس ہائی کورٹ دتیا تھے۔ اور ان کی اس ترقی میں گو ایڈیٹر "ریاست" کا بھی ہاتھ تھا۔ اور قاضی صاحب کی مہربانی سے یہ سب کچھ ہوا۔ مگر اس میں زیادہ حصہ لالہ بشن داس کی اپنی ہوشیاری اور ملنساری کا تھا۔ کیونکہ آپ کو اگر کسی جگہ کھڑے ہونے کے لئے جگہ مل جائے۔ تو وہاں بیٹھنے کے لئے آپ خود جگہ بنا لیا کرتے ہیں۔

ریاست دتیا میں آپ کو ملازم ہوئے چند برس ہوئے تھے۔ تو قاضی صاحب کی صحت نے جواب دینا شروع کیا۔ کیونکہ آپ کی عمر بھی کافی تھی۔ قاضی صاحب طبعاً اور فطرتاً بے حد وضعدار دوست پرست اور خویش پرور انسان تھے۔ آپ نے جب یہ خیال کیا۔ کہ آپ کی صحت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور کمزوری میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ تو آپ نے اپنے تمام پروردوں کے لئے نیا اور مستقل انتظام شروع کیا تاکہ ان کو اپنی زندگی میں تکلیف اور روزگار کی تلاش میں پریشانی نہ ہو۔ کیونکہ دتیا کے مہاراجہ ہونق کلاس کے تھے۔ جو دن رات شراب میں بدمست رہتے۔ اور کچھ اعتبار نہ تھا۔ کہ یہ اپنے کس ملازم کو کب موقوف کر دیں۔ چنانچہ ان جذبات کے تحت ہی آپ نے لالہ بشن داس کی بھی اپنے گہرے دوست مہاراجہ بیکانیر سے سفارش کی۔ اور مہاراجہ نے لالہ بشن داس کو ریاست بیکانیر میں فنانشل کمشنر مقرر کر دیا۔ اور لالہ

Marfat.com

بشن داس نے وہاں اپنی کوششوں اور سفارشوں سے "رائے صاحب" کا خطاب بھی حاصل کیا۔ یعنی وہاں آپ رائے صاحب لالہ بشن داس چوپڑہ فنانشل کمشنر تھے۔

لالہ بشن داس کا بیکانیر جانے کے بعد بھی ایڈیٹر "ریاست" کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات کا سلسلہ جاری رہا۔ اور جب کبھی بیکانیر سے گوالیار یا کسی دوسری جگہ جاتے۔ تو ایک دو روز دہلی میں ضرور قیام کرتے۔ اور یہاں ان کے تعلقات ایڈیٹر "ریاست" کے دوستوں یعنی لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر "وطن" وغیرہ سے بھی ہو گئے۔ کیونکہ یہ دوست اکثر دفتر "ریاست" میں تشریف لاتے۔ جہاں کہ لالہ بشن داس کی ان سے ملاقات ہوتی۔ اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

ایڈیٹر "ریاست" پر جعلی نوٹوں کے اپنے قبضہ میں رکھنے کا مقدمہ چل رہا تھا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ اور بے حد مالی پریشانیاں تھیں۔ اس زمانہ میں لالہ دیس راج پاہوہ دہلی میں سب جج تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" ان سے قریب قریب ہر روز ملتا۔ کیونکہ ایک تو لالہ دیس راج رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس آئی سپیشلسٹ کے بھتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ زندگی بھر گہرے نیازمندانہ تعلقات رہے۔ اور دوسرے لالہ دیس راج کی والدہ کو ایڈیٹر "ریاست" کی والدہ اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز سمجھتی تھیں۔ لالہ بشن داس کے بھی لالہ دیس راج کیساتھ گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ کیونکہ یہ دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے۔ اور تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی ان کے مراسم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ایک روز لالہ بشن داس چوپڑہ بیکانیر سے کسی سرکاری کام کے لئے گوالیار گئے۔ تو آپ نے ہمیشہ کی طرح دو روز کے لئے ایڈیٹر "ریاست" کے ہاں قیام کیا۔ اور اس قیام کے دوران جب آپ لالہ دیس راج پاہوہ سے بھی ملے۔ تو لالہ دیس راج نے آپ سے رات کو کھانے پر آنے کے لئے کہا۔ اور ایڈیٹر "ریاست" کو بھی ٹیلی فون کیا۔ کہ وہ رات کو ان کے ہاں کھانے پر آئے۔ کیونکہ لالہ بشن داس کی دعوت ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے ہاں تو ضرور کہہ دیا۔ مگر مصروفیت کے باعث وہ جا نہ سکا۔ لالہ بشن داس نے اس روز مقدمہ کے متعلق بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ تو ایڈیٹر "ریاست" نے اپنی مالی پریشانیوں اور مقدمہ کے مصارف کا ذکر کرتے ہوئے لالہ بشن داس سے کہا۔ کہ اگر ممکن ہو۔ تو آپ ایڈیٹر "ریاست" کو پانچ سو روپیہ بطور قرض دیں۔ جس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ کہ آپ کے پاس روپیہ تو کافی تھا۔ مگر آپ نے ابھی حال میں ایک جائیداد خرید لی ہے۔ اس لئے آپ یہ قرض نہیں دے سکتے۔ آپ کے اس انکار کو ایڈیٹر "ریاست" نے قطعی محسوس نہ کیا۔ کیونکہ ہر شخص کے اپنے حالات ہیں۔ اگر لالہ بشن داس روپیہ نہیں دے سکتے۔ تو مجبور ہیں۔ ان کے اس انکار سے دل میں میل کیوں آنے دی جائے۔ دن کو یہ باتیں ہوتی رہیں۔ اور رات کو لالہ بشن داس کھانے پر لالہ دیس راج کے ہاں چلے گئے۔ مگر میں نہ جا سکا۔ کیونکہ ایک تو مصروف تھا۔ اور دوسرے ایک دوست ملنے کے لئے آنے والے تھے۔ لالہ بشن داس لالہ دیس راج کے ہاں کھانا کھانے کے بعد

Marfat.com

واپس آ گئے۔ اور ہم رات کو دیر تک باتیں کرنے کے بعد سو گئے۔ اور اگلی صبح لالہ بشن داس گوالیار چلے گئے۔

دو یا تین روز بعد ایڈیٹر "ریاست" لالہ دیس راج سے ملا۔ اور باتوں باتوں میں لالہ بشن داس کا ذکر چل پڑا۔ تو لالہ دیس راج نے بتایا۔ کہ لالہ بشن داس نے اپنی ملازمت میں بہت کافی روپیہ پیدا کیا ہے۔ میں نے کچھ زیادہ نہ کر پایا۔ تو آپ نے بتایا۔ کہ کھانے پر لالہ بشن داس نے لالہ دیس راج کی مالی حالت دریافت کی تھی۔ تو لالہ دیس راج نے جواب دیا تھا۔ کہ آٹھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ کچھ روپیہ انشورنس میں چلا جاتا ہے۔ کچھ بچوں کی تعلیم وغیرہ میں اور اس آٹھ سو روپیہ میں سے ایک پیسہ نہیں بچتا۔ اور آپ نے لاہور میں اپنی کوٹھی بنانے کے لئے اپنے خسر سردار بہادر پریم سنگھ ممبر پبلک سروس کمیشن سے چوبیس ہزار روپیہ قرض لیا تھا۔ اس میں سے بھی آپ ایک پیسہ اب تک واپس ادا نہیں کر سکے۔ اور لالہ دیس راج نے جب باتوں باتوں میں اپنی یہ مشکلات بیان کیں۔ تو لالہ بشن داس نے لالہ دیس راج سے کہا۔ کہ ان کے پاس پچیس تیس ہزار روپیہ نقد موجود ہے اگر لالہ دیس راج چاہیں۔ تو وہ روپیہ لے سکتے ہیں۔ اور لالہ بشن داس کی اس پیش کش کے جواب میں لالہ دیس راج نے کہا۔ کہ ان کو ضرورت نہیں۔ کیونکہ سردار بہادر پریم سنگھ کوئی غیر نہیں ہیں جب کبھی ممکن ہوگا۔ آپ ان کا روپیہ واپس کر دینگے۔

میں نے لالہ دیس راج کے منہ سے جب یہ سنا۔ کہ لالہ بشن داس چوپڑہ نے لالہ دیس راج کو بیس پچیس ہزار روپیہ دینے کی پیش کش کی ہے۔ تو میں حیران رہ گیا۔ کہ دن کے وقت تو میں نے لالہ بشن داس سے پانچ سو روپیہ قرض مانگا۔ اور آپ نے انکار کر دیا۔ اور کہا۔ کہ وہ اپنا تمام روپیہ جائیداد خریدنے میں صرف کر چکے ہیں۔ اور رات کو یہ لالہ دیس راج کو پچیس تیس ہزار روپیہ بغیر لالہ دیس راج کی خواہش کے ان کو دینے کے لئے تیار تھے۔ میں یہ سن کر واپس آ گیا۔ اور میں نے لالہ دیس راج سے کچھ نہ کہا۔ رات کو سوچتا رہا۔ کہ گو دیوان سنگھ اور بشن داس کے حقیقی بھائیوں جیسے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ مگر چونکہ دیوان سنگھ مقدمہ اور مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ اس لئے لالہ بشن داس کی نگاہوں میں اس کی قیمت آج پانچ سو روپیہ قرضہ بھی نہیں۔ اور چونکہ لالہ دیس راج اقتدار میں ہیں۔ اس لئے لالہ بشن داس ان کے قدموں میں بیس پچیس ہزار روپیہ پھینکنے کے لئے تیار ہیں۔ میں رات کو بہت دیر تک دنیا کی اس حالت پر غور کرتا رہا۔ کیونکہ لالہ بشن داس جب بھی تشریف لاتے ان کے لئے آنکھیں بچھا دی جاتیں۔ ان کے ساتھ تعلقات ایک فیملی کے سے تھے۔ اور یہ بھی جب کسی سے ملتے تو یہی کہا کرتے کہ ان کے تمام عروج کا باعث دیوان سنگھ ہے۔ جس نے ان کی قاضی سر عزیز الدین احمد سے سفارش کی۔ اس سفارش کے باعث ہی ان کو ریاستوں میں ملازمت ملی۔ اور بعد میں بھی وہ ہمیشہ امداد کرتا رہا۔

اس واقعہ کے پندرہ روز بعد لالہ بشن داس بیکانیر سے کہیں جاتے ہوئے پھر دہلی تشریف لائے دوپہر کا وقت تھا۔ اور میں ہیلشن روڈ والے دفتر کے اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ لالہ بشن داس

Marfat.com

جب آئے۔ تو آپ نے ہمیشہ کی طرح آتے ہی بے تکلفی کے ساتھ چپڑاسی سے کہا۔ کہ سامان اوپر کے کمرہ میں رکھ دو۔ اور آپ میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے ان کو دیکھا۔ تو ان سے کوئی بات نہ کی۔ اور سرد مہری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ لالہ بشن داس نے شائد میری اس بے اعتنائی کو محسوس کیا ہو۔ مگر انہوں نے اس وقت غالباً یہی سمجھا۔ کہ میں بے حد مصروف ہوں۔ اور میرے پاس تپاک کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے وقت نہیں۔ یہ بیٹھے رہے۔ اور میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ یہ کئی گھنٹے بیٹھے رہے۔ مگر میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ اس زمانہ میں دفتر ریاست " تو ہملٹن روڈ پر تھا۔ اور رہائش کے لئے میں نے قرول باغ میں ایک کوٹھی نما مکان لے رکھا تھا جب شام کو پانچ بجے۔ تو میں نے گیرج میں سے کار کو نکالا۔ چپڑاسی کے پاس خرچ کے لئے روپے موجود رہتے تھے۔ میں نے چپڑاسی سے کہا۔ کہ لالہ بشن داس جی کے لئے کھانے وغیرہ کا انتظام کر دینا۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ کہہ کر میں کار میں اکیلا ہی سوار ہو کر قرول باغ چلا گیا۔ میرا خیال ہے۔ کہ لالہ بشن داس نے اس وقت یقیناً محسوس کیا ہوگا۔ کہ کانٹا بدل چکا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے میں ان کو ہمیشہ ہی کار میں قرول باغ والے رہائشی مکان میں اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

لالہ بشن داس اگلے روز بھی دفتر کے ایک کمرہ میں جہاں کہ ان کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا رہے میں اگلے روز صبح دس بجے دفتر پہنچا۔ تو یہ موجود تھے۔ میں نے اس روز بھی ان سے کوئی بات نہیں کی۔ اور نہ ان کو جرأت ہوئی۔ کہ یہ اس بے اعتنائی کا سبب مجھ سے پوچھتے۔ یہ اس روز جہاں جانا تھا۔ چلے گئے۔ اور میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ چار پانچ روز کے بعد یہ پھر واپس بیکانیر جاتے ہوئے تشریف لائے۔ اور دفتر میں مقیم ہوئے۔ میرا رویہ وہی تھا۔ جو چار روز پہلے تھا۔ یعنی میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ اور نہ میں ان کو قرول باغ اپنے ساتھ لے گیا۔ اور چپڑاسی سے کہہ دیا۔ کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کر دیا جائے۔

ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد یہ پھر بیکانیر سے گوالیار جاتے ہوئے دہلی تشریف لائے۔ کیونکہ یہ گوالیار سرکاری کام کے لئے اکثر جایا کرتے تھے۔ اس بار یہ میرے ہاں مقیم نہیں ہوئے۔ مہاراجہ ہوٹل میں ٹھہرے مگر ملنے کے لئے تشریف لائے۔ میرا ان کے ساتھ وہی بے اعتنائی کا رویہ تھا۔ جو ان کے پچھلی بار آنے پر تھا۔ یہ چند منٹ بیٹھے اور چلے گئے۔ مجھ سے ملنے کے بعد یہ لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس پریکٹیشنر کے ہاں پہنچے۔ لالہ امیر چند میرے اور ان کے دوست اور دونوں کے ہم وطن تھے۔ انہوں نے لالہ امیر چند سے میرے رویہ کی شکائت کی۔ اور کہا۔ کہ وہ دیوان سنگھ سے پوچھیں۔ کہ اس بے اعتنائی کا سبب کیا ہے۔ کیونکہ لالہ بشن داس کو یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ مجھ سے لالہ دیس راج پاہوہ ان کے بیس پچیس ہزار روپیہ کی پیش کش کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس بے اعتنائی کی اصل وجہ یہ ہے۔ کہ لالہ بشن داس ہزار ہا روپیہ نقد رکھتے ہوئے میری پانچ سو روپیہ قیمت بھی نہیں سمجھتے۔ ان کے زور دینے پر لالہ امیر چند میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے دریافت کیا۔ کہ اتنے گہرے تعلقات ہوتے ہوئے اس بے اعتنائی کا سبب کیا ہے۔ میں نے لالہ امیر چند کو ٹال دیا۔ اور کہا کہ کوئی خاص وجہ نہیں۔ اس کے چند روز بعد لالہ بشن داس پھر دہلی تشریف لائے

Marfat.com

اور مہاراجہ ہوٹل میں ٹھہرے۔ تو آپ نے لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر "وطن" کو میرے پاس بھیجا۔ کہ وہ ہی بے اعتنائی کی اصل وجہ دریافت کریں۔ مَیں نے لالہ شیو نرائن کو بھی ٹال دیا۔ اور کچھ نہیں بتایا۔ کہ اصل وجہ کیا ہے۔ چند روز بعد لالہ شیو نرائن پھر تشریف لائے۔ اور جب انہوں نے بہت زیادہ زور دیا تو مَیں نے ان کو تمام حالات بتا دیئے۔ اور لالہ شیو نرائن نے لالہ بشن داس کو بتایا۔ کہ اصل وجہ یہ ہے۔ کہ آپ نے دیوان سنگھ جیسے سالہا سال کے بہت ہی گہرے دوست کی اس مصیبت کے زمانہ میں پانچ سو روپیہ قیمت نہ سمجھی۔ اور لالہ دیس راج کو آپ بغیر ان کے طلب کئے بیس پچیس ہزار روپیہ دینے پر آمادہ تھے۔ کیونکہ آپ کا ذہن لالہ دیس راج کے اقتدار سے متاثر تھا۔ چنانچہ اس روز لالہ بشن داس کو معلوم ہوا۔ کہ اصل وجہ کیا ہے۔ اور مجھے بتایا گیا۔ کہ لالہ بشن داس کو جب اصل حالات کا علم ہوا۔ تو وہ اپنے فعل پر بہت ہی نادم اور شرمندہ تھے۔ اور معافی چاہتے تھے۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ایڈیٹر "ریاست" کے دل میں جب کسی کے متعلق ایک بار نفرت پیدا ہو جائے۔ تو نفرت کے یہ جذبات زندگی بھر ساتھ دیتے ہیں۔ ان میں کبھی بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میرے ماموں زاد بھائی سردار ہرنام سنگھ کپور (جو لاہور کے خزانہ کے انچارج تھے) کسی اپنے سرکاری کام کے لئے بیکانیر گئے۔ لالہ بشن داس بیکانیر میں فنانشل کمشنر تھے۔ اور مَیں اس مقدمہ کے سلسلہ میں ہی لاہور سنٹرل جیل میں تھا۔ بیکانیر میں سردار ہرنام سنگھ لالہ بشن داس سے ملے۔ تو ان دونوں کے درمیان میرے متعلق بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ تو لالہ بشن داس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آپ نے سردار ہرنام سنگھ سے کہا۔ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی غلطی کی۔ اور جب آپ لاہور جائیے۔ تو دیوان سنگھ سے جیل میں ملئے۔ اور اس سے کہیئے کہ بشن داس اپنے فعل پر انتہائی نادم اور شرمندہ ہے۔ وہ معافی چاہتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہے۔ کہ اس مقدمہ میں جتنا بھی روپیہ صرف ہو وہ کرنے چاہے یہ رقم آٹھ دس ہزار روپیہ ہی کیوں نہ ہو۔ اور خدا کے لئے اس کو معاف کر دیا جائے۔

سردار ہرنام سنگھ بیکانیر سے لاہور پہنچے۔ اور انہوں نے تمام حالات مجھے لکھے۔ اور بتایا۔ کہ لالہ بشن داس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور ان کی دلی خواہش یہ ہے۔ کہ وہ اس مقدمہ کے تمام مصارف برداشت کریں۔ اور ان کو معاف کر دیا جائے۔ مَیں لاہور جیل میں اس زمانہ کتابیں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ ایک تو دیوان حافظ شیرازی معہ ترجمہ اور دوسری کلیات اکبر الہ آبادی۔ یہ دونوں کتابیں میری چارپائی پر پڑی رہتی تھیں۔ اور ان کے اکثر اشعار مجھے یاد ہو گئے تھے۔ مَیں نے سردار ہرنام سنگھ کے خط کے جواب میں حافظ شیرازی کا صرف ایک شعر لکھ بھیجا۔ اور اس کے ساتھ ہدایت کی۔ کہ یہ شعر میری طرف سے بطور جواب لالہ بشن داس کو بھیج دیا جائے۔ مجھے اس وقت یہ شعر تو یاد نہیں مگر اس کا ترجمہ یہ تھا۔

اگر کمینہ شخص سو من سونا دے۔ اور یہ کہے۔ کہ اس سو من سونے کے معاوضہ میں صرف جَو کے ایک دانہ کا احسان قبول کر لو۔ تو سو من سونے کو قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔

Marfat.com

تاکہ کمینہ شخص کے ایک جَو کا احسان بھی نہ اٹھانا پڑے؟

مجھے معلوم نہیں۔ کہ سردار ہرنام سنگھ نے حافظ شیرازی کا یہ شعر میرے جواب کی صورت میں لالہ بشن داس کو بھیجا یا نہیں۔ اور اگر بھیجا۔ تو اس روز ہی یا اس کے بعد۔ میرے پاس اس کے بعد لالہ بشن داس کا نہ کوئی خط آیا۔ نہ پیغام۔ اور نہ میں توقع کرتا تھا۔

مَیں اس مقدمہ میں بَری ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ اور دو ماہ کے بعد پھر گرفتار ہو کر انبالہ اور فیروزپور جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک سال اور تین ماہ بعد نظر بندی سے رہائی ملی۔ تو اس وقت اخبار بند ہو چکا تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد محلہ گڑھیا میں مکان کرایہ پر لیا۔ اور اخبار جاری کر دیا۔ اخبار کو جاری ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔ ایک روز دس بجے کے قریب مَیں اپنی میز پر بیٹھے کام کر رہا تھا۔ کہ مَیں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ کہ لالہ بشن داس چوبڑہ تشریف لا رہے ہیں۔ جب یہ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو مَیں نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور اپنا کام کرتا رہا۔ یہ میری میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور چند منٹ کے بعد آپ نے فرمایا۔

"کیا کوئی صورت ہے۔ کہ آپ مجھے معاف کر دیں"؟

مَیں نے اس کے جواب میں کہا۔

"لالہ بشن داس میرے دل میں آپ کے لئے نفرت ہے۔ آپ سے عداوت نہیں۔ اگر عداوت ہوتی۔ تو آپ بیکانیر میں ملازم نہ رہ سکتے تھے۔ مَیں انتظام کر سکتا تھا۔ کہ آپ وہاں جیل میں ہوتے۔ میرے دل میں آپ کے لئے صرف نفرت ہے۔ آپ نے اچھا نہیں کیا جو یہاں چلے آئے۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ اس وقت میری چھت کے نیچے ہیں۔ ورنہ میں آپ کو بہت ہی بُری طرح سے بے عزت اور ذلیل کر کے یہاں سے نکال دیتا۔ آپ کے لئے بہتر یہ ہے۔ کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ اور پھر کبھی بھی میرے مکان پر نہ آئیے۔ اس میں ہی آپ کا فائدہ ہے"!

میرے یہ الفاظ سن کر لالہ بشن داس میرے مکان سے چلے گئے۔

اس واقعہ کے دو برس بعد ایک روز لالہ شیو نرائن بھٹناگر ایڈیٹر "وطن" دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ اس زمانہ میں دفتر "ریاست" محلہ چرخے والاں میں تھا۔ آپ جب تشریف لائے۔ تو آپ نے فرمایا۔

"آپ کے اور میرے سالہا سال سے اخلاص کے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اور مَیں نے آپ سے آج تک کبھی کوئی فرمائش یا خواہش نہیں کی۔ مَیں آج ایک خواہش لے کر آیا ہوں۔ بشرطیکہ آپ میری اس خواہش اور درخواست کو منظور کر لیں"۔

مَیں نے کہا۔ کہ فرمائیے۔ تو لالہ شیو نرائن نے پھر کہا۔

"مَیں پہلے آپ سے وعدہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ میری درخواست کو منظور کر لیں گے"۔

Marfat.com

مَیں نے پھر کہا کہ فرمائیے۔ آپ بار بار ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ مَیں تو آپ کا نیاز مند ہوں۔ اس پر شیو نرائن نے کہا۔ کہ

"بشن داس جو پڑہ گلی سے باہر کھڑے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر ان کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دے دیجئے۔ اور چونکہ آپ مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں۔ کہ مَیں جو کچھ کہوں گا۔ آپ اس کو منظور کریں گے۔ اس لئے انکار نہ کیجئے!"

لالہ شیو نرائن کے یہ الفاظ سن کر مَیں نے کہا۔ کہ "اچھا بشن داس کو بلا لو۔ مگر ــــ اُس سے کوئی بات نہ کروں گا" لالہ شیو نرائن گلی سے باہر گئے۔ لالہ بشن داس کو ساتھ لائے۔ یہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے چند منٹ بیٹھے۔ مگر مَیں نے نہ تو ان کی طرف دیکھا۔ اور نہ ہی ان سے کوئی بات کی۔ اور چند منٹ کے بعد یہ لالہ شیو نرائن کے ساتھ ہی چلے گئے۔

اس واقعہ کے عرصہ بعد ایک روز رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس تشریف لائے۔ میرے اور ان کے عزیزوں اور بزرگوں کے سے تعلقات ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ آپ اپنے صاحبزادہ مسٹر پیارے لال چیف انجینئر کے پاس بیکانیر گئے تھے۔ وہاں ان سے لالہ بشن داس ملنے آئے۔ اور بشن داس نے درخواست کی ہے۔ کہ آپ (ڈاکٹر صاحب) دیوان سنگھ سے بشن داس کی سفارش کریں۔ دیوان سنگھ ان پر ناراض ہے۔ وہ لالہ بشن داس کو معاف کر دے۔ ڈاکٹر صاحب کو اصل واقعات کا کوئی علم نہ تھا۔ کیونکہ مَیں نے ان سے کبھی کوئی ذکر نہ کیا۔ آپ نے پوچھا۔ کہ ناراضی کی وجہ کیا ہے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ٹالنا چاہا۔ اور کہا۔ کہ کوئی وجہ نہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے بضد ہو کر پوچھا۔ کہ ناراضی کا اصل سبب کیا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے زیادہ ہی مجبور کیا۔ تو مَیں نے تمام حالات من وعن سنا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ حالات سن کر بے حد افسوس ہوا۔ اور آپ نے جو الفاظ کہے وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ اور مَیں شائد ان الفاظ کو زندگی میں کبھی بھی بھول نہ سکوں گا۔ آپ نے فرمایا۔

"دیوان سنگھ۔ میری زندگی ــــ میں میرے دوستوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس کے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر اس کی شکائت کیا۔ جب کہ تمام دنیا ہی ایسی ہے۔ مَیں اب تو کسی کے متعلق بھی اپنے دل میں کدورت کے جذبات نہیں رکھتا۔ تم بھی بشن داس کو معاف کر دو۔"

مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے نصیحت کر کے چلے گئے۔ مگر مجھ پر اس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ جب کسی شخص کے متعلق میرے دل میں نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہو جائیں تو یہ زندگی بھر دل سے نہیں نکلتے۔ چاہے مَیں کتنی بھی کوشش کروں۔ ہاں اگر صرف عداوت یا دشمنی کے جذبات ہوں۔ اور ان کے ساتھ نفرت وحقارت کے جذبات کی ملاوٹ نہ ہو۔ تو میرا دل دشمنی یا عداوت کے جذبات سے صاف ہو جاتا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ راجہ سر دیا کشن کول جیسے کئی اصحاب کے لئے اپنے دل میں مخالفت، عداوت، اور انتقام کے جذبات رکھتا رہا۔ مگر چونکہ یہ لوگ بلند تھے۔ اور ان کے لئے میرے

Marfat.com

دل میں نفرت وحقارت کے جذبات نہ تھے۔ صرف عداوت اور دشمنی تھی۔ وقت آیا۔ کہ میرے دل میں ان کے لئے عزت اور محبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ یعنی نفرت و عداوت دونوں کی علیحدہ حیثیتیں ہیں۔ ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ عداوت تو وقت آنے پر محبت کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نفرت و حقارت کے جذبات کوشش کرنے پر بھی دل سے نہیں نکلتے۔ اور ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔

غسل اور صحت

لاہور میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدرلینڈ (جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے داماد اور شہزادی بمبا دلیپ سنگھ کے شوہر تھے) نے ایک بار میڈیکل کالج کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے خوب کہا تھا۔

"ہندوستان عجیب ملک ہے۔ کہ یہاں کے لوگ اپنے منہ کی صفائی کا تو خیال نہیں کرتے۔ جہاں کہ جسم کی پرورش کے لئے غذا داخل کی جاتی ہے۔ اور یہ اپنی مقعد کے متعلق بہت محتاط ہیں۔ جہاں سے یہ غذا فضلہ بن کر نکلتی ہے۔"

کرنل سدرلینڈ کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی منہ کی صفائی نہیں کرتے۔ جہاں کہ غذا جسم کے لئے داخل کی جاتی ہے۔ اور گندہ منہ ہونے کے باعث جب غذا اچھی طرح ہضم نہ ہو۔ اور اس کا نتیجہ قبض کی صورت میں پیدا ہو۔ تو پھر یہ جلاب لے کر نکالتے ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے۔ تو کرنل سدرلینڈ کا یہ بیان بے معنی نہیں۔ ہندوستانیوں کی اپنی صحت کے متعلق فی الحقیقت پوزیشن یہی ہے۔

میں صحت کے متعلق اپنے چند تجربات لکھتا ہوں۔ تاکہ یہ پبلک کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔

آنکھ:۔ یہ شاید تعجب اور حیرانی کے ساتھ سنا جائے گا۔ کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ میری آنکھوں میں کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور نہ کبھی میری کوئی آنکھ دکھی۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میں جب غسل کرتا ہوں۔ اور غسل کرتے ہوئے۔ صابن سے منہ دھوتا ہوں۔ تو میں آنکھیں کھول دیتا ہوں تاکہ صابن کی جھاگ میری آنکھوں کی غلاظت کو صاف کر دے۔ کیونکہ آنکھ تب ہی دکھتی ہے۔ اگر وہ غلیظ ہو۔ اور اگر صاف ہو۔ تو اس کے دکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر منہ کو کسی جرمی سائیڈل سوپ (جراثیم کش صابن) سے دھویا جائے۔ اور اس صابن کی جھاگ آنکھوں میں جائے۔ تو یہ آنکھوں کے ہر قسم کے جراثیم کو ہلاک کرنے کا باعث بھی ہوتی ہے۔ ورنہ غلاظت کو صاف کرنے کے لئے تو ہر صابن کام دے سکتا ہے۔ جھاگ کے آنکھوں میں جانے کے بعد آنکھوں کو صاف پانی سے اچھی طرح دھویا جائے۔ تاکہ جھاگ آنکھوں میں باقی نہ رہے۔

بال:۔ بالوں کے متعلق اصول یہ ہے۔ کہ اگر تو بالوں کی جڑیں صاف یعنی میل سے پاک اور تر ہوں گی۔ تو بال مضبوط اور صحت مند پیدا ہوں گے۔ اور اگر بالوں کی جڑوں میں میل ہو گی۔ یا یہ خشک ہوں گی۔ تو بال کمزور پیدا ہوں گے۔ کیونکہ میل میں ایک قسم کی ایسی ڈی (تیزابی مادہ) ہوتا ہے۔ جو بالوں کی جڑوں کے لئے

Marfat.com

بے حد نقصان رساں ہے۔ اور یہی کیفیت جڑوں کے خشک ہونے کے متعلق ہے۔ بالوں کی جڑوں کا خشک ہونا بالوں کی صحت کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ اس لئے بالوں کو اگر ہر روز اچھے صابن سے دھویا جائے۔ اور ان کی جڑوں کو انگلیوں کے ساتھ اچھے تیل کے ساتھ تر کر دیا جائے۔ تو یہ بالوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ ورنہ ہفتہ میں دو، تین بار تو بالوں کو ضرور دھونا اور ان کی جڑوں کو تیل میں تر کر دینا چاہیئے۔ جہاں تک صابن کا سوال ہے وہ صابن بالوں کے لئے بے حد نقصان کا باعث ہیں۔ جن میں کاربالک ایسڈ ڈالا جاتا ہے۔ اور جو کاربالک سوپ کہلاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسڈ بالوں کی جڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میری رائے میں بالوں اور غسل کے لئے یہ صابن مفید ہیں۔

پارک ڈیوس کمپنی کا نیکوسوپ (یہ صابن جراثیم کش ہے۔ کیونکہ اس میں پارہ کا جزو ہوتا ہے) گاڈریج کمپنی کا سنتھول سوپ (یہ بھی جراثیم کش ہے) اور دوسرے بڑے کمپنیوں کے قیمتی صابن۔ ارزاں کوالٹی کے صابن کبھی استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ بالوں کے لئے بے حد نقصان کا باعث ہیں۔ جہاں تک بالوں کے تیل کا سوال ہے۔ یہ تیل بہت مفید ہیں۔

سمتھ سٹینی سٹریٹ کمپنی کا کنتھر ڈین ہیر آئل۔ بنگال کیمیکل کمپنی کا کنتھر ڈین ہیر آئل۔ رشک منیر کمپنی کا ہیر آئل اور کالوگیٹ کمپنی کا ہیر ٹانک۔ تیل بھی ادنیٰ قسم کا استعمال کرنا بالوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور ہمیشہ قابل اعتماد۔ اور بڑی کمپنیوں کے ہیر آئل ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ بالوں کے متعلق ایک بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیئے۔ کہ اگر ان کو سردیوں کے زمانہ میں گرم پانی سے دھویا جائے۔ تو گرم پانی سے دھونے کے بعد ٹھنڈے پانی کے دو چار لوٹے بالوں میں ضرور ڈالے چاہئیں۔ تاکہ مسام جو (گرم پانی کے باعث کھل جاتے ہیں) ٹھنڈے پانی کے باعث بالوں کو اچھی طرح سے پکڑ لیں۔ اور یہ سکڑ جائیں۔ بالوں کو دھونے اور تیل لگانے کے بعد ان کو خشک کرنے کے لئے کھلے چھوڑ دینا مفید نہیں۔ بلکہ یہ ایک حد تک غیر مفید بھی ہے۔ کیونکہ اگر سکیلپ (سر کی کھال) پر تیل اچھی طرح سے لگا لیا جائے۔ تو پانی کے مساموں کے اندر جانے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ تیل پانی کو اندر جذب ہونے نہیں دیتا۔ اور سر میں درد نہیں ہو سکتا۔ اور خوشبودار تیل کی صورت میں اگر عورتیں غسل کے بعد بالوں کو کنگھی کر کے فوراً باندھ لیں۔ تو نہ تو بدبو پیدا ہونے کا سوال ہے۔ اور بالوں کو عرصہ تک تر یا مرطوب رہنا بالوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔ اور بالوں میں بدبو اس زمانہ میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ جب عورتیں ان کو دہی سے دھو کر گھی یا سرسوں وغیرہ کا تیل استعمال کرتی تھیں۔ بالوں کو دھوتے وقت پانی میں تھوڑا سا امونیا ملانا تو بہت ہی مفید ہے۔ یہ میل کو بہت صاف کرتا ہے۔ اور بالوں کی جڑوں میں ایک طرح سے کھاد کا کام دیتا ہے چنانچہ میں نے تمام زندگی ہی اپنے بالوں کو امونیا والے پانی اور صابن سے دھویا۔ مگر امونیا ایک زہر ہے۔ بچوں والے گھروں میں اس کا احتیاط سے نہ رکھنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ غلطی سے منہ میں ڈال لیا جائے۔ تو انسان ہلاک ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر اسے استعمال کیا جائے۔ تو بہت احتیاط کی جانی چاہیئے۔ میں نے خود بھی ایک بار غسل خانہ میں غرارہ والی دوائی کی جگہ امونیا منہ میں ڈال لیا۔ اور میں

Marfat.com

بہت مشکل سے بچا۔ ورنہ اگر اس کے چند قطرے بھی حلق میں چلے جاتے۔ تو میں فوراً ہلاک ہوجاتا۔

مُنہ:۔ انسان کو اپنا منہ لازمی طور سے صاف رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ منہ اگر صاف نہ ہوگا۔ تو غذا منہ کی غلاظت کو ساتھ لے کر پیٹ میں جائے گی۔ منہ کی صفائی کے متعلق پبلک ایک بہت ہی بڑی غلطی میں مبتلا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسوڑوں کے متعلق پرواہ نہیں کی جاتی۔ اور تمام کوشش دانتوں کی صفائی اور ان کو چمکانے پر صرف کی جاتی ہے۔ حالانکہ دانتوں کی صفائی کے مقابلے میں مسوڑوں کا مضبوط ہونا زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ مسوڑے اگر کمزور ہوں گے۔ یہ سخت نہ ہوں گے۔ اور ان میں پلپلاہٹ ہو گی۔ تو یہ نہ صرف دانتوں کو اچھی طرح سے پکڑ نہ سکیں گے۔ بلکہ ان میں پایوریا (یعنی پیپ کا پیدا ہونا) بھی ہو جائے گا۔ اس لئے منہ کے متعلق سب سے پہلا سوال مسوڑوں کے مضبوط رکھنے کا ہے۔ اور میں اپنے تجربہ کی بنیادوں پر منہ کو صاف کرنے کے متعلق رائے دیتا ہوں۔ کہ

(۱) سب سے پہلے پانی سے غرارے کئے جائیں۔ اور انگلی سے مسوڑوں کی مالش کی جائے تا کہ مسوڑوں کی غلاظت منہ سے باہر نکل جائے۔

(۲) اس کے بعد فارہن دیہ منجن مسوڑوں کے لئے ہے۔ مگر لوگ غلطی سے اس کو دانتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی ٹیوب پر صاف طور پر فارہن فار گمز یعنی مسوڑوں کے لئے لکھا ہوتا ہے) کو انگلی پر لگا کر اسے ایک منٹ مسوڑوں پر ملا جائے۔ تا کہ مسوڑوں میں دوران خون پیدا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند روز میں مسوڑے مضبوط ہو جائیں گے۔ مسوڑوں پر فارہن کی مالش کرنے کے بعد غرارے کر دیئے جائیں۔ اور پھر برش پر کوئی اچھی یعنی کالوگیٹ یا کوئی دوسری ٹوتھ پیسٹ لگا کر دانتوں کو صاف کر جائے۔ اور دانتوں کو صاف کر لینے کے بعد منہ میں تھوڑی سی لسٹرین ڈال کر غرارہ کر دیا جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ منہ جراثیم سے قطعی پاک ہو جائے گا۔

دانتوں اور مسوڑوں کو الگ الگ حیثیت نہ دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ اور اگر مصنوعی دانت ہوں۔ تو مسوڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے فارہن کا استعمال پھر بھی کرنا چاہیئے۔ تا کہ مسوڑے مضبوط ہوں۔ اور ان میں پلپلاہٹ پیدا نہ ہو۔ اگر فارہن میسّر نہ آسکے۔ تو پھٹکری کے پانی سے غرارے کرنا بھی مسوڑوں میں مضبوطی اور سختی پیدا کرتا ہے۔

غسل:۔ مسلمانوں کا امیر طبقہ تو ہر روز غسل کرتا ہے۔ مگر ان کا غریب طبقہ کئی کئی روز تک غسل نہیں کرتا۔ اور یہ صرف جمعہ کے جمعہ غسل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جو ان کی صحت کے لئے بے حد نقصان کا باعث ہے۔ اور ہندوؤں میں بھی جو لوگ پانی کے صرف چند لوٹے جسم پر ڈالنا ہی غسل سمجھتے ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی حماقت میں مبتلا ہیں۔ غسل کے لئے ضروری ہے۔ کہ پہلے چند لوٹے گرم یا سرد پانی کے موسم کے مطابق ڈالے جائیں۔ اور پھر جسم پر اچھی طرح سے صابن لگایا جائے۔ تا کہ یہ صابن میل کو صاف کر دے۔ اور صابن لگانے کے بعد پھر جسم کو پانی سے صاف کیا جائے۔

جوئیں:۔ یہ افسوسناک واقعہ ہے۔ کہ ہندوستان میں اکثر بچوں کے سر میں جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ اور لوگ

Marfat.com

اپنی جہالت کے باعث ان کو چن چن کر ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایک جوں سفر کرتے ہوئے آسانی کے ساتھ ایک شخص کے سر سے نکل کر دوسرے کے سر میں پہنچ جاتی ہے جس کے باعث گھر کے تمام بچوں کے سر جوؤں سے بھرے ہوتے ہیں۔ جوؤں کو ختم کرنے کی بہترین صورت یہ ہے۔ کہ امپیریل کیمیکل انڈسٹری کے "لور اکسا ین" کا ایک بڑا چمچہ لے کر اس کو بالوں اور بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح سے انگلیوں کے ساتھ مل دیا جائے۔ اور اس کو خشک ہونے دیا جائے۔ اور چند گھنٹہ کے بعد بالوں کو صابن سے دھو دیا جائے۔ صرف ایک بڑا چمچہ سر کی تمام جوئیں ہلاک کر دے گا۔ بالوں کو دن میں دو بار کنگھی کرنا جوؤں کو پھر سر میں اپنا اڈہ قائم نہ کرنے اور بالوں کو صاف اور صحت مند رکھنے کے اعتبار سے مفید ہے۔

کپڑے: میری زندگی کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں۔ کہ میں نے غسل کے بعد پہلے دن والے کپڑے پھر بغیر دھوئے استعمال کئے ہوں۔ اور میں غسل کے بعد ہر روز دُھلے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں۔ اور اب کئی برس سے اپنے کپڑے خود ہی دھوتا ہوں۔ کپڑوں کو دھونے کی بہترین ترکیب یہ ہے۔ کہ بالٹی میں پانی ڈال کر اس میں تھوڑا سا لکس یا ڈر اور دو بڑے چمچے امونیا کے ڈال دیئے جائیں۔ اور اس میں کپڑوں کو ڈال کر ایک یا دو گھنٹہ کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ امونیا اور لکس والا پانی —— کپڑوں کی میل کو حل کر دے۔ اس کے بعد اچھی کوالٹی کا صابن (کپڑے دھونے کے لئے ۵۰۱ یا ۷۷ نمبر کے صابن بہت اچھے ہیں) لگا کر ان کو دھویا جائے۔ کپڑا دھونے کے بعد کپڑے میں صابن باقی نہ رہنا چاہئیے۔ اور پانچ سات بار کُھلے پانی میں ان کو صاف کر دینا چاہئیے۔ تاکہ صابن باقی نہ رہے۔ اس کے بعد سفید کپڑوں کو تھوڑا سا نیل لگا دیا جائے۔ گھر میں خود کپڑے دھونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہو گا۔ کہ دھوبی کے ہاں دوسروں کے گندے کپڑوں کے ساتھ یہ ملائے نہ جائیں گے۔ اور دوسرے دھوبی کے ہاں دھلوانے کے مقابلہ پر کپڑے کی عمر میں بہت اضافہ ہو جائے گا یعنی اگر دھوبی سے دُھلوانے کی صورت میں کپڑا تین ماہ میں پھٹ جائے گا۔ تو اوپر کی ترکیب سے گھر میں دھوئے ہوئے کپڑا ایک برس میں بھی نہ پھٹے گا۔ کپڑا دھونے میں زیادہ محنت بھی نہ کرنی پڑے گی۔ اور دھوبی کے مقابلہ پر کپڑے زیادہ صاف ہوں گے۔

کان: کانوں کی غلاظت صاف کرنے کے لئے کسی ایسی شے کا استعمال کرنا بے حد خطرناک ہے جس کو جراثیم لگے ہوں۔ میں کانوں کو ہمیشہ چھوٹی قینچی کے سرے پر صاف اور ستھرا کپڑا لگا کر صاف کرتا ہوں۔ تاکہ قینچی کا سرا کان کے اندرونی حصّہ کو زخمی نہ کر سکے۔ اور صاف کرنے سے پہلے قینچی کو کاربالک سوپ یا کسی دوسری جراثیم کش دوائی مثلاً لسٹرین وغیرہ سے دھو لیتا ہوں۔ تاکہ اس پر جراثیم نہ ہوں۔

ناخن: ناخنوں کو ایک ہفتہ میں ایک بار ضرور کاٹ دینا چاہئیے۔ تاکہ ان میں میل نہ جم سکے۔

Marfat.com

اور ناخن کاٹنے کے بعد ہاتھوں کو کاربالک صابن یا کسی جراثیم کش دوائی سے ضرور دھو دینا چاہیئے۔

بزنس کا کیریکٹر اور تجارتی ساکھ

بہت برس ہوئے۔ لالہ امیر چند کھنہ انکم ٹیکس پریکٹیشنر نے باتوں باتوں میں ایک بار خوب کہا تھا کہ "جس بزنس مین کی تجارتی ساکھ قائم نہ ہو۔ وہ تجارت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور تجارتی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے۔ کہ جس شخص سے روپیہ دینے کا کوئی وعدہ کیا جائے۔ یا روپیہ ادا کرنے کی تاریخ مقرر کی جائے۔ تو اس شخص کو تاریخ مقررہ سے ایک روز پہلے روپیہ دے دیا جائے چاہے روپیہ کسی پٹھان سے بہت زیادہ سود پر ہی کیوں نہ قرض لینا پڑے۔ کیونکہ تاریخ مقررہ سے پہلے یا تاریخ مقررہ پر روپیہ ادا کرنے کے بعد روپیہ دینے والا تجارتی ساکھ کو دیکھ کر دگنا اور سہ گنا روپیہ اور دے سکے گا۔"

لالہ امیر چند کھنہ کا یہ بیان تجارتی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ تجارتی دنیا میں اگر ساکھ قائم ہے۔ تو سب کچھ ہے۔ اور اگر ساکھ قائم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

ایک زمانہ میں جب والیانِ ریاست کے چلائے ہوئے کئی فوجداری اور دیوانی مقدمات ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف دائر تھے۔ اور یہ تمام مقدمات دہلی سے چھ چھ سو میل کے فاصلہ پر تھے۔ تاکہ ایڈیٹر "ریاست" مقدمات کی زیادتی سے پریشان ہو کر اپنی شکست قبول کرے۔ اور ہتھیار گرا دے۔ اور ان مقدمات میں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ تو اس زمانہ میں ایڈیٹر "ریاست" چھتیس ہزار روپیہ کا مقروض ہو گیا۔ اور دہلی میں یا کسی اور مقام پر اس کی ایک پیسہ کی جائداد نہ تھی۔ مگر یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ کسی قرض خواہ نے بھی کبھی تنگ نہ کیا۔ کیونکہ قرض لینے والے تمام یہ محسوس کرتے تھے۔ کہ دیوان سنگھ گو مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ مگر بے ایمان نہیں۔ یعنی ایڈیٹر "ریاست" کی تجارتی ساکھ قائم تھی۔ اور لوگ یہ سمجھتے تھے۔ کہ ان کا روپیہ مارا نہ جائے گا۔

تجارتی ساکھ کے متعلق ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ کئی برس تک "ریاست" دہلی کے محبوب المطابع پریس میں چھپتا رہا۔ اور اکثر روپیہ تو ساتھ ساتھ ادا کیا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کے ذمہ پریس کا گیارہ سو روپیہ باقی تھا۔ کہ اخبار کے چھاپنے کا انتظام ایک دوسرے پریس میں کر لیا گیا۔ اور یہ گیارہ سو روپیہ محبوب المطابع کا مالی مشکلات کے باعث کئی برس تک ادا نہ ہو سکا۔ اس پریس کے قانونی مشیر مسٹر آر۔ ایس لاہری ایک روز دفتر "ریاست" میں آئے۔ اور آپ نے باتوں باتوں میں فرمایا۔ کہ محبوب المطابع پریس نے اپنے گاہکوں کے ذمہ جو سات آٹھ ہزار روپیہ لگایا تھا۔ زائد المعیاد ہونے کے باعث اپنی کتابوں میں سے خارج کر دیا ہے۔ یہ روپیہ اب قانوناً بھی عدالت کے ذریعہ وصول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس روپیہ کے متعلق تین برس کی میعاد گذر چکی ہے۔ ایڈیٹر "ریاست" نے جب یہ سنا۔ تو اس نے دریافت کیا۔ کہ کیا وہ روپیہ بھی کتابوں میں سے خارج کر دیا گیا۔ جو "ریاست" کے ذمہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی تو زائد المیعاد

Marfat.com

ہو چکا ہے۔ اس پر مسٹر لبری نے فرمایا۔

"ریاست والا گیارہ سو روپیہ تو ہم نے کتابوں میں سے خارج نہیں کیا۔ کیونکہ گو یہ روپیہ زائد المیعاد ہو چکا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں۔ کہ یہ روپیہ ادا ہو جائے گا۔ چاہے دس برس بھی کیوں نہ ہو جائیں"۔

اس کے چند ماہ بعد یہ روپیہ اقساط کی صورت میں محبوب المطابع پریس کو ادا کر دیا گیا۔ اور اب اس روپیہ کے متعلق لبری صاحب سے جب بھی ذکر آتا ہے۔ تو میں کہا کرتا ہوں۔ کہ بزنس کے کیریکٹر اور تجارتی ساکھ کا ایک تاریک پہلو یہ ہے۔ کہ لوگ میعاد گذرنے کے بعد بھی روپیہ کے وصول کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔

دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی کا ایک نامور ترین پریس ہے۔ جو اپنی چھپائی کے لحاظ سے بہت شہرت رکھتا ہے۔ اور اب تو دہلی میں پنجابیوں کے بہت اچھے اچھے پریس ہیں۔ تبادلہ آبادی سے پہلے اس پریس کا اچھی چھپائی کے اعتبار سے کوئی دوسرا پریس مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اور گورنروں اور وائسرائے تک کا کام اس پریس میں چھپنے کے لئے آتا۔ اس پریس کی تجارتی ساکھ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

بہت برس ہوئے۔ اس پریس میں ایک کتاب چھپنے کے لئے آئی۔ جو بہت کافی ضخیم اور بہت بڑی تعداد میں تھی۔ اس کتاب کی جب چھپائی ہو چکی تو پریس کے مالک لالہ شنبھو ناتھ نے دیکھا۔ کہ کتاب کے کچھ فرمے خراب چھپے ہیں۔ اور وہ پتھر بھی کٹ چکے ہیں۔ جن سے یہ فرمے چھاپے گئے تھے۔ آپ نے فوراً کاتب کو بلا کر یہ فرمے نئے لکھوائے بازار سے کاغذ منگایا۔ اور ان کی قیمت اپنے پاس سے ادا کی۔ اور پریس میں چھاپ کر ان فرموں کو خراب فرموں کی جگہ رکھا۔ اور کتاب گاہک کو دی گئی۔ اور گاہک کو کوئی علم نہ تھا۔ کہ مالک پریس نے کاغذ اور کتابت کا خرچ خود برداشت کیا ہے۔ اس واقعہ کا آپ کے ایک دوست کو علم ہوا۔ تو اس نے ازراہ ہمدردی ان غیر ضروری مصارف پر اظہار افسوس کیا۔ اس کے جواب میں لالہ شنبھو ناتھ نے کہا۔

"جو روپیہ صرف کیا گیا۔ بزنس کی ساکھ اس سے زیادہ قیمتی تھی۔ اگر یہ روپیہ صرف نہ کیا جاتا لیکن تو ہم اس گاہک سے ہمیشہ کے محروم ہو جاتے۔ اور دوسرے یہ گاہک اور دس گاہکوں کے پاس شکایت کر کے ہماری بدنامی کا باعث ہوتا"۔

یعنی عاقبت اندیش تاجر وقتی فائدہ کے مقابلہ پر اپنی تجارتی ساکھ کو زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اور ناعاقبت اندیش تاجر وقتی مفاد پر اپنی تجارتی ساکھ کو قربان کر دیتے ہیں۔

جب پہلی جنگ شروع ہوئی۔ تو جنگ کا اعلان ہونے سے دو روز پہلے جرمنی کی ایک فرم کا برلن سے بھیجا ہوا چیک دفتر "ریاست" میں پہنچا۔ جو غالباً تین چار سو روپیہ کا تھا۔ اور اعلان جنگ ہونے کے باعث یہ چیک کیش ہونے کے لئے برلن نہ بھیجا جا سکا۔ کیونکہ کسی دشمن ملک کے ساتھ لین دین یا خط و کتابت کرنا جرم تھا۔ اور یہ چیک اس فرم کی فائل میں نتھی کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد پانچ برس تک جنگ

Marfat.com

دی رہی۔ روس نے جرمنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ میں پہلے جیل گیا۔ اور جیل سے واپس آیا۔ تو مہاتما
ندھی کی گرفتاری کے چند روز بعد کانگرسیوں کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا۔ اور میری نظر بندی میں ہی اخبار
ند ہو گیا۔ اور میں جب نظر بندی سے رہا ہو کر واپس آیا۔ اخبار کو پھر جاری کیا۔ اور جنگ بھی ختم ہو چکی تھی
ر ایک روز پچھلے کاغذات کو تلف کرنے کے لئے فائلوں میں سے نکال رہا تھا۔ تو اتفاق سے یہ چیک
ل پڑا گیا۔ میں نے تلف ہونے والے کاغذات میں سے اس چیک کو الگ کر کے رکھ لیا۔ اور اس سے
گلے روز اس خیال سے کہ شاید یہ فرم روس کی گولہ باری سے بچ گئی ہو۔ یہ چیک میں نے اس فرم کو برلن
بھیج دیا۔ اور ساتھ لکھا۔ کہ چیک کے پہنچنے کے بعد جنگ جاری ہو گئی تھی۔ اس لئے یہ چیک بنک نہ
بھجا۔ اب اگر آپ چاہیں۔ تو اس کی جگہ دوسرا چیک بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ دلچسپ ہے۔ کہ اس
رم نے اس چیک کے واپس پہنچتے ہی ایک دوسرا ڈرافٹ بھیج دیا۔ جو دہلی کے ایک بنک کے نام تھا۔
ور اس فرم نے اپنے خط میں رقم کی ادائیگی کی دیر کے لئے اظہار افسوس بھی کیا۔ یعنی پانچ برس کے بعد
ی جرمنی کی اس فرم نے رقم ادا کر کے اپنے بزنس کے کیریکٹر کی بلندی کا ثبوت دیا۔ مگر اس کے مقابلہ
ہندوستان میں تجارتی ساکھ کی کیونکر مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ جس کا
تیجہ یہ ہے۔ کہ دنیا کی مارکیٹ میں ہماری زبان پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔

دنیا کی مارکیٹ میں جہاں تک مال کے اچھا ہونے۔ ایک بات کرنے اور بزنس کے کیریکٹر کی
ندی کا سوال ہے۔ برطانیہ پہلی صف میں ہے۔ اس کے بعد جرمنی کا نمبر ہے۔ اور جہاں تک مال کی
والٹی کے اونچے اور قیمت کے کم ہونے کا سوال ہے۔ جاپان کا کوئی دوسرا ملک مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور
امریکہ بھی مارکیٹ میں کوئی اچھی ساکھ نہیں رکھتا۔ اور یہ عام شکایت ہے۔ کہ امریکن مال تو اچھی کوالٹی
کا دکھاتے ہیں۔ مگر مال جو سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس کی کوالٹی اچھی نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ خریدنے
والا جب بازار میں جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے انگلستان اور جرمنی کا بنا ہوا مال تلاش کرتا ہے۔ اور اگر
یہ نہ ملے۔ تو امریکن مال خریدتا ہے۔ کیونکہ برطانیہ اور جرمنی کی تجارتی ساکھ مارکیٹ میں زیادہ اچھی ہے۔

ہندوستان ہی نہیں۔ تمام مشرقی ممالک کی حالت تجارتی ساکھ کے اعتبار سے نہ صرف قابل رحم بلکہ
شرمناک بھی ہے۔ جو ملک کی تجارتی عزت اور وقار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خراب مال تیار کرتے ہیں۔ اور
عارضی اور وقتی منافع پر اپنی اور اپنے ملک کی تجارتی ساکھ کو قربان کر دیتے ہیں۔ جسے ان کا اپنی تجارت
پر ظلم اور اپنے ملک کے ساتھ غداری قرار دیا جانا چاہیے۔ چنانچہ یہ کس قدر شرم کی بات ہے۔ کہ جنوبی ہند
سے امریکہ کو جو کالی مرچیں بھیجی جاتی ہیں۔ وہ خالص نہیں ہوتیں۔ آگرہ سے روس کو کئی لاکھ جوڑے جوتوں کے
بھیجے گئے۔ جو مال کے ناقص ہونے کے باعث واپس کر دیئے گئے۔ لدھیانہ اور جالندھر میں سائیکلوں
اور سلائی کی مشینوں کے پرزے تیار کر کے ان پر برطانوی کارخانوں کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ کھانے کی
اشیاء میں لکڑی کا برادہ ریت اور کھریا مٹی ملائی جاتی ہے۔ دودھ میں پانی نہیں۔ بلکہ پانی میں دودھ ملایا جاتا
ہے۔ ادویات میں ملاوٹ کی جاتی ہے۔ اور لاکھوں کی تعداد میں ہر روز جعلی لیبل چھپ رہے ہیں۔ جو غیر ملکی

Marfat.com

خالی شیشیوں پر لگا کر ان میں ناقص اور نقصان رساں ادویات بھر دی جاتی ہیں۔ اور اس تجارتی چار سو بیس کا خمیازہ ملک کی تجارتی ساکھ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اور یہ لوگ نہیں سوچتے۔ کہ اگر تجارتی ساکھ قائم ہے۔ تو تجارت میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اور اگر تجارتی ساکھ قائم نہیں۔ تو گو وقتی منافع تو مل سکتا ہے۔ مگر ان کی تجارت کا مستقبل بے حد تاریک ہے۔ اور تجارتی ساکھ کے باعث یورپ میں تو دو دو سو برس سے لمیٹڈ کمپنیاں قائم ہیں۔ مگر ہندوستان میں لیمٹڈ کمپنی کے معنی ہی کانسٹی ٹیوشنل دے آف چیٹنگ (یعنی دنیا کو لوٹنے کا آئینی طریقہ) سمجھا جاتا ہے۔ اور کمپنی کے قائم کرنے سے پہلے سوچ لیا جاتا ہے۔ کہ کس کس طریقہ کے ساتھ حصہ داروں کا روپیہ ہضم کیا جائے گا۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی درویشانہ فطرت

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی خدا یا مذہب کے متعلق کچھ بھی پوزیشن ہو۔ مگر واقعہ یہ ہے۔ کہ آپ فطرتاً ایک بہت ہی بلند اور درویش صفت انسان ہیں۔ اور میں نے اپنی زندگی میں دوسروں کی مخالفت یا کمزوریوں کو معاف کر دینے والا انسان ان سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔ اور جب بعض خود غرض لوگ ان پر غلط الزام لگاتے ہوئے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ تو میرا خون اُبل آتا ہے۔ چنانچہ میں ان کے صرف چند واقعات لکھتا ہوں۔ جن سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ درویش صفت اور معصوم انسان کیونکر زندگی بھر دوسروں کے کام آتا رہا۔ اور یہ طبعاً اور فطرتاً کتنا بلند ہے۔

ایک شاعر طویل عرصہ تک ان کی مخالفت کرتے رہے ہے۔ اور انہوں نے حضرت جوشؔ کا نام لکھے بغیر "ریاست" میں چھپنے کے لئے ایک نظم بھی بھیجی تاکہ مجھے یہ علم نہ ہو۔ کہ یہ کس کے خلاف ہے۔ اور یہ نظم "ریاست" میں چھپ جائے۔ مگر جب میں نے جب یہ نظم دیکھی۔ تو محسوس کیا۔ کہ اس نظم کے پردہ میں جوشؔ صاحب کی مخالفت ہے۔ اور میں نے یہ نظم "ریاست" میں شائع نہ کی۔

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد یہ حضرت اپنے وطن سے دہلی تشریف لائے۔ دفتر "ریاست" میں ہی مقیم ہوئے۔ مالی لحاظ سے بے حد پریشان تھے۔ اور کسی ملازمت کے خواہاں تھے۔ تو باتوں باتوں میں جب یہ ذکر ہوا۔ کہ جوشؔ صاحب ان کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ یہ حضرت جوشؔ کے پاس گئے۔ اور اپنی تنگدستی اور مشکلات کا ذکر کیا۔ تو جوشؔ صاحب فوراً ان کی امداد کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ چیف کمشنر مسٹر شنکر پرشاد کے پاس سفارش کے لئے چلے گئے۔ اور آپ نے یہ خیال تک نہ کیا۔ کہ یہ حضرت ایک طویل عرصہ سے ان کے خلاف زہر اُگلتے رہے ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سٹی مجسٹریٹ دہلی اور ایڈیٹر "ریاست" کے درمیان تعلقات کچھ کشیدہ سے ہو گئے۔ جس کی وجہ ایک دوست کی غلط بیانی تھی۔ کنور صاحب جوشؔ صاحب کے گہرے دوست تھے۔ اور ایڈیٹر "ریاست" جوشؔ صاحب کے نیازمندوں میں سے تھے۔ جوشؔ صاحب کنور صاحب اور ایڈیٹر "ریاست" کے تعلقات کی کشیدگی کو بہت بُری طرح سے محسوس کرتے تھے۔ اور آپ نے بارہا ان تعلقات کو اچھا

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی۔ مگر آپ کو اس میں کامیابی نہ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ دونوں غیر ضروری طور پر خود دار تھے۔ اور کوئی بھی جھکنے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر اتفاق ایسا ہوا۔ کہ کنور صاحب بیمار ہو گئے۔ آپ نے ڈاکٹر سین کے ہسپتال میں اوپریشن کرایا۔ جو دفتر "ریاست" سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ جوش صاحب نے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ اور آپ دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ نصف گھنٹہ کے قریب ادھر اُدھر کی گپ بازی کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں۔ آپ کی کار دفتر "ریاست" کی گلی سے باہر کھڑی تھی۔ اور جب دفتر "ریاست" سے چلے تو آپ ڈاکٹر سین کے ہسپتال کے سامنے رُک گئے۔ اور کہا کہ ایک بیمار کو دیکھنا ہے۔ میں بھی چند منٹ کے لئے ہسپتال کی اوپر کی منزل میں ان کے ساتھ چلوں۔ جہاں کہ بیمار مقیم ہے۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا اور ہم کمرہ میں پہنچے۔ تو دیکھا۔ کہ کنور صاحب ہیں۔ کنور صاحب تپاک سے ملے۔ اور تعلقات کی کشیدگی دور ہو گئی۔ کیونکہ دراصل تعلقات کی کشیدگی کی کوئی خاص وجہ ہی نہ تھی۔ صرف ایک دوست نے اپنی غرض کے لئے یہ تعلقات کشیدہ کرا دیئے تھے۔ یعنی جوش صاحب نے ایک دوستانہ "سازش" کرتے ہوئے ان کشیدہ تعلقات کو خوشگوار صورت میں بدل دیا۔

دہلی گورنمنٹ کے چیف منسٹر چوہدری برہم پرکاش سے کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ کیونکہ میں وزرا یا حکام سے ملنے کے اعتبار سے کچھ غیر معمولی ساریزرو ہوں۔ اور بغیر کام کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ (چنانچہ ابھی حال میں مرکزی گورنمنٹ کے ایک بہت بڑی پوزیشن کے وزیر نے مسٹر انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" سے یہ شکوہ بھی کیا۔ کہ میں ان سے کبھی ملا نہیں۔) حالانکہ چوہدری برہم پرکاش کی بلندی کی میر مشتاق احمد اور دوسرے کئی اصحاب نے تعریف کی۔ جوش صاحب اور چوہدری برہم پرکاش کے تعلقات گہرے دوستانہ تھے مجھے علم نہیں۔ کہ میرے متعلق ان دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔ ایک روز جوش صاحب دوپہر کو اپنی کار میں تشریف لائے۔ اور ارشاد فرمایا کہ آج رات کو میں کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں نے کہا۔ کہ کیا کوئی خاص تقریب ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی خاص تقریب تو نہیں۔ جی چاہتا تھا۔ کہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ اور باتیں کریں۔ کیونکہ باتیں کئے بہت روز ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا۔ کہ بہت اچھا۔ میں رات کو حاضر ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ شام کو سات بجے کے قریب پھر آ گئے۔ اور میں نے کہا۔ کہ میں تو آپ کے ہاں آنے والا تھا۔ آپ کیوں تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ایک تو یہ خیال تھا۔ کہ میں بھول جاؤں گا۔ اور دوسرے یہ کہ عین وقت پر کوئی بہانہ نہ کر دوں۔ اس لئے آپ خود ہی لینے کے لئے چلے آئے۔ میں ان کے ساتھ ان کی کوٹھی پر گیا۔ اور وہاں ہم بیٹھے ہی تھے۔ کہ چوہدری برہم پرکاش آ گئے۔ تو اس وقت آپ نے بتایا۔ کہ میرے لانے کی وجہ یہ تھی۔ کہ میرا چوہدری صاحب سے تعارف ہو جائے۔ اور اس غرض کے لئے ہی آپ نے دونوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ مجھے بتایا اس لئے نہ تھا۔ کہ میں کہیں آنے سے انکار نہ کر دوں۔ کیونکہ میں وزراء اور حکام سے بہت کم ملتا ہوں۔ کھانے کی میز پر مختلف کھانوں کے علاوہ وسکی بھی تھی۔ میں نے تو نصف پیگ کے قریب وسکی پی۔ جوش صاحب نے اپنا کوٹہ پورا کیا۔ اور چوہدری برہم پرکاش نے نہ تو وسکی پی۔ اور نہ گوشت سے پکی ہوئی کوئی شے کھائی۔

Marfat.com

کیونکہ آپ کانگرسی اور گاندھی بھگت ہیں۔ کھانے پر مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں چوہدری صاحب سے ملا۔ اور جوش صاحب نے اس کے لئے بھی ایک "سازش" کی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے ویسے ہی فرماتے۔ تو میں حاضر ہو جاتا۔ مگر آپ کو خیال تھا۔ کہ میں شاید نہ آؤں۔ اور ملنے سے احتراز کروں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد کا ذکر ہے۔ ایک دوست آپ کے ہاں آئے۔ اور درخواست کی۔ کہ آپ اپنے دوست مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر سے پستول کا لائسنس دینے کی سفارش کر دیں۔ آپ ان کو لے کر مسٹر شنکر پرشاد کے پاس پہنچے۔ اور تینوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مسٹر شنکر پرشاد۔ فرمایئے کیا ارشاد ہے؟

جوش صاحب۔ یہ میرے دوست ہیں۔ اور ان کو پستول کے لائسنس کی ضرورت ہے۔

مسٹر شنکر پرشاد۔ اب تو فسادات ختم ہو چکے ہیں اب پستول کی کیا ضرورت ہے۔

جوش صاحب۔ ہاں پستول کی اب ضرورت تو نہیں۔

دوست: جوش صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں رات کو بارہ بجے واپس گھر آتا ہوں۔ راستہ خطرناک ہے۔ مجھے پستول کی ضرورت ہے۔

جوش صاحب۔ ہاں پستول کی اب ضرورت تو ہے۔

مسٹر شنکر پرشاد۔ رات کو تمام سڑکوں پر پولیس کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس لئے کیا ضرورت ہے۔

جوش صاحب۔ ہاں ضرورت تو نہیں۔

دوست۔ جوش صاحب مجھے پستول کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ مجھے رات کو آنا پڑتا ہے اور آپ کو اس غرض کے لئے ہی یہاں لایا ہوں۔

جوش صاحب۔ ہاں ضرورت تو ہے۔

یعنی ایک ہی نشست میں جب دوست نے کہا۔ کہ پستول کی ضرورت ہے۔ تو آپ نے فرما دیا کہ ہاں ضرورت ہے۔ اور جب چیف کمشنر نے کہا۔ کہ ضرورت نہیں۔ تو آپ نے کہہ دیا۔ کہ ہاں ضرورت نہیں انفرمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کی منسٹری میں ایک جگہ خالی تھی۔ اور اس عہدہ کے لئے آپ ایک دوست کے علاوہ آپ کے ایک ماتحت (جو رسالہ "آجکل" میں کام کرتے تھے) نے بھی درخواست دی آپ کے یہ دوست آئے اور کہا کہ منسٹر انفرمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ سے ملازمت دینے کی سفارش کر دیجئے۔ آپ فوراً ان کے ساتھ چلے گئے۔ اور منسٹر سے سفارش کر دی۔ جب واپس آئے اور آپ کے دفتر والوں کو اس دوست کی سفارش کا علم ہوا۔ تو آپ کے جس ماتحت نے اس عہدہ کے لئے درخواست دی تھی۔ اس نے آپ سے کہا۔ کہ آپ تو پہلے ہی اپنے ماتحت کی سفارش کر چکے ہیں۔ اور ان کی درخواست پر لکھ کر سفارش کی گئی ہے۔ جوش صاحب کو اپنی پہلی سفارش یاد نہ تھی۔ اور نہ یہ خیال رہا۔ کہ آپ کے ماتحت نے اس عہدہ کے لئے درخواست دی ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ اپنے اس

Marfat.com

ماتحت کے زور دینے پر اس کے ساتھ بھی منسٹر انفرمیشن کے پاس چلے گئے۔ اور سفارش کردی۔ جوش صاحب کی یہ حالت دیکھ کر منسٹر انفرمیشن مسکرا دیئے۔ اور کہا۔ کہ جگہ ایک ہے اور آپ نے ہی دو امیدواروں کی سفارش کی ہے۔ کس کے حق میں فیصلہ کیا جائے؟"

جوش صاحب کا خودداری کے اعتبار سے بھی بہت کم لوگ مقابلہ کر سکیں گے۔ آپ کئی برس دہلی میں مقیم رہے۔ ہر منسٹر اور ہر افسر کے ہاں بغیر وقت مقرر کئے بے تکلف چلے جاتے۔ اور ہر وزیر اور افسران کی ناز برداری کرتے ہوئے ملنے سے کبھی انکار نہ کرتا۔ ایک بار پنڈت نہرو کی کوٹھی پر پنڈت جی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ کہ پنڈت جی کچھ سوچتے سوچتے غسل خانہ میں پیشاب کی رفع حاجت کرنے چلے گئے۔ اور ان کو یاد نہ رہا۔ کہ جوش صاحب سے انتظار کرنے کے لئے کہہ جائیں۔ جوش صاحب نے اسے بھی اپنی توہین سمجھا۔ اور اُٹھ کر چلے آئے۔ اور بعد میں پنڈت جی نے ٹیلی فون پر غلط فہمی رفع کی۔

بہت برس ہوئے۔ جوش صاحب سرکاری ملازم ہونے سے پہلے ایک بار دہلی تشریف لائے اور "ایڈیٹر ریاست" کے مکان پر ہی مقیم ہوئے۔ تو مسلسل کئی روز تک مجھے اس درویش فطرت اور معصوم شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ دوسرے شعرا تو رات کو ضرورت سے زیادہ شراب پیتے ہیں۔ پینے کے بعد قے کرتے ہیں۔ اور صبح دوسرے کے ساتھ دس بارہ بجے تک کروٹیں لیا کرتے ہیں۔ مگر جوش صاحب نے اپنے اندازہ سے زیادہ کبھی شراب نہیں پی۔ وقت مقررہ پر پیتے ہیں۔ اور اس کے بعد وقت مقررہ کے پر کھانا کھاتے ہیں۔ اور چاہے گرمی ہو۔ یا سردی اور آندھی ہو یا برسات علی الصبح تین چار بجے بیدار ہوتے۔ اور ضروریات سے فارغ ہو کر لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب میرے ہاں مقیم تھے۔ تو آپ بھی صبح تین چار بجے بیدار ہو کر کام کرتے۔ اور میری بھی یہی عادت تھی۔ اور جب دونوں کام شروع کرتے۔ تو میں کہا کرتا۔ کہ "آئیے اب دونوں مل کر تہجد کی نماز شروع کر دیں"۔

جوش صاحب طلوع آفتاب سے پہلے پیدل سیر کے لئے بھی جایا کرتے ہیں۔ آپ دہلی کی سول لائینز میں رہتے تھے۔ اور ان کی کوٹھی سے کچھ فاصلہ پر رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس اور چیف کمشنر مسٹر شنکر پرشاد کی کوٹھیاں بھی تھیں۔ اور ڈاکٹر صاحب اور مسٹر شنکر پرشاد بھی صبح پیدل سیر کرنے والوں میں سے ہیں۔ اور سیر کرتے ہوئے یہ تینوں اکثر صبح ملا کرتے۔ جوش صاحب پر ڈاکٹر متھرا داس صاحب کی نیکی اور بلندی کا بہت اثر تھا۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب اور جوش صاحب میں سیر کرتے ہوئے یہ بات چیت ہوئی۔

جوش صاحب۔ ڈاکٹر صاحب آپ شراب پیتے ہیں!

ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں پی۔

جوش صاحب۔ تو پھر آپ اتنے نیک کیونکر ہیں! جو شخص شراب نہ پیئے۔ وہ تو اتنا نیک ہو نہیں سکتا۔

Marfat.com

یعنی نیکی کے لئے اور دل میں طہارت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان شراب پیتا ہو۔ گویا کہ صرف سپرٹ (شراب) ہی دل کی کدورت کو دھو سکتی ہے۔

حضرت جوش کی خودداری کا ایک اور واقعہ دلچسپ ہے۔ آپ ایک بار بمبئی جا رہے تھے۔ اور اسی گاڑی کے دوسرے خانہ میں مرحوم مسٹر جناح بھی تھے۔ راستہ میں مسٹر جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری کو علم ہوا۔ کہ کہ حضرت جوش بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ آپ نے مسٹر جناح سے ذکر کیا۔ تو مسٹر جناح نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا۔ کہ جا کر جوش کو بلا لائیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے آ کر جوش صاحب سے کہا۔ کہ مسٹر جناح ملنے کے لئے بلاتے ہیں۔ آپ نے یہ سنا۔ تو جواب دیا کہ

"اگر مسٹر جناح ملنا چاہتے ہیں۔ تو ان کو خود آنا چاہیئے تھا!"

پرائیویٹ سیکریٹری نے یہی الفاظ مسٹر جناح سے کہے۔ تو مسٹر جناح حضرت جوش والے خانہ میں آئے۔ اور ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔

حضرت جوش ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازم تھے۔ ایک بار نظام دکن سے کسی بات میں اختلاف ہو گیا۔ تو آپ نے ملازمت ہی چھوڑ دی۔ اور اپنے وطن چلے آئے۔ ان کے چلے آنے کے بعد بھی نظام نے آپ کی پانچ سو روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ اور بہت چاہا۔ کہ آپ واپس حیدرآباد چلے آئیں۔ مگر آپ نہ گئے۔ اس کے بعد حیدرآباد کے ولی عہد کے ساتھ آپ کے گہرے مراسم رہے۔ اور ولی عہد نے بھی بہت کوشش کی۔ کہ آپ حیدرآباد واپس چلے آئیں۔ مگر آپ اپنی خودداری کے باعث نہیں گئے۔

حضرت جوش کی معصومیت اور لاپرواہی کا ایک واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ رسالہ "آج کل" کے ایڈیٹر تھے۔ تو آپ کا ایک خط ایڈیٹر "ریاست" کے پاس پہنچا۔ جس پر سرکاری سروس کا ٹکٹ تھا۔ اور خط قطعی پرائیویٹ تھا۔ یعنی اس کا سرکاری کاروبار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد تیسرے روز آپ تشریف لائے۔ تو میں نے یہ لفافہ آپ کو دکھایا۔ اور بتایا۔ کہ آپ کو پرائیویٹ خط و کتابت کے لئے سرکاری ٹکٹ استعمال نہ کرنا چاہیئے تھا۔ آپ نے یہ دیکھ کر پوچھا۔ کہ حرج تھا۔ میں نے کہا۔ کہ اتنا ہی حرج تھا۔ کہ آپ اگر قید نہ ہوں۔ تو کم از کم سرکاری ملازمت سے فوراً موقوف ہو سکتے تھے۔ یعنی آپ کو علم ہی نہ تھا۔ کہ پرائیویٹ خط و کتابت کے لئے سرکاری ٹکٹ استعمال کرنا جرم ہے۔

جوش صاحب خط و کتابت کے معاملہ میں بھی بے حد غیر محتاط ہیں۔ اور اپنے ہاتھ سے خط و کتابت میں بعض ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں۔ جو اگر پبلک میں آ جائیں۔ تو آپ کے دشمن یا مخالف ان کا غلط استعمال کرتے ہوئے آپ کو پبلک میں کھڑا ہونے کے قابل نہ چھوڑیں۔ حالانکہ ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوتی۔ صرف بے احتیاطی کے باعث یہ خطوط نقصان پہنچانے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے حضرت جوش کے ہندوستان سے پاکستان چلے جانے کے بعد ہندوستان میں یا پاکستان میں ان کی مخالفت کی۔ انہوں نے انسانیت پر بہت ظلم کیا۔ کیونکہ ایک شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے لئے تمام دنیا ہی اس کا وطن ہے۔ وہ تمام دنیا کے لئے پیدا ہوا۔ اور تمام دنیا کے لئے مرے گا۔ اور حضرت جوش جیسے

Marfat.com

سیاسیات سے قطعی بے تعلق شخص کے خلاف سیاست کے پردہ میں بیٹھ کر حملے کرنا تو یقیناً پست فطرتی کا مظاہرہ ہے۔ جسے معقولیت پسند حلقوں میں قابل تعریف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کیا سکھ ہندو نہیں

مَیں بچپن کے زمانہ میں سکھوں کو ہندوؤں سے قطعی الگ سمجھتا تھا۔ یعنی سکھوں کو ہندو قرار نہ دیتا تھا۔ جس کی وجہ مجھ پر میرے سکھ دوستوں کے حلقہ کے اثرات تھے۔ جو اپنے آپ کو ہندو نہ سمجھتے تھے۔ ورنہ مجھے نہ ہندوؤں کے مذہب سے کوئی واقفیت تھی نہ سکھوں کے مذہب کا کوئی علم۔ اور اگر کوئی شخص میری موجودگی میں سکھوں کو ہندوؤں کا ایک حصہ قرار دیتا۔ تو مَیں اسے بُرا محسوس کرتا۔ اور بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔

ناگپور جیل میں مجھے کوئی کام نہ تھا۔ اور بیکار رہنا میری فطرت کے خلاف ہے۔ مَیں نے جیل کی لائبریری سے کتابوں کی فہرست منگائی۔ تو مَیں نے دیکھا۔ کہ اس فہرست میں ہندی زبان کی بہت اچھی اچھی کتابیں موجود ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے اور اپنے وقت کو ضائع نہ ہونے دینے کے لئے جیل کی اس لائبریری سے ہندی کی کچھ کتابیں منگا لیں۔ اور دن بھر ان کتابوں کو پڑھتا اور ہندی لٹریچر اور ہندی کتابوں کا یہ مطالعہ کرتے ہی مجھے خیال آیا۔ کہ مَیں ہندی زبان کے بلند ترین شعرا کے کلام کا "ریاست" میں کیوں ترجمہ شروع نہ کر دوں۔ چنانچہ مَیں نے اس جیل میں ہی بہاری اور پدماکر وغیرہ ہندی زبان کے بلند شعرا کے کلام کا ترجمہ شروع کر دیا۔ جو "ریاست" کے نئے جاری کیے جانے والے کالم "جذبات مشرق" کے کئی ماہ کے لئے کافی تھا۔ اور جیل سے رہا ہوتے ہی مَیں نے اس نئے مستقل کالم کو "ریاست" میں جاری کر دیا۔

اس کالم کو جاری ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ اور مَیں جب کرسمس کے دنوں میں کلکتہ گیا۔ تو راستہ میں بنارس اُتر کر مَیں نے دو سو روپیہ مالیت کی اور کتابیں ہندی زبان کی خرید لیں کیونکہ بنارس ہندی زبان کا مرکز ہے۔ اور وہاں اچھی سے اچھی کتابیں مل سکتی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ مَیں نے گورمکھی زبان کی اچھی اچھی کتابیں جمع کر لیں۔ اور گورمکھی زبان کی ان کتابوں میں گورو صاحب کے بعد سکھوں کے لئے سب سے زیادہ قابل احترام شخصیت بھائی گورداس کی تصانیف اور سکھ لٹریچر کی مشہور تصنیف بچتر ناٹک بھی تھیں۔ جو ادبی اعتبار سے بہت ہی بلند ہیں۔ جب پنجابی زبان کا بھی یہ لٹریچر مَیں نے جمع کر لیا۔ اور اس کا ترجمہ شروع کیا۔ تو ایک روز مَیں نے دیکھا۔ کہ بچتر ناٹک (جو گورو گوبند سنگھ کی تصنیف ہے) میں سری کرشن اور رادھا جی کی تعریف میں اشعار ہیں۔ جن کو لٹریری اعتبار سے بہت ہی بلند قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے ان اشعار کا ترجمہ تو "ریاست" میں شروع کر دیا۔ مگر میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کہ اگر یہ کلام گورو گوبند سنگھ کا ہے۔ یا گورو گوبند سنگھ کے ارشاد کے مطابق یہ کلام بچتر ناٹک میں شامل کیا گیا۔ اور ان اشعار میں سری کرشن اور رادھا جی کی تعریف کی گئی ہے۔ تو یہ کہنا کس قدر کذب بیانی

Marfat.com

ہے۔ کہ سکھ ہندو نہیں۔ اور جس صورت میں کہ گورو صاحب سری کرشن اور رام جی کے معترف تھے۔ یہ کہنا ایک مذہبی ظلم ہے۔ کہ سکھ ہندو نہیں۔ اور وہ ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں چنانچہ میں نے اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے قادیان کے ایک احمدی مبلغ گیانی عباد اللہ (جو سکھ لٹریچر پر اتھارٹی ہیں) کو ایک خط لکھا جس میں درخواست کی گئی کہ آپ سکھوں اور ہندوؤں کے مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالیں۔ گیانی صاحب "ریاست" اور ایڈیٹر "ریاست" کے معترف ہیں۔ آپ نے اس خط کے جواب میں ایک بہت طویل خط لکھا اور اس میں دوسرے سکھ لٹریچر کے علاوہ گورو گرنتھ صاحب کے بھی حوالے دیئے جن سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ گورو صاحبان رام اور کرشن کے معترف یا بھگت تھے۔ میں نے جب یہ خط دیکھا۔ تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دہلی کے ایک سکھ کتب فروش کے ہاں سے اٹھارہ روپیہ میں ایک چھوٹے سائز کا گورو گرنتھ صاحب منگایا اور دیکھا۔ کہ جن شبدوں کا گیانی عباد اللہ نے حوالہ دیا ہے۔ وہ تمام شبد گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہیں چنانچہ ان شبدوں کو دیکھنے کے بعد میں نے سکھوں کی تین اہم شخصیتوں (جو سکھوں کو ہندوؤں سے الگ تسلیم کرنے کے مدعی تھے) پروفیسر جودھ سنگھ ایم اے خالصہ کالج امرتسر۔ سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ آف باگڑیاں (جو ریاست ہائے نابھ پٹیالہ اور جھیند کے مذہبی منسٹر تھے) اور سردار امر سنگھ کو خط لکھے اور دریافت کیا۔ کہ گورو گرنتھ صاحب کے ان شبدوں کے متعلق ان سکھوں کی کیا پوزیشن ہے جو سکھوں کو ہندوؤں کا ایک حصہ نہیں بلکہ ان کو ہندوؤں سے بالکل الگ قرار دیتے ہیں۔ ان تین اصحاب میں سے سردار امر سنگھ نے تو لکھا کہ آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے اس لیے آپ تفصیل سے جواب نہیں دے سکتے اور کچھ عرصہ بعد جواب دیں گے اور اس کے بعد ان کا کبھی بھی کوئی جواب نہ آیا۔ پروفیسر جودھ سنگھ کا نہ صرف کوئی جواب نہ آیا بلکہ آپ نے خط پہنچنے کی بھی کوئی اطلاع نہ دی اور سردار بہادر بھائی ارجن سنگھ آف باگڑیاں کا ایک طویل خط پہنچا جس میں گورو گرنتھ صاحب کے صرف ان شبدوں کو نقل کر دیا گیا تھا جو سری کرشن اور رام چندر جی کے خلاف یا ان کی تعلیم اور آئیڈیالوجی سے اختلاف رکھتے تھے۔ جب تینوں اصحاب کو لکھے گئے خطوط کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا تو میں نے سردار بھائی ارجن سنگھ آف باگڑیاں کو تو یہ جواب دیا کہ آپ کے خط اور حوالہ جات کا مطلب تو یہ ہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں متضاد خیالات موجود ہیں اور آپ کا ایسا کہنا سکھ مذہب کی بہت بڑی توہین ہے۔ چنانچہ میں نے "ریاست" میں کئی ایک ایڈیٹوریل لکھے جن میں سکھوں کے لیڈروں کو چیلنج کیا گیا۔ کہ ان کے پاس ان شبدوں کا کیا جواب ہے۔ جو گورو گرنتھ صاحب میں سری کرشن اور رام چندر جی کی تعریف میں ہیں۔

جب "ریاست" میں یہ ایڈیٹوریل شائع ہوئے تو دہلی ہندو مہاسبھا کے ایک لیڈر دفتر "ریاست" میں تشریف لائے۔ یہ پہلے کبھی کبھی ملا کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اگر سکھوں کو ہندو ثابت کرنے کی یہ تحریک زور کے ساتھ شروع کی جائے تو سیٹھ برلا و برلا فیملی میں ایک سیٹھ برلا تو گاندھی بھگت اور کانگریسی ہیں اور دوسرے سیٹھ برلا کٹر کلاس کے ہندو مہاسبھائی ہیں) اس تحریک کے لیے بہت کافی روپیہ دے سکتے ہیں۔ میں نے جب ہندو مہاسبھائی

Marfat.com

کا یہ ارشاد سنا تو میں مسکرا دیا اور کہا کہ اگر تحریک جاری کروں گا یا مضامین لکھوں گا تو روپیہ کے لالچ سے نہیں کیونکہ روپیہ لے کر تحریک جاری کرنا ایک کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ میں نے جو لکھا وہ میرے ضمیر کی آواز تھی اور آئندہ بھی اگر لکھوں گا تو صرف اپنے ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر۔ ہندو مہاسبھا کے یہ لیڈر تو میرا جواب سن کر تشریف لے گئے اور میں نے اس کے بعد بھی کئی اڈیٹوریل اپنی زندگی میں لکھے۔ جن میں صاف کہا گیا تھا۔ کہ گرو گرنتھ صاحب اور سکھ لٹریچر کی تعلیم کی موجودگی میں یہ کہنا۔ کہ سکھ ہندو نہیں ہیں اور ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں اپنے منہ کو گندہ کرنا ہے اور سکھوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مذہباً ہندوؤں سے بے تعلق ہیں ایک بہت بڑی کذب بیانی ہے جس کی مذہبی دنیا میں اجازت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ میں اب بھی اس خیال کا مدعی ہوں کہ ہندوؤں میں سکھوں کی پوزیشن بالکل ایسی ہے۔ جیسی سناتن دھرمیوں، آریہ سماجیوں، جینیوں اور بودھوں وغیرہ کی۔ یعنی یہ ہندو قوم کا ایک حصہ اور فرقہ ہیں۔ یہ ہندوؤں سے قطعی الگ نہیں اور میں اپنے ضمیر کی اس آواز پر قائم رہوں گا۔ کیونکہ سکھ ازم کی تعلیم کے مطابق حق و صداقت کی آواز پیدا کرنا اس کا پابند رہنا ہی سکھ ازم ہے اور میں ان سکھوں کا سکھ ہونا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جو وقتی جذبات سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے دشمن ہیں یا جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب میں قتل کر کے ننگِ انسانیت اور ننگ سکھ ازم شعار کا ثبوت دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلی اور آخری ملاقات

اڈیٹر ریاست۔ گو زندگی بھر مولانا آزاد کا معترف اور مداح رہا اور مولانا کی تحریروں کا پڑھنا ہی اس کو صحافتی دنیا میں لانے کا سب سے بڑا سبب تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۵۸ء کی یکم جنوری سے پہلے اسے کبھی بھی مولانا کی کوئی تقریر سننے یا مولانا سے ہم کلام ہونے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اڈیٹر "ریاست" نے بہت ہی کم اور کبھی ہی کسی کانفرنس یا جلسہ میں شرکت کی۔ مولانا فطرتاً ایک تنہائی پسند شخصیت تھے اور اڈیٹر "ریاست" بھی اب کئی برس سے بیس بیس روز اور ایک ایک ماہ تک اپنے گھر سے باہر نہیں جاتا اور اب یہ تنہائی میں ایسا ہی لطف محسوس کرتا ہے جیسے کوئی پرندہ طویل عرصہ تک کسی پنجرے میں رہنے کے بعد اپنے قفس کو چھوڑنا نہ چاہتا ہو اور مرحوم سید اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر پر عامل ہو۔

پر شکستہ ہوں قفس میں نہ رہا ذوقِ چمن
ولولے دل کے گئے قوتِ پرواز کے ساتھ

چنانچہ گو مرحوم مولانا سے ملنے اور ہم کلام ہونے کا کبھی اتفاق نہ ہوا مگر اطلاعیں ملتی رہتی تھیں کہ آپ اڈیٹر "ریاست" کے بہت بڑے مداحوں میں سے ہیں اور "ریاست" سالہا سال سے مسلسل اور شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور آپ نے بعض لوگوں سے اڈیٹر "ریاست" کی اکثر تعریف کی۔

Marfat.com

ایڈیٹر "ریاست" اور مولانا کے اس تعلق یا بے تعلقی کی کیفیت میں دسمبر ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے کہ جب کتاب "ناقابلِ فراموش شائع ہوئی تو اس کتاب کی ایک جلد مولانا کو بھی بھیجی گئی اور ساتھ خط لکھا گیا کہ اگر آپ اس کتاب کو کبھی فرصت کے وقت ملاحظہ فرمائیں گے تو یہ ایڈیٹر "ریاست" کے لیے عزت اور فخر کا باعث ہوگا۔ اس کتاب کے مرحوم مولانا کے پاس پہنچنے کے بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مولانا ملیح آبادی مولانا آزاد کے ساتھ "الہلال" اور "البلاغ" میں سالہا سال تک کام کرتے رہے ہیں اور اب چونکہ آپ دہلی میں تھے آپ مرحوم مولانا سے ملنے ہفتہ عشرہ میں ضرور جایا کرتے تھے۔ اور اس وقت شاید دو شخصیتیں یعنی مولانا ملیح آبادی اور مرحوم مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر اجمل خاں ہی ایسے ہیں جو مرحوم مولانا کے ساتھ سالہا سال تک رہے اور جن کو مرحوم مولانا کی سب سے زیادہ قربت حاصل تھی) آپ سے ملنے کے لیے گئے تو آپ نے ملیح آبادی صاحب سے ایڈیٹر "ریاست" کی تعریف کی اور ملیح آبادی صاحب نے دیکھا۔ کہ کتاب "ناقابلِ فراموش" آپ کے پاس چھوٹی تپائی پر پڑی ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کتاب آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ ملیح آبادی صاحب مرحوم مولانا سے مل کر واپس آئے تو انہوں نے ٹیلیفون پر بتایا کہ کتاب مرحوم مولانا کے پاس تپائی پر پڑی تھی اور مرحوم نے ایڈیٹر "ریاست" کی تعریف کی اور ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ کہ یہ بھی کہا۔ کہ وہ ایڈیٹر "ریاست" کے لیے مفید ثابت ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ایڈیٹر "ریاست" نے کہا۔ کہ اب جب پھر مولانا کے ہاں جائیے تو کوئی وقت مقرر کر لیجئے۔ جب وہ حکم دیں میں حاضر ہو جاؤں گا۔ مولانا کا نیاز حاصل کرنا میرے لیے عزت اور سعادت کا باعث ہوگا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ملیح آبادی صاحب مولانا سے پھر ملے تو مولانا نے ان سے فرمایا۔ کہ میں مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں صاحب کو ٹیلیفون کر کے ملنے کی تاریخ اور وقت پوچھ لوں۔ چنانچہ اجمل خاں صاحب کو ٹیلیفون کیا تو آپ نے مولانا سے دریافت کر کے جواب دیا۔ کہ یکم جنوری کو صبح ساڑھے نو بجے ملنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ میں اس سال کی پہلی تاریخ کو صبح سوا نو بجے کے قریب مولانا کی کوٹھی پہنچ گیا اور ٹھیک ساڑھے نو بجے اجمل خاں صاحب نے مجھے مولانا کے کمرے میں بھیج دیا۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا اور مولانا کو سلام کیا تو مولانا نے اپنے قریب اور سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور اس وقت جو بات چیت ہوئی وہ کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے اور وہ بات چیت یہ تھی:

ایڈیٹر "ریاست": یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آج میں آپ جیسی بلند ترین شخصیت سے ملنے اور ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے صرف ایک بار الٰہ آباد میں مرحوم پنڈت موتی لال نہرو کی کوٹھی پر آپ کے نیاز حاصل کرنے کا اتفاق ہوا۔ پنڈت جی کے بھتیجے پنڈت شام لال نہرو ممبر مرکزی اسمبلی میرے دوست تھے۔ ان کے ہاں مقیم تھا تو وہ پنڈت موتی لال جی سے ملانے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور آپ بھی اس وقت پنڈت جی کے ہاں تشریف فرما تھے۔

Marfat.com

مولانا: نہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک بار آپ سے ملنے کا اتفاق ہُوا ہے۔ میں سول لائنز کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا اور میں کھانا کھا رہا تھا اور آپ بھی وہاں کھانا کھانے کے لیے آئے تھے۔

(میں یہ سن کر مولانا کی قوتِ یادداشت کے متعلق حیران رہ گیا کیونکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ بہت برس ہوئے۔ میٹکاف ہاؤس کے قریب ایک کوٹھی میں سر کیلاش ژرائن ہکسر کے بھائی کے داماد کا ایک ہوٹل تھا جس کا نام غالباً سول ملٹری ہوٹل تھا۔ میں اس ہوٹل میں رات کو ڈنر کھایا کرتا تھا اور اس کے لیے غالباً ساٹھ روپیہ ماہوار دیتا تھا۔ ایک روز رات کو میں ڈنر کھانے کے لیے وہاں گیا اور ہوٹل کے ایک خانہ میں داخل ہُوا تو وہاں مولانا کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جب دیکھا کہ مولانا تشریف فرما ہیں تو میں فوراً ہی واپس آگیا اور دوسرے خانہ میں چلا گیا۔ مولانا سے نہ تو واقفیت تھی اور نہ کبھی اس سے پہلے بات کرنے کا اتفاق ہُوا اور نہ اس وقت کوئی بات ہوئی مگر آپ کو یہ واقعہ یاد رہا)۔

ایڈیٹر "ریاست": تو پھر میں نے اس ہوٹل کے واقعہ سے بھی پہلے ایک بار آپ کا نیاز حاصل کیا ہے۔ میں اور خواجہ حسن نظامی دہلی سے جب ایک روزانہ اردو اخبار جاری کرنے والے تھے۔ تو میں اور خواجہ صاحب آپ کا نیاز حاصل کرنے مرحوم حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاں گئے تھے جہاں کہ آپ مقیم تھے۔ اخبار کا نام ابھی زیرِ تجویز تھا اور آپ نے دریافت فرمایا تھا۔ کہ اخبار کا نام کیا ہوگا تو خواجہ صاحب نے بتایا کہ "غریبوں کا اخبار" یہ سن کر اور اخبار کے نام کی طوالت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے طنزاً فرمایا تھا۔ کہ ابھی یہ نام بہت مختصر ہے۔ نام ہونا چاہیئے "غریبوں کا اخبار قیمت ایک آنہ" چنانچہ آپ کے اس طنز کے باعث ہی مختصر نام "رعیت" تجویز کیا گیا تھا۔

مولانا: مجھے یہ واقعہ یاد نہیں۔

ایڈیٹر "ریاست": میرے حاضر ہونے کا ایک عرصہ سے مقصد یہ بھی تھا کہ میں کچھ پرانے کاغذات آپکی خدمت میں پیش کر دوں۔ یہ کاغذات غدر کے زمانہ کے ہیں جو بہادر شاہ بادشاہ سے سمبندھی مرزا الٰہی بخش کے خاندان کی ایک خاتون نے مجھے بطور امانت رکھنے کے لیے دیے جبکہ وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلی گئی تھیں۔ پاکستان جانے کے بعد اس خاتون کا وہاں انتقال ہو گیا (یہ کہتے ہوئے میں نے یہ کاغذات مولانا کی خدمت میں پیش کر دیے۔ ان کاغذات میں کچھ تو پہلے زمانے کے وائسرائے لارڈ لٹن کے خطوط ہیں۔ کچھ اس زمانے کے سیکرٹریوں کی چٹھیاں۔ کچھ نکاح نامے اور کچھ مولویوں کے جائز و ناجائز اولاد کے متعلق فتوے کیونکہ بہادر شاہ کے خاندان میں یہ جھگڑا رہتا تھا۔ کہ فلاں اولاد بغیر نکاح پیدا ہوئی۔ جو ناجائز ہے اور فلاں نکاح کے بعد جو جائز قرار دی جا سکتی ہے اور اس سلسلہ میں مفتیوں سے فتوے حاصل کیے جاتے تھے۔ مولانا ان کاغذات کو بہت غور اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتے رہے اور آپ نے یہ کاغذات اپنے پاس رکھ لیے۔

مولانا: آپ کے اخبار کا آجکل کیا حال ہے؟

Marfat.com

ایڈیٹر "ریاست" ایسا ہی حال ہے جیسا دوسرے اخبارات کا۔ اب تو زمانہ ان اخبارات کا ہے جن کی پشت پر کروڑپتی سرمایہ دار ہوں اور جو لاکھوں روپیہ صرف کریں اور لاکھوں روپیہ ان اخبارات سے بطور تجارت فائدہ حاصل کریں۔

مولانا۔ آپ نے بھی تو اپنی زندگی میں اخبار سے بہت روپیہ پیدا کیا۔

ایڈیٹر "ریاست": جو روپیہ پیدا کیا وہ یا تو سابق والیانِ ریاست کے ساتھ مقدمہ بازی میں صرف ہوا اور یا اخبار کو بلند کے جانے پر۔ اخبار کی ضخامت ستر ستر صفحے کی تھی اور بارہ بارہ صفحہ آرٹ پیپر پر تصاویر ہوتی تھیں۔ بغیر روپیہ صرف کیے تو اتنا شاندار اخبار جاری نہ رکھا جا سکتا تھا۔ اور مقدمات پر بھی پانی کی طرح روپیہ صرف ہوا۔ صرف نواب بھوپال والے مقدمہ پر ہی میرا اسی ہزار روپیہ اور نواب بھوپال کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

مولانا: ہاں۔ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایڈیٹر "ریاست": اس کے علاوہ جو لوگ روپیہ سے محبت نہ کریں ان کے پاس روپیہ رہا نہیں کرتا۔

مولانا: آپ نے بھی زندگی بھر روپے سے محبت نہ کی اور اسے خوب صرف کرتے رہے۔

ایڈیٹر "ریاست": میں روپیہ جمع کرنے کو زندگی بھر ایک کمینہ پن سمجھتا رہا۔

مولانا: میں نے سنا ہے کہ آپ مقروض بھی ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست": یہ کوئی نئی بات نہیں۔ زندگی میں کوئی دن بھی ایسا نہ تھا جب میں مقروض نہ تھا۔

مولانا: اس وقت کتنا قرضہ ہوگا۔

ایڈیٹر "ریاست": اخبار کے ذمے چھ ہزار روپے کے قریب ہے اور میرے ذمے چار ہزار روپے کے قریب۔ ایک دوست نے اخبار کا نصف قرضہ ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

مولانا: اب اخبار میں نقصان کتنا ہے۔

ایڈیٹر "ریاست": ایک دوست اپنی فیاضی اور محبت کا ثبوت دیتے ہوئے کاغذ کے تمام مصارف ادا کر دیتے ہیں اور اس کے بعد غالباً اڑھائی تین سو روپے ماہوار کے قریب نقصان ہے۔

مولانا: آپ قرضہ اقساط کی صورت میں کیوں ادا نہیں کر دیتے۔

ایڈیٹر "ریاست": اقساط کے ذریعہ قرضہ تو تب ادا کیا جائے اگر منافع ہو۔ نقصان ہو تو اقساط کہاں سے آئیں۔

مولانا: کیا اخبار اب ٹرسٹ کی ملکیت میں ہے۔

ایڈیٹر "ریاست": جی ہاں۔ یہ اب ٹرسٹ کی ملکیت میں ہے۔ مرحوم مسٹر رفیع احمد قدوائی کے ایماء سے یہ ٹرسٹ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اور مرحوم نے فرمایا تھا کہ آپ تیس ہزار روپے کا انتظام کر دیں گے تاکہ اخبار پھر اپنی پہلی شان حاصل کر سکے مگر مرحوم نے پانچ ہزار کے قریب دیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں اس کی تصاویر اور ضخامت میں اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ

Marfat.com

۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ اس سال اس پر سترہ ہزار روپے کے قریب صرف ہوا جو دوستوں نے اور مرحوم تندوانی صاحب نے دیا۔

مولانا: ٹرسٹی کون کون لوگ ہیں۔

ایڈیٹر "ریاست": ایک میر مشتاق احمد، دوسرے سردار لچھمن سنگھ گل ٹھیکہ دار اور میں۔

مولانا: کیا یہ ٹرسٹی روپے کا انتظام نہیں کرتے۔

ایڈیٹر "ریاست": سردار لچھمن سنگھ نے تو ایک بار پانچ ہزار روپیہ دیا تھا۔ میر صاحب کی مالی حالت مجھ سے بھی زیادہ گئی گزری ہے۔

مولانا: کیا کتاب "ناقابلِ فراموش" کافی فروخت ہو رہی ہے۔

ایڈیٹر "ریاست": کتاب تو کافی فروخت ہو رہی ہے۔ مگر جو روپیہ آتا ہے وہ دفتر میں ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا موجودہ پہلا ایڈیشن دو ماہ میں ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ پنجاب اور کئی ایک دوسرے صوبہ جات کی گورنمنٹوں سے خط و کتابت ہو رہی ہے مجھے توقع ہے کہ یہ گورنمنٹیں کافی جلدیں خریدیں گی۔

مولانا: اگر آپ چاہیں تو میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرتاپ سنگھ کیروں سے کتابیں کافی تعداد میں خریدنے کے لیے کہہ سکتا ہوں۔

ایڈیٹر "ریاست": وہ میرے بھی سالہا سال کے گہرے دوست ہیں اور اطلاع آئی ہے کہ پنجاب گورنمنٹ کافی جلدیں خریدے گی اور مسٹر زندھاوا نے بھی خود ہی پنجاب گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ ایسی اچھی کتاب وہاں کی ہر لائبریری میں ہونی چاہیے۔ آپ اس کے متعلق سردار پرتاپ سنگھ سے نہ کہیئے۔ آپ کی پوزیشن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بلند ہے۔

مولانا: کئی روز ہوئے میں نے فیصلہ کیا تھا۔ کہ آپ کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیئے۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے دو سو روپے ماہوار آپ کے لیے مقرر کرتا ہوں۔

ایڈیٹر "ریاست": میں آپ کا اس کے لیے شکر گزار ہوں مگر بہتر ہو کہ آپ مقرر نہ کیجیے جس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ پنشن پانے والے لوگ عام طور پر جلدی مر جاتے ہیں اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اور دوسرے اگر گورنمنٹ نے پانچ سات یا دس برس کے بعد یہ پنشن بند کر دی تو پھر مجھے تکلیف ہو گی۔

مولانا: (مسکراتے ہوئے) نہیں۔ پنشن پانے والوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ جلدی مر جائیں۔ لوگ بہت طویل عرصہ تک بھی پنشن پاتے ہیں اور میں اس کے لیے انتظام کر رہا ہوں اور خود حکم لکھوں گا کہ یہ پنشن ہمیشہ جاری رہے۔ آپ کی زندگی میں کبھی بھی بند نہ ہو۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ آپ کے سیکرٹری محمد اجمل خاں صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور آپ نے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا ٹیلیفون آیا ہے کہ وہ دس بجے ملنے کے لیے آ رہے ہے

Marfat.com

کے لیے آرہے ہیں۔ یہ سن کر مولانا نے اجمل خاں صاحب سے کہا۔ کہ جواہر لال جی سے کہہ دو کہ وہ گیارہ بجے آئیں میں ابھی باتیں کر رہا ہوں۔ مولانا کا یہ جواب سن کر اجمل خاں صاحب تو پنڈت جواہر لال جی کو ٹیلیفون کرنے چلے گئے اور میں حیران کہ ہندوستان کا وزیر تعلیم یہاں کے وزیر اعظم کو کہہ رہا ہے کہ ابھی نہ آئیں وہ ابھی باتیں کر رہے ہیں مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ خلاف توقع نہیں کیونکہ پنڈت جواہر لال نہرو جی مولانا کی ایسی ہی عزت کرتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے بزرگوں کی کرتا ہے اور مولانا بھی پنڈت جی کو اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔ ہم نے پھر باتیں شروع کی ہی تھیں کہ اجمل خاں صاحب پھر آئے اور انہوں نے بتایا کہ پنڈت جی تو اپنی کوٹھی سے چل چکے ہیں اور پنڈت جی کے سیکرٹری نے بتایا ہے کہ وہ پہلے رادھا کرشنن جی (ہندوستان کے نائب صدر) کے ہاں جائیں گے اور وہاں سے یہاں تشریف لائیں گے۔ یہ سن کر مولانا نے کہا کہ رادھا کرشنن جی کے ہاں پنڈت جی کو ٹیلیفون کردو کہ میں ابھی مصروف ہوں وہ گیارہ بجے آئیں۔ اس پر اجمل خاں صاحب نے عرض کیا۔ کہ چند گز کے فاصلے پر تو رادھا کرشنن جی کی کوٹھی ہے۔ پنڈت جی وہاں گیارہ بجے تک کہاں انتظار کرتے رہیں گے۔ یہ سن کر مولانا نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی اور دیکھا کہ دس بجنے میں ابھی دس منٹ باقی ہیں۔ چند لمحے آپ نے سوچا اور کہا اچھا آنے دو۔ کیا حرج ہے۔ میں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ آپ بہت مصروف ہیں اور پنڈت جی بھی آ رہے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے میں جانا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ نے کہا۔ نہیں۔ دس بجنے میں ابھی دس منٹ باقی ہیں۔ تھوڑی دیر اور بیٹھئے۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا بیٹھنا مناسب نہیں۔ پانچ منٹ گزرے ہوں گے میں پھر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ اجازت دیجئے۔ میں جا رہا ہوں۔ پنڈت جی آتے ہونگے اس پر آپ نے کہا۔ اچھا جایئے مگر مجھے آپ سے ابھی بہت باتیں کرنی ہیں کسی روز پھر آیئے اور اجمل خاں سے ٹیلیفون پر وقت مقرر کر لیجئے۔ میں نے سلام کیا اور کمرے سے باہر آیا تو دیکھا کہ باہر سڑک پر دوڑ دھوپ جاری ہے۔ بھنگی سڑک صاف کر رہے ہیں اور چھ سات اصحاب پنڈت جی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں اپنی ٹیکسی میں واپس اپنے دفتر آ گیا اور راستہ میں سوچتا رہا۔ کہ مولانا کا مرتبہ اور پوزیشن کس قدر بلند ہے کہ آپ وزیر اعظم سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی فرصت نہیں ایک گھنٹہ بعد آیئے

اس ملاقات کے بعد اطلاعیں آتی رہیں کہ کانگرس کے جھگڑوں اور مسٹر کرشنا چاری کے متعلق مولانا بہت مصروف ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ اب گوہاٹی کانگرس کے اجلاس کے بعد وقت مقرر کرنے کے لیے اجمل خاں صاحب کو ٹیلیفون کروں گا۔ مگر کانگرس کے اجلاس کے دن معلوم ہوا۔ کہ مولانا گوہاٹی نہیں جا رہے۔ چنانچہ میں نے اجمل خاں صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ تو انہوں نے مولانا سے دریافت کر کے منگل کے روز صبح ساڑھے نو بجے کا وقت مقرر کیا۔ یعنی یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو تو میری پہلی ملاقات ہوئی اور یہ منگل کی ملاقات دوسری اور آخری ملاقات تھی۔

اس منگل کے روز میں صبح مولانا کی کوٹھی پہنچا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے ان کے کمرے میں داخل

Marfat.com

ہوا اور ٹھیک ساڑھے دس بجے تک یہ ملاقات ہوئی یعنی اس روز ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی اور ان باتوں میں حافظ محمد یوسف ایڈیٹر "شمع" مرحوم مہاراجہ نابھہ، موجودہ مہاراجہ نابھہ اور ان کی حقیقی والدہ کے تعلقات میں کشیدگی، مرکزی گورنمنٹ کے بعض وزرا، بخشی غلام محمد، راجکماری امرت کور، ڈاکٹر سید محمود اور بعض صوبہ جات کے وزراء کے متعلق ذکر ہوتا رہا اور شفقت و محبت کا آپ نے ان دونوں ملاقاتوں میں جو سلوک کیا اس کا خیال کرتے ہوئے اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ آئندہ ہندوستان کی اس محترم ترین شخصیت کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوگا آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور اپنی اس کیفیت میں یہی دعا کرتا ہوں کہ خدا ہندوستان کے ہر شخص کو اس محب الوطن، دیانت دار، بلند اور لائق ادیب بابا شخص کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

سفید پوشی کی مصیبتیں

بچپن کے زمانہ میں عورتوں سے پنجابی زبان کی ایک کہاوت سنی تھی "نہ موئی جٹی، نہ موئی بھرمٹی، اندر وڑ موئی کھتری" یعنی اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے یا مالی مشکلات کا شکار ہو تو نہ جٹی یعنی جاٹ کی بیوہ کو تکلیف ہوتی ہے وہ کاشت کاری یا محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی بسر کر لیتی ہے نہ بھرمٹی (براہمن کی بیوہ) کو تکلیف ہوتی ہے وہ گلی محلہ والوں سے

(ہندو ہندوؤں میں براہمنی بیوہ عورتوں کو گھروں میں سے ہر روز بطور خیرات پکی پکائی روٹی مل جاتی ہے جسے ہندو کہتے ہیں) لے کر گزارہ کر لیتی ہے مگر کھتری (یعنی کھتری کی بیوہ) کی زندگی کا بسر ہونا بے حد مشکل ہے کیونکہ وہ اپنے خاندانی وقار اور عزت کے خیال سے کسی کے سامنے نہ تو ہاتھ پھیلا سکتی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا گزارہ کر سکے یعنی سفید پوشی ایک مصیبت ہے اور سفید پوش ایک عورت ہو یا مرد اس بیچارے کو تو گھٹ کر مرنا ہی پڑتا ہے۔

میری عمر چالیس روز کی تھی جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ والد کے انتقال کے وقت ہمارے پاس کافی نقد روپیہ اور زیورات تھے جن سے دس برس کے قریب عرصہ تک گزارہ ہوتا رہا اور اس روپیہ اور زیورات سے ہی میری دو بہنوں اور ایک بھائی کی شادی ہوئی۔ اور جب میری عمر دس برس کی تھی تو نہ کوئی روپیہ تھا اور نہ کوئی زیور، کچھ ہماری امداد میرے ایک ماموں سردار نرائن سنگھ کرتے جو کشمیر میں ملازم تھے مگر یہ امداد کافی نہ ہوتی۔ ایک روز میری والدہ نے برتنوں میں سے پیتل کی ایک نئی گاگر کو اندر لے جا کر ایک بڑی اینٹ سے توڑا۔ جب یہ اس گاگر کو توڑ رہی تھیں تو میں نے معصومانہ سپرٹ میں اعتراض کرتے ہوئے اپنی والدہ سے کہا "یہ نئی گاگر کیوں توڑ رہی ہیں" تو والدہ نے کہا: "کہ اس کو بغیر توڑے ایسی حالت میں ہی فروخت کریں تو دکاندار سمجھے گا کہ ہم غریب ہو چکے ہیں جو برتن فروخت کر رہے ہیں"۔ چنانچہ گاگر کے توڑنے کے بعد میں اس کو بازار میں ایک برتن فروش لالہ منگل داس ملہوترہ کے پاس گیا اور اپنی والدہ کی ہدایت کے مطابق اس سے کہا کہ "یہ ٹوٹی ہوئی گاگر ہمارے کام کی نہیں اس کو خرید لو اور اس کی قیمت دے دو۔" چنانچہ وہ گاگر ردی پیتل کے بھاؤ خ

Marfat.com

کر کے اس کی قیمت اپنے گھر لے آیا اور والد نے اس میں سے آٹا اور گھی وغیرہ منگوایا۔ پیتل کے برتنوں کو اسی طرح بیچا
تو اُن کے بعد والد کی لائبریری کی ڈائری کی ضخیم کتابیں بھی گلی کے قریب لدھارام حلوائی کے پاس بطور ردی فروخت
کیں۔ یہ کتابیں تو شاید بیس بیس یا تیس تیس روپیہ کی ایک ہو گی مگر یہ چند پیسوں میں ہی فروخت ہوا کرتیں کیونکہ حلوائی ان
کو پکوڑے بیچنے کے لیے استعمال کرتا اور ہماری کوشش ہوتی کہ ہماری غریبی اور افلاس کا کسی دوسرے کو علم نہ ہو اور ہمارا خاندانی وقار قائم رہے۔
رڑکی ضلع سہارنپور (یوپی) کے قریب ایک تعلقہ دار رہتے جو اچھے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ تعلقہ دار اب مر چکے ہیں اور ان
کی بیوہ تنگدستی کا شکار ہیں۔ کیونکہ زمین نو یوپی کے نئے قانون کے مطابق سوشلزم کی نذر ہو گئی یعنی زمین پر کاشتکاروں
نے قبضے کر لیے اور تعلقہ دار کے مرنے کے بعد آمدنی کے ختم اور اخراجات کے جاری رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ گھر میں تنگدستی
کا دور ہے ہر روز آہستہ آہستہ گھر کا سامان فروخت ہو رہا ہے۔ ان تعلقہ دار کی بیوی نے راقم الحروف کو پیغام بھیجا کہ ان کے پاس
ان کے شوہر کا ایک قیمتی ریوالور موجود ہے جو آج آٹھ سو روپیہ سے کم قیمت پر نہیں مل سکتا اور یہ اس ریوالور کو صرف ڈیڑھ
سو روپیہ میں فروخت کر دینگی کیونکہ ہر شخص تو اس کو خرید نہیں سکتا۔ صرف وہی لوگ اس کو خرید سکتے ہیں جن کے پاس ریوالور کا لائسنس
ہو اور چونکہ راقم الحروف کے پاس ریوالور کا لائسنس موجود ہے وہ چاہتی ہیں کہ اس ریوالور کو میں خرید لوں۔ اس پیغام کو سن کر مجھ پر
وہی اثر ہوا جو ایک مصیبت زدہ یا تباہ ہو چکے شخص کی حالت دیکھ کر ہوا کرتا ہے مگر میں کیا کر سکتا تھا کیونکہ میرے پاس
پہلے ہی ایک ریوالور موجود ہے اور لائسنس صرف ایک ریوالور کا ہے دوسرے ریوالور کو کیوں کر خریدا جا سکتا ہے۔ میرے
انکار پر یہ خاتون کچھ مایوس سی ہو گئی کیونکہ ان کو توقع تھی کہ میں ان کا یہ ریوالور اس کم قیمت پر ہی خرید لوں گا۔

ایک مسلمان رئیس ڈیرہ دون میں مقیم ہیں یہ برٹش گورنمنٹ کے زمانہ میں خان بہادر خطاب یافتہ اور آنریری مجسٹریٹ
تھے۔ سالہا سال تک بطور مجسٹریٹ لوگوں کے سلام لیتے رہے مگر اب زمانہ کے انقلاب کا شکار ہیں۔ ان کے اب لوگوں کے
سلام قبول کرنے کا کیا سوال ہے یہی بہت بڑی بات ہے کہ یہ خود کسی دوسرے کو سلام کریں اور جس کو یہ سلام کریں
وہ خندہ پیشانی کے ساتھ اس سلام کا جواب دے۔ یہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لیے یہاں راجپور میں آیا کرتے ہیں اور ان سب
کا ان کے چہرے سے اظہار ہوتا ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے افلاس یا مشکلات کا ذکر نہیں کیا کیونکہ
اظہار افلاس رئیسا کی خاندانی وضعداری کے خلاف ہے اور ان کی قمیض اور واسکٹ میں چاہے پیوند لگے ہوں مگر اچکن ابھی اور قائم اکڑی ہے۔
حیدرآباد دکن کے سابق وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ۱۹۱۱ء میں پنجاب آئے اور یہ ان کا پنجاب کا پہلا اور آخری
سفر تھا۔ کیونکہ ان کا خاندان پنجاب (غالباً قصیم کرن ضلع لاہور) کا رہنے والا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ یہ جب پنجاب آئے
تو ان کے اعزاز میں بیسیوں پارٹیاں دی گئیں اور ان کی اور ان کے خاندان کی تعریف میں اخبارات نے کئی کئی کالم لکھے اور اس سفر میں انہوں
نے مذہبی اور تعلیمی اداروں کو لاکھوں روپیہ دیا۔ میں اپنی زندگی میں دوبار حیدرآباد دکن گیا ہوں ایک تو شروع کے زمانہ میں "ہمدم" لکھنؤ میں
کام کرنے کے بعد ملازمت کی تلاش میں اور دوسرے مہاراجہ نابھہ کے گدی سے معزول ہونے کے بعد پیغام لے کر۔ میں نے دونوں
مرتبہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی خدمت میں حاضری دی اور طویل ملاقاتیں کیں۔ ایک روز باتوں باتوں میں مہاراجہ بہادر سے میں نے کہا کہ "اب تو
پنجاب گئے آپ کو بہت برس ہو گئے کبھی تشریف لے چلیے تا کہ پنجاب کے لوگ آپ کا نیاز حاصل کر سکیں"۔ مہاراجہ نے اس کا جو جواب دیا وہ
مجھے اب تک یاد ہے۔ آپ نے فرمایا "سردار صاحب میرا سفر کرنا آسان نہیں لاکھوں روپیہ کے مصارف کا سوال ہے"۔ یعنی یہ ممکن
تھا کہ مہاراجہ سفر میں جاتے تو لاکھوں روپیہ صرف نہ کرتے اور مہاراجہ کی فیاضیوں کی کیفیت یہ تھی کہ ان کو اس زمانہ میں دس لاکھ روپیہ سالانہ

Marfat.com

جاگیر سے آمدنی تھی مگر آپ زندگی بھر مقروض رہے یعنی ان کا خاندانی وقار ان کو سفر کی بھی اجازت نہ دیتا تھا حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ پھر پنجاب کے دورہ پر جائیں۔

مرحوم سردار سردول سنگھ کویشر نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک بار سردار صاحب کالکا سے پیدل کسولی پہاڑ پر گئے اس زمانہ میں کسولی جانے کے لیے صرف پیدل یا گھوڑے کی سواری ہی ذریعہ تھے یعنی نہ تو کسولی جانے کے لیے موٹریں تھیں اور نہ موٹروں کے لیے سڑک ہی تھی۔ کالکا سے کسولی سات میل کا فاصلہ ہے اور راستہ میں کسولی سے دو میل کالکا کی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی ریاست تھی (انگریزوں کے زمانہ میں ضلع شملہ میں تیرہ چھوٹی چھوٹی پہاڑی ریاستیں تھیں جن میں سے بعض کی آمدنی چند ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ نہ تھی مگر ان کے حکمرانوں کو پورے اختیارات تھے) سردار صاحب کسولی جاتے ہوئے راستہ میں اس ریاست کے ہیڈکوارٹر میں بھی چلے گئے جہاں ایک صاحب چارپائی پر بیٹھے تھے۔ سردار صاحب نے پوچھا کہ راجہ صاحب کہاں ہیں تو اس شخص نے جواب دیا "آپ بیٹھئے راجہ صاحب ابھی آتے ہیں۔" یہ شخص یہ کہہ کر اپنے مکان کے اندر چلا گیا اور اچھے کپڑے بدل کر آ گیا اور آتے ہی کہا "فرمائیے کیا کام ہے میں اس ریاست کا راجہ ہوں۔" یہ دیکھ کر سردار سردول سنگھ مسکرا دیئے کیونکہ جو شخص پہلے چارپائی پر بیٹھا تھا وہی دراصل راجہ تھا اور وہ کپڑے بدلنے اس لیے مکان کے اندر گیا تا کہ راجہ صاحب کے افلاس اور غربت کا اظہار نہ ہو۔ بعد میں سردار صاحب کو باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس راجہ صاحب کے علاقہ کا رقبہ دو میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے جنگل کی لکڑی اور ریاست کے ریونیو سے دو ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے اور راجہ صاحب کے اصطبل میں تین بکریاں ہیں جن کا راجہ صاحب دودھ بھی پی لیتے ہیں۔

بالائی آمدنی

ہندوستان اور پاکستان میں اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کا رشتہ کرنا چاہے تو لڑکی کی ماں یا لڑکی کا باپ رشتہ کی بات چیت کرتے ہوئے یہ دو سوال ضرور کرے گا۔ پہلا: لڑکے کی تنخواہ کیا ہے۔ دوسرا اوپر سے آمدنی کیا ہے۔ یعنی لڑکا چاہے بطور ملازم کے سو روپیہ تنخواہ پاتا ہو یا دو سو روپیہ یا پانچ سو روپیہ تنخواہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر اس کو اوپر (یعنی رشوت) کی آمدنی نہ ہو اور اگر وہ کسی سکول یا ڈاک خانہ میں ملازم ہے۔ جہاں کہ رشوت کا ملنا ممکن نہیں تو لڑکے کی یہ بہت بڑی ڈس کوالیفکیشن ہے اور اس ڈس کوالیفکیشن کے باعث رشتہ سے انکار ممکن ہے کیونکہ اگر رشوت نہ ملتی ہو تو صرف تنخواہ کو پبلک میں "سوکھی تنخواہ" قرار دیا جاتا ہے۔ اوپر کی آمدنی (یعنی بالائی آمدنی) کی یہ صورتیں ہیں۔

راقم الحروف کے پڑوس میں ایک آنریری مجسٹریٹ رہتے تھے جو آنریری مجسٹریٹ مقرر ہونے سے پہلے پنجاب میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے اور پنشن پانے کے بعد آپ دہلی آ گئے۔ کیونکہ ملازمت کے چند آخری سال ہی تھے اور یہاں لوگوں سے ان کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ یہ بطور سرکاری ملازم کے اور بطور آنریری مجسٹریٹ دیانت دار افسروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ کیونکہ یا تو رشوت نہ لیتے تھے یا کمزور طبیعت کے باعث ان میں رشوت لینے کی جرأت ہی نہ تھی۔ مگر یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ان کے گھر کے اخراجات مثلاً آٹا۔ دالیں، لکڑی، سبزی، گھی اور گوشت وغیرہ تمام ان کے ریڈر کے ذمہ تھا۔ یہ ریڈر صبح سات آٹھ بجے ان کے مکان پر پہنچتا اور بی بی جی (یعنی مجسٹریٹ صاحب کی بیوی) سے پوچھ کر وہ تمام اشیاء ایک کاغذ پر لکھ لیتا۔

Marfat.com

جن کی گھر میں ضرورت ہوتی۔ وہ بازار جا کر کچہری جانے سے پہلے تمام سامان بی بی جی کو دے آتا اور اس سامان کی کوئی قیمت ادا کرنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ اس کے معاوضہ میں مجسٹریٹ صاحب اپنے ریڈر کے اعمال پر پردہ پوشی فرماتے اور ریڈر عدالت میں ہی دل کھول کر اپنا نذرانہ، محنتانہ اور شکرانہ وصول کرتا یعنی ان ریڈر اور مجسٹریٹ صاحب دونوں کے اخراجات آسانی کے ساتھ "اوپر کی آمدنی" سے چل جاتے۔

مجھے پاکستان کے وزراء کی تنخواہوں کا تو علم نہیں مگر ہندوستان کے صوبہ جات کے وزراء ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کا چیف سیکرٹری جو انڈین سول سروس کا ایک سینئر ممبر ہوا کرتا ہے۔ تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ وزراء کی کم تنخواہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ مہاتما گاندھی نے ایک بار کہا تھا۔ کہ پبلک کے نمائندے وزراء کو پانچسو روپیہ ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہ لینی چاہیئے۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے گرانی کا خیال اور اپنی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے صوبہ جات کے وزراء کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کی۔ ان وزراء کو تو چھوڑئیے جو ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ میں ہی اپنی دو چار برس کی وزارت کے زمانہ میں فاقہ کشی سے کروڑپتی ہو گئے۔ اور ان کے عزیز و اقارب بیس بیس ہزار روپے کی موٹروں میں سیر کرتے پھرتے ہیں دیانتدار وزراء کی پوزیشن یہ ہے کہ ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے وزیر بطور سفر خرچ کے سرکاری خزانہ سے عام طور پر دس دس پندرہ پندرہ اور بیس بیس ہزار روپیہ سالانہ وصول کرتے ہیں اور اس رقم کا انکشاف اس وقت ہوتا ہے جب مخالف پارٹی کا کوئی ممبر اسمبلی میں وزراء کے سفر خرچ کی رقم کے متعلق سوال کرے اور فنانس منسٹر سرکار کی طرف سے جواب دیتے ہوئے اس رقم کا اقرار کرے۔

مرحوم مولانا محمد علی جوہر کے اخبارات پبلک کے چندوں اور امداد سے چلتے تھے کیونکہ ان اخبارات کو چلانے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ آپ ایک بار جمعہ کی نماز کے بعد دہلی کی جامع مسجد میں تقریر کر چکے تو آپ کے مخالف خواجہ حسن نظامی کی پارٹی کے ایک ممبر نے آپ سے سوال کیا۔ کہ "آپ نے پبلک سے کتنا روپیہ چندہ وصول کیا اور اس چندہ کا پبلک میں حساب کیوں پیش نہیں کیا گیا" مرحوم مولانا بہت حاضر جواب تھے۔ آپ نے فرمایا "پبلک کا کام کرنے والوں سے چندہ کا حساب طلب نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ حساب قیامت کے روز خدا کے سامنے ہی پیش کیا جائے گا"

مرحوم مولانا کے اس قول کے مطابق صوبہ جات یا سنٹرل گورنمنٹ کے بعض وزراء کے رشوت کے کروڑوں روپیہ کا حساب بھی صرف قیامت کے روز ہی طلب کیا جا سکتا ہے مگر سفر خرچ کا دس پندرہ یا بیس ہزار روپیہ تو آمدنی ہے۔ جس پر نہ کسی تحقیقاتی کمیشن کو اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ آڈیٹر جنرل باز پرس کر سکتا ہے۔ چاہے مہاتما گاندھی کی روح اپنے حکم اور اپنی رائے کی مٹی پلید ہوتے دیکھ کر کتنا ہی افسوس کرے۔

آپ ریلوے سٹیشن پر جائیے جہاں کہ ٹرین میں آپ کی سیٹ ریزرو ہے۔ ریزرویشن کلرک سے جو فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کے پاس گھوم رہا ہوتا ہے پوچھیئے کہ آپ کے نام کی کون

Marfat.com

سی سیٹ ریزرو ہے۔ یہ بابو آپ کو آپ کی ریزرو برتھ بتاتے گا۔ اور بتانے کے بعد آپ کو سلام کر کے کھڑا ہو جائے گا۔ تاکہ آپ اس کو کچھ دیں۔ آپ اپنی فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کو ایک روپیہ دیں گے تو یہ ایک روپیہ لے کر اپنی جیب میں ڈال لے گا۔ کیونکہ یہ رشوت نہیں یہ تو صرف "اوپر کی آمدنی" ہے۔

مجھے دوسرے ممالک کا تو علم نہیں۔ مگر ہندوستان اور پاکستان کے دیہات کے پٹواری بھی ایک عجیب مخلوق ہیں۔ ان کی تنخواہ اس موجودہ گرانی کے زمانہ میں بھی پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں۔ جب کہ آج کوئی بڑھئی یا معمار چھ روپیہ روزانہ سے کم اجرت پر نہیں مل سکتا۔ ان لاکھوں پٹواریوں میں سے شاید ہی کوئی پٹواری ایسا مل سکے جس کا تمام خرچ "اوپر کی آمدنی" سے نہ چلتا ہو۔ اور کوئی کسان ایسا نہ ہوگا جو ان کے ہاتھوں تنگ نہ ہو اور کچھ اپنی پیداوار میں سے کچھ نہ کچھ پٹواری کو نہ دیتا ہو۔ چنانچہ گورو نانک کا بھی قول ہے: "موکو نت ڈسے پٹواری" (مجھے پٹواری ہر روز ڈستا ہے) اور ملک خضر حیات خاں کے ایک معتمد نے بتایا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی ملک صاحب اپنے دیہات کے پٹواریوں کو رشوت دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اگر یہ نہ دیتے تو ان کے کارندوں کو پٹواری تنگ کرتے۔ اور مرحوم مہاراجہ دھولپور (جو مذہبی خیال کے بہت نیک اور سناتن دھرم سبھا کے صدر تھے) کا تو ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ کہ ایک شخص نے مہاراجہ سے شکایت کی۔ کہ اس کے گاؤں کا پٹواری اسے تنگ کرتا ہے اور زمین کے داخل خارج کرنے کا معاوضہ پچیس روپیہ مانگتا ہے۔ مہاراجہ نے جب یہ سنا تو آپ نے اپنی جیب سے پچیس روپیہ نکال کر اس دیہاتی کو دیے اور کہا کہ یہ لو روپے پٹواری کو دے کر اپنا کام کرا لو۔ پٹواریوں کی رشوت خوریوں کا میرے پاس بھی کوئی علاج نہیں۔

عدالتوں میں جس قسم کی اوپر کی آمدنی ہے۔ جس روز کسی مقدمہ کے سلسلہ میں عدالت میں جاؤ۔ تو وکیل صاحب فرمایا کرتے ہیں۔ دو سو روپیہ ریڈر کو دے دو تاکہ وہ تنگ نہ کرے۔ اس کے بعد مقدمہ کے دوران کبھی کبھی ریڈر کو چائے پانی کے نام پر کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے اور جب مقدمہ کا فیصلہ حق میں ہو تو چپراسی عدالت کے باہر شکرانہ طلب کرتا ہے۔

سرکاری دفاتر کے کلرک اپنے دفتر سے آتے ہوئے دفتر میں سے نبیں۔ پنسلیں۔ روشنائی کی ٹکیاں۔ ٹائپ میں استعمال ہونے والے سفید کاغذ اور کلپ اپنے گھر لے جاتے ہیں تاکہ بچوں کی سکول کی ضروریات اس "اوپر کی آمدنی" سے پوری ہو سکیں۔

اخبارات کے سلسلہ میں اوپر کی آمدنی دینے اور لینے والوں کی کیفیت دلچسپ ہے۔ اخبارات والے اشتہارات لینے جب بمبئی کلکتہ وغیرہ جاتے ہیں تو اشتہارات دینے والے متعلقہ اصحاب کے لیے پھل۔ مٹھائی۔ ساڑھیاں۔ سکارچ۔ وسکی کی بوتلیں۔ سوٹوں کا کپڑا اور بعض اوقات صوفہ سیٹ بھی بطور تحائف لے جاتے ہیں۔ جن کو یہ تحائف قبول کرنے والے "اوپر کی آمدنی" قرار دیتے ہیں۔ اور

Marfat.com

اگر کوئی شخص کسی اخبار کے دفتر میں کوئی خبر یا مضمون شائع کرانے کے لیے جائے اور ایڈیٹر صاحب کے لیے کچھ پھل۔ بادام۔ اخروٹ یا پستہ لفافہ میں لے جائے تو یہ ایڈیٹر صاحب کی "اوپر کی آمدنی" ہوا کرتی ہے۔

رشوت کھانے والے سپرنٹنڈنٹ پولیس فی تھانہ کچھ رقم ماہوار مقرر کر لیتے ہیں۔ اور یہ تھانہ کی حیثیت سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جس تھانہ میں جرائم زیادہ ہوں اور تھانیدار کئی ہزار روپے ماہوار پیدا کر لیتا ہو تو اس تھانہ سے ایک ہزار روپیہ ماہوار سپرنٹنڈنٹ پولیس کے لیے دیا جاتا ہے۔ اور چھوٹے تھانہ سے پانچسو یا ڈھائی سو روپے ماہوار۔ اس آمدنی کو بھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بیوی "اوپر کی آمدنی" قرار دیا کرتی ہیں۔

اوپر کی آمدنی کا دار و مدار علاقہ پر بھی منحصر ہے۔ مثلاً پنجاب کا کانسٹیبل کسی ملزم سے پانچ روپے رشوت لیتا ہے تو یو پی کا کانسٹیبل صرف تمباکو کی بیڑی کے ایک پیکٹ پر ہی مطمئن ہو جاتا ہے۔

بڑے لوگوں کی "اوپر کی آمدنی" عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی وزیر کسی شخص کو ٹرک کا پرمٹ دے تو وہ پرمٹ دیتے وقت کچھ طلب نہیں کرتا۔ مگر چھ ماہ بعد چندہ کے نام پر پرمٹ لینے والے سے پانچ یا دس ہزار روپیہ وصول کرتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔

پنجاب کے ایک مہاراجہ ظلم کے اعتبار سے بہت بدنام تھے۔ اور ان کو گدی سے اتارنے کا مسئلہ وائسرائے کے سامنے درپیش تھا۔ تو ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے پنجاب نے اس مہاراجہ کی امداد کی اور وائسرائے سے کہہ کر اس کو گدی سے اترنے سے بچا لیا اور اس امداد کے باعث ایجنٹ اور مہاراجہ کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ چنانچہ دو برس کے بعد ایجنٹ گورنر جنرل نے اپنی مالی مشکلات کے نام پر مہاراجہ سے دس لاکھ روپیہ حاصل کیا یہ رشوت نہ تھی۔ بلکہ ایجنٹ گورنر جنرل کی صرف "اوپر کی آمدنی" تھی۔

"اوپر کی آمدنی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ پنجاب کا ایک گداگر گداگری کے سلسلہ میں ایک گھر میں گیا۔ اور اس نے خیرات حاصل کرنے کے لیے صدا بلند کی تو گھر کی مالکہ اس فقیر کے لیے روٹی لینے ڈیوڑھی میں سے باورچی خانہ کی طرف گئی۔ یہ جب جا رہی تھی۔ تو فقیر نے دیکھا۔ کہ ڈیوڑھی میں پیتل کا ایک گلاس پڑا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر گلاس اٹھا لیا۔ فقیر کے آگے بڑھنے کی آہٹ کو سن کر گھر کی مالکہ نے مڑ کر دیکھا تو فقیر اس گلاس کو اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال رہا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر کہ فقیر گلاس چوری کر رہا ہے۔ گھر کی مالکہ نے فقیر کو ڈانٹتے ہوئے کہا "کھسماں نوں کھانیاں توں گلاس چوری کر رہیا ایں۔" (کم بخت تو گلاس چوری کر رہا ہے) گھر کی مالکہ کے یہ الفاظ سن کر فقیر نے بے تکلف جواب دیا "اور تمہاری چکی آٹے کے رحم پر بیٹھے رہیں گے۔ گزارہ کہاں سے کریں۔" اس فقیر کے گلاس کے چوری کے ڈیفنس کی طرح ہندوستان اور پاکستان میں تنخواہ اتنی ضروری نہیں۔ جتنی کہ "اوپر کی آمدنی"۔

Marfat.com

انگریزوں کے جانے کے بعد پچھلے سترہ برس میں ہندوستان اور پاکستان میں نہ صرف "اوپر کی آمدنی" میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ اس میں بہت کافی اضافہ ہو گیا۔ اور اس کو کم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ دونوں ممالک میں ایسے جرائم کے لیے بھی کئی برس قید کی سخت سزا مقرر کی جائے۔ ایسے جرائم پر چشم پوشی کرنا یقیناً جرائم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہے ❊

ایڈیٹر "ریاست" کے خلاف مقدمات اور ان میں بریت

"کتاب ناقابلِ فراموش" کے ختم کرنے سے پہلے میں ان چودہ مقدمات کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں جن کے چلانے میں سابق والیانِ ریاست کا ہاتھ تھا کیونکہ ان مقدمات نے میری زندگی میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا اور اگر یہ مقدمات نہ چلائے جاتے تو شاید اس کتاب کے لکھنے کا موقع ہی نصیب نہ ہوتا۔ ان مقدمات کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ سب سے پہلے مجھ پر پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں مہاراجہ پٹیالہ کے ایما اور پنجاب کے ظالم ترین لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ قائم ہوا۔ یہ مقدمہ ڈپٹی کمشنر لاہور کی عدالت میں ایک پمفلٹ کے سلسلہ میں چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں میری کم عمری کو دیکھ کر ڈپٹی کمشنر نے مجھے تنبیہ کر کے مقدمہ واپس لے لیا۔

۲۔ یہ مقدمہ مجھ پر کوکین رکھنے کے جرم میں چلایا گیا جو لاہور کے مجسٹریٹ ٹھاکر ملت چند کی عدالت میں تھا۔ یہ مقدمہ مرحوم راجہ پٹیالہ کے روپیہ سے چلایا گیا۔ میں اس مقدمہ میں باعزت بری ہوا اور مجسٹریٹ نے مقدمہ چلانے والوں کے خلاف سخت ریمارک پاس کیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس مقدمہ کی تحقیقات ایک لائق اور دیانت دار اعلیٰ پولیس افسر خان بہادر مسٹر عبدالعزیز کے ذریعہ کی اور مقدمہ میں حصہ لینے والوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔

۳۔ نابھہ کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر اوگلوی نے مہاراجہ پٹیالہ کے ایماء سے مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں مجھے نابھہ میں گرفتار کیا اور کئی ماہ تک پولیس کی حراست میں رکھا اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے حکم سے یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔

۴۔ مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں مجھ پر امانت میں خیانت کرنے کے جرم میں مہاراجہ پٹیالہ کے ایماء سے ایک مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں مرکزی اسمبلی میں بحث ہوئی اور دو درجنوں ممبرانِ اسمبلی نے حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مقدمہ میں بحکم گورنمنٹ ہند میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

Marfat.com

۵- ہوشنگ آباد (سی پی) میں نواب بھوپال نے یہ مقدمہ پرنسس پروٹیکشن ایکٹ میں قائم کیا یہ مقدمہ بھی کئی بار مرکزی اسمبلی میں زیر بحث آیا۔ مقدمہ چھ برس تک چلا۔ کئی بار ہائیکورٹ ناگپور میں گیا اس مقدمہ میں میرا اسی ہزار روپیہ اور نواب بھوپال کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور اس مقدمے میں مجھے تین ماہ قید کی سزا ہوئی اور میں اے کلاس میں رکھا گیا۔

۶- میانوالی کی عدالت میں ریاست پٹیالہ کے ایک جج نے یہ مقدمہ میرے خلاف توہین کا جاری کیا۔ مقدمہ میں پچاس ہزار روپیہ ہرجانہ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مگر چند ماہ کے بعد جب مقدمہ میں مہاراجہ کو بے نقاب ہونے کا خدشہ ہوا تو یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔

۷- یہ مقدمہ نواب بھوپال نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں دائر کیا۔ یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں بھی گیا اور میں نہ صرف باعزت بری ہوا بلکہ عدالت اور ہائیکورٹ نے نواب بھوپال کے نمائندوں پر عدالت میں جعلی دستاویز پیش کرنے اور ریاست کو سازش کے ذریعہ چھلنے کا سنگین الزام بھی لگایا۔

۸- مقدمہ ریاست خیرپور میرس کے وزیر اعظم نے سکھر میں توہین کا دائر کیا اور یہ مقدمہ گورنمنٹ آف بمبئی کے حکم سے واپس لے لیا گیا۔

۹- نواب بھوپال کے نمائندوں کے ایما سے یہ مقدمہ آنریری مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں دائر ہوا۔ جس میں باعزت بری ہوا۔

۱۰- یہ مقدمہ نواب بھوپال کے نمائندوں نے ایک شخص شمس الدین کے ذریعہ دہلی میں دائر کیا گیا مگر مجسٹریٹ نے میرے نام سمن ہی جاری نہ کیے۔

۱۱- خواجہ حسن نظامی نے نواب رامپور کے ایما سے یہ مقدمہ رامپور کے کاغذات چوری کرانے کے جرم میں کیا مگر پولیس نے چالان تک نہ کیا۔

۱۲- یہ مقدمہ ایک آنریری مجسٹریٹ کے ذریعہ جھانسی میں کیا گیا۔ اس مقدمہ کی تہ میں بھی ایک والیٔ ریاست کا ہاتھ تھا۔

۱۳- یہ مقدمہ مہاراجہ پٹیالہ کے خسر سردار اندر سنگھ نے دہلی میں دائر کیا اور میں بری ہوا۔ مجسٹریٹ نے اپنے فیصلہ میں مستغیث کے خلاف سخت ریمارک کیے۔

۱۴- یہ مقدمہ جعلی نوٹوں کے رکھنے کے الزام میں تھا۔ اس مقدمہ میں مستغیث لالہ گوپال داس سابق ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ریاست بے پور تھے۔ میں اس مقدمہ میں بری ہوا اور ہائی کورٹ نے پولیس کے خلاف اپنی عدالت میں سخت ریمارک پاس کیے۔

Marfat.com

Marfat.com

لافانی کتاب "ناقابلِ فراموش" کا دُوسرا حِصّہ

سَیف و قلم

دیوان سنگھ مفتُون

سردار دیوان سنگھ مفتُون کی کتاب 'ناقابلِ فراموش' ان کی زندگی کا زبردست کارنامہ اور اُردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

اُنھوں نے اپنی زندگی کی پیچیدہ اور طویل راہوں سے اپنے منتشر نقوش قدم کو بڑی دیدہ دَری کے ساتھ چُن چُن کر اس سلیقے کے ساتھ الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ جو اس کتاب کو غور سے پڑھے گا، اس کی زندگی کے راستوں پر ایسے چراغ جگمگا اُٹھیں گے، جن کی مستقل روشنی میں وُہ بے خوف خطر آگے بڑھے گا، اور کسی نشیب و فراز یا کسی موڑ پر وہ ٹھوکر نہیں کھا سکے گا۔

رُوح میں بالیدگی اور عقل میں روشنی پیدا کرنے والی سبق آموز اور عبرت انگیز کتاب "ناقابلِ فراموش" کا دُوسرا حِصّہ "سَیف و قلم" شائع ہوگیا ہے۔

اپنے شہر کے بُک سٹال یا ہم سے طلب فرمائیں۔

Marfat.com